
شعلوں کا کفن
PDFBOOKSFREE.PK
سان آصف

شعلوں کا کفن



○ "سلطان معظم، بے شک ہم آپ کے مزاج کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتے مگر کیا ایک شادی شدہ عورت کا وجود اتنا قیمتی ہے کہ اس کے حصول کیلئے آپ اپنے جاں نثاروں کے قافلے کو وادیٔ مرگ میں گم کر دینا چاہتے ہیں۔" .... یہ تلخ الفاظ سلطان علاءالدین سے کس بزرگ نے کہے ؟

○ وہ اس آواز کو مسلسل کئی برسوں سے سن رہا تھا، یہ آواز ہمیشہ آدھی رات کو سنائی دیتی تھی۔ اس آواز کو روکنے والا کوئی نہ تھا یہاں تک کہ سلطان علاءالدین بھی نہیں .... وہ آواز کس کی تھی ؟

○ جشن فتح میں شریک ہونے والے ایک ایک فرد پر سکوت مرگ طاری تھا۔ ہر شخص حیران پریشان نظروں سے بھان متی کو دیکھ رہا تھا۔ تب حکم علاءالدین ہوا۔ "اس عورت کی زبان کاٹ کر ہمارے قدموں میں ڈال دو۔" .... وہ عورت کون تھی اور سلطان نے ایسا حکم کیوں دیا ؟

○ ملک کافور چونکہ بچپن ہی سے بے غیرتی کی آخری منزل کو چھو چکا تھا، اس لئے وہ سلطان کے معیار پر پورا اترا اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ علاءالدین کے قریب ہوتا چلا گیا۔

○ "پدمنی! تمہارے شوقِ دید نے ہمارے دنوں کو بے آرام اور راتوں کو بے خواب بنا دیا ہے۔ تمہیں کسی تاخیر کے بغیر خلوتِ شاہی تک پہنچ جانا چاہئے تاکہ ہم تمہارے حسنِ شرربار سے اپنے شبستانِ محبت کو آراستہ کر سکیں۔" .... سلطان کا پیغام ابھی پڑھ کر سنایا جا رہا تھا کہ اتنا سن کر دربار میں موجود غیرت مند راجپوتوں نے اپنی تلواریں بے نیام کر لیں۔

○ "یقین نہیں آتا کہ ایک عورت بھی ہمیں شکست دے سکتی ہے۔ آج ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم دنیا کی ہر شے کو حاصل نہیں کر سکتے۔" فرمانروائے ہند کے لہجے سے محرومی جھلک رہی تھی .... وہ کون تھی جو سلطان کو شکست کا سبق یاد کرا گئی تھی ؟

○ دلچسپیوں سے بھرپور، اس غیر روایتی ناول "شعلوں کا کفن" کی زبان بڑی تیکھی، انداز دلبرانہ اور بیان اتنا دلکش اور سحر انگیز کہ آپ اس ناول کو پڑھتے ہوئے اس کے اوراق میں کھو جائیں گے۔



خان آصف

پہلی اشاعت.........1991ء

تعداد.........پندرہ سو

طابع.........جاوید پرنٹنگ پریس، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی

قیمت.........دو سو پچاس روپے



اخبار جہاں پبلی کیشنز

آئی، آئی چندریگر روڈ

کراچی۔ فون...9-210710

پیش لفظ

زیر نظر ناول "شعلوں کا کفن" سلسلہ وار اخبار جہاں میں شائع ہوکر مقبولیت حاصل کرچکا ہے۔ اب کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ یہ اخبار جہاں پبلی کیشنز کی دوسری کتاب ہے۔

"شعلوں کا کفن" اس طالع آزما کی زندگی کی ایک خوں رنگ داستان ہے جس نے اپنی شمشیر آبدار سے فتوحات کی نئی تاریخ رقم کی۔ سلطان علاءالدین خلجی نے کم و بیش چوراسی جنگیں لڑیں اور ہر معرکے میں سربلند ٹھہرا۔

جب علاءالدین خلجی بساط سیاست پر ابھرا تو برصغیر کے گوشے گوشے پر توہم پرستی کی حکمرانی تھی۔ انسانی تقدیریں بے لباس سادھوؤں کے منتروں اور جاپوں کی اسیر تھیں، ہر گلی کوچے میں ہوس کے مذبح خانے قائم تھے اور ہندوستانی عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کی جارہی تھیں۔ دیوداسیوں کے ہیجان خیز رقص اور نشاط انگیز موسیقی، پوجا کا حصہ بن گئی تھی۔ پنڈتوں اور برہمنوں کی سازشوں نے ملک کی بڑی آبادی کو "اچھوت" بنا کر رکھ دیا تھا۔ کوئی منصف نہیں تھا اور کوئی عدالت نہیں تھی۔ ظلم اپنی آخری حدوں کو چھو چکا تھا۔ اس طرح اندرونی انتشار، غیر منصفانہ نظام اور آپس کے نفاق نے بیرونی مداخلت کیلئے بنیاد فراہم کی اور سلطان علاءالدین نے "ہزاروں خداؤں" کی سرزمین پر قدم رکھا، برہمن گزیدہ قوم سلطان علاءالدین کے ایک وار کو بھی نہ روک سکی اور اس کے جلال و جبروت کے سامنے جھکتی چلی گئی۔

اس غیر روایتی ناول کی زبان بڑی تیکھی اور انداز بڑا دلبرانہ ہے اور بیان اتنا دلکش، دلچسپ اور سحر انگیز کہ آپ اس ناول کو پڑھتے ہوئے اس کے اوراق میں گم ہو جائیں گے۔

(میر جاوید رحمٰن)

جب غوری فرمانرواؤں اور ان کے پروردہ غلاموں نے ہندوستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو خلجیوں کے گروہ کے گروہ ہندوستان آکر شاہی ملازمتیں اختیار کرنے لگے۔ ان خلجیوں میں سے بعض افراد نے اس قدر رسوخ حاصل کئے کہ وہ شاہی امراء کی صفوں میں داخل ہو گئے۔ انہی امراء میں سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی اور سلطان محمود خلجی کے باپ بھی شامل تھے۔

ایک مورخ کا خیال ہے کہ قالج خان کی نسبت سے ان امراء کو "قالجی" کہا جاتا تھا پھر کثرت استعمال سے یہ لفظ بگڑتے بگڑتے خلجی بن گیا۔

دوسرے مورخ کا خیال ہے کہ ترک بن یافث کے گیارہ بیٹوں میں سے ایک کا نام خلج تھا۔ اسی کی اولاد کو خلجی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو' جلال الدین خلجی کے لئے طالع آزمائی کا وقت آ گیا تھا۔ اس نے اپنی شاطرانہ چالوں سے امرائے دہلی کو اس طرح اسیر کر لیا تھا کہ وہ سب کے سب ذہنی طور پر اس کے غلام نظر آنے لگے تھے۔

اس دوران تاریخ ہند کا ایک بڑا حادثہ پیش آیا۔ غیاث الدین بلبن کا بیٹا معز الدین کیقباد گردش وقت سے بے خبر عوام کے ساتھ اس طرح کھیل رہا تھا جیسے وہ انسان نہ ہوں' لکڑی کے کھلونے ہوں۔ اسی عاقبت نا اندیشی نے کیقباد کو اس کے انجام سے قریب تر کر دیا تھا۔

جلال الدین خلجی نے زیر زمیں ایسے دام بچھائے تھے کہ کیقباد جیسا عیش پرست حکمراں اس دام کے حلقوں کو اپنی خمار آلود آنکھوں سے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر وقت کی گردش نے جلال الدین خلجی کے لئے وہ موقع فراہم کر دیا جو اس کی ذات کو تاریخ ساز بنا دینے کے لئے کافی تھا۔

جلال الدین خلجی نے بہت سوچ سمجھ کر بساط سیاست پر ایک فیصلہ کن چال چلی۔ جلال الدین نے ان ترک نوجوانوں کو آگے بڑھایا جن کے باپ کیقباد کے ہاتھ تہ تیغ کئے جا چکے تھے۔ اس وقت کیقباد کی جسمانی حالت یہ تھی کہ فالج کی وجہ سے وہ پہلے ہی نیم مردہ ہو چکا تھا۔ بس ایک سانس کا رشتہ باقی تھا۔ اگر اس رشتے کو توڑ دیا جاتا تو فرشتۂ اجل کیقباد پر غالب آجاتا اور جلال الدین کی آنکھوں میں پوشیدہ خوابوں کی تعبیر ہندوستان کے نقشے پر واضح نظر آنے لگتی۔

ترک نوجوان جوش انتقام میں آگے بڑھے۔ کیقباد بستر علالت پر اس طرح پڑا تھا کہ اس کے قریب نہ

کوئی مسیحا تھا۔......... اور نہ کوئی غمگسار۔ آنے والوں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر سلطان معز الدین کیقباد نے آنکھیں کھولیں اور نحیف و نزار لہجے میں بولا۔

"مجھ شکستہ انسان سے تمہیں کیا شکایت ہے؟"

"بس ایک ہی شکایت ہے کہ تو اب تک زندہ کیوں ہے؟" ایک ترک نوجوان نے آگے بڑھ کر کہا۔ خنجرِ قضا اس کے ہاتھ میں پوری آب و تاب کے ساتھ لہرا رہا تھا۔

"میں خود موت کے دہانے پر کھڑا ہوں۔ تم میرے خون سے اپنے ہاتھ کیوں رنگین کر رہے ہو؟"

معز الدین کیقباد کی آواز لرز رہی تھی اور آج اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ موت کتنے دبے پاؤں داخل ہوتی ہے کہ آہٹ تک سنائی نہیں دیتی اور جب ہزاروں سنگی اور آہنی دیواریں توڑ کر موت داخل ہو جاتی ہے تو اس سے زیادہ لرزہ خیز منظر کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ آنکھ کی پتلیاں شدت خوف سے کانپنے لگتی ہیں اور خون رگوں میں جم جاتا ہے۔ کیقباد کی بھی یہی حالت زار تھی جو اسے بھیک مانگنے پر مجبور کر رہی تھی۔

"اے بہادر ترک زادو! مجھے معاف کر دو۔" کیقباد کا لہجہ گداگرانہ تھا۔ "میں تمہارے دامن پر خون کی کسی چھینٹ کا نشان چھوڑے بغیر خود ہی دنیا سے گزر جاؤں گا۔"

"تجھے انجام کار دنیا سے جانا ہے۔ تیرے آخری سفر کو کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر اس وقت تیرے وفادار و نمک خوار بھی تیری گردن پر اپنی گردنیں رکھ دیں تو شمشیرِ قضا کا عمل رک نہیں سکتا۔ وہ یہاں تک اترے گی کہ زندگی بخشنے والی ایک ایک شریان کو کاٹ کر جسم سے علیحدہ کر دے گی۔"

دوسرا ترک زادہ اپنی دلی نفرت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"تم لوگ مجھے بس بھیک کی چند سانسیں دے دو کہ میں سکون سے مر سکوں۔" معز الدین کیقباد کا لہجہ مزید عاجزانہ ہو گیا تھا۔

"بھیک میں زندگی تو دی جا سکتی ہے لیکن اقتدار نہیں دیا جا سکتا۔" تیسرے ترک زادہ نے غضبناک آواز میں کہا۔

"میں تم سے اقتدار نہیں مانگتا۔ بس اپنی تھکی ہوئی زندگی کا سوال کرتا ہوں۔" کیقباد آخری لمحے تک دشمنوں کو اپنے لاغر جسم سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ تیری تھکی ہوئی زندگی ہی سب سے بڑا فتنہ ہے۔" ایک اور ترک زادے کی قہر آلود آواز بلند ہوئی۔ "مہرہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو مگر بساط پر اس کی موجودگی خطرناک ہوتی ہے۔ شاطر وہی ہے جو مہرے کو مکمل طور پر ہٹا دے۔ بیشک! آج تیری حالت کمزور ترین مہرے کی سی ہے لیکن بساط پر تیرا زندہ رہنا ایک خوفناک حقیقت ہے۔ پتہ نہیں کب تیرے دوسرے غلام مہرے ہم پر یلغار کر دیں اور اچانک بساط الٹ جائے۔ ہم جاہل شاطروں کی طرح اتنی کمزور بازی کھیلنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ تیرے جوتے چاٹنے والے سپاہیوں کو جلد از جلد معلوم ہو جانا چاہئے کہ ان کا شاہ اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ چکا تاکہ وہ میدان جنگ سے فرار ہونے میں عجلت کا مظاہرہ کریں...... اور وہ ایسا ہی کریں گے کہ تیری حکومت ناانصافیوں کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ تیرے اقتدار کا کوئی مقصد نہیں۔ زیادہ سے زیادہ دولت، شراب اور عورتیں۔ یہ کوئی مقصد نہیں تھا اور بے مقصد حکومتیں زیادہ دیر تک زمین پر قائم نہیں رہ سکتیں۔"

معز الدین کیقباد نے مزید گریہ و زاری کی مگر زندگی کی ساعتیں شمار کی جا چکی تھیں۔

اچانک ایک ترک زادہ شمشیرِ بے نیام لے کر آگے بڑھا تاکہ کیقباد کے کاندھوں سے اس کے سر کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے۔ جیسے ہی وہ بے دست و پا سلطان کے قریب پہنچا دوسرے ترک زادے نے چیخ کر کہا۔

"اس مردے کے جسم پر مشق ستم کر کے شمشیر کی کاٹ کو بے آبرو نہ کرو۔"

پھر چند ترک زادوں نے معز الدین کیقباد کے ناتواں اور بیمار جسم کو ایک کپڑے میں لپیٹا اور پھر دو چار ضربات میں اس کا کام تمام کر دیا۔

سانس کا رشتہ ٹوٹتے ہی ترک زادوں نے معز الدین کیقباد کے بے حس و حرکت جسم کو ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ پھر چند لمحوں بعد وہ ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور کیقباد کی لاش دریائے جمنا کے حوالے کر دی گئی۔

☆..................☆..................☆

ایک قتل کے بعد بظاہر جلال الدین خلجی اقتدار میں آ چکا تھا لیکن ابھی اس کے راستے میں دوسری رکاوٹ موجود تھی۔ وہ اسے بھی صبر و تحمل کے ساتھ دور کرنا چاہتا تھا۔ جب کیقباد کے مردہ جسم کو دریا برد کیا گیا تو اس کا تین سالہ بیٹا کیومرث حکومت کے وارث کی حیثیت سے موجود تھا۔ جلال الدین خلجی نے بساط سیاست پر ایک اور الجھی ہوئی چال چلی۔ ایسی پیچیدہ چال جسے اس کے عیار مخالف بھی سمجھنے سے عاجز تھے۔

جلال الدین خلجی نے غیاث الدین بلبن کے خاندان سے اس زور و شور کے ساتھ اظہار وفاداری کیا کہ سننے والے حیران رہ گئے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ معز الدین کیقباد کو بیدردی سے قتل کرنے والا اس کے بیٹے کو اپنا فرمانروا تسلیم کر لے گا۔

اور پھر جلد ہی وہ لمحہ آ گیا جب جلال الدین خلجی نے کیومرث کو سلطان شمس الدین کے لقب سے ہندوستان کے تخت پر بٹھا کر خود اس کے نائب کی حیثیت اختیار کر لی۔ ہر طرف جلال الدین خلجی کے عہد وفا کی گونج تھی۔ کہنے والے کہتے تھے ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں جو اس طرح اپنے مرحوم سلطان کی نشانی کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں مگر جاننے والے جانتے تھے کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

اور پھر ایک دن یہ پردہ بھی چاک ہو گیا۔ سلطان شمس الدین کی نام نہاد حکومت کو ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ معصوم فرمانروا قتل کر دیا گیا۔ اس بار بھی جلال الدین خلجی قاتل کے لباس میں نمودار ہوا تھا لیکن بظاہر اس کے دامن پر سلطان شمس الدین کے خون کا کوئی داغ نہیں تھا۔ وہ کہا کرتا تھا "میرے ہاتھ صاف ہیں۔"

پھر جب ۶۸۸ھ میں جلال الدین خلجی کو تاج پہنایا گیا تو اس کی عمر ستر سال تھی۔ ہوس اقتدار کی تسکین کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ محبت کی طرح سیاست کے جذبات بھی بڑھاپے میں زیادہ بھڑکتے ہیں۔ جلال الدین خلجی کے قدم قبر کی طرف رواں تھے مگر اس نے جاتے جاتے بھی اپنے دو آقاؤں کے خون سے رنگا ہوا تاج پہن لیا۔

پھر اقتدار کے یہ کیف آور اور نشاط انگیز لمحات بھی ختم ہو گئے۔ سلطان جلال الدین خلجی کے بھتیجے اور داماد علاء الدین خلجی کے نفس نے سرکشی اختیار کی اور اپنے بزرگ و محسن کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں ۷۷ سالہ بوڑھا حکمران جلال الدین خلجی چیخ رہا تھا۔

"بے وفا بھتیجے! میں نے تجھے اپنے سینے پر سلایا اور تو نے میری پشت میں خنجر اتار دیا۔"

جب سلطان جلال الدین خلجی زخمی ہو کر کشتی میں گر پڑا تو اس کے حلق سے دردناک آوازیں نکل رہی تھیں۔

"عہد شکن علاء الدین! میں نے اپنی آبرو تیرے حوالے کر دی مگر تو نے خون اور ناموس کے ایک ایک رشتے کو پامال کر ڈالا۔"

سلطان جلال الدین خلجی کے زخموں سے لہو جاری تھا........ اور علاءالدین خلجی کشتی کے گوشے میں اس طرح خاموش کھڑا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں حرص و ہوس کے خون رنگ سائے لہرا رہے تھے اور ہونٹوں پر ایک ایسا تبسم نمایاں تھا جو کسی منصوبہ ساز کے لبوں پر اس وقت ابھرتا ہے جب دشمن عالم نزع میں گرفتار ہو اور اس کے بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہے۔

علاءالدین خون کا سمندر عبور کر کے ساحل مراد تک پہنچ چکا تھا اور سلطان جلال الدین خلجی کا سفینۂ حیات گرداب فنا میں الجھا ہوا تھا۔ بہتا ہوا خون، ابھرتی ہوئی دردناک چیخیں اور ڈگمگاتی ہوئی کشتی اقتدار........ بڑا عبرت خیز منظر تھا۔

اچانک علاءالدین خلجی کی آنکھوں میں اس کے خونی ارادوں کا عکس ابھرنے لگا۔ کشتی میں موجود اختیارالدین نے علاءالدین کی آنکھوں کی زبان سمجھنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ اس وقت جلال الدین خلجی تڑپتے تڑپتے اوندھا ہو گیا تھا۔ اختیارالدین نے بڑے سفاکانہ انداز میں تاجدار ہند کو سیدھا کیا اور دوسرے ہی لمحے سلطان جلال الدین خلجی کا سر اس کے جسم سے علیحدہ ہو چکا تھا۔

اقتدار فطرتاً ایک بےوفا چیز ہے۔ جلال الدین سے بھی اس نے بیوفائی کی مگر اس قدر سنگین انداز میں کہ اس کے نمک خوار نیزوں پر اپنے آقا کا بریدہ سر لئے ہوئے گلی گلی، کوچے کوچے پھرتے رہے اور پکار پکار کر کہتے رہے۔

"یہ اس شخص کی سزا ہے جو بےوفا دنیا پر عاشق تھا۔"

اس کے بعد علاءالدین خلجی کے زرخرید غلاموں نے سلطان جلال الدین کے کٹے ہوئے سر کو ایک نیزے پر لٹکا کر کڑا اور مانک پور کے ایک ایک گوشے میں اس کی تشہیر کی۔ پھر یہی لوگ جلال الدین کا سر لے کر اودھ پہنچے۔ تاجدار ہند کی جس قدر رسوائی ممکن تھی وہ ہو کر رہی اِس نے جو فصل بوئی تھی وہ کاٹ لی۔ اب علاءالدین خلجی ہندوستان کا مطلق العنان حکمراں تھا۔

۶۹۵ھ کے آخر میں علاءالدین خلجی بڑی ہنگامہ خیزیوں کے ساتھ دہلی میں داخل ہو کر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا اور اسی دن دہلی کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔

علاءالدین ایک ذہین اور شاطر انسان تھا۔ لوگوں کی زبانیں خاموش تھیں مگر ان کی آنکھیں علاءالدین کے دامن پر جمی ہوئی تھیں وہ دامن جو سلطان جلال الدین خلجی کے خون سے رنگین تھا۔ علاءالدین نے ان آنکھوں کی زبان سمجھ لی اور پھر خون کے گہرے داغوں کو دھونے کے لئے اس نے جشن کیف و نشاط کا اہتمام کیا۔

دہلی کے ہر گلی کوچے میں شراب کی سبیلیں اس طرح کھول دی گئیں جیسے وہ نشہ آور سیال نہ ہو، شہد یا دودھ ہو۔ ترسے ہوئے لوگ کیف و مستی کے ان ذخیروں پر ٹوٹ پڑے۔ جب لذیذ غذاؤں اور خمار آلود پانی کی کثرت سے اہل شہر کے اعصاب بوجھل ہو گئے تو انہیں سلطان جلال الدین کے قتل کو بھی فراموش کرنا پڑا۔

عوام کے ضمیر اور احساس کو دولت کی لوریوں سے سلانے کے بعد علاءالدین خلجی امرائے دربار کی طرف متوجہ ہوا۔ انہیں بڑے بڑے عہدوں سے نوازا گیا یہاں تک کہ علاءالدین کا جرم اقتدار کے سنہری غبار میں گم ہو گیا۔

☆........☆........☆

علاءالدین خلجی ایک شجاع اور حوصلہ مند انسان ہونے کے ساتھ فطرتاً حسن پرست تھا۔ یہ اس کی عیش کوشی ہی کا نتیجہ تھا کہ اس نے عام لوگوں کے لئے شراب پر پابندی لگا دی تھی مگر خود اپنی خلوتوں میں شغل مے نوشی جاری رکھتا تھا۔

اپنے اس عیب کو چھپانے اور ہندوستانی عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے علاءالدین نے محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ کی پاکیزہ شخصیت کے سائے میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ وہ مرد قلندر تھے کہ کسی سلطان یا امیر کا سایہ تک برداشت نہیں کرتے تھے۔ علاءالدین خلجی نے کئی بار محبوب الٰہیؒ سے ملنے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ اس درویش خدامست نے فرمانروائے ہند سے ملنے سے انکار کر دیا۔

جب علاءالدین کا تمام جاہ و جلال اس مرد فقیر کے پیروں کی خاک سے بھی کمتر ٹھہرا تو خلجی کے حکمراں نے خود نظام الدین اولیاؒ کے نام ایک خط تحریر کیا۔ خط کیا تھا ایک گداگر کی التجا تھی، علاءالدین خلجی نے لکھا تھا۔

"یہ میری زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہوگی کہ میں ایک بار آپ کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہو جاؤں؟"

جواب میں حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنے خادم کو حکم دیا۔

"علاءالدین کو لکھ دو کہ اس درویش کے مکان کے دو دروازے ہیں۔ اگر تو ایک دروازے سے داخل ہو گا تو میں دوسرے دروازے سے باہر نکل جاؤں گا۔ اس کے بعد بھی اگر مجھے تنگ کرے گا تو میں تیرا ملک ہی چھوڑ دوں گا کہ خدا کی زمین تیرے اندازے سے بھی زیادہ وسیع ہے۔"

حضرت نظام الدین اولیاؒ کی اس بےنیازی کے بعد علاءالدین کا شاہی وقار بجھ کر رہ گیا اب اسے خطرہ لاحق ہو چلا تھا کہ اگر اس کے بعد بھی ضد کی گئی تو محبوب الٰہی یقیناً ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں گے اور وہ ایک مرد خدا کے قیام کی برکتوں سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے مجبوراً علاءالدین نے اپنے درباری شاعر حضرت امیر خسروؒ کا سہارا لیا۔

حضرت امیر خسروؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ کے محبوب ترین مرید تھے۔ بالآخر ایک دن علاءالدین خلجی نے حضرت امیر خسروؒ کو تنہائی میں طلب کرتے ہوئے کہا۔

"خسرو! میں تو حضرت شیخ کو مناتے مناتے تھک گیا۔ میرے دربار میں آنا تو کجا، وہ اس کے لئے بھی آمادہ نہیں کہ میں خود حاضر ہو کر ایک بار ان کی قدم بوسی کے اعزاز سے شرفیاب ہو جاؤں اب تم ہی میرا آخری سہارا ہو۔ میری خاطر کم سے کم اپنے شیخ کے حضور اتنی سفارش تو کر دو کہ میں ان کی دعاؤں میں شامل ہو جاؤں۔"

پھر جب حضرت امیر خسروؒ نے حضرت نظام الدین اولیاؒ سے عرض کیا تو محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔

"ہاں! میں اس کے لئے دعا کرتا ہوں گا مگر وہی شرط اب بھی برقرار ہے کہ وہ کبھی میرے سامنے آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

جب حضرت امیر خسروؒ نے سلطان علاءالدین خلجی کو اطلاع دی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کی دعاؤں میں اس کا نام شامل ہو جانا ہی اتنی بڑی سعادت تھی کہ جس کے بارے میں علاءالدین سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"خسرو! میں تمہارا مشکور ہوں کہ تم نے میری عافیت کے لئے ایک مضبوط سائبان فراہم کر دیا۔"

علاءالدین نے بڑے والہانہ انداز میں کہا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جب بھی علاءالدین کو کوئی سخت معرکہ پیش آتا تھا وہ اپنے قاصدوں کو حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں بھیج کر دعاؤں کا طالب ہوتا تھا۔ جواب میں محبوب الٰہی فرمادیا کرتے تھے۔

"خدا تجھے سرخرو کرے گا۔" ایک مرد بزرگ کی زبان سے ادا ہونے والے یہ چند الفاظ سلطان علاءالدین خلجی کے لئے جنگی اسلحے کا سب سے بڑا ذخیرہ ثابت ہوتے تھے۔ کئی خوفناک مواقع پر جب شکست سلطان کی فوجوں کا مقدر بن گئی تھی 'اس وقت حضرت محبوب الٰہی کی دعائیں کام آئیں اور علاءالدین خلجی ناکامی ونامرادی کے اندھیروں میں ڈوب کر ابھر آیا۔

چتوڑ کی مہم بھی ایک ایسی ہی مہم تھی جس نے علاءالدین خلجی کے ہوش اڑادیئے تھے۔ اس بار بھی سلطان 'امیر خسروؒ کے ذریعے حضرت نظام الدین اولیاؒ سے اپنے حق میں دعا کرانا چاہتا تھا.......... مگر خسروؒ نے صاف انکار کردیا۔

"میں شاہی ملازمت چھوڑ کر آپ کے عتاب کا شکار ہو سکتا ہوں" حضرت امیر خسروؒ نے فرمایا۔" مجھے یہ گوارہ ہے کہ میں آپ کی ناراضگی مول لے کے اپنی دنیا خراب کرلوں لیکن یہ گوارہ نہیں کہ پیرومرشد مجھ سے خفا ہوجائیں اور پھر میری آخرت برباد ہوجائے۔ سلطان! یہ بڑے خسارے کی تجارت ہے۔ مجھے اس قدر سنگین آزمائش میں نہ ڈالیں۔ وہ جنگ جو ایک عورت کے حصول کیلئے لڑی جارہی ہے 'میں اس کا تذکرہ پیرومرشد سے کس طرح کر سکتا ہوں؟ مجھ پر قیامت نازل نہیں ہوجائے گی۔"

"خسروؒ! بیشک! اس جنگ کی محرک ایک عورت ہے لیکن اس کے ساتھ یہ سرکش راجپوت بھی ہمارا نشانہ ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس بہانے ایک جنگجو قوم کے اٹھے ہوئے سروں کو پائے شاہی پر جھکادیں۔ یہ ایک بڑی سیاسی فتح ہوگی.........." سلطان علاءالدین خلجی نے امیر خسروؒ کو عیارانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔" تم تو پیرومرشد کے حضور صرف اتنا عرض کروگے کہ علاءالدین چتوڑ کے ناقابل تسخیر قلعے کی طرف جارہا ہے اور محبوب الٰہیؒ کی دعاؤں کا طلب گار ہے۔ تمہیں کیا ضرورت ہے کہ ایک عورت کے ذکر کو درمیان میں لاؤ۔ پیرومرشد کو کیا خبر ہوگی کہ اس جنگ کا بنیادی سبب کیا ہے؟"

حضرت امیر خسروؒ سے برداشت نہ ہوسکا۔ اس لئے بے اختیار فرمانے لگے۔" سلطان! اگر نظام الدین اولیاؒ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ کس ارادے سے میدان کارزار کی جانب جارہے ہیں تو پھر وہ پیرروشن ضمیر کس طرح قرار پائیں گے.......... اور جب شیخ کو یہ بھی خبر نہیں کہ دعاؤں کا طالب اپنے دل میں کیا مقصد لے کر آیا ہے تو پھر دعا کس طرح قبول ہوگی؟ اگر رسم دعا اتنی ہی ارزاں ہے تو پھر جس کا جی چاہے دعا کیلئے ہاتھ اٹھادے۔ آپ کو محبوب الٰہیؒ کی دعاؤں کی کیا ضرورت ہے؟" احترام شاہی کے باوجود حضرت امیر خسروؒ کے لہجے میں ناخوشگواری کا رنگ جھلکنے لگا تھا پھر آپ یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے..........

"سلطان! مجھے اس حکم کی تعمیل سے معذور سمجھا جائے اور اگر میرا یہ عمل مزاج شاہی پر گراں ہے تو مجھے ملازمت سے سبکدوش کردیا جائے۔"

"نہیں خسروؒ میں ضد نہیں کررہا ہوں۔" علاءالدین خلجی نے گھبرا کر کہا.......... "تمہاری ملازمت کی یہ شرط نہیں کہ تم میری ناجائز درخواستوں کو بھی نظام الدین اولیاؒ کے حضور پیش کرو۔ یہ تو ایک التجا تھی جو تمہاری وضاحت کے بعد نامناسب معلوم ہوتی ہے۔"

امیر خسروؒ جاتے جاتے ٹھہر گئے اور پھر علاءالدین خلجی سے مخاطب ہوکر فرمانے لگے "اگر آپ کو تسخیر چتوڑ کا شوق ہے تو بے دریغ چلے جایئے۔ جب پیرومرشد ایک بار فرما چکے کہ آپ ان کی دعاؤں کے

زیر سایہ رہیں گے تو پھر یہ اندیشے کیوں؟ شمشیر کو بے نیام کیجئے اور چتوڑ کے کوہساروں میں اپنے حوصلوں کو آزمایئے۔" اتنا کہہ کر امیر خسروؒ دربار سے چلے گئے اور علاءالدین خلجی نے اپنی محفل تنہائی کو سامان کیف ونشاط سے آراستہ کرلیا۔

☆.......................☆.......................☆

اب وہ عالم بے خودی میں ایک فاتح کے بجائے دل شکستہ عاشق نظر آرہا تھا۔ جب علاءالدین خلجی کا اضطراب حد سے گزر گیا تو اس نے اپنے ایک معتمد خاص علی عامر کو خلوت میں طلب کیا۔

علی عامر جب اجازت لے کر سلطان کے تنہا کمرے میں داخل ہوا تو فرمانروائے ہند سرمستی کے باوجود لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ عامر کے آتے ہی علاءالدین خلجی نے اپنے غیر متوازن قدموں کو سنبھالا اور دھندلی نظروں سے علی عامر کی طرف دیکھنے لگا۔

علی عامر پٹھانوں کے مشہور قبیلے آفریدی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے مورث اعلیٰ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور پھر محمود غزنوی کے دور حکومت میں قلعہ ہانسی کی فتح کے بعد ان لوگوں نے یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔

اس کے بعد ہندوستانی سیاست کا نقشہ بہت تیزی سے بدلتا رہا۔ شہاب الدین غوری کی فتوحات سے لے کر خلجیوں کے اقتدار تک علی عامر کے خاندان نے اسلامی حکومت کے قیام میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اب علی عامر سلطان علاءالدین کے دربار سے اس طرح وابستہ تھا کہ اس نے کئی خونریز معرکوں میں حصہ لے کر اپنی بے پناہ جنگی صلاحیتوں کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کیا تھا اور پھر اس طویل آزمائش کے راستے سے گزر کر وہ علاءالدین خلجی کے مصاحبین خاص کے حلقے تک پہنچ گیا تھا۔

علی عامر آفریدی 'علاءالدین خلجی کا مصاحب ضرور تھا مگر خوشامدی نہیں کہ سلطان کی زبان سے کوئی لفظ ادا ہوا اور وہ غلاموں کی طرح سر جھکادے۔ علی عامر ان جاں نثار مصاحبوں میں سے تھا جو بادشاہ کے قریب محض اس لئے رہتے ہیں کہ گردش کے وقت اپنے فرمانروا کو بچانے کیلئے زندگی تک قربان کرڈالیں۔ سلطان علاءالدین خلجی بھی اس حقیقت سے باخبر تھا کہ علی عامر آزمائش کے لمحات میں پشت دکھانے والا نوجوان نہیں۔ سلطان کے خیال میں اس کے بیٹے منہ موڑ سکتے ہیں مگر علی عامر اس وقت تک ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا جب تک جسم اور جان میں سانس کا رشتہ باقی رہتا اسی اعتبار نے علی عامر کو سلطان کے بہت قریب کردیا تھا۔

آج جب علاءالدین خلجی دل کے زخموں سے بے قرار ہوکر اپنے حواس کھو بیٹھا تھا تو اسے علی عامر کی شدید ضرورت محسوس ہورہی تھی اور پھر ایک ہی جنبش لب نے علی عامر کو سلطان کے سامنے حاضر کردیا تھا۔

"میرے قریب آؤ آفریدی!" سلطان نے اپنے نوجوان سپہ سالار اور معتمد خاص کو پکارا۔

علی عامر باوقار مگر وفادارانہ رفتار کے ساتھ چلتا ہوا علاءالدین خلجی کے قریب پہنچا اور احتراماً سر کو قدرے خم کرتے ہوئے بولا۔" سلطان معظم! یہ جاں نثار سایۂ جسم کی طرح آپ کے قریب ہے۔"

علاءالدین خلجی کے قدموں نے اس کے بدن کا بوجھ اٹھانے سے انکار کردیا تھا۔ اس لئے وہ قریب ہی پڑی ہوئی ایک آبنوسی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ایک تو کمرے کی تنہائی دوسرے سلطان کا جاہ وجلال 'فضا میں عجیب سا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ علی عامر بدستور سر جھکائے کھڑا رہا۔

"آفریدی!" سلطان کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔" آج ہم ایسی اذیت میں مبتلا ہیں کہ جسے دوسروں کے سامنے بیان کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔"

"سلطان معظم! مجھے بھی غیر سمجھ کر اس راز کو اپنے سینے ہی میں پرورش کرتے رہے۔ غلام نہیں چاہتا کہ شاہ والا کے ہونٹ کانپیں اور چند الفاظ اس طرح تاریخ کے اوراق پر جم کر رہ جائیں کہ پھر مستقبل کا ہاتھ بھی ان کو کھرچنے سے قاصر رہے۔" علی عامر آفریدی بڑے مدبرانہ انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔

"آفرین ہے تم پر آفریدی! سو بار آفرین! ہم تمہیں اسی لئے پسند کرتے ہیں کہ تم صرف اندھے جاں نثار ہی نہیں، عقل و ہوش بھی رکھتے ہو، لیکن دل کے درد کو کیا کریں جو مسلسل کئی ماہ سے اٹھ رہا ہے۔ ایسا درد جسے کوئی طبیب سمجھ سکتا ہے اور نہ دوا فراہم کر سکتا ہے۔"

"تو پھر غلام کے روبرو بیان کر دیجئے کہ شاید اس طرح کچھ مداوا ہو جائے۔" علی عامر نے آہستہ سے کہا اور نظریں سنگی فرش پر جھکا دیں۔

"چتوڑ کی رانی پدمنی نے ہماری راتوں کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔" بالآخر علاء الدین اپنے راز کو راز نہ رکھ سکا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ اس کے حسن جہاں سوز نے بے شمار دلوں کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ لوگوں کا دعویٰ درست ہی معلوم ہوتا ہے۔ تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ اس کے شعلۂ رخسار کی تپش سے تمہارا سلطان بھی محفوظ نہیں رہ سکا ہے۔"

"شاہ والا! آپ کے دل اور عام انسانوں کے دلوں میں بڑا فرق ہے ان لوگوں کے دل جلیں گے تو وہ شعلے صرف چند گھروں کو جلائیں گے، مگر آپ کے دل میں آگ لگنے کا مطلب ہے کہ پورا ہندوستان اس آگ کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ خدا کے لئے آپ ان شعلوں کو اسی کمرے میں بجھا دیجئے۔ ورنہ خاندان خلجی کا جاہ و جلال ایک معمولی عورت کی نذر ہو جائے گا۔" علی عامر، سلطان کی کیفیت دیکھ کر خود بھی اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ اس کی آواز سے رقت جھلکنے لگی تھی اور آنکھوں کے گوشوں سے ہلکا ہلکا پانی ابھرتا ہوا صاف محسوس ہو رہا تھا۔

"نہیں! آفریدی نہیں، آگ لگے ہوئے بہت دیر ہو چکی اب ان شعلوں کا سفر دل سے روح کی طرف ہے۔ یہ شعلے اسی وقت بجھیں گے جب رانی پدمنی ہمارے شبستانِ محبت میں جلوہ آراء ہو گی۔" یکایک سلطان علاء الدین خلجی کا سوز و گداز، شدید قہر و نفرت میں بدل گیا تھا۔

علی عامر آفریدی، بادشاہ کی حالتِ جنوں دیکھ کر سہم گیا تھا۔

"آفریدی! کیا سوچ رہے ہو؟" سلطان نے علی عامر کو خاموش دیکھ کر سوال کیا۔

"سلطان معظم! اگر اس غلام کی رائے کو گستاخی و بے ادبی کے دائرے میں شامل نہ کیا جائے تو اس قدر وسیع و عریض ہندوستان میں رانی پدمنی کی کیا حیثیت ہے؟ اس سے زیادہ دلکش عورتیں بادشاہ کے حرم کو اس طرح آراستہ کر سکتی ہیں کہ نہ رعایا کے مکانات جلیں گے، نہ میدان انسانی خون سے سرخ ہوں گے اور نہ سلطان کے دامن جلال پر تہمت و الزام کا کوئی داغ ابھرے گا۔ مذہب آپ کو جائز ارادوں سے باز نہیں رکھتا حکم کی دیر ہے، پھر اپنے خدام کی کارگزاری ملاحظہ کیجئے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے کو ان کے گھوڑوں کے سم پامال کر ڈالیں گے اور پھر ایک ایسی دوشیزہ آپ کے نکاح میں داخل ہو جائے گی جس کے رخِ تابناک کے آگے پدمنی کا حسن ایک مہمل اور بے رنگ افسانہ بن کر رہ جائے گا۔ خاندان خلجی کے عظمت و جلال کی قسم! چتوڑ کی رانی پدمنی اتنی باکمال عورت نہیں کہ سلطان اس کے لئے سب کچھ فراموش کر دیں۔"

"یہ عورت کے حسن یا کمال کی بات نہیں، ایک مطلق العنان فرمانروا کی شاہانہ ضد کا سوال ہے۔" علاء الدین خلجی کا لہجہ بدستور قہرناک تھا۔ "بے شک! اقتدار کا یہ مزاج ہے کہ وہ ہمیشہ سود کی طرف دیکھتا

ہے مگر کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ زیاں کی طرف بھی ہاتھ بڑھائے۔ آفریدی! تم نہیں جانتے کہ جذبۂ خودپسندی کتنی عجیب چیز ہے۔ کبھی اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ شبنم میں نہائے اور کبھی اس کا مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ قصداً بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں میں جل جائے۔ رانی پدمنی بھی ہماری ذات کے لئے ایک ایسا ہی آتشیں مسئلہ ہے۔ سیاسی اعتبار سے قلعہ چتوڑ کی تسخیر ہماری فطری ضرورت ہے۔ اگر ہم بیک وقت دونوں بازیاں جیت گئے تو اقتدار کے ساتھ دل کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں گے اور یہ ایک مثالی فتح ہو گی۔" یہ کہہ کر سلطان کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گیا۔ غالباً وہ علی عامر آفریدی کے چہرے پر اپنی گفتگو کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔

علی عامر مزید کیا کہتا؟ اسے اپنی حدود میں رہ کر جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا تھا۔ فرمانرواؤں کی سرکش ضدوں کے آگے مشوروں کی دیواریں کھڑی نہیں کی جا سکتیں۔ مجبوراً علی عامر نے بھی اپنے حسن پرست فرمانروا کے سامنے سر جھکا دیا۔

پھر سیاست و محبت کے ایک خاص منصوبے کے مطابق یہ بات طے پا گئی کہ چتوڑ کی ابتدائی مہم میں علی عامر آفریدی، سلطان علاء الدین خلجی کے سفیر کے فرائض انجام دے گا۔ آفریدی اس وقت ایک ایسا سفیر تھا جو اپنے سینے میں فرمانروائے ہند کا بہت نازک راز چھپائے ہوئے تھا۔ یہ راز اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ رانی پدمنی سلطان علاء الدین خلجی کی محبت و اطاعت قبول کر کے ایک بیوی کی حیثیت سے اس کے حرم میں داخل ہو جائے اور سلطان کے دل کے ساتھ ساتھ عظیم ہندوستان پر بھی حکومت کرے اور اگر اسے یہ پیشکش منظور نہ ہو تو اپنی آنکھوں سے چتوڑ کی ہلاکت و بربادی کا خوں رنگ تماشا دیکھے۔

اگرچہ سلطان علاء الدین خلجی کے اس راز پر بہت سے گہرے پردے ڈالے گئے تھے مگر علی عامر کے علاوہ بھی ایک اور شخص تھا جو اس راز سے باخبر تھا۔ اس شخص کو تاریخ ہند ملک کافور کے نام سے خوب جانتی ہے۔ گجرات کی ایک خونریز جنگ کے بعد دو ایسی چیزیں سلطان کے ہاتھ آئیں جن کی وجہ سے علاء الدین خلجی کی سلطنت بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ گجرات کی اس جنگ میں راجہ کرن اس قدر بدحواسی میں فرار ہوا کہ اپنی بیوی کملا دیوی اور خزانے کو بھی ہمراہ نہ لے جا سکا۔ نتیجتاً کملا دیوی کے ساتھ سیم و زر کا یہ انبار بھی علاء الدین کے ہاتھ لگا۔ دہلی پہنچ کر کملا دیوی نے اس شرط پر اسلام قبول کر لیا کہ اسے "بانوئے سلطنت" اور "ملکۂ جہاں" بنا دیا جائے۔ سلطان نے کملا دیوی کی یہ شرط قبول کر لی اور اسے اپنی جائز بیوی کا درجہ دیا۔

علاء الدین خلجی کے دربار میں ملک نائب نامی ایک غلام نے اس قدر ترقی کی کہ سلطان کے دل پر حکومت کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ملک کافور کو "ملک نائب" کا خطاب دیدیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی خلعتِ فاخرہ اور سرخ شامیانے کی بھی اجازت دیدی گئی جسے سلطان کے سوا حکومت کا کوئی دوسرا عہدیدار استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

آج اسی ملک نائب کو جب سلطان کے نئے عشق کا راز معلوم ہوا تو، اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔

ملک کافور سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سلطان علاء الدین خلجی اس کی محبت کے حصار سے نکل کر ایک شادی شدہ راجپوت عورت کی محبت میں اس طرح گرفتار ہو جائے گا۔ یہ ایک خوفناک جذباتی حادثہ تھا۔ ملک کافور ساری ساری رات جاگ کر شراب پیتا اور مسلسل غور کرتا رہتا کہ سلطان کو رانی پدمنی کے فتنے سے کس طرح محفوظ رکھے؟ اس کی یہ بے چینی صرف اپنی ذات تک محدود تھی۔ وہ نہ سلطان کی ہمدردی میں

شب بیداری کر رہا تھا اور نہ اسے اس بات سے کوئی دلچسپی تھی کہ چتوڑ پر فوج کشی کے سیاسی اثرات کیا ہوں گے؟ وہ تو بس ایک ہی آگ میں جل رہا تھا کہ رانی پدمنی کی نادیدہ شخصیت نے سلطان کے سر سے اس کی محبت کا جادو کیوں اتار دیا تھا؟ ملک کافور نے ہر زاویے سے سوچا مگر اس کا محدود ذہن ہر گزرے ہوئے لمحے کے ساتھ ناکارہ ہوتا جا رہا تھا۔ ملک کافور ایک جاہل نوجوان تھا۔ اس نے وقتی ضرورت کے مطابق شمشیر زنی کے کچھ انداز سیکھ لئے تھے ورنہ اس میں سازشی منصوبے بنانے کے سوا کوئی صلاحیت موجود نہیں تھی اور یہ سازشیں بھی محض اس بنیاد پر کامیاب ہو جاتی تھیں کہ علاء الدین خلجی کی رنگین مزاجی اس کی پشت پناہی کرتی تھی، مگر آج ملک کافور کی زندگی کا نازک ترین موڑ آ گیا تھا۔ سلطان کی جس نگاہ کرم کے باعث ایک غلام معزز و محترم ٹھہرا تھا، وہی نگاہ اب چتوڑ کے طلسم کدے پر مرکوز تھی۔

ملک ایک قریب المرگ سانپ کی طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وہ اس سنگین مسئلے پر کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تمام اہل شہر اور سارے درباری اس سے نفرت کرتے تھے۔ اس موقع پر ملک کافور کو ساہو کار نندلال بہت یاد آ رہا تھا۔ وہی نندلال جس کی غلامی میں اس نے اپنے لڑکپن کے کئی سال گزارے تھے۔ ملک کافور کے تصور میں نندلال کا چہرہ ابھرا تو اسے اپنا ماضی بھی یاد آ گیا۔

یہ چند سال پہلے کا واقعہ تھا۔ جب سلطان علاء الدین خلجی کے بھائی الغ خان اور ملک نصرت خان گجرات کے حاکم راجہ کرن کو شکست دے کر کمبایت کے علاقے کی طرف بڑھے تو انہیں ساہو کاروں کی ایک جماعت نظر آئی۔ یہ سود خور ہندو بہت زیادہ مالدار تھے۔ ملک نصرت خان نے ان تمام ساہو کاروں سے بے شمار روپیہ خراج کے طور پر وصول کیا۔ کمبایت کے ان ہی سود خوروں میں سے ایک ساہو کار نندلال بھی تھا۔ ملک نصرت خان نے نندلال کے یہاں سونے اور چاندی کا ذخیرہ بھی دیکھا مگر جس چیز نے اسے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ایک ہندو لڑکا تھا، بے پناہ حسن رکھنے والا۔ ملک نصرت خان اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر جب نصرت خان نے نندلال سے لڑکے کے متعلق دریافت کیا کہ یہ کون ہے تو ساہو کار نے بتایا کہ وہ اس کا غلام ہے۔

نندلال ایک سیاہ فام اور بد صورت انسان تھا۔ ملک نصرت خان اس کا جواب سن کر غضبناک ہو گیا اور کہنے لگا۔

ایک کریہہ المنظر شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اتنا خوبصورت غلام رکھ سکے۔ اس پری زاد کو تو صرف اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ کسی شہنشاہ یا سلطان کی خدمت کرے۔" اتنا کہہ کر ملک نصرت خان نے اس لڑکے کو نندلال سے جبراً چھین لیا۔ نندلال شاہی افواج کے سامنے بے دست و پا تھا مگر پھر بھی اس نے ملک نصرت خان سے بڑے گداگرانہ انداز میں التجا کی۔

"میں سلطان کی خواہشات کا احترام کرتا ہوں مگر اس لڑکے سے مجھے بے پناہ محبت ہے میں نے اپنی ذات پر ساری دنیا کے عیش حرام کر کے اس کی پرورش کی ہے۔ اب مجھ سے اس کی جدائی برداشت نہیں ہوگی۔" نندلال ملک نصرت خان کے سامنے زار و قطار رو رہا تھا۔

"اگر تو روتے روتے ہلاک بھی ہو جائے تو میں اس لڑکے کو تیرے ساتھ نہیں رہنے دوں گا۔ تو نے ایک لڑکے کو بیٹے کی طرح نہیں ایک بدترین غلام کی طرح پالا ہے اور وہ بھی ایسا غلام کہ جسے مردانگی سے محروم کر دیا گیا ہے۔ تم لوگ ازلی سود خور ہو اور تم نے انسانی رشتے قائم کرنے میں بھی اسی سود خوری سے کام لیا ہے۔ اس خوبصورت لڑکے سے اس کی مردانہ پہچان چھین کر تم نے اس سفاکی کا مظاہرہ کیا ہے جس کے متحمل جانور بھی نہیں ہو سکتے۔" ملک نصرت خان کو جس قدر بھی برے الفاظ یاد تھے وہ سب کے سب اس

نے ساہو کار نندلال کے لئے استعمال کر ڈالے تھے مگر وہ پھر بھی سلطان علاء الدین خلجی کے نمائندے کے قدموں سے لپٹا ہوا تھا اور لڑکے کی بھیک اس طرح مانگ رہا تھا کہ اس کے بدلے میں اپنی ساری دولت دینے کے لئے آمادہ تھا۔

ملک نصرت خان اس کی مسلسل گریہ و زاری کے بعد اس حد تک متاثر ہوا تھا کہ وہ نندلال کو لڑکے کے ساتھ سلطان علاء الدین خلجی کے دربار میں پیش کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ "اب تیرا فیصلہ سلطان ہی کر سکیں گے۔"

کریہہ المنظر بوڑھا، اس شرط پر بھی دہلی جانے کیلئے تیار تھا۔ پھر الغ خان اور ملک نصرت خان نے دربار سلطانی میں پہنچ کر اپنے جنگی کارناموں کی تفصیلات پیش کیں تو علاء الدین خلجی جوش جذبات میں کھڑا ہو گیا وہ اپنے فاتح سپاہیوں کو اسی طرح خوش آمدید کہتا تھا پھر سلطان یہ کہتا ہوا اپنے تخت زر نگار پر بیٹھ گیا۔

"بے شک! سلطنت خلجی کے وفاداروں نے اپنے عہد نبھا دیئے اور ایفائے عہد کرنے والے بڑے مقام کے مالک ہیں۔"

پھر اس نے سیم و زر کے ذخائر دیکھے جو اکثر حکمرانوں کی کمزوری ہوتے ہیں۔ علاء الدین خلجی کی عقابی آنکھیں ایک بار پھر چمکنے لگیں۔ سرزمین گجرات سے لایا ہوا یہ سنہری شکار اس کے پنجوں میں تھا۔

"اور وہ بزدل راجہ کرن کہاں ہے جس نے ہمیں خراج دینے سے انکار کر دیا تھا؟" علاء الدین خلجی کی پر جلال آواز گونجی۔

"وہ سلطان معظم کے غلاموں کی ہیبت دیکھ کر میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔" ملک نصرت خان نے اظہار وفاداری میں اپنے سر کو قدرے خم کرتے ہوئے کہا۔

علاء الدین خلجی فاتحانہ انداز میں قہقہہ زن ہوا اور پھر اس نے وزیر اعظم کی طرف دیکھ کر ایک مخصوص اشارہ کیا۔

اس سے پہلے کہ کسی سیم تن رقاصہ کی پازیب کھنکتی، علاء الدین خلجی کی آواز دوبارہ گونجی۔

"اس بزم طرب کی تمام سرمستی اور اس مجلس کیف و نشاط کی تمام بے خودی، آگ اور خون کے دریا سے گزر کر آنے والوں کے نام۔"

جیسے ہی سلطان کے الفاظ کی بازگشت ختم ہوئی، شاہی دربار میں ہنگامۂ رقص و سرود شروع ہو گیا پھر جب نغموں کی لے اپنی انتہائی بلندیوں کو پہنچ گئی اور شاخ گل جیسی لچکنے والی رقاصاؤں کا فن تمام ہوتا نظر آنے لگا تو ملک نصرت خان نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ علاء الدین خلجی دربار میں اس طرح بیٹھا کرتا تھا کہ اگر کوئی شخص آنکھوں ہی آنکھوں میں بھی اشارہ کرتا تو سلطان کو اس جنبشِ چشم کی خبر ہو جاتی۔ اس نے دربار کے ہر گوشے میں بے داغ آئینے اس طرح ترتیب دیئے تھے کہ ایک ایک فرد کا چہرہ سلطان کی نگاہوں کی حدود میں رہتا تھا۔ جیسے ہی ملک نصرت خان نے سپاہیوں کو اشارہ کیا، سلطان علاء الدین خلجی چونک کر اپنے سپہ سالار کی طرف دیکھنے لگا۔

ملک نصرت خان، سلطان کے بائیں ہاتھ پر وزیر اعظم کی نشست کے بعد بیٹھا تھا۔ سلطان کو حیرت زدہ پا کر نصرت خان آگے کی طرف جھکا اور سرگوشی کے انداز میں علاء الدین خلجی سے کہنے لگا۔

"ابھی فتح گجرات کی داستان مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ابھی اس کا ایک لالہ رنگ باب پردوں میں لپٹا ہوا ہے۔ کچھ دیر بعد ہی سلطان معظم اس بے مثال تحریر کا مطالعہ کریں گے۔ پھر شاہ والا کو اندازہ ہو گا کہ غلاموں کی وفاداریاں کس منزل میں ہیں؟" یہ کہہ کر ملک نصرت خان اپنی نشست پر سیدھا ہو گیا اور ان سپاہیوں کو

دیکھنے لگا جو دبے پاؤں دربار سے نکل کر ملحقہ کمرے کی طرف جا رہے تھے۔

پھر جب اس ہندو لڑکے کو دربار میں لایا گیا تو ہر آنکھ حیرت سے کشادہ ہو گئی۔ وہ یونانی دیوتاؤں جیسا حسن رکھنے والا' ایک سترہ اٹھارہ سالہ ہندو لڑکا گوپی رام تھا۔ اس کے دربار میں داخل ہوتے ہی ایک زلزلہ سا آ گیا۔ ساز خاموش ہو گئے اور رقص تھم گیا۔ سلطان علاء الدین خلجی آنے والے اجنبی لڑکے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے ایسا ہی تھا کہ انسانی نظریں اس کے نقش و نگار پر جم کر رہ جائیں۔ اہل دربار کی نگاہیں بھی گوپی رام کے بڑھتے ہوئے قدموں کے ساتھ گردش کر رہی تھیں۔ اس نوخیز لڑکے کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی پتھر کے بت میں جان پڑ گئی ہے۔

علاء الدین خلجی نے گھبرا کر ملک نصرت خان کی طرف دیکھا جو اپنی نشست پر کھڑا ہو چکا تھا۔

سلطان ذی حشم! فتح گجرات کے افسانے کا یہی وہ آخری ورق ہے جو ایک غلیظ ساہوکار کے گندے ہاتھوں سے میلا ہو رہا تھا۔ " یہ کہہ کر ملک نصرت خان نے پوری تفصیل سلطان کے گوش گزار کر دی اور اس کے ساتھ ہی والئ ہند کو یہ بھی بتا دیا کہ سود خور نندلال دربار سے باہر موجود ہے اور شرف باریابی چاہتا ہے۔

سلطان نے چند لمحوں کیلئے سوچا اور پھر ہاتھ کے ایک اشارے سے محفل رقص و سرود کو درہم برہم کر دیا پھر اس نے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

"نندلال کو ہمارے حضور پیش کیا جائے۔ "

پھر نندلال دو سپاہیوں کے درمیان گھرا ہوا دربار میں داخل ہوا تو حاضرین اسی طرح حیرت زدہ رہ گئے جس طرح وہ گوپی رام کی آمد پر حیران ہوئے تھے۔ آج سلطان کے درباریوں نے تابناک سورج اور سیاہ رات کو بیک وقت طلوع ہوتے دیکھا تھا۔ نندلال اپنے کریہہ اور مضحکہ خیز چہرے کی وجہ سے دلچسپ عجوبہ بن کر رہ گیا تھا۔ ابھی اہل دربار اس کی بے ہنگم شخصیت کا مکمل جائزہ لینے بھی نہیں پائے تھے کہ نندلال تیزی سے آگے بڑھا اور تخت شاہی کے نیچے پہنچ کر سجدہ ریز ہو گیا۔ سلطان علاء الدین خلجی دم بخود تھا۔ جب نندلال کا سجدہ طویل ہوا تو سلطان کی بارعب آواز گونجی۔

"اٹھو کہ ہم نے تمہاری حاضری قبول کر لی۔ "

نندلال علاء الدین خلجی کے روبرو کھڑا ہوا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر اس نے انتہائی دردناک لہجے میں گریہ وزاری شروع کر دی۔ "پربھو (آقا) اس لڑکے کو مجھ سے جدا نہ کیجئے کہ میں گوپی رام کے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ یہ میرا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ میں نے اس پر بے دریغ دولت لٹائی ہے۔ " نندلال ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

"شاہی خزانہ تیرے تمام اخراجات ادا کر دے گا اور تجھ پر مزید دولت کی بارش کر دی جائے گی۔ " علاء الدین خلجی نے اپنی ادائے شاہانہ کا مظاہرہ کیا۔" یہ تیرا بیٹا نہیں' غلام ہے اور غلام انہی بازاروں کا رخ کرتے ہیں جہاں بڑے خریدار موجود ہوتے ہیں۔ آج ہندوستان کے کسی گوشے میں ہم سے بڑا خریدار کوئی دوسرا نہیں۔ "

مالک! اگر میں اپنے اس غلام کو فروخت نہ کرنا چاہوں ؟" نندلال نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو پھر ہم تجھ پر جبر نہیں کریں گے۔ " علاء الدین خلجی کی آواز پر سکون تھی۔ "مگر اس غلام سے ضرور پوچھیں گے کہ اسے کونسی نیلام گاہ پسند ہے۔ " یہ کہہ کر سلطان نے گوپی رام کے رخِ روشن پر ایک گہری نگاہ کی۔

گوپی رام نے بڑے احترام کے ساتھ سر جھکا دیا۔ اچانک اہل دربار نے دیکھا کہ ساہوکار نندلال کے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے مگر اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ مسخ نظر آنے لگا۔ گوپی رام کی خاموشی نے کئی سال پرانے رشتے کا ایک ایک تار توڑ دیا تھا۔

"گوپی! یہ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ تو مجھے اس طرح چھوڑ کر چلا جائے گا۔ " اب نندلال اپنے اس غلام سے مخاطب تھا۔ جس نے کئی برس کی رفاقتوں کو بھول کر شاہی محل کا انتخاب کر لیا تھا۔ " دنیا اسی کا نام ہے' بے وفا دنیا' ناپائیدار اور منافق دنیا۔ تو بھی اسی دنیا کی قاتل ادا کا شکار ہو گیا۔ میرے دل میں تیرے خلاف شکایتوں کا ایک طوفان اٹھ رہا ہے مگر میں تیری خوشی کی خاطر کوئی گلہ نہیں کروں گا۔ " نندلال کے سینے کی تپش سے الفاظ جل اٹھے تھے۔ دھواں پھیلا تو چہرے کی سیاہی کچھ اور بڑھ گئی پھر وہ ہندو سود خور مڑا اور سلطان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔

"سمراٹ (شہنشاہ) آپ جیت گئے اور نندلال ہار گیا۔ آپ کو جیتنا ہی چاہئے تھا کہ آپ کے ماتھے کی ریکھائیں بے جوڑ ہیں۔ اب میں اپنی مرضی سے گوپی رام کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ مگر میرے حال پر اتنا کرم کیجئے کہ اگر میں سال میں ایک دوبار اس سے ملنا چاہوں تو.......... "

نندلال نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی اور رحم طلب نظروں سے علاء الدین خلجی کی طرف دیکھنے لگا۔

"اجازت دی جاتی ہے کہ تو سال میں ایک بار گوپی رام سے ملاقات کر سکتا ہے۔ " علاء الدین خلجی آداب شاہی سے مجبور ہو کر زیر لب مسکرایا ورنہ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایک انسان نما جانور کی اس خواہش پر سرِ دربار قہقہے لگائے۔

جیسے ہی علاء الدین خلجی کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے ساہوکار نندلال دوبارہ سجدے میں چلا گیا۔ سلطان کو مسکراتا دیکھ کر تمام درباریوں کے ہونٹوں پر بھی ہلکا سا تبسم ابھر آیا تھا۔ وہ نندلال کی وحشت آمیز حرکتوں سے خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔

پھر جب نندلال رسم سجدہ ادا کر چکا تو سلطان نے ملک نصرت خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔"خراج میں وصول کی جانے والی اس کی تمام رقم کو چار گنا کر کے واپس لوٹا دو۔ یہ اضافی رقم گوپی رام کی ذات پر کئے جانے والے اخراجات میں شامل ہے۔ "

"نہیں مالک! اب مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ " نندلال نے ایک بار پھر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"شہنشاہ جب کسی سے کوئی چیز چھیننا چاہتے ہیں تو اپنی طاقت کا لحاظ رکھتے ہیں اور جب دیتے ہیں تو اپنے ظرف کے مطابق دیتے ہیں۔ اس دولت کے ساتھ ہم تجھے اپنی سلطنت میں امان بھی بخشتے ہیں کہ جس طرح چاہے زندگی بسر کر۔ "

علاء الدین خلجی نے ایک کم حیثیت سود خور کی نفی کر دی تھی۔

"ملک اسے دو چار دن ہمارے مہمان خانے میں رکھو۔ " علاء الدین خلجی دوبارہ نصرت خان سے مخاطب ہوا۔" پھر اسے یہ بھی بتاؤ کہ ایک ساہوکار اور شہنشاہ میں کیا فرق ہوتا ہے ؟"

سلطان کے اس حکم کے ساتھ ہی دربار برخاست ہو گیا۔

نندلال کوئی ایک ہفتے تک محلات شاہی کی سیر کرتا رہا اور اسی دوران گوپی رام اپنی مرضی سے اپنا آبائی مذہب بدل کر مسلمان ہو چکا تھا۔ خود سلطان علاء الدین خلجی نے اس کا نام ملک کافور تجویز کیا تھا۔ تبدیلئ مذہب کی اس تقریب میں نندلال بھی شریک تھا۔ اسے گوپی رام کے ملک کافور ہو جانے پر بہت دکھ ہوا تھا مگر وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھاتا رہا۔

"بچھڑنے والا جب بچھڑ گیا تو وہ اپنا دل بدلے یا مذہب تبدیل کر ڈالے۔"

نندلال نے بھی اپنی زندگی کے اس جذباتی حادثے کو کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیا تھا۔

اور پھر وقتِ رخصت قریب آ گیا۔ نندلال شاہی مہمان نوازی سے لذت آشنا ہو کر اپنے شہر کمبایت واپس جا رہا تھا۔ الوداعی لمحات میں تنہائی کی چند ساعتیں ملتے ہی اس نے سرگوشیوں میں اپنے سابقہ محبوب غلام سے کہا تھا۔

"گوپی رام تو آخری سانس تک گوپی رام ہی رہے گا' ملک کافور نہیں ہو سکتا تو ایک ہندو ہے صرف ایک ہندو۔ تجھے اس وقت تک اسلام کی قبا پہننی ہوگی جب تک گردشِ وقت تیرا اصلی لباس واپس نہیں کر دیتی۔ میں نے علاءالدین کو خوب پہچان لیا ہے۔ وہ حسن پرست بھی ہے اور خوشامد پسند بھی۔ جب تیرے غمزہ و ادا کے حربے ناکارہ ہو جائیں تو اس کے پیروں پر اپنا سر رکھ دینا' بالآخر وہ پگھل جائے گا۔ اب میں تجھے دیوتاؤں کے حوالے کرتا ہوں۔ دیوتا ہی تجھے شکتی دیں گے اور دیوتا ہی ہماری مہان بھومی کو حملہ آوروں سے پاک کریں گے۔" یہ کہتے وقت نندلال کے چہرے پر دنیا کی تمام کالک ابھر آئی تھی اور آنکھوں میں راون جیسی شیطنت کا عکس نمایاں تھا۔

مگر جب وہ گوپی رام سے اپنے دل کی بات کہہ کر کمبایت جانے لگا تو سپاہیوں نے اسے زار و قطار روتے دیکھا وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "گوپی! تجھ سے بچھڑنے کا یہ پہلا دن ہے۔ ابھی سے دل کی حالت غیر ہوتی جاتی ہے تو پھر آنے والے ماہ و سال کیسے گزریں گے؟ گوپی! میرا تو سب کچھ لٹ گیا۔" نندلال محل سے باہر آتے ہی نوحہ خوانی کرنے لگا تھا۔ لیکن سپاہیوں کی سرد نگاہیں دیکھ کر وہ خود بھی ہولی کی آگ کی طرح ٹھنڈا ہو گیا اور پھر سلطان علاءالدین خلجی کو بے شمار دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

دہلی کے اکثر باشندوں نے نندلال اور گوپی رام کے بچھڑنے کے اس رقت انگیز منظر کو دیکھا اور بہت سے لوگوں کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں مگر ان میں سے ایک شخص بھی اس راز سے واقف نہیں تھا کہ نندلال دہلی کیوں آیا تھا؟ اور اس کی گریہ وزاری کا حقیقی سبب کیا تھا۔ دہلی کے عام باشندوں نے تو ایک منظرِ فراق دیکھا اور اپنے حساس دلوں پر اس کے اثرات محسوس کرنے لگے لیکن اس وصال اور جدائی کے پس منظر میں کیا تھا' کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔

پھر جب سپاہیوں نے سلطان کو اس واقعے کی اطلاع دی تو وہ کسی تاثر کے بغیر کہنے لگا "کاروبارِ حیات اسی کا نام ہے۔ بڑے تاجر اپنی پسندیدہ چیز خرید لیتے ہیں۔ چھوٹے سوداگر بازار سے مایوس لوٹ جاتے ہیں' نندلال بھی ایک حقیر سا سود خور تھا۔ اپنی ہی چیز سے ہاتھ دھو بیٹھا۔" یہ کہہ کر سلطان علاءالدین خلجی نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ قہقہہ جو حکمرانوں کے شایانِ شان ہوتا ہے۔ جب اس فاتحانہ قہقہے کی بازگشت ختم ہوئی تو سلطان نے ملک کافور کی طرف دیکھا جو سرخ لباس میں ایسا نظر آ رہا تھا جیسے ایران کے آتش کدے کا کوئی دہکتا ہوا انگارہ دہلی کے دربار میں پہنچ گیا ہو۔

اس کے بعد ملک کافور کی محبوبیت کا سفر شروع ہو گیا۔ سلطان کی بیگمات کے شبستان آتشِ حسد سے جل اٹھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ علاءالدین خلجی کے سامنے لب کشائی کر سکے۔ سلطان کی پہلی بیوی جو اس کی چچا زاد تھی' پہلے ہی اپنے شوہر کی توجہ سے محروم ہو چکی تھی۔ پھر بھی سلطان کے دل میں جلال الدین خلجی کی بیٹی کیلئے جو نرم گوشہ موجود تھا اسے دوسری نو مسلم بیویوں نے اپنے حسن کی کرشمہ سازیوں سے پہلے ہی چھڑا دیا تھا اور اس رشتے کے درمیان جو ایک کچا دھاگا باقی رہ گیا تھا اسے ملک کافور نے توڑ دیا تھا۔ یہ اس خوبصورت غلام کی پہلی فتح تھی۔

پھر ملک کافور گجرات کی سابقہ رانی کملا دیوی کی طرف متوجہ ہوا جس کے ناز و ادا کی فتنہ انگیزیاں برقرار تھیں اور جو "ملکۂ جہاں" بن کر پورے ہندوستان پر حکومت کر رہی تھی کچھ دن بعد ملک کافور نے "ملکہ جہاں" کا طلسم بھی پارہ پارہ کر دیا۔

کملا دیوی نئی نئی ملکۂ جہاں بنی تھی اس لئے وہ سلطان کی بے نیازی سے بہت زیادہ متاثر ہوئی تھی۔ اس نے ایک دن اپنی فطرت کے خلاف سلطان کی تمام بیگمات کو جمع کیا اور انتہائی سرکش لہجے میں کہا۔

"ہمارے حقوق کی حفاظت اسی طرح ہو سکتی ہے کہ ملک کافور کو ہمیشہ کیلئے راستے سے ہٹا دیا جائے۔"

کملا دیوی (ملکۂ جہاں) نے اس خفیہ نشست میں ایک خوفناک تجویز پیش کی۔ سلطان کی دوسری بیگمات نے بھی بڑے جذباتی انداز میں اس کی تائید کی۔ پھر ملکۂ جہاں نے بڑی رازداری کے ساتھ ملک کافور کے قتل کے لئے چند معتمد سپاہیوں کو مقرر کیا مگر وہ سلطان کے اس محبوب کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ علاءالدین خلجی ملک کافور کے سلسلے میں بیگمات کے حسد سے آگاہ تھا' اس لئے اس نے بہت پہلے بہترین شمشیر زنوں کا ایک دستہ ملک کافور کی حفاظت کیلئے مقرر کر دیا تھا۔ یہ فوجی ہر وقت سائے کی طرح ملک کافور کے ہمراہ رہتے تھے اور ملک کافور برق رفتاری کے ساتھ کامیابی کے راستوں پر دوڑ رہا تھا۔

مگر بھاگتے بھاگتے آج اسے ایسی ٹھوکر لگی تھی کہ وہ ماضی کے خوابوں سے باہر نکل آیا تھا اور حقیقت حال یہ تھی کہ سلطان علاءالدین خلجی ملک کافور سے بے نیاز ہو کر مسلسل چتوڑ کے اس تخت کی طرف دیکھ رہا تھا جس پر رانی پدمنی جلوہ افروز تھی۔ بات اگر تخت کی ہوتی تو سلطان کا تخت اتنا وسیع تھا کہ چتوڑ جیسے کئی تخت اس کے ایک گوشے میں سما جاتے مگر سلطان کو تخت سے زیادہ "تخت نشیں" کا خیال تھا۔ اور پھر اس خیال نے وحشت و جنوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ملک کافور' سلطان کے اس جنوں کو بھی برداشت کر لیتا مگر اس بات کی ضمانت دینے والا کون تھا کہ رانی پدمنی کی موجودگی میں اس کی موجودہ حیثیت برقرار رہے گی۔ اسی اندیشے نے ملک کافور کی نیند حرام کر دی تھی۔

آج پوری سلطنت میں نہ اس کا کوئی ہمدرد تھا اور نہ کوئی غمگسار وہ کس سے اپنے دل کا درد بیان کرتا؟ ساہوکار نندلال ہر سال اس سے ملنے آتا اور اس کی مسلسل فتوحات پر اپنی خوشی کا اظہار کرتا۔ سلطان کو رام کرنے کے نئے طریقے بتاتا اور رخصت ہوتے وقت سرگوشیوں میں ایک ہی بات دہراتا۔ "گوپی رام تو گوپی رام ہی رہے گا' ملک کافور نہیں ہو سکتا۔ تو ایک ہندو ہے' صرف ایک ہندو۔" ملک کافور نے نندلال کی گفتگو کے ایک ایک رمز کو سمجھ لیا تھا مگر ابھی اس کی منزل بہت دور تھی۔ اچانک راستے میں پدمنی کے حسن کا سنگِ گراں آیا تو وہ ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ آج اسے کسی شاطر اور جہاندیدہ شخص کے سہارے کی ضرورت تھی اور وہ سہارا نندلال کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ مگر ملک کافور کی اس بدنصیبی کو کیا کہا جائے کہ چند ماہ پہلے ہی نندلال گردوں کی ہولناک بیماری کے سبب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا تھا۔ مرنے سے پہلے نندلال نے اپنے ایک خاص آدمی کے ہاتھ ملک کافور کو ایک خط بھیجا تھا جسے پہلے سلطان علاءالدین خلجی کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اور بعد میں وہی خط ملک کافور کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ نندلال کے خط میں یہ مختصر سی عبارت درج تھی۔

"گوپی رام! میں دنیا سے جا رہا ہوں میرے لئے دعا کرتے رہنا ورنہ یہ بے چین آتما کئی جنم تک بھٹکتی رہے گی۔"

نندلال کے اس خط میں کوئی خاص بات تحریر نہیں کی گئی تھی لیکن ملک کافور جانتا تھا کہ "گوپی رام" کا لفظ کس طرف اشارہ کرتا تھا اور دعا سے مرنے والے کی کیا مراد تھی۔ نندلال کی موت کے بعد کچھ عرصے تک

ملک کافور اداس رہا اور پھر اس کی زندگی سیاست کے ہنگاموں میں گم ہو گئی۔ مگر آج ملک کافور کے دل میں نندلال کی یادوں کا درد پوری شدت سے اٹھا تھا۔ اس وقت اگر وہ بوڑھا ساہوکار زندہ ہوتا تو ملک کافور کے جلتے ہوئے زخموں پر اپنے برف جیسے مشوروں کا مرہم ضرور رکھتا لیکن جانے والا بہت دور جا چکا تھا۔

ملک کافور نے ایک اور جامِ سرخ لبریز کیا اور غیر متوازن قدموں سے اپنے آراستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کی دھندلی آنکھوں کے سامنے بار بار نندلال کا چہرہ ابھر رہا تھا۔ پھر یکایک ملک کافور کے ڈوبتے ہوئے ذہن میں برق سی لہرائی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہاری ہوئی بازی جیت گیا ہو اور رانی پدمنی اس کے قدموں پر جھکی ہوئی اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہی ہو۔

ملک کافور کو نندلال کے وہ الفاظ یاد آنے لگے جو سیاست کی کتاب میں ایک قیمتی اضافہ تھے۔ نندلال نے پہلی بار دہلی سے کمبایت رخصت ہوتے وقت کہا تھا۔

"میں نے علاء الدین کو پہچان لیا ہے۔ وہ حسن پرست بھی ہے اور خوشامد پسند بھی۔ جب تیرے غمزہ و ادا کے تمام حربے ناکارہ ہو جائیں تو اس کے پیروں پر اپنا سر رکھ دینا۔ بالآخر وہ پگھل جائے گا۔"

نندلال کے الفاظ یاد آتے ہی ملک کافور کو قرار سا آ گیا۔

☆ ☆ ☆

پھر اسی رات ملک کافور سلطان علاء الدین خلجی کے عشرت کدے میں داخل ہوا۔

"سلطان معظم!" ملک کافور نے داخل ہوتے ہی بڑے دردناک لہجے میں اپنے فرمانروا کو صدا دی۔

"کیا بات ہے ملک؟" علاء الدین خلجی نے چونک کر اپنے محبوب غلام کی طرف دیکھا' سلطان اس وقت عالم سرمستی میں تھا۔ یہ شاہ کے وہ لمحات ہوتے تھے جن میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کی جاتی تھی مگر ملک کافور کو یہاں آنے کے لئے بھی کسی اجازت نامے کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ دیوانہ وار آگے بڑھا اور سلطان کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا۔

کثرتِ خمار کے باعث سلطان کچھ دیر تک تو صورت حال کو سمجھ ہی نہیں سکا مگر جب ملک کافور کے گرم آنسوؤں نے اس کے پیروں کو بھگونا شروع کیا تو علاء الدین خلجی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"ملک! یہ کیا حرکت ہے؟" اچانک سلطان کے لہجے سے غصے کا اظہار ہونے لگا تھا۔ "ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تو اس قدر ناشائستہ اور غیر مہذب ہو جائے گا۔ کیا تجھے ہمارے مزاج کا اندازہ نہیں اور کیا تو شاہی خلوتوں کے آداب کو فراموش کر چکا ہے؟"

اگر ملک کافور کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو سلطان کے یہ الفاظ سن کر سمجھ لیتا کہ یا تو وہ ہمیشہ کیلئے معتوب ہو چکا ہے یا پھر اس کی زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں مگر وہ ملک کافور تھا' سلطان علاء الدین خلجی کا محبوب غلام اور اسی محبوبیت کے غرور و ناز نے فرمانروائے ہند کے جلال کو جھٹلا دیا تھا۔

"سلطان والا حشم' مجھ سے زیادہ شاہی خلوتوں کے راز سے کون واقف ہو گا؟" ملک کافور کا سر علاء الدین خلجی کے قدموں پر تھا لیکن اس کی آواز میں وہی کاٹ تھی جو حسن پرست شہنشاہوں کے قلب کو دو نیم کر دیتی ہے۔

اگرچہ اس وقت سلطان کے اعصاب نشے سے مغلوب ہو چکے تھے لیکن پھر بھی وہ سنبھل کر بولا۔ "اس میں کیا شک ہے؟" یہ کہتے ہوئے علاء الدین قدرے خم ہوا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے ملک کافور کو اٹھایا پھر جب وہ سلطان کے سامنے مودب کھڑا ہو گیا تو اسے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"ملک! اگر تو ہمارے جذبوں کا راز دار نہیں ہوتا تو پھر ہم تجھے یہ شرف بھی نہ بخشتے۔" جو ہم سے دور

ہوتے ہیں ان کے سروں کو ہمارے قدم چھونے کی اجازت بھی نہیں ہوتی۔"

"سلطان معظم! یہ غلام اس حقیقت سے باخبر ہے۔" ملک کافور کے آنسو تھم گئے تھے مگر آواز سے پھر بھی رقت جھلک رہی تھی۔

"اب بتا تجھ پر کیا گزری ہے؟" علاء الدین خلجی نے ملک کافور سے پوچھا۔ "وہ کون ہے جس نے تیری خوابناک آنکھوں میں آنسو بھر دیئے؟" سلطان کا لہجہ پُرجلال تھا مگر آواز میں لرزش سی تھی۔ "تیری آنکھیں اشک ریزی کے لئے نہیں بنائی گئی ہیں یہ تو سلطان کے لئے قرارِ جاں ہیں۔"

"کوئی نہیں سلطان معظم! کوئی نہیں۔" ملک کافور کی ہچکیاں دوبارہ جاری ہو گئی تھیں "اس عظیم الشان سلطنت میں کس کی جرأت ہے کہ وہ آپ کے غلام کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ آپ کی عنایاتِ خسروانہ نے تو زمین کو عرش اور ایک غلام کو شاہ بنا دیا ہے۔"

"پھر تیری آنکھوں میں یہ آنسو کیوں ہیں جن کی نمی ہمیں اپنے دل کے قریب محسوس ہو رہی ہے۔" سلطان کے لہجے میں خلش درد بھی تھی اور قہر شاہی کی تپش بھی۔

"کل تک یہ غلام جس چشمِ کرم کے سہارے زندہ تھا آج وہی مہربان آنکھ رانی پدمنی کے نادیدہ نقش و نگار میں گم ہے۔" آخر جوشِ رقابت میں ملک کافور کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"ملک!" سلطان علاء الدین اس طرح چیخا کہ عشرت کدے کے در و دیوار گونج اٹھے۔ "غلام اگر درجہ محبوبیت تک بھی پہنچ جائے تو مزاج شاہ میں دخل اندازی کا اختیار نہیں رکھتا۔ پھر یہ ہمارا دل کا مسئلہ ہے۔ سمندر اپنی مرضی سے موجزن ہوتا ہے دریاؤں کو اس کا لحاظ رہنا چاہئے۔" شدتِ غضب سے سلطان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"سلطان والا! میں بھی آپ کے دل کا مسئلہ ہوں۔" ملک کافور نے ایک بار پھر سلطان کے قدموں پر سر رکھ دیا تھا۔

"انسانی زندگی کے مسائل کا کوئی شمار نہیں۔" علاء الدین خلجی نے جھنجلا کر اپنے پاؤں کھینچ لئے اور ملک کافور کا سر فرش سے ٹکرا گیا۔ "شہنشاہوں کے دل کسی ایک دائرے میں قید نہیں رہتے اگر وہ اس بندش کو قبول کر لیں تو پھر انہیں شاہ کون کہے گا؟ بے شک! تجھے بھی قربت کا فخر حاصل ہے لیکن اس وقت رانی پدمنی ہمارے قریب تر ہے کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ عورت بھی ہے' حسین بھی اور سرکش حکمراں بھی ہے۔ ہم اس سے یہ تینوں اعزاز چھین لیں گے۔ اگر اس کا کوئی اعزاز یا غرور برقرار رہا تو یہ ہمارا عطیہ ہو گا' ہماری بخشش خاص ہو گی اور ایسا نہ ہو سکا تو ہندوستان کے نقشے پر دو ناموں میں سے صرف ایک نام اپنا وجود باقی رکھ سکے گا۔ عظیم خلجیوں کا عظیم وارث علاء الدین یا رانی پدمنی؟" سلطان کے جسم میں تحلیل ہو جانے والی شراب کی آگ اب اس کے چہرے پر بھی روشن ہو چکی تھی۔

ملک کافور کو نندلال کا تجویز کردہ نسخہ یاد آ گیا مگر آج اس کا استعمال بھی بے اثر ثابت ہو رہا تھا۔ ملک کافور نے ہواؤں کا رخ پہچان لیا تھا اس لئے چپ چاپ اٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگا ابھی وہ علاء الدین خلجی کے عشرت کدے کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ ایک بار پھر سلطان کی آواز گونجی۔

"جس طرح شہنشاہ کی مملکت میں لاکھوں انسان بستے ہیں اسی طرح اس کے دل میں بیک وقت ہزاروں محبوب بھی قیام کر سکتے ہیں۔ رعایا کے کسی فرد کو شہنشاہ کی اس فراخدلی پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ شہنشاہ خود ہی بہتر جانتا ہے کہ کسے اس کے دل کے قریب رہنا ہے اور کسے زندگی سے دور ہو جانا ہے۔"

ملک کافور سلطان کی نشاط گاہ سے باہر نکل چکا تھا اور اب طویل راہداری سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف

جارہا تھا۔ یہ مختصر سا فاصلہ طے کرتے ہوئے اس کا ذہن بے شمار وسوسوں سے بھرا ہوا تھا۔ آج پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ وہ کون ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے۔

پھر جب ملک کافور اپنے آراستہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے اعصاب شکستہ ہو چکے تھے اور جب وہ اپنے بستر پر دراز ہوا تو اسے شدید گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ سلطان کے تحقیر آمیز سلوک نے ملک کافور کی اداؤں کے اس بت کو پاش پاش کر دیا تھا جس کے ذریعے وہ خدائی کا خواب دیکھ رہا تھا پھر یہ خواب بکھرا تو ملک کافور کی آنکھوں کے سامنے دربارِ شاہی کے وہ مناظر ابھر آئے جو اس کی ذلت و رسوائی کی شرمناک داستان سنا رہے تھے۔

ملک کافور جانتا تھا کہ جب وہ دربار میں سلطان کے قریب ایک مخصوص اعزاز کے ساتھ بیٹھتا ہے تو امرائے وقت اور شہر کے دیگر معززین کی آنکھوں میں کیسے کیسے افسانے تحریر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ افسانے جن کی کوئی زبان نہیں ہوتی مگر پڑھنے والے پھر بھی انہیں بڑی آسانی کے ساتھ پڑھ لیتے ہیں۔ جلالِ شاہی کے خوف سے لوگ کچھ کہتے نہیں تھے مگر ان کے دماغوں میں کافور کی بے حیاء تصویر محفوظ تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایسے تمام سروں کی ہڈیاں توڑ کر ان میں پیوستہ تمام دماغ باہر نکال دے اور پھر انہیں اپنے پیروں سے مسل ڈالے لیکن ملک کافور اتنا با اختیار نہیں تھا اور آج سلطان کی جارحانہ روش نے اس کی بے اختیاری میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

ملک کافور گھبرا کر بستر سے اٹھا اور کمرے کی تمام قندیلیں روشن کر دیں اس کا کمرہ کیا تھا ایک ہفت رنگ آئینہ خانہ تھا۔ ہر طرف شیشے ہی شیشے تھے ملک کافور ان شیشوں کے درمیان ایک وحشت زدہ انسان کی طرح کھڑا تھا۔ پھر اس نے سامنے والے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ سرخ و سفید چہرے پر اذیت و کرب کی ہلکی ہلکی سیاہی پھیل گئی تھی۔

یکایک آئینہ بولنے لگا "دنیا میں اقتدار حاصل کرنے کیلئے کم سے کم ایک بڑی قربانی ضرور دینی پڑتی ہے۔ کچھ لوگ اپنی جانوں کی نذر پیش کر کے اقتدار حاصل کرتے ہیں اور اس اقتدار کے اثرات صدیوں پر محیط ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ناتواں اور بے گناہ انسانوں کے قتل عام کے بعد مسند اقتدار تک پہنچتے ہیں اور پھر ایک روز یہی مسند ان کی قبر بن جاتی ہے یہاں تک کہ اس قبر میں اتاری جانے والی لاش کو حشرات الارض اپنی خوراک بنا لیتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ قبریں دوبارہ کھودی جاتی ہیں اور لاشوں کو باہر پھینک دیا جاتا ہے تاکہ مخلوق خدا ان کے بے گور و کفن ہونے کا تماشا دیکھ سکے۔ کوئی ضمیر فروخت کر کے اپنے بدن پر قبائے اقتدار سجاتا ہے اور کوئی اپنی آبرو نیلام کر کے کوچۂ اقتدار میں داخل ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر آئینہ خاموش ہو گیا۔

ملک کافور کسی پتھر کے مجسمے کی مانند آئینے کے سامنے کھڑا تھا اور حیرت و سکوت کے عالم میں سوچ رہا تھا۔ "کیا آئینے بھی بولتے ہیں؟"

ابھی اس کی حیرانی برقرار تھی کہ آئینہ دوبارہ بول اٹھا۔ "ملک کافور تو نے کیا کیا؟ وقار کتنے میں رہن رکھا، ضمیر کتنے میں بیچ ڈالا؟"

"میں نے اقتدار کیلئے اپنی غیرت و مردانگی کی قربانی پیش کی ہے۔" ملک کافور نے سحر زدہ مریض کے انداز میں کہا۔

"تاریخ تجھے بھی یاد رکھے گی مگر بڑے عجیب نام سے۔" آئینے سے ابھرنے والی صدا آہستہ آہستہ ڈوب گئی۔

پھر یکایک ایک چہرے کے عقب سے کئی چہرے ابھرنے لگے۔ یہ ملک کافور ہی کے چہرے کے مختلف عکس

تھے غلامی کی سطح سے گزر کر دربار شاہی میں ایک خاص مقام تک پہنچنے والے چہرے۔ تمام چہروں کے نقش و نگار یکساں تھے مگر کردار کی غلاظتوں نے ہر چہرے کو نیا رنگ دیدیا تھا۔

بے حیائی اور خوشامد ملک کافور کا پیشہ تھا لیکن آج سلطان کی کج ادائی نے اسے انتہائی بلندیوں پر پہنچا کر ایسی پستیوں میں پھینک دیا تھا کہ اگر علاءالدین خلجی اس کی طرف دوبارہ توجہ نہ کرتا تو ملک کافور کی وہ رسوائی ہوتی کہ گلی گلی بھیک مانگنے والے بھی اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ خوش نصیب سمجھتے۔

یہ خیال بڑا اذیت ناک تھا۔ ملک کافور اپنے ہی چہرے کے ہزار رنگ زاویوں سے ڈر گیا پھر شدید حالتِ غضب میں اس کا ہاتھ بلند ہوا اور اس نے نادر و نایاب آئینوں پر مشقِ ستم شروع کر دی۔ رات کے سناٹے میں شیشوں کے ٹوٹنے کی آوازیں بڑی عجیب تھیں شاید مفلسوں کے دل بھی ایسے ہی ٹوٹتے ہوں گے۔ ابھی نازک ترین آئینوں پر ملک کافور کی تیشہ زنی جاری تھی کہ ایک خوبصورت لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔

لڑکی ہر طرف شیشوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑے دیکھ کر گھبرا گئی۔ وہ لڑکی ملک کافور کی ایک شوخ و شریر کنیز تھی۔ سلطان علاءالدین خلجی نے خوبصورت ترین کنیزوں کو اپنے محبوب غلام کا دل بہلانے کی خدمت پر مامور کر دیا تھا۔ یہ کنیزیں رقص کی بھی ماہر تھیں اور نغمہ سرائی میں بھی بے مثال تھیں۔ روزانہ یہ کنیزیں رات کا اندھیرا پھیلتے ہی راگ اور رنگ کی محفلیں آراستہ کرتیں۔ ملک کافور جب ایک رقاصہ یا مطربہ کے فن کی نمائش سے اکتا جاتا تو دوسری کنیز محفل کا رنگ بدلنے کے لئے پازیب کی جھنکار کے ساتھ خلوت کدے میں داخل ہو جاتی۔ ملک کافور شاہانہ انداز میں نصف شب تک بزمِ کیف و طرب سے لطف اندوز ہوتا رہتا اور پھر کنیزوں کو رخصتی اشارہ کر کے اپنے بستر پر دراز ہو جاتا۔ فانوس اور قندیلیں بجھا دی جاتیں۔ پھر ایک کنیز ستار اٹھا لیتی اور کوئی خوابناک دھن چھیڑ دیتی۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ کمرے کی فضا بوجھل ہو جاتی اور ملک کافور نیند کی وادیوں میں گم ہو جاتا۔

مگر آج ملک کافور کے معمولات میں فرق آ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ آنے والی کنیز کوئی راگ چھیڑتی ملک کافور نے خود ہی آئینہ شکن غزل چھیڑ دی تھی۔

"نصیبِ دشمناں! حضور کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" رقاصہ ناہید رباب نے رسمی آداب بجالاتے ہوئے ملک کافور کی مزاج پرسی کی۔

کمرے میں ایک شناسا کھنکتی ہوئی آواز گونجی تو ملک کافور کا دست ستم رک گیا اور چند آئینے ایک رقاصہ کی مداخلت سے اپنی زندگی بچانے میں کامیاب ہو گئے۔

"میں بہت اداس ہوں ناہید!" ملک کافور پلٹا اور رقاصہ کے قریب آتے ہوئے بولا "آج اس رنگین دنیا میں میرے لئے کوئی دلکشی باقی نہیں رہی ہے۔"

"یہ آپ کہہ رہے ہیں؟" ناہید رباب اس طرح ہنسی جیسے کسی مطرب کی انگلی نے ستار کے شوخ تاروں کو چھیڑ دیا ہو۔

"ہاں! یہ میں کہہ رہا ہوں، ملک کافور بساطِ خلجی کا سب سے طاقتور مہرہ۔" اس کی باتوں سے گہری مایوسی کے باوجود اقتدار کا غرور جھلک رہا تھا۔

"اس اداسی کا سبب؟ اس نفرت و بیزاری کی وجہ؟"

رقاصہ، ملک کافور سے مصنوعی اظہار ہمدردی کر رہی تھی۔ ورنہ وہ دلی طور پر اس خواجہ سرا سے شدید نفرت کرتی تھی۔ ملک کافور ہی کی وجہ سے ناہید رباب کے اعلیٰ خاندان پر یہ بد نما داغ لگا تھا۔

ناہید کے ایرانی النسل باپ اسفندیار کا بس اتنا قصور تھا کہ اس نے ڈھلتی ہوئی جوانی کے باوجود شہسواری کے ایک مقابلے میں شرکت کی تھی۔ ہر سال تیراندازی، شمشیرزنی اور شہسواری کے ان مقابلوں کا اہتمام ہوتا تھا پھر جو سپاہی یا غیر فوجی امیدوار فاتح قرار پاتا اسے سلطان علاءالدین خلجی کی طرف سے ایک تقریب خاص میں گرانقدر انعام دیا جاتا تھا۔ اتفاق سے شہسواری کے اس مقابلے میں ملک کافور بھی شامل ہوا تھا۔ اگرچہ ملک کافور ایک عام شہسوار تھا لیکن سلطان کی قربتوں کے سبب مقابلے میں شریک ہونے والے تمام شہسوار سہمے ہوئے نظر آرہے تھے پھر جب یہ دوڑ شروع ہوئی تو وہ لوگ قصداً پیچھے رہ گئے جن پر فن شہسواری ناز کرتا تھا۔ ان لوگوں کو انعام حاصل کرنے سے زیادہ اپنی آبرو اور زندگی عزیز تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا گھوڑا آگے نکل جائے اور پھر ان کی ذات ملک کافور کے انتقام کا نشانہ بنے۔ مقابلے میں علاءالدین کے غلام سے پیچھے رہ جانے والے زمانہ شناس تھے۔ اس لئے ہوشیاری کے ساتھ بازی ہار گئے۔ مگر اسفندیار کی رگوں میں نوشیروان عادل کا شاہی خون دوڑ رہا تھا وہ اس ذلت کو برداشت نہ کر سکا اور کچھ دیر بعد ہی اس کا گھوڑا ملک کافور کے گھوڑے سے بہت آگے نکل گیا۔ اسفندیار نے مقابلہ جیت لیا اور دستور کے مطابق سلطان علاءالدین خلجی نے اسے بہترین شہسوار کے اعزاز سے نوازا۔

تقریب انعامات میں ملک کافور، سلطان کے قریب بائیں ہاتھ پر بیٹھا تھا۔ اس نے مقابلہ شہسواری کے ایرانی فاتح کو بہت غور سے دیکھا اور زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔ پھر چند روز بھی نہ گزرے تھے کہ مسلح چوروں کے ایک گروہ نے اسفندیار اور اس کی بیوی کو قتل کر کے سارا قیمتی سامان لوٹ لیا۔ ہلاکت و بربادی کے اس کھیل میں اسفندیار کی سترہ اٹھارہ سالہ حسین لڑکی ناہید رباب حیرت انگیز طور پر محفوظ رہی تھی۔ بھری دنیا میں تنہا رہ جانے کے بعد ناہید نے عدالت کے دروازے پر گریہ وزاری کی مگر جھوٹی شہادتوں کے ذریعے انصاف کو پہلے ہی گمراہ کر دیا گیا تھا نتیجتاً اسفندیار اور اس کی بیوی کا قتل ایک حادثہ قرار پایا۔

قانون سے مایوس ہو جانے کے بعد ناہید نے ایران واپس جانے کی کوشش کی کہ اس کے سارے رشتے دار وہاں موجود تھے مگر ایک معصوم دوشیزہ پر سلامتی کے تمام راستے بند کر دیئے گئے تھے۔ پھر کچھ دن بعد ناہید پر یہ خوفناک راز بھی فاش ہو گیا کہ اس کے ماں باپ کو ایک سازش کے تحت ذبح کیا گیا تھا اور اب وہ صرف ملک کافور کی کنیز بن کر ہی زندہ رہ سکتی تھی۔ ناہید رباب نے کئی بار سوچا کہ خودکشی کر کے جسم اور سانسوں کے درمیان باقی رہ جانے والے رشتے کو توڑ دے لیکن اسے انتقام کے ایک سرکش جذبے نے زندہ رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ناہید اس طرح دنیا سے جانا چاہتی تھی کہ ملک کافور اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ چکا ہو اور وہ اس کی دریدہ لاش پر قہقہہ زن ہو۔ مگر یہ ایک خواب تھا، ایک حسرتِ ناکام تھی جس کے سہارے ناہید کے زخمی شب و روز گزر رہے تھے۔

پھر بھی آج جب اس نے ملک کافور کو پاگل پن کی منزل کے قریب دیکھا تو خوشی کی ایک تیز لہر ناہید کے دل میں اٹھی اور پھر وہ مزید شوخیوں پر اتر آئی۔

"سلطان کے دل پر حکومت کرنے والا زندگی سے اس قدر مایوس ہو گیا ہے کہ اس نے اپنے شبستان کے تمام آئینے تک توڑ دیئے ہیں۔" ناہید رباب نے ملک کافور کے سلگتے ہوئے زخموں کو ہوا دینے کی کوشش کی۔

"ہاں! میں ایسے تمام آئینوں کو توڑ دوں گا جو مجھے میرے مستقبل کا عکس دکھانا چاہتے ہیں۔" ملک کافور کا لہجہ نفرتوں اور تلخیوں سے بھر گیا تھا۔

"کسی آئینے کی کیا مجال جو آپ کو عکسِ ذات دکھا سکے۔" ناہید کا لہجہ دم بہ دم منافقانہ ہوتا جا رہا

تھا۔

"میں جانتا ہوں، سب کچھ جانتا ہوں" ملک کافور پر شدید حالت اضطرار طاری تھی۔ "کچھ آئینے میری بے پروائی کی وجہ سے سرکش اور گستاخ ہو گئے ہیں۔" یہ کہتے کہتے ملک کافور اس صراحی کی طرف بڑھ گیا جو انگوروں کے رقیق سیال سے لبریز تھی۔ "اسے میرے حلق میں انڈیل دے کہ قیامت کی پیاس ہے۔ بے آب صحرا میں بھٹکنے والا کوئی مسافر بھی اتنا پیاسا نہیں ہو گا۔"

ناہید رباب نے اسی منافقانہ ادا کے ساتھ رسم ساقی گری ادا کی اور جب ملک کافور کا جلتا ہوا دماغ کچھ پرسکون ہوا تو وہ دوبارہ رقاصہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"ناہید! انسانی زندگی دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے ایک حصہ اس کی اپنی ذات کے لئے وقف ہوتا ہے۔ زندگی کے اس حصے میں وہ صرف اپنے لئے جیتا اور مرتا ہے۔ پھر جب حیات کے افق پر دوسرا حصہ طلوع ہوتا ہے تو وہ اپنی نسل کیلئے زندہ رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں ایک دن مکمل اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر کس کیلئے؟ میرا ایک حصہ تکمیل پا جائے گا لیکن میں اپنی زندگی کے دوسرے حصے کو کہاں تلاش کروں گا؟ میری کوئی بیوی نہیں، میرا کوئی بیٹا نہیں۔ میں برسوں سے ان دونوں کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ دونوں اس دنیا کے ہجوم میں کہیں گم ہو گئے ہیں۔"

ناہید، ملک کافور کی باتیں سن کر حیران رہ گئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک "خواجہ سرا" بھی اپنے سینے میں اولاد کی تمنا کو پروان چڑھا سکتا ہے۔

ابھی ناہید اپنی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ دوبارہ ملک کافور کی آواز ابھری۔ "طلب کی اس منزل میں تو ہمارا ساتھ دے گی۔ پھر ہم دونوں مل کر اپنے گمشدہ فرزند کی جستجو کریں گے۔" ملک کافور نے آج عجیب و غریب خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔

ناہید، ملک کافور کی بات کا کیا جواب دیتی؟ وہ کچھ دیر تک سناٹے کے عالم میں بیٹھی رہی پھر اسے اپنے ماں باپ کے قاتل کی بے کسی دیکھ کر ناقابل بیان خوشی کا احساس ہوا اور اسی احساس نے ناہید کے ہونٹوں کو فاتحانہ مسکراہٹ سے سجا دیا۔

"تو خاموش کیوں ہے ناہید؟" غصے اور نشے کی گہری کیفیت نے ملک کافور کے ہوش و حواس چھین لئے تھے اور وہ ایک ایسی شے کی جستجو میں نکل کھڑا ہوا تھا جس کا دنیا میں وجود تو تھا مگر وہ شے اس کیلئے قطعاً حرام تھی۔

"حضور! میں بہت دیر سے مسلسل یہی سوچ رہی ہوں کہ آپ اس فرزند کو کس طرح تلاش کریں گے؟" ناہید کے ایک ایک لفظ میں طنز و دشنام کا زہر بھرا ہوا تھا۔

"یہ تیرے سوچنے کی بات نہیں کہ میں اس فرزند تک کس طرح پہنچوں گا؟" اچانک ملک کافور کا غرور اقتدار جاگ اٹھا تھا اور وہ سرمستی کے باوجود غضبناک لہجے میں بول رہا تھا۔ "اپنے بیٹے کو میں خود ڈھونڈوں گا کہ آخر اس کی ذات سے ہندوستان کا اقتدار وابستہ ہے۔"

پھر مجھے کیا کرنا ہو گا؟" ناہید نے حیران ہو کر پوچھا ملک کافور کی ہر بات اس کے ذہن سے بالاتر تھی۔

"تجھے ہم سے شادی کرنی ہو گی۔" ملک کافور کی آواز میں یکایک لچک سی پیدا ہو گئی تھی۔ "اس شادی کے بعد ہماری ذات مکمل ہو جائے گی اور پھر ہم اپنے فرزند کو آسانی سے تلاش کر لیں گے۔"

ناہید رباب کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ ملک کافور کے اس مطالبے کا کیا جواب دیتی؟ مگر اسے بولنے کے لئے مجبور ہو جانا پڑا تھا۔

"میں تو ایک ادنیٰ خاندان کی لڑکی ہوں اور وہ بھی سرِ دربار ناچنے والی ایک رقاصہ۔ میرے ساتھ آپ کی شادی اس قدر بے جوڑ ہوگی کہ تاریخ آپ کے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔" یہ کہہ کر ناہید رباب چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں انسان کو ذلیل کر دینے والی شرارت رقصاں تھی اور ہونٹوں پر ایک خاص تبسم ابھرنے ہی والا تھا کہ ملک کافور نے ناہید کو خاموش پا کر غبار آلود آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ناہید نے فوراً بولنا شروع کر دیا۔ "آنے والا زمانہ آپ کے بچوں پر یہ کہہ کر انگشت نمائی کرے گا کہ اس خاندان میں عیب ہے' پیوند لگایا گیا ہے۔ ایک وفادار کنیز کی حیثیت سے میں یہ کبھی برداشت نہیں کروں گی کہ آپ کی " ذاتِ محترم " تاریخ ہندوستان میں ایک مستقل الزام بن کر رہ جائے۔" ناہید کے دل میں جس قدر زہر پوشیدہ تھا وہ سب کا سب الفاظ کے ذریعہ باہر آ رہا تھا مگر ملک کافور کو نشے کی زیادتی اور شدید احساس محرومی نے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ اپنی بات کسی کو سمجھا سکے یا کسی کی بات سمجھ سکے۔

"میں کسی خاندان کو اہمیت نہیں دیتا۔ میں خود اعلیٰ نسب ہوں اس لئے مجھے کسی حوالے کی ضرورت نہیں۔ تاریخ بس اتنا یاد رکھے گی کہ ملک کافور آیا اور ہندوستان کے ایک ایک گوشے پر چھا گیا۔ تمہارے بارے میں کون پوچھے گا کہ تم کہاں سے آئی ہو اور کیا کیا کرتی رہی ہو؟ میری بیوی ہو جانے کے بعد لوگ تمہارے بارے میں سوچتے ہوئے بھی ڈریں گے۔ ان کی سانسیں تک آدابِ شاہی کی پابند ہو جائیں گی۔ نگاہیں سجدہ ریز رہیں گی اور دل ہمیشہ اطاعت میں جھکے رہیں گے۔" یہ کہہ کر ملک کافور' ناہید کے قریب آیا اور محبت آمیز لہجے میں بولنے لگا۔

"ویسے تو تمہارا دل' تمہارا دماغ' تمہاری ایک ایک سوچ اور تمہارا ایک ایک جذبہ ہمارے حکم کا پابند ہے مگر پھر بھی شریکِ حیات کی حیثیت سے ہم تمہاری مرضی کو زیادہ اہمیت دیں گے۔"

اب ناہید کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ذہانت اور حکمت عملی کے ساتھ ملک کافور کی اس دیوانگی کو قابو میں رکھے اور اپنی ذات کو مزید تماشا بننے سے بچائے۔

پھر وہ لمحہ آ گیا جب ناہید کے ہونٹ بے اختیار ہو گئے۔ "حضور! یہ کنیز آپ کی نوازشات کا شکریہ کس طرح ادا کرے کہ اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ بہت محدود ہے مگر پھر بھی میں اس صورت حال کو سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہ شادی کس طرح ہوگی؟ ایک میں ہی نہیں' تمام اہل دربار' تمام اہل شہر اور پورا ہندوستان آپ کی اس مجبوری کو جانتا ہے کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔"

ابھی ملک کافور کے زر نگار کمرے میں ایک رقاصہ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ اس کے ہاتھ سے ساغر شراب چھوٹ کر اس قیمتی قالین پر گر گیا جو کسی مفتوح حکمراں نے علاء الدین خلجی کو بطور نذر پیش کی تھی اور پھر سلطان نے وہی نادر و نایاب تحفہ اپنے غلام کے حوالے کر دیا تھا۔

ملک کافور کچھ دیر تک سکتے کے عالم میں کھڑا رہا پھر جھپٹ کر اس نے اپنے بستر کے قریب سے ایک چمکدار زہر آلود خنجر اٹھا لیا۔ ناہید رباب کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے تمام احتیاطوں کے باوجود ملک کافور کو دنیا کی غلیظ ترین گالی دے ڈالی تھی الفاظ کمان سے نکلے ہوئے تیر تھے انہیں واپس نہیں لایا جا سکتا تھا۔ ناہید اپنی زندگی کے انجام کو قریب تر دیکھ رہی تھی۔ وہ چاہتی تو ملک کافور کے قدموں پر سر رکھ کر سانسوں کی بھیک مانگ سکتی تھی مگر اب یہ بھی ممکن نہیں تھا دنیا میں وہی لوگ معاف کرتے ہیں جن کے دل کشادہ ہوتے ہیں۔ معافی اعلیٰ ظرفی کا ردِ عمل ہوتی ہے اور ملک کافور کا ظرف علاء الدین خلجی کے دربار میں اتنی بار نیلام ہو چکا تھا کہ اب نہ اس کی کوئی قیمت تھی اور نہ وجود باقی رہا تھا اس لئے ناہید نے ملک کافور سے رحم کی بھیک نہیں مانگی

بس وہ عجیب نظروں سے ملک کافور کے اس ہاتھ کو دیکھتی رہی جس میں زہر آلود خنجر چمک رہا تھا۔ ملک کافور کسی غضب ناک بھیڑیے کی طرح آگے بڑھتا رہا اور ناہید رباب بند دروازے کی جانب پیچھے ہٹتی رہی یہاں تک کہ کمرے کا درمیانی فاصلہ ختم ہو گیا اور ناہید کی پشت اس دیوار سے جا لگی جس کے قریب صندل کی لکڑی کا مہکتا ہوا دروازہ تھا اور دروازے کے باہر وہ زندگی تھی جس کی تلاش میں بے شمار انسان دن رات سرگرداں رہتے ہیں۔

ناہید رباب کی نظریں ملک کافور کے چہرے پر مرکوز تھیں اور ملک کافور کے اندازِ غضب میں وہ تمام سفاکیاں شامل تھیں جو پیشہ ور قاتلوں کا سرمایہ ہوتی ہیں۔

"نمک حرام رقاصہ! آخر تو مجھے کیا سمجھتی ہے؟" ملک کافور اس اعلیٰ نسب دوشیزہ کو نہایت غلیظ لہجے میں پکار رہا تھا۔ جسے گردشِ وقت نے علاء الدین خلجی کے ایک حقیر غلام کے سامنے ناچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

پھر جب مجبوریاں حد سے گزر گئیں تو ناہید نے اپنے چہرے سے مصلحت کی نقاب اتار پھینکی اور منافقت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے الفاظ کو ان کی حقیقی آزادی بخش دی۔ کئی برسوں سے سینے میں دہکتی ہوئی آگ نے ناہید کے ہونٹوں کو جلا ڈالا۔ "تو وہ ہے جس نے نسل آدم کی دو جنسوں کو سربازار رسوا کیا ہے۔" ناہید رباب کی آواز ابھری تو ملک کافور کے کمرے میں ہر طرف انگارے بکھر گئے۔ "مجھ لاوارث اور کمزور عورت پر اپنی مردانگی کیوں آزماتا ہے؟ سلطان علاء الدین کے چہیتے! بہادر افواج کے سپہ سالار! اگر تجھ میں ہمت ہے تو اہل دربار سے سوال کر کہ تو کون ہے؟ خلجی حکمراں سے پوچھ کہ وہ تجھے کیا سمجھتا ہے؟"

ملک کافور کی ایک ادنیٰ کنیز نے آج اسے وہ آئینہ دکھایا تھا کہ جس کے سامنے تمام آئینے دھندلے پڑ گئے تھے۔ ملک کافور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا پھر اس کا ہاتھ بلند ہوا۔ ایک لمحے کیلئے ملک کافور نے سوچا کہ رقاصہ اپنی جان بچانے کیلئے چیخے گی یا مزاحمت کرے گی مگر ناہید نے اس کے دونوں اندازوں کو جھٹلا دیا تھا۔ ناہید کمرے کے صندلی دروازے سے ٹیک لگائے اس طرح دست قاتل کو دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس کے محبوب کا ہاتھ ہو جس میں زہر آلود خنجر کے بجائے مہکتے ہوئے پھولوں کا گجرا ہو اور جو ساعتِ کیف و نشاط میں اس کے گلے کا ہار بننے والا ہو۔

ملک کافور کا ہاتھ بار بار فضا میں بلند ہو کر ناہید کے شاداب جسم کو مشقِ ستم بناتا رہا علاء الدین خلجی کے منظورِ نظر کا ہر وار ناہید کے سینے پر شفق رنگ نشان چھوڑتا جا رہا تھا اور وہ سیم تن رقاصہ اس طرح زخم کھا رہی تھی جیسے کوئی مردِ شجاع میدان میں اس خوف سے پیٹھ نہیں موڑتا کہ تاریخ میں اس کے نام کے ساتھ رسوائیاں رقم ہو جائیں گی۔ ناہید رباب نے بھی اس طرح زخم کھائے کہ جب وہ نیم جاں ہو کر فرش پر گری تو سارے زخم سینے پر روشن تھے پشت پر ملک کافور کے خنجر کا ایک نشان بھی نہیں تھا۔

"تو نے اپنی گستاخی کا انجام دیکھ لیا۔" ملک کافور نے خون میں نہائی ہوئی رقاصہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ایک کیڑا اس وقت تک محفوظ رہتا ہے جب تک وہ اپنے آقا کے سائے سے دور دور چلتا رہے۔ حکمرانوں کی قدم بوسی حشرات الارض کیلئے موت کا پیغام بن جاتی ہے۔ ہماری عظمتوں کی قبا کو داغدار بنانے والوں کے ساتھ فرشتۂ اجل یہی سلوک کرتا ہے۔" ملک کافور کے لہجے میں خدائی کے دعویداروں جیسا غرور سمٹ آیا تھا۔

ناہید نے بمشکل اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو کھولا اور لرزتے ہوئے لہجے میں آخری الفاظ ادا کئے۔

"ملک کافور! میں جا رہی ہوں کہ اس دنیا کی ہر شے جانے ہی کے لئے آئی ہے مجھے معلوم ہے کہ تجھ سے

میرے خونِ ناحق کا حساب طلب کرنے والا کوئی نہیں ہے مگر یاد رکھنا کہ اس زمین پر حشر سے پہلے ایک اور حشر برپاء ہوگا جہاں میرا لہو گرا ہے تو بھی اسی جگہ اپنی قبر کھودلے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زمین تیرا جسم قبول کرنے سے منحرف ہو جائے۔"

اس کے ساتھ ہی ساز تھم گئے، رقصِ زندگی ختم ہو گیا اور پازیب ٹوٹ کر بکھر گئی ۔

نہ مدعی نہ عدالت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزق خاک ہوا

کچھ دیر بعد ملک کافور کے معتمد پہرے دار سپاہی رقاصہ ناہید رباب کی لاش اٹھا کر لے گئے اور کسی ویران قبرستان میں وہ دوشیزہ دفن کر دی گئی جس کا نہ کوئی وارث تھا اور نہ جس کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔

اگرچہ ملک کافور سے اس خون کا حساب مانگنے والا کوئی نہیں تھا لیکن شدید وحشت واضطراب نے اسے رات بھر سونے نہیں دیا۔ رقاصہ کے قتل نے اس کی آنکھوں سے نیند نہیں چھینی تھی یہ تو سیاست کا پرانا مشغلہ تھا کہ جب جوان ہوں بچے تو قتل ہو جائیں۔ ملک کافور کی یہ کربناک بے چینی محض اس لئے تھی کہ آج اسے پہلی بار اپنی حیثیت کا اندازہ ہوا تھا۔ ملک کافور کا خیال تھا کہ جلال شاہی نے رعایا سے ان کی زبانیں چھین لی ہیں اور وہ گونگوں کی بستی پر قابض ہے مگر آج اس خوش فہمی کا پردہ بھی چاک ہو گیا تھا اور ملک کافور اس راز کو جان چکا تھا کہ ہر منہ میں زبان موجود ہے جب ایک رقاصہ اسے فحش ترین گالی دے سکتی ہے تو پھر امرائے دربار ؟ ملک کافور اس سے آگے نہ سوچ سکا چند ساعتوں کے لئے ملک کافور کے دل میں سلطان علاءالدین خلجی کے خلاف نفرتوں کا طوفان اٹھا مگر اس طوفان کی حقیقت پانی کے ایک بلبلے سے زیادہ نہیں تھی۔ سطحِ آب پر نفرت کا وہ حباب فوراً ہی ابھر کر ڈوب گیا اور ملک کافور کا پورا جسم اس خوف سے کانپنے لگا کہ کسی دیوار یا قندیل وفانوس نے اس کے خیالات کو نہ پڑھ لیا ہو اور پھر یہ راز سلطان تک منتقل نہ کر دیا جائے اسی قسم کے اندیشوں نے ملک کافور کی پشت بستر سے نہ لگنے دی یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

دربار کے آراستہ ہونے سے پہلے ہی ملک کافور نے علاءالدین خلجی سے خلوت میں حاضر ہونے کی اجازت مانگی پھر جب سلطان نے اسے شرف حضوری بخشا تو وہ گریہ وزاری کرتا ہوا فرمانروائے ہند کے قدموں سے لپٹ گیا۔ اشک ریزی کے دوران رقاصہ کے قتل کا پس منظر بیان کیا اور پھر ایک ادائے خاص کے ساتھ علاءالدین خلجی سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

"سلطان معظم! اس نے مجھے آپ کے حوالے سے دنیا کی غلیظ ترین گالی دی تھی اس لئے غلام یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکا۔"

علاءالدین خلجی نے ملک کافور کے اس جابرانہ فعل کی روداد خاموشی سے سنی اور پھر نہایت تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔

"ملک! ہم نے تجھے یہ اختیارات نہیں دیئے ہیں کہ تو لوگوں کی زندگی سے موت کا کھیل کھیلے ان حرکتوں سے خوشامدیوں اور حاشیہ برداروں کا کیا بگڑے گا ؟ رسوائی تو ہماری ہوگی لوگوں کی زبانیں چپ رہیں گی تو دل چیخ اٹھیں گے کہ ان کا سلطان خوابِ غفلت میں سو گیا ہے۔ ہمارے نامۂ اعمال میں اس قدر تہمتیں تحریر نہ کر کہ ہمارا قہر بیدار ہو جائے اور پھر تیری محبوبیت بھی ہمارے جبر کے اس سیلاب کو نہ روک سکے۔ تجھے ہر قدم پر اس کا لحاظ رہنا چاہئے کہ رعایا کی جان و آبرو کی حفاظت سلطان کا فرض اولین ہے۔" یہ کہہ کر علاءالدین خلجی نے منہ پھیر لیا اور ملک کافور سر جھکائے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

☆..........☆..........☆

ناہید رباب کی حقیقت بیانی اور رانی پدمنی کی شعلہ سامانی نے ملک کافور کو پاگل کر دیا تھا۔ وہ مسلسل اس حادثے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ابھی رونما نہیں ہوا تھا اگر وہ حادثہ پیش آجاتا تو ملک کافور کے خیال میں دربار شاہی زیروزبر ہو کر رہ جاتا ایک طرف رانی پدمنی اس کی محبوبیت پر شب خون مارتی اور دوسری طرف علی عامر آفریدی ایک قزاق کا کردار ادا کرتے ہوئے اس کا اقتدار لوٹ لیتا۔ اس طرح رانی پدمنی اور آفریدی بیک وقت اس کے رقیب بن کر رہ گئے تھے۔

"رانی پدمنی میری پہنچ سے دور ہے۔" ملک کافور نے ایک وحشت زدہ انسان کی طرح خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن آفریدی نے ابھی دہلی کی حدود سے باہر قدم نہیں نکالا ہے ابھی وقت میری گرفت میں ہے اگر یہ گرفت کمزور ہو گئی تو پھر وقت کی رفتار کو اپنے حق میں نہیں موڑا جا سکے گا۔"

اس خیال کے آتے ہی ملک کافور کی ساری توجہ علی عامر آفریدی کی ذات پر مرکوز ہو گئی۔ دربار برخاست ہونے کے بعد ملک کافور، علی عامر آفریدی سے تنہائی میں ملا۔

"آفریدی! تمہیں یہ کامیابیاں اور سلطان کی یہ قربتیں مبارک ہوں۔" ملک کافور کا لہجہ بظاہر عامیانہ تھا مگر اس کے ایک ایک لفظ میں نفرت و حقارت پوشیدہ تھی۔

علی عامر چند لمحوں تک سلطان علاءالدین خلجی کے محبوب غلام کو بغور دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ رک رک کر کہنے لگا۔ "میری یہ کامیابیاں کوئی نئی بات نہیں تاریخ گواہ ہے کہ جوانمردوں اور سرفروشوں کو خدائے عزیز و جلیل نے اسی طرح سرفراز کیا ہے۔"

"جوانمرد و سرفروش ؟" ملک کافور کا قہقہہ بلند ہوا۔ آفریدی کی جو توہین الفاظ کے ذریعے نہیں ہو سکی تھی اس کی تکمیل ملک کافور کے قہقہے نے کر دی تھی۔ "آج معلوم ہوا کہ تم جوانمرد بھی ہو اور سرفروش بھی۔" ملک کافور نے اپنی جگہ طے کر لیا تھا کہ آج وہ بہرعنوان آفریدی کی تذلیل کرے گا۔ "تم اپنے موجودہ اعزاز کو ذاتی کوششوں کا نتیجہ سمجھتے ہو ؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ سلطان کی بے جا خوشامد نے تمہیں اس درجے تک پہنچایا ہے۔" ملک کافور نے بڑی عیاری کے ساتھ ایک غیرت مند افغان کی رگ احساس پر مکمل ضرب لگا دی تھی۔

اس نازک موقع پر علی عامر اپنی قبائلی صفات کی وجہ سے قہر و غضب کا آتش فشاں بن سکتا تھا مگر فطرتاً وہ نہایت متحمل مزاج نوجوان تھا اس لئے ملک کافور کی بات سن کر کچھ دیر تک مسکراتا رہا پھر بڑے معنی خیز انداز میں کہنے لگا۔ "خیر! مجھے تو خوشامد نے اس منصب تک پہنچایا ہے مگر تم اپنے بارے میں سوچو کہتی ہے تم کو خلق خدا غائبانہ کیا۔" اتنا کہہ کر علی عامر آفریدی اٹھ کھڑا ہوا تھا پھر جاتے جاتے اچانک ٹھہر کر بولا تھا۔

"ملک کافور! خدا کسی کسی انسان کو یہ توفیق دیتا ہے کہ وہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ سکے، کاش! تمہیں بھی یہ سعادت حاصل ہو جائے کہ تم آئینے میں ایک بار ہی اپنا چہرہ دیکھ لو۔ پھر کسی کی غیرت و مردانگی کا اس طرح مذاق نہیں اڑاؤ گے۔" علی عامر آفریدی نے مہذب لہجے میں سب کچھ کہہ دیا تھا۔

مگر بے حیا لوگ شائستگی اور تہذیب کی زبان نہیں سمجھتے۔ پتھر کے دل پر کسی گلاب کی پنکھڑی کے گرنے کا کیا اثر ہوگا ؟ سوائے اس کے کہ وہ گلاب کی پنکھڑی بکھر کر خود اپنا ہی وجود کھو بیٹھے۔

علی عامر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا ملک کافور کے دل میں اس کی طرف سے حسد کا جو غلیظ رنگ جذبہ بہت دن سے پرورش پا رہا تھا آج وہ ایک لمحے میں اپنی تمام تر کثافتوں کے ساتھ جوان ہو گیا تھا۔

علی عامر ایک بلند حوصلہ اور شجاع انسان تھا اس لئے اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ ملک کافور کے چہرے پر خباثتوں کے کتنے رنگ ابھر آئے ہیں۔

زندگی کا یہی وہ موڑ تھا جہاں پہنچ کر علی عامر آفریدی جیسا فرض شناس نوجوان ملک کافور کی دشمنی اور اذیت رسانی کا مستقل نشانہ بن گیا تھا۔ اگر آفریدی ایک لمحے کے لئے ٹھہر جاتا تو وہ ملک کافور کی زبان سے ادا ہونے والے وہ الفاظ سن لیتا جو ہر دور کے سازش کرنے والوں نے ہزار پردوں میں چھپ کر کہے ہیں۔

ملک کافور کہہ رہا تھا۔ ”آفریدی! یہ مت سوچ کہ دنیا مجھے کیا کہتی ہے؟ یہ دیکھ کہ آنے والا زمانہ تیرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔“

اس کے بعد ملک کافور کینہ پروری کی آگ میں سلگتا ہوا محل واپس چلا گیا اور اس کے پراگندہ ذہن میں علی عامر کے خلاف مختلف تصورات ابھرنے لگے۔

پھر اسی رات ملک کافور نے دربار شاہی کی ایک اور رقاصہ زہرہ جمال کو طلب کیا۔ یہ ایک ایسی رقاصہ تھی جو دوسری لڑکیوں کے ہجوم میں اپنے فن کا مظاہرہ کر کے سلطان علاءالدین خلجی اور دوسرے امرائے سلطنت کا دل بہلایا کرتی تھی۔ اگرچہ وہ فنِ رقص سے بخوبی واقف تھی لیکن ملک کافور کی سفارش حاصل نہ ہونے کے سبب دربار شاہی میں زہرہ جمال کا فن بجھا بجھا نظر آتا تھا۔ اس نے ملک کافور سے دبے لہجے میں کئی بار اس ناقدریٔ فن کی شکایت بھی کی تھی مگر ملک کافور ہمیشہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا۔

”تمام رقاصائیں یہی گلہ کرتی ہیں مگر انہیں اس حقیقت کا علم نہیں کہ چشم خریدار میں رہنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔“

اس دل شکنی کے بعد زہرہ جمال اپنے روشن مستقبل سے مایوس ہو گئی تھی اور اب اس کی زندگی محض ایک ایسا کھلونا تھی کہ جس کی طرف سلطان یا دوسرے درباری دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے.......... اور شاہی مجلس کیف و نشاط میں اس کا داخلہ عام خدمت گاروں کی نظر کرم کا مرہون منت ہو کر رہ گیا تھا مگر آج جب ملک کافور نے اسے تنہائی میں طلب کیا تھا تو وہ چند لمحوں کے لئے چونک اٹھی تھی۔ زہرہ جمال کا خیال تھا کہ شاید اس کے مقدر کے سنورنے کی گھڑی آ گئی ہے ورنہ سلطان کا سب سے منہ چڑھا مصاحب اسے اس طرح طلب نہ کرتا۔

اپنے بے شمار نا آسودہ جذبات اور منتشر خیالات میں گھری ہوئی' زہرہ جمال ملک کافور کی عشرت گاہ میں داخل ہوئی۔ چند لمحوں تک وہ عالم حیرت میں کھڑی اس کمرے کی آرائش کو دیکھتی رہی جس پر دنیا پرستوں کے بقول جنت ”ارضی“ کا گمان ہوتا تھا۔ زہرہ جمال یہاں آ کر کھو سی گئی تھی ایسا لگتا تھا کہ دنیاوی آسائشوں سے محروم رقاصہ کچھ دیر اس زمینی جنت میں آرام کرنا چاہتی ہے۔

ابھی زہرہ جمال اپنے پیاسے خوابوں کے جزیرے میں مبہوت کھڑی تھی کہ ملک کافور نے گرجدار آواز میں اسے پکارا.......... ”کیا سوچ رہی ہے لڑکی؟“

”کچھ نہیں حضور۔“ زہرہ جمال خوابوں کے اجنبی کوچے سے نکل آئی تھی اور اب اس کے چہرے پر سراسیمگی اور ندامت کا گہرا عکس نظر آ رہا تھا۔

”ہم تیرے دل سے واقف ہیں کہ وہاں کیسی کیسی حسرتیں کروٹیں لے رہی ہیں۔“ ملک کافور کا لہجہ ٹھہرا ہوا تھا مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ سلطان علاءالدین خلجی کا یہ خبیث فطرت مہرہ زندگی کی بساط پر کیسی خوفناک چال چلنے والا ہے۔

”نہیں حضور! ہم اس بستی کے رہنے والے ہیں جہاں کے لوگ خواب نہیں دیکھ سکتے۔“ زہرہ جمال کی آواز سے روح کا کرب جھلک رہا تھا۔ ”بس کچھ دیر کیلئے اپنے اطراف پر یہ بے قرار نظریں ٹھہر جاتی ہیں۔

نظروں کے بھٹکنے کو خواب کون کہہ سکتا ہے؟ خواب تو وہ ہوتے ہیں جن میں انسان کھو کر رہ جاتا ہے۔ وقت مجھے کھونے کی فرصت ہی نہیں دیتا۔ اگر جبراً ان وادیوں میں کھونے کی کوشش کرتی ہوں تو یہ سنگدل گھنگھرو چونکا دیتے ہیں اور یہ بے رحم پائل جھنجھوڑ کر جگا دیتی ہے۔“ زہرہ جمال کے دل کا درد خون ہو کر اس کے ہونٹوں سے بہہ رہا تھا۔

”لڑکی! تو ٹھیک کہتی ہے۔“ ملک کافور کے چہرے پر عیارانہ مسکراہٹ ابھر آئی.......... ”یقیناً تجھے خواب دیکھنے کا حق حاصل نہیں مگر دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو کسی بھی شخص کو ہر رنگ کے خواب دکھانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اگر تو میرے حکم پر عمل کرے گی تو میں تجھے تیری زندگی کا سب سے سنہری خواب دکھاؤں گا۔“

رقاصہ کسی بچے کی طرح مچل اٹھی ”سرکار! یہ کنیز تو پیدا ہی اسی لئے ہوئی ہے کہ آپ کی ایک جنبشِ چشم پر قربان ہو جائے۔“

”تو علی عامر آفریدی کو پہچانتی ہے؟“ اچانک ملک کافور نے زہرہ جمال سے ایک غیر متوقع سوال کر ڈالا۔

”وہی سردار آفریدی' جنہیں کئی جنگوں میں فتوحات حاصل ہوئی ہیں اور جو آج کل سلطان کے بہت قریب نظر آتے ہیں۔“ زہرہ جمال نے علی عامر سے شناسائی کا اس طرح اعتراف کیا جیسے وہ اس افغان زادے کے حالات سے بہت زیادہ باخبر ہو۔

”سردار آفریدی نہیں! صرف علی عامر آفریدی۔“ یکایک ملک کافور غضب ناک ہو گیا تھا۔ ”اس بے نام انسان کو سرداری کے مرتبے تک میں نے پہنچایا ہے۔ میری نگاہ کرم سے پہلے اسے یہاں کون جانتا تھا؟ اس کی تمام فتوحات بھی میری جنگی حکمت عملی کا صدقہ ہیں۔“

بات اچانک بگڑ گئی تھی اس لئے زہرہ جمال نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے کہا.......... ”حضور! آپ کو ان احسانات کے شمار کرانے کی کیا ضرورت ہے؟ ساری دنیا جانتی ہے کہ آفریدی آپ کا ممنونِ کرم ہے۔“

”یقیناً ایسا ہی ہے۔“ ملک کافور کا غصہ بظاہر کم ہو گیا تھا مگر لہجے کی رعونت اب بھی برقرار تھی۔ ”جس طرح ہم نے آفریدی کو پستی سے اٹھا کر منزلِ عروج تک پہنچایا ہے' اسی طرح ہم تیرے خوابوں کو بھی شرمندۂ تعبیر کریں گے۔“ ملک کافور کی گفتگو میں ابہام تھا۔

”مجھے حکم دیجئے۔“ جوشِ جذبات سے زہرہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”میں تو حضور کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کی پابند ہوں۔“

رقاصہ کو اس بے قراری کے ساتھ آمادہ پا کر ملک کافور نے اپنا وہ غلیظ منصوبہ پیش کر دیا۔

”تم آج ہی آفریدی کے مکان پر جا کر اس کی ماں اور بہن کے سامنے اس راز کو فاش کر دو گی کہ علی عامر نے محبت کے جھوٹے خواب دکھا کر تمہیں برباد کیا اور اب شادی سے انکار کر رہا ہے۔“ یہ کہتے کہتے ملک کافور کے چہرے پر انسانی فطرت کی تمام سیاہیاں ابھر آئی تھیں۔

”حضور! یہ کیسے ممکن ہے؟“ زہرہ جمال کی آواز بجھتے ہوئے چراغ کی مانند تھرتھرا رہی تھی۔ ”دربار کے تمام لوگ سردار آفریدی کو پہچانتے ہیں کہ انہیں کیف و نشاط کے ان ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اقتدار کے باوجود کسی نے ان کے قدموں کو لڑکھڑاتے نہیں دیکھا پھر میں یہ کس طرح کہہ سکوں گی کہ ان کے بہکے ہوئے قدم میرے مکان تک آئے اور مجھے برباد کر کے چلے گئے۔ میں نے تو کبھی ان کی نظروں کو بھی بہکتے

ہوئے نہیں دیکھا پھر میں کیسے ان کے نام کے ساتھ یہ سنگین تہمت منسوب کر سکوں گی؟"

"تو پھر یہ تہمت خود تجھ پر لگ جائے گی۔" ملک کافور بے قابو شعلے کی طرح بھڑک اٹھا "جسم فروشی کی تہمت نہیں کہ یہ تو تیری زندگی ہے۔ ہم تجھ پر موت کی تہمت لگائیں گے وہ موت جو ہمارے حکم سے آتی ہے تو پھر ٹلتی نہیں۔"

زہرہ جمال سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ملک کافور اس کی ترسی ہوئی آنکھوں کو اس قدر لرزہ خیز خواب دکھائے گا۔ رقاصہ کے دل کی دھڑکنیں پہلے ہی بے ترتیب ہو چکی تھیں، اب آنکھوں کے سامنے تباہیوں کا دھواں بھی پھیلنے لگا تھا۔ پھر وہ اپنے قدموں کا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور ملک کافور کے سامنے ہی سنگ مرمر کے فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

دوسرے ہی لمحے ملک کافور نے اسی قبیلے کی چند جوان عورتوں کو اپنے کمرے میں طلب کیا اور پھر تھوڑی دیر بعد کسی مخصوص خوشبو کے استعمال سے زہرہ جمال ہوش میں آگئی۔ ملک کافور کی آنکھ کے دوسرے اشارے نے ایک بار پھر کمرے کو دوسری عورتوں کے وجود سے خالی کر دیا۔

ملک کافور دوبارہ زہرہ سے مخاطب ہوا "بس اب تو اپنے گھر جا اور ہمارے حکم پر عمل کر۔ آفریدی دو چار دن میں چتوڑ روانہ ہونے والا ہے اس سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ وہ دہلی کے ہر گلی کوچے میں رسوا ہو جائے اور پھر ہم تجھے تیرا حق دلانے کیلئے اس خوشامدی پٹھان زادے کو سلطانِ معظم کی عدالت عالیہ میں کھینچ لائیں۔" منصوبے کی وضاحت ہو چکی تھی اس لئے رقاصہ زہرہ جمال لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنے گھر چلی گئی جہاں ایک اندھی ماں اور معصوم بہن بھائی اس کا انتظار کر رہے تھے۔

☆..................☆..................☆

گھر پہنچتے ہی زہرہ جمال اس طرح بستر پر گر گئی جیسے آندھی کے تیز جھونکے نے کئی دن کے باسی پھول کو شاخ سے الگ کر دیا ہو اندھی ماں ٹھوکریں کھاتی ہوئی بیٹی کے بستر تک آئی اور اس لڑکی کی مزاج پرسی کرنے لگی جس کی شاہی ملازمت پر ایک غریب گھرانے کی زندگی کا انحصار تھا۔

نابینا ماں، بیٹی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کیا دیکھتی؟ پھر بھی زہرہ جمال نے اپنے لبوں پر جبری تبسم سجا لیا اور شگفتہ لہجے میں ماں کو بتانے لگی کہ اس کی طبیعت ٹھیک ہے مگر درباری مصروفیات نے جسم کو تھکا ڈالا ہے خوش فہمی کے سہارے زندہ رہنے والی ماں مطمئن ہو کر چلی گئی اور زہرہ جمال کا ذہن منتشر خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔ ایک تصور ڈوبنے بھی نہیں پاتا تھا کہ دوسرا ابھر آتا تھا۔

یہ ایک راز تھا کہ رقاصہ زہرہ جمال، علی عامر آفریدی کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر تھی وہ جب بھی اس کی طرف دیکھتی تو دل میں ایک عجیب سی خواہش موجزن ہو جاتی۔ وہ آفریدی سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن اس نے یہ خواب ہمیشہ دیکھے تھے کہ کاش علی عامر جیسا کوئی نوجوان اس کا ہم سفر ہو۔ زہرہ نے بہت پہلے دل ہی دل میں یہ عہد کیا تھا کہ جب بھی آفریدی کی طرح کوئی مرد اسے زندگی کے ناہموار راستوں پر نظر آئے گا وہ اسے پکارے گی اور اپنا دلِ داغ داغ اس کے قدموں میں رکھ کر کہے گی۔

"مسافر! میں نہ جانے کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی میری طرف دیکھ کہ ان آنکھوں میں کیسے چراغ روشن ہیں اور دل پر نظر ڈال کہ وہاں آرزوؤں کے کتنے سمندر قید ہیں۔"

پھر وہ اسے اپنے شیشۂ جسم و جاں کے ٹوٹنے کا ایک ایک راز بتا دے گی۔ اگر اس نے شیشے کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو اپنی اعلیٰ ظرفی کے دامن میں سمیٹ لیا تو وہ خود کو دنیا کی سب سے خوش نصیب عورت سمجھے گی اور اگر وہ نظر پھیر کر چلا گیا تو اسی طرح سر دربار ناچتی رہے گی یہاں تک کہ اس کے پاؤں شل ہو جائیں گے

اور گھنگھرو ٹوٹ کر اہلِ زر کے قدموں میں بکھر جائیں گے۔

زہرہ جلتے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچ رہی تھی کہ آج اس کی زندگی میں وہ دن آیا بھی تھا تو کس انداز سے آیا تھا۔ علی عامر آفریدی جو اس کے خیالی محبوب کا ہم رنگ تھا اسی کے ہاتھوں ایک خوفناک سازش کا شکار ہوا جا رہا تھا۔

اچانک زہرہ جمال کے ذہن میں ایک برق سی لہرائی اور پھر یہی برق اس کے دل پر چمکی پھر اسے اپنی روح میں ایسی تپش محسوس ہوئی کہ وہ بستر پر دراز نہ رہ سکی۔ ماضی کی بربادی، حال کی ساری شکستگی اور مستقبل کے تمام خوابوں کو فراموش کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ زہرہ کے دل و دماغ ایسے زلزلے کی زد پر تھے جو اسے تباہیوں کے مدفن کی طرف پکار رہا تھا۔ رقاصہ نے گھبرا کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

زہرہ جمال، ملک کافور کی سازشی ہواؤں کو اندر نہیں آنے دینا چاہتی تھی مگر وہ اقتدار کی ہوائیں تھیں۔ ایک بے سہارا اور کمزور رقاصہ کے مکان کے روزنوں سے گزر آئیں دروازے رکاوٹ بنے تو گرا دیئے گئے۔ دریچوں نے مزاحمت کی تو توڑ دیئے گئے۔ ہواؤں کو آنا تھا، وہ اندر آگئیں۔ زہرہ جمال ضربِ اقتدار سے ٹوٹ کر بکھرنے ہی والی تھی کہ اس کے معصوم جذبوں نے اسے سمیٹ لیا وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل زمین بوس ہونے ہی والی تھی لیکن ایک آرزوئے خوں گشتہ نے اسے بڑھ کر سنبھال لیا اور پھر اس شکستہ عورت نے ایک نئے جذبے کو تخلیق کیا۔

☆..................☆..................☆

وہ بڑی عجیب رات تھی کہ جب درباری رقاصہ زہرہ جمال گہری تاریکی میں علی عامر آفریدی کے دروازے پر دستک دے رہی تھی آخر مسلسل کئی دستکوں کے بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھولنے والا خود علی عامر تھا وہ اندھیروں کی قبا میں لپٹے ہوئے ایک انسانی ہیولے کو دیکھ کر جھجکا پھر نہایت سخت لہجے میں کہنے لگا۔

"تم کون ہو جو نصف شب کے قریب میرے مکان تک آئے ہو؟ آخر تم کس مصیبت کا شکار ہو؟ جلدی بتاؤ مجھے وحشت ہو رہی ہے۔"

"میں زہرہ جمال ہوں۔" آنے والے نے تھکی تھکی آواز میں کہا اور علی عامر حیرت سے چونک اٹھا رات کے سناٹے میں ایک نسوانی لہجے کی گونج نے اسے عجیب سی ذہنی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ آفریدی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آدھی رات کے قریب کوئی اجنبی عورت بھی اس کے گھر تک آ سکتی ہے۔ دروازے پر کھڑے کھڑے اس نے چند لمحوں میں اپنی تمام رشتے دار خواتین کے بارے میں سوچ ڈالا مگر اس نام کی کسی عورت سے آفریدی کا کوئی خاندانی تعلق نہیں تھا۔

"میں زہرہ جمال کو نہیں جانتا۔" بالآخر علی عامر آفریدی نے دروازے پر کھڑی ہوئی عورت کو بڑی بے رخی کے ساتھ پہچاننے سے انکار کر دیا۔

"مجھے اندر آنے دیجئے۔" زہرہ کے لہجے میں التجا تھی۔ "میں اندر آ کر سب کچھ بتا دوں گی پھر آپ مجھے پہچان جائیں گے۔"

اگرچہ ایک لمحے کے لئے آفریدی کی غیر معمولی ذہانت نے حالات کے اس زاویئے پر بھی سوچا تھا کہ ایک اجنبی عورت کی آمد اس کے خلاف کوئی سازش نہ ہو لیکن وہ فطرتاً شجاع تھا اس لئے ان معمولی واقعات سے گھبرانا اس کی سرشت نہیں تھی۔ "خاتون! تم اندر آجاؤ۔" یہ کہہ کر علی عامر نے راستہ چھوڑ دیا اور زہرہ جمال رات کی تاریکی میں اس پٹھان زادے کے مکان میں داخل ہو گئی جو چند روز بعد سلطان علاء الدین

خلجی کا سفیر بن کر سرکش راجپوتوں کے دربار میں جانے والا تھا۔

آفریدی اور زہرہ جمال کی گفتگو سن کر اس مکان کی بوڑھی مالکہ بھی بیدار ہو چکی تھی جسے پٹھانوں کی تاریخ شائستہ بیگم کے نام سے جانتی ہے اور جو رشتے میں علی عامر آفریدی کی ماں تھی۔ شائستہ بیگم کے ساتھ اس کی بیٹی عالیہ آفریدی بھی جاگ گئی تھی۔ جب ماں اور بیٹی نے آفریدی کے ساتھ ایک اجنبی عورت کو مکان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو وہ چونک اٹھیں ان کی پوری زندگی میں بڑی انہونی بات ظاہر ہوئی تھی۔

جیسے ہی زہرہ جمال مکان کے طویل آنگن سے صحن میں آئی اور اس کے دلکش چہرے پر قندیل کی روشنی پڑی تو شائستہ بیگم بے اختیار کہہ اٹھیں۔

"آفریدی! یہ کون لڑکی ہے ؟" ماں کے لہجے میں کرختگی بھی تھی اور دبی دبی نفرت بھی۔ پٹھانوں کی مخصوص رسمیں کسی اجنبی عورت کو شب کے اندھیرے میں ایک اجنبی مرد کے ساتھ برداشت ہی نہیں کر سکتی تھیں۔

"یہ مجھے نہیں جانتے مگر ایک معزز سردار ہونے کے سبب میں ان سے بخوبی واقف ہوں۔" رقاصہ زہرہ جمال بہت آہستہ لہجے میں بول رہی تھی۔ "میں نے بہت سوچا کہ میں اس معاملے میں وہی کردار ادا کروں جس کا مجھے حکم دیا گیا ہے مگر میری خاندانی غیرت نے گوارہ نہیں کیا کہ سردار آفریدی کے دامن پر میری وجہ سے بدنامی کا کوئی داغ ابھر آئے۔" زہرہ جمال کا لہجہ بہت پر سوز تھا اور اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں سے ابھر رہا تھا۔

رقاصہ کی بات سن کر شائستہ بیگم کی جہاندیدہ نظروں میں کئی سوالات ابھرنے لگے تھے۔

"کیا سرِ دربار ناچنے والی عورتیں بھی غیرت کا مفہوم سمجھتی ہیں ؟" شائستہ بیگم نے بڑے جارحانہ انداز میں زہرہ جمال کے احساس پر نشتر زنی کی تھی۔

"ہاں مادرِ محترم! ایک رقاصہ بھی اپنے سرمایۂ غیرت کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔ شہنشاہوں کے دربار میں جسم یقیناً پامال ہو جاتے ہیں لیکن جذبات نہیں خریدے جا سکتے۔ انسانی جذبات تو اتنے پاگل اور سرکش ہوتے ہیں کہ وہ جبراً کسی کے اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے۔ میں خاندانی رقاصہ نہیں ہوں میرا باپ بھی ایک غیرت مند قبیلے کا سپاہی تھا جسے جنگ کے عفریت نے نگل لیا پھر وقت نے وہ ستم کئے کہ قبیلہ قبیلہ نہیں رہا اور خاندان خاندان نہیں رہا۔" یہ کہتے کہتے زہرہ جمال کی پلکیں بھیگنے لگیں مگر وہ عجیب آہنی اعصاب کی عورت تھی اس نے خود ہی یادوں کے نشتر سے اپنے دل کے زخموں کو کھرچا اور پھر بہتے ہوئے خون سے اس طرح نظر چرالی کہ جیسے ان جراحتوں کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

"مادرِ محترم! وقت بہت کم ہے میری غیرت اور بے حیائی کو موضوع بحث نہ بنائیے۔" اتنا کہہ کر رقاصہ زہرہ جمال کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گئی اور پھر اس نے علی عامر کے سامنے ملک کافور کا منصوبہ ظاہر کر دیا۔

جب زہرہ جمال ملک کافور کے منصوبے کی تفصیلات بتا کر خاموش ہوئی تو علی عامر کے مکان میں ہر طرف درد انگیز سناٹا پھیل گیا۔ بوڑھی شائستہ بیگم' نوخیز عالیہ اور علی عامر آفریدی اس طرح خاموش ہو گئے جیسے موت دبے قدموں ان کے گھر میں داخل ہو گئی ہو اور وہ رقاصہ کا چہرہ دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے ہوں کہ ایک ناچنے والی بھی سچ بول سکتی ہے۔

اس سے پہلے کہ علی عامر' زہرہ کی باتوں کا جواب دیتا وہ اٹھ کھڑی ہوئی پھر شائستہ بیگم سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ "مادرِ محترم! اس ناوقت تکلیف دہی کے لئے معافی کی خواست گار ہوں اور اس جذباتی

اذیت رسانی کیلئے بھی معذرت طلب کرتی ہوں کہ ایک بے وقار رقاصہ آپ کے ذہنی سکون میں خلل انداز ہوئی۔" یہ کہہ کر زہرہ جمال آہستہ قدموں سے باہر جانے لگی۔

علی عامر آفریدی بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر آگیا تھا۔ "زہرہ! اگر تم مناسب سمجھو تو میں تمہیں گھر تک چھوڑ آؤں یہاں سے تمہارے مکان تک بہت اندھیرا ہے۔"

"نہیں سردار! آپ کیوں زحمت کرتے ہیں۔" تنہائی پا کر زہرہ جمال کے دل کا درد اس کے ہونٹوں تک آگیا تھا۔ "اندھیرے کے مسافر کو تاریکیوں سے ڈر نہیں لگتا میں تو پیدا ہی اندھیروں میں ہوئی تھی کہ دنیا میں میری آمد سے تین ماہ پہلے ہی والد محترم کا انتقال ہو چکا تھا اب میرا تعلق قبیلۂ شب سے ہے' پھر میں اندھیروں سے کیوں گھبراؤں ؟" زہرہ جمال آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔

علی عامر بھی اس کے دوش بہ دوش چل رہا تھا۔ اچانک اس نے رقاصہ سے سوال کیا۔ "آخر تم نے اپنا منصوبہ تکمیل تک کیوں نہیں پہنچایا۔ تم مجھے بدنام کئے بغیر واپس کیوں جا رہی ہو ؟"

"بس اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں آپ کے چہرے اور مستقبل دونوں کو تابناک دیکھنا چاہتی ہوں۔" زہرہ کی آواز کی لرزش صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

"آخر کیوں ؟ تم سے میرا کیا رشتہ ہے ؟" علی عامر جیسی چٹان بھی ایک رقاصہ کا نیا روپ دیکھ کر پگھلنے لگی تھی۔

"کوئی رشتہ نہیں اگر ہے بھی تو وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا اور پھر یہ ہوشمند دنیا اسے تسلیم بھی نہیں کرے گی۔" یکایک زہرہ جمال کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ "سردار! آپ واپس چلے جائیں اور صرف ملک کافور کے بارے میں سوچیں جو آپ کے اندازے سے بھی زیادہ بے ضمیر اور کینہ پرور ہے بس! سر دربار ناچنے والی عورت کی یہی آخری التجا ہے کہ آپ ایک لمحے کے لئے بھی اپنی ذات کی طرف سے غافل نہ رہئے گا۔" یہ کہہ کر زہرہ جمال تیزی سے آگے بڑھی اور پھر اندھیروں نے اس کے مرمریں پیکر کو اپنی تاریک قبا میں چھپا لیا۔

زہرہ جا چکی تھی مگر علی عامر آفریدی اپنے مکان سے چند قدموں کے فاصلے پر کسی پتھر کی مانند ساکت کھڑا اس رقاصہ کے بارے میں سوچ رہا تھا جو بڑے ہنگامہ خیز انداز سے آئی تھی اور بڑے پرسکون انداز میں واپس چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

رقاصہ کے جانے کے بعد علی عامر آفریدی اپنی والدہ شائستہ بیگم اور چھوٹی بہن عالیہ کے ساتھ ساری رات جاگتا رہا۔ اب اسے محلاتی سازشوں کا اندازہ ہو گیا تھا کہ کس طرح وفاپرست اور باکردار انسانوں کے خلاف منصوبہ سازی کی جاتی ہے اور کس طرح بے ضمیر افراد اپنے حاصل کردہ اقتدار کو بچانے کے لئے گھناؤنی سازشیں کرتے ہیں۔

بہت غور و فکر کے بعد آفریدی نے اپنی والدہ کے سامنے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ "مادر گرامی! میں سمجھتا تھا کہ ملک کافور اس تلخ گفتگو کو فراموش کر دے گا جو اس کے اور میرے درمیان ہوئی تھی مگر اب یقین ہو چلا ہے کہ وہ مجھے کسی بھی طرح معاف نہیں کرے گا۔"

"آپ چھوڑ جانے سے انکار کیوں نہیں کر دیتے ؟" اچانک عالیہ درمیان میں بول اٹھی۔

"میرے باپ کی معصوم نشانی! تمہیں نہیں معلوم کہ شاہوں کے قانون میں انکار کا کوئی لفظ موجود نہیں۔" علی عامر نے چھوٹی بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہ بڑے لوگ صرف اقرار سننے کے عادی ہوتے

ہیں اب اس میں کسی کی زندگی محفوظ رہے یا وہ جان سے گزر جائے۔"

عالیہ اپنے بھائی سے مزید بحث کرنا چاہتی تھی کہ شائستہ بیگم نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور دوبارہ آفریدی سے مخاطب ہوئیں۔ "تم کس معافی کا ذکر کر رہے تھے ؟"

"میں عرض کر رہا تھا کہ ملک کافور مجھے معاف نہیں کرے گا۔" آفریدی اپنی والدہ کے سامنے بہت آہستہ لہجے میں بولتا تھا۔

"کیسی معافی ؟" شائستہ بیگم نے پریشان لہجے میں بیٹے سے سوال کیا۔

آفریدی چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے اپنی چھوٹی بہن عالیہ کو حکم دیتے ہوئے کہا کہ وہ دوسرے کمرے میں چلی جائے۔ آفریدی اپنی زندگی کا اس قدر خوفناک راز ایک معصوم بچی کے سامنے بیان کرنا نہیں چاہتا تھا عالیہ جب اپنے چہرے پر شدید ناگواری کے اثرات لئے ہوئے کمرے سے اٹھ کر چلی گئی تو علی عامر نے ملک کافور سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں اپنی والدہ کو سب کچھ بتا دیا اور اس کے ساتھ ہی اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا۔

"میں کل یا پرسوں چتوڑ روانہ ہو رہا ہوں کون جانے میرے پیچھے ملک کافور کا عیار ذہن کیا سوچتا ہے اس لئے مناسب ہے کہ آپ کل صبح سویرے ہی ہانسی تشریف لے جائیں۔" ہانسی' دہلی سے کوئی ساٹھ میل دور ایک چھوٹا سا شہر یا قصبہ ہے مگر تاریخی اعتبار سے اس مقام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہانسی میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے بارہ سال قیام فرمایا تھا اور ایسی مبارک سرزمین پر چشتیہ سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کا مزار آج بھی اہل دل کے لئے مرکز نظر ہے۔

"ہانسی جانے سے کیا ہو گا ؟" شائستہ بیگم نے حیران ہو کر بیٹے سے پوچھا۔

"وہاں ہمارے کچھ رشتے دار موجود ہیں کم سے کم اپنے لوگوں کے درمیان آپ کو تنہائی اور عدم تحفظ کا احساس تو نہیں ہو گا۔"

شائستہ بیگم نے بڑے تحمل سے آفریدی کی بات سنی اور پھر نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا تمہیں یہ اندیشے تو پریشان نہیں کر رہے ہیں کہ تمہاری غیر موجودگی میں ملک کافور ہمیں ستانے کی کوشش کرے گا ؟"

"اندیشے نہیں مادر محترم! کچھ یقینی شکلیں میری آنکھوں کے سامنے ابھر رہی ہیں۔ اب میں کسی حال میں بھی اس پر اعتبار نہیں کر سکتا۔" علی عامر بہت زیادہ مضطرب نظر آنے لگا تھا۔

شائستہ بیگم نے بیٹے کو سمجھانا چاہا کہ انسانی مقدرات اٹل ہوتے ہیں۔ وہ مکان یا شہر کے تبدیل کرنے سے ٹالے نہیں جا سکتے مگر آفریدی اپنی اسی منطق پر اصرار کرتا رہا کہ جب کسی جگہ آگ بھڑک اٹھے تو انسان کو لازم ہے کہ وہاں سے ہٹ جائے ورنہ شعلوں کی تپش اسے بھی متاثر کر دے گی۔ بالآخر ایک طویل بحث کے بعد شائستہ بیگم اس بات پر آمادہ ہو گئیں کہ کل صبح وہ اپنی بیٹی عالیہ کے ہمراہ دہلی سے ہانسی روانہ ہو جائیں گی۔ والدہ کے اس فیصلے سے آفریدی کی بے چینیوں میں کسی حد تک کمی آ گئی تھی۔

☆..................☆..................☆

پھر جب سورج طلوع ہوا تو علی عامر نے اپنی ماں اور بہن کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ دونوں میری چتوڑ روانگی کو ایک عام سفر سے تعبیر نہ کریں میں جانتا ہوں کہ سلطان کے تیور بہت نازک ہیں اگر چتوڑ سے کوئی مثبت جواب نہیں آیا تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے اگر بساط اقتدار پر جنگ کی ایک چنگاری بھی رقصاں نظر آئی تو پھر ایک بہت بڑا علاقہ خوفناک آگ کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ نتیجتاً مجھے بھی اس وقت تک برسرپیکار رہنا

پڑے گا جب تک آسمان سے کوئی فیصلہ نازل نہ ہو جائے اس لئے میری واپسی میں تاخیر کا امکان بھی موجود ہے۔"

"میں تو صرف تیری ضد کی وجہ سے دہلی چھوڑ رہی ہوں ورنہ گردشِ وقت کیلئے سارے فاصلے یکساں ہیں آفات و مصائب کی نگاہ میں کیا دہلی اور کیا ہانسی ؟ انسان کو ہر حال میں خدا کی رحمت پر نظر رکھنی چاہئے کہ وہی محافظ اعلیٰ ہے۔ باقی سہارے تو کاغذ کے سائبان ہیں جو ہوا کے ایک معمولی جھونکے سے گر جاتے ہیں۔" شائستہ بیگم نے اپنے بیٹے کو محبت آمیز لہجے میں نصیحت کرتے ہوئے کہا "تم صرف اپنی منزل کی طرف دیکھو کہ جہاں خدا نے تمہیں پہنچا دیا ہے وہ ایک مشکل مقام ہے۔ اسے بس ایک ہی صورت میں برقرار کرایا جا سکتا ہے کہ تم سلطان کے اعتماد پر پورے اترنے کی کوشش کرو۔ باقی وزیر و امیر کیا کہتے ہیں ان کے بارے میں سوچ کر اپنی ذہنی صلاحیتوں کو برباد نہ کرو۔ جاؤ! فرزند جاؤ! خدا تمہارے حوالے سے تمہارے بزرگوں کی روایتوں کو زندہ رکھے۔"

جانے والے چلے گئے اور فضاؤں میں بہت دیر تک شائستہ بیگم کے دعائیہ کلمات کی گونج سنائی دیتی رہی۔ والدہ اور بہن کو رخصت کرنے کے بعد آفریدی کسی حد تک مطمئن نظر آ رہا تھا لیکن زہرہ جمال کے واقعے نے اس کے سینے میں بیک وقت کئی حشر اٹھا دیئے تھے۔

☆..................☆..................☆

دوسرے دن علی عامر آفریدی علاءالدین خلجی کے دربار میں حاضر ہوا تو ہر شے معمول پر نظر آ رہی تھی لیکن ملک کافور کا چہرہ خلاف معمول بہت زیادہ بجھا بجھا محسوس ہوتا تھا۔ جب بھی آفریدی اسے غور سے دیکھنے کی کوشش کرتا تھا وہ فوراً ہی نگاہیں چرا لیا کرتا تھا' یا تو یہ ملک کافور کی مجرمانہ وحشت تھی یا پھر اسے اپنے منصوبے کی ناکامی کا صدمہ تھا جس نے ملک کافور سے وہ اطمینان و غرور چھین لیا تھا جس کی بنیاد پر وہ دوسرے اہل دربار کو تمسخر آمیز نظروں سے دیکھتا تھا۔ آفریدی نے کچھ دیر تک ملک کافور کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی مگر پھر جلد ہی اس نے ایک بے ضمیر اور بے غیرت انسان کو اپنی نگاہ کے دائرے سے نکال پھینکا۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ تیسرے دن سلطان علاءالدین خلجی نے آفریدی کو ایک بار پھر اپنی خلوت میں طلب کیا۔ آفریدی باوقار انداز میں چلتا ہوا سلطان کے روبرو حاضر ہوا۔ شاہی آداب بجا لایا اور خاموشی سے اپنے فرمانروا کے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

"آفریدی! آخر وہ وقت آ پہنچا۔" یکایک سلطان کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی "کل تم ہمارے جذباتی سفیر کی حیثیت سے چتوڑ روانہ ہو رہے ہو۔ ہم نے آج تک کسی دوسرے شخص کو یہ منصبِ عظیم نہیں بخشا کہ وہ ہمارے دل کے معاملات اس ذات کے روبرو بیان کرے جو ہمارا نادیدہ محبوب ہے۔" سلطان علاءالدین خلجی کے لہجے سے شاہی جلال نمایاں تھا لیکن پھر بھی جاننے والے جانتے تھے کہ اس تمام تر جبروت کے باوجود والئ ہندوستان کی آواز سے خلشِ دل بھی جھلکتی تھی۔

"سلطان معظم! میں اپنی اس خوش نصیبی کا اعتراف کرتا ہوں۔" علی عامر آفریدی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ایک شہنشاہ کے جذباتی طوفان کو خاموشی سے گزر جانے دے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک تم وفاداری کے ایک ایک امتحان میں سرخرو رہے ہو لیکن آفریدی! یہ بڑی آزمائش ہے ہم ان لمحات کو اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھ سکتے جب تم رانی پدمنی کے سامنے ہمارے دل کی وکالت کر رہے ہو گے مگر دہلی میں بیٹھ کر یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ تم نے کیا کہا اور سننے والے نے کیا

سنا ؟ حسن کی عدالت میں ہمارا مقدمہ صرف تمہاری ذہانت اور وفاداری کے رحم و کرم پر ہو گا۔ "

آفریدی کو پہلی بار محسوس ہوا کہ عشق کیا چیز ہے ؟ اس نے چند ساعتوں کے دوران ایک با اختیار حکمراں کو موم کی طرح پگھلتے دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب سا منظر ابھر آیا تھا۔ جیسے چتوڑ کی گلیاں اس کے مقابل روشن ہو گئی ہوں اور ایک نامعلوم گوشے سے رانی پدمنی کا تابناک و ضیا بار چہرہ طلوع ہوا ہو اور سلطان علاء الدین خلجی نے گڑگڑاتے ہوئے اپنا کاسۂ گدائی رانی پدمنی کے سامنے پھیلا دیا ہو اور وہ تاریخی حسن رکھنے والی عورت ایک خاص اندازِ بے نیازی کے ساتھ سلطان کی جلتی ہوئی آرزو کو ٹھکرا کر آگے بڑھ گئی ہو اور سلطان نے شدید عالم طیش میں اپنا کاسہ زمین پر مار دیا ہو۔ پھر اس کے ریزے بکھر کر ہوا میں شامل ہو گئے ہوں اور ناگہاں وہ ہوا سرخ آندھی میں تبدیل ہو گئی ہو۔ منظر اس قدر لرزہ خیز تھا کہ آفریدی جیسے مضبوط اعصاب کا نوجوان بھی اپنے جسم میں ہلکا ہلکا ارتعاش محسوس کرنے لگا۔

علی عامر کے ہونٹوں پر مہر سکوت دیکھ کر سلطان نے تیز آواز میں پکارا۔" آفریدی! ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم ذہنی طور پر ہمارے روبرو نہیں ہو۔ " علاء الدین خلجی نے ایک ہی لمحے میں علی عامر آفریدی کی غائب دماغی کو محسوس کر لیا تھا۔

"نہیں سلطان۔ ذی حشم! میں اپنے پورے وجود کے ساتھ آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ " آفریدی نے اپنے منتشر خیالات کو یکجا کرتے ہوئے کہا۔" میں کیا اور میری وکالت کی حقیقت کیا چتوڑ کے دربار میں جو کچھ بھی ہو گا وہ جلالِ سلطانی کے زیر اثر ہو گا۔ مجھے بھی تو سلطان ہی کی نظر کرم نے وکالت کے منصب پر فائز کیا ہے اگر ایک ساعت کے لئے بھی مجھے غائب دماغی نے گھیر لیا تو میں اعتبار اور وکالت کے درجے سے گر جاؤں گا اور پھر آفریدی، آفریدی نہیں رہے گا۔ "

سلطان نے اپنے نوجوان سفیر کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا اور پھر نہایت پر شکوہ لہجے میں کہنے لگا۔

" آفریدی! ہم تمہاری ذہانت اور وفاداری پر شبہ نہیں کرتے مگر چاہتے ہیں کہ تم اپنے سلطان کی زبان سمجھ لو اگر تم عظیم خلجیوں کے وارث کی زبان سمجھنے سے عاجز رہے تو پھر اپنے حکمران کا مقدمہ کامیابی کے ساتھ پیش نہیں کر سکو گے۔ کہنے والوں نے ہم سے کہا ہے کہ راجہ رتن سنگھ بڑھاپے کی سرحدوں پر کھڑا ہے اور اس کی بیویوں میں رانی پدمنی سب سے کم عمر ہے۔ نوجوانی کی آرزوئیں بڑھاپے کی تمناؤں سے مختلف ہوتی ہیں۔ رانی پدمنی بھی زیادہ آزاد اور رنگین فضاؤں میں محو خرام ہونا چاہتی ہے تمہاری کامیابی یہ ہو گی کہ رانی پدمنی، رتن سنگھ کے سرد بازوؤں کو جھٹک دے اور پھر وہ ہمارے حرم میں داخل ہونے کے لئے بے قرار نظر آنے لگے۔ اگر ہمارے اقتدار کی ہمہ گیری اور ہمارے جذبوں کی آشفتہ سری کا فسانہ سن کر پدمنی کے چہرے پر حرص اور اضطراب کی کوئی علامت نہیں ابھری تو ہم سمجھ لیں گے کہ آفریدی ناکام ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی آفریدی کے سلطان کو بھی شکست ہو گئی۔ " یکایک علاء الدین خلجی کا لہجہ بدل گیا تھا۔ اب صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ایک عاشق کے آمادۂ فغاں لب، ایک جابر حکمران کے آتش بار ہونٹوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔

"اور آفریدی! تم خوب جانتے ہو کہ دل کے محاذ پر ہماری یہ شکست بڑی خونریز ہو گی۔ ابھی ہمیں نہیں معلوم کہ ایک حرفِ انکار کے بعد کتنا خون بہے گا، وقت سے پہلے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اگر شکست کا دھندلا سا بھی امکان موجود ہو تو قتل و غارت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ صرف پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ موت کے دہانے کھل جائیں گے، سبزہ زار جل اٹھیں گے اور دریاؤں کا پانی سرخ ہو جائے گا۔ "

یہ کہہ کر سلطان علاء الدین خلجی نے ایک سربمہر لفافہ علی عامر کی طرف بڑھایا.......... " جاؤ

آفریدی! ہماری دعائیں تم پر بھی سایہ فگن ہیں اور رانی پدمنی پر بھی۔ خدا سرزمینِ چتوڑ کو ہمارے قہر و جلال سے محفوظ رکھے۔"

آفریدی سلطان کی خلوت گاہ سے نکل کر شاہی اصطبل میں آیا اور ایک برق رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر چتوڑ کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆..........☆..........☆

آفریدی کے روانہ ہوتے ہی ملک کافور نے بیس مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ اپنی تنہائی میں طلب کیا۔ جیسے ہی مسلح سپاہی ملک کافور کے مخصوص کمرے میں داخل ہوئے، سلطان علاء الدین خلجی کے محبوب غلام نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

" جس طرح سلطان کی نظر میں آج آفریدی کی وفاداریوں کا امتحان ہے اسی طرح میری بارگاہ میں تمہاری جاں نثاریوں کی آزمائش ہے۔ "

ملک کافور کی بات سن کر مسلح دستے نے کوئی جواب نہیں دیا بس اطاعت و فرمانبرداری کے طور پر تمام سپاہیوں نے اپنے سر جھکا دیئے۔

" تم نہایت رازداری اور احتیاط کے ساتھ آفریدی کا تعاقب کرو گے۔ پھر جب وہ چتوڑ کی سرحد کے قریب پہنچ جائے تو تم اچانک عقب سے اس پر حملہ کر دو گے ایسا حملہ جو مکمل اور کارگر ہو کسی عنوان بھی آفریدی کو زندہ نہیں رہنا چاہئے۔ اگر وہ بچ گیا اور اس نے تم میں سے کسی کو پہچان لیا تو پھر تم لوگوں کے ساتھ تمہارے خاندان بھی زندہ دفن کر دیئے جائیں گے۔ "

" حضور! یہ ممکن نہیں کہ ہماری شمشیریں آپ کے دشمنوں کے خون سے پیاس بجھائے بغیر اپنی نیاموں میں واپس چلی جائیں۔ "

ملک کافور نے اس سپاہی کی لاف زنی پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ اپنے منصوبے کی ایک ایک کڑی کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دینا چاہتا تھا۔

" بہتر یہ ہے کہ آفریدی پر حملے کے لئے رات کے اندھیرے کا انتخاب کیا جائے وہ بھی اس طرح کہ علی عامر چتوڑ کے قریب پہنچ چکا ہو اور کائنات کا ایک ایک ذرہ تاریکی میں ڈوب چکا ہو۔ چتوڑ کی حدود کی قربت اور شبِ سیاہ میں اچانک حملے سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ بے خبری کے عالم میں راجپوت سرحدی محافظوں نے آفریدی کو قتل کر دیا۔" اتنا کہہ کر ملک کافور نے مسلح سپاہیوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اس اشارے کا واضح مطلب تھا کہ وہ علی عامر آفریدی کا تعاقب شروع کر دیں۔

سپاہیوں کے جاتے ہی ملک کافور کے چہرے پر سکون و اطمینان کی ایک تیز لہر دوڑ گئی وہ خود کلامی کے انداز میں آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ " آفریدی کی سفارت ناکام ہوتے ہی سلطان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں گے اور پھر شاہی فوجیں چتوڑ کو اس طرح پامال کر ڈالیں گی کہ رانی پدمنی کے دل میں نفرتوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہو گا اور پھر یہ طوفان میرے راستے کی ہر رکاوٹ کو بہا کر لے جائے گا۔ " آج بہت دن بعد ملک کافور کو ایک عجیب سی آسودگی کا احساس ہوا تھا۔

☆..........☆..........☆

ملک کافور بہت خوش تھا مگر اس کی یہ خوشی ریت کی دیوار ثابت ہوئی شاطر و عیار ذہن میں ایک خیال نے سر ابھارا اور پھر ملک کافور کی نظروں میں درباری رقاصہ زہرہ جمال کا سراپا گھوم گیا۔ اس کے منصوبے کے مطابق اب تک ہنگامہ برپا ہو جانا چاہئے تھا مگر آفریدی تو کسی الزام کے بغیر چتوڑ روانہ ہو چکا تھا۔ ملک کافور

شدید عالم اضطراب میں اپنی نشست پر پہلو بدلنے لگا پھر اس کا ذہن سلگ اٹھا وہ یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ اس نے آفریدی کو چتوڑ جانے سے روکنے کے لئے زہرہ کے ذریعے سازش کا نیا جال بچھایا تھا۔ پھر اس جال کے پھندے کس نے کاٹ دیئے اور نئے منصوبے پر عملدر آمد کیوں نہ ہو سکا حالانکہ ملک کافور کے جاسوسوں نے اسے خبر دی تھی کہ رات کے اندھیرے میں زہرہ جمال' علی عامر آفریدی کے گھر تک گئی تھی اور کچھ دیر بعد اس کی واپسی بھی ہو گئی تھی لیکن پھر وہ اپنا مقدمہ لے کر دربار میں کیوں نہیں آئی تھی ؟ سلطان کے سامنے اس نے آفریدی کے دامن کو داغدار کیوں نہیں کیا تھا ؟ ایسے کئی سوالات تھے جو بیک وقت ملک کافور کے ذہن پر حملہ آور ہوئے تھے۔

"کیا زہرہ جمال' آفریدی سے خوفزدہ ہو گئی اور پھر وہ منصوبے کو تکمیل تک پہنچائے بغیر اس کے مکان سے واپس چلی آئی ؟"

"کیا وہ رقاصہ اس خوبصورت افغان زادے کے سامنے اپنا دل ہار بیٹھی ؟"

"اور اگر ایسا ہو چکا ہے تو کہیں زہرہ نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آفریدی کے سامنے یہ بھیانک راز فاش نہ کر دیا ہو ؟"

یہ خیال آتے ہی ملک کافور ایک لمحے کے لئے لرز اٹھا اور پھر اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا مگر تنہا کمرے میں اس کی وحشتوں کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

"شاید میں یہ بازی ہار چکا ہوں۔" ملک کافور نے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔"اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ذلیل رقاصہ اب تک علی عامر پر تہمت لگا چکی ہوتی اور وہ افغان زادہ' سلطان کے سفیر کی حیثیت سے چتوڑ جانے کے بجائے ذلت و رسوائی کا طوق پہن کر پسِ دیوار زنداں جا چکا ہوتا۔ یقیناً رقاصہ نے خود میرے خلاف کوئی سازش کی ہے۔" یہ کہتے کہتے ملک کافور اپنی زر نگار کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ان عورتوں کو اپنے کمرے میں طلب کیا جو دولت و اقتدار کے آگے اپنے جان و تن ہار چکی تھیں اور اب نہایت رکیک انداز میں ملک کافور کے اشاروں پر ناچ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ملک کافور کا کمرہ ان عورتوں سے بھر گیا تھا جو غیر اخلاقی خدمت پر مامور تھیں۔

"شمیمہ! کیا وہ رقاصہ زہرہ جمال آج دربار میں حاضر ہوئی تھی ؟" ملک کافور نے اس بوڑھی عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جو دربار سے تعلق رکھنے والی تمام رقاصاؤں کی نگراں تھی۔

"نہیں حضور!" شمیمہ ملک کافور کے سامنے اس طرح جھک گئی جیسے وہ ہندوستانی حکمراں کو سجدہ کر رہی ہو۔ "سرکار! اس کنیز نے سنا ہے کہ وہ کئی روز سے بیمار ہے اس لئے اس نے دربار میں حاضر ہونے سے معذوری کا اظہار کیا ہے۔"

"بیمار ؟" ملک کافور کی زبان سے یہ لفظ اس طرح ادا ہوا جیسے وہ اس لفظ کے مفہوم سے قطعاً ناآشنا ہو۔ پھر یکایک اس کے لہجے سے آگ برسنے لگی۔ "میں نہیں جانتا کہ زہرہ کے جسم پر بیماری کس حد تک اثر انداز ہوئی ہے۔ اگر وہ نزع کے عالم میں بھی گرفتار ہو تو اسے میرے روبرو حاضر کرو۔"

بڑا قہرناک حکم تھا۔ شمیمہ اور دوسری اربابِ نشاط اپنی رفتار بھول گئی تھیں جب وہ ملک کافور کے کمرے سے برآمد ہوئیں تو ان میں سے ہر ایک کے چہرے پر وہی زردی نمایاں تھی جسے موت کے رنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شمیمہ اور دوسری عورتوں کو ملک کافور کے غصے کا سبب تو معلوم نہیں تھا لیکن وہ اتنا اندازہ کر سکتی تھیں کہ ملک کافور کی بارگاہ سے رقاصہ زہرہ کا رزق بند ہو چکا ہے۔

☆..................☆..................☆

پھر جب زہرہ جمال' ملک کافور کے روبرو حاضر کی گئی تو اس کے چہرے پر دور دور تک بیماری کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ البتہ شاداب چہرہ اس گلاب کی طرح مرجھا گیا تھا جسے بادِ صرصر کا کوئی گرم جھونکا چھو کر گزر گیا ہو۔

زہرہ! تونے بیماری کا یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے"؟ ملک کافور کی زہریلی آواز گونجی۔ "کیا تو بھول گئی کہ ہمارے حضور فریب کاری کی سزا کتنی دردناک ہوتی ہے ؟"

زہرہ جمال نے کئی مناسب بہانے تراشے مگر ملک کافور یہی کہتا رہا۔

"ابھی تیرے جسم میں اتنی توانائی اور کشش باقی ہے کہ تو اہلِ دربار کی نظروں کو آسودہ کر سکتی ہے.......... اور ابھی تیرے پیروں میں بھی اتنی حرارت باقی ہے کہ پازیب کی آواز ابھر سکتی ہے اور گھنگھروؤں کی جھنکار اہلِ ذوق کی سماعتوں پر خوشگوار اثر چھوڑ سکتی ہے پھر ہمارے دربار سے تیری غیر حاضری کا کیا مطلب تھا ؟"

زہرہ جمال نے ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کرنی چاہی مگر ملک کافور نے اس کے ہر عذر کو جھٹلا دیا اور اب وہ براہ راست اس موضوع پر آگیا جو زہرہ کے لئے کسی بھی لمحے جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔

"علی عامر آج چتوڑ روانہ ہو گیا اور اس طرح کہ اس کے دامن پر تیری لگائی ہوئی تہمت کا عکس تک نہیں تھا۔" ملک کافور کی آواز میں سارے زمانے کی نفرتیں اور غصہ سمٹ آیا تھا۔ "ہم نے تجھ سے کہا تھا کہ اس کی پوری شخصیت کو داغدار بنا دے لیکن ہماری آنکھوں نے دیکھا کہ دہلی سے رخصت ہوتے وقت علی عامر کے ماتھے پر فکر و پریشانی کی ایک لکیر تک نہ تھی اور اس کے دامن پر سیاہی کا ایک ذرہ تک نظر نہیں آرہا تھا آخر اس کا کیا سبب ہے ؟ ہماری نافرمانی کی یہ گناہ گار رسم کیوں روا رکھی گئی ؟" ملک کافور کے لہجے سے مسلسل قہر و نفرت کی آگ برس رہی تھی۔

زہرہ جمال نے ایک اور جھوٹ کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ "حضور! میں اپنی بیماری کے سبب آفریدی سے بروقت رابطہ قائم نہ کر سکی۔ پھر جب میری طبیعت کچھ بحال ہوئی اور میں نے اس سے ملنے کی کوشش کی تو وہ چتوڑ جا چکا تھا۔ میں اپنی اس کوتاہی پر بہت شرمندہ ہوں۔ آج میں خود ہی حضور کو اس ناخوشگوار واقعے کی اطلاع دینے والی تھی کہ آپ نے کنیز کو طلب کر لیا۔"

زہرہ جمال نے اپنی دانست میں ایک معقول بہانہ تراشا تھا مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ طاقتور بھیڑیئے اپنی زندگی گزارنے کیلئے بڑے پراسرار قوانین رکھتے ہیں۔

"ہمارے مخبروں نے ہمیں اسی رات اطلاع دیدی تھی کہ تو نصف شب کے قریب آفریدی کے گھر میں داخل ہوئی تھی اور پھر اندرون خانہ ایک طویل وقفہ گزارنے کے بعد تو نے اپنے مکان کا رخ اختیار کیا تھا۔" اس بار خلافِ معمول ملک کافور کی آواز سرد تھی' ایسی سرد جیسے کوئی اژدھا اپنے شکار کو قریب پا کر لذت و آسودگی کی سانسیں لے رہا ہو۔

اس انکشاف کے بعد زہرہ جمال اپنے اعصاب پر قابو نہ رکھ سکی۔ کچھ دیر کیلئے اسے ملک کافور اور اقتدار کے ہاتھوں کی درازی کا اندازہ نہیں رہا تھا بازی یقیناً مات ہو چکی تھی مگر درباری رقاصہ پھر بھی اس امید پر ملک کافور کے سامنے کھڑی تھی کہ شاید پنجۂ ستم سے نجات کا کوئی پہلو نکل آئے لیکن یہ اس کا خیالِ خام تھا۔ ذہین شاطر مردوں کی سرکشی کو کبھی معاف نہیں کرتے۔

زہرہ جمال نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ملک کافور کی طرف دیکھا پھر اس کی تمام خوش فہمیاں فنا ہو گئیں۔ ملک کافور کی آنکھوں میں وہی درندگی لوٹ آئی تھی۔

"یہ تیرا تیسرا جھوٹ ہے۔" ملک کافور کا لہجہ اچانک آتشیں ہو گیا تھا۔ "اصولاً ایک ہی جھوٹ پر انسان کو اس کی قوت گویائی سے محروم کر دینا چاہئے مگر ہم نے ایک کمزور عورت ہونے کی وجہ سے تجھے تین مواقع فراہم کئے۔ پھر بھی تیری فریب کاری کا یہ کمال ہے کہ تو ہر بار نئے زاویئے سے جھوٹ بولتی رہی اب تجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ تو اپنے منہ میں اتنی گندی زبان رکھ کر آزادانہ گھوم سکے۔ ہم نے تجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ اگر کہیں بھی زبان لڑکھڑائی تو پھر تیری سانسوں کا توازن برقرار نہ رہ سکے گا۔ ہمیں شک نہیں، یقین ہے کہ تو علی عامر کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے اور تو نے ہمارا منصوبہ اس پر ظاہر کر دیا ہے۔ زہرہ! تیری اس نادانی نے بڑی زہرناک فصل بوئی ہے جسے تو خود کاٹے گی اور تیرا محبوب بھی۔"

"حضور! میرے لئے سخت سے سخت سزا تجویز کر سکتے ہیں مگر میری زبان حکومت کے کسی راز کو فاش کرنے کی مجرم نہیں ہے۔" زہرہ کے لہجے میں وہی اعتماد تھا جو انسان کو خوفِ مرگ سے یکسر آزاد کر دیتا ہے۔

"ہم ابھی تیرے سچ اور جھوٹ کو پرکھ لیتے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی ملک کافور نے ان ستمگر جلادوں کو طلب کر لیا جو تشدد کے ذریعے جھوٹ اور سچ کی پہچان کراتے تھے۔

زہرہ جمال کو پتھر کے ایک ستون سے باندھ دیا گیا پھر اس کے شیشہ جسم پر مسلسل تازیانے برسائے گئے مگر زہرہ جمال کی زبان پر ایک ہی جملے کی تکرار تھی۔

"میری علی عامر آفریدی سے کوئی گفتگو نہیں ہوئی اور میں نے کوئی سرکاری راز فاش نہیں کیا ہے۔"

پھر جب زہرہ کا پورا جسم گلنار ہو گیا اور وہ بے ہوشی کے قریب پہنچ گئی تو ملک کافور نے ہاتھ کے اشارے سے جلادوں کو روک دیا۔ صیاد کے لئے ایک بے بال و پر چڑیا کا گلا گھونٹ دینا بہت آسان تھا مگر ملک کافور کچھ اور ہی سوچ رہا تھا صرف رقاصہ کی موت سے اسے تسکین حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ ملک کافور نے شاہی دربار میں زہرہ جمال کی زندگی سے بہت سود کمایا تھا اور اب وہ اس کی لاش سے بھی ایک بڑا نفع وصول کرنا چاہتا تھا۔

زہرہ کو آزاد کیا گیا تو وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ رہ سکی تھی ملک کافور نے خفیہ طور پر ایک شاہی طبیب کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ انسانوں کو شفاء بخشنے والا وہ شخص کچھ دیر تک اس خوبصورت لڑکی کو دیکھتا رہا جس کی سحر کار آنکھیں کسی بجھتے ہوئے چراغ کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ مسیحا کے دل میں ایک درد سا اٹھا مگر سر جھکا رہا کہ کہیں ملک کافور چہرے سے اس کے جذبات کا اندازہ نہ کر لے۔ شاہی طبیب زہرہ کے جسم سے بہتے ہوئے خون کو روکنے کی کوشش کرنے لگا پھر کہیں شام کے قریب وہ اپنی کوششوں میں اس حد تک کامیاب ہو سکا کہ رقاصہ آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش کی جابرانہ فضا کو دیکھ سکے اور اگر اس سے کوئی بات کی جائے تو وہ رک رک کر نحیف آواز میں جواب دے سکے۔

پھر جب رات کی تاریکی گہری ہو گئی تو ملک کافور نے زہرہ جمال کو بڑے رازدارانہ طریقے سے ایک پالکی میں ڈال کر اس کے گھر بھجوا دیا۔ زہرہ اس حالت میں گھر پہنچی تو وہاں ایک کہرام سا برپا ہو گیا۔ اندھی ماں اور چھوٹے بہن بھائی زہرہ کی بے کسی کا ماتم کرنا چاہتے تھے مگر زہرہ نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کرا دیا۔

"ظلم کے گنبد میں انسانی چیخ گونج تو سکتی ہے مگر باہر نہیں جا سکتی یہاں تک کہ وہ آواز خود ہی اپنا گلا گھونٹ لیتی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری زندگی میں تمہاری آوازیں گم ہو جائیں۔ خود غرضی اور ہوس کے میل سے پاک ان آوازوں کو سننے کیلئے میں نے وقت کی غلیظ ترین گالیاں سنی ہیں۔ ابھی تو میں جاگ رہی ہوں، ابھی خلوص و وفا کے ان نغموں کو نوحہ خوانی سے بچائے رکھو جب میں سو جاؤں تو.........." زہرہ جمال

اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

"پھر بھی میری بیٹی! کچھ تو بتا کہ یہ کیا ہوا ہے؟" اندھی ماں نے اپنی چیخوں پر پہرے بٹھا دیئے تھے مگر زبان نہیں کاٹی جا سکتی تھی۔

"کچھ نہیں ماں!" زہرہ جمال نے چھوٹے بہن بھائی کے نازک دلوں کو صدمات کے شعلوں سے بچانے کیلئے مطمئن لہجے میں کہا۔ "طوفان ضرور آیا تھا لیکن کسی تباہی کے بغیر گزر گیا۔"

ماں، بیٹی کے اشارے کو سمجھ گئی اس لئے وہ بچوں کی موجودگی میں زہرہ سے مزید کوئی سوال نہیں کر سکی۔ پھر جب رات گئے دونوں بچے سو گئے تو ماں نے اس راکھ کو پھر کریدا جس میں نہ جانے کتنی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں۔

زہرہ نے ماں کے سامنے ایک اور بہانہ تراش لیا۔ "وہ لوگ مجھے ایک ایسے امیر کی محفل میں رقص پر آمادہ کرنا چاہتے تھے جسے میں سخت ناپسند کرتی ہوں میں رقاصہ ہوں طوائف نہیں۔ بس میرے اس انکار پر ملک کافور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور پھر میرے پورے جسم کو زخموں سے سجا دیا گیا۔"

"تو نے سلطان سے اس درندے کی شکایت نہیں کی؟" ماں، اپنی بیٹی کے زخموں کا احساس کر کے تڑپ اٹھی۔

"آہستہ بولیے! فرشتوں کو درندہ کہنا ناقابل معافی جرم ہے۔" زہرہ جمال کی آواز لرز رہی تھی۔

"پھر بھی سلطان سے کچھ تو کہا ہوتا۔" زہرہ کی تنبیہہ کے بعد ماں کا لہجہ مدھم ہو گیا تھا۔

"سلطان سے کس طرح شکایت کرتی کہ وہ تو آج کل آسمان پر رہتے ہیں کبھی کبھی زمین پر اترتے ہیں تو صرف ملک کافور کے لئے ایسے میں میری کون سنتا۔" یہ کہتے کہتے زہرہ کے دونوں ہونٹ آپس میں پیوست ہو گئے اور چہرے پر اس تشنج کے آثار ابھر آئے جو انتہائی برداشت کے نتیجے میں نمایاں ہوتا ہے۔

"بیٹی! یہ ناانصافی کب تک ہوتی رہے گی؟" ماں کی بے نور آنکھیں بیٹی کی حالتِ زار پر آنسو بہا رہی تھیں۔

"جب تک قیامت نازل نہیں ہو جاتی۔" زہرہ کے ہونٹوں سے دھوئیں کی ایک لکیر الفاظ کی شکل میں برآمد ہوئی۔

"قیامت تو ابھی دور ہے۔" بوڑھی ماں کی آواز اتنی پست تھی جیسے اس کی گردن ظلم کے نادیدہ ہاتھوں کی گرفت میں ہو اور وہ ضعیفی کی باقی ماندہ قوتوں کو جمع کر کے بولنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"تو پھر آپ کی بیٹی کے ساتھ ہونے والا انصاف بھی دور ہے۔ قیامت نازل ہونے کی دعا کرتی رہیں کہ ہمارا انصاف بھی اسی دن سے وابستہ ہے۔"

"اس سے پہلے؟" اندھی ماں کی مایوسی ناقابل بیان تھی۔

"اس سے پہلے وہی کاروبار نشاط کہ پاؤں ٹھہرے تو کاٹ دیئے گئے، ساز تھمے تو توڑ دیئے گئے، جسموں کے گداز ختم ہوئے تو غلاموں کے حوالے کر دیئے گئے، آنکھوں میں عکسِ شکایت ابھرا تو بجھا دی گئیں، ہونٹوں پر حرفِ انکار آیا تو جلا دیئے گئے، متاع کوچہ و بازار کی حیثیت ہی کیا؟ خریداروں کی مرضی پر ہے کبھی شبستان، کبھی قبرستان۔" اب زہرہ جمال کے جذبات کا لاوا بھی آنکھوں کے راستے بہنے لگا تھا۔

"بس اب سو جاؤ ماں! شاید نیند ہم پر مہربان ہو جائے بہت دنوں سے کوئی خواب بھی نہیں آیا۔"

بوڑھی عورت زیرِ لب کچھ کہتی ہوئی چلی گئی۔

داغ داغ جسم کے باوجود زہرہ جمال کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ابھر آئی اس نے ملک کافور

سے زخم خرید کر آفریدی کی زندگی بچالی تھی اور خود بھی کسی نہ کسی طرح سازش کے آہنی حصار سے باہر نکل آئی تھی۔

☆..........................☆..........................☆

زہرہ جمال کی خوش گمانی تھی کہ ہلاکت و بربادی کا طوفان گزر چکا ہے ابھی مشکل سے ایک ہفتہ بھی نہ گزرا ہو گا کہ ایک رات اس کے مکان پر دستک ہوئی گھر کے تمام افراد جاگ چکے تھے مگر ایک نامعلوم سی دہشت کے سبب کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کوئی اٹھ کر دروازہ کھول دیتا یا دستک دینے والے سے پوچھ ہی لیتا کہ وہ کون ہے اور کس کام سے آیا ہے۔ دونوں بچے تو اسی روز سے ہر آہٹ پر لرز جاتے تھے جس دن سے انہوں نے اپنی بڑی بہن کو خون میں نہائے ہوئے دیکھا تھا۔ اندھی اور بوڑھی ماں ایک بلند حوصلہ عورت تھی مگر بیٹی کے زخم دیکھ کر وہ بھی اس قدر خوفزدہ ہو گئی تھی کہ اسے ہوا کی سنسناہٹ پر بھی فرشتۂ اجل کے پروں کی آواز کا گمان ہوتا تھا۔

دستک دوبارہ ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ایک گرجدار آواز سنائی دی۔ "ہم کوئی قزاق یا رہزن نہیں ہیں۔ دربار سلطانی سے رقاصہ زہرہ جمال کے لئے ایک حکم ہے جس پر فوری عملدر آمد چاہتے ہیں۔"

اس آواز کے ساتھ ہی زخموں سے شکستہ زہرہ جمال کراہتی ہوئی اٹھی اور پھر اس نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔

"میں حاضر ہوں۔" ایک لڑکی اپنی تمامتر مجبوریوں کے ساتھ بول رہی تھی۔

"ہمیں اندر آنے دو یہ ایک رازدارانہ حکم ہے جسے ہم دیواروں سے بھی چھپانا چاہتے ہیں۔" دوسری آواز ابھری جس کے جواب میں زہرہ نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔

پہلے ایک اجنبی شخص اندر داخل ہوا اور پھر اس کے پیچھے یکے بعد دیگرے کئی ناشناسا لوگ درباری رقاصہ کے مکان میں چلے آئے۔ مومی شمعوں کی روشنی جب آنے والوں کے چہروں پر پڑی تو زہرہ کو اندازہ ہوا کہ وہ شاہی فوج کے سپاہی تھے اور مکمل طور پر مسلح نظر آ رہے تھے۔

"میرے لئے کیا حکم ہے؟" زہرہ کی جان سلب ہوئی جا رہی تھی اس لئے وہ دروازے کے قریب ہی کھڑے سپاہیوں سے کہنے لگی۔

رقاصہ کے سوال کے جواب میں کسی سپاہی کے ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوئی وہ فوجی جو سب سے پہلے مکان میں اندر داخل ہوا تھا اس نے پلٹ کر اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھا اور عقبی حصے کی جانب آنکھ سے اشارہ کیا دوسرے ہی لمحے وہ سپاہی پلٹا اور اس نے دروازہ بند کر دیا اس دوران زہرہ کی اندھی ماں ٹھوکریں کھاتی ہوئی سپاہیوں کے قریب آ گئی۔ چھوٹی بہن اور بھائی بھی بستروں سے اٹھ گئے تھے مگر سہمے ہوئے دور کھڑے تھے۔

"زہرہ! یہ کیسا حکم ہے جس کی تعمیل کے لئے دن کی روشنی کا بھی انتظار نہیں کیا گیا۔" بینائی سے محروم ماں نے شدید عالم وحشت میں اپنے دونوں ہاتھوں کو ادھر ادھر حرکت دیتے ہوئے کہا۔

"یہ درباری سپاہی ہیں سلطان معظم کی طرف سے رقص کی کسی تقریب میں شرکت کا حکم دینے آئے ہیں۔"

"مگر تو کس طرح رقص کرے گی بیٹی؟" ماں نے زہرہ جمال سے کہا۔ "تو زخمی ہے جسم کی ایک جنبش سے سارے زخم پھر خون دے اٹھیں گے۔" بوڑھی عورت کی وحشت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

"آپ فکر مند نہ ہوں میں ٹھیک ہوں۔" زہرہ جمال نے ماں کو مطمئن کرتے ہوئے کہا مگر ایک

سپاہی کی تند و تیز آواز نے گھر کے ہر فرد کا اطمینان غارت کر دیا۔ وہ سفاکی کے بدترین لہجے میں بول رہا تھا۔

"اگر جسم کی ایک ایک شریان سے بھی خون کا دریا جاری ہو جائے تو حکم شاہی ٹل نہیں سکتا۔ تیری بیٹی رقص کرے گی لیکن رقصِ فنا۔"

"کیسی تقریب' کیسا رقص اور کیسی موت؟" یکایک زہرہ جمال کی ماں کا لہجہ ہذیانی ہو گیا تھا۔ "تم لوگ میری بیٹی کو کہاں لئے جا رہے ہو؟ اس یتیم بچی نے اپنے فن سے کئی سال تک تمہارے سلطان اور اس کے درباریوں کے جذبوں کو آسودہ کیا' ان کی آنکھوں کو کیف و نشاط کے خوش رنگ مناظر فراہم کئے اور اب تم اس سے رقصِ فنا کرانا چاہتے ہو؟ آخر کیوں؟ میری بیٹی کی خدمات کا اس قدر وحشیانہ صلہ؟ اس نے کیا گناہ کیا ہے؟" ایک جوان بیٹی کی مجبور و نابینا ماں گریہ وزاری کر رہی تھی۔

"اپنی آواز کو سینے میں گھونٹ دے کہ ایسی فریادیں مزاج شاہی پر بہت گراں گزرتی ہیں۔" ایک سپاہی نے چیختے ہوئے کہا۔ "تیری بیٹی ایک شاہی راز کو فاش کرنے کی مجرم ہے اور آئینِ سلطانی میں ایسے لوگ زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتے۔"

"کیسا راز؟ کیسا جرم؟" بوڑھی عورت بھی خوف و دہشت سے چیخنے لگی مگر دوسرے ہی لمحے ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کا منہ بند کر دیا۔ "اگر تیری آواز گھر کی چار دیواری سے باہر نکلی تو پھر ہم تیری زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتے۔"

بوڑھی عورت لرزتی رہی اشک بہتے رہے' بے نور آنکھیں بار بار آسمان کی طرف اٹھتی رہیں مگر ہونٹوں کو جنبش نہ ہو سکی۔

جب کمرے کا سناٹا گہرا ہو گیا تو دوسرے سپاہی کی آواز ابھری وہ زہرہ جمال سے مخاطب تھا۔ "جو کچھ تجھ سے کہا جا رہا ہے اسے حرف بہ حرف اس کاغذ پر تحریر کر دے۔" یہ کہہ کر سپاہی نے زہرہ جمال کی طرف ایک سادہ کاغذ' قلم اور دوات بڑھا دیئے۔

صورت حال اس قدر حیران کن تھی کہ زہرہ جمال کا ذہن مفلوج سا ہو گیا تھا اور وہ سر سے پاؤں تک پتھر بن گئی تھی۔ جب ایک سپاہی نے اس پتھر پر ٹھوکر ماری تو زہرہ جمال کو ہوش آیا۔ سپاہی کے ہاتھ کی ضرب نے اسے مکان کے فرش پر گرا دیا۔ "جلدی کر کہ ہمارا وقت بہت زیادہ قیمتی ہے۔" زہرہ جمال زخمی کہنیوں کے سہارے سیدھی ہوئی اور اس نے کانپتے ہاتھوں سے کاغذ لے لیا اور موت کے نقیبوں کی طرف دیکھنے لگی۔

"اس پر یہ تحریر لکھ دے کہ علی عامر آفریدی نے میری بے آبروئی کی میں اس کی جارحیت کی داستان سنا کر سلطان معظم سے انصاف چاہتی تھی مگر وہ اتنا با اثر تھا کہ شاہ والا تک میری رسائی نہ ہو سکی ایک عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن بے عزت ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ آفریدی مجھے اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول کر کے جائز حقوق دیدے مگر وہ ایک سنگدل اور بے کردار انسان ہے۔ آخر تمام راستے بند پا کر میں اور میرے گھر والے اس راہ پر جا رہے ہیں جس کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ دیر بعد میں' میری اندھی ماں' چھوٹی بہن اور بھائی زہر پی کر ظالموں کی اس بستی سے دور چلے جائیں گے۔ پھر سرِ محشر میرے ہاتھ میں سلطان معظم کا گریبان ہو گا وہاں میرے ساتھ ناانصافی نہیں ہو گی۔ میرا خدا ان سب لوگوں سے جو اس ظلم میں شریک رہے ہیں' ایک ایک ذرے کا حساب لے لے گا۔"

سلطان علاء الدین خلجی کے دربار کی ادنیٰ رقاصہ۔ زہرہ جمال۔

پورے کمرے پر سکوتِ مرگ طاری تھا اگرچہ زہرہ جمال کے لئے زندگی ایک غلیظ تہمت تھی لیکن وہ پھر

بھی اندھی ماں اور معصوم بہن بھائی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی خوشیاں جمع کر کے زندہ رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ زہرہ کو زندگی کے محاذ پر شکست فاش ہوئی تھی مگر وہ سر دربار ناچنے کو بھی ایک جنگ سمجھتی تھی اور یہ جنگ ان معصوم بچوں کے لئے لڑی جا رہی تھی جو مستقبل کے امین تھے۔ زہرہ نے زندگی کے کثیف اندھیروں میں بھی عہد کیا تھا کہ وہ چھوٹے بہن بھائی کے لئے ہر قیمت پر روشنی خریدے گی پھر وہ زندگی کے دونوں کمسن مسافروں کو اس منزل کا پتا دے گی جوان کے بزرگوں کی منزل تھی مگر ملک کافور نے اس کی آنکھوں سے یہ خواب بھی چھین لئے تھے۔

جب سپاہی کی زبان سے آخری لفظ ادا ہوا تو بوڑھی ماں اس صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے دل پکڑ کر زمین پر گر گئی۔ دونوں بچے اپنی ماں کی یہ حالت زار دیکھ کر رونے لگے مگر سپاہیوں کی شعلہ بار آنکھوں نے ان کی چیخوں کو بھی ان کے سینوں ہی میں قتل کر دیا۔ اب وہ زرد چہروں اور پھیلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کبھی اپنی بڑی بہن کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی اس ضعیف ماں کی طرف جو دل کے درد سے تڑپ رہی تھی۔ جب ان کی پتھرائی ہوئی آنکھیں ان دو نقطوں سے ہٹ کر درباری سپاہیوں کی جانب اٹھتیں تو وہ ماں اور بہن کی تکلیف بھول جاتے اور بے نیام شمشیروں کی طرف دیکھنے لگتے جن کی آب و تاب میں خون کی موجیں اور موت کے اندھیرے پوشیدہ تھے۔

بالآخر شدید ذہنی اذیت کے بعد زہرہ جمال نے سادے کاغذ پر تحریر منتقل کر دی جسے ملک کافور کے عیار ذہن نے تخلیق کیا تھا۔

جب درباری رقاصہ اپنے اور اہل خانہ کے قتل نامے پر دستخط کر چکی تو ایک سپاہی نے فوجی پیرہن کی جیب سے زہر کی شیشی نکالی پھر حکم کے دوسرے غلام نے چار برتنوں میں پانی بھرا اور ان میں زہر کے چند قطرے شامل کر دیئے۔ سپاہی زہر آلود پانی کی ابتداء زہرہ جمال کے چھوٹے بہن بھائی سے کرنا چاہتے تھے مگر رقاصہ کی دردناک آواز نے انہیں اس ارادے سے باز رکھا۔

"یہ دونوں میرے بچوں کی طرح ہیں اور ایک محبت کرنے والی ماں اپنی سانسوں کی موجودگی میں بچوں کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی' پہلے یہ زہر مجھے دو میں کھلی آنکھوں سے اپنے بہن بھائی کے رگ و پے میں یہ قاتل سیال اترتے ہوئے کس طرح دیکھ سکوں گی۔ جب میری آنکھیں بند ہو جائیں تو ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کرنا کم سے کم مرتے وقت مجھے اذیت تو نہ دو کہ میری وجہ سے تین بے گناہ ہستیاں نذر اجل ہو گئیں۔" شاید ملک کافور کے سپاہیوں کے نزدیک یہ رحم کی بڑی علامت تھی کہ انہوں نے زہرہ جمال کی درخواست قبول کر لی۔ پھر شاہی دربار میں ناچنے والی ایک خوبصورت لڑکی اپنے ہاتھوں سے زہر پینے پر مجبور ہو گئی۔ زہرہ جمال نے دل و جگر کے ٹکڑے ہوتے ہوئے' اپنی ماں اور بہن بھائی پر الوداعی نگاہ کی اور دنیا سے اس طرح چلی گئی کہ زمین و آسمان اس کی آرزوؤں کے خون سے سرخ ہو گئے تھے۔ زہرہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس گھر کے تین افراد نے بھی زہر آلود پانی سے اپنے ہونٹ اور حلق تر کر لئے۔ انجام آشیاں بہت مختصر تھا۔ برقِ اجل چند لمحوں کے لئے لہرائی اور چھوٹے سے گلشن میں ہر طرف ہلاکت کا گہرا دھواں پھیل گیا۔

ملک کافور کا مسلح دستہ اس محاذ سے کامیاب و کامران لوٹا جہاں مزاحمت کرنے والی تین بے دست و پا عورتیں تھیں اور ایک دس گیارہ سالہ معصوم لڑکا۔ جب سپاہیوں نے زہرہ جمال کی تحریر ملک کافور کے حوالے کی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی شکست خوردہ شہنشاہ نے اپنی تمام جاگیروں کی دستاویز اس کے سپرد کر دی ہو۔

سلطان علاء الدین خلجی کے محبوب غلام نے درباری رقاصہ کی تحریر پڑھی اور مسموم قہقہہ فضاؤں میں ارتعاش پیدا کرنے لگا۔ پھر ملک کافور کی نفرتوں میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

"بدنصیب آفریدی! تو کہاں تک بھاگے گا؟ میں تیرے تعاقب میں آ رہا ہوں۔"

☆..................☆..................☆

علی عامر تیز رفتاری کے ساتھ چتوڑ کی طرف بڑھ رہا تھا وہ ذاتی طور پر اس سفارت سے خوش نہیں تھا کہ اس سفارت نے سازشوں اور ہنگاموں کے سلسلے کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ تمام راستے اپنی ماں' بہن کے ساتھ رقاصہ زہرہ جمال کے بارے میں بھی سوچتا رہا۔ اسے رقاصہ کے کردار نے بہت زیادہ متاثر کیا تھا مگر اسی تاثر کے عقب سے ملک کافور کی خباثتیں بھی ابھر رہی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ آفریدی سفر کے دوران پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنی والدہ شائستہ بیگم اور بہن عالیہ آفریدی کی طرف سے تو مطمئن ہو چکا تھا مگر اسے زہرہ جمال کی طرف سے شدید فکر لاحق ہو گئی تھی۔

"خدا جانے اپنے منصوبے کو ناکام دیکھ کر ملک کافور پر کیا گزری ہوگی اور پھر اس نے زہرہ جمال کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا؟" آفریدی کے ذہن میں بے شمار اندیشے ابھر رہے تھے اور وہ گھوڑے کی پشت پر ہی زہرہ کے بارے میں مسلسل دعائیں مانگ رہا تھا۔

"خدایا! اس مجبور لڑکی کی حفاظت کر' جو تیرے گناہ گار بندے آفریدی کی غم گسار ہے۔ اگر وہ چاہتی تو شاہی اعزاز کے ساتھ سیم و زر کا ذخیرہ قبول کر لیتی اور میرے چہرے پر ایسی سیاہی مل دیتی جسے اس دنیا میں کوئی صاف کرنے والا نہیں تھا۔ اس نے میرے لباس کو بے داغ رکھا تو بھی اسے ملک کافور کی دست درازیوں سے محفوظ رکھ وہ جو میری خاطر جلائے جا رہے ہیں۔ انہیں آتش انتقام سے بچا اور جو میرے لئے اپنے سینے میں درد رکھتے ہیں ان کی مشکلوں کو آسان کر دے تیرے سوا آفریدی کا کون ہے۔ وہ تو پہچانا ہی تیرے کرم سے جاتا ہے۔" آفریدی' رقاصہ زہرہ جمال کے لئے دل کی گہرائیوں سے دعائیں کر رہا تھا' اور وہ بدنصیب رقاصہ اپنے گھر والوں کے ساتھ قبر میں اتاری جا چکی تھی۔ درباری ضمیر فروشوں کی نظر میں زہرہ اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ چکی تھی اور کسی کو یہ خبر تک نہ ہو سکی کہ ایک ناچنے والی نے اپنی جان دے کر سلطنت خلجی کے ایک وفاپرست سپہ سالار کو ذلت و رسوائی کے تاریک غار سے باہر کھینچ لیا تھا اور وہی سپہ سالار اب علاء الدین خلجی کی زندگی کے نازک ترین مسئلے کا حل تلاش کرنے کیلئے چتوڑ کی طرف گامزن تھا۔

آفریدی کے ذہن میں مختلف وسوسے اور اندیشے پرورش پا رہے تھے مگر یہ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ زہرہ جمال دردناک موت سے دوچار ہو چکی ہے اور اب وہی موت اپنے خونی پنجے کھولے ہوئے اس کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

بے عیب وفاداریوں اور داغدار سازشوں کا سفر جاری رہا۔

ابھی رات بہت زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی پھر بھی فضائیں اس قدر دھندلی ہو چلی تھیں کہ قریب کی چیزوں کو بھی ان کے اصلی نقش و نگار کے ساتھ پہچاننا دشوار ہو گیا تھا۔ آفریدی گھوڑے کی پشت سے اتر کر رات بسر کرنے کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش کر رہا تھا کہ اچانک اسے اپنے عقب میں بیک وقت کئی گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔

آفریدی نے اچانک منہ اس طرف پھیر لیا جدھر سے گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں پشت سے کسی دشمن کا نمودار ہونا ایک خوفناک علامت ہوتی ہے اس لئے آفریدی نے دشمنوں کو اپنی نگاہوں

کے سامنے رکھا اور الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا یہاں تک کہ برگد کے ایک بوڑھے درخت کی زمین پر لٹکتی ہوئی شاخیں اس کے جسم کو چھونے لگیں آفریدی کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی اس کے لئے یہ بوڑھا برگد ایک محفوظ خندق ثابت ہو رہا تھا۔

انتظار ختم ہوا اور دیر تک سنائی دینے والی آوازیں آفریدی کے قریب آ کر گم ہو گئیں۔ افغان زادے نے آنے والوں کو دیکھا وہ پندرہ بیس کے قریب مسلح شہسوار تھے مگر سب کے چہرے نقابوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔

"تم لوگ کون ہو ؟" آفریدی کی آواز میں زلزلے کی سی دھمک تھی۔" یہاں کیوں آئے ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو ؟" آفریدی نے آنے والوں سے پوچھا اور آہستہ آہستہ برگد کے گھنے درخت کے قریب ہوتا چلا گیا۔

"ہم ان بھیانک جنگلوں کے حکمراں ہیں۔ رات کی تاریکیوں پر ہماری حکومت ہے اور ہم ادھر آنے جانے والوں سے ان کے جان و مال کا خراج وصول کرتے ہیں۔" ایک نقاب پوش شہسوار نے بھاری لہجے میں کہا۔ اس کے بولنے کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ آواز بگاڑ کر مصنوعی لہجے میں گفتگو کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

آفریدی ایک لمحے کے لئے چونک اٹھا بولنے والے کا لہجہ ضرور بگڑا ہوا تھا مگر اس کی گفتگو میں وہ روانی تھی جو قزاقوں اور رہزنوں کے معیار کلام سے بہت بلند تھی۔ یہ مقامی لوگوں کی زبان نہیں تھی اس خیال نے آفریدی کو حیرت میں ڈال دیا تھا مگر صورت حال کی سنگینی نے اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم لٹیرے ہو۔" علی عامر آفریدی کسی جھجک اور گھبراہٹ کے بغیر آنے والوں سے مخاطب تھا۔

"لیٹرے نہیں۔" دوسرے نقاب پوش کی آواز نفرتوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔" ہم فرمانروائے شب ہیں۔ اندھیروں کے شہنشاہ۔"

پھر جیسے ہی اس شخص کے الفاظ کی بازگشت ختم ہوئی تمام نقاب پوش اپنے گھوڑوں سے نیچے اتر آئے۔ ان سب کی شمشیریں بے نیام تھیں وہ تعداد میں اپنے دشمن سے زیادہ تھے اس لئے بڑے غرور و تکبر کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے۔ علی عامر آفریدی بھی اپنی جنگی حکمت عملی کے مطابق پیچھے ہٹتا رہا اور پھر وہ برگد کی پھیلی ہوئی شاخوں کے درمیان سے گزر کر بوڑھے درخت کے تنے سے جا لگا برگد کا تنا اس قدر طویل و عریض تھا کہ اس کی آڑ میں آٹھ دس آدمی اطمینان سے چھپ سکتے تھے۔

پھر جب ملک کافور کے سپاہی بیک وقت آفریدی پر حملہ آور ہوئے تو ان کی شمشیریں درخت کی شاخوں سے الجھ گئیں۔ آفریدی نے اس رعایت سے فائدہ اٹھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے تین چار سپاہیوں کو قتل کر دیا۔ آفریدی، سلطان علاءالدین خلجی کے ماہر شمشیرزنوں میں نمایاں مقام رکھتا تھا اس نے بارہا ایسے مناظر پیش کئے تھے کہ اس کی تلوار دشمن کے جسم سے گزر گئی اور دشمن قتل ہونے کے باوجود اپنے پیروں پر کھڑا رہا۔ دوسرے سپاہی سمجھے کہ وہ زندہ ہے مگر جب اسے ہاتھ لگایا گیا تو مقتول کا جسم دو حصوں میں تقسیم ہو کر زمین پر گر گیا۔ چتوڑ کے گھنے جنگل میں بھی آفریدی نے اپنے اسی فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ دشمنوں کی تلواریں درخت کی شاخوں میں الجھ گئیں اور آفریدی کی شمشیر اس طرح ان کا کام تمام کر گئی کہ دوسرے لٹیروں کو پتہ بھی نہیں چلا کہ ان کے کئی ساتھی زندگی کے قافلے سے ہمیشہ کیلئے بچھڑ گئے ہیں۔

ملک کافور کے سپاہیوں نے دوسری یلغار کی۔ آفریدی برق رفتاری کے انداز میں اپنے دائیں جانب پیچھے کی طرف ہٹ گیا دشمنوں کی بیشتر تلواریں برگد کے درخت میں پیوست ہو گئیں۔ آفریدی فوراً ہی درخت کی اوٹ سے نکلا اور اس بار بھی اس کی شمشیر نے تین چار دشمنوں کے سر قلم کر دیئے۔ مخالفین کی تقریباً نصف قوت تباہ ہو چکی تھی مگر اس دوران حملہ آور آفریدی کے منصوبے کو سمجھ چکے تھے اس لئے ایک سپاہی نے چیخ کر کہا۔

"درخت کو چاروں طرف سے گھیر لو اگر ایسا نہیں کیا تو تم سب کے سب مارے جاؤ گے۔"

دشمنوں کا یہ ایک بہتر منصوبہ تھا مگر آفریدی ذرا بھی ہراساں نہیں ہوا اس نے اپنی پشت برگد کے درخت سے لگا دی اور حملہ آوروں کے سامنے آنے کا انتظار کرنے لگا ملک کافور کے سپاہی درخت کو گھیرے میں لینے کے لئے آگے بڑھے مگر اس کا تنا اتنا چوڑا تھا کہ آفریدی کی پشت پر وار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نتیجتاً گھیرا ڈالنے والے سارے سپاہی ایک ایک کر کے سامنے آ گئے پھر نا گہاں گیارہ بارہ تلواریں فضا میں بلند ہوئیں اس سے پہلے کہ وہ تلواریں اپنے شکار پر جھپٹتیں آفریدی کا وہی مخصوص ہنر کام آیا۔ دو سپاہی اپنی جگہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور آفریدی کی تلوار ان کے جسموں سے گزر کر فضا میں لہرانے لگی۔ اب صورت حال بدل گئی تھی تمام دشمن ایک ہی وقت میں حملہ کر کے آفریدی کا قصہ پاک کر دینا چاہتے تھے اس لئے ساری تلواریں اس تنہا شخص کی طرف لپکنے لگیں جو اپنی پشت کی جانب درخت کو ڈھال بنائے ہوئے ایک محدود دائرے میں جنگ کر رہا تھا۔ یہ حکمت عملی آفریدی کے لئے مفید بھی تھی اور نقصان دہ بھی۔ مفید اس لئے کہ درخت کی آڑ لے کر وہ عقبی حملے سے محفوظ ہو چکا تھا مگر اس طریق کار میں نقصان کا پہلو یہ تھا کہ آفریدی چند گز کے ایک حلقے میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ حملہ آور کثرت تعداد کے سبب پھیلے ہوئے تھے۔ آفریدی سامنے کے وار کو اپنی سپر پر روک رہا تھا لیکن دائیں اور بائیں ہاتھ کے حملوں کو روکنا اتنا آسان نہیں تھا اس کے دونوں ہاتھ برق کی مانند گردش کر رہے تھے مگر پھر بھی دشمنوں کی کوئی نہ کوئی تلوار اس کے جسم کو چھو لیتی اور زخم کا منہ کھل جاتا۔ یہ لڑائی دیر تک جاری رہی اس دوران آفریدی نے زخمی ہوتے ہوئے بھی مزید چار پانچ سپاہیوں کو موت کے دہانے تک پہنچا دیا تھا لیکن ابھی اتنے ہی دشمن اور باقی تھے جو آفریدی پر غالب آتے جا رہے تھے۔

زخمی سپاہیوں کی چیخوں اور شمشیروں کی جھنکار نے رات کے سناٹے کا جگر چاک کر کے فضا میں عجیب سا شور پیدا کر دیا تھا۔ اسی شور کے سبب درختوں پر سوئے ہوئے پرندے بیدار ہو گئے تھے پھر جب پرندے اپنے آشیانوں سے چیختے ہوئے اڑے تو جنگل کی فضا اور بھی ہیبت ناک ہو گئی جس درخت کے نیچے جنگ ہو رہی تھی وہ بے شمار گدھوں کا مسکن تھا۔ گدھوں کے پروں کی تیز سرسراہٹ اور پرہول آوازوں نے مزید دہشت پھیلا دی تھی اس اچانک افتاد سے حملہ آوروں کے گھوڑے بھی فرار ہو گئے اور ملک کافور کے سپاہیوں کی یکسوئی بھی متاثر ہوئی۔ ان کے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے ہاتھ چند لمحوں کے لئے رک گئے تھے کچھ ساعتوں کی اس مہلت نے آفریدی کو بھی اپنے دفاع کے لئے ایک موقع فراہم کر دیا تھا۔ دشمن ذرا جھجکا تو آفریدی کی تلوار نے دو سپاہیوں کی زندگی کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب مخالفین کی تعداد تین تک محدود ہو گئی تھی۔ آفریدی کے لئے انہیں ٹھکانے لگا دینا زیادہ آسان تھا مگر شدید زخمی ہونے اور بہت دیر تک مصروف جنگ رہنے کی وجہ سے اس کے بازو شل ہوتے جا رہے تھے اور فضا دشمنوں کے حق میں سازگار نظر آنے لگی تھی۔

خود آفریدی کو بھی یہ یقین ہو چلا تھا کہ اب دشمن اس کے جسم پر غالب آ جائیں گے لیکن اچانک بساط الٹ

گئی۔ آفریدی کا ذہین اور وفادار گھوڑا جو قریب ہی کھڑا اس کشمکش کو دیکھ رہا تھا موقع ملتے ہی عقب سے دشمنوں پر جھپٹ پڑا اور اس کی اگلی دونوں ٹاپیں ایک دشمن کے سر پر پڑیں تو وہ غیر متوازن ہو کر سامنے کی جانب گرتا چلا گیا۔ آفریدی نے اس تائید غیبی سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی شمشیر دشمن سپاہی کے شکم میں اتار دی۔ یہ آفریدی کی اضطراری غلطی تھی وہ اپنی تلوار کھینچنے بھی نہیں پایا تھا کہ دوسرے دشمن نے وار کیا۔ آفریدی نے حیرت انگیز عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ڈھال آگے بڑھائی مگر تلوار پھسلتی ہوئی آفریدی کے سر تک پہنچ گئی اگرچہ ڈھال نے وار کی طاقت کو کمزور بنا دیا تھا لیکن پھر بھی آفریدی کے سر پر گہرا زخم آیا۔ چند لمحوں کیلئے افغان زادے کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا مگر گھوڑے کی بروقت مداخلت نے اس دشمن سپاہی کو بھی زمین بوس ہو جانے پر مجبور کر دیا اتنی دیر میں آفریدی سنبھل چکا تھا اب اس کا صرف ایک مدمقابل باقی تھا۔ آفریدی اپنی تمام قوت ارادی کو سمیٹ کر آگے بڑھا۔ زمین پر گرے ہوئے سپاہی نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن آفریدی کا گھوڑا پوری طرح مستعد تھا۔ اس نے دو ٹھوکروں میں سپاہی کا سر کچل دیا اور وہ پھر آخری دشمن کی طرف پلٹا اب کی بار دشمن کا سینہ گھوڑے کی ٹاپوں کا ہدف تھا۔ ملک کافور کا آخری غلام پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ آفریدی اسے ختم کرنے کیلئے اپنی شمشیر کو استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن گھوڑے نے اپنے زخمی آقا کو اس زحمت سے بچا لیا اور دشمن کو اس طرح روند ڈالا کہ اس کے سینے کی ہڈیاں تک چٹخنے لگیں۔

معرکہ آفریدی کے سر رہا تھا۔ اس نے نمناک آنکھوں کے ساتھ اس جانور کی گردن پر اپنا سر رکھ دیا جو عزیزوں سے بڑھ کر غمگسار اور انسانوں سے زیادہ وفادار تھا۔ ابھی آفریدی سر ٹیکے کھڑا تھا کہ اسے کچھ فاصلے سے ایک گھوڑے کے دوڑنے کی آواز آئی آفریدی نے گھبرا کر دیکھا ایک انسانی ہیولا گھوڑے پر سوار بھاگا چلا جا رہا تھا۔

"کم نسل' بے اعتباروں کی اولاد' غلام زادہ اپنی جان سلامت لے گیا۔" علی عامر آفریدی اس قدر زور سے چیخا کہ دور تک جنگل کی ساکت فضا گونج اٹھی۔ اس نے اپنا سارا غصہ فرار ہونے والے سپاہی پر اتار دیا تھا اور سینے میں دبی ہوئی تمام نفرتیں خاموش درختوں کو منتقل کر دی تھیں۔ یہ وہی سپاہی تھا جو پہلا زخم کھا کر اپنے ساتھیوں کی صف سے الگ ہو گیا تھا اور دور کھڑا ہوا اس خونریز ہنگامے کو دیکھ رہا تھا پھر جب تقدیر نے آفریدی کے حق میں فیصلہ دے دیا تو وہ اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ کھڑا ہوا۔

آفریدی نے پلٹ کر ان سپاہیوں کی طرف دیکھا جن میں سے بیشتر موت کی خوراک بن چکے تھے۔ باقی سسک رہے تھے اور دو چار گھڑی کے مہمان تھے۔ آفریدی نے یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ اب کوئی دشمن اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں ہے اپنے زخموں کی طرف دیکھا ویسے تو پورے جسم پر ہی ہلکے ہلکے زخموں کی لالہ کاری تھی مگر سر کا زخم زیادہ گہرا تھا جس سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ آفریدی نے خون روکنے کے لئے اپنی دستار کھولی اور اسے دوبارہ اپنے زخم کے گرد لپیٹ لیا پھر کچھ دیر تک وہ ذہنی کشمکش کا شکار رہا اجنبی علاقے میں رات کا سفر مشکل ترین کام تھا مگر کسی درخت کے سائے میں ٹھہر جانا اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ آفریدی سوچنے لگا کہ اگر ساری رات خون اسی طرح بہتا رہا تو وہ صبح تک جنبش کرنے کے بھی قابل نہیں رہے گا۔ اس خیال نے افغان زادے کو سفر جاری رکھنے کے لئے مجبور کر دیا۔

پھر کسی نہ کسی طرح وہ لمحہ بھی آ گیا جب آفریدی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اسے درختوں کی اوٹ سے مشرقی افق پر ہلکی ہلکی روشنی نظر آنے لگی تھی اور صبح کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ آفریدی نے گھوڑے کی رفتار کسی قدر تیز کر دی۔ اب گزرنے والی ہر ساعت اس کے لئے خطرے کا پیغام لے کر آ رہی تھی۔

زیادہ خون بہہ جانے سے نقاہت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ آفریدی کا سر چکرانے لگا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ گھوڑے کی پشت سے گر کر مزید زخمی نہ ہو جائے اس لئے لگام پر آفریدی کے ہاتھوں کی گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔

یہی وہ لمحات تھے جب علی عامر نے دل ہی دل میں اپنے خدا کو پکارا تھا۔ "اے بے پناہ اور لازوال قدرت والے! اپنے عاجز و ناتواں بندے آفریدی کو اتنی ہمت دے کہ وہ چتوڑ پہنچ کر سفارت کی پہاڑ جیسی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو سکے۔"

آفریدی کی دعا قبول ہوئی مگر اس طرح کہ جب وہ تاریک جنگل کی حدود سے باہر نکلا تو صبح ہو چکی تھی اور سامنے چتوڑ کی سرحدوں کے محافظ دستے ادھر ادھر گردش کرتے نظر آ رہے تھے۔

علی عامر نے گھوڑے کو ایڑ دی سبک رفتار گھوڑا آگے بڑھا لیکن اس کے ساتھ ہی آفریدی کی آنکھوں کے سامنے گہرا اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ پلکیں اور کچھ دیر کھلی رہیں مگر کثرت سے خون بہہ جانے کے باعث اب کمزوری آفریدی پر مکمل غلبہ پا چکی تھی۔ آفریدی کے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام چھوٹ گئی اور وہ لہرا کر زمین پر گر پڑا یہ بھی ایک خوفناک حادثہ تھا مگر ٹل گیا۔ آفریدی کے پاؤں رکابوں میں الجھے ہوئے نہیں رہ گئے تھے ورنہ برق رفتار گھوڑا نادانستگی میں اسے کھینچتا ہوا دور تک لے جاتا پھر جب گھوڑے نے پشت پر اپنے آقا کا وزن محسوس نہیں کیا تو وہ کچھ دور جا کر ٹھہرا اور پھر آفریدی کی جانب پلٹ پڑا۔

چتوڑ کے سرحدی محافظوں نے بھی ایک اجنبی شہسوار کو گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لئے بیک وقت کئی راجپوت سپاہی آفریدی کی طرف دوڑ پڑے۔

"اجنبی! تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟" ایک راجپوت سپاہی آفریدی پر جھکا ہوا کرخت لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"آفریدی نے اس کی آواز سنی۔ ابھی کچھ ہوش باقی تھا وہ آنکھیں تو نہیں کھول سکا مگر اس کے ہونٹ جنبش کر رہے تھے۔

"میں.......... سلطان علاءالدین.......... خلجی کا.......... سفیر.......... ہوں۔" علی عامر آفریدی رک رک کر بول رہا تھا۔

"مجھے.......... رانی پدمنی.......... کے حضور.......... لے چلو.........." اتنا کہہ کر آفریدی بے ہوش گیا۔

☆..........☆..........☆

پھر جب آفریدی کی آنکھ کھلی تو وہ ایک آراستہ کمرے میں نرم اور ریشمی بستر پر دراز تھا۔ آفریدی نے حیرت سے کمرے کی فضا کو دیکھا اور فوراً ہی اندازہ کر لیا کہ اسے قلعہ چتوڑ کے کسی آرام دہ گوشے میں پہنچا دیا گیا ہے' اس نے اپنے زخمی جسم پر نظر ڈالی۔ پورا جسم سفید پٹیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس علامت کا واضح مفہوم تھا کہ دشمن ریاست کے حاکموں نے کسی تاخیر کے بغیر رسم مسیحائی ادا کی ہے۔ اب وہ اپنے زخموں کی خلش میں کمی محسوس کر رہا تھا اور نسبتاً اس کی طبیعت میں بہتری کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔

"آفریدی کی نگاہیں کمرے کے ماحول کا جائزہ لینے لگیں' عجیب سی فضا تھی۔ کمرے کا سامان بہت زیادہ قیمتی تھا اور ہر چیز سے شاہانہ وقار کا اظہار ہو رہا تھا۔ تمام دیواریں بڑی تصویروں سے سجائی گئی تھیں۔ یہ تصویریں راجپوتوں کی خاص فطرت کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ آفریدی کے بالکل مقابل والی دیوار پر جو

تصویر بنائی گئی تھی چتوڑ کی حکمراں قوم کے جذبوں کی عکاسی کرتی تھی۔ تصویر میں ایک دراز قامت شیر کو دکھایا گیا تھا جس کی زبان باہر تھی اور اس سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ شیر فضا میں معلق تھا اور مصور نے اس کے پیروں کے نیچے کچھ جنگلی جانور زمین پر پڑے ہوئے دکھائے تھے اور بہت سے دہشت زدہ انداز میں بھاگتے ہوئے نظر آتے تھے۔ شیر پر ایک شمشیرزن سوار تھا وہ اپنی شکل وصورت اور لباس سے کوئی راجپوت نظر آرہا تھا۔ آفریدی بہت دیر تک اس تصویر کو دیکھتا رہا جو اقتدار اور جبروتشدد کا بھیانک نقشہ پیش کررہی تھی۔

آفریدی کی نظریں اپنی دائیں جانب اس تصویر پر بھی پڑیں جس میں جانوروں کی جگہ انسانوں کے چہرے استعمال کیے گئے تھے۔ اس تصویر کے حجم نے بھی طویل وعریض دیوار کو گھیر لیا تھا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک مصور نے رنگوں کی عجیب گل کاریاں کی تھیں۔ مصور کے فن کا کمال یہ تھا کہ ہر شے متحرک اور چہرہ بولتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس تصویر میں ایک دراز قامت راجپوت کو شمشیر بکف دکھایا گیا تھا۔ وہ تانبے جیسی رنگت رکھنے والا راجپوت اپنی گھنی مونچھوں کے ساتھ جارحانہ انداز میں ہنستا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی جس سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور دوسرے ہاتھ میں کٹے ہوئے انسانی سر تھے۔ پھر جب آفریدی کی نظریں تصویر کے نچلے حصے کی طرف گئیں تو وہاں کچھ اور ہی حشر برپا تھا۔ بے شمار انسان اس راجپوت کے قدموں سے لپٹے ہوئے تھے۔ ان آدم زادوں کی یہ حالت تھی کہ جسموں پر کپڑے تک نہ تھے۔ چہرے سیاہ فام تھے اور بدن اتنے لاغر کہ جیسے فاقہ کشی کی زندگی بسر کررہے ہوں۔ یہ چتوڑ اور دیگر راجپوت ریاستوں میں بسنے والے اچھوت تھے۔ جن کی پسماندگی اور غلامی کو تصویروں کے ذریعے ظاہر کیا گیا تھا۔ محل کی دیواروں پر ان تصویروں کے آویزاں کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس ملک میں راجپوتوں کے سوا حکمرانی کا حق کسی اور قوم کو حاصل نہیں۔ برہمنوں کے علاوہ جتنی بھی اقوام ہیں وہ راجپوتوں کے نزدیک ازلی غلام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ علی عامر آفریدی نے چند لمحوں میں اندازہ کرلیا کہ چتوڑ کا حکمراں طبقہ غرور وتکبر کے نشے میں انتہائی حدوں تک پہنچ چکا ہے اور یہی غرور انہیں ایک دن خاک میں ملا کر سلطان علاءالدین خلجی کے لئے راستہ ہموار کردے گا۔

ابھی آفریدی اپنے خیالات میں گم تھا کہ اس کے سامنے کا دروازہ کھلا اور ایک دراز قامت شخص اندر داخل ہوا وہ بھی راجپوت تھا۔ آنے والے کی عمر جوانی کی حدوں سے گزر چکی تھی مگر اس کی صحت وجسامت قابل رشک تھی۔ اس کا قیمتی لباس ظاہر کررہا تھا کہ وہ ریاست کا کوئی اہم شخص ہے۔ آفریدی آداب سیاست سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس لئے زخمی ہوتے ہوئے بھی اپنے بستر پر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ آنے والے شخص نے جب آفریدی کو ذہنی کشمکش کا شکار دیکھا تو فوراً ہی پکار کر کہنے لگا۔

"مہمان! تمہیں اپنے زخموں کی شدت کا اندازہ نہیں' اس لئے آرام سے لیٹے رہو' میں تمہاری اس شائستگی سے بہت متاثر ہوا ہوں۔" ادھیڑ عمر راجپوت باوقار انداز میں چلتا ہوا علی عامر آفریدی کے قریب آگیا تھا۔

"میں ریاست چتوڑ کا مہامنتری وکرم سنگھ ہوں۔" آنے والے نے اپنا مختصر تعارف کرایا مگر اس کی آواز میں نخوت وغرور کا شائبہ تک نہیں تھا۔ "مجھے راجہ رتن سین (رتن سنگھ) اور مہارانی پدمنی نے شاہی سفیر کی مزاج پرسی کے لئے بھیجا ہے۔ ہمیں سرحدی محافظوں نے اتنا ہی بتایا تھا کہ بے ہوش ہوتے وقت آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ میں سلطان علاءالدین خلجی کا سفیر ہوں اور مجھے جلد از جلد رانی پدمنی کے حضور لے چلو۔" مہامنتری وکرم سنگھ کا لہجہ تہذیب وشائستگی کا آئینہ دار تھا۔ اس کے بولنے کا یہ انداز

یا تو فطری تھا یا پھر سلطان علاءالدین خلجی جیسے باجبروت حکمراں کا سفیر ہونے کے سبب وکرم سنگھ کے الفاظ میں لچک اور نرمی پیدا ہوگئی تھی۔ ورنہ یہ جنگجو قوم اپنی محبوباؤں سے محبت کا اظہار کرتے وقت اس طرح بولتی تھی جیسے زبان سے موتی جھڑنے کے بجائے انگارے گر رہے ہوں۔ اس تلخ کلامی میں راجپوتوں کا کوئی قصور نہیں تھا وہ تھے ہی فطرتاً اکھڑ' تند مزاج اور غصیلے۔ وہ پیار کی بات بھی اس طرح کرتے تھے کہ جیسے کسی آہنی ہتھیار سے پتھر توڑ رہے ہوں۔ مگر وکرم سنگھ کے لہجے نے اپنی نرم کلامی سے راجپوتوں کی اس روایت کو بدل ڈالا تھا۔

علی عامر آفریدی نے مہامنتری وکرم سنگھ کی طرف غور سے دیکھا ابھی وہ جواب میں اپنے ہونٹوں کو جنبش بھی دینے نہیں پایا تھا کہ مہامنتری وکرم سنگھ دوبارہ بول اٹھا۔ "ہمارے محافظ فوجیوں کے بقول آپ شدید زخمی تھے اور زبان سے چند الفاظ ادا کرنے کے بعد بے ہوش ہوگئے تھے۔ پھر آپ کو ہمارے سپاہی راج محل میں لے آئے۔ راج وید (شاہی طبیب) نے آپ کے زخموں کا علاج کیا۔ بھگوان کی کرپا سے آپ بہت جلد ہوش میں آگئے۔ مجھے بتائیے کہ اب آپ کیا محسوس کررہے ہیں؟ کہیں کوئی ایسی تکلیف تو نہیں ہے جسے راج وید نہ سمجھ سکے ہوں۔"

علی عامر آفریدی کے ہونٹوں پر ایک خوشگوار سا تبسم ابھر آیا اور پھر وہ آہستہ لہجے میں کہنے لگا۔ "میں مہارانی پدمنی اور مہامنتری وکرم سنگھ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ آج اپنے گرد پائی جانے والی سہولتیں دیکھ کر راجپوتوں کی مہمان نوازی کا قائل ہوگیا ہوں۔"

علی عامر کے اس اعتراف کے بعد وکرم سنگھ کے چہرے پر بھی خوشی کے آثار نمایاں ہوگئے پھر اس نے آفریدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں اب تک اپنے معزز مہمان کے نام سے واقف نہیں ہوسکا ہوں۔"

"مجھے علی عامر آفریدی کہتے ہیں۔" علاءالدین خلجی کے سفیر نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "میں مہارانی کے لئے سلطان کا ایک اہم پیغام لے کر آیا ہوں۔"

آفریدی کی بات سن کر وکرم سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ اصولی طور پر سلطان کا پیغام راجہ رتن سنگھ کے نام ہونا چاہئے تھا۔ رانی پدمنی سے سلطان کے پیغام کا کیا تعلق؟ وکرم سنگھ' علی عامر آفریدی کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ مگر پھر بھی وہ خاموش رہا اور بدستور نرم لہجے میں کہنے لگا۔ "آپ مزید چند روز آرام کرلیں۔ پھر جب سارے زخم بھر جائیں گے تو مہارانی آپ کو درشن دیں گی۔" اب وکرم سنگھ کی باتوں میں گرمجوشی نہیں تھی اور لہجہ کھوکھلا محسوس ہورہا تھا چند لمحوں کے لئے کمرے میں سکوت طاری رہا۔ پھر وہ علی عامر آفریدی سے کہنے لگا۔ "یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ چتوڑ کی سرحدوں تک زخمی حالت میں کس طرح پہنچے؟" بالآخر وکرم سنگھ نے وہ نازک سوال پوچھ ہی لیا جس کا آفریدی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

علی عامر کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر فکر انگیز لہجے میں بولا۔ "میں حملہ آوروں کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ جیسے ہی میں سرشام چتوڑ کے جنگلی علاقے میں داخل ہوا' وہ اچانک کسی طرف سے نکل آئے اور ان لوگوں نے یہ کہہ کر مجھ پر یلغار کردی کہ وہ جنگل کے شہنشاہ ہیں۔ میں نے خدا کے بھروسے پر تنہا ان لوگوں کا مقابلہ کیا اور تمام لٹیروں کو تہہ تیغ کردیا۔ پھر بھی ان قزاقوں میں سے ایک لٹیرا معمولی زخمی ہونے کے سبب فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔"

وکرم سنگھ' سلطان علاءالدین خلجی کے سفیر کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

"نہیں! میرے معزز مہمان! ایسا ہرگز نہیں ہے۔" مہامنتری وکرم سنگھ نے آفریدی کی زبان سے پورا واقعہ سننے کے بعد کہا۔ "چتوڑ کے مضافاتی علاقے سے ملحقہ یہ جنگل تاریک ضرور ہے مگر یہاں لٹیرے قیام نہیں کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو دیہات کی جوان لڑکیاں آبرومندانہ زندگی کس طرح بسر کرتیں؟ وہ روزانہ دریا پر پانی بھرنے جاتی ہیں، کھیتوں سے چارہ لا کر اپنے مویشیوں کی پرورش کرتی ہیں اگر جنگل میں قزاقوں کا ڈیرہ ہوتا تو پھر چتوڑ کے دیہاتی باشندوں پر زندگی حرام ہو جاتی۔" مہامنتری اپنے مضافاتی علاقے کی صورت حال وضاحت سے بیان کر رہا تھا اور علی عامر کی پیشانی پر ابھرنے والی دھندلی لکیریں آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی تھیں۔

"ہاں! چند سال پہلے ڈاکوؤں کی ایک جماعت کسی ریاست سے بچھڑ کر یہاں بسیرا کرنے آ گئی تھی مگر جیسے ہی ہمیں خبر ملی، ہم نے پوری توانائی کے ساتھ ان پر حملہ کیا اور ایک ہی دن میں قزاقوں کی اکثریت کو ہلاک کر ڈالا اور کچھ بچ گئے تو وہ آج تک ہمارے قید خانوں میں بدترین زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں پردھان منتری کی حیثیت سے اپنے مہمان کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ وہ قزاق ہمارے علاقے سے تعلق نہیں رکھتے۔ یقیناً یہ کوئی گہری سازش معلوم ہوتی ہے۔"

سازش کے لفظ پر علی عامر چونک اٹھا اور پھر اس کے ذہن میں گزری ہوئی رات کی کئی پرچھائیاں لرزنے لگیں پھر جب سکوت کا یہ وقفہ طویل ہوا تو مہامنتری وکرم سنگھ نے آفریدی کو پکارا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ جب وہ چتوڑ کے جنگل کے پناہ گیر ڈاکو نہیں تھے تو پھر وہ کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے اور میری جان کے درپے کیوں نظر آ رہے تھے؟"

"اسی سوال پر میرا ذہن بھی الجھ جاتا ہے۔" وکرم سنگھ بھی پریشان نظر آ رہا تھا۔

علی عامر آفریدی بھی مسلسل پیچیدہ صورت حال کے بارے میں غور کر رہا تھا اور ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ اس کی سوچ کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر شدید ذہنی اضطراب کے بعد وہ ایک نتیجہ خیز مرحلے پر پہنچ گیا۔

آفریدی نے مہامنتری وکرم سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ابھی اس واقعے کو زیادہ وقت نہیں گزرا ہے میرے خیال میں تقریباً تمام ڈاکو لقمۂ اجل بن چکے ہیں ان کی لاشیں ابھی تک وہیں موجود ہوں گی۔ اگر آپ ان لاشوں کا معائنہ کرا لیں تو یہ راز فاش ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ پیشہ ور رہزن تھے یا کسی سازشی منصوبے کا ایک حصہ بن کر یہاں تک پہنچے تھے۔"

وکرم سنگھ کو علی عامر آفریدی کی یہ تجویز پسند آئی تھی اور وہ سلطان علاءالدین خلجی کے نوجوان سفیر کو تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا واپس چلا گیا تھا۔

دوسرے دن وکرم سنگھ نے آفریدی کو یہ ناقابل یقین اطلاع دی کہ مرنے والوں کی تعداد انیس تھی اور وہ سب کے سب اپنے ظاہری حلیے سے قزاق معلوم نہیں ہوتے تھے۔ پھر وکرم سنگھ نے قتل ہونے والوں کی تفصیل سنائی تو آفریدی کو معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کا انجام لرزہ خیز بھی تھا اور عبرتناک بھی۔ مہامنتری وکرم سنگھ نے آفریدی کو بتایا۔

"اگر ہمارے سپاہی وہاں پہنچنے میں کچھ تاخیر سے کام لیتے تو ساری لاشیں گِدھوں کی خوراک بن چکی ہوتیں۔ سولہ لاشیں اس حالت میں پائی گئیں کہ ان کے جسموں پر کسی کسی جگہ گوشت باقی رہ گیا تھا وہ سب کے سب ہڈیوں کا پنجر بن چکے تھے۔ بس تین لاشیں ایسی تھیں جو گِدھوں کی تیز چونچوں سے محفوظ

رہ گئی تھیں۔ ہم نے ان مردہ جسموں کو جنگل سے اٹھوا کر تہہ خانوں میں پہنچا دیا ہے۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ خاموش ہو گیا اور بہت غور سے علی عامر آفریدی کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

آفریدی، وکرم سنگھ کا بیان سن کر چونک اٹھا تھا۔ اندیشے تو پہلے ہی اس کے ذہن میں سر ابھارنے لگے تھے مگر اب واقعات کے موجودہ رخ نے ان اندیشوں کو ایک بھیانک حقیقت میں تبدیل کر دیا تھا اور وہ حقیقت یہ تھی کہ مرنے والے ڈاکو نہیں، تربیت یافتہ سپاہی تھے۔ اس انکشاف کے بعد علی عامر آفریدی کی بے چین نگاہوں کے سامنے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان واضح ہو گیا تھا کہ اگر وہ سپاہی تھے تو ان کا تعلق کس حکمراں کی فوج سے تھا۔ رانی پدمنی کے لشکر سے یا پھر چتوڑ کے کسی حریف راجہ کی فوج سے؟ بڑے نازک لمحات تھے۔ علی عامر آفریدی اپنے پریشان خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک مہامنتری کی تیز آواز نے کمرے کے سکوت میں گہرا شگاف ڈال دیا۔

"آفریدی! تمہیں تعجب ہو گا کہ مرنے والے فوجی لباس میں نہیں تھے مگر ان کا تعلق یقینی طور پر کسی فوج سے تھا۔" وکرم سنگھ رک رک کر بول رہا تھا اور اس کی نظریں آفریدی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"آپ کے خیال میں مرنے والوں کا تعلق کس فوج سے ہو سکتا ہے؟" علی عامر آفریدی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ بے داغ کردار کا مالک تھا اس لئے دیارِ دشمناں میں بھی اپنی روایتی بے باکی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"مرنے والوں کا تعلق کسی مسلمان حکمراں کی فوج سے ہے۔" وکرم سنگھ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور آفریدی کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ کا مشاہدہ کرنے لگا۔

"مسلمان فوج!" آفریدی زخمی ہونے کے باوجود بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کشمکش میں شاہی سفیر کے کئی زخموں سے خون رسنے لگا۔ مگر اس وقت وہ جسم کی تمام اذیتوں سے بے نیاز تھا۔ "میں آپ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھا۔" آفریدی نے اپنے منتشر لہجے پر قابو پانے کی کوشش کی تھی "آپ کے قرب و جوار میں بھی کوئی اسلامی ریاست موجود نہیں ہے۔" آفریدی نے وکرم سنگھ سے ایک منطقی سوال کیا تھا "پھر مرنے والے قزاقوں کا تعلق کسی مسلمان لشکر سے کس طرح ہو سکتا ہے؟"

"ہمارے مہمان کا یہ سوال حقیقت پسندانہ ہے۔" اچانک وکرم سنگھ کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم ابھر آیا جو کسی خاص بات کی غمازی کر رہا تھا "ہمارے ماہر جاسوسوں نے مرنے والوں کے چہرے اور ان کی تلواریں دیکھ کر اپنا شک ظاہر کیا ہے کہ وہ سلطان علاءالدین خلجی کی فوج سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی ظاہری نشانیوں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ سب کے سب مسلمان تھے۔"

وکرم سنگھ کے الفاظ کیا تھے، ایک زلزلہ تھا جس کے اثر سے آفریدی کے دل و دماغ کی ساکت زمین لرز اٹھی تھی۔ وہ بہت دیر تک سکتے کے عالم میں بیٹھا، وکرم سنگھ کو دیکھتا رہا۔

پھر ایک طویل وقفۂ سکوت کے بعد آفریدی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ "اگر مہامنتری مناسب سمجھیں تو مرنے والوں کی لاشیں مجھے دکھا دیں تاکہ میں خود بھی کسی نتیجے پر پہنچ سکوں اور یہ اندازہ کر سکوں کہ سلطان علاءالدین خلجی کے سفیر پر حملہ کرنے کی یہ گستاخانہ جرأت کس نے کی تھی اور حملہ آور کس علاقے سے تعلق رکھتے تھے؟" یہ کہتے کہتے علی عامر آفریدی کی رگوں میں بہنے والا افغانی خون جلنے لگا تھا اور علاءالدین خلجی جیسے باجبروت حکمراں کی نسبت نے اس کے لہجے کو مزید باوقار بنا دیا تھا۔

☆.................☆.................☆

پھر جب مہامنتری وکرم سنگھ کے حکم پر ایک ایک کر کے وہ تینوں لاشیں علی عامر آفریدی کے سامنے لائی

گئیں تو وہ ان مردہ انسانوں کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ اب اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ گیا تھا کہ وہ تمام مرنے والے دہلی کے لشکر سے تعلق رکھتے تھے۔ تینوں مقتول سپاہیوں کو دیکھ کر آفریدی کو احساس ہوا تھا جیسے وہ تینوں چہرے اس کے شناسا ہوں لیکن آفریدی ان کے ناموں سے واقف نہیں تھا۔ اگر انسانی آنکھ کے دھوکا کھا جانے کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا کہ مقتول سپاہیوں کی تلواروں پر پائے جانے والے مخصوص نشانات بھی سلطانی افواج کی نشاندہی کر رہے تھے۔ آفریدی کے دل و دماغ قابو میں نہیں تھے مگر پھر بھی اس نے غیر معمولی ضبط و تحمل کا مظاہرہ کیا اور اپنے چہرے سے بدحواسی کی کسی علامت کو ظاہر نہیں ہونے دیا جب وہ ایک ایک لاش کو بغور دیکھ چکا تو اس نے ریاست چتوڑ کے مہامنتری وکرم سنگھ کے سامنے کسی جھجک کے بغیر اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔

"آپ کے ماہر جاسوسوں کا شبہ محض ایک شبہ ہے۔ اسے اعتبار اور یقین کا درجہ حاصل نہیں۔" آفریدی نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے وکرم سنگھ کے دعوے کو یکسر جھٹلا دیا تھا۔

"نہیں ایسا نہیں ہے۔" اچانک وکرم سنگھ کا لہجہ بھی تبدیل ہو گیا تھا اور زبان کی نرمی دفعتہً سختی میں بدل گئی تھی۔ "میں نے شک کی بات کسی احتیاط کے پیش نظر کہی تھی ورنہ مجھے یقین تو اسی وقت آ گیا تھا جب پہلی لاش جنگل سے اٹھا کر میرے سامنے لائی گئی تھی۔ مرنے والوں کا مسلمان ہونا تعجب کی بات ضرور ہے لیکن یہ امر میرے لئے زیادہ حیرتناک ہے کہ ان کی تلواریں سلطان علاء الدین خلجی سے کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور رکھتی ہیں۔"

علی عامر مکمل طور پر مستعد اور ہوشیار تھا۔ جیسے ہی وکرم سنگھ خاموش ہوا آفریدی کہنے لگا۔ "ریاست چتوڑ کے پردھان منتری اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ یہ شمشیریں شاہی اسلحہ خانے سے چرائی بھی جا سکتی ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی جنگ میں سلطان کے سپاہی شہید کر دیئے گئے ہوں اور پھر ان کی تلواریں کسی عیار دشمن نے کسی خاص مقصد کیلئے استعمال کی ہوں۔ وہ اس طرح مجھ پر حملہ کرا کے چتوڑ کے حکمراں کو میری طرف سے بدگمان بھی کر سکتا ہے۔ اگر مرنے والوں کا تعلق سلطانی لشکر سے ہوتا تو پھر وہ اپنے ہی سفیر کی جان کے دشمن کیوں ہو جاتے؟" علی عامر آفریدی نے انتہائی ذہانت سے کام لیتے ہوئے وکرم سنگھ کے سامنے ایک مضبوط دلیل پیش کی تھی۔

جب فوری طور پر چتوڑ کے مہامنتری سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تو آفریدی نے ایک اور نفسیاتی ضرب لگائی "اس صورت میں تو آپ کی گفتگو سے یہی مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے کہ میں سلطان کا مصنوعی سفیر ہوں۔ دارالحکومت سے فرار ہو کر آیا ہوں اور سلطان کو میری خفیہ روانگی کی خبر ہو گئی ہے پھر میرے سفر کو روکنے کے لئے خود سلطان ہی نے مجھ پر حملہ کرایا ہو۔" علی عامر آفریدی سوالیہ نظروں سے وکرم سنگھ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

آفریدی کے دلائل کے سامنے وکرم سنگھ لاجواب سا نظر آ رہا تھا۔

"آپ کو میرے سفیر ہونے پر تو شک نہیں؟" علی عامر نے الفاظ بدل کر اپنے نفسیاتی حربے کو دوبارہ استعمال کیا۔

"نہیں۔" مہامنتری وکرم سنگھ کی آواز بجھی بجھی سی تھی۔

"بے ہوش ہو جانے کے بعد یقیناً آپ کو میرے پیرہن سے کچھ کاغذات ملے ہوں گے۔" آفریدی نے وکرم سنگھ کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ "وہی کاغذات میری شناخت ہیں۔ ان سے آپ کو پتہ چل سکتا ہے کہ میں سلطان کا حقیقی سفیر ہوں یا کوئی مفرور مجرم؟"

وکرم سنگھ کے چہرے پر ندامت کے آثار نظر آنے لگے۔ "نہیں! ہم اپنے معزز مہمان کی ذات پر شبہ نہیں کر سکتے۔"

"پھر مجھے ہلاک کرنے کی کوششوں کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟" آفریدی نے خجالت کا شکار ہو جانے والے وکرم سنگھ سے پوچھا۔

"آپ مطمئن رہیں۔" وکرم سنگھ نے گھبرا کر کہا "ہم بہت جلد اس واقعے کی تحقیق کرائیں گے کہ یہ گھناؤنا منصوبہ کس نے ترتیب دیا تھا؟"

"یہ منصوبہ اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ مجھے رات کے اندھیرے میں رانی پدمنی کے دربار تک پہنچنے سے پہلے ہلاک کر دیا جائے اور پھر بہادر راجپوتوں کی تاریخ پر یہ بدنما داغ ہمیشہ کیلئے نقش ہو کر رہ جائے۔"

وکرم سنگھ زیادہ دیر تک آفریدی کے پاس نہ بیٹھ سکا اور مختلف خیالات میں الجھا ہوا واپس چلا گیا۔

☆..........☆..........☆

وکرم سنگھ کے جاتے ہی علی عامر آفریدی کے ذہن میں اندیشوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ لاشوں کو دیکھ لینے کے بعد آفریدی کو یقین آ گیا تھا کہ وہ تمام مقتول سپاہی شاہی افواج سے تعلق رکھتے تھے۔ آفریدی بہت دیر تک سوچتا رہا کہ آخر پس پردہ کون شخص ہے جو اس کی اور رانی پدمنی کی ملاقات کو برداشت نہیں کرتا اور وہ کون خفیہ دشمن ہے جو اسے اس قدر نازک فرض کی ادائیگی کے وقت قتل کرنا چاہتا تھا؟ ذہن کے ایک ایک گوشے کی تلاشی لینے کے بعد آفریدی کو اپنے لاشعور کے نقاب میں چھپا ہوا ایک ہی آدم زاد نظر آیا جس کا نام ملک کافور تھا۔ اسی نے سلطان کی بخشی ہوئی اس سفارت پر طعنہ زنی کی تھی۔ آفریدی کی آنکھوں کے سامنے گزرے ہوئے مناظر کا ایک ایک عکس ابھر آیا۔ خیالات کے اس ہجوم سے نکل کر درباری رقاصہ زہرہ جمال بھی چند لمحوں کیلئے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور پھر یادوں کا یہ سلسلہ شہر ہانسی تک جا پہنچا جہاں اس کی والدہ شائستہ بیگم اور چھوٹی بہن عالیہ مقیم تھیں۔ آفریدی لرز کر رہ گیا۔ اگر وہ اس حملے میں مارا جاتا تو اس کی بیوہ ماں اور معصوم بہن پر کیا گزرتی؟ افغان زادے کے آہنی اعصاب اس پتھر کی طرح چٹخنے لگے جس پر اچانک کسی کے دست جفاکار نے مشق ستم شروع کر دی ہو۔

ناگہاں ایک اور جان لیوا اندیشے نے آفریدی کے دل کی دنیا تہ و بالا کر کے رکھ دی۔ وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے سوچنے لگا۔ "جب ملک کافور سلطان کے اہم ترین سفیر پر حملہ کرانے کی جرأت کر سکتا ہے تو پھر میرے اہل خانہ کا کیا ہو گا جو دہلی سے دور ہانسی میں بظاہر ایک محفوظ زندگی گزار رہے ہوں گے مگر پھر بھی ملک کافور کی دسترس سے دور نہیں ہوں گے۔" اس خیال کے ساتھ ہی آفریدی کا زخمی جسم لرز اٹھا اور اس کے ہونٹوں سے آہ سرد نکل گئی۔

"خدایا! مجھ پر جو گزرنی ہے گزر جائے مگر ان خواتین کی حفاظت فرما جو میرا ناموس ہیں، میری آبرو کو اس بے ضمیر انسان کے حوالے نہ کر جس کی غیرت و حیا سر دربار نیلام ہو چکی ہے۔" آفریدی بہت دیر تک دل ہی دل میں دعائیں کرتا رہا پھر انہی دعاؤں کے دوران اسے رقاصہ زہرہ جمال کا خیال آیا اور آفریدی پر ایک بار پھر وحشت طاری ہونے لگی۔ "مالک دوجہاں! اس عورت کی بھی حفاظت کر جسے اہل شہر بے آبرو سمجھتے ہیں مگر جو اپنے سینے میں ایک دردمند اور پاکباز دل رکھتی ہے۔"

پھر آفریدی کی دعاؤں کا سلسلہ طویل تر ہوتا چلا گیا۔ ذہن وسوسوں اور اندیشوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ وہ اپنے ذہن کو پرسکون رکھنا چاہتا تھا مگر پریشان خیالات کی یلغار نے اسے دن بھر چین سے نہیں رہنے دیا یہاں تک کہ شام ہو گئی۔

شام کے وقت مہامنتری وکرم سنگھ دوبارہ علی عامر آفریدی کی مزاج پرسی کے لئے آیا اور شگفتہ مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا" ہمارے مہمان کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے ؟ "

آفریدی نے جواباً کہا کہ وہ بہادر راجپوتوں اور خصوصاً مہامنتری کی مہمان نوازی کا تہہ دل سے شکر گزار ہے۔

پھر جیسے ہی شام کا اندھیرا گہرا ہوا' آفریدی کے لئے کھانا آ گیا اگرچہ راجپوت گوشت کھاتے تھے لیکن آفریدی نے پہلے ہی منع کر دیا تھا کہ وہ گوشت استعمال نہیں کرے گا۔ اس کے نزدیک ایک کافر کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور حلال نہیں تھا۔ اس لئے آفریدی کو سبزیوں' دالوں اور چاول پر ہی گزارہ کرنا پڑا۔

کھانے کے کچھ دیر بعد آفریدی نے ایک خوبصورت لڑکی کو شیشے کے کچھ برتن اٹھائے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ آفریدی نے حیرت سے اس لڑکی کو دیکھا جو ایسے لباس میں ملبوس تھی جس سے اس کے رقاصہ ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

آفریدی نے غور سے ان شیشے کے برتنوں کو دیکھا جن سے شراب نوشی کے پر تکلف اہتمام کی نمائش ہو رہی تھی۔ آفریدی نے قدرے ناگوار لہجے میں لڑکی سے پوچھا" یہ سب کیا ہے ؟ "

لڑکی نے ایک نگاہ غلط انداز سے آفریدی کی طرف دیکھا اور جواب دیئے بغیر بادِ صبا کے کسی کیف آور جھونکے کی طرح لہراتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ آفریدی کو لڑکی کے خاموش رویے پر حیرت تھی مگر زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ اس کی خاطر و مدارات کیلئے ایک حرام شے پیش کی گئی تھی۔ آفریدی بڑے انہماک سے اس منقش صراحی کو دیکھنے لگا جس سے سرخ پانی جھلک رہا تھا۔ یہ وہی سرخ پانی تھا جس کی لذتوں میں بڑے بڑے دیو قامت انسان کسی حقیر کیڑے کی طرح ڈوب گئے تھے اور تاریخ کا رخ موڑ دینے والی عظیم الشان سلطنتیں اس طرح غرق ہو گئی تھیں جیسے بلوریں جام میں کثیف تلچھٹ نظر آتی ہو۔ آفریدی کا چہرہ ندامت سے سرخ ہو گیا۔ اس نے سلطان علاءالدین خلجی کے دربار میں بھی کبھی کبھی ایسے مناظر دیکھے تھے اور وہ ہمیشہ شرم و خجالت کے پسینے میں نہا جاتا تھا۔ یکبارگی آفریدی کے دل میں آیا کہ وہ ان شیشے کے تمام برتنوں کو توڑ دے اور انگوروں کے اس رس سے کمرے میں بچھی ہوئی قالین کو داغدار بنا دے مگر یہ سوچ کر اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ رک گئے کہ ایک شاہی سفیر کو دشمن ملک میں کسی بھی جذباتی حرکت سے باز رہنا چاہئے۔

ابھی آفریدی کے دل و دماغ میں یہ کشمکش جاری تھی کہ وہ لڑکی دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی اب کی بار بھی وہ خالی ہاتھ نہیں آئی تھی اس کے ہاتھوں میں ایک خوش رنگ رباب موجود تھا جس پر جگہ جگہ زمرد' نیلم اور پکھراج جڑے ہوئے تھے۔ لڑکی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک شوخ مسکراہٹ کے ساتھ آفریدی کی طرف دیکھا اور پھر رباب کو ایک گوشے میں رکھتے ہوئے پلٹ کر کہنے لگی۔

" ہمارے مہمان اب تک خاموش ہی بیٹھے ہیں۔ " لڑکی کی باتوں سے دلربائی کا انداز جھلک رہا تھا۔

" شیشہ و صراحی سے چھیڑ چھاڑ نہ کرنا مردانگی کی توہین ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ اب تک یہ تمام برتن خالی ہو کر ٹوٹ چکے ہوں گے۔ " لڑکی کی شوخیاں اپنے عروج کو پہنچ چکی تھیں۔

اب آفریدی کی قلبی کیفیت دگرگوں ہونے لگی۔ " میں پوچھتا ہوں کہ یہ سب کچھ کیا ہے ؟ " آفریدی کا لہجہ تند و تیز بھی تھا اور حاکمانہ بھی۔

" تعجب ہے آپ اسے نہیں پہچانتے۔ " لڑکی مسلسل شرارت پر آمادہ تھی۔ " میں تو بچپن سے یہی سنتی آئی ہوں کہ اس پانی کے بغیر بڑے لوگ زندہ نہیں رہ سکتے۔ آپ بھی بڑے آدمی ہیں۔ پھر ایک آشنا سے

یہ بے وفائی کیوں ؟ "

" میں شراب نہیں پیتا۔ " آفریدی کے لہجے میں بیزاری تھی۔ " مہمان نوازی کے ان لوازمات کو اٹھاؤ اور کمرے سے باہر جا کر ایک ایک شیشے کو ریزہ ریزہ کر دو۔ "

" آپ شراب نہیں پیتے' آخر کیوں ؟ " اب لڑکی کی زبان بات کرتے ہوئے لڑکھڑانے لگی تھی۔

" مجھ سے تو کہا گیا تھا کہ مسلمان بڑے نفیس مزاج کے مالک ہوتے ہیں اور شراب کے سلسلے میں وہ " قدیم و جدید " کا خاص لحاظ رکھتے ہیں۔ " لڑکی کی شوخی و شرارت رخصت ہو چکی تھی اور اب وہ بڑے سنجیدہ اور پُراعتماد لہجے میں بول رہی تھی۔ " مسلمانوں کی اسی عادت کے پیش نظر مہامنتری نے شراب کے تمام ذخیروں میں سے اس پانچ سو سالہ پرانی شراب کا انتخاب کیا ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ شراب صرف چتوڑ آنے والے اہم راجہ اور مہاراجہ کو پیش کی جاتی ہے۔ تم ایک سفیر ہو مگر علاءالدین خلجی کے سفیر۔ اگر کسی دوسری ریاست کا سفیر یہاں آتا تو اسے ایک عام سے کمرے میں ٹھہرایا جاتا اور اس کی مہمان نوازی کیلئے معمولی سی شراب پیش کی جاتی۔ "

" تم نے جو کچھ سنا ہے وہ جھوٹ ہے اور تمہیں جو کچھ بتایا گیا ہے وہ مسلمانوں پر ایک شرمناک تہمت ہے۔ " آفریدی کا پورا چہرہ تمتمانے لگا۔ مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور سکوت توڑا " لیکن اس میں تمہارا بھی کیا قصور ہے کہ لوگ کسی ایک انسان کی لغزش کو اس کی پوری قوم سے منسوب کر دیتے ہیں۔ پھر بھی میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مسلمان شغلِ مے نوشی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے وہ اس زمین پر صرف ہدایت اور انصاف لے کر آئے ہیں۔ بادہ خانے تو کبھی کے اجاڑ دیئے گئے ہیں اور شراب تو بہت پہلے مٹی میں ملا دی گئی۔ تم یہ بھی جنسِ حرام یہاں سے اٹھا کر لے جاؤ ۔ تمہارے مہامنتری نے میری بڑی دل آزاری کی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ آدابِ میزبانی کا خیال رکھتے رکھتے اچانک بہک جائیں گے۔ " علی عامر بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وکرم سنگھ نے جو کچھ کیا ہے' وہ ایک سیاسی سلوک ہے اور وحشیانہ دور کی تواضع کا ایک انداز ہے مگر آفریدی کو یہ انداز گراں گزرا تھا۔

علی عامر کی باتیں سن کر لڑکی ایک بے جان تصویر کی مانند نظر آنے لگی تھی وہ پلکیں جھپکائے بغیر آفریدی کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہو جو آکاش کی بلندیوں سے چتوڑ کی دھرتی پر اتر آئی ہو۔

" شاید تم نے نہیں سنا ؟ " آفریدی کی آواز بلند تھی۔

لڑکی گھبرا کر اٹھی اور سہمے ہوئے انداز میں تمام سامانِ کیف و نشاط لے کر باہر نکل گئی۔ لڑکی کے جاتے ہی آفریدی کو احساس ہوا کہ انفرادی غلطیاں کس طرح پوری قوم کو " کوئے ملامت " میں لے جا کر ہمیشہ کیلئے بدنام کر دیتی ہیں۔ راجپوتوں کی بستی میں بھی مسلمانوں کے متعلق کچھ ایسے ہی رسوا کن اور تحقیر آمیز افسانے مشہور تھے۔ آفریدی کو ایک عجیب سی گھٹن کا احساس ہونے لگا پھر اس نے طے کر لیا کہ وہ کل اسی زخمی حالت میں رانی پدمنی کے سامنے چلا جائے گا اور چتوڑ کی حکمراں کو سلطان کا پیغام دے کر دہلی روانہ ہو جائے گا۔

آفریدی کی اذیتوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا کہ وہی لڑکی تیسری بار کمرے میں داخل ہوئی اسے دیکھتے ہی آفریدی بول اٹھا۔

" اب تم کیوں آئی ہو ؟ تمہارا یہاں کیا کام ہے ؟ " آفریدی کا لہجہ ناخوشگوار تھا۔

" میں شرفائے زمانہ کی ایک حقیر سی کنیز اور معززین وقت کی ایک ادنیٰ سی خدمت گار ہوں۔ رات کے

ستاروں کی شریک 'ایک مطربہ 'ایک رقاصہ 'اداس دلوں کا قرار اور منتشر ذہنوں کا سکون۔" لڑکی کے ہونٹوں پر شگفتہ مسکراہٹ تھی مگر آواز میں ایک 'خلش 'ایک درد بھی پنہاں تھا۔

"میں تمہاری خدمت معاف کرتا ہوں۔" اب آفریدی کے لئے لڑکی کی آمد کوئی راز نہیں رہی تھی وہ سمجھ رہا تھا کہ وکرم سنگھ نے اسے کس مقصد کیلئے بھیجا ہے؟ یہ تماشا دہلی کے بعض مسلمان امراء بھی بڑے شوق سے دیکھتے تھے اور چتوڑ میں بھی یہی کھیل جاری تھا۔ آفریدی کو اقتدار کی ان دلچسپیوں سے نفرت تھی۔ اس لئے جیسے ہی ہندو لڑکی نے اپنے فرائض کی تفصیل بیان کی' وہ بے اختیار ہو کر کہنے لگا۔" آج کی شب تم مجبور نہیں ہو۔ مجھے بھی چین سے سونے دو اور خود بھی ایک رات کے لئے سارے غموں کو فراموش کر کے گہری نیند سو جاؤ۔ پتہ نہیں تم کب سے جاگ رہی ہو۔ تصورات کی محفل آراستہ کرو اور روشنی کے خواب دیکھو۔ میں نہیں جانتا کہ تمہاری آنے والی رات کس کے نام وقف ہوگی۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ میں تمہیں صرف ایک رات کی آزادی دے سکتا ہوں۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہاری تمام راتوں کی زنجیریں کاٹ دیتا۔ جاؤ! بس اب چلی جاؤ۔ اگر کبھی تمہیں فرصت ملے تو اپنی قوم کے لوگوں کو بتا دینا کہ تمہارے دیس میں ایک مسلمان آیا تھا جسے شراب سے کوئی رغبت نہیں تھی اور جو مجبور لڑکیوں کی نیندیں حرام نہیں کرتا تھا۔"

آفریدی نے سوگوار لہجے میں کہا اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

شاہی سفیر کی گفتگو سن کر بت پرستوں کی مملکت میں رہنے والی خود بھی ایک بت بن گئی۔ چند لمحوں کیلئے راج محل کے کمرے پر قبرستان جیسی مہیب خاموشی چھا گئی پھر وہ لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی اور آفریدی کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

"کیا تم مجھ سے مزید کچھ کہنا چاہتی ہو؟" علی عامر نے لڑکی سے پوچھا جس کی ساری شوخیاں رخصت ہو گئی تھیں اور وہ سر سے پا تک ایک مکمل پیکر درد بن کر رہ گئی تھی۔

"ہاں!" لڑکی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی "میں ایک گیت سنانے آئی تھی۔"

آفریدی کچھ دیر تک لڑکی کی اس عجیب سی خواہش کے بارے میں سوچتا رہا پھر بے دلی کے انداز میں کہنے لگا۔

"ایسا لگتا ہے جیسے اس دنیا میں رہنے والے ہر شخص کی زبان کو اس کے ہونٹوں کے درمیان قید کر دیا گیا ہے۔ کوئی تقریر کی آرزو رکھتا ہے اور کوئی نغمہ خوانی کی مقصد تو ایک ہی ہے کہ الفاظ بندشوں سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ تم بھی اپنا گیت سنا ڈالو کیا خبر کہ آنے والے لمحات مجھ سے میری سماعت چھین لیتے ہیں یا تم سے تمہاری آواز۔"

لڑکی کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں خوشی کا ایک شعلہ سا بھڑکا اور پھر وہ رباب اٹھا کر آفریدی کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس سے پہلے کہ لڑکی کی مخروطی انگلیاں کسی تار کو چھیڑتیں وہ آفریدی سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

"میرا نام کانتا ہے۔ مہامنتری نے آپ کو خوش کرنے کی ذمہ داری میری ایک ساتھی لڑکی شکنتلا کو سونپی تھی مگر میں نے انہیں کسی نہ کسی طرح اس بات پر آمادہ کر لیا کہ شکنتلا کی جگہ خود آپ کی خدمت میں پیش ہو جاؤں۔ میں نے مسلمانوں کے متعلق یہ بھی سنا تھا کہ ان کے یہاں نسل اور ذات کا جھگڑا نہیں ہوتا۔ جب وہ اپنی عبادت گاہوں میں جاتے ہیں تو راجا اور پرجا کے بیچ کوئی تفریق باقی نہیں رہتی۔ میری عقل اس "انہونی" کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ لوگ کون ہیں جو پرماتما کی اونچی نیچی دھرتی پر ایک قطار میں کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ میری زندگی کا سب سے بڑا ارمان تھا کہ میں کسی مسلمان کو دیکھوں۔ آج تمہیں دیکھا تو پیاسی آرزو سیراب ہو گئی۔ اب اپنے پیدا کرنے والے سے کوئی شکوہ نہیں رہا۔" یہ کہتے کہتے لڑکی کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ اس نے فوراً ہی سر جھکا لیا اور پھر دوسرے ہی

لمحے رباب کے تار جھنجھنا اٹھے۔ کانتا پر سوز لہجے میں گا رہی تھی۔

"ہم دھرتی کی کوکھ سے پھوٹنے والی وہ فصل ہیں جسے پکنے سے پہلے گرم ہواؤں نے جلا ڈالا
ہمیں ماؤں کی گود سے اس وقت جدا کر دیا گیا جب ہمارے لوریاں سننے کے دن تھے
ہمارے ریشم جیسے سپنوں کو کانٹوں پر ڈال کر کھینچا گیا
ہمارے کومل تن پتھروں کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے
پھر وہ دیوتا بن گئے اور ان دیوتاؤں نے ہماری پوجا کو ٹھکرا دیا کہ ہمارے ہاتھ ناپاک تھے
اور ہم آدم کی نہیں' حیوانوں کی اولاد تھے۔"

جیسے ہی کانتا نے اپنے گیت کے آخری بول ادا کئے کمرے میں چار مسلح سپاہی داخل ہوئے۔ آفریدی صورت حال کو سمجھنے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک سپاہی نے کانتا کے ہاتھ سے رباب چھین کر دیوار پر مار دیا اور دوسرے سپاہی نے لڑکی کے بال پکڑ لئے پھر وہ اسے ذبح کئے جانے والے جانور کی طرح کھینچتے ہوئے کمرے سے لے جانے لگے۔

"تم کون لوگ ہو اور اس لڑکی کو کہاں لئے جا رہے ہو؟" آفریدی شدید زخمی ہونے کے باوجود بستر سے اتر کر فرش پر کھڑا ہو گیا تھا۔ سپاہی اسے قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔ آفریدی چند قدم آگے بڑھا تو دروازے پر کھڑے ہوئے دونوں محافظوں نے اپنے ہاتھ آگے کر دیئے اور شاہی سفیر سے سخت لہجے میں کہا۔

"تمہیں اس کمرے سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

آفریدی اس غیر متوقع حادثے پر حیران ہو رہا تھا اور طویل راہداری میں کانتا کی چیخیں گونج رہی تھیں۔

"مہمان! جب تم دہلی واپس جاؤ تو اپنے سلطان کو بھی میرا یہ گیت سنا دینا اور ان سے کہہ دینا کہ وہ جلد از جلد چتوڑ آئیں۔ اگر سلطان نے آنے میں تاخیر کی تو ان گنت آوازیں سینوں میں گھٹ کر رہ جائیں گی اور بے شمار نغمے پتھروں سے ٹکرا کر دم توڑ دیں گے۔"

بہت دیر تک کانتا کی چیخیں گونجتی رہیں۔ علی عامر آفریدی کو کمرے میں محصور کر دیا گیا تھا۔ اس لئے وہ نہیں دیکھ سکا کہ مسلح سپاہی کانتا کو طویل راہداری سے گزار کر کس طرف لے گئے؟ کسی زنداں میں یا مقتل میں؟ جب کانتا کی آوازوں کی بازگشت بھی ڈوب گئی تو آفریدی کانپتے قدموں سے اپنے بستر کی طرف بڑھا۔ شدید زخمی حالت میں اس کا یہ عمل اپنی ذات کے لئے بڑا جارحانہ تھا جس کے نتیجے میں زخموں کے منہ کھل گئے تھے اور آفریدی کا جسم ایک بار پھر رنگین ہو گیا تھا۔ جیسے ہی علی عامر اپنے بستر پر پہنچا' دونوں راجپوت محافظ بھی اپنی اپنی جگہ واپس چلے گئے۔

آفریدی نے منتشر ذہن کے ساتھ کانتا کے بارے میں سوچا اور پھر اس کی دھندلی آنکھیں شکستہ

رباب کو دیکھنے لگیں جس کے سینے سے کچھ دیر پہلے ایک المناک نغمہ پھوٹ رہا تھا۔ اور اب اس کے تار اس طرح بکھر گئے تھے کہ انھیں دوبارہ جوڑنا ممکن نہیں رہا تھا۔ کانتا کی زندگی بھی ایک رباب تھی جس کا انجام کسی کو معلوم نہیں تھا مگر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس کے جسم پر تازیانوں کی بارش ہو رہی ہوگی یا پھر کسی شمشیرِ ستم نے کانتا کے گلے سے نغمگی کا سلسلہ منقطع کر دیا ہوگا۔

آفریدی بہت دیر تک خیالات میں گم رہا۔ کانتا کے گائے ہوئے گیت نے ریاست چتوڑ کی تہذیب پر پڑے ایک ایک نقاب کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی اس سنگلاخ زمین پر آگ ہی آگ تھی۔ لوگوں کے بدن بھی جل رہے تھے اور ذہن بھی۔ دور دور تک انصاف و کرم کے پانی کا کوئی چشمہ یا آبشار نہیں تھا جس سے یہاں بسنے والے نچلے طبقے کے اقتدار گزیدہ لوگ اپنی روحوں کی پیاس بجھا سکتے۔ خدا جانے کانتا پیاس کی کس منزل پر پہنچ گئی تھی کہ اس نے ایک قطرۂ آب کو ترسے ہوئے ہونٹ پتھر کے اس پیالے پر رکھ دیئے جس میں قاتل زہر بھرا ہوا تھا۔ کانتا کو یاد کر کے آفریدی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بڑی عجیب لڑکی تھی کہ دوسروں کی تشنگی کا احساس دلانے کے لئے خود فنا کے شعلہ زار میں اتر گئی۔

اہل قفس نے جشن بہاراں کے نام پر
وہ داستاں سنائی کہ دامن بھگو دیئے

کانتا کا فسانۂ غم سن کر پہلے آفریدی کے رخسار تر ہوئے پھر یہ نمی دامنِ دل تک پہنچ گئی۔ ابھی تک بت پرست عورت کے لئے علی عامر کی یہ اشک ریزی جاری تھی کہ دھوئیں کی ایک تیز لہر آئی اور پورا کمرہ لوبان کی خوشبو سے بھر گیا۔ آفریدی نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ خوشبو کیسی ہے اور آدھی رات کے وقت محل کے لوگوں کو اس کی کیا ضرورت پیش آئی ہے؟ ابھی وہ خوشبو کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ناگہاں ایک انسانی آواز گونجنے لگی۔ آواز اتنے قریب سے سنائی دی تھی کہ جیسے کوئی شخص آفریدی سے چند گز کے فاصلے پر کھڑا ہو کر چیخا ہو۔ آفریدی یکبارگی اچھل سا گیا۔ ملک کافور کی سازشوں' حملہ آوروں کے تشدد' کانتا کی نغمہ سرائی اور لوبان کی خوشبو نے اسے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ واقعات میں ایک خاص تسلسل تھا۔ اس لئے آفریدی کو ہر بات پر حیرت ہونے لگی تھی اور ہر گزرنے والا لمحہ ایک نئی خبر لے کر آ رہا تھا۔ اب یہ کریہہ سی آواز اس کے اعصاب پر مسلط ہو کر رہ گئی تھی۔ آواز میں اس قدر کرختگی تھی کہ آفریدی کو ناگواری کا احساس ہونے لگا۔ کوئی نادیدہ شخص ایسی زبان میں کچھ مخصوص کلمات کی تکرار کر رہا تھا جو آفریدی کیلئے قطعاً اجنبی تھی۔ نامانوس الفاظ کی گردان کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا آواز لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی لوبان کا دھواں بھی کمرے میں بھرتا جا رہا تھا۔ آفریدی اس حقیقت کو تو سمجھ گیا تھا کہ لوبان کی خوشبو ہندوؤں کی پسندیدہ خوشبو ہے مگر اس کے کمرے میں خوشبو کا گزر کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اگر اس حرکت کا کوئی مفہوم تھا بھی تو وہ آفریدی کی عقل سے بالاتر تھا۔

جب علی عامر کو سانس لینے میں دشواری محسوس ہوئی تو اس نے دروازے پر کھڑے ہوئے محافظ سپاہیوں کو پکارا۔ آفریدی کی آواز سنتے ہی ایک مسلح سپاہی کمرے میں داخل ہوا اور شاہی سفیر کے سامنے پہنچ کر تلخ لہجے میں پوچھنے لگا۔ "کیا بات ہے؟"

آفریدی نے محافظ کے لہجے کی تلخی کو فوراً محسوس کر لیا مگر وہ اس کی ناشائستگی پر کوئی احتجاج نہ کر سکا۔ "یہ کیسا دھواں ہے جو میرے کمرے میں بھرتا ہی چلا جا رہا ہے؟"

"تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونا چاہئے کہ دھواں کہاں سے آ رہا ہے اور اس کی حقیقت کیا

ہے؟" سپاہی کا لہجہ بدستور ناخوشگوار تھا اور اس کے چہرے پر آفریدی کیلئے ناپسندیدگی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔

"میں اس دھوئیں کی حقیقت نہیں پوچھ رہا ہوں۔" آفریدی نے ایک بار پھر راجپوت محافظ کی تلخ کلامی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ "میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ یہ دھواں بند ہو جائے اور مجھے آج کی رات سکون کے چند لمحات میسر آ سکیں۔ اگر دھواں اسی رفتار سے میرے کمرے میں داخل ہوتا رہا تو کچھ دیر بعد میری سانس گھٹ جائے گی اور پھر شاید میں ہمیشہ کیلئے گہری نیند سو جاؤں گا۔" اب آفریدی کے لہجے سے تلخی جھلکنے لگی تھی "مہامنتری کو میرے آرام کا بہت خیال ہے۔ شاید وہ اسی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ یہاں کسی قسم کی تکلیف کا احساس تک نہیں ہوگا۔ اب مجھے وکرم سنگھ کی اعلیٰ مہمان نوازی کا اعتبار آ گیا۔" یہ کہہ کر علی عامر آفریدی چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا اور راجپوت سپاہی کو بغور دیکھنے لگا۔ وہ بیزاری کے عالم میں شاہی سفیر کے روبرو کھڑا تھا۔ یہ جبر کی ایک کیفیت تھی۔ اگر مہامنتری کا حکم نہ ہوتا تو وہ آفریدی کو اسی زخمی حالت میں چھوڑ کر کبھی کا جا چکا ہوتا۔

"میں مہامنتری سے صبح خود بات کر لوں گا اور ان کی اس بہترین تواضع کا شکریہ بھی ادا کر دوں گا مگر تم فی الحال اس دھوئیں کو بند کر دو جس کے اثر سے اب میری سانسیں متاثر ہو چلی ہیں اور اس آواز کو بھی روک دو جو مجھ سے میری نیند چھین لینا چاہتی ہے۔" علی عامر نے راجپوت محافظ سے کہا اور اس کے ردعمل کا انتظار کرنے لگا۔

محافظ سپاہی نے جواباً جو کچھ کہا تھا وہ حیرت انگیز بھی تھا اور ناقابل برداشت بھی۔ "تمہاری سانسیں بند ہو سکتی ہیں مگر یہ دھواں بند نہیں ہو سکتا۔" راجپوت سپاہی کی تلخ گوئی اب بدکلامی کے دائرے میں داخل ہو گئی تھی۔

"کیا تمہاری ریاست میں مہمانوں کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے؟" آفریدی ایک معمولی سپاہی سے الجھنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کی پراسرار باتوں نے علی عامر کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ یہاں کے حالات جاننے کے لئے اس قسم کا رویہ اختیار کرے۔

"ہم اپنے مہمانوں کے لئے جان بھی دے سکتے ہیں مگر اس دھوئیں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں سن سکتے۔" راجپوت محافظ کے لہجے میں وہی ناگواری تھی اور چہرے پر وہی ناپسندیدگی کے آثار نمایاں تھے۔

"اس دھوئیں کو تو راجہ رتن سنگھ اور مہارانی پدمنی بھی نہیں روک سکتے۔"

راج محل کی پراسراریت نے نیا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ آفریدی' راجپوت محافظ کی زبانی چتوڑ کے مزید حالات جاننا چاہتا تھا اس لئے وہ گفتگو کا زاویہ بدل کر بولا۔

"راجہ رتن سنگھ اور مہارانی پدمنی اس دھوئیں کو برداشت کر سکتے ہیں' یہ ان کا ذاتی فعل ہے مگر ایک شاہی سفیر کو اس طرح پریشان نہیں کیا جاتا کہ وہ رات کی نیند سے بھی محروم ہو جائے۔" اب علی عامر کے الفاظ میں بھی غیر سفارتی رنگ شامل ہو گیا تھا۔

"وہ باہر سے آنے والا کوئی مہمان ہو یا راجپوتانے کا کوئی باشندہ' ہر شخص اس دھوئیں کو برداشت کرنے کے لئے مجبور ہے۔" اب محافظ سپاہی پوری طرح جذباتی ہو گیا تھا۔ "یہ مقدس دھواں صدیوں سے ہے اور صدیوں تک نسل در نسل جاری رہے گا۔ اسے کوئی نہیں روک سکتا۔" یہ کہتے کہتے راجپوت سپاہی کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو گئی تھی اور آواز سے مذہبی جوش نمایاں ہونے لگا تھا۔

"مقدس دھواں؟" علی عامر آفریدی کو شدید حیرت ہو رہی تھی۔

"ہاں! مقدس دھواں۔" راجپوت سپاہی لمحہ بہ لمحہ پرجوش ہوتا جارہا تھا۔ "یہی وہ دھواں ہے جو چتوڑ کی فضاؤں پر سیکڑوں سال سے سایہ فگن ہے۔ اس دھویں نے راجپوتوں کو عظیم بنایا ہے اور ان کی دھرتی کو دشمنوں کی تخریب کاری سے محفوظ رکھا ہے۔ یہ دھواں اپنے پرستاروں کو نئی زندگی بخشتا ہے اور انکار کرنے والوں کو ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔"

محافظ راجپوت کی باتیں سن کر آفریدی سمجھ چکا تھا کہ یہ دھواں چتوڑ میں کسی مخصوص مذہبی رسم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ سنبھل گیا اور پھر بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس راجپوت سپاہی سے پوچھنے لگا۔ "میں کل رات بھی اسی کمرے میں موجود تھا مگر دھویں کے کوئی آثار نہیں تھے پھر آج یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ کیا مہامنتری نہیں چاہتے کہ میں چین سے سو سکوں؟" آفریدی نے نہایت محتاط انداز میں محافظ سپاہی کے جذبات کو مشتعل کرنے کی کوشش کی تھی۔

راجپوت محافظ' علی عامر آفریدی کے اس انداز گفتگو پر بگڑ گیا۔ "کل رات تم بے ہوش تھے اس لئے بے خبر رہے۔ دھویں کی خوشبو سونگھے بغیر اہل چتوڑ کی کوئی رات نہیں گزرتی۔ اگر کسی ایک رات بھی آگ روشن نہ ہو اور مقدس دھواں راج محل کے در و بام پر نہ پھیلے تو اہل چتوڑ نامعلوم مصائب کا شکار ہو جائیں اور ان کے لئے آسمان سے نئی نئی بلاؤں کی بارش ہونے لگے۔"

آفریدی چتوڑ کے باشندوں کی توہم پرستی کا راز جان چکا تھا' اس لئے اب وہ ناقابل برداشت دھویں سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ "تم اس مقدس دھویں کی خوشبو سے نئی زندگی حاصل کرتے رہو مگر میں اس سے فوری نجات چاہتا ہوں۔ میرے کمرے کا دروازہ بند کر دو اور اس شخص کو بھی خاموش کر دو جو لوگوں کی نیندوں میں خلل ڈالنے کیلئے نصف شب کے سناٹے میں چیخ رہا ہے۔"

آفریدی کی بات سن کر راجپوت محافظ غصے سے بے قابو ہو گیا۔ "تم کس شخص کو خاموش کرنے کیلئے کہہ رہے ہو؟"

"کیا تمہیں یہ آواز سنائی نہیں دے رہی ہے؟" آفریدی نے اس سوال کا جوب دینے کے بجائے خود ایک نیا سوال کر دیا تھا۔

"یہ آواز مہاراج رام دیو کی ہے۔" راجپوت محافظ غضب ناک لہجے میں بول رہا تھا "تم اس مہاپرش کا نام بے ادبی سے لے رہے ہو جو پورے راجپوتانے کا پالن ہار ہے' چتوڑ کا رکشک ہے' ہندو دھرم کا سب سے بڑا سیوک ہے اور دیوتاؤں کی آنکھ کا دیپک ہے۔ اگر مہاراج رام دیو راتوں کو جاگ کر یہ کٹھن جاپ نہ کریں تو ہمارے شترو چتوڑ کی دھرتی کو رن بھومی (میدان جنگ) بنا ڈالیں اور ہم سب کا یہ سکھی جیون ناش کی اگنی میں جل کر بھسم ہو جائے۔" یہ کہتے کہتے راجپوت محافظ کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا تھا اور اس کے منہ سے کف اڑنے لگا تھا۔

آفریدی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ نادانستگی میں ایک ایسی بات کہہ گیا تھا جس نے راجپوت محافظ کے مذہبی جذبات مجروح کر دیئے تھے۔ "میں تم سے شرمندہ ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ آواز تمہارے مہاراج رام دیو کی ہے۔" آفریدی ندامت آمیز لہجے میں اپنی معذرت پیش کر رہا تھا۔

"اگر تم غیر ملکی سفیر نہ ہوتے تو آج تمہارے یہ چوڑے کاندھے سر کے بوجھ سے ہلکے ہو جاتے۔" راجپوت محافظ نے اضطراری حالت کے زیر اثر اپنی شمشیر کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آئندہ سوچے سمجھے بغیر ہمارے دیوتاؤں کی شان میں کوئی بات نہ کہنا۔ یہ پہلی اور آخری تنبیہہ ہے۔ ہم لوگ دوسری غلطی کو معاف کرنے کے عادی نہیں ہیں۔" محافظ سپاہی کو آفریدی کی پشیمانی کا کوئی احساس نہیں تھا وہ اپنی طاقت کا

مظاہرہ کرتا ہوا چلا گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ کواڑوں کو پوری طاقت کے ساتھ کھینچا گیا تھا جس سے محافظ کے غصے اور مشتعل جذبات کی بھرپور نمائش ہوتی تھی۔

علی عامر آفریدی واقعتاً اپنی غلطی پر شرمسار تھا۔ اس نے انجانے میں مہاراج رام دیو کو ایک عام انسان سمجھ لیا تھا اور نہ حقیقت تو یہ تھی کہ بے خبری کے باوجود اس کی زبان سے راجپوتوں کے مذہبی پیشوا کیلئے کوئی ناشائستہ لفظ ادا نہیں ہوا تھا پھر بھی محافظ سپاہی نے اس کی بڑی دل آزاری کی تھی۔ یہ ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا جس سے آفریدی کو بڑے صبر و ضبط کے ساتھ گزرنا پڑا۔

دروازہ بند ہو جانے سے دھویں کا مسلسل داخلہ ختم ہو گیا تھا مگر ابھی تک کمرے میں لوبان کی خوشبو کے اثرات موجود تھے۔ پھر بھی کچھ دیر بعد جب یہ گھٹن ختم ہو گئی تو علی عامر آفریدی نے مہاراج رام دیو کے بارے میں سوچا۔

"کیا یہ راجپوت محض ایک رام دیو اور اس کے پھیلائے ہوئے مقدس دھویں کی طاقت پر زندہ ہیں؟" آفریدی چتوڑ کی سیاسی حالت پر غور کر رہا تھا۔ راجپوت معاشرے میں اونچ نیچ' رقص' شراب' عیش پرستی عام ہو چکی ہے۔ مقامی آبادی اپنی طاقت پر اعتبار کرنے کے بجائے توہمات میں الجھی ہوئی ہے۔ یہاں صرف ایک شخص رام دیو جاگ رہا ہے اور باقی لوگ لوبان کے دھویں کے اثرات میں بدمست پڑے ہیں۔ ایسی بے خبر قوم کو نہایت آسانی سے غلام بنایا جا سکتا ہے۔ آفریدی کی سوچ وسیع ہوتی جا رہی تھی اور وہ خود کلامی کے انداز میں زیر لب بول رہا تھا۔

"مجھے سلطان کے خوابوں کی تعبیر سامنے نظر آ رہی ہے۔ بے جان دیوتاؤں کی محبت کی افیم کھا کر یہ قوم زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسے سلطان کے ہاتھوں اپنی آزادی فروخت کرنا ہی ہوگی۔"

آفریدی زخمی ہونے کے باوجود بہت خوش تھا وہ اپنے ساتھ پیش آنے والے حادثے کو ایک نیک فال سمجھ رہا تھا۔ بڑے بڑے پراسرار چہرے کھل کر سامنے آ رہے تھے اور حالات کے رخ پر پڑے ہوئے پردے عجیب انداز میں خود بخود ہٹتے جا رہے تھے۔ یہ فتح کی علامت تھی مگر جب آفریدی کو کانتا کی یاد آئی تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ کہیں نہ کہیں شکست کھا گیا ہے اور اس کے سینے میں کوئی نہ کوئی چیز ٹوٹ کر بکھر گئی ہے۔ آفریدی رات بھر جاگتا رہا۔ جسم کے زخموں نے اور دل کی جراحتوں نے اسے ایک لمحے کیلئے بھی چین سے سونے نہیں دیا۔

☆..................☆..................☆

صبح ہوتے ہی حسب معمول مہامنتری وکرم سنگھ' آفریدی کی خبر گیری کے لئے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ آفریدی نے آداب حکمرانی کے زیر اثر اپنے بستر پر اٹھنے کی کوشش کی مگر وکرم سنگھ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔ "تم بہت زیادہ زخمی ہو چکے ہو اور ایک زخمی شخص اپنی ناتوانی کے باعث بعض رسمیں ادا کرنے کا پابند نہیں ہوتا۔ آرام سے لیٹے رہو۔" وکرم سنگھ کا لہجہ بظاہر نرم محسوس ہو رہا تھا مگر گزشتہ دنوں کی طرح اس کے انداز گفتگو میں شگفتگی نہیں تھی۔ ایک قسم کی بیگانگی اور بے تعلقی تھی جسے آفریدی نے فوراً ہی محسوس کر لیا تھا۔

"آپ کے راج وید میرے زخموں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟" آفریدی نے وکرم سنگھ کی بدلی ہوئی روش کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "ان کے خیال میں مجھے کب تک اس معذوری سے نجات مل جائے گی۔"

وکرم سنگھ نے آفریدی کے سوال کا فوراً جواب نہیں دیا۔ وہ چند لمحوں کے لئے سوچتا رہا اور پھر بڑی

بے دلی کے ساتھ کہنے لگا۔ "راج وید تمہاری صحت کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ جلد از جلد صحت یاب ہونا چاہتے ہو یا.........۔" وکرم سنگھ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"میں مہامنتری کی نامکمل گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔" آفریدی، وکرم سنگھ کا مطلب سمجھ چکا تھا مگر وہ مہامنتری کی طرح خود بھی مصلحت سے کام لے رہا تھا۔

"ایک سفیر کو اپنی ذمے داریوں کا احساس ہونا چاہئے۔" مہامنتری وکرم سنگھ نے یکسر بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بے شک! یہ میزبان کا فرض ہے کہ وہ اپنے مہمان کی خاطر داری کا لحاظ رکھے مگر مہمان بھی کچھ اخلاقی اصولوں کا پابند ہوتا ہے اگر یہ پابندی مجروح ہونے لگے تو مہمان اپنے درجے سے گر جاتا ہے۔ پھر وہ مہمان نہیں رہتا۔ ایک بار گراں بن جاتا ہے۔" وکرم سنگھ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔

"کیا مہامنتری پورے یقین کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ میں نے اپنی سفارتی ذمے داریوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔" آفریدی سمجھ چکا تھا کہ وکرم سنگھ درپردہ کیا کہنا چاہتا ہے، اس لئے وہ بھی مبہم انداز اختیار کرتے ہوئے حقیقت کی طرف پلٹ آیا تھا۔

"ہاں! تم اپنا سفارتی منصب بھلا چکے ہو۔" اب کی بار وکرم سنگھ کی آواز قدرے تیز تھی۔ "تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ تم راجپوتوں کے دیوتاؤں پر انگلی اٹھاؤ یا ان کی شان میں کوئی حقیر لفظ استعمال کرو۔"

صورت حال واضح ہو چکی تھی۔ رام دیو کے بارے میں محافظ سپاہیوں نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے وکرم سنگھ کو ورغلانے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں مہامنتری کا رویہ بدل گیا تھا۔

"آپ کو غلط اطلاعات فراہم کی گئی ہیں۔" آفریدی نے انتہائی جرأت و بےباکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اچانک کمرے میں دھواں بھر جانے سے مجھے گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا، اس لئے میں نے محافظ سپاہیوں سے دروازہ بند کرنے کو کہا تھا بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

"تم نے مہاراج رام دیو کی توہین بھی کی تھی۔" وکرم سنگھ کے لہجے میں بدستور ناگواری کی آمیزش تھی۔

"جس شخص کو میں نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا اور جس سے میرا کوئی تعارف نہیں، میں اس کی تحقیر کس طرح کر سکتا ہوں؟" آفریدی نے اپنی صفائی کیلئے ایک مضبوط دلیل پیش کی تھی۔ "میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ اس آواز کو بھی خاموش کرا دو کہ اس سے لوگوں کی نیندوں میں خلل پڑتا ہے۔ پھر جب معلوم ہوا کہ وہ آواز مہاراج رام دیو کی ہے جسے کسی صورت بھی بند نہیں کرایا جا سکتا تو میں نے محافظ سپاہی سے یہ کہہ کر معذرت طلب کر لی تھی کہ جو کچھ بھی ہوا نادانستگی میں ہوا میری اس سچائی کو جھوٹ کا لباس پہنا کر جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ مناسب نہیں۔ میرے نزدیک یہ انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے کہ کسی شخص کی آواز دن بھر کے تھکے ماندے لوگوں سے ان کے خواب چھین لے مگر جب مجھ پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ اس آواز کا گونجتے رہنا اہل چتوڑ کے لئے مذہبی رسم کی حیثیت رکھتا ہے تو میں نے مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ مجھے اس آواز نے رات بھر سونے نہیں دیا۔ اب ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو براہِ کرم مجھے اس جگہ منتقل کر دیجئے جہاں وہ آواز میری سماعت کا تعاقب نہ کرے۔ میزبان کو اپنی رسمیں اپنی ذات تک محدود رکھنی چاہئیں ورنہ یہ میزبانی نہیں، دل آزاری ہے۔" آفریدی نے بھی اپنے دل کی بات اس طرح کہہ ڈالی کہ مہامنتری وکرم سنگھ، شاہی سفیر کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

کچھ دیر تک وکرم سنگھ سکوت کے عالم میں بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر مختلف رنگ ڈوب ڈوب کر ابھر رہے

تھے۔ یہ رنگ قہر و نفرت کے رنگ تھے۔ آفریدی کا جواب سن کر وکرم سنگھ کا ذہن جل اٹھا تھا مگر وہ ایک باہوش سیاستدان تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پایا اور بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔

"تمہارا ایک جرم یہ ہے کہ تم نے درباری رقاصہ کانتا کو اپنے دلکش چہرے اور منافقانہ باتوں سے یہاں تک اکسایا کہ اس نے چتوڑ کے کئی راز فاش کر دیئے اور سلطان علاءالدین خلجی کو ریاست پر حملے کی دعوت دیدی۔ یہ بڑا سنگین جرم ہے آفریدی! اسے نہ میں معاف کر سکتا ہوں، نہ راجہ رتن سنگھ اور نہ مہارانی پدمنی۔" ضبطِ احتیاط کے باوجود وکرم سنگھ کا لہجہ غضب ناک ہو گیا تھا۔

ایک اور جھوٹ بڑی شدت کے ساتھ بولا گیا تھا۔ آفریدی اس تہمت کو برداشت نہ کر سکا۔

"مہامنتری! مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے کہ راجپوت اپنے معیار حیات پر قائم نہیں رہے یا پھر ان کی شجاعت کے افسانے غلط مشہور ہو گئے ہیں۔ یہ کیسی مردانگی ہے کہ مسلسل میری ذات سے جھوٹ اور حیلہ بازی کو منسوب کیا جا رہا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ان تمام باتوں سے آپ کا کیا مقصد ہے؟ میں نے کب یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ آپ میرے لئے عورت و شراب کا اہتمام کریں۔ یہ میری توہین تھی مگر میں کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لایا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی دل آزاریوں کا ذکر کرتا، مجھ سے کہا جا رہا ہے کہ میں نے راجپوتوں کے دیوتاؤں کی تذلیل کی ہے اور ایک درباری رقاصہ کو فریب دے کر سلطان علاءالدین خلجی کے لئے جاسوسی کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ میں ان محافظ سپاہیوں کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں جنہوں نے آپ کو یہ من گھڑت کہانیاں سنا کر مجھے منصبِ سفارت سے گرانے کی ذلت آمیز کوشش کی ہے۔ اگر یہی نقب زنی اور عیاری چتوڑ کی سیاست کا مشغلہ ہے تو مجھے اسی زخمی حالت میں رانی پدمنی کے روبرو پیش کر دیا جائے۔ اور اگر مہامنتری کو یہ بھی پسند نہیں تو مجھے میرے گھوڑے کی پشت پر ڈال کر رخصت کر دیا جائے۔ میں دہلی واپس جانا چاہتا ہوں۔ میرے کسی گوشۂ تصور میں بھی نہیں تھا کہ شاہی سفیر کے ساتھ اس قدر بدسلوکی کی جائے گی۔ میں کچھ دیر پہلے تک آپ کی مہمان نوازی اور تواضع کا بہت قدر دان تھا مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں راجپوتوں کی کسی خراج گزار ریاست کا حقیر سا نمائندہ ہوں، سلطان علاءالدین خلجی کا باوقار سفیر نہیں۔" علی عامر آفریدی جوشِ اضطراب میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

مہامنتری ایک بار پھر حیرت و سکوت کا شکار ہو گیا۔ اسے یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ موت کے نرغے میں گھر جانے کے بعد بھی شاہی سفیر آبرومندانہ زندگی کا ثبوت فراہم کرے گا۔ وکرم سنگھ کا خیال تھا کہ آفریدی اپنی کوتاہی کا احساس کر کے شرمندہ ہو جائے گا اور پھر جب اس کے جرائم کی بات کی جائے گی تو وہ اپنے دل پر راجپوتوں کی ہیبت محسوس کرے گا۔ مگر علی عامر کی جرأتِ گفتار نے مہامنتری کا منصوبہ ناکام بنا دیا تھا اور اب وکرم سنگھ اس زخمی نوجوان کی طرف پریشان نظروں سے دیکھ رہا تھا جس کے تیوروں میں بجلی سے زیادہ چمک اور تلوار سے زیادہ کاٹ تھی۔

"میں رقاصہ کانتا سے بھی آپ کے سامنے ملنا چاہتا ہوں تاکہ میرے کردار پر لگا یا ہوا یہ داغ دھل سکے وہ خود اقرار کرے گی کہ جرم کس سے سرزد ہوا ہے اور گناہ گار کون ہے؟" آفریدی نے وکرم سنگھ کو خاموش پا کر اپنے دل کا غبار کم کرنا چاہا۔

"اب اس کی گواہی کسی کے کام نہیں آئے گی۔" وکرم سنگھ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "وہ قتل کر دی گئی۔"

یہ لرزہ خیز انکشاف سن کر آفریدی سناٹے میں آ گیا۔ اس رقاصہ کے سزا یاب ہونے کا یقین تو اسی وقت

آ گیا تھا جب راجہ رتن سنگھ کے جاسوس سپاہی کانتا کو بے دردی کے ساتھ کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے مگر آفریدی کو اس سنگدلی کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ رقاصہ کو قید میں ڈال دیا جائے گا یا پھر اس کے نازک سے جسم پر تشدد کے کچھ نشانات ابھر آئیں گے۔ لیکن وکرم سنگھ جو کچھ بتا رہا تھا وہ تو آفریدی کے قیاس و گمان کی حدود سے بھی باہر تھا۔ یکایک اس کی آنکھوں کے سامنے رات کا وہ منظر ابھر آیا جب کانتا پرسوز آواز میں گا رہی تھی۔

"ہمیں اس وقت ماؤں کی گود سے جدا کر دیا گیا جب ہمارے لوریاں سننے کے دن تھے۔ "

پھر آفریدی کو کانتا کے آخری الفاظ یاد آ گئے جب وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی "مہمان! تم دہلی واپس جاؤ تو میرا یہ گیت اپنے سلطان کو بھی سنا دینا۔ "

اپنے تصورات کا عکس دیکھ کر آفریدی لرز اٹھا۔ ابھی اس نے سلطان کو ایک اجنبی مطربہ کا گیت سنایا بھی نہیں تھا کہ موسیقی کا آبشار خشک ہو گیا اور وہ نغمہ گر قتل کر دی گئی۔

پھر آفریدی کے خیالات کی رو صحرائے عرب کی طرف بھٹک گئی جہاں عہد جاہلیت میں معصوم لڑکیاں زندہ دفن کر دی جاتی تھیں جور و ستم کی اسی تاریخ نے پھر نئے انداز سے کروٹ لی تھی۔

آفریدی کے چہرے پر کرب و اذیت کا رنگ نمایاں دیکھ کر مہامنتری مسکرانے لگا "کیا سوچ رہے ہو ؟" وکرم سنگھ کے لہجے میں گہرا طنز پوشیدہ تھا۔

آفریدی خیالات کے حصار سے نکل آیا اور مہامنتری کی طرف کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ایسا لگتا ہے کہ تمہیں کانتا کی موت سے بہت صدمہ پہنچا ہے۔ " وکرم سنگھ کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

"ہاں! بہت زیادہ' آپ کے اندازے سے بھی کہیں زیادہ۔ " آفریدی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی وہ بہت آہستہ بول رہا تھا۔

"یہی تمہارے جرم کا ثبوت ہے۔ " مہامنتری نے ہنستے ہوئے آفریدی کے زخموں پر نشترزنی کی "تمہیں کانتا کی موت کا دکھ نہیں' اس بات کا غم ہے کہ وہ رقاصہ موت کی نیند سلا دی گئی۔ اگر تمہارے کمرے میں اس کی کچھ اور راتیں جاگتے ہوئے گزر جاتیں تو شاید چتوڑ کے کچھ اور راز بے نقاب ہو جاتے مگر موت نے کانتا کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ اپنے وطن کے بارے میں مزید معلومات تمہارے ہاتھ فروخت کر سکتی۔ تمہیں اسی رشتے کے اچانک ٹوٹ جانے کا افسوس ہے۔ "

آفریدی نے فوری طور پر وکرم سنگھ کے الزامات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اداس نظروں سے مہامنتری کو دیکھتا رہا پھر ایک مختصر سے وقفۂ سکوت کے بعد اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

"مہامنتری! آپ نے مجھے اتنی دیر میں سیاسی نشیب و فراز کی کئی داستانیں سنا ڈالیں مگر میں اپنی کتاب مقدس کی صرف ایک آیت سنانا چاہتا ہوں۔ میں کانتا کی موت کے ساتھ خدا کے اس کلام پر بھی غور کر رہا تھا جب صحرائے عرب میں انسانی خون مسلسل جذب ہوتا جا رہا تھا' اس وقت میرے رسولؐ پر یہ آیت نازل ہوئی۔

"وہ دن جب ان بے گناہ لڑکیوں سے پوچھا جائے گا کہ آخر تمہیں کس جرم میں زندہ دفن کیا گیا تھا۔ "

"کانتا کے قتل کی خبر سن کر مجھے یہ آیت یاد آ گئی تھی اور میں راجپوتانے (راجستھان) کے ریگستان سے نکل کر کئی صدی پہلے کے صحرائے عرب میں چلا گیا تھا۔ اب دوبارہ چتوڑ کی طرف لوٹا ہوں تو

کانتا سوال کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ "

"مہمان! مجھے آخر کس جرم میں قتل کیا گیا ہے ؟ میں اسے کیا جواب دوں ؟ وہ تو مجھ سے بہت دور چلی گئی اگر آپ کے جنگجو اور شجاع سپاہی کانتا کو میرے سامنے قتل کرتے تو میں بے دریغ کہہ دیتا کہ تجھے سچ بولنے کے گناہ پر ذبح کیا گیا۔ " آفریدی کا لہجہ بہت شکستہ تھا۔

"وہ غدار وطن تھی' اس لئے قتل کر دی گئی۔ " وکرم سنگھ کے لہجے میں ایک بار پھر قہر و نفرت کا رنگ شامل ہو گیا تھا۔ "اس نے اپنی مٹی سے بےوفائی کی تھی۔ وہ اپنی دھرتی کو ان مسلمانوں کے ہاتھ بیچنا چاہتی تھی جنہیں ہم غاصب اور گمراہ سمجھتے ہیں۔ "

"نہیں مہامنتری! وہ غدار نہیں تھی وہ ازل سے ترسی ہوئی ایک محکوم اور پسماندہ قوم کی لڑکی تھی جس کا آبگینہ جسم ٹوٹ گیا تھا اور روح دریدہ ہو چکی تھی۔ وہ حسن سلوک کی بھوکی اور مساوات کی پیاسی تھی۔ میری نظر میں وہ راجپوت لڑکیوں سے بھی زیادہ بہادر تھی کہ اپنی ہم جنسوں کی آبرو پر قربان ہو گئی۔ مجھے حرف بہ حرف اس کا گیت یاد ہے۔ میں کانتا کی آخری خواہش ضرور پوری کروں گا۔ سلطان معظم بھی یہ گیت سنیں گے۔ پھر انہیں اندازہ ہو گا کہ نغمگی کی قبا کس کس طرح چاک کی گئی ہے۔ " آفریدی بہت دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔ "مہامنتری! مجھے آپ کی تہذیب نے بہت مایوس کیا ہے۔ "

آفریدی کی بات سن کر وکرم سنگھ پھر بھڑک اٹھا۔ "میں شاہی سفیر کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کرے۔ " مہامنتری کا لہجہ برہم تھا اور اس کی آنکھوں میں آفریدی کیلئے نفرت کا ایک طوفان موجزن تھا۔

"مداخلت خود بخود نہیں ہوتی۔ صدیوں تک زمین کی تہہ پر انسانی خون جمتا رہتا ہے' جوانیاں پیرہن کو ترسنے لگتی ہیں' خدا کی بخشی ہوئی تمام نعمتیں چند ہاتھوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں اور یہی چند آدمیوں کا گروہ خدائی کا دعویٰ کر دیتا ہے۔ پھر انسان کی یہی محرومیاں غیروں کو مداخلت کی دعوت دیتی ہیں۔ اس دعوت پر سلطان نہیں آئے گا تو کوئی دوسری طاقت آئے گی تاکہ زمین کی ناہمواریاں دور ہو جائیں۔ " آفریدی کے الفاظ کیا تھے' آتش فشاں کا دہانہ کھل گیا تھا۔

مہامنتری کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ شدید عالم طیش میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے واپس جانے کے لئے تیزی سے قدم بڑھائے مگر اچانک پلٹ آیا۔ "سفارت کے یہ انداز نہیں ہوتے۔ تم نے ہمارے مذہب' ہماری سیاست اور ہمارے معاشرے کی اس طرح توہین کی ہے کہ ہم اسے فراموش نہیں کر سکتے۔ اب ہم تمہارے جرائم کے ثبوت پیش کرنے کے پابند نہیں ہیں۔ خود تمہاری زبان ہی کھلی ہوئی مجرم ہے اور یہی زبان ایک دن رنگ لا کر رہے گی۔ " یہ کہہ کر وکرم سنگھ آفریدی کے کمرے سے نکلا اور اس خلوت خاص میں چلا گیا جہاں راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔

☆..................☆..................☆

وکرم سنگھ کو دیکھتے ہی راجہ رتن سنگھ بول اٹھا۔ "اب سلطان کے سفیر کا کیا حال ہے ؟"

"حالت پہلے سے بہتر ہوتی جا رہی تھی مگر کل رات اس نے رقاصہ کو بچانے کے لئے دوبارہ اپنے آپ کو زخمی کر لیا۔ " وکرم سنگھ سر جھکائے وضاحت کر رہا تھا۔

"کیا تم نے اسے کانتا کے قتل کی خبر سنا دی ؟" راجہ رتن سنگھ نے دریافت کیا۔

"میں نے بہت لرزہ خیز انداز میں اسے اطلاع بہم پہنچائی تھی مگر وہ اس خونیں کھیل سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ کہہ رہا تھا کہ یہی ظلم بڑی طاقتوں کو دوسروں کے معاملات میں مداخلت کی دعوت دیتا ہے۔ "

"اسے یہ جرات کیونکر ہوئی۔" اب کی بار رانی پدمنی' وکرم سنگھ سے مخاطب ہوئی تھی اور اس کا لہجہ نہایت تحقیر آمیز تھا۔

"وہ ایک ذہین' تعلیم یافتہ اور بے باک سفیر ہے۔ حالات کے ایک ایک پہلو پر نظر رکھتا ہے۔ کانتا کی زبان کی ایک لغزش نے اس پر یہ راز فاش کر دیا ہے کہ ریاست نا انصافیوں کی آگ میں جل رہی ہے اور سلطان علاء الدین خلجی اسی آگ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔"

"پھر اسے خاموشی کے ساتھ قتل کر دو۔" رانی پدمنی کی غرور و ناز میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

"اس واقعے کے بعد آفریدی کا دہلی واپس جانا زیادہ خطرناک ہوگا۔" رانی پدمنی بزعم خود سیاست کے ایک مسئلے کو سلجھا رہی تھی مگر اس کی رائے سراسر احمقانہ تھی۔

"مہارانی! کسی بڑی طاقت کے سفیر کا قتل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اگر ہم شدت جذبات میں ایسا کر بیٹھیں تو سلطان کا غصہ وحشت و درندگی کا رنگ اختیار کر لے گا۔ اگر کسی بستی میں ایک تنکا بھی اس کے خلاف سرکشی اختیار کرتا ہے تو وہ پوری بستی کو ڈبونے کے لئے ہلاکت و بربادی کا سیلاب لے آتا ہے۔"

"کیا راجپوت سورما کوئی لقمۂ تر ہیں کہ سلطان کی خوراک بن جائیں۔" رانی پدمنی اپنے حسن کے نشے میں وہی طفلانہ باتیں کر رہی تھی۔

وکرم سنگھ کچھ دیر کیلئے گہری سوچ میں غرق ہو گیا پھر اس نے سر اٹھایا اور مؤدب لہجے میں رانی پدمنی سے کہنے لگا۔ "اب تک شاہی سفیر کی ایک ہی کمزوری میرے ہاتھ آسکی ہے۔"

"وہ کیا؟" رانی پدمنی نے پرجوش لہجے میں پوچھا۔

"وہ مہاراج رام دیو کی سلگائی ہوئی خوشبو کے دھوئیں اور ہیبت ناک آواز میں پڑھے جانے والے منتروں سے سخت بیزار ہے۔ کل رات وہ ایک لمحے کیلئے بھی نہیں سوسکا۔ اگر مہاراج رام دیو اپنے سارے طلسمات آفریدی کے سامنے ظاہر کر دیں اور اپنی تمام ساحرانہ قوتوں کو استعمال میں لے آئیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ دہشت زدہ ہو جائے گا۔ اور پھر خوف کی یہ کیفیت جب اس کے اعصاب پر مسلط ہو جائے گی تو اس بات کا امکان موجود ہے کہ وہ دہلی جا کر سلطان کے سامنے سارے حالات بیان کرے گا اور اس طرح تسلیم کر لیا جائے گا کہ چتوڑ صدیوں کی طرح آج بھی ناقابل تسخیر ہے۔ بس یہی ایک صورت ہے کہ ہم علاء الدین خلجی کے قہر و غضب سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

ماضی کے پس منظر میں مہامنتری وکرم سنگھ کا مشورہ معقول تھا۔ مہاراج رام دیو نے اپنی ساحرانہ قوتوں کے ذریعے کئی دشمن ریاستوں پر غلبہ حاصل کیا تھا۔ دشمن سپاہیوں پر کبھی آگ برسی تھی اور کبھی ژالہ باری ہوئی تھی۔ کبھی آندھی کا ایسا گرد و غبار اٹھا تھا کہ حریفوں کے خیمے تک اکھڑ گئے تھے۔ ان مسلسل واقعات کے بعد پھر کسی ہندو ریاست کے حکمراں نے چتوڑ کا رخ نہیں کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مہاراج رام دیو کو راجپوتانے (راجستھان) کا "ساحر اعظم" مان لیا گیا تھا۔

مہاراج رام دیو' شادی دیو کے بھائی کی نسل میں سب سے بڑا جادوگر تھا۔ شادی دیو وہ ساحر تھا جس پر سارے ہند کے بت پرست ناز کرتے تھے۔ شادی دیو نے اس ہلاکت خیز علم کو اس قدر عروج پر پہنچا دیا تھا کہ طویل و عریض ہندوستان میں اس کی مہارت فن کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی تھی۔ ہندوؤں کی بعض کتابوں میں بڑے فخر سے یہ بات لکھی گئی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے دور میں جو حیثیت سامری کی تھی' پرتھوی راج چوہان کے عہد حکومت میں وہی درجہ شادی دیو کا تھا۔ پھر جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر

تشریف لائے تو پرتھوی راج نے آپ کو اس علاقے سے بے دخل کرنے کیلئے شادی دیو کی شعبدہ بازیوں کا سہارا لیا۔ ہندوستان کا وہ پورا دور طلسمات اور جادو کے شکنجوں میں جکڑا ہوا تھا۔ شادی دیو نے اس مرد مسلمان کے سامنے اپنے آبائی ہنر کے کئی بھرپور مظاہرے کئے مگر حضرت خواجہ غریب نوازؒ پر شادی دیو کے سحر کا ذرہ برابر اثر بھی نہیں ہوا پھر جب شادی دیو آخری معرکے کے لئے حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے مقابل آیا تو اپنے بزرگوں کا سکھایا ہوا سارا جادو بھول گیا اور پھر اس نے عاجز آکر سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے پائے اقدس پر اپنا سر رکھ دیا اور ایک نگاہ کرم کی بھیک مانگنے لگا۔ حضرت خواجہؒ نے شادی دیو کو مشرف بہ اسلام کیا۔ ایمان کی دولت سے سرفراز ہونے کے بعد شادی دیو نے اپنے چھوٹے بھائی کام دیو کو بھی اسلام کی دعوت دی مگر اس کا قلب مکمل طور پر سیاہ ہو چکا تھا۔ شہاب الدین غوری کے ہاتھوں پرتھوی راج چوہان کی شکست کے بعد کام دیو اجمیر سے فرار ہو کر چتوڑ میں مقیم ہو گیا یہاں آکر اس نے بے پناہ ترقی کی اور شادی دیو کی جگہ "ساحر اعظم" کا خطاب پایا۔ پھر کام دیو دنیا سے رخصت ہونے لگا تو اس نے سارا سیاہ علم اپنے بیٹے رام دیو کو منتقل کر دیا۔ اس وقت مسلمانوں کی سیاسی حکمت عملی کچھ اور تھی۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق دیگر علاقوں پر لشکر کشی کر رہے تھے۔

چتوڑ اور راجپوتوں کے دیگر علاقوں سے یہ بے تعلقی دیکھ کر رام دیو نے مشہور کر دیا کہ اب مسلمان کبھی ادھر کا رخ نہیں کریں گے اور یہ جو کچھ ہوگا اس کے جادو کے زیر اثر ہوگا۔ مگر جب سلطان علاء الدین خلجی نے چتوڑ کی تسخیر کا منصوبہ بنایا اور ابتدائی مرحلے میں اپنے سفیر علی عامر آفریدی کو بھیجا تو یہاں کے حکمرانوں کی راتیں بے خواب ہو گئیں۔

علی عامر کی شجاعت و بے باکی نے راجپوتوں کے حکمراں طبقے پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ اب کی بار سرزمین چتوڑ بھی سلطان کے قدموں کو بوسہ دیئے بغیر محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ یہی وجہ تھی کہ راجہ رتن سنگھ اور مہارانی پدمنی علی عامر آفریدی کو رام دیو کی ساحرانہ قوتوں سے دہشت زدہ کرنا چاہتے تھے۔

پھر طویل غور و فکر کے بعد یہ طے پایا گیا کہ جب تک علی عامر آفریدی کے زخم اچھے نہیں ہو جاتے' اس وقت تک روزانہ اس کے کمرے میں ایک خوبصورت جام بکف عورت بھیجی جائے اور مہاراج رام دیو اپنا خوفناک جادوئی عمل جاری رکھیں تاکہ دیوتاؤں کی قوت کے مظاہرے دیکھ کر آفریدی اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔

پھر جب فضاؤں کے دوش پر رات کی زلفیں بکھر گئیں تو علی عامر آفریدی کے خیالات سیلاب کے سرکش پانی کی طرح بہنے لگے۔ پھر اچانک کسی نے تصورات کی موجوں کے سامنے کوئی دیوار سی کھڑی کر دی۔ آفریدی کی سوچ کا طلسم ٹوٹ گیا اور اس طلسم کو توڑنے والی وہ لڑکی تھی جو سونے کے طشت میں سامانِ کیف و نشاط لئے علی عامر کے سامنے کھڑی تھی۔

"ایک اور کانتا؟" آفریدی لرز سا گیا۔ پھر آفریدی نے خود ہی اپنے خیال کی نفی کر دی۔ "نہیں یہ کانتا نہیں ہے۔" سامنے کھڑی ہوئی لڑکی کے چہرے پر نہ وہ معصومیت تھی' نہ وہ زخم خوردہ مسکراہٹ اور نہ روشن آنکھوں کے گوشوں سے ابھرتا ہوا وہ نم آلود دھواں۔ پھر یہ کون تھی؟ یقیناً مہامنتری کی آلۂ کار ہوگی۔ پھر وہی ہوا مہامنتری نے ریاست کی خوبصورت ترین لڑکی کو اس لئے بھیجا تھا کہ علی عامر آفریدی اپنی توبہ توڑ دے اور وہ بھی دوسرے شاہی سفیروں کی طرح بن جائے کہ .... ریاست کی حدود میں داخل ہوئے' حکمراں طبقے کو غلامانہ سلام پیش کیا' چند روز کیلئے خوبصورت لڑکیوں کو اپنا ہم سفر بنایا' شرابیں پیں' حلال و حرام کھانے کھائے اور جوابی پیغام لے کر رخصت ہو گئے۔

علی عامر آفریدی اب مکمل طور پر خیالات کے حصار سے نکل آیا تھا اور اس لڑکی کو بغور دیکھ رہا تھا جس کے مرمریں پیکر میں جہاں سوزی کے تمام رنگ شامل تھے اور شبنم فشانی کی دھندلی سی بھی کوئی ادا موجود نہیں تھی۔

"لڑکی! تم کیوں آئی ہو؟" بالآخر آفریدی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

"مہامنتری وکرم سنگھ نے مجھے شاہی مہمان کو خوش کرنے کی ذمے داری سونپی ہے۔" لڑکی نے بڑے شوخ لہجے میں کہا۔

"تمہارا نام۔" آفریدی بے سبب اس سے گفتگو کر رہا تھا۔

"رجنی۔" لڑکی نے کہا اور شاخ گل کی طرح لہرائی۔ اس کی ادا فروشی کا ایک ایک زاویہ یہ بتا رہا تھا کہ اس نے چتوڑ کے حکمرانوں کی جنبش چشم پر رقص کرنے کے تمام آداب سیکھ لئے ہیں۔

"رجنی۔ کسے کہتے ہیں؟" آفریدی نے دوسرا سوال کیا۔

"رجنی کا مطلب ہوتا ہے رات۔" لڑکی آفریدی کی اس گفتگو سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور ساتھ ہی اپنے حسن کی سیاست کے ان حربوں کو بھی استعمال کر رہی تھی جن سے مسلح کر کے اسے آفریدی کے کمرے میں بھیجا گیا تھا۔

"بے شک! تم گہری سیاہ رات ہو۔ کسی نے تمہارے نام کا صحیح انتخاب کیا ہے۔" آفریدی کا لہجہ ناخوشگوار تھا۔

"میں کالی رات نہیں ہوں۔ میری روح کی گہرائیوں میں دیکھو' وہاں اجالا ہی اُجالا ہے۔" رجنی اچانک اداس ہو گئی تھی۔

"میں کچھ دیکھنا نہیں چاہتا۔" آفریدی کی بیزاری بڑھتی جا رہی تھی۔ "یہ شیشے اور سونے کے برتن باہر لے جا کر پھینک دو میں نے مہامنتری سے کہہ دیا تھا کہ یہ ساری چیزیں میرے لئے ناقابل برداشت ہیں۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتی۔" رجنی کی وہ عارضی کیفیت ختم ہو چکی تھی اور اب اس کے چہرے پر شوخی و شرارت کی گمراہ کن قندیلیں روشن تھیں۔ وہ رات کے خنک اندھیروں کو دن کی تپتی ہوئی دھوپ میں بدلنا چاہتی تھی۔ "مجھے یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں شاہی سفیر کو کیف و طرب کے وہ رنگین لمحات فراہم کروں کہ انہیں آخری سانسوں تک راجپوتوں کی مہمان نوازی یاد رہے۔" یہ کہہ کر رجنی نے وہ سونے کا طشت اور منقش شیشہ و صراحی ایک طرف رکھ دیئے۔

اس دوران آفریدی نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی دل آزاری کے لئے کیا جا رہا ہے۔ آفریدی چاہتا تو رجنی کے ساتھ بھی کانتا جیسا سلوک کر سکتا تھا مگر اس خیال نے اسے اپنے ارادے سے باز رکھا کہ کہیں رجنی بھی صبح ہوتے ہوتے کانتا کی طرح قتل نہ کر دی جائے۔ اس لئے اس نے کروٹ بدل لی تھی۔

"اب میں کیا کروں؟" رجنی نے شاہی سفیر کی اس حرکت کو بڑے تعجب سے دیکھا تھا وہ تیزی سے آگے بڑھی تو پورا کمرہ پازیب کی جھنکار سے گونج اٹھا۔ "آخر میرے لئے کیا حکم ہے؟" رجنی' آفریدی کے سامنے آتے ہوئے بولی۔

"صراحی میں جمع شدہ ایک ایک قطرہ اپنے حلق میں انڈیل لو پھر بدمست ہو کر باہر چلی جاؤ یا اسی کمرے کے کسی گوشے میں چپ چاپ پڑی رہو اس طرح تم پر بھی نافرمانی کا الزام نہیں آئے گا اور میری رات بھی سکون سے گزر جائے گی۔" آفریدی کی آنکھیں بدستور بند تھیں اور وہ شدید ناگواری کے انداز میں بول رہا تھا۔

"میں تو شراب نہیں پیتی۔" رجنی نے حیرت سے کہا۔

"تو پھر اپنے مہامنتری کو پلا دو وہی تمہیں اس کے ذائقے کی داد بھی دے سکے گا۔ ہم پانی پینے والے لوگ اپنی بساط سے زیادہ کی خواہش نہیں کرتے۔" آفریدی نے اپنی گفتگو کو نیا رنگ دیدیا تھا۔ جس سے رقاصہ رجنی مزید حیرت میں ڈوب گئی تھی۔

اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی نوجوان کو اس قدر بے حسی کا شکار دیکھا تھا۔ کچھ دیر تک وہ کسی مجسمے کی مانند کھڑی رہی پھر آفریدی کے پیروں کی جانب فرش پر بیٹھ کر رباب کے تاروں کو چھیڑنے لگی۔

آفریدی کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ کل رات کانتا نے بھی اسی طرح رباب چھیڑا تھا اور پھر اس کے ہونٹوں سے جو نغمہ پھوٹا تھا اسی نغمے نے اس کی جان لے لی تھی۔ آفریدی نے چاہا کہ رجنی کو گیت گانے سے روک دے اور اسے بتا دے کہ یہی گیت اس کی موت کا پیغام بھی بن سکتا ہے۔ مگر آفریدی چپ چاپ لیٹا رہا اس کی سماعت کی تمام قوتیں رباب کی آواز پر مرکوز تھیں اور وہ انتظار کر رہا تھا کہ رجنی کے ہونٹوں کو کس طرح جنبش ہوتی ہے اور ہونٹوں سے ابھرنے والے بول دل کے کس زخم کا پتا دیتے ہیں؟

رجنی کے گیت سے بھی خون بہہ رہا تھا مگر یہ خون ایک عام سی لڑکی کے جذبوں کا خون تھا جسے اس کا محبوب روتا چھوڑ کر کسی دور دراز کی بستی میں جا بسا تھا اور اب وہی لڑکی برہا کی دبی دبی آگ میں کسی گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہی تھی۔ رجنی کی آواز بھی دلکش تھی اور گائیکی کا انداز بھی موسیقی کے اصولوں پر پورا اترتا تھا۔ آفریدی انہماک سے اس کے گیت سنتا رہا۔ ہجر و فراق کی بات چلی تو علی عامر کو اپنی والدہ شائستہ بیگم اور چھوٹی بہن عالیہ یاد آ گئیں۔ ماں اور بہن کا تصور ابھرا تو ملک کافور کا غلیظ چہرہ بھی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ ان تمام یادوں میں اذیتوں کی مختلف چنگاریاں دبی ہوئی تھیں۔ آفریدی کے دل و دماغ پر جلتا ہوا غبار چھانے لگا۔

"کوئی خوشی کا راگ چھیڑو۔" آفریدی نے کربناک یادوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا۔ "کوئی بھجن گاؤ تاکہ چتوڑ کے دیوتا تم سے خوش رہیں' پتھروں کے نگر میں جو ایک بار بچھڑ گیا سو بچھڑ گیا۔ جانے والوں کو یاد نہ کرو کہ وہ بہت بے رحم ہوتے ہیں۔"

رجنی کو آفریدی کی اس فرمائش پر بڑی حیرت ہوئی تھی وہ شاہی سفیر کے الفاظ میں چھپے ہوئے طنز کو محسوس کئے بغیر ہندوؤں کا مشہور بھجن گانے لگی۔

"برج میں ہولی کھیلت نندلال۔"

اس بھجن میں کرشن جی کو اس سرزمین پر گوپیوں کے ساتھ ہولی کھیلتے ہوئے دکھایا گیا تھا جہاں رنگ و نور کی بارش ہوتی تھی۔ اور رقاصہ رجنی اسی گیت کو راجپوتوں کی اس بستی میں گا رہی تھی جہاں یہ سرکش قوم برہمنوں کے ساتھ مل کر انسانی خون سے ہولی کھیلتی تھی۔ کیسا بھجن تھا اور کیسے اس کے ماننے والے تھے؟ نیسے لچکتے' لہراتے' نرم الفاظ تھے اور کیسا زہریلا اور جان لیوا ان کا مفہوم تھا۔ آفریدی خاموشی سے رجنی کا گیت سن رہا تھا وہ مدہم سُروں کے ساتھ من موہ لینے والے انداز میں گا رہی تھی۔ آفریدی کو اس کی نغمگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو صرف رجنی کو موت کے دراز ہاتھوں سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ رجنی' کانتا کے مقابلے میں بہت ہوشیار لڑکی تھی مگر پھر بھی اس کا تعلق چتوڑ کی غلام آبادی سے تھا۔ کانتا کی موت سے عبرت حاصل کرنے کے باوجود رجنی بھی اپنے دل کے درد کو پوشیدہ نہیں رکھ سکی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس کے گائے ہوئے گیت سے خوں گشتہ آرزوؤں کا اظہار ہونے لگا تھا۔ آفریدی کو اندیشہ تھا کہ کہیں رجنی بھی اپنی اس بے راہ روی کے سبب فنا کے گھاٹ نہ اتار دی جائے اس لئے وہ رجنی سے فسانۂ دل سننے کے

بجائے بھجن سن رہا تھا۔ اور نادان لڑکی سمجھ رہی تھی کہ شاہی سفیر کو ہولی کے رنگوں میں نہائی ہوئی گوپیوں سے بہت زیادہ دلچسپی ہے۔

ابھی رجنی کا گیت جاری تھا کہ یکایک لوبان کی خوشبو کمرے میں بھر گئی اور چاروں طرف وہی دھواں پھیلنے لگا جسے چتوڑ کے باشندے "مقدس دھواں" کہتے تھے۔ آفریدی گھبرا کر اٹھ بیٹھا اس کے نزدیک یہ بڑا جارحانہ عمل تھا۔

پھر کچھ دیر بعد وہی کریہہ آواز ابھری جس نے کل رات آفریدی کی سماعت کو مجروح کر دیا تھا۔ محافظ سپاہیوں کے بقول وہ مہاراج رام دیو کی آواز تھی۔ آفریدی نے محسوس کیا جیسے وہ آواز بہت قریب سے ابھر رہی ہے۔ علی عامر نے اپنی ساری توجہ اس آواز کے سننے پر مرکوز کر دی۔ رام دیو ان ہی کلمات کی گردان کر رہا تھا جن کے مفہوم سے آفریدی قطعاً نا آشنا تھا۔

"تمہارے مہاراج رام دیو جو کچھ پڑھتے ہیں، تم اس کا مطلب سمجھتی ہو؟" آفریدی نے بے اختیار ہو کر رجنی سے پوچھا۔

رقاصہ نے نفی میں اپنے سر کو جنبش دی۔ اس کی آنکھوں میں دہشت کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ آفریدی اپنی غلطی پر شرمسار نظر آنے لگا۔ وہ رجنی کو کسی آزمائش میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کی یہ خواہش ضرور تھی کہ وہ رام دیو کے اس عمل کی حقیقت کو جان لے جو روزانہ آدھی رات کے وقت شروع کیا جاتا تھا اور جس کی تاثیر اہل چتوڑ کو ہر مصیبت سے محفوظ رکھتی تھی۔

یکایک اسے دروازے کے قریب بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر محسوس ہوا جیسے کوئی وزن دار چیز زمین پر گری ہو آفریدی سنبھل گیا۔ اب وہ کسی نئے حادثے کا منتظر تھا۔ اس کیفیت میں چند ساعتیں ہی گزری تھیں کہ علی عامر کا یہ تجسس بھی ختم ہو گیا۔ آنے والا کمرے میں داخل ہو چکا تھا وہ ایک دراز قامت، سیاہ فام، سرخ آنکھوں والا صحت مند شخص تھا جسے دیکھتے ہی رقاصہ رجنی سجدے کی حالت میں چلی گئی تھی۔ آفریدی نے آنے والے کو سر سے پاؤں تک بہت غور سے دیکھا۔ وہ انتہائی بدشکل انسان تھا۔ بے ترتیب داڑھی اور حد سے بڑھی ہوئی مونچھوں نے اس کی صورت کو مکروہ بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ آفریدی کی نگاہ اس کے چوڑے چکلے سینے پر ٹھہر گئی جہاں ایک مالا جھول رہی تھی اور جس میں قیمتی یاقوت جگمگا رہے تھے۔ آفریدی نے ایک نظر میں سمجھ لیا تھا کہ وہ کوئی سادھو یا جوگی نہیں ہو سکتا۔ دنیا کو ترک کر دینے والے سادھو نیلم یا فیروزہ جیسے سرد مزاج پتھر پہنتے ہیں۔ انہیں خون کی حرارت بڑھانے والے یاقوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آفریدی کراہیت کے اس زندہ مجسمے کے بارے میں ابھی رائے قائم کرنے نہیں پایا تھا کہ وہ خود ہی بول اٹھا۔

"یہ اجڑی ہوئی کیاریاں، یہ ٹھکرائی ہوئی ناریاں تجھے کیا بتائیں گی کہ ہم کیا پڑھتے ہیں؟" آنے والے نے انتہائی نخوت و غرور کے ساتھ اپنا تعارف کرا دیا تھا۔ وہ مہاراج رام دیو تھا جس کی ہیبت سے اہل چتوڑ سہمے ہوئے رہتے تھے۔

"ستارے مجھے آسمانوں کی خبر دیتے ہیں اور میں زمین پر اپنا حکم نافذ کرتا ہوں۔ کسی صدی کا کوئی ساحر میرے علم کو نہیں پہنچتا۔ ان کی روحیں آج بھی میرے آگے جھکی رہتی ہیں اور اعتراف کرتی ہیں کہ میں نے ان کے چھوڑے ہوئے علم کو آگے بڑھا دیا۔ وہ میرے پیشرو تھے۔ مگر گیان میں ان کا درجہ میرے ایک شاگرد سے زیادہ نہیں۔" رام دیو غرور کی آخری منزل سے گزر چکا تھا اور فرضی کامیابیوں کے نشے میں اپنے بزرگ ساحروں کی شخصیت کو بھی حقارت سے جھٹلا رہا تھا۔

"ستارے تمہیں آسمانوں کی کیا خبر دیں گے وہ تو خود افلاک کی وسعتوں میں حیران و پریشان پھر رہے ہیں۔ ان کی چالیں تو الٹی جا چکیں۔ وہ کسی کے کیا کام آئیں گے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ جس جادو کی قوت پر تم نازاں ہو وہ تو صدیوں پہلے فنا ہو چکا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کا عصا اجگر (اژدھا) بن کر بے شمار طلسمی سانپوں کو کھا چکا اور تمہارے پیشوا سامری کی روح جہنم کی آگ میں جل رہی ہے۔ میں اس وقت بھی سامری کی دردناک چیخیں سن رہا ہوں۔ کیا تمہیں اپنے گرو دیو کی وہ چیخیں سنائی نہیں دیتیں؟ کیسے پجاری ہو کہ دیوتا کے حال زار کی خبر تک نہیں۔ ایک بار ماضی کے پردوں میں جھانک کر تو دیکھو کہ سامری پر کیا گزری ہے اور وہ کس عذاب الیم میں مبتلا ہے۔" اتنا کہہ کر آفریدی چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا اور رام دیو کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ رام دیو کی جلتی ہوئی آنکھوں میں تو کوئی نرمی کی لہر پیدا نہیں ہوئی تھی مگر چہرے پر حیرت کا ہلکا سا عکس بھی ابھر آیا تھا۔

علی عامر آفریدی نے رام دیو کے جادوئی بت پر ایک اور ضرب لگائی۔ "مجھے تمہاری زبان سے یہ سن کر شدید حیرت ہوئی کہ جادو ابھی تک زندہ ہے حالانکہ یہ غارت گر علم اسی روز تباہ ہو چکا تھا جب یہودی لبید بن اعصم کی لڑکیوں نے پیغمبر اسلامؐ کے جسم اطہر پر اپنی ساحرانہ قوتیں آزمائی تھیں اور وہ اپنی ان کوششوں میں بری طرح ناکام رہی تھیں۔ کیا تمہیں لبید بن اعصم کا حشر بھی یاد نہیں۔ مہاراج! دوزخ کے لامحدود آتش کدے کی جانب ایک نظر تو دیکھو، وہ یہودی ساحر اپنی مدد کیلئے کس کس کو پکار رہا ہے۔ کوئی اس کی پکار نہیں سنتا اور کوئی اس کی مدد کو نہیں پہنچتا۔ یہ کیسی سنگدلی ہے اور کیسی بے حسی ہے؟ تم تو سامری کے علم کے وارث ہو۔ پھر کیوں اس کی مدد نہیں کرتے؟" آفریدی نے ایک بار پھر سکوت اختیار کیا اور رام دیو کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

ساحر اعظم کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی اور چہرے پر نمایاں ہونے والے تحیر کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں بھی ایک عجیب سی دھندلاہٹ جھلکنے لگی تھی۔

"تم کہتے ہو کہ جادو کی قوتیں لازوال ہیں۔" آفریدی نے ایک نئے انداز سے رام دیو کو مخاطب کیا تھا۔ "تمہیں اپنے قبیلے کا وہ شخص یاد نہیں جسے شہاب ساحر کہتے تھے اور جو قصبہ اجودھن (پاک پٹن) کا مشہور جادوگر تھا۔ تم نے اس کی قبر کے اندر جھانک کر نہیں دیکھا کہ حشرات الارض نے اس کی ہڈیاں تک چاٹ لی ہیں اور پوری قبر سانپوں سے بھری ہوئی ہے۔ تمہیں شہاب ساحر کے بیٹے کا بھی حشر یاد نہیں کہ اس نے حضرت بابا فریدؒ کے جسم مبارک پر اپنی جادوئی طاقتوں کو آزمانے کی کوشش کی تھی اس نے آٹے کا ایک پتلا بنایا تھا اور اس میں سوئیاں چبھو کر پتلے کو اپنے باپ کی قبر کے سرہانے دفن کر دیا تھا پھر وہ مطمئن ہو گیا تھا کہ طلسماتی سوئیاں حضرت بابا فریدؒ کو ہلاک کر ڈالیں گی۔ تمہیں تو اپنے اس پیشوا کا انجام بھی یاد نہیں ہو گا کہ اجودھن کے حاکم نے اسے گرفتار کر کے حضرت بابا فریدؒ کے سامنے پیش کر دیا تھا اور درخواست کی تھی کہ اس نابکار کے قتل کا حکم جاری فرما دیں۔ اگر تمہاری آنکھیں اتنی ہی روشن ہیں تو گزرے زمانے کی طرف پلٹ کر دیکھو۔ تمہیں شہاب ساحر کا بیٹا ایک مرد مومن سے اپنی زندگی کی بھیک مانگتا ہوا نظر آ جائے گا۔ اور واقعتاً تمہاری بینائی اتنی ہی طاقتور ہے تو تمہیں یہ منظر بھی دکھائی دے گا کہ حضرت بابا فریدؒ نے اپنے بدترین دشمن کو بھی معاف کر دیا تھا۔ کیا تم شہاب ساحر کو نہیں پہچانتے؟ وہ بھی اپنے وقت میں ساحر اعظم کہلاتا تھا۔ اسے زوال کیوں ہوا؟ اس کا بیٹا ذلت و رسوائی کے غبار میں کہاں گم ہو گیا؟ یہ کیسی جادوگری تھی جو گردش کے وقت ان کے کام نہ آ سکی۔" علی عامر آفریدی نے رام دیو کے سامنے کتاب زندگی کا ایک اور ورق الٹ دیا تھا جس پر دنیا کے مشہور ساحروں کی شکست و نامرادی کی عبرتناک داستان تحریر کی گئی تھی۔

رام دیو نے آفریدی کے سوالات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

بس وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب سے سائے لرزاں تھے۔

"مہاراج! یہ کیسی بے خبری ہے کہ تم اپنے مرحوم دادا شادی دیو کو بھی فراموش کر بیٹھے۔" علی عامر آفریدی نے رام دیو کو ایک اور بھولا ہوا قصہ یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ قصہ جو رام دیو کے اپنے ایک بزرگ کی گمراہی اور ہدایت کا قصہ تھا۔ "مگر تم اپنے دادا کو کس طرح یاد رکھو گے کہ اس نے تمہاری خاندانی روایتوں سے بغاوت کر کے حضرت خواجہؒ کی غلامی اختیار کر لی تھی۔ وہ ایک ہدایت یافتہ' خوش نصیب انسان تھا۔ اسے جادو کی حقیقت معلوم ہو گئی تھی اس لئے اپنے گناہوں سے تائب ہو کر نجات پا گیا اور شادی دیو سے خدا کا بندہ (عبداللہ) بن گیا۔ تم نے.........." آفریدی نے قصداً اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔

"میں ایک مکمل ساحر ہوں۔" علی عامر کے خاموش ہوتے ہی رام دیو گرجنے لگا۔ اس کی رعونت پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔ "وہ سب نامکمل تھے' اس لئے شکست کھا کر ذلیل و خوار ہو گئے۔ میری تپسیا اور گیان تکمیل کے مرحلے سے گزر چکے ہیں۔ مجھے کبھی زوال نہیں ہو گا اور میرے ماننے والوں کو بھی محرومی و ناکامی کے ہاتھ کبھی نہیں چھو سکیں گے۔" یہ کہہ کر رام دیو نے سجدے میں پڑی ہوئی رقاصہ رجنی کے ایک زوردار ٹھوکر ماری۔

آفریدی نے دیکھا دفعتہً رجنی کے کپڑوں میں آگ لگ گئی پھر رقاصہ کی دردناک چیخیں کمرے میں گونجنے لگیں۔ چند مسلح سپاہی کمرے میں داخل ہوئے اور رقاصہ کو کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ آفریدی خاموشی سے رام دیو کی سفاکی کا تماشا دیکھتا رہا۔ شاہی سفیر کو معلوم تھا کہ رجنی بھی کانتا کی طرح قتل کر دی جائے گی یا پھر بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹوں میں اس کا کومل تن جل کر راکھ ہو جائے گا۔ ستمگروں کی بستی تھی' وہاں ظلم کے سوا کوئی دوسرا تماشا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

جب رجنی کی چیخیں راہداری میں گونجنے لگیں تو رام دیو نے تضحیک آمیز نظروں سے آفریدی کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک شیطانی شرارت ناچ رہی تھی۔ پھر یکایک رام دیو نے پوری طاقت سے کمرے کے فرش پر اپنا پاؤں مارا۔ آفریدی اس کے جسم کی ایک ایک جنبش کا جائزہ لے رہا تھا۔ رام دیو کا پاؤں پڑتے ہی آفریدی کو ایک تیز گڑگڑاہٹ سنائی دی جیسے کہیں قریب ہی بادل گرجے ہوں۔ دوسرے ہی لمحے آفریدی کو محسوس ہوا کہ زمین لرز رہی ہے۔ رام دیو اپنی جادوئی قوت سے زلزلہ لے آیا تھا۔ کچھ دیر تک کمرے کی زمین کانپتی رہی اور پھر ایک گوشے میں دھماکا سا ہوا۔ پتھر پھٹ گئے تھے اور کمرے میں ایک چوڑا شگاف نمایاں ہو گیا تھا۔ شگاف کے ظاہر ہوتے ہی ایک اور عجیب و غریب سانحہ پیش آیا ناگہاں بے شمار انسانوں کی چیخوں کا شور اس کی سماعت سے ٹکرایا۔

رام دیو نے ایک بار پھر آفریدی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور پیر پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ آفریدی کچھ دیر تک گہرے سناٹے کی کیفیت سے دوچار رہا۔ پھر اس نے اپنے اعصاب پر قابو پایا اور ان چیخوں کو غور سے سننے لگا جو کمرے کے چوڑے شگاف سے برآمد ہو رہی تھیں چیخیں اس قدر دردناک تھیں کہ آفریدی انہیں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کمرے کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے اور اس تہہ خانے میں نہایت سنگدلی کے ساتھ انسانوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ آفریدی بے دست و پا تھا۔ وہ کسی مظلوم کی فریاد سننے کے بعد اس کی مدد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ جب نادیدہ انسانوں کی چیخوں کا شور زیادہ بلند ہونے لگا تو آفریدی بہت احتیاط کے ساتھ اپنے بستر سے نیچے اترا۔ زخموں نے ایک بار پھر اس کا راستہ روکنے

کی کوشش کی تھی مگر آفریدی اپنی غیر معمولی قوتِ ارادی کے سہارے آگے بڑھا اور اس شگاف کے قریب پہنچا جو رام دیو کے طلسماتی عمل کے نتیجے میں ظاہر ہو گیا تھا۔

چیخیں اب بھی بلند ہو رہی تھیں۔ آفریدی نے جھانک کر ان مظلوم انسانوں کو دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر وہ بری طرح چونک اٹھا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کمرے میں پیدا ہو جانے والا شگاف بھی غائب تھا اور انسانی چیخیں بھی بند ہو گئی تھیں۔ آفریدی چند لمحوں تک حیرت میں ڈوبا ہوا کھڑا رہا جب کوئی چیخ نہیں ابھری تو اس نے اپنے ایک پاؤں کو زمین پر ادھر ادھر گردش دی زمین کی سطح ہموار تھی۔ وہاں کسی چوڑے شگاف کا وجود تو درکنار' کوئی ہلکی سی دراز بھی نہیں تھی۔ آفریدی مسکرانے لگا اور پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے بستر تک پہنچ گیا۔

پھر جیسے ہی آفریدی اپنے بستر پر دراز ہوا' وہی انسانی چیخیں اسی شدت کے ساتھ ابھرنے لگیں۔ آفریدی کا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا۔ وہ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ اگر کمرے کے شگاف اور انسانی چیخوں کا کوئی حقیقی وجود ہے تو پھر اس کے وہاں پہنچنے کے بعد وہ شگاف بند کیوں ہو گیا تھا۔ اور پُرشور چیخیں یکایک معدوم کیوں ہو گئی تھیں؟" یہ ایک عجیب و غریب معمہ تھا جسے آفریدی کی غیر معمولی ذہانت بھی حل کرنے سے قاصر تھی۔ ابھی آفریدی رام دیو کے جادوئی عمل کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ وہ چیخیں بلند ہوتی چلی گئیں اور کمرے کے گوشے میں وہی شگاف دوبارہ نظر آنے لگا۔ آفریدی نے ایک بار اور ہمت کر کے اس طلسم کی حقیقت جاننے کی کوشش کی مگر جیسے ہی وہ اس شگاف کے قریب پہنچا زمین کی سطح دوبارہ ہموار ہو گئی اور تیز چیخیں اس طرح دم توڑ گئیں جیسے کبھی ان کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ آفریدی کو شدید حیرت کا شکار ہو کر دوبارہ اپنے بستر کی طرف لوٹ جانا پڑا۔

چیخوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔ اب آفریدی پوری سنجیدگی کے ساتھ رام دیو کی ساحرانہ قوتوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ جادو ایک نفسیاتی حربے کے سوا کچھ نہیں۔ اگر کوئی شخص اس کے زیر اثر آ جائے تو پھر وہ ہلاک ہو جاتا ہے اور اگر کوئی اسے اپنی قوتِ ارادی یا طاقتِ ایمانی سے جھٹلا دے تو جادو محض ایک شعبدہ بازی اور نظربندی بن کر رہ جاتا ہے۔

آفریدی نے دہلی کے علماء سے جادو کے بارے میں یہی معلومات حاصل کی تھیں اور آج ان ہی معلومات کے سہارے وہ رام دیو کے خلاف جنگ کر رہا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ ساری رات اس کے کمرے میں خوشبودار دھواں بھرا رہا اور ایک گوشے سے نادیدہ انسانوں کی دردناک چیخیں ابھرتی رہیں۔ آفریدی نے اپنے منتشر خیالات کو یکجا کر کے سونے کی بہت کوشش کی مگر کمرے کی فضا اتنی پراسرار اور پرہول تھی کہ وہ ایک لمحے کیلئے بھی نہیں سو سکا۔

پھر سورج طلوع ہونے سے کچھ دیر قبل راجپوتوں کا مقدس دھواں بھی فضا میں تحلیل ہو کر کہیں غائب ہو گیا اور وہ دردناک چیخیں بھی بند ہو گئیں۔ آفریدی کو مہامنتری وکرم سنگھ کی اس ناشائستگی اور غیر سیاسی حرکت پر بہت غصہ آ رہا تھا۔

تھکن اور بے خوابی نے جلد ہی آفریدی کو نیند کی آغوش میں کھینچ لیا۔ پھر وہ اتنی گہری نیند سویا کہ دوپہر کا کھانا بھی نہ کھا سکا اور شام کے قریب اس کی آنکھ کھلی' جاگنے کے بعد محافظوں نے آفریدی کو کھانا پیش کیا تو اس نے یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا کہ وہ مہامنتری سے ملے بغیر راج محل کی کوئی چیز استعمال نہیں کرے گا۔ محافظوں نے مہامنتری تک یہ خبر پہنچائی تو وکرم سنگھ کچھ دیر بعد ہی آفریدی سے ملنے کے لئے اس کے کمرے میں آیا۔

"سلطانی سفیر کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وکرم سنگھ کے لہجے میں ہلکا ہلکا طنز پوشیدہ تھا۔

"میری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا ہے مگر آپ کی مہمان نوازی اب دل آزاری میں تبدیل ہو گئی ہے۔" آفریدی کا لہجہ سخت تھا۔

"یہ دل آزاری نہیں، راجپوتوں کی رواداری ہے۔" وکرم سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کا ایک ایک لفظ آفریدی کی مجبوریوں کا مذاق اڑا رہا تھا۔

"یہ رواداری ہے کہ میرے سر پر عجیب عجیب بلائیں مسلط کر دی گئی ہیں۔" علی عامر آفریدی کی آواز بھی تیز ہو گئی تھی۔

"مہمان سفیر شاید یہ بھول گئے کہ وہ انتہائی مشکوک حالت میں چتوڑ کی حدود تک پہنچے تھے۔" یہ کہہ کر مہامنتری وکرم سنگھ کھڑا ہو گیا۔ "جب تک تمہارے زخم ٹھیک نہیں ہو جاتے تمہیں چتوڑ کے اسی انداز سیاست کو قبول کرنا ہو گا۔" وکرم سنگھ نے بالآخر اپنے دل کی بات کہہ دی تھی اور یہ ثابت ہو گیا تھا کہ آفریدی کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ وکرم سنگھ کی مرضی سے ہو رہا ہے۔

آفریدی نے غور سے مہامنتری کو دیکھا پھر تلخ لہجے میں کہنے لگا۔ "کل ایک اور کانتا آگ کے شعلوں میں جلا دی گئی۔" آفریدی کی آواز میں دل کا کرب شامل تھا۔

"تمہیں زندگی کا تماشا دکھانے کے لئے ابھی تو بے شمار جسم جلیں گے۔" وکرم سنگھ کا رویہ جارحانہ تھا۔ "تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے کہ کون جل رہا ہے اور کون بجھ رہا ہے؟ یہ ہمارے ملکی معاملات ہیں۔ ہم ایسے امور میں غیروں کی مداخلت برداشت نہیں کرتے۔ جب تک تم راجہ رتن سنگھ اور مہارانی پدمنی کے مہمان ہو، تمہیں سب کچھ دیکھنا ہو گا۔ پھر جب دہلی جاؤ تو شوق سے کانتا کا گیت اپنے سلطان کو سنا دینا۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ کمرے سے جانے لگا مگر دروازے کے قریب پہنچ کر اچانک پلٹا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "اپنی غذا کا خاص خیال رکھو ورنہ کئی سال بھی صحت مند نہ ہو سکو گے۔" اس کے بعد وکرم سنگھ تیز قدموں سے چلا گیا۔

اب آفریدی چتوڑ کے حکمرانوں کی ایک ایک چال کو سمجھ گیا تھا۔ وہ وکرم سنگھ ہو یا ساحر رام دیو یہاں کا ہر با اختیار فرد اس کی ذہنی قوتوں کو مفلوج کر کے کوئی خاص فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسی غور و فکر کے دوران آفریدی کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا تھا وہ یہ کہ چتوڑ کے فرمانروا طبقے نے اسے ایک مشتبہ انسان سمجھ لیا تھا اس لئے اب اس کی دہلی واپسی بھی مشکوک نظر آ رہی تھی۔ آفریدی کی اس سوچ نے اسے مزید ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ والدہ اور چھوٹی بہن سے جدائی اور سلطان کے دربار سے غیر حاضری، بڑی کربناک صورت حال تھی۔ آفریدی بہت دیر تک اپنے خیالات میں الجھتا رہا اور پھر یہ کہہ کر دل کو تسلیاں دینے لگا کہ تائید غیبی اس کے ساتھ ہے۔ خدا جو بھی کرے گا بہتر کرے گا۔ اس تصور کے ساتھ ہی آفریدی کا دل ٹھہر سا گیا اور وہ آنے والی رات کے متوقع حادثوں کو برداشت کرنے کے لئے اپنی اعصابی قوتوں کو سمیٹنے لگا۔

☆..........☆..........☆

پھر جب رات کے اندھیرے گہرے ہو گئے تو وہی رسم دہرائی گئی کھانے کے بعد ایک اور خوبصورت لڑکی ساغر بکف آفریدی کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ علی عامر اس لڑکی کو چپ چاپ دیکھتا رہا۔ اس نے منقش صراحی اور بلوری جام ایک طرف رکھے اور شاہی سفیر کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جن میں آفریدی کیلئے نفرت بھری ہوئی تھی۔

"کیا مسلمان بھی راجپوتوں کی طرح ہوس کے اس کھیل میں برابر کے شریک ہیں؟" لڑکی، آفریدی سے

اس طرح مخاطب ہوئی کہ وہ سناٹے میں آ گیا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔" آفریدی جیسے شجاع نوجوان کی زبان میں صاف لکنت محسوس ہو رہی تھی۔ "تم کون ہو اور مجھ سے اس قدر ناگوار لہجے میں کیوں مخاطب ہو؟"

"میرا نام ساوتری ہے۔ میرے ماں باپ نے ہندوؤں کی ایک عظیم اور شوہر پرست عورت کا نام چرا کر وہ نام مجھے بخش دیا تھا۔ ایک پنچ خاندان کو یہ نام راس نہیں آیا۔ میری ذات برہمنوں اور راجپوتوں کی ذات سے کم تر تھی۔ ہماری ذات کے لوگ زندہ تو رہ سکتے ہیں مگر انہیں آبرومندانہ زندگی گزارنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ ہم راستے کی وہ دھول ہیں جو ہر گزرنے والے مسافر کے قدم چھونے کیلئے مجبور ہے۔ ہماری برادری میں شادیاں ہوتی ہیں مگر ہر لڑکی کو اپنے شوہر کے گھر جانے سے پہلے کسی راجپوت کی دلہن بننا پڑتا ہے جب گھر میں میرے رشتے کی باتیں ہونے لگیں تو میں نے ماں باپ سے صاف کہہ دیا کہ میں شادی نہیں کروں گی۔ اہل چتوڑ کے نزدیک یہ بڑا باغیانہ عمل تھا۔ میرے انکار سے دیوتا ناراض ہو کر اس دھرتی پر قہر نازل کر سکتے تھے۔ برادری والوں نے میرے خلاف فیصلہ دے دیا کہ کوئی لڑکی راجپوتوں کے بنائے ہوئے قانون کو نہیں توڑ سکتی۔ جب میری قوم کے مردوں نے بھی بے غیرتی کا لباس پہن لیا تو اس شادی کو کون روک سکتا تھا۔ پھر میں دلہن بن گئی اور جب ایک راجپوت سردار کے یہاں سہاگ رات گزار کر شوہر کے گھر پہنچی تو اس نے مجھے اپنی بیوی ماننے سے انکار کر دیا۔ برادری اس شخص کا کچھ نہ بگاڑ سکی کیوں کہ وہ بھی ایک مرد تھا اور مرد ہی تمام قانون بنایا کرتے تھے۔ لوگوں نے میرے شوہر کو ایک غیرت مند انسان سمجھا حالانکہ اس کی کئی بہنیں بھی شادی شدہ زندگی بسر کر رہی تھیں۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکی کہ اس شخص کی غیرت اس وقت کہاں سو گئی تھی جب اس کی اپنی بہنیں راجپوت سرداروں کے یہاں سہاگ رات گزار رہی تھیں اور وہ چین کی نیند سو رہا تھا۔" یہ کہتے کہتے ساوتری کے سرخ و سفید چہرے پر آگ سی برسنے لگی تھی۔

آفریدی اس مظلوم لڑکی کی لرزہ خیز داستان سن کر لرز اٹھا تھا۔ "بس! خاموش ہو جاؤ اگر سانسوں سے پیار ہے تو اپنے ہونٹوں کو قابو میں رکھو۔" آفریدی، ساوتری کو خاموش کر دینا چاہتا تھا کہ اس کی نم آلود آنکھیں تیسری کانتا کو قتل ہوتے دیکھ رہی تھیں۔

"تم اس عورت کو موت سے ڈراتے ہو جو روزانہ سورج غروب ہوتے ہی مر جاتی ہے۔" اچانک ساوتری کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ ابھری جس میں موت سے بے خوفی اور زندگی سے شدید نفرت پوشیدہ تھی۔ "اس سے پہلے کہ میں بھی کانتا کے پہلو میں جا کر سو جاؤں میری کہانی سن لو تم بھی مرد ہو اور اسی دنیا سے تعلق رکھتے ہو۔"

ساوتری نے علی عامر آفریدی کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ بڑے بےباک لہجے میں بول رہی تھی۔ "میں اس طرح لوٹی گئی کہ کچھ بھی باقی نہ بچا شوہر کی ٹھوکریں کھا کر ماں باپ کے گھر پہنچی تو وہ دروازہ بھی بند ہو گیا اور اپنی بے ضمیر برادری سے مدد مانگی تو کہا گیا اس بوجھ کو کوئی نہیں اٹھا سکتا مجبوراً اسی راجپوت سردار کے ہاں چلی گئی جس نے میری قوم کی لڑکیوں کیلئے وحشیانہ قانون بنایا ہے۔ پھر جب اس کی محفل کیف و نشاط بھی مجھ سے بیزار ہو گئی تو راجپوت سپاہیوں نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی۔ میری ذلت و رسوائی کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ تم آ گئے۔ مہامنتری وکرم سنگھ نے مجھے راج محل میں طلب کر کے کہا تھا کہ سلطان علاء الدین خلجی کا سفیر بہت رنگین مزاج ہے۔ اگر وہ میرے رقص اور ساقی گری کی ادا سے خوش ہو گیا تو انسانوں کی بستی سے نکالی ہوئی اس عورت پر انعام و اکرام کی بارش کر دی جائے گی۔" اتنا کہہ کر ساوتری نے ایک بار پھر سکوت اختیار کر لیا اور آفریدی کو اس طرح دیکھنے لگی جیسے انسانی تہذیب کے سجے ہوئے بازار میں دہلی سے آنے والا ایک

بہت بڑا سوداگر حوا کی بیٹیوں کی بولی لگا رہا ہو۔

ساوتری کی الزام تراشی نے چند لمحوں کے لئے آفریدی کے دل و دماغ کو پتھر کا بنا دیا تھا۔ وہ سکتے کے عالم میں اس رقاصہ کو دیکھ رہا تھا جو کانتا اور رجنی سے بہت زیادہ مختلف تھی۔

"مہان سمراٹ کے مہان راج دوت (سفیر) میں تمہیں خوش کر دوں گی مگر مجھے اتنا بتا دو کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ تم تو عرب کے اس دیوتا کے ماننے والے ہو جو پتھر کا نہیں تھا جس نے صدیوں سے جلنے والی ناریوں کو اپمان کے نرک سے نکال کر سرکشا اور مانتیا (تحفظ و احترام) کا سورگ بخشا تھا۔ یہ بھومی کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی لیکن تم آئے بھی تو کس طرح آئے۔ سنسار کو بھیڑیوں سے مکتی دلانے والے خود ہی مایا کے موہ میں ڈوب گئے۔ پربھو! یہ کیسا اتیاچار (ظلم) ہے؟ اس دھرتی کو الٹ کیوں نہیں دیتا؟" یہ کہتے کہتے ساوتری کی آواز لرزنے لگی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

آفریدی کو بھی ہوش آ چکا تھا جیسے ہی ساوتری کی زبان سے آخری الفاظ ادا ہوئے وہ چیخ اٹھا۔ "تمہارا مہامنتری جھوٹ بولتا ہے وہ مسلسل میرے گرد نفاق و ریا کاری کا حصار کھینچتا جا رہا ہے اور میں خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ مگر آج کے بعد میں چپ نہیں رہوں گا۔ وہ خود کو بہت بڑا سیاستداں سمجھتا ہے مگر اسے معلوم نہیں کہ میں کس شہنشاہ کا سفیر ہوں ابھی اسے سلطان کی تندخوئی کا اندازہ نہیں۔ میں چتوڑ کے قلعے میں محصور ہو سکتا ہوں لیکن علاء الدین خلجی مجبور نہیں' وہ آزاد ہے اور اپنی آزادی کے صدقے میں تمہیں بھی آزاد کرتا ہے۔ یہ کمرہ کسی اوباش سفیر کا کمرہ نہیں۔ یہ ایک مسلمان کی عارضی قیام گاہ ہے جو اپنی بناوٹ میں تمہارے ماں باپ کی چار دیواری سے بھی زیادہ محفوظ ہے۔"

ابھی فضا میں آفریدی کی صدائے بازگشت کے اثرات موجود تھے کہ دروازے پر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ علی عامر اور ساوتری نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ اتنی دیر میں رام دیو کئی مسلح سپاہیوں کے ہمراہ اندر داخل ہو چکا تھا۔

"جسے ہم آزادی نہیں دیتے وہ کبھی آزاد نہیں ہوتا۔" رام دیو کا مکروہ قہقہہ گونجا اور وہ شعلہ بار نظروں سے آفریدی کو دیکھنے لگا۔ "تجھے نہیں معلوم کہ تیری ایک ایک حرکت پر سو سو پہرے لگے ہوئے ہیں۔ اگر تیرے دل میں کبھی کوئی خیال بھی گزرے گا تو ہم اس سے باخبر ہو جائیں گے۔"

"میں سب جانتا ہوں۔" شدتِ جذبات سے آفریدی کا لہجہ جل اٹھا۔ "میں نے بھی یہ باتیں چتوڑ کے حکمرانوں کو سنانے ہی کیلئے کہی ہیں۔ مہامنتری وکرم سنگھ کہاں ہے؟" آفریدی نے رام دیو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ سلطان کے سفیر نے پہلی بار اپنے لبوں سے نرمی کی تہہ کھرچ دی تھی اور اب اس کے ہونٹ سنگ و آہن کے ہونٹ نظر آ رہے تھے۔

"میری موجودگی میں مہامنتری کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔" رام دیو کی کریہہ آواز ابھری اس کا لہجہ کبر و غرور میں ڈوبا ہوا تھا۔

"وکرم سنگھ نے یہ اچھا نہیں کیا کہ حکومت کے نازک ترین معاملات جادوگروں کے حوالے کر دیئے۔" جواباً آفریدی کی آواز بھی تیز ہو گئی تھی۔ "سیاسی مسائل کو سیاست ہی سے حل کرنا چاہئے تھا۔ جوگیوں اور بیراگیوں کے منتروں نے تو سب کچھ الجھا کر رکھ دیا۔ اب شاید کچھ نہیں ہو سکتا' کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔" آفریدی ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"سب کچھ ہوگا اور ہماری مرضی کے عین مطابق ہوگا۔" رام دیو کا غصہ عروج پر تھا وہ اچانک پلٹا اور اپنے ساتھ آنے والے سپاہیوں سے چیخ کر کہنے لگا۔ "لڑکی کو اسی کمرے میں زندگی کی قید سے آزاد

کر دو۔" رام دیو کی سنگدلی اور جارحیت نے اب ایک نیا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ وہ علی عامر آفریدی کو نئے انداز سے اذیت پہنچانا چاہتا تھا۔

"رام دیو' بس بہت ہو چکا۔" علی عامر آفریدی جادوگر کی بہیمانہ حرکت پر اس قدر زور سے چیخا تھا کہ شب کے سناٹے میں اس کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی تھی۔ "اب میں اس خونیں تماشے کی اجازت نہیں دے سکتا تم پورے چتوڑ کی لڑکیوں کو قتل کر ڈالو مگر میرے نام پر یہ کاروبار نہیں ہوگا۔ تمہارا مہامنتری اور تم کئی دن سے ان بے گناہ لڑکیوں کے ساتھ ایک بھیانک کھیل کھیل رہے ہو۔ لیکن آج یہ کھیل ختم ہو چکا۔"

رام دیو نے ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ "تو نے اپنے وطن میں آزادی کے بے شمار مظاہرے دیکھے ہوں گے مگر آج یہ منظر بھی دیکھ کہ ہم لوگوں کو کس قدر لالہ رنگ آزادی دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر رام دیو نے ان سپاہیوں کی طرف دوبارہ دیکھا جو اپنی شمشیریں بے نیام کر چکے تھے۔ "اس لڑکی کو قسطوں میں آزادی دو۔"

سپاہی حیرت سے رام دیو کا منہ تکنے لگا۔ مہاراج کے اس حکم کا مفہوم ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"لڑکی کو ٹھہر ٹھہر کر قتل کرو۔" رام دیو اس سفاک قاتل کے انداز میں ہنسا جو انسانی خون بہاتے بہاتے پتھر کا ہو جاتا ہے۔ "لڑکی کے ایک ایک عضو کو رک رک کر کاٹو پھر ہم دیکھیں گے کہ ہمارے اور سلطان کے بھیک دینے میں کیا فرق ہے؟"

"رام دیو! اگر یہ لڑکی اور اس جیسی دوسری لڑکیاں تیرے معاشرے پر بوجھ ہیں تو انہیں میرے ساتھ جانے دے۔ میں انہیں لے کر چتوڑ کی حدود سے نکل جاؤں گا۔ میرے سلطان کی حکومت بہت وسیع ہے۔ عزت و آبرو کے ساتھ یہ کہیں بھی سما جائیں گی۔ تو نے ان پر ہر وہ شے بند کر دی جس کی یہ حق دار تھیں۔ خدا کیلئے اب ان پر سانسوں کے دروازے بند نہ کر۔ میں تجھے آخری بار تنبیہہ کرتا ہوں کہ اگر ان معصوم لڑکیوں پر زندگی کے دروازے بند ہوئے تو پھر تیرے لئے اور تیری پوری قوم کیلئے جہنم کے دروازے کھل جائیں گے۔"

"تیری آنکھیں ابھی دیکھ لیں گی کہ نرک کے دروازے کس پر کھلتے ہیں؟" رام دیو چیخا۔ "اپنے دیوتاؤں کا اپمان کرنے والی اس نرتکی (رقاصہ) کا ایک ایک انگ شریر سے الگ کر دو۔ اسے ایسی سزا دو کہ مہان راجپوتوں کے بیچ دشمن بھی کانپ اٹھیں۔"

"رام دیو! تو میرے الفاظ کو ایک زخمی سفیر کی التجا نہ سمجھ۔" سپاہیوں کو ساوتری کی طرف بڑھتا دیکھ کر آفریدی غضب ناک آواز میں بولا۔ "یہ ایک طاقتور اور مطلق العنان فرمانروا کا حکم ہے جو سرزمین چتوڑ پر بسنے والے ایک ایک ستمگر کو سنایا جا رہا ہے۔ اگر تو نے جوشِ اقتدار یا اپنے طلسم و جادو کی بدمستی میں نافرمانی کی تو راجپوتوں کی بستی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایسی بھیانک آگ بھڑک اٹھے گی کہ پھر راکھ کے سوا کچھ باقی نہیں بچے گا۔ ہوش سے کام لے اور اس بے گناہ کو اس عذاب سے دوچار نہ کر جو کسی حیوان کیلئے بھی جائز نہیں۔"

"اس دھرتی کے مالک ہم ہیں۔ ہمارے کانوں نے آج تک ایسے شبد نہیں سنے جن سے شکتی اور ابھیمان (غرور) کی بو آتی ہو اس ودروہی (باغی) لڑکی کو اسی طرح موت کے گھاٹ اتارو جیسے میں نے تمہیں حکم دیا ہے۔" شدت غضب سے رام دیو کا چہرہ اور مسخ ہو گیا تھا۔

سپاہی' رقاصہ ساوتری کی طرف بڑھے۔ موت بڑی خوفناک شے ہوتی ہے جب وہ بے نقاب ہو کر لڑکی

کے سامنے آئی تو بغاوت اور بے خوفی کے جذبے سے سرشار ہونے کے باوجود ساوتری لرز اٹھی اور پھر اس نے کمرے سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن قاتلوں کے ہاتھ بہت دراز تھے ایک ہی وار میں ساوتری کے دونوں پاؤں کٹ گئے اور وہ اوندھے منہ کمرے کے فرش پر گر پڑی دونوں پیروں کے گھنگھرو بج اٹھے۔ ان کے بجنے کا وہی انداز تھا مگر کمرے کے اندر موجود تمام افراد جانتے تھے کہ یہ رقص طرب نہیں، رقص فنا ہے۔

ساوتری کے کٹے ہوئے پیروں سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا اور رام دیو کو خون کی اس پھوار پر جلترنگ کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ عالم سرمستی میں جھومنے لگا اور ساوتری کی دردناک چیخیں گونجنے لگیں۔ ظالموں کے نزدیک یہ مغنیہ کی ایک نئی تان تھی، گیت کا ایک نیا سُر تھا۔

آفریدی جوش اضطراب میں اپنے بستر سے اتر آیا اس نے آگے بڑھ کر رقاصہ کو بچانے کی ایک کوشش ناکام بھی کی مگر بیک وقت کئی راجپوت سپاہیوں نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا۔ داغ داغ جسم رکھنے والا ایک مجبور سا انسان اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ علی عامر آفریدی تڑپ کر رہ گیا۔ جب دست و پا طاقت کی زنجیروں میں جکڑ دیئے گئے تو اس کی آنکھوں میں دل کا خون اتر آیا۔ زبان پر ابھی کوئی بندش نہیں تھی اس لئے آفریدی چیخنے لگا۔

"مظلوم انسانیت کے بے رحم شکاریو! اس خدا کے غضب و قہر سے ڈرو جس کے تم نے لاکھوں شریک تراش لئے ہیں۔ ہمارے یہاں تو پاگل کتے کے لئے بھی یہ حکم ہے کہ اسے شمشیر کے ایک ہی وار میں ہلاک کر دو۔ مگر تم بے گناہ لڑکی کے جسم کے ٹکڑے کر رہے ہو۔ اپنے اس جابرانہ عمل کی طرف دیکھو خدا کی بستی کسی قصاب کی دکان نہیں ہے۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ جور و جفا کے ان لمبے ہاتھوں کو روک لو اور اپنے گھناؤنے کردار پر ایک نظر ڈال کر شرمندہ ہو جاؤ۔ شاید اس طرح عذاب آسمانی کچھ دن کیلئے تمہارے سروں سے ٹل جائے ابھی وقت ہے اس وقت کو اپنی ظالمانہ رسموں کی بھینٹ نہ چڑھاؤ۔"

آفریدی چیختا رہا مگر رام دیو کی سماعتوں پر گمراہی کے قفل لگ چکے تھے۔ وہ ہدایت کا ایک لفظ بھی نہ سن سکا اور اس کے بہیمانہ حکم پر رقاصہ کے جسم کے ٹکڑے کئے جاتے رہے پھر گل بدنی کا سارا افسوں ختم ہو گیا۔ دلکش اور رنگین زندگی کے عناصر اس طرح بے ترتیب ہو گئے تھے کہ ساوتری کی بکھری ہوئی لاش دیکھ کر آفریدی جیسے بے خوف نوجوان کو بھی دہشت کا احساس ہونے لگا تھا۔

ہندوؤں میں ایک ساوتری وہ تھی جس کے شوہر کا جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ جب موت کا دیوتا یم راج اس نوجوان کی روح نکال کر آسمانوں کی طرف جانے لگا تو ساوتری کے پریم اور تپسیا نے یم راج کا رستہ روک لیا پھر موت کا دیوتا ایک عورت کی شوہر پرستی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے ساوتری کے پتی کے پران دوبارہ اس کے شریر میں پرویش (داخل) کر دیئے۔ نوجوان زندہ ہو گیا اور پھر اس واقعہ کی اتنی دھوم مچی کہ ساوتری اپنی شوہر پرستی اور موت کے دیوتا کو شکست دینے کے سبب ہندوؤں کی مذہبی تاریخ میں امر ہو گئی۔

اور دوسری ساوتری وہ تھی جس کے سیکڑوں شوہر تھے وہ بھی ایک شوہر کی پرستش کرنا چاہتی تھی مگر سماج کے راجپوت ٹھیکیداروں نے اس سے یہ حق چھین لیا اور وہ کسی دوسرے مرد کی جان بچانے کے بجائے خود اپنی زندگی سے محروم ہو گئی۔

علی عامر آفریدی خیالات میں اس طرح گم تھا جیسے اس کی یادداشت کھو گئی ہو۔ ساوتری کے لرزہ خیز قتل نے اسے راجستھان کی سرحدوں سے نکال کر کہیں دور پہنچا دیا تھا۔

پھر جب بہت دیر بعد آفریدی کو ہوش آیا تو ایک اور قیامت اس کی منتظر تھی علی عامر نے گھبرا کر دیکھا ساوتری کی لاش کے ٹکڑے اسی طرح فرش پر بکھرے ہوئے تھے اور کمرے کا دروازہ بند تھا۔ آفریدی کو

احساس ہوا کہ جیسے رام دیو اور اس کے سپاہی قصداً ساوتری کی لاش کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر جا چکے ہیں اور اپنے ظلم و تشدد میں مزید رنگ بھرنے کے لئے دروازہ بھی بند کر گئے ہیں۔ آفریدی کا یہ احساس جلد ہی زندہ حقیقت میں تبدیل ہو گیا اس نے محافظ راجپوتوں کو مسلسل آوازیں دیں مگر باہر سے کوئی جواب نہیں آیا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک خاص منصوبے کے تحت مسلح نگہبانوں نے جواب نہ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

"اس عورت کی لاش کی اور بے حرمتی نہ کرو۔ اسے لے جا کر آگ میں پھونک ڈالو اور میرے کمرے سے خون کے نشانات صاف کر دو میں شاہی سفیر ہوں۔ اس کے مرتبے کو پہچاننے کی کوشش کرو یہ جادوگر رام دیو جس کی تم کسی دیوتا سے بھی زیادہ پوجا کر رہے ہو، تمہیں کہیں کا نہ چھوڑے گا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ عنقریب تم پر ہلاکت و بربادی کا عذاب نازل ہونے والا ہے۔ تمہارے راج محل کی بلند و مضبوط دیواریں، سلطان کے قہر و جلال سے پانی کے جھاگ کی طرح بیٹھ جائیں گی۔ ظلم کی بنیادوں پر کوئی پناہ گاہ قائم نہیں رہ سکتی۔ دروازہ کھولو اور اس مظلوم لڑکی کی آخری رسمیں ادا کر دو۔" علی عامر آفریدی پوری طاقت سے چیختا رہا مگر اس کی دردناک صدائیں پتھر کے اس مقبرے میں گونجتی رہیں جہاں ایک رقاصہ کی دریدہ لاش کو ابھی تک زمین نے قبول نہیں کیا تھا۔

وہ سنا کرتا تھا کہ شاہوں کو، مہاراجوں کو رقص بسمل بہت پسند تھا آج آفریدی نے بھی اپنی آنکھوں سے وہی رقص بسمل دیکھ لیا تھا۔ بڑے لوگوں کے کیسے کیسے عجیب مشغلے تھے؟ آفریدی ایک بار پھر لرز اٹھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور خیالات کی سوزش دل و دماغ کو پھونکے دے رہی تھی۔

اچانک اسے لوبان کی ہلکی ہلکی خوشبو کا احساس ہوا آفریدی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ "مقدس دھویں" کا سفر نیم شب جاری ہو گیا تھا کمرے کے کواڑ بند تھے اس لئے رام دیو کی عظمتوں کا نشان وہ خوشبودار دھواں اندر داخل نہ ہو سکا مگر اپنی شدت کے سبب اتنا احساس ضرور دلاتا رہا کہ اہل چتوڑ سو رہے ہیں اور ستمگر و سفاک ساحر جاگ رہا ہے۔

پھر رام دیو کی کریہہ آواز ابھرنے لگی۔

"آگ امر ہے اور ہم اسی آگ کے پجاری ہیں۔ یہ وہ آگ ہے جو انکار کرنے والوں کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے اور اپنے ماننے والوں کو نئی شکتی دے کر خود انہیں بھی امر بنا دیتی ہے۔ ہم نے آکاش کی جوالا کو اس قدر پوجا ہے کہ اب ہم خود بھی جوالا مکھی (آتش فشاں) بن گئے ہیں۔ اب ہمیں کوئی آگ نہیں جلا سکتی۔ اب ہم ہی نرک ہیں اور ہم ہی سورگ۔ عرب سے آنے والے ملیچھ (ناپاک) سارے سنسار کو نرک کی اگنی سے ڈرا کر انہیں ان کے دھرم سے بھٹکا سکتے ہیں مگر ہم تو اپنے آپ ہی اگنی کا ایک سمندر ہیں۔ ہمیں کون جلا سکتا ہے؟ ہم بڑی بے چینی سے سلطان کی پرتیکشا (انتظار) کر رہے ہیں وہ چتوڑ آئے اور ہمارے دیوتاؤں کی آگ کا ایندھن بن جائے۔ دلی کے شاسک (حکمراں) کو نہیں معلوم کہ ہمارے گیان کی اگنی کتنی بھوکی ہے جب تک اسے ملیچھوں کے شریر کا بھوجن نہیں ملے گا، یہ اس سے تک بھڑکتی ہی رہے گی۔"

آفریدی آج پہلی بار رام دیو کے منتر کی زبان سمجھ سکا تھا۔

کچھ دیر بعد رام دیو کی آواز دوبارہ گونجنے لگی اب کی بار وہ اسی نامانوس زبان میں منتر پڑھ رہا تھا آفریدی چند لمحوں تک حیران و پریشان رہا پھر اس پر یہ راز فاش ہو گیا کہ رام دیو نے جان بوجھ کر آسان زبان استعمال کی تھی وہ کوئی منتر نہیں تھا بلکہ ایک دھمکی تھی جسے رام دیو، آفریدی کو منتقل کرنا چاہتا تھا۔ رام دیو کی یہ حکمت عملی بھی اسی منصوبے کا ایک حصہ تھی کہ علی عامر آفریدی راجپوتوں کی سیاسی قوت اور جادوگروں کی ساحرانہ

طاقت سے متاثر ہو کر اپنے سلطان کو چتوڑ کی طرف آنے سے باز رکھے اور واضح الفاظ میں علاء الدین خلجی کو بتادے کہ وہ ادھر کا رخ نہ کرے۔ راجپوتوں کا پورا علاقہ رام دیو کے طلسم کے زیر اثر ہے' اس لئے ناقابل تسخیر ہے۔

رام دیو کی عیاریوں کے مسلسل مظاہرے دیکھ کر آفریدی کے چہرے پر چٹانوں جیسی سختی ابھر آئی لیکن یہ سختی بھی برسات کی اسی دھوپ کی طرح عارضی تھی جسے دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ بادل نگل لیتے ہیں۔

آفریدی نے رام دیو کی آواز سے پیچھا چھڑایا تو ساوتری کا تنِ داغ داغ منتظر تھا کوئی آئے اور اس کی مقتول جوانی کا مرثیہ پڑھے۔ آفریدی کے سوا رقاصہ ساوتری کی موت پر نوحہ خوانی کرنے والا کون تھا ؟ علی عامر نے ساوتری کے کٹے ہوئے سر کو دیکھا اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جن میں خلشِ انتظار کا عکس تھم کر رہ گیا تھا۔ آفریدی نے میدان جنگ سے لے کر شاہی مقتل تک بے شمار لوگوں کو زندگی سے محروم ہوتے دیکھا تھا مگر ساوتری کے تو مرنے کی ادا ہی انوکھی تھی۔

کانتا نے بھی آفریدی کو رلایا تھا لیکن ساوتری تو زندگی بھر کے لئے اس کے دل میں ایک رستا ہوا زخم چھوڑ گئی تھی۔ "کوئی اس طرح بھی موت کو گلے لگاتا ہے ؟" علی عامر آفریدی خود کلامی کے انداز میں اس طرح بول رہا تھا جیسے وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا ہو۔ "برباد پھولوں کو زمین پر گرنا ہی تھا تو میرے آنے سے پہلے گر گئے ہوتے میری آنکھوں کے سامنے شاخ سے یہ رشتہ کیوں توڑا گیا ؟ گرم ہواؤں کی بیدادگری کے فسانے مجھے کیوں سنائے ؟ میرے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں پھر جانے والوں نے اپنا یہ زہر میری سماعتوں میں کیوں اتار دیا ؟ میں کوئی مسیحا تو نہیں کہ ایک ایک زخم پر مرہم رکھ دیتا مجھے رقصِ زنجیر کیوں دکھایا کہ میرے ناتواں ہاتھ نغمگی کے پیروں کی بیڑیاں نہیں کاٹ سکتے میں تو نامعلوم منزلوں کا مسافر ہوں اور اس لئے پیدا کیا گیا ہوں کہ راستوں میں صدیوں سے پڑے ہوئے سنگ ریزوں کی فریادیں سنتا ہوا گزر جاؤں۔ کس کی چیخ پر ٹھہروں کہ یہاں تو چیخیں ہی چیخیں ہیں۔ موسم کی سختیوں سے بے رنگ ہو جانے والے کس پتھر کی داستان سنوں کہ ہر پتھر کا سینہ اندر سے گرم موم کی طرح ہے۔" آفریدی بہت دیر تک اپنی مجبوریوں کا ماتم کرتا رہا۔

پھر وہ آہستہ آہستہ نیچے اترا پورا کمرہ خون سے بھرا ہوا تھا۔ ساوتری کے بہنے والے لہو نے اتنی جگہ بھی نہیں چھوڑی تھی کہ کوئی شخص اپنے قدموں کو آلودہ کئے بغیر یہاں سے گزر جاتا۔ آفریدی کے تلوے بھی ساوتری کے خون سے تر ہو گئے۔ راجپوتوں کی نظر میں یہ ایک نیچ لڑکی کا خون تھا وہ غیرت کی حرارت سے محروم ہوتا ہے۔ مگر جب اسی خون نے آفریدی کے پیروں کو چھوا تو شاہی سفیر کے دل و دماغ جل اٹھے۔ علی عامر کو محسوس ہوا کہ ساوتری کے خون میں اعلیٰ نسل راجپوتوں کے خون سے زیادہ گرمی تھی۔

آفریدی بے پناہ قوت برداشت کا مظاہرہ کرتا ہوا بالآخر رقاصہ ساوتری کے پیروں تک پہنچ گیا جن میں باندھے جانے والے سنہری گھنگھرو خون آلود نظر آرہے تھے۔ آفریدی چند لمحوں تک ان پیروں کو دیکھتا رہا جن کی گردش سے کبھی اہل ہوس کے دل کی دنیا زیر و زبر ہو جاتی تھی اور اب وہی پائے حنائی کسی خاردار شاخ کی طرح کاٹ کر پھینک دیئے گئے تھے۔ اہلِ ہوس کا یہ کاروبار بھی کس قدر سنگدلانہ تھا۔ جسم و جاں کے تاجر رات کے اندھیروں میں گھنگھروؤں سے ان کی جھنکار کا سود وصول کرتے اور صبح ہوتے ہوتے انہیں اس لئے توڑ دیتے کہ آئندہ شب میں کوئی دوسری نوخیز پازیب ان کی سوداگری کا نشانہ بننے کی منتظر ہوتی تھی۔

آفریدی جھکا اور لرزتے ہاتھوں سے گھنگھروؤں کو کھولنے لگا۔ "مرنے کے بعد سہی مگر میں نے تجھے ہوس پرستوں کی پہنائی ہوئی زنجیروں سے آزاد کر دیا۔ کل تیرے جسم کے ٹکڑوں کو نذر آتش کر دیا جائے

گا مگر اس طرح کہ تیرے پاؤں میں مجبوری و غلامی کی کوئی لعنت زدہ نشانی نہیں ہوگی پھر میں تیری اس نشانی کو دہلی لے جاؤں گا۔ اگر زندگی نے وفا کی تو دوبارہ چتوڑ آؤں گا اور تیری قوم کی ایک ایک لڑکی کے پیروں سے گھنگھرو کھول دوں گا۔ میں تیری نیم باز آنکھیں دیکھ رہا ہوں تو آنے والوں کا انتظار کر رہی ہے۔ راکھ ہو جانے کے بعد بھی اپنی شبنمیں آنکھوں کو کھلا رکھنا آنے والے ایک دن ضرور آئیں گے۔ انہیں جادوگر رام دیو روک سکتا ہے اور نہ یہ اعلیٰ نسل ہوس کے پجاری بس ساوتری ! وہ آیا ہی چاہتے ہیں۔ میری سماعتوں میں ان کی آب دار شمشیروں اور گھوڑوں کی برق رفتاری کا شور گونج رہا ہے۔ اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔"

ساوتری کی لاش کو مخاطب کر کے آفریدی اپنے بستر کی طرف پلٹا اور اس نے رقاصہ کے گھنگھرو اپنے پیرہن کی جیب میں رکھ لئے۔ "یہ ان مظلوم لڑکیوں کی امانت ہیں جنہیں میں آنے والے وقت کی بارگاہ میں پیش کروں گا جو بہت مہربان اور انصاف کرنے والا ہے۔"

پھر آفریدی بستر پر لیٹ گیا۔ ساوتری کے خونِ ناحق کے دھبے اس بے داغ چادر تک پہنچے جو شاہی سفیر کے لئے بچھائی گئی تھی۔ آفریدی نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کے تصور میں خون کا ایک سمندر موجزن ہو گیا۔ سمندر کی ہر موج کے دوش پر ایک لہولہان لڑکی کا مردہ جسم تھا اور وہ تمام لڑکیاں ریاست چتوڑ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اپنی زندگی میں پہلی بار آفریدی کو محسوس ہوا کہ وہ راج محل کے کمرے کے بجائے کسی مقتل میں لیٹا ہے اور اس کا ریشمی بستر پتھر کی ایک قبر بن گیا ہے۔

سونے والوں کو سولی پر بھی نیند آجاتی ہے مگر تمام رات آفریدی کی پلک بھی نہ جھپک سکی یہاں تک کہ صبح ہو گئی پھر آفریدی اس وقت چونک اٹھا جب کمرے کا دروازہ کھلا اور چتوڑ میں بسنے والی نیچ قوم کے کچھ لوگ ساوتری کی لاش اٹھانے کے لئے اندر داخل ہوئے رام دیو کی سفاکی اور مسلسل کئی راتوں کی بے خوابی کے سبب آفریدی کا دماغ کسی پھوڑے کی طرح پک رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ کمرے کی صفائی کرنے والوں پر اپنی تمام نفرتیں نازل کر دے مگر یہ ایک کارِ بے سود تھا۔ وہ تو خود زمانے بھر کے ٹھکرائے ہوئے ستم رسیدہ انسان تھے۔ آفریدی بڑی قوت برداشت کے ساتھ وہ منظر دیکھتا رہا قانون کے محافظوں نے ایک رقاصہ کو قتل کر دیا تھا اور اب اس کی لاش کو جلانے کیلئے لے جایا جا رہا تھا۔ عدالتیں بھی قائم تھیں گواہ بھی موجود تھے مگر ساوتری کے خون کا کوئی حساب لینے والا نہیں تھا۔

آفریدی کے ہاتھ بھی دھوئے گئے جو ساوتری کے گھنگھرو کھولنے کی وجہ سے رنگین ہو گئے تھے اور اس چادر کو بھی صاف کر دیا گیا جس پر آفریدی کے خون آلود پیروں کے نشانات ابھر آئے تھے۔ بڑی مہارت سے رقاصہ کے خون کا عکس تک مٹا دیا گیا تھا مگر صفائی کرنے والوں کو یہ راز نہیں معلوم تھا کہ خون آفریدی کے پیرہن کی جیب تک پہنچ گیا ہے۔

جب کمرہ آئینے کی طرح شفاف ہو گیا تو مہامنتری وکرم سنگھ اس کی عیادت کیلئے آیا آفریدی نے بہت غور سے ریاست چتوڑ کے اس عظیم سیاستداں کو دیکھا۔ وکرم سنگھ کے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ تھی۔ آفریدی نے بھی اپنا انداز فکر بدل ڈالا اس سے پہلے کہ وکرم سنگھ اس کی مزاج پرسی کرتا' آفریدی خود ہی بول اٹھا۔

"مہامنتری کو یہ مسلسل فتوحات مبارک ہوں۔" آفریدی کے ہونٹوں پر بھی ایک زہر آلود تبسم رقصاں تھا۔ "ابھی چتوڑ میں اور کتنی مظلوم لڑکیاں باقی ہیں جو شاہی سفیر کے ملاحظے کے لئے پیش کی جائیں گی۔"

"جب تک تمہیں اور تمہارے سلطان کو راجپوتوں کی لازوال قوت کا اندازہ نہیں ہو جاتا۔" وکرم سنگھ ' آفریدی کے قریب ہی بیٹھتا ہوا بولا۔

"طاقتور لوگ اپنی شمشیروں کا استعمال گلاب اور چنبیلی کی لچکتی ڈالیوں پر نہیں کرتے۔" آفریدی نے وکرم سنگھ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "فولاد صفت حریفوں کے جسم ہی بتا سکتے ہیں کہ اہل چتوڑ کی تلواریں زنگ آلود ہو گئی ہیں یا ابھی ان میں کچھ آب باقی ہے۔"

"وقت آنے دو' سربلند راجپوت تمہیں یہ ثبوت بھی فراہم کر دیں گے۔" کمرے میں مہامنتری کا قہقہہ بلند ہوا وکرم سنگھ کی یہ روش انتہائی تحقیر آمیز تھی۔

"نہیں مہامنتری! ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔" آفریدی' وکرم سنگھ کے دعوؤں کو مسلسل جھٹلا رہا تھا۔ "مجبور و بے کس عوام پر ناروا جبر و تشدد نے راجپوتوں کے وقار کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ جھوٹے غرور کی دیمک آپ کی پوری تہذیب کو چاٹ چکی ہے۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ کچھ بھی باقی نہیں بچا۔" آفریدی کی طعنہ زنی میں نشتروں جیسی کاٹ تھی۔

وکرم سنگھ تڑپ اٹھا۔ "آفریدی! تم اندھے ہو۔ کیا تمہیں اب تک مہاراج رام دیو کی ساحرانہ قوتوں کا اندازہ نہیں ہوا ؟"

"میں نے رام دیو سے کہہ دیا تھا کہ چتوڑ کے حکمرانوں نے سیاسی مسائل کو جادوگروں کے حوالے کر کے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ میں آپ سے ایک بار پھر درخواست کروں گا کہ مجھے خوف و ہراس میں مبتلا کرنے کے بجائے رانی پدمنی کے حضور پیش کر دیا جائے میری پیغام رسانی میں جس قدر تاخیر ہوتی جائے گی مسائل اتنے ہی الجھتے چلے جائیں گے۔ ساعتِ انتظار زیادہ طویل ہو گئی تو پھر سلطان کے قہر و غضب کے آگے معذرت کی کوئی دیوار کھڑی نہیں کی جا سکے گی۔" آفریدی نے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"ہم نے تمہارے سلطان سے کسی سفارتی تعلق کی درخواست نہیں کی تھی اور نہ تم ہمارے بلائے ہوئے مہمان ہو تم نے یہ سفر اپنی غرض سے اختیار کیا ہے اس لئے تمہیں ہر حال میں رانی پدمنی کی خوشنودی کو پیش نظر رکھنا ہو گا۔ میں نے ان سے بات کی تھی لیکن ابھی وہ وقت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں' ویسے تمہارے زخم بھی مندمل نہیں ہوئے ہیں۔ انہیں بھر تو جانے دو۔" وکرم سنگھ نے بڑی خوبصورتی سے اپنی بے نیازی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"میرے زخم بھرنے تک تو بڑا ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ میرے زخموں کی طرف نہ دیکھیں سلطان کی اس بلند اقبال پیشانی کو تصور میں لانے کی کوشش کریں جس پر اب تک بے شمار شکنیں نمایاں ہو چکی ہوں گی۔"

"آفریدی! اپنی زبان کو احتیاط سے جنبش دو۔ تم کسی خراج گزار حکمراں سے نہیں ایک آزاد فرمانروا کے مہامنتری سے مخاطب ہو۔"

"مہامنتری! میں نے بہت احتیاط سے کام لیا' صبر کی آخری منزل سے بھی گزر کر دیکھ لیا مگر آپ کے تیور سمجھ میں نہیں آتے۔" آفریدی کے لہجے سے جھنجلاہٹ آشکار تھی۔ "اب میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔"

"ہم بھی تمہیں کشمکش انتظار سے بچانا چاہتے ہیں۔" وکرم سنگھ دوبارہ سرد مزاج نظر آنے لگا تھا۔" اگر تم اپنے مقصد کی تکمیل چاہتے ہو تو میرے ایک سوال کا جواب دو پھر تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"پوچھئے۔" آفریدی نے بیزاری سے جواب دیا۔

"تمہاری شمشیر سے ہلاک ہونے والے وہ مسلمان سپاہی چتوڑ کی سرحدوں تک کیوں آئے تھے ؟" وکرم سنگھ نے پوچھا۔ اور آفریدی کے جواب دینے سے پہلے ہی اپنے سوال کو آگے بڑھا دیا۔ "ہم اس راز سے واقف ہو چکے ہیں کہ مقتول سپاہی بھی سلطانی افواج سے تعلق رکھتے تھے پھر یہ مصنوعی جنگ کیوں کی گئی اور تم زخمی ہو کر مشکوک حالت میں ہمارے سرحدی محافظوں تک کیوں پہنچے ؟"

"مہامنتری! آپ اپنا اور میرا وقت برباد کر رہے ہیں۔" جب آفریدی نے گریز اختیار کیا تو وکرم سنگھ نے نئی چال چلی۔

"آخر تم مہارانی پدمنی سے کیوں ملنا چاہتے ہو ؟"

"مہامنتری! ہمیشہ یاد رکھو کہ شاہوں کے راز جاننے کی سزا بڑی دردناک ہوتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم بھی کچھ دن زندہ رہو اور مجھے بھی زندہ رہنے دو۔"

کچھ دیر تک کمرے پر سناٹا طاری رہا پھر وکرم سنگھ بہت ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا۔ "تم میرے کسی سوال کا بھی جواب نہ دے سکے اس لئے تمہیں رانی پدمنی کی حضوری کا شرف حاصل نہیں ہو سکتا۔" یہ کہتے ہوئے وکرم سنگھ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے۔" آفریدی نے بھی اپنی نگاہوں کا زاویہ تبدیل کر لیا۔ "اگر رانی پدمنی کے پاس سلطان علاء الدین خلجی کا پیغام سننے کے لئے وقت نہیں ہے تو پھر میں بھی چتوڑ کی سلامتی کی ضمانت نہیں دے سکتا اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ مدتِ انتظار ختم ہونے کے بعد دہلی سے کوئی دوسرا سفیر چتوڑ کی جانب آئے گا تو اپنے ان گمراہ کن خیالات سے فوراً پیچھا چھڑا لیجئے۔ سلطان کی نازک مزاجیاں ان باتوں کی عادی نہیں وہ اپنی خواہشات کی تکمیل میں ایک لمحے کی تاخیر بھی برداشت نہیں کرتے میں نے سلطان کی شاہی لغت میں انتظار کا لفظ نہیں دیکھا۔" یہ کہتے کہتے علی عامر آفریدی کو بھی محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ خود علاء الدین خلجی کی زبان میں بول رہا ہو۔

وکرم سنگھ نے ناپسندیدہ نظروں سے آفریدی کی طرف دیکھا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

☆..............☆..............☆

اس رات بھی آفریدی کے کمرے میں صراحی بدست رقاصہ بھیجی گئی۔ رام دیو اور وکرم سنگھ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تھے ان کی مسلسل یہی کوشش تھی کہ کسی طرح آفریدی ایک بار لڑکھڑا جائے یا خوف و دہشت کی پرچھائیاں اس کے دل و دماغ کو گھیر لیں۔ منصوبے نئے نئے انداز سے ترتیب دیئے جاتے تھے مگر آفریدی کا توازن ابھی تک برقرار تھا۔ نہ شیشہ و جام اسے اپنی طرف متوجہ کر سکے تھے اور نہ ہوش ربا حسن رکھنے والی لڑکیاں اس کے حواس چھین سکی تھیں یہاں تک کہ رام دیو کے تمام جادوئی عمل بھی بے اثر ٹھہرے تھے اور علی عامر آفریدی پہلے سے زیادہ بے باک ہو گیا تھا۔

تقریباً پندرہ دن تک رام دیو کی سفلی سازشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصے میں شاہی سفیر صحت یاب ہو چکا تھا مگر ابھی اسے رانی پدمنی کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا۔

ادھر رام دیو اپنے طلسمات کے ذریعے آفریدی کو زیر کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ادھر انتہائی رازداری کے ساتھ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی' وکرم سنگھ سے مشورے کر رہے تھے۔

"مہاراج رام دیو اپنے بہترین ہنر کی نمائش کر چکے مگر شاہی سفیر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔" مہامنتری' راجہ رتن سنگھ کے سامنے اپنی تمام کارروائیوں کی تفصیلات پیش کر رہا تھا۔ "علاء الدین خلجی کا سفیر مہارانی

سے کس لئے ملنا چاہتا ہے ؟" آخر راجہ رتن سنگھ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ کئی دن سے اس تلخ حقیقت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر آج وہ خاموش نہ رہ سکا اور وکرم سنگھ پر برس پڑا۔

مہامنتری سر جھکائے کھڑا تھا۔ "میں نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی طرح میرے سامنے کھل جائے۔" وکرم سنگھ بہت آہستہ لہجے میں بول رہا تھا۔ "میں سارے حربے استعمال کر چکا ہوں۔ مگر وہ یہی کہتا ہے کہ سلطان کا پیغام صرف مہارانی پدمنی کے لئے ہے۔"

راجہ رتن سنگھ نے گھبرا کر اپنی خوبصورت شریک حیات کی طرف دیکھا۔ رانی پدمنی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ ایک نامحرم کی زبان سے ادا ہونے والے ان الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ فوراً ہی چیخ کر بولی۔ "اس کی زبان کاٹ کر پھینک دو یا پھر اسی حالت میں دہلی واپس بھیج دو۔"

"نہیں مہارانی! ہمیں سلطان کا پیغام سننا ہی ہو گا۔" وکرم سنگھ نے ادب کے ساتھ رانی پدمنی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "علاء الدین خلجی طاقت کا وہ طوفان ہے جس کے اثر سے مضبوط ترین سلطنتیں بھی خس و خاشاک کی مانند اڑی جا رہی ہیں۔ یہ بات خواہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو مگر ہمیں ان سرکش ہواؤں کے صحیح رخ کا اندازہ کرنا ہو گا ورنہ چتوڑ کا ایک ایک چراغ بجھ جائے گا۔"

"یہ راز تمہارے علاوہ کس کو معلوم ہے کہ دہلی کا سفیر رانی پدمنی کے لئے خفیہ پیغام لے کر آیا ہے ؟" راجہ رتن سنگھ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"راج محل کے سبھی نواسی اس راز سے واقف ہیں۔" وکرم سنگھ اس حقیقت کو چھپانا چاہتا تھا کہ اس طرح رانی پدمنی کے رسوا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

"آخر ایسا کیوں ہوا ؟" راجہ رتن سنگھ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور چیختے ہوئے بولا "کیا ہم نے تمہیں اسی دن کیلئے وزارت عظمیٰ کا منصب بخشا تھا کہ تم گہری نیند سو جاؤ اور راج محل کے راز بند کمروں سے نکل کر چتوڑ کی پہاڑیوں میں گونجنے لگیں۔"

راجہ رتن سنگھ کے اس سوال پر وکرم سنگھ کا چہرہ فق ہو گیا مگر وہ ایک مضبوط اعصاب کا انسان تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بکھرنے نہیں دیا۔ "مہاراج میں نے اس راز پر گہرا پردہ ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر وقت کی رفتار میرے ارادوں سے زیادہ تیز تھی۔" وکرم سنگھ بہت پُراعتماد لہجے میں بول رہا تھا۔ "جب ہمارے سرحدی محافظوں نے ایک زخمی نوجوان کو نیم بے ہوشی کے عالم میں پایا تو وہ بار بار چیخ رہا تھا کہ میں علاء الدین خلجی کا سفیر ہوں مجھے رانی پدمنی کے حضور لے چلو۔ میں چتوڑ کی حکمراں کے لئے سلطان کا ایک اہم پیغام لے کر آیا ہوں۔ یہ الفاظ ہمارے کئی سپاہیوں نے سنے اور پھر بات پھیلتی چلی گئی۔ علاء الدین خلجی کا سفیر انتہائی مشکوک اور ہنگامی حالت میں یہاں تک پہنچا تھا۔ میرا ذہن حادثے کی تحقیق میں الجھا رہا۔ اور چتوڑ کے سپاہی اشاروں کنایوں میں راز ایک دوسرے کو منتقل کرتے رہے۔ ان کی زبانیں آج بھی خاموش ہیں مگر نگاہیں سلطان کا وہ مخصوص پیغام جاننے کے لئے بے چین نظر آتی ہیں۔"

"تم راجپوت سپاہیوں کی بے چینی کا مطلب سمجھتے ہو وکرم سنگھ ؟" راجہ رتن سنگھ کا لہجہ نفرت کے زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔ "کچھ دن پہلے گجرات میں یہ شرمناک واقعہ رونما ہو چکا ہے کہ راجہ کرن شکست کھا کر فرار ہو گیا اور اس کی بیوی کملا دیوی مسلمان ہو کر سلطان کے حرم میں داخل ہو گئی۔ سلطان کا یہ خصوصی پیغام بھی ایسا ہی ہے کہ جیسے دہلی کا حکمراں چتوڑ کے راجپوتوں کے چہروں پر سیاہی مل دینا چاہتا ہے۔ اس کی فوجوں نے ابھی تک گردش نہیں کی لیکن سفیر بھیج کر سلطان نے ہماری عزت و ناموس پر یلغار کر دی ہے۔ تم بار بار یہ جاہلانہ تبصرہ کرتے رہتے ہو۔ علاء الدین کا سفیر مشکوک حالات میں یہاں تک پہنچا ہے۔ میں

کہتا ہوں کہ اس کے ایک لفظ نے راجپوت سرداروں اور فوجیوں کے درمیان رانی پدمنی کے تقدس کو مشتبہ بنانے کی کوشش کی ہے اور یہ سب کچھ تمہاری بے خبری کے باعث ہوا ہے۔" راجہ رتن سنگھ انتہائی عالم جبر میں اپنے لائق ترین مہامنتری کو اس کا گناہ یاد دلا رہا تھا۔

"یہ سرگوشیاں صرف راج محل اور وزراء کے اعلیٰ طبقے تک محدود ہیں۔" وکرم سنگھ کا لہجہ ندامت آمیز تھا۔ "یقیناً صورت حال کسی حد تک بگڑ گئی ہے مگر پھر بھی آپ کی عام رعایا کو یہ خبر نہیں ہے کہ سلطانی سفیر یہاں کس لئے آیا ہے ؟ وہ بس اتنا جانتے ہیں کہ سلطان علاء الدین خلجی نے مہاراجہ رتن سنگھ کی طرف صلح اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ آپ کا یہ خادم بس اتنا ہی کر سکتا تھا کہ بگڑی ہوئی صورت حال کو نیا رخ دے کر عوام کے ذہنوں کو غبار آلود ہونے سے بچا لے۔"

"عورتوں کی حد سے بڑھی ہوئی خوبصورتی شبستان محبت کو سیاسی مقتل بنا دیتی ہے۔" راجہ رتن سنگھ بہت زیادہ شکستہ نظر آنے لگا تھا۔ رانی پدمنی نے فوراً ہی ایک جام سرخ لبریز کر کے اپنے شوہر کی خدمت میں پیش کیا۔ رتن سنگھ ہمیشہ پدمنی کے ہاتھ سے شراب پیتا تھا اس کی دوسری رانیوں کو یہ سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی جب کبھی سیاسی صورت حال الجھ جاتی تو رانی پدمنی رات رات بھر راجہ رتن سنگھ کو شراب پلاتی رہتی اور چتوڑ کا حکمراں اپنے پرسکون اعصاب کے ساتھ ان مسائل کا حل تلاش کرتا رہتا۔ پدمنی کے ہاتھ سے کئی جام پینے کے بعد رتن سنگھ نے مہامنتری کی طرف دیکھا۔

"اب ہمارے سامنے تین راستے کھلے ہوئے ہیں آفریدی کو مسلسل قید میں رکھا جائے یا پھر قتل کر دیا جائے۔ اس طرح ہم اپنی حکومت کے سفینے کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتے ہیں اگر سلطان نے ہم سے اپنے سفیر کا حساب طلب کر لیا تو پھر بڑے سے بڑا سنگین حادثہ ہو سکتا ہے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو تم کل رات یہ راز جاننے کی کوشش کرو کہ پیغام زبانی ہے یا تحریری ؟ میرے خیال میں خصوصی پیغام زبانی نہیں ہوتے۔ اس طرح یہ امکان موجود ہے کہ آفریدی کے پاس سلطان کا تحریری پیغام موجود ہے اگر ہم وہ پیغام حاصل کر لیں تو شاہی سفیر کو بے دست و پا کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم اس خفیہ پیغام کی عبارت سے بھی باخبر ہو جائیں گے اور پھر اس کی روشنی میں کوئی قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔" حالتِ بے خودی میں بھی راجہ رتن سنگھ کا مشورہ بہت معنی خیز تھا۔

☆..................☆..................☆

دوسرے دن فضا بہت زیادہ پرسکون نظر آ رہی تھی۔ مہاراج رام دیو کو اطلاع دی دی گئی تھی کہ آج کی رات وہ آفریدی کے کمرے میں نہیں جائیں گے بلکہ آدھی رات کے قریب راجہ رتن سنگھ' رانی پدمنی اور وکرم سنگھ خود ان کے درشن کو حاضر ہوں گے۔ منصوبے پر کس طرح عملدر آمد کیا جائے گا' اس کی خبر چتوڑ کی ان تین ہستیوں کے سوا کسی چوتھے فرد کو نہیں تھی۔ پھر جب شام ہوئی تو آفریدی کے لئے کھانا بھیجا گیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی سلطان کے سفیر کو محسوس ہوا کہ جیسے اس کی طبیعت کچھ بوجھل ہو گئی ہے۔ آفریدی نے اس تبدیلی پر کوئی دھیان نہیں دیا وہ اسے طبیعت کی سستی سمجھتا رہا اور کچھ دیر بعد بے ہوشی کی دوا نے اس کے حواس چھین لئے جب آفریدی اپنے گرد و پیش سے بالکل بے خبر ہو گیا تو محافظ سپاہی اسے اٹھا کر آشرم میں لے گئے۔ آفریدی کو بے ہوش دیکھ کر رام دیو' راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی پسندیدہ شکار بڑی بے دست و پا حالت میں ان کے سامنے لایا گیا تھا۔

"اسے یہاں ڈال دو۔" رام دیو نے تحقیر آمیز لہجے میں سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ رام دیو نے جس جگہ کی طرف اشارہ کیا تھا وہ لکڑیوں کی بنی ہوئی ایک بلند سیج تھی جو گیندے کے پھولوں کی کثرت سے

زرد نظر آ رہی تھی۔

راجہ رتن سنگھ آگے بڑھا اور رام دیو سے عرض کرنے لگا۔ "مہاراج! یہ ہمارے دشمن کا ایک خوفناک پیغام لے کر آیا ہے۔ اگر وہ پیغام کسی طرح "پرجا" کے سامنے سنا دیا گیا تو آپ کے ماننے والوں کی بڑی رسوائی ہوگی۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنے گیان سے اس پیغام کی حقیقت معلوم کر لیں پہلے یہ بتائیں کہ وہ زبانی پیغام ہے یا تحریری؟"

مہاراج رام دیو نے رتن سنگھ کا سوال سن کر پہلے تو بھڑکتی ہوئی آگ میں مٹھی بھر لوبان ڈالا اور جب کمرہ دھویں سے بھر گیا تو پھر آفریدی کے سینے پر اپنی پانچوں انگلیاں رکھ کر چند نامانوس کلمات پڑھے اور گرجدار آواز میں کہا۔

"پاپی! اسی میں تیری کُشلتا (سلامتی) ہے کہ تو اپنے من کا بھید کھول دے اور صاف صاف بتا دے کہ یہاں کیوں آیا ہے؟" رام دیو کا یہ جادوئی عمل سائنسی دور کے عمل تنویم سے مشابہ تھا۔ وہاں موجود تمام لوگ سمجھ رہے تھے کہ رام دیو کی پہلی ہی ہدایت پر آفریدی زبان کھول دے گا مگر بار بار ایک ہی بات کو دہرانے کے باوجود علی عامر آفریدی کے ہونٹوں کو جنبش تک نہ ہو سکی۔ جادوگر رام دیو کو ایک مرتبہ پھر ایک مسلم نوجوان نے شکست دیدی تھی۔ رام دیو شدید جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا۔

"بڑا پاپی ہے' بڑا پاپی ہے۔" رام دیو اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔ پھر اچانک راجہ رتن سنگھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "اس کے پاس کوئی زبانی پیغام نہیں۔ یہ جو کچھ لایا ہے وہ تحریری شکل میں کہیں موجود ہے تم لوگ تلاش کر لو۔ کامیابی حاصل ہوگی۔"

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی' رام دیو کے اس انکشاف کے بعد بہت خوش تھے۔ رتن سنگھ نے فوراً وکرم سنگھ کو حکم دیا کہ وہ شاہی سفیر کی باریک بینی سے تلاشی لے۔ وکرم سنگھ نے اپنے فرمانروا کی ہدایت کے مطابق آفریدی کے لباس کا ایک ایک گوشہ دیکھ ڈالا مگر وہاں کوئی شاہی دستاویز موجود نہیں تھی پھر جب راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کے چہرے گہری اداسیوں میں ڈوبنے لگے تو وکرم سنگھ اچانک بہت زیادہ خوش نظر آنے لگا۔ آفریدی کے پیرہن میں کسی ٹھوس چیز کی موجودگی ان کے خوابوں کی تعبیر پیش کر رہی تھی۔ مگر جب وکرم سنگھ کا ہاتھ باہر آیا تو سب کی آنکھیں حیرت سے کشادہ ہو گئیں وکرم سنگھ کے ہاتھ میں دو خون آلود گھنگھرو تھے۔

"یہ کیا ہے؟" راجہ رتن سنگھ حیرانی سے وکرم سنگھ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ رقاصہ ساوتری کے پیروں کے گھنگھرو ہیں جو کچھ دن پہلے آفریدی کے کمرے میں قتل کر دی گئی تھی۔ اور اس کا یہ جرم تھا کہ وہ شاہی سفیر کے سامنے اپنے حکمرانوں کی تذلیل کر رہی تھی۔"

"یہ گھنگھروؤں کا کیا کرے گا؟" راجہ رتن سنگھ کی حیرت برقرار تھی۔

"ہمارے جاسوسوں کی اطلاع کے مطابق یہ احمق نوجوان ساوتری کے گھنگھرو لے جا کر اپنے سلطان کی بارگاہ میں پیش کرے گا اور انہیں بتائے گا کہ چتوڑ میں انسانوں پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔" وکرم سنگھ نے اپنے حکمران کے سامنے آفریدی کی وحشت و دیوانگی کی تفصیلات پیش کیں۔

"مجھے کسی اچھوت رقاصہ کے گھنگرو نہیں علاء الدین خلجی کی وہ دستاویز چاہئے جو غیور راجپوتوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئی ہے۔" راجہ رتن سنگھ کا لہجہ قہر و غضب میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس سے پہلے کہ وکرم سنگھ کوئی جواب دیتا رام دیو کی مکروہ آواز سے رات کا سناٹا مجروح ہو گیا۔ "یہ کوئی شاہی دستاویز لے کر نہیں آیا ہے۔ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے زبانی پیغام کی شکل میں ہے اس پر تشدد کرو۔

تھوڑی ہی دیر میں زبان کھول دے گا۔" رام دیو کے لہجے میں آفریدی کے لئے بدترین نفرت موجود تھی۔

راجہ رتن سنگھ' رانی پدمنی اور مہامنتری حیرت زدہ نگاہوں سے رام دیو کی طرف دیکھ رہے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مہاراج کی کس بات کا اعتبار کریں۔ رام دیو نے پہلے کہا تھا کہ آفریدی زبانی پیغام لے کر آیا ہے۔ جب وہ منتروں کی شکتی سے سلطانی سفیر کی زبان نہ کھلوا سکے تو کہنے لگے کہ اس کے پاس کوئی تحریری دستاویز موجود ہے بہت دیر کی تلاشی کے بعد جب گھنگھروؤں کے سوا کچھ بھی برآمد نہ ہو سکا تو رام دیو نے ایک بار پھر اپنا بیان پلٹ دیا۔ اس کی یہ حرکت کسی سیاستدان سے کم نہیں تھی۔

"مہاراج ہم تو آپ کی ایک بات بھی نہیں سمجھ سکے۔" بالآخر رتن سنگھ نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو یہ خود بھی کوئی جادوگر معلوم ہوتا ہے۔" رام دیو بڑی بے حیائی کے ساتھ بول رہا تھا۔ "اس نے اپنی ساحرانہ قوتوں کا سہارا لے کر علاء الدین خلجی کے پیغام کو کہیں ایسی جگہ چھپا دیا ہے جسے کھوجنے کے لئے ہمیں کٹھن جاپ کرنا پڑے گا۔ تم لوگ اسے ایک رات کے لئے میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ آنے والی صبح میں روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ یہ سب کچھ اگل دے گا۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے آپ کا داس بن جائے گا۔ مجھے ایسے ٹیڑھے جانور کو سدھارنا خوب آتا ہے۔" یہ کہتے کہتے رام دیو کی مخمور سرخ آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئی تھیں اور کافوری شمعوں کی روشنی میں بڑا بھیانک منظر پیش کر رہی تھیں۔

راجہ رتن سنگھ اور مہامنتری وکرم سنگھ کو سکتہ سا ہو گیا تھا ابھی وہ دونوں حیرت و استعجاب میں ڈوبے ہوئے کھڑے تھے کہ چند سپاہی مہاراج رام دیو کے آشرم کے دروازے پر نمودار ہوئے۔

"ہم نے راج دوت کے گھوڑے کی زین کو ادھیڑ کر دیکھ لیا وہاں بھی کوئی کاغذ موجود نہیں۔" ایک سپاہی نے بلند آواز میں راجہ رتن سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بس ایک ہی کاغذ ہاتھ آیا ہے جو اس کے تکیئے کے نیچے موجود تھا۔"

سپاہی کے الفاظ کی گونج ختم ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ وکرم سنگھ دوڑتا ہوا آشرم کے دروازے تک پہنچا اور سپاہی کے ہاتھ سے کاغذ لے کر دیکھنے لگا۔ حالتِ اضطراب میں راجہ رتن سنگھ بھی مہامنتری کے قریب پہنچ چکا تھا۔ "کیا یہ وہی پیغام ہے؟" رتن سنگھ کسی بچے کی طرح وحشت زدہ نظر آ رہا تھا۔

"نہیں مہاراج! یہ تو علی عامر آفریدی کے شناختی کاغذات ہیں جن سے اس کے شاہی سفیر ہونے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔" وکرم سنگھ نے آہستہ سے کہا۔

"ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ اس کے پاس کوئی تحریری پیغام موجود نہیں۔" رام دیو بھی متکبرانہ انداز میں چلتا ہوا راجہ رتن سنگھ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ "آخر تم لوگ پریشان کیوں ہو؟ بس ایک رات ہی کی تو بات ہے پھر یہ راج دوت آپ کی آنکھ کے اشاروں پر ناچے گا۔"

رام دیو کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر وکرم سنگھ' راجہ رتن سنگھ سے سرگوشیوں میں مخاطب ہوا۔ "میری درخواست ہے کہ آفریدی کو ایک لمحے کے لئے بھی مہاراج کے حوالے نہ کیجئے گا۔ مہاراج کو اس نوجوان سے شدید نفرت ہے اور یہی نفرت شاہی سفیر کی زندگی کا بھی خاتمہ کر سکتی ہے۔" وکرم سنگھ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ بول رہا تھا۔ وہ مہاراج رام دیو کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اپنی بات ختم کر لینا چاہتا تھا۔ "مجھے یقین ہے کہ مہاراج' آفریدی پر تشدد کے حربے آزمائیں گے اور پھر یہی تشدد ہماری زندگی کے اس خوفناک مسئلے کو بری طرح الجھا کر رکھ دے گا۔"

جیسے ہی وکرم سنگھ کی بات ختم ہوئی رام دیو' راجہ رتن سنگھ کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔

"اب آپ لوگ سکھ کی نیند سوجائیں۔" مہاراج رام دیو اپنے ہونٹوں پر ایک خبیث مسکراہٹ سجائے ہوئے بڑے سفاکانہ انداز میں بول رہا تھا۔ "بس ایک رات ہی کی تو بات ہے۔ بھور ہوتے ہی جب سورج دیوتا اپنے درشن دیں گے تو آپ کا کام ہوچکا ہوگا یہ ملچھ جو اس سمے مون (خاموشی) سادھے پڑا ہے کل اس دشا میں نہیں پایا جائے گا۔" رام دیو نے علی عامر آفریدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کل جب یہ ندرا (نیند) سے جاگے گا تو رام رام کرتا اٹھے گا اور اپنا سارا دھرم کرم بھول جائے گا۔"

راجہ رتن سنگھ نے بہت کوشش کی کہ وہ علی عامر آفریدی کو راج محل میں واپس لے جائے مگر رام دیو نہیں مانا۔ اور چتوڑ کا حکمراں اس جادوگر کے سامنے مجبور نظر آنے لگا۔

پھر رام دیو نے اپنے شاگرد خاص شیوا کو طلب کر کے کہا۔ "اپنی ساحرانہ قوتوں سے اس ملچھ کا دھرم نشٹ کر دے۔"

شیوا نے بے ہوش آفریدی پر کئی منتر آزمائے مگر شاہی سفیر کے ہونٹوں کو جنبش تک نہ ہو سکی۔ آخر شیوا نے اپنے گرو کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "مہاراج! آپ کا یہ داس بھی ناکام ہوگیا۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی نادیدہ طاقت اس کی مدد کر رہی ہے اور یہ خود بھی کوئی بڑا جادوگر ہے۔"

شیوا نے جس نادیدہ طاقت کا ذکر کیا تھا' وہ محض تائید غیبی تھی۔ رام دیو اور شیوا نہیں جانتے تھے کہ علی عامر آفریدی حافظ قرآن تھا۔ اس لئے شاہی سفیر پر بدترین جادو بھی اثرانداز نہیں ہورہا تھا۔

اپنے شاگرد کی ناکامی دیکھ کر رام دیو پر وحشت طاری ہوگئی۔ پھر اس نے علی عامر آفریدی کو قتل کرنے کے لئے نشتر اٹھایا۔

"مہاراج! اسے قتل نہ کیجئے گا۔ یہ دلی کا راج دوت (سفیر) ہے۔" شیوا چیخنے لگا۔ مگر رام دیو پر جنون طاری تھا۔ چتوڑ کا درندہ علی عامر کو قتل کر دینا چاہتا تھا لیکن اچانک اس کا ہاتھ مفلوج ہوگیا جس میں تیز نشتر چمک رہا تھا۔

"شیوا! میرے ہاتھ کو کیا ہوگیا؟" رام دیو پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔

"مہاراج! اسے جانے دیں۔ مجھے ایک نامعلوم خطرے کی آہٹ محسوس ہورہی ہے۔" شیوا نے ایک بار پھر اپنے گرو سے درخواست کی۔

مسلسل ناکامیوں نے رام دیو کے ہوش وحواس چھین لئے تھے۔ اس نے شیوا کو حکم دیا کہ وہ لکڑیاں جمع کر کے آگ بھڑکائے اور آفریدی کے جسم کو خونخوار شعلوں کے حوالے کر دے۔ شیوا گرو کے حکم کے آگے مجبور تھا۔ پھر جیسے ہی آگ بھڑکائی گئی' یکایک تیز ہوا چلنے لگی اور جلتی ہوئی لکڑیاں رام دیو پر گریں جس سے اس کا پورا چہرہ جھلس کر رہ گیا۔ "شیوا! یہ سب کچھ کیا ہے؟" رام دیو کسی ذبح کئے جانے والے جانور کی طرح چیخ رہا تھا۔

"اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ ہم سنیاسی آنند پال سے مدد لیں۔" شیوا نے اپنے گرو کا جلا ہوا چہرہ دیکھ کر کہا۔ "آنند پال کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا کہ راج دوت کن طاقتوں کے زیراثر ہے؟"

سنیاسی آنند پال ایک تارک الدنیا اور انتہائی شریف النفس انسان تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رام دیو جیسا خبیث شخص سنیاسی سے نفرت کرتا تھا۔ مگر مجبوریاں اسے آنند پال کے دروازے تک لے گئیں۔ رام دیو' شیوا کے ہمراہ شاہی رتھ میں بیٹھ کر "جین" کے سات مندروں سے گزرتا ہوا "کمبھ شیام" کے مندر پہنچا۔

شیوا بجھے دل کے ساتھ رتھ سے نیچے اترا اور مندر میں چلا گیا۔ بیشتر پجاری زمین پر پڑے سو رہے تھے مگر کوئی کوئی درد کا مارا جاگ رہا تھا اور اپنے گھنشیام کو پکار رہا تھا۔ شیوا نے اسی جاگنے والے سے سنیاسی آنند پال کے بارے میں پوچھا۔ پجاری نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ سنیاسی جی اسی کمرے میں دن رات بند پڑے رہتے ہیں' کبھی کبھی باہر نکلتے ہیں۔ اتفاقاً کسی شخص سے بات کر لیتے ہیں ورنہ ان کے روزوشب خاموشی اور گوشہ نشینی میں گزر جاتے ہیں۔ رام دیو نے تو اپنے تکبر کے نشے میں آنند پال کی شخصیت کو جھٹلا دیا تھا مگر شیوا اس رحم دل سنیاسی کے مقام سے کچھ کچھ واقف تھا۔ اس لئے ڈرتا ہوا آگے بڑھا اور پھر آہستہ سے آنند پال کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ آنند پال جاگ رہا تھا۔ سنیاسی نے چاہا کہ وہ دستک کا جواب نہ دے مگر یہ سوچ کر کہ آدھی رات کو دشوار ترین راستہ طے کر کے آنے والا کوئی دکھی انسان بھی ہو سکتا ہے۔ یہی سوچ کر سنیاسی اٹھا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ ایک دراز قامت سیاہ فام نوجوان آنند پال کے سامنے کھڑا تھا۔ شیوا کی صورت دیکھ کر سنیاسی نے کراہیت محسوس کی تھی مگر وہ اپنی خوش اخلاقی سے مجبور تھا۔

"میرے بچے! تم کون ہو اور اتنی رات کو یہاں کیوں آئے ہو۔" آنند پال کی آواز دل موہ لینے والی تھی۔

شیوا نے ہاتھ جوڑ کر سنیاسی کو پرنام کیا اور پھر اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "میں مہاراج رام دیو کا داس شیوا ہوں۔ مہاراج مندر سے باہر رتھ میں موجود ہیں۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

رام دیو کا نام سنتے ہی سنیاسی کے بزرگ اور معصوم چہرے پر نفرت وغضب کی آگ بھڑک اٹھی۔

"رام دیو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں مانوتا (انسانیت) پر ستم ڈھانے والے ہتیاروں (قاتلوں) سے نہیں ملتا۔ اسے جب راجاؤں کے تلوے چاٹنے سے فرصت مل جائے تو پھر ادھر کا رخ کرے۔ اس سے پہلے میں اس کا چہرہ دیکھنا بھی پاپ سمجھتا ہوں۔" یہ کہہ کر سنیاسی آنند پال نے دروازہ بند کر لیا۔

رام دیو کو مجبوراً ملاقات کی بھیک مانگنی پڑی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سنیاسی آنند پال ایک بڑا سادھو ہے اس نے زندگی بھر اپنے دیوتاؤں کی بےلوث عبادت کی تھی۔ سخت مجاہدات کئے تھے اور وہ (ہندو مذہب کے اعتبار سے) روحانیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گیا تھا۔ اسے حکمرانوں سے شدید نفرت تھی۔ وہ امراء اور وزراء کی صورت دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتا تھا۔ اس لئے راجہ رتن سنگھ نے اس پر چتوڑ کی سماجی زندگی کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ وہ مستقل طور پر مختلف مندروں میں پڑا رہتا تھا۔ سنیاسی آنند پال کی عمر اب ستر سال کے قریب ہوچکی تھی۔ وہ تجرد کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ چتوڑ کے کئی اعلیٰ نسل برہمنوں نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ ان کی لڑکیوں سے شادی کر لے مگر آنند پال ہمیشہ یہ کہہ کر انکار کر دیا کرتا تھا۔ "میں نے سنسار کو تیاگ دیا۔ اب مایا موہ کے راستے پر میرے قدم دوبارہ نہیں آئیں گے۔" آنند پال زندگی کے ان معاملات میں انتہائی سخت گیر انسان تھا۔ چتوڑ کی بےشمار عورتیں اس کے پاس اپنی ہزاروں مرادیں لے کر آتی تھیں مگر وہ کسی بھی عورت سے ملنا گوارہ نہیں کرتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ کسی غم زدہ عورت کی فریاد سن کر وہ اپنے کمرے کے اندر ہی سے اس عورت کو آشیرواد دیدیا کرتا تھا لیکن کبھی اس نے صنف نازک کا سامنا نہیں کیا۔ اس طرح آنند پال "مردم بیزار" سے زیادہ "عورت بیزار" نظر آتا تھا۔

اسی سخت ریاضت نے آنند پال کو انتہائی نڈر اور بےباک بنا دیا تھا۔ وہ کھلے الفاظ میں راجپوتوں کے نظام حکومت اور جبروتشدد پر نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ بالآخر راجہ رتن سنگھ نے ایک فرمان جاری کر دیا تھا جس کے تحت آنند پال دور دراز کے مندروں میں زندگی گزار سکتا تھا۔ ان حدود سے نکلنا اس کیلئے ایک سنگین جرم ٹھہرا

تھا۔ راجہ کا معتوب ہونے کے باعث کوئی درباری آنند پال سے نہیں ملتا تھا۔ مگر آج رام دیو کی مجبوریاں اسے ایک ایسے شخص کے پاس کھینچ کر لے آئی تھیں جو سرزمین چتوڑ پر سب سے زیادہ سچ بولنے والا انسان تھا۔ جس سے لوگ ڈرتے تھے اور وہ خود لوگوں کی منافقانہ زندگی کا مذاق اڑاتا تھا۔

رام دیو اس حقیقت سے بھی باخبر تھا کہ آنند پال ایک بہت بڑے جوگی امرپال کا بیٹا ہے۔ امرپال اپنے بیٹے آنند پال سے بھی زیادہ صادق القول اور بےباک تھا پھر یہی سچائی اور بےباکی اس کی موت کا سبب بن گئی تھی۔ راجہ رتن سنگھ کے باپ راجہ سمر سنگھ نے حکومت وقت پر کڑی تنقید کرنے کے جرم میں امرپال کو قتل کرا دیا تھا اس وقت آنند پال کی عمر چودہ پندرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ مرتے وقت امرپال نے اپنے بیٹے کو ان الفاظ میں نصیحت کی تھی۔

"بیٹے! میں کوئی نیا انسان نہیں ہوں جو اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ مجھ سے پہلے بھی بےشمار آدمی فنا کے راستے پر جا چکے ہیں۔ آج جو لوگ میری جان لے رہے ہیں انہیں بھی ایک دن اسی راہ پر جانا ہوگا۔ بےشک! میں تمہیں دنیا کی آسائشیں اور نعمتیں نہیں دے سکا مگر پھر بھی ایسی چیز دے کر پرلوک (دوسری دنیا) جا رہا ہوں جس کے سوا سنسار میں کوئی دوسری شے زندہ رہنے والی نہیں ہے۔ ایک باپ اپنے بیٹے کو سچائی سے بڑی جاگیر نہیں دے سکتا۔ سچ ہی حقیقت ہے اور سچ ہی امر ہے۔ میں جس کو زندگی بھر ڈھونڈتا رہا وہ پتھروں میں نہیں، کہیں اور چھپا ہے۔ تم بھی آخری سانس تک سچ بولتے رہنا۔ شاید تمہاری سچائی سے متاثر ہو کر کسی دن وہ تمہارے سامنے بےنقاب ہو جائے۔" اس نصیحت کے بعد راجہ سمر سنگھ کے سپاہیوں نے جوگی امرپال کو قتل کر دیا تھا۔ باپ کو خون میں نہاتا ہوا دیکھ کر آنند پال بہت رویا تھا اور پھر اسے تمام دنیا پرستوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ عالم شباب میں راجہ رتن سنگھ کے اشارے پر چتوڑ کی خوبصورت عورتوں نے آنند پال کو گمراہ کرنے کی بھی کوشش کی تھی مگر وہ فریب حسن کے جال سے سلامتی کے ساتھ نکل گیا تھا اس کے بعد کئی مواقع پر راجہ رتن سنگھ نے اسے آزمانے کی کوشش کی تھی لیکن آنند پال ہر امتحان اور آزمائش میں ثابت قدم ٹھہرا تھا۔ انجام کار راجہ رتن سنگھ نے اسی میں عافیت سمجھی کہ آنند پال کو شہری زندگی سے دور کر کے پہاڑی مندروں میں محصور کر دے۔

سنیاسی آنند پال کو تنہائی کی زندگی بسر کرتے کرتے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔ آج چتوڑ کے سب سے بڑے شعبدہ باز کو اپنے سامنے دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی تھی اور خوشی بھی۔ آنند پال اپنی اسی خوشی میں اضافہ کیلئے رام دیو سے پوچھ رہا تھا کہ تیرا ایک ہاتھ مفلوج کیوں ہو گیا ہے اور چہرے پر جلے ہوئے زخموں کے نشانات کیسے ہیں؟

رام دیو نے انتہائی حالت جبر میں اپنی ناکامیوں کا قصہ سنایا اور سنیاسی کے پاؤں چھونے کے لئے اپنے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "آنند پال! اہل چتوڑ اور راجہ رتن سنگھ کے سامنے مجھے بےآبرو ہونے سے بچا لے۔"

"نہیں اس کی آوشکتا (ضرورت) نہیں۔" آنند پال نے اپنے پاؤں کھینچ لئے۔ "تیرے روگ کی ایک ہی دوا ہے کہ تو اپنے ہاتھ سے اس راج دوت کے پاؤں چھو لے جو تیرے آشرم میں بےسدھ پڑا ہے۔"

"سنیاسی!" رام دیو چیخ اٹھا۔ "میں تیرے گیان کے پاؤں چھو رہا ہوں، کسی ملچھ یا اچھوت کے نہیں۔"

"اپنی دھونی (آواز) نیچی کر رام دیو۔" سنیاسی آنند پال بھی اپنی حقیقت کی طرف پلٹ آیا۔ "دینے والا جو کچھ دے، بھکاری کو شیش (سر) جھکا کر سویکار کر لینا چاہئے۔"

رام دیو فوراً سنبھل گیا۔ اس کی آنکھوں میں گداگری کا وہی رنگ دوبارہ لوٹ آیا تھا۔

"اس طرح تو یہ بھید بھی جان لے گا کہ راج دوت کون ہے؟" آنند پال نے بیزار لہجے میں کہا اور منہ پھیر لیا۔ "بس اب جا، میری آنکھوں سے اوجھل ہو جا۔"

رام دیو اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں جا رہا ہوں۔ آنند پال! تیرا بہت بہت دھنیہ واد (شکریہ) میں پھر آؤں گا۔"

"نہیں! کبھی نہیں۔" آنند پال نے مڑ کر رام دیو کی طرف دیکھا۔ "اب کے آئے گا تو میں کواڑ بھی نہیں کھولوں گا۔"

"تیری کرپا ہو گی سنیاسی! بس ایک اور الجھن دور کر دے۔" رام دیو نے کسی حریص بھکاری کی طرح آنند پال کے سامنے اپنا کشکول پھر بڑھا دیا تھا۔

آنند پال خاموش تھا مگر اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ رام دیو کی بات سننے کے لئے آمادہ ہے۔

"میرے سارے منتر اپر بھاوت (غیر موثر) کیوں رہے؟" رام دیو، آنند پال سے پوچھ رہا تھا۔ "سدھ میں نہ ہوتے ہوئے بھی راج دوت کی سرکشا (حفاظت) کون کر رہا تھا؟ میرے یہ منتر تو وہ تھے جن کا سنسار میں کوئی توڑ نہیں۔ پھر وہ کون تھا جس نے سب کچھ کاٹ کر رکھ دیا۔"

رام دیو کا سوال سنتے ہی آنند پال گہری سوچ میں ڈوب گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ سنیاسی اپنے دھیان (مراقبے) میں تھا۔ اس کے چہرے پر مسلسل کئی رنگ ابھر ابھر کر ڈوب رہے تھے۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"میری پہنچ راج دوت کے چہرے تک ہے۔ جب اس کے دل کی طرف دیکھتا ہوں تو آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی ایک دیوار کھنچ جاتی ہے۔ پھر مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ کچھ بھی نہیں۔ میں اندھا ہو جاتا ہوں۔" سنیاسی ایک عجیب سے عالم میں بول رہا تھا۔ "دلی سے آنے والے راج دوت کا دل ایک بند کوٹھری ہے۔ میں اسے کھولنے کی شکتی نہیں رکھتا شاید مائی بھان متی کھول سکے اب مائی کا گیان ہی ہماری مایا ہے۔ شاید ایسا ہو جائے......... مگر نہیں!! ایسا نہیں ہو سکتا۔ بس تو یہاں سے چلا جا۔" سنیاسی آنند پال پر وحشت سی طاری تھی۔

رام دیو نے گھبرا کر آنند پال کی طرف دیکھا۔ وہ چٹائی پر اپنی انگلی سے آڑے ترچھے نشان بنا رہا تھا۔

"مائی بھان متی۔" رام دیو نے اس نام کو دل ہی دل میں دہرایا اور دروازہ کھول کر تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

آشرم پہنچ کر رام دیو نے اپنا ہاتھ علی عامر آفریدی کے تلوؤں سے مس کیا اور اس کا مفلوج ہاتھ پہلے کی طرح حرکت کرنے لگا۔ رام دیو بہت خوش تھا مگر ساتھ ہی ساتھ شاہی سفیر اور سنیاسی آنند پال کو گالیاں بھی دے رہا تھا۔ "میری یہ شکست عارضی ہے۔ میں عنقریب تم دونوں سے بھیانک انتقام لوں گا۔"

پھر اس کے بعد رام دیو نے صبح سے ذرا پہلے آفریدی کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا۔

☆..........................☆..........................☆

دوسرے دن راجہ رتن سنگھ نے رام دیو سے پوچھا۔

"مہاراج! کیا آپ نے دلی کے راج دوت پر قابو پا لیا؟" راجہ رتن سنگھ بڑے حسرت آمیز لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ "سلطان کا وہ گپت سندیش (خفیہ پیغام) کیا ہے؟ ہمارے وچار میں تو آپ نے اب تک راج دوت کا دھرم بھی بدل ڈالا ہوگا۔"

"نہیں! راجپوت سمراٹ! میں ایسا نہیں کر سکا۔" رام دیو کے لہجے سے ندامت کا اظہار ہو رہا تھا۔
"راج دوت ایک بڑا جادوگر ہے جس پر قابو پانا اتنا سہل نہیں ہے۔"
"پھر؟" راجہ رتن سنگھ سر سے پاؤں تک ایک سوال بن کر رہ گیا تھا۔
"راج دوت یا اس کے سلطان سے ہمیں اتنا خطرہ نہیں جتنا گھر کے بھیدیوں سے ہے۔" رام دیو کی عیاریوں کا کاروبار شروع ہو گیا تھا۔
"مہاراج! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" رتن سنگھ اس انکشاف پر وحشت زدہ سا نظر آنے لگا تھا۔
"یہ گھر کے بھیدی آپ کی لنکا کو ڈھا دینا چاہتے ہیں۔"
"وہ کون پاپی ہیں، مہاراج!" شدت غضب میں راجہ رتن سنگھ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"میں نے گرہن کی اس رات کو بیکار نہیں گنوایا ہے۔ سمراٹ! میں نے آپ کیلئے، چتوڑ کیلئے، مہان راجپوتوں کیلئے اپنے چہرے کا بلیدان دیا ہے۔" یہ کہہ کر رام دیو نے اپنے چہرے پر لپٹی ہوئی سیاہ چادر ہٹا دی۔ راجہ رتن سنگھ اور مہامنتری، رام دیو کا جھلسا ہوا چہرہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔
"یہ کیا ہوا مہاراج؟" رتن سنگھ اور وکرم سنگھ بیک وقت بولے۔
"آپ کی آن پر میں نے اپنے پرانوں کی بلی (قربانی) چڑھا دی تھی۔ بھور ہوتے ہی آپ کو آشرم میں میرا مردہ جسم نظر آتا۔ وہ تو دیوتاؤں کی کرپا تھی کہ کیول (صرف) میرے مکھ پر ہی یہ آپتی (آفت) ٹوٹ پڑی۔ ورنہ پورا شریر جل کر راکھ ہو چکا ہوتا۔ میں راج دوت کے دل پر اپنا منتر آزما رہا تھا کہ آنکھوں کے سامنے اچانک "مکبھ شیام" کا مندر ابھر آیا اور پھر مندر کے ایک کمرے میں آنند پال کا چہرہ دکھائی دینے لگا۔ یہ بڑی انوکھی بات تھی۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں نے راج دوت کو چھوڑ دیا اور اس دشٹ (گناہ گار) کے بارے میں سوچنے لگا جو سمراٹ کے سارے پریوار کو نشٹ بھرشٹ (تباہ و برباد) کر دینا چاہتا ہے۔ میں پلٹ پڑا اور آدھی رات کو آنند پال کے پاس پہنچا۔ اس نے اپنی شکتی کے بل پر میرا چہرہ جلا دیا۔ پھر ایک بڑی لڑائی کے بعد میں نے اسے اچیت (بےہوش) کر دیا۔ بے سدھ ہو کر وہ چیخنے لگا۔ "سلطان علاءالدین خلجی چتوڑ کی بنیادیں اکھاڑ پھینکے گا۔ رانی پدمنی کا بڑا اپمان ہو گا اور راجہ رتن سنگھ کو بندی (قیدی) بنا لیا جائے گا۔" اتنا کہہ کر رام دیو خاموش ہو گیا اور راجہ رتن سنگھ کے چہرے پر اپنے جھوٹ کا ردعمل تلاش کرنے لگا۔
"بہت ہو چکا۔" راجہ رتن سنگھ جذبات سے مغلوب ہو کر چیخنے لگا۔ "ہم سے بڑی بھول ہو گئی کہ اس پاپی کے پران نہیں چھینے۔ پتاجی ٹھیک ہی کہتے تھے کہ شترو کو گھات لگانے کا دوسرا اوسر (موقع) نہیں دینا چاہئے۔ پھر بھی وہ بھاگ کر کہاں جائے گا۔ ہمارے ہاتھ سب سے لمبے ہیں اور ہماری تلوار کی چمک سے بجلی بھی ڈرتی ہے۔ ہم آنند پال کو ایسی سزا دیں گے کہ اس کے باپ کی آتما بھی کانپ اٹھے گی۔" یہ کہہ کر رتن سنگھ، مہامنتری سے مخاطب ہوا۔ "وکرم سنگھ! آنند پال کو "مکبھ شیام" کے مندر سے پکڑ کر مہاراج کے آشرم میں لے آؤ۔ آج رات ہم اس کی موت کا جشن منائیں گے۔"

☆..................☆..................☆

راجہ رتن سنگھ کا حکم سنتے ہی مہامنتری اس مخصوص کمرے سے باہر نکلا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وکرم سنگھ کا مکان راج محل کے درمیانی حصے میں واقع تھا۔ مختصر سا فاصلہ طے کرتے ہوئے بھی وکرم کے ذہن میں ایک حشر سا برپا تھا اور سینے میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ وہ ذاتی طور پر سنیاسی آنند پال کا بہت احترام کرتا تھا اور آج وہی محترم شخصیت راجہ رتن سنگھ کے قہر و غضب کا نشانہ بن کر دنیا سے رخصت ہو جانے

والی تھی۔
وکرم سنگھ کسی ملازمہ یا خادمہ سے کچھ کہے بغیر سیدھا اپنے کمرے میں داخل ہوا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ وکرم سنگھ کی آمد نے آنند بھون میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ آنند بھون وکرم سنگھ کے مکان کا نام تھا جس میں واقعتاً دنیا کی ہر لذت و آسائش موجود تھی۔ وکرم سنگھ ایک خاندانی راجپوت تھا۔ اس کے بزرگ صدیوں سے حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز چلے آ رہے تھے۔ رانی پدمنی اس کے حقیقی بڑے بھائی کی بیٹی تھی۔ رانی چتوڑ کا چچا ہونے کے باعث اس کے اثر و رسوخ میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک ہوشمند اور مدبر وزیراعظم تھا۔ اس نے بیشتر مواقع پر اپنی فطری ذہانت سے کئی بگڑے ہوئے کام سنوارے تھے لیکن جب سے سلطان علاءالدین خلجی کا سفیر چتوڑ آیا تھا اسی دن سے مسائل الجھتے جا رہے تھے۔ اور آج وکرم سنگھ کے لئے ایک اذیت ناک مرحلہ آ پہنچا تھا۔
"کیا میں حاضر ہو سکتی ہوں؟" کمرے کے دروازے پر ایک شیریں آواز ابھری۔ آنے والی لڑکی وکرم سنگھ کی لائق بیٹی نرملا کماری تھی۔ "میں گزشتہ پندرہ بیس دن سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ دن رات کسی اذیت ناک خیال میں کھوئے رہتے ہیں۔ پہلے مجھے شک تھا کہ کوئی تکلیف دہ مرحلہ درپیش ہے جسے آپ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں مگر آج بےوقت کی آمد اور چپ چاپ کمرے میں داخل ہو کر محصور ہو جانا اس بات کی علامت ہے کہ وہ مسئلہ اپنی الجھنوں کی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔" یہ کہہ کر نرملا کماری خاموش ہو گئی اور افسردہ نگاہوں سے باپ کے چہرے کو دیکھنے لگی۔
"آپ کی بے پناہ محبت نے مجھے ایک پر اعتماد زندگی بخشی۔" اب نرملا رونے لگی تھی اور اس کی آواز سے لرزش صاف نمایاں تھی۔ "ماں کے انتقال کے بعد آپ نے ان کے حصے کی محبت بھی میرے نام کر دی۔ ہر قدم پر اپنے ساتھ ساتھ رکھا اور ہر سیاسی مسئلے پر گفتگو کر کے مجھے حوصلہ دیا کہ میں خارزارِ زندگی کے مزاج اور موسم سے آشنا ہو جاؤں۔ پھر آج آپ سوچوں کا یہ عذاب تنہا کیوں برداشت کر رہے ہیں۔ کیا اب میں اس قابل نہیں رہی یا وہ مسئلہ میرے ذہن کی سطح سے بلند تر ہے؟" نرملا کماری نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں اپنے باپ سے سوال کیا۔
"نہیں میری بیٹی! ایسا نہیں ہے۔" وکرم سنگھ، نرملا کماری کی دل پگھلا دینے والی گفتگو سن کر سخت اضطراب کا شکار نظر آنے لگا۔ "میں نے تمہیں چتوڑ کی سیاست سے ہر قدم پر باخبر رکھا ہے مگر انسان کی زندگی میں کچھ ایسے لمحات آ جاتے ہیں کہ وہ بعض امور کو اپنے آپ سے بھی چھپانے لگتا ہے۔" مہامنتری کی آنکھوں میں الجھن اور پریشانی کا گہرا رنگ نمایاں تھا۔ "میں نے کئی بار چاہا کہ تمہیں انقلاب کی ان گرم ہواؤں کے بارے میں بھی تفصیل سے سب کچھ بتا دوں جو عنقریب چتوڑ کا رخ کرنے والی ہیں۔ مگر میں یہ سوچ کر خاموش رہا کہ کہیں ان ہواؤں کا ذکر تمہاری آنکھوں سے نیندیں نہ چھین لے اور جوانی کی وہ تمنائیں جن کے سینے پر ایک زخم پہلے ہی لگ چکا ہے کہیں مزید زخموں سے لالہ رنگ نہ ہو جائیں۔" وکرم سنگھ نے باتوں ہی باتوں میں اپنی بیوی سندھیا کماری کی موت کا ذکر کر دیا تھا۔ اس وقت نرملا کماری کی عمر پانچ چھ سال تھی۔
سندھیا کے انتقال کے بعد وکرم سنگھ نے دوسری شادی نہیں کی تھی اور اپنی اکلوتی لڑکی نرملا کو مسلسل بیس سال تک ایک بیٹے کی طرح تربیت دی تھی۔ چتوڑ کے ودوانوں (عالموں) سے بہترین تعلیم دلائی تھی اور خود اپنی نگرانی میں تمام فنون جنگ سکھائے تھے۔ اس کے علاوہ وکرم سنگھ فرصت کے اوقات میں نرملا کماری سے سیاست کے موضوع پر بھی تفصیلی گفتگو کرتا تھا۔ بیٹی کو زمانے کے نشیب و فراز سمجھاتا تھا اور ایک رحم دلانہ زندگی گزارنے کی تلقین بھی کرتا تھا۔ اسے ذاتی طور پر راجپوتوں کے نظامِ تشدد سے نفرت تھی مگر وقت نے

اسے اقتدار کے ہاتھوں کا کھلونا بنا دیا تھا۔ ان مجبوریوں کے باوجود وکرم سنگھ' نرملا کماری کو متوازن اور منصفانہ زندگی کے آداب سکھاتا رہتا تھا۔ مگر جب سے علی عامر آفریدی' سلطان علاء الدین خلجی کا پیغام لے کر چتوڑ آیا تھا' اس دن سے وکرم سنگھ نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اگر کبھی نرملا نے باپ سے اس سیاسی **صورت حال** کے بارے میں کچھ پوچھا بھی تو اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کوئی خاص بات نہیں۔ دلی اور چتوڑ کے سیاسی تعلقات کا مسئلہ ہے جو آسانی کے ساتھ حل ہو جائے گا۔ مگر رام دیو کی مداخلت نے معاملات کو اس قدر بگاڑ کر رکھ دیا کہ ہر گزرنے والا لمحہ نئی صورت اختیار کرنے لگا اور ہر صورت اتنی خوفناک ہوتی چلی گئی کہ نرملا سے اس کا ذکر کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ وکرم سنگھ خاموشی سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا لیکن آج جب سنیاسی آنند پال کی محترم شخصیت سازشوں کا ہدف بن گئی تو وکرم سنگھ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور اس کے چہرے پر گہرے رنج والم کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ یہی وہ سنگین ساعتیں تھیں جنہیں نرملا کماری نے اپنی جاگتی آنکھوں سے وکرم سنگھ کے چہرے پر پڑھ لیا تھا اور بیٹی اپنے باپ کو ایک نامعلوم اذیت میں مبتلا دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھی تھی۔

"کیا میں آپ کی بیٹی نہیں جو مجھ سے اس طرح رازداری برتی جا رہی ہے؟"

وکرم سنگھ' نرملا کے لہجے کی شدت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا اور پھر اس نے اپنی بیٹی کو علی عامر آفریدی کی آمد سے لے کر راجہ رتن سنگھ کے موجودہ فیصلے تک' تمام واقعات سنا ڈالے۔

"آپ علاء الدین خلجی کے سفیر کو رانی پدمنی کے سامنے پیش کیوں نہیں کر دیتے؟"

"بیٹی! تم اس نازک معاملے کو نہیں سمجھتیں۔" وکرم سنگھ نے نرملا کماری کو ٹالنے کی کوشش کی۔

"یہ تو بڑی نادانی ہے کہ ہم مفروضات میں الجھ کر وقت برباد کرتے رہیں۔" نرملا کماری اپنی کم عمری کے باوجود نہایت مدبرانہ انداز میں بول رہی تھی۔ "اگر کوئی شخص ہماری موت کی خبر لاتا ہے تو ہمیں پورے حوصلے کے ساتھ اس خبر کو سننا چاہئے۔ اس طرح فائدہ یہ ہوگا کہ ہم تمام تر قوتوں اور تدبیروں کے ساتھ اپنی زندگی کا تحفظ کر سکیں گے۔ اگر پھر بھی موت ہم پر غالب آ جائے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہوگی کہ دنیا میں روزانہ ہزاروں اور لاکھوں انسان مرتے رہتے ہیں۔" نرملا کماری نے ایک مضبوط دلیل کے ساتھ اپنے باپ کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

"آفریدی کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے مگر میں اس شخص کی جان کس طرح بچاؤں جس کی زندگی کی سانسوں کا شمار ختم ہونے والا ہے۔" وکرم سنگھ نے گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑ دیا تھا۔ "بیٹی! اگر آنند پال کو قتل کر دیا گیا تو وہ لوگ بھی جیتے جی مر جائیں گے جو انسانی کردار کی اصلاح کیلئے مخالف ہواؤں سے جنگ کر رہے ہیں۔ یہ گنتی کے دو چار چراغ ہیں جو آندھیوں کے رخ پر ہوتے ہوئے بھی اپنی تھرتھراتی لو کو اس امید پر بچانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ شاید ہواؤں کا طوفان تھم جائے اور اندھیروں کے مسافر روشنی کی اس لکیر کے سہارے اپنا راستہ تلاش کر لیں۔ سنیاسی آنند پال چراغ نہیں' روشنی کی ایک قندیل ہے۔ اگر قندیل ہی بجھا دی گئی تو یہ ٹمٹماتے دیئے ظلمتوں سے کس طرح نبرد آزما ہوں گے۔"

"آپ اس قندیل کو بچانے کی بھرپور کوشش کیجئے۔" نرملا نے بے جھجک ہو کر باپ سے کہا۔ "اگر کوئی ہلاکت خیز جھونکا قندیل کی طرف بڑھے تو آپ اپنی پشت اس کی جانب کر دیجئے۔ یہ آپ کا فرض ہے۔"

"سنیاسی کے گیان نے اسے قتل کی منزل تک پہنچا دیا ہے۔" وکرم سنگھ شدید بے چینی کے عالم میں بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر پشت پر اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "جھوٹوں کی بستی میں سچے گیان کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

"راجپوت سمراٹ تو ایک ہوشمند فرمانروا ہیں۔ انہیں سنیاسی کی سچی باتوں کو برداشت کرنا چاہئے۔"

"سنیاسی آنند پال کہتے ہیں کہ چتوڑ تباہ و برباد ہو جائے گا۔" وکرم سنگھ نے اس طرح جواب دیا جیسے وہ سرگوشیاں کر رہا ہو۔ "سنیاسی نے یہ بھی کہا ہے کہ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کی بڑی رسوائی ہوگی اب تم ہی بتاؤ کہ یہ باتیں سننے کا حوصلہ کس میں ہے؟"

"میرے نزدیک تو سنیاسی قابل احترام ہیں کہ وہ وقت سے پہلے سیلاب کی خبر دے رہے ہیں۔" نرملا کماری کی باتوں میں وہی سادگی اور وہی معصومیت تھی۔

"لوگ سیلاب کی خبر سننے کے لئے تیار نہیں۔ وہ حکمراں ہوں یا عوام۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ ندیاں بہتی رہیں' گنگناتی رہیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ پانی کے ترنم ریز دھاروں کو موج بلا کی شکل میں دیکھ سکیں۔" مہامنتری بار بار اپنے ہاتھوں کو رگڑ رہا تھا۔ "کوئی بھی سنیاسی کا احسان ماننے کیلئے تیار نہیں۔ سب کے سب اسے احمق کہتے ہیں' گناہ گار سمجھتے ہیں۔ آنند پال جیسے پاگل کو اس ہوشیار دنیا سے جانا ہی ہوگا۔"

وکرم سنگھ کو مضطرب دیکھ کر نرملا کماری گھبرا گئی۔ "اگر آپ راجہ رتن سنگھ سے سنیاسی کیلئے رحم طلب نہیں کر سکتے تو میں رانی پدمنی سے بات کر سکتی ہوں۔ آخر وہ میری بہن بھی ہیں۔"

"نہیں نرملا! ہرگز نہیں۔" وکرم سنگھ نے تیز آواز میں کہا۔ "کوچۂ اقتدار میں داخل ہونے والے کا کسی سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ پدمنی کو اپنے ناز و ادا اور غرورِ شاہانہ کی نمائش ہی سے فرصت نہیں۔ وہ سنیاسی کے اسرار کو کیا سمجھے گی؟ وہ تو خود چاہتی ہے کہ صرف اس کے اشاروں پر ناچنے والے زندہ رہیں۔ آنند پال اس کی جنبشِ چشم پر رقص نہیں کر سکتا اس لئے اسے قتل ہونا ہی پڑے گا۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ کمرے سے باہر آیا اور پھر طویل راہداریاں طے کرتا ہوا اپنے مکان سے نکل کر راج دربار کے اس حصے میں چلا گیا جو مہامنتری کیلئے مخصوص تھا۔ کچھ دیر بعد وکرم سنگھ نے اپنے دستۂ خاص کے چار سپاہیوں کو طلب کیا اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ " کمبھ شیام " کے مندر جا کر سنیاسی آنند پال کو احترام کے ساتھ لے آؤ۔ ان کے پیروں میں بیڑیاں نہ ڈالنا کہ وہ کوئی مفرور مجرم نہیں۔ اور انہیں ایذا بھی نہ پہنچانا کہ وہ کوئی قاتل یا غدار نہیں۔"

☆..................☆..................☆

جب ریاست چتوڑ کے سپاہیوں نے کمبھ شیام کے مندر پہنچ کر سنیاسی آنند پال کے دروازے پر دستک دی تو فوری طور پر کوئی جواب نہیں آیا۔ سپاہیوں نے چاہا کہ وہ سنیاسی کے کمرے کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو جائیں مگر پھر انہیں مہامنتری کی ہدایات یاد آ گئیں۔ دوبارہ دستک دی گئی اندر سکوت طاری رہا۔ تیسری دستک پر سنیاسی کی جھنجلائی ہوئی آواز ابھری۔

"تم لوگ کون ہو جو مجھے مرنے بھی نہیں دیتے۔ واپس جاؤ کہ میں کسی سے نہیں مل سکتا۔"

"ہم راجپوت سمراٹ رتن سنگھ کے سپاہی ہیں اور آپ کو راج محل لے جانے کیلئے آئے ہیں۔" ایک سپاہی نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

"میں کسی سمراٹ کو نہیں جانتا۔" آنند پال کی آواز میں جھنجلاہٹ کے ساتھ غصہ بھی شامل ہو گیا تھا۔

"رتن سنگھ سے کہہ دو کہ میں اس کا ملازم نہیں ہوں۔"

سپاہی کچھ دیر کے لئے ذہنی کشمکش کا شکار ہو گئے۔ ایک طرف انہیں اپنی نازک ترین ذمہ داری کا احساس تھا اور دوسری طرف مہامنتری وکرم سنگھ کے ہدایت نامے کا۔ بالآخر دوسرے سپاہی کو صاف صاف

کہہ دینا پڑا۔ "سنیاسی! خاموشی کے ساتھ باہر نکل آؤ۔ راجہ رتن سنگھ کی طرف سے تمہاری گرفتاری کا حکم دیا گیا ہے۔ تمہیں اسی وقت دربار میں حاضر ہونا ہے۔ اگر تم نے پس وپیش سے کام لیا تو ہم دروازہ توڑ دیں گے۔"

"ٹھہرو! تمہیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" یکایک آنندپال کی آواز پُرسکون محسوس ہونے لگی تھی "تم نے پہلے کیوں نہیں کہا کہ میری موت کا پیغام لے کر آئے ہو۔ چند لمحے انتظار کرو۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر سنیاسی آنندپال نے ایک گوشے میں پڑا ہوا کپڑے کا وہ جوڑا اٹھایا' جسے اس نے اپنے ہاتھ سے کل ہی دھویا تھا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر اطمینان سے باہر آیا اور سپاہیوں کو مخاطب کر کے بولا۔

"وہ سامنے تال ہے۔ میں ابھی اشنان کر کے واپس آتا ہوں۔"

سپاہی تالاب کے کنارے پہنچ کر ٹھہر گئے۔ سنیاسی اطمینان سے نہا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ پانی سے باہر نکلا' کپڑے تبدیل کئے اور مغرب کی جانب جھکتے ہوئے سورج کو دیکھ کر کہنے لگا۔

"تو بھی مجبور ہے اور میں بھی بے دست وپا ہوں۔ تو کتنا ہی چمکے مگر اس نگری کے باسی اندھے ہیں۔ انہیں کچھ نظر نہیں آئے گا کہ ان کا مقدر ہی اندھیرا ہے۔ میں کتنا ہی چیخوں لیکن اس بستی کے رہنے والے نپٹ بہرے ہیں۔ انہیں کچھ سنائی نہیں دے گا کہ ان کے کانوں پر سدا سے جھوٹ کا پہرا ہے۔ میں اپنے سفر پر جا رہا ہوں تو بھی اپنی منزل کی طرف چلا جا۔" سپاہیوں کو ایسا لگا جیسے سنیاسی سورج سے باتیں کر رہا ہو۔ مگر ایک سچے انسان کے اشاروں کا رمز کون سمجھتا؟ دنیا دار تو اسے پاگل ہی سمجھ رہے تھے۔

پھر وہ پاگل شخص راجہ رتن سنگھ کے سپاہیوں کو دیکھ کر ہنسا اور چپ چاپ اس رتھ پر بیٹھ گیا جو مندر کے دروازے پر کھڑا تھا۔

سپاہیوں نے سنیاسی کو رام دیو کے آشرم میں پہنچا کر مہامنتری کو اطلاع دی۔ وکرم سنگھ نے بڑے حوصلے کے ساتھ یہ جاں گداز خبر سنی اور سپاہیوں کو ہاتھ کے اشارے سے چلے جانے کے لئے کہا۔ چتوڑ کے جاں نثار سپاہی یہ منظر نہ دیکھ سکے کہ چٹانوں جیسے اعصاب رکھنے والا وکرم سنگھ چپ چاپ رو رہا ہے۔

☆..................☆..................☆

پھر جب وکرم سنگھ اپنے کمرے میں آیا تو نرملا کماری اس کی منتظر تھی۔ نرملا باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بے قرار ہو گئی۔ "پتا جی آپ رو تو سکتے ہیں مگر............"

"فریاد نہیں کر سکتا۔" وکرم سنگھ نے نرملا کی ادھوری بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں! بیٹی میں سنیاسی کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی پر چیخنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر چیخئے۔" نرملا نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ "اتنی زور سے چیخئے کہ آپ کی آواز راجپوت سمراٹ رتن سنگھ تک پہنچ جائے۔ یہی آپ کے چیخنے کا وقت ہے۔ اگر اس وقت مہان پرش (مردِ عظیم) کو کچھ ہو گیا تو پھر سارے چتوڑ کی چیخیں بھی لاحاصل ہوں گی۔ راجہ رتن سنگھ کو اپنی خدمات یاد دلایئے اور ان ہی خدمات کے صلے میں سنیاسی آنندپال کی زندگی مانگ لیجئے۔ یہ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہو گا۔ تاج وتخت' عہدہ ومنصب بہت عارضی چیزیں ہیں۔ سنیاسی کا گیان ان سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اگر وہ گیان قتل کر دیا گیا تو جہالت فاتح قرار پائے گی اور اندھیرے روشنی کو نگل لیں گے۔" نرملا کی آواز میں دل کا گداز شامل تھا۔

"نہیں! میں کچھ نہیں کر سکتا۔" وکرم سنگھ کی آواز میں لرزش تھی۔

"اقتدار کی ہوس نے آپ کی زبان کو زنجیر پہنا دی ہے۔ اس لئے آپ راجہ کے سامنے آنندپال کی

سچائیوں کا اعتراف نہیں کر سکتے۔" نرملا کا لہجہ مدہم تھا مگر الفاظ نشتر بن گئے تھے۔

"نرملا!" اچانک وکرم سنگھ چیخ اٹھا۔ "میں نے تمہیں بے ادبی کی تعلیم نہیں دی تھی۔ پھر تمہاری باتوں میں گستاخی کا یہ رنگ کس طرح شامل ہو گیا۔ تم فوراً میرے کمرے سے نکل جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

حساس بیٹی باپ کی یہ کیفیت برداشت نہ کر سکی اور دوڑ کر وکرم سنگھ کے قدموں سے لپٹ گئی۔

مہامنتری نے نرملا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بیٹی! تجھے خبر نہیں کہ تیرا باپ کیسی آفتوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ شاید میں سنیاسی کیلئے اپنی جان بھی دے دیتا مگر میں جانتا ہوں کہ اس کے بعد بھی آنے والا طوفان نہیں رکے گا۔ جس طوفان کو روکنے کیلئے میں اپنی زندگی کی بازی کھیلوں گا' اسی طوفان کے شکم سے ایک اور طوفان پیدا ہو گا۔ اس طوفان کی فطرت بڑی ہلاکت خیز ہو گی۔ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا کسی کو میری مجبوریوں کا علم نہیں۔ میں تجھے بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ طوفان کیسا ہو گا۔ بس! اب چلی جا اور مجھے تنہا چھوڑ دے۔ آنے والی سیاہ اور خونیں رات میں کوئی کسی کا دوست نہیں رہے گا۔"

نرملا کماری روتی ہوئی اٹھی اور باپ کو انجانی اذیت میں مبتلا چھوڑ کر چلی گئی۔

نرملا کے جاتے ہی وکرم سنگھ نے دروازہ بند کر لیا۔ پھر ایک خفیہ تجوری کھول کر شراب کی بوتل نکالی اور اس نشہ آور سیال سے اپنا حلق تر کرنے لگا۔ وکرم سنگھ عادی شرابی نہیں تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں دوسری بار دخترِ انگور کو منہ لگایا تھا۔ ایک بار اس وقت جب اس کی محبوب بیوی سندھیا کا انتقال ہوا تھا۔ شریکِ حیات کی محبت آمیز یادوں سے پیچھا چھڑانے کیلئے اور زخمِ فراق کی سوزش کو کم کرنے کیلئے اس نے مسلسل ایک ہفتے تک شراب نوشی کی تھی۔ اس کے بعد جب وکرم سنگھ کا دل سنبھل گیا تو اس نے ساغر وصراحی کو توڑ دیا اور معمول کے مطابق زندگی بسر کرنے لگا۔ اعلیٰ ترین شراب کا ایک بڑا ذخیرہ اس کی خفیہ تجوری میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ کبھی کبھی وکرم سنگھ کسی نشست میں اپنے مخصوص دوستوں کو شراب پیش کرتا تھا مگر خود اس کے ہونٹ آلودہ نہیں ہوتے تھے۔ وہ کیف وسرور اور رقص وشباب کی محفلوں سے بہت دور رہتا تھا مگر آج وکرم سنگھ نے دوسری مرتبہ بادۂ گلفام کا سہارا لیا تھا۔ آج بھی اس کی محبوب ترین ہستی اس سے بچھڑ جانے والی تھی۔ وکرم سنگھ' سنیاسی آنندپال کا خاموش پجاری تھا۔ راجہ رتن سنگھ کا معتوب ہونے کی وجہ سے وکرم سنگھ' سنیاسی سے بظاہر کوئی رسم وراہ نہیں رکھتا تھا مگر اس کے جذباتِ عقیدت ہمیشہ سنیاسی کی بارگاہ میں خم رہتے تھے۔ وہ ذاتی طور پر اس کا قائل تھا کہ اگر سنیاسی کے گیان کو اہل چتوڑ اپنی زندگی میں شامل کر لیتے تو خون آشام تہذیب کا خاتمہ ہو جاتا اور قتل گاہوں میں سکون اور روشنی کے پھول کھل اٹھتے۔ مگر اس نگری کے باسی رام دیو کے سفلی مظاہروں کے دیوانے تھے اور آنندپال جیسا اہل دل راجپوتوں کی بستی میں اچھوت بن کر رہ گیا تھا۔ وکرم سنگھ پھر بھی خوش تھا کہ کم سے کم آنندپال زندہ تو ہے۔ انسانیت کی کوئی علامت کہیں نظر تو آتی ہے لیکن آج سچائی کی وہی علامت اور کردار کی وہی نشانی بجھ جانے والی تھی۔ اسی سنگین وقت کا احساس کر کے وکرم سنگھ غم زدہ ہو جاتا تھا اور پھر وہ غم اس قدر بڑھا کہ مہامنتری گھبرا کر پینے لگا۔

وکرم سنگھ چاہتا تھا کہ آج کی رات وہ غرق مئے آب ہو کر اپنے حواس کھو بیٹھے اور رام دیو کے آشرم میں جو حادثہ پیش آئے وکرم سنگھ اس کا تماشائی نہ ہو۔ مگر مہامنتری یہاں بھی بے اختیار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ راجہ رتن سنگھ اس کی موجودگی ہی میں گناہ کا یہ کھیل کھیلیں گے۔ اس لئے وکرم سنگھ کا ہوش میں رہنا بھی ضروری تھا۔ اگر وہ ہوش کھو دیتا تو رام دیو اور دیگر مخالفین اس کی بدمستی کے عجیب عجیب مفہوم تراشتے اور پھر وکرم سنگھ پر ایک نئی قیامت نازل ہو جاتی۔

"بیٹی! میں تجھے کیسے سمجھاؤں۔" وکرم سنگھ بند کمرے میں آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ "اگر میں سنیاسی

کی زندگی بحال رکھنے کے لئے راجہ رتن سنگھ سے سفارش کرتا ہوں تو چتوڑ کا حکمراں اور رانی پدمنی دونوں میرے دشمن ہوجائیں گے۔ رام دیو پہلے ہی میرے تعاقب میں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی مقام پر میرے قدم لڑکھڑائیں اور میں اس کی نفرتوں کا شکار ہوجاؤں۔ اگر ان تینوں کی نفرتیں میری جان لینے کے بعد بھی ختم ہوجائیں تو میں آنند پال پر قربان ہونے کے لئے تیار ہوں مگر مجھے خبر ہے کہ ان کی نفرتیں فنا نہیں ہوں گی۔ میرے مرتے ہی وہ تجھے اپنی نفرتوں کا نشانہ بنالیں گے۔ تو نہیں نہیں جانتی کہ وہ کون لوگ ہیں؟ وہ سنیاسی کو کسی بھی حالت میں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ سنیاسی کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ بد صورتوں کے شہر میں آئینہ ہے۔ تو نے غور سے نہیں دیکھا کہ ہر ہاتھ میں ایک پتھر ہے۔ میں کس کس کے ہاتھ کو روکوں؟ میری مجبوریوں کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔" وکرم سنگھ کی آنکھیں اشکبار تھیں اور وہ شدید عالمِ اضطراب میں اپنے سر کے بالوں کو نوچ رہا تھا۔

پھر وہ بستر پر بڑی بے ترتیب حالت میں گر گیا۔ شراب آہستہ آہستہ اثر کر رہی تھی اور رات کے اندھیرے گہرے ہوتے جارہے تھے۔ یہاں تک کہ وکرم سنگھ کی آنکھ لگ گئی۔ خوابوں کے جزیرے میں داخل ہوتے ہی وکرم سنگھ نے دیکھا کہ وہ زمین کے ایک خشک حصے پر تنہا کھڑا ہے اور اس کے چاروں طرف لامحدود پانی کا پُرشور سمندر ہے۔ مرتے ہوئے سانپوں کی طرح پیچ و تاب کھاتی ہوئی موجیں اس کی طرف بڑھتی ہیں مگر اچانک واپس لوٹ جاتی ہیں۔ پھر ناگہاں وہ سارا پانی انسان کے تازہ خون کی طرح سرخ ہوگیا اور موجوں نے سر سے بلند ہوکر وکرم سنگھ کو اپنی بے رحم آغوش میں چھپالیا۔ خواب اس قدر ڈراؤنا تھا کہ خوف سے وکرم سنگھ کی چیخ نکل گئی اور وہ اپنی ہی چیخ کی آواز سے جاگ اٹھا۔

وکرم سنگھ نے دھندلی آنکھوں سے وحشت زدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ وہ خونیں سمندر کی گرفت سے بہت دور اپنے کمرے میں موجود بھی تھا اور محفوظ بھی۔ مگر دروازے پر مسلسل دستک سنائی دے رہی تھی۔ شراب کے اثر سے اپنا جسم تھکا تھکا محسوس ہو رہا تھا۔ وکرم سنگھ نے خود کو سنبھالا اور دروازہ کھول دیا۔

باہر نرملا کماری سر جھکائے کھڑی تھی۔ "آپ کو راجہ رتن سنگھ یاد کر رہے ہیں۔" نرملا نے آہستہ سے کہا۔ "راجپوت سمراٹ کا حکم ہے کہ آپ مہاراج رام دیو کے آشرم میں پہنچ جائیں۔"

"تم جاؤ!" وکرم سنگھ نے بیٹی سے کہا اور اندر واپس چلا گیا۔ مہامنتری کی ظاہری حالت بگڑی ہوئی تھی اس نے لباس تبدیل کیا۔ کچھ دیر تک منہ دھوتا رہا اس سے چہرے پر تازگی تو نمایاں ہوئی مگر آنکھوں کے خمار کو چھپانا ممکن نہیں تھا۔ غرض اس نیم مستی کے عالم میں وکرم سنگھ اپنے مکان سے نکلا اور راج محل کی مختلف راہ داریوں سے گزرتا ہوا اس سنسان علاقے میں پہنچ گیا جہاں رام دیو کا آشرم طلسم و ساحری سے آباد تھا۔

آشرم میں داخل ہوتے ہی وکرم سنگھ نے تین کرسیوں پر راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی اور رام دیو کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ چوتھی کرسی خالی تھی۔ رام دیو بات بات پر قہقہے لگا رہا تھا اور راجہ رتن سنگھ بھی اس کی بے ہنگم ہنسی میں برابر کا شریک تھا۔ البتہ رانی پدمنی کے ہونٹوں پر ہلکی سی غرور آمیز مسکراہٹ تھی جس سے اس کی بے پناہ خوشی کا اظہار ہوتا تھا۔ وکرم سنگھ چتوڑ کے حکمرانوں کے سامنے جاکر ٹھہرا اور نصف قد تک خم ہوکر راج دربار کی رسم ادا کی اور پھر اس نے نفرت و کراہیت کے ساتھ مہاراج رام دیو کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

اس وقت چتوڑ کے یہی آداب تھے کہ راجپوت رتن سنگھ اور رانی پدمنی کے سامنے خم ہوتے تھے مگر مہاراج رام دیو کے قدموں پر سر رکھ کر انہیں اپنی مکمل اطاعت کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔ پوری ریاست میں صرف رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ کو یہ رعایت حاصل تھی کہ وہ رام دیو کے پاؤں چھو کر ہی اپنی عقیدت کی نمائش

کر سکتے تھے۔ ورنہ سب کے سب اس شعبدہ باز کے سامنے سر بہ سجدہ رہتے تھے۔ وکرم سنگھ بھی اپنے سر کو رام دیو کے قدموں سے مس کر کے اٹھا اور آخری کرسی پر بیٹھ گیا۔

راجہ رتن سنگھ بہت غور سے وکرم کا جائزہ لے رہا تھا۔ انتہائی کوشش کے باوجود مہامنتری کے قدموں کی لغزشیں پوشیدہ نہ رہ سکی تھیں۔ "وکرم سنگھ!" اچانک راجہ رتن سنگھ کی آواز بلند ہوئی۔ "آج تو ایسا لگتا ہے کہ تم نے بھی توبہ توڑ دی ہے۔"

اپنے حکمراں کی بات سن کر وکرم سنگھ فوراً کھڑا ہوگیا۔ سرشاری کی کیفیت پر قابو پایا اور رک رک کر کہنے لگا۔ "آج کے دن میں شراب کیسے نہیں پیتا۔ آج تو میرے سمراٹ کی زندگی کا سب سے بڑا جشن ہے۔ نصرت و کامرانی کے ایسے عظیم الشان جشن میں بے خود نہ ہونا بھی تو گناہ ہے۔ یہی سوچ کر میں بھی آپ کی خوشی میں شریک ہوگیا۔" وکرم سنگھ کی زبان عالمِ جبر میں جھوٹ بول رہی تھی مگر اندر ہی اندر اس کے دل پر نفرت و ملامت کی سنگ باری ہو رہی تھی۔

"بیٹھ جاؤ وکرم سنگھ!" راجہ رتن سنگھ نے انتہائی مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ "ہم تمہاری وفاداریوں پر ناز کرتے ہیں۔ تم اپنے سمراٹ کے حقیقی مزاج شناس ہو۔ اگر آج کی رات تم لڑکھڑاتے ہوئے آشرم میں داخل نہیں ہوتے تو ہم سمجھتے کہ تمہیں ہمارے فیصلے سے کہیں نہ کہیں کوئی اختلاف ضرور ہے۔ مگر تم نے اپنی سعادت مندی اور فرمانبرداری کو اپنے عمل سے ثابت کر دیا۔"

اتنے میں رام دیو کے شیطان چیلے سنیاسی آنند پال کو لے کر آئے۔ وہ عجیب شان بے نیازی کے ساتھ قدم اٹھا رہا تھا جیسے اس کے سامنے چتوڑ کا سمراٹ نہیں کوئی غلام بیٹھا ہو۔

"آنند پال! تیرا باپ بھی غدار وطن تھا اور تو بھی۔" راجہ رتن سنگھ جوشِ غضب میں کھڑا ہوگیا۔ "آج ہمیں یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ ہمارے پوجیہ پتاجی سمراٹ سمر سنگھ نے تیرے بدکار باپ جوگی امر پال کو کیوں قتل کرا دیا تھا۔ کاش! ہم بھی تجھے پہلے ہی قتل کر چکے ہوتے تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتے۔"

"کیوں پچھتاتا ہے راجپوت سمراٹ!" سنیاسی آنند پال کے لہجے میں بلا کا ٹھہراؤ تھا۔ "میں گزرا ہوا وقت تو نہیں ہوں کہ واپس لوٹ کر نہ آسکوں۔ سامنے کھڑا ہوں۔ اپنی ایک ایک منوکامنا (دلی خواہش) پوری کر لے۔ مجھے تو خود بھی افسوس ہے کہ تیرے عہد میں اتنے دن زندہ کیوں رہا؟"

سنیاسی کی اس گرم گفتاری نے راجہ رتن سنگھ کے دل و دماغ جلا ڈالے۔ وہ کسی وحشی کی مانند چیخنے لگا۔

"سپاہیو! اس پاپی کی وہ زبان کاٹ ڈالو جو ہمارے تخت و تاج اور چتوڑ کی تباہی کے من گھڑت افسانے سناتی ہے، جو راجپوتوں کی آن رانی پدمنی کی ذلت و رسوائی کی بے سروپا کہانیاں بیان کرتی ہے۔ اسے عبرتناک سزا دو۔"

"سمراٹ! میری زبان تو کٹ جائے گی مگر تجھے وہ راز کون بتائے گا جو دلی سے آئے ہوئے راج دوت کے سینے میں چھپا ہوا ہے۔" آنند پال ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بول رہا تھا۔ "وہ راز جسے جاننے کی کوشش میں مہاراج رام دیو بھی ناکام ہوگئے۔"

"سنیاسی! کیا تو اس راز کو جانتا ہے؟" راجہ رتن سنگھ جو چند لمحے پہلے قہر و غضب کا مجسمہ نظر آرہا تھا، اچانک حیرت و استعجاب کے پیکر میں ڈھل گیا تھا۔

"اس دھرتی پر میرے سوا اس راز کو اور کون جان سکتا ہے۔" یہ کہتے کہتے سنیاسی کے چہرے پر اس کے علم کا جلال روشن ہوگیا تھا۔ "میں تجھے بتا سکتا ہوں کہ راج دوت، رانی پدمنی کیلئے کیا سندیش لے کر آیا ہے؟"

سنیاسی آنند پال کی گفتگو سن کر راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی پر سکتہ ساطاری ہو گیا تھا اور خود رام دیو کی یہ کیفیت تھی کہ وہ عالمِ وحشت میں بار بار سنیاسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو کس طرح سنبھالے ؟

"نہیں راجپوت سمراٹ! ہرگز نہیں۔" رام دیو کا لہجہ بہت تیز تھا۔ "اس فریب کار کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ جھوٹ بول کر اپنی موت کا وقت ٹالنا چاہتا ہے۔"

"مہاراج! آپ سب کچھ جانتے ہیں مگر اتنا نہیں جانتے کہ موت کا وقت ٹالا نہیں جا سکتا۔" سنیاسی کے لہجے میں شدید حقارت تھی۔ "مہاراج کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اگر میری زندگی پر راجپوت سمراٹ کو مکمل اختیار ہوتا تب بھی میں اس سے اپنی زندگی کی بھیک نہیں مانگتا۔ میں تو ایک ہی کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہوں اور وہ تم اندھوں کو نظر نہیں آتا۔" آنند پال ایک صاحبِ جلال سنیاسی تھا مگر آج کی رات وہ حالتِ جمال میں ظاہر ہوا تھا۔ آنند پال کے اسی ٹھہراؤ اور اطمینان کو رام دیو موت کے خوف سے تعبیر کر رہا تھا مگر سنیاسی نے جلد ہی راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی اور جادوگر رام دیو کی ساری غلط فہمیاں دور کر دیں۔ وہ چند لمحے خاموش رہ کر دوبارہ رام دیو سے مخاطب ہوا۔

"مہاراج! آپ کچھ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں مگر یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ سنیاسی کی زبان پر جھوٹ ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ اگر یہ ہونٹ منافقت کا ذائقہ ایک بار چکھ لیتے تو پھر آپ کا وجود راج محل کے بجائے کسی شمشان میں ہوتا یا پھر آپ چتوڑ کی گلیوں میں کشکول لئے ہوئے، دروازے دروازے ایک روٹی کا سوال کر رہے ہوتے۔ یہ ریشمی لباس، یہ قیمتی پتھروں کی مالائیں، یہ طاقتور غذائیں، یہ نرم بستر، یہ شراب یہ داسیاں میرے سچ کی دین ہیں۔ میرے سچ کا نشیمن جلا تو ریاکاروں اور منافقوں کے آشیانوں پر بہار آ گئی۔"

سنیاسی کے الفاظ کیا تھے، بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹیں تھیں۔ جس نے رام دیو کی جھوٹی شخصیت کے غلیظ پیرہن کو جلا ڈالا تھا۔

"سمراٹ! آپ اس نمک حرام کی باتیں سن رہے ہیں ؟" رام دیو نے سنیاسی کے سامنے زچ ہو کر راجہ رتن سنگھ کو پکارا۔

"میں کسی سمراٹ کا نمک نہیں کھاتا بلکہ پورا چتوڑ میرا نمک کھاتا ہے۔ میری دعائیں اس زمین کے رہنے والوں کو رزق پہنچاتی ہیں۔ اگر میں اپنی زبان بند کر لوں تو چتوڑ کے باسی بھوکے مر جائیں۔" سنیاسی آنند پال پر اچانک مجذوبانہ کیفیت طاری ہو گئی تھی اور اس نے اپنے باپ امر پال کی طرح دنیا کے ہر اقتدار کو جھٹلا دیا تھا۔

سنیاسی کی شعلہ بیانی راجہ رتن سنگھ کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ حرفوں کی آگ پھیلی تو راجپوت سمراٹ کے غرور کی قبا بھی جل گئی۔ "سنیاسی! تو اپنی حد سے گزر گیا۔" یکایک راجہ رتن سنگھ چیخ اٹھا۔......... "تو نہیں جانتا کہ اگلے پل کیا ہونے والا ہے ؟ تجھے یہ بھی پتا نہیں کہ ہم تیرے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے ؟"

"موت! صرف موت! تو اس سے زیادہ برا سلوک نہیں کر سکتا۔" سنیاسی نے ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ راجہ رتن سنگھ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ "جلدی کر کہ اس ناپاک مقام پر میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

"اور راج دوت کا وہ سندیش ؟"

راجہ رتن سنگھ گھبرا کر بولا۔ آنند پال کی موت پر آمادگی نے چتوڑ کے حکمراں کو بدحواس کر دیا تھا۔

"وہ سب کچھ تجھے یہ جادوگر بتا دے گا۔" سنیاسی آنند پال نے رام دیو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حقارت سے کہا۔

"نہیں سنیاسی! وہ راز تیری ہی زبان سے آشکار ہو گا۔ تو نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اور تو ہر حال میں اپنے الفاظ کا پابند ہے۔" راجہ رتن سنگھ نے مجبور ہو کر اپنے غصے پر قابو پا لیا تھا اور اب اس کے لہجے میں خوشامد شامل ہو گئی تھی۔

"رتن سنگھ! میں تجھے خوب جانتا ہوں۔ تو مجھے میرے سچ کی قسم دے رہا ہے اور جب میری زبان سے سچ ظاہر ہو جائے گا تو پھر تیری عیار فطرت اپنے مرکز کی طرف لوٹ جائے گی تو مجھے قتل کرا دے گا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے سچ بولنے کی یہ آخری رات ہے۔ اس اندھیرے کے بعد میرے لبوں پر کوئی روشن حرف طلوع نہیں ہو گا۔ بے زبانی ہی بے زبانی ہو گی۔ اس ذات کی قسم! جو پتھروں میں پوشیدہ نہیں ہے، مجھ سے میری طاقتِ گفتار چھین لی جائے گی۔ میرے اشاروں پر سنگباری اور میرے الفاظ قتل کر دیئے جائیں گے۔ تو یہی چاہتا ہے اور یہی ہو گا۔" سنیاسی کے گیان کی آنکھ نے راجہ رتن سنگھ کے قلبِ سیاہ کا پردہ چاک کر ڈالا تھا۔

"اگر تو علاءالدین خلجی کے خفیہ پیغام کو ظاہر کر دے تو کوئی عجب نہیں کہ میں تجھ پر مہربان ہو جاؤں۔" رتن سنگھ نے نئی چال چلی۔

"میں تیری مہربانیوں کو اپنی ٹھوکروں پر رکھتا ہوں۔" اچانک آنند پال کی گردن میں کجی نمایاں ہو گئی تھی اور نرم لہجے نے چٹان کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔

بھرے آشرم میں اپنے شوہر کی یہ تذلیل دیکھ کر رانی پدمنی بھی خاموش نہ رہ سکی۔ "چتوڑ کی تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے رحم و کرم کی تحقیر کرنے والوں کی سانسیں زیادہ نہیں ہوتیں۔ کیا تو نے اپنے باپ کے آخری لمحات کو فراموش کر دیا۔" رانی پدمنی نے انتہائی طیش کے عالم میں سنیاسی کو اس کے باپ امر پال کا انجام یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"یہ بات پرانی ہو چکی ہے۔" سنیاسی اس مغرور عورت کی متکبرانہ روش دیکھ کر یکایک مسکرانے لگا تھا۔ "باپ پر جو گزرنا تھی سو گزر گئی۔ اب تو تیری مملکت کے غلاموں کو اس سے دلچسپی ہے کہ بیٹے کا کیا حشر ہوتا ہے ؟ میں تیرے بازارِ ستم میں اپنی سانسیں فروخت کرنے آیا ہوں۔ اگر خرید سکتی ہے تو خرید لے اور میرے بارے میں زیادہ نہ سوچ کہ میں تو ہمیشہ جان اپنی کوچۂ قاتل میں رکھتا ہوں۔"

رانی پدمنی، آنند پال کی اس گرمیٔ گفتار کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے چیخ کر سپاہیوں کو حکم دیا۔

"سنیاسی کے پاپی شریر کو ٹکڑوں میں بانٹ دو۔"

پدمنی کے قہرناک حکم پر سپاہیوں میں ہلچل تو ہوئی مگر وہ سنیاسی آنند پال کے لاغر جسم پر مشقِ ستم نہ کر سکے۔ ان کی آنکھیں راجہ رتن سنگھ کے چہرے پر مرکوز تھیں اور سماعتوں کو چتوڑ کے حکمراں کی جنبشِ لب کا انتظار تھا۔

رانی پدمنی ایک بار پھر اپنے غضب کا اظہار کرنا چاہتی تھی مگر راجہ رتن سنگھ نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔ یہ ایک اشارہ تھا کہ وہ ہوش اور مصلحت سے کام لے۔ رانی پدمنی پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

راجہ رتن سنگھ نے ایک خود غرض انسان کی طرح اپنا لہجہ بدل لیا۔ "سنیاسی! مجھے یا مہاراج رام دیو کو تم سے لاکھ اختلاف سہی مگر تم اول و آخر ایک ہندو ہو اور اس وقت پوری ہندو قوم کو اپنے بدترین دشمن کا سامنا

ہے۔"

"رتن سنگھ! مجھ سے کھلے لفظوں میں بات کر۔ مرد پروے کے پیچھے بیٹھ کر گفتگو نہیں کرتے۔" سنیاسی آنند پال کی مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی۔ "کبھی اپنے دل کی غلامی کرتا ہے اور کبھی عورتوں کی۔ یہ بیچ کا راستہ چھوڑ دے۔ اسی میں تیری بھلائی ہے۔"

راجہ رتن سنگھ کے دل میں قہر و نفرت کا طوفان پھر اٹھا مگر مصلحت نے اسے دبا دیا۔ "سنیاسی! بس مجھے اتنا بتا دے کہ راج دوت دلی سے کیوں آیا ہے اور سلطان کے کیا ارادے ہیں؟"

"میں نے ابھی تک راج دوت کو نہیں دیکھا۔ پھر میں کس طرح بتا سکتا ہوں کہ اس کے دل میں کیا ہے؟" آنند پال اپنی موت سے بے خبر مسلسل مسکرا رہا تھا۔

مجبوراً راجہ رتن سنگھ نے سنیاسی کو آفریدی کے کمرے میں جانے کی اجازت دیدی۔ رام دیو اور مہامنتری وکرم سنگھ سب ساتھ ساتھ تھے۔

پھر جب سنیاسی آنند پال' رام دیو اور وکرم سنگھ آشرم کے دروازے سے نکل کر راج محل کی طویل راہ داری میں داخل ہوگئے تو راجہ رتن سنگھ نے ان چاروں سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ باہر پہرا دیں۔ سپاہیوں نے اپنی برہنہ شمشیروں کا رخ زمین کی طرف کر دیا اور گردنیں جھکائے ہوئے چلے گئے۔ اب آشرم میں مکمل تنہائی تھی۔ راجہ رتن سنگھ نے محبت آمیز نظروں سے اپنی سرکش بیوی کی طرف دیکھا جسے احساسِ حسن اور شدتِ غضب نے دہکتا ہوا انگارہ بنا دیا تھا۔ "مہارانی! میری ذہنی کشمکش کا اندازہ کرو اور اپنے اس غصے کو پھر کسی موسم کے لئے اٹھا رکھو۔" چتوڑ کا حکمراں بارگاہِ حسن میں گداگری کر رہا تھا۔ "میرے دل و دماغ بھی جل رہے ہیں اور تمہارے رخسار بھی' پھر یہ آگ کہاں ٹھہرے گی؟ تم اگر برسات کی گھنگھور گھٹا کی طرح نہیں برس سکتیں تو پھر شبنم ہی بن جاؤ۔ تمہاری یہ ہمہ وقت کی شعلگی ایک دن مجھے بھی جلا کر رکھ دے گی۔"

رانی پدمنی کی آنکھوں میں غرورِ فتح نے انگڑائی لی اور وہ بے نیازانہ منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"میں یہ سب کچھ تمہاری خاطر کر رہا ہوں۔" راجہ رتن سنگھ کی آواز سرگوشیوں میں بدل گئی تھی۔ "میں نے چتوڑ کے تخت و تاج کو تمہاری گزر گاہِ ناز بنا دیا ہے کہ تم جب چاہو اسے پامال کرتی ہوئی گزر جاؤ۔ میرا راجپوتی وقار تمہارے ماتھے کی بندیا میں سمٹ گیا ہے اور میری شمشیرِ آبدار تمہاری چوڑیوں کی کھنک بن کر رہ گئی ہے۔ پھر یہ جارحانہ بے رخی کیسی اور یہ غمزۂ سفاک کیوں؟ تمہیں ایک لمحے کیلئے بھی وقت کی سنگینی کا احساس نہیں ہوتا۔ کم سے کم ایک ہی ساعت کے لئے اپنی ذات کے آئینہ خانے سے نکل کر دیکھو کہ خونی ہوائیں اپنے دامن میں کیسی کیسی بھاری چٹانوں کو لئے ہوئے تمہارے شیش محل کی جانب بڑھ رہی ہیں۔ سنیاسی سے مجھے دلی نفرت ہے مگر میں پھر بھی اس کے گیان سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آنند پال کا علم مہاراج رام دیو سے زیادہ نہیں لیکن کبھی کبھی کم جاننے والے بھی کوئی بڑا راز جان لیتے ہیں۔ شاید سنیاسی' سلطان علاءالدین خلجی کے اس خفیہ پیغام تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائے۔ جسے دلی کا راج دوت اپنے من کے اندر چھپائے ہوئے ہے۔" حسن کے رعب نے اسے گڑگڑانے پر مجبور کر دیا تھا۔

رانی پدمنی نے ایک ادائے دلبری کے ساتھ اپنے سر کو جنبش دی اور تابناک و بے داغ پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"سمراٹ! اب اس کھیل کو ختم ہوجانا چاہئے۔"

"مہارانی! یہ کسی بازی گر کا کھیل نہیں ہے۔" راجہ رتن سنگھ' پدمنی کی طرف جھکتے ہوئے بولا.......... "یہ اقتدار اور ہوس کا کھیل ہے' یہ آفات و مصائب کا تماشا ہے جس نے صرف میرا گھر دیکھ لیا ہے۔"

"کس کی ہوس اور کس کا اقتدار؟" رانی پدمنی نے اپنے پائے حنائی سے مخملیں گھاس کو مسلتے ہوئے کہا۔

"علاءالدین خلجی کی ہوس اور دلی کا اقتدار۔" راجہ رتن سنگھ یکایک جل اٹھا اور اس نے اپنے غصہ کو قابو میں رکھنے کے لئے کرسی کے دونوں بازوؤں پر ہاتھوں کی گرفت اس قدر مضبوط کر دی کہ رگیں تک ابھر آئیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایک ان سنے پیغام سے اتنے خوفزدہ کیوں ہیں؟" رانی پدمنی کے لہجے کی شعلہ ریزی برقرار تھی۔

"پدمنی میں وہ پیغام سننا نہیں چاہتا جو ایک غیر مرد نے تمہارے لئے بھیجا ہے۔" بالآخر راجہ رتن سنگھ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ "تمہارا یہ ناز' یہ غرور' یہ احساس برتری تمہیں اتنی فرصت ہی نہیں دیتا کہ تم علاءالدین خلجی کی اس حرکت کا مفہوم سمجھ سکو۔ ابھی یہ سوال صرف راج محل کے راجپوتوں کی آنکھوں میں ابھر رہا ہے کہ سلطان نے راجہ رتن سنگھ کے بجائے رانی پدمنی کو پیغام کیوں بھیجا؟ کل یہی سوال چتوڑ کے ایک ایک باشندے کی زبان پر ہوگا۔ میں اس وقت سے بہت ڈرتا ہوں۔"

"سمراٹ کا خوف بے حقیقت ہے۔" رانی پدمنی کے ہونٹوں پر یکایک ایک فاتحانہ تبسم ابھر آیا تھا "سلطان کو کسی نہ کسی طرح پتا چل گیا ہوگا کہ چتوڑ کی اصل حکمراں رانی پدمنی ہے۔ اسی لئے علاءالدین نے میرے نام اپنا پیغام بھیجنا مناسب سمجھا۔" حسن کی سرکشی نے عجیب رخ اختیار کر لیا تھا۔

راجہ رتن سنگھ نے بڑی حیرت سے اپنی بیوی کا جواب سنا۔ دل و دماغ ایک بار پھر جل اُٹھے مگر اس نے ہوش و حواس نہیں کھوئے۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ تم میرے دل کے ساتھ چتوڑ کی بھی حکمراں ہو مگر سلطان کی یہ روش آدابِ سفارت کے خلاف ہے۔ اس ریاست کا جاہل ترین فرد بھی تمہاری پیش کردہ دلیل کو قبول نہیں کرے گا۔" رتن سنگھ نے پدمنی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "بھگوان کے لئے اپنا یہ انداز فکر کسی پر ظاہر بھی نہ کرنا کہ لوگوں کی انگلیاں ہماری عزت کے پیرہن کو تار تار کرنے کے لئے بے قرار ہیں۔"

رانی پدمنی فطرتاً ایک ذہین عورت تھی مگر راجہ رتن سنگھ کی بے جا ناز برداریوں نے اسے بد دماغ بنا دیا تھا۔ آج جب چتوڑ کے حکمراں نے راج دوت کے لائے ہوئے خفیہ پیغام کے سلسلے میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا تو وہ بری طرح چونک اٹھی۔ "پھر آپ نے اس مسئلہ کا کیا حل تلاش کیا ہے؟" رانی پدمنی کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

"میں نے اسی کام کیلئے سنیاسی آنند پال کو راج دوت کے پاس بھیجا ہے۔" رانی پدمنی کو پرسکون دیکھ کر راجہ رتن سنگھ بھی مطمئن نظر آنے لگا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم صبر سے کام لو اور سب لوگوں کے سامنے سیاسی معاملات میں مداخلت نہ کرو۔ اگر سنیاسی آنند پال نے راج دوت سے وہ راز اگلوا لیا تو یہ ہماری بڑی کامیابی ہوگی۔"

اس طویل گفتگو کے بعد آشرم کی فضا پر گہرا سکوت طاری ہوگیا۔

☆..............................☆..............................☆

ادھر راجہ رتن سنگھ سنیاسی کی کامیابیوں کا منتظر تھا اور ادھر آنند پال نے علی عامر آفریدی کے کمرے

میں پہنچتے ہی اپنے عقائد کی بازی ہار دی تھی۔ ستر سالہ بوڑھا جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ نادیدہ خدا کی تلاش اور سچ بولنے میں گزارا تھا' جب وہ علی عامر آفریدی کی خواب گاہ میں داخل ہوا تو دلی سے آئے ہوئے اس نوجوان کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

"ہاں! تم وہی ہو جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا" آنند پال پر جذب کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور وہ بڑے والہانہ انداز میں بول رہا تھا۔ "آخر میں نے تمہیں پا لیا۔ دیکھو! دنیا نے میرے اور تمہارے درمیان کتنی دیواریں کھڑی کر دی ہیں مگر میں ہر بندش سے گزر آیا۔ یہ میرا شوقِ آوارہ ہی تھا کہ ایک ایک پتھر سے ٹکراتا رہا۔ میرے بچے! تم نہیں دیکھ سکتے کہ میں کہاں کہاں سے زخمی ہوں۔ آؤ! میرے قریب آؤ اور اس شخص کی حالتِ زار کا اندازہ کرو جو صحرا کی تپتی ہوئی ریت سے پانی مانگتا رہا۔ میرے جلتے ہوئے لب دیکھو اور اس دل پر نظر ڈالو جو آگ اور دھوئیں کے درمیان کب سے سلگ رہا ہے اس سے پہلے کہ میری ذات راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائے' تم آخری منظر کو اپنی نگاہوں میں محفوظ کر لو۔ تم وہی نوجوان ہو جو ایک دن میرے سچ پر گواہی دو گے۔"

سنیاسی کی آواز ایک طاقتور مقناطیس تھی جس نے آفریدی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ ایک سحر زدہ انسان کی مانند اپنے بستر سے اٹھا اور اس اجنبی شخص کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا جو بظاہر ہندو تھا۔ مگر تمام ہندوؤں سے مختلف۔ اس کے لہجہ میں واقعتاً ایک آگ تھی جس کی تپش آفریدی کو بھی اپنے دل کے قریب محسوس ہو رہی تھی۔

"بزرگ! میں نے نہیں پہچانا کہ آخر آپ کون ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" آفریدی نے حیران ہو کر پوچھا اور ایک نظر رام دیو پر ڈالی جس کی آنکھوں میں اس وقت بھی نفرتوں کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

"ابھی تم مجھے نہیں پہچانو گے لیکن میرا اور تمہارا رشتہ ازل سے ہے جسے زمینوں اور زمانوں کے فرق نے کچھ دن کے لئے توڑ دیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے سنیاسی آنند پال نے اپنا دایاں ہاتھ آفریدی کے کاندھے پر رکھ دیا۔ "آج وقت نے اسی رشتے کو دوبارہ جوڑ دیا ہے۔"

"سنیاسی!" اچانک رام دیو گرجا۔ "تم جس کام کے لئے آئے ہو اسے تکمیل تک پہنچاؤ۔ جھوٹے رشتے قائم کرنے میں وقت برباد نہ کرو۔"

"مہاراج!" سنیاسی نے پلٹ کر رام دیو کی طرف دیکھا۔ "میں وہی کام انجام دے رہا ہوں۔ صبر کریں' بس چند لمحوں کی بات ہے۔" آفریدی جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ "کیا کام؟ کیا تم بھی اس جادوگر سے تعلق رکھتے ہو جو تقریباً ایک ماہ سے مسلسل مجھ پر اپنے منتر آزما رہا ہے۔" آفریدی نے رام دیو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور کیا تم بھی اسی مہامنتری کے قبیلے کے ایک فرد ہو جو مجھے گمراہ کرنے کیلئے ہر رات کو میری تنہائی میں ایک خوبصورت رقاصہ بھیجتا ہے اور صبح ہوتے ہی وہ معصوم لڑکی مہاراج کے حکم پر قتل کر دی جاتی ہے؟"

"میرے بچے! جو تم سمجھ رہے ہو میں وہ نہیں ہوں۔ مجھے اتنا بتا دو کہ تم کیا پیغام لے کر آئے ہو؟" سنیاسی نے انتہائی محبت آمیز لہجے میں کہا۔

آفریدی پھر بھڑک اٹھا۔ "جس پیغام کو قبل از وقت جاننے کیلئے مجھے پیہم اذیتیں پہنچائی جا رہی ہیں' میں اسے رانی پدمنی کے سوا کسی کے سامنے بیان نہیں کر سکتا۔"

"تم پھر غلط سمجھے۔" سنیاسی کے لہجے میں بے پناہ محبت تھی۔ "میں تو اس پیغام کے بارے میں پوچھ رہا

ہوں جو تم دنیا والوں کے لئے لے کر آئے ہو۔"

آفریدی' سنیاسی کی بات سن کر حیرت میں ڈوب گیا۔ چند لمحوں تک کسی بے جان مورت کی طرح ساکت کھڑا رہا۔ پھر جب لب کشا ہوا تو کمرے میں زلزلہ سا آ گیا۔ "وہ پیغام اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ ایک ہے' اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد عربیؐ اس کے آخری رسول ہیں۔"

جیسے ہی آفریدی کے الفاظ کی گونج ختم ہوئی' سنیاسی نے ایک جگر خراش چیخ ماری۔ اس کا پورا جسم ہوا کے طوفان میں کسی کمزور شاخ کی طرح لرز رہا تھا۔ پھر آنند پال کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ "ہاں! یہ وہی پیغام ہے جسے سننے کی حسرت میں میرے پتا جوگی امر پال قتل کر دیئے گئے اور میں بھی کچھ دیر بعد ہلاکت کے اسی راستے پر چلا جاؤں گا مگر یہ میری خوش نصیبی ہے کہ موت سے پہلے میں نے وہ پیغام سن لیا۔" یہ کہہ کر سنیاسی آنند پال دیوانہ وار آگے بڑھا اور علی عامر آفریدی سے لپٹ گیا۔ "تیرے سینے میں بھی وہی آگ روشن ہے جو مجھے ستر سال سے پھونکے ڈال رہی ہے۔ تو نے سچ کہا نوجوان کہ اللہ ایک ہے' اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد عربیؐ اس کے آخری رسول ہیں۔ میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ تیرے پیغام کا ایک ایک حرف سچا ہے اور اس کے سوا دنیا میں جو کچھ موجود ہے وہ سب جھوٹ ہے۔" سنیاسی آنند پال بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ "جگ کے پالن ہار! مجھے معاف کر دے کہ میں تیری ذات سے بے خبر رہا۔ اور اب ہوش آیا ہے تو سرِ مقتل کھڑا ہوں۔ میرے اقرار کی مدت بہت مختصر ہے مگر تیرا کرم لامحدود ہے' اپنے اسی کرم سے مایا موہ میں گرفتار میری بے چین آتما کو مکتی دے اور اس نوجوان کو زندگی کے ہر معرکے میں سربلند کر جس نے تیرا پیغام مجھ گناہ گار تک پہنچایا۔" گریہ وزاری کی شدت سے آنند پال کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

کچھ دیر تک رام دیو اس انقلاب کو سمجھ ہی نہیں سکا مگر جب اس نے آنند پال کے الفاظ پر غور کیا تو سارا کھیل بگڑ چکا تھا۔ رام دیو' سنیاسی کی یہ حالت دیکھ کر فرطِ غضب سے پاگل ہو گیا۔ "دیوتاؤں کے اس غدار کو آشرم میں واپس لے چلو۔" رام دیو نے ان سپاہیوں کو حکم دیا جو دن رات آفریدی کی حفاظت پر مامور رہتے تھے۔

رام دیو کا حکم سن کر سپاہی آگے بڑھے اور پوری طاقت سے بوڑھے سنیاسی کو پکڑ کر کھینچا۔ آنند پال توازن برقرار نہ رکھ سکا اور کمرے کے فرش پر گر گیا۔ دوسرے ہی لمحے رام دیو کی بھرپور ٹھوکر اس کے منہ پر پڑی۔ درد کی شدت سے سنیاسی کی چیخ نکل گئی مگر اس چیخ میں ایک ایسا لفظ بھی شامل تھا جس کی گونج پہلی بار بت خانۂ چتوڑ میں سنائی دی تھی۔ آنند پال نے اذیت و کرب کے عالم میں بھگوان کے بجائے "اللہ" کو پکارا تھا۔ ابھی اس مقدس ترین لفظ کی بازگشت ختم ہونے نہیں پائی تھی کہ رام دیو کی دوسری ٹھوکر نے سنیاسی کے چہرے سے خون کا آبشار جاری کر دیا۔ آفریدی کے لئے مذہبی بہروپیئے کا یہ تشدد ناقابلِ برداشت تھا۔

"رام دیو!" علی عامر نے اس جادوگر کو پکارا جس کے پنجۂ ستم میں چتوڑ کے حکمراں ایک چڑیا کی مانند تھے۔ "تیری یہ ٹھوکریں بوڑھے سنیاسی کے منہ پر نہیں' سلطان علاء الدین خلجی کے چہرۂ جلال پر پڑ رہی ہیں' یہ ضعیف و ناتواں شخص جسے تو نے اس کے خون سے نہلا دیا ہے' سلطان کا رشتہ دار ہے اور سلطان اپنے رشتہ دار کے ایک ایک قطرۂ خون کا حساب اس طرح لے گا کہ تمہارے سروں پر لہو کے سمندر امڈ پڑیں گے۔"

"اس سے سلطان کا کوئی رشتہ نہیں۔" رام دیو کی مکروہ آواز گونجی۔ "یہ ہندو دھرم کا وشواس گھاتی (فریب کار) ہے اسے اس کے کئے کی سزا اس طرح دی جائے گی کہ پھر کوئی پجاری اپنے دیوتاؤں سے

غداری کی جرأت نہ کر سکے گا۔"

"سنیاسی نے دیوتاؤں سے اپنی نسبت کو توڑ دیا۔ اب یہ خدا پرستوں کا حوالہ ہے اور مسلمان اپنے اس حوالے کو رسوا نہیں ہونے دیں گے۔"

"تم کیا اور تمہارا حوالہ کیا؟" رام دیو نے انتہائی نفرت و حقارت کے لہجے میں کہا اور جھک کر سنیاسی آنند پال کو اٹھایا اور پھر آفریدی کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تیرا یہ حوالہ ابھی کچھ دیر میں اہل چتوڑ کے لئے عبرت کا نشان بن جائے گا۔"

آفریدی بے دست و پا تھا۔ اس کی فریاد بے اثر تھی اور تنبیہہ رائیگاں پھر بھی آخری امید کا سہارا لے کر اس نے وکرم سنگھ کو پکارا جو کمرے کی دیوار سے پشت ٹیکے' آنکھیں بند کئے اس طرح کھڑا تھا جیسے وہ ان تمام معاملات سے لاتعلق ہو۔ "مہامنتری! مجھے اسی وقت راجہ رتن سنگھ کے روبرو حاضر کر دیں یا پھر ایک کلمہ گو کی زندگی بچانے کے لئے اپنے اثر و رسوخ استعمال کریں۔ اگر حلقۂ اسلام میں داخل ہونے والا یہ بے گناہ شخص آپ کی جابرانہ روایتوں کی بھینٹ چڑھ گیا تو دہلی پر اس کے خوفناک اثرات مرتب ہوں گے۔"

آفریدی کے تخاطب پر وکرم سنگھ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور ان آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کرنے لگا جن کی نمی اس کی پلکوں پر صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

"اس اپرادھی (مجرم) کو کوئی نہیں بچا سکتا۔" وکرم سنگھ کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ رام دیو کی چیخ سے پورا کمرہ لرز اٹھا اور پھر اس جفاکار نے لہولہان سنیاسی کو باہر کی جانب کھینچنا شروع کر دیا۔ حالت اضطراب میں آفریدی بھی آگے بڑھا مگر سفارتی آداب کی زنجیروں اور راجپوت سپاہیوں کے طاقتور بازوؤں کی گرفت نے اسے روک دیا۔ نحیف و نزار سنیاسی کو کسی ذبح کئے جانے والے جانور کی طرح کھینچ کر لے جایا جا رہا تھا اور طویل راہ داری میں اس کی غمزدہ آواز گونج رہی تھی۔ "بیٹے! میری موت کا غم نہ کرنا۔ میں تو چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں۔ اپنے حوصلہ کو بلند رکھنا کہ ابھی تجھے بڑی آزمائشوں سے گزرنا ہے۔ میری دھندلی آنکھیں ظلم کے عفریتوں کو تیری طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہی ہیں۔ ثابت قدم رہنا کہ یہ سب ایک دن اپنی ہی آگ میں جل بجھیں گے۔ کوئی کچھ بھی کر لے مگر انجام کار فتح تیرا ہی مقدر ہے۔" پھر فاصلے بڑھ گئے اور سنیاسی کی آواز ظلم کے مقبرے میں گم ہو گئی۔

آخر میں مہامنتری وکرم سنگھ کمرے سے باہر نکلا۔ جاتے جاتے ایک لمحے کیلئے ٹھہرا اور مڑ کر آفریدی کی طرف دیکھنے لگا۔ پلکوں پر ٹھہرے ہوئے آنسو رخساروں تک آئے۔ وکرم سنگھ کی بے زبانی نے علی عامر کو اپنی مجبوری کا فسانہ سنایا اور پھر چتوڑ کا وزیر اعظم تیز قدموں سے اس طرف چلا گیا جدھر رام دیو' سنیاسی آنند پال کو لے کر گیا تھا۔

جادوگر کے آشرم میں ایک حشر سا برپا تھا۔ رام دیو' راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کو چیخ چیخ کر آنند پال کے جرم کی تفصیلات سنا رہا تھا۔ جب وہ سیاہ فام سیاہ کار خاموش ہوا تو رتن سنگھ' آنند پال پر برس پڑا۔

"تو نے اپنے باپ دادا کی رسمیں بھی اس ملیچھ کے ہاتھوں بیچ ڈالیں۔"

"ہاں! میں نے اندھیرے بیچ کر روشنی خرید لی۔" آنند پال آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ "میں جانتا ہوں کہ تو خسارے کا سودا کرے گا مگر پھر بھی تجھ پر آخری احسان کئے جاتا ہوں۔ میری بات غور سے سن! یہ فاسق و فاجر رام دیو جو تیرے سامنے اپنے گیان کے جھوٹے دعوے کرتا ہے' چاند گرہن کی رات اپنا مفلوج ہاتھ لے کر میرے پاس آیا تھا۔ اس کے سارے منتر اسی پر الٹ گئے تھے۔ پھر جب میرے کہنے پر اس نے راج دوت کے پاؤں چھوئے تو وہ فالج زدہ ہاتھ حرکت میں آیا۔" سنیاسی کچھ دیر کیلئے خاموش

ہو گیا۔ زخموں کی سوزش نے اسے بے قرار کر دیا تھا۔

"سمراٹ! یہ اپنے گناہوں کو چھپانے کیلئے دوسروں پر تہمتیں تراش رہا ہے۔" رام دیو نے آنند پال کے سکوت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

"رتن سنگھ! ابھی وقت ہے۔ اس شعبدہ باز کے حصار سے نکل کر حقیقت کا چہرہ دیکھ ورنہ جھوٹے طلسمات کی زمین تجھ پر تنگ ہو جائے گی۔" آنند پال' رام دیو کی چیخوں سے بے نیاز' ایک عجیب سے عالم بے خودی میں بولے جا رہا تھا۔ "سلطان کے راج دوت کو بے گناہ لڑکیوں کے قتل اور لوبان کے دھوئیں سے ہراساں کرنے کی کوششیں چھوڑ دے کہ اس نوجوان کو سارے ہندوستان کے جادوگر مل کر بھی خوفزدہ نہیں کر سکتے۔"

"سنیاسی! تو جھوٹ بولتا ہے۔" اچانک رانی پدمنی نے مداخلت کی۔ "راج دوت ایک حقیر کیڑا ہے۔ چوہانوں اور راٹھوروں کی بے پناہ قوت اسے ہی نہیں اس کے سلطان کو بھی روند ڈالے گی۔"

آنند پال نے پدمنی کے چہرے پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور رتن سنگھ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "اس کی زبان کو لگام دے اور ہونٹوں پر آہنی قفل لگا دے کہ یہ عورت خود بھی رسوا ہو گی اور تجھے بھی سارے جہاں میں ذلیل کرائے گی۔" یہ کہہ کر سنیاسی آنند پال خاموش ہو گیا اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ زخموں سے خون رس رہا تھا۔ سنیاسی کے دونوں ہاتھ سرخ ہو گئے۔ آنند پال نے رنگین ہاتھوں کو غور سے دیکھا پھر آسمان پر نگاہ کی اور سر جھکا لیا۔

راجہ رتن سنگھ اپنی مغرور رانی کی زبان کو لگام تو نہ دے سکا لیکن اس نے تبدیلیٔ مذہب اور شعلہ بیانی کے جرم میں سنیاسی کی زبان کاٹ دی۔ رام دیو' آنند پال کو قتل کر دینا چاہتا تھا مگر رانی پدمنی کی خواہش تھی کہ سنیاسی کی زبان کاٹ کر اسے تڑپنے کیلئے چھوڑ دیا جائے۔ وہ بڑا اذیت ناک منظر تھا جب ایک سچ بولنے والے کو اس کی زبان سے محروم کر دیا گیا۔ آنند پال نے اس موقع پر غیر معمولی قوت برداشت کا مظاہرہ کیا۔ منہ سے تو کوئی چیخ نہیں نکلی مگر آنکھیں بہنے لگیں۔ تکلیف کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ مہامنتری وکرم سنگھ سے یہ منظر نہیں دیکھا گیا تو شدت غم سے بے ہوش ہو گیا۔

پھر رات کے اندھیرے میں سنیاسی کو راج محل سے باہر نکال دیا گیا۔ سورج طلوع ہوا تو اہل چتوڑ کے لئے راجہ رتن سنگھ کا یہ فرمان جاری ہو گیا کہ سنیاسی پر ریاست کی غذا اور پانی حرام ہے۔ اگر کسی نے اس سلسلے میں آنند پال سے معاونت کی تو وہ بھی راجپوت سمراٹ کے قہر کا شکار ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی دو سپاہی مسلسل آنند پال کے تعاقب میں تھے۔ سنیاسی پانی کے کسی چشمے پر جھکتا تو سپاہی اسے کھینچ کر دور لے جاتے اور بہ آواز بلند اعلان کرتے۔

"اس پر دیوتاؤں کا عذاب نازل ہو رہا ہے۔"

سنیاسی نے ایک دوبار پانی پینے کی کوشش کی مگر جب سپاہیوں کو اس شقی القلبی پر آمادہ پایا تو خاموشی سے اپنے کمرے میں محصور ہو گیا۔ شاید وہ زبان کے زخم سے جانبر ہو جاتا لیکن پیاس نے اسے تیسرے دن ہی مار ڈالا۔ سنیاسی آنند پال بڑی بے کسی کی موت مرا تھا مگر مرنے سے پہلے اس نے اپنے ہم وطنوں کیلئے ایک زندہ نشانی چھوڑ دی تھی۔ جاسوس سپاہیوں نے راجہ رتن سنگھ کو سنیاسی کی موت کی خبر کے ساتھ ساتھ یہ اطلاع بھی بہم پہنچائی کہ آنند پال نے مرنے سے پہلے اپنے کمرے کی دیوار پر بڑی خوفناک باتیں تحریر کی ہیں۔

راجہ رتن سنگھ' رانی پدمنی اور رام دیو کے لئے سپاہیوں کی یہ اطلاع حیران کن تھی۔

"آخر اس پاپی نے مندر کی دیوار پر کیا لکھا ہے؟" رتن سنگھ اور رام دیو کو اپنے اپنے خیالات میں

غرق پاکر رانی پدمنی نے سپاہیوں سے دریافت کیا۔

دونوں سپاہیوں نے احتراماً اپنی گردنیں خم کردیں اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مہارانی کا اقبال بلند ہو۔ ہماری زبانیں ان باتوں کو دہرانے سے عاجز ہیں۔"

"پھر ہم خود اپنی آنکھوں سے اس شیطان کی آخری حرکت کا مشاہدہ کریں گے۔" یہ کہہ کر پدمنی نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

راجہ رتن سنگھ نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور رام دیو کی طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے وہ ساحرِ اعظم کی رضا حاصل کرنا چاہتا ہو۔

رام دیو کے چہرے پر ناقابلِ بیان خوشی کا عکس صاف نظر آرہا تھا۔ آج اس کے بدترین دشمن کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے چھولیا تھا اور یہ کامیابی رام دیو کے نزدیک عظیم الشان کامیابی تھی۔ "میں خود بھی اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہوں کہ دیوتاؤں کے ٹھکرائے ہوئے کتے کا انجام کتنا دردناک ہوا۔" یہ کہہ کر رام دیو نے پدمنی کی طرف دیکھا۔ "اور میں یہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ مہارانی کی رسوائیوں کی پیش گوئی کرنے والا خود کس طرح ذلیل ہوا؟" رام دیو نے چتوڑ کی مغرور عورت کی نفسیات پر بڑی ہوشیاری کے ساتھ ضرب لگائی تھی۔

رتن سنگھ نے اس اذیت ناک فضا سے نکلنے کے لئے بات کا رخ حقائق کی طرف موڑ دیا۔ "ہمیں اپنے دشمن کی موت کا جشن منانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ دشمن جاتے جاتے ہمارے لئے اور کونسی نئی سازش چھوڑ گیا ہے۔ ہمیں اس موقع پر وکرم سنگھ کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔ آخر وہ ہماری ریاست کا دماغ بھی ہے اور ہمارا ہمدرد بھی۔"

"کئی دن سے مہامنتری بیمار ہیں۔ شاید وہ اس سفر میں ہمارے شریک نہ ہوسکیں۔" رانی پدمنی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

یہ ایک رسمی سا ذکر تھا مگر رام دیو یہاں بھی خاموش نہ رہ سکا۔ "سمراٹ! انہیں سنیاسی آنند پال کی موت کا بہت صدمہ ہے؟" یہ ایک بڑی خوفناک بات تھی جو مسکراتے ہوئے لہجے میں کہی گئی تھی۔

رانی پدمنی نے فوراً جواب دیتے ہوئے کہا۔ "وہ ایک رقیق القلب انسان ہیں۔ خونیں مناظر ان سے برداشت نہیں ہوتے۔"

"نہیں! کوئی بات نہیں۔ بس مجھے شبہ سا تھا کہ وکرم سنگھ راجہ چتوڑ اور رانی پدمنی کے دشمن کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ شاید اسی غم نے انہیں بیمار ڈال دیا ہے۔" رام دیو نے وکرم سنگھ کے خلاف سازش کی ایک چنگاری چھوڑ دی تھی جسے شعلہ بننے کے لئے کچھ وقت درکار تھا۔

☆..................☆..................☆

مہامنتری وکرم سنگھ اسی وقت بے ہوش ہوگیا تھا جب سنیاسی آنند پال کی زبان کاٹی گئی تھی اور پھر اسی بے ہوشی کی حالت میں اسے گھر پہنچا دیا گیا تھا۔

پھر جب مہامنتری کی طبیعت کچھ سنبھلی تو اس نے بڑی رازداری کے ساتھ بیٹی کو اس خونی واردات کی تفصیل سنائی اور اپنے بے پناہ رنج و الم کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"نرملا! وہ سنیاسی پوری ریاست میں تنہا شخص تھا جسے دیکھ کر زندگی کا حوصلہ ملتا تھا۔ اس کی موجودگی سے میرے دل میں جینے کی آرزو پیدا ہوتی تھی۔ اب سنیاسی کے بعد ریاست چتوڑ ایک شمشان بھومی بن گئی ہے جس میں رہنے والے لوگ بھوت بن کر مجھے ڈراتے ہیں۔ کاش! میں سنیاسی کو بچا سکتا۔" یہ کہہ کر

وکرم سنگھ نے سنیاسی کی تبدیلیِ مذہب کی کہانی بھی نرملا کو سنا ڈالی۔

"کیا سلطان کا راج دوت ایک ایسا ہی انسان ہے جسے دیکھ کر لوگ اپنے آباؤ اجداد کے صدیوں پرانے مذہب کو ترک کردیتے ہیں؟" نرملا نے بڑے اثرانگیز لہجے میں اپنے باپ سے سوال کیا تھا اور وہ عجیب سے خیالات میں گم ہوکر رہ گئی تھی۔

"راج دوت روشن چہرہ رکھنے والا ایک باوقار نوجوان ہے۔ جن لوگوں نے اسے ایک بار دیکھا ہے وہ اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ مگر آنند پال کا تو یہ حال تھا کہ آفریدی سے دیوانہ وار لپٹ کر روئے تھے۔ پھر سنیاسی نے یہ بھی کہا تھا کہ ہندوستان کے سارے جادوگر مل کر بھی راج دوت کی زندگی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔" وکرم سنگھ رقت آمیز لہجے میں بول رہا تھا۔ "جہاں مجھے سنیاسی پر کئے جانے والے تشدد سے اذیت پہنچی ہے وہاں میں اس نوجوان کی بے جا قید و بند سے بھی پریشان ہوں۔ میں یہ راز صرف تم سے کہہ رہا ہوں کہ جسے دیکھ کر آنند پال نے اپنا مذہب بدل ڈالا وہ کوئی عام نوجوان نہیں ہوسکتا۔ اب مجھے بھی آفریدی سے اپنے بچے کی طرح محبت ہوگئی ہے اور میں اس کا احترام کرنے لگا ہوں۔"

نرملا کماری، وکرم سنگھ کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کو بغور سن رہی تھی ایک اجنبی نوجوان کی بے پناہ تعریف اور شخصیت کے اس تابناک پہلو نے نرملا کو خیالوں کی کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔

"نرملا۔" وکرم سنگھ نے بیٹی کو آواز دی مگر جواب میں خاموشی طاری رہی۔ وکرم سنگھ نے نرملا کو دوبارہ پکارا تو اس خوبصورت لڑکی کا انہماک ختم ہوا اور وہ خیالوں کے حصار سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آئی۔

"بیٹی! میری مجبوریوں نے سنیاسی کو تو کھو دیا۔ اب ڈرتا ہوں کہ کہیں آفریدی بھی رام دیو کی جفاکاریوں کا نشانہ نہ بن جائے۔ میری تو خواہش ہے کہ راج دوت آج ہی چتوڑ سے نکل کر دلی واپس چلا جائے ورنہ کون جانے کہ یہاں کونسا فتنہ کھڑا ہو جائے۔"

"تو پھر راج دوت کو دلی واپس بھیجنے میں کیا رکاوٹ ہے؟" نرملا نے اپنے مضطرب باپ سے پوچھا۔

"وہی ایک ضد کہ جب تک راجہ رتن سنگھ، سلطان کے خفیہ پیغام سے آگاہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک نہ اسے رانی پدمنی سے ملنے کی اجازت ہے اور نہ دلی واپس جانے کا اختیار۔ مہاراج رام دیو تقریباً ایک ماہ سے اپنے منتر آزما رہے ہیں، مگر راج دوت کسی طرح بھی اپنی زبان نہیں کھولتا۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ نے گزرے ہوئے تمام واقعات اپنی بیٹی کو سنا دیئے۔ مہامنتری کے ذہن پر جو ناقابلِ برداشت بوجھ تھا، آج وہ کسی حد تک کم ہوگیا تھا۔

اس دوران نرملا کماری کے چہرے پر مختلف رنگ ابھر کر ڈوبتے رہے۔ اور جب بار بار رام دیو کا ذکر آیا تو وہ خاموش نہ رہ سکی۔ "کیا مہاراج کے اثرات اتنے بڑھ چکے ہیں کہ راج محل ان کی جنبشِ چشم کا پابند ہوکر رہ گیا ہے؟" نرملا کی آواز شدید حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ "کیا اب چتوڑ کی قسمت کے فیصلے ایک جادوگر کے آشرم میں کئے جائیں گے؟"

"بس بیٹی! خاموش رہو!" نرملا کی بے باکی کا یہ انداز دیکھ کر وکرم سنگھ لرز اٹھا۔ "اس شخص کے بارے میں اپنے گھر کی دیواروں سے بھی کچھ نہ کہنا۔ تم مہاراج کے متعلق صرف سوچ سکتی ہو لیکن تمہیں اظہارِ رائے کا حق نہیں ہے۔ اگر اس لمحے سے پہلے تمہیں کوئی حق حاصل بھی تھا تو تمہارا باپ آج تم سے وہ حق چھین رہا ہے۔ مجھے معاف کرنا نرملا کہ تمہارا باپ اس ریاست میں بالکل تنہا ہے۔ تمہیں میری تنہائی کی قسم! اپنے ہونٹوں پر موت جیسی خاموشی کے پہرے بٹھا کر انتظار کرو کہ انتظار ہی نئے راستے کھولتا ہے۔"

☆..................☆..................☆

آفریدی تین راتوں سے عجیب اذیت و کرب کا شکار تھا۔ جس دن ابتدائے شب میں رام دیو' سنیاسی آنند پال کو بے دردی کے ساتھ کھینچتا ہوا آفریدی کے کمرے سے لے گیا تھا' اس رات علی عامر صرف چند لمحوں کے لئے سو سکا تھا اور پھر وہی لمحے اس کے لئے ایک عذاب جاں بن گئے تھے۔ آنکھ لگتے ہی آفریدی نے خواب دیکھا تھا کہ سنیاسی آنند پال کے منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ اس طرح اٹھے ہوئے ہیں جیسے وہ آفریدی کو اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہے مگر اچانک راجپوت سپاہی درمیان میں حائل ہو جاتے ہیں۔ پھر سنیاسی کی ایک تیز چیخ ابھرتی ہے۔

"بیٹے! میری زبان کاٹ دی گئی۔ میں دنیا سے جا رہا ہوں۔"

یہ خواب اتنا لرزہ خیز تھا کہ دہشت سے آفریدی کی آنکھ کھل گئی تھی پھر اس نے محافظ سپاہیوں سے عاجزانہ درخواست کرتے ہوئے کہا تھا۔ "مجھے راجہ رتن سنگھ کے پاس لے چلو۔ مہامنتری وکرم سنگھ کو خبر کرو کہ آفریدی ان سے ملنا چاہتا ہے۔ سنیاسی آنند پال پر کیا گزری؟ تم نے میرے ایک ہم مذہب کے ساتھ کیسا بے رحمانہ سلوک کیا ہے کہ وہ خواب میں آ کر مجھے پکار رہا ہے؟" آفریدی وحشیوں کی مانند چیختا رہا مگر سپاہیوں نے اس کی ایک بھی نہیں سنی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ پتھر کے ہو گئے ہیں۔ پھر وہ اپنی بے کسی پر رونے لگا۔

☆..........................☆..........................☆

راج محل کے ایک کمرے میں آفریدی کی آنکھوں سے اشک جاری تھے اور "مکھوُ شیام" کے مندر میں جادوگر رام دیو سنیاسی آنند پال کی لاش دیکھ کر چیخ رہا تھا۔ "آخر تو اپنے بدترین انجام کو پہنچا اور تیرے لئے آگ کے دروازے کھل گئے۔ وہ آگ جو ایک پاپی کا جسم جلانے کے بعد اس کی روح کو بھی ہمیشہ پھونکتی رہتی ہے۔"

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے بھی سنیاسی آنند پال کی لاش کو دیکھا اس مختصر سے کمرے میں کئی جگہ جمے ہوئے خون کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ یہ سنیاسی کی کٹی ہوئی زبان سے بہنے والا خون تھا۔ سپاہیوں کی اطلاع کے مطابق آنند پال نے تین دن کی بھوک اور پیاس کے بعد ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی تھی مگر اس کے چہرے پر اذیت و کرب کا ہلکا سا عکس تک نہیں تھا۔ موت کے خوف اور تکلیف سے اکثر چہرے بگڑ جاتے ہیں۔ مگر سنیاسی کا چہرہ مرنے کے بعد کچھ اور روشن ہو گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بچوں جیسی معصوم مسکراہٹ تھی اور آنکھیں نیم باز تھیں۔ جیسے آنند پال کسی کا انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گیا ہو۔

اس دوران رانی پدمنی خاموش کھڑی' سنیاسی آنند پال کے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی اچانک اس کی آنکھوں سے حیرت اور بے چینی جھلکنے لگی۔ "سمراٹ! آپ فضول باتوں میں وقت برباد کر رہے ہیں۔ اس دیوار کو دیکھئے جس پر ہمارا دشمن اپنی آخری تحریر چھوڑ گیا ہے۔"

پدمنی کی آواز سن کر راجہ رتن سنگھ اور رام دیو چونک اٹھے ان کی نظریں بیک وقت اس دیوار کی طرف اٹھ گئیں تھیں جدھر رانی پدمنی اشارہ کر رہی تھی۔

رام دیو نے بہ آواز بلند اس تحریر کو پڑھنا شروع کیا جسے سنیاسی آنند پال نے لوہے کی کسی نوکیلی چیز سے دیوار پر نقش کیا تھا۔

"اہل چتوڑ! میں تمہاری اس دنیا سے بہت دور جا رہا ہوں۔ جس میں ہوس' ظلم اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں۔ میں نے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک پتھر کے دیوتاؤں کی خدائی تسلیم نہیں کی۔ اس لئے مندر کے ایک کمرے میں محصور کر دیا گیا۔ تم نے مجھے اچھوت سمجھ لیا کہ میں راجہ رتن سنگھ کا معتوب تھا۔ اور اس

ریاکارمداری کے آگے اپنے سروں کو جھکا دیا جس کا نام رام دیو ہے۔ پھر اس وقت میری زبان کاٹ دی گئی جب میں نے سارے بتوں کو چھوڑ کر ایک اللہ کی بندگی اختیار کر لی۔ میں دروازے دروازے پھرا کہ تمہیں اشاروں میں اس عذاب کی خبر دوں جو کسی خونیں آندھی کی طرح چتوڑ پر منڈلا رہا ہے۔ مگر تم بدنصیب تھے کہ اپنے ہی جیسے ایک فانی انسان کے خوف سے گھروں کے کواڑ بند کر لئے۔ جب مکین اپنے مکانوں کا ایک ایک روزن بند کر دیں تو پھر حیات بخش تازہ ہوا کہاں سے آئے گی؟ مجھے معلوم ہے کہ ایک دن سیاہ رسم و رواج کے حبس میں تمہارا دم گھٹ جائے گا۔ تمہارا ایک جرم یہ بھی ہے کہ تم نے مجھ پر پانی بند کر دیا۔ کہنے والے کہیں گے کہ میں پیاس سے مر گیا لیکن ایسا نہیں ہے۔ بے شمار لوگ اس طرح بھی مرتے ہیں کہ ان کے منہ میں "گنگا جل" ہوتا ہے۔ پھر پانی کی کیا حیثیت ہے؟ میں تو اس اللہ کے حکم سے فنا ہوا جو اپنی ذات میں تنہا ہے۔ اگر تم مجھے پانی پلا دیتے تو شاید میرا پالن ہار (پالنے والا) تمہارے تالابوں' چشموں اور آبشاروں کو سرخ ہونے سے بچا لیتا مگر اب ایسا نہیں ہو گا۔ جس پانی کی ایک ایک بوند کو بچانے کے لئے تم نے میری بے کسی کا تماشا دیکھا' عنقریب وہ پانی تمہارے ہی خون سے سرخ ہو جائے گا۔ دلی سے آنے والوں کو کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ میرے بھائی ہیں' میرے بچے ہیں۔ ان کے جسم گھوڑوں کی پیٹھ تک پہنچ چکے ہیں بس لگاموں کو جنبش ہونے کی دیر ہے۔ پھر ان کے گھوڑوں کے سم تمہاری چٹانوں کے جگر چیر دیں گے۔ یہ "اراولی" پہاڑ اور "آبو" کی بلند چوٹیاں انہیں سجدے کریں گی پھر نہ تمہیں کہیں کوئی امان ملے گی اور نہ تمہارے دیوتاؤں کو۔ میں یہ سب کچھ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اللہ کی حجت پوری ہو جائے۔ وہ کسی کو بے خبری کے عالم میں نہیں پکڑتا۔ میں نے تمہیں خبر پہنچا دی۔ میرا کام ختم ہوا اب تمہاری ذمے داری یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی ادھر آئے تو راجہ رتن سنگھ تک میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ میں ہندو دھرم چھوڑ چکا ہوں اس لئے مجھے مرنے کے بعد آگ کے حوالے نہ کیا جائے۔ راجپوت سمراٹ کو چاہئے کہ وہ میری لاش کو گھوڑے کی پشت پر باندھ کر دلی روانہ کر دے۔ وہیں میرے تمام رشتے دار موجود ہیں وہ میرا انتم سنسکار (آخری رسوم) اپنی مرضی کے مطابق کر لیں گے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر میرا مردہ جسم راج دوت کے سپرد کر دیا جائے کہ مذہبی رشتے سے وہ میرا بیٹا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اللہ کے ماننے والوں کو دنیا سے کس طرح رخصت کیا جاتا ہے۔ پھر جب راج دوت میرا بے روح جسم حاصل کر لے تو اسے لازم ہے کہ وہ کوہ "آبو" پر مائی بھان متی کے مندر کے قریب میری لاش کو ٹھکانے لگا دے اور ایک باپ کی حیثیت سے اس پر میرا یہ قرض ہے کہ وہ میرے گناہوں کی بخشش کیلئے اللہ سے دعا کرتا رہے۔" اس کے بعد دیوار کا کچھ حصہ خالی تھا۔ اندازاً ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سنیاسی آنند پال نے یہ عبارت اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر تحریر کی ہے پھر جب وہ شدید کمزوری کے باعث کھڑا نہ رہ سکا تو زمین پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے دوبارہ لکھنا شروع کر دیا۔

"مجھے جو کچھ سہنا تھا سہ چکا۔ پھر بھی اہل چتوڑ کو آخری ہدایت دیتا ہوں کہ اگر میری وصیت سے روگردانی کی گئی اور میرے مردہ جسم کو چتا پر رکھ کر جلا دیا گیا تو میں نہیں جانتا کہ آسمان تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ ہو سکتا ہے کہ اس بڑے عذاب سے پہلے تم پر ایک اور عذاب نازل ہو جائے۔"

اس کے بعد عبارت ختم ہو گئی تھی مگر سنیاسی نے تین بار "اللہ" کا نام تحریر کیا تھا۔ دو شکلیں مکمل تھیں مگر تیسری مرتبہ لفظ نامکمل رہ گیا تھا اور درمیان سے ایک لکیر کھنچتی ہوئی نیچے کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ سنیاسی کے ہاتھ بے جان ہو چکے تھے۔ لوہے کا وہ ٹکڑا ابھی وہیں فرش پر پڑا تھا جس سے عبارت دیوار پر کندہ کی گئی تھی۔ خود سنیاسی کی لاش دروازے کے قریب پڑی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ آنند پال

نے اپنا آخری پیغام یا وصیت لکھنے سے پہلے دروازہ بند کر دیا تھا اور پھر مرنے سے پہلے وہ زمین پر گھسٹتا ہوا' سینے کے بل دروازے تک پہنچا تھا اور کواڑ کھول کر دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

رام دیو نے سنیاسی کی تحریر پڑھ کر راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کی جانب دیکھا وہ دونوں سکوت کے عالم میں کھڑے تھے اور ان کے چہروں پر وحشت برس رہی تھی۔

"اب کیا ہو گا مہاراج ؟" راجہ رتن سنگھ نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"سنیاسی کی لاش کو آگ کے حوالے کریں۔ دیوتاؤں کا قہر اسے پھونک کر رکھ دے گا۔ پھر سارے چتوڑ پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ آنند پال کتنا بڑا جھوٹا تھا۔" رام دیو کے ایک ایک لفظ سے سنگدلی ظاہر ہو رہی تھی۔

راجہ رتن سنگھ نے بظاہر رام دیو کی تجویز کو قبول کر لیا تھا لیکن ابھی اس کے دل میں ایک خلش سی باقی تھی۔ "مہاراج! ہمیں اس نازک صورت حال میں مہامنتری سے مشورہ طلب کرنا ہو گا۔ وکرم سنگھ کا روشن دماغ ہر آڑے وقت میں ریاست کے کام آیا ہے ایسے موقع پر مہامنتری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" راجہ رتن سنگھ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

☆......................☆......................☆

پھر جب مہامنتری وکرم سنگھ کو شاہی رتھ میں بٹھا کر کمبھ شیام کے مندر لایا گیا تو صورت حال کچھ الجھ گئی۔ وکرم سنگھ نے سنیاسی کی لاش دیکھی تو دل پکڑ کر رہ گیا۔ مہامنتری جانتا تھا کہ آنند پال پر جس قدر تشدد کیا جا رہا ہے' اس کا انجام دردناک موت کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ مگر جب موت مجسم ہو کر سامنے آئی تو وکرم سنگھ کے دل پر قیامت سی گزر گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سنیاسی تیسرے دن ہی پتھروں کی اس دنیا سے چلا جائے گا۔ "زبان کٹ جانے سے انسان کی موت واقع نہیں ہوتی۔" غمزدہ مہامنتری اپنے ڈوبے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ "پھر کیا راجہ رتن سنگھ نے دوسرا حکم جاری کر کے سنیاسی پر جینے کے تمام دروازے بند کر دیئے ؟"

وکرم سنگھ ابھی اپنے سوال کا جواب تلاش ہی کر رہا تھا کہ راجہ رتن سنگھ کی بارعب آواز گونجی۔ "وکرم سنگھ! یہ ہمارے دشمن کے ماتم کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمہارے دل میں ہمارے بدخواہوں کے لئے کچھ نرم گوشے موجود ہیں۔" بالآخر رتن سنگھ نے وہ بات کہہ ڈالی جس کی طرف رام دیو نے اشارہ کیا تھا۔

"نہیں سمراٹ! میں آپ کے دشمنوں کا خیر خواہ نہیں ہوں۔" وکرم سنگھ نے اپنی طرف بڑھنے والے طوفان کو روکنے کی کوشش کی اور وہ دل و دماغ کی بکھر جانے والی ساری قوتیں سمیٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"پھر یہ سب کچھ کیا ہے ؟" راجہ رتن سنگھ نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ "جب ہم نے مہاراج کے آشرم میں سنیاسی کی ناپاک زبان کاٹی تھی اس وقت تم شدت غم سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ اب یہ محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے آنند پال کو موت نہیں آئی خود تمہاری جان بدن سے نکل جانے والی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ دشمن کی ذلت و خواری پر تم جشنِ نشاط مناتے لیکن ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اگر تمہیں موقع میسر آجائے تو تم سنیاسی کے صدمۂ فراق میں گریہ وزاری کے ساتھ سینہ کوبی شروع کر دو۔"

"سمراٹ! یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔" وکرم سنگھ نے اس آفتِ ناگہانی کو ٹالنے کے لئے اپنا لہجہ بدل ڈالا۔ "اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میرے اعصاب بھی اتنے شکستہ ہیں کہ کوئی بھی غم برداشت نہیں ہوتا۔ میں آنند پال کو ایک گیانی ضرور مانتا تھا لیکن میں نے آج تک آپ کی وفاداری پر کسی شے کو ترجیح نہیں

دی۔"

راجہ رتن سنگھ' مہامنتری کی وضاحت سے تو مطمئن نہیں ہوا مگر رانی پدمنی کی بروقت مداخلت نے اسے راجپوت حکمراں کے غضب سے بچا لیا۔ "سمراٹ! یہ بات درست ہے۔ نرملا کی ماں کے دیہانت (انتقال) نے مہامنتری کی دنیا ہی بدل ڈالی ہے۔ شیر جیسا دل رکھنے والا اب کسی کا خون بہتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔"

"اپنی اس کمزوری پر قابو پاؤ وکرم سنگھ! کیا خبر تمہیں کل خون کا دریا دیکھنا پڑ جائے۔" راجہ رتن سنگھ کا غصہ تو ختم ہو گیا تھا مگر انداز گفتگو تحقیر آمیز تھا۔ "فی الحال تم اس پنچ انسان کی آخری دھمکی کا جائزہ لو جس کے غم نے تمہیں نڈھال کر دیا ہے۔" راجہ رتن سنگھ نے دیوار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پھر جب وکرم سنگھ نے سنیاسی آنند پال کی پتھر کے سینے پر رقم کی جانے والی تحریر پڑھی تو ان کا دل پگھل کر آنکھوں کے راستے باہر آنے لگا اور جسم اس قدر لرزا کہ وکرم سنگھ کو دوبارہ فرش پر بیٹھ جانا پڑا۔

"مہامنتری ؟ اپنے چہرے پر کہاں تک نقاب ڈالو گے ؟ تمہاری شخصیت کا ایک ایک زاویہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ تم راجپوت سمراٹ کے دشمن سے دلی ہمدردی رکھتے ہو۔"

وکرم سنگھ نے دوبارہ سنبھلنے کی کوشش کی۔ "مہاراج! یہ اس شخص پر الزام تراشی ہے جس کی ایک ایک سانس راجپوتوں کی عظیم روایات کے عشق میں بسر ہوئی ہے۔ مجھے سنیاسی آنند پال کی موت کا قلق نہیں۔" مہامنتری نے اپنے دل پر جبر کر کے یہ سنگین جھوٹ بولا۔ "میں تو اپنی جنم بھومی (مادر وطن) کی تباہی کے تصور ہی سے کانپ جاتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ سنیاسی کی پیش گوئی غلط ہے لیکن اگر وقت نے اسے حقیقت کا روپ دیدیا تو پھر کیا ہو گا ؟ سمراٹ میرے جذبات سے باخبر ہیں کہ میں چتوڑ کے شیشۂ وقار پر خوف یا رسوائی کا ایک ذرہ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔" وکرم سنگھ نے بڑے جرأت مندانہ لہجے میں عیار رام دیو کی تہمت کا جواب دیا۔

"وکرم سنگھ ہم نے تمہیں اس مشورے کے لئے طلب کیا ہے کہ سنیاسی کے مردہ جسم کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے ؟ ہندو رسم و رواج کے مطابق بھڑکتی ہوئی آگ کے حوالے کر دیں یا پھر آنند پال کی وصیت کا لحاظ رکھیں ؟"

بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ حالات وکرم سنگھ کو ایک بار پھر موت و زیست کے دوراہے پر لے آئے تھے۔ مہامنتری نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے لئے سلامتی کا راستہ منتخب کیا۔ "سمراٹ دونوں صورتوں پر مکمل اختیار رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ سلطان کا راج دوت' سنیاسی کی لاش کو اس کی وصیت کے مطابق آبو کی بلند چوٹی پر لے جا کر پتھروں کے نیچے دبا دے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہو گا کہ ہم سنیاسی کی دھمکیوں سے ڈر گئے۔" رتن سنگھ پھر چراغ پا ہو گیا۔ "اس طرح تو چتوڑ میں ایک رسم زندہ ہو جائے گی کہ جو بھی چاہے اپنے باپ دادا کے مذہبی دائرے کو توڑ کر نکل جائے۔ ہم اس گمراہی کے بیج کو پھوٹنے کیلئے سازگار موسم فراہم نہیں کریں گے۔ یہ بڑی شکست ہو گی۔"

وکرم سنگھ خاموش رہا اب وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو چکا تھا۔

"سنیاسی کو آگ میں جلنا ہی ہو گا۔" رام دیو نے مہامنتری کی طرف دیکھتے ہوئے نعرہ زنی کی۔

"بے شک! کسی انسان کا مقدر نہیں بدلا جا سکتا۔" ہواؤں کا رخ دیکھ کر وکرم سنگھ نے بھی اپنی زبان کو مصلحت کے سانچے میں ڈھال لیا۔

راجہ رتن سنگھ نے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "پہلے اس جھوٹی تحریر کو دیوار سے کھرچ دو اور پھر

دیوتاؤں کے ٹھکرائے ہوئے ایک ناشکر گزار انسان کو چتا پر رکھ کر پھونک ڈالو۔ ہم بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ بڑے عذاب سے پہلے چھوٹا عذاب کس طرح نازل ہوتا ہے۔"

چتوڑ کے فرمانروا کا حکم سنتے ہی سپاہیوں نے سنیاسی کی کندہ کی ہوئی عبارت کو مٹانا چاہا مگر نقوش گہرے تھے اس لئے سپاہی اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔

"اس پر سیاہی پھیر دو۔" سپاہیوں کی بے بسی دیکھ کر رتن سنگھ نے دوسرا حکم دیا۔ کچھ دیر بعد سنیاسی کی روشن تحریر کو کالے رنگ نے اس حد تک چھپا لیا کہ انسانی آنکھ اسے واضح طور پر پڑھنے سے قاصر تھی۔

پھر ایک مفلس انسان کی طرح سنیاسی کی چتا معمولی لکڑیوں سے سجائی گئی۔ اس کی لاش پر نہ خوشبودار پھول تھے اور نہ مہکا ہوا صندل کا پانی بس ایک گھٹیا درجے کا تیل جسے لکڑیوں پر چھڑک دیا گیا تھا۔ آگ لگانے کی رسم رام دیو نے ادا کی۔ جادوگر کا سیاہ ہاتھ بڑھا اور لکڑیوں میں آگ لگ گئی۔ شعلے آہستہ آہستہ بڑھتے گئے اور سنیاسی کا پورا جسم ان کی لپیٹ میں آ گیا۔ آگ نے اپنی فطرت کے تقاضے پورے کئے۔ سنیاسی کی ہڈیاں چٹخنے لگیں اور گوشت جلنے لگا۔ فضا ایک ناگوار بو سے بھر گئی۔ دھواں آسمان کی طرف بلند ہونے لگا اور پھر مندر کے باہر موجود تمام لوگوں نے محسوس کیا کہ سورج کی تیز دھوپ مدہم ہوتی جا رہی ہے۔ راجہ رتن سنگھ نے گھبرا کر رام دیو کی طرف دیکھا۔ جادوگر کے چہرے پر دہشت نمایاں تھی۔ ابھی وہ موسم کی تبدیلی کا راز سمجھ نہیں پایا تھا کہ دوپہر پر شام کا گمان ہونے لگا۔

"سمراٹ! راج محل واپس چلیں اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔" رام دیو نے چیخ کر کہا۔

پھر دوسرے ہی لمحے شاہی رتھ راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی، رام دیو اور وکرم سنگھ کو لے کر محل کی طرف لوٹ رہا تھا۔ ابھی اقتدار کی سواری اپنی پناہ گاہ تک پہنچنے نہیں پائی تھی کہ چاروں سمت گہری تاریکی پھیل گئی اور ہوا کے جھونکے دم بہ دم تیز ہونے لگے۔

رام دیو رتھ چلانے والے کو قہر آلود لہجے میں ڈانٹ رہا تھا۔

"تمام فاصلے چند لمحوں میں طے کر ڈالو۔"

ہاتھیوں جیسی جسامت رکھنے والے بیل تیز رفتاری سے پتھریلے راستے پر بھاگ رہے تھے اور ہواؤں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی جو آگے بیٹھے ہوئے تھے، ان کے چہروں پر دہشت برس رہی تھی۔ ایسے سنگین لمحات میں رانی پدمنی نے مڑ کر جادوگر رام دیو کی طرف دیکھا جو خود بھی بدحواسی کا شکار نظر آ رہا تھا۔

مہامنتری وکرم سنگھ بھی آنے والے طوفان سے خوفزدہ تھا مگر اس کے چہرے پر کبھی کبھی خوشی کی ایک لہر بھی ابھر آتی تھی۔ ایسی لہر جسے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ وکرم سنگھ کی یہ خوشی سنیاسی آنند پال سے ایک تعلقِ خاص کے سبب تھی۔ وہ سنیاسی کی موت پر زور و شور کے ساتھ نوحہ خوانی کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ جب آنند پال جیسے عظیم گیانی کا جنازہ اٹھے تو پورا چتوڑ امڈ آئے۔ ایک ایک گھر سے آہ و فغاں بلند ہو، ایک ایک چراغ بجھا دیا جائے اور پھر جب سنیاسی کی چتا میں آگ لگے تو اس کی تپش سے ہر سینہ جل اٹھے......... مگر یہ ایک فریبِ آرزو تھا، آسودہ تمناؤں کا طلسم تھا جسے وقت کے بے رحم ہاتھوں نے پارہ پارہ کر دیا تھا۔ سنیاسی جو پہلے ہی اربابِ اقتدار کا معتوب تھا، تبدیلیٔ مذہب کے بعد وہ چتوڑ کے ہندوؤں کے لئے سب سے زیادہ لعنت زدہ انسان بن گیا تھا۔

"کاش! یہ اندھیرا اتنا بڑھے کہ رام دیو کا پورا وجود تاریکی میں گم ہو جائے اور رتن سنگھ چتوڑ کی پہاڑیوں پر، گلیوں میں، کوچوں میں چیختا پھرے کہ اس نے ایک مہاپرش (مردِ عظیم) کو قتل کر دیا اور یہ طوفان

اسی سرکشی کا انجام ہے۔"

وکرم سنگھ سوچ رہا تھا اور شاہی رتھ ہواؤں سے الجھتا ہوا راج محل کی طرف جا رہا تھا۔ رتھ میں بیٹھنے والے چاروں افراد کو کئی بار ایسا محسوس ہوا جیسے تیز ہوائیں بیلوں کے جمے ہوئے قدموں کو اکھاڑ پھینکیں گی اور قیمتی ساز و سامان سے آراستہ سواری کسی گہرے کھڈ میں جا گرے گی۔ مگر یہ صرف اندیشے تھے جو ہواؤں کے زور کو دیکھتے ہوئے قائم کئے گئے تھے۔ رتھ کئی بار لڑکھڑایا، رانی پدمنی کی چیخیں ابھریں، راجہ رتن سنگھ کی زبان سے دعائیہ کلمات ادا ہوئے اور رام دیو کے نعرے گونجے.......... "جے جگ دیپے۔" (دنیا کے چلانے والے کا نام سربلند رہے) سب اپنے اپنے انداز میں چیخ رہے تھے۔ مگر وکرم سنگھ انتہائی پرسکون حالت میں بیٹھا تھا۔ اس کی تو خواہش ہی یہی تھی کہ بھیانک طوفان آئے اور آنند پال کی سچائیاں تمام چتوڑ والوں پر ظاہر ہو جائیں۔

پھر کسی نہ کسی طرح شاہی رتھ راج محل کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ وہاں ہر طرف ایک حشر سا برپا تھا۔ نشۂ اقتدار میں غرق رہنے والے لوگ چیخ چیخ کر اپنے دیوتاؤں کو پکار رہے تھے اور ان سے مدد مانگ رہے تھے کوئی "برہما" کو آواز دے رہا تھا، کوئی "شیو" کا نام لے رہا تھا، کسی کی زبان پر "شنکر" کا ذکر تھا، کسی کو "کرشن" کی ضرورت تھی، کوئی "رام" کا طلب گار تھا، کوئی "ہنومان" کے سامنے دامن پھیلائے ہوئے کھڑا تھا اور کسی نے قہر کی دیوی "درگا" کے آگے سر جھکا دیا تھا.......... مگر ہوا کے جھونکوں کی شدت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ پورے چتوڑ پر ایسا گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا کہ اس کے مقابل "اماوس کی رات" بھی ہیچ تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ محل کے ہر کمرے میں فانوس جلا دیئے گئے تھے اور کافوری شمعیں روشن کر دی گئی تھیں مگر پھر بھی ہر شے دھندلی نظر آ رہی تھی۔ محل سے باہر غریب عوام کی بستیوں پر کیسی تاریکی چھائی ہوئی تھی اس کا اندازہ کسی کو نہیں تھا۔

راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی، رام دیو اور مہامنتری وکرم سنگھ دربارِ خاص میں داخل ہوئے تو چتوڑ کے امراء اور سردار حیران و پریشان کھڑے ہوئے تھے۔ مسلح محافظ سپاہیوں کے چہروں پر انجانے خوف کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ راجہ رتن سنگھ نے اپنے درباریوں کو ہوش و حواس میں رہنے کی تلقین کی مگر راجپوت سرداروں پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ یہی کہتے رہے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں نہ ایسا اندھیرا دیکھا ہے اور نہ ایسی پرشور آندھی۔ راجہ رتن سنگھ کے حقیقی ماموں بلرام سنگھ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ آندھی نہیں، شاید چتوڑ پر دیوتاؤں کا قہر ٹوٹ رہا ہے۔

رتن سنگھ رشتے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بلرام سنگھ سے کچھ نہیں بولا۔ اس نے رام دیو کی طرف دیکھا۔

"مہاراج! آپ ہی اپنے ماننے والوں کو اس سیاہ آندھی کے بارے میں بتائیں"۔

رام دیو جوشِ اضطراب میں کھڑا ہوا اور بہ آوازِ بلند، اہلِ دربار کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "یہ کوئی اسادھارن (غیر معمولی) بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی ستاروں کی گردش ایک ایسے نقطے پر آ جاتی ہے جس سے موسم میں عجیب و غریب تغیرات رونما ہو جاتے ہیں۔ چاند گرہن کی رات کے بعد شنی (ستارہ زحل) اور منگل (ستارہ مریخ) میں مقابلے کی نظر قائم ہوئی ہے جس کے سبب فضاؤں میں انتشار برپا ہو گیا ہے۔ کل بارہ بجے دن جب یہ مکمل نظر ختم ہو گی تو اندھیرے خود بخود چھٹ جائیں گے اور ہواؤں کی سرکشی بادِ صبا کے نرم و لطیف جھونکوں میں بدل جائے گی"۔

رام دیو کی وضاحت سن کر راجہ رتن سنگھ کا ماموں بلرام سنگھ سرِ دربار کھڑا ہو گیا۔ "مہاراج! مجھے آپ کی پیش کردہ اس توجیہہ سے شدید اختلاف ہے، میں نے بھی چتوڑ کے ایک بڑے گیانی ست پال سے علم نجوم

پڑھا ہے۔ میں بھی ستاروں کی چالیں سمجھتا ہوں۔ اگر مریخ و زحل کے مقابلے کی وجہ سے یہ موسمی انقلاب آیا ہے تو پھر اہل دربار کو یہ بھی بتائیں کہ زحل کی سیاہی اور مریخ کی سرخی اتنی آسانی سے زائل نہیں ہوگی۔ یہ اندھیرے نئے گل کھلائیں گے اور یہ سرکش ہوائیں نئے حادثوں کو جنم دیں گی"۔

بلرام سنگھ کی بات سن کر رام دیو غصے سے کانپنے لگا۔ "سمراٹ! میں کچھ دن سے دیکھ رہا ہوں کہ ریاست کے معمولی انسان بھی میرے گیان کا مذاق اڑانے لگے ہیں۔ میں اپنی ریاضتوں کی یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر بلرام سنگھ کا گیان چتوڑ کو آفات و مصائب سے بچا سکتا ہے تو پھر میری ضرورت کہاں باقی رہتی ہے؟ میں اپنے آشرم میں جا رہا ہوں اور عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی آپ کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کروں گا"۔ رام دیو نے بڑی عیاری سے نیا ناٹک رچایا تھا۔

راجہ رتن سنگھ کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے خاندان کے ایک بزرگ کو سرِ دربار ڈانٹا تھا۔ "بلرام سنگھ! میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ تمہاری جہالت میری ریاست کے سب سے بڑے گیانی کو ناراض کر دے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تم سے راضی رہوں اور تم پر دربار کے دروازے کھلے رہیں تو مہاراج کے سامنے اپنے جہل کا اقرار کرو۔"

بوڑھے بلرام سنگھ نے اپنے احمق و نادان بھانجے کو ایک نظر دیکھا اور یہ کہتا ہوا دربار سے نکل گیا۔ "جو اہل علم ہیں وہ ان پڑھ لوگوں کا بھی مذاق نہیں اڑاتے۔ علم تو انسان کے صبر و ضبط اور ظرف و تحمل میں اضافہ کرتا ہے۔ بے شک! میں جاہل ہوں مگر ستاروں کے جن اثرات کا ذکر مہاراج نے کیا ہے' وہ یکسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ میں اس طرح جا رہا ہوں کہ پھر کبھی ادھر نہیں آؤں گا لیکن مہاراج کو صحیح صورتحال بتانا ہوگی کہ اس "اندھیرے اور آندھی" کے پیچھے کیا چھپا ہے؟ میں کسی بھی صورت میں ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ یہ آندھی چتوڑ پر کوئی ستم ڈھائے بغیر چپ چاپ گزر جائے گی"۔ بلرام سنگھ کے چہرے پر ناپسندیدگی کا غبار تھا اور اسی غبار کو لے کر وہ دربار سے نکل گیا۔

بلرام سنگھ کے جانے کے بعد رام دیو نے پرجوش لہجے میں کہا۔" میں رام دیو' ساحرِ اعظم کام دیو کا بیٹا' آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس آندھی کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ تاریکی بے حقیقت ہے اور پرشور ہوائیں اپنے اندر کوئی ضرر نہیں رکھتیں۔ آپ سب لوگ اطمینان سے اپنے گھروں میں آرام کریں۔" رام دیو کی تقریر نے اہل دربار کو مطمئن کر دیا تھا اور پھر چتوڑ کی یہ با اثر ہستیاں دربار سے نکل کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں۔ جادوگر رام دیو محل کی طویل راہداریاں طے کرتا ہوا اپنے آشرم کی طرف بڑھنے لگا۔ مہامنتری وکرم سنگھ دربار سے اٹھ کر اپنے مکان میں چلا گیا جو قلعے کے وسط میں آباد تھا.......... اور راجہ رتن سنگھ رانی پدمنی کو لے کر دربار سے ملحقہ اپنی آراستہ خواب گاہ میں آ گیا۔

☆..................☆..................☆

چتوڑ کے باسیوں کا خیال تھا کہ یہ سیاہ آندھی جو پچھلے برسوں میں آنے والی تمام آندھیوں سے مختلف تھی' کچھ دیر بعد دم توڑ دے گی مگر جب ہوا کے جھکڑوں نے طول کھینچا تو پوری ریاست پر خوف و دہشت کی حکمرانی نظر آنے لگی۔ لوگوں نے اپنے دروازوں اور کھڑکیوں کو سختی سے بند کر لیا تھا' لیکن ہر لمحے مکینوں کو گمان ہوتا تھا کہ ان کے در و دیوار تنکوں کی طرح اڑ جائیں گے۔ غریبوں کی بستیوں میں تمام بوڑھے' جوان' بچے اور عورتیں اپنے اپنے دیوتاؤں کے ساتھ رام دیو کو بھی مدد کے لئے پکار رہے تھے کہ وہ ان کا زندہ دیوتا تھا۔

اور زندہ دیوتا کا یہ حال تھا کہ وہ ہوا کے تھپیڑے کھاتا ہوا اپنے آشرم تک پہنچا تھا اور پھر بیک وقت کئی

داسیوں کو طلب کر کے اس نے اپنی تمام سانسیں شراب میں غرق کر دی تھیں۔ جب تک ہوش باقی رہے' رام دیو' سنیاسی آنند پال کو غلیظ گالیاں بکتا رہا۔

ہواؤں کی سرکشی بڑھتی رہی' راجہ رتن سنگھ بھی بار بار رانی پدمنی سے ساغرِ مئے طلب کر رہا تھا۔

"آپ کب تک پئیں گے؟" رانی پدمنی جھنجلاہٹ کا شکار ہو گئی تھی۔

"جب تک چتوڑ کے در و دیوار پر اجالا نہیں پھیل جاتا اور یہ دیوانی ہوائیں سکون کی زنجیریں نہیں پہن لیتیں"۔ شراب اور خوف و دہشت کے اثرات سے رتن سنگھ کی آواز کانپ رہی تھی۔

"مہاراج رام دیو تو کہہ رہے تھے کہ مریخ اور زحل کے مقابلے کی نظر کئی دن تک قائم رہے گی"۔ رانی پدمنی بھی ہراساں نظر آ رہی تھی۔ "اس طرح چار پانچ روز تک نہ اندھیرے چھٹیں گے اور نہ پاگل ہوائیں ٹھہریں گی۔"

"بھگوان جانے کہ اگلے پل کیا ہوگا؟" راجہ رتن سنگھ بہت شکستہ نظر آ رہا تھا۔

"بھگوان کیوں جانیں؟" پہلی بار رانی پدمنی کے لہجے میں ساحرِ اعظم کے خلاف بغاوت کا عکس نظر آیا تھا۔ "زمین و آسمان کے معاملات تو مہاراج کے سپرد ہیں' پھر وہی جان سکتے ہیں کہ آنے والی گھڑیاں کیا خبر لے کر آتی ہیں"؟

"مہارانی! تمہاری زبان سے یہ تلخ باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔" راجہ رتن سنگھ نے مخمور آنکھوں سے اپنی اس بیوی کی طرف دیکھا جس کی رعنائی شباب پر کسی آتش فشاں کا دھوکا ہوتا تھا۔ "میں نے تو صرف تمہاری خاطر رام دیو کو سر چڑھایا ہے کہ تم اس کے قدم چھوتی ہو"۔

رانی پدمنی سنبھل گئی کہ اسی کی وجہ سے رام دیو کو راج دربار میں غلبہ حاصل ہوا تھا۔ رانی پدمنی نے اپنے شوہر کو غلام بنانے کے لئے رام دیو سے بڑے بڑے جاپ اور منتر کرائے تھے' پھر جلد ہی ان کی کوششوں کے اثرات اس طرح ظاہر ہوئے تھے کہ رتن سنگھ جیسے مغرور اور سرکش حکمراں کو اپنی بیوی کی نازبرداری کے سوا کچھ یاد نہیں رہا تھا اب عالم سرمستی میں راجہ رتن سنگھ ان ہی گزری ہوئی باتوں کو دہرا رہا تھا۔

"میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ مجھے مہاراج کے گیان پر کوئی اعتراض ہے۔" رانی پدمنی نے کسی باہوش شاطر کی طرح نئی چال چلی۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ آپ مہاراج رام دیو کو بلائیں اور ان سے کہیں کہ اپنی شکتیوں کے ذریعے اس خوفناک فضا کو بدل ڈالیں۔"

"مہارانی! میں بڑے دکھ کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مہاراج کچھ نہیں کر سکتے۔" راجہ رتن سنگھ کی آواز بدستور لرز رہی تھی۔ "پہلے ہمیں سنیاسی کی بات پر یقین نہیں آیا تھا مگر اب محسوس ہوتا ہے جیسے آنند پال سچ کہتا تھا۔"

"کونسی بات؟" رانی پدمنی نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہ چاند گرہن کی رات' مہاراج رام دیو' آفریدی پر منتر آزماتے ہوئے اپنے ایک ہاتھ سے محروم ہو گئے تھے اور پھر ان کا وہ ہاتھ اسی وقت متحرک ہو سکا تھا جب انہوں نے راج دوت کے قدم چھوئے تھے۔ چتوڑ کا ساحرِ اعظم اپنے گیان کی شکتیوں سے سلطان کے خفیہ پیغام کو نہ پڑھ سکا' پھر وہ آسمان پر ہونے والے فیصلوں کو کس طرح روکے گا؟" یہ کہہ کر راجہ رتن سنگھ مایوس نظروں سے رانی پدمنی کی طرف دیکھنے لگا۔

"سمراٹ! دھیرج دھریں۔ اگر آپ نے اس وقت ہوش و حواس گنوائے تو پھر راجپوتوں کی عظیم شان سلطنت کا کیا ہوگا؟ آپ مہاراج کو طلب تو کریں۔ وہی کوئی اُپائے (ترکیب) سوچیں

گے۔ آخر وہ ساحرِ اعظم ہیں۔ ان کے ترکش میں دشمنوں کے لئے اب بھی کوئی نہ کوئی زہریلا تیر موجود ہوگا۔ "

" تم یہ کوشش بھی کر دیکھو، مجھے تو شراب کی ایک بوند کے برابر بھی توقع نہیں کہ مہاراج کچھ کر سکیں گے۔ " رتن سنگھ کی زبان بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔

پھر جب رانی پدمنی نے ایک پہرے دار سپاہی کے ذریعے رام دیو کو طلب کیا تو اسے مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ سپاہی بہت دیر میں زخمی حالت میں ناکام واپس آیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے گرد و غبار کے سبب پانی بہہ رہا تھا اور جسم پر جگہ جگہ زخموں کے نشان تھے۔

" ابھی جا کر مہامنتری وکرم سنگھ کو اطلاع دے کہ انہیں مہارانی یاد کر رہی ہے۔ " پدمنی کے الفاظ میں بھی وہی تندی تھی جس کا مظاہرہ سرکش ہوا کر رہی تھی۔

سپاہی لرزتے ہوئے قدموں سے وکرم سنگھ کے مکان کی طرف جانے لگا۔ عین اسی وقت مہامنتری اپنی بیٹی نرملا سے پرجوش لہجے میں کہہ رہا تھا.......... " میرا سنیاسی سچا ٹھہرا۔ اگر چتوڑ پر یہ عذاب نازل نہ ہوتا تو آنند پال جھوٹا قرار پاتا اور میری تمام عمر کی عقیدت رائیگاں جاتی "۔

" کیا آپ اس آندھی کو سنیاسی کے شراپ (بدعا) کا نتیجہ سمجھتے ہیں ؟ " نرملا نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

" یقیناً! سنیاسی نے یہی لکھا تھا کہ اگر اس کی لاش کو جلایا گیا تو قہرِ عظیم سے پہلے چتوڑ پر ایک اور عذاب نازل ہوگا۔ غور سے دیکھو! یہ عذاب نہیں تو اور کیا ہے ؟ "

" پتاجی! آپ اس عذاب سے خوش ہیں ؟ " نرملا نے اپنے باپ سے ایک عجیب سا سوال کر دیا تھا۔

" نہیں! میں اپنے وطن اور قوم کی تباہی پر خوش نہیں ہوں۔ مگر میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ تم نے سنیاسی کی دردناک موت اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی۔ بیٹی! تم نہیں جانتیں کہ وہ کیسی پیاس لے کر دنیا سے رخصت ہوا ہے۔ " یہ کہتے کہتے وکرم سنگھ رونے لگا اور پھر اس نے آہ و زاری کے ساتھ وہ داستانِ الم سنائی جو سنیاسی آنند پال نے " کمبھ شیام " کے مندر کی دیوار پر تحریر کی تھی۔

یہ واقعہ اس قدر اثر انگیز تھا کہ نرملا کی پلکیں بھی نم ہو گئیں۔ ابھی وہ اپنے مہربان باپ سے مزید کچھ دریافت کرنا چاہتی تھی کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔ وکرم سنگھ نے باہر آکر دیکھا تو اس کا ملازمِ خاص راجہ رتن سنگھ کا حکم سنا رہا تھا۔ مہامنتری نے پلٹ کر نرملا کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور تسلی دی کہ اسے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج تو ستمگروں اور ہوس کاروں کے حساب کا دن ہے۔ وہ جن کے دل بے داغ ہیں اور جن کے ہاتھ صاف ہیں، آج انہیں کسی غم کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ کہہ کر وکرم سنگھ اپنے مکان سے رخصت ہوا اور ایک مختصر سا فاصلہ طے کر کے راجہ رتن سنگھ کی خلوتِ خاص میں داخل ہو گیا۔

مہامنتری نے مودبانہ سلام پیش کر کے چتوڑ کے حکمرانوں کو اپنی آمد کا احساس دلایا۔ رتن سنگھ نے بمشکل تمام اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو کھولا اور ہاتھ کے اشارے سے مہامنتری کو اپنے قریب بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ " وکرم سنگھ! یہ کیا ہو رہا ہے ؟ "

" سمراٹ میں کچھ نہیں جانتا۔ " وکرم سنگھ کا لہجہ بے نیازانہ تھا۔ " نہ مجھے ستاروں کی چال کا علم ہے اور نہ میں جادوگری کا ہنر جانتا ہوں۔ مہاراج رام دیو آسمانوں کی بھی خبر رکھتے ہیں اور زمینوں کی بھی۔ " وکرم سنگھ نے بڑی ذہانت سے اپنے طنز کے نشتر رام دیو کے توانا جسم میں اتار دیئے تھے۔

" مہاراج کا ذکر نہ کرو کہ وہ آشرم کا دروازہ بند کئے کسی جاپ میں غرق ہوں گے مگر یہ سرکش ہوائیں ان کے منتروں کی زنجیر سے گرفتار ہونے والی نہیں۔ " کثرتِ خمار اور شدتِ خوف سے رتن سنگھ کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ " ہمیں سنیاسی کے جسم کو آفریدی کے حوالے کر دینا چاہئے تھا۔ "

وکرم سنگھ کے جواب دینے سے پہلے رانی پدمنی بول اٹھی۔ " سمراٹ نے جو کچھ کیا، ٹھیک کیا۔ میری ذلت و رسوائی کی پیش گوئی کرنے والے کا انجام اتنا ہی عبرتناک ہونا چاہئے تھا۔ "

یہ صورتِ حال دیکھ کر وکرم سنگھ نے اپنے لہجے کو وقت کی ضرورت اور مصلحت کے سانچے میں ڈھال لیا۔

" سمراٹ! جو قدم آپ کو اٹھانا تھا وہ اٹھا چکے ہیں۔ اب چتوڑ کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ کر گہری نیند سو جائیں۔ جو کچھ لکھا ہوگا وہ آئندہ چند گھنٹوں میں ظاہر ہو جائے گا۔ ابھی ہم فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ آندھی سنیاسی کی پیش گوئی کا نتیجہ ہے یا بقول مہاراج مریخ و زحل کے مقابلے کا انجام ؟ ہمیں صبح تک بہرحال انتظار کرنا ہوگا۔ "

☆..........................☆..........................☆

وہ رات اہلِ چتوڑ کے لئے قیامت کی سی رات تھی۔ بس کچھ عیش پرستوں نے حد سے زیادہ شراب پی کر بے ہوشی کی آغوش میں پناہ حاصل کی تھی ورنہ ریاست کا ہر شخص موت و زیست کی کشمکش کے دوران جاگ رہا تھا۔ رات کے ختم ہونے کا صحیح اندازہ تو نہیں ہو سکا لیکن جب سیاہی میں کچھ کمی واقع ہوئی تو قیاس کر لیا گیا کہ سورج نکل آیا ہے۔ راجہ رتن سنگھ کے اعصاب شراب کے اثر سے آزاد ہو چکے تھے اور وہ مہامنتری سے کہہ رہا تھا۔ " وکرم سنگھ! اٹھو، ہم خود چل کر مہاراج سے دریافت کریں کہ انہوں نے اس آفتِ ناگہانی کو ٹالنے کے لئے کیا کیا جتن کئے ہیں ؟ "

پھر راجپوت سمراٹ اور وکرم سنگھ سپاہیوں کے ایک دستے کے ساتھ راج محل سے باہر نکلے تو ہواؤں کا زور گھٹ گیا تھا اور تاریکی بھی اس قدر کم ہو گئی تھی کہ قریب سے دیکھنے کے بعد چیزوں کو ان کی اصلی شکل میں پہچانا جا سکتا تھا۔ رتن سنگھ کے منہ سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔ جیسے وہ ایک طویل عذاب سے نجات پا کر اپنے معمول کی زندگی کی طرف پلٹ رہا ہو۔ مگر اس وقت رتن سنگھ حیران رہ گیا جب اس نے آشرم کے دروازے کو زمین بوس پایا۔ سرکش ہواؤں نے فولاد اور پتھر کی اس مضبوط ترین پناہ گاہ کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ سپاہیوں نے ملبہ صاف کر کے اپنے حکمران کے آگے بڑھنے کے لئے راستہ بنایا۔ رتن سنگھ انتہائی خوف کی حالت میں احتیاط سے قدم رکھتا ہوا آشرم میں داخل ہوا تو اب کی بار اس کے منہ سے ایک اور تیز چیخ نکلی مگر یہ چیخ دہشت کی چیخ تھی۔ رام دیو کا خوبصورت آشرم ایک کھنڈر کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس کے تمام چیلوں کی کٹیائیں منہدم ہو چکی تھیں، اور چھوٹے شیطان اینٹوں کے ڈھیر میں دبے پڑے تھے۔ رتن سنگھ کے اشارے پر سپاہیوں نے جائزہ لیا تو تمام جادوگر شدید زخمی ہو کر مر چکے تھے۔ راجپوت سمراٹ نے گھبرا کر تالاب کی جانب دیکھا تو وہ پتھروں اور لکڑیوں سے بھر چکا تھا۔ رام دیو نے اپنے جادوئی عمل کے مقصد کیلئے جو جانور پالے تھے وہ بھی اس حادثے کی تاب نہ لا کر فنا ہو چکے تھے۔ رتن سنگھ سہمے ہوئے انداز میں آگے بڑھا تو ایک اور عبرتناک منظر اسے دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ رام دیو کا چالیس کمروں پر مشتمل عالی شان محل بھی ملبے کا ایک ڈھیر بن چکا تھا۔ رتن سنگھ نے شدتِ خوف سے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ وکرم سنگھ کے دل میں خوشی کی ایک لہر اٹھی تھی جسے اس نے اپنے سینے ہی میں دبا دیا۔

" سمراٹ! جلدی کریں! کہیں مہاراج بھی اس سنگباری کا شکار نہ ہو گئے ہوں۔ " وکرم سنگھ کی آواز میں مصنوعی لرزش تھی۔

اور جب کچھ دیر بعد ریاست کے تنومند سپاہیوں نے ملبہ صاف کیا تو بڑے دلخراش منظر آنکھوں کے سامنے ابھر آئے تھے۔ ہر کمرے میں ایک بے لباس لڑکی مردہ پائی گئی یہ سب کی سب رام دیو کی داسیاں تھیں۔ اب رتن سنگھ کو یقین ہو چلا تھا کہ مہاراج بھی کسی حادثے کا شکار ہو گئے.......... اور پھر ایسا ہی ہوا۔

جب رام دیو کے منہدم کمرے کو صاف کیا گیا تو وہاں موجود چار پانچ لڑکیاں تو مر چکی تھیں مگر رام دیو چند پتھروں کے نیچے دبا ہوا سسک رہا تھا۔ وہ بے ہوش تھا لیکن چلتی ہوئی سانسیں اس کی زندگی کا ثبوت فراہم کر رہی تھیں۔

"مہاراج کو جلدی باہر نکالو اور اسی وقت راج وید کے پاس لے چلو۔" رتن سنگھ جوش جذبات میں چیخا۔ آج اس کا روحانی پیشوا بڑی بے چارگی کی حالت میں تھا۔ سپاہیوں نے برق رفتاری سے کام لیا اور رام دیو کے شکستہ جسم کو اینٹوں اور پتھروں کے انبار سے باہر کھینچ لیا۔ پھر جیسے ہی راجہ رتن سنگھ اور وکرم سنگھ' رام دیو کے بے ہوش جسم کو لے کر راج محل کی طرف بڑھے' ہوائیں یک بہ یک تیز ہو گئیں اور اندھیرا پہلے کی طرح گہرا ہونے لگا۔

راج وید نے رام دیو کے جسم پر اپنی مسیحائی کے تمام نسخے آزما لئے پھر کہیں جا کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ راجہ رتن سنگھ کے چہرے پر خوشی کا گہرا عکس ابھر آیا اور اس نے گھبرا کر رام دیو سے پوچھا۔

"مہاراج! اب کیسی طبیعت ہے ؟"

"میری فکر چھوڑ دو اور چتوڑ کو بچانے کی کوشش کرو۔" رام دیو نے کراہتے ہوئے کہا۔ "چتوڑ کے دو دشمن ابھی اس دھرتی پر موجود ہیں۔ اسی وقت راج دوت کو قتل کر دو اور اس کا کٹا ہوا سر گنیش دیوتا کے قدموں میں ڈال دو۔ اس کے بعد کوہ آبو کے مندر پہنچ کر اس بوڑھی خبیث جادوگرنی مائی بھان متی کو بھی ہلاک کر ڈالو۔ وہ آنند پال کو اپنا بھائی کہتی ہے۔ آندھی کا یہ طوفان اسی ذلیل عورت کا لایا ہوا ہے۔ وہ بھی سنیاسی کی طرح اپنا مذہب بدل چکی ہے۔ جب تک یہ دونوں ملیچھ چتوڑ کی پاک دھرتی پر موجود رہیں گے' آندھی اسی طرح بڑھتی رہے گی۔ اگر آپ نے تاخیر کی تو پھر میں چتوڑ کی سلامتی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔" یہ کہہ کر رام دیو دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔

☆.................☆ ....☆

ایک بار پھر والئی چتوڑ کی عشرت گاہ میں خفیہ اجلاس ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس اجلاس میں رانی پدمنی بھی شامل ہو گئی تھی۔ راجہ رتن سنگھ نے کسی شکستہ دل عاشق کی طرح پھر شراب کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

"وکرم سنگھ! کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارا حکمراں کس اذیت میں مبتلا ہے ؟" رتن سنگھ کے لہجے میں غضب بھی تھا' نفرت بھی تھی اور احساس شکست بھی۔

"میں سمراٹ کی الجھن کو سمجھتا ہوں۔" وکرم سنگھ نے اپنے الفاظ کو ہمدردی اور غمگساری کی مصنوعی قبا پہناتے ہوئے کہا۔

"الجھن نہیں' عذاب کہو' کبھی ختم نہ ہونے والا عذاب۔" رتن سنگھ کسی شعلے کی طرح بھڑک اٹھا تھا۔ "جس دن سے یہ بدبخت سفیر چتوڑ میں داخل ہوا ہے اسی روز سے ریاست پر عذاب کے دھندلے بادل منڈلانا شروع ہو گئے تھے اور اب وہی بادل اتنے سیاہ ہو چکے ہیں کہ کسی کو کچھ نظر نہیں آتا۔ مہاراج ٹھیک ہی کہتے ہیں' اسے گنیش دیوتا کی بھینٹ چڑھا دو اور پھر اس بوڑھی جادوگرنی کے کھوکھلے جسم کو گھوڑوں سے باندھ کر چٹانوں پر کھینچو۔ اندھیرے کا یہ عذاب خود بخود فنا ہو جائے گا۔"

راجہ رتن سنگھ کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر وکرم سنگھ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ رام دیو کی شیطانی چال

رنگ لا رہی تھی اور چتوڑ کا فرمانروا اتنے بڑے حادثے کے بعد بھی اسی فریب و عیاری کا اسیر نظر آ رہا تھا۔ وکرم سنگھ کے سامنے تذبذب اور کشمکش کی ایک آہنی دیوار کھڑی تھی۔ مہامنتری اپنے جسم کو اس دیوار سے ٹکرانا نہیں چاہتا تھا مگر وقت کے پیچ و خم نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ ایک بار ہمت کر کے وہ اس دیوار کو گرا دے۔ بالآخر وکرم سنگھ نے اس جھجک پر قابو پا لیا جو اسے آج تک لب کشائی سے روکتی رہی تھی۔

"سمراٹ! میں مہاراج رام دیو کی روحانی عظمت پر طنز نہیں کر رہا ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کا گیان ہمارے کسی کام نہیں آیا۔" وکرم سنگھ کا لہجہ بہت سرد تھا۔

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو ؟" رتن سنگھ نے شرربار نظروں سے مہامنتری کی طرف دیکھا۔

"شاید اب وقت آ گیا ہے کہ راجپوتوں کی بے مثال طاقت کا مرکز مہاراج کے طلسمی حصار سے نکل جائے ورنہ یہ عظیم الشان سلطنت ان منتروں کی نذر ہو جائے گی جو ایک فریب کے سوا کچھ نہیں۔" وکرم سنگھ نے اپنی قوم سے رسم وفاداری نبھانے کے لئے وہ بات کہہ ڈالی تھی جو خود اس کی زندگی کے لئے خطرے کا ایک نشان بھی بن سکتی تھی۔

"کیا آپ اپنی بات کا مفہوم سمجھ رہے ہیں ؟" رانی پدمنی نے درمیان میں مداخلت کی۔ وہ ایک ذہین عورت ہونے کے باوجود رام دیو کی شان میں کسی حرف گستاخ کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

"ہاں مہارانی! تمہارے اس بوڑھے چچا نے بہت غور و فکر کے بعد ہی آج پہلی بار زبان کھولی ہے۔" وکرم سنگھ بہت زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ "مہاراج نے اپنی تمامتر جادوئی قوتیں آزما لیں مگر وہ دلی کے راج دوت پر قابو نہیں پا سکے۔ اگر ہم کچھ دیر کیلئے آفریدی کو جادوگر تسلیم کر لیں تو پھر ہمیں یہ بھی ماننا ہوگا کہ وہ مہاراج سے بڑا ساحر ہے۔"

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کے پاس وکرم سنگھ کی اس دلیل کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ دونوں شدید حیرت کے عالم میں مہامنتری کو دیکھے جا رہے تھے۔

"اور اگر ہم مہاراج کے بقول اس سیاہ آندھی کو مائی بھان متی کی ساحرانہ کرشمہ سازیوں کا نتیجہ سمجھ لیں تو پھر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔" وکرم سنگھ نے رام دیو کی قوتوں کو جھٹلانے کے لئے ایک اور دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔ "جو عورت کوہ آبو کی چوٹی پر بیٹھ کر چتوڑ کی فضاؤں کو زیر و زبر کر سکتی ہے' اسے قتل کرنے کے لئے کون جائے گا ؟" وکرم سنگھ کا سوال بڑا عجیب تھا۔

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کی حیرت بڑھتے بڑھتے دہشت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ان دونوں کے پاس مہامنتری کے اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں تھا۔

"سمراٹ! جو عورت ہواؤں کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی قدرت رکھتی ہے وہ کس طرح کسی انسان کو اپنے قریب پہنچنے دے گی۔" آہستہ آہستہ وکرم سنگھ کا لہجہ پرجوش ہوتا جا رہا تھا۔ "اور اس بات کی بھی کیا ضمانت ہے کہ مائی بھان متی کے قتل ہو جانے کے بعد کوئی دوسرا طوفان نہیں آئے گا۔" وکرم سنگھ جسے ریاست چتوڑ کا سب سے بڑا دماغ سمجھا جاتا تھا' آج اسی دماغ نے راجہ رتن سنگھ کے سامنے بیک وقت ایسے کئی سوال اٹھائے تھے جن کا جواب دینا بہت مشکل تھا۔

"پھر کیا ہوگا ؟" رانی پدمنی نے جھجکتے ہوئے اپنے سیاستداں چچا سے پوچھا۔ پہلی بار اس کی پتھریلی شخصیت میں ہلکی سی دراڑ پڑی تھی۔ اور سر پُرغرور میں پہلی مرتبہ معمولی سے جھکاؤ کا زاویہ نمایاں ہوا تھا۔

"مہاراج کی روحانی شخصیت کو سیاست کے دائرے سے خارج کر دیجئے۔" وکرم سنگھ کے لہجے نے ساحر اعظم سے مکمل بغاوت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ "مہاراج کا کسی مشورے میں شریک ہونا اور بات ہے مگر

جب ان کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ ”حکم“ کا درجہ اختیار کر لیتا ہے تو مسائل الجھ جاتے ہیں۔“

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے سکوت اختیار کر لیا تھا۔

”سمراٹ! میری گستاخی معاف کریں۔ اگر سنیاسی کی لاش علی عامر آفریدی کے حوالے کر دی جاتی تو اس میں کسی نقصان کا اندیشہ نہیں تھا۔“

”لیکن کہنے والوں کی زبان کون روکتا؟ اسے ہماری شکست سے تعبیر کیا جاتا اور پھر اہل چتوڑ کے پر سکون عقائد میں ایک ہلچل سی مچ جاتی۔“ راجہ رتن سنگھ نے جواباً کہا مگر اس کے لہجے میں تلخی نہیں تھی۔

”اس وقت کوئی ہلچل نہیں مچتی۔“ وکرم سنگھ نے راجہ رتن سنگھ کی دلیل کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت سب کچھ خاموشی سے ہو جاتا اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ چتوڑ میں ایک گوشہ نشیں انسان پر کیا گزر گئی۔ عام لوگوں کو تو سنیاسی کے عذاب کی کیفیت اس وقت معلوم ہوئی جب وہ اپنی زبان سے محروم ہو کر پیاس کی شدت میں ایک ایک قطرۂ آب کیلئے ترسا۔ چتوڑ کے باشندوں نے سنیاسی کو تالابوں اور چشموں پر جھکتے ہوئے دیکھا اور پھر ان کی آنکھوں نے یہ مناظر بھی محفوظ کر لئے کہ راجپوت سپاہی سنیاسی کو اس وقت پانی پینے سے روک دیتے تھے جب اس کے ہونٹ ذخیرۂ آب کے قریب پہنچ جاتے تھے۔ عوام آپ کے رعب و جلال کے خوف سے اپنی زبانیں نہیں کھولتے مگر ان کی آنکھوں میں ایک ایک نقش جم کر رہ گیا ہے کہ پانی کسے کہتے ہیں اور ایک معتوب انسان پر بھگوان کی یہ ارزاں نعمت کس طرح بند کی جاتی ہے؟“

”وکرم سنگھ! جو گزر گئی سو گزر گئی۔“ راجہ رتن سنگھ نے ایک اور لبریز جام سرخ اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”اب سوچو کہ ہمیں ان بلاخیز اندھیروں سے کس طرح نجات مل سکتی ہے؟“

”میرے نزدیک بس ایک ہی صورت ہے کہ آپ مائی بھان متی سے رابطہ قائم کریں۔“ وکرم سنگھ نے کسی جھجک کے بغیر کہا۔ ”سنیاسی آنند پال بھی مائی کا بہت احترام کرتے تھے۔ اب ان کے سوا چتوڑ میں اور کون رہ گیا ہے جو مستقبل کے رازوں کو منکشف کر سکے۔“

وکرم سنگھ کے مشورے پر راجہ رتن سنگھ بری طرح چونک اٹھا اور رانی پدمنی پیچ و تاب کھانے لگی۔ پھر اس سے برداشت نہ ہوا تو چیخ اٹھی۔ ”آپ سمراٹ کو ایک طوائف زادی کے سامنے دامن پھیلانے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ کیا اب راجپوتوں کی آن اس طرح نیلام ہوگی؟“

وکرم سنگھ نے اس الزام تراشی کے نشتر کو بڑی مشکل سے سینے پر روکا اور پھر بہت افسوسناک لہجے میں کہنے لگا۔ ”مہارانی! آپ شاید نہیں جانتیں کہ بھان متی کی ماں روپ متی کو راجپوت سردار نے دھوکا دیا تھا۔ روپ متی ایک غریب سپاہی کی بیٹی تھی اور راجپوت سردار اجیت سنگھ نے سیکڑوں قسمیں کھا کر بمل شاہ کے مندر میں بھگوان شنکر کو گواہ بناتے ہوئے روپ متی سے خفیہ شادی کر لی تھی۔ پھر جب زر پرست معاشرے میں جاہ و اقتدار کا سوال اٹھا تو اجیت سنگھ نے روپ متی کو پہچاننے سے انکار کر دیا اور غریب روپ متی کو اپنی عیش پرستیوں کی زندہ نشانی دے کر دوسرے راجپوت سردار کنور سنگھ کی نوخیز بیٹی سے شادی کر لی۔ روپ متی کے ماں باپ رسوائی کے خوف سے خودکشی کر کے مر گئے مگر وہ خود بھان متی کی پیدائش تک زندہ رہی۔ روپ متی بے گناہ تھی اس لئے اپنی سچائی ثابت کرنے کے لئے حالات سے جنگ کرتی رہی۔ مگر اجیت سنگھ کے ہاتھ بہت دراز تھے اس نے مستقبل کے کسی دعوے کے خوف سے روپ متی کو زہر دلوا دیا۔ اس وقت بھان متی کی عمر چھ سات سال تھی مرتے وقت ماں نے بیٹی کو سب کچھ بتا دیا تھا کہ اس بے رحم معاشرے کے ہاتھوں اس پر کیا گزری ہے اور آخری سسکیوں کے درمیان یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ اس

کے مرنے کے بعد وہ مندر کے نیک دل پجاری ست رام کی شرن (پناہ) میں چلی جائے۔ بے سہارا بھان متی مندر میں چلی گئی اور پجاری ست رام نے اپنی بیٹی سے زیادہ اس کی نگہداشت کی۔ بھان متی کے ذہن پر اس سنگین حادثے کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ وہ دنیا والوں سے شدید نفرت کرتی تھی اور یہ نفرت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی تھی جب مندر میں آنے والی اس سے بڑی عمر کی لڑکیاں بھان متی پر انگلیاں اٹھاتی تھیں کہ اس کا باپ نہیں ہے۔ ایسے نازک موقع پر پجاری ست رام اپنی بے لوث محبت دے کر اس کے معصوم ذہن کو غبار آلود ہونے سے بچانے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر زہر پھر زہر تھا۔ قطرہ قطرہ کانوں میں ٹپک کر دل کی طرف اترتا ہی رہا جن لوگوں کو بھان متی کا بچپن یاد ہے وہ اس کی گریہ وزاری کو بھی نہیں بھولیں گے۔ وہ دن رات دیوتاؤں سے اپنی ماں کا انصاف مانگتی تھی۔ پھر جب بھان متی کے ساتھ انصاف کیا گیا تو سردار اجیت سنگھ کی دوسری نوخیز بیوی آگ میں جل کر مر گئی۔ اس موقع پر لوگوں نے اجیت سنگھ کو بہت سمجھایا کہ وہ بھگوان سے ڈرے اور علی الاعلان اپنی بیٹی کو اس کے جائز حقوق دے دے۔ مگر وہ خاندانی غرور کے نشے میں یہی کہتا رہا کہ روپ متی جیسی عورتیں سرداروں کے محلات کی زینت بڑھانے کے لئے صرف داشتہ ہی بن سکتی ہیں 'ایک بیوی نہیں۔ اجیت سنگھ نے بڑا تکبر کیا تھا اور پھر جب کوڑھی ہو جانے کے سبب اسے تمام رشتے داروں نے بستی سے باہر نکال کر پھینک دیا تو وہ بھان متی ہی تھی جس نے دن رات اپنے باپ کی خدمت کی مگر اجیت سنگھ بڑا سفاک انسان تھا جب تک اس کی زبان بھی کوڑھ کے اثرات سے گل کر زمین پر نہیں گر گئی اس وقت تک بھان متی کی خدمات کے صلے میں کثیف و غلیظ گالیاں ہی دیتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن اس کے سارے اعضاء گل گئے اور وہ گوشت کا سرخ لوتھڑا بن کر رہ گیا پھر جب دستِ اجل نے اس کی جان سلب کی تو اجیت سنگھ کی آنکھوں میں گیدڑوں اور لومڑیوں جیسا خوف تھا اور پھر وہ خوفزدہ آنکھیں ہمیشہ کیلئے بجھ گئیں۔ ایسی عبرتناک فضا میں بھی بھان متی ہی کی ذات تھی جس نے اجیت سنگھ کا آخری کریا کرم کیا اور قصاب باپ کی چتا کو آگ لگائی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بھان متی اس طرح ریاست کے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتی تھی مگر بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہ مندر میں آنے والے کسی شخص کا منہ دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتی تھی۔ اسے انسانوں سے نفرت تھی اور پھر یہی نفرت بڑھتے بڑھتے دیوتاؤں کے خلاف نفرت میں تبدیل ہو گئی۔ وہ بچپن ہی سے کہا کرتی تھی کہ ایک دنیا کے اتنے مالک نہیں ہو سکتے پھر وہ ایک خدا کے دھیان میں گم ہو گئی اور اسے اتنا گیان حاصل ہو گیا کہ اگر کسی بڑے سے بڑے پنڈت کو بھی نگاہِ گرم سے دیکھ لیتی تو اس کے بدن میں آگ لگ جاتی۔ یہی وہ حادثہ تھا جس نے بھان متی کو جلال کا پیکر بنا دیا ہے۔ اب وہ کسی انسان سے ملنا بھی گوارہ نہیں کرتی اور لوگ خود بھی اس کے سامنے جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔“

”وہ کوئی بھی روپ دھار لے مگر ہم ایک طوائف زادی کے دروازے پر بھیک مانگنے نہیں جائیں گے۔ چاہے ریاست چتوڑ کا ایک ایک ستون ہوا میں اڑ جائے اور ہمارے زندہ جسم پتھروں کی چٹانوں میں دب کر ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جائیں۔“ یہ کہہ کر رانی پدمنی اپنی خواب گاہ میں چلی گئی اور راجہ رتن سنگھ اداس نظروں سے وکرم سنگھ کی طرف دیکھنے لگا۔

”سمراٹ! کبھی کبھی جنگ جیتنے کیلئے اپنی فوجیں پیچھے بھی ہٹانی پڑتی ہیں اور کبھی مناسب موقع کی تلاش میں دشمن سے دب کر بھی معاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ اسے ایک جنگی حکمت عملی ہی سمجھ لیجئے۔“ وکرم سنگھ نے راجہ چتوڑ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ رانی پدمنی کے حسن کا غلام تھا اس لئے اس مغرور عورت کی رضامندی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

جب صورت حال قابو میں نہ آسکی تو وکرم سنگھ نے اجازت طلب کرتے ہوئے کہا۔ ”اس ہنگامہ خیزی میں راج دوت سے بھی ملاقات نہیں ہوسکی ہے۔ میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ اٹھا اور طویل راہداری سے گزرتا ہوا آفریدی کے کمرے میں داخل ہوگیا۔

☆..................☆..................☆

مہامنتری ’سلطان کے راج دوت کا چہرہ دیکھتے ہی حیران رہ گیا۔ آفریدی کی سرخ و سفید رنگت ہلکی سیاہی میں تبدیل ہوگئی تھی۔ آنکھیں متورم تھیں جیسے وہ بہت دیر تک روتا رہا ہو۔ دو دن سے اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ وکرم سنگھ کو دیکھتے ہی چیخا۔

”سنیاسی! کہاں ہیں؟ مجھے ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں دیتا۔ تمہارے محافظ سپاہی کیسے سفاک ہیں۔ اب تم آئے ہو تو مجھے ڈھارس سی ہوئی ہے کہ شاید تمہاری زبانی سنیاسی کا کچھ حال معلوم ہوسکے۔“ آفریدی کی آنکھوں میں وحشت تھی اور لہجے میں ایک عجیب سا درد تھا۔

”سنیاسی آنندپال ٹھیک ہیں مگر انہیں تبدیلیٔ مذہب کے جرم میں حوالۂ زنداں کردیا گیا ہے۔“ وکرم سنگھ نے آفریدی کی بے قراری دیکھتے ہوئے جھوٹ بولنا ہی مناسب سمجھا۔

”نہیں! مہامنتری تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟“ آفریدی نے تیز آواز میں کہا۔ ”میں مسلسل تین راتوں سے سنیاسی کو خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کی زبان کاٹ دی گئی ہے اور وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ بیٹے میں دنیا سے جا رہا ہوں۔“ آفریدی کے بیان میں اس قدر خلش اور بے ساختگی تھی کہ مہامنتری وکرم سنگھ لرز کر رہ گیا۔

”مہامنتری! مجھ سے جھوٹ نہ بولئے کہ اس جھوٹ کے بڑے خوفناک نتائج برآمد ہوں گے۔ سنیاسی کا قتل کسی ہندو کا قتل نہیں ’ایک مسلمان کی ہلاکت ہے اور اس ہلاکت کا حساب پوری ریاست چتوڑ پر قرض ہے۔ خیر! میں تو اپنی زندگی سے مایوس ہوچکا ہوں لیکن میرے بعد آنے والے سنیاسی کے قتل کا انتقام اس طرح لیں گے کہ تاریخ ہند میں صرف راجپوتانے کا ذکر باقی رہ جائے گا اور زمین اپنا نشان تک کھو بیٹھے گی۔“ آفریدی کا لہجہ آتشِ فراق سے جل اٹھا تھا اور اس کی آنکھیں اشکبار ہوگئی تھیں۔

راج دوت کے جذبوں کا یہ الم انگیز مظاہرہ دیکھ کر خود وکرم سنگھ بھی رونے لگا تھا۔ ”بیٹے! تم نے تو اپنے دل کا غبار آنسوؤں سے دھو دیا۔ میں اس درد کو کہاں لے جاؤں جس کی شدت سے میرا سینہ دونیم ہوا جاتا ہے۔ تم کیوں نہیں سمجھتے کہ میں اس بھری ریاست میں سنیاسی کا تنہا عقیدت مند ہوں۔ تم نے خواب میں آنندپال کی شکستہ حالت دیکھی ہے اور میں تو خود اپنی جاگتی آنکھوں سے اسے مرتے اور پھر آگ میں جلتے دیکھ کر آرہا ہوں۔ صبر کرو! میں تمہارا ہمدرد ہوں۔“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ نے سنیاسی آنندپال کی زبان کاٹے جانے اور پھر مندر کی دیوار پر خوفناک تحریر لکھنے اور آخر میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجانے کے تمام واقعات آفریدی کو سناڈالے۔ یہ فسانۂ غم اتنا اذیت ناک تھا کہ آفریدی پاگل سا ہوگیا۔ وہ چیخ چیخ کر راجپوتوں کے اس نظامِ آمریت کو ذلیل کرنا چاہتا تھا مگر وکرم سنگھ کی عاجزانہ درخواست نے اسے اظہار غضب سے دور رکھا۔

”تم دو دن سے بھوکے ہو۔“ یکایک مہامنتری نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”میں اس غم میں دو مہینے بھی بھوکا رہ سکتا ہوں۔“ آفریدی کے ہونٹوں پر آگ روشن تھی۔

”تمہیں کچھ دن کیلئے اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھنا ہوگا۔ تمہارے لئے یہ اس شخص کی نصیحت ہے جس

سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔“ وکرم سنگھ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم مجھ بوڑھے انسان کی خوش گمانیوں کا بھرم رکھو گے اور ان لوگوں کے سامنے اپنی زبان کو ہرگز جنبش نہیں دو گے۔“ اتنا کہنے کے بعد وکرم سنگھ چلا گیا اور آفریدی نے دل پر جبر کر کے چند لقمے اپنے حلق سے اتارے مگر ایک لمحے کیلئے بھی وہ سنیاسی آنندپال کے منہ سے بہتے ہوئے خون کو فراموش نہ کرسکا۔

☆..................☆..................☆

دوسری رات بھی اسی طرح گزر گئی۔ اندھیرے ہر شے کو نگل گئے تھے اور سرکش ہواؤں نے راج محل کی بنیادیں تک ہلا کر رکھ دی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ابھی کچھ دیر میں بہترین صناعوں کی بنائی ہوئی یہ عمارت اپنا وجود کھو بیٹھے گی۔ اسی رات کوئی نصف شب کے قریب رانی پدمنی نے خواب دیکھا کہ وہ وحشی انسانوں کے ہجوم میں گھری ہوئی ہے۔ ان کے تیر اور نیزے پدمنی کے سرو سمن جیسے جسم میں پیوست ہوگئے ہیں۔ منظر اس قدر خوفناک تھا کہ رانی پدمنی چیختی ہوئی اٹھ بیٹھی اس کی جگر خراش چیخ سے راجہ رتن سنگھ نے بھی اپنی مخمور آنکھیں کھول دیں۔ پھر جب رانی پدمنی نے سمراٹ کو اپنا خواب سنایا تو رتن سنگھ لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہنے لگا۔

”یہ سیاہ طوفان مہاراج رام دیو کے منتروں سے نہیں رکے گا۔“

”ہمیں اپنی غرض کیلئے اس طوائف زادی کے دروازے پر بھی جانا ہوگا۔“ راجہ رتن سنگھ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”بس ایک بار یہ طوفان ٹل جائے پھر ہندو دھرم کی اس دشمن پر بھی چتوڑ کی زمین تنگ ہوجائے گی۔“ راجہ رتن سنگھ نے بڑی رازداری کے ساتھ پدمنی کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ سنیاسی آنندپال کی طرح مائی بھان متی کو بھی اس کے عبرتناک انجام تک پہنچا کر دم لے گا۔ پدمنی نے خاموشی اختیار کرلی۔

☆..................☆..................☆

یہ مسئلہ حل ہوا تو وکرم سنگھ کو دوبارہ طلب کیا گیا۔

”اس آندھی میں ”کوہ آبو“ کا دشوار ترین سفر کس طرح طے پائے گا؟“ راجہ رتن سنگھ کے چہرے پر خوف و ہراس کی ہلکی سی لہر نمایاں تھی۔

”ممکن ہے کہ آپ عام حالت میں باہر نکلتے تو یہ سرکش ہوائیں آپ کا راستہ روک لیتیں مگر اس وقت ہمارا سفر ایک نیک کام کیلئے ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس دشوار گزار راہ میں مائی بھان متی کا آشیرواد ہمیں حاصل رہے گا۔“

اب کی بار شاہی رتھ میں برق رفتار سیاہ گھوڑے جوڑے گئے۔ پھر جیسے ہی وہ رتھ راج محل کی حدود سے نکلا تو حکومت چتوڑ کے دونوں بااثر افراد کو اندازہ ہوگیا کہ پاگل ہوائیں کتنی بپھری ہوئی ہیں اور تاریکی کس قدر گہری ہے؟ کئی بار رتھ اس طرح ڈولنے لگا کہ اس کے سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں گر جانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا۔ اس قدر سنگین فضا میں وکرم سنگھ نے باآواز بلند پکارا۔

”مائی بھان متی! ہم تیرے مہمان ہیں ’اس کا لحاظ رہے۔“ وکرم سنگھ کے الفاظ کی گونج جیسے ہی ختم ہوئی ڈولتا ہوا شاہی رتھ متوازن ہوگیا۔ راجہ رتن سنگھ نے حیرت سے وکرم سنگھ کی طرف دیکھا مگر اس کے دل میں مائی بھان متی کیلئے اب بھی نفرت کی آگ جل رہی تھی۔

اب ان کا سفر ”بمل شاہ“ کے مندر کی طرف تھا۔ راجپوتانہ (راجستھان) کا پہاڑی سلسلہ اس علاقے کو قدرتی طور پر دو حصوں میں تقسیم کردیتا ہے۔ ایک مغربی اور دوسرا مشرقی حصہ۔ یہ تمام پہاڑی سلسلے

"اراولی" کے نام سے مشہور ہیں، یہ سلسلے "ایشان کونڑ" سے شروع ہو کر "نیترو جنہ کونڑ" تک چلے گئے ہیں (کونڑ سنسکرت زبان میں زاویے کو کہتے ہیں) یہ پہاڑ "اودے پور" "بانسواڑہ" اور "ڈونگر پور" میں نسبتاً چوڑے نظر آتے ہیں۔ اسی کوہسار کا ایک سلسلہ "مانڈل گڑھ" سے ہوتا ہوا "کوٹہ" "بوندی" اور "جھالاواڑ" تک پہنچ گیا ہے۔ "جودھپور" میں "اراولی" ایک مکمل پہاڑ کی مانند دکھائی دیتا ہے لیکن "جیسلمیر" میں یہی پہاڑ اونچے نیچے ٹیلوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

"اراولی" کے سلسلۂ کوہسار میں "آبو" سب سے زیادہ بلند مقام ہے۔ "ہندوؤں" اور "جینوں" کی مذہبی کتابوں میں "آبو" کی بہت زیادہ تعریف کی گئی ہے۔ اس مذہبی نقطۂ نظر سے ہٹ کر بھی "کوہ آبو" کو موجودہ دنیا میں ایک خوبصورت پہاڑی مقام کی حیثیت حاصل ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے مطابق کوہ آبو "زمانۂ قدیم میں رشیوں اور سنیاسیوں کی پناہ گاہ تھی پہلے پہلے یہاں گہرے کھڈ تھے۔ ان کھڈوں کے متعلق ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں بڑی دلچسپ روایتیں موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک بار کسی باشنشٹ نامی رشی کی گائے کھڈ میں گر گئی۔ اس نے اپنے دودھ سے کھڈ کو بھر دیا اور پھر تیر کر باہر نکل آئی۔ مگر خطرہ اپنی جگہ موجود تھا۔ باشنشٹ رشی نے اسی خطرے کے پیش نظر "ہمالیہ" پہاڑ سے درخواست کی کہ وہ کسی چھوٹے پربت کو بھیج کر ان تمام گڑھوں کو بھر ڈالے۔ "ہمالیہ" نے رشی کی درخواست قبول کرتے ہوئے اپنے بیٹے "نندوردھن" کو حکم دیا کہ وہ "آبو" کے تمام گہرے کھڈ بھر کر اسے ہموار کر دے نتیجتاً ایک سانپ "نندوردھن" کو اپنی پشت پر اٹھا کر وہاں لے آیا اور اس طرح آبو کی تمام ناہمواریاں دور کر دی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی "اربد" سانپ پہاڑ کے نیچے رہنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ آبو پہاڑ کو "اربداچل" یا "نندوردھن" بھی کہتے ہیں۔

آبو کا سب سے اونچا حصہ "گرو شکھر" کہلاتا ہے۔ جو سمندر کی سطح سے پانچ ہزار چھ سو پچاس فٹ اونچا ہے، یہاں "گرودتا کے قدم" "گوشالا" اور کمنڈل کنڈ وغیرہ ہندوؤں کیلئے مقامات مقدسہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ "کوہ آبو" کی مخصوص شہرت "دیل واڑا" کے جین مندروں کے باعث ہے۔ ان مندروں کی تعمیر بارہویں صدی عیسوی میں گجرات کے سیناپتی (سپہ سالار) تیج پال اور منتری واستوپال نے کرائی تھی۔ ان مندروں میں دستِ انسانی کی صناعی قابل دید ہے۔ نقاشی کا کام اس قدر باریکی سے کیا گیا ہے کہ چشمِ انسانی حیران رہ جاتی ہے۔ کہنے والے یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر تاج محل کے پس منظر میں ایک عورت کی جنوں رنگ محبت کارفرما نظر آتی ہے تو کوہ آبو کے جین مندروں کے در و دیوار پر بے پناہ مذہبی عقیدت کا عکس نظر آتا ہے۔

تیج پال اور واستوپال سے پہلے گجرات کے سولنکی راجہ بھیم دیو کے وزیر اور سپہ سالار "بمل شاہ" نے اپنے نام پر 1031ء میں ایک دلکش مندر تعمیر کرایا تھا۔ اس مندر میں سنگ مرمر کا استعمال کیا گیا ہے۔ مندر کی خاص مورتیوں کی آنکھوں میں بیش قیمت ہیرے آویزاں کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک مورتی مشہور سنیاسی آدی ناتھ کی ہے جو ہندوؤں میں پہلے تارک الدنیا مانے جاتے ہیں۔

مائی بھان متی "بمل شاہ" کے اسی مندر میں زمانۂ دراز سے مقیم تھی۔

کئی گھنٹوں کا طویل فاصلہ طے کر کے راجہ رتن سنگھ اور وکرم سنگھ مندر کی سیڑھیوں کے قریب پہنچے۔ وہاں جا کر یہ تلخ حقیقت ظاہر ہوئی کہ مائی بھان متی شب و روز اپنے کمرے میں بند رہتی ہیں اور وہ کسی سے ملاقات نہیں کرتیں۔ اگر کبھی کوئی غمزدہ عورت ملنے آ گئی تو اسے اپنے کمرے میں بلا لیتی ہیں ورنہ کسی مرد کا داخلہ قطعاً بند ہے۔ راجہ رتن سنگھ جو تباہ کار موسم کی سختیاں جھیلتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا، خدمت گار

عورت کا یہ جواب سن کر بہت مایوس ہوا۔ پھر بھی وکرم سنگھ نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ مائی بھان متی کی سیوا کرنے والی ایک عورت سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مائی سے کہنا کہ ان کا داس (غلام) وکرم سنگھ بڑی پریشانی کے عالم میں یہاں تک پہنچا ہے اور راجپوت سمراٹ رتن سنگھ بھی ان کے سلام کیلئے حاضر ہوئے ہیں۔" رتن سنگھ کو وکرم سنگھ کا یہ اظہار عقیدت گراں گزرا تھا مگر مہامنتری کی آنکھ کے اشارے نے رتن سنگھ کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

کچھ دیر بعد داسی نے باہر آ کر بتایا کہ دونوں مہمانوں کو مائی نے اندر بلایا ہے۔ وکرم سنگھ پر مائی کا جلال طاری تھا، اس لئے وہ کانپتے قدموں سے کمرے کے دروازے میں داخل ہوا۔ مگر رتن سنگھ پر حکومت کا نشہ غالب تھا، اس لئے سمراٹ کی رفتار میں کجی نمایاں تھی۔ جیسے ہی وہ دونوں اندر داخل ہوئے مائی کی پُر رعب آواز گونجی۔

"سمراٹ رتن سنگھ! تمہیں ایک طوائف کے دروازے پر آتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوئی۔" رتن سنگھ نے گھبرا کر دیکھا۔ مندر کے فرش پر ایک نوے سالہ بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ عمر کی زیادتی نے اس کی کمر جھکا دی تھی مگر سفید چہرے سے ایک روشنی سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ رتن سنگھ حیران و پریشان کھڑا تھا۔ یہ بات اس کی عقل سے بالاتر تھی کہ رانی پدمنی اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو کو مائی بھان متی نے کس طرح سن لیا تھا؟

"میں اس لئے آیا ہوں کہ پورا چتوڑ خوفناک طوفان کی لپیٹ میں ہے، اس بلا کو کسی طرح ٹال دیجئے کہ پرمیشور (خدا) کے ہزاروں بندوں کی جانوں کا سوال ہے۔" رتن سنگھ کے لہجے میں اب بھی اقتدار کی جھلک موجود تھی۔

"اور ان لوگوں کی جانوں کا حساب کون دے گا جنہیں تو اپنے اقتدار کی بھینٹ چڑھا چکا ہے؟" مائی بھان متی مسکرائی۔ "تجھے کب سے خدا کے بندوں کی حفاظت کا خیال رہنے لگا ہے، اور تیرے مہاراج رام دیو نے چتوڑ کی حفاظت کیلئے کچھ نہیں کیا؟" اچانک مائی کے لہجے سے آگ برسنے لگی تھی۔

رتن سنگھ کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ کسی پتھر کے مجسمے کی مانند ساکت کھڑا رہا۔

"تجھے یاد تو ہو گا کہ تیرے باپ راجہ سمر سنگھ نے میری ماں کے ساتھ کیسی ناانصافی کی تھی۔ اس نے اپنے عزیز اجیت سنگھ کو نردوش قرار دے کر میری ماں کے خلاف فیصلہ دے دیا تھا۔ تیرے باپ کے قانون نے میری بے گناہ ماں کو "داشتہ" کا لقب دے کر عدالت سے نکلوا دیا تھا۔ پھر جب روپ متی کو زہر دیا گیا تو تیری عدالت نے اسے سانپ کا زہر ثابت کر کے مجھے دوبارہ انصاف سے محروم کر دیا۔ اس قدر ناانصافی کے بعد تو مجھ سے سیاہ آندھی کے روکنے کی تدبیر پوچھنے آیا ہے؟ میں اپنی ذات پر ڈھائے جانے والے مظالم فراموش بھی کر دوں تو اپنے بھائی سنیاسی آنند پال کے غم کو کیسے بھلاؤں؟ تو نے اس کی زبان کاٹ کر پانی بھی بند کر دیا۔ اب اگر پورا چتوڑ بھی برباد ہو جائے تو مجھے کیا غم ہو گا؟ ہونے دو، جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے دو۔" مائی بھان متی پر جذب کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ "آنند پال کی لکھی ہوئی تحریر پر سیاہی پھیرتا ہے۔ آئینہ کیوں نہیں دیکھتا کہ تو نے خود اپنا منہ کالا کر لیا ہے۔ رتن سنگھ بڑا خون بہے گا، بڑی رسوائی ہو گی پھر تیرے اور تیری بیوی کے چہروں پر سیاہی مل جائے گی جسے دریائے گمبھیری کا سارا پانی بھی نہ دھو سکے گا۔"

"مائی! ہمارے حالِ زار پر رحم کرو۔ ہم نادان ہیں، آپ کی عظمت سے واقف نہیں۔" یہ کہتے ہوئے وکرم سنگھ، بھان متی کے قدموں پر جھک گیا۔

مائی نے وکرم سنگھ کے سر پر مشفقانہ انداز میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "تیرے ہی صدقے تو یہ بدکار حکمراں میرے دروازے تک پہنچ سکا ہے۔"

راجہ رتن سنگھ اندر ہی اندر سلگ رہا تھا مگر اس نے یکایک منافقانہ روش اختیار کی اور اپنا سر جھکا دیا۔

"مائی! میری رہنمائی کر کہ میں بھٹک گیا ہوں۔ مجھے اور میری حکومت کو اس سیاہ آندھی سے نجات دے۔" مصلحت نے رتن سنگھ کو بھیک مانگنے کا طریقہ سکھا دیا تھا۔

"اس آندھی کے گزر جانے سے بھی کیا ہوگا؟" مائی بھان متی زور سے ہنسی۔ "دوسری آندھی کی طرف دیکھ جو سب کچھ اڑا کر لے جائے گی۔"

"دوسری آندھی؟" رتن سنگھ لرز اٹھا۔

"ہاں! دلی سے آنے والی آندھی جس کے ایک شرر فشاں جھونکے کو تونے راج محل کے کمرے میں قید کر رکھا ہے۔" مائی نے علی عامر آفریدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سلطان کا راج دوت؟" رتن سنگھ نے چونک کر کہا۔

"ہاں! وہی راج دوت جو تجھے اس آندھی سے نجات دلا سکتا ہے۔" مائی بھان متی نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ "تیرے سارے دیوتا مل کر بھی اس آندھی کو نہیں روک سکتے۔ سنیاسی نے مرنے سے پہلے راج دوت کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ اگر کسی باپ پر ظلم ہو اور وہ دنیا میں نہ رہے تو پھر بیٹا ہی ظلم کرنے والوں کو معاف کر سکتا ہے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ اندھیرے کا یہ طوفان تھم جائے تو سنیاسی کے بیٹے سے رحم کی بھیک مانگ! وہ اگر چاہے تو کچھ دنوں کیلئے تجھے سلامتی کی بھیک دے سکتا ہے۔" مائی بھان متی نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

"اور دوسری آندھی؟" رتن سنگھ نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"اسے کوئی نہیں روک سکتا' وہ تیرا اور اہل چتوڑ کا مقدر ہے۔" یہ کہہ کر بھان متی نے منہ پھیر لیا جیسے اس کیلئے راجہ رتن سنگھ کا وجود ناقابل برداشت ہو۔

"مائی! میری ایک درخواست ہے کہ مجھے دوبارہ یہاں آنے کی اجازت دیدی جائے۔" راجہ رتن سنگھ اس قدر خوفزدہ ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"اس وقت تو اندھیرا ہے' تیری رعایا نے تجھے یہاں آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اگر دن کے اجالے میں آئے گا تو بدنام ہو جائے گا۔ طوائف زادی کے دروازے کے قریب سے گزر جانے والوں کے بھی لباس داغدار ہو جاتے ہیں' اور پھر تو تو اندر چلا آیا ہے۔ بس بہت ہو چکا۔ واپس جا اور راج دوت کی خوشامد کر ورنہ یہی آندھی تجھے اور تیرے اقتدار کو کھا جائے گی۔" مائی کے لہجے سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

ذلت ورسوائی کے باوجود رتن سنگھ کا عیار ذہن پوری طرح جاگ رہا تھا۔ راج دوت کے نام پر اس کے ذہن میں برق سی لہرا گئی تھی۔ رتن سنگھ نے گھبرا کر کہا۔ "مائی! بس اتنا اور بتا دے کہ راج دوت دلی سے کیا خفیہ پیغام لے کر آیا ہے۔" رتن سنگھ کی بے کسی قابل دید تھی۔

"اس پیغام کو سننے میں جلدی کر۔ اگر تاخیر ہو گئی تو پھر وہ پیغام بھی نہیں سن سکے گا۔" مائی بھان متی نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ "اس گنبد میں چیخ کا جواب صرف چیخ ہے' کوئی نغمہ جانفزا نہیں۔ راج دوت تیرے لئے وہ پیغام لے کر آیا ہے جس کی گونج ساری دنیا میں سنائی دے گی۔ وہ اس عورت کی خوبصورتی کا انعام ہوگا جو اپنی ہم جنسوں کو طوائف کہہ کر پکارتی ہے۔ وہ سلطان کا بھیجا ہوا ایک ایسا قیمتی تحفہ ہے جسے قبول کرنے کے بعد تیرے اقتدار میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔"

راجہ رتن سنگھ گھبراہٹ میں مائی بھان متی کے لہجے کی نشتریت کو محسوس نہیں کر سکا اور تیز رفتاری کے ساتھ مندر سے نکل کر شاہی رتھ میں سوار ہو گیا۔

مائی بھان متی کے انداز گفتگو نے اسے بڑا صدمہ پہنچایا تھا' کسی عورت کی روحانی قوت اپنی جگہ مگر رتن سنگھ' بھان متی کو ایک راجپوت سردار کی ناجائز اولاد ہی سمجھتا تھا۔ رتن سنگھ کو بڑا قلق تھا کہ وکرم سنگھ کی موجودگی میں اس کی تمام عظمتوں کو ایک عورت نے پامال کر ڈالا تھا اور وہ ایک مفلوج انسان کی مانند پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنی ذلت کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ رتن سنگھ کی نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مائی بھان متی نے اس کے باپ دادا کے صدیوں پرانے مذہب کی تحقیر کی تھی اور ساتھ ہی ساتھ یہ خوفناک پیش گوئی بھی کر دی تھی کہ دلی سے آنے والے ملیچھوں کے گھوڑوں کے سم چتوڑ کی سرزمین کو روند ڈالیں گے اور اس کا اقتدار ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے گا۔ رتن سنگھ نے عالم جبر میں یہ تمام باتیں سنی تھیں اور وہ کسی ایک حرف تحقیر کا بھی جواب نہ دے سکا تھا۔ رتن سنگھ کے سینے میں نفرت وغضب کی آگ سلگ رہی تھی اور وہ اس کے دھوئیں کو وکرم سنگھ کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر جب وہ اسی آگ میں سلگتا ہوا راج محل پہنچا تو رانی پدمنی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"کیا ہوا سمراٹ؟" پدمنی نے شوہر کے چہرے کا بگڑا ہوا رنگ دیکھ کر پوچھا۔

راجہ رتن سنگھ کچھ دیر تک خاموشی سے اس عورت کی طرف دیکھتا رہا جس کے توبہ شکن حسن نے بڑے بڑے فتنے کھڑے کر دیئے تھے۔ راجپوت سمراٹ کا دل چاہا کہ آج وہ پدمنی کے ساتھ کنیزوں جیسا سلوک کرے' اس کے سرو وسمن جیسے جسم پر تشدد کے نشانات ابھارے اور پھر اسے ذلیل کر کے اپنے عشرت کدے سے باہر نکال دے۔ مگر نفرت وقہر کا یہ رنگ بہت عارضی تھا۔ رتن سنگھ' رانی پدمنی کے سامنے خود کو اس ہرن کی طرح سمجھنے لگا جو شیر کے خونی پنجوں کی زد پر آکر دہشت سے سہم گیا ہو۔ رام دیو کی پوری ساحرانہ زندگی کا بس یہی کمال تھا کہ اس نے مختلف منتر آزما کر رتن سنگھ کو رانی پدمنی کا زرخرید غلام بنا دیا تھا۔

"آپ کا چہرہ بجھا بجھا کیوں ہے؟ کیا اس طوائف زادی کے پاس بھی اس آندھی کا کوئی حل نہیں۔" رانی پدمنی کی رعونت پھر لوٹ آئی تھی۔ "میں تو پہلے ہی اس کیلئے آمادہ نہیں تھی کہ آپ ایک زمانے بھر کی ٹھکرائی ہوئی عورت کے دروازے پر چتوڑ کی سلامتی کی بھیک مانگنے جائیں۔"

"بھگوان کیلئے اپنی زبان بند رکھو کہ اس بوڑھی جادوگرنی کو اس کمرے میں کی جانے والی باتوں کی بھی خبر ہو جاتی ہے' تم جذبوں کو اپنے دل میں قید رہنے دو کہ زبان کی کوئی جنبش ہمارے حق میں نہیں ہے۔" رتن سنگھ بری طرح سہما ہوا تھا۔

رانی پدمنی نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی اور راجہ رتن سنگھ اسے مائی بھان متی کی تمام باتیں جھوٹ کی رنگ آمیزی کے ساتھ سنانے لگا۔ رتن سنگھ نے چتوڑ کی تباہی کے تمام ذکر کو حذف کر دیا تھا اور رانی پدمنی کو صرف یہ خوشخبری دی تھی کہ اس آندھی کو راج دوت کے سوا کوئی نہیں روک سکتا۔ راج دوت کا نام سن کر غرور حسن لوٹ آیا تھا اور پدمنی کی پیشانی ان گنت لکیروں سے بھر گئی تھی۔

"راج دوت! ایک ادنیٰ انسان! ایک حقیر خادم! کیا ہمیں اس کے احسانات کا بھی بار اٹھانا پڑے گا؟"

☆..........☆..........☆

اب آفریدی کی آمادگی کا مسئلہ تھا۔ مہامنتری وکرم سنگھ اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ بہت اداس تھا۔ وکرم سنگھ کو دیکھتے ہی علی عامر بے اختیار بول اٹھا۔ "سنیاسی آنند پال رات بھی میرے خواب میں آئے

تھے۔"

"کیا کہہ رہے تھے ؟" وکرم سنگھ نے گھبرا کر رقت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"کہہ رہے تھے کہ میری خاک پریشان کر دی گئی۔ اب غبار اور دھوئیں کے سوا چتوڑ میں کیا رہ گیا ہے۔ اب تم بھی اپنے گھر چلے جاؤ۔" یہ کہتے کہتے علی عامر آبدیدہ ہو گیا تھا۔

"راج دوت! تم یقیناً عزت و احترام کے ساتھ اپنے گھر واپس جاؤ گے مگر ابھی تو تمہارا فریضۂ سفارت باقی ہے۔ کیا اس کی تکمیل کئے بغیر تم دلی لوٹ جانا پسند کرو گے ؟" وکرم سنگھ چتوڑ کو تباہی سے بچانے کے لئے آفریدی کے دل سے نفرت کا غبار دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"منصب سفارت کی تکمیل کے بغیر تو آفریدی 'آفریدی' نہیں رہ سکتا۔" علی عامر کا لہجہ پرجوش ہو گیا تھا۔ "مگر میں یہاں تنہا ہوں اور میری تنہائی سے بڑے ناجائز فائدے اٹھائے جا رہے ہیں کسی مہذب حکومت نے کسی غیر ملکی سفیر سے یہ وحشیانہ سلوک نہیں کیا ہو گا۔" آفریدی کی زبان پر حرفِ شکایت اس طرح آیا کہ وکرم سنگھ شرمسار نظر آنے لگا۔

"یہ آندھی سنیاسی آنند پال کی بددعاؤں کا نتیجہ ہے۔" وکرم سنگھ آہستہ آہستہ اپنا مدعا بیان کر رہا تھا۔ "سنیاسی نے مرنے سے پہلے تمہیں اپنا روحانی فرزند قرار دیا تھا۔ اب اگر باپ کسی ظلم کا شکار ہو جائے تو اس کے قتل کا دعویٰ کون کرے گا ؟" وکرم سنگھ نے بڑی ذہانت سے سوال کیا۔

"میں 'علی عامر آفریدی اور لاکھوں فرزندانِ توحید کہ جانے والا ا ہی میں سے ایک تھا۔" یکایک سوزِ دروں سے آفریدی کا چہرہ جل اٹھا تھا اور ہونٹوں سے تلخیوں کی بارش ہونے لگی تھی۔

"اور اگر سنیاسی کے قتل کی معافی کا سوال اٹھے تو اسے کون معاف کرے گا ؟" وکرم سنگھ نے بڑے تدبر کے ساتھ دوسرا سوال کیا۔

"پہلے تو یہ ممکن نہیں اور اگر بالفرض ایسا ہوا بھی تو معافی کے فرائض بھی پوری مسلمان قوم انجام دے گی۔" آفریدی بڑے بے باکانہ لہجے میں جواب دے رہا تھا۔

"تو پھر سنیاسی کے قتل کو معاف کر دو کہ اس طرح لاکھوں معصوم جانیں بچ جائیں گی۔" وکرم سنگھ کی گفتگو میں ابھی تک ابہام تھا۔

"مہامنتری! میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔" علی عامر حیران نظر آ رہا تھا۔

"یہ آندھی اس وقت تک نہیں ٹھہرے گی جب تک تم اپنے روحانی باپ کا خون معاف نہیں کرو گے۔" بالآخر مہامنتری وکرم سنگھ نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

آفریدی کچھ دیر تک خیالات میں گم رہا پھر طنز آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ "ہمارے مذہب میں آنکھ کا بدلہ آنکھ' کان کا بدلہ کان اور ناک کا بدلہ ناک ہے۔ رام دیو نے سنیاسی کا پورا جسم جلا ڈالا' اب انصاف یہی ہے کہ رام دیو کو بھی نذرِ آتش کر دیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سیاہ آندھی چند لمحوں میں رک جائے گی۔" علی عامر آفریدی نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

"آفریدی! میں جانتا ہوں کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔" وکرم سنگھ اچانک جذباتی ہو گیا تھا۔ "انصاف کے تقاضے یہی ہوتے ہیں مگر میں بھی تمہارے ایک بزرگ کی حیثیت سے درخواست کرتا ہوں کہ تم بے گناہ عوام کی خاطر اپنا طریقۂ انصاف بدل ڈالو۔" وکرم سنگھ کا انداز ایسا تھا جیسے اس نے آفریدی کے سامنے دامن پھیلا دیا ہو۔

"بے شک! چتوڑ کے عوام بے قصور ہیں مگر رام دیو کا گناہ ناقابلِ معافی ہے۔ میں اس کے کریہہ

جسم کو چتا کے شعلوں کے درمیان دیکھنا چاہتا ہوں۔" آفریدی کا لہجہ چٹانوں سے بھی زیادہ سخت ہو چکا تھا۔

"راجہ رتن سنگھ کسی صورت بھی مہاراج رام دیو کو تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔" وکرم سنگھ نے صورت حال کی نزاکت بیان کرتے ہوئے کہا۔

"تو میں بھی اپنے مطالبے سے باز نہیں آؤں گا۔" آفریدی بھی کسی پتھر کے ستون کی طرح جما ہوا تھا۔

"پھر کیا یہ سارے معصوم بچے' بے گناہ دوشیزائیں' بے قصور عورتیں' بوڑھے اور بیمار مرد زمین کی خوراک بن جائیں گے ؟" وکرم سنگھ نے انتہائی جذباتی لہجہ اختیار کر لیا تھا۔

آفریدی ایک بار پھر گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ اس کے چہرے پر شدید اذیت و کرب کے رنگ ابھر ابھر کر ڈوبنے لگے تھے۔ پھر سکوت کا یہ وقفہ طویل تر ہوتا چلا گیا۔

"آفریدی! میں بھی سنیاسی کا عقیدت مند ہوں اور ان ہی کے نام پر تم سے اہلِ چتوڑ کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔" شدتِ جذبات سے وکرم سنگھ کی آنکھیں چھلک اٹھی تھیں۔

آفریدی منتشر خیالات کی دنیا سے نکل آیا۔ "مہامنتری! آپ گواہ رہیں کہ میں اس وقت سنیاسی کے خون کا انتقام نہیں لے رہا ہوں مگر جب بھی مجھے موقع ملے گا میں یہ قرض ادا کروں گا۔"

☆.........☆.........☆

پھر وہ منظر بڑا عجیب تھا جب علی عامر آفریدی کو اس جگہ لے جایا گیا جہاں سنیاسی آنند پال کی لاش جلائی گئی تھی۔ وکرم سنگھ نے راجہ رتن سنگھ سے بھی چلنے کیلئے کہا تھا مگر وہ یہ کہہ کر گریز اختیار کر گیا کہ اسے وہاں جاتے ہوئے شرم محسوس ہو گی اور وہ ایک معمولی انسان کے احسان کا بوجھ اس طرح نہیں اٹھا سکے گا۔ اب شمشان میں وکرم سنگھ اور آفریدی کے سوا کوئی تیسرا فرد موجود نہیں تھا۔ اندھیرے کی وہی کیفیت تھی اور ہواؤں کے جھکڑ اسی انداز میں چل رہے تھے۔ آفریدی نے جھک کر اس جگہ کو دیکھا جہاں سنیاسی کے جسم کی راکھ کا ایک ذرہ بھی موجود نہیں تھا۔ سرکش آندھی مرنے والے کی ہر نشانی کو اڑا کر لے گئی تھی۔ صرف ایک سیاہ داغ تھا جو چتا کی لکڑیاں جلنے کے بعد زمین کے سینے پر نقش ہو گیا تھا۔ علی عامر آفریدی نے اس سیاہ نشان کو اس طرح چھوا جیسے وہ سنیاسی کی پیشانی کو چھو رہا ہو۔ بڑی جذباتی فضا تھی۔ آفریدی اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا اور بے اختیار رونے لگا۔ وکرم سنگھ بھی اس رقت انگیز منظر کی تاب نہ لا سکا اور اس کی آنکھیں بھی اشک برسانے لگیں۔

کچھ دیر بعد جب دل کا غبار آنسوؤں سے دھل گیا تو آفریدی نے آسمان کی طرف اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔

"اے خدا! میں اس شخص کو جانتا بھی نہ تھا کہ وہ تیرا نادیدہ پرستار تھا اور تیرے نام لیواؤں کا برسوں سے انتظار کر رہا تھا پھر جب اس نے تیری وحدانیت کا اقرار کیا تو دیوتاؤں کے بھجن گانے والوں نے اس کی زبان کاٹ دی اور اس کے ہونٹوں پر پانی کی بوند بوند کو حرام ٹھہرا دیا۔ وہ سنیاسی کی زبان سے بلند ہونے والی تیری تعریف کو برداشت نہیں کر سکے پھر ان کی سنگدلی ان پر ہوا کا عذاب لے آئی۔ مجھے تیرے ان بے شمار بندوں کا خیال ہے، جو سنیاسی کے قتل میں ملوث نہیں تھے۔ انہیں اس عذاب سے بچا لے کہ میں ایک روحانی فرزند کی حیثیت سے اپنے باپ کا خون اہلِ چتوڑ پر معاف کرتا ہوں۔ جادوگر رام دیو کا معاملہ تیرے سپرد کرتا ہوں کہ تو علیم و خبیر اور بڑا زبردست انتقام لینے والا ہے۔"

جیسے ہی علی عامر آفریدی کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے' آندھی کے جھونکوں میں کچھ اور شدت آ گئی۔ آفریدی نے تاریک تر فضا کو دیکھا اور پھر بڑے کربناک لہجے میں سنیاسی کی روح سے مخاطب ہوا۔

"بس اے جانِ بے قرار ٹھہر جا! کہ بے گناہ عورتیں اور معصوم بچے اس قہر کی زد میں آ گئے ہیں۔" اتنا کہنا تھا کہ ہوا کا زور ٹوٹنے لگا اور اندھیرا بتدریج کم ہوتا چلا گیا کچھ دیر بعد چتوڑ کی فضا معمول پر آ گئی تھی اور سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔

دو دن اور دو راتوں سے محصور لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے اور بے پناہ خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ علی عامر آفریدی بھی وکرم سنگھ کے ساتھ اپنے کمرے میں لوٹ آیا تھا۔ مہامنتری کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو تھے۔

"بیٹے! تم نے ریاست کے باشندوں کے سامنے میری لاج رکھ لی۔ آخر یہ میری رعایا ہیں۔ میں ان کی ہلاکت و بربادی کس طرح دیکھ سکتا تھا۔"

"جایئے آپ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کی وحشیانہ مسرتوں میں شریک ہو کر خود کو سرخرو کر لیجئے۔ جانے والا تو چلا گیا یہ رسن' یہ دار' کرو گے کیا؟" آفریدی کے لہجے میں سارے زمانے کی تلخیاں سمٹ آئی تھیں۔ اس نے اپنے چہرے کی وحشت اور دل کا درد چھپانے کے لئے منہ پھیر لیا تھا۔

وکرم سنگھ آگے بڑھا اور اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ علی عامر آفریدی کے کاندھے پر رکھ دیا۔ "راج دوت! تمہیں کیا خبر کہ یہ بوڑھا شخص کون ہے جسے وکرم سنگھ کہتے ہیں۔ خیر! تم بہت جلد پہچان جاؤ گے کہ میں راجہ رتن سنگھ کی وحشتوں میں شریک ہوں یا.........؟" وکرم سنگھ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔

☆..................☆..................☆

نرملا کماری بڑی حیرت سے اپنے باپ کی بیان کردہ تفصیلات سن رہی تھی۔ پھر جب وہ "دوسری آندھی" کے موضوع پر آیا تو اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور آنکھوں میں گہری اداسیاں کروٹیں لینے لگیں۔ "بیٹی! اب چتوڑ کے مستقبل کے بارے میں طے ہو چکا کہ 'تم' تم نہیں رہو گی اور 'ہم' ہم نہیں رہیں گے۔" شدت جذبات سے وکرم سنگھ کی آواز لرز رہی تھی۔ "جب دو بڑے انسان دیوار کے دوسری طرف ایک ہی منظر دیکھیں تو وہ آنکھوں کا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ میں نے سنیاسی کی بات پر شبہ نہیں کیا مگر ایک خود فریبی سی تھی کہ شاید آنے والا عذاب ٹل جائے۔ پھر مائی بھان متی نے بھی اسی قہر کی طرف اشارہ کر دیا تو چتوڑ کو کون بچا سکتا ہے؟"

"کیا آپ کی سیاست بھی اس مقام پر عاجز نظر آتی ہے؟" نرملا کماری اپنے باپ کو مایوس دیکھ کر خود بھی اداس ہو گئی تھی۔

"سیاست کچھ دیر کیلئے تلواروں کو شاخ گل تو بنا سکتی ہے مگر آسمان کے فیصلوں کو نہیں بدل سکتی۔" وکرم سنگھ کا لہجہ ڈوبتا جا رہا تھا۔ "راجہ رتن سنگھ نے بہت دیر کر دی۔ تمہاری مغرور بہن اور مہاراج رام دیو نے مسائل کو یہاں تک الجھا دیا کہ اب موت کی خونی انگلیاں ہی گرہ کشائی کر سکتی ہیں۔ زندگی کے تو ہاتھ بھی کٹ گئے اور ناخن بھی ٹوٹ چکے ہیں۔ پھر عقدے کو کون سلجھائے گا؟ کوئی بھی نہیں۔" وکرم سنگھ رونے لگا تھا۔ "کاش! پہلے دن ہی کسی نے میری بات سن لی ہوتی۔"

"پھر کیا ہوتا؟" نرملا کماری باپ کو اس طرح روتا دیکھ کر بے قرار ہو گئی۔

"شاید یہ خطرہ ٹل جاتا۔" آنسوؤں کی نمی سے وکرم سنگھ کی آواز بھی بجھتی جا رہی تھی۔ "سنیاسی

آنند پال کو بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا' ایک عظیم عورت طوائف زادی قرار پائی اور سلطان علاءالدین خلجی جیسے طاقتور حکمراں کے راج دوت کو مسلسل ذلیل کیا جا رہا ہے۔ آخر ہمارا کونسا عمل ایسا ہے جو ہمیں تباہی و رسوائی سے بچا سکتا ہے؟" یہ کہتے کہتے وکرم سنگھ کے لہجے سے غصے اور جھنجلاہٹ کا اظہار ہونے لگا تھا۔

"آپ کے خیال میں ہندو دھرم کے باغیوں کو معاف کر دیا جاتا۔" نرملا نے حیران ہو کر اپنے باپ سے عجیب انداز میں پوچھا۔

"کیسا دھرم اور کیسے باغی؟" وکرم سنگھ یکایک بھڑک اٹھا تھا۔ "دھرم تو وہ ہے جسے بچاتے بچاتے مائی بھان متی نے سنسار کو تیاگ دیا اور جس کا دفاع کرتے کرتے سنیاسی نے موت کو گلے لگا لیا۔ دھرم وہ نہیں جس پر راجہ رتن سنگھ' رانی پدمنی اور رام دیو عمل کرتے ہیں۔ یہ تو پتھروں کا قانون ہے جسے نرم و نازک انسانوں کے دل و دماغ پر مسلط کر دیا گیا ہے۔" وکرم سنگھ کا ذہنی انقلاب مکمل ہو چکا تھا اور دل کی سرکشی نے زبان کو بھی باغی بنا دیا تھا۔

باپ کی باتیں سن کر نرملا کماری مبہوت ہو گئی تھی۔ "کیا آپ بھی آج تک غلط راستے پر چلتے رہے؟"

"ہاں! میں بھی گمراہی کا شکار تھا مگر سنیاسی نے اپنی جان کی قربانی دے کر مجھے اندھیروں کی دنیا سے باہر کھینچ لیا۔ اب میں روشنی میں کھڑا ہوں۔"

☆..................☆..................☆

چتوڑ کی زندگی معمول پر آ گئی تھی مگر علی عامر آفریدی کی زندگی میں نیا حشر برپا ہو گیا تھا۔ وہ چتوڑ کی سرزمین پر پہلی رات تھی جب اس نے اپنی والدہ شائستہ بیگم اور چھوٹی بہن عالیہ آفریدی کو خواب میں دیکھا۔ وہ دونوں ماں بیٹی ہانسی کے مکان کے ایک کمرے میں خاموش بیٹھی تھیں کہ اچانک عقب کی دیوار میں ایک شگاف پڑ گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس شگاف سے ایک دراز قامت سیاہ پوش انسان بر آمد ہوا۔ شائستہ بیگم اور عالیہ آفریدی اس سیاہ پوش کی موجودگی سے بے خبر تھیں۔ وہ سیاہ پوش دبے قدموں ان کی طرف بڑھا۔ فاصلہ آہستہ آہستہ سمٹ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ سیاہ پوش ان کے قریب آ گیا۔ ناگہاں شائستہ بیگم نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر چاروں طرف دھواں پھیل گیا۔ دھواں اس قدر گہرا تھا کہ انسانی آنکھ کو کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ بس شائستہ بیگم اور عالیہ کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ علی عامر شدت خوف سے جاگ گیا اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کچھ لمحوں بعد جب نیند کا خمار ٹوٹا اور گرد و پیش کی دھندلی چیزیں صاف نظر آنے لگیں تو اسے احساس ہوا کہ وہ محض ایک خواب تھا۔ آفریدی نے اطمینان کا سانس لیا مگر یہ اطمینان عارضی تھا۔ علی عامر نے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے تو اسے خواب کی ہولناکیوں کا اندازہ ہوا سر سے لے کر پاؤں تک آفریدی کا پورا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ پریشان خیالات تھے یا حقیقت؟ آفریدی اس کا فیصلہ نہیں کر سکا۔ اس نے ساری رات جاگ کر گزار دی۔ علی عامر کو ماں اور بہن سے بچھڑے ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ روز و شب کے دائرے میں اس مختصر سے وقت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی مگر جب آفریدی نے ایک سیاہ پوش کو شائستہ بیگم اور عالیہ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا اور پھر ان کی چیخیں گونجنے لگیں تو اسے احساس ہوا کہ تیس دن نہیں' تیس صدیاں گزر گئی ہیں۔ ایک بار یادوں کا غبار اٹھا تو ذہن بے شمار وسوسوں سے بھر گیا......... یہ خواب مستقبل کے کس خطرے کی علامت ہے؟ سلطان اس کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے؟ دربار شاہی میں ملک کافور کی محبوبیت اور فتنہ انگیزیوں کا کیا حال ہو گا؟ اس کے پیچھے رقاصہ زہرہ جمال پر کیا گزری ہو گی؟ ان گنت سوال تھے جو آفریدی کے ذہن پر مسلسل یلغار

کر رہے تھے۔ اس نے یادوں کی آگ سے دامن کو بچانے کی بہت کوشش کی مگر شعلے تھے کہ رات بھر لپکتے ہی رہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی اس کی پلکیں نہ جھپک سکیں۔ آفریدی چاہتا تھا کہ رات کے اندھیرے اسی وقت چھٹ جائیں اور صبح ہوتے ہی وہ اپنے سفارتی فرائض انجام دے کر دلی واپس چلا جائے۔ اس دہشت ناک خواب نے آفریدی کو عجیب سے کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆..........☆..........☆

پھر جب صبح ہوئی اور سورج "اراولی" کی چٹانوں سے اتر کر چتوڑ کے میدانوں میں پھیل گیا تو مہامنتری وکرم سنگھ، علی عامر آفریدی سے ملنے کیلئے اس کے کمرے میں آیا۔

"سنیاسی آنند پال بھی قتل ہو چکے، آندھی بھی تھم چکی اور مجھ گناہ گار پر بھی رام دیو مشق ستم کر چکا۔ آخر اب اقتدار کا اور کونسا مشغلہ باقی ہے۔" آفریدی کی زبان پر حرفِ شکایت بھی تھا اور گہرا طنز بھی............

"اب مجھے اور کتنے دن بدترین قیدیوں جیسی زندگی بسر کرنی ہوگی؟"

وکرم سنگھ نے آفریدی کے بگڑے ہوئے تیوروں کو شدت سے محسوس کیا اور اس جذباتی نوجوان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "اب تمہارے لئے فضا ہموار ہو چکی ہے۔ ریاست کے عوام تو اس راز سے بے خبر ہیں کہ وہ خوفناک آندھی کیوں آئی تھی اور پھر کس کے اشارے پر رک گئی؟ مگر راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی جانتے ہیں کہ اس بلا کو ٹالنے میں پس پردہ تمہارا ہاتھ حرکت کر رہا ہے۔" وکرم سنگھ سیاست کے خاص لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ "اب راجپوت سمراٹ تمہیں زیادہ دن تک ایک کمرے میں محصور نہیں رکھ سکتا۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ نے سرگوشی کے انداز میں علی عامر آفریدی کو تمام واقعات سنا دیئے۔ یہ اپنائیت کا پہلا قدم تھا جو مہامنتری کی طرف سے علی عامر کی طرف بڑھا تھا۔

آفریدی نے شکر گزار نگاہوں سے وکرم سنگھ کی طرف دیکھا۔ "آفریدی! میں بھی تمہارا ہم سفر ہوں مگر میرا سفر آگ کا سفر ہے۔" یہ ایک بڑا اہم اشارہ تھا جس کی گہرائیوں پر آفریدی سوچتا رہا اور وکرم سنگھ کمرے سے نکل کر راج دربار میں چلا گیا۔

راجہ رتن سنگھ، مائی بھان متی کے اس طنزیہ جملے سے دھوکا کھا گیا تھا کہ سلطان کا پیغام سن کر اس کے عزت و وقار میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ بالآخر یہ طے پا گیا کہ راج دوت کو کل کسی وقت دربار عام میں پیش کر دیا جائے گا تاکہ دوسرے راجپوت سردار بھی سلطان کے پیغام کو سن لیں اور رانی پدمنی کے دامن پر شبہات کی جو گرد جم گئی ہے وہ دور ہو جائے۔

وکرم سنگھ بہت خوش تھا کہ عنقریب سیاسی پیچیدگیوں کا کوئی حل نکلنے والا تھا۔ فضا میں ٹھہراؤ سا پیدا ہو گیا تھا مگر رام دیو کے ہوش میں آتے ہی ایک بار پھر راج دربار میں کسی زلزلے کی پیش گوئی کی جا رہی تھی۔ رام دیو ابھی بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ اس کا پورا جسم پٹیوں سے جکڑا ہوا تھا لیکن حواس پوری طرح بحال ہو چکے تھے۔ ہوش میں آتے ہی اس نے اپنے نائب شیوا اور دوسرے چیلوں کے بارے میں دریافت کیا۔ پھر جب رام دیو کو یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ اس کے سارے پجاری مر چکے ہیں اور آشرم نیست و نابود ہو چکا ہے تو وہ کسی ذبح ہونے والے جانور کی طرح چیخا۔ اس نے مائی بھان متی اور علی عامر آفریدی کو غلیظ ترین گالیاں دیں اور پھر اپنے خدمت گاروں سے کہا کہ اسی وقت راجہ رتن سنگھ کو اطلاع دیں، مہاراج ان سے ملنا چاہتے ہیں۔

پھر جیسے ہی راجہ رتن سنگھ، رام دیو کی عیادت کیلئے حاضر ہوا تو اس فریب کار ساحر نے پہلا سوال یہی کیا۔

"آندھی رک چکی ہوگی؟"

رتن سنگھ نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ رام دیو چیخا............ "مجھے میرے گیان نے یہی خبر دی تھی کہ اگر اس پنچ عورت بھان متی اور راج دوت کو ایک ہی وقت میں قتل کر دیا جائے تو یہ آفتِ ناگہانی چتوڑ کے سر سے ٹل سکتی ہے۔ کیا سمراٹ نے ان دونوں راکششوں کو نرک میں پہنچا دیا۔" رام دیو نے راجہ رتن سنگھ سے بڑا خوفناک سوال کیا تھا۔ راجپوت سمراٹ ایک لمحے کیلئے سکتے میں آ گیا تھا مگر وکرم سنگھ نے فوراً ہی بگڑی ہوئی بات کو سنبھال لیا۔

"مہاراج کے حکم پر مائی بھان متی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ جیسے ہی اس کی گردن تن سے جدا ہوئی، سیاہ آندھی نے دم توڑ دیا۔ جب ایک شخص کے قتل سے عذاب ٹل گیا تو پھر دوسرے انسان کو ہلاک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" وکرم سنگھ نے اس قدر برجستہ جھوٹ بولا تھا کہ رام دیو کو اس کے بیان کی صداقت پر یقین آ گیا۔

"نہیں سمراٹ! دوسرے دشمن کو بھی قتل کرنا ضروری ہے۔" زخمی ہونے کے باوجود رام دیو کا لہجہ درندوں جیسا تھا۔

"اسے زندہ چھوڑ دینے میں ایک سیاسی مصلحت ہے۔" اب کی بار رتن سنگھ نے رام دیو کی بات کا جواب دیا تھا۔ "ہماری سیاسی مجبوریاں یہ ہیں کہ ہم ایک غیر ملکی سفیر کو قتل نہیں کر سکتے۔"

"اور سلطان کے اس سندیش کا کیا ہو گا جس کی وجہ سے میں نے ایک ماہ تک کٹھن جاپ کئے ہیں اور سخت ترین آزار جھیلے ہیں۔" رام دیو کی عیار فطرت کسی طرح بھی دم لینے کیلئے آمادہ نہیں تھی۔

"اس سندیش میں کچھ نہیں ہے۔ وہ محض ایک خیر سگالی کا پیغام ہے۔" رتن سنگھ نے زخمی ساحر اعظم کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔ "پیغام رسانی کی ایک مختصر سی سرکاری تقریب ادا ہو گی اور پھر راج دوت کو دلی روانہ کر دیا جائے گا۔"

"وہ تقریب میرے بغیر ادا نہیں ہو گی۔" رام دیو چیخ کر بولا۔ "مجھے چار آدمیوں کے کاندھوں پر اٹھا کر راج دربار میں لے چلنا۔ میرا گیان تو زخمی نہیں ہے۔" رام دیو کا غرور اپنے عروج پر تھا۔ اس نے اپنے چیلوں کی موت اور آشرم کی تباہی سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی تھی۔

راجہ رتن سنگھ اور مہامنتری وکرم سنگھ مجبوراً سر جھکائے چلے گئے اور پھر یہ خبر سارے چتوڑ میں عام ہو گئی کہ کل دلی کا سفیر، رانی پدمنی کے حضور سلطان کا پیغام پیش کرے گا۔

☆..........☆..........☆

وکرم سنگھ نے شام ہونے سے پہلے ہی علی عامر آفریدی کو یہ خبر پہنچا دی تھی کہ کل کا دن اس کی زندگی کا اہم ترین دن ہو گا۔ "آخر تمہیں ایک راجپوت سمراٹ کے دربار میں جانا ہے۔" وکرم سنگھ نے اسے احساس دلاتے ہوئے کہا۔

"سنیاسی آنند پال کے رشتے سے میں آپ کا احترام کرتا ہوں ورنہ ایوان خلجی کے سامنے ایک راجپوت حکمراں کے دربار کی حیثیت ہی کیا ہے۔" علی عامر نے آہستہ لہجے میں کہا۔ "جہاں آنکھیں فرش سے اوپر نہیں اٹھتیں اور اکثر بولنے والوں کی قوت گویائی سلب ہو جاتی ہے، میں اس دربار کا نمائندہ ہوں۔" آفریدی کی گفتگو میں اس قدر اعتماد تھا کہ مہامنتری وکرم سنگھ شرمسار نظر آنے لگا تھا۔

"میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔" مہامنتری نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "میں تو تمہیں اس محاذ پر بھی فاتح دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اپنے حکمراں کے خلاف۔" آفریدی نے غیر ارادی طور پر ایک چبھتا ہوا سوال کر دیا۔

"نہیں! سنیاسی آنند پال کے قاتلوں کے خلاف۔ " وکرم سنگھ نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "ستمگروں کے خلاف' جابروں اور پتھر کے پجاریوں کے خلاف۔ " یہ کہہ کر وکرم سنگھ چلا گیا۔ اور آفریدی ریاست چتوڑ کے اس وزیر اعظم کے بارے میں سوچنے لگا جس کا رویہ ایک طرف مشفقانہ تھا اور دوسری طرف ناقابل فہم۔

وہ رات چتوڑ کے حکمران طبقے کے لئے ایک عجیب رات تھی۔ اچانک رتن سنگھ کے منتشر ذہن میں ایک خوفناک تصور نے سر ابھارا۔ "کیا مجھے مہلت تو نہیں دی گئی ہے کہ میں مطمئن ہو جاؤں اور پھر اچانک مجھ پر رام دیو سے بھی زیادہ شدید عذاب نازل ہو جائے۔ " یہ روح کو پگھلا دینے والا خیال تھا۔ رتن سنگھ نے رانی پدمنی سے تو اپنے خدشات کا اظہار نہیں کیا مگر وحشت دل پر قابو پانے کے لئے تیز شراب کا سہارا لیا اور نرم و گداز بستر میں منہ چھپا کر سو گیا۔

رانی پدمنی جاگ رہی تھی اور اس کا مغرور ذہن ہر پریشانی سے آزاد تھا۔ مائی بھان متی کے انکشاف سے پہلے وہ اس سلسلے میں اکثر سلطان علاء الدین خلجی کی ذات کو نازیبا کلمات کا ہدف بناتی رہتی تھی کہ ایک مسلمان حکمران کے سبب راجپوت سرداروں کے درمیان اس کی شخصیت مشکوک بن کر رہ گئی تھی مگر جب راجہ رتن سنگھ نے مائی بھان متی کی پیش گوئی منتقل کی تھی کہ سلطان کا تحفہ قبول کرنے کے بعد اس کے اقتدار میں مزید اضافہ ہو جائے گا تو رانی پدمنی بہت زیادہ مطمئن نظر آنے لگی تھی۔ مائی بھان متی اس کے نزدیک ایک معتوب عورت تھی لیکن جب اس طوائف زادی نے پدمنی کو اچھی خبر فراہم کی تو پدمنی کی دلی نفرت میں تو کمی نہ آسکی لیکن نخوت و تکبر میں مزید اضافہ ہو گیا اور وہ خیالوں کی دنیا میں اپنے اقتدار کو وسیع تر ہوتا ہوا دیکھتی رہی۔ اس رات رانی پدمنی کے اطمینان کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ریاست چتوڑ کو ناقابل تسخیر سمجھتی تھی۔ پدمنی کے خیال میں اگر سلطان نے اسے جنگ کی دھمکی بھی دی تو وہ کسی پاگل کی چیخ کی طرح رائیگاں جائے گی۔ وہ ایک ذہین اور تعلیم یافتہ عورت تھی۔ سیاسی امور میں بھی اسے بڑا دخل تھا۔ اس لئے راجپوتانے (راجستھان) کی پوری تاریخ اس کے ذہن میں محفوظ تھی۔ پدمنی نے کچھ دیر کیلئے راجپوتوں کی ماضی کی تاریخ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اس نے عالم تصورات میں پرتھوی راج چوہان کو خون میں نہاتے ہوئے دیکھا' پھر وہ منظر بھی اس کی نگاہوں کے سامنے ابھر آیا کہ شہاب الدین غوری کے سپاہی پرتھوی راج کا سر کاٹ کر اجمیر کی قسمت پر ہمیشہ کیلئے مہر غلامی ثبت کر رہے تھے۔ اس خوں رنگ منظر کے احساس نے رانی پدمنی کے جسم کو پسینے میں غرق کر دیا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس کے ذہن میں راجپوت ہیم راج کا پیکر ابھر آیا جس نے بغاوت کر کے مسلمانوں سے اجمیر کا اقتدار چھین لیا تھا۔ اس تصور نے رانی پدمنی کو چند ساعتوں کے لئے سرشار کر دیا مگر یہ ساعتیں عارضی تھیں۔ رانی پدمنی نے اپنے ذہن کے پردے پر ایک اور مسلمان حکمران قطب الدین ایبک کے چہرے کو ابھرتے دیکھا۔ ایبک نے راجپوت ہیم راج کو ذلت آمیز شکست دے کر اس علاقے سے چوہانوں کے اقتدار کو ہمیشہ کیلئے ختم کر ڈالا۔ رانی پدمنی بڑے اضطراب کے عالم میں بستر پر کروٹیں لینے لگی۔ وہ راج محل کے ایک آراستہ کمرے میں موجود تھی لیکن اس کا منتشر ذہن ماضی کی شاہراہوں پر بھٹک رہا تھا۔ اچانک پدمنی کو "جالور" کا قلعہ یاد آگیا جس پر سلطان شمس الدین التمش نے یلغار کر کے راجہ اڈیسہ کو شکست فاش دی تھی اور اس راجپوت حکمران کو مسلم حکومت کا خراج گزار بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ ایک اور لرزہ خیز منظر تھا جس کی یادوں نے رانی پدمنی کو کچھ دیر کیلئے بے قرار کر دیا تھا پھر اس کی نظریں بھٹکتے بھٹکتے رنتھمبور کی طرف چلی گئیں۔ اس

قلعے پر سلطان شمس الدین التمش کے وزیر الغ خان (غیاث الدین بلبن) کا پرچم لہراتا دیکھ کر پدمنی کے سینے میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی تھی مگر یہ آگ فوراً ہی بجھ گئی کہ اسے ریاست چتوڑ کا قلعہ ناقابل تسخیر نظر آرہا تھا۔ رانی پدمنی کے دل میں احساسِ غرور پھر کروٹیں لینے لگا اور یہ بات اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی کہ اگر چتوڑ ناقابل تسخیر نہ ہوتا تو مسلمان حملہ آور اسے بھی پامال کئے بغیر چین سے نہیں بیٹھتے۔ ماضی اور حال کے تمام نشیب و فراز پر غور کرنے کے بعد رانی پدمنی خود کلامی کے انداز میں یہ کہتی ہوئی سو گئی۔

"چتوڑ کا ماضی' حال اور مستقبل آزادی کے سوا کچھ نہیں۔ " غرورِ حسن نے اسے بڑے رنگین خواب دکھائے تھے۔

اس رات اگر کچھ لوگ بیدار تھے تو ان کے خیالات میں انقلاب آچکا تھا۔ یہ جاگنے والے مہامنتری وکرم سنگھ اور اس کی بیٹی نرملا کماری تھی۔ دونوں خاموش تھے اور گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یکایک نرملا نے سکوت توڑا اور اپنے باپ سے پوچھنے لگی۔ "آپ کے خیال میں آنے والی صبح اہل چتوڑ کیلئے کیا پیغام لے کر آئے گی؟"

"وہ پیغام زیادہ خوشگوار نہیں ہو گا۔ " وکرم سنگھ نے بڑی ذہانت سے ایک ایک لفظ کا استعمال کیا تھا۔

"مائی بھان متی نے تو ایک اچھی پیش گوئی کی ہے۔ " نرملا نے راجہ رتن سنگھ کے دہرائے ہوئے الفاظ کو بنیاد بنا کر کہا۔

"یہ چتوڑ کی بدنصیبی ہے کہ رتن سنگھ' مائی بھان متی کے الفاظ کا صحیح مفہوم نہ سمجھ سکے۔ " وکرم سنگھ نے اشارتاً کہا۔ "اگر راجپوت سمراٹ مائی کے الفاظ کی گہرائی کو سمجھ لیتے تو ان کی نیندیں حرام ہو جاتیں اور رانی پدمنی کے شعلہ رنگ رخسار بجھ کر دھواں ہو جاتے۔ "

"کیا آپ کو اس صورت حال پر کوئی افسوس نہیں ہے؟" نرملا کماری نے ایک بار پھر وہی سوال کیا تھا جس سے اس کی روح کی بے چینی کا اظہار ہوتا تھا۔

"ہاں! اب میرا ان لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ ان کے دیوتا الگ ہیں اور میرا خدا الگ۔ " آج وکرم سنگھ نے اپنے دل کی بات صاف صاف کہہ دی تھی۔

نرملا کماری پہلے بھی باپ کی گفتگو سن کر حیران ہوتی رہی تھی مگر آج تو اس کی حیرت' وحشت میں بدل گئی تھی۔ "کیا پرکھوں کا تمام سرمایہ لٹ گیا اور کیا سارے دیوی دیوتا ٹوٹ کر بکھر گئے؟" نرملا کماری کا لہجہ بہت اداس تھا۔

"دیوتا ٹوٹنے ہی کیلئے بنائے جاتے ہیں۔ پتھر کے مجسمے موسم کی زیادہ سختیاں برداشت نہیں کر سکتے۔ " مہامنتری وکرم سنگھ کے لہجے میں بڑی جارحیت تھی۔

"تو پھر آپ دیوتاؤں سے بےوفائی کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے؟" نرملا کے لہجے میں ہلکی سی سختی نمایاں ہو گئی تھی۔ "اپنے عقائد کو سینے میں چھپا کر زندہ رہنا راجپوتوں کی شان نہیں۔ "

"حقیقت کی آگ کو برداشت کرنا اس سے بڑی بہادری ہے۔ " وکرم سنگھ نے اپنی ذہین بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے کئی بار اپنے عقائد کا اعلان کر کے نئے راستے پر جانا چاہا مگر ہر مرتبہ تمہاری معصوم یادوں نے میرا دامن پکڑ لیا۔ " یکایک وکرم سنگھ کا لہجہ رقت آمیز ہو گیا تھا۔ "میں اپنی ہلاکت سے نہیں ڈرتا مگر مرنے کے بعد تمہاری تنہائی اور بے چارگی سے خوف آتا ہے۔ رام دیو کے ماننے والے تمہیں بہت آزار پہنچائیں گے۔ اگر چتوڑ کے حکمران مجھے تمہاری آبرومندانہ زندگی کی ضمانت دیدیں تو میں اسی

وقت سنیاسی آنند پال کے نقش قدم پر چلنے کیلئے تیار ہوں۔ "

"پھر کیا آپ دلی سے آنے والی ہواؤں کے ترجمان بن جائیں گے ؟" نرملا کے چہرے کی افسردگی زائل ہو چکی تھی مگر حیرت بدستور قائم تھی۔

"یقیناً۔" وکرم سنگھ نے پورے اعتماد سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کس چیز کا انتظار ہے ؟" نرملا کماری نے ایک اور مشکل سوال کر دیا تھا۔

"ان آنے والوں کا جو عورتوں کی عزت و ناموس کے محافظ ہیں۔" وکرم سنگھ نے بڑے اثر انگیز لہجے میں کہا۔

"وہ کب آئیں گے ؟" اب نرملا کماری بھی بے چین نظر آنے لگی تھی۔

"بس آیا ہی چاہتے ہیں۔ سنیاسی نے بھی یہی کہا تھا اور مائی بھان متی کی بھی یہ پیش گوئی ہے۔" یہ کہتے کہتے وکرم سنگھ کے چہرے کی چمک کچھ گہری ہو گئی تھی۔

"پھر جب وہ آجائیں گے تو میں تمہیں ان کے حوالے کر کے سنیاسی سے جاملوں گا۔ اب مجھ سے ان کی یہ جدائی برداشت نہیں ہوتی۔ ایک ایک لمحۂ فراق صدیوں کی طرح گزر رہا ہے۔" شدتِ جذبات میں وکرم سنگھ رونے لگا تھا۔

باپ کو اس قدر آزردہ دیکھ کر نرملا بھی رونے لگی تھی۔

"جب انسانی قہقہے اور خوشیاں ایک گھر میں سمٹ جاتے ہیں تو پوری بستی آہ و زاری میں مبتلا ہو جاتی ہے اور ایک ایک آنکھ اشک برسانے لگتی ہے۔" وکرم سنگھ انسانی مظالم کی تاریخ بیان کر رہا تھا۔ "اگر ہم نے یہ قہقہے اور خوشیاں برابر سے لوگوں میں تقسیم کر دی ہوتیں تو پھر وہ عذاب کبھی نہیں آتا۔ مگر اب اسے کون روک سکتا ہے کہ وقت گزر چکا اور مہلت ختم ہو چکی ہے۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ روشن فانوسوں، جگمگاتے قمقموں اور پگھلی ہوئی کافوری شمعوں کو دیکھنے لگا۔ "کون جانے کیسا اندھیرا ہے ؟"

مہامنتری کا کمرہ اداسیوں کا مقبرہ بن کر رہ گیا تھا۔ وکرم سنگھ نے بجھی بجھی فضاؤں کا اثر زائل کرنے کے لئے نرملا سے کہا۔ "بیٹی! اب سو جاؤ کہ آنے والی صبح ہمارے تمام اندیشوں کا خاتمہ کر دے گی اور ذہنوں پر چھایا ہوا غبار چھٹ جائے گا۔ "

باپ کا حکم سنتے ہی نرملا اپنے بستر پر دراز ہو گئی تمام روشنیاں گل کر دی گئیں مگر اندھیرے میں بھی اس کا ذہن برقی لہروں کا مرکز بنا ہوا تھا اور اس نامحرم مرد کے بارے میں مسلسل سوچ رہی تھی جس نے سنیاسی آنند پال سے اس کے عقائد چھین لئے تھے اور اب وہ وکرم سنگھ کو زیر کرتا ہوا خود اس کے اپنے دل و دماغ پر حملہ آور ہوا تھا۔

☆..................☆..................☆

مہامنتری وکرم سنگھ اور نرملا کماری کے ساتھ عامر آفریدی بھی اپنے کمرے میں جاگ رہا تھا۔ بار بار اس کی سماعت میں سلطان علاء الدین خلجی کا ایک ہی جملہ گونج رہا تھا۔

"آفریدی! حسن کی عدالت میں ہمارا مقدمہ تمہاری وکالت کے رحم و کرم پر ہوگا۔ "

سلطان کا یہ اعتماد بڑا عجیب اعتماد تھا اور سفارت کی ذمے داری تھی اور اسی اعتماد نے آفریدی کے دل میں اور جسم پر بڑے زخم سجائے تھے اور وہ ان ہی زخموں کو سجا کر سر بزم یار چلا جانا چاہتا تھا۔

اسی دوران سوچتے سوچتے کچھ دیر کیلئے علی عامر آفریدی کی آنکھ لگ گئی پلکیں جھپکتے ہی آفریدی نیند کی دنیا میں چلا گیا اور پھر اس کی بند آنکھوں کے سامنے ایک خواب روشن ہو گیا۔ آفریدی نے سنیاسی آنند پال کو

دیکھا اب اس کے منہ سے خون نہیں بہہ رہا تھا لیکن چہرے پر شدید اذیت و کرب کا رنگ نمایاں تھا۔ آفریدی نے سنیاسی سے حزن و ملال کی وجہ دریافت کرنا چاہی لیکن سنیاسی اس سے پہلے ہی بول اٹھا۔

"بیٹے! تو نے اچھا کیا کہ چتوڑ کے معصوم انسانوں کو بچا لیا۔ اس آگ کو تیرے سوا بجھانے والا کوئی نہیں تھا۔ تیری محبت نے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو راکھ بنا دیا اور سیاہ آندھی کو باد نسیم کے خوشگوار جھونکوں میں بدل ڈالا۔ بت پرستوں کی اس ریاست پر تیرا احسان ہے۔ مگر تو نہیں جانتا کہ یہ لوگ بہت ناشکرے ہیں۔ عنقریب تجھے بڑی اذیتیں پہنچنے والی ہیں۔ یہ فریب کار نئے نئے بہانے تراش کر تجھ پر حملہ آور ہوں گے۔ لیکن انہیں تجھ پر غلبہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ عظیم الشان فتح تیرا مقدر ہوگی مگر بڑی خونریزیوں کے بعد، بڑی رسوائیوں کے بعد، ثابت قدم رہنا کہ تو اہل ایمان کا عظیم وارث ہے۔" یہ کہہ کر سنیاسی آنند پال روپوش ہو گیا اور علی عامر آفریدی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

اب ایک اور نئی نادیدہ مصیبت اس کی منتظر تھی۔ آفریدی شدید حیرت و دہشت کے عالم میں بہت دیر تک سنیاسی کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ آنند پال کا خواب میں آنا بے سبب نہیں تھا۔ وہ جس خونریزی اور رسوائی کی طرف اشارہ کر رہا تھا اس کے بظاہر کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ آفریدی نے خونریزی کا یہی مفہوم لیا تھا کہ سلطان علاء الدین خلجی چتوڑ پر حملہ کرے گا جس کے نتیجے میں راجپوتوں کی سنگلاخ زمین انسانی خون سے نم ہو جائے گی۔ اور اس کے نزدیک رسوائی کا مطلب یہ تھا کہ راجہ رتن سنگھ یا رام دیو کوئی نئی چال چل کر اسے نئے انداز کی کوئی اذیت پہنچائیں گے۔ آفریدی کچھ دیر تک خواب کے اثرات سے پریشان رہا پھر اپنے ذہن سے تمام اندیشوں کو جھٹک کر آنے والی صبح کا انتظار کرنے لگا۔

☆..................☆..................☆

چتوڑ کی وہ صبح عام دنوں سے زیادہ روشن تھی مگر حکمراں طبقے کے ذہنوں پر ایک غبار سا چھایا ہوا تھا۔ اس کے برعکس آفریدی کے دل و دماغ پر سرشاری کی سی کیفیت طاری تھی۔ مہامنتری وکرم سنگھ خلاف معمول آج کچھ پہلے ہی آفریدی سے ملنے کے لئے آیا تھا اور اس نے سلطان کے سفیر کو مطلع کیا تھا کہ تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں اور اسے دوپہر سے پہلے راجپوت سمراٹ کے دربار میں پیش کر دیا جائے گا۔

ادھر علی عامر آفریدی، رانی پدمنی کے دربار میں حاضر ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا ادھر دلی میں علاء الدین خلجی کی بے قراریاں اپنے عروج پر تھیں۔ سلطان کے دن بے سکون اور راتیں بے خواب تھیں۔ شاہی محلات کے عیش پرور ہنگاموں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ہر شخص اپنے نفس کو مطمئن کرنے کے لئے کیف و نشاط کے ذرائع ڈھونڈ رہا تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ سلطان کی بیگمات محض اس لئے پریشان تھیں کہ علاء الدین خلجی ان کی نازبرداریوں سے بے نیاز ہو کر رانی پدمنی کے حسنِ سوزاں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اگر اس وقت چتوڑ کی خوبصورت حکمراں درمیان میں حائل نہ ہوتی تو سلطان کی کسی بیوی کو بھی ہوش نہ ہوتا کہ اس وقت علاء الدین کہاں ہے اور جذباتی طور پر کیا چاہتا ہے ؟ یہ تو صرف جذبۂ رقابت تھا جس نے بیگمات کو نرم اور مہکے ہوئے بستروں پر کروٹیں بدلنے کے لئے مجبور کر دیا تھا اور نہ سلطان کی کوئی بیوی بھی اس کی حقیقی غمگسار نہیں تھی۔ کسی شریک حیات کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس کا شوہر ایک باجبروت حکمراں ہوتے ہوئے بھی کس قدر خوفناک تنہائی کا شکار ہے۔ کئی بیویاں اور بے شمار کنیزیں ہونے کے باوجود علاء الدین خلجی خود کو اکیلا سمجھتا تھا اور اس تنہائی کے احساس کو پرورش کرنے میں بیگمات کی بے حسی کا بڑا ہاتھ تھا۔ سلطان اپنی بیگمات کو اعلیٰ ترین خطابات عطا کرتا تھا اور ان کے خالی دامنوں کو ہر روز نئی آسائشوں سے بھر دیتا تھا مگر خود اس کے اپنے دل کی دنیا ویران ہی رہتی تھی۔ وہ تسخیر عالم کے خواب دیکھتا

تھا اور بیگمات اپنے جسموں کو آراستہ کرکے آئینوں کے سامنے خودنمائی کرتی رہتی تھیں۔ وہ اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے منصوبے بناتا تھا اور بیگمات اپنے نااہل رشتے داروں کو نوازنے کے لئے نت نئی تقریبات منعقد کرتی رہتی تھیں۔ وہ اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے نئے محاذ کھولنے کی فکر میں غرق رہتا تھا اور بیگمات سلطان کیلئے خانگی انتشار کے نئے مورچے سنوارتی رہتی تھیں۔ یہی مایوسی اور محرومی علاءالدین خلجی کو ملک کافور جیسے نمک حرام غلام کی محبوبیت تک لے گئی تھی۔ پھر جب اس طرح بھی دل نہیں بہلا تو سلطان نے گھر کو آگ لگا کر تماشا دیکھنا چاہا۔ رانی پدمنی کی محبت ایک ایسا ہی حادثہ تھا جس نے علاءالدین خلجی کی ازدواجی زندگی کو نئے حادثات سے دوچار کر دیا تھا۔ اگرچہ چتوڑ کی تسخیر سلطان کی ایک سیاسی ضرورت تھی لیکن رانی پدمنی کے حصول کی خواہش کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ علاءالدین خلجی ابھی کچھ دن اور چتوڑ کی طرف متوجہ نہ ہوتا لیکن ایک برہمن راگھون چیتن کی دربار میں آمد نے تسخیر کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکا کر شعلہ بنا دیا تھا۔

راگھون چیتن کے بارے میں روایت ہے کہ وہ مختلف شہروں میں گھومتا ہوا چتوڑ پہنچا اور راجہ رتن سنگھ کے دربار میں داخل ہوگیا۔ برہمن ہونے کے ناتے سے راجہ رتن سنگھ راگھون چیتن کے ساتھ عزت واحترام کے ساتھ پیش آیا۔ دراصل راگھون ایک دوسرے درجے کا جادوگر تھا' مہاراج رام دیو نے اپنی ساحرانہ شکتیوں سے راگھون کے چہرے پر پڑا ہوا نقاب الٹ دیا اور راجہ رتن سنگھ کے سامنے یہ بات ثابت کر دی کہ راگھون چیتن کسی دشمن حکمراں کا جاسوس ہے جو مذہبی منتروں کی آڑ لے کر چتوڑ میں داخل ہوا ہے۔ جیسے ہی اسے ریاست کے قیمتی راز معلوم ہوجائیں گے۔ وہ چتوڑ چھوڑ کر چلا جائے گا۔ راجہ رتن سنگھ' رام دیو کے زیراثر تھا' اس لئے راگھون چیتن کی کوئی دلیل کام نہیں آئی۔ بالآخر راگھون چیتن کو ذلت ورسوائی کے ساتھ چتوڑ سے نکال دیا گیا۔ جانے سے پہلے ایک دن اتفاقاً اس نے رانی پدمنی کو بھی دیکھ لیا۔ راجستھان کی تاریخ لکھنے والے ہندو مصنفوں کا کہنا ہے کہ رانی پدمنی کا تابناک چہرہ دیکھ کر راگھون چیتن بے ہوش گیا تھا پھر جب اسے ہوش آیا تو وہ چتوڑ کی حدود سے نکل کر دلی پہنچا اور سلطان علاءالدین خلجی کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ علاءالدین کی یہ خوبی تھی کہ وہ ہر مذہب وملت کے باکمال لوگوں کی دل سے قدر کرتا تھا جس کے نتیجے میں اہل فن کی ایک بڑی جماعت سلطان کے گرد جمع رہتی تھی۔ راگھون چیتن کو بھی سلطان نے خوش آمدید کہا۔ پھر ایک دن تنہائی میسر آتے ہی راگھون چیتن نے سلطان کے سامنے رانی پدمنی کے غیرمعمولی حسن کا طویل قصیدہ پڑھا۔ سلطان ایک عورت کی صفات کا ذکر سن کر بہت زیادہ متاثر ہوا۔ چتوڑ کی تسخیر کے خواب میں رانی پدمنی کے حسن دلفریب نے نئے رنگ بھر دیئے تھے۔

راگھون چیتن دلی کے سلطان کو اکسا کر راجہ رتن سنگھ سے اپنی توہین کا انتقام لینا چاہتا تھا اور سلطان اس بات سے خوش تھا کہ ریاست کی فتح کے ساتھ ایک ایسی عورت بھی اس کے حرم میں داخل ہوجائے گی جو تو بہ شکن حسن کی بھی مالک ہے اور امور سیاست کی ماہر بھی۔ سلطان کی نظر میں چتوڑ دولت واقتدار کا ایک ذخیرہ تھا اور رانی پدمنی اس کا سود۔ بالآخر علاءالدین خلجی نے طے کرلیا کہ وہ کاروبار سیاست کے ساتھ کاروبار دل بھی جاری رکھے گا۔ اور اس کاروبار کو جاری رکھنے کے لئے اس نے علی عامر آفریدی کو اپنے سفیر خاص کی حیثیت سے چتوڑ روانہ کیا تھا اور جب ایک ماہ تک آفریدی کی کوئی خبر نہیں ملی تو سلطان مضطرب نظر آنے لگا۔ پھر یہ اضطراب اس حد تک بڑھا کہ علاءالدین خلجی کی راتیں بے خواب ہوگئیں۔ آفریدی کے بروقت واپس نہ آنے پر سلطان بہت زیادہ پریشان تھا۔ بالآخر اس الجھن کا کوئی حل تلاش کرنے کے لئے اس نے اپنے لائق ترین سپہ سالاروں حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی کو خلوت میں طلب کرلیا۔ وہ اس موقع پر اپنے

چھوٹے بھائی الغ خان سے بھی مشورہ کرنا چاہتا تھا مگر رانی پدمنی کا حوالہ علاءالدین اور الغ خان کے درمیان شرم وحیاء کی ایک دیوار بن گیا تھا۔ اسی رشتے کی نزاکت کے پیش نظر سلطان نے اپنے بہادر سپہ سالار الغ خان کو خصوصی مجلس مشاورت سے دور رکھا۔ پھر بھی ملک کافور وہاں موجود تھا کہ اس کے اور علاءالدین خلجی کے درمیان اس قسم کا کوئی حجاب باقی نہیں رہا تھا۔

جب دونوں امیر لشکر حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی خلوت خاص میں پہنچے تو سلطان بہت زیادہ اداس نظر آرہا تھا اور ملک کافور گردن جھکائے دست بستہ کھڑا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی کے سر خم ہوگئے تھے اور پھر جیسے ہی وہ فرمانروائے ہند کے نزدیک پہنچے' زمین بوس ہوکر شاہی آداب بجالائے۔ دونوں سپہ سالاروں کے سر سلطان کے روبرو سنگ مرمر کے فرش پر یوں ٹکے ہوئے تھے جیسے وہ سجدے کی حالت میں ہوں۔ یہی اس وقت شاہان ہند کے درباروں کی رسم احترام تھی۔

"اٹھو کہ تمہارا اسلام قبول کیا گیا۔" علاءالدین کی رعب دار آواز گونجی۔ مگر وہ اپنے لہجے کی افسردگی کو پوشیدہ نہ رکھ سکا۔

حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی کھڑے ہوگئے۔ خلجی فرمانروا نے اپنے جاں نثاروں کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس کی آنکھیں دھندلا گئی ہوں۔

"بیٹھ جاؤ۔" سلطان نے دونوں امیران سپاہ کو حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی ملک کافور کو بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی' علاءالدین خلجی کے عین سامنے ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئے۔ ملک کافور اپنی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے سلطان کے بائیں ہاتھ کی جانب ذرا آگے بڑھ کر بیٹھا۔ چند لمحوں کے لئے حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی کی سانسیں رک گئیں۔ ایک بدکردار غلام' تاجدار ہند کے اس قدر قریب بھی ہوسکتا ہے؟ یہ سوچ کر ان شہسواروں کے ذہن جل اٹھے تھے جن کے دم سے دنیا میں شمشیروسناں کی آبرو برقرار تھی۔ حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی جیسے شجاعان وقت نے اس صورت حال کو برداشت تو کرلیا مگر ان کی رگوں میں دوڑنے والا خون لو دے اٹھا تھا۔

"سلطان معظم!" حاجی خواجہ نے حضور شاہ اپنے ہونٹوں کو جنبش دی۔ "خدام اپنے آقا کی اس بے قراری کا سبب جاننے کے لئے بے چین ہیں۔ کیا ہماری کسی لغزش نے نمک خواری کا اعتبار کھو دیا؟ اگر ایسا ہے تو ہماری گردنوں میں طوق رسوائی ڈال دیجئے۔ پھر ہم خود ہی کوچہ در کوچہ گھوم کر آپ کی رعایا کو بتا دیں گے کہ اپنے فرائض سے غفلت برتنے والوں کا یہ انجام ہوتا ہے۔" حاجی خواجہ کی آواز سوز دروں سے لبریز تھی۔

"نہیں خواجہ۔" سلطان بے اختیار ہوکر بول اٹھا۔ "چشم فلک تمہاری جانفروشیوں کی گواہ ہے۔ تم سے کوئی کوتاہی سرزد نہیں ہوئی ہے تم بہترین فرض شناس ہو۔ میں علی عامر آفریدی کی وجہ سے پریشان ہوں۔ آج اسے چتوڑ کی طرف گئے ہوئے ایک ماہ گزر گیا۔ مگر اس طرح کہ نہ اس کی خبر آئی اور نہ راستے سے کوئی غبار اٹھا۔ میرا سفیر کدھر گیا خواجہ؟" سلطان نے اپنا زاویۂ نظر تبدیل کیا۔ "تم بتاؤ عراقی! میرا سفیر کہاں گم ہوگیا؟ فاتح عالم علاءالدین خلجی کا سفیر۔" یہ وہی زمانہ تھا جب سلطان نے ساری دنیا کی تسخیر کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے اور وہ تصورات میں اپنے آپ کو فاتح عالم سمجھنے لگا تھا۔

حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی' سلطان کی وحشت دیکھ کر چند ساعتوں کے لئے سہم سے گئے۔ ابھی ان دونوں میں سے کوئی بھی علاءالدین کے سوال کا جواب دینے نہیں پایا تھا کہ سلطان انتہائی تندوتیز لہجے میں دوبارہ بولنے لگا۔ "پچاس پچاس میل تک میرے پیادے شب وروز دوڑ رہے ہیں مگر اب تک کوئی بھی

آفریدی کی خبر نہیں لایا۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ ایک تیز رفتار گھوڑا چتوڑ اور دلی کے درمیانی فاصلے کو کتنے دن میں طے کر سکتا ہے۔"

سپہ سالار حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی ابھی اپنے اپنے ذہن میں راستے کی پیمائش کر ہی رہے تھے کہ ملک کافور اچانک بول اٹھا۔ "آفریدی کو دو ہفتے پہلے دارالحکومت پہنچ جانا چاہئے تھا۔ اسے واپسی میں پندرہ دن کی تاخیر ہو چکی ہے۔"

علاءالدین خلجی نے ناپسندیدہ نظروں سے ملک کافور کی طرف دیکھا۔ سلطان کو ایک غلام کا یہ انداز مداخلت گراں گزرا تھا پھر بھی والئی ہند نے ملک کافور کو حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی کے سامنے رسوا ہونے سے بچا لیا۔

"سلطانِ ذی حشم! آفریدی ایک دشوار گزار سفر پر روانہ ہوا ہے۔ اس سلسلے میں موسم کی خرابی یا شاہی سفیر کی ناسازیٔ طبع کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس نازک ترین سفارتی معاملے میں پندرہ دن کی تاخیر کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ بے شک! ہمارے لئے سلطان کی بے قراریاں ناقابل برداشت ہیں مگر پھر بھی اس غلام کا مشورہ یہی ہے کہ آپ پرسکون رہ کر مزید کچھ دن آفریدی کا انتظار کر لیں۔"

"انتظار تو ہم کر ہی رہے ہیں عراقی۔" سلطان کی پُرجلال آواز سے خلوت خاص لرز اٹھی۔ "پھر بھی تم سے پوچھتے ہیں کہ اگر آفریدی ناکام ہو گیا.........۔" یہ کہتے کہتے علاءالدین خلجی کے چہرے پر اذیت ناک وحشت نمایاں ہو گئی تھی۔ "آفریدی کی ناکامی خود تمہارے سلطان کی شکست ہے۔"

"نہیں! اے مالکِ جاہ و جلال! ایسا نہیں ہوگا۔ اگر چتوڑ کے حکمرانوں نے آفریدی کی قدر نہیں کی تو آپ کے غلام کوہساروں کی ہر بلندی سے گزر جائیں گے۔ صحرا کا ایک ایک ذرہ ان سے بے وفائی کرے گا اور پھر وہی زمین جسے وہ ماں کہہ کر پکارتے ہیں 'ان پر تنگ ہو جائے گی۔" عراقی شعلہ بار لہجے میں بول رہا تھا۔ یہ خوشامد کا کوئی انداز یا مصاحبت کی کوئی گداگرانہ روش نہیں تھی۔ تاج الدین عراقی میدان جنگ میں دشمنوں کیلئے اتنا ہی تند خو ثابت ہوتا تھا اور اس وقت بھی سلطان کے دشمنوں کی بات چھڑی ہوئی تھی۔

علاءالدین خلجی نے ستائشی نظروں سے عراقی کی طرف دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر وحشت و اضطراب کے بجائے سکون و اطمینان کے سائے ابھر آئے تھے۔ پھر یکایک سلطان نے اپنے دونوں سپہ سالاروں کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ یہ علاءالدین خلجی کا ایک مخصوص انداز تھا جسے دیکھ کر حاضرین سمجھ لیتے تھے کہ اب سلطان گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دینا چاہتا ہے۔ حاجی خواجہ اور عراقی نے بھی اپنے حکمراں کے اس اشارے کو سمجھ لیا اور رخصتی سلام کر کے الٹے قدموں کمرے سے باہر چلے گئے۔

ملک کافور اب بھی سلطان کی خلوت میں موجود تھا۔ تنہائی ملتے ہی اس نے رسمِ ساقی گری ادا کی اور سلطان نے جامِ سرخ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ عام رعایا کیلئے شراب ممنوع تھی مگر سلطان اعصابی دباؤ کے وقت یا کسی سرخوشی کے موقع پر آبِ سرخ کو ایک خاص تکلف کے ساتھ استعمال کیا کرتا تھا۔

"ملک! اب ہمیں کچھ اطمینان حاصل ہوا ہے۔" سرمستی کی لہر ہونٹوں سے گزر کر دماغ تک پہنچی تو سلطان کا اندازِ گفتگو بدل گیا......... "عراقی ٹھیک کہتا ہے......... اہل چتوڑ اس تجارت کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔ وہ ایک عورت کیلئے موت کی آگ اور غلامی کا دھواں نہیں خریدیں گے۔"

"یہ درست ہے سلطانِ معظم!" ملک کافور' علاءالدین خلجی کے قدموں پر جھک گیا.........

"آپ کی اقبال مندی کی ضرب تمام دنیا کے قلعوں کو مسمار کر سکتی ہے۔ مگر علی عامر آفریدی ایک بے اعتبار نوجوان ہے۔ چتوڑ روانگی سے پہلے وہ اپنی ماں اور بہن کو کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر گیا ہے۔ سلطانی

جاسوسوں نے اطلاع دی ہے کہ آفریدی کا مکان اسی روز سے بند پڑا ہے۔" ملک کافور بڑی احتیاط سے اپنی فطری عیاری کے حربے استعمال کر رہا تھا۔

"شاہی جاسوسوں کو ایسی کیا ضرورت پیش آئی تھی کہ وہ ہمارے سفیر خاص کی سراغ رسانی کریں۔" سلطان کے غضب میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

یہ ایک مشکل سوال تھا جس کا جواب دیتے وقت ملک کافور کو سراسیمگی کا شکار ہو جانا چاہئے تھا مگر وہ بے غیرت "خواجہ سرا" اپنے ذہن میں سازش کے منصوبے کی ایک ایک کڑی کو مضبوطی کے ساتھ جوڑ چکا تھا۔ "غلام کا فرض ہے کہ وہ آقا کی عظیم الشان سلطنت کے ایک ایک گوشے پر نظر رکھے۔ آفریدی کی ماں اور بہن تنہا رہتی ہیں۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ ان کی حفاظت کیلئے ایک پہرے دار مقرر کر دیا جائے......... مگر جب وہ محافظ' آفریدی کے مکان پر پہنچا تو سارا گھر مقفل تھا اور مکین وہاں سے غائب تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید تنہائی کے خیال سے وہ لوگ اپنے رشتے داروں کے یہاں منتقل ہو گئے ہوں گے لیکن جب تحقیق کی گئی تو یہ انکشاف ہوا کہ دلی میں آفریدی کا کوئی عزیز موجود نہیں۔ کچھ دور کے رشتے دار ہیں جو ہانسی میں رہتے ہیں۔ پھر میں نے قیاس کیا کہ آفریدی کی والدہ اور ہمشیرہ ہانسی چلی گئی ہوں گی۔ بظاہر یہ کوئی فکر انگیز بات نہیں تھی مگر جب آفریدی کی واپسی میں تاخیر ہوتی چلی گئی تو میرا چونک پڑنا ایک فطری امر تھا۔ ان حالات کی روشنی میں ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ آفریدی واپس آنے کے ارادے سے چتوڑ نہیں گیا ہے.........۔"

"آخر کیوں؟" سلطان کے غصے نے قہر کا رنگ اختیار کر لیا تھا......... "ہمارا ایسا کونسا کرم ہے جو اس پر نازل نہیں ہوا......... پھر وہ ایسا کیوں چاہتا ہے؟ ملک! اگر تمہارا یہ دعویٰ محض ایک الزام تراشی ثابت ہوا تو پھر ہم تمہیں بھی معاف نہیں کریں گے۔"

ملک کافور کو سلطان سے ایک قربت خاص کے سبب اپنی ذات پر پورا اعتماد تھا۔ اس لئے وہ آفریدی کی شخصیت کو نئے انداز سے داغدار کرنے کی کوشش کرنے لگا......... "وہ نمک حرام' سلطان کی حکومت کو ظلم کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومت سمجھتا ہے۔ اس نے ایک بار مجھے آپ کے حوالے سے غلیظ گالیاں دیتے ہوئے کہا تھا کہ جس حکمران نے اپنے حقیقی چچا کو قتل کیا اور پھر اپنے محسن کے بریدہ سر کی گلی گلی رسوائی کی 'اس کی سلطنت میں رہنا بھی حرام ہے......... آفریدی کہتا ہے........."

سلطان نے ملک کافور کو مزید بولنے کا موقع نہیں دیا......... "کیا اس طرح وہ ہماری سلطنت کی حدود سے نکل جائے گا؟" سلطان کی گفتگو سے خدائی کا سا انداز جھلکنے لگا تھا......... "اگر آفریدی ہمیں ایک غاصب و جابر حکمراں سمجھتا ہے تو پھر اسے کونسا خطۂ زمین قبول کرے گا؟ کوئی بھی نہیں' کوئی بھی نہیں۔"

"سلطانِ معظم! آفریدی کا منصوبہ یہ ہے کہ وہ پہلے چتوڑ میں سیاسی پناہ حاصل کرے گا اور پھر اپنی ماں اور بہن کو بھی وہیں بلا لے گا........." ملک کافور نے سلطان کی حالتِ غضب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تہمت طرازی میں نیا رنگ بھرنے کی کوشش کی۔

سلطان نے چونک کر ملک کافور کی طرف دیکھا......... "ہم نہیں سمجھتے کہ دنیا میں اس قدر احمق شخص بھی زندہ رہ سکتا ہے......... " اچانک سلطان کا لب و لہجہ بدل گیا تھا۔ "یہ ممکن نہیں......... آفریدی ہمارا حرف اعتبار ہے......... وہ خود تو موت کے گرد و غبار میں گم ہو سکتا ہے مگر ہمارے یقین کو دھندلا نہیں ہونے دے گا۔ ابھی ہم اس کا انتظار کریں گے۔ کون جانے کہ ہمارے سفیر پر کیا گزری ہے؟ وقت ہی بتائے گا کہ وہ ہمارے بخشے ہوئے اعزاز کا مستحق تھا یا نہیں؟"

سلطان کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر ملک کافور کا دل ڈوبنے لگا...... "کچھ بھی ہو حضور والا! آفریدی آپ کے اقتدار کو دل سے تسلیم نہیں کرتا ......" ملک کافور نے ایک بار پھر وہی ناگوار قصہ چھیڑ دیا تھا جسے کوئی بھی حکمران سننا پسند نہیں کرتا........ "آفریدی قومی تعصب کا شکار ہے۔ وہ ہندوستان کے تخت و تاج کو اہل کابل کی میراث سمجھتا ہے......." ملک کافور نے دلوں کی زمین میں نفرت کا ایک بیج ڈال دیا تھا۔

"مگر تم پر یہ راز کس طرح فاش ہوا ؟" سلطان اپنے محبوب غلام کی باتیں سن کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

ملک کافور نے اپنے جھوٹ کو بے اثر ہوتے دیکھا تو ایک ایسی تاویل پیش کرنے لگا جو انسانی نفسیات کے عین مطابق تھی...... "اے شاہِ ذی وقار! اگر آفریدی آپ کو غاصب و جابر نہیں سمجھتا تو پھر اس حقیر غلام تک یہ خبر کیسے منتقل ہوئی کہ سلطان معظم نے اپنے حقیقی چچا کے ساتھ ناروا سلوک کیا تھا۔" بے حیاء ملک کافور نے اپنی دلیل کو پرزور بنانے کیلئے نئی چال چلی تھی....... "اس نے شراب کے نشے میں ایک درباری رقاصہ سے یہ بات کہی تھی کہ سلطان اپنے چچا کے قاتل ہیں۔ اور وہ ایسے احسان فراموش حکمران کے دربار سے وابستہ رہنا نہیں چاہتا۔"

سلطان ناقابل بیان اذیت میں مبتلا تھا۔ "آفریدی شراب بھی پیتا ہے اور زنانِ درباری سے دل بھی بہلاتا ہے...... ؟" سلطان کو ملک کافور کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"حضور والا! وہ کون سی علت کا شکار نہیں........ یہ تو محض آپ کا حسنِ ظن ہے کہ اسے پارسا سمجھتے ہیں۔" ملک کافور کی عیاریاں انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ "اگر وہ موجود ہوتا تو میں اس کے گناہ کو ثابت کرنے کیلئے بیک وقت کئی گواہیاں پیش کر دیتا۔"

ایک ذلیل غلام نے سلطان کی شہ رگ پر زہر آلود نشتر رکھ دیا تھا جس کی تکلیف سے ہندوستان کا تاجدار تڑپ اٹھا تھا....... "ہم اپنے اعتبار کا خون کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتے........ آفریدی نے ابھی ہمارے کرم کے انداز دیکھے ہیں' اسے فاتح عالم کے قہر کا اندازہ نہیں....... ملک! تم جاؤ اور آفریدی کے اہل خانہ کی نگرانی پر شاہی جاسوس متعین کر دو۔ اگر تمہارا دعویٰ درست ثابت ہوا تو عنقریب ہم آفریدی کو اس کے گناہِ عظیم کی دردناک سزا دیں گے۔"

ملک کافور خلوت خاص سے باہر آیا تو اس کے چہرے پر ناقابل بیان خوشی کا عکس روشن تھا۔

☆..........☆..........☆

گردش وقت کا عجیب انداز تھا۔ دلی جو آفریدی کیلئے جائے پناہ تھی' اب اس کی آغوش سے نئے فتنے پھوٹ رہے تھے اور ان تمام فتنوں کا خالق نمک حرام ملک کافور تھا جس نے سلطان علاء الدین خلجی کا سہارا لے کر اہل وفا کے پیرہن کو داغدار کرنے کی کوشش کی تھی اور دوسری طرف چتوڑ تھا جو علی عامر کیلئے پہلے ہی دن سے ایک مقبرہ' ایک مدفن ثابت ہوا تھا۔ کئی بار موت اس کے بدن کو چھوتی ہوئی گزر گئی اور آفریدی مر مر کے جیتا رہا۔ بالآخر ان ہی فتنوں اور ہنگاموں سے الجھتا ہوا علی عامر' رانی پدمنی کے دربار تک پہنچ گیا۔ دربار میں داخل ہونے سے پہلے مہامنتری وکرم سنگھ اس کے کمرے تک آیا اور پھر جب وکرم سنگھ نے آفریدی کو نئے لباس میں دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

"راستے کے گرد و غبار' زخموں کی کثرت اور چتوڑ کی اذیت رسانی نے تمہیں بجھا کر رکھ دیا تھا۔" وکرم سنگھ نے علی عامر کی ظاہری شخصیت کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "واقعتاً تم سلطان علاء الدین خلجی کے سفیر معلوم ہوتے ہو۔" وکرم سنگھ کا لہجہ عجیب سا تھا۔

مہامنتری کی تعریف اتنی بے ساختہ تھی کہ آفریدی ایک لمحے کیلئے شرما سا گیا آج پہلی بار کسی شخص نے اس کے مردانہ حسن کی تعریف کی تھی۔ آفریدی نے نظریں نیچی کر لیں اور وکرم سنگھ سے اپنی تلوار کا ذکر کیا جو چتوڑ میں داخل ہوتے وقت اس کے جسم پر آویزاں تھی وکرم سنگھ نے فوراً ہی محافظ سپاہیوں کو حکم دیا کہ آفریدی کی وہ شمشیر لائی جائے جسے سفیر کے زخمی ہو جانے کے بعد ریاست کے اسلحہ خانہ میں جمع کر دیا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد تلوار لائی گئی تو اس پر جگہ جگہ خون کے داغ نمایاں تھے۔ آفریدی نے تلوار کو نیام سے کھینچا لیکن وہ آسانی سے برآمد نہ ہو سکی خون کی آمیزش کے سبب تلوار نیام میں چپک کر رہ گئی تھی۔ بمشکل اسے کھینچا گیا۔ آفریدی بہت غور سے اپنی اس تلوار کو دیکھتا رہا جس پر اس کے بے نام اور نادیدہ دشمنوں کا خون جم کر سیاہ دھبوں کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

"مہامنتری!" تلوار پر نظریں جمائے ہوئے آفریدی نے وکرم سنگھ کو مخاطب کیا۔ "میں امن اور محبت کا سفیر ہوں اس لئے اپنی شمشیر پر انسانی خون کے داغ لے کر دربارِ چتوڑ میں داخل ہونا نہیں چاہتا۔"

مہامنتری نے آفریدی کے اس اندازِ فکر کو پسند کرتے ہوئے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ تلوار کے دستے اور پھل کو صاف کر دیں پھر جب شمشیر کی اپنی حقیقی آب و تاب لوٹ آئی تو آفریدی نے اسے نیام میں ڈالا اور مہامنتری وکرم سنگھ کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"آؤ آفریدی! تمہیں تمہاری منزل تک پہنچا دوں۔" وکرم سنگھ نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "میں بھگوان سے پرارتھنا (دعا) کرتا ہوں کہ وہ تمہیں سرخروئی عطا کرے۔"

"مہامنتری! آپ کی محبتوں کا شکریہ۔" علی عامر آفریدی نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا۔ "سرخروئی اہلِ وفا کا مقدر بھی ہے اور حق بھی۔ زندہ رہے تو فتح و نصرت کے جذبات کی سرخی ہمارے چہروں کو گلنار بنا دے گی اور اگر قتل کر دیئے گئے تو خود ہمارا لہو شفق بن کر پورے جسم کو رنگین کر دے گا۔"

وکرم سنگھ نے ایک بار پھر دلی کے سفیر کو ستائشی نظروں سے دیکھا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

پھر جب علی عامر آفریدی سپاہیوں کے نرغے میں' مہامنتری وکرم سنگھ کے ساتھ راجہ رتن سنگھ کے دربار میں داخل ہوا تو ایک لمحے کیلئے در و دیوار تک ساکت ہو گئے۔ امرائے چتوڑ نے آج تک مختلف ریاستوں کے سیکڑوں سفیروں کو دربار میں داخل ہوتے دیکھا تھا مگر علاء الدین خلجی کے سفیر کو دیکھ کر حاضرین ششدر رہ گئے تھے۔ دراز قامت آفریدی کی وجیہہ شخصیت نے کچھ دیر کیلئے اہل دربار کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ آنے والا سفیر کسی عام خاندان سے تعلق رکھتا ہے یا کوئی ترک شہزادہ ہے ؟ آفریدی کا ایک ایک قدم اس شان سے اٹھ رہا تھا جیسے وہ کوئی فاتح ہے اور سرزمین چتوڑ کو پامال کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ تمام امرائے دربار عالم سکوت میں سلطانی سفیر کو دیکھ رہے تھے۔ آفریدی' حاضرین کی دو رویہ قطاروں سے گزر کر مسند اقتدار کے قریب ٹھہر گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک مرصع تخت تھا جس پر رانی پدمنی ایک عجیب شانِ بے نیازی کے ساتھ جلوہ افروز تھی۔ رانی پدمنی کے دائیں جانب اس کا شوہر راجہ رتن سنگھ بیٹھا تھا۔ راجہ رتن سنگھ کے دائیں جانب مہاراج رام دیو اپنے پورے جسم پر زخموں کے نشان سجائے موجود تھا۔ ابھی ساحرِ اعظم کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ وہ اپنے پیروں پر چل کر دربار تک پہنچ سکتا۔ اس لئے رام دیو کو پالکی میں بٹھا کر دربار میں لایا گیا تھا۔ تخت کے دونوں طرف راجگان چتوڑ کے عزیز و اقارب زرنگار کرسیوں پر بیٹھے تھے ان معززین چتوڑ میں ایک قطار مردوں کی تھی اور دوسری عورتوں کی۔

آفریدی نے ان تمام لوگوں پر ایک اچٹتی سی نگاہ کی' پھر اس کی نظریں رانی پدمنی کے چہرے پر مرکوز

ہوگئیں۔ رانی پدمنی ایک سفید باریک نقاب میں تھی جس نے اس کے گلابی چہرے کو حسین تر بنا دیا تھا۔ آفریدی چند لمحوں تک اس لالۂ صحرائی کو دیکھتا رہا جس کے نقش و نگار فتنہ انگیز تھے اور جس کا مرمریں پیکر توبہ شکن۔ آج اسے اندازہ ہوا کہ علاءالدین خلجی کا عشق اس قدر جنوں خیز کیوں ہے؟ ایک بتِ کافر کی موجودگی نے آفریدی کو احساس دلایا کہ سلطان وحشتِ دل سے مجبور ہو کر وادیٔ فنا میں اتر جانے کیلئے کیوں بے قرار ہے؟ آفریدی نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ رانی پدمنی بے مثال حسن رکھنے والی ایک ایسی عورت ہے جس کی خاطر کوئی بھی حکمراں دل و جاں کی بازی کھیل سکتا ہے۔ آفریدی کے سکوت اور نظروں کے ارتکاز نے دربار میں ہلچل سی مچادی تھی۔ امراء بڑی بے چینی سے اپنی نشستوں پر پہلو بدل رہے تھے۔ انہیں علاءالدین خلجی کے سفیر کی یہ ادا بڑی ناگوار گزری تھی کہ وہ ایک تسلسل اور خاص انہماک کے ساتھ مہارانی چتوڑ کو دیکھے جارہا تھا۔

پدمنی نے بھی شاہی سفیر کی لغزشِ نگاہ کو محسوس کرلیا تھا مگر آنے والے سے براہِ راست مخاطب ہونا ایک حکمراں کی شان کے خلاف تھا' اس لئے رانی پدمنی نے ریاست کے وزیرِ اعظم کو آواز دی۔

"وکرم سنگھ۔" پدمنی کے لہجے سے سخت ناپسندیدگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

وکرم سنگھ جو علی عامر آفریدی کے قریب ہی کھڑا تھا' تیزی سے آگے بڑھا اور دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھتے ہوئے رانی پدمنی کے سامنے خم ہوگیا۔ "سلطان علاءالدین خلجی کا سفیر علی عامر آفریدی' مہارانی چتوڑ کی بارگاہ میں حاضر ہے۔"

پھر جیسے ہی وکرم سنگھ خاموش ہوا' علی عامر کے قدموں کو جنبش ہوئی وہ تخت کے نزدیک پہنچ کر رکا۔ پھر اس کا دایاں ہاتھ سینے کی بلندی تک اٹھا اور گردن میں معمولی سا خم پیدا ہوا۔ یہ درباری رسم تھی جسے آفریدی نے آزاد قوم کے نمائندے کی طرح ایک خاص وقار کے ساتھ ادا کیا پھر اس کی دلکش اور بلند آواز ابھری۔

"مرکزِ قہر و کرم' مالکِ جاہ و حشم' تاجدارِ ہند' سلطان معظم علاءالدین خلجی کا سفیر' رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ کی خدمت میں آداب پیش کرتا ہے۔"

"تمہارا سلام قبول کیا گیا۔" راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے بیک وقت جواب دیا تھا مگر راجہ کی آواز پر رانی پدمنی کی آواز غالب تھی۔

پورے دربار میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سرکش و خودسر راجپوت پہلی بار ایک شاہی سفیر کی تمکنت کا مشاہدہ کررہے تھے۔ رانی پدمنی نے ابھی تک آفریدی کی گستاخ نگاہی کو فراموش نہیں کیا تھا۔

"تمہاری آمد کا مقصد؟" راجہ رتن سنگھ نے تلخ لہجے میں آفریدی سے سوال کیا۔

"راجپوت سمراٹ میری آمد کے مقصد سے بخوبی واقف ہیں۔" علی عامر نے اپنا بیان جاری رکھا۔ "راجہ رتن سنگھ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ان کی ریاست کی حدود میں کب داخل ہوا تھا اور آج جب مجھے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت دی گئی ہے تو کونسا دن ہے؟" آفریدی نے انتہائی شائستہ لہجے میں پس پردہ ہونے والے تمام ناگوار واقعات کی طرف اشارہ کردیا تھا۔

"چتوڑ کی حدود میں داخل ہوتے وقت تم بے ہوش ہوگئے تھے۔" راجہ رتن سنگھ نے سیاسی حربہ استعمال کیا۔ "ہم نے جس طرح تمہاری تیمارداری کی ہے اس کیلئے تمہیں ہمارا شکر گزار ہونا چاہئے۔"

"میں والیٔ چتوڑ کی نوازشات کا مشکور ہوں۔" آفریدی کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاہی سفیر چند لمحوں کیلئے خاموش رہا پھر رتن سنگھ کو مخاطب کرکے بولا۔ "رانی پدمنی

کے لئے سلطان علاءالدین خلجی کا ایک خصوصی پیغام ہے۔"

شاہی سفیر کے انکشاف پر راجپوتوں کے دربار میں زلزلہ سا آگیا۔ "وہ پیغام زبانی ہے یا تحریری؟" رتن سنگھ نے بمشکل اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"شاہوں کے پیغام زبانی نہیں ہوتے۔" علی عامر کا لہجہ ایک نشتر تھا جسے وہ چتوڑ کے حکمرانوں پر بے دریغ استعمال کررہا تھا۔ "اور وہ پیغام تو زبانی ہو بھی نہیں سکتا کہ جس پر وقارِ شاہی کی بقاء کا انحصار ہے۔"

اس انکشاف پر اہلِ دربار کی سانسیں رک سی گئیں۔ راجہ رتن سنگھ کے چہرے پر چند لمحوں میں کئی رنگ آکر گزر گئے تھے۔ رانی پدمنی نے بڑے غرور کے ساتھ اپنی نشست پر پہلو بدلا تھا۔ مگر رام دیو غیر متوقع طور پر وحشت زدہ نظر آرہا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں گزشتہ ناکامیاں اور رسوائیاں تازہ ہوگئی تھیں۔

"سلطان کا پیغام پیش کیا جائے۔" بالآخر ایک عالمِ جبر میں رتن سنگھ نے اس پُراسرار پیغام کو سرِ دربار پیش کرنے کی اجازت دیدی تھی جس نے مسلسل ایک ماہ سے ریاست کا امن و سکون غارت کرکے رکھ دیا تھا۔

اجازت پاتے ہی علی عامر آفریدی نے کاندھے سے اپنی تلوار اتاری تمام درباریوں کی نظریں شاہی سفیر کی اس حرکت پر مرکوز تھیں۔ آفریدی نے دونوں ہاتھوں سے اس بھاری شمشیر کو سنبھالا اور نیام کے اگلے حصے پر لگے ہوئے باریک پیچوں کو کھولنے لگا۔ کچھ دیر بعد اہلِ دربار نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ آفریدی کی نیام دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی نیام کا اگلا حصہ اضافی اور کھوکھلا تھا پھر اس حصے سے آفریدی نے ایک سرخ رنگ کا لفافہ برآمد کیا۔

"یہ پیغام آپ مہارانی کے ملاحظے کیلئے پیش کردیجئے۔" آفریدی نے وکرم سنگھ سے کہا۔

"نہیں!" اچانک رانی پدمنی کی آواز گونجی۔ اب اس کی مترنم آواز کی سحر کاریاں ختم ہوچکی تھیں اور مہارانی کے لہجے میں رنگِ قہر شامل ہوگیا تھا۔ "ہم اس شخص کی تحریر کو دیکھنا پسند نہیں کرتے جس نے تمام آدابِ سفارت کو پامال کرکے ایک غیر مہذبانہ روش اختیار کی ہے۔ سلطان کا پیغام زبانی بیان کیا جائے۔"

"مہارانی! سلطان کے پیغام کو اپنی زبان سے ادا کرنا میرے اختیار کے دائرے میں نہیں۔" یہ کہہ کر علی عامر آفریدی نے وہ سرخ لفافہ مہامنتری وکرم سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔

"تم پڑھو مہامنتری کہ اس مغرور سلطان نے کیا لکھا ہے؟ ہماری نظر میں یہ پردہ داری ناقابلِ معافی جرم ہے۔ اسے جو کچھ کہنا تھا راجپوت سمراٹ سے کہنا تھا۔ غیرت مند خواتین غیر مردوں سے پُراسرار گفتگو کی متحمل نہیں ہوتیں۔"

رانی پدمنی کی اجازت کے بعد مہامنتری وکرم سنگھ نے علاءالدین خلجی کا سربمہر لفافہ چاک کر ڈالا۔ لفافے سے برآمد ہونے والا کاغذ سرخ تھا اہلِ دربار شدید حیرت و سکوت کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ وکرم سنگھ نے سرخ کاغذ پر اپنی نظریں مرکوز کردیں۔ سنہری حروف اس کے سامنے اس طرح نمایاں تھے جیسے ڈوبتے سورج کی کرنیں شفق کے کناروں سے ابھرتی ہیں۔ مہامنتری خاموشی سے سلطان کا پیغام پڑھتا رہا۔ حاضرینِ دربار اپنی سانسیں روکے وکرم سنگھ کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں گھبراہٹ اور انتشار کے سوا کسی دوسرے جذبے کا عکس موجود نہیں تھا۔ ابھی علاءالدین خلجی کا خط تمام ہونے بھی نہ پایا تھا کہ درمیان میں علی عامر آفریدی بول اٹھا۔

"مہارانی اس خط کو خود ملاحظہ کریں۔ شاہی پیغام ایک راز ہے اور راز کو سرِ محفل بیان نہیں کیا جا سکتا۔"

"ہمارا سلطان سے ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے نام رازدارانہ پیغام ارسال کر سکے۔" رانی پدمنی کے لہجے سے قہر کی آگ برسنے لگی تھی۔ "وکرم سنگھ! ہمارے حکم پر فوری عمل کیا جائے۔ نافرمانی غیروں کی جانب سے ہو یا اپنوں کی طرف سے 'یہ جرم ہمارے حضور قابلِ معافی نہیں ہوتا۔"

"مہارانی! راج دوت کا مشورہ درست ہے۔ اس پیغام کو صرف آپ ہی ملاحظہ کر سکتی ہیں۔" خوفناک ترین حالات میں بھی ثابت قدم رہنے والا وکرم سنگھ اس وقت بہت زیادہ شکستہ نظر آ رہا تھا اس نے کانپتے ہاتھوں سے علاءالدین خلجی کا خط آفریدی کی طرف بڑھا دیا۔

"اگر مہامنتری کے احساسِ وفاداری نے ان سے ان کی زبان چھین لی تو پھر تم ہی اپنے سلطان کا پیغام بہ آوازِ بلند پڑھو۔" رانی پدمنی نے آفریدی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ شاہی پیغام ایک راز ہے اور راز کو سرِ دربار فاش نہیں کیا جا سکتا۔" آفریدی نے پدمنی کے غضب ناک لہجے کا ہلکا سا تاثر بھی قبول نہیں کیا تھا وہ اسی بے باکی کے ساتھ بول رہا تھا جیسے کوئی شخص حلقۂ یاراں میں بے تکلفانہ گفتگو کرتا ہے۔

"یہ تمہارے سلطان کا محل نہیں' دربار چتوڑ ہے۔ اور اس دربار میں آنے والے ہماری ایک ایک جنبشِ چشم و لب کے پابند ہوتے ہیں۔" اب رانی پدمنی کی آواز بھی اس کے چہرے کی طرح شعلہ ریز ہو گئی تھی۔

"مہارانی! میں آپ کے حضور آنے والے تمام انسانوں سے جدا ہوں۔" آفریدی کے الفاظ سرکش تھے مگر لہجہ جارحانہ نہیں تھا۔ "میں ہندوستان کے کسی بھی گوشے میں جاؤں لیکن میری آنکھیں ہمیشہ دلی پر مرکوز رہتی ہیں۔ میں صرف اپنے سلطان کی زبان سمجھتا ہوں۔ باقی زبانیں میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔"

"تو پھر اسی وقت چتوڑ کی حدود سے نکل جاؤ۔" دلوں کی تسخیر کرنے والی آواز سے بدستور شعلے برس رہے تھے۔ "پھر جب دلی پہنچو تو اپنے سلطان سے کہہ دینا کہ غیرت مند راجپوتوں کی بیٹی نے اس کا پیغام سننے سے انکار کر دیا۔"

علی عامر نے بڑے حوصلے کے ساتھ رانی پدمنی کے اس تحقیر آمیز سلوک کو برداشت کیا۔ "مہارانی! میں تو جانے ہی کیلئے آیا ہوں مگر سلطان کے خط کا سرِ دربار پڑھا جانا آپ کے مفاد میں نہیں ہے۔" آفریدی کا لہجہ نرم تھا۔ "چتوڑ کی حکمراں سے درخواست کروں گا کہ وہ سلطان کے پیغام کو تنہائی میں پوری رازداری کے ساتھ پڑھیں اور تحریری جواب لکھ کر میرے سپرد کر دیں۔ میری نظر میں یہی سلامتی کا ایک راستہ ہے۔ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا مجھے جو حکم دیا گیا ہے میں اسی پر عمل کر رہا ہوں۔"

"تمہاری گفتگو نے نہ صرف مجھے بلکہ اہلِ دربار کو بھی شبہات میں مبتلا کر دیا ہے۔" رانی پدمنی کے قہر و غضب کا وہی عالم تھا۔ "سلطان کو یہ اختیار کس نے دیا کہ وہ مجھے خفیہ پیغام ارسال کرے۔ اب جبکہ تمہارے حکمراں سے یہ ذلیل حرکت سرزد ہو چکی ہے تو پھر لازم ہے کہ جو کچھ کہا جائے 'سب کے سامنے کہا جائے ورنہ جدھر سے آئے ہو اسی طرف ناکام و نامراد واپس چلے جاؤ۔"

علی عامر آفریدی شدید ذہنی کشمکش کا شکار تھا۔ اپنی سفارت کو ناکام دیکھنا یا سلطان کے راز کا طشت ازبام ہو جانا۔ اس کے سوا کوئی تیسرا راستہ نہیں تھا۔ آفریدی نے بڑے کرب کے ساتھ دوسرے راستے کا انتخاب کر لیا۔ وہ ایک ناکام سفیر کی حیثیت سے دلی واپس جانا نہیں چاہتا تھا اس فیصلے کے بعد

آفریدی نے رانی پدمنی کے تختِ زرنگار سے لے کر دربار کے آخری گوشے تک نظر ڈالی پھر بہ آوازِ بلند کہنے لگا۔

"اہلِ دربار گواہ رہیں کہ میں نے رازداری قائم رکھنے کیلئے ایک ماہ تک دنیا کی ہر تکلیف برداشت کی مگر رانی پدمنی نے اس معاملے میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔" اتنا کہہ کر آفریدی نے سلطان کے خط کو بغور دیکھا۔ اگرچہ وہ علاءالدین خلجی کے مفہوم سے باخبر تھا لیکن تفصیلات اس کے علم میں نہیں تھیں۔ "میں جانتا ہوں کہ یہ سخت بے ادبی ہے مگر مجھے سفارت کی ناکامی منظور نہیں۔ کاش! مہارانی اپنا فیصلہ بدل دیتیں۔"

"ایک ایک حرف پڑھا جائے۔" رانی نے آفریدی کی آخری امید کا بھی خون کر ڈالا۔

علی عامر کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور راجپوت سرداروں کی سماعتیں شاہی سفیر کی آتشِ گفتار سے جلنے لگیں۔

"حکم نامہ سلطان۔ بنام رانی چتوڑ۔"

یہ عبارت پڑھ کر آفریدی چند لمحوں کیلئے ٹھہر گیا۔ سلطان کے اندازِ تخاطب نے راجپوت زادی کے پورے جسم میں آگ لگا دی تھی۔

آفریدی کی نظریں دوبارہ مکتوبِ شاہی کی طرف پلٹ آئیں پھر اہلِ دربار پر قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ آفریدی کی دلکش مگر بارعب آواز دربارِ چتوڑ کے ایک ایک گوشے میں گونج رہی تھی۔

"پدمنی! یہ تمہاری خوش نصیبی ہوگی کہ ہندوستان کا مطلق العنان حکمراں تمہارے حسنِ بے مثال کو اس طرح بے نقاب دیکھے کہ درمیان میں کوئی پردہ حائل نہ رہے۔ تمہارے شوقِ دید نے ہمارے دنوں کو بے آرام اور راتوں کو بے خواب بنا دیا ہے۔ تمہیں کسی تاخیر کے بغیر خلوتِ شاہی تک پہنچ جانا چاہئے۔ اب یہ مزاجِ شاہ پر منحصر ہے کہ وہ دیدارِ خاص کے بعد تمہیں چتوڑ واپس جانے دے یا پھر رسمِ تاجپوشی ادا کر کے ایک رانی کو ملکۂ ہند بنا دے۔ ہم نہیں جانتے کہ تم سے ملاقات کے بعد ہمارا جذباتی ردِعمل کیا ہوگا؟ پھر بھی ہم یہ بات طے کر چکے ہیں کہ تمہارے حسنِ شرربار سے اپنے شبستانِ محبت کو آراستہ کریں۔" سلطان کی تحریر ابھی باقی تھی مگر آفریدی کو تلواروں کی جھنکار سن کر چند ساعتوں کیلئے رک جانا پڑا۔ دربار میں موجود تمام راجپوت سپاہیوں کی تلواریں بے نیام ہو چکی تھیں اور ان کے چہرے پر وہی وحشت ناچ رہی تھی جو بھوکے درندوں کے غول پر اس وقت طاری ہو جاتی ہے جب وہ شکار کو اپنے نرغے میں گھرا ہوا دیکھتے ہیں۔ علی عامر نے تابناک فولاد کے ٹکڑوں کی کھنک کا کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔ اب اس کی نظریں رانی پدمنی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ چتوڑ کی حکمراں شدید غضب سے کانپ رہی تھی اور واقعتاً اس نے قہر کی دیوی درگا کا روپ دھار لیا تھا۔ حسن اس قدر برہم ہو چکا تھا کہ رخساروں پر بہنے والے پسینے کے گلاب رنگ قطرے زہر کی بوندوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ وکرم سنگھ اپنے دونوں ہاتھ سے سر پکڑے رانی پدمنی کے بائیں ہاتھ والی نشست پر اس طرح بیٹھا تھا جیسے وہ اپنی زندگی کی سب سے اہم بازی ہار گیا ہو۔ راجہ رتن سنگھ کا چہرہ بھی آتشِ نفرت سے جل رہا تھا مگر اس کے اعصاب مکمل طور پر شکستہ نہیں ہوئے تھے۔ وہ دربار میں موجود تھا لیکن اس کی سرخ آنکھیں کہیں دور بھٹکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ تمام درباری اپنی اپنی حیثیت کے مطابق علی عامر آفریدی اور سلطان علاءالدین خلجی کے خلاف نفرتوں کا خاموش اظہار کر رہے تھے۔ ابھی ان کی زبانیں نہیں کھلی تھیں کہ وہ دربار کے آداب سے مجبور تھے۔ اسی سنگین اور کشیدہ فضا میں آفریدی نے رانی پدمنی اور اہل

دربار کی دلی کیفیات کا جائزہ لیا اور دوبارہ اپنے سلطان کا خط پڑھنا شروع کر دیا۔ علاء الدین خلجی نے رانی چتوڑ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

" پدمنی! تم یقیناً اس حقیقت سے باخبر ہوگی کہ ہماری ہر خواہش حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ ہماری نافرمانی کا بس ایک ہی مفہوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی فرد اس گناہ کا مرتکب ہو گا تو زندگی اس سے اپنا رشتہ توڑ لے گی۔ اور اگر کوئی قوم ہمارے حکم سے روگردانی کرتی ہے تو پھر حیات و زیست کے تمام عناصر بھی اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور اگر کوئی حکومت ہماری خواہشات کا احترام نہیں کرتی تو تاریخ اس کے انجام پر روتی ہے اور جغرافیہ اس کی المناک موت پر صدیوں تک مرثیے پڑھتا رہتا ہے۔ ہم نے تمہارے بارے میں سنا ہے کہ تم حسن کی نعمتوں کے ساتھ ہوش و خرد کی صلاحیتوں سے بھی شرفیاب کی گئی ہو۔ ہم ایسی ہی شریک حیات چاہتے ہیں جو میدان جنگ میں فتح و نصرت کا پرچم اٹھا کر ہمارے دوش بہ دوش چلے۔ اور جب ہمارے جسموں پر زخموں کے چراغ روشن ہو جائیں تو وہ اپنی مشکبار سانسوں سے ان چراغوں کو بجھا دے اور حریری آنچل کے لمس سے جراحتوں کی سوزش کو کیف میں بدل ڈالے۔ ہمیں بتانے والوں نے بتایا ہے کہ اس طویل و عریض ہندوستان میں تم ہی ایک ایسی عورت ہو جو ہمارے ذوقِ جمال کی گہرائیوں کو سمجھ سکتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس وضاحت کے بعد تم "رانی چتوڑ" اور "ملکۂ ہند" کے فرق کو بھی بآسانی سمجھ سکو گی۔ اگر پھر بھی تم نے مٹھی بھر راجپوتوں کی حمایت کے نشے میں ہمارے جذباتِ وارفتہ کو عزت و توقیر نہیں بخشی تو پھر مڑ کر ایک نظر راجپوتانے کی پہاڑیوں کی طرف دیکھو جن کے سنگلاخ سینوں میں عنقریب ہمارے گھوڑے کے سم کبھی نہ بھرنے والے شگاف ڈال دیں گے' پتھروں کے درمیان بہنے والی تمام ندیاں انسانی خون سے سرخ ہو جائیں گی' کیسے کیسے جوان مردوں کی لاشیں زمین کی خوراک بن جائیں گی اور کیسی کیسی بے خود و سرمست دوشیزائیں اپنے ہاتھوں سے اپنی تشنہ جوانیوں کو آگ لگا دیں گی۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ وہ کیسا لرزہ خیز منظر ہو گا اور تمہیں اس کا بھی اندازہ نہیں ہو گا کہ ہمارے ہاتھ کتنے دراز ہیں؟ پدمنی! ایک بار پھر اپنے محل کے جھروکوں سے اس تپتے ہوئے صحرا کو دیکھو جس کا ایک ایک ذرہ بہت جلد تم سے بے وفائی کرنے والا ہے۔ چتوڑ کی زمین کا ایک ایک گوشہ ہمارے حکم کا تابع ہے۔ جب دربار شاہی سے یہ حکم سرزمین چتوڑ پر نازل ہو گا تو وہ مٹی جسے تم اپنی ماں سمجھتی ہو' تمہیں فراموش کر دے گی اور اپنی تمام اولادوں کو سلطان علاء الدین خلجی کے ہاتھوں فروخت کر دے گی۔ اس سے پہلے کہ خونی تجارت کا یہ بازار گرم ہو' تم ہمارے حرم میں چلی آؤ۔ تمہارے لئے یہ شرف کافی ہو گا کہ ہم دلی کی حدود سے نکل کر حسن کی دیوی کا استقبال کریں ورنہ ہمارا مزاج تو یہ ہے کہ ہم کسی دیوی کو کوئی اعزاز نہیں بخشتے۔ پتھر کے یہ بُت خود ہی ہمارے قدموں پر سجدہ ریز ہونے کیلئے بے قرار رہتے ہیں۔"

جیسے ہی شاہی حکم نامے کی آخری سطر ختم ہوئی' رانی پدمنی غصے سے بے قابو ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اپنی حکمراں کا یہ اضطراری عمل دیکھ کر راجپوت سردار بھی اپنی اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے۔ جن سپاہیوں کی تلواریں آہنی خول میں روپوش تھیں' وہ بھی بے نیام ہو گئیں۔

پھر سارا دربار مختلف آوازوں کے شور سے گونجنے لگا۔ کسی مسلمان حکمراں نے آج تک خود دار و غیور راجپوتوں کی اتنی تذلیل نہیں کی ہے۔ یہ دنیا کی غلیظ ترین گالی ہے جو سلطان علاء الدین خلجی نے ہماری رانی پدمنی کیلئے استعمال کی ہے۔ ہم سلطان کو اس حرفِ بد کا جواب اس طرح دیں گے کہ سارا عالم ہماری نفرتوں کے اظہار کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔

پھر اسی شور میں ایک راجپوت سردار کی گرجدار آواز ابھری۔ "ہم مہارانی سے التجا کریں گے کہ سلطان

کے سفیر کا سر کاٹ کر دلی بھیج دیا جائے۔ سلطان کے غلاظت نامہ کا یہی بہتر جواب ہو گا۔"

رانی پدمنی نے راجپوت سردار کے اس مطالبے کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ شدید غصے کے باعث اپنے حواس کھو چکی تھی اور کسی برگ خزاں رسیدہ کی طرح کانپ رہی تھی۔ راجہ رتن سنگھ نے اپنی بیوی کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھی تو خود تخت سے اٹھا اور رانی پدمنی کو سہارا دے کر اپنے قریب بٹھا لیا۔ اس کے ساتھ ہی تمام راجپوت سردار بھی اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مگر ان کی شمشیریں بدستور بے نیام تھیں۔ راجہ رتن سنگھ کے اشارے پر راج محل کی ایک کنیز گلاب سے بھرا ہوا ایک بلوریں پیالہ لے کر آئی جسے پینے کے بعد رانی پدمنی کے جلتے ہوئے اعصاب کسی حد تک پر سکون ہو گئے۔

رانی پدمنی کے دربار میں کوئی بھی ایسا شخص موجود نہیں تھا جس کے دل میں آفریدی کیلئے نفرتوں کا دھواں نہ بھرا ہو............ مگر اس مشتعل اور کشیدہ فضا میں ایک ایسی ہستی موجود تھی جس کی نظریں مستقل آفریدی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ کسی مجسمے کی مانند خاموش بیٹھی ہوئی یہ ہستی اس نوجوان اور دلکش لڑکی کی تھی جسے اہل چتوڑ نرملا کماری کے نام سے جانتے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کا عشق زدہ حکم نامہ سن کر دربار میں موجود ایک ایک فرد کے جذبات برانگیختہ ہو گئے تھے۔ خود نرملا کماری بھی اپنی بہن کے حوالے سے سلطان کے اس پیغام کو انتہائی ناشائستہ حرکت سمجھتی تھی مگر علی عامر آفریدی کی دلکش اور باوقار شخصیت نے اس کی توجہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کبھی وہ علاء الدین خلجی کا اقتدار کے نشے میں ڈوبا ہوا محبت نامہ سن کر اپنے سینے میں نفرت کا جذبہ موجزن پاتی اور کبھی آفریدی کی سحر کار شخصیت میں کھو کر رہ جاتی۔ اس وقت بھی نرملا کماری' علی عامر آفریدی ہی کی طرف دیکھ رہی تھی کہ راجہ رتن سنگھ کی تیز آواز نے اسے چونکا دیا چتوڑ کا حکمراں اپنی خوبصورت رانی کو زمانے کے نشیب و فراز اور سیاست کے پیچ و خم سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"علاء الدین آدمیت کی قبا میں ایک خون آشام درندہ ہے جس کے خونی پنجے اور آہنی دانت انسانی بستیوں کی طرف لپک رہے ہیں اس کی وحشتوں کے خلاف حصار کھینچنا اتنا آسان نہیں۔ تمہیں بہرحال ضبط و ہوش سے کام لینا ہو گا۔"

"سلطان نے آپ کے ناموس کو بدترین گالی دی ہے۔" رانی پدمنی اسی تند و تیز لہجے میں راجہ رتن سنگھ سے مخاطب ہوئی۔ "آپ نے میرے بارے میں ایک نامحرم کے غلیظ کلمات سن کر نہ صرف اپنے کان بند کر لئے ہیں بلکہ مجھے بھی مشورہ دے رہے ہیں کہ میں اپنی سماعتوں پر پہرے بٹھا دوں اور شرمناک باتوں کو ایک کڑوی دوا سمجھ کر پی جاؤں۔ نہیں! سمراٹ! میں اس سیاست کی قائل نہیں۔ یہ سیاست نہیں' بے ضمیری اور بے حیائی کی بدترین علامت ہے جسے برداشت کرنے کے بعد عورت' عورت نہیں رہتی۔"

راجہ رتن سنگھ شدید اعصابی دباؤ کا شکار تھا۔ وہ اس نازک ترین صورت حال پر قابو پانے کیلئے ابھی کوئی تدبیر سوچ ہی رہا تھا کہ راجپوت سردار اپنی اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"مہاراج! ہم آپ کی ذہانت اور تدبر کے قائل ہیں مگر یہ ہماری زندگی کی سب سے زیادہ شرمناک گھڑیاں ہیں۔ ہم ان گھڑیوں میں زندگی کو نہیں' موت کو گلے لگاتے ہیں۔ رانی کا یہ غیظ و غضب راجپوتوں کی غیرت کا فطری تقاضا ہے۔ انہیں ایسا کوئی مشورہ نہ دیجئے جسے قبول کرنے کے بعد وہ راجپوتوں کی تاریخ میں ایک سیاہ باب بن کر رہ جائیں۔"

راجہ رتن سنگھ اہلِ دربار کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر حیرت وحسرت سے ہاتھ ملتا رہا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس بگڑی ہوئی صورت حال پر کس قدر قابو پائے؟

"تمہارا سلطان ہماری عدالت میں دنیا کا ایک بدترین مجرم ہے۔" رانی پدمنی کی آواز بلند ہوئی تو اہلِ دربار کے ہونٹوں کی گمشدہ مسکراہٹ لوٹ آئی.......... "کیا تمہیں پتہ ہے کہ تمہارے فرمانروا نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے؟"

"میں نے آپ سے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ سلطان کا پیغام ایک راز ہے اور راز ہمیشہ تنہائی چاہتا ہے۔" علی عامر آفریدی کے لہجے میں بے خوفی کی وہی گرج اور وفاداری کی تڑپ تھی.......... "مجھے اس تلخ کلامی کیلئے معاف کیا جائے کہ میری نظر میں خود رانی چتوڑ مجرم ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے اہم ترین راز کو خلوت سے کھینچ کر محفل میں لائیں۔"

مہامنتری وکرم سنگھ کی بیٹی نرملا کماری سحر زدہ سی آفریدی کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ پھر اس کی محویت کا طلسم اس وقت ٹوٹا جب رانی پدمنی نے چیختے ہوئے کہا۔

"آفریدی! تم کیسے بے ضمیر انسان ہو؟"

"میری بے ضمیری سے رانی چتوڑ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اس وقت صرف ایک سفیر ہوں۔ ایفائے عہد کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ایک سفیر.......... آفریدی کی اپنی ذات تو کابل کے کہساروں میں کہیں گم ہو گئی ہے۔ اب میرا ایک ایک جذبہ 'ایک ایک سانس دلی کی پابند ہے۔ اس وقت میری آنکھ سلطان کی آنکھ اور میری زبان سلطان کی زبان ہے۔ میں صرف ایک نامہ بر ہوں 'ایک راز کا امین ہوں اور امانت اسی طرح منتقل کی جاتی ہے۔" آفریدی کے لہجے میں وہی شمشیر جیسی کاٹ اور پہاڑ جیسی استقامت تھی۔

رانی پدمنی کی برہمی کچھ اور بڑھ گئی.......... "تم بھی سلطان کے شریکِ جرم ہو۔ تمہارا وہ عیاش حکمران دوسروں کی بیویوں پر اپنی گناہ گار نظریں ڈالنے والا 'ہماری دسترس سے دور ہے مگر ہم اسے معاف نہیں کریں گے۔"

آفریدی کے دل ودماغ جل اٹھے۔ وہ اپنے آقا کی تحقیر برداشت نہیں کر سکتا تھا.......... "رانی چتوڑ کو لازم ہے کہ وہ اپنے لہجے کو شائستہ بنائیں اور اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔" رانی پدمنی کی ذلت آمیز گفتگو سن کر علی عامر آفریدی پر شدید ردعمل ظاہر ہوا تھا۔

"کیسا اخلاق اور کیسی شائستگی؟" شدید غضب میں رانی پدمنی ایک بار پھر اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی.......... "تم نے اس بھیڑیئے کا جو پیغام ابھی سرِ دربار پڑھا ہے۔ کیا اس کا کوئی ایک حرف اس قابل ہے جسے شائستگی اور اخلاق کے دائرے میں شامل کیا جا سکتا ہے؟"

"اس پیغام کا یہ جواب نہیں کہ رانی چتوڑ بھرے دربار میں ہندوستان کے ناقابلِ تسخیر شہنشاہ کو اس طرح دشنام طرازی کا ہدف بنا ڈالیں.........." علی عامر آفریدی بھی اپنے دلائل سے کام لے رہا تھا..........

"اگر آپ سلطان کی خواہش کا احترام نہیں کر سکتیں تو اسے سختی کے ساتھ جھٹلا سکتی ہیں مگر فرمانروائے ہند کی یہ کردار کشی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ وہ جس کے حضور انسانی ہونٹ پتھر کے ہو جاتے ہیں اور آدم زادوں کی زبانیں گل کر گر جاتی ہیں' اسے ایسے نازیبا الفاظ سے یاد کرنا سنگین جرم ہے۔"

"ہمارے حضور بھی یہ گستاخی ناقابلِ معافی جرم ہے۔" رانی پدمنی مجسم آگ بن گئی تھی۔

"یہ فیصلہ وقت کرے گا کہ کس کا گناہ قابلِ معافی ہے اور کس کا جرم لائقِ تعزیر؟" آفریدی کے لہجے کی سرکشی میں دم بہ دم اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ "میرے سلطان کی جانب وہی شخص انگشت نمائی کر سکتا ہے جس

کا اپنا دامن داغدار نہ ہو۔ علاء الدین خلجی کی ہوس کاریوں کے افسانے بیان کرنے والے روز و شب کے آئینے میں اپنے چہرے تو دیکھیں کہ ان کے نقش و نگار کتنے بھیانک اور خون آشام ہیں۔ خدا کی قسم! میں نے چتوڑ کے شبستانوں میں جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسے بیان کر دوں تو یہ اٹھی ہوئی گردنیں زمینوں پر جھک جائیں۔ اس اعتبار سے میرا سلطان فرشتہ ہے کہ وہ زندگی کی شاخ پر کھلنے والی کلیوں کو نہیں نوچتا 'نوخیز جوانیوں سے ان کے خواب نہیں چھینتا اور بے دست و پا اچھوت دوشیزاؤں کو اپنی ہوس کے مذبح خانے میں لے جا کر قتل نہیں کرتا۔ وہ ایک شجاع انسان ہے۔ اسے صرف مغرور بتوں کو اپنے قدموں پر جھکانے سے خوشی ہوتی ہے۔"

"مگر میں وہ بت نہیں ہوں جو تمہارے سلطان کو سجدہ کر سکے۔" رانی پدمنی بھی فرطِ غضب سے پاگل سی نظر آ رہی تھی.......... "یہاں میری خدائی ہے 'عظیم غیرت مند راجپوتوں کی خدائی جسے سلطان علاء الدین خلجی جیسے راکشش کا نام سننا بھی گوارہ نہیں۔" رانی پدمنی ایک بار پھر تہذیب اور شائستگی کے دائرے سے نکل کر سلطان علاء الدین خلجی کی تحقیر پر اتر آئی تھی۔

"میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ اگر سلطان آپ کی نظروں میں مجرم ہیں تو آپ انہیں سزا دینے کا پورا حق رکھتی ہیں مگر میں آپ کو یہ اختیار نہیں دے سکتا کہ آپ میرے سامنے میرے حکمران کیلئے کسی حرفِ بد کا استعمال کریں۔"

علی عامر آفریدی نے انصاف پسندانہ بات کہی تھی جسے تنگ نظر اور مستقل درباری تو نہیں سمجھ سکے مگر نرملا کماری نے ایک مرتبہ پھر آفریدی کو ایسی نظروں سے دیکھا تھا جو عام نظروں سے بہت مختلف تھیں۔ ایسی نظریں جن میں پسِ پردہ کوئی اور ہی افسانہ تخلیق پا رہا تھا۔ وہ اپنی نشست پر بار بار پہلو بدل رہی تھی اور اب اس کے احمریں ہونٹوں پر ایک شگفتہ سا تبسم بھی رقص کرنے لگا تھا۔ اہلِ دربار نرملا کماری کی طرف متوجہ نہیں تھے ورنہ انہیں اندازہ ہو جاتا کہ یہ خوبصورت راجپوت زادی آفریدی کی باوقار اور سحر کار شخصیت میں گم ہوتی جا رہی ہے۔ اور وہ چاہتی ہے کہ دربار چتوڑ میں سلطان کا سفیر ہی فاتح قرار پائے۔ نرملا کماری کے جذبات کا یہ رجحان نہیں تھا کہ اس کی بہن رانی پدمنی کی تحقیر ہو مگر وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ آفریدی کو کسی عنوان شکست ہو جائے۔ عجیب صورت حال تھی۔ نرملا کماری' سلطان علاء الدین خلجی سے نفرت کرنے لگی تھی مگر اس کے سفیر کیلئے اس کے دل میں نرم گوشے ابھر رہے تھے۔ یہ بڑا تضاد تھا اور بڑی کشمکش تھی۔

اچانک نرملا کماری کے دلکش تصورات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ رانی پدمنی تیز آواز میں آفریدی سے مخاطب ہوئی۔ "تم سلطان علاء الدین خلجی کے جرم میں برابر کے شریک نہ سہی مگر اس کے معاون ضرور ہو۔ اور میں نے اسی معاونت کے سلسلے میں تمہارے لئے ایک سزا منتخب کی ہے۔" یہ کہتے کہتے یکایک رانی پدمنی کے لہجے میں تبدیلی آ گئی تھی۔ اس تغیر پر اہلِ دربار نے بھی اپنی حکمران کو چونک کر دیکھا تھا۔

"ایک سفیر کو اپنے فرائض انجام دیتے دیتے کبھی اپنی جان سے بھی گزر جانا پڑتا ہے۔" رانی پدمنی کا غضب اور سزا کی دھمکی بھی آفریدی کے لہجے سے اس کا سکون نہیں چھین سکی تھی۔

"اگر تم سرِ دربار اپنے سلطان کی مذمت کرو تو ہم تمہارا گناہ معاف کر سکتے ہیں۔" رانی پدمنی کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے کسی انسان کی زندگی اور موت پر اسے مکمل اختیار حاصل ہے۔ "کہو کہ تمہارا سلطان درندہ ہے جو معصوم انسانوں کے گوشت سے اپنی بھوک مٹاتا ہے اور بے گناہ آدم زادوں کے خون سے اس کی پیاس بجھتی ہے۔"

علی عامر آفریدی کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ رانی پدمنی اس قدر ذلت آمیز شرط پیش کرے گی۔

"اور یہ بھی کہو کہ تمہارا سلطان بزدل ہے جو اپنی فوجی طاقت کے نشے میں غیرت منداور شجاع انسانوں کے سر اپنے قدموں پر جھکانا چاہتا ہے۔" رانی پدمنی نے اپنے شرائط نامے کا ایک اور رسوا کن ورق الٹ دیا تھا۔ "اور یہ بھی کہو کہ اس کے ہاتھ شیطان کے ہاتھ ہیں جن کی درازی سے کوئی عزت دار شخص محفوظ نہیں۔ اور یہ بھی کہو کہ وہ فاتح ہندوستان نہیں' ایک غاصب' ایک لٹیرا ہے جسے گردش وقت مسند اقتدار تک لے آئی ہے۔" یہ کہہ کر رانی پدمنی خاموش ہو گئی اور علی عامر کو انتہائی تحقیر آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

آفریدی کسی مجسمے کی مانند ساکت کھڑا تھا اور اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ اس طویل گفتگو کے دوران یہ پہلا مرحلہ تھا جس کی سنگینی نے آفریدی سے اس کی زبان چھین لی تھی۔

"اگر تمہیں ہماری یہ شرائط حرف بہ حرف منظور ہیں تو پھر تمہارا گناہ معاف کیا جا سکتا ہے۔" رانی پدمنی نے آفریدی کے تنِ داغ داغ پر اپنے زاویے سے نشتر زنی کی تھی۔

"ورنہ.........۔" آفریدی نے بمشکل اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میری کیا سزا ہوگی؟"

"تم کہہ چکے ہو کہ تمہاری آنکھیں سلطان کی آنکھیں ہیں اس لئے ان بے ادب آنکھوں کو بجھا دیا جائے گا اور تم یہ بھی کہہ چکے ہو کہ تمہاری زبان سلطان کی زبان ہے ہم ایسی گستاخ زبان کو کاٹ کر پھینک دیں گے۔" رانی پدمنی نے آفریدی کے جرم کی سزا سنادی تھی اور اس فیصلے سے درباریوں میں مسرت وجوش کا ہلکا ہلکا شور ابھرنے لگا تھا۔

"یہی انصاف ہے اور یہی سلطان کی گالیوں کا مناسب ترین جواب ہے۔" اچانک رانی پدمنی کا سپہ سالار ہری سنگھ کھڑا ہوا اور اپنی شمشیر کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر بہ آواز بلند کہنے لگا۔ "راجپوتوں کی آبرو' مہارانی پدمنی پر دیوتاؤں کا کرم ہمیشہ سایہ فگن رہے۔"

ہری سنگھ کے بعد دیگر سرداران قوم بھی رانی پدمنی کے فیصلے کی پرزور تائید کرنے لگے۔ راجپوتوں کی رگوں میں ابلنے والا خون مسلسل مطالبہ کر رہا تھا کہ رانی پدمنی جلد از جلد اپنے فیصلے کو عملی شکل دے کر ایک غیرت مند قوم کی خواہشات کا احترام کریں۔

مہامنتری وکرم سنگھ سر جھکائے بیٹھا تھا اور پسینے کے قطرے ٹپک ٹپک کر اس کے جوتوں کو بھگو رہے تھے۔ نرملا کا سرخ و سفید اور شاداب چہرہ شدتِ الم سے دھواں ہو گیا تھا۔ اور اسے زندگی میں پہلی بار احساس ہوا تھا جیسے آنے والے لمحات اس کی متاع عزیز چھین کر وقت کے گرد و غبار میں گم ہو جانے والے ہوں۔ راجہ رتن سنگھ کی پیشانی لکیروں سے بھر گئی تھی مگر اس نے ابھی تک اپنی مغرور بیوی کے معاملات میں مداخلت نہیں کی تھی۔

رانی پدمنی ایک بار پھر علی آفریدی سے مخاطب ہوئی۔ "اگر تم ہماری مرضی کے مطابق اپنے سلطان کی مذمت کرنے کو تیار ہو تو دردناک سزا کا یہ حکم واپس لیا جا سکتا ہے۔" چتوڑ کی حکمراں سلطان کے سفیر کو خوفزدہ کرنے کیلئے نفسیاتی دباؤ ڈال رہی تھی۔

"بے شک! رانی پدمنی اور راجپوت سرداروں نے اپنی غیرت کے ترانے بہت پرشور آہنگ کے ساتھ گائے مگر افسوس! ان لوگوں نے اپنے مخاطب کی شخصیت کو نظر انداز کر دیا۔ جب سلطان علاءالدین خلجی کے سفیر نے پہلی بار لے چھیڑی تھی تو رانی چتوڑ کو اندازہ ہو جانا چاہئے تھا کہ نغمہ گر کون ہے اور کہاں

سے آیا ہے؟ اب موت کا رقص ہو یا زنجیروں کی جھنکار' جو کہنا تھا کہہ دیا گیا اور جو سننا تھا سن لیا گیا۔ میں اپنا فرض ادا کر چکا رانی پدمنی بھی اپنے فیصلوں میں آزاد ہیں۔" یہ کہہ کر علی عامر آفریدی نے ان راجپوت سرداروں کی طرف دیکھا جو اپنی شمشیریں بے نیام کئے ہوئے اس کیلئے اذیت ناک سزا کا مطالبہ کر رہے تھے۔ آفریدی کے ہونٹوں پر ایک ایسی تلخ مسکراہٹ ابھر آئی تھی جو راجپوتوں کے گھر میں ان کے تمام تر اقتدار کا مذاق اڑا رہی تھی۔

"اس کی گستاخ آنکھیں بجھا دو اور بے ادب زبان کاٹ دو۔" رانی پدمنی نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تھا۔

"سلطان سے انتقام لینے کا یہ انداز غیر سیاسی ہے۔" راجہ رتن سنگھ نے رانی پدمنی کی آتش انتقام کو اپنے تدبر کے چھینٹوں سے بجھانا چاہا۔ مگر نفرت کی اس آگ کو بجھانے کے لئے الفاظ کے چند قطرے ناکافی تھے۔

"سمراٹ! میں خود بھی سیاست کے پیچ و خم کو سمجھتی ہوں مگر سیاست انسان کی ہر بیماری کا علاج نہیں ہے۔" شوہر سے گفتگو کرتے ہوئے بھی رانی پدمنی کا لہجہ تلخ تھا۔ "اگر شاہی سفیر کو کسی اعزاز کے بغیر رخصت کر دیا گیا تو سلطان کے ناپاک حوصلے اور بلند ہو جائیں گے۔"

"سفیر کا اپنی زبان اور آنکھوں سے محروم ہو جانا کوئی سرکاری اعزاز نہیں۔" راجہ رتن سنگھ کا لہجہ ناصحانہ تھا جیسے وہ کسی ضدی بچے کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ "یہ تو ہماری طرف سے دی جانے والی ایک ورگالی ہوگی جو سلطان کے قہر کی آگ کو بھڑکا کر رکھ دے گی۔"

"میرے وقار کا پیرہن جل جانے کے بعد اس آگ کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔" رانی پدمنی سیاسی روش اختیار کرنے پر قطعاً آمادہ نہیں تھی۔ "اب وہ آگ تخت و تاج کو جلائے یا چتوڑ کے ایک ایک گوشے کو پھونک کر رکھ دے۔"

راجہ رتن سنگھ نے اپنی غضب ناک بیوی کو منانے کیلئے کئی متبادل طریقے پیش کئے آخر وہ اس پر آمادہ ہو گئی کہ علی عامر آفریدی ایک بار اپنی زبان سے سلطان کو گناہ گار کہہ دے تو اسے چتوڑ سے رخصت کر دیا جائے گا۔ ورنہ اس دوران اس پر اس وقت تک تشدد جاری رہے گا جب تک سفیر کے ہونٹوں پر علاءالدین خلجی کیلئے کوئی حرفِ گستاخ نہیں ابھرتا۔

آفریدی نے ایک بار پھر رانی پدمنی کے اس ذلت آمیز مطالبے کو ٹھکرا دیا تھا جس کے جواب میں اس کے جسم پر تازیانوں کی بارش شروع ہو گئی تھی طاقتور جلاد آفریدی کو مشق ستم بنا رہے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے جا رہے تھے کہ وہ اپنے سلطان کی مذمت کرے راجہ رتن سنگھ پریشان تھا کہ بگڑے ہوئے راجپوتوں اور غضب ناک پدمنی کو اپنے حکم کا پابند نہیں کر سکا تھا۔

مہامنتری وکرم سنگھ کی گردن بدستور جھکی ہوئی تھی اگر وہ ایک بار بھی سر اٹھا لیتا اور کوئی درباری اس کے چہرے کا جائزہ لیتا تو صاف ظاہر ہو جاتا کہ وہ شدید اذیت و کرب کا شکار تھا۔ وکرم سنگھ کے علاوہ دربار میں ایک اور ہستی بھی موجود تھی جس نے آفریدی کے جسم پر پڑنے والے تازیانوں کی ضرب اپنے دل پر محسوس کی تھی۔ یہ نرملا کماری تھی جس کا شگفتہ چہرہ شدت رنج و الم سے دھواں ہو گیا تھا اس نے اپنے دل پر جبر کر کے ان چیخوں کو روکا تھا جو ہونٹوں کی قید سے آزاد ہو جانا چاہتی تھیں۔

آفریدی کا پورا جسم گلرنگ ہو گیا تھا وہ زخم جو ملک کافور کے سپاہیوں کی عنایت سے ابھی تک ہرے تھے'

ان سے دوبارہ خون کے آبشار جاری ہو گئے تھے اور کچھ نئے زخم بھی تھے جو آفریدی کی قبا کو رنگین بنانے میں مصروف تھے۔ تازیانے کی ہر ضرب پر آفریدی کے چہرے کا رنگ بدل جاتا مگر کوئی آواز بلند نہ ہوتی۔

رانی پدمنی کے حکم پر جلاد اس سے وہ مطالبہ کر رہے تھے' آفریدی اس کے جواب میں یہی کہتا۔ "رانی چتوڑ! مجھ سے واقف نہیں گردش وقت نے انہیں میرے جسم پر با اختیار بنا دیا ہے مگر جذبے ان کے تشدد کی نیلام گاہ میں فروخت نہیں ہو سکتے ممکن ہے کچھ لوگوں نے ان کے ہاتھ اپنے ضمیر اور زبانیں بیچ دی ہوں مگر ان کی لگائی ہوئی یہ قیمت مجھے خریدنے کیلئے ناکافی ہے میں جس کے ہاتھوں فروخت ہوا ہوں وہ سلطان ذی وقار کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔ خدا میرے تاجدار کے جلال کو برقرار رکھے۔ عنقریب انہیں خبر ہو جائے گی کہ آفریدی پر کیا گزری؟ پھر راجپوت سورماؤں کو اندازہ ہو گا کہ ایک سفیر کی تذلیل کیسے کیسے خونیں مناظر پیش کرتی ہے۔ میرا لہو تو بدن میں جمع ہی اس لئے ہوا تھا کہ ایک دن وہ بہہ جائے اور چتوڑ کی زمین پر ان مٹ نقش و نگار بنا دے۔"

آفریدی کے صبر و استقامت پر تشدد کی لے اور بڑھ جاتی۔ یہاں تک کہ آفریدی بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑا۔

"بس مہارانی! آپ کا شوقِ انتقام پورا ہو چکا۔" راجہ رتن سنگھ سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "شاہی سفیر کو زندہ رہنے دیں کہ اس کی موت کا قرض راجپوتوں سے ادا نہیں ہو سکے گا۔"

"نہیں سمراٹ! ابھی میرے انتقام کی آگ کہاں بجھی ہے۔ سفیر کے خون کی چھینٹوں سے تو شعلے کچھ اور بھڑک گئے ہیں۔" رانی پدمنی اس قدر غصے میں تھی کہ درباری آداب کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر تیز قدموں سے باہر جانے لگی۔

راجہ رتن سنگھ نے بڑے کرب کے عالم میں اس عورت کو جاتے ہوئے دیکھا جس نے چتوڑ کی سیاست کو وادیٔ مرگ تک پہنچا دیا تھا اور وہ خود ایک خاموش تماشائی کی طرح اپنے اقتدار کی لاش کا نظارہ کر رہا تھا۔ رانی پدمنی کے جاتے ہی رتن سنگھ نے ہاتھ کے اشارے سے تخلیئے کا حکم دیا۔ جب دربار خالی ہو گیا اور مہامنتری بھی اٹھ کر جانے لگا تو راجہ رتن سنگھ نے اسے پکارا۔ "وکرم سنگھ! تم بھی ہمیں اس غم انگیز فضا میں تنہا چھوڑ کر جا رہے ہو۔"

وکرم سنگھ اپنے حکمراں کی آواز سن کر پلٹ آیا اور سر جھکا کر کہنے لگا۔ "سمراٹ! میں کہاں جا سکتا ہوں یہ تو اس حکم کی تعمیل تھی جو اہل دربار کو دیا گیا تھا۔"

"تم عام اہل دربار میں سے نہیں ہو۔" راجہ رتن سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم شاہی سفیر کو اپنی نگرانی میں رکھو کہ آفریدی کے لئے تمہارے مکان سے زیادہ محفوظ کوئی دوسری پناہ گاہ چتوڑ میں موجود نہیں ہے۔"

مہامنتری وکرم سنگھ نے گردن کے خم سے اپنے فرمانروا کے حکم کی تعمیل کا اظہار کیا اور پھر چند سپاہیوں کی مدد سے بے ہوش آفریدی کو اٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ دوسرے ہی لمحے راج وید بھی طلب کر لیا گیا جس نے فوری طور پر آفریدی کے زخموں پر مرہم رکھ دیا تھا۔

☆......☆......☆

پھر جیسے ہی رتن سنگھ اپنے کمرے میں داخل ہوا' رام دیو کی پالکی بھی وہاں پہنچ گئی۔ عیار جادوگر بہت دیر تک راجپوت سمراٹ کو یہی سمجھاتا رہا کہ جب تک شاہی سفیر کو قتل نہیں کیا جائے گا اس وقت تک چتوڑ پر مختلف

عذاب نازل ہوتے رہیں گے۔ رتن سنگھ اپنے دل پر جبر کر کے رام دیو کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ پھر اس نے بڑی مشکل سے فریب کار ساحر کو رخصت کیا۔

رام دیو کے جاتے ہی راجہ رتن سنگھ اپنی خصوصی نشست گاہ میں واپس آ گئے۔ راجپوت سمراٹ پر ایک بار پھر وحشت طاری ہو گئی تھی اور اس نے شغلِ مے نوشی شروع کر دیا تھا۔ رانی پدمنی خاموشی سے شوہر کی اضطراری کیفیت کو دیکھتی رہی پھر تابِ ضبط نہ رہی تو بول اٹھی۔

"آخر کب تک شراب پیتے رہیں گے؟" پدمنی کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔

"جب تک میں پاگل نہیں ہو جاتا۔" راجہ رتن سنگھ کی گفتگو کا انداز دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی حکمران کو یہ خبر دی جا رہی ہو کہ اس کی فوجیں مسلسل پیچھے ہٹ رہی ہیں اور کسی بھی وقت ملک پر دشمن کا قبضہ ہو سکتا ہے۔

"آخر کیوں؟" رانی پدمنی نے بڑے غرور و ناز کے ساتھ کہا۔ "وہ کونسا غم ہے جسے آپ شراب کے ذریعے فراموش کرنا چاہتے ہیں؟"

راجہ رتن سنگھ اپنی خوبصورت اور نوجوان بیوی کی اس بے نیازی پر سلگ اٹھا تھا۔ "تم نہیں جانتیں کہ مجھے کیا غم ہے؟" چتوڑ کے حکمراں کا لہجہ بہت تلخ تھا۔

"نہیں۔" پدمنی کا وہی اندازِ دلربائی تھا۔

"تمہیں بہت جلد سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔" راجہ رتن سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔ "جب علاءالدین خلجی چتوڑ کی بنیادیں اکھاڑ پھینکے گا۔ جب حیادار دوشیزاؤں کے سروں سے آنچل کھینچ لئے جائیں گے۔ جب سہاگنوں کی سیج چتا بن جائے گی۔ جب کمر خمیدہ بوڑھے تپتے ہوئے صحرا میں موت کی تمنا کر رہے ہوں گے جب کڑیل جوان پیوند خاک ہو جائیں گے اور جب معصوم بچوں کے سینے پر یتیمی کے داغ روشن کر دیئے جائیں گے اس وقت تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔" راجہ رتن سنگھ کا پورا جسم لرز رہا تھا' اس نے گھبرا کر کرسی کا سہارا لیا اور بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا۔

"سمراٹ! آپ کی باتیں سن کر تو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے دلی کا سفیر دربار چتوڑ میں تقریر کر رہا ہو۔" رانی پدمنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مہارانی! بڑی عجیب بات ہے۔" راجہ رتن سنگھ کو پدمنی کی یہ شوخی و شرارت سخت گراں گزری تھی۔

"تو کیا میں تمہاری بیوی ہوتے ہوئے بھی سلطان کے حرم میں چپ چاپ داخل ہو جاتی۔" رانی پدمنی کی بے داغ پیشانی بے شمار شکنوں سے بھر گئی تھی۔

"تم سے یہ کس نے کہا تھا کہ راج محل چھوڑ کر علاءالدین خلجی کے شبستانِ کیف و نشاط میں چلی جاؤ۔" راجہ رتن سنگھ نے خلاف معمول تند و تیز لہجے میں کہا۔

"پھر سلطان کے حکم نامے کا کیا مفہوم تھا؟" رانی پدمنی اسی ادائے بے نیازی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"وہ اقتدار کی ایک شیطانی ادا تھی اور اس شیطانی ادا کا یہ جواب نہیں تھا کہ شاہی سفیر کے جسم پر تشدد کی انتہا کر دی جائے۔" راجہ رتن سنگھ کا ہاتھ دل پر تھا اور وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ "میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ علاءالدین ایک سیاہ آندھی ہے جب وہ کسی طرف کا رخ کرتا ہے تو پھر موت کی تاریکی کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اس کے ایک سفیر کے جسم پر زخموں کی گل کاریاں کی گئی ہیں وہ انتقاماً ہزاروں راجپوتوں کے جسموں پر موت کے نشان ثبت کر دے گا۔ اور پھر چتوڑ کے خوبصورت محلات کو شمشان

بھومی (قبرستان) بنانے کا الزام اس عورت کے سر جائے گا جسے ناجائز آزادیاں بخشی گئی تھیں۔"
راجہ رتن سنگھ نے ایک آہِ سرد کھینچی اور کرسی کی پشت سے سر ٹیک دیا۔
رانی پدمنی نے ایک بار پھر ناز و ادا کا سہارا لے کر سرکشی اختیار کرنے کی کوشش کی تھی مگر راجہ رتن سنگھ نے اسے ڈانٹ دیا۔

"خاموش ہو جاؤ - یہ میرے ہی اعمال کی سزا ہے کہ میں نے تمہاری محبت میں گرفتار ہو کر سیاست کے آداب کو فراموش کر دیا۔ میں نے یہ نازبرداریاں اس لئے نہیں کی تھیں کہ تم میرے اقتدار کو تماشا بنا ڈالو۔ تمہیں راجپوت قوم کے سامنے اس لئے سربلند نہیں رکھا گیا تھا کہ میری ذات محض ایک کھلونا بن کر رہ جائے۔" راجہ رتن سنگھ کا لہجہ بہت سوگوار تھا اور اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمایاں تھے۔

"اب وقت آ گیا ہے کہ عشق اپنے دعوے کی سچائی کو حسن کے حضور ثابت کرے۔" رانی پدمنی بڑے متکبرانہ لہجے میں بول رہی تھی۔ "کیا آپ نے مجھ سے شادی کے بعد یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ میرے اور آپ کے درمیان جو شے بھی حائل ہوگی، اسے مٹا دیا جائے گا؟ کیا آپ نے شبِ عروسی میں میرے حسن کی قسم کھاتے ہوئے یہ نہیں کہا تھا کہ میری ایک جنبشِ لب پر چتوڑ کے تاج و تخت تک قربان کر دیئے جائیں گے؟ پھر یہ کشمکش کیسی اور وعدوں سے یہ انحراف کیوں؟"
"ہاں! مجھے اپنا کہا ہوا ایک ایک حرف یاد ہے۔" رتن سنگھ کی آواز بجھی بجھی محسوس ہو رہی تھی۔
"میں اپنے عہد پر قائم ہوں مگر تمہارے حسن کی یہ شادابی و شگفتگی بھی میرے اقتدار کے دم سے قائم ہے۔ جب یہ تخت جلا دیا جائے گا اور دشمن میرے تاج کو چتوڑ کی گلیوں میں اچھالتے پھریں گے اس وقت یہ ناز، یہ غرور، یہ ادا، یہ عشوہ طرازی کہاں پناہ ڈھونڈے گی۔ تمہارا یہ حسنِ توبہ شکن آسائشوں کی آغوش میں جوان ہو کر فتنہ گری کی منزل تک پہنچا ہے۔ اگر تم اقتدار کے اس سائبان سے محروم ہو جاؤ گی تو تمہاری آنکھیں جادوگری کی قوت سے محروم ہو جائیں گی اور عارضوں کے گلاب صحرا کی گرم ہوا سے جھلس کر رہ جائیں گے۔ پھر تمہیں کوئی پہچان بھی نہیں سکے گا کہ یہ راجپوت ساحرہ رانی پدمنی ہے یا تیز دھوپ میں جل کر سیاہ ہو جانے والی کوئی عام سی دیہاتی لڑکی؟" راجہ رتن سنگھ بڑے ہوش کی باتیں کر رہا تھا۔ "تمہارا ناز و غرور دولت و اقتدار سے مشروط ہے۔ مہارانی ابھی تم نے افلاس کی صورت تک نہیں دیکھی۔ غربت اور محرومی کا عفریت ناز و غرور تو کجا، انسان سے اس کی پہچان تک چھین لیتا ہے۔"
"ہوتا ہوگا۔" رانی پدمنی کی گردن کا کج کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا۔ "اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے تو سب کچھ برداشت کرنا ہوگا۔ سلطان کے سفیر کو میری مرضی کے مطابق قتل کیا جائے گا۔ اگر اس کے جواب میں چتوڑ پر قیامت بھی نازل ہو جائے تو اسے گوارہ کیجئے کہ قیامت کی ادا میری ادا کے مقابل نہیں ہو سکتی۔ میں رانی پدمنی ہوں جس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ برقرار رکھنے کیلئے پورے چتوڑ کو قربان ہو جانا پڑے گا۔ اور یہ قربانی بھی ایک حقیر سی قربانی ہوگی۔" اتنا کہہ کر رانی پدمنی راجہ رتن سنگھ کی خلوت خاص سے نکل کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔
رانی پدمنی کے مطالبے نے سیاسی صورت حال کو بری طرح الجھا دیا تھا۔ پھر جب رتن سنگھ آزادانہ طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکا تو اس نے مہامنتری کو اپنی خلوت میں طلب کر لیا۔ "وکرم سنگھ! ہم نے اپنے دورِ اقتدار میں اتنے سیاہ دن کبھی نہیں دیکھے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے دھواں ہے، مجبوریوں اور الجھنوں کا گاڑھا دھواں جس کے درمیان کچھ نظر نہیں آتا۔" یہ کہہ کر رتن سنگھ نے ایک اور جام لبریز کیا اور اپنے

ہونٹوں سے لگا لیا۔
"ہمارے پاس ان مسائل کا حل ہے سمراٹ۔" وکرم سنگھ بڑے یقین کے ساتھ کہہ رہا تھا۔
"کوئی حل نہیں مہامنتری! کوئی حل نہیں۔" راجہ رتن سنگھ کی مایوسیاں اپنے عروج پر تھیں۔
"رانی پدمنی کی رفاقت اور علاء الدین خلجی سے بدترین دشمنی؟ ہمیں ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔"
"مجھے ایک بار مہارانی سے بات کر لینے دیجئے۔ پھر ہم کشمکش کے گرداب سے باہر نکل آئیں گے۔"
"تم اپنا یہ شوق بھی پورا کر لو۔" رتن سنگھ نے اپنے مہامنتری کو اس عورت سے مذاکرات کی اجازت دے دی تھی جو اس وقت سراپا شعلۂ برہم تھی، ہوا کا ایک سرکش جھونکا تھی اور کھل کر برس جانے والی ایک کالی گھٹا تھی۔
کچھ دیر بعد وکرم سنگھ، رانی پدمنی کے سامنے ایک ایسے شکست خوردہ سیاستداں کی طرح بیٹھا تھا جو اپنے دلائل پیش کرتے کرتے عاجز آ گیا ہو اور اس کے مخاطب نے کسی بات کا کوئی اثر قبول نہ کیا ہو۔
قہر کی دیوی راج دوت کی زندگی کی بھینٹ لینے سے کم کسی بات پر آمادہ نہیں تھی۔ وکرم سنگھ شدید مایوسی کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "مہارانی! تو پھر کیا تمہارا یہ بوڑھا چچا زہر سے زیادہ تلخ اس حقیقت کو تسلیم کر لے کہ آپ نے زندہ و خوشحال چتوڑ کے مستقبل کو بچانے میں کوئی تعاون نہیں کیا۔"
"یقیناً!" رانی پدمنی مزید غضبناک ہو گئی۔ "تم بھی تسلیم کر لو اور اپنے سمراٹ کو بھی سمجھا دو کہ چتوڑ کا مستقبل ہماری آبرو سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔"
مہامنتری وکرم سنگھ خود بھی راجپوت تھا۔ اس کی غیرت کے بھی وہی زاویے تھے جن کا مظاہرہ رانی پدمنی کر رہی تھی مگر قوم کی سلامتی کے احساس نے اس کے خون کو بہت پہلے ٹھنڈا کر دیا تھا۔ وہ اپنے مشتعل جذبوں کو ہوش و خرد کے تابع رکھتا تھا لیکن آج جب رانی پدمنی نے اپنی عزت و آبرو کی خاطر تمام راجپوت خواتین کے ناموس کو جھٹلا دیا تو وہ خاموش نہ رہ سکا۔
"مہارانی! آپ جس کو غیرت و حیا اور آبرو کا نام دے رہی ہیں وہ محض خود غرضی ہے، پندارِ ذات ہے اور انا کا جھوٹا طلسم ہے۔" وکرم سنگھ کی آواز پرشور ہو گئی تھی اور غصہ کا رنگ نمایاں طور پر جھلکنے لگا تھا۔
رانی پدمنی، وکرم سنگھ کے چہرے کا تغیر اور لب و لہجہ کی گرمی دیکھ کر چند ساعتوں کے لئے دم بخود رہ گئی۔ وکرم سنگھ نے آج تک اس سے اس طرح گفتگو نہیں کی تھی۔ پدمنی کا ذہن جل اٹھا اور پھر اس کے ہونٹوں کو بھی آگ لگ گئی۔
"مہامنتری! آپ نے اپنی حیثیت کو فراموش کر دیا ہے۔"
"ہاں! میں نے آج ہر اس آئینے کو توڑ دیا ہے جو مجھے میری حیثیت کا عکس دکھایا کرتا تھا۔" وکرم سنگھ کے لہجے میں وہی تپش تھی۔ "میں نہیں سمجھتا تھا کہ میرے بھائی کی یہ نشانی حرص اور خود غرضی کی اس منزل تک پہنچ جائے گی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک عورت اپنے جذبۂ خود پرستی کی تسکین کیلئے اپنی لاکھوں ہم جنسوں کو بھیڑیوں کے غول میں چھوڑ کر فرار ہو جائے گی۔"
"مہامنتری........" رانی پدمنی پوری قوت سے چیخی مگر وکرم سنگھ نے اس کی بات کاٹ دی۔
"پہلے بزرگوں کو بات مکمل کر لینے دے۔ پھر اپنی اس دریدہ دہنی کا مظاہرہ کرتی رہنا۔" وکرم سنگھ نے انجام کی پروا کئے بغیر پدمنی کو جھڑک دیا۔ "یہ بھی تو ممکن تھا کہ تو زہر کھا کر اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتی اور راجہ رتن سنگھ سے کہتی کہ تیری لاش کو علاء الدین خلجی کے پاس بھیج دیا جائے۔ سلطان کے

منہ پر تھوکنے کا یہ بھی تو ایک طریقہ تھا جسے تو نے اختیار نہیں کیا۔ مرنے کے بعد تیری آبرو کس طرح نیلام ہوتی؟ مگر راجپوتوں کی تاریخ میں یہ بات ہمیشہ کیلئے امر ہو جاتی کہ رانی پدمنی نے اپنی جان دے کر لاکھوں انسانوں کی جانیں بچالیں۔ غیرت کے اظہار کا یہ بھی تو ایک طریقہ تھا کہ تیرا مردہ جسم سلطان کے دربار میں پہنچتا اور اس بھیڑیے کے منہ پر قیامت تک کیلئے سیاہی مل دی جاتی۔ یہ بھی تو علاءالدین خلجی کے غلاظت نامے کا ایک جواب تھا۔ تیرے ہونٹوں پر یہ الفاظ کیوں نہیں آئے کہ "مجھے چتوڑ کے عزت و ناموس پر بھینٹ چڑھا دیا جائے۔" تو نے اپنی خلوتِ ناز کی آرائش کیلئے ہزاروں دوشیزاؤں کو کھلے جنگل میں چھوڑ دینا کیوں گوارہ کر لیا؟ تجھے کیا خبر ہماری راتیں کب سے بے خواب ہیں اور سلامتی کا راستہ تلاش کرنے کیلئے ہمارے ذہن کب سے جل رہے ہیں؟ ہم نے اس علاقے میں امن برقرار رکھنے کیلئے کیسے کیسے منصوبے بنائے مگر تو نے ایک بدکار جادوگر کی خوشامدانہ باتوں میں عقل و ذہانت کے تمام منصوبوں کو غرق کر دیا۔ اب اپنی ذات کے آئینہ خانے میں بیٹھ کر جبر و تشدد کے ان پتھروں کا انتظار کر جن کو دلی کے طاقتور ہاتھ چتوڑ کی طرف اچھالیں گے۔ عنقریب یہ تماشا ہونے والا ہے۔ اس سے پہلے کہ بارشِ سنگ شروع ہو جائے' اس مداری رام دیو کو بھی باخبر کر دے جس کے بے ہودہ منتروں نے تجھے غرور کی دیوی بنا دیا ہے۔" یہ کہہ کر مہامنتری وکرم سنگھ باہر جانے لگا۔

"ٹھہرو!" رانی پدمنی نے چیخ کر کہا مگر وکرم سنگھ آگے ہی بڑھتا رہا۔ "اس گستاخی کے جرم میں تمہیں وزارت عظمٰی کے عہدے سے برطرف کیا جاتا ہے اور تمہاری تمام شاہانہ مراعات سلب کی جاتی ہیں۔"

"مہارانی کو اس اعلان کی ضرورت نہیں تھی میں خود بھی اس ریاست سے وابستہ رہنا نہیں چاہتا جہاں رام دیو جیسے مداری انسانیت کے قانون سے گھناؤنا کھیل کھیلتے ہیں۔"

مہامنتری وکرم سنگھ نے بلند آواز میں کہا اور رانی پدمنی کے کمرے سے نکل گیا۔

☆..................☆..................☆

راجہ رتن سنگھ بڑی بے چینی سے وکرم سنگھ کا انتظار کر رہا تھا مگر مہامنتری' راجپوت سمراٹ کے پاس آنے کے بجائے اپنے گھر چلا گیا۔ نرملا کماری باپ کا اداس چہرہ دیکھ کر بے قرار ہو گئی۔ "کیا پھر کوئی طوفان اٹھ کھڑا ہوا؟" نرملا کے لہجے میں بڑا اضطراب تھا۔

"گردش وقت کی آگ میں سب کچھ جل گیا۔ تمہاری بہن مہارانی چتوڑ نے مجھے وزارت عظمٰی کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ وہ اپنی ذات کی خاطر پورے چتوڑ کو ایک خوں رنگ تماشا بنا دینا چاہتی ہے اور میں اس تماشے میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔"

"پھر انہیں اس تماشے کا اہتمام کرنے دیجئے۔" نرملا نے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"اگر موت اور رسوائی کے اس کھیل میں صرف راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی ملوث ہوتے تو میری دلچسپیاں نصیحت کی حدود سے آگے نہ بڑھتیں۔ میں انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاتا۔" وکرم سنگھ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "یہ حکمرانوں کا کوئی تفریحی مشغلہ نہیں کہ ہرنوں کے غول پر درندے چھوڑ کر اپنے حیوانی شوق کا محل کے جھروکوں سے نظارہ کریں۔ یہ لاکھوں انسانوں کی زندگی کا سوال ہے۔ وہ زندگی جو ہزاروں عذاب جھیلنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اقتدار اور دولت کے ذخائر راجہ رتن سنگھ یا رانی پدمنی کی خاندانی میراث نہیں۔ چتوڑ کے باغوں' کھیتوں اور زمینوں پر یہاں بسنے والے ہر انسان کا حق ہے۔ میں ان رقص کرتی فصلوں میں کیسے آگ لگا دوں اور گنگناتی ندیوں کو کس طرح خون سے بھر دوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

"اس کے علاوہ تو آپ کو مہارانی سے کوئی اختلاف نہیں؟" ایک مختصر سے سکوت کے بعد نرملا نے وکرم سنگھ سے دوسرا سوال کیا۔

"قومی مفاد سے ہٹ کر ایک اور اختلاف بھی موجود ہے اور اس کا بنیادی سبب سلطان علاءالدین خلجی کا سفیر علی عامر آفریدی ہے۔" وکرم سنگھ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ آفریدی کو قتل کرنا چاہتی ہے اور میں اسے بچانا چاہتا ہوں۔"

نرملا حیران رہ گئی۔ آفریدی کے نام پر اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی.......... "ایک ایسے شخص کی خاطر آپ راج محل کے معتوب بننا چاہتے ہیں جس سے نہ آپ کی کوئی شناسائی ہے اور نہ مذہبی رشتہ۔" نرملا کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی اور وہ باپ کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔

"دلی کے سفیر سے میرے کئی رشتے ہیں مگر لوگوں کو نظر نہیں آتے۔" وکرم سنگھ بڑے جذباتی لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کی نظریں سامنے کی دیوار پر مرکوز تھیں اور زبان سے کئی سربستہ رازوں کا اظہار ہو رہا تھا۔ "میں نے اپنی زندگی میں اس قدر شجاع نوجوان نہیں دیکھا جو مردانگی کے ساتھ تہذیب و شائستگی بھی رکھتا ہو۔ یہ پہلا رشتہ ہے جو آفریدی سے اس وقت قائم ہوا جب وہ چتوڑ کی حدود میں داخل ہوا تھا۔ پھر سلطان علاءالدین سے اس کی وفاداریوں نے ثابت کر دیا کہ سفیر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس کے اندازِ سفارت نے میرے دل کو مسخر کر لیا۔ میری آنکھوں سے فرض شناسی کی ایسی کوئی زندہ مثال نہیں گزری.......... اور پھر یہ دونوں رشتے ایک انوٹ رشتے میں ضم ہو گئے۔ وہ رشتہ سنیاسی آنند پال کے حوالے سے ہے جس نے آفریدی کو محترم بنا دیا ہے۔ اب میری نظر میں وہ علاءالدین خلجی کا نہیں' سچائی اور روشنی کا سفیر ہے۔ اگر وہ چتوڑ میں داخل نہ ہوتا تو میں زندگی بھر اندھیروں میں بھٹکتا رہتا۔ وہ میرے تاریک جذبوں کے لئے سورج لے کر آیا ہے۔"

"کیسی روشنی' کیسا سورج؟" نرملا نے چونک کر پوچھا۔

"میں تم سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھے صرف دو انسانوں سے عقیدت رہی ہے۔ ایک قتل کر دیا گیا اور دوسرا کوہِ آبو کے مندر میں اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا ہے۔" وکرم سنگھ کا اشارہ مقتول آنند پال اور مائی بھان متی کی طرف تھا۔ "میں نے ان دونوں عظیم انسانوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ مائی بھان متی ابھی کسی انقلاب کا انتظار کر رہی ہے مگر سنیاسی آنند پال انقلاب سے قبل ہی مسلمانوں کا مذہب اختیار کر چکے تھے۔ اب میں بھی اسی راستے کا مسافر ہوں جس پر سنیاسی بہت آگے جا چکے۔"

"کیا آپ بھی اپنا دھرم بدلنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" نرملا کماری پر شدید حیرت طاری تھی۔

"جس دن سنیاسی نے ایک خدا کا اقرار کیا تھا' میں نے بھی اسی دن نئی روش اختیار کر لی تھی۔" وکرم سنگھ نے بیٹی کے سامنے اپنے روحانی انقلاب کا اعتراف کر لیا۔

"میں تو اب تک یہی سمجھتی رہی کہ آپ سنیاسی آنند پال کے اقدام سے صرف متاثر ہیں۔" نرملا کماری عجیب سی الجھن میں مبتلا ہو گئی تھی۔

"دل سے اقرار تو ہو چکا' بس زبان کا اقرار باقی ہے.........." وکرم سنگھ کے اندازِ گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا۔ جیسے وہ تصورات کی دنیا میں بہت دور چلا گیا ہو۔

"پھر آپ زبان سے اقرار کب کریں گے؟" نرملا کی حیرت میں دم بہ دم اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

"بہت جلد۔" اچانک وکرم سنگھ کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ "اب آفریدی میرے قریب آ گیا ہے۔ اللہ اسے صحت دے اور دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے۔"

نرملا کی سماعتوں میں عجیب سا شور بلند ہوا۔ پہلی بار اس کے کانوں میں بھگوان کے بجائے "اللہ" کے نام کی صدا گونجی تھی۔

"بیٹی! پہلے میں اس بات سے بہت ڈرتا تھا کہ میرے بعد تمہارا کیا ہوگا؟" وکرم سنگھ نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا......... "مجھے ہر وقت یہ اندیشے خوفزدہ رکھتے تھے کہ میرے اعمال کی سزا کے بہانے کہیں یہ لوگ تمہیں جان لیوا آزار نہ پہنچائیں......... مگر سنیاسی آنند پال کی موت نے میرا یہ خوف ہمیشہ کیلئے دور کر دیا۔ وہ دنیا سے جاتے جاتے مجھے زندگی کا سب سے بڑا سبق دے گئے کہ سچائی کی راہ میں موت بھی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ میں اس موت کو دل کی تمام تر کشادگی کے ساتھ قبول کر چکا ہوں جو عنقریب میرا مقدر بننے والی ہے......... لیکن میں تمہیں اجازت دیتا ہوں تم اپنے لئے زندگی کا انتخاب کر لو۔"

باپ کی بات سن کر نرملا کے چہرے پر رنج و الم کے گہرے سائے پھیل گئے......... "کیا آپ مجھ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ میں اس زندگی کو قبول کر لوں گی؟" نرملا نے بڑے آزردہ لہجے میں باپ سے سوال کیا۔

"نہیں میری بچی! یہ توقعات باندھنے کا وقت نہیں۔ تم ابھی بہت کم عمر ہو۔ شاید نوخیزی کے عہد کی تمنائیں تمہیں اپنی ریت اور رواج سے بغاوت نہ کرنے دیں۔ اس لئے میں تمہیں ہر ذہنی کشمکش سے آزاد رکھنا چاہتا ہوں۔ بوڑھی آنکھوں کا مشاہدہ کچھ اور ہوتا ہے' نوجوانی کا زاویۂ نگاہ کچھ اور۔" وکرم سنگھ نے انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں نرملا کو سمجھانا چاہا۔

"جس سچائی کو سنیاسی جیسے باکردار انسان نے تسلیم کر لیا' ہم جیسے کمزور ارادوں کے لوگوں کو اس پر شک نہیں کرنا چاہئے۔ جو شخص تمام عمر حکومت کا معتوب رہا اور پھر جس نے موت کے سائے میں تنہا اپنی بغاوت کا اعلان کیا' وہ نظر کا فریب نہیں ہو سکتا۔ یقیناً سنیاسی کی آنکھوں نے کسی غیر معمولی شے کو دیکھا تھا ورنہ وہ اس طرح مستانہ وار مقتل کی طرف نہیں جاتے۔"

نرملا کے انداز فکر نے مہا منتری کو ناقابل بیان مسرت بخشی تھی۔ ایک شریف النفس انسان نے اپنی بیٹی کی تربیت کیلئے جو خون جگر پیا تھا وہ آج رنگ لا رہا تھا۔ "نرملا میں آج تم سے راضی ہو گیا تم میری جاں فشانی کا وہ درخت ہو جس کی گھنی چھاؤں کیلئے میں نے دیوتاؤں سے شب و روز دعائیں کی ہیں۔"

"دیوتاؤں سے؟" نرملا نے وکرم سنگھ کو ٹوکا۔

مہا منتری' نرملا کماری کی اس گرفت پر مسکرایا......... "بتوں کو پکارتے صدیاں گزر گئی ہیں۔ اس لئے زبان کی لغزش پر تمہیں کوئی حیرت نہیں ہونی چاہئے۔" وکرم سنگھ کے لہجے میں شگفتگی تھی مگر یہ شگفتگی زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔

مہا منتری کے ایک خدمت گار نے سکون کے ان چند لمحات کو منتشر کر دیا اور ایک بار پھر فضا میں تلخیاں گھل گئیں۔ خدمت گار نیم قد جھکا ہوا کہہ رہا تھا۔ "راج محل کا ملازم خاص حاضر ہوا ہے۔ راجپوت سمراٹ رتن سنگھ بہت دیر سے آپ کے منتظر ہیں۔"

رتن سنگھ کا نام سنتے ہی وکرم سنگھ کے سینے میں بیزاری کی ایک تیز لہر اٹھی مگر اس نے اپنے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ "سمراٹ کے حضور عرض کرو کہ میں ریاست کے ایک ضروری کام سے فارغ ہونے کے بعد پہلی فرصت میں حاضر ہوتا ہوں۔"

ملازم کے جاتے ہی وکرم سنگھ نے نرملا کماری کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ جب دونوں باپ بیٹی طویل راہداری طے کر رہے تھے' اس وقت وکرم سنگھ نے اچانک مڑتے ہوئے کہا۔ "میں آفریدی کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔"

"آپ نے راج دوت کو کس کمرے میں رکھا ہے؟" نرملا نے جذبوں کی روانی میں باپ سے سوال تو کر دیا مگر فوراً ہی اسے شرم اور ندامت کا احساس ہونے لگا۔

"آفریدی ہمارے مخصوص تہہ خانے میں موجود ہے۔" وکرم سنگھ نے چلتے چلتے جواب دیا۔

"مخصوص تہہ خانہ؟" نرملا نے حیرت سے پوچھا۔

"تم اس تہہ خانے کے راز سے باخبر نہیں ہو۔" وکرم سنگھ نے مختصراً سمجھاتے ہوئے کہا۔ "وہ ہمارے بزرگوں کا بنایا ہوا ایک ایسا تہہ خانہ ہے جس کے اندر داخل ہونے کا راستہ ہمارے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ رانی کی بے پناہ نفرت نے راجہ رتن سنگھ کو مجبور کر دیا کہ وہ علی عامر آفریدی کو میرے حوالے کر دیں۔ ان کے خیال میں راج دوت کی سلامتی کا یہی ایک راستہ ہے اور میرے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ میں آفریدی کو اپنے بزرگوں کے مخصوص تہہ خانے میں منتقل کر دوں۔"

"تو کیا راجپوت سمراٹ بھی اس تہہ خانے تک نہیں پہنچ سکتے؟" نرملا نے باپ سے ایک اور سوال کیا۔

"میری رہنمائی کے بغیر وہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا۔" وکرم سنگھ نے جواب دیتے ہوئے کہا......... "میں بہت جلد تمہیں اس تہہ خانے کے متعلق تمام تفصیلات بتا دوں گا۔ تہہ خانے کے راز سے اس خاندان کے وارث کا واقف ہونا ضروری ہے اور تمہارے سوا میرا کوئی وارث نہیں۔ فی الوقت تم واپس جاؤ اور رانی پدمنی سے ہوشیار رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ باتوں باتوں میں تم راج دوت کی یہاں موجودگی کا ذکر کر دو۔ پدمنی کتنا ہی جذباتی لہجہ اختیار کرے' اپنے رشتے کا کوئی بھی حوالہ دے مگر تم آفریدی کے معاملات سے قطعاً انجان بنی رہو گی۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ راہداری میں بائیں جانب مڑ گیا اور نرملا کماری بے شمار خیالات میں الجھی ہوئی الٹے قدموں واپس چلی گئی۔

وکرم سنگھ پیچ در پیچ تہہ خانے سے گزرتا ہوا آفریدی تک پہنچا۔ شاہی سفیر ابھی تک بے ہوش تھا۔ آفریدی کے نزدیک راج وید خاموش بیٹھا تھا اور ایک چالیس سالہ مسلح راجپوت بے قراری کے عالم میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ وکرم سنگھ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی گھبرائے ہوئے لہجے میں راج وید سے پوچھا......... "کیا آفریدی کو ہوش آیا؟" مہا منتری کی آواز سے گہرا درد جھلک رہا تھا۔

وکرم سنگھ کی آواز سنتے ہی راج وید احتراماً اٹھ کھڑا ہوا اور مسلح نوجوان نے بھی آگے بڑھ کر تعظیماً سر جھکا دیا۔

"راج دوت کے ہوش میں آنے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ پورا جسم زخموں سے بھرا ہوا ہے اور دماغ کی چوٹیں بہت گہری ہیں۔"

"اس کی جان کو تو کوئی خطرہ نہیں ہے؟" شدت جذبات سے وکرم سنگھ کی آواز لرز رہی تھی۔

"جان کو تو کوئی خطرہ نہیں مگر بینائی زائل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔" راج وید آفریدی کی صحت سے مایوس نظر آتا تھا......... "اگر آنکھیں بے نور ہونے سے بچ گئیں تو وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھے گا۔"

"پھر تمہاری حکمت' فن اور طب کا ہنر کس دن کام آئے گا؟" وکرم سنگھ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

راج وید' مہا منتری کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر کانپ گیا......... "میں تو اپنی بہترین دوائیں استعمال کر رہا ہوں۔ مگر صحت و شفا میری قدرت میں نہیں۔" راج وید نے ان بوتلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جن میں مختلف عرق' سیال اور محلول بھرے ہوئے تھے۔

"تم نے اپنی زندگی میں جو کچھ سیکھا ہے' وہ سب راج دوت پر آزما ڈالو۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھی نسخہ تمہارے ذہن کے کسی گوشے میں آزمائش کے بغیر رہ جائے۔" وکرم سنگھ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ

جذباتی ہوتا جارہا تھا۔ "راج وید! میری بات کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کرو جیسے تمہارا اپنا بیٹا بستر مرگ پر لیٹا ہوا ہے اور تم اس کا علاج کر رہے ہو۔"

"میں سمجھ رہا ہوں مہامنتری۔" راج وید کے جسم کی لرزش کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

"تم کچھ نہیں سمجھ رہے ہو راج وید! کچھ بھی نہیں سمجھ رہے ہو۔" مہامنتری نے اضطراب و کرب کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے کہا.......... "تم اگر سمجھنا ہی چاہتے ہو تو یوں سمجھنے کی کوشش کرو کہ یہ نوجوان جو بے ہوش پڑا ہے تمہارے اپنے بیٹے سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔" وکرم سنگھ کسی وحشت زدہ انسان کی طرح آگے بڑھا اور آفریدی پر جھک گیا۔ "ایک تمہارے بیٹے کا یہاں کیا ذکر ہے' اس کی زندگی تو خود میری بیٹی نرملا سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ سیدھا ہوا اور راج وید کے چہرے کا بغور جائزہ لینے لگا۔

"تم میری بات سمجھ گئے نا؟" مہامنتری کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

"سمجھ گیا مہامنتری! خوب سمجھ گیا۔" راج وید کچھ بھی نہیں سمجھا تھا وکرم سنگھ کے جذباتی رویّے نے اسے اقرار پر مجبور کر دیا تھا۔

"اور یہ بھی سمجھ لو کہ جب تک راج دوت ہوش میں نہیں آجاتا' تم اس وقت تک اس کمرے سے باہر نہیں نکل سکو گے۔" وکرم سنگھ نے راج محل کے معالج خاص پر ایک عجیب پابندی لگا دی تھی۔ "اور یہ بھی سمجھ لو کہ اگر راج دوت کی موت واقع ہو گئی تو اس میں تمہاری نا اہلی اور غفلت کو دخل ہو گا.........۔" وکرم سنگھ نے راج وید کو اس طرح تنبیہہ کی جیسے شمشیرِ فنا اس کی شہ رگ کے قریب پہنچ چکی ہو اور دستِ قضا بلند ہونے ہی والا ہو۔

راج وید چند لمحوں میں رعشہ کا مریض نظر آنے لگا تھا۔ اس تنبیہہ کے جواب میں وہ مہامنتری کے قدموں پر جھکا مگر وکرم سنگھ نے اپنے پاؤں کھینچ لئے.......... "اس کی ضرورت نہیں.......... تم ہر خوف اور دباؤ سے آزاد ہو مگر اتنا یاد رکھو کہ اپنے مقدس پیشے سے بے وفائی نہ کرنا.........۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ اس مسلح نوجوان سے مخاطب ہوا جو خود بھی مہامنتری کی طرح بے قرار و مضطرب نظر آ رہا تھا۔

"چندر سنگھ! راج وید کے کھانے کا انتظام کر دینا۔ مجھے واپسی میں شاید کچھ دیر ہو جائے۔"

مسلح نوجوان نے سر جھکا دیا.......... اس کے ساتھ ہی وکرم سنگھ بھی جھکا اور سرگوشی میں کہنے لگا..........

"چندر سنگھ! یہاں میری مرضی کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ سارے انتظامات مکمل ہیں۔ آفریدی کے گرد مضبوط ترین حصار کھینچ دیا گیا ہے مگر تم جاگتے رہنا کہ اس دنیا میں نرملا کے بعد تم ہی میرا حرفِ اعتبار ہو۔ تمہاری موجودگی میں آفریدی کے جسم تک دشمن کا ہاتھ پہنچ گیا تو پھر کوئی کسی پر اعتبار نہیں کرے گا۔" فرطِ جذبات سے وکرم سنگھ کی آواز رقت آمیز ہو گئی تھی۔

"نہیں پربھو (مالک) ایسا نہیں ہو گا۔" چندر سنگھ نے لفظوں کو چباتے ہوئے کہا تا کہ اس کی آواز بلند نہ ہو سکے اور راج وید کے کانوں تک یہ راز کی باتیں نہ پہنچ سکیں.......... "اگر کوئی آپ کو یہ خبر دے کہ دشمن کے ہاتھ نے آفریدی کے لباس کو چھو لیا ہے تو پہلے اس بات پر یقین کر لیجئے گا کہ چندر سنگھ دنیا میں موجود نہیں ہے.........."

وکرم سنگھ نے راجپوت نوجوان کے کاندھے کو دباتے ہوئے کہا.......... "مجھے یقین ہے.........."
مہامنتری اپنے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ تیزی سے مڑا اور سر کو جھٹکتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

مہامنتری' راجہ رتن سنگھ کے عشرت کدے میں داخل ہوا اور رسم احترام ادا کرنے کے بعد دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

"وکرم سنگھ تنہائی میں تم درباری آداب کے پابند نہیں ہو.........."

"سمراٹ کی عنایتوں کا شکریہ مگر اب میں اپنے آپ کو ان نوازشات کے لائق نہیں سمجھتا۔" وکرم سنگھ نے ریاست کے ایک وفادار ملازم کے لہجے میں کہا۔

راجہ رتن سنگھ نے چونک کو وکرم سنگھ کی طرف دیکھا.......... "مہامنتری کے علاوہ تم میرے بزرگ بھی ہو وکرم سنگھ! میں تمہارا بہت احترام کرتا ہوں.........."

"جس رشتے کے سبب آپ میرا احترام کرتے ہیں' آج اسی رشتے کو مہارانی نے بڑی بے رحمی کے ساتھ توڑ دیا.........." وکرم سنگھ نے اس ناخوشگوار واقعہ کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا جو کچھ دیر پہلے رونما ہوا تھا..........

"یہ کیسے ممکن ہے؟" راجہ رتن سنگھ جوشِ وحشت میں کھڑا ہو گیا تھا اور اس کے قدم لرز رہے تھے.......... "ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم ایسے گراں وقت میں ہمارا ساتھ چھوڑ جاؤ گے.........." راجہ رتن سنگھ مایوس انسانوں کے لہجہ میں گفتگو کر رہا تھا۔

ابھی وکرم سنگھ' راجپوت سمراٹ کے اس جذباتی سوال کا جواب دینے نہیں پایا تھا کہ غضب ناک پدمنی' رتن سنگھ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے داخلے کا انداز بہت خوفناک تھا مگر وکرم سنگھ پر نظر پڑتے ہی وہ جھجک سی گئی۔ پھر بھی غصے کی وہی کیفیت تھی اور چہرے پر ایک آگ سی روشن تھی۔

"مہارانی! اب غیظ و غضب کے اس مظاہرے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ میں گناہ گار وکرم سنگھ اپنے عہدے سے استعفیٰ پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والا مہامنتری بہتر انداز میں ریاست چتوڑ کی خدمات انجام دے سکے گا۔" وکرم سنگھ کے الفاظ شائستہ تھے مگر ان میں بے پناہ تلخی پوشیدہ تھی۔

رانی پدمنی کچھ دیر کیلئے ساکت کھڑی رہی۔ پھر اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگی.......... "میں مہامنتری کی خدمات سے انکار نہیں کرتی مگر راج دوت کی حمایت میری عقل سے بالاتر ہے.........."

اس سے پہلے کہ وکرم سنگھ کوئی جواب دیتا' رتن سنگھ درمیان میں بول اٹھا.......... "مہارانی! تم ریاست کے انتہائی وفادار شخص پر الزام تراشی کر رہی ہو۔ ان کا علی عامر آفریدی سے کوئی رشتہ نہیں مگر سیاست میں ایک راج دوت کی اہمیت ہوتی ہے.......... اور وہ بھی علاء الدین خلجی جیسے شیر کا سفیر.......... اسے کسی طور بھی قتل نہیں کیا جا سکتا۔ آفریدی کے ساتھ اب تک جو کچھ ہوتا رہا وہ سیاسی قوانین کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ تم نے راج دوت کے جسم کو تشدد کا نشانہ بنایا اور توجیہہ پیش کی کہ وہ تمہاری شان میں گستاخی کا مرتکب ہوا تھا۔ حالانکہ اس نے شدید مجبوری کی حالت میں تمہارے اصرار پر سلطان کا خط سرِ دربار پڑھا.......... یہ اس کا ذاتی جرم نہیں تھا۔ پھر بھی تم نے اسے سزا دی۔ اب چاہتی ہو کہ راج دوت کا سر کاٹ کر تمہارے قدموں میں ڈال دیا جائے۔ ہم تمہاری خاطر یہ بھی گوارہ کر لیتے مگر آفریدی کا سر علاء الدین خلجی کا سر ہے.......... اور وہ سرِ پُر غرور ابھی ہماری پہنچ سے بہت دور ہے۔ اگر دیوتاؤں کا کرم اسی طرح جاری رہا تو ایک دن ہم تمہاری اس خواہش کی تکمیل بھی کر دیں گے.........."

راجہ رتن سنگھ' پدمنی کی فطری کمزوریوں سے واقف تھا۔ وہ خوشامد پسند تھی' اس لئے رتن سنگھ نے بھی اپنے لہجے کو کئی پردوں میں چھپا لیا تھا۔ راجپوت سمراٹ غرورِ حسن کی دیوی کو بھی رام کرنا چاہتا تھا اور مہامنتری وکرم سنگھ کو بھی اس کے خول میں واپس لانا چاہتا تھا۔

رانی پدمنی نے بہت غور سے شوہر کا ایک ایک لفظ سنا اور پھر نہایت سنجیدہ لہجے میں راجہ رتن سنگھ سے مخاطب ہوئی...... "کیا راج دوت کی زندگی ہمیں اس کی سفاکیوں سے بچا سکتی ہے ؟" پدمنی نے سوال کیا اور پھر کسی تاخیر کے بغیر خود ہی جواب دینے لگی.......... "اس بد نیت اور ہوس کار انسان کو کسی طرح بھی اخلاق اور تہذیب کا سبق نہیں سکھایا جا سکتا۔ آپ کے اور مہامنتری کے بقول اگر سلطان ایک درندہ ہے تو اس کیلئے دونوں حالتیں یکساں ہیں۔ راج دوت زندہ رہے یا قتل کر دیا جائے.........."

"مہارانی! آپ کی یہ سوچ زیادہ حقیقت پسندانہ نہیں ہے.........." رتن سنگھ نے نرم لہجے میں اپنی خود سر بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا.......... "سیاست میں کوئی چال آخری چال نہیں ہوتی۔ مفروضات پر یقین کر لینا دانش مندوں کا طریقہ نہیں ہے۔ انسانوں سے زیادہ درندوں کو اپنی انا عزیز ہوتی ہے۔ اگر راج دوت کو قتل کر دیا گیا تو سلطان کے ارادے کچھ اور جنوں خیز ہو جائیں گے۔ مہامنتری کو چتوڑ کے مستقبل کے بارے میں سوچنے دو۔ ابھی تو آکاش پر گھٹا اٹھی ہے' برسی نہیں ہے' ابھی خون رنگ پانی کے ریلوں سے بچا جا سکتا ہے.......... وکرم سنگھ یقیناً آفتوں کے سیلاب کے مقابل کوئی مضبوط بند باندھنے کی کوششوں میں مصروف ہوں گے اور تم انہیں ان کے عہدے سے برطرف کر دینا چاہتی ہو.........." راجہ رتن سنگھ نشے میں ہونے کے باوجود بڑے ہوش کی باتیں کر رہا تھا۔

رانی پدمنی شرمسار سی نظر آنے لگی...... .. "مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے اپنے محترم چچا کی شان میں نامناسب الفاظ ادا کئے.......... مگر کون جانے کہ میں کس آگ میں جل رہی ہوں.........." یہ کہتے کہتے پدمنی کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

وکرم سنگھ اپنے بھائی کی نشانی کو مغموم دیکھ کر خود بھی افسردہ ہو گیا.......... "مہارانی! مجھے خوب اندازہ ہے کہ ایک حرفِ گرم سن کر کوئی غیرت مند عورت کس طرح سلگ اٹھتی ہے لیکن گردشِ وقت کو کیا کہوں جس نے میرے اور آپ کے راستے جدا کر دیئے ہیں...... .."

رانی پدمنی نے کچھ عجیب سی نگاہوں سے وکرم سنگھ کی طرف دیکھا اور کھڑی ہو گئی.......... "میں اپنی بد کلامی کیلئے معافی کی خواستگار ہوں۔ آپ استعفیٰ نہ دیں مگر سلطان سے میری بے آبروئی کا انتقام ضرور لیں۔ ایک بزرگ کی حیثیت سے آپ پر یہ انتقام قرض ہے۔ اگر علاءالدین خلجی تک آپ کے ہاتھ نہ پہنچ سکیں تو پھر اس کے سفیر کو میرے حوالے کر دیجئے گا۔" یہ کہہ کر رانی پدمنی اس طرح کمرے سے نکل گئی جیسے شعلوں کے ذخیرے سے کوئی چنگاری جدا ہوئی ہو' کچھ دیر فضا میں لہرائی ہو اور پھر اچانک بجھ گئی ہو۔

وکرم سنگھ حیرت سے رانی پدمنی کو جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ ؎

نہ تم بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

"کیا سوچ رہے ہو وکرم سنگھ ؟" مہامنتری کو اپنے خیالات میں غرق پا کر راجہ رتن سنگھ نے اسے آواز دی..........

"اب تو تمہیں اپنی بھتیجی سے کوئی شکایت نہیں ہے ؟"

"شاید سمراٹ نے مہارانی کے لہجے پر غور نہیں کیا...... وہی ضد ہے' وہی سرکشی ہے۔ میں ان حالات میں یکسوئی سے کام نہیں کر سکتا.........." وکرم سنگھ بہت زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا.......... "آپ کے حق میں یہی بہتر ہے کہ مجھے سبکدوش کر دیا جائے۔"

"نہیں وکرم سنگھ! ہم اپنے دماغ کو کھونا نہیں چاہتے.........." راجہ رتن سنگھ بدحواس نظر آنے لگا۔

"تو پھر کچھ دن کیلئے اپنے دل کو کھو دیجئے۔" وکرم سنگھ نے برجستہ جواب دیا۔

"ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھے ...." راجہ رتن سنگھ نے چونک کر کہا۔

"جب تک علاءالدین خلجی کے ارادے عملی شکل اختیار نہیں کر لیتے' اس وقت تک رانی پدمنی اور مہاراج رام دیو کو سیاست سے دور رکھئے.........." وکرم سنگھ نے بڑی بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ...... "خصوصاً رام دیو کو اس کے تباہ شدہ آشرم میں محصور کر دیجئے۔ اس کا رانی پدمنی سے ملنا آپ کے اقتدار کیلئے انتہائی خطرناک ہے۔"

"ہمیں تمہاری یہ شرط منظور ہے۔" راجہ رتن سنگھ نے کچھ دیر کی کشمکش کے بعد ہتھیار ڈال دیئے۔

"سمراٹ کی دور اندیشی کو سلام۔ دیوتا چتوڑ کی نگہبانی کریں.........." وکرم سنگھ نے اپنی زندگی میں پہلی بار کھلا ہوا جھوٹ بولا اور رخصت کی اجازت طلب کی۔

"راج دوت کا کیا حال ہے ؟" راجہ رتن سنگھ نے سکون کا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"میں اسے بے ہوش چھوڑ کر آیا تھا۔ راج وید اس کی مسلسل نگرانی کر رہے ہیں۔ انہیں آفریدی کی صحت کے بارے میں شک ہے۔" وکرم سنگھ کا لہجہ غیر ارادی طور پر بجھا بجھا سا تھا۔

"کیا ہم اسے ایک نظر دیکھ سکتے ہیں ؟" راجہ رتن سنگھ نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔" وکرم سنگھ نے بے جھجک ہو کر کہا.......... "آپ چتوڑ کی سرحدوں کو مضبوط کریں۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق علاءالدین خلجی کی فوجیں دلی سے کوچ کر چکی ہوں گی یا وہ چتوڑ پر لشکر کشی کیلئے اپنی صفیں ترتیب دے رہا ہو گا۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ راجپوت سمراٹ کی خلوتِ خاص سے نکل آیا۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔ اس نے پلٹ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ سلطان کے امکانی حملے کا ذکر سن کر رتن سنگھ کے چہرے پر کس قسم کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

پھر جب وہ تقریباً بھاگتا ہوا اپنے مخصوص تہہ خانے میں پہنچا تو ایک الم انگیز خبر اس کی منتظر تھی۔ راج وید کی ان تھک کوششوں سے عین عالم آفریدی کو ہوش آ چکا تھا مگر اس کی بینائی زائل ہو چکی تھی۔

"تمہیں یقین ہے کہ راج دوت کی آنکھیں ہمیشہ کیلئے بجھ گئیں۔" آہنی اعصاب رکھنے والے وکرم سنگھ کی آواز لرز رہی تھی۔

"میرا آیورویدک گیان تو یہی کہتا ہے کہ اب راج دوت اس دلکش دنیا کے کسی منظر کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے گا۔" راج وید کا لہجہ سپاٹ تھا۔ اسے ایک خوبصورت نوجوان کے عالمِ شباب میں اندھا ہو جانے کا کوئی دکھ نہیں تھا۔

وکرم سنگھ اندر ہی اندر سلگ اٹھا۔ اس نے چاہا کہ وہ راج وید سے اس بے حسی کا حساب طلب کرے مگر وقت بہت نازک تھا۔ وکرم سنگھ نے بمشکل اپنے جذبات پر قابو پایا اور چندر سنگھ کو مخاطب کر کے بولا۔ "تم راج وید کو کمرے میں لے جاؤ اور ان کے کھانے کا انتظام کرو۔ جب تک میں آفریدی کی نگہداشت کر رہا ہوں۔"

چندر سنگھ راج وید کو دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں سنگ مرمر کے فرش پر لذیذ کھانے رکھے ہوئے تھے۔ راج وید نے جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور پھر اپنے شکم کی آگ بجھانے لگا۔

اس دوران وکرم سنگھ' آفریدی کے چہرے پر جھکا ہوا بہت آہستہ لہجے میں اسے پکار رہا تھا۔ "آنکھیں کھولو میرے بیٹے!"

مہامنتری کے کئی بار آواز دینے کے بعد علی عامر آفریدی کی پلکوں کو جنبش ہوئی۔ شاہی سفیر نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ بظاہر اس کی آنکھوں پر کسی چوٹ کا نشان نمایاں نہیں تھا۔ وکرم سنگھ کو راج وید کے بیان پر شک ہونے لگا۔ مہامنتری نے بے قرار ہو کر علی عامر کو مخاطب کیا۔

"آفریدی! تم نے مجھے پہچانا ؟"

وکرم سنگھ کی آواز پر علی عامر نے اپنی پتلیوں کو دونوں طرف حرکت دی پھر اس نے یہی عمل کئی بار دہرایا۔ وکرم سنگھ کانپ اٹھا۔ راج وید کا بیان درست تھا مگر مہامنتری کو اس المناک حادثے کا یقین نہیں آرہا تھا۔ "جواب دو بیٹے! تم نے مجھے پہچانا ؟"

"میں اندھیرے......... میں......... کسی کو......... نہیں پہچان سکتا......... روشنی کرو......... تم لوگوں نے......... چراغ کیوں......... بجھا دیئے......... ؟"

آفریدی رک رک کر بول رہا تھا۔ آواز اس قدر مدہم تھی کہ وکرم سنگھ بڑی دشواری کے ساتھ اس کا جواب سن سکا۔ مہامنتری کچھ دیر تک منتظر رہا کہ آفریدی مزید گفتگو کرے مگر شاہی سفیر نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

وکرم سنگھ کا دل رونے لگا۔ آفریدی کے پورے جسم پر سفید پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ صرف آنکھ' ناک اور ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے جیتے جی کسی انسان کو کفن پہنا دیا گیا ہو۔

وکرم سنگھ بے قراری کے عالم میں آفریدی کے بستر کے گرد ٹہلتا رہا' کبھی اس کی نظریں فانوسوں اور قمقموں پر ٹھہر جاتیں اور کبھی وہ آفریدی کی دلکش آنکھوں کے چراغوں کو دیکھنے لگتا جو راج وید کے بقول بجھ چکے تھے۔ پھر راج وید کھانے سے فارغ ہو کر آیا تو وکرم سنگھ نے بے اختیار یہ سوال کر دیا۔ "کیا یہ عارضی اندھیرا ہے جسے ہم دواؤں کے مسلسل استعمال سے زائل کر سکتے ہیں ؟" وکرم سنگھ کو پورا یقین تھا کہ راج وید حقیقت بیان نہیں کرے گا بلکہ اس کی خاطر جھوٹی تسلیوں سے کام لے گا۔ مگر مہامنتری کی یہ قیاس آرائی غلط ثابت ہوئی۔

راج وید نے اسی بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "مہامنتری! اگر آپ کہیں تو میں راج دوت کی مکمل صحت کا اعلان کر دوں۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ روشنی کا کھیل ختم ہو چکا۔ اگر مجھ جیسا وید' راج دوت کی آنکھوں کے اجالے واپس نہیں لا سکتا تو کم سے کم ہندوستان میں کوئی وید موجود نہیں ہے جو اسے اس محرومی سے نجات دلا سکے۔"

وکرم سنگھ نے سر کو جنبش دی مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ پھر اس نے چندر سنگھ کو الگ لے جا کر کہا۔ "یہاں دوسرے سپاہی متعین کر دو۔ مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔"

چندر سنگھ نے احتراماً سر جھکا دیا۔ پھر تیز قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ آفریدی کو جس کمرے میں زیر علاج رکھا گیا تھا اس کمرے کے باہر پچیس ماہر تیغ زنوں کا ایک چاق و چوبند دستہ موجود تھا۔ چندر سنگھ ان میں سے دو سپاہیوں کو لے کر اندر آ گیا۔ پھر راج وید کو ہدایت دیتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ آپ کی خدمت کیلئے حاضر رہیں گے۔"

راج وید نے عجیب سی نظروں سے پہلے چندر سنگھ کو اور پھر مہامنتری کو دیکھا۔ "میں کب تک اپنے گھر جا سکوں گا۔"

"میں تم سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ تمہاری واپسی راج دوت کی مکمل صحت سے مشروط ہے۔" وکرم سنگھ کی آواز تحکم آمیز تھی۔ "ویسے تمہیں یہاں کیا پریشانی ہے ؟"

"کچھ نہیں مہامنتری! کچھ بھی نہیں۔" راج وید اچانک سراسیمگی کا شکار نظر آنے لگا تھا۔

"ویسے بھی کسی وید کی بہترین تپسیا (عبادت) یہی ہے کہ اس کا مریض صحت یاب ہو جائے۔" وکرم سنگھ نے تیز لہجے میں کہا اور تہہ خانے کے پیچیدہ نظام کے سہارے بالائی منزل پر آ گیا۔ وہاں بھی پچیس شمشیرزنوں کا ایک دستہ متعین تھا ان سپاہیوں نے وکرم سنگھ کو دیکھتے ہی گردنیں جھکا دیں۔

"میرے وفادار نوجوانو! سب کچھ ٹھیک ہے نا ؟" وکرم سنگھ نے سپاہیوں کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! سمراٹ! آپ کا ہر جاں نثار اپنی جگہ سربکف کھڑا ہے۔ یہاں خود یم راج (موت کا فرشتہ) بھی ہماری اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔" جوشِ جذبات میں وکرم سنگھ کے سپاہی انتہائی مبالغے سے کام لے رہے تھے۔

"نہیں یہ غرور اور یہ خود اعتمادی بھی اچھی نہیں بس جاگتے رہو۔ میں تمہارے جذبوں کا معترف ہوں۔" وکرم سنگھ نے اپنے حفاظتی دستے کی تعریف کرتے ہوئے کہا پھر وہ اسی طرح اپنے مختلف دستوں کا جائزہ لیتا ہوا چندر سنگھ کے ہمراہ اپنے محل کے بالائی حصے میں پہنچ گیا۔

چندر سنگھ اس کے انتہائی وفادار ملازم رنبیر سنگھ کا لڑکا تھا۔ بظاہر وہ ملازم تھا مگر دراصل وکرم سنگھ کے خاندان ہی کا ایک فرد تھا۔ چندر سنگھ کے ساتھ آج تک ملازموں جیسا سلوک نہیں کیا گیا تھا۔ حقیقت میں خاندانی وفاداریوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ تقریباً دو سو سال پہلے چندر سنگھ کے مورثِ اعلیٰ کو وکرم سنگھ کے پرداداویر سنگھ نے اپنے محافظِ خاص کے طور پر ملازم رکھا تھا۔ پھر اس خاندان کے آنے والے ہر وارث نے اپنی وفاداری کا ثبوت کچھ اس طرح پیش کیا کہ رنبیر سنگھ کا خاندان بھی وکرم سنگھ کے خاندان کا ایک لازمی حصہ بن گیا۔ چندر سنگھ ان ہی بہادر اور جاں نثار راجپوتوں کی اولاد تھا۔ اس قربت کے باوجود چندر سنگھ کو تہہ خانے کا راز معلوم نہیں تھا کئی خاص مواقع پر چندر سنگھ' مہامنتری کے ہمراہ اس تہہ خانے میں آیا مگر اسے اب تک پتہ نہیں چل سکا تھا کہ یہ تہہ خانہ ایک حیرت انگیز طلسم کے ذریعے بنایا گیا ہے وہ تو بس حیرت زدہ نظروں سے دیواروں میں شگاف ہوتے دیکھتا تھا' اس کے بعد نظروں کے سامنے کشادہ اور آراستہ کمرے ابھر آتے تھے۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ تہہ خانے سے نکل کر ساتویں منزل پر آیا تھا اور راہداری میں بائیں جانب مڑ کر ایک دلکش نقش و نگار والی دیوار کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر اچانک دیوار میں شگاف پیدا ہو گیا تھا وہ سیڑھیاں چڑھ کر چھٹی منزل پر پہنچ گیا تھا۔ چندر سنگھ اس طلسم کدے کا راز جاننے کیلئے بے چین رہتا تھا مگر اس نے اپنے آقا وکرم سنگھ کے سامنے کبھی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔

محل میں پہنچتے ہی وکرم سنگھ نے اسے مخصوص کمرے میں طلب کیا جہاں نرملا کماری بھی موجود تھی۔ نرملا نے باپ کو دیکھتے ہی انتہائی جذباتی لہجے میں آفریدی کے متعلق پوچھا تھا اور پھر وکرم سنگھ نے شاہی سفیر کی وہی المناک حالت بیان کر دی تھی جسے کچھ دیر پہلے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ نرملا اداس ہو گئی مگر چندر سنگھ کی موجودگی میں اپنے جذبوں کا اظہار نہ کر سکی۔

کمرے کی فضاؤں پر کچھ دیر تک اداسی طاری رہی پھر وکرم سنگھ نے چندر سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "پہلے میں نے راج وید کے بیان پر شک کیا تھا مگر بعد میں میرے کہنے سے آفریدی نے آنکھیں کھولی تھیں اور یہ دردناک حقیقت سامنے آئی تھی کہ وہ بینائی سے محروم ہو چکا ہے میں جانتا ہوں کہ اس بہیمانہ تشدد کے بعد آفریدی کا زندہ رہنا بھی ایک معجزہ ہے۔ آنکھوں سے محروم ہو جانا میرے نزدیک کوئی تعجب کی بات نہیں۔ پھر بھی میں راج وید کے طریقۂ علاج سے مطمئن نہیں ہوں۔"

"تو پھر کیا ہمیں کوئی دوسرا طبیب تلاش کرنا ہو گا ؟" چندر سنگھ نے چونک کر پوچھا۔

"شاید! مگر ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" وکرم سنگھ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں تمہیں اسی وقت کوہِ آبو چلا جانا چاہئے۔" وکرم سنگھ نے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جس کا مفہوم سمجھنے سے نرملا کماری اور چندر سنگھ دونوں عاجز تھے۔

"کوہِ آبو ؟" چندر سنگھ اور نرملا کماری نے بیک وقت چونکتے ہوئے کہا تھا۔ "رات کے اندھیرے میں ؟"

"اب اندھیرا ہو یا موت کا طوفان۔ تمہیں کوہِ آبو تو جانا ہی ہے۔" وکرم سنگھ نے پرزور لہجے میں کہا۔ بمل شاہ کے مندر میں مائی بھان متی کے پاس۔ یہ کام بہت رازداری کا تھا اور اصولی طور پر مجھے خود ہی وہاں جانا چاہئے تھا مگر میں مجبور ہوں۔ راج محل کی فضا اس قدر مخدوش ہے کہ وہاں رہنے والے ہر شخص پر رتن سنگھ کے جاسوس کا گمان ہوتا ہے۔ اگر میں نے کوہِ آبو کے راستے پر چند قدم بھی آگے بڑھائے تو مجھے یقین ہے کہ راجپوت سمراٹ میری روانگی سے باخبر ہو جائیں گے اور اس فضا میں مائی بھان متی سے ملنا میرے حق میں مفید نہیں ہو گا۔ مائی، رانی پدمنی اور رتن سنگھ دونوں کی اس قدر معتوب ہے کہ اگر ان کا بس چلے تو اس مہان عورت کو زندہ جلا ڈالیں۔ اس صورت میں میرا وہاں جانا بے شمار شکوک و شبہات پیدا کر سکتا ہے۔"

"آپ حکم دیجئے! میں وہاں جاؤں گا۔" چندر سنگھ جوشِ جذبات میں کھڑا ہو گیا اور دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ شمشیر کے قبضے پر پہنچ گیا۔

"اگر راستے میں تمہارا تعاقب کیا جائے تو خواہ مخواہ کسی سے الجھنے کی کوشش نہ کرنا۔ صاف صاف کہہ دینا کہ تم اس وقت ایک مخصوص پوجا کیلئے بمل شاہ کے مندر جا رہے ہو۔"

چندر سنگھ نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔

"مائی بھان متی تمہیں نہیں جانتیں۔" وکرم سنگھ نے آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ "تم وہاں پہنچ کر کہو گے کہ تمہیں ان کے داس وکرم سنگھ نے بھیجا ہے۔ پھر جب وہ تمہیں تنہائی میں طلب کر لیں تو پھر کہہ دینا کہ رانی پدمنی کے تشدد کے سبب راج دوت اپنی بینائی کھو چکا ہے۔ راج وید ہر قسم کی دوا آزما رہا ہے مگر اس کے دعوے کے مطابق آفریدی دوبارہ کسی چیز کو نہیں دیکھ سکے گا ایسی سنگین فضا میں ہمیں آپ کی دعاؤں اور مشوروں کی سخت ضرورت ہے۔ اس گزارش کے بعد مائی بھان متی جو کچھ کہیں اسے حرف بہ حرف ذہن نشین کر لینا۔ جاؤ جلدی کرو۔"

چندر سنگھ گہری سیاہ رات میں مہامنتری کے محل سے نکلا اور کوہِ آبو کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆..........................☆..........................☆

چندر سنگھ کے جانے کے بعد وکرم سنگھ اپنی بیٹی نرملا کماری سے مخاطب ہوا۔ "میں نے چندر سنگھ کو مائی بھان متی کے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ وہ میری رہنمائی کر سکیں۔ مجھے یہاں کسی پر بھروسہ نہیں ہے۔ راج وید ایک زر پرست طبیب ہے۔ اس کافر راجہ رتن سنگھ نے چند سکوں کے عوض خرید لیا ہے وہ شب و روز ان دواؤں کی تلاش میں رہتا ہے جو راجہ رتن سنگھ اور رام دیو کو مصنوعی جوانی فراہم کر سکیں۔ یا پھر رانی پدمنی کا یہ حسن تابناک برقرار رہ سکے۔ بے شک! وہ اپنے ہنر میں یکتائے روزگار ہے۔ راج وید نے بہت مطالعہ کیا ہے۔ اپنی ذہانت سے بڑے کامیاب تجربے کئے ہیں مگر دولت کی حد سے بڑھی ہوئی بھوک نے اسے پیٹ کا کتا بنا دیا ہے۔ اسے یہ علم اس لئے بخشا گیا تھا کہ وہ خدا کے بندوں کو اذیت ناک بیماریوں

سے نجات دلائے مگر راج وید کا یہ حال ہے کہ بیمار لوگ اس کے مکان کے سامنے سسکتے تڑپتے رہتے ہیں اور دوا ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ بیٹی! مجھے تم سے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ راج وید کی غفلت نے کیسے کیسے ذہین لوگ بے موت مار دیئے اسے ہمہ وقت صرف ایک ہی فکر رہتی ہے کہ راجپوت سمراٹ رتن سنگھ اور شعبدہ باز رام دیو آبِ حیات پی کر کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی حاصل کریں اور رانی پدمنی کی دلکشی آج جس مقام پر ہے وہیں ٹھہر جائے۔ تمہیں خبر نہیں کہ کئی سرکاری کارندے دور دراز کے جنگلات میں دن رات قیمتی جڑی بوٹیوں کی جستجو کرتے رہتے ہیں اور راج وید انہیں مرکبات میں تبدیل کر کے مسلسل نئے تجربات کرتا رہتا ہے۔ یہ تجربات چتوڑ کے صرف تین انسانوں کیلئے وقف ہیں۔ راجہ رتن سنگھ، رام دیو اور رانی پدمنی۔" وکرم سنگھ کا لہجہ زہر سے بھی زیادہ تلخ تھا۔ "وہ رتن سنگھ اور رام دیو کا خاص آدمی ہے اور چتوڑ کے یہ دونوں بت نہیں چاہیں گے کہ آفریدی جیسا انسان زندہ رہے۔ اگر شاہی سفیر کو زندگی مل بھی گئی تو رتن سنگھ، رانی پدمنی اور رام دیو یہ پسند نہیں کریں گے کہ آفریدی مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے تہہ خانے میں قید کر رکھا ہے ممکن ہے کہ آفریدی کا وقت پورا ہو جائے مگر میں اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی طے کر چکا ہوں کہ راج وید کو دوبارہ کھلی فضا میں واپس جانے نہیں دوں گا۔ اس کی لاش بھی اسی تہہ خانے میں سڑ جائے گی اور اہلِ چتوڑ کو یہ پتہ بھی نہیں چل سکے گا کہ ان کا مایہ ناز طبیب کہاں گم ہو گیا ؟"

"مائی بھان متی! کیا وہ بھی طبیب ہیں ؟" نرملا حیران تھی۔

"سرزمین چتوڑ پر بسنے والی سب سے بڑی طبیب۔" وکرم سنگھ کے چہرے پر رنگِ عقیدت پوری تابناکی کے ساتھ جھلکنے لگا تھا۔ "وہ روح کی بھی طبیب ہیں اور جسم کی بھی۔ دیوار کے پار دیکھنے والی ان آنکھوں پر روشن ہو جائے گا کہ راج وید جھوٹ بول رہا ہے یا آفریدی کی آنکھیں بے نور ہو جانے کی تلخ سچائی ہمارا مقدر بن گئی ہے ؟ مائی بھان متی نے میرے سامنے تو یہی کہا تھا کہ حالات کچھ بھی ہوں مگر کوئی شخص راج دوت پر غلبہ حاصل نہیں کر سکے گا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ظلم کے اندھیرے جیت گئے یا روشنی نے فتح حاصل کر لی ؟"

"کیا آپ کو چندر سنگھ پر مکمل اعتماد ہے ؟" نرملا کماری نے ایک اور سوال کر دیا تھا جو ان مشکوک فضاؤں میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

"تم چندر سنگھ کے بارے میں صرف اتنا جانتی ہو کہ وہ ہمارا خاندانی ملازم ہے لیکن آج میں تمہیں اس کے بزرگوں کا ایک عجیب واقعہ سناتا ہوں۔ چندر سنگھ نسلاً راجپوت ہے۔ اس کے دادا بھیم سنگھ میرے دادا کے ملازم تھے مگر ایسے ملازم کہ ان کا عزت و احترام ہمارے اہل خاندان سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا جب بھیم سنگھ دنیا سے رخصت ہونے لگے تو انہوں نے میرے دادا کے سامنے ایک انکشاف کیا جس پر آج کی دنیا اعتبار نہیں کر سکتی۔ بھیم سنگھ نے بتایا کہ ان کے پاس میرے خاندان کا ایک بہت بڑا خزانہ بطور امانت محفوظ ہے۔ وہ خزانہ نسل در نسل بھیم سنگھ کے خاندان کی تحویل میں چلا آ رہا تھا۔ میرے بزرگوں نے بھیم سنگھ کے بزرگوں کو ہدایت کی تھی کہ اس خزانے کو اس وقت ظاہر کیا جائے جب ہمارا خاندان کسی خوفناک مالی مشکل سے دوچار ہو جائے۔ یہ ہمارے بزرگوں کی سوچ تھی کہ آڑے وقت میں دولت کا اتنا بڑا ذخیرہ ہمارے کام آ جائے اور ہم غربت و افلاس کا شکار ہونے سے محفوظ رہیں اس راز کو میرے دادا اور چندر سنگھ کے دادا کے سوا کوئی تیسرا شخص نہیں جانتا تھا۔ پھر میرے دادا کا انتقال ہو گیا اب اس خزانے کا مدعی دنیا میں موجود نہیں رہا تھا۔ اگر چندر سنگھ کے دادا چاہتے تو سیم و زر کے اس انبار کو اس طرح غصب کر سکتے تھے کہ ان کے

دامن پر خیانت کی چھینٹ تک نہ آئی پھر جب چندر سنگھ کے دادا دنیا سے رخصت ہونے لگے توانہوں نے میرے پتاجی کو بسترِ مرگ پر بلایا اور روتے ہوئے کہا۔" اب میں اپنی آخری سانسیں لے رہا ہوں۔ مجھے اپنی زندگی کے بارے میں اتنی بھی امید نہیں کہ کل کا سورج دیکھ سکوں اس لئے چاہتا ہوں کہ اپنے دل و دماغ سے امانت کا وہ بوجھ اتار دوں جس نے مجھے تھکا کر رکھ دیا ہے۔" اس کے بعد چندر سنگھ کے دادا نے میرے پتاجی کے سامنے وہ خفیہ خزانہ ظاہر کر دیا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔" ناتھ (آقا) اب میں سمجھتا ہوں کہ میری آنے والی نسل اس امانت کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گی اس لئے مجھے تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا جائے۔" یہ کہتے ہی چندر سنگھ کے دادا کی روح پرواز کر گئی۔ "چندر سنگھ ان ہی امانت داروں کی اولاد ہے۔" وکرم سنگھ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اب اگر وہ بھی بک گیا تو سمجھ لو کہ وکرم سنگھ بھی وقت کی نیلام گاہ میں فروخت ہو سکتا ہے۔"

"میں ان حالات سے بے خبر تھی۔ اس لئے چندر سنگھ پر شک کرنا کچھ زیادہ غیر فطری نہیں تھا۔" نرملا کماری نے معذرت کے انداز میں کہا۔

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ میں نے ہی تمہیں بے خبر رکھا۔" وکرم سنگھ بہت تیز لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ "اب وقت آ گیا ہے کہ میں اس بے خبری کو ختم کر دوں اور زندگی کے بعض گوشوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے ہٹا دوں۔ لوگ اپنی خاندانی وراثت کو برقرار رکھنے کیلئے لڑکے کی تمنا کرتے ہیں میں نے بھی بہت دن اپنے سینے میں اس آرزو کو پروان چڑھایا مگر آسمانوں پر میرے لئے یہی تحریر کیا گیا تھا کہ میں بیٹے سے محروم رہوں۔ کچھ دن تک میں آسمانی فیصلوں کو جھٹلانے کیلئے مقدر کے خلاف جنگ کرتا رہا مگر تمہاری ماں کی موت کے بعد یہ آرزو دم توڑ گئی۔ میں اس وقت جوان تھا۔ لوگوں نے دوسری شادی کا مشورہ دیا۔ درباری نجومیوں نے پیش گوئیاں بھی کیں کہ اگر میں دوسری شادی کر لوں تو مجھے خاندان کا وارث مل جائے گا۔ آخر انسان تھا احساسِ محرومی نے یہاں تک مجبور کیا کہ میں دوسری شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا مگر جب شادی سے پہلے میں نے سنیاسی آنند پال سے ملاقات کی تو اس مہان پرش (مردِ عظیم) نے نجومیوں کی ساری پیش گوئیوں کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔

"وکرم سنگھ! تمہیں بیٹا یقیناً ملے گا مگر شادی کے بعد نہیں۔ تمہارے خاندان کا وراث کسی اور ہی شکل میں آئے گا شاید تم اسے پہچان بھی نہ سکو۔ میرا گیان کہتا ہے کہ وہ ضرور آئے گا۔ اگر آنے والا آ جائے تو اسے بے دریغ اپنے سینے سے لگا لینا یہ خود غرض اور گمراہ دنیا تم سے تمہارے وارث کو چھیننے کی بہت کوشش کرے گی مگر تم کسی کے فریب میں نہ آنا موجِ خوں بھی سر سے گزر جائے تو خوفزدہ نہ ہونا کہ بالآخر تمہارا وہی وارث تمہیں نجات اور سلامتی کے راستے پر لے جائے گا۔ آنکھیں کھلی رکھنا اور زندگی کی رہ گزر کو مسلسل دیکھتے رہنا کہ وہ آنے ہی والا ہے۔" یہ کہتے کہتے مہامنتری وکرم سنگھ کے چہرے پر یادوں کا دھواں پھیل گیا تھا۔ اذیت و کرب کی ایک تند لہر تھی جو دل کے کسی گوشے سے اٹھ کر پورے وجود پر محیط ہو گئی تھی۔ وکرم سنگھ نے بمشکل ان یادوں سے اپنا دامن چھڑایا مگر لہجے کی اداسی پر قابو نہ پا سکا۔" پھر سنیاسی آنند پال کے کہنے پر میں نے دوسری شادی کا ارادہ ملتوی کر دیا اور تمہاری پرورش اس انداز میں کرنے لگا کہ تم عورت ہوتے ہوئے بھی میرے نزدیک ایک مرد تھیں۔ یہ تیراندازی' یہ شمشیرزنی' یہ شہسواری اور سیاست کی تعلیم' سنیاسی آنند پال کی اسی ہدایت کا نتیجہ تھی کہ میں تمہاری شکل میں اپنے خاندان کے ایک نئے وارث کو دیکھ رہا تھا۔ اس دوران میں نے کئی بار سنیاسی سے اس وارث کے بارے میں دریافت بھی کیا مگر وہ یہی کہتے رہے کہ انتظار کرو آنے والا ایک دن ضرور آئے گا۔ پھر اچانک سنیاسی آنند پال' راجہ رتن سنگھ اور

رانی پدمنی کے معتوب قرار پا گئے۔ اس لئے میرا اور ان کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ بس ایک روح اور دل کا تعلق تھا جو قائم رہا میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن جسمانی فاصلوں کے درمیان زندہ رہنے والا یہ رشتہ بھی ٹوٹ جائے گا۔ سنیاسی سے آخری چند ملاقاتیں ہوئیں مگر اس طرح کہ وہ ریاست چتوڑ کے قانون کی نظر میں بدترین مجرم ٹھہرے تھے۔ پھر سنیاسی اس طرح قتل کر دیئے گئے کہ تمام جفا کار و ستمگر اپنے آپ کو آج تک بے قصور سمجھتے ہیں۔ میں ایسی کربناک فضا میں ان سے کس طرح سوال کرتا کہ میرا وارث کب آئے گا؟ یہ تو بڑی وحشیانہ خود غرضی ہوتی مگر آج مجھے یقین آ گیا ہے کہ وہ جانے سے پہلے میرے سوال کا جواب دے چکے تھے۔"

"کیسا جواب؟" نرملا کماری نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہی کہ میرے خاندان کا وارث مجھ تک پہنچ چکا ہے۔" وکرم سنگھ کے لہجے میں اسی مسرت کا رنگ شامل تھا جو ایک بے اولاد انسان کو بیٹا مل جانے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

"کون وارث؟" نرملا کماری کی حیرت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

"علاءالدین خلجی کا سفیر علی عامر آفریدی۔" یہ کہتے کہتے وکرم سنگھ کا چہرہ جوشِ جذبات سے روشن ہو گیا تھا۔ "سنیاسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ بڑے عجیب انداز سے مجھ تک پہنچے گا۔" وکرم سنگھ کے چہرے پر نظر آنے والی نشاط رنگ خوشی اچانک بجھ گئی۔ "کیسی گردشِ وقت ہے کہ آنے والا آیا بھی تو کس طرح کہ اس کے پورے جسم پر زخموں کی فصل اگی ہوئی ہے اور آنکھیں بے نور ہو چکی ہیں۔"

باپ کے اظہارِ غم نے بیٹی کو بھی اداس کر دیا۔ نرملا اپنے خیالات میں غرق بیٹھی رہی اور کمرے پر موت کا سناٹا طاری ہو گیا۔

پھر وکرم سنگھ کی پُرسوز آواز نے اس الم انگیز سناٹے کے جگر میں شگاف ڈال دیا۔

"اب تم دونوں ہی میرے وارث ہو۔ خدا تمہیں وقت کے تمام ہنگاموں سے' فتنہ و شر سے اور دشمنوں کی دست درازیوں سے محفوظ رکھے۔" یہ کہتے کہتے وکرم سنگھ کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔ "میں تو اپنے وطن' اپنی زمین چتوڑ کیلئے بھی یہی دعائیں مانگتا ہوں مگر خود یہاں رہنے والوں کو احساس نہیں کہ ان پر کیسا دردناک عذاب نازل ہونے والا ہے۔"

عذاب کے ذکر پر نرملا چونک اٹھی اور استفہامیہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں! وہ عذاب نازل ہو کر رہے گا اسے کوئی روکنے والا نہیں۔" وکرم سنگھ کے لہجے میں پوشیدہ درد بھی تھا اور جھلکتا ہوا غصہ بھی۔ "سنیاسی آنند پال نے مکھ شیام کے مندر پر جو کچھ لکھ دیا ہے وہ ظاہر ہو کر رہے گا۔"

"پھر آپ اپنی قوم کو' اپنی دھرتی پر بسنے والوں کو وقت سے پہلے خبردار کیوں نہیں کرتے؟" نرملا نے باپ سے احتجاج کیا۔" آپ انہیں اس عذاب سے بچانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے جو سنیاسی کے بقول اہلِ چتوڑ کا مقدر بن چکا ہے۔"

نرملا نے وکرم سنگھ سے بڑا عجیب سوال کیا تھا جس کا جواب دیتے وقت مہامنتری شدید ذہنی کشمکش کا شکار نظر آ رہا تھا۔ "ہاں میں جانتا ہوں کہ اس عذاب کا نشانہ میرے بزرگوں کی صدیوں پرانی تہذیب ہے۔ میرے دوست' میرے رشتہ دار' میری زمین' میرے دریا' میرے کھیت' میری مملکت اور وہ تمام چیزیں جن سے میری شناسائی ہے سب کی سب اس عذاب کی لپیٹ میں آنے والی ہیں۔ میں اپنے ہر تعلق اور ہر نسبت کو اس آسمانی قہر سے بچانا چاہتا ہوں مگر میری بات سننے کیلئے کوئی آمادہ نہیں ہوگا۔ کیا مائی بھان متی

نے راجہ رتن سنگھ کو اس عذاب کی اطلاع نہیں دی ہے ؟ کیا سنیاسی آنند پال نے اپنی جان دے کر انہیں سمجھانے کی کوشش نہیں کی...... مگر سب کے سب اندھے ہیں......... سارے کے سارے بہرے ہیں۔ انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا یہ اپنی ناک کے سامنے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ پھر مستقبل کی دیوار کے پیچھے کس طرح دیکھیں گے جو فولاد و آہن سے بنائی گئی ہے اور جس کے پار گزر جانے کی صلاحیت ہر آنکھ میں نہیں ہوتی۔ میں انہیں پکاروں گا تو وہ میری زبان بھی کاٹ دیں گے۔ میری معصوم بیٹی! دنیا میں اکثریت ان ہی لوگوں کی ہے جو روشن نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ یہ ایک خدا کیلئے اپنے سیکڑوں خداؤں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ سنیاسی کے قتل کا مرثیہ پڑھنے والی سیاہ آندھی نے چتوڑ کو زیروزبر کر کے رکھ دیا مگر یہ لوگ اسے اتفاق سمجھتے رہے۔ ستاروں کے اثرات کہہ کر سچائی سے منہ چھپاتے رہے۔ یہاں تو سب رام دیو کے پجاری ہیں۔ جھوٹ ظلم اور اندھیروں کے پرستار۔ میں ان کے درمیان سچ کی شمع نہیں جلا سکتا۔ یہ میری اور تمہاری زندگی کے چراغ بھی بجھا دیں گے۔ " وکرم سنگھ کی آنکھوں میں کرب اور مجبوری کے آنسو تھے۔

" میں نہیں جانتا کہ آنے والے دنوں میں سیاست کیا رخ اختیار کرے گی لیکن میں آفریدی کو رانی پدمنی کے حوالے نہیں کروں گا چاہے اس کشمکش اور تصادم میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ " وکرم سنگھ ایک بار پھر انتہائی جذباتی نظر آنے لگا تھا۔ " نرملا! میں اپنی زندگی میں آفریدی کو گمراہی اور تشدد کی خوراک نہیں بننے دوں گا۔ سنیاسی آنند پال کے روحانی فرزند سے اب میرا بھی ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ اس رشتے کو قائم رکھنے کیلئے میں آفریدی کو اس تہہ خانہ تک لے آیا ہوں۔ یہ وہ تہہ خانہ ہے جسے راجہ رتن سنگھ کی پوری فوج مل کر بھی تلاش نہیں کر سکے گی۔ آفریدی یہاں اپنی ماں کی آغوش کی طرح محفوظ ہے۔ اٹھو بیٹی! آج میں تمہیں اس تہہ خانے کا راز بتا دوں جو آفات و مصائب کے وقت تمہاری آخری پناہ گاہ ہوگی۔ " یہ کہہ کر مہامنتری اٹھا اور نرملا کماری کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ نرملا کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی میں اس قدر برق رفتاری کے ساتھ اتنے پیچ و خم آئیں گے۔ راج دوت کی چتوڑ میں آمد' سنیاسی کا قتل' وکرم سنگھ کی تبدیلی مذہب' راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی سے شدید سیاسی اختلاف' راجپوتوں کی سرزمین کی تباہی کے اندیشے اور خود اس کے اندر حشر برپا کرنے والی جذباتی کشمکش۔ بیک وقت کئی طوفان اٹھے تھے جن کا براہ راست ہدف نرملا کماری اور وکرم سنگھ کی ذات تھی۔ اسی سوچ میں غرق وہ تیز قدموں سے باپ کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ وکرم سنگھ طویل راہداری طے کر کے بائیں جانب گھوم گیا۔ ایک اور طویل راہداری موجود تھی۔ اس موڑ پر پہنچتے ہی وکرم سنگھ ایک مورتی کے سامنے رک گیا جو سنگ سرخ کی دیوار پر آویزاں تھی۔ نرملا کماری بھی باپ کی تقلید میں ٹھہر گئی۔

" یہ کرشن جی کی مورتی ہے جو کبھی ہمارے بھگوان ہوا کرتے تھے۔ " وکرم سنگھ کا لہجہ سپاٹ تھا اس کے دل سے دیوتاؤں کی عقیدت اس طرح رخصت ہو چکی تھی کہ جیسے ان پتھر کے خداؤں سے وہ کبھی آشنا ہی نہ تھا۔ نرملا کماری نے سیکڑوں بار اس سونے کی مورتی کو دیکھا تھا جو سونے کی دھات سے کسی ماہر فن کے ہاتھوں تراشی گئی تھی۔ کرشن جی کے ہاتھوں میں چاندی کی ایک بانسری تھی جسے شیام' مرلی منوہر' کنہیا اور نندلال جیسے خطابات رکھنے والے کرشن کی مشہور علامت سمجھا جاتا تھا۔ یہ بانسری اسی مرلی کی یاد تازہ کرتی تھی جسے کرشن جی بندرابن میں بجایا کرتے تھے اور جس کی دلفریب تانیں سن کر گوپیاں مستانہ وار رقص کرتی تھیں۔ چند لمحوں کیلئے نرملا کی حالت متغیر ہو گئی اور دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں۔ پھر اس کے ذہن نے ماضی کی تمام کہانیوں کو فراموش کر دیا کہ آج وقت اسے کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔

نرملا کماری نے غور سے کرشن جی کی سنہری مورتی کو دیکھا اور اس نقرئی بانسری پر نظر کی جس میں قیمتی نیلم جڑے ہوئے تھے۔

" یہ مورتی ہمارے بزرگوں کے بنائے ہوئے اس مخصوص تہہ خانے کی ابتداء ہے جس کے اندر مورتی کی مدد کے بغیر داخل نہیں ہوا جا سکتا۔ " وکرم سنگھ نے اپنی بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

" مورتی کے بغیر تہہ خانے میں داخلہ ناممکن ہے ؟ " نرملا کماری کی دلفریب آنکھیں حیرت سے کشادہ ہو گئی تھیں۔

" تہہ خانہ تو ایک عام سا لفظ ہے۔ " وکرم سنگھ نے نرملا کی حیرت دور کرنے کیلئے وضاحت کی۔ " اسے ایک طلسم کدہ کہو' دنیا کا عجیب و غریب طلسم کدہ۔ اسی طلسم کدے کے سات پردوں میں سلطان علاء الدین خلجی کا سفیر علی عامر آفریدی موجود ہے۔ "

" سات پردے ؟ طلسم کدہ ؟ " نرملا کماری کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

" اب تم میری ایک ایک بات غور سے سنو اور جو کچھ میں کہوں اسے اپنے ذہن پر پتھر کی لکیر کی طرح نقش کر لو۔ اس طلسم کدے کا راز یادداشت کیلئے کسی کاغذ پر تحریر نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح یہ خوف اور اندیشہ باقی رہتا ہے کہ اگر وہ تحریر کسی دشمن کے ہاتھ لگ گئی تو پھر راز' راز نہیں رہے گا اور یہ طلسم کدہ ہمارے مخالفین کی عام گزر گاہ بن جائے گا۔ اس لئے تمہیں صرف اپنے حافظے پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے کسی بھی لمحے میری زندگی کو کوئی المناک حادثہ پیش آ سکتا ہے اور میں تمہیں کچھ بتائے بغیر دنیا سے رخصت ہو سکتا ہوں۔ "

" آپ کیسی دل شکن باتیں کر رہے ہیں پتاجی! " نرملا کماری نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ " ابھی تو سالہا سال آپ کی محبتوں کا سایہ میرے سر پر قائم رہے گا۔ "

" خدا کرے ایسا ہو...... مگر سایہ آخر سایہ ہے۔ گردش کا کوئی اندھیرا اس سائے کو کسی بھی وقت نگل سکتا ہے۔ تم ایک راجپوت زادی ہو' تمہیں اس قدر کم ہمتی اور ناطاقتی کی بات نہیں کرنی چاہئے۔ خوف و خطر کے ہر احساس کو اپنے ذہن و قلب سے کھرچ ڈالو اور پوری یکسوئی کے ساتھ اس طلسم کدے کے ایک ایک راز کو اپنے حافظے کی گہرائیوں میں جذب کر لو۔ "

باپ کی باتیں سن کر نرملا کماری پوری طرح مستعد ہو گئی۔ وکرم سنگھ نے کرشن کی مورتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ " یہ پہلی مورتی ہے۔ تم آگے بڑھو اور بانسری پر تیز پھونک مارو۔ "

نرملا کماری چند لمحوں کیلئے جھجکی اور پھر باپ کی ہدایت کے مطابق اس نے آگے بڑھ کر اس بانسری کے بڑے سوراخ پر پھونک ماری جو کرشن جی کے ہاتھوں کا ایک مخصوص کھلونا نظر آ رہی تھی۔ نرملا کے ہونٹوں کی جنبش کے ساتھ ہی راہداری میں ایک انتہائی مسحور کن آواز گونجنے لگی۔ یہ گونج محل کی فضاؤں میں دیر باقی رہی اور پھر آہستہ آہستہ ڈوبنے لگی۔ پھر جیسے ہی مرلی کی تان ختم ہوئی مورتی کی دائیں جانب دیوار میں سات شگاف نمایاں ہو گئے۔ یہ منظر دیکھ کر نرملا کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی۔ " اوہ میرے خدا! " نرملا کی دلکش آواز ایک ہلکی سی چیخ میں تبدیل ہو گئی تھی۔

" بیٹی! یہ حیرت کے اظہار کا وقت نہیں ہے۔ " وکرم سنگھ نے نرملا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ یہ ساتوں دروازے نرملا کے بائیں ہاتھ کی جانب کھلے ہوئے تھے۔ " اب ادھر دیکھو۔ " مہامنتری نے اپنے دائیں جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نرملا نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا اور پھر جیسے ہی اس کی آنکھوں نے وکرم سنگھ کے اٹھے ہوئے ہاتھ

کا تعاقب کیا تو وہ ایک بار پھر حیرت کا شکار ہو گئی۔ بھگوان کرشن کی مورتی کی بائیں جانب بھی سات دروازے کھلے ہوئے تھے۔

"پتا جی! یہ سب کچھ کیا ہے؟" نرملا کماری نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"یہ اس طلسم کدے کا پہلا راز ہے۔ جو دروازے مورتی کی دائیں جانب کھلیں گے وہ تمہارے بائیں جانب کے دروازے شمار ہوں گے۔ اور جو مورتی کے بائیں جانب وا ہوں گے وہ تمہارے لئے دائیں طرف کے دروازے کہلائیں گے۔ کیونکہ تم مورتی کے بالکل سامنے کھڑی ہو۔ اس لئے زاویے بدل جائیں گے۔ یہاں یہ راز سمجھ لینا ضروری ہے کہ طلسم کدے میں پہنچنے کیلئے تم ہر مرتبہ اپنے دائیں ہاتھ کے دروازے استعمال کرو گی۔"

"اور اگر کوئی شخص غلطی سے بائیں جانب کے کسی دروازے میں داخل ہو جائے؟" نرملا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"طلسم تیار کرنے والوں نے دشمنوں کو دھوکا دینے کیلئے دونوں طرف ایک ہی انداز کے دروازے بنائے ہیں۔ اگر بد قسمتی سے ہمارا کوئی دشمن طلسم کدے کا نامکمل راز حاصل کر لے تو پھر اسے پہلے ہی قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پہلے ہی مرحلے میں آنے والا الجھ کر رہ جائے گا کہ وہ بائیں جانب کے دروازے سے داخل ہو یا دائیں طرف کے راستے سے۔ اگر اس نے بائیں جانب کے کھلے ہوئے دروازوں کا استعمال کیا تو پھر وہ کبھی نہ ختم ہونے والی مصیبت کا شکار ہو جائے گا۔"

"وہ کس طرح؟" نرملا کماری بہت زیادہ سراسیمہ نظر آ رہی تھی۔

"ٹھہرو! تمہیں یہ بات عملی طور پر سمجھنا پڑے گی۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ تیزی سے پلٹا اور اپنے کمرے میں پہنچ کر اس خوبصورت عورت کا مجسمہ اٹھا لایا جسے کسی ماہرِ فن کے ہاتھوں نے تراشا تھا۔ باپ کے ہاتھ میں یہ مجسمہ دیکھ کر نرملا کی حیرت کچھ اور بڑھ گئی۔

وکرم سنگھ نے واپس آ کر بیٹی کو مخاطب کیا۔ "اس طرح سمجھنے کی کوشش کرو کہ یہ مجسمہ ہمارا دشمن ہے اور اسے کسی طرح طلسم کدے کا راز حاصل ہو گیا ہے۔ یہ مجسمہ اصول کے مطابق بانسری میں پھونک مارتا ہے اور مورتی کے دونوں جانب سات سات دروازے کھل جاتے ہیں۔ اب اس مجسمے کو یہ راز نہیں معلوم ہے کہ کون سے دروازے میں داخل ہو کر دوسرے تہہ خانے تک پہنچا جا سکتا ہے۔ نتیجتاً وہ غلطی کا مرتکب ہو کر بائیں جانب کے دروازے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب غور سے دیکھو کہ اس غلطی کا کیا انجام ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ آگے بڑھا اور اس نے عورت کے دلکش مجسمے کو کھلے ہوئے دروازے میں رکھ دیا۔ جیسے ہی مجسمہ دروازے کے فرش سے ٹکرایا' دائیں اور بائیں جانب کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ صرف وہ دروازہ کھلا رہ گیا جس میں وکرم سنگھ نے مجسمہ رکھا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دروازے کا فرش تیزی سے نیچے کی طرف گرنے لگا۔

"نرملا! میرے قریب آؤ اور اس مجسمے کا حشر دیکھو۔"

نرملا تیزی سے باپ کے قریب آئی اور اس خلاء میں جھانکنے لگی جو مجسمے کے رکھتے ہی اچانک پیدا ہو گیا تھا۔ نرملا نے دیکھا' وہ مجسمہ بہت تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔ پھر نرملا کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب سا منظر ابھر آیا۔ مجسمہ سنگ مرمر کا تھا اس لئے گہری تاریکی کے باوجود نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی شخص اوپر سے نیچے جانے والے تاریک غار میں سفر کر رہا ہو یا کوئی چیز بلندی سے پستی کی طرف گر رہی ہو۔ یکایک نرملا نے دیکھا کہ مجسمہ کسی چیز سے ٹکرایا اور اس تصادم کے نتیجے میں ہلکی سی روشنی پیدا ہوئی ہو پھر

دوسرے ہی لمحے تاریکی چھا گئی اور دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔

"وہ مجسمہ کہاں گیا؟" نرملا کماری کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

"اس غلطی کا کوئی ازالہ ممکن نہیں۔" وکرم سنگھ نے گہرے رازوں سے پردہ ہٹاتے ہوئے کہا۔

"یہ مجسمہ ساتوں تہہ خانوں سے گزرتا ہوا اس سرنگ تک چلا گیا ہے جو دشمنوں کیلئے موت کی سرنگ ہے۔ تم نے مجسمے کے گرتے وقت کچھ روشنی سی دیکھی تھی۔ دراصل وہ پانی کی چھینٹیں تھیں جو کسی وزنی چیز کے گرنے سے بلند ہوئی تھیں۔ بائیں جانب کے دروازوں کا انجام موت کی سرنگ پر ہوتا ہے۔ یہ پانی کا ایک تیز رفتار چشمہ ہے جس پر سرنگ تعمیر کی گئی ہے۔ جو شخص بھی اوپر سے گر کر پانی کے چشمے تک پہنچے گا تیز لہریں اسے طویل اور تاریک سرنگ میں کھینچ کر لے جائیں گی۔ یہ سرنگ بیس میل لمبی ہے۔ سرنگ کے خاتمے پر مضبوط ترین لوہے کی سلاخیں نصب کی گئی ہیں تاکہ کوئی سخت جان دشمن سرنگ سے باہر نہ جا سکے اور آہنی سلاخیں اس کے تھکے ہوئے جسم کو روک لیں اور پانی کے خوفناک تھپیڑے اسے ہلاک کر ڈالیں پھر وہ مردہ جسم چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر دریائے گمبھیری میں پہنچ جائے۔"

وکرم سنگھ نے محبت سے بیٹی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "یہ دشمنوں کی سزا ہے 'غداری اور خیانت کا انجام ہے۔ اگر طلسم کدے کا معمار اس تہہ خانے کو اس پیچیدہ انداز میں تعمیر نہیں کرتا تو پھر کسی وقت بھی ہمارے خلاف کوئی ہنگامہ کھڑا ہو سکتا تھا اور دشمن تمہارے اس خاندانی راز کو چرا کر غلط فائدے بھی حاصل کر سکتے تھے۔"

نرملا کماری نے آہستہ آہستہ اپنے اعصاب پر قابو پا لیا اور جب وہ پرسکون نظر آنے لگی تو وکرم سنگھ نے کہا۔ "اب تم دوبارہ طلسم کدے کے پہلے مرحلے کو سر کرنے کی کوشش کرو۔"

نرملا خاموشی سے آگے بڑھی اور اس نے بانسری پر تیز پھونک ماری۔ ایک بار پھر فضاؤں میں مدھر تان گونجی اور مورتی کے دونوں جانب سات سات دروازے کھل گئے۔

"مثال کے طور پر کوئی شخص چوری کی نیت سے یہاں داخل ہوا اور اس قیمتی مورتی کو چرا لے جائے۔ اس طرح طلسم کدے کا پہلا مرحلہ تباہ ہو جائے گا۔" نرملا نے اچانک اس بحث کو ایک نئی سمت میں موڑ دیا تھا۔

وکرم سنگھ مسکرانے لگا۔ "تمہارے ذہن میں اس اندیشے کا پیدا ہونا ایک فطری عمل ہے۔ مگر طلسم کدے کے بنانے والے ہم سے زیادہ ہوشیار تھے۔ ان لوگوں نے صدیوں پہلے انسان کی اس کمزوری کو سمجھ لیا تھا۔ اس لئے حفاظتی طور پر مورتی کو اس قدر مضبوطی کے ساتھ نصب کیا گیا ہے کہ کئی زور آور انسان مل کر بھی اسے دیوار سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ مجبوراً انہیں کسی آہنی آلے کا سہارا لینا پڑے گا اور پھر جیسے ہی لوہا مورتی سے ٹکرائے گا اس آہن بدست چور کے جسم میں آگ لگ جائے گی۔ انجام کار اس کے دوسرے ساتھی بھی اپنی غلطی کو دہرانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ویسے یہ ایک انتہائی مشکل کام ہو گا کہ کوئی شخص اپنے بھگوان کو چرانے کی کوشش کرے۔"

نرملا ایک بار پھر شدید حیرت کے عالم میں اپنے آپ کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔

وکرم سنگھ نے بیٹی کی حیرت کو دور کرنے کے لئے کہا۔ "اگرچہ تمہارا یہ سوال بھی اس ضروری گفتگو کا ایک حصہ تھا لیکن فی الوقت ہم اپنے اصل موضوع سے ہٹ گئے ہیں۔ اب ہمیں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ اگر طلسم کدے میں داخل ہوتے وقت ہم سے یہ غلطی سرزد ہو جائے کہ ہم پہلے دروازے کی بجائے دوسرے 'تیسرے یا ساتویں دروازے میں داخل ہو جائیں تو پھر اس غلطی کی اصلاح کس طرح ہو گی؟ اس کا

ایک ہی جواب ہے کہ ہم غلط دروازے سے نکل کر دوبارہ مورتی کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔"

نرملا باپ کا اشارہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھی اور مورتی کے عین مقابل کھڑی ہو گئی۔

"اب تم اس بانسری کو اس طرح چھوؤ کہ ایک ہاتھ پہلے سرے پر ہو اور دوسرا ہاتھ آخری سرے پر۔ اگر غلطی سے تم نے ایک ہاتھ استعمال کیا تو مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکیں گے۔" مہامنتری وکرم سنگھ نے بیٹی کو ہدایت کی۔ "لیکن یاد رہے کہ تمہارے ہاتھ کرشن بھگوان کے ہاتھوں سے مس نہ ہونے پائیں۔"

نرملا نے وکرم سنگھ کی ہدایت کے مطابق بیک وقت دونوں ہاتھوں سے بانسری کو چھو لیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے تمام دروازے بند ہو گئے اور پوری دیوار ہموار نظر آنے لگی۔

"اس طرح ہم نے اپنی غلطی کا ازالہ کر دیا۔" وکرم سنگھ نے مسرور لہجے میں کہا۔ "اب ہم دوبارہ اسی انداز میں اپنے سفر کا آغاز کریں گے۔"

نرملا نے دوسری مرتبہ بانسری میں پھونک ماری۔ راہداری میں ایک ترنم ریز گونج پیدا ہوئی اور پھر گونج کے ختم ہوتے ہی پہلے کی طرح مورتی کے دونوں جانب سات سات دروازے کھل گئے۔ نرملا نے سوالیہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھا جیسے وہ پوچھ رہی ہو کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہو گا۔

"اب ہم پہلے دروازے میں قدم رکھیں گے۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ نے نرملا کو آگے بڑھایا۔ نرملا کچھ سہمی ہوئی سی دروازے میں داخل ہوئی اور اس کے ساتھ وکرم سنگھ بھی اندر چلا آیا۔

یکایک نرملا نے چونک کر باپ کی جانب دیکھا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ ان گھنٹیوں کی آواز مندر کی گھنٹیوں سے مشابہ تھی۔ جیسے کوئی پجاری بھگوان کو پوجا کیلئے بلا رہا ہو۔

"یہ گھنٹیاں اس بات کی دلیل ہیں کہ ہم صحیح دروازے میں داخل ہوئے ہیں۔" وکرم سنگھ نے نرملا کی حیرت کو دور کرتے ہوئے کہا۔ "بانسری کی تان کی طرح یہ گھنٹیاں بھی کچھ دیر تک بجتی رہیں گی۔ ان آوازوں کے بند ہونے کا انتظار کرو اور دیکھو کہ طلسم کدے کا کونسا در کھلتا ہے۔"

نرملا اپنی سانسیں روکے ان سحر کار گھنٹیوں کی آوازیں سنتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ آوازیں آہستہ آہستہ ڈوبنے لگیں۔ پھر گہرا سکوت چھا گیا۔ یہ سکوت لمحاتی تھا۔ نرملا نے اپنی آنکھوں کے سامنے دروازہ بند ہوتے دیکھا۔ دیوار کا شگاف ختم ہو گیا تھا اور نرملا کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی تاریک زندان میں قید کر دی گئی ہو۔ وہ اس وحشت ناک اندھیرے سے گھبرا کر کوئی نیا سوال کرنے ہی والی تھی کہ وکرم سنگھ کی آواز ابھری۔

"نرملا! پیچھے مڑ کر دیکھو۔"

پھر جیسے ہی نرملا نے گھوم کر دیکھا' عقب کی دیوار میں بھی ایک شگاف پیدا ہو گیا تھا۔

"باہر چلو۔" وکرم سنگھ نے کہا۔ "ہم طلسم کدے کے پہلے مرحلے سے گزر آئے۔"

نرملا دروازے سے باہر آئی تو اسی انداز کی راہداری اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔ قدم قدم پر فانوس جل رہے تھے اور قندیلیں روشن تھیں۔

"عام دنوں میں رات کے وقت اندھیرا رہتا ہے مگر آفریدی کی وجہ سے روشنی کے انتظامات کئے گئے ہیں۔ دن میں تمہیں یہ جگہ بھی محل کے رہائشی حصے کی طرح روشن نظر آئے گی۔ اس تہہ خانے کے نقشے اور تمہاری رہائش گاہ کے نقشے میں سرمو بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ اسے تم اپنا دوسرا محل کہہ سکتی ہو۔ یہاں تمہاری آسائش کیلئے ہر شے مہیا کی گئی ہے۔ آفریدی کی حفاظت کیلئے تہہ خانے میں میرے وفادار اور جنگجو سپاہیوں کا ایک دستہ موجود ہے۔" وکرم سنگھ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ کے سپاہیوں کو بھی اس حقیقت کا علم ہے کہ وہ مہامنتری کے مخصوص طلسم کدے کے اندر پہرہ دے رہے ہیں۔" نرملا کماری نے اپنے باپ سے ایک اور سوال کیا۔

"نہیں! ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ وکرم سنگھ کے محل میں ایک طلسم کدہ موجود ہے۔" وکرم سنگھ نے نرملا کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

"پھر یہ لوگ یہاں کس طرح پہنچے ہیں؟" نرملا' وکرم سنگھ کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

"دراصل ہمارا محل دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ فولادی دیوار طلسم کدے کو محل سے بالکل الگ کر دیتی ہے۔" وکرم سنگھ نے سامنے کی دیوار کی جانب اشارہ کیا۔ "اس وقت آفریدی' راج وید اور محافظ سپاہی دیوار کے دوسری طرف موجود ہیں۔ میں نے مصلحتاً آفریدی کو محل کے اسی حصے میں رکھا ہے جس سے ہمارے دربان' ملازم' فوجی دستے' راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی واقف ہیں۔ اس حصے کے تمام دروازے عقب میں کھلتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس حصے میں پہنچنا چاہے تو اسے زیادہ دشواری نہیں ہو گی۔"

"پھر آفریدی کس طرح محفوظ رہے گا؟" نرملا کماری نے ایک اور سوال کیا۔

"ہم اسے آج رات کے پچھلے پہر طلسم کدے کے ساتویں تہہ خانے میں منتقل کر دیں گے۔ مجھے صرف مائی بھان متی کے جواب کا انتظار ہے۔ راستہ پرپیچ اور طویل ہونے کے سبب چندر سنگھ کی واپسی شب کے آخری حصے میں ممکن ہو سکے گی۔ اس وقت تک آفریدی عام تہہ خانے میں رہے گا۔"

نرملا خاموش ہو گئی۔ اس کے ذہن میں طلسم کدے کے متعلق جو سوالات ابھر رہے تھے۔ ان کا سلسلہ عارضی طور پر ختم ہو گیا تھا۔

بیٹی کو خاموش پا کر وکرم سنگھ نے کہا۔ "اب ہم طلسم کدے کا دوسرا مرحلہ طے کریں گے۔"

نرملا نے سوالیہ نظروں سے مہامنتری کی طرف دیکھا۔

"یہاں پہنچ کر ہم دائیں جانب کچھ دور تک چلیں گے۔" یہ کہتے ہی وکرم سنگھ نے راہداری میں دائیں طرف چلنا شروع کر دیا۔ باپ کی تقلید میں نرملا بھی آگے بڑھی۔ چند قدم چلنے کے بعد وکرم سنگھ ٹھہر گیا۔ نرملا نے چونک کر دیکھا۔ سامنے کی دیوار میں اسی شکل کی دو مورتیاں نصب تھیں اور دونوں کے ہاتھوں میں نقرئی بانسریاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

"یہ دو مورتیاں کیسی ہیں پتا جی؟" نرملا نے بہت دیر بعد ایک نیا سوال کیا۔

"یہ مورتیاں بھی اسی طلسم کدے کا ایک حصہ ہیں۔" وکرم سنگھ نے اس پراسرار تہہ خانے پر پڑا ہوا ایک اور پردہ اٹھا دیا۔ "دو مورتیاں اس لئے ہیں کہ تم دھوکا نہ کھا سکو اور آسانی کے ساتھ سمجھ لو کہ یہ طلسم خانے کا دوسرا مرحلہ ہے۔ جب تمہیں دو مورتیاں نظر آئیں تو پھر لازم ہے کہ تم کسی ایک بانسری میں دو بار پھونک مارو گی۔ پھر وہی مسحور کن آواز فضا میں گونجے گی اور آواز کے ڈوبتے ہی پہلے مرحلے کی طرح مورتی کے دونوں جانب سات سات دروازے کھل جائیں گے۔"

نرملا نے اس معمے کو سمجھ لیا تھا اور وہ بڑے اعتماد کے ساتھ دروازے میں داخل ہو گئی۔ وکرم سنگھ بھی ایک رہنما کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں تیسرے تہہ خانے کی راہداری میں پہنچے۔ اس بار وہاں تین ہم شکل مورتیاں موجود تھیں اور تینوں کے ہاتھوں میں علیحدہ علیحدہ چاندی کی بانسریاں نظر آ رہی تھیں۔ کسی ماہر نقاش نے ان خوبصورت مورتیوں کو اس طرح تراشا تھا کہ کوئی شخص بھی انہیں ایک دوسرے سے مختلف ثابت نہیں کر سکتا تھا وہ ہم شکل بھی تھیں اور ہم رنگ بھی۔

"یہاں ہمیں تین بار پھونکوں کا استعمال کرنا پڑے گا۔" نرملا نے مورتیوں پر نظر پڑتے ہی کہا۔

"یقیناً۔" وکرم سنگھ زیرلب مسکرایا۔ "تین مورتیوں کی موجودگی ثابت کر رہی ہے کہ ہم تیسرے تہہ خانے میں داخل ہونے والے ہیں۔"

غرض اسی طرح وکرم سنگھ نرملا کو لے کر ساتویں تہہ خانے میں داخل ہو گیا۔ پھر جب عقب کی دیوار کھلی تو وہاں کوئی راہداری نظر نہیں آئی چاروں طرف درخت ہی درخت نظر آ رہے تھے۔ اور سامنے محل کی بلند ترین دیوار تھی جس کی اونچائی پچاس گز کے قریب ہوگی۔

"کیا ہمارا طلسم کدے کا سفر ختم ہو گیا؟" یہاں پہنچ کر نرملا نے سوال کیا۔

"ہاں! ہم ساتوں تہہ خانے عبور کر چکے۔" وکرم سنگھ نے وضاحت کی۔ "ان تمام مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہمارے سامنے دو راستے باقی رہ جاتے ہیں۔ ایک راستہ درختوں سے ڈھکی ہوئی وہ سرنگ ہے جو تمہیں بحفاظت چتوڑ کی سرحدوں سے نکال کر اجمیر جانے والی راہ پر ڈال دے گی۔ اور دوسرا راستہ محل میں داخل ہونے کا ہے۔ آفریدی اس آہنی دیوار کے پیچھے ایک کمرے میں موجود ہے۔ دیوار کی دوسری طرف پہنچنے کیلئے ہم اس سیاہ پتھر کی مورتی کو استعمال کریں گے جس کے ہاتھ میں نیلے رنگ کی بانسری موجود ہے۔ اس بانسری میں سات پھونکیں مارنے کے بعد آہنی دیوار میں شگاف پیدا ہو جائے گا۔" وکرم سنگھ نے پلٹ کر اس مورتی کی طرف اشارہ کیا جو ساتویں تہہ خانے کی باہری دیوار پر دائیں جانب نصب تھی۔

نرملا کو اندھیرے کی وجہ سے وہ مورتی صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس لئے وکرم سنگھ نے بیٹی کی ذہنی کشمکش کو دور کرتے ہوئے کہا۔ "تم سرنگ اور محل کے راستوں کو دن کی روشنی میں بہتر طور پر سمجھ سکو گی۔ کل کسی وقت تمہیں ان دونوں چیزوں کا بھی عملی مشاہدہ کرا دیا جائے گا۔ فی الوقت ہمیں واپس چلنا چاہئے۔"

"وہ کس طرح؟" نرملا کماری نے طلسم کدے کے دوسرے رخ کو جاننے کی خواہش ظاہر کی۔

"یہاں سے واپسی کا طریقہ بالکل الٹا ہے۔" وکرم سنگھ نے کہا۔ "تمہارے بائیں ہاتھ پر سونے کی اسی جیسی ایک مورتی موجود ہے جو تم نے پہلی بار دیکھی تھی سات پھونکیں مارنے کے بعد دروازہ کھل جائے گا میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا کہ آتے وقت ہر تہہ خانے کی دیوار میں مقررہ تعداد کے مطابق بڑے بڑے سوراخ موجود ہیں۔ جب تم طلسم کدے سے باہر آنے کے بعد بانسری میں سات پھونکیں مارو گی تو اندر والے تہہ خانے کے سوراخوں میں خود بخود چھ مورتیاں ابھر آئیں گی جو اس بات کی نشاندہی کریں گی کہ تم چھٹے تہہ خانے میں پہنچ چکی ہو اور پھر چھ پھونکیں تمہیں پانچویں تہہ خانے میں پہنچا دیں گی۔ دیوار پر تمہیں جس قدر مورتیاں نظر آئیں گی اسی تعداد میں پھونکوں کا استعمال کرنا ہوگا یہاں تک کہ تم اپنے محل میں واپس پہنچ جاؤ گی۔"

تہہ خانے سے محل واپس آنے کے بعد وکرم سنگھ نے اپنی بیٹی نرملا کو مزید ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ "کل تم کسی وقت اپنے بزرگوں کے بنائے ہوئے اس طلسم کدے میں منتقل ہو جاؤ گی۔ میں تمہیں اس محل میں نہیں رہنے دوں گا جس کے ایک ایک گوشے سے تمہاری بہن رانی پدمنی واقف ہے۔"

"آخر آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟" نرملا کو اپنے باپ کے لہجے میں پوشیدہ گہری مایوسی کا احساس ہو رہا تھا۔

"میری یہ سوچ کسی خوف کا نتیجہ نہیں۔" وکرم سنگھ کی گفتگو کا انداز جارحانہ تھا۔ "میں اس خاندان کا ایک فرد ہوں جس کے وارثوں نے آفات و حادثات کے سامنے کبھی سر نہیں جھکایا مگر تمہاری پیدائش نے مجھے فطری طور پر کمزور بنا دیا ہے۔ لیکن پھر بھی اہل چتوڑ سمجھ لیں کہ باد سموم کا ہر جھونکا پہلے میرے بدن کی دیوار کو جلائے گا اگر وہ گرم ہوا تمہارے دامن کے قریب سے بھی گزر گئی تو پھر میری زندگی ایک گناہ ہے اور

میں گناہ گاروں کی طرح گردن جھکا کر جینا نہیں چاہتا۔ میں نے تمام عمر پتھر کے دیوتاؤں سے دعا کی ہے کہ جب تک زندہ رہوں اس وقت تک لوگ مجھے میرے سر سے پہچانیں میں چتوڑ کے گلی کوچوں سے گزروں تو دیکھنے والے بے ساختہ پکار اٹھیں کہ............ "وہ آ رہا ہے سرافراز وکرم سنگھ چوہان۔ میری پہچان میرے سر سے ہے کانپتے ہوئے قدموں سے نہیں۔ آج میں آفریدی کے خدا سے بھی یہی دعا کرتا ہوں کہ میرے کاندھوں پر میرا سر باقی رہے میں بغیر سر کے جینا نہیں چاہتا۔" وکرم سنگھ کا لہجہ دم بہ دم رقت آمیز ہوتا جا رہا تھا۔

"وہ کون ہے جو آپ سے آپ کا سر چھیننا چاہتا ہے؟" نرملا کماری بدستور باپ کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگی۔

"بیٹی! کس کس کا نام لوں؟ تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں۔" وکرم سنگھ نے اس ماتمی فضا کو بدلنے کیلئے اپنے سوگوار لہجے پر قابو پایا اور درشت آواز میں کہنے لگا۔ "میں رام دیو کی مسلسل شکستوں کا چشم دید گواہ ہوں۔ آفریدی کے سامنے اس کی نام نہاد عظمتوں کا بت ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔ وہ آندھی جو راج دوت کی دعاؤں سے رکی اس نے رام دیو کے آشرم کو بنیادوں سے اکھاڑ پھینکا اور اس کے سیکڑوں بدکار چیلوں کو ہلاک کر دیا۔ چتوڑ کے باقی باشندے ہر طرح محفوظ رہے۔ اس واقعے نے راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی، رام دیو اور تمام راجپوت سرداروں پر یہ بات ثابت کر دی کہ ہندوؤں کا پورا مذہبی نظام ایک معمولی سفیر کے سامنے مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ رام دیو اپنی اس شکست کو فراموش نہیں کرے گا۔ میں نے استعفیٰ واپس لینے کیلئے یہ شرط عائد کی تھی کہ رانی پدمنی اور رام دیو سیاست سے علیحدہ رہیں گے اور راجہ رتن سنگھ نے وقتی طور پر میری یہ شرط مان بھی لی تھی مگر میں صاحبان اقتدار کے مزاج کو جانتا ہوں کہ وہ اپنے مفادات کے لئے انتہائی پستیوں میں بھی گر جاتے ہیں اور جیسے ہی انہیں مجبوریوں سے نجات ملتی ہے وہ اپنی فطری خود غرضی اور سنگدلی کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ اہل وفا کو صرف اس جرم پر مٹا دیا جاتا ہے کہ وہ حریص نہیں ہوتے اور آزمائش کے وقت سچ بولتے ہیں پھر یہی سچ انہیں زندگی سے محروم کر دیتا ہے۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے اپنی آنکھوں سے رام دیو کو ناکام و نامراد ہوتے ہوئے دیکھ لیا مگر جب بھی وہ خوشامدی جادوگر چتوڑ کے حکمرانوں کی خلوت میں پہنچے گا یہ غیرت مند راجپوت اس کے قدموں پر سر جھکا دیں گے۔"

"آخر ایسا کیوں ہوتا ہے پتا جی؟" نرملا کماری اب بھی رو رہی تھی۔

"راجہ رتن سنگھ اور رام دیو کے درمیان بدی اور گناہ کا طاقتور رشتہ موجود ہے جو اس وقت تک نہیں ٹوٹے گا جب تک ایک فریق اپنا راستہ نہیں بدل لیتا۔ رام دیو عیار ہے اس لئے راجہ رتن سنگھ کے ظلم و تشدد کو بھی دیوتاؤں کا آشیرواد کہتا ہے۔ چتوڑ کے عوام کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کی تعریف کرتا ہے اور پھر یہی ذلت آمیز خوشامد راجہ رتن سنگھ کے عشرت کدے میں اسے گہری نیند سلا دیتی ہے۔ اس نے اپنے آشرم کی بنیاد ڈال کر اہل چتوڑ کو مندروں سے دور کر دیا جو کام شیو گنیش اور شنکر کرتے تھے وہ کام رام دیو کرنے لگا۔ سادہ لوح اور جاہل عوام اس کی شعبدہ بازیاں دیکھ کر آشرم کی سیڑھیوں پر سجدے کرنے لگے۔ معصوم لڑکیاں مذہبی تعلیم سیکھنے کے شوق میں رام دیو کے آشرم میں پہنچنے لگیں۔ وہ تمام دوشیزائیں جو ایک بار آشرم میں داخل ہو گئیں پھر وہ کبھی سلامتی کے ساتھ اپنے گھر نہیں پہنچیں۔ آشرم اور راجہ رتن سنگھ کے عشرت کدے کے درمیان ایک خفیہ سرنگ موجود ہے۔ یہ ناشگفتہ کلیاں اسی سرنگ کے ذریعے راجہ رتن سنگھ کی خلوت خاص میں لے جائی جاتی ہیں اور پھر ظلم و ہوس کی گرم ہوائیں ان کلیوں کو جھلسا کر رکھ دیتی

ہیں۔ رام دیو قوم کی بیٹیوں کا تاجر ہے اور اس تجارت نے اسے مہاتما بنا دیا ہے۔"

"رانی پدمنی، راجپوت سمراٹ کے اس گھناؤنے فعل پر کوئی اعتراض نہیں کرتیں؟" نرملا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس کیلئے اس کا شوق آرائش ہی کافی ہے۔" وکرم سنگھ کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔ "اس کا غرور حسن برقرار رہے۔ اگر چتوڑ کی ایک ایک دوشیزہ کا دامن بھی چاک ہو جائے تو پدمنی کے خواب ناز میں کوئی خلل واقع نہیں ہو گا۔ وہ اسی طرح سوتی رہے گی کہ راجہ رتن سنگھ اس کا غلام ہے۔"

"مگر ان راجپوت سرداروں کو کیا ہو گیا ہے۔" اب نرملا کی آواز بھی شعلہ ریز ہو گئی تھی.........

"رانی پدمنی کی توہین پر سلطان علاءالدین خلجی کو قتل کرنے کی قسم کھانے والوں کو اپنی قوم کی دریدہ لباس ۔۔۔ آنچل بیٹیاں نظر نہیں آتیں۔"

"نہیں! کسی کو کچھ نظر نہیں آئے گا کہ یہ سب کے سب رام دیو کے کاروبار ہوس میں برابر کے حصے دار ہیں۔ چتوڑ کے ناموس کی شراب قطرہ قطرہ ہر اس شخص کے ہونٹوں تک پہنچتی ہے جو اقتدار میں شریک ہے۔" غصے کی آگ سے وکرم سنگھ کا چہرہ بھی جل رہا تھا اور ہونٹ بھی......... "مائی بھان متی نے انصاف مانگا تھا تو طوائف زادی کہلائی۔ آنند پال نے ہونٹوں کو جنبش دی تو ان کی زبان کاٹ دی گئی۔ اب میں بولا ہوں تو میری سزا بھی سنیاسی کے انجام سے مختلف نہیں ہو گی۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گیا اور اپنے قدموں سے لپٹی ہوئی نرملا کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"بیٹی! تمہیں اس المناک حادثے کیلئے تیار رہنا چاہئے۔ تمہارا باپ اس فریب کار دنیا سے کسی بھی وقت رخصت ہو سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد یہ درندے اپنے خونیں پنجوں کے ساتھ تمہاری طرف جھپٹیں۔ ممکن ہے کہ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی قرابت داری کے سبب تمہیں زندہ رہنے کی رعایت بخش دیں۔ مگر رام دیو کے کالے قانون میں معافی کا کوئی لفظ نہیں ہے۔ وہ لومڑیوں اور گیدڑوں کی طرح چالیں چلے گا اور انسانی جسم کے ساتھ بھیڑیوں سے بدتر سلوک روا رکھے گا.........۔"

"مگر اس سے پہلے تو میں خود کو آگ کے حوالے کر سکتی ہوں۔" نرملا کی اداسی ختم ہو گئی تھی۔ اس نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"یہ تو آخری صورت ہے۔" وکرم سنگھ نے نرملا کے خیالات کی نفی کرتے ہوئے کہا۔ "اگر عزت و وقار محفوظ رہ سکتے ہیں تو انسان کو زندہ رہنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ میں تمہیں ایک پرسکون اور آبرومندانہ زندگی دے کر اس بے وفا دنیا سے منہ موڑنا چاہتا ہوں۔ اور تمہیں وہ زندگی اس طلسم کدے کے اندر ملے گی۔ وہاں زندگی کا ایک سچا سفیر موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے سر سے موت ٹل جائے گی۔ اگر وہ بینائی سے محروم ہو گیا تو تم اس کا سہارا ہو گی۔ آفریدی میرے دور اقتدار میں اندھا ہوا ہے، اس لئے اس کا علاج بھی مجھ پر فرض ہے۔ جب تک مجھے سانسوں کا سرمایہ حاصل ہے اس وقت تک میں خود اس کی نگہداشت کر رہا ہوں۔ اور جب فرشتۂ اجل میری سانسیں غصب کرے گا تو پھر اس فرض کو اس شخص کی بیٹی تکمیل تک پہنچائے گی جو تمام عمر اپنے خیالات و نظریات کی آگ میں تنہا جلتا رہا۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ دشمنوں پر غالب آ جائیں۔" یکایک نرملا نے پرامید لہجے میں کہا۔

"ایک جسم ناتواں اور لاکھوں پتھر؟ تمہیں اندازہ ہے نرملا کہ کتنے زخم اس شخص کا مقدر بنیں گے؟ نہیں میری بیٹی! خدا تمہیں وہ منظر کبھی نہ دکھائے۔ میں بہت دن جی لیا۔ اپنے باقی دن تمہارے نام اور ان

آنے والوں کے نام لکھ رہا ہوں جو سچ کی امانت کا بار گراں اٹھائے ہوئے چتوڑ کی طرف آئیں گے۔"

☆..................☆..................☆

چندر سنگھ نصف شب سے پہلے بمل شاہ کے مندر پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ مائی بھان متی سو چکی ہوں گی مگر جب چندر سنگھ نے ایک داسی سے پوچھا تو اسے معلوم ہوا کہ مائی جاگ رہی ہیں مگر وہ کسی سے ملاقات نہیں کرتیں۔

"تم مائی کے حضور عرض کرو کہ ان کے داس مہامنتری وکرم سنگھ کا ملازم شرف باریابی چاہتا ہے۔" چندر سنگھ نے اس قدر عاجزانہ لہجے میں کہا کہ داسی حیران رہ گئی۔ یہ عزت و احترام تو خود راجہ رتن سنگھ کو بھی حاصل نہیں تھا۔

داسی نے چندر سنگھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور کچھ سوچتے ہوئے کمرے کے اندر چلی گئی جہاں مائی بھان متی آنکھیں بند کئے اپنے گیان میں غرق تھی۔

"مائی! میری یہ جرأت نہیں تھی کہ میں اس وقت آپ کی خلوت میں داخل بھی ہو سکوں مگر آپ کے داس وکرم سنگھ کا خادم ایک خاص پیغام کے ساتھ دروازے پر سر جھکائے کھڑا ہے۔" داسی کی آواز بھی کانپ رہی تھی اور جسم بھی۔

مائی نے آنکھیں کھول کر لرزتی ہوئی داسی کو دیکھا اور پھر بڑے فکر انگیز لہجے میں کہا......... "اس وقت آدھی رات کے وقت، مہامنتری پر کیا بپتا پڑی ہے کہ اس نے سورج نکلنے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ اسے جلدی بھیجو۔" مائی بہت بے قرار نظر آ رہی تھی۔

چندر سنگھ بے تابانہ داخل ہوا اور مائی کے قدموں پر سر رکھنے کیلئے زمین بوس ہونے لگا۔

"کھڑے رہو کہ یہ سجدہ میرے یہاں حرام ہے۔ رتن سنگھ کے آداب اسی کے دربار میں دفن کرو۔" مائی بھان متی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا اور پھر فوراً ہی پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔ "سب کشل (خیریت) تو ہے۔ وکرم سنگھ نے تمہیں آدھی رات کو یہاں کیوں بھیجا ہے؟"

"رانی پدمنی کے حکم پر راج دوت کو اس قدر زدوکوب کیا گیا ہے کہ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ بہت دیر بعد اسے ہوش آیا تو راج وید نے یہ راز فاش کیا کہ دلی کا سفیر اپنی بینائی سے محروم ہو چکا ہے۔ خود مہامنتری نے بھی آفریدی سے دریافت کیا مگر وہ یہ کہہ کر دوبارہ بے ہوش ہو گیا کہ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔" چندر سنگھ گھبرائے ہوئے لہجے میں آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ "اب مہامنتری آپ کے حکم کے منتظر ہیں، انہیں راج وید پر بھروسہ نہیں کہ وہ راجہ رتن سنگھ اور رام دیو کا غلام ہے۔ مہامنتری کے خیال میں وہ آفریدی کو جسمانی طور پر ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

مائی بھان متی بہت دیر تک آنکھیں بند کئے کسی مجسمے کی مانند ساکت بیٹھی رہی۔ چندر سنگھ امید و بیم کی حالت میں اس بوڑھی عورت کو دیکھ رہا تھا جس کے ہونٹوں کی جنبش پر ایک بہت بڑے فیصلے کا انحصار تھا۔ اور جب مائی بھان متی نے لب کشائی کی تو چندر سنگھ کے چہرے پر خوشی کے چراغ روشن ہو گئے۔ مائی، وکرم سنگھ کے قاصد سے پرجوش لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "راج وید جھوٹ بولتا ہے۔ آفریدی کی بینائی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا ہے۔ راج وید اگر اسے زہر دے کر بھی ہلاک کرنا چاہے تو وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ یہ وقتی تکلیف ہے جو بہت جلد زائل ہو جائے گی۔ آفریدی کے مقدر میں کسی بت پرست کے ہاتھوں ہلاک ہونا نہیں لکھا ہے۔ جب آسمانوں کا فیصلہ کچھ اور ہے تو زمین والے پریشان کیوں ہیں؟ ہونے دو جو کچھ ہو رہا ہے......... اور جو آنے والے ہیں وہ آ کر رہیں گے......... اور جو کچھ لکھ دیا گیا ہے

اسے مٹانے والے ابھی پیدا نہیں ہوئے۔ " یہ کہہ کر مائی بھان متی خاموش ہوگئی۔

جواب مل چکا تھا۔ اس لئے چندر سنگھ نے ادب سے سر جھکایا اور الٹے قدموں واپس جانے لگا۔ جب دروازے کے قریب پہنچا تو مائی بھان متی نے پکار کر کہا۔ " وکرم سنگھ سے کہنا وقت بہت کم ہے۔ موت اور بربادی کے درمیان مشورے ہو رہے ہیں۔ " قہر کی لہر " اٹھنے ہی والی ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ جلد از جلد مکتی (نجات) حاصل کرلے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لمحے کسی طوفان کی طرح گزر جائیں اور وہ کفِ افسوس ملتا رہ جائے۔" اتنا کہہ کر مائی نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں اور چندر سنگھ، بمل شاہ کے مندر سے نکل کر گھوڑے کی پشت پر سوار ہوگیا۔

پھر جب وہ رات کے پچھلے پہر مہامنتری کے محل پہنچا تو وکرم سنگھ شدید بے چینی کے عالم میں ٹہل رہا تھا اور نرملا کماری اداس نظروں سے اس مشفق و مہربان باپ کو دیکھ رہی تھی جس کا سفینۂ حیات سیاست کے بھنور میں اس طرح الجھا ہوا تھا کہ کبھی ڈوب جانے کا گمان ہوتا تھا اور کبھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ آسودۂ ساحل ہوجائے گا۔

" کیا خبر لائے ہو چندر سنگھ ؟ " مہامنتری نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔

چندر سنگھ نے اپنے آقا کے اضطراب کو دیکھتے ہوئے بڑی روانی سے ایک ایک بات کہہ ڈالی۔ آفریدی کی بینائی محفوظ رہنے کی خبر سن کر مہامنتری، چندر سنگھ سے لپٹ گیا۔ یہ فرطِ مسرت اور وارفتگیٔ شوق کا عجیب مظاہرہ تھا۔ " چندر سنگھ! تم اہلِ وفا کے سربلند خاندان سے تعلق رکھتے ہو اور اہل وفا ایسی ہی جاں فزا خبریں لے کر آتے ہیں۔ "

پھر جب چندر سنگھ نے اسے مائی بھان متی کا آخری پیغام پہنچایا تو وکرم سنگھ سناٹے میں آگیا۔ اس کے دونوں ہاتھ بلند ہوئے اور اپنے لمبے بالوں کو اس طرح جکڑ لیا جیسے وہ شدید ذہنی کشمکش کا شکار ہو۔

" ہاں! میں جانتا ہوں کہ وقت بہت کم ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر وقت گزر گیا تو میری زندگی رائیگاں جائے گی۔ کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ " وکرم سنگھ خود کلامی کے انداز میں بول رہا تھا۔ " مگر میں وقت کو پکڑ لوں گا۔ اگر میرا جذبہ سچا ہے تو میرے انتظار میں چند ساعتوں کے لئے وقت کی رفتار خود ٹھہر جائے گی۔ "

" آقا یہ آپ کو کیا ہو رہا ہے ؟ " مہامنتری کی وحشت دیکھ کر چندر سنگھ لرز اٹھا۔

" کچھ نہیں! تم جا کر سو جاؤ۔ " وکرم سنگھ نے فوراً ہی اپنی ہیجانی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔" میں صبح تم سے بات کروں گا۔ "

چندر سنگھ بجھے ہوئے چہرے اور تھکے ہوئے قدموں سے واپس چلا گیا۔

☆..................☆..................☆

چندر سنگھ کے جاتے ہی وکرم سنگھ مڑا اور نرملا کی طرف دیکھنے لگا۔

باپ کی یہ حالت دیکھ کر نرملا خاموش نہ رہ سکی۔ " مائی کے اس پیغام کا کیا مطلب ہے ؟ " نرملا کی آواز میں ارتعاش اور آنکھوں میں گہری اداسی تھی۔

" یہی کہ چتوڑ کے مقدر کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ " وکرم سنگھ نے نرملا کی خاطر مسکرانے کی کوشش کی مگر یہ ایک ایسا تبسم تھا جس کے پیچھے ہزاروں غم پنہاں تھے۔ " موت اور بربادی کے مشوروں کا ایک ہی مفہوم ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی اپنے سپہ سالاروں کے ساتھ مل کر چتوڑ پر حملے کا منصوبہ ترتیب دے رہا ہے۔ " قہر کی لہر " اٹھنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ سلطان کی فوجیں دلی سے کوچ کرنے ہی والی ہیں۔ اور

نجات حاصل کرنے سے مائی کا مقصد یہ ہے کہ سنیاسی آنند پال نے جس خدا کا اقرار کیا ہمیں بھی اسی خدا کی سچائی کا اعلان کر دینا چاہئے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ وقت ہمیں اتنی مہلت نہ دے۔ "

" پھر ؟ " نرملا کے خوبصورت چہرے پر ایک بڑا سوالیہ نشان ابھر آیا تھا۔

" صبح قریب ہے، ہماری زندگی کی نئی صبح .... سورج کے نکلنے اور آفریدی کے ہوش میں آنے کا انتظار کرو۔ "

☆..................☆..................☆

دوسرے دن مہامنتری نے انعام و اکرام دے کر راج وید کو رخصت کر دیا اور خود اس کمرے کے دروازے پر آیا جہاں پچیس مسلح سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ وکرم سنگھ کو دیکھ کر وہ تمام سپاہی احتراماً خم ہوئے مہامنتری ان کے ادب و احترام کا جواب دیتا ہوا دبے پاؤں کمرے میں اس طرح داخل ہوا کہ ہلکی سی آہٹ تک نہیں ہو رہی تھی۔ وکرم سنگھ نے ایک بار پھر وہی جگر شگاف منظر دیکھا۔ علی عامر آفریدی سفید پٹیوں میں اس طرح لپٹا ہوا تھا جیسے کسی شخص نے کفن اوڑھ لیا ہو۔ وکرم سنگھ تڑپ کر رہ گیا۔

" اے عظیم نوجوان! تجھے کس جرم بے گناہی پر سزا دی جا رہی ہے! " وکرم سنگھ نے دل ہی دل میں کہا اور آفریدی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ قریب پہنچ کر وکرم سنگھ آفریدی کے چہرے پر جھک گیا۔ شاہی سفیر کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جیسے ہی وکرم سنگھ اس قدر قریب ہوا آفریدی نے چونک کر کراہا۔

" کون! راج وید ؟ " آفریدی کی آواز میں وہی استقامت تھی۔

" راج وید نہیں بیٹے! یہ میں ہوں مہامنتری وکرم سنگھ۔ " شدتِ جذبات سے وکرم سنگھ کی آواز لرز رہی تھی۔

" آپ نے کیوں زحمت کی ؟ " علی عامر آفریدی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ایسی مسکراہٹ جو اپنے ہر زاویے سے زخمی اور شکستہ تھی۔ " آپ تو صاحبانِ اقتدار میں سے ہیں۔ آپ کو اپنے عہدے کا لحاظ رکھنا چاہئے تھا۔ میری مزاج پرسی کے لئے رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ کی فوج کا کوئی سپاہی یا ان کا کوئی خدمت گار ہی کافی تھا۔ ہم جس درجے کے لوگ ہیں، اسی پیمانے پر ہماری تواضع بھی ہونا چاہئے۔ براہِ کرم آپ تشریف لے جائیں میرے لئے راج وید یا کسی ملازم کی موجودگی بہت ہے اور اس کی بھی کیا ضرورت ہے۔ جب آدابِ سفارت ہی قتل کر دیئے گئے تو پھر شاہی سفیر جئے یا مرے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ "

وکرم سنگھ، آفریدی کے طرزِ کلام پر حیرت زدہ رہ گیا۔ موت سے منہ میں بھی وہی تیور تھے۔ بسترِ مرگ پر بھی وہی بے نیازی تھی اور دستِ قاتل کو شہ رگ کے قریب دیکھ کر بھی زندگی کی وہی ادا تھی، سرفروشانہ ادا جو کسی ایک کا ہو جانے کے بعد دوسرے کی غلامی تسلیم نہیں کرتی۔

" نہیں بیٹے! تم معمولی انسان نہیں ہو۔ " وکرم سنگھ نے آہستہ سے آفریدی کے زخمی سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ " تم تنہا ایک پورا عہدِ سیاست ہو، ہندوستان کی تاریخ کا ایک مکمل باب ہو، علاء الدین خلجی کا عکس ذات ہو اور دلی کے سلطان کا ایک زندہ اور متحرک حکم ہو۔ " وکرم سنگھ نے آفریدی کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔

" سلطان کا وہی عکسِ ذات جسے اندھیروں کے حوالے کر دیا گیا۔ علاء الدین خلجی کا وہی حکم جس کی دھجیاں ہوا میں اڑا دی گئیں اور ایک ایک حرفِ جلال کو پیروں سے مسل دیا گیا۔ اگر میں اتنا ہی معتبر تھا تو خود رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ کو میری عیادت کیلئے آنا چاہئے تھا۔ " گفتگو کرتے وقت آفریدی کے

چہرے پر کرب کی علامت نمایاں ہو جاتی تھی اور یہ علامت ان زخموں کی سوزش کا نتیجہ تھی جو اس کے پورے جسم پر سجے ہوئے تھے۔

"قاتل کسی کی عیادت کو نہیں آتے۔" سوزِ دروں سے وکرم سنگھ کا لہجہ بھی جل اٹھا تھا۔ "وہ تو تمہیں قتل کر دینا چاہتے ہیں۔"

"پھر مجھے اب تک ہلاک کیوں نہیں کیا گیا؟ ایک بے دست و پا سفیر اور ہزاروں مسلح راجپوت شرر فشاں تلواریں، زہر میں بجھے ہوئے تیر، فولادی نیزے۔ کیا میرے قتل کیلئے اتنا ساز و سامان ناکافی ہے؟ کیا رانی پدمنی چاہتی ہیں کہ میں خود اپنی گردن کاٹ کر ان کے قدموں میں رکھ دوں؟ ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا ہے میں تو روزانہ ہی اپنی موت سے یہ سوال کرتا ہوں، اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے؟" خلشِ دل رقیق آگ کی طرح آفریدی کے ہونٹوں سے بہہ رہی تھی۔

وکرم سنگھ خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر اس نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ "آفریدی کیا تم میرا چہرہ دیکھ سکتے ہو۔"

"میں اب کچھ دیکھنا نہیں چاہتا۔" آفریدی ہر شے سے بیزار نظر آ رہا تھا۔

"بیٹے! اب اس تلخ گفتگو کا وقت نہیں رہا۔ جو کچھ گزر گئی اسے فراموش کر دو۔" وکرم سنگھ کی مہربان آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ "مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تمہاری قوتِ بینائی زائل ہو گئی ہے یا تم اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہو؟"

"آپ ان دونوں حالتوں میں کس کو پسند کریں گے؟" آفریدی کے لہجے کی تلخی برقرار تھی۔

"آفریدی تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں۔" وکرم سنگھ کی آواز سے اس کے دل کا درد جھلک رہا تھا۔ "یہ میری زندگی کی کیسی عجیب مشکل ہے کہ میں تمہیں اپنی زبان نہیں سمجھا سکتا۔ تم رانی پدمنی کی قید میں نہیں، میرے مکان کے ایک محفوظ ترین کمرے میں ہو۔ تم نہیں جانتے کہ میں تمہیں یہاں تک کس طرح لایا ہوں؟" یہ کہہ کر وکرم سنگھ نے آفریدی کو تمام واقعات تفصیل سے سنا ڈالے۔

آفریدی کا پورا چہرہ پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا، اس کے چہرے سے اس کے دلی تاثرات ظاہر نہ ہو سکے مگر بے نور آنکھوں میں کئی رنگ ابھر کر ڈوبے اور پتلیاں کئی بار کانپ کر رہ گئیں۔ پھر ایک طویل وقفۂ سکوت کے بعد آفریدی، وکرم سنگھ سے مخاطب ہوا۔

"آخر آپ کو میری زندگی سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟" آفریدی نے پہلی بار واضح انداز میں مہامنتری سے ایک نازک سوال کیا تھا۔ "میں اس شخص کا سفیر ہوں جو عنقریب آپ کے وطن کی بنیادیں تک اکھاڑ پھینکے گا۔ آپ جن دیوتاؤں کو پوجتے ہیں وہ انہیں محض پتھر کے کھلونے سمجھتا ہے۔ وہ سربلند ہے اور آپ کے سروں کو اپنے قدموں پر جھکا دینا چاہتا ہے۔ اس کا تمدن الگ ہے اور آپ کی تہذیب و ثقافت جدا۔ سیاست کی بساط پر وہ آپ کا دشمن ہے اور آپ اس کے خون کے پیاسے۔ پھر اسی کے نامہ بر سے یہ ہمدردیاں کیوں؟ مہامنتری! میں آج تک اس راز کو سمجھنے سے عاجز رہا کہ رانی پدمنی مجھے قتل کرنا چاہتی ہیں اور آپ اپنی زندگی کو خطرات میں ڈال کر میری جان بچانا چاہتے ہیں۔ آپ کی یہ نوازشات انسانی فطرت کے خلاف ہیں۔ مجھے بتائیں کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟"

"میں نے سوچا تھا کہ کسی فرصت کے لمحے میں تمہیں مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ وقت میری گرفت سے نکل چکا ہے۔" وکرم سنگھ بہت زیادہ افسردہ نظر آ رہا تھا۔ "بے شک! تم اس شخص کے سفیر ہو جو عنقریب ہماری زمین پر قہر بن کر برسنے والا ہے مگر پھر بھی تم مجھے عزیز ہو...........

ذریعہ رشتہ بالآخر سنیاسی آنند پال تک جا پہنچتا ہے۔ آنند پال میرے روحانی رہنما تھے اور تم ان کے روحانی فرزند...... اس تعلق سے تمہارے اور میرے درمیان بھی ایک اٹوٹ رشتہ قائم ہوتا ہے میں اس رشتے کو کس طرح منقطع ہو جانے دوں۔ کیا کسی محبت کرنے والے غیرت مند باپ نے اپنے بیٹے کو مسائل کی آگ میں جلتا چھوڑ کر اپنا دامن بچا لیا ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ آج چتوڑ کی تاریخ بھی اسی مقدس روایت کو دہرا رہی ہے۔" وکرم سنگھ کی آنکھیں اشکبار ہو گئی تھیں مگر آفریدی ان آنسوؤں کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ "کیا اب بھی تمہیں کسی وضاحت کی ضرورت ہے؟ کیا اب بھی تم اس راز کو سمجھنے سے قاصر ہو کہ میں اپنی جان پر کھیل کر تمہاری زندگی کیوں بچانا چاہتا ہوں؟"

آفریدی کچھ دیر تک سناٹے کے عالم میں کھلی آنکھوں سے دیکھتا رہا پھر یہ آنکھیں چند لمحوں کیلئے بند ہوئیں اور اس کے رخساروں پر جلے ہوئے اشکوں کی دو شمعیں روشن ہو گئیں۔ زبان کا استعمال تو سب کر لیتے ہیں مگر درحقیقت آنکھیں ہی انسانی جذبوں کی سچی ترجمان ہوتی ہیں۔

"میں سمجھ گیا۔" آفریدی کی آواز کانپ رہی تھی۔

"آج اندازہ ہوا کہ پتھروں کی بستی میں شبنم و گل کا سینہ رکھنے والے کیسے کیسے لوگ زندہ ہیں۔ سنیاسی آنند پال عظیم انسان تھے۔ ان کی گواہی بہت بڑی گواہی تھی۔ زبان کٹ جانے کے بعد حق کی شہادت دینا یہ انہی جیسے حوصلہ مند انسان کا کام تھا۔ ہم تو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے اس لئے مسلمان ہیں۔ مگر وہ شخص جسے چتوڑ کے جفا کاروں نے جلا دیا، ہم سے بڑا مسلمان تھا۔ سنیاسی جانتے تھے کہ ان کے اقرار کا انجام لرزہ خیز موت ہے مگر پھر بھی انہیں جو کچھ کہنا تھا وہ اس طرح کہہ گئے کہ آنے والے زمانے صدیوں تک ان کی آواز سنتے رہیں گے۔ سنیاسی کے بعد آپ بھی ایک بڑے انسان ہیں کہ روشنی کو بچانے کیلئے خود اندھیروں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔"

علی عامر آفریدی ابھی اپنا بیان جاری رکھتا لیکن وکرم سنگھ نے اس کی بات کاٹ دی.......... "بیٹے! ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میری زندگی کے چند دن بھی بعافیت گزر جائیں۔ موت مجھ سے اتنے قریب ہے کہ میں اس کے قدموں کی چاپ مسلسل سن رہا ہوں۔ چتوڑ کے جابر و سفاک انسان زہر کا پیالہ لئے میرے نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ میں اسے پینے سے پیہم انکار کر رہا ہوں.......... مگر کب تک! وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ کسی بھی لمحے زہر جبراً میرے جسم میں اتار دیا جائے گا۔ اس سے پہلے کہ میرے ہونٹ نیلگوں ہو کر پتھرا جائیں اور دل و جگر کٹ کر خون بن جائیں، میں بھی اسی پیغام پر گواہی دینا چاہتا ہوں جسے سنیاسی آنند پال نے سنا اور جس کی تصدیق کیلئے اپنی جان گنوا دی۔"

"مبارک ہو مہامنتری! آپ کو آپ کی زندگی کا یہ سب سے خوشگوار سفر مبارک ہو۔ وہ سفر جو موجِ خوں سے شروع ہوتا ہے اور پھر انسانی زندگی کو ہمیشہ کیلئے سرخرو کر جاتا ہے۔ میں اس کانٹوں بھری شاہراہ پر آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ یہی خارزارِ حیات ایک دن مہکتے ہوئے پھولوں کی رہ گزر پر ختم ہو جائے گا۔ آپ کی اس آبلہ پائی کو آفریدی کا سلامِ عقیدت جو اس سفر میں آپ کا مقدر بننے والی ہے۔ آنکھوں سے بہنے والے اس پانی کو بھی میری محبتوں کا سلام جو اپنی قدر و قیمت میں دریائے بڑہیچ اور گمبھیری کے پانی سے زیادہ حیات بخش اور مقدس ہے۔"

وکرم سنگھ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو تیز ہو گئے۔ اس نے ایک بار پھر آفریدی کے سر پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ "میں ایک خوش نصیب انسان ہوں جسے تمہارے آنے سے روشنی کا سراغ ملا مگر مجھے اتنا بتاؤ کہ تمہاری آنکھوں کی روشنی کا کیا حال ہے؟ کل رات تم کچھ دیر کیلئے ہوش میں آئے تھے اور تم

نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ "

"نظر تو مجھے اس وقت بھی نہیں آ رہا ہے لیکن میں اپنی آنکھوں کے سامنے دھندلے سے سائے محسوس کر رہا ہوں۔ " آفریدی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مائی بھان متی ٹھیک کہتی ہیں۔ تمہاری بینائی آہستہ آہستہ بحال ہو جائے گی۔ " وکرم سنگھ اچانک بہت زیادہ پرجوش ہو گیا تھا۔ "راج وید جھوٹ بولتا تھا۔ میں نے اسے رخصت کر دیا۔ " یہ کہہ کر مہا منتری نے آفریدی سے مائی بھان متی کا غائبانہ تعارف کرایا اور اسے پوری صورت حال سمجھائی۔ "مائی نے کہا تھا کہ تمہاری بینائی آہستہ آہستہ لوٹ آئے گی اور میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم تیزی سے صحت یابی کی طرف بڑھ رہے ہو۔ "

"مجھے اپنی آنکھوں کا کوئی غم نہیں ہے ایک دن تو ان چراغوں کو بجھنا ہی ہے۔ " آفریدی کا لہجہ سوگوارانہ تھا۔ "میں اپنی موت سے نہیں ڈرتا مگر آپ سے التجا کرتا ہوں کہ کسی طرح مجھے دلی تک پہنچا دیجئے۔ میں اپنی والدہ اور چھوٹی بہن کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ روز انہیں خواب میں چیختے ہوئے دیکھتا ہوں پتہ نہیں کہ وہ نقاب پوش کون ہے جو میری ماں اور بہن کی طرف بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ " آفریدی، جسے جبر و تشدد کی انتہا بھی متاثر نہ کر سکی تھی وہ اپنے خونی رشتوں کو یاد کر کے رونے لگا تھا۔

"بیٹے! اگر میں صورت حال پر قادر ہوتا تو تمہیں بہت پہلے اس عذابوں کے جنگل سے نجات دلا چکا ہوتا لیکن کس سے کیا کہوں؟ تصور میں بھی آ سکتی نہیں مجبوریاں میری۔ یہی خدا کا بڑا کرم ہے کہ تمہیں ان درندوں کے منہ سے کھینچ کر یہاں تک لے آیا۔ " وکرم سنگھ اپنی بے چارگی پر کفِ افسوس مل رہا تھا۔

"پھر تم چلنے پھرنے کے قابل بھی تو نہیں ہو۔ ان بے نور آنکھوں کے ساتھ زخمی جسم کو لے کر کہاں جاؤ گے۔ ہر قدم پر رانی پدمنی کے خونخوار کتے تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ مجھے تو یہ بھی خبر نہیں کہ دربار میں کیا ہو رہا ہے؟ راجہ رتن سنگھ کو بڑی مشکل سے یہ نکتہ سمجھایا کہ تمہارے قتل کے بعد علاء الدین خلجی کے قہر میں اور اضافہ ہو جائے گا اگر وہ فوری طور پر سلطان کے حملے کے تصور سے خوفزدہ نہ ہو جاتا تو تم اس پناہ گاہ تک بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ بے شک! میں اپنی ابتدائی کوششوں میں کامیاب ہو گیا ہوں مگر ابھی خطرات ہمارے سروں پر بھوکے گدھوں کی طرح منڈلا رہے ہیں۔ راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی کے حسن کا غلام ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ایک رات میں اس پر کیا گزری؟ وہ میرے مشوروں پر عمل کر رہا ہے یا رام دیو اور پدمنی اسے ورغلا کر تمہاری جان کا دشمن بنا چکے ہیں۔ " وکرم سنگھ اپنے حریفوں کی سیاسی چالوں کو آفریدی کے سامنے بے نقاب کر رہا تھا۔ "تم مطمئن رہو! اگر راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی اور رام دیو کے فریب میں آ بھی گیا تو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں اپنی جان دے کر بھی سنیاسی آنند پال کے وارث کی حفاظت کروں گا۔ فی الوقت میرا دربار میں جانا بہت ضروری ہے تاکہ کوئی دشمن مہرہ حرکت کرے تو میں اس کی چال سے باخبر رہوں۔ تم شام تک میرا انتظار کرنا۔ میں رات میں کسی وقت تمہارے پاس آؤں گا۔ پھر ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ ہمارا اگلا قدم کس سمت میں اٹھے گا۔ " یہ کہہ کر وکرم سنگھ نے آفریدی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے وفادار خدمت گاروں کو سخت نگرانی کا حکم دے کر دربار چلا گیا۔

☆

دربار میں ایک عجیب سا سناٹا تھا۔ تمام حاضرین کے چہروں پر کھنچاؤ اور غصے کی سی کیفیت طاری تھی۔ وکرم سنگھ کے پہنچتے ہی چھوٹے وزراء اور راجپوت سردار مہا منتری کے احترام میں خلاف معمول اپنی نشستوں پر کھڑے نہیں ہوئے۔ یہ ایک باغیانہ رسم تھی جسے وکرم سنگھ نے نوشتۂ دیوار کی طرح ایک نظر میں پڑھ لیا

تھا۔

وکرم سنگھ اہل دربار کی اس ذلت آمیز روش کو جھٹلا کر راجہ رتن سنگھ کی طرف مڑا، درباری آداب بجا لایا اور دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ وہ راجہ رتن سنگھ کے حکم کا منتظر تھا کہ کب راجپوت سمراٹ اس سے اپنی کرسی پر بیٹھنے کیلئے کہیں......... مگر راجہ رتن سنگھ نے اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اہل دربار کو تخلیے کا حکم دیا۔ راجپوت امراء اور سردار اپنی اپنی نشستوں سے اٹھے اور دربار سے باہر جاتے وقت وکرم سنگھ کو اس طرح دیکھتے ہوئے گزر رہے جیسے آج وہ ریاست چتوڑ کا کوئی حقیر ترین فرد ہے۔ ہر راجپوت سردار نے اپنی رنگین پگڑیوں کو سروں پر کج کر لیا تھا اور گھنی مونچھوں میں مزید کئی بل دے لئے تھے۔ یہ وکرم سنگھ کے خلاف ان کا اظہار نفرت تھا۔ پھر جب ایک ایک... ہر سردار حلقہ دربار سے نکل گیا تو وکرم سنگھ نے راجہ رتن سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سمراٹ! میں نے آپ کے دورِ حکومت میں بے شمار ناپسندیدہ مناظر دیکھے ہیں مگر اقتدار کی یہ ادا مجھے سخت ناپسند ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ چھوٹے لوگ میرے ساتھ اس طرح پیش آئیں گے۔ جیسے میں ان کی رعایا ہوں اور وہ میرے آقا۔ "

"ہم مجبور ہیں وکرم سنگھ۔ " رتن سنگھ نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا.......... "ایک شخص کو منانے کیلئے پورے چتوڑ کا غصہ نہیں خریدا جا سکتا۔ یہ سر پھرے بے عقل لوگ میری ذہانت و تدبر کو شرمناک فعل سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ سب کے سب یہی چاہتے ہیں کہ راج دوت کا سر کاٹ کر دلی بھیج دیا جائے۔ علاء الدین کے خط کا یہی مناسب ترین جواب ہے۔ "

"آپ کے پسندیدہ مشیروں کو اس حرکت کا ردعمل معلوم ہے؟ " وکرم سنگھ نے سوال کیا۔

"یہ بہادر اور غیرت مند قوم کا فیصلہ ہے۔ " رتن سنگھ کا لہجہ تلخ ہوتا جا رہا تھا......... "وہ لوگ صرف مرنا جانتے ہیں اور موت کو کھیل سمجھنے والے کسی کے ردعمل کا انتظار نہیں کرتے۔ " راجپوت سردار، رتن سنگھ کے اعصاب پر شراب کے نشے کی طرح مسلط ہو گئے تھے۔

"مستقبل کا مورخ اس حماقت کو شجاعت کے نام سے منسوب نہیں کرے گا۔ " وکرم سنگھ نے بھی سارے تکلفات ختم کر دیئے تھے اور اب وہ ایک باغی کے انداز میں بول رہا تھا.......... "آئندہ جب میواڑ کے راجپوتوں کی تاریخ لکھی جائے گی تو وہ وقت کا بے رحم ہاتھ کسی رعایت کے بغیر روز و شب کے اوراق پر تحریر کر دے گا کہ یہ اندھی قوم بینائی نہ ہونے کے سبب عذابوں کی دلدل میں کود گئی اور پھر یہاں تک دھنستی چلی گئی کہ اس نے سڑی ہوئی مٹی کا کفن اوڑھ لیا۔ راجپوت سمراٹ! آپ کے حاشیہ بردار وقت کے قلم کی گردش کو روک نہیں سکتے۔ وہ صفحۂ ہستی پر یہ عبارت بھی لکھ جائے گا کہ احمقوں کے ایک بڑے گروہ نے اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لیا۔ پھر وہ نادان اس خودکشی کو مردانگی کا نام دے کر آنے والی نسلوں کیلئے غلامی کی میراث چھوڑ گئے۔ " وکرم سنگھ نے اتمام حجت کیلئے اپنے دل میں کوئی غبار باقی نہیں رہنے دیا۔ چتوڑ کے اس ذہین ترین شخص نے جو کچھ سوچا اسے زبان پر لے آیا۔

"یہ تمہاری بزدلانہ اور غدارانہ سوچ ہے۔ " رتن سنگھ نے احتیاط کا دامن چھوڑ دیا اور وکرم سنگھ جیسے انسان کیلئے غلیظ ترین الفاظ استعمال کر ڈالے۔

"میں بزدل اور غدار؟ " وکرم سنگھ کا ذہن سلگ اٹھا اور ضبطِ سخن کی شدت سے زبان لڑکھڑانے لگی۔

"ہاں! تم راجپوتوں کے لباس شجاعت پر ایک گندی چھینٹ ہو۔ " رتن سنگھ نے عالم غیظ میں اس

رشتے کے احترام کو بھی پامال کر ڈالا جو رگانی پدمنی کے تعلق سے اس کے اور وکرم سنگھ کے درمیان قائم تھا۔ تمہیں ہر وقت سلطان کے خوف کا عفریت ڈراتا رہتا ہے اور تم اپنی اسی دہشت کو راجپوتوں کے دل و دماغ پر بھی مسلط کرنا چاہتے ہو۔"

وکرم سنگھ کوئی جواب نہ دے سکا قوتِ برداشت حد سے گزری تو اس کا پورا جسم کانپنے لگا۔

"تم ریاست کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کے بھی غدار ہو۔" راجہ رتن سنگھ کی آواز اس قدر تیز ہو گئی تھی کہ اس کی گفتگو پر چیخنے کا گمان ہونے لگا تھا.......... "تم آج تک اس پاپی آنند پال کو اپنا روحانی پیشوا مانتے رہے جو ہمارا معتوب تھا۔ تمہاری غداریوں کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ تم اس بوڑھی جادوگرنی کے حضور بھی اپنا سر جھکاتے رہے ہو جسے چتوڑ کی ساری پرجا ایک طوائف زادی کے نام سے جانتی ہے۔ تمہارا ایک جرم یہ بھی ہے کہ تم نے ریاست کی مقدس ترین ہستی مہاراج رام دیو کی شان میں نازیبا کلمات ادا کئے۔ ہمیں ان کے خلاف ورغلایا اور چتوڑ کی دھرتی کو ان کے سایۂ کرم سے دور کرنے کی کوشش کی۔ تم یہ سب کچھ اس لئے کرتے رہے کہ تمہیں اس ناپاک سنیاسی سے محبت تھی۔ آنند پال نے اپنا دھرم چھوڑ کر مسلمانوں کا مذہب اختیار کیا تو تم بھی درپردہ اسی کی گناہ گارانہ روش پر چل نکلے۔ بھگوان 'مہاراج رام دیو کی عمر دراز کرے۔ کل رات ان کے اپار گیان (غیر محدود علم) نے ہماری آنکھوں پر پڑے ہوئے تمام پردے ہٹا دیئے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم راج دوت کو کیوں بچانا چاہتے ہو؟ اس بدکار سنیاسی نے راج دوت کو اپنا بیٹا بنایا تھا۔ اس لئے تم بھی آفریدی کا مذہب اختیار کر کے اسے پناہ دینا چاہتے ہو۔" راجہ رتن سنگھ کو اپنی زبان پر قابو نہیں رہا تھا۔ وہ وکرم سنگھ سے ایک غلام کی طرح سلوک کر رہا تھا..........

"راج دوت کو بچانے کیلئے تم نے سلطان کے قہر و غضب کا ڈھونگ رچایا اور ہم بھی تمہاری باتوں میں الجھ کر رہ گئے.......... مگر مہاراج جیسے عظیم گیانی کے علم کو کس طرح جھٹلاؤ گے جس کی روشن آنکھوں سے ایک چیونٹی بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ مہاراج نے کل رات ہمیں اور مہارانی کو کھلی آنکھوں سے سب کچھ دکھا دیا۔ علاءالدین خلجی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو گا۔ وہ مہان راجپوتوں پر کبھی غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ ہم کچھ دیر کیلئے سنکٹ (مصیبت) میں ضرور آئے تھے لیکن مہاراج کی شکتی نے ہمیں بچا لیا۔ ہم نے دیکھا کہ مہاراج کے ہاتھوں کو جنبش ہوئی اور سلطان کے لشکر میں ہر طرف آگ بھڑک اٹھی۔ مسلمان سپاہیوں کے جسم جلنے لگے اور وہ جس طرف سے آئے تھے اسی طرف اپنی ناکامیوں کا ماتم کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔" یہ کہہ کر رتن سنگھ خاموش ہو گیا اور وکرم سنگھ کو ان نظروں سے دیکھنے لگا جن میں سارے عالم کی نفرت بھری ہوئی تھی۔

وکرم سنگھ کیا جواب دیتا؟ فریب کار رام دیو نے اپنی کسی شعبدہ بازی سے پوری بساط الٹ دی تھی۔

"جواب دے اے غدارِ مذہب و وطن! تو نے ایسا کیوں کیا؟" راجہ رتن سنگھ کی تلخ گوئی اب بدکلامی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ "مہاراج نے تو تیرے دل کا یہ حال بھی جان لیا ہے کہ تو راج دوت کو چتوڑ کے فوجی راز دے کر دلی واپس بھیجنا چاہتا تھا۔ اس طرح تو اپنی ماتر بھومی (مادرِ وطن) کو سلطان کے ہاتھوں فروخت کر دیتا اور پھر تیری حصولِ اقتدار کی ناپاک خواہش تسکین پا جاتی۔"

"بس! سمراٹ بہت ہو چکا۔" وکرم سنگھ کا لہجہ ادب و احترام کی سطح سے زیادہ بلند ہو گیا تھا۔ "ایک رات میں اس مداری پر تمام راز فاش ہو گئے؟ میری غداری بھی عیاں ہو گئی اور سلطان کا لشکر بھی جل کر راکھ ہو گیا۔ میری جانسوزیوں اور رفاقتوں کا اس قدر بھیانک صلہ؟ میں وکرم سنگھ وطن فروش؟ اور ایک

فاسق و فاجر دیوتا؟ نسل چوہان اپنی زمین کا تاجر؟ اور رام دیو آسمان سے اترا ہوا اوتار؟ اے بے وفا زمانے! تو نے مجھے کس منزل پر لا کر چھوڑ دیا؟"

"زمانے کا شکوہ نہ کرو وکرم سنگھ! وقت غداروں کو زیادہ دن پناہ نہیں دیتا۔" راجہ رتن سنگھ پوری قوت سے چیخا اور اپنے خدمت گاروں کو آواز دینے لگا۔

دوسرے ہی لمحے دو مسلح محافظ دربار میں داخل ہوئے

"نارائن داس کو پیش کرو۔" راجہ رتن سنگھ نے محافظوں کو حکم دیا اور پلٹ کر دوبارہ مہامنتری سے مخاطب ہوا۔ "وکرم سنگھ! تیری ذہانت کو ہم نے تشہیر دی۔ ہم نے تیری سیاست کو باکمال بنا کر اہل چتوڑ کے سامنے پیش کیا اور تو سمجھ بیٹھا کہ تیرے دماغ کے سوا یہاں کوئی دوسرا دماغ نہیں ہے.......... تجھے کیا خبر کہ ہمارا ذہن.........."

ابھی رتن سنگھ اپنی بات مکمل کرنے نہیں پایا تھا کہ دونوں محافظ ایک سیاہ فام شخص کو لئے ہوئے دربار میں داخل ہوئے۔ وہ نارائن داس تھا جسے وکرم سنگھ نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نارائن داس پاگلوں کی طرح آگے بڑھا اور تخت کے قریب پہنچ کر سجدے میں چلا گیا۔

"کھڑا ہو جا اور تو نے کل رات جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بیان کر۔" رتن سنگھ نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ نارائن داس کھڑا ہو گیا مگر وہ اس طرح کانپ رہا تھا جیسے اس کے پاؤں بدن کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر رہے ہوں۔ نارائن داس کے دونوں ہاتھ جڑے ہوئے تھے اور وہ لرزتی ہوئی آواز میں مائی بھان متی اور چندر سنگھ کے درمیان ہونے والی گفتگو دہرا رہا تھا۔ وکرم سنگھ جس کی رگوں میں شدتِ غضب سے خون جل رہا تھا' کچھ دیر کیلئے اپنا سارا غصہ بھول کر حیرت سے نارائن داس کی طرف دیکھنے لگا۔ نارائن داس کا بیان کردہ ایک ایک حرف درست تھا۔

نارائن داس کے خاموش ہوتے ہی راجہ رتن سنگھ نے اسے باہر جانے کا حکم دیا۔

"اسے پہچانے وکرم سنگھ؟" راجپوت سمراٹ کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ طنز کے زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

"نہیں!" وکرم سنگھ کی حیرت بدستور قائم تھی۔

"پہچان بھی نہیں سکتے۔" رتن سنگھ کے ہونٹوں پر تحقیر آمیز مسکراہٹ ابھر آئی.......... "سمراٹ آخر سمراٹ ہوتا ہے۔ سارے منتریوں کا آقا! چاہے ان میں مہامنتری ہی شامل کیوں نہ ہو۔ ہم بساطِ سیاست کے مالک ہیں۔ تمام مہروں کو نچانے والے اور تم بھی تو ایک مہرہ ہی تھے۔ اپنی رفتار کے نشے میں شاطر کو فراموش کر بیٹھے۔ ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا کہ تمہاری ڈور کس کے ہاتھ میں ہے؟"

وکرم سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اب بھی نارائن داس کے تصور میں الجھا ہوا تھا کہ یہ شخص کون ہے اور اس نے کئی اہم راز رتن سنگھ کو کس طرح منتقل کیے ہیں؟

"یہ اس طوائف زادی کی داسی کا شوہر ہے جسے تو ایک عظیم عورت سمجھتا ہے۔" بالآخر راجہ رتن سنگھ نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ "ہم نے آنند پال کی موت کے بعد حالات کے کسی گوشے کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ جس دن ہم پر یہ راز فاش ہوا کہ تجھے مائی بھان متی سے بھی ایک عقیدت خاص ہے' اسی روز سے ہم نے بمل شاہ کے مندر میں اپنے جاسوس متعین کر دیئے تھے۔ کل رات جیسے ہی تیرا وفادار ملازم چندر سنگھ اس بوڑھی جادوگرنی کا پیغام لے کر روانہ ہوا' اسی وقت بھان متی کی داسی نے اپنے شوہر کو تمام گفتگو سے باخبر کر دیا.......... اور پھر نارائن داس نے جو ہمارا زر خرید غلام ہے ایک برق رفتار

گھوڑے پر راج محل پہنچ کر اس راز کو اگل دیا جسے تو نے ہزار پردوں میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔ "

وکرم سنگھ کے چہرے پر کئی تاریک سائے آ کر گزر گئے اور اس کی کشادہ پیشانی لکیروں سے بھر گئی۔

راجہ رتن سنگھ اپنے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ تبسم سجائے بولے جا رہا تھا............ " کہاں گیا اس دیشیا کی بیٹی کا گیان جو مستقبل کے پیچھے جھانکنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ جسے اپنے گرد ہونے والا تماشا نظر نہیں آتا۔ وہ تجھے تیری قسمت کا حال کیا بتائے گی؟ جو یہ نہیں جانتی کہ اس کی داسی چند سکوں کے عوض بک چکی ہے وہ راج دوت کو ہمارے قہر و غضب سے کس طرح محفوظ رکھے گی۔ "

وکرم سنگھ کے لبوں پر مہر سکوت تھی اور چہرہ دھواں ہو کر رہ گیا تھا۔

" ہم تجھے پابہ زنجیر کر کے رات کے پچھلے پہر بھی اپنی بارگاہ میں طلب کر سکتے تھے لیکن مہارانی نے ہمارا دامن پکڑ لیا کہ آخر تو ان کا چچا ہے۔ " راجہ رتن سنگھ لہجہ بدل بدل کر مہامنتری کو ذلیل کر رہا تھا۔ " آخر تیرا راج دوت سے کیا رشتہ ہے کہ تو نے اپنی بھتیجی کے عزت و ناموس پر اس کی زندگی کو ترجیح دی؟ تو رات بھر کس کیلئے جاگتا رہا؟ راج وید کو موت کی دھمکیاں کس نے دیں؟ میں تیرے جرائم کو ثابت کرنے کیلئے کس کس کی گواہی پیش کروں؟ "

وکرم سنگھ کا دم گھٹ رہا تھا۔ کئی بار اس نے چاہا کہ چیخ کر دل کا سارا بوجھ اتار دے مگر ہر مرتبہ ایک خیال اسے لب کشائی سے باز رکھتا تھا۔

" ہم چاہتے ہیں کہ تجھے عبرتناک سزا دیں۔ آنند پال سے زیادہ عبرتناک............ لیکن اپنے دل کو کیا کریں جو مہارانی کے چہرے پر حزن و ملال کا ہلکا سا عکس دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ " راجہ رتن سنگھ نے اپنے پیروں کو اس طرح جنبش دی جیسے وہ کسی کیڑے کو مسل رہا ہو............ " یہ ہمارا تجھ پر آخری کرم ہے کہ ہم نے تجھے بھرے دربار میں ذلیل نہیں کیا۔ بس! ہماری نظروں سے دور ہو جا اور اس نامراد سفیر کی زندہ لاش رانی پدمنی کی خدمت میں پیش کر دے جسے بچانے کیلئے تو نے اپنے مذہب اور وطن دونوں کو نیلام کر دیا۔ "

وکرم سنگھ کے ہونٹ آپس میں پیوست ہو گئے تھے اور رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ اس نے جلتی ہوئی آنکھوں سے راجہ رتن سنگھ کی طرف دیکھا' اپنی اور دیگر سرداروں کی خالی کرسیوں پر نظر ڈالی اور سر جھکائے ہوئے دربار سے نکل آیا۔ طویل راہداری طے کرتے وقت کئی خدمت گار سامنے سے گزرے تھے مگر آج کوئی ہاتھ اس کے سلام کیلئے نہیں اٹھا تھا۔

" وکرم سنگھ! جلدی کر! شاید وقت تجھے زیادہ مہلت نہ دے۔ " یکایک اس کی سماعت میں ایک شور سا اٹھا۔ یہ مائی بھان متی کے آخری الفاظ تھے جو چندر سنگھ کے ذریعے اس تک پہنچے تھے۔ شور بڑھتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی وکرم سنگھ کی رفتار میں بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ بہت تیز قدموں سے اپنے مکان کی طرف جا رہا تھا۔

وکرم سنگھ اپنے محل میں داخل ہوا تو تمام خدمت گار حیرت زدہ رہ گئے۔ وقت سے پہلے وکرم سنگھ کی واپسی ملازمین کیلئے تعجب خیز تھی مگر کوئی شخص پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ وکرم سنگھ جب نرملا کماری کے کمرے میں پہنچا تو وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ وکرم سنگھ نے بہت کوشش کی تھی کہ اپنے چہرے سے اس طوفان کو ظاہر نہ ہونے دے جو اس کے دل میں پوری سرکشی کے ساتھ اٹھ رہا تھا مگر جذبات کی ضرب سے تو پتھر کے چہرے بھی بولنے لگتے ہیں اور پھر ایسا ہی ہوا۔ وکرم سنگھ انتہائی قوت برداشت کا مظاہرہ کرنے کے باوجود اپنے احساسات کو نرملا کماری سے پوشیدہ نہ رکھ سکا۔

" گردشِ روز و شب انسانی خواہشات کی پابند نہیں۔ ہمیں ان جان لیوا لمحات کا انتظار تو تھا مگر یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ آندھی کی رفتار سے چل کر ہم تک پہنچ جائیں گے۔ "

" میں نہیں سمجھی پتا جی! کیا علاء الدین خلجی نے چتوڑ پر حملہ کر دیا؟ " نرملا کماری اچانک پریشان نظر آنے لگی تھی۔

" اگر سلطان حملہ کر دیتا تو سارے مسائل ہی ختم ہو جاتے۔ " وکرم سنگھ کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ " دشمن کی فوجیں چتوڑ کی حدود میں داخل ہو جاتیں تو پھر راجپوت سورماؤں کا یہ شرمناک رویہ بھی برقرار نہ رہتا۔ اب بہادری کی رسم یہ ٹھہری ہے کہ رانی پدمنی' آفریدی کا سر کاٹ دینا چاہتی ہے۔ شاہ پر بس نہیں چلتا تو اس کے بے دست و پا درباری سے انتقام لینے کو راجپوتوں کی موت و زیست کا مسئلہ بنایا جا رہا ہے۔ رام دیو اپنی شعبدہ بازیوں میں ناکام ہو گیا تو مجھے غدارِ مذہب و وطن کہہ کر پکارا جا رہا ہے۔ " وکرم سنگھ نے گلوگیر لہجے میں پورا واقعہ سنا دیا۔

نرملا کے ہوش و حواس گم ہو گئے تھے۔ کچھ دیر کیلئے اس کی آنکھوں کے سامنے گہری تاریکی چھا گئی تھی۔

" حوصلہ اور صبر سے کام لو نرملا! " وکرم سنگھ نے بیٹی کو آواز دی۔ " ہر گزرنے والا لمحہ ہماری جرأتوں کا امتحان ہے۔ جہاں بھی پر سمیٹنے کی کوشش کرو گی وہیں صیاد نظر آئے گا۔ اس لئے انجام سے بے پروا ہو کر اڑتی رہو۔ بازوؤں کے شل ہو جانے کی فکر نہ کرو۔ آزاد پرندے بھی زیرِ دام چلے جاتے ہیں مگر دانے کی تلاش میں نہیں۔ پرواز جاری رکھو۔ اگر حالات کا قفس تمہارا مقدر ہی بن گیا تو پھر وہاں اس طرح پہنچو کہ تمہارے بازو جل گئے ہوں اور تمہارا جسم کوہسار کی بلندیوں سے ٹکرا رہا ہو۔ صیاد کے جال کو دیکھ کر بال و پر کی قوتوں سے انکار کر دینا اہل پرواز کیلئے ایک لعنت ہے' موسم کی غلیظ ترین گالی ہے۔ موسم تو بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ وہ تمہارے پر نوچ ڈالے اور تمہیں ذلت و شکست کے پنجرے میں ہمیشہ کیلئے قید کر دے۔ "

وکرم سنگھ کی تند و تیز باتیں سن کر نرملا کماری اس طرح چونک اٹھی جیسے کسی نے اسے گہری نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا ہو۔ " اب آپ کیا کریں گے؟ "

" وہی کروں گا جس کی خبر کل رات تمہیں دی جا چکی ہے۔ " وکرم سنگھ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ " وقت بہت کم ہے مجھے فوری طور پر دربار واپس جانا ہے۔ " یہ کہہ کر مہامنتری نے اپنی پچاس سالہ خادمہ رامیشوری کو آواز دی۔

رامیشوری کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ اس نے اپنے آقا کو آج سے پہلے اس قدر اضطراب میں مبتلا نہیں دیکھا تھا۔ " خیریت تو ہے پربھو (مالک)"۔ رامیشوری نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

" ہاں سب کشل ہے رامیشوری۔ " وکرم سنگھ نے اپنی سراسیمگی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ " تم اور تمہارے اہل خاندان نے وکرم سنگھ کے پریوار سے جس طرح اپنی وفاداریاں نبھائی ہیں' ان کے اظہار کا موقع نہیں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ میں اپنی امانت تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ " وکرم سنگھ کا اشارہ نرملا کماری کی طرف تھا۔

" نہیں پربھو! ابھی تو آپ کئی جگ جئیں گے۔ موت آئی تو پہلے یہ داسی آپ پر قربان ہو گی۔ " رامیشوری نے زمین پر بیٹھتے ہوئے وکرم سنگھ کے پاؤں پکڑ لئے تھے اور زار و قطار رو رہی تھی۔

" کوئی کسی کی موت کو نہیں ٹال سکتا۔ ہر شخص کو اپنی چتا میں جلنا ہو گا۔ " وکرم سنگھ اپنے کمرے میں

آویزاں اس فانوس کو دیکھ رہا تھا جو قیمت کے اعتبار سے نوادرات میں شامل ہوتا تھا۔ "یہ فانوس بھی برسوں سے اپنی ہی آگ میں جل رہا ہے۔ اس کے اندر کی آگ کسی دوسرے دل میں کبھی منتقل نہیں ہوئی۔ میری تقدیر' میرا وقت' میرا مستقبل کسی کی قربانی سے تبدیل نہیں ہو سکتا۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ رامیشوری کہ تم نرملا کے ساتھ اس سفر پر روانہ ہو سکو گی جو کانٹوں اور انگاروں کا سفر ہے۔ تم انکار بھی کر سکتی ہو اور تمہارا یہ انکار مجھ پر گراں نہیں گزرے گا۔ میں جانتا ہوں کہ آفات و مصائب اور موت کا ہم سفر ہونا آسان نہیں۔ اگر اس راستے پر کسی ساتھی کے قدم لڑکھڑا جائیں تو انسان کو برا نہیں ماننا چاہئے۔ مجھے بھی تمہارے انکار سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ میں نرملا کو تنہا بھی اس سفر پر روانہ کر سکتا تھا مگر ابھی وہ بہت کم عمر ہے۔ ممکن ہے اس کی کم سنی اور تنہائی اسے کسی موڑ پر خوفزدہ کر دے' اس لئے تم اس کے ہمراہ جاؤ گی اور اس وقت تک نرملا کے ساتھ رہو گی جب تک وہ اپنی منزل پر نہیں پہنچ جاتی۔" خوف و ہراس زائل ہو چکے تھے اور اب دکرم سنگھ اسی آمرانہ لہجے میں بول رہا تھا جو اس کا خاندانی لہجہ تھا۔

"کیسا سفر پربھو! مجھے کچھ تو بتایئے۔" رامیشوری کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

"اہل وفا سوال نہیں کرتے۔ بس ایک پکار پر دوڑے چلے آتے ہیں۔" وکرم سنگھ کی آواز سے سختی نمایاں تھی۔ "سوال و جواب کی مہلت ہم سے چھین لی گئی ہے۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ تم نرملا کے ساتھ نامعلوم منزل کی طرف جا سکتی ہو یا تمہارے قدم اس ان دیکھے راستے پر چلنے سے عاجز ہیں۔"

"نہیں پربھو!" بوڑھی کنیز کے آنسو تھم گئے اور چہرہ جوشِ جذبات سے تمتمانے لگا۔ "میں معافی کی خواستگار ہوں۔ آپ کو پریشان دیکھ کر زبان لڑکھڑا گئی تھی۔ میں اپنی آقازادی کے ساتھ موت کے سفر پر بھی جانے کیلئے تیار ہوں۔"

وکرم سنگھ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ "رامیشوری! تمہاری اس عنایت کا بہت شکریہ۔ وکرم سنگھ بہت مجبور ہے ورنہ تمہیں اپنے غموں میں شریک نہیں کرتا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چندر سنگھ کو بلا کر اپنے خاندانی طلسم کدے کی طرف بڑھنے لگا۔

نرملا کو پہلے ہی طلسم کدے کا راز سمجھا چکا تھا اس لئے پر پیچ راستوں سے گزرتے ہوئے اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی مگر چندر سنگھ اور رامیشوری کا برا حال تھا۔ منتری محل میں سالہا سال کے دوران بھی ان دونوں پر یہ اسرار نہیں کھل سکے تھے کہ مہامنتری وکرم سنگھ اپنے مکان میں ایک پیچیدہ تہہ خانہ بھی رکھتے ہیں۔ ملازمہ رامیشوری اور چندر سنگھ تو دریائے حیرت میں غرق ہو چکے تھے انہیں پتا بھی نہیں چلا کہ طلسم کدے کا پہلا دروازہ کس طرح کھلا اور کب بند ہوا؟ وہ تو خاموشی کے ساتھ اندھیرے راستوں سے گزرتے رہے۔ پھر ساتواں تہہ خانہ عبور کر کے وہ سب کے سب کھلی ہوئی فضا میں آ گئے۔ یہاں ہر طرف آموں کے درخت تھے اور مختلف اقسام کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ بڑی جاذب نظر اور پر سکون فضا تھی۔ پیڑوں کے درمیان سے میٹھے پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا۔

رامیشوری اور چندر سنگھ اس اجنبی فضا میں الجھے ہوئے تھے اور وکرم سنگھ نرملا کماری کو درختوں کے اس کنج کی طرف لے گیا تھا جہاں ایک خفیہ سرنگ موجود تھی۔ سرنگ کے دہانے پر ایک دروازہ بنا ہوا تھا جسے دیکھ کر بظاہر یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ کوئی تفریحی کمرہ ہے جسے باغ کے اندر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس دروازے پر بھی ایک سیاہ رنگ کی مورتی آویزاں تھی جس کے ہاتھوں میں نیلگوں بانسری صاف نظر آ رہی تھی۔

وکرم سنگھ نے آگے بڑھ کر اس بانسری میں پھونک ماری اور ایک ہلکی سی گونج کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔

"غور سے دیکھو نرملا۔" وکرم سنگھ نے بیٹی کو ہدایت کی۔

نرملا نے قدرے خم ہو کر دروازے کے اندر جھانکا کمرے میں چند گز کی جگہ مکمل ہموار تھی۔ اس کے بعد نیچے اترنے کیلئے سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔

"یہ سیڑھیاں تمہیں نیچے لے جائیں گی اور پھر وہ طویل سرنگ شروع ہو جائے گی جس کا خاتمہ اجمیر کے صحرائی علاقے پر ہوتا ہے۔ اگر گردشِ وقت تمہیں چتوڑ سے فرار ہونے پر مجبور کر دے تو یہ سرنگ تمہاری آخری پناہ گاہ ثابت ہو گی اور تم کسی زحمت کے بغیر اجمیر تک پہنچ جاؤ گی جو ہندو راجپوتوں کا مرکز ہونے کے باوجود مسلمان درویش خواجہ اجمیر کا شہر کہلاتا ہے۔ وہاں تمہاری دل آزاری کرنے والا کوئی دشمن موجود نہیں ہو گا۔" اتنا کہہ کر وکرم سنگھ مڑا اور اس نے بانسری میں دوبار تیز پھونکیں ماریں نتیجتاً خفیہ سرنگ کا آہنی دروازہ بند ہو گیا۔

اس کے بعد مہامنتری نے نرملا' چندر سنگھ اور رامیشوری کو وہیں ٹھہرنے کیلئے کہا اور خود سیاہ مورتی کے ذریعے اس دروازے کو کھولا جس کی دوسری طرف منتری محل کا وہ حصہ تھا جسے عام لوگ وکرم سنگھ کا نواس استھان سمجھتے تھے اور جہاں ایک کمرے میں آفریدی زیر علاج تھا۔ وکرم سنگھ کو اپنے سامنے پا کر تمام مسلح سپاہی خم ہو گئے۔ انہیں ایک نئے راستے سے مہامنتری کے داخلے پر حیرت ضرور ہوئی تھی مگر وہ اس راز سے بے خبر تھے کہ وکرم سنگھ کسی مخصوص تہہ خانے کو عبور کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔ مہامنتری نے اپنے سپاہیوں کو ایک نظر دیکھا اور تیزی سے اس کمرے میں چلا گیا جہاں علی عامر آفریدی بستر پر دراز تھا۔ محافظ جو آفریدی کے سرہانے بیٹھا تھا اور ایک ایک لمحے کی نگہداشت کر رہا تھا' وکرم سنگھ کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ مہامنتری شدید بے قراری کے عالم میں آگے بڑھے اور آفریدی کے قریب پہنچ کر کہنے لگے۔

"فرزند! تم کیسے ہو؟" وکرم سنگھ کی آواز سے بے پناہ محبت جھلک رہی تھی۔

"اب میں بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔" آفریدی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آنکھوں کے دھندلے پن میں کچھ اور کمی نمایاں ہو گئی ہے۔"

"بے فکر رہو۔ جس خدا نے تمہیں قہر و ستم کے دریا سے بعافیت ساحل تک پہنچایا ہے وہ تمہاری بینائی بھی تمہیں لوٹا دے گا۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ نے محافظ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ تنہائی ہوتے ہی وکرم سنگھ نے اپنے دونوں ہاتھ آہستہ سے آفریدی کے سر پر رکھ دیئے اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔

"فرزند! اب تم یہاں نہیں رہو گے۔ میں تمہیں ایک محفوظ تہہ خانے میں منتقل کر رہا ہوں۔ کیا تم اس قابل ہو کہ اپنے پیروں پر کچھ دور چل سکتے ہو؟"

"شاید! میں چل سکتا ہوں۔" آفریدی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ پھر اپنے ایک پاؤں کو جنبش دی اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں درد کے گہرے رنگ ابھر آئے۔ "مہامنتری! میرا اندازہ غلط تھا پاؤں کی ہلکی سی جنبش نے میرے پورے جسم کو درد کی سوزش سے جلا ڈالا ہے۔ ممکن ہے کسی زخم کا منہ بھی کھل گیا ہو۔"

"پھر رہنے دو میں صرف تمہاری جسمانی حالت کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ ابھی تم اس قابل نہیں ہو کہ اپنا بوجھ خود اٹھا سکو۔ میرا انتظار کرو۔ میں ابھی آتا ہوں" یہ کہہ کر وکرم سنگھ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ طویل راہداری سے گزر کر دوبارہ باغ میں پہنچا اور نرملا کماری کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "تم اندر داخل ہو جاؤ۔" ساتویں تہہ خانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نرملا جانے لگی تو وکرم سنگھ نے رامیشوری اور چندر سنگھ کو بھی اندر داخل ہونے کا حکم دیا: تم لوگ بائیں ہاتھ کے ساتویں کمرے میں پہنچ کر میرا انتظار کرو۔"

جب نرملا کماری ' رامیشوری اور چندر سنگھ تہہ خانے کے اندر چلے گئے تو وکرم سنگھ تیزی سے مڑا اور دوبارہ منتری محل کے عام حصے میں چلا گیا۔ مسلح سپاہی بڑی حیرت سے اپنے مہامنتری کی اس آمدورفت کو دیکھ رہے تھے۔ "تم لوگ میرے ساتھ آؤ۔" آگے بڑھتے بڑھتے مہامنتری نے سپاہیوں کو آواز دی۔ سپاہی وکرم سنگھ کا حکم پاتے ہی تیز قدموں سے پیچھے پیچھے چلنے لگے یہاں تک کہ وکرم سنگھ ' آفریدی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"راج دوت کے بستر کو اٹھا کر دوسری جگہ منتقل کر دو۔" وکرم سنگھ نے حکم دیتے ہوئے کہا۔

سات آٹھ سپاہی بیک وقت آگے بڑھے اور آفریدی کے مسہری نما پلنگ کو اٹھا کر تہہ خانے کے پانچویں کمرے میں لے گئے۔ ان میں سے ہر شخص اپنی جگہ حیرت کا چلتا پھرتا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ کوئی سپاہی بھی اس راز کو سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ تبدیلی کس لئے کی جا رہی ہے ؟

آفریدی کا بستر ساتویں تہہ خانے کے پانچویں کمرے میں منتقل کرنے کے بعد وکرم سنگھ تیسری بار باہر آیا اور سپاہیوں کو پہرہ سخت کرنے کا حکم دے کر لوٹ گیا ۔ پھر اس نے سیاہ مورتی کے ذریعے اس فولادی دروازے کو بند کر دیا جس کے بند ہو جانے کے بعد منتری محل کا یہ حصہ دوسرے حصے سے بالکل علیحدہ ہو جاتا تھا۔

وکرم سنگھ نے ٹھہر کر اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا طلسم کدے کے ساتویں کمرے میں آیا جہاں نرملا کماری ' رامیشوری اور چندر سنگھ اس کے منتظر تھے۔

"تم لوگ یقیناً میرے اس عمل پر حیران ہو گے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے اور میں مسلسل یہ کیسی عجیب حرکتیں کر رہا ہوں۔" وکرم سنگھ نے ان تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں آقا! ہمارے لئے آپ کی کوئی بات عجیب نہیں ہے۔" چندر سنگھ نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "آپ ہمارے بزرگ بھی ہیں اور ریاست کے سب سے بڑے سیاستداں بھی۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں ' ہمارے ذہن اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے اور آپ کے ذہن کی جستجو کرنا ہمارے فرض میں شامل بھی نہیں۔ ہم تو آپ کی جنبشِ چشم و لب کے پابند ہیں۔ ہم سے یہ سوال کرنے کے بجائے حکم دیجئے کہ ہم بھڑکتی ہوئی آگ میں کود پڑیں یا موت کے خونی دہانے میں اپنی گردنیں رکھ دیں۔"

"چندر سنگھ! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اہلِ وفا ایسے ہی انداز ہوتے ہیں کہ ان کے ہونٹوں پر "کیوں" کا لفظ کبھی نہیں ابھرتا۔ جب ایک بار عہد استوار کیا جا چکا تو پھر کسی سوال کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔" وکرم سنگھ کی نظریں چندر سنگھ کے چہرے سے گزرتی ہوئی نرملا کماری پر ٹھہر گئیں۔ "تم لوگوں نے میرے حکم کو اپنی زندگی سے وابستہ کر لیا' یہ تمہاری فرض شناسی تھی اور جذبۂ وفاداری تھا جس نے میرا دل خرید لیا' میری روح سرشار ہو گئی۔ مگر اس کے ساتھ میرا بھی ایک فرض ہے کہ تمہیں نئے سفر کی تفصیلات سے آگاہ کر دوں۔ وہ سفر جس میں جانوں کی قربانی پہلی شرط ہے۔ میں انسانی جان کی قیمت سے واقف ہوں۔ اسے جسم سے نکال پھینکنا آسان نہیں ہوتا۔"

"پربھو! ہم اپنی جانیں تو آپ کے ہاتھوں بیچ چکے۔ پھر اس وضاحت کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟" اب کی بار ملازمہ رامیشوری اپنے آقا سے مخاطب ہوئی تھی۔

"آج اس وضاحت کی بہت ضرورت ہے۔" وکرم سنگھ کا لہجہ اچانک اداس ہو گیا تھا۔ "میں نہیں چاہتا کہ بعد میں تمہیں اس خرید و فروخت پر پشیمانی ہو۔ کہیں یہ نہ سوچو کہ تم نے گھاٹے کا سودا کیا اور ایک شخص کی خاطر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔"

"نہیں آقا! ایسا نہیں ہو گا۔" رامیشوری اور چندر سنگھ نے بیک زبان کہا۔ "آخر ہم بھی راجپوت ہیں اور راجپوت سود و زیاں کا حساب نہیں کرتے۔"

"ایسا نہ کہو کہ میں نے بے شمار راجپوتوں کو نقصان کے موسم میں آنسو بہاتے دیکھا ہے۔" وکرم سنگھ نے کہا۔ "تم وفادار اس لئے نہیں ہو کہ تمہارا تعلق راجپوت قوم سے ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے کئی بے وفا چہرے ہیں اور ان سب کا تعلق نسل چوہان سے ہے۔ قوم صرف پہچان کیلئے ہوتی ہے۔ سچائی اور کھرے پن کا معیار نہیں ہوتی۔ دیانتدار اور باوفا اس قوم میں بھی پائے جاتے ہیں جنہیں تم ملیچھ کہہ کر پکارتے ہو۔ میں راجپوت ہونے کے ناتے سے تمہارا احترام نہیں کرتا میں ایک اچھا انسان ہونے کی وجہ سے تم پر نازاں ہوں اور یہ ناز ' یہ اعتبار ' آج اس آزمائش کی خوفناک منزل تک آ پہنچے ہیں۔ وہ منزل یہ ہے کہ شاید میں تم سے ہمیشہ کیلئے بچھڑ کر نئی دنیا کی طرف جا رہا ہوں۔"

نرملا کماری ' رامیشوری اور چندر سنگھ کو سکتہ سا ہو گیا۔

"منزلِ فراق ؟ دوسری دنیا ؟" نرملا کماری کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ "پتاجی! آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟"

"ہاں بیٹی! ساعتِ فراق میرے اندازے سے پہلے آ پہنچی۔" وکرم سنگھ بیٹی کو تنہا چھوڑتے وقت رو دینا چاہتا تھا مگر اس نے ان آنسوؤں کے طوفان کو پی لیا جو آنکھوں کے بند توڑنے کیلئے بے قرار تھا۔ "مجھے اس لمحۂ فراق کی آمد پر اسی طرح یقین تھا جیسے میں تم تینوں کو اپنی آنکھوں سے زندہ دیکھ رہا ہوں۔ مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ وقت اتنی جلدی پوری بساط کو درہم برہم کر دے گا۔ اب کوئی نہیں جانتا کہ شاہ پر کیا گزرے گی ؟ وزیر کا کیا حال ہو گا اور پیادے آگ اور خون کے کس محاذ پر دشمنوں کے لشکر جرار سے الجھیں گے ؟ ہائے! یہ میری فوج جو صرف پانچ افراد پر مشتمل ہے۔" وکرم سنگھ کو اپنے سینے میں درد کی ایک تیز لہر سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ اس نے گھبرا کر دل پر ہاتھ رکھ لیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

"آقا! آپ کی طبیعت بگڑ رہی ہے ؟" چندر سنگھ بے چین ہو کر قریب آیا۔

"نہیں! میرے بچے! میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وکرم سنگھ کے لہجے کی گرج لوٹ آئی تھی۔ "ساعتِ فراق تو پتھروں میں بھی شگاف ڈال دیتی ہے اور میں تو پھر ایک بوڑھا انسان ہوں جسے زمانے کے الٹ پھیر نے کھوکھلا کر دیا ہے۔ اپنے پیاروں سے بچھڑتے وقت مجھ پر اتنا اثر تو ہونا چاہئے کہ میری زبان کانپنے لگے ' قدم لڑکھڑا جائیں اور آنکھوں سے چیت اور اساڑھ کے جلتے ہوئے موسم میں ساون بھادوں کی کوئی بوند برس جائے۔"

وکرم سنگھ کے ضبط کا یہ انداز دیکھ کر نرملا کماری ' چندر سنگھ اور رامیشوری رونے لگے۔

"میں تمہاری آنکھوں پر جبر کے پہرے بٹھانا نہیں چاہتا۔ مگر پھر بھی میری خواہش ہے کہ کچھ دیر کیلئے اپنے آنسوؤں کو روک لو۔ یہ آنسو اس وقت تمہارے کام آئیں گے جب میں تم سے بچھڑ کر بہت دور چلا جاؤں گا پھر جب برہا کی آگ بھڑکے گی تو پھر نین ندی کا یہ پوتر اور شیتل جل ہی اس اگنی کو بجھائے گا۔ پانی کے ان چند قطروں کو بچا کر رکھو تمہیں نہیں معلوم کہ کیسی آگ لگے گی ؟" یہ کہہ کر وکرم سنگھ اچانک کمرے کے ایک گوشے میں رکھی ہوئی طویل و عریض فولادی تجوری کی طرف بڑھا پھر اس نے تجوری کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ "یہ میرے بزرگوں کا خاندانی سرمایہ ہے۔ اس میں کوئی زیور ' کوئی ہیرا اور کوئی سکہ چتوڑ کے حکمراں کی خوشامد کر کے حاصل نہیں کیا گیا ہے۔ سیم و زر کا یہ انبار راجپوت سمراٹ کی بخشی ہوئی جاگیر کا ثمر نہیں ہے۔ یہ میرے پرکھوں کا نجی دھن ہے اگر تم اس دولت کو سونگھو گے تو اس سے

بے ضمیری کا تعفن نہیں اٹھے گا اور غلامی کی بو نہیں آئے گی۔ یہ سارا مال و متاعِ مردانِ آزاد کا خزانہ ہے۔ اس کی چمک دمک انسانی خون سے مستعار نہیں لی گئی ہے۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ نے نرملا کماری کی طرف دیکھا۔ "تم اپنی ماں کے زیورات کو پہچانتی ہو۔ ان پر تمہارا حق ہے۔" وکرم سنگھ وصیت کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ "ویسے تو یہ ساری دولت ہی تمہاری ملکیت ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ تم اس دولت کو ان لوگوں پر خرچ کرو جو سچائی کے راستے پر چلتے چلتے افلاس و محرومی کا شکار ہو گئے ہیں وہ جو اپنی خودداری کے سبب کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے لیکن ان کے چہروں پر بھوک لکھی ہوتی ہے اور لباس غربت کے میل سے اٹ جاتے ہیں۔ سیم وزر کے اس ذخیرے سے تم ان لوگوں کی کفالت کرنا پھر میری بے چین روح کو قرار آ جائے گا اور میں سمجھ لوں گا کہ میرے بزرگوں کا اثاثہ رائیگاں نہیں گیا۔"

"آپ ابھی سے ایسی باتیں کر رہے ہیں؟" نرملا کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ "ابھی تو ہمارے سروں پر آپ کا سایہ تادیر قائم رہے گا۔"

"نہیں بیٹی! تمہیں موسم کا اندازہ نہیں ہے۔" وکرم سنگھ جبراً مسکرا رہا تھا۔ "میری آنکھوں سے دیکھو۔ ہر طرف گہری تاریکی چھا گئی ہے اور تمام سائے ایک دوسرے سے گلے مل کر رخصت ہو چکے ہیں۔ وقت کم ہے۔ آؤ! ہم زندگی کا نیا پیغام سنیں۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ کمرے سے نکل آیا۔

نرملا کماری، ملازمہ رامیشوری اور چندر سنگھ بھی اس کے عقب میں سر جھکائے چل رہے تھے۔ ساتویں کمرے سے نکل کر وکرم سنگھ پانچویں کمرے میں داخل ہوا جہاں ایک سفید بستر پر علی عامر آفریدی کھلی آنکھوں کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔

انسانی قدموں کی آہٹ سن کر شاہی سفیر چونکا۔

"مہامنتری! آپ تشریف لے آئے۔"

"ہاں فرزند! میں آ گیا ہوں مگر تنہا نہیں۔" وکرم سنگھ نے آفریدی کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ تمہارے تین غمگسار اور آئے ہیں۔"

آفریدی کے ہونٹوں پر ایک اداس مسکراہٹ ابھر آئی۔ "اب تو آنکھیں ہی نہیں رہیں کیسے پہچانوں کہ کون غمگسار ہے اور کون دشمن؟"

"کہنے کو یہ دیارِ غیر ہے لیکن یہاں تمہارا کوئی دشمن نہیں آئے گا۔" وکرم سنگھ نے اپنی عادت کے مطابق علی عامر آفریدی کے سر پر اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اب تم میرے خاندانی طلسم کدے میں ہو جہاں رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ کے دراز ہاتھ نہیں پہنچ سکتے۔"

"ان کے ہاتھ مجھ تک پہنچے ہی کب تھے۔ وہ تو جسم پر مشقِ ستم کر رہے تھے۔ زبان تو میرے اختیار میں تھی۔" علی عامر آفریدی مسکرانے لگا۔ "زبان ان کے دستِ کرم کا سوال کرتی یا ان سے پناہ مانگ لیتی تو پھر میں سمجھتا کہ واقعی رانی پدمنی کے ہاتھ دراز ہیں وہ تو انتہائی مختصر بلکہ بے ہاتھ کی عورت ہے۔ شاہوں کے بجائے ان کے ملازموں پر غصہ اتارتی ہے۔ آج تک میں نے اتنی کمزور عورت نہیں دیکھی۔" آفریدی مہارانی پدمنی کا تمسخر اڑا رہا تھا۔

کچھ دیر کیلئے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ پھر مہامنتری وکرم سنگھ نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ "آفریدی! میں جا رہا ہوں اور تمہاری نگہداشت کیلئے تین غم خواروں کو چھوڑے جا رہا ہوں۔ کون جانے کہ میری سماعت کب تک قائم رہے میں عجیب سا شور سن رہا ہوں۔ یہ شور مجھ سے میری سماعت چھین لینا چاہتا ہے۔ میں بڑی مشکل سے تم تک پہنچا ہوں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر مجھے وہ پیغام سنا دو جو تم نے سنیاسی آنند پال

کو سنایا تھا۔"

"کیا رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ آپ سے زندگی کی مہلت چھین لینا چاہتے ہیں؟" آفریدی نے وکرم سنگھ سے نیا سوال کر دیا تھا۔ یہ شاہی سفیر کی فطری ذہانت تھی جس نے آنکھوں کی روشنی کے بغیر اسے کچھ ہولناک مناظر دکھا دیئے تھے۔

"نہیں! ایسی کوئی فکر انگیز بات نہیں ہے۔" مہامنتری وکرم سنگھ نے آفریدی کو آزردہ دیکھ کر صورت حال پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

"مہامنتری! میں اندھیرے کا مسافر ضرور ہوں مگر ابھی میرے ذہن کے چراغ نہیں بجھے ہیں۔" آفریدی کا لہجہ اچانک افسردہ ہو گیا تھا۔ "دماغ کی روشنی مجھے بتا رہی ہے کہ اہلِ اقتدار کو آپ کی یہ روش پسند نہیں آئی۔"

"ان کی پسند اور ناپسند سے میں اپنی زندگی کے فیصلے نہیں کرتا۔" وکرم سنگھ نے تیز آواز میں کہا۔ "فضائیں زہر سے بھر چکی ہیں اور میرے چاروں طرف سازشوں کے شعلے بھڑکا دیئے گئے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس پیغام کے سننے سے پہلے جل جاؤں اور پھر میری راکھ ان کے راستے کی دھول بن جائے۔ جلدی کرو فرزند! اگر مجھے پہنچنے میں دیر ہو گئی تو بھیڑیئے اپنے اپنے غاروں سے میری تلاش میں نکل چکے ہوں گے۔"

"وہ ایک ہی پیغام ہے جو ازل سے ابد تک گونجتا رہے گا۔" بالآخر آفریدی نے مجبور ہو کر کہا۔ "نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری رسول ہیں۔"

جیسے ہی آفریدی کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، کمرے کی فضا ہیبت و جلال سے لبریز ہو گئی۔ وکرم سنگھ کانپنے لگا اور نرملا کماری بھی اپنے جسم کی لرزش پر قابو نہ پا سکی۔

وکرم سنگھ نے حرف بہ حرف اس پیغام سرمدی کو اپنی زبان سے ادا کیا اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ "تم گواہ رہنا آفریدی کہ میں نے ہزاروں دیوتاؤں کا انکار کر کے ایک خدا کی ہستی کا اقرار کر لیا ہے۔"

"میری گواہی کی ضرورت نہیں کہ آپ نے جس کی خدائی کا اقرار کیا ہے وہ سن بھی رہا ہے اور دیکھ بھی رہا ہے۔ وہ ایسا سننے اور دیکھنے والا ہے کہ اگر بیک وقت ساری کائنات گواہی دے تو ایک حرف بھی اس کی سماعت کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔"

"میں بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔" وکرم سنگھ کی حالت یکسر بدل گئی تھی۔ "اس رشتے کے بعد تمام رشتے باطل نظر آنے لگے ہیں۔"

"یہ وہی اقرار ہے جو ایک ذات کے سوا ہر شے کی نفی کر دیتا ہے۔" علی عامر آفریدی کی خوشی ناقابل بیان تھی۔

"بیٹی! تم نے یہ پیغام سن لیا۔" وکرم سنگھ، نرملا سے مخاطب ہوا۔ "یہی پیغام سنیاسی آنند پال نے سنا تھا، اسی پیغام کو سننے کیلئے مائی بھان متی برسوں سے کوہِ آبو کے ایک مندر میں محصور ہیں اور یہی پیغام تمہارے باپ نے ایسی حالت میں سنا ہے جب اس سے اس کی زندگی چھیننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تم بھی میری موجودگی میں ایک خدا کا اقرار کر لو کہ اس طرح میری موت آسان ہو جائے گی۔" یہ کہتے کہتے وکرم سنگھ رونے لگا تھا۔

"مہامنتری! کیا آپ کی صاحبزادی بھی تشریف لائی ہیں؟" علی عامر آفریدی بے قرار ہو کر بول اٹھا۔

"ہاں! یہ میری بیٹی نرملا ہے جو تم سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہے۔" وکرم سنگھ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی تمہارا مذہب اختیار کرنا چاہتی ہے۔"

"انہیں مجبور نہ کریں۔" آفریدی نے آہستہ لہجے میں کہا۔ "اگر انہوں نے باپ کے حکم سے مجبور ہو کر اقرار کیا تو گواہی نامکمل رہے گی اور نامکمل گواہی خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوتی۔"

نہیں! میں مجبور نہیں ہوں۔" یکایک کمرے میں پرسوز آواز ابھری "میں نے اس اقرار کی طلب میں سنیاسی آنند پال کو بڑی اذیت ناک موت مرتے دیکھا ہے یہ کوئی جنون نہیں تھا جسے سنیاسی نے گلے لگا لیا اور تشدد کی آگ میں جل کر خاک ہو گئے۔ سنیاسی کی آنکھوں نے کچھ تو دیکھا جسے پانے کیلئے وہ فنا کے راستے پر دوڑتے چلے گئے تھے۔ آخر اس پیغام کی کوئی تو حقیقت ہے کہ میرے باپ چند حرفوں کے بدلے اپنی شاہانہ زندگی قربان کئے دے رہے ہیں اور اس شخص کی زندگی بھی تو کوئی اہمیت رکھتی ہے جسے جبر و استبداد کی دیوی بھی اپنے آگے نہیں جھکا سکی۔" نرملا کماری کا اشارہ خود علی عامر کی طرف تھا۔

"تو پھر آپ بھی اقرار کیجئے۔ اسے حالت جبر نہیں کہہ سکتے۔" آفریدی کی نظروں کے سامنے نرملا کا چہرہ نہیں تھا مگر پھر بھی ایک اجنبی دوشیزہ سے بات کرتے وقت اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

پھر جب نرملا کماری نے خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا تو ایسی مسحور کن آواز فضا میں ابھرنے لگی جس کی دلکشی کے آگے مندروں کی گھنٹیاں بجھ کر رہ گئی تھیں اور ناقوس بے صدا ہو گئے تھے۔

"آفریدی! اب میری روح کا بوجھ اتر گیا۔" وکرم سنگھ بہت زیادہ سرشار نظر آنے لگا تھا۔ "اب مجھے چتوڑ کی گلیاں سونی ہو جانے کا تو غم ہو گا مگر دل کے نگر کی بربادی کا مرثیہ نہیں پڑھوں گا۔ کہ یہ نوحہ خوانی میری طاقت سے باہر تھی۔"

"اہل وفا تنہا رہ گئے تھے اور نوکیلے پتھروں پر چلتے چلتے پاؤں آبلوں سے بھر گئے تھے کہ تو نے ان کے ہم سفر بھیج دیئے۔ اے خدا! تیرے یہ چند نام لیوا آدم خوروں کی بستیوں میں پناہ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں انہیں اپنے دامنِ رحمت میں چھپا لے کہ تیرے کرم کے سائبان سے محفوظ کوئی دوسرا سائبان نہیں ہے۔"

یہ چند دعائیہ کلمات تھے جنہیں سن کر وکرم سنگھ' نرملا کماری' رامیشوری اور چندر سنگھ کے دامن بھیگ گئے۔

"فرزند! میں جا رہا ہوں۔" اچانک وکرم سنگھ نے آفریدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "رام دیو اور رتن سنگھ کے جاسوسوں نے مجھے اس منزل پر پہنچا دیا ہے جو موت اور فراق کی منزل ہے میرے راز ان پر ظاہر ہو گئے اب وہ چاہتے ہیں کہ میں تمہارا شکستہ جسم ان کے حوالے کر دوں مگر........"

"آپ اس میں کوئی پس و پیش نہ کیجئے۔" آفریدی نے وکرم سنگھ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے انجام سے باخبر تھا۔ سفارت کے یہ مرحلے جان دے کر ہی انجام دیئے جاتے ہیں۔ مجھے رانی پدمنی کے حضور لے چلئے میں ان کا قرض چکا دوں گا۔ میری خاطر اپنے جاہ و جلال اور نرملا کماری کی شاہانہ زندگی کو قربان نہ کیجئے۔ آپ کو وہ پیغام سننا تھا' سن لیا۔ اس پیغام کے سہارے باقی زندگی سکون سے بسر کی جا سکتی ہے۔ آپ بتوں کے ہجوم میں رہ کر بھی اپنے خدا کو یاد رکھ سکتے ہیں۔ کچھ دن ہی کی تو بات ہے جب دوسرے ہم مذہبوں کا قافلہ آپ سے آ ملے گا تو یہ تنہائی بھی ختم ہو جائے گی۔ وہ لوگ بس آنے ہی والے ہیں انتظار کی آخری گھڑیاں ہیں جو پلک جھپکتے گزر جائیں گی۔ اتنے دن اپنے دلوں پر پتھر رکھ لیجئے۔ بہت جلد یہ پتھروں کا کاروبار ختم ہو جائے گا۔ پھر آپ ان ہی شاہراہوں پر اپنے شیشۂ دل کو لے کر نکلیں گے' اور کوئی

پتھر اچھالنے والا باقی نہیں رہے گا۔" آفریدی نے وکرم سنگھ کو نئی راہ دکھائی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہیں ستمگروں کے حوالے کر دوں۔" وکرم سنگھ نے پوچھا۔

"اس میں فکر و تردد کی کیا بات ہے؟ میرا کام ختم ہو چکا۔" آفریدی پرسکون لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "میں سلطان کے عشق کا پیغام لے کر آیا تھا جسے رانی پدمنی نے سننے سے انکار کر دیا اور وہ پیغام جو میری نگاہوں میں پوشیدہ تھا اسے سنیاسی آنند پال نے سن لیا۔ آپ نے اور نرملا کماری نے سن لیا۔ میری خوش قسمتی کا اندازہ کون کر سکتا ہے کہ ایک سفیر کی حیثیت سے مجھے کیسی فتوحات حاصل ہوئیں۔ مجھے اسی وقت دربار چتوڑ میں لے چلئے میں راجہ رتن سنگھ' رانی پدمنی' رام دیو اور دوسرے اہل دربار کو بھی یہی پیغام سناؤں گا پھر وہ مجھے اپنے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیں گے یا میرے پیغام کو دل سے قبول کر لیں گے دونوں صورتوں میں مجھے کامیابی نصیب ہوگی۔ میرا پیغام سن لیا گیا تو چتوڑ کی سنگلاخ زمین میں گل و یاسمین کی فصل پھوٹے گی۔ اور اگر میں قتل کر دیا گیا تو میرے خون کے ہر قطرے سے اس عقیدے کا درخت اگے گا جس کی آبیاری آپ لوگ کریں گے۔"

"نہیں بیٹے! تم ان لوگوں کو نہیں جانتے وہ بڑے سفاک ہیں انہیں رقص' شراب کے سوا کسی شے سے دلچسپی نہیں۔ وہ پیدائشی اندھے ہیں۔ میں روشنی کو ان کے حوالے نہیں کروں گا۔ ان کی گناہ گار سانسیں اس چراغ کو بجھا دیں گی۔ میرا کیا ہے کہ میں زندگی کے درخت کا آخری خزاں رسیدہ پتّہ ہوں۔ میرے گرنے کے بعد نئی کونپلیں پھوٹیں گی' سنہری اور سبز کونپلیں' ٹھنڈی چھاؤں دینے والی کونپلیں۔ مجھے گر جانے دو کہ میرے بعد ہی فصل بہار آئے گی۔ میں نقیبِ بہار کو جھلسا دینے والی ہواؤں کے درمیان کیسے لے جاؤں؟" وکرم سنگھ نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔

آفریدی نے ایک بار پھر جرح کی' مختلف دلائل پیش کئے مگر وکرم سنگھ نے آفریدی کی ہر منطق کو جھٹلا دیا۔

"آفریدی! تم میرا وقت برباد کر رہے ہو۔ غور سے سنو کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟ یہ میری بیٹی نرملا ہے۔ میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ علاءالدین خلجی کی یلغار کو اب دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ چتوڑ تباہ ہو جائے گا کہ سنیاسی آنند پال اور مائی بھان متی کی آنکھیں سب کچھ دیکھ چکی ہیں پھر بھی اگر سلطان نے ادھر کا رخ نہیں کیا تو تم لوگ اس تہہ خانے میں ایک سال تک پرسکون زندگی گزار سکتے ہو۔ میں نے تمہارے آرام کی ہر چیز یہاں مہیا کر دی ہے جب یہ ساری اشیاء ختم ہو جائیں تو تم سرنگ کے ذریعے اجمیر چلے جانا۔ وہاں سے تم بآسانی دلی پہنچ سکتے ہو۔ پھر تمہیں اپنی والدہ اور بہن کی قربت بھی میسر آ جائے گی۔ نرملا کو اس وقت تک اپنے ساتھ رکھنا جب تک اس کی زندگی کسی باکردار مسلمان سے وابستہ نہ ہو جائے۔"

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اس قدر نازک امانت کا بار اٹھا لوں گا۔" علی عامر آفریدی شدتِ جذبات سے مجبور ہو کر درمیان ہی میں بول اٹھا۔

"یہ امانت اتنی گراں نہیں۔" وکرم سنگھ کی آواز آنسوؤں کی نمی سے متاثر نظر آ رہی تھی۔ "تم جس امانت کا بوجھ اٹھائے اٹھائے یہاں تک آ پہنچے ہو وہ بڑی امانت ہے میں نے تمہیں ہر زاویے سے امین پایا۔ اس لئے اپنی غیرت و ناموس تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ جھکا اور اس نے آفریدی کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیئے۔

بڑا جانگداز منظر تھا دیکھنے والوں کے دل پگھلے جا رہے تھے یکایک وکرم سنگھ سیدھا ہوا۔ "تم سلطان کے

حضور رسائی رکھتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ فاتح قوم شکست خوردہ لوگوں سے کیا سلوک کرتی ہے اگر سلطان چتوڑ پر غلبہ پا جائے تو اس سے میری قوم کی سفارش کرنا۔ ایوان اقتدار کے علاوہ اس بستی میں رہنے والے اکثر لوگ بے خبر اور معصوم ہیں انہیں نفرتوں کی آگ میں نہ جلانا' محبتوں کا پیغام دینا وہ بہت جلد سیدھے راستے پر آ جائیں گے۔"

اس کے بعد وکرم سنگھ نرملا کی طرف بڑھا اور اس نے دونوں بازو کشادہ کر دیئے ماں کی ممتا سے محروم لڑکی اب باپ کی محبت سے بھی دور ہوتی جا رہی تھی۔ نرملا نے بے اختیار وکرم سنگھ کے سینے پر سر رکھ دیا اور اتنا روئی کہ آنکھوں کی ندیاں جل تھل ہو گئیں۔

وکرم سنگھ نے نرملا کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان لے لیا۔ "راجپوت زادیاں لوریوں کے ساتھ تلوار کی جھنکار بھی سنتی رہی ہیں۔

میں نے تمہیں لوریاں نہیں سنائیں کہ یہ کام تمہاری ماں کا تھا۔ باپ کی حیثیت سے میں تمہیں گیت سنا رہا ہوں۔ گیت خواب آور بھی ہوتے ہیں اور خون میں آگ لگا دینے والے بھی۔ اب تم وہی جلتے ہوئے گیت سنو گی کہ ملہار اور لوریاں تمہارے مقدر میں نہیں تھیں۔ رخصت سب ہوتے ہیں مگر تمہاری رخصتی کا انداز دوسری لڑکیوں سے مختلف ہو گا۔ آخر وکرم سنگھ چوہان کی بیٹی ہو' جسے راجہ رتن سنگھ غدار مذہب و وطن کہتا ہے۔ تم بہت جلد اپنے باپ سے دور چلی جاؤ گی۔ تمہاری ڈولی میدان جنگ سے اس طرح اٹھے گی کہ بابل گھر کے دروازے پر موجود نہیں ہو گا۔ اگر تمہیں اپنی نامرادی کا خیال ستائے تو دیس کی ان بیٹیوں کو بھی یاد کر لینا جن سے ان کا کنوارپن چھین کر ہوس کے منڈپ میں بٹھا دیا گیا تھا۔ جن کی روز برات آتی تھی اور جنہیں روز راکششوں کی دلہن بنا دیا جاتا تھا۔ وہ بھی تمہاری ہم جنس تھیں' ہم جولیاں تھیں اور جو اس طرح جلائی گئیں کہ نہ کوئلہ بن سکیں اور نہ راکھ۔"

اچانک وکرم سنگھ کو راجہ رتن سنگھ کا خیال آ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ نرملا کے چہرے سے ہٹا لئے۔ "بیٹی! میں ابھی کچھ دیر اور ٹھہر جاتا مگر رتن سنگھ میرے اس عمل کو تاخیری حربوں سے تعبیر کرے گا اور میں ایک عورت کے غلام کا یہ شرمناک طعنہ سننا نہیں چاہتا۔"

"جب ہم لوگ یہاں محفوظ زندگی بسر کر سکتے ہیں تو پھر آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہ جاتے ؟" چندر سنگھ نے ایک ایسی تجویز پیش کی تھی جس پر عمل کر کے وکرم سنگھ اپنی جان بچا سکتا تھا۔

"نہیں چندر سنگھ! میں فرار کی تہمت برداشت نہیں کروں گا۔" وکرم سنگھ نے پلٹ کر کہا۔ "ابھی رتن سنگھ کی گالیوں کا حساب باقی ہے۔ میں اس کا یہ قرض سر دربار ادا کروں گا۔ میں اہل چتوڑ کیلئے واپس جا رہا ہوں۔ اگر بے عقل اور اندھے حکمرانوں نے میرے مرتبے کو پہچان لیا تو ہزاروں گھر ویران ہونے سے بچ جائیں گے۔ میں اس امید پر مقتل کی جانب گامزن ہوں کہ شاید تقدیر کا فیصلہ بدل جائے اور میں اپنی بستی والوں کو سلطان کے قہر و غضب سے محفوظ رکھ سکوں۔" یہ کہہ کر وکرم سنگھ جانے کیلئے مڑا۔ چند قدم تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھا اور پھر رک کر بلند آواز میں بولا۔ "خدا حافظ! میرے بچو!"

دروازے پر پہنچ کر وکرم سنگھ ایک بار پھر مڑا۔ "نرملا! اگر میں زندہ بچ گیا تو خود ہی تم سے دوبارہ آملوں گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میری تلاش میں اس طلسم کدے سے باہر نکل جاؤ۔ اس کے باہر صرف موت تمہاری منتظر ہو گی۔ ذلت و رسوائی اور اذیت و کرب کی موت۔ یہ میرا حکم ہے تمہارے باپ کا حکم۔"

☆..................☆..................☆

پھر جب وکرم سنگھ راج دربار میں داخل ہوا تو ہر طرف سکوت طاری ہو گیا۔ راجپوت سرداروں کے چہروں پر نفرت و حقارت کے آثار نمایاں تھے مگر چند ساعتیں گزرتے ہی یہ نفرت حیرت میں تبدیل ہو گئی۔ وکرم سنگھ کو تنہا دیکھ کر حاضرین دربار پتھر کے مجسموں میں ڈھل گئے تھے۔ خود راجہ رتن سنگھ کی یہ کیفیت تھی کہ وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "راج دوت کہاں ہے ؟" راجپوت سمراٹ پوری طاقت سے چیخا۔

"میں نے اسے دلی بھیج دیا۔" وکرم سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو جھوٹ بولتا ہے۔" راجہ رتن سنگھ عالمِ وحشت میں تخت پر بیٹھنا بھی بھول گیا تھا۔

"مجھے جھوٹا ثابت کرنے کیلئے پورے چتوڑ کو ہم زبان ہونا پڑے گا' پھر بھی میری سچائی پر آنچ نہیں آئے گی۔" وکرم سنگھ کا سکون و اطمینان قابل دید تھا۔

"تو اس نافرمانی کی سزا جانتا ہے۔" رتن سنگھ آتشِ غضب سے جل اٹھا تھا۔

"اپنا لہجہ درست کرو رتن سنگھ۔" مہا منتری نے ادب و احترام کی دیوار مسمار کرتے ہوئے کہا۔ "جس تخت و کلاہ نے تم سے گفتگو کے آداب چھین لئے وہ میرے بزرگوں کی ٹھوکروں کا صدقہ ہیں۔" آج وکرم سنگھ نے بھی اپنے دل کا سارا غبار نکال دیا تھا۔

پھر حالات یکسر بدل گئے۔ ریاست کا سب سے بڑا دماغ ذلت و رسوائی کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ راجہ رتن سنگھ نے سر دربار مہا منتری کے ساتھ اس قدر تحقیر آمیز سلوک کیا کہ چتوڑ کی تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ وکرم سنگھ نے علی الاعلان کہہ دیا کہ وہ پتھروں کا دھرم چھوڑ کر مسلمان ہو چکا ہے اور علی عامر آفریدی مذہبی رشتے سے اس کا بیٹا ہے اور اسے کسی بھی قیمت پر رانی پدمنی کے حوالے نہیں کرے گا۔

"وہ ہم ہی تھے جس نے اسے سربلند کیا۔ وہ ہم ہی ہیں جو اس کی پیشانی زمین پر رگڑیں گے۔" راجہ رتن سنگھ اہل دربار کو مخاطب کر کے چیخ رہا تھا۔ "اٹھو اور اسے پستیوں میں دھکیل دو۔" راجپوت سمراٹ کا حکم سنتے ہی تمام راجپوت سردار اور وزراء اپنی نشستوں سے اٹھے اور پھر ایک سرکش قوم کے سینے میں جس قدر غلیظ کلمات پوشیدہ تھے وہ سب کے سب ان کی زبانوں پر آ گئے۔ چند سپاہیوں نے بوڑھے وکرم سنگھ کے کمزور بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور پھر دربار سے گزر کر جانے والا ہر سردار مہا منتری کی عظیم شخصیت کے بت کو ریزہ ریزہ کر رہا تھا۔ وکرم سنگھ کے کپڑے پھٹ گئے تھے' دستار جو وزارتِ عظمیٰ کی پہچان تھی اہلِ دربار کے پیروں سے الجھ الجھ کر دریدہ ہوئی جا رہی تھی۔ نفرتوں کے اظہار کیلئے راجپوت سرداروں نے اپنے جوتے بھی استعمال کئے اور وکرم سنگھ کے چہرے پر تھوکا بھی۔

دشنام طرازیوں کے اس شور میں وکرم سنگھ کی بارعب آواز کئی بار گونجی۔ "اے میری بدنصیب قوم! مجھے پہچان کہ میں کون ہوں ؟ تبدیلیٔ مذہب کے باوجود میں تیرا ہمدرد ہوں۔ تجھے سلطان کی آتش قہر سے بچانا چاہتا ہوں۔" وکرم سنگھ چیختا رہا مگر دھرم اور دیس کے پرستاروں نے اس کی ایک چیخ بھی نہیں سنی یہاں تک کہ وکرم سنگھ زخمی ہو کر فرش پر گر پڑا اور راجپوت امراء اسے روندتے ہوئے گزر گئے۔

اس ہنگامے کے دوران رانی پدمنی اپنے شبستانِ ناز میں کسی آئینے کے سامنے محوِ آرائش تھی۔ جب وکرم سنگھ کی ذلت و رسوائی کا تماشا اپنے عروج کو پہنچ گیا تو راجہ رتن سنگھ محافظ سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "مہارانی کے حضور ہماری درخواست پیش کرو کہ راجپوت سمراٹ دربار میں ان کے منتظر ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے سپہ سالار ہری سنگھ کو حکم دیا کہ وہ فوج کا ایک دستہ لے جا کر شاہی سفیر علی عامر آفریدی، وکرم سنگھ کی بیٹی نرملا کماری اور اس کے تمام خدمت گاروں کو گرفتار کر کے حوالۂ زنداں کر دے۔ اگر وکرم سنگھ کے مسلح محافظ سرکشی اختیار کریں تو انہیں بے دریغ قتل کر دیا جائے۔ سمراٹ کا حکم سنتے ہی سپہ سالار ہری سنگھ منتری محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد رانی پدمنی دربار میں داخل ہوئی تو عبرت کا ایک لرزہ خیز منظر اس کے استقبال کیلئے موجود تھا۔ اس سے پہلے کہ رانی پدمنی اپنے چچا وکرم سنگھ کی شکستہ حالت پر کوئی تبصرہ کرتی، راجہ رتن سنگھ خود ہی بول اٹھا۔ "ہم نے صبر وضبط کی انتہا کر دی، مہارانی! مگر جب تمہارا اپنا خون ہی تمہارے خلاف گواہی دے تو پھر کس طرح اس بے وفائی کے متحمل ہوتے۔"

"آپ نے ٹھیک کیا سمراٹ! اب اس شخص سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔" غرور وتکبر سے رانی پدمنی کے شفاف ماتھے پر کئی بل پڑ گئے تھے اور خمدار بھنویں کمان سے بھی زیادہ کھنچ گئی تھیں۔ "میں حیران ہوں کہ میرے خاندان میں اس قدر بے حیا شخص کس طرح پیدا ہوا جس نے اپنا مذہب بھی فروخت کر دیا اور خون کی وہ گرمی بھی بیچ دی جو راجپوتوں کا امتیازی نشان ہے۔ میں اس کی بیٹی تھی اور اس نے اپنی بیٹی کے ناموس کے قاتلوں کو پناہ دی۔ میواڑ کی تاریخ اس بے غیرتی کو اپنے صفحات پر کس طرح برداشت کرے گی؟ سمراٹ میرے بے داغ خاندان کی کتاب سے اس سیاہ ترین تحریر کو کھرچ ڈالیں۔ میں کوئی شکوہ نہیں کروں گی۔" رانی پدمنی مجسم شعلہ بنی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے وکرم سنگھ کے چہرے پر پاؤں سے ایک ضرب لگائی۔ وکرم سنگھ بے ہوش ہو چکا تھا۔

"کیا وکرم سنگھ کو اس حال میں دیکھ کر آپ کی آتشِ انتقام سرد ہو گئی؟" راجہ رتن سنگھ بھی رانی پدمنی کے قریب آ گیا تھا۔ اس نے انتہائی خوشامدانہ لہجے میں سوال کیا۔

"ہرگز نہیں۔" رانی پدمنی کی ایک اور ٹھوکر وکرم سنگھ کے چہرے پر پڑی "سمراٹ! آپ شعلوں کی بات کرتے ہیں، ہمارے سینے میں تو نفرت وانتقام کا ایک سمندر موجزن ہے۔ یہ آگ تو اس دن بجھے گی جب وکرم سنگھ کے بجائے سلطان کا سر ہمارے قدموں میں ہوگا۔"

"وہ وقت بھی آئے گا مہارانی!" رتن سنگھ کا انداز غلامانہ تھا۔

"اسے قید خانے میں ڈال دیجئے اور اس وقت تک تشدد کیجئے جب تک یہ راج دوت کا پتا نہ بتا دے۔" رانی پدمنی نے وکرم سنگھ کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے ساتھ ہی نرملا کے بدن سے ہر لباس نوچ لیا جائے اور وکرم سنگھ کو کھلی آنکھوں سے یہ تماشا دکھایا جائے۔ پھر اسے اندازہ ہوگا کہ علاء الدین خلجی کا خط کس قدر شرمناک تھا اس کے بعد نرملا کو یہ کہہ کر دلی بھیج دیا جائے کہ رانی پدمنی سلطان کے حرم میں داخل ہونے کیلئے آ رہی ہے۔"

راجہ رتن سنگھ چونک اٹھا اس کے چہرے پر مسرتوں کی ایک تیز لہر روشن ہوئی مگر فوراً ہی بجھ گئی۔ "کیا سلطان، نرملا کو رانی پدمنی کی حیثیت سے تسلیم کر لے گا؟"

"سلطان نے ہماری ایک جھلک بھی نہیں دیکھی پھر اسے کون بتائے گا کہ یہ رانی پدمنی نہیں، مہامنتری وکرم سنگھ کی غیرت مند بیٹی نرملا کماری ہے۔" رانی پدمنی کا فاتحانہ قہقہہ ابھرا۔

"مگر وہاں وہ حرام کار راگھو چیتن موجود ہے وہ سارا بھید کھول دے گا۔" رتن سنگھ اس منصوبہ سازی پر خوش ہوتے ہوئے بھی پریشان نظر آ رہا تھا۔

"جب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔" رانی پدمنی کے جذبۂ انتقام نے عجیب کروٹ لی تھی۔ "سلطان

اتنی جلد تحقیق پر آمادہ نہیں ہوگا۔ اس وقت تک نرملا کے سر سے قیامت گزر چکی ہوگی اور اگر دلی پہنچ کر نرملا نے یہ راز فاش کر بھی دیا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وکرم سنگھ کی داستانِ رسوائی دلی کے گلی کوچوں میں ہر شخص کی زبان پر ہوگی اور ہم یہی چاہتے ہیں۔ سلطان نہیں، کوئی اور مسلمان سردار نرملا کو شکار کر لے کیونکہ پھر ان شعلوں میں سے ہمارے انتقام کی ایک چنگاری بجھ جائے گی۔"

"کاش! یہ سب کچھ پہلے ہو جاتا۔" راجپوت سمراٹ کف افسوس مل رہا تھا۔ "اس طرح ہمیں اپنے دونوں دشمنوں سے نجات مل جاتی۔"

"نہیں سمراٹ! یہ کام وقت سے پہلے ممکن نہیں تھا۔" رانی پدمنی نے اپنے شبستانِ خاص میں پہنچنے کے بعد کہا۔

"کسے خبر تھی کہ سلطان علاء الدین خلجی ہمارے ساتھ یہ ذلت آمیز سلوک کرے گا اور کون جانتا تھا کہ خود ہمارے خون میں پرورش پانے والے غلیظ کیڑے جوان ہو کر غیرت وشجاعت کے جذبوں کو چاٹ جائیں گے۔ وہ مجھے سلطان کے حرم میں بھیج کر اپنی سیاست کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا اور آج میں اس کی چال اسی پر الٹ کر نرملا کماری کو آلۂ کار بنا رہی ہوں۔ یہ تو سیاست کے کھیل ہیں۔ اب وکرم سنگھ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ریاست میں اس سے زیادہ ذہین افراد بھی موجود ہیں۔ ہم نے اسے مدبرِ اعظم کا خطاب دے کر غلطی کی تھی کہ اس طرح کم ظرف چھلک جاتے ہیں اور پھر اپنے ذہن کی غلاظت سے دوسرے کا لباس بھی داغدار کر دیتے ہیں۔" رانی پدمنی اس فاتح حکمراں کے انداز میں بول رہی تھی جو دشمنوں کی لاشوں سے گزر کر فتح کی منزل تک پہنچا ہو اور پھر خاک وخون میں نہائے ہوئے لوگوں کی بے کسی دیکھ کر اپنی نصرت وکامرانی کا قصیدہ خود اپنی زبان سے پڑھ رہا ہو۔ رانی پدمنی بھی اسی طرح وکرم سنگھ اور نرملا کماری کی شکستگی پر طعنہ زنی کر رہی تھی اور اپنے غلام شوہر پر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ صرف مجلسِ کیف ہی کی ساتھی نہیں، میدان جنگ کی بھی سب سے زیادہ بااثر شخصیت ہے۔

"مہارانی آپ درست کہتی ہیں۔" راجہ رتن سنگھ نے پدمنی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا کہ وہ اختلافی گفتگو کر کے رنگینیٔ شب کے اثرات کو زائل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر کیف ونشاط کے یہ لمحے اس وقت برباد ہو گئے جب رات کے ابتدائی حصے میں سپہ سالار ہری سنگھ نے راجپوت سمراٹ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی۔

"مہارانی کا اقبال بلند ہو ہم اپنے مقصد میں ناکام ہو گئے۔" ہری سنگھ کے لہجے سے کسی فاتح شمشیر زن کا تکبر چھلکنے کے بجائے کسی ہارے ہوئے جواری کی تھکن ظاہر ہو رہی تھی۔ "منتری محل ویران پڑا ہے۔ نہ راج دوت کا کہیں پتہ ہے اور نہ نرملا کماری کا۔" سپہ سالار ہری سنگھ اپنی شکست کا اعتراف کر رہا تھا۔ "چند محافظ سپاہی تھے جنہیں ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا گیا مگر وہ بغاوت پر آمادہ تھے۔ ان لوگوں نے سمراٹ کے فوجی دستے کا بے جگری سے مقابلہ کیا یہاں تک کہ ایک سپاہی مارا گیا۔ چند زخمی ہمارے ہاتھ لگے مگر وہ بھی راستے ہی میں دم توڑ گئے۔ وکرم سنگھ کے چند خدمت گاروں کو گرفتار کر لیا گیا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی نرملا کماری یا راج دوت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"کہیں وہ لوگ کسی سرحدی راستے سے تو باہر نہیں نکل گئے۔" راجہ رتن سنگھ بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔

"یہ تو ممکن نہیں سمراٹ!" ہری سنگھ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ بہتر جانتے ہیں کہ ہم نے سرحدی راستوں کو کس طرح محفوظ بنا دیا ہے۔"

"اب تم جاؤ اور حفاظتی انتظامات سخت تر کردو۔" راجہ رتن سنگھ کسی زخمی درندے کی مانند پلٹا اور ہری سنگھ کا رخصتی انداز دیکھے بغیر اپنے شبستان میں چلا گیا جہاں رانی پدمنی کے سحر کار حسن کی شمع روشن تھی۔

"آخر وہ بدنصیب کہاں جاسکتے ہیں جن کے سروں سے ہم نے اپنا دستِ کرم کھینچ لیا ہے۔" رانی پدمنی نے ایک خاص ادائے ناز کے ساتھ کہا۔ احساسِ نفرت نے چتوڑ کی ملکہ کے جلتے ہوئے رخساروں کو مزید دہکا دیا تھا۔ "جنہیں ہم شرن (پناہ) نہیں دیتے انہیں یہ دھرتی کیسے سویکار (قبول) کرلیتی ہے؟" یہ کہتے کہتے حسن کی دیوی کے ابروئے خمدار کچھ اور کھنچ گئے۔

"اے ناز آفریں! اسے کوئی پناہ نہیں دے سکتا جس کی پیشانی تیرے پائے حنائی پر سجدہ ریز نہ ہو۔" رتن سنگھ کی آواز ڈوبتی جارہی تھی۔

رانی پدمنی، نرملا کماری اور آفریدی کے بارے میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر راجہ رتن سنگھ کے دستِ شوق نے اس کے ہونٹ بند کردیئے۔ "مہارانی! ان لمحوں کو ایسی یادوں کے حوالے نہ کرو جن سے نفرتوں کی بو آتی ہے۔ ان ساعتوں کو اپنی سانسوں سے مہکادو کہ سیاست کا تعفن ہمارا تعاقب کرتے کرتے یہاں تک آپہنچا ہے۔ اپنی خلوت گاہِ شوق میں ہم کسی رقیب کا گزر برداشت نہیں کرسکتے۔ اس وقت تم صرف رتن سنگھ کی جانب دیکھو اور ماسوائے اپنی آنکھیں بند کرلو۔"

پدمنی کے لبوں پر ایک فتنہ خیز تبسم ابھرا جس نے تمام فانوسوں اور قندیلوں کو بجھا کر رکھ دیا تھا۔ اب شبستانِ راز و نیاز میں صرف پدمنی کے پیکر سیمیں کی روشنی تھی اور سیاہ رات کے دوش پر ایک کافر ادا کے گیسو اس طرح بکھر گئے تھے کہ فضا شبنم ریز بھی تھی اور شرر فشاں بھی۔

☆..............................☆..............................☆

اور وہی ایک رات کچھ غم زدوں پر موت کی رات کی طرح بھاری تھی۔ اسی رات کے اندھیرے میں چتوڑ کا سب سے بڑا دماغ شل ہو کر رہ گیا تھا اور وکرم سنگھ بے شمار زخموں کے ساتھ فرشِ زنداں پر بے ہوش پڑا تھا۔ اور وہی ایک رات نرملا کماری کو خون کے آنسو رلا رہی تھی۔ "پتاجی! ابھی تک نہیں آئے۔" نرملا نے آہ و فغاں پر قابو پالیا تھا مگر درد کی شدت سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"حوصلہ رکھو راج کماری!" ملازمہ رامیشوری نے ماں کا روپ دھار لیا تھا.......... "آقا ضرور واپس آئیں گے۔"

"نہیں رامیشوری! پتاجی عجیب انداز سے گئے ہیں۔" نرملا کا لہجہ شکستہ تھا۔ "جو لوگ اس طرح جاتے ہیں وہ کبھی واپس نہیں آتے۔"

رامیشوری کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی مگر وہ پھر بھی اس بیٹی کو تسلیاں دے رہی تھی جس نے ماں کے بعد اب اپنے باپ کو بھی کھو دیا تھا۔

دوسرے کمرے میں چندر سنگھ، علی عامر آفریدی کے زخموں پر مرہم رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا "سردار! آپ بہت جلد صحت یاب ہوجائیں گے۔ مائی بھان متی کا یہی کہنا ہے.......... اور مائی جو کچھ کہہ دیتی ہے وہ پورا ہو کر رہتا ہے۔"

مائی بھان متی کے نام پر علی عامر آفریدی چونک اٹھا تھا۔ اس نے پہلے بھی یہ نام کئی بار سنا تھا اور اس گیانی عورت کے بارے میں تفصیل جاننے کی کوشش کی تھی مگر وقت نے اتنی مہلت نہیں دی تھی کہ وہ وکرم سنگھ

سے اپنے دل کی بات کہہ سکتا۔ آج جب موقع ملا تو آفریدی نے چندر سنگھ سے مائی بھان متی کے متعلق پوچھ ہی ڈالا۔ چندر سنگھ، مائی کے بارے میں جو کچھ جانتا تھا وہ اس نے حرف بہ حرف بیان کردیا اور خود آفریدی کے سلسلے میں مائی کی پیش گوئی کا اظہار بھی کردیا۔ آفریدی کو یہ سب کچھ سن کر بہت حیرت ہوئی۔

"میں حیران ہوں چندر سنگھ کہ اس بت کدے میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بتوں کی خدائی کا اقرار نہیں کرتے۔" اچانک آفریدی کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ "ایک سنیاسی آنندپال تھے کہ پتھروں سے بغاوت کرتے کرتے اپنی جان تک قربان کردی.......... اور اب مائی بھان متی ہیں کہ تنہا عورت ہوتے ہوئے طاقت و اقتدار کی نفی کر رہی ہیں۔"

"سردار! مائی آپ سے بہت محبت کرتی ہیں۔" چندر سنگھ نے ایک اور انکشاف کیا۔ "میں نے ان کی آنکھوں میں وہ جذبے موجزن دیکھے ہیں جو کسی ماں کی محبت ہی کا عکس ہوسکتے ہیں۔"

ماں کے نام پر آفریدی کے آنسو کچھ اور تیز ہوگئے۔ "چندر سنگھ میرے بھائی میں اپنی بدنصیبی کا ماتم کروں یا خوش قسمتی کا جشن مناؤں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ اپنوں نے مجھے اس حال تک پہنچایا اور بیگانوں نے میری خاطر اپنی زندگی کو بھی ہلاکت میں ڈال دیا.......... سنیاسی مجھے اپنا بیٹا کہہ کر دوسری دنیا میں چلے گئے۔ پھر یہی محبت مہامنتری نے دی اور نفرتوں کا شکار ہوگئے۔ تم میرے زخموں پر مرہم لگا رہے ہو اور تمہیں اپنے آقا وکرم سنگھ کی خبر تک نہیں کہ ان کا کیا حال ہے؟"

آفریدی کی جاں گداز باتیں سن کر چندر سنگھ کچھ دیر کیلئے خاموش ہوگیا۔ اگر شاہی سفیر کی آنکھیں روشن ہوتیں تو دیکھ لیتا کہ چندر سنگھ کے گرم آنسو اس کے رخساروں کو جلائے ڈال رہے تھے۔

"تم بولتے کیوں نہیں چندر سنگھ؟" آفریدی نے اپنے تنہائی کے ساتھی کو آواز دی۔ "مجھ سے مسلسل باتیں کرتے رہو۔ اگر تم خاموش ہوئے تو اس قبر میں میرا دم گھٹ جائے گا۔"

"کیا کہوں سردار؟" چندر سنگھ بولا تو آفریدی کو محسوس ہوا کہ اس کی آواز آنسوؤں کے اثرات سے بھیگ گئی ہے۔ "سردار! میرے اختیار میں ہوتا تو ان کے پیروں کی زنجیر بن جاتا، اگر وہ رک سکتے تو اپنا سر کاٹ کر ان کے قدموں میں رکھ دیتا.......... مگر غلامی کی یہی تو وہ منزل ہوتی ہے جو انسان کو بے دست و پا کر دیتی ہے، ہم تو ایک غلام ہیں، صرف ایک غلام، آقا کی ایک جنبشِ لب کے پابند کیا کرتے سردار؟ آقا نے تو ہمارے دست و پا ہی مفلوج کردیئے۔ ہم تو اس چراغ کی مانند ہیں جسے کسی کا مہربان ہاتھ جلا کر خود تاریکی میں گم ہو گیا ہے.......... اور جاتے وقت حکم دے گیا ہے کہ اسی طرح جلتے رہو، بارشِ ستم ہو یا ظلم کی آندھیاں چلیں، ہمارے لئے یہی ایک حکم ہے کہ ہم ہر موسم میں جلتے رہیں، بھڑکتے رہیں۔ ہم اپنی مرضی سے بجھ بھی نہیں سکتے۔ سردار! بجھ بھی نہیں سکتے۔" یہ کہتے کہتے چندر سنگھ کی آواز تیز ہوگئی تھی اور وہ ہچکیاں لے کر رونے لگا تھا۔

"میں جانتا ہوں چندر سنگھ! خوب جانتا ہوں۔" علی عامر آفریدی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے بھی مہامنتری سے کئی بار التجا کی تھی کہ وہ مجھے رانی پدمنی کے حوالے کرکے اپنی خاندانی عظمت کو ہوس پرستوں کے بازار میں نیلام ہونے سے بچالیں.......... مگر وہ ایک عظیم انسان ہیں۔ انہیں کبھی اپنی زندگی کی پروا نہیں رہی۔ وہ نرملا کماری کیلئے جیتے رہے۔ پھر اچانک زندگی کے ایک موڑ پر میں ان کے راستے میں حائل ہوگیا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہو رہا ہے۔" آفریدی شدتِ جذبات سے بے قرار ہوگیا تھا۔ اس نے بستر سے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی.......... مگر چندر سنگھ نے فوراً ہی آفریدی کو اس اضطراری حرکت سے روک دیا۔

"آپ ہمارے نزدیک آقا کی چھوڑی ہوئی امانت ہیں۔" چندر سنگھ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس امانت کا بارِ گراں اس وقت تک ہمارے کمزور کاندھوں سے نہیں اترے گا جب تک آپ بحفاظت دلی نہیں پہنچ جاتے۔"

"ابھی میری منزل تو بہت دور ہے۔" آفریدی نے دوبارہ بستر پر دراز ہوتے ہوئے انتہائی کربناک لہجے میں کہا۔

چندر سنگھ اس خوفناک جذباتی فضا کے تسلسل کو توڑنے کیلئے اٹھا اور آفریدی کے کمرے سے نکل کر نرملا کماری کے پاس پہنچا جو خاموش بیٹھی سامنے کی دیوار کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہاں یادوں کا کوئی نقش موجود ہو۔ "راج کماری! یہ میں ہوں آپ کا سیوک (خدمت گار) چندر سنگھ۔"

"آؤ چندر سنگھ!" نرملا نے اپنی اضطرابی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اوڑھنی کو دونوں ہاتھوں سے ٹھیک کیا اور اپنے خاندانی ملازم سے مخاطب ہوئی۔ "کیسے آئے؟ کیا کوئی خاص بات ہے؟"

"آقا کی کوئی خبر نہیں۔ اس سلسلے میں راج دوت بہت پریشان ہیں۔" چندر سنگھ نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ "وہ آپ سے ہمدردی کا اظہار کرنے کیلئے خود یہاں آنا چاہتے تھے۔ اس کشمکش میں ایک بار وہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ بھی گئے تھے مگر زخموں کی سوزش نے انہیں مجبور کر دیا۔"

نرملا کے چہرے پر اذیت کا ایک رنگ ابھر کر ڈوب گیا۔ "انہیں راج دوت نہیں، سردار کہا کرو۔" نرملا نے باوقار لہجے میں چندر سنگھ کو حکم دیا۔ "وہ یقیناً علاءالدین خلجی کے راج دوت ہیں مگر ہمارے یہاں ان کی حیثیت ایک سردار ' ایک رہنما کی سی ہے۔" یہ کہتے ہوئے نرملا کماری اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم یہاں ٹھہرو۔ میں خود ان سے بات کروں گی۔"

چندر سنگھ اور رامیشوری حیرت سے اپنی آقازادی کو دیکھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ایک مجبور و بے کس لڑکی ہے جو اپنی زندگی کی ہولناک تنہائی سے گھبرا کر ہر شخص کے چہرے کو امداد طلب نظروں سے دیکھنے لگے گی مگر جب وہ اپنے کمرے سے نکل کر جانے لگی تو ان دونوں کو اندازہ ہوا کہ نرملا تمام راجپوت لڑکیوں سے ایک مختلف لڑکی ہے۔ اس کا اٹھنے والا ہر قدم ہمت و استقامت کی ایک نئی داستان سنا رہا تھا۔

"آپ کی کیسی طبیعت ہے؟" اچانک علی عامر آفریدی نے ایک دلکش آواز سنی جس سے بھرپور نسوانی وقار جھلک رہا تھا۔

"میں تو بالکل ٹھیک ہوں راج کماری۔" آفریدی نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا اس نے زندگی میں پہلی بار کسی نامحرم دوشیزہ سے گفتگو کی تھی۔ اس لئے آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" نرملا کماری کے لہجے میں بے باکی کے ساتھ ایک جھجک سی تھی۔ "یہ خون کے نشانات ظاہر کرتے ہیں کہ آپ نے احتیاط نہیں برتی۔ پھر کہیں کوئی زخم رسنے لگا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ کچھ دیر پہلے میں نے دیکھا تھا تو صورتِ حال معمول پر تھی۔ یہ اچانک کیا ہو گیا؟"

نرملا نے بڑے عجیب لہجے میں شکایت کی تھی۔ علی عامر آفریدی چند لمحوں کیلئے سناٹے میں آ گیا۔ "آنکھوں کی روشنی چلے جانے کے بعد اپنے عیبوں کو بھی نہیں چھپا سکتا۔ کامیاب جھوٹ بھی وہی بول سکتے ہیں جنہیں روشنی میسر ہو۔" آفریدی کو اپنی بینائی لٹ جانے کا بڑی شدت سے احساس ہوا تھا۔ "راج کماری! معاف کرنا میں دیکھ بھی نہیں سکتا اور چل پھر بھی نہیں سکتا۔ اگر یہ دونوں مجبوریاں نہ ہوتیں میں خود رانی پدمنی کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ مجھے جس طرح جلایا جا رہا ہے اس کا کسی کو اندازہ نہیں شمعیں تو پگھل پگھل کر جل جاتی ہیں ' دھواں بھی دیتی ہیں ' بجھ بھی جاتی ہیں۔ مگر میں نہ جلتا ہوں ' نہ بجھتا

ہوں اور نہ دھواں دیتا ہوں۔ کیسی سوزش ہے ' کیسے بتاؤں؟ سلطان نے اپنا امین بنا کر یہاں بھیج دیا۔ شاہ کی امانت رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بہن ہانسی میں بے اماں کھڑی میرا راستہ دیکھ رہی ہوں گی۔ سلطان کے پندارِ ذات کا طلسم ٹوٹ رہا ہو گا اور اہل اقتدار نئے تماشے کے منتظر ہوں گے مگر کسی کو کیا معلوم کہ سنیاسی کی لاش جلائی جا چکی ' ریاست چتوڑ کا عظیم اور باکردار سیاستداں جفا کاروں کے نرغے میں جا چکا اور ایک شہزادی اپنے ہی دیس میں جلاوطن ہو چکی۔ یہ فسانۂ جور و وفا کتنا طویل ہے کہ ایک ورق بھی تمام نہ ہوا اور سننے والوں کی جانوں پر بن گئی۔ راج کماری! ابھی وقت ہے۔ چندر سنگھ کو بھیج کر رانی پدمنی کو خبردار کر دو کہ میں یہاں ہوں۔ اگر یہ راہ پُر خطر ہو تو مجھے اٹھا کر پھینک دو جہاں راج وید میرا علاج کر رہا تھا۔ رتن سنگھ کے کتے میرے ناکارہ جسم کو کھینچتے ہوئے رانی پدمنی کے حضور لے جائیں گے۔ پھر یہ نفرت و غضب کا طوفان تھم جائے گا اور چتوڑ کی پرسکون زندگی واپس لوٹ آئے گی۔" شاید اعصابی دباؤ اور ذہنی کشمکش نے آفریدی کی پلکوں کو نم کر دیا تھا۔

"اب کچھ نہیں ہو گا سردار!" نرملا نے انتہائی استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

آفریدی اس طرز تخاطب پر چونک اٹھا۔ "میں سردار نہیں ' سلطان کی فوج کا ایک عام سا سپاہی ہوں۔"

"سردار کا لفظ بھی آپ کی شخصیت کی مکمل تشریح نہیں کرتا۔" نرملا نے آفریدی کے انکسار کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ ہندو قوم کیلئے نجات کا پیغام لے کر آتے تو یہاں کے باشندے آپ کو دیوتا کا درجہ دیتے۔ سنیاسی آنند پال کا فرزند ہماری نظر میں کسی دیوتا سے کم نہیں۔"

"راج کماری! مسلمانوں میں دیوتاؤں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔"

"میں نے ایک مثال پیش کی تھی۔ آپ کو دیوتا کہہ کر نہیں پکارا تھا۔" یہ کہتے کہتے نرملا کے چہرے پر ایک عجیب سی حیا آمیز سرخی ابھر آئی تھی مگر اس کیفیت کو آفریدی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"راج کماری! آپ نے مجھے دیوی دیوتاؤں کی باتوں میں الجھا دیا۔" اچانک آفریدی اپنے موضوع کی طرف پلٹ آیا تھا۔ "میں مہامنتری کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔"

"میں پہلی اور آخری بار ان تمام واقعات کا پس منظر بیان کرتی ہوں۔ اس کے بعد آپ کہیں گزری ہوئی باتوں کو دہرا کر نہ میرے صدمات میں اضافہ کیجئے گا اور نہ خود اپنی ذات کو اذیت پہنچایئے گا۔ میں اس کے سوا کچھ کہنا نہیں چاہتی کہ جس دن آپ چتوڑ کی حدود میں داخل ہوئے تھے اسی روز سے زیرِ زمین کسی بڑے حادثے کی پرورش کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ پتاجی نے مجھے ہر لمحے کی خبر دی ' ہر موڑ پر سمجھایا۔ یہاں تک کہ سنیاسی آنند پال کے قتل کی قیامت خیز گھڑی آ پہنچی۔ پھر سیاہ آندھی نے چتوڑ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ راجپوتوں کی یہ سنگلاخ زمین شاید تہ و بالا ہو جاتی مگر مائی بھان متی نے بروقت انکشاف کیا کہ اس آندھی کو صرف آپ ہی روک سکتے ہیں۔ دیوتاؤں کی بستی میں یہ بڑی حیران کن بات تھی کہ دلی سے آنے والا ایک عام سا نوجوان اس حادثے کو ٹال سکتا ہے۔ پھر تمام نظریں آپ کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ ہوا کا طوفان ٹل گیا۔ پھر کچھ دن بعد ہی ایک اور طوفان اٹھا۔ رانی پدمنی کے دربار میں سلطان کا خط پڑھا گیا۔ آپ نے ایک سفیر کے فرائض اس طرح انجام دیئے کہ دیکھنے والے بدحواس ہو گئے۔ ستمگروں کی جماعت آپ پر جس قدر ستم ڈھا سکتی تھی ان سب کی تکمیل کی گئی۔ یہ لرزہ خیز منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ حادثات کی ضربوں سے جب پتھر چٹخنے لگتے ہیں ' اس وقت بھی آپ کے ہونٹوں پر سلطان کی عظمتوں کا ترانہ تھا۔ جبر و تشدد کی بے شمار آوازوں پر ایک سفیر کی آواز غالب آ گئی تھی۔ یہی وہ لمحات تھے

جب پتا جی نے آپ کو اس طلسم کدے تک پہنچانے کا فیصلہ کیا تھا میں ان کے اس فیصلے سے نہ صرف باخبر تھی بلکہ کئی مقامات پر میں نے ان سے اختلاف بھی کیا تھا۔ یہ میرے اپنے ذہن کی رسائی تھی۔ میرے لئے دیوتا ہی سب کچھ تھے مگر آپ کے طرزِ عمل نے پتھروں کی نفی کر دی۔ آپ نہیں جانتے کہ جب عقائد کے بت ٹوٹتے ہیں تو انسان کے دل پر کیا گزر جاتی ہے میں بھی اسی عذاب سے گزرتی رہی پھر میں نے پتھروں سے اپنا ایک ایک رشتہ توڑ لیا۔ اب آپ چاہتے ہیں کہ میں اور پتا جی دوبارہ ان ہی پتھروں کے آگے سر جھکا دیں اور اس انسان کو پتھروں سے ٹکرا کر ہلاک ہو جانے کیلئے چھوڑ دیں جو خود شیشے کا ہے اور جس کے دل و دماغ پھولوں کی نرم پتیوں سے بنائے گئے ہیں۔"

"میں تو یہ نہیں چاہتا کہ آپ دوبارہ پتھروں کے کاروبار کو زندہ کریں۔" آفریدی نے گھبرا کر کہا۔"مجھے تو یہ احساس آزار پہنچ رہا ہے کہ میری وجہ سے کتنے آباد گھرانے اجڑ گئے اور کیسے سرسبز و شاداب چمن بادِ خزاں کے گرم جھونکوں میں جھلس گئے۔"

"میں یہی کہنا چاہتی ہوں کہ آپ اپنے اس احساس کو دل سے کھرچ ڈالیں۔ میں نے اپنے باپ کو اس میدانِ جنگ کی طرف رخصت کیا ہے جہاں وہ اکیلے ہیں اور بے شمار خون آشام شمشیریں ان کا انتظار کر رہی ہیں۔ اب اس سے جانگداز خبر اور کیا آ سکتی ہے کہ مہامنتری وکرم سنگھ قتل کر دیئے گئے۔" نرملا کماری یہ واقعہ اس طرح بیان کر رہی تھی جیسے وہ کسی دوسرے انسان کے قتل کی تماشائی ہو۔ اس کی آواز میں ہلکا سا بھی ارتعاش نہیں تھا۔

اچانک آفریدی کے دل میں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ کاش وہ اس لڑکی کو دیکھ سکتا۔ جس نے اسے عزم اور حوصلے کی ایک نئی داستان سنائی تھی۔ "راج کماری! میں نے آپ کو دیکھا نہیں' صرف باتیں سنی ہیں' بڑی عجیب باتیں' ایسی باتیں جیسے کسی چٹان سے یہ صدا آ رہی ہو' جیسے پہاڑ کی کوئی ناقابلِ تسخیر چوٹی مجھ سے ہم کلام ہو۔"

آفریدی کی زبان سے اپنی اس قدر تعریف سن کر نرملا شرما سی گئی۔ پھر اس نے بہت مدھم لہجے میں کہا۔
"آپ ان فضول باتوں میں اپنے ذہن کو نہ الجھائیں اپنی صحت کی طرف دھیان دیں وہ وقت بہت قریب ہے جب آپ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ سکیں گے۔"

"میں چتوڑ میں کچھ دیکھنا نہیں چاہتا۔" یکایک آفریدی کا لہجہ سوگوار ہو گیا تھا۔"اب تو بس ایک ہی خواہش ہے کہ جب آنکھوں کی روشنی واپس آئے تو سب سے پہلے اپنے محسن وکرم سنگھ کا چہرہ دیکھوں۔ پھر اس راج کماری کو دیکھوں جو ایک سپاہی کو بچاتے بچاتے خود بھی وقت کے مقبرے میں داخل ہو گئی ہے۔"

"آپ پھر بے مقصد گفتگو کر رہے ہیں۔" نرملا نے آفریدی کو ٹوکتے ہوئے کہا۔"جب امیرِ قافلہ ہی اتنا دل شکستہ ہو جائے تو دوسرے ہم سفروں کا کیا حال ہو گا۔ آپ اپنے ذہن پر اتنا دباؤ نہ ڈالیں کہ آنکھوں کی روشنی مزید متاثر ہو اور منزل کا نشان دھندلا ہوتے ہوتے مٹ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو پتا جی کے المناک حادثے کے بعد یہ میری دوسری بدنصیبی ہوگی۔" یہ کہہ کر نرملا تیز قدموں سے واپس چلی گئی۔

پھر جب چندر سنگھ واپس آیا تو آفریدی نے اس سے کہا۔"تمہاری راج کماری تو بہت پر سکون نظر آ رہی تھیں۔"

"ہاں سردار! وہ دوسرے لوگوں کے سامنے اتنی ہی پر سکون نظر آتی ہیں۔" چندر سنگھ کی آواز سے سوگواری جھلک رہی تھی۔ "وہ چٹانوں کے لہجے میں گفتگو کرتی ہیں۔ ان کے چہرے پر سختی ہوتی ہے مگر کوئی

غور سے ان کی آنکھوں کو دیکھے تو اسے اندازہ ہو گا کہ یہ دریا ابھی ابھی خشک ہوئے ہیں گیلے کناروں کو کیسے چھپایا جا سکتا ہے۔ سارا پانی اپنے دل میں جذب کر لیتی ہیں لیکن آنکھوں کے بھیگے ہوئے گوشے تو بتاتے ہیں کہ کچھ دیر پہلے دریا میں طوفان آیا تھا۔ میں تو بچپن سے انہیں دیکھ رہا ہوں۔ یہ ان کا مزاج ہے کہ سب کی ہنسی میں شریک رہتی ہیں مگر کسی کو اپنے آنسوؤں میں شریک نہیں کرتیں۔ آپ کے پاس سے جانے کے بعد انہوں نے رامیشوری کو حکم دیا ہے کہ وہ دوسرے کمرے میں منتقل ہو جائے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے بعد بند کمرے میں کیا ہو گا؟ وہ اپنی ماں کی اس قلمی تصویر کو دیکھیں گی جو ان ہی کے خاندان کے ایک نامور مصور کیشو نے بنائی ہے۔ پھر گھنٹوں تصویر سے باتیں کریں گی۔ اپنا ایک ایک غم ماں سے کہہ ڈالیں گی پھر جی بھر کے روئیں گی۔ برسوں سے ان کا یہی معمول ہے۔ مگر آج کی رات تو اس غم میں باپ کی جدائی کا غم بھی شامل ہو گیا ہے۔ خدا ہی جانے کہ آنے والی راتیں کیسی گزریں گی؟" آفریدی کو محسوس ہوا جیسے چندر سنگھ خود بھی رونے لگا ہو۔

☆..........................☆..........................☆

اور وہی ایک رات شائستہ بیگم اور عالیہ آفریدی کیلئے قیامت کی سی رات تھی جس طرح آفریدی چتوڑ میں رہ کر اپنی والدہ اور بہن کو بحالتِ خواب بہت زیادہ پریشان اور خوفزدہ دیکھا کرتا تھا اسی طرح شائستہ بیگم نے اسی انداز کے کئی خواب دیکھے تھے جو ان کے بیٹے آفریدی پر نازل ہونے والی آفات کی عکاسی کرتے تھے۔ شائستہ بیگم ان خوابوں سے اس قدر سہمی ہوئی تھیں کہ ان کی نیندیں تک اڑ گئی تھیں۔ ایک دن انہیں معلوم ہوا کہ حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کے مزار کے سجادہ نشین ایک مردِ کامل ہیں۔ وہ علم ظاہری و باطنی کے علاوہ علمِ تعبیر میں بھی بے مثال حیثیت رکھتے ہیں۔ شائستہ بیگم نے خواہش ظاہر کی کہ وہ بزرگ کسی روز ان کے مکان پر تشریف لے آئیں اور ایک غم زدہ خاتون کے کچھ خواب سن کر ان کی تعبیر بیان کر دیں۔ مگر بعد میں شائستہ بیگم پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ وہ ایک گوشہ نشین بزرگ ہیں جو اپنے حجرے سے بہت کم نکلتے ہیں۔ ضرورت مند لوگ خود ہی ان کے آستانے تک جاتے ہیں اور ان کی روحانی برکتوں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ مجبوراً شائستہ بیگم نے حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کے مزار مبارک پر حاضری دینے کا ارادہ کیا وہ بعد نمازِ مغرب اپنی بیٹی عالیہ آفریدی کو مرد رشتے داروں کی نگرانی میں چھوڑ کر دیگر خواتین کے ساتھ ان بزرگ کی خانقاہ جانا چاہتی تھیں مگر جب رات کا اندھیرا پھیل گیا اور شائستہ بیگم نے گھر سے باہر قدم نکالا تو ان پر یہ بھیانک راز فاش ہوا کہ مکان کے چاروں طرف مسلح سپاہی گشت کر رہے ہیں۔

"خاتون! آپ گھر کے اندر تشریف لے جائیں آپ کو اس چار دیواری سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔" ملک کافور کے متعین کردہ ایک سپاہی نے مہذب لہجے میں شائستہ بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آخر اس کی وجہ؟" شائستہ بیگم کا لہجہ کرخت تھا۔ وہ اسلامی تہذیب کی نمائندہ خاتون تھیں۔ اس لئے قرآن کریم کے حکم کے مطابق نامحرموں سے گفتگو کرتے وقت اپنے لہجے کو سخت کر لیا کرتی تھیں تاکہ لوگوں کے سینوں میں چھپے ہوئے شیطان بیدار نہ ہو سکیں۔

"یہ سلطان کا حکم ہے۔ ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔"

شائستہ بیگم حوادث آشنا عورت تھیں فوراً ہی سمجھ گئیں کہ اس وقت گردشِ روز و شب کے کیا تیور ہیں؟ چند لمحے دروازے پر کھڑی کچھ سوچتی رہیں اور پھر الٹے قدموں اندر چلی گئیں۔ ماں کو اس طرح واپس آتے دیکھا تو عالیہ آفریدی بے قرار ہو کر پوچھنے لگی۔ "مادرِ گرامی! آپ نے اپنا ارادہ کیوں ملتوی کر دیا؟"

"کچھ نہیں بیٹی!" شائستہ بیگم نے اپنا نقاب علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرے وہ خواب بے سبب نہیں

ہیں' خدا آفریدی کو اپنی امان میں رکھے۔ سلطان کے معتبر سفیر کی ماں کے ساتھ یہ نازیبا سلوک کسی حادثے یا طوفان کی نشاندہی کر رہا ہے شاید میرا بیٹا درباری سازشوں کا شکار ہو گیا۔"

عالیہ آفریدی لرز اٹھی۔۔۔۔۔۔ اور پھر "میرا بھائی۔" کہہ کر ماں سے لپٹ گئی۔

"بیٹی میں انسانی جذبوں کے خلاف نصیحتوں کا بند باندھنا نہیں چاہتی مگر پھر بھی صبر کی تلقین کرتی ہوں کہ تیرے آنسو تجھے اہل دنیا کے سامنے تماشا بنا دیں گے ان اشکوں کو خشک کرنے کیلئے کوئی مہربان دامن تیری طرف نہیں بڑھے گا۔ مگر رسوا کن انگلیاں ضرور اٹھیں گی۔" شائستہ بیگم نے بڑے تحمل سے بیٹی کو سمجھایا تھا مگر خود ان کی پلکیں بھی بھیگ چکی تھیں۔

☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔☆

اور وہی رات دلی میں بڑی ہنگامہ خیز رات تھی۔ سلطان علاءالدین خلجی نے اپنے تمام دانشور مصاحبوں' مشیروں اور سپہ سالاروں کا اجلاس طلب کر لیا تھا ان سپہ سالاروں میں خواجہ حاجی اور تاج الدین عراقی نمایاں تھے۔ حضرت امیر خسروؒ نے بھی سلطان کے مصاحب خاص کی حیثیت سے اس ہنگامی اجلاس میں شرکت کی تھی۔ جب تمام مشیر اور سپہ سالار جمع ہو گئے تو علاءالدین خلجی نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر انتہائی پُر جلال لہجے میں اپنے ارکینِ سلطنت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ گواہ ہو کہ جس نے ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہم نے اس کے دامن کو اپنی نوازشات سے بھر دیا اور جس نے ہم سے نظر پھیر کر بات کی اس سے وقت نے منہ موڑ لیا۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی بھی ان ہی بدنصیب لوگوں کی قطار میں کھڑے ہیں جن کے زوال و بربادی پر عنقریب زمانہ مرثیے پڑھے گا اور ان کے دریدہ دامن میں بھیک کے چند ٹکڑے بھی نہیں سما سکیں گے۔" علاءالدین خلجی کے لہجے سے آگ برس رہی تھی۔ "ہمارے سفیر کا کوئی پتہ نہیں کہ چتوڑ کی حدود میں داخل ہوتے ہی اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ آفریدی ایسا نوجوان نہیں تھا کہ دربار چتوڑ میں گھٹنے ٹیک کر بات کرتا وہ تو ہمارا پیامبر تھا۔ علاءالدین خلجی کا پیامبر' سرکش و سربلند و سرفراز پھر وہ کیوں واپس نہیں آیا! دور دراز تک پھیلے ہوئے ہمارے مخبروں کا کہنا ہے کہ راستے سے کوئی گرد و غبار نہیں اٹھا' کسی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نہیں گونجی' تمام راہیں سونی پڑی ہیں۔ پھر آفریدی کا راستہ کس نے روکا اور ہمارے حکم نامے کے روشن حروف تاریخ چتوڑ کی پیشانی پر کیوں رقم نہیں کئے گئے؟" دربار کے ایک ایک گوشے میں سلطان کی آواز گونج رہی تھی اور اس کی قہر آلود نظریں ایک ایک چہرے پر اپنے سوال کا جواب تلاش کر رہی تھیں۔

"اس لئے کہ سفیر معتبر نہیں تھا۔" یکایک ایک نرم آواز ابھری۔ ایسی آواز جس میں مردانہ جلال نہیں تھا۔ یہ آواز ملک کافور کی تھی جو سلطان کے بائیں جانب دست بستہ بیٹھا تھا جب علاءالدین خلجی نے اہل مجلس سے یہ سوال کیا تو کسی میں جواب دینے کی جرأت پیدا نہ ہو سکی مگر ملک کافور کی محبوبیت نے اسے علاءالدین خلجی کے سامنے بے باک بنا دیا تھا۔

سلطان کے سارے مصاحب اور مشیر ملک کافور کے اس طرزِ گفتار پر حیران رہ گئے کیا انقلاب تھا کہ جس شخص نے ذلت و رسوائی کے سائے میں پرورش پائی تھی اور جو نسلِ آدم کی تاریخ میں سب سے زیادہ شرمناک باب کا اضافہ کرنے کے بعد علاءالدین خلجی کے دربار میں اس منصب تک پہنچا تھا' اس کے غلیظ ہاتھ ایک غیرت مند سردار کی دستارِ فضیلت کو پارہ پارہ کر رہے تھے۔ حضرت امیر خسروؒ نے ملک کافور کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ سپہ سالار خواجہ حاجی اور تاج الدین عراقی کی نظریں بھی اس بے ضمیر غلام کی جانب اُٹھی تھیں مگر فوراً ہی جھک گئیں۔ احساس ندامت سے ان دونوں کے جسم پسینے میں نہا گئے تھے۔

"آفریدی کی بے وفائی ایک الگ مسئلہ ہے ہم اُسے بعد میں دیکھیں گے مگر رانی پدمنی ہمارے حکم کی پابند تھی' اسے بلا تاخیر سلطان کے حرم میں داخل ہو جانا چاہئے تھا۔" علاءالدین خلجی کے غضب کی آگ کا دائرہ پھیلتا جا رہا تھا۔ "راجہ رتن سنگھ اس بات کا پابند تھا کہ وہ ہمارے حضور معذرت نامہ پیش کرتا یا اپنے جان و مال کیلئے ہماری پناہ مانگتا۔ فرمانِ شاہی سے یہ بے رخی ناقابلِ برداشت ہے۔ اسے نہ زمین معاف کرے گی اور نہ آسمان۔"

"بے شک! جسے سلطان معظم پناہ نہ دیں اسے دنیا میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔" یہ کہتے کہتے ملک کافور اس قدر جھک گیا کہ اس کا سر فرش سے ٹکرانے لگا۔ "جب ایک نمک حرام شخص کی وجہ سے سفارت ناکام ہو گئی تو سیاست کا تقاضا یہی ہے کہ دوسرا سفیر چتوڑ کی جانب روانہ کیا جائے اس سلسلے میں غلام اپنی حقیر خدمات پیش کرتا ہے۔"

"نہیں ملک! شہنشاہ جاگیرداروں سے مراسلت نہیں کرتے۔" علاءالدین خلجی کے قہر کی لے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ "وہ تو ہمارے دل کا مسئلہ تھا کہ ہم نے اپنا سفیر بھیج دیا ورنہ خود پورے چتوڑ کو ہماری قدم بوسی کیلئے حاضر ہونا چاہئے تھا۔"

"مالکِ جاہ و حشم! بدنصیب راجپوتوں کو ایک مہلت اور عطا کیجئے۔" ملک کافور گڑگڑانے لگا۔ اس کی یہ ذلت آمیز خوشامد محض اس لئے تھی کہ معاملات طول پکڑ جائیں یہاں تک کہ سلطان کے دل سے رانی پدمنی کا خیال مٹ جائے اور وہ آفریدی کے انجام سے مکمل طور پر باخبر ہو جائے۔

"مہلت دی جا چکی۔" علاءالدین خلجی کی آواز میں بجلیوں جیسی کڑک تھی۔ "خواجہ! ایک لمحہ ضائع کئے بغیر کوچ کی تیاریاں کرو۔" علاءالدین خلجی اپنے جہاں دیدہ اور دلیر سپہ سالار خواجہ حاجی کی طرف مڑا۔ یہ تجربہ کار اور سرد و گرم آشنا امیر لشکر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور شاہ کے سامنے گردن جھکا لی۔

"عراقی! بس ایک دن یا دو دن! ہم اس سے زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔" سلطان نے دوسرے سپہ سالاروں کی طرف دیکھا۔ عراقی نے بھی خواجہ حاجی کی تقلید کی اور اپنے فرمانروا کے روبرو سرِ تسلیم خم کر دیا۔

"ہم خود اس فوجی مہم کی قیادت کریں گے۔" برقِ جلال پورے دربار میں لہرا رہی تھی۔ "ہم تو چاہتے تھے کہ چتوڑ ہمارے قہر و غضب سے محفوظ رہے مگر افسوس ان راجپوت تاجروں پر جو ہم سے آگ اور خون کا سودا کرنا چاہتے ہیں۔ ربِّ لازوال کی قسم! یہ فاتح عالم انہیں وہی دے گا جس کی وہ طلب رکھتے ہیں۔ تاریک زنداں' لاشوں کے ذخیرے' خون کے آبشار' غلامی کی زنجیریں' غربت و نامرادی کی سسکتی ہوئی تصویریں' اے تیرہ بخت چتوڑ! ہمارے ہاتھوں کی طرف دیکھ کہ وہ کتنے دراز ہیں۔ اے اراولی اور آبو کی چوٹیو! ہماری بلند قامتی کا اندازہ کرو کہ تمہاری اٹھی ہوئی گردنیں ہمارے قدموں تک بھی نہیں پہنچ سکتیں" شدتِ جذبات میں علاءالدین خلجی کھڑا ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی تمام حاضرینِ مجلس بھی اپنی نشستوں پر ایستادہ ہو گئے۔

پورے دربار پر سکوت طاری تھا اور علاءالدین خلجی کے جسم میں ہلکی ہلکی لرزش صاف نظر آ رہی تھی۔ یہ جلتے ہوئے جذبات کا لاوا تھا۔ جو انسانی جسم میں زلزلے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ "تم لوگ اس بات کے بھی گواہ رہنا کہ ہم نے سربراہانِ چتوڑ کو پورا موقع فراہم کیا کہ وہ اپنے گناہوں سے تائب ہو سکیں مگر انہوں نے اپنی عافیت کے تمام دروازے بند کر دیئے۔" سلطان کے غصے کی کیفیت جنگل کی آگ جیسی تھی کہ ہر گزرنے والا لمحہ اسے پوری شدت کے ساتھ بھڑکا رہا تھا۔

کسی مشیر یا سپہ سالار میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اپنے فرمانروا کے حضور لب کشائی کر سکتا۔

"کیوں عراقی؟ تمہارے ہونٹوں پر یہ مہر خاموشی کیسی ہے؟" اچانک علاءالدین خلجی نے تاج الدین عراقی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ "تمہارے چہرے پر بجھے ہوئے کوئلوں کی راکھ کیوں ہے؟ ہم تو سمجھتے تھے کہ اتنی دیر میں تمہارا چہرہ بھی اپنے سلطان کی طرح سوز دروں سے دہک اٹھا ہوگا۔ کیا تمہیں یہ خوف ستا رہا ہے کہ آج تک چتوڑ پر کسی مسلمان حکمران نے لشکر کشی نہیں کی اور پھر بتوں کے نام لیواؤں نے یہ مفروضہ قائم کر لیا کہ چتوڑ ناقابلِ تسخیر ہے۔ کیا تم بھی صنم پرستوں کے اس مفروضے سے سہمے ہوئے ہو؟" سلطان کا رنگِ قہر تیز تر ہو گیا تھا۔

"نہیں سلطان والا حشم! یہ غلام اہل ہنود کے کسی مفروضے کو اہمیت نہیں دیتا۔" بالآخر تاج الدین عراقی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ "دنیا میں ہر حقیقت پیدا ہی اس لئے ہوئی ہے کہ وہ فاتح عالم کے سامنے ایک مفروضہ یا واہمہ بن کر رہ جائے۔"

"اور خواجہ، تمہاری جھکی ہوئی گردن اس بات کی علامت تو نہیں کہ تم نے اراولی اور آبو کی بلندیوں کو تسلیم کر لیا ہے؟" اب کی بار سلطان کا روئے سخن سپہ سالار خواجہ حاجی کی طرف تھا۔

"یہ غلام دنیا کی ساری بلندیاں اپنے آقا کے نام وقف کر چکے ہیں۔" سلطان کے غضب کی آگ کو سرد کرنے کیلئے خواجہ حاجی نے خوشامد کا حربہ استعمال کیا۔ "اراولی اور آبو کی چوٹیاں تو اس قابل بھی نہیں کہ حضور کے قدم ان پر پڑیں۔ یہ قدم تو کسی اور ہی بلندی کیلئے بنائے گئے ہیں۔"

"پھر تمہارے چہرے پر دھوپ کے بادل کیسے ہیں؟ انتقام کی جلا دینے والی دھوپ کیوں نظر نہیں آتی؟" علاءالدین خلجی اپنے سپہ سالاروں کی سرد مزاجی سے ناراض نظر آ رہا تھا۔

"سلطان معظم! یہ سکوت اور یہ سرد مزاجی آپ کیلئے غلاموں کی کم ہمتی کی دلیل نہیں۔" خواجہ حاجی نے سر اٹھاتے ہوئے عرض کیا۔ "یہ ندامت و شرمساری کا اظہار ہے کہ خدمت گاروں کے ہوتے ہوئے ان کے مالک کو تپتے ہوئے صحراؤں میں بھٹکنا پڑے۔" سپہ سالار خواجہ حاجی نے بڑی ذہانت سے سلطان کے غصے کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ "جب تک غلاموں کے کاندھوں پر ان کے سر موجود ہیں آقا کیلئے چتوڑ دردِ سر نہیں بن سکتا۔ دستِ مبارک کو جنبش دیجئے اور پھر ان لشکروں کی یلغار کا انداز دیکھئے جن کی راہ میں کسی پہاڑ کی بلندی حائل نہیں ہو سکتی۔"

علاءالدین خلجی نے بڑے بے نیازانہ انداز میں اپنے اس سپہ سالار کی گفتگو سنی جو امور جنگ میں ایک خاص مہارت بھی رکھتا تھا اور اپنے سلطان کا اس قدر وفادار بھی تھا جس نے خواجہ کو مردانِ اعتبار کی صف میں نمایاں مقام بخشا تھا۔

خواجہ حاجی کے خاموش ہونے کے بعد تاج الدین عراقی اپنی جگہ سے ایک قدم آگے بڑھا اور سر کو اس حد تک اٹھایا کہ آدابِ شاہی کے دائرے سے باہر نہ ہو سکے۔ "سلطان ذی وقار! یہ نمک خوارانِ سلطنت اپنے شاہ کے اضطراب سے بے خبر نہیں۔ کوئی ایک غلام بھی اس عرصے میں چین کی نیند نہیں سویا ہے۔ ہماری آنکھیں بھی جل رہی ہیں اور خون میں بھی شعلے بھڑک رہے ہیں۔ اب یہ آگ اسی وقت ٹھنڈی ہوگی جب سلطان کے شبستان میں مرادوں کے پھول کھل جائیں گے۔"

عراقی کی جاں نثارانہ گفتگو سن کر علاءالدین خلجی کے چہرے کے تناؤ میں کسی قدر کمی آ گئی تھی۔

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو عراقی؟" اچانک سلطان کا لہجہ شرربار ہو گیا اور سلگتے ہوئے چہرے پر ہلکی سی جو نرمی پیدا ہوئی تھی وہ چند ثانیوں میں غائب ہو گئی۔

"سلطانِ معظم! غلاموں کو حکم دیں کہ وہ یلغار کر کے چتوڑ کے حکمران راجہ رتن سنگھ کو جلال خلجی کی ناقابلِ شکست زنجیر پہنا دیں اور اسے اس وقت تک حالت اسیری میں رکھیں جب تک وہ فاتح عالم کا اقرار نہ کر لے۔"

عراقی کی زبان سے فاتح عالم کا لفظ سن کر علاءالدین خلجی کے ہونٹوں پر پہلی بار خفیف سا تبسم نمودار ہوا۔ وہ کئی سالوں سے سکندر کی طرح دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ تمام مشیر اور سردار، سلطان کے اس خواب جہانگیری سے آگاہ تھے۔ اس لئے عراقی نے قصداً فاتح عالم کا لفظ استعمال کیا تھا۔ علاءالدین خلجی کے جذبۂ تسخیر نے اس ایک لفظ سے تسکین حاصل کر لی اور وہ تعریفی نظروں سے عراقی کی طرف دیکھنے لگا۔

"عراقی! تم اپنے شاہ کے مزاج شناس ہو۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ رتن سنگھ ایک جاگیردار اور شہنشاہ کے فرق کو تسلیم کر لے اور ساری دنیا اپنی آنکھوں سے یہ تماشا دیکھ لے کہ چند دیہاتوں پر حکومت کرنے والا خلجیوں کے عظیم وارث کی طرح آزاد و سربلند نہیں ہو سکتا۔ وہ غلام ہے محض ایک غلام۔ سلطان علاءالدین کی بارگاہِ جلال میں سجدے کرنے والا ایک حقیر و ناتواں انسان۔"

"آپ کے غلام عنقریب چشم عالم کو یہ تماشا بھی دکھا دیں گے۔" تاج الدین عراقی نے اپنے جذبہ جاں فروشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دن کیسا یادگار دن ہوگا جب سلطانِ عالی مقام تختِ زر نگار پر بیٹھ کر اپنی سپاہ کی برق فشانیاں دیکھیں گے اور مورخ کا قلم بڑی حیرت سے یہ جگر گداز واقعات تحریر کرے گا کہ فاتح عالم نے قصرِ ہزار ستون سے جنبش تک نہ کی اور چتوڑ کے چہرے پر ذلت و بربادی کی سیاہی مل دی گئی۔"

"عراقی!" سلطان کی آواز تیز ہو گئی۔ "تم چاہتے ہو کہ ہم اپنے محل سے قدم باہر نہ نکالیں اور تم چتوڑ کو پامال کر ڈالو؟"

"یقیناً سلطانِ ذی جلال! غلام یہی چاہتے ہیں کہ آپ کے دست و بازو ساکت رہیں اور صرف ایک جنبشِ نگاہ چتوڑ کی تقدیر کا فیصلہ کر دے۔" عراقی جوشِ وفاداری میں آفات و مصائب کا طوفان اپنے سر لینا چاہتا تھا۔

جیسے ہی عراقی کے الفاظ کی گونج ختم ہوئی اہل مجلس نے دوبارہ سلطان کے چہرے پر آتش غیظ کو بھڑکتے دیکھا۔ علاءالدین کی بلند پیشانی لکیروں سے بھر گئی تھی اور کشادہ آنکھوں کے گوشے سمٹتے جا رہے تھے۔

"تم یہ چاہتے ہو عراقی کہ ہم اپنی زندگی کی دشوار ترین مہم سے پیٹھ موڑ کر بزم کیف و نشاط میں گہری نیند سو جائیں اور اس بات پر یقین کر لیں کہ تمہارے گھوڑوں کے سم اراولی کی چوٹیوں سے چنگاریاں پیدا کر دیں گے۔ نہیں! یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

شاہ کی آواز ابھری تو خدمت گاروں کے سر جھک گئے۔ "یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم گھوڑے کی پشت پر سوار نہ ہوں۔ یہ ہمارا ہی جلال ہے جو سپاہیوں کے جسم و جاں میں موت سے ٹکرانے کی تڑپ پیدا کرتا ہے، تلواروں میں بجلیاں بھر دیتا ہے اور گھوڑوں کو سیمابی رفتار عطا کرتا ہے۔ اس کے سوا میدان کارزار میں کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ صرف ہمارے جلال کی نمود۔ اور ہمارے وقار کا بول بالا۔"

حاضرینِ مجلس کی گردنیں کچھ اور خم ہو گئیں۔

علاءالدین خلجی تختِ زر نگار پر کھڑا تھا۔ اس فاصلے اور بلندی کے سبب مشیروں اور سپہ سالاروں

کے قد پہلے سے بھی زیادہ چھوٹے نظر آنے لگے۔

"تم جانتے ہو خواجہ کہ چتوڑ کیا ہے؟" اب کی بار سلطان نے گردن کج کر کے خواجہ حاجی کی طرف دیکھا تھا۔

"نہیں سلطانِ محترم! غلام کچھ نہیں جانتا۔" سپہ سالار خواجہ نے شاہ کے بگڑتے ہوئے تیوروں کو سمجھ لیا تھا۔

"جب تم لوگ چتوڑ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو تمہاری زبانوں پر فتح ونصرت کے بے بنیاد ترانے کیوں ہیں؟" یک بیک علاءالدین خلجی گرجنے لگا۔ "چتوڑ وہ ہے جس پر ہمارے پیش رو حکمراں صرف للچائی ہوئی نظریں ڈال کر رہ گئے۔ کسی فرمانروا نے آگے بڑھ کر اپنے گرزِ آہنی سے اراولی کی سرکوبی نہیں کی۔ تم نے غور سے نہیں دیکھا کہ "آبو" کا سرِ غرور کچھ اور بلند ہو گیا ہے اور "اراولی" کی گردن میں نئی ٹیڑھ پیدا ہو گئی ہے۔ اس کجی کا علاج صرف ہمارا دستِ کارکشاہی کر سکتا ہے۔ وہ ہمی ہیں جو رتن سنگھ کے تاج وتخت کو اپنی ٹھوکروں پر رکھ سکتے ہیں اور وہ ہماری ہی ذات ہے جو پدمنی کے حریری آنچل میں آگ لگا سکتی ہے۔ ہاں! وہ ہمی ہیں ہمارے سوا کوئی دوسرا نہیں۔ بس! تم لوگ جاؤ اور اپنی صفیں آراستہ کرو۔" یہ کہہ کر سلطان علاءالدین خلجی نے اہلِ مجلس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا۔ سلطان کی یہ ادائے خاص تھی کہ جب وہ گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنا چاہتا تو اپنے چہرے کا زاویہ تبدیل کر لیتا۔

"تمام حاضرینِ مجلس رخصتی آداب بجالائے اور گردنیں جھکا کر سلطانی خلوتِ خاص سے باہر آ گئے۔

ملک کافور اب بھی سلطان کی تنہائی میں موجود تھا۔

"ملک! تمہاری موجودگی نافرمانی کی دلیل ہے۔" علاءالدین کے لہجے میں اب غصے کی آگ نہیں، نفرتوں کی تلخیاں پوشیدہ تھیں۔

"شاہ والا! وہ غلام تو نافرمانی کا تصور بھی نہیں کر سکتا جسے سلطان کی نظرِ کرم نے تخلیق کیا اور سلطان کی نگاہِ قہر ہی ایک دن اسے فنا کر دے گی۔" یہ کہتے کہتے ملک کافور سجدہ ریز ہو گیا۔ کیسی خوشامد تھی کہ ایک غلام نے اپنے آقا کو خدائی صفات کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔

"تم یہاں کیوں موجود ہو؟" سلطان نے اپنے قدموں سے لپٹے ہوئے ملک کافور کی طرف دیکھا۔

"یہ نمک خوار اپنے آقا کو ہیجان واضطراب کی حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔" ملک کافور گڑگڑانے لگا۔ "دوسرے لوگ جا سکتے ہیں کہ انہیں سلطان کی بے قراری کا احساس نہیں مگر یہ غلام کس طرح چلا جائے کہ اس پر تو سکون کی ایک سانس بھی حرام ہو چکی ہے۔" سلطان کے پیروں میں ملک کافور کی گرفت کچھ اور مضبوط ہو گئی تھی خوشامد وگداگری کے انداز نے پہلے سے زیادہ شدت اختیار کر لی تھی۔

"اٹھو ملک! ہم تم سے راضی ہیں۔" سلطان نے اپنے دائیں پیر کو تخت کی سطح سے بلند کیا اور اس کے ساتھ ہی ملک کافور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "تمہاری یہی ادا ہمیں آسودہ کر دیتی ہے کہ تم ہمارے سوا کسی دوسری شے کے بارے میں نہیں سوچتے۔"

ملک کافور نے اطاعت وفرمانبرداری کی نمائش کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ سینے کی بلندی تک باندھ لئے اور سر کو اس قدر جھکا لیا کہ اس کے جسم پر حالتِ رکوع کا گمان ہونے لگا۔

"اور ملک! ہمارے سوا کسی کے بارے میں سوچنا بھی مت کہ ہم اپنی ذات کو تنہا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔"

"نہیں سلطانِ ذی حشم! یہ غلام کبھی اس گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔" ملک کافور آج کی رات

خوشامد کی انتہائی پستیوں میں اتر جانا چاہتا تھا۔ "اب تو اس نمک خوار کے وہم وگمان میں بھی کوئی دوسرا نہیں آتا۔ دل ودماغ کے سارے گوشوں سے، روح کی ہر گہرائی سے بس ایک ہی صدا آتی ہے۔ مالکِ جاہ وجلال، صاحبِ اقتدار وجبروت، سلطانِ عالم علاءالدین خلجی۔ اس ایک نامِ نامی کے بعد کوئی دوسرا نام نہیں کوئی نہیں۔" خلوتِ شاہ میں پستیوں اور غلاظتوں کا ایک کیڑا اپنا شیطانی کردار بھرپور انداز میں ادا کر رہا تھا۔

"تمہارے لئے ہر حالت میں امان ہے۔" سلطان کا ہاتھ بڑھا اور ملک کافور کے سر پر سایہ فگن ہو گیا۔

"غلام کو اپنی فکر نہیں، شاہ والا کی اداس اور جلتی ہوئی راتوں کا غم ہے۔" ملک کافور سیدھا ہو گیا تھا اور سلطان کو علاجِ غم کی ترغیب دے رہا تھا۔

"نہیں ملک! اب یہ راتیں ہمارے جلنے کی راتیں ہیں۔" علاءالدین خلجی نے ملک کافور کے مشوروں کی زبان کو جھٹلا دیا تھا۔

"سلطانِ معظم نے تو ہمیشہ پازیب کی جھنکار کو تلواروں کی کھنک کا درجہ دیا ہے۔" ملک کافور کی خوشامدوں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ "کئی دن سے ایک ایرانی رقاصہ شادمان حضور کی چشمِ دلنواز کی منتظر ہے۔"

"نہیں ملک! اب ہم شمشیر اور پازیب کی آوازوں کو ہم آہنگ نہیں ہونے دیں گے۔" سلطان کے چہرے پر اچانک بیزاری کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ "اب ہم رقصِ فنا دیکھیں گے اور نغمۂ مرگ سنیں گے۔"

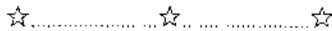
"کم سے کم اپنے تھکے ہوئے اعصاب کو تو سکون پہنچائیے۔" ملک کافور نے بادۂ گلرنگ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ رسمِ ساقی ادا کر کے سلطان کی مزید قربت چاہتا تھا مگر علاءالدین خلجی نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

"ملک ہمارے اعصاب کبھی نہیں تھکتے۔" سلطان کی آواز غضب ناک ہو گئی تھی۔ "ہمارا ذہن، ہمارے ارادے ہمیشہ توانا اور تازہ دم رہتے ہیں۔ ہم شراب کے چند قطروں میں پناہ نہیں ڈھونڈتے۔"

"شاہ والا کی ایک ایک ادا سے یہ غلام واقف ہے۔" ملک کافور نے سلطان کو برہم ہوتے دیکھ کر سر جھکا دیا۔

"پھر تم بھی اپنا چہرہ ہماری نظروں کے سامنے سے گم کر دو۔ اس وقت ہمیں کسی شے میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔ ہر صورت مکروہ اور ہر آواز ناقابلِ برداشت ہو کر رہ گئی ہے۔ اب ہم چتوڑ کے ماتھے پر ابھرنے والی مہرِ غلامی کے سوا کچھ دیکھنا نہیں چاہتے اور پدمنی کی آواز کے سوا کوئی آواز قبولِ ساعت نہیں کہ وہ ہمارے سامنے بے حجاب ہو اور اس کی جلوہ آرائیاں ہمارے التفاتِ خاص کی بھیک مانگ رہی ہوں۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی ہم نے ہر قطرۂ شراب کو اس وقت تک کیلئے اپنی ذات پر حرام کر لیا ہے جب تک ہمارے ہونٹ سرکشوں اور نافرمانوں کی شہ رگوں کو نہیں چھو لیتے۔"

ملک کافور نے اندازہ کر لیا تھا کہ جنگ سلطان کے ذہن پر مسلط ہو چکی ہے۔ اس لئے وہ لرزتے ہوئے قدموں سے باہر نکل گیا۔



علاءالدین خلجی اپنے کمرے میں تنہا ٹہل رہا تھا اور اس کی قہر آلود نظریں ہندوستان کے نقشے پر مرکوز

تھیں۔ وہ بار بار نقشے کے سامنے رک جاتا اور ان چند لکیروں کو غور سے دیکھنے لگتا جن کے درمیان ایک لفظ چتوڑ لکھا ہوا تھا۔ بہت دیر تک سلطان کی نگاہیں اسی خاص نقطے پر جمی رہیں۔ پھر اس نے پلٹ کر اپنا خنجر اٹھایا اور چتوڑ کے دائرے میں کئی شگاف ڈال دیئے۔ ہر مرتبہ سلطان کا خنجر اٹھتا اور دبیز کپڑے پر بنے ہوئے نقشے کے ایک مخصوص حصے کو چیرتا ہوا گزر جاتا اور ہر بار سلطان کے ہونٹوں سے ایک ہی کلمہ ابھرتا۔

"من فاتح عالم چتوڑ را تاخت و تاراج کردم۔" (میں نے ایک فاتح عالم کی حیثیت سے چتوڑ کو تباہ و برباد کر ڈالا)

ان الفاظ کی بازگشت کے ساتھ ہی سلطان علاء الدین خلجی کا قہقہہ بند کمرے میں گونجنے لگتا۔ اگر اس وقت کوئی دوسرا شخص سلطان کی خلوت میں موجود ہوتا اور اس ہنسی کی آواز کو سن لیتا تو اسے یہی گمان ہوتا کہ موت بے شمار انسانوں کی لاشوں پر قہقہہ زن ہے۔

پھر یکایک سلطان علاء الدین خلجی نے نقشے کے اس مخصوص حصہ پر سیاہی پھیر دی اور بلند آواز میں کہنے لگا۔

"اے بدنصیب چتوڑ! ہم نے تیرا مستقبل سیاہ کر دیا۔"

ادھر اپنے شبستانِ خاص میں فرمانروائے ہند جنگی منصوبے ترتیب دے رہے تھے اور دوسری طرف قصر ہزار ستون کے ایک کمرے میں تمام بڑے سپہ سالاروں کا خفیہ اجلاس ہو رہا تھا۔ ان سپہ سالاروں میں خواجہ حاجی اور تاج الدین عراقی نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ان دونوں سپہ سالاروں نے حضرت امیر خسروؒ کو بھی اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ جب یہ سلطنت خلجی کے مضبوط ترین مہرے کمرے کے ایک گوشے میں جمع ہو گئے تو عراقی نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہم سب پر فرض ہے کہ کسی طرح سلطان والا کو اس ارادے سے باز رکھیں اور وقار شاہ کے نازک آبگینے کو چتوڑ کے بے رحم پتھروں سے بچانے کی کوشش کریں۔"

"میں تو سلطان کے روبرو لب کشائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" سالار خواجہ حاجی نے اپنی مجبوریاں بیان کرتے ہوئے کہا۔ "پوری سلطنت میں بس ایک امیر کی ذات ہے جو سلطان کو کوئی مشورہ دے سکتے ہیں۔" خواجہ نے خسروؒ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

امیر خسروؒ کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بہت آہستہ سے بولے۔ "میں مزاج سلطانی سے واقف ہوں کہ وہ اپنے الفاظ واپس لینے کے عادی نہیں ہیں۔ پھر بھی میں کسی مناسب موقع پر کوشش کروں گا کہ شاہ کی آتش جلال سرد ہو جائے اور وہ اس بازی سے ہاتھ اٹھا لیں جس کے کھیلنے میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔"

عراقی نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ برہمن راگھو چیتن کو قتل کر دیا جائے تاکہ وہ رانی پدمنی کے حسن کے قصیدے پڑھ کر سلطان کے شعلۂ عشق کو مزید نہ بھڑکا سکے۔

"اب اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" حضرت امیر خسروؒ نے کہا اور وفادارانِ سلطنت کا یہ خفیہ اجلاس برخاست ہو گیا۔

☆..........................☆..........................☆

رات تیزی سے گزرتی جا رہی تھی۔ علاء الدین خلجی خیالات کے دوش پر پرواز کرتے ہوئے چتوڑ میں داخل ہو گیا تھا اور اس نے تصورات کی دنیا میں چتوڑ کو تباہ و برباد کر کے نیند کی آغوش میں پناہ ڈھونڈلی تھی۔ نصف شب کے ہوتے ہوتے پورا قصر ہزار ستون سو گیا تھا مگر ملک کافور اپنے کمرے میں جاگ رہا تھا۔ اچانک رات کے سناٹے کا جگر چاک کر کے ایک تیز آواز ابھری۔

"زمین والوں نے اپنی حقیقت کو پہچاننے سے انکار کر دیا اور وہ آسمانوں کی طرف اڑنے لگے جیسے وہ آسمانوں کی حدود سے نکل جائیں گے مگر ان نادانوں کو کون سمجھائے کہ ایک دن ان پر ان کے مکان بھی پست ہو جائیں گے۔ جس زمین کی عبادت کی جا رہی ہے وہ ان کی لاشوں کو بھی قبول نہیں کرے گی۔" یہ آواز خاموش ہو گئی۔

ملک کافور شدت خوف سے لرزنے لگا۔ وہ اس آواز کو پہچانتا تھا اور کئی برسوں سے مسلسل سن رہا تھا۔ یہ آواز ہمیشہ آدھی رات کے وقت قلعے کی فصیل کے نیچے سنائی دیتی تھی۔ اس آواز پر پہرے بٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ کئی عیش پرست مصاحبوں نے سلطان سے شکایت کی تھی کہ وہ آواز ان کے نشاط آمیز خوابوں میں خلل ڈالتی ہے' اس لئے آواز کو بند کر دیا جائے مگر علاء الدین خلجی ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیا کرتا تھا کہ اس شخص کو بولنے دو۔ اگر وہ آواز کسی کی سماعت پر گراں گزرتی ہے تو اسے چاہئے کہ اپنے دریچے بند کر دے یا پھر اپنے کانوں پر دبیز غلاف لپیٹ لے۔

دلوں میں لرزہ ڈال دینے والی وہ آواز دلی کے مشہور بزرگ بشیر مجذوب کی تھی بشیر ایک صاحب جذب صوفی تھے جنہیں عشق خداوندی کی آگ نے جلا ڈالا تھا وہ حقیقتاً بہت باخبر انسان تھے مگر اہل دنیا کیلئے ہمیشہ مدہوش نظر آتے۔ ہر وقت ان کے گرد حاجت مندوں کا ہجوم رہتا تھا مگر بشیر کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔ اگر کبھی بولتے تو ایسے اشاروں میں کہ ان کا سمجھنا مشکل ہوتا۔ دن بھر کسی درخت یا دیوار کے سائے میں پڑے رہتے۔ رات ہوتے ہی اپنی جگہ چھوڑ دیتے اور دلی کے مختلف گلی کوچوں میں نعرہ زنی کرتے رہتے۔ زبان سے عجیب عجیب کلمات ادا کرتے۔ عام لوگوں کیلئے ایک مجذوب کی بے سروپا باتوں میں کوئی مفہوم نہ ہوتا مگر اہل خبر جان لیتے کہ بشیر کیا کہنا چاہتے ہیں وہ درپردہ گمراہ حکمرانوں کو بھی متنبہ کرتے اور عوام الناس کو بھی ڈراتے لیکن اس طرح کہ یہ بات ایک معمہ ہوتی۔ نصف شب کے قریب بشیر مجذوب سلطان علاء الدین خلجی کے عظیم الشان محل "قصر ہزار ستون" کے نیچے سے گزرتے اور اپنی زبان میں جو کچھ کہنا ہوتا کہہ جاتے۔ شروع میں علاء الدین نے بھی بشیر مجذوب کی اس نعرہ زنی کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا مگر وہ بزرگان دین کی عظمتوں سے واقف تھا اس لئے بشیر کو چھیڑنے کی جرأت نہ کر سکا۔

قصر ہزار ستون کے رہنے والے روزانہ ہی اس مرد قلندر کی آوازیں سنتے۔ کبھی صدا بلند ہوتی۔

"افسوس! بے خبروں کی بستیوں پر کہ آگ ان کے گھروں تک آ پہنچی اور وہ بے ہوشی کی نیند سو رہے ہیں۔"

کبھی اس لہجے میں پکارتے۔

"انسان بڑا ناشکرا ہے۔ اس کیلئے کیسی کیسی نعمتیں پیدا کی گئیں مگر اس نے پاکیزہ چیزوں سے ہاتھ کھینچ لئے اور غلاظتوں سے اپنے شکم بھر لئے۔"

کبھی یوں پکارتے۔

"دینے والے نے اہل جفا کو پوری مہلت دی مگر ستمگروں نے سمجھ لیا کہ خدا بے اثر ہو گیا۔"

بشیر مجذوب اشارات و کنایات میں سب کچھ کہہ جاتے مگر سرمستیوں میں ڈوبے ہوئے انسانوں کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ ایک مرد قلندر کی آوازوں کو بغور سننے کی کوشش کرتے۔ شہر والوں کے نزدیک یہ بے ربط کلمات تھے اور ان کا ادا کرنے والا عقل و دانش سے محروم ایک پاگل شخص تھا' اور آج کی رات اسی پاگل شخص نے ایک عجیب نعرہ بلند کیا تھا۔

"تونے شرفاء کے گریبان چاک کر ڈالے اور اپنے بدن پر گناہوں کی قبا سجا کر بڑا بن بیٹھا۔ مگر یہ بڑائی تو بہت عارضی ہے۔ دیوار کو نہیں دیکھتا کہ وہاں تیرے لئے کیسی پستیاں اور ذلتیں لکھ دی گئی ہیں۔"

بشیر مجذوب کی آواز آہستہ آہستہ سنسان فضاؤں میں ڈوب گئی اور ملک کافور کا خوف و دہشت سے لرزتا ہوا جسم پسینے میں نہا گیا۔ بشیر مجذوب نے رات کے اندھیرے میں راہ چلتے چلتے اسے آئینہ دکھایا تھا اور ملک کافور اس آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر ایک بار پھر ڈر گیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو دلی کے اس مرد قلندر کو دار پر کھینچ دیتا یا اس کے جسم کے ٹکڑوں سے اقتدار کے مقتل کو آراستہ کر دیتا۔ مگر وہ مجبور تھا اور اپنی اسی مجبوری کے احساس کو مٹانے کیلئے اس نے ایک لبریز جام سرخ اپنے حلق میں اتار لیا۔ پھر جب اعصاب آہستہ آہستہ سن ہونے لگے تو ملک کافور نے اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے محافظ کو آواز دی۔ "نورا۔"

ملک کافور کی آواز سنتے ہی نورا کمرے میں داخل ہوا اور احتراماً اس طرح جھک گیا جیسے دوسرے امراء سلطان علاءالدین خلجی کے سامنے سجدہ ریز ہو جایا کرتے تھے۔ نورا' ملک کافور کے معتمد دستے کا ایک سپاہی تھا جس کا اصلی نام نورالدین تھا لیکن ملک کافور اسے نورا کہہ کر پکارا کرتا تھا۔

"اٹھ اور سیدھا کھڑا ہو جا۔" ملک کافور نے اپنے قدموں پر جھکے ہوئے نورا کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

نورا ایک غلام کی ٹھوکر سے کانپ اٹھا اور لرزتے جسم کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ "حضور! کیا اس غلام سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا؟" نورا کی آواز میں گہری لرزش تھی۔

"یہ مکاریاں چھوڑ اور ہمیں تفصیل سے بتا کہ آفریدی کا کیا حشر ہوا؟" ملک کافور نورا سے گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

"سرکار! میں تو سب کچھ عرض کر چکا۔" نورا کا جسم بدستور کانپ رہا تھا۔ "اس بات کو ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا۔ اب کیا باقی بچا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں۔" نورا نے ملک کافور کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

"بدبخت! تجھے نہیں معلوم کہ سلطان نے چتوڑ پر لشکر کشی کا ارادہ کر لیا ہے۔" ملک کافور نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ "اسے بند کر دے۔ اگر میری زبان سے ادا ہونے والا ایک لفظ بھی کمرے کی چار دیواری سے باہر چلا گیا تو ہم سب کی شہ رگیں کاٹ دی جائیں گی اور ہمارے جسم بھوکے کتوں کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔"

نورا نے دوڑ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور جواب طلب نظروں سے ملک کافور کی طرف دیکھنے لگا۔

"اگر سلطان نے چتوڑ پر قبضہ کر لیا اور آفریدی وہاں موجود پایا گیا تو پھر.........؟" فرطِ وحشت سے ملک کافور کا سوال ادھورا رہ گیا تھا۔

"حضور! آفریدی تو کب کا مر چکا۔ زمین کی خوراک بن چکا۔ پھر ایک مردہ کیڑے کے تصور سے آپ اپنے ذہن کو کیوں پریشان کر رہے ہیں؟" عیار نورا لہجہ بدل بدل کا ملک کافور کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "اگر اب بھی آپ کو یقین نہیں آتا تو پھر اپنی شمشیر سے اس غلام کا سر قطع کر دیجئے کہ میری زندگی کی قربانی آفریدی کی موت پر آخری گواہی ہوگی۔"

ملک کافور حیرت سے نورا کی طرف دیکھنے لگا جس کی گردن اس غلام کی مانند جھکی ہوئی تھی جسے ذبح کرنے کیلئے مقتل کی جانب لے جایا جا رہا ہو۔ نورا کی چرب زبانی بہرحال رنگ لائی اور ملک کافور کے چہرے پر سکون و اطمینان کے آثار نظر آنے لگے۔

"اور ہانسی کی صورت حال کیا ہے؟" ملک کافور نے شائستہ بیگم اور عالیہ آفریدی کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ دونوں اپنے گھر میں محصور کر دی گئی ہیں۔ بس حضور کے دوسرے اشارے کا انتظار ہے۔" نورا کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ ابھری۔

"ہمارے دوسرے حکم کے منتظر رہو۔ ان دونوں شریف زادیوں کو بھی بہت جلد ایک لرزہ خیز انجام سے دوچار ہونا ہے۔" یہ کہتے کہتے ملک کافور نے بلوریں ساغر کو اتنی طاقت سے دبایا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور شیشے کے کچھ ذرے اس طرح پیوست ہوئے کہ ملک کافور کے ہاتھ سے خون بہنے لگا۔

"حضور! آپ کا یہ دست مبارک.........اور خون.........۔" نورا بے قرار ہو کر آگے بڑھا۔

"ہمارے خون کے چند قطروں کی طرف نہ دیکھ' لہو کے اس سمندر کی جانب نظر کر جو عنقریب اپنی حدیں توڑ کر ہندوستان کے گلی کوچوں میں بہہ نکلے گا۔"

نورا' ملک کافور کو رات کا آخری سجدہ کرنے کے بعد کمرے سے جانے لگا تو علاءالدین خلجی کے محبوب غلام کی آواز گونجی۔

"یقیناً آفریدی موت کی نیند سو چکا ہوگا مگر ہمیں جاگتے رہنا چاہئے کہ آنے والی ہر رات قیامت کی رات ہے۔"

دلی کی دوسری رات بھی بڑی ہنگامہ خیز تھی۔ دن کے وقت علاءالدین خلجی نے دربارِ عام کا کوئی اہتمام نہیں کیا تھا پھر جب کائنات پر اندھیرا چھا گیا تو سلطان نے اپنے اہم سپہ سالاروں اور مشیروں کا اجلاس دوبارہ طلب کر لیا۔ پہلی ہی نظر میں محسوس ہوتا تھا جیسے سلطان رات بھر سو نہیں سکا ہے۔ فرمانروائے ہند کی اس ظاہری کیفیت نے فوجی اجلاس میں شریک ہونے والے ہر فرد کو اپنی جگہ بہت زیادہ محتاط بنا دیا تھا۔

"شاید تم لوگ ہماری ذہنی اور قلبی کیفیت سے باخبر نہیں ہو۔" اچانک مجلس میں سلطان کی بارُعب آواز گونجی۔

"غلاموں کی ذہنی پرواز اپنے شہنشاہ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔" تاج الدین عراقی نے گھٹنے ٹیک کر گردن کو اس قدر خم کر لیا کہ اس کے سر اور فرشِ دربار کے درمیان ایک بالشت کا فاصلہ تھا۔

"ہم نے ساری رات جاگ کر گزاری ہے کبھی نیند آئی بھی تو اس طرح کہ ہم گھوڑے کی پشت پر سوار تھے اور ہماری شمشیرِ قہر سے راجپوتوں کے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔" شب بیداری کے اثر سے سلطان کی آنکھیں کسی میخوار کی طرح چڑھی ہوئی تھیں "کبھی اراولی کی چوٹیاں قدم بوس ہو رہی تھیں اور کبھی آبو ہمیں سجدے کر رہا تھا۔"

"بے شک! اراولی اور آبو کو اسی لئے بنایا گیا تھا کہ ایک دن وہ سلطان محتشم کی عظمت و سربلندی کا اعتراف کریں اور آج وہی دن آ پہنچا ہے۔" یہ کہتے کہتے تاج الدین عراقی نے فرش پر سر رکھ دیا۔

علاءالدین خلجی کے بجھے ہوئے چہرے پر روشنی ابھر آئی اور وہ تازہ دم نظر آنے لگا۔

"اٹھو عراقی! ہم نے تمہارا اسلام قبول کیا۔ تمہاری وفاداریاں بے داغ ہیں مگر ہمیں بتاؤ کہ ہمارے ناقابلِ شکست لشکر کس حالت میں ہیں؟" علاءالدین اپنے سپہ سالار سے فوجی تیاریوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

"پیادے صف بہ صف اس طرح کھڑے ہیں کہ ان کے پاؤں رکابوں میں ہیں' ہاتھ شمشیروں کے قبضوں پر جمے ہوئے ہیں اور سماعتیں حکم شاہ کی منتظر ہیں۔ سلطان کا دست کارساز بلند ہو اور غلام چتوڑ کی تاریخ بدل ڈالیں۔" تاج الدین عراقی نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

حضرت امیر خسروؒ نے حیرت سے عراقی کا جواب سنا۔ گزشتہ شب سپہ سالاروں کے خفیہ اجلاس میں جو

کچھ طے پایا تھا' آج رات اس کے خلاف عمل ہو رہا تھا۔ چند لمحوں کیلئے امیر خسروؒ نے سوچا کہ وہ بھی خاموشی اختیار کر لیں مگر انہیں اپنا وعدہ یاد آ گیا اور اسی وعدے کو وفا کرنے کیلئے وہ ایسی فضا میں بول اٹھے جو امن و سکون کی گفتگو کیلئے قطعاً ناساز گار تھی۔

بظاہر امیر خسروؒ کے ہونٹوں پر مہر سکوت تھی مگر آپ کا چہرہ کسی خاص اضطراب اور بے چینی کا غماز تھا۔

امیر خسروؒ اپنی نشست پر بار بار پہلو بدل رہے تھے کہ اسی دوران سلطان نے ان کی طرف دیکھا۔

"خسروؒ! تم بے چین نظر آ رہے ہو۔" علاء الدین خلجی اپنی عادت کے خلاف نرم لہجے میں مخاطب ہوا اور کیوں نہ ہوتا کہ امیر خسروؒ عام درباری مصاحب نہیں تھے۔ شاہ کے ملازم ہوتے ہوئے بھی امیر ایک خاص درجۂ احترام رکھتے تھے۔ خسروؒ نے علاء الدین خلجی کی شان میں بے شمار قصیدے لکھے تھے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا محبوب مرید تماشا گاہ خلجی کا ایک کھلونا بن کر رہ گیا ہو۔ علاء الدین کا رعب و جلال اپنی جگہ مگر خسروؒ سے ہم کلام ہوتے وقت سلطان کو اپنا لہجہ بدلنا پڑتا تھا اور اس وقت بھی وہی کیفیت تھی کہ علاء الدین نے ایک مخصوص رغبت اور انسیت کے ساتھ امیر خسروؒ کے اضطراب کا سبب دریافت کیا تھا۔

"سلطان! یہ خادم اپنی ذات کیلئے کبھی پریشان نہیں ہوتا۔" امیر خسروؒ نے درباری آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا۔

"پھر ؟" سلطان کا سوال بہت مختصر تھا۔

"میری یہ وحشت اور بے چینی بھی آپ کی بے خوابی کے سبب ہے۔" امیر خسروؒ نے انتہائی ذہانت سے اپنا مدعا بیان کرنے کیلئے تمہید باندھی۔

"خسروؒ! ہم تمہارے جذبوں کی سچائی سے باخبر ہیں۔" سلطان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ "ہم جانتے ہیں کہ اگر ہماری آنکھیں جاگیں گی تو تمہاری پلکیں بھی نہیں جھپکیں گی۔"

"اگر آپ کو اپنے خدام کے جذبات کا اس قدر پاس ہے تو پھر اپنے شبستانِ جمال میں محوِ خواب رہئے کہ جاگنے کیلئے لاکھوں غلام ہیں۔" حضرت امیر خسروؒ' علاء الدین خلجی کو آہستہ آہستہ اس دائرے کی طرف کھینچ کر لا رہے تھے جہاں ایک شہنشاہ سے نازک ترین موضوع پر گفتگو کی جا سکتی تھی۔

"نہیں خسروؒ! ابھی کچھ دن کیلئے ہم نے اپنی آنکھوں پر نیندیں حرام کر لی ہیں۔" سلطان پھر اسی دائرے میں سمٹ گیا تھا۔ "اگر ہم سو گئے تو ہندوستان کی تقدیر سو جائے گی۔"

"بے شک! سلطان کی بلند اقبالی اہل ہند کی تقدیروں کو تاریک سایوں سے محفوظ رکھے گی مگر یہ خادم پہلے بھی عرض کر چکا ہے کہ محض چتوڑ کی خاطر قصر ہزار ستون کو خالی نہیں چھوڑا جا سکتا۔" امیر خسروؒ نے بالآخر اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ "ہر طرف نئے نئے فتنے سر اٹھا رہے ہیں زمین کے بیشتر خطوں میں ہنگاموں کے بیج بوئے جا رہے ہیں۔ اگر شاہ والا کی غیر موجودگی میں شورشوں کی یہ زہریلی فصل تیار ہو گئی تو اس کے اثر سے ہماری سکون و عافیت کی لہلہاتی کھیتیاں جل اٹھیں گی۔"

"خسروؒ! ہم کہیں بھی رہیں مگر ہمارا جلال ان کھیتوں کی حفاظت کرے گا۔" علاء الدین خلجی اپنے ذہن کے خول سے نکلنے کیلئے آمادہ نہیں تھا۔

"سلطان معظم کا ہر ارشاد بجا مگر پھر بھی خادم کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔" اب امیر خسروؒ واضح انداز میں اپنا مفہوم پیش کرنا چاہتے تھے۔

"خسروؒ! حضرت شیخ کے صدقے میں تم کسی اجازت کے پابند نہیں ہو۔" علاء الدین خلجی کے

چہرے پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کیلئے ایک عقیدتِ خاص کا اظہار ہو رہا تھا اور اسی عقیدت نے اسے خسروؒ کے سامنے بھی نرم گفتار بنا دیا تھا۔ "خسروؒ! تمہیں جو کچھ کہنا ہے بے خوف و خطر کہو۔ ہماری سماعتیں تو تمہاری شیریں کلامی کی ہمیشہ منتظر رہتی ہیں۔"

"سلطان والا! کیا چتوڑ پر لشکر کشی کا حکم آپ کی کسی اضطرابی کیفیت کا نتیجہ ہے۔" امیر خسروؒ نے سلطان کے جنگی منصوبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں خسروؒ! ایسا ہرگز نہیں۔" سلطان علاء الدین خلجی کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ "ہم مضطرب ضرور رہتے ہیں مگر ہمارا یہ اضطراب کسی احمق یا دیوانے کا اضطراب نہیں۔ جو لوگ ہمارے اس فیصلے کو ایک عاشق کا فیصلہ سمجھتے ہیں وہ مزاجِ شاہ سے کچھ زیادہ آشنا نہیں۔ ہم نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ چتوڑ کی تباہی کا فیصلہ کیا ہے۔ ایسی تباہی کہ جس کی شدت یا کمی کا انحصار راجپوتوں کے طرزِ عمل پر ہے اگر وہ آسانی کے ساتھ ہمارا بخشا ہوا طوقِ غلامی اپنی گردنوں میں ڈال لیں گے تو قلعہ چتوڑ کے دیوار و در ہمارے قہر کی سنگ باری سے محفوظ رہیں گے۔ اور اگر ان لوگوں نے سرکشی اختیار کی تو ہمارا قہر راجپوت ریاست کے آثار تک جلا ڈالے گا۔ اس طرح کہ پھر ان بدنصیبوں کی بربادی پر کوئی مرثیہ پڑھنے والا بھی باقی نہیں رہے گا۔ چمگادڑیں ان کے شبستانوں میں بسیرا کریں گی اور الوؤں کا غول ہماری فتح کے نقارے بجا کر کہا کرے گا۔ "چتوڑ میں بسنے والے گیدڑوں کی ایک نسل نے ترکی شیروں کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی ابھی شیروں نے اپنے دانت اور پنجے کھولے بھی نہ تھے کہ گیدڑوں کی پوری قوم ان کے قدموں کی دھمک سے مر گئی۔" علاء الدین خلجی کے لہجے کی آگ اس قدر بھڑک چکی تھی کہ امیر خسروؒ کو اپنے نرم و شیریں الفاظ بے حقیقت نظر آنے لگے تھے۔

ایک مختصر سے وقفۂ سکوت کے بعد حضرت امیر خسروؒ دوبارہ علاء الدین خلجی سے مخاطب ہوئے۔

"شاہِ ذی وقار! بے شک! ہم آپ کے مزاج کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ مگر کیا ایک شادی شدہ عورت کا وجود اتنا قیمتی ہے کہ جس کے حصول کیلئے سلطان اپنے جاں نثاروں کے قافلے کو وادیٔ مرگ میں گم کر دینا چاہتے ہیں ؟"

"خسروؒ تم جیسے شاعر و دانشور کی زبان سے یہ الفاظ اچھے نہیں معلوم ہوتے۔" علاء الدین خلجی کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ "کیا کسی جاں نثار کو اپنی زندگی ہمارے حکم سے زیادہ عزیز ہے ؟" سلطان نے امیر خسروؒ سے سوال کیا۔

"شاہِ عالی مقام! میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس معرکہ آرائی کو ایک عورت کے حسن سحر کار سے وابستہ نہ کیا جائے کچھ بھی ہو' ایک ساحرہ کے چشم و لب اس لائق نہیں کہ وہ سلطان کو وادیٔ فنا کی جانب لائیں اور فولاد کے اعصاب رکھنے والا شہنشاہ موم ہو کر بہہ جائے۔ میں اس وقت سے ڈرتا ہوں کہ سلطان کے بے داغ پیراہنِ فتوحات پر شکست کا کوئی داغ ابھر آئے۔ اور یہ غلام ندامت و شرم ساری سے گردنیں جھکا کر اپنی زندگی کے باقی دن بسر کریں۔ یہ بڑی ہولناک صورتحال ہو گی کہ رانی پدمنی اور اس کے سپاہی قلعے کی فصیل پر کھڑے ہو کر قہقہہ زنی کریں۔ ہماری پشت ایک معمولی حکمراں کی طرف ہو اس کے تیر انداز ہمارے جسموں کو اس طرح چھید رہے ہوں کہ ہم نے میدانِ جنگ سے منہ موڑ لیا ہو۔ سلطان معظم! خسرو تو اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ آپ کا وقار خود غلاموں کا وقار ہے' آپ کا اقتدار خود نمک خواروں کا اقتدار ہے۔ اور آپ کا جذبۂ تسخیر خود غلاموں کے سینوں میں پرورش پاتا ہے۔ اگر یہ جذبہ ناآسودہ رہ گیا تو آپ کے قطار در قطار غلام بھی حسرت و مراد کے ساحل پر پیاسے مر جائیں گے اور وقت

کا مورخ زندگی کے قرطاس پر یہ عبارت تحریر کر دے گا کہ والیٔ ہند نے خود اپنی فتوحات کا احترام نہیں کیا اور محض شعلۂ لب ورخسار میں جلنے کیلئے پوری سلطنت خلجی کو آگ اور دھویں کی نذر کر دیا اور وقت کا مورخ یہ بھی لکھے گا کہ ہندوستان کا سب سے بڑا سوداگر جس کی نیلام گاہ میں بڑے بڑے حکمران اپنی قیمتیں مقرر کرانے آتے تھے وہ خود چتوڑ کے ایک دیہاتی بازار میں سستے داموں فروخت ہو گیا۔ شہنشاہ! یہ خسارے کی تجارت ہوگی۔ کاش! آپ پدمنی جیسی جنس حقیر کی طرف سے منہ پھیر لیں اور راستے کے اس بے وزن پتھر کو ٹھوکر مار کر اپنی منزل کے دائرے سے خارج کر دیں۔ کاش! ایسا ہو جائے۔ کاش! ایسا ہو جائے۔"
امیر خسروؒ بڑے حسرت آمیز لہجے میں بول رہے تھے۔

"نہیں خسروؒ! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" ایک بار پھر سلطان کے لہجے سے جلال کی آگ برسنے لگی تھی۔
"ایک شاعر اور حکمراں کی سوچ میں بڑا فرق ہوتا ہے تم اپنے تصور میں آسمانوں کی سیر کر سکتے ہو مگر چند گز اونچے ایک ٹیلے پر نہیں چڑھ سکتے۔ پھر کہاں وہ "اراولی" اور "آبو" کی سرکش چوٹیاں۔ خسرو! تم چتوڑ کے سنگریزوں کو چھو بھی نہیں سکتے مگر تمہارا سلطان پہاڑوں کو اپنے قدموں پر جھکا سکتا ہے۔ ہم رانی پدمنی کو ٹھوکر مار کر اپنے راستے سے الگ کرنا نہیں چاہتے۔ ہماری تو خواہش ہے کہ راجپوت سورما اپنی آن کو ریزہ ریزہ ہوتے دیکھیں اور پھر ہمارے قہر کی آندھی ان ریزوں کو تاریخ کے اوراق پر بکھیر دے۔ ہم نے گردشِ روز و شب کو کبھی اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ ہماری تاریخ رقم کرے ہم تو خود ہی اپنی تاریخ لکھ رہے ہیں اور اس وقت تک لکھتے رہیں گے جب تک فرشتۂ اجل ہمارے ہاتھ سے قلم نہ چھین لے اور خوں رنگ روشنائی کو فرش پر نہ بہا دے۔"

دیوار و در پر سکوتِ مرگ طاری تھا اور اہلِ مجلس کے دل کی دھڑکنیں اس طرح سنائی دے رہی تھیں۔ جیسے سارے کے سارے دل سینے کی ہڈیاں توڑ کر باہر آ گئے ہوں۔ امید کی آخری کرن بھی بجھ گئی تھی اور پھر اسی اندھیرے کا قلب چیرتی ہوئی سلطان کی آواز دوبارہ ابھری۔

"نہیں خسرو! تمہارا سلطان اس قدر عاقبت نا اندیش اور بے خبر نہیں ہے۔ اپنے فرمانروا کے تدبر پر بھروسہ رکھو۔" علاء الدین خلجی نے تمام اراکین مجلس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "خسرو! یہ جنگ ایک عورت کیلئے نہیں لڑی جا رہی ہے۔ تم نہیں جانتے کہ ہمارے قہر کے کتنے رنگ ہیں؟ اور سچ تو یہ ہے کہ ہم خود بھی اپنے قہر کی انتہا سے واقف نہیں اگر ہم اپنے لب کسی گلاب کے چہرے پر رکھ دیں تو وہ ہمارے قہر کا متحمل نہ ہو سکے اور دیکھنے والے دیکھیں کہ گلاب جل اٹھا ہے اور اس کی پتیوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی ہیں۔ اگر ہم کبھی کسی نازنین کے پیکرِ سیمیں کو چھو لیں تو وہ بھی ہمارے قہر و جلال کی حرارت سے شمع کی مانند پگھلنے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے راکھ کا ایک ڈھیر ہو جائے۔ ہماری چشمِ تسخیر تو آبشاروں کو بھی خوں رنگ دیکھتی ہے ہم تو نسیم و صبا کی سرگوشیوں میں بھی موت کے نغمے سنتے ہیں تم ایک عورت کا ذکر کرتے ہو۔ نہیں خسرو! یہ تمہاری لغزشِ نگاہ ہے اور عراقی؟ تمہاری بینائی بہت کمزور ہو گئی ہے۔ اور خواجہ! تمہاری آنکھیں دھندلا گئی ہیں تم لوگ اپنے چہروں سے دس قدم آگے تک بھی دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے کہو کہ تم نابینا ہو' اور یہ بھی کہو کہ تم بے ہوش و بے خبر ہو' اور یہ بھی کہو کہ تم مزاجِ شاہ سے قطعاً نا آشنا ہو' اور یہ بھی کہو کہ تمہارے شکستہ بال و پر طوفانی فضاؤں میں اپنے سلطان کی بلند پروازی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔"
علاء الدین خلجی کے الفاظ نے شعلگی کی قبا پہن لی تھی اور لہجے کی حرارت سے پوری مجلس جل اٹھی تھی۔
تمام سپہ سالاروں اور مشیروں کے سر جھک گئے۔ علاء الدین خلجی کی فطرت بے نقاب ہو چکی تھی اور مزاج اس قدر برہم ہو گیا تھا کہ اب اسے اعتدال پر لانے والا کوئی نہیں تھا۔

"اے سلطنت خلجی کے وفا شعار خدمت گارو! ہم تمہیں کیا بتائیں کہ ہمارا قہر کیا ہے؟ ہم خود بھی نہیں جانتے کہ ہمارا اجلال کیسی کیسی شکلیں اختیار کرتا ہے اور اپنے دشمنوں پر حملہ آور ہونے کیلئے کیسے کیسے بہانے تراشتا ہے؟ پدمنی کی ذات بھی محض ایک بہانہ ہے۔ راگھو چیتن کہتا ہے کہ وہ عورت صرف ہمارے حرم کیلئے پیدا کی گئی تھی مگر رتن سنگھ نے اسے اپنے عشرت کدے کی زینت بنا لیا ہم جانتے ہیں کہ وہ فریب کار برہمن ہمارے قہر کی پناہ میں آ کر رتن سنگھ سے اپنی ذلت کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ ہمیں صرف ایک غضب ناک حکمراں سمجھتا ہے جسے کوئی بھی خوشامدی درباری آگ کے شعلے کی طرح بھڑکا سکتا ہے۔ وہ کیسا احمق ہے کہ ایک عظیم الشان سلطنت کے فرمانروا کو دل کے ہاتھوں میں کھیلنے والا ایک کھلونا قرار دیتا ہے۔ اسے خبر ہی نہیں کہ ہمارا دل بھی ہمارے قہر و جلال کا تابع ہے اس کی دھڑکنیں بھی ہمارے دماغ کی پابند ہیں۔ ہماری مرضی کے بغیر ہمارا دل بھی کسی کے گیسوؤں کا اسیر نہیں ہو سکتا۔ اگر کبھی ایسا ہو جائے تو ہم اپنے دل کو بھی سینے سے نکال کر پھینک دیں۔ اس لومڑی کو خود ہم نے ایک موقع فراہم کیا ہے کہ وہ شیروں کے نرغے میں کچھ دیر اچھل کود کر لے ہم تو اس تماشے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں کہ ایک کم ظرف اپنی ہی قوم کی ایک عورت کے حیاء سوز افسانے غیر مرد کو سنا رہا ہے۔ وہ بے غیرت راگھو چیتن ہمیں کیا سمجھے گا کہ ہم کون ہیں اور اپنے جاہ و جلال کے کتنے حوالے رکھتے ہیں۔"

"بے شک؟ شاہِ والا! بے شک۔" کئی آوازیں بیک وقت ابھریں حاضرین مجلس نے اپنی گردنیں جھکا دی تھیں اور زبانوں کو سلطان کی تعریفوں کیلئے وقف کر دیا تھا وہ جانتے تھے کہ اب علاء الدین کی سماعتیں کسی ایسے حرف کو قبول نہیں کریں گی جو اس کے منصوبے کی خلاف ورزی کرتا ہو۔
تاہم امیر خسروؒ کی ایک تنہا ذات تھی جس نے آخری وقت تک علاء الدین خلجی کو اس کے خوفناک ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"خسرو! ہم تمہاری ذہانت کے بھی قائل ہیں اور تمہاری وفاداریوں کو بھی بے داغ سمجھتے ہیں۔" اس وقت علاء الدین خلجی قدرے پرسکون نظر آ رہا تھا۔ "تمہارے اندیشے درست ہیں مگر پھر بھی ایک شاعر ہی کے اندیشے ہیں۔ تم نہیں جانتے کہ ہم ایک پیدائشی فاتح ہیں۔ پیدا کرنے والے نے ہماری تقدیر میں فتح کے سوا کوئی دوسرا لفظ تحریر نہیں کیا ہم تو شکست کے تصور سے بھی آشنا نہیں۔ یہ غلیظ خیال ہمارے ذہن میں کبھی نہیں ابھرا۔ چتوڑ کے محاذ پر بھی ہم شکست کا منہ نہیں دیکھیں گے۔ دوسرے لمحے کے بارے میں بزدل اور نکمے لوگ سوچتے ہیں۔ ہمارے لئے تو بس یہی ایک لمحہ ہے۔ یہ راز کوئی نہیں جانتا کہ ہمیں الہام ہوتا ہے اور اسی الہام نے ہمیں بتایا ہے کہ اراولی کی ساری چوٹیاں سجدہ ریزی کیلئے تیار کھڑی ہیں۔ بس انہیں ہماری آمد کا انتظار ہے۔ ہمارے قدم آگے بڑھیں اور وہ اپنی تمام تر بلندیوں کے ساتھ جھک جائیں۔" یہ کہہ کر علاء الدین خلجی چند ساعتوں کیلئے خاموش ہو گیا اور اپنی روشن و کشادہ آنکھوں سے اہلِ مجلس کو دیکھنے لگا جن کی گردنیں خم تھیں اور چہروں پر مصنوعی شادابی تھی۔
"خسرو! ہم نے تمہاری باتیں بہت غور سے سنیں۔ غلاموں کی تربیت کے فلسفے کو بھی سمجھا۔ مگر غلام تو اسی لئے پیدا کئے جاتے ہیں کہ وہ اپنے آقا کے ایک اشارے پر قربان ہو جائیں۔ یہی غلاموں کا سب سے بڑا اعزاز ہے اگر وہ اس اعزاز سے محروم رہ جائیں تو پھر انہیں غلام نہیں کہا جا سکتا۔ وہ حشرات الارض کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور پھر کوئی بھی حادثہ انہیں پامال کر کے بے نام و نشان بنا سکتا ہے۔ غلاموں کی حقیقی پہچان یہ ہے کہ وہ کس کے غلام ہیں؟ علاء الدین خلجی کے یا خوف و ہراس کے دائرے میں سمٹے ہوئے کسی کم ہمت حکمراں کے غلام۔ یقیناً وہ فاتح عالم کے غلام ہیں اور ان کی قیمتیں دنیا کے عام غلاموں

سے کہیں زیادہ ہیں ہمارے جاں نثاروں کو اس بات پر یقین کر لینا چاہئے کہ ہم اپنے نام لیواؤں کو ایک عورت کے گیسوئے خمدار پر قربان نہیں کریں گے اور تم خود بھی سمجھ لو کہ ایک نازنین کے لب و رخسار اتنے گراں بہا نہیں ہیں کہ ہم تم جیسے وفادارانِ سلطنت کو چتوڑ کی اجنبی وادیوں میں لے جا کر موت کے منہ کا ایک لقمہ بنا دیں۔ ہم نے آفریدی کو اس لئے نہیں بھیجا کہ وہ ہمارے لئے رانی پدمنی کے وصال کی بھیک مانگے۔ یہ تو ہمارے اقتدار کی ایک ادا ہے' سیاست کا ایک عجیب منصوبہ ہے جسے باشندگانِ ہند سمجھ سکتے ہیں اور نہ اہلِ چتوڑ۔ مگر تم لوگ ہمارے معتمد ہو اس لئے تمہیں جان لینا چاہئے کہ ہم نے بساطِ عشق کو بساطِ جنگ ہی سمجھا ہے ہم نے رتن سنگھ کو اس کے ناموس کی گالی دی ہے کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے اور اس سوراخ سے گھبرا کر باہر نکل آئے جسے وہ شیر کا غار سمجھتا ہے۔ وہ اول و آخر ایک چوہا ہے جسے چتوڑ کی محفوظ پناہ گاہ نے خود ساختہ شیر بنا دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے کلمات سن کر اس چوہے کی نیندیں حرام ہو گئی ہوں گی اور وہ پاگل ہو کر باہر آنے کیلئے بے قرار ہو گا۔ بس یہی وہ ساعتیں ہوں گی جب ہم چتوڑ کے سر سے اس کی آزادی کا تاج اتار لیں گے اور ہمیشہ کیلئے "اراولی" اور آبو کی گردن میں غلامی کا طوق ڈال دیں گے پھر یہ سربلند پہاڑ ہماری عظمتوں کے ترانے گائیں گے۔"

اہلِ مجلس حیرت سے اپنے سلطان کا رخِ تابناک دیکھ رہے تھے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ رانی پدمنی کا نادیدہ عاشق اپنی محبت کے پردے میں اس قدر خوفناک جنگی منصوبہ ترتیب دے چکا ہے۔

مجلس کا یہ سکوت بہت عارضی تھا اچانک علاء الدین خلجی اپنے سپہ سالاروں سے مخاطب ہوا۔

"خواجہ! تم اپنی صفیں درست رکھو کہ کل صبح ہم قصر ہزار ستون کو اس وقت تک کیلئے خیرباد کہہ دینا چاہتے ہیں جب تک قلعۂ چتوڑ پر "علائی پرچم" نہ لہرا جائے۔ اور عراقی! تم بھی ان جوانوں کو تیاری کا حکم دے دو جن کی شمشیروں کی کاٹ نرالی ہے اور جن کی شہسواری کے انداز ساری دنیا سے انوکھے ہیں۔"

خواجہ حاجی اور تاج الدین عراقی کے ساتھ دوسرے سپہ سالار بھی اٹھے۔ رخصتی آداب پیش کئے اور سلطان کی مجلسِ خاص سے اس طرح باہر نکلے جیسے ان کے قدم اراولی اور آبو کے ناہموار راستوں پر پڑے ہوں۔

☆..................☆..................☆

حضرت امیر خسروؒ بھی دیگر سپہ سالاروں اور مشیروں کے ہمراہ جانا چاہتے تھے مگر انہیں سلطان نے یہ کہہ کر روک لیا۔ "خسرو! تم کہاں جا رہے ہو ہم نے بہت دنوں سے تمہاری کوئی غزل نہیں سنی۔"

امیر خسروؒ اٹھ کھڑے ہوئے تھے مگر سلطان کا حکم سن کر دوبارہ بیٹھ گئے۔

"خسرو! چتوڑ ہماری سیاسی اور تجارتی ضرورت ہے اگر ہم اس علاقے کے راجپوتوں کی سرکوبی نہیں کریں گے تو پھر ہماری سلطنت کی یہ ہمہ گیری بھی برقرار نہیں رہے گی۔ ہمیں اقتدار کی وسعت کے ساتھ تجارت کا فروغ بھی درکار ہے۔ ہماری آنکھیں برسوں سے تسخیرِ عالم کا خواب دیکھ رہی ہیں مگر ہم اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ ابھی ہندوستان کے بعض گوشوں پر ہماری گرفت کمزور ہے۔ چتوڑ بھی ان ہی حساس علاقوں میں سے ایک ہے کہ اگر اسے بہت جلد مغلوب نہیں کیا گیا تو ہمارا خواب بکھر جائے گا۔ دیگر امرائے سلطنت سمجھتے ہیں کہ ہم رانی پدمنی کے جنون میں مبتلا ہیں۔ انہیں ایسا سمجھنے دو۔ خود ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہمارے قہرناک ارادوں پر حسن پرستی کا پردہ پڑا رہے مگر تمہیں تو جان لینا چاہئے کہ چتوڑ ہماری داستانِ اقتدار کا ایک ایسا صفحہ ہے جو اب تک علائی فتوحات کی کتاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دفترِ تسخیر میں جلد از جلد یہ صفحہ بھی جوڑ دیں۔"

"خادم سلطان کی سیاسی ضرورتوں کو سمجھتا ہے۔" امیر خسروؒ نے اعتراف کر لیا کہ قلعۂ چتوڑ کو قصر ہزار ستون سے جاری ہونے والے احکام کا پابند ہونا چاہئے۔

"خسرو! تم اپنے سلطان کے جذبوں کا پاس تو رکھتے ہو مگر ہماری تسکین کیلئے عملی قدم نہیں اٹھاتے۔" علاء الدین کی گفتگو کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی شخص اپنے قریبی ساتھی سے خفا ہو مگر اس خفگی میں بھی محبت کا رنگ شامل ہو۔

"خادم کو یاد نہیں کہ اس نے کبھی اپنے عمل میں کسی کوتاہی سے کام لیا ہو۔" امیر خسروؒ حیران ہو کر سلطان کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

"یہ کوتاہی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہماری درخواست اب تک حضرت شیخؒ کی سماعت سے نہیں گزری۔" علاء الدین خلجی نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنا مقصد بیان کیا اور پُرامید نظروں سے خسروؒ کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں آج رات ہی پیر و مرشد کی بارگاہِ جلال میں سلطان کی درخواست پیش کروں گا۔" بالآخر امیر خسروؒ راضی ہو گئے۔

"خسرو! حضرت شیخؒ کی جناب میں ہماری درخواست کس طرح پیش کرو گے؟" علاء الدین خلجی اچانک مضطرب نظر آنے لگا تھا۔ "تم جانتے ہو کہ چتوڑ کا قلعہ کیسے پرخطر مقام پر آباد ہے۔ راجپوت اپنے اس آہنی حصار پر ناز کرتے ہیں۔ انہیں اپنی اس پناہ گاہ پر غرور ہے۔ کئی حکمراں پتھر کی ان بلند دیواروں سے ٹکرا کر واپس لوٹ گئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا سلطان بھی نامرادوں کی صف میں کھڑا ہو اور آسمان کی آنکھ ذلت کا عبرتناک تماشا دیکھ رہی ہو۔ خسرو! وہ بڑا نازک وقت ہو گا علاء الدین اپنی شکست برداشت نہیں کر سکتا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ پھر تمہارے شاہ کا کیا حشر ہو ممکن ہے کہ قصیدہ لکھنے کے بجائے تم اپنے سلطان کا مرثیہ لکھو۔" یکایک علاء الدین خلجی بہت زیادہ شکستہ نظر آنے لگا تھا۔

"نہیں سلطان ایسا نہیں ہو گا۔" علاء الدین خلجی کی حالت دیکھ کر امیر خسروؒ بھی افسردہ و پریشان نظر آنے لگے تھے۔ "اس کائنات کا مالک میرے شیخؒ کی بہت سنتا ہے۔ اس نے میرے پیر و مرشد کی دعاؤں کو بابِ قبولیت سے کبھی واپس نہیں لوٹایا۔ انشاء اللہ! آپ کی فتوحات کا دامن داغدار نہیں ہو گا۔ آپ تو خانقاہ میں موجود نہیں ہوں گے مگر چشمِ تصور سے دیکھ لیجئے گا کہ خادم نے حضرت شیخؒ کے پائے مبارک پر اپنا سر رکھ دیا اور یہ سر اس وقت تک نہیں اٹھے گا جب تک محبوبِ الٰہی (حضرت نظام الدین اولیاءؒ) اپنا دستِ دعا فضا میں بلند نہیں کر دیں گے اور یہ نمک خوار اس وقت تک اپنے مرشد کا دامن نہیں چھوڑے گا جب تک دعائیہ کلمات سے حجرۂ شیخؒ کے دیوار و در نہیں گونج اٹھیں گے۔ آپ کی سرخروئی اور فتح مندی کیلئے آج کی شب اپنے شیخؒ سے سب کچھ مانگ لوں گا۔"

"ہاں! خسرو! ایسا ہی کرنا۔" علاء الدین کی بے قراری کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ "ہم تو خود اپنے قدموں سے چل کر بارگاہِ شیخؒ میں حاضر ہونا چاہتے تھے مگر کیا کریں کہ شیخؒ نے ہمارے پاؤں ہی کاٹ دیئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم خانقاہ میں داخل ہوئے تو شیخؒ اپنے مکان کے دوسرے دروازے سے نکل جائیں گے اور اگر ہم نے زیادہ تنگ کیا تو شیخؒ ہمارا ملک ہی چھوڑ دیں گے۔ خسرو! یہ کیسی مجبوری ہے کہ ہم حضور شیخؒ نہیں جا سکتے۔ کئی بار سوچا کہ اجازت کے بغیر ہی چلے جائیں مگر............" علاء الدین خلجی نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"نہیں سلطان معظم! ایسا کبھی نہ کیجئے گا۔" امیر خسرو نے گھبرا کر کہا۔ "آپ حضرت شیخؒ کے مزاج

سے واقف نہیں اگر خدانخواستہ یہ واقعہ پیش آ گیا تو ملک ہند بڑی سعادتوں سے محروم ہو جائے گا۔ "

"خسرو! ہم بھی یہی سوچ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ بارگاہ شیخ میں حضوری حاصل نہ ہونا ایک بدنصیبی ہے لیکن اس سے بڑی بدنصیبی یہ ہوگی کہ شیخ ہماری حدودِ مملکت سے نکل کر کہیں اور چلے جائیں گے۔ " علاء الدین خلجی نے اس قدر تاسف آمیز لہجے میں کہا کہ اس کے ایک ایک لفظ سے شدید حسرت ٹپک رہی تھی۔

"اسی لئے عرض کر رہا ہوں کہ یہ فاصلے بھی بہت غنیمت ہیں۔ " امیر خسروؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بے نیازی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "فاصلوں کو برقرار رہنے دیجئے کہ ان میں بھی قربت کا رنگ شامل ہے۔ " یہ کہتے ہوئے خسروؒ نے رخصت کی اجازت چاہی۔

"جاؤ خسرو! شیخ کی خدمت میں ہمارا سلام پیش کرنا اور عرض کرنا کہ اب کی بار بڑا معرکہ ہے اور علاء الدین بڑی دعاؤں کا سوالی ہے۔ "

☆..........☆..........☆

امیر خسروؒ کے جاتے ہی ملک کافور بے تکلفانہ انداز میں اندر داخل ہوا مگر سلطان نے اس کی طرف التفاتِ خاص کے ساتھ نہیں دیکھا۔ والئی ہند بہت تھکا تھکا نظر آ رہا تھا ملک کافور نے آگے بڑھ کر سلطان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو ملک ؟ " علاء الدین نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"غلام سے ایسا کونسا گناہ سرزد ہوا ہے کہ اب وہ رازدارِ شب نہیں رہا۔ " ملک کافور نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

"ہمیں تمہاری یہ ادا پسند نہیں آئی ملک۔ " سلطان کے لہجے سے جارحیت جھلکنے لگی تھی۔ "یہ بات ہمیں بہت گراں گزری ہے کہ تم نے ہمارے قدم آنسوؤں سے بھگو دیئے۔ ہم اس وقت خوش ہوتے کہ تمہاری آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگتیں اور ان کے اثر سے ہمارے پاؤں جل اٹھتے۔ "

ملک کافور مزاج شاہ کو برہم پا کر سیدھا ہو گیا۔ "غلام اس خونریز معرکے میں آقا کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ " ملک کافور کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

"نہیں ملک! ہم حالتِ جنگ میں اطلس و کمخواب کی قبا استعمال نہیں کرتے۔ آہن و فولاد کا کفن پہنتے ہیں۔ "

علاء الدین کی آواز قہر و غضب میں ڈوبی ہوئی تھی "آج کل موت ہماری راتوں کی شریک ہے اور وہی ہماری رفیق ہے اور وہی ہماری محبوب۔ "

ملک کافور نے شرم و ندامت سے سر جھکا دیا۔

"اور یہ جنگ سورماؤں کی جنگ ہے 'غیرت مندوں کا معرکہ ہے اور جاں فروشوں کی آزمائش ہے۔ اس جنگ میں وہ لوگ شریک نہیں ہو سکتے جن کی پشت زخموں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ تو ان مردانِ شجاع کی بازی گاہ ہے جن کے دل آتشِ انتقام میں جل رہے ہیں اور جن کے سینوں پر خوں رنگ نقش و نگار روشن ہیں۔ " یہ کہہ کر سلطان نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

ملک کافور الٹے قدموں سلطان کی خلوتِ خاص سے نکل گیا۔ اس کی ذلت آمیز خوشامد رائیگاں گئی تھی اور یہ حقیقت ظاہر ہو چکی تھی کہ وہ چتوڑ کے سفر میں سلطان کی قربت حاصل نہیں کر سکے گا۔

☆..........☆..........☆

وہ رات ملک کافور پر بہت گراں تھی۔ سلطان نے ایک بار پھر حقیقت کے آئینے میں اسے اس کی شکل دکھا دی تھی مگر وہ بے حیائی کی اس منزل پر کھڑا تھا جہاں پہنچ کر انسانی خون کی حرارت ختم ہو جاتی ہے۔ ملک کافور کا خون بھی سرد ہو گیا تھا۔ اسے سلطان کی زبان سے ادا ہونے والے کلمات کا احساس نہیں تھا اگر کوئی فکر تھی تو اس بات کی کہ اگر آفریدی زندہ ہوا اور سلطان تک پہنچ گیا تو پھر کیا ہو گا ؟ اس خیال نے ملک کافور کو بدحواس کر دیا تھا۔ یکایک وہ بری طرح چیخا اور اس نے نورالدین نورا کو آواز دی۔

"حضور! " نورا کی آواز لرز رہی تھی۔

"تجھے معلوم ہے کہ کل صبح سلطان کا لشکر چتوڑ روانہ ہو رہا ہے ؟ " ملک کافور نے غضبناک لہجے میں کہا۔

"غلاموں کو کیا پتہ کہ شاہوں کے کیا ارادے ہیں ؟ " نورا نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے جیسے وہ اپنی زندگی کی امان مانگ رہا ہو۔

"ہاں! کل سورج کی پہلی کرن کے نمودار ہوتے ہی شاہی لشکر کوچ کر جائے گا۔ " ملک کافور نے نورا کو بتایا۔ "تو بھی اس لشکر میں شامل ہو جا پھر جب سلطان کے فاتح سپاہی چتوڑ میں داخل ہو جائیں تو اس بات پر نظر رکھ کہ آفریدی کہاں ہے ؟ اس سے پہلے کہ آفریدی 'سلطان تک پہنچے 'اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دے۔ "

"مگر حضور.......... " نورا گڑگڑایا۔

"ہم جانتے ہیں کہ وہ مر چکا ہے لیکن پھر بھی ہمیں اسے زندہ سمجھنا چاہئے۔ " ملک کافور نے نورا کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "ہم نے بہت کوشش کی تھی کہ ہم کسی طرح سلطان کے ہمراہ چتوڑ چلے جائیں مگر قسمت نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ اب یہ تیری ذمہ داری ہے کہ تو ہمارے وفادار سپاہیوں کے ساتھ مل کر آفریدی کو تلاش کر۔ "

نورا نے سر جھکا دیا اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔

"اور یاد رکھنا کہ جب چتوڑ کی فوجیں شکست کھا جائیں اس وقت ہمارے سپاہی لوٹ مار میں شامل ہونے کے بجائے آفریدی کی جستجو کریں وہ ہنگامہ خیز وقت ہمارے منصوبے کی تکمیل کیلئے بہترین وقت ہو گا '"

نورا پیچھے ہٹتے ہٹتے دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"اور یہ بھی یاد رکھنا کہ ہم اپنے وفاداروں کو مایوس نہیں کرتے۔ " ملک کافور سلطان کے لہجے میں بول رہا تھا۔ "ہم تمہارا خالی دامن اس طرح بھر دیں گے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بس اب جاؤ اور شاہی لشکر میں اس انداز سے شامل ہو جاؤ کہ جیسے تم ہمارے نہیں سلطان کے وفادار ہو۔ "

☆..........☆..........☆

برصغیر کی تاریخ میں وہ اسلامی فتوحات کا بڑا عجیب اور لرزہ خیز باب ہے جسے سلطان علاء الدین خلجی نے جمادی الاول 702ھ میں لکھنا شروع کیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ سلطان رجب 702ھ میں ایک لشکر جرار لے کر اپنے رنگارنگ محل "قصر ہزار ستون" سے نکلا تھا اور پھر دلی سے باہر قدم رکھتے ہی اس نے اپنی شمشیر کو فضا میں لہراتے ہوئے کہا تھا۔

"ہم نے بہت چاہا کہ جمنا کے پانی کی طرح بریج اور گمبھیری کا پانی بھی صاف و شفاف رہے مگر ہوش و خرد سے محروم راجپوت چاہتے ہیں کہ ان کے دونوں دریا انسانی خون سے سرخ ہو جائیں۔ ہماری خواہش تھی کہ تلواروں کی جھنکار سے امن کی راگنیاں پھوٹیں مگر چتوڑ کے حکمرانوں نے ہمارے جذبوں کا احترام نہیں

کیا۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ شمشیرزنی کے جوہر دکھاتے دکھاتے ہمارے بازو شل ہو چکے ہیں۔ افسوس! وہ بہت بے خبر اور نادان ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہمارے اعصاب تھک گئے ہیں اور ہم نقارۂ جنگ کی آواز سننے کی بجائے کوئی خواب آور ساز سننا چاہتے ہیں۔ صد حیف! وہ بہت جاہل ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ ہم نغمۂ قہر کے سوا کچھ سننا ہی نہیں چاہتے۔ ہم نے تو چنگ و رباب کیلئے اپنی سماعتوں کے دروازے محض اس لئے کھول دیئے تھے کہ کہیں آنے والا وقت ہمیں سنگ و آہن کا انسان نہ کہے لکھنے والے یہ نہ لکھیں کہ سلطان کو جنگ و جدل کے علاوہ کسی چیز سے رغبت ہی نہیں تھی۔ ہم نے لوگوں کے امن و سکون کی خاطر اپنی عادت بدل ڈالی تھی اپنے مزاج کو تبدیل کر لیا تھا مگر اہل چتوڑ بڑے احسان فراموش ہیں۔ ان لوگوں نے ہمارے الطاف و کرام کا شکر ادا نہیں کیا۔ اور ہم ایسے ناشکروں کو معاف نہیں کرتے۔ "

یہ کہہ کر سلطان گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے مڑا اور اپنی شمشیر بے نیام کا رخ قصر ہزار ستون کی طرف کر دیا پھر بلند آواز میں کہنے لگا۔

"اے ارضِ دلی! ہمارا انتظار کر کہ یہ چند روزہ سفر ہے۔ ہم عنقریب اس طرح واپس آئیں گے کہ ہمارا چہرہ فتح و نصرت کے جلال سے سرخ ہو رہا ہو گا اور سرزمین چتوڑ ہمارے حکم کے تابع ہو چکی ہو گی۔ "

ان الفاظ کی گونج میں سلطان کا لشکر آگے بڑھا۔ ہر سپاہی اپنی جگہ مطمئن تھا کہ وہ وادیٔ فنا کی طرف جا رہا ہے اور اس سفر میں واپسی کے امکانات بہت کم باقی رہ جاتے ہیں اس لئے ہر مسلمان فوجی کے جذبے ہی کچھ اور تھے۔ گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتے ہی سلطان کے ہر لشکری نے موت کو اپنے اوپر مسلط کر لیا تھا اور وہ خیالوں کی دنیا میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا گھوڑا اپنی حدودِ مملکت میں کسی ہموار راستے پر محو خرام نہیں۔ اراولی اور آبو کی چوٹیوں پر دوڑ رہا ہے اور ہر طرف خوفناک آوازیں گونج رہی ہیں۔ گھوڑے کے سموں اور چٹانوں کے تصادم سے پیدا ہونے والی آوازیں۔

لشکر کی روانگی سے پہلے برہمن راگھو چیتن نے بھی سلطان کی بارگاہِ جلال میں حاضر ہو کر عرض کیا تھا۔

"سمراٹوں کے سمراٹ علاءالدین خلجی کو یہ سفر مبارک ہو مگر حضور کے قدم ان پر پیچ راستوں سے نا آشنا ہیں۔ "

"پھر؟" سلطان نے غضب ناک لہجے میں سوال کیا تھا۔

"اگر حضور مجھے اس سفر میں ہمراہ لے چلیں تو میں راستے کے بے شمار کانٹے اپنی پلکوں سے صاف کر دوں گا۔ " راگھو چیتن اپنی زبان کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس لئے سلطان سے شاعرانہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔ "میں قلعہ چتوڑ کے کئی خفیہ راستوں سے واقف ہوں۔ میری رہنمائی ایک اجنبی دیار میں سلطان کیلئے بہت سود مند ثابت ہو گی۔ "

راگھو چیتن کی دلیل معقول تھی مگر سلطان نے بڑی حقارت سے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ "دیگر جنگلی درندوں کا کیا ہوا شکار تو کجا ہم اپنے ہی ہم جنس کسی شیر کے مارے ہوئے جانور کو بھی کھانا پسند نہیں کرتے۔ " علاءالدین خلجی کا جلال اس شعلے کی مانند تھا جو بھڑکتے بھڑکتے بے قابو ہو گیا ہو۔ "کیا تو چاہتا ہے کہ ہماری عظیم الشان فتح ایک عیار برہمن کی سازباز کا نتیجہ ٹھہرے اور تاریخ ہمارے حملے کا ذکر کرتے ہوئے یہ غلیظ عبارت تحریر کرے کہ فاتح عالم کی فوجیں چتوڑ پر یلغار کر رہی تھیں اور رتن سنگھ کے دربار سے ٹھکرایا ہوا برہمن' سلطان کو اپنے گھر کے بھید بتا رہا تھا۔ نہیں راگھو! ہم اس ذلت و رسوائی کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔ ہم نے آج تک جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ہماری ذاتی صلاحیتوں کا ثمر ہے۔ ہماری ساری فتوحات بے داغ ہیں۔ ہم تسخیرِ چتوڑ کو بھی دوسروں کے احسانات سے پاک رکھنا چاہتے ہیں۔ "

ادھر شاہی لشکر کا پرچم تیز ہوا میں لہرا رہا تھا اور اس کا رخ بار بار چتوڑ کی جانب ہو جاتا تھا جس سے سلطان کے بعض سپاہی پیش گوئی کر رہے تھے کہ راجہ رتن سنگھ کو اس معرکہ آرائی میں شکست فاش ہو گی اور علاءالدین خلجی ایک یادگار فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ سلطان سے لے کر ایک عام لشکری تک ہر شخص مطمئن تھا اور ہر آنکھ میں امیدوں کے نئے چراغ روشن تھے۔ مگر دوسری طرف چتوڑ میں جبر و تشدد کی ہوائیں مہامنتری وکرم سنگھ کی زندگی کا چراغ بجھانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھیں۔

وکرم سنگھ کو ایک خفیہ تہہ خانے میں قید کر دیا گیا تھا اور اس سے مسلسل بازپرس جاری تھی۔

"نمک حرامی کی کتاب میں نئے باب کا اضافہ کرنے والے وکرم سنگھ! دیوتا مرنے سے پہلے تیرا چہرہ سیاہ کر دیں اور تیرے جسم کو نرک کے اژدھوں کی خوراک بنا دیں۔ " راجہ رتن سنگھ بوڑھے وکرم سنگھ کے چہرے کو اپنی ٹھوکروں کا نشانہ بناتے ہوئے چیخ رہا تھا۔ "اب بھی وقت ہے تو راج دوت کو ہمارے حوالے کر دے اور ان اذیت ناک سزاؤں سے نجات حاصل کر لے کون جانے کہ آنے والا لمحہ ہمارے مزاج کو کس قدر برہم کر دے اور پھر تیری زندگی اہل چتوڑ کیلئے لعنت کا ایک نشان بن کر رہ جائے۔ "

رانی پدمنی بھی اس وقت تہہ خانہ میں موجود تھی۔

"رتن سنگھ! میں تو اپنے انجام کو پہنچ چکا۔ " شدید زخمی ہونے کے باوجود وکرم سنگھ کی آواز سے اب بھی راجپوتوں کا وہی جلال نمایاں تھا۔ "اپنی فکر کر کہ میری زندگی کے دن تو پورے ہو گئے۔ میری یہ سزائیں بہت حقیر ہیں اپنے دستِ ستم کو جتنا چاہے دراز کر لے مگر وہ میرے گریبان تک نہیں پہنچ سکتا۔ میرے بدن کے کپڑے کا ایک ایک تار نوچ لے مگر میں پھر بھی برہنگی کے الزام سے محفوظ رہوں گا۔ برہنہ تو وہ ہوتے ہیں جو ظلم اور گمراہی کے ہاتھوں اپنے ضمیر بیچ دیتے ہیں۔ پھر ان کے غلیظ جسم ہزار ریشمی قباؤں میں لپٹ کر بھی برہنہ ہی رہتے ہیں۔ میری دھندلی آنکھیں زنداں کے اس اندھیرے میں بھی تیرا کوڑھ زدہ جسم دیکھ رہی ہیں۔ تیری روح پہلے ہی سڑ چکی تھی اب تیرا بدن بھی آہستہ آہستہ گل رہا ہے۔ بس کچھ دیر کی بات ہے کہ تیرے ظلم کی کوکھ سے پیدا ہونے والے عذاب کے زہریلے کیڑے تیرا گوشت چاٹ لیں گے۔ اور تیری ہڈیوں میں سوراخ کر دیں گے۔ " وکرم سنگھ کے دل میں نفرتوں کا جس قدر زہر بھرا ہوا تھا وہ سب ہونٹوں کے راستے باہر آ رہا تھا۔

"بے غیرت انسان! عذاب تجھ پر نازل ہو رہا ہے یا مجھ پر؟" راجہ رتن سنگھ نے مہامنتری کے چہرے پر ایک اور زوردار ٹھوکر لگائی۔

"عذاب تو تجھی پر نازل ہو گا۔ " وکرم سنگھ نے کراہتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی گمراہی کے دور میں سارے عذاب جھیل چکا۔ اب میرے لئے کوئی عذاب نہیں ہے۔ راحت ہے' اطمینان ہے' بے اندازہ سرور ہے اور ناقابل بیان خوشی ہے۔ میں تو ہر حال میں فاتح ہوں تو ایک شکست خوردہ انسان ہے۔ ذلت و رسوائی کا نشانہ لعنت و ملامت کا ہدف۔ " وکرم سنگھ دنیا کے ہر خوف سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اب موت کا تصور بھی اسے ڈرانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

"یہ حقیر کیڑا بہت دیر سے ہمارے پیروں کے نیچے کلبلا رہا ہے۔ ہم اسے کچل دینا چاہتے ہیں مگر ہر بار تمہاری نسبت ہمارے ارادوں کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ آپ حکم دیں تو آج ہم اسے اس کی حیثیت بتا دیں۔ " راجہ رتن سنگھ نے قہر آلود لہجے میں رانی پدمنی سے پوچھا۔

"نہیں سمراٹ! آپ اس غدار مذہب و وطن کے خون سے اپنے دامن کو ناپاک نہ کریں۔ " رانی پدمنی کی رعونت بھی اپنے عروج پر تھی اور اس نے تمام خونی رشتوں کو جھٹلا دیا تھا۔ وہ اس شخص کو پہچاننے

سے انکار کر رہی تھی جو اس کا چچا تھا اور جس نے باپ کے مرنے کے بعد اسے اپنی بیٹی نرملا سے بھی زیادہ چاہا تھا۔ اب اسی کا خون ناپاک ٹھہرا تھا اور وہ اقتدار کی ٹھوکروں میں اس طرح پڑا تھا جیسے کوئی درماندہ بھکاری۔

"سمراٹ! اسے زنداں کی تاریکیوں میں اسی طرح سانس لینے دیجئے۔ اس کیلئے یہی سزا کافی ہے کہ یہ ہمارے رحم و کرم کی بھیک پر زندہ رہے۔ ایک دن یہی احساس غلامی اسے مار ڈالے گا۔"

"میں کسی کے رحم و کرم پر زندہ نہیں رہا۔" اچانک قید خانے کی پرہول فضا میں وکرم سنگھ کی آواز ابھری۔ زخموں کی شدت سے اس کا لہجہ شکستہ تھا مگر آواز میں گداگری یا غلامی کا رنگ شامل نہیں تھا۔

"ہاں! میرا آخری سفر قریب ہے۔ شاید میں آج ہی دنیا سے رخصت ہو جاؤں لیکن اس طرح نہیں جاؤں گا کہ چتوڑ کی تاریخ میرے احسانات کو جھٹلا دے۔ اگر لکھنے والوں نے میرے نام کے ساتھ بددیانتی کی تو قلعے کے بام و در پکار اٹھیں گے کہ ان کی بنیادوں کو کس نے اپنا خون پلایا ہے؟ بے ضمیر انسانوں کے ہجوم خاموش رہے تو شاہراہیں چیخیں گی کہ کبھی ادھر سے وکرم سنگھ گزرا کرتا تھا۔ وہ وکرم سنگھ جس نے راستوں کے کانٹے ہٹا کر انہیں گلزار بنانا چاہا اور اسی کشمکش میں مارا گیا اگر شاہراہیں بھی پامال کر دی گئیں اور ان کی زبانوں کو روند ڈالا گیا تو برہج اور گمبھیری کا آزاد و شفاف پانی بولے گا کہ چتوڑ کے کھیتوں کو سرسبز و شاداب رکھنے کیلئے وکرم سنگھ نے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ دیا مگر افسوس کسی نے اس کے خون کی قدر نہیں کی۔ اگر برہج اور گمبھیری کے لب بھی سی دیئے گئے تو چتوڑ کی فضائیں میری وفاؤں کے ترانے گائیں گی کہ وکرم سنگھ کیسا زمین دوست اور کیسا وطن پرست تھا؟ مجھ سے زیادہ اپنی دھرتی سے محبت کرنے والا کون ہے؟ کوئی نہیں کوئی نہیں۔" یہ کہتے کہتے وکرم سنگھ کی آواز لرزنے لگی تھی اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

"چلیں سمراٹ! یہ بوڑھا پاگل ہو گیا ہے۔" رانی پدمنی نے ایک بار پھر احترام و آداب کے سارے رشتے توڑ ڈالے تھے۔

"پدمنی! میری بیٹی! میں نے تیرے باپ سے عہد کیا تھا کہ میں گرم ہوا کے کسی جھونکے کو تیری طرف نہیں آنے دوں گا۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو اپنا سینہ سامنے کر دوں گا۔ چاہے اس کشمکش میں میرا پورا بدن جھلس جائے لیکن میں تجھے بچانے کی کوشش کروں گا۔ میرے بھائی کی نافرمان اور سرکش نشانی! اپنے چچا کی طرف نظر کر کہ وہ سر سے پاؤں تک سازشوں کی آگ میں جل اٹھا ہے۔"

"مجھ پر تیرا کوئی احسان نہیں۔" رانی پدمنی کے لہجے میں وہی نفرت و حقارت تھی۔ "یہ میرا ہی کرم ہے کہ جس کے سہارے تو اب تک زندہ ہے۔ اگر میں تیری طرف سے اپنی چشم عنایت پھیر لیتی تو تیرے غدار جسم کو چتوڑ کے گلی کوچوں میں کھینچا جا رہا ہوتا اور لوگ تیرے سیاہ چہرے پر تھوک رہے ہوتے مگر میں نے تجھے صرف اپنے باپ کے حوالے سے بچا لیا ورنہ تیری غداریوں کی سزا بڑی دردناک ہوتی وکرم سنگھ!"

"بیٹی! میں تجھ سے اپنی زندگی کی بھیک نہیں مانگ رہا ہوں۔" ایسے اذیت ناک لمحوں میں بھی وکرم سنگھ کو اپنے خون کی محبت پریشان کر رہی تھی۔ "میں اپنے وطن کا غدار نہیں ہوں مگر مجھے بے جان دیوتاؤں سے نفرت ہے۔ میں نے ان پتھروں سے بغاوت کی ہے۔ میرے عظیم خاندان کی نادان وارث! میری بغاوت کو سمجھنے کی کوشش کر۔ آخر وہ کونسی خوشی ہے جسے حاصل کرنے کیلئے میں نے دنیا کی ہر دولت ٹھکرا دی؟ زرنگار محلوں کو چھوڑ کر زنداں کی تاریکیوں میں چلا آیا۔ آخر کیوں؟ موت میرے سر پر کھڑی ہے مگر میں اپنے باغیانہ جذبوں کو نہیں چھوڑتا۔"

"دیوتاؤں نے تجھ سے تیری عقل چھین لی ہے۔" رانی پدمنی نے اسی تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

"اب بھی وقت ہے میں سب کچھ فراموش کر کے تیری خاطر خود دلی جا سکتا ہوں مجھے یقین ہے کہ میں سلطان کے قہر و غضب کی آگ بجھا کر چتوڑ واپس آؤں گا۔" مہامنتری وکرم سنگھ نے اپنے جذبہ وطن پرستی سے مجبور ہو کر سب کچھ گوارہ کر لیا تھا۔

"دیوتاؤں کی قسم! میں نے آج تک اتنا حیلہ ساز انسان نہیں دیکھا۔" رانی پدمنی دروازے کے قریب کھڑے کھڑے برسنے لگی۔ "دلی جانا چاہتا ہے کہ اس طرح چتوڑ سے فرار ہو جائے اور ریاست کے فوجی راز بیچ کر اقتدار حاصل کر لے۔ آخر تیری ناپاک خواہش زبان پر آ ہی گئی مگر میں تیرے گھناؤنے ارادوں کو تکمیل تک نہیں پہنچنے دوں گی۔ اب تجھے ایک ہی شرط پر زندگی کی بھیک دی جا سکتی ہے کہ تو آفریدی اور نرملا کا پتہ بتا دے۔"

"یہ ممکن نہیں مہارانی چتوڑ! میری زندگی میں بھی نہیں اور میری موت کے بعد بھی نہیں۔ میرے وہ دونوں بچے تیری پہنچ سے بہت دور ہو چکے ہیں۔" وکرم سنگھ کا لہجہ ایک بار پھر تلخ ہو گیا تھا۔ "ان ہی کو بچانے کیلئے میں نے یہ سارے آزار جھیلے ہیں۔"

"آیئے سمراٹ! دیوتاؤں کے کرم سے یہ پاکھنڈی قبل از وقت بے نقاب ہو گیا۔" یہ کہتے ہوئے رانی پدمنی قید خانے کے دروازے سے باہر نکل گئی۔

"وکرم سنگھ! ابھی تیری سزا ختم نہیں ہوئی ہے۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ تو مجھ سے میرے رحم کی بھیک مانگے گا اور میں اپنے دونوں ہاتھوں کو بند کر لوں گا۔" راجہ رتن سنگھ نے کہا اور غلامانہ انداز میں اپنی بیوی کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔

تنہائی ہوتے ہی وکرم سنگھ نے زنداں کے فرش پر اپنا سر رکھ دیا۔ "اے خدا! تو میری قوم کو ہدایت دے کہ یہ سب نادان اور بے خبر ہیں۔" وکرم سنگھ بے اختیار رو رہا تھا۔ "میرے وطن کے سربلند پہاڑوں کو سرنگوں ہونے سے بچا لے کہ یہ وکرم سنگھ کے آباؤ اجداد کی نشانی ہیں۔ چتوڑ کے سبزہ زاروں کو خاکستر ہونے سے محفوظ رکھ کہ یہ میرے باپ دادا کا سرمایہ ہے۔ یہ میری وادیاں ہیں میرے کوچے ہیں میری گلیاں ہیں' میرے ہم وطنوں کو بھی اس دولت سے محروم نہ رکھ۔" وکرم سنگھ عجیب ذہنی کشمکش کا شکار تھا۔ وہ مسلمان ہو چکا تھا مگر ایک بت پرست قوم کی عافیت کیلئے دعائیں مانگ رہا تھا اور یہ دعائیں اس غیر معمولی محبت کا نتیجہ تھیں جو اسے اپنے وطن اور اہل وطن سے تھی۔ وکرم سنگھ فطرتاً ایک دردمند اور حساس انسان تھا اور اس کے دل کی یہی کیفیت اسے اہل چتوڑ سے نفرت کرنے کے بجائے محبت کا آخری پیغام دینے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اہل وطن بھی اس کی طرح بتوں کی پرستش چھوڑ کر ایک خدا پر ایمان لے آئیں اور اگر ایمان نہ لا سکیں تو کم سے کم علاء الدین خلجی کے قہر و غضب سے محفوظ رہیں۔ وہ کسی طرح بھی اہل چتوڑ کی تباہی نہیں چاہتا تھا اور یہی جذبہ اس کی محبتوں کا امین تھا مگر ایسی محبت جسے سمجھنے والا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا۔ شدید اذیت و کرب کے عالم میں وہ اپنا سر فرش پر مارتا رہا اور زنداں کے پرہول سناٹے میں بس ایک ہی صدا گونجتی رہی۔

"اے خدا! اے خدا! میں کیا کروں؟ مجھے روشنی دے مجھے راستہ دکھا۔"

☆..................☆..................☆

قید خانے سے ناکام و نامراد واپس لوٹنے کے بعد رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ اپنے خصوصی کمرے میں سر جوڑے بیٹھے تھے اور ان کے چہروں کی شادابی رخصت ہو چکی تھی۔ "اب کیا ہو گا مہارانی؟" راجہ رتن سنگھ فرط اضطراب میں کھڑا ہو گیا اور سرخ قیمتی قالین کو اپنے پیروں سے رگڑنے لگا۔

"وہ دونوں منتری بھون میں موجود ہیں۔" رانی پدمنی نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ "وکرم سنگھ نے انہیں کسی محفوظ جگہ چھپا دیا ہے۔ شاید کسی زیرِ زمین تہہ خانے میں۔ وقت تیزی سے گزرتا جارہا ہے آج رات یا زیادہ سے زیادہ کل صبح ہوتے ہی نرملا ہمارے قبضے میں ہونا چاہئے۔ اب یہی ایک صورت ہے کہ ہم علاءالدین کو دلی تک محدود رکھ سکتے ہیں۔ ہمیں نرملا کو آراستہ کر کے سلطان کی خدمت میں بھیجنا ہی ہوگا۔ یہی وہ تدبیر ہے جو سلطان کی ہوس کے طوفان کو بھی روک سکتی ہے اور ہم نرملا کو شاہی عشرت کدے میں فروخت کرکے وکرم سنگھ سے اپنی ذلت کا انتقام بھی لے سکتے ہیں۔"

"یقیناً! مہارانی یقیناً! ہم آپ کے حسنِ تدبر کے قائل ہیں مگر نرملا کماری ہے کہاں ؟"

"ریاست کے تمام تیشہ زنوں کو طلب کر لیجئے اور حکم دیجئے کہ وہ منتری بھون کا فرش توڑ کر پانی نکال لیں۔" رانی پدمنی اپنے منصوبے پر فوری عمل چاہتی تھی۔ حکمرانوں کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ بہت پُر تاثیر ہوتے ہیں۔ رانی پدمنی کی ایک جنبشِ لب نے منتری بھون کی شکل ہی بدل ڈالی آن کی آن میں تمام فانوس روشن کر دیئے گئے اور اس روشنی میں ریاست کے سیکڑوں ماہر تیشہ زنوں نے وکرم سنگھ کی جاگیر کی بنیادیں کھودنا شروع کر دیں۔ جب منتری بھون میں کسی تہہ خانے کا سراغ نہیں ملا تو پھر سنگ سرخ سے بنے ہوئے فرش پر تیشہ زنی شروع ہوگئی۔ رات کے سناٹے میں گونجنے والی آوازیں بڑی عجیب تھیں۔ پتھروں اور تیشوں کے تصادم سے پیدا ہونے والی چنگاریاں اس آتش بازی کا منظر پیش کر رہی تھیں جو بجھنے کے قریب ہو یا رہ رہ کر بھڑک رہی ہو۔ تیشہ زنوں کے جسم پسینے میں تر تھے اور چہرے مایوسی کی آگ میں جلتے جلتے دھواں ہوگئے تھے۔ نگراں سپاہیوں کی گردنیں بھی اسی طرح لٹکی ہوئی تھیں جیسے وہ ان کے کاندھوں کا بوجھ بن گئی ہوں۔

رات کے سناٹے میں تیشوں کی آوازیں دور تک گونج رہی تھیں۔ وکرم سنگھ کا زیرِ زمین طلسم کدہ بھی ان کی آوازوں کی دھمک سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اگرچہ سات تہہ خانوں تک پہنچتے پہنچتے یہ آوازیں بہت مدہم ہوگئی تھیں لیکن پھر بھی طلسم کدے میں قیدیوں کی سی زندگی گزارنے والے چاروں افراد ان آوازوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی ملازمہ رامیشوری' نرملا کماری کے برابر دوسرے کمرے میں سو رہی تھی اور چندر سنگھ' علی عامر آفریدی کے کمرے میں محوِ خواب تھا۔ نرملا کماری تنہا تھی اور اس وقت بھی جاگ رہی تھی۔ ماضی کی پریشان کن یادیں اسے سونے ہی نہیں دیتی تھیں۔

دوسری طرف علی عامر آفریدی بھی آنکھیں بند کئے ماضی کی خوشگوار یادوں اور حال کی تلخیوں میں گم تھا۔ اس نے آوازیں سنیں تو گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ آفریدی حیران رہ گیا۔ اسے اس بات پر یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ دوبارہ ہر چیز کو صاف صاف دیکھ سکتا ہے۔ گم ہو جانے والی بینائی یکایک لوٹ آئی تھی کئی دن سے اسے دھندلے سائے نظر آرہے تھے۔ مگر اس وقت دفعتاً اس کی دونوں آنکھیں روشن ہوگئی تھیں۔ جوشِ مسرت میں وہ اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن اسے فوراً بستر پر لیٹ جانا پڑا کہ زخموں کی فصل مشقت کی اس تیز دھوپ کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ آفریدی نے لیٹے لیٹے ان آوازوں کو سنا جب ان کے تسلسل میں کوئی کمی نہیں آئی تو وہ چندر سنگھ کو پکارنے پر مجبور ہوگیا۔

چندر سنگھ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ "سردار! کیا آپ نے مجھے آواز دی ؟"

"غور سے سنو! یہ کیسی آوازیں آرہی ہیں ؟" آفریدی نے پہلی بار چندر سنگھ کا سرخ چہرہ دیکھا جس سے شجاعتِ مردانگی کا اظہار ہوتا تھا۔

چندر سنگھ ان آوازوں کی طرف متوجہ ہوگیا جو بہت دور سنائی دے رہی تھیں۔ طلسم کدے میں بند

ہونے کے سبب آوازوں کا پہچاننا مشکل تھا مگر کچھ دیر بعد چندر سنگھ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ جیسے کسی چیز کو کھودا جارہا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ پریشان ہوگیا۔ "سردار! ایسا محسوس ہوتا ہے منتری بھون کی دیواریں ڈھائی جارہی ہیں۔" یہ کہتے کہتے چندر سنگھ کھڑا ہوگیا۔ "مجھے راج کماری کو خبر دینا چاہئے کہ یہ بہت سنگین معاملہ ہے۔"

آفریدی نے اسے روکنا چاہا آدھی رات کے وقت نرملا کی نیند میں خلل ڈالنا مناسب نہیں مگر چندر سنگھ یہ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا کہ انہیں ہر گزرنے والے لمحہ سے باخبر رکھنا ضروری ہے۔ چندر سنگھ نے ملازمہ رامیشوری کو جگایا اور پھر جب رامیشوری' نرملا کے کمرے میں داخل ہوئی تو نرملا پوری طرح بیدار تھی۔

"ہاں! میں ان آوازوں کو سن رہی ہوں۔" نرملا نے مطمئن لہجے میں کہا۔ "چندر سنگھ سے کہو کہ وہ پریشان نہ ہو۔ راجہ رتن سنگھ ہماری تلاش میں ہے اور وہ ہمیں پانے کیلئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ منتری بھون کو مسمار بھی کیا جا سکتا ہے۔"

رامیشوری کچھ دیر تک انتظار کرتی رہی کہ شاید راج کماری کچھ اور کہے مگر جب نرملا کے ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوئی تو وہ لرزتے قدموں سے واپس آگئی اور اس نے چندر سنگھ کو اپنی آقازادی کے الفاظ منتقل کر دیئے۔ چندر سنگھ نے آفریدی کو صورتحال سے آگاہ کیا پھر وہ دونوں رات بھر جاگتے رہے اور آوازیں مسلسل سنائی دیتی رہیں۔

☆..........☆..........☆

اسی رات کوہ آبو پر بمل شاہ کے مندر میں مائی بھان متی اپنی خادمہ کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھی۔ "تو سمجھتی ہے کہ میں تیری سازشوں سے بے خبر ہوں ؟"

خادمہ' بھان متی کے جلال سے کانپنے لگی۔

"میں جانتی ہوں کہ تیرا شوہر نارائن داس' راجہ رتن سنگھ کا جاسوس ہے اور تیرے ذریعے یہاں کی ساری باتیں راج محل تک پہنچ جاتی ہیں۔" مائی بھان متی کی آواز شعلہ ریز ہوگئی تھی۔ "کل تو نے چند ٹکڑوں کی خاطر میرے اعتماد کا خون کیا مگر آج میں تجھے اجازت دیتی ہوں کہ اپنے پتی سے سب کچھ کہہ دے۔ اسی وقت چلی جا اور نارائن داس سے کہہ دے کہ چتوڑ کی تباہی کا آغاز ہوگیا۔ عذاب کی جس ساعت کا انتظار تھا وہ آسمان سے نازل ہو چکی۔ اپنے ان داتا راجہ رتن سنگھ کو خبر کر دے کہ علاءالدین خلجی آرہا ہے۔ آنے والا کچھ بھی نہیں چھوڑے گا۔ سونے چاندی کے سارے انبار' تاج و تخت' عزت و وقار سب کچھ سمیٹ کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اور اپنی دیوی پدمنی سے بھی کہہ دے کہ ایک طوائف زادی کے سرخرو ہونے کا دن آگیا۔ اور سنیاسی آنند پال نے جو کچھ مندر کی دیوار پر لکھا تھا وہ تحریر زندہ ہوگئی۔ سارے حرف جی اٹھے اور ہر لفظ رقص کر رہا ہے۔ جلدی کر! وقت کم ہے۔ یہاں سے چلی جا اور چتوڑ کے تمام کج کلاہوں سے کہہ دے کہ پگڑیاں اچھالی جانے والی ہیں۔ اپنے اپنے آئینے نکال لیں کہ چہروں پر سیاہی ملی جانے والی ہے۔ نامۂ اعمال ہاتھوں میں لے لیں کہ حساب کا دن آپہنچا۔ اور میری طرف سے یہ بھی کہہ دے کہ اگر بھاگ سکتے ہیں تو بھاگیں۔ مگر کہاں جائیں گے کہ بند کرنے والے نے تمام دروازے بند کر دیئے۔ بس ایک دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ موت کا دروازہ' ذلت و رسوائی کا دروازہ۔" یہ کہہ کر مائی بھان متی نے خادمہ کی طرف دیکھا اور اس ریاکار عورت کو محسوس ہوا جیسے اس کا پورا جسم جل اٹھا ہو۔

خادمہ بھاگ کھڑی ہوئی اور مندر سے نکل کر اپنے گھر پہنچی۔ نارائن داس بیوی کی حالت دیکھ کر وحشت زدہ ہوگیا اور جب خادمہ نے پاگلوں کے سے انداز میں مائی بھان متی کے الفاظ دہرائے تو نارائن

داس کو یوں محسوس ہوا جیسے کوہ آبو پھٹ پڑا ہو اور پتھروں کے ڈھیر کے نیچے دبا ہوا چیخ رہا ہو۔

☆..................☆..................☆

نارائن داس کئی بار گھوڑے پر چڑھا اور کئی بار نیچے گرا۔ خوف و دہشت کے سبب اس کے ہاتھ کام نہیں کر رہے تھے اور گھوڑے کی لگام بار بار چھوٹ جاتی تھی پھر بھی دنیا کی محبت اور علاءالدین خلجی کے حملے کی خبر اسے راج محل کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔ آخر بڑی کشمکش کے بعد وہ راجہ رتن سنگھ کے قدموں تک پہنچ ہی گیا۔

رتن سنگھ کا پجاری جاسوس کچھ دیر تک سجدے کی حالت میں پڑا رہا اور پھر اس نے مائی بھان متی کا پیغام حرف بہ حرف منتقل کر دیا۔

اگرچہ راجہ رتن سنگھ اس تارک الدنیا عورت کو طوائف زادی کہہ کر ذلیل کرتا تھا لیکن جب نارائن داس نے علاءالدین خلجی کا ذکر کیا تو وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے سلطان کے سپاہی خلوت خاص میں داخل ہو گئے ہوں اور اسے گرفتار کرنے کیلئے آگے بڑھ رہے ہوں۔

"بھان متی ؟ آنند پال ؟ علاءالدین خلجی ؟"

راجہ رتن سنگھ کے چہرے کا رنگ اچانک زرد ہو گیا اور وہ خود کلامی کے انداز میں زور زور سے بول رہا تھا۔ "بھیڑیا آئے گا اور سب کچھ اٹھا لے جائے گا۔ ہمارا تخت و تاج' مال و دولت' عزت و وقار۔"

رتن سنگھ پر ناقابل بیان وحشت طاری تھی۔

"آنے دیں' اس بھیڑیئے کو آنے دیں۔ اس طرح اسے اندازہ تو ہو جائے گا کہ چتوڑ کیا ہے اور اس سرزمین پر کیسے کیسے شیر بستے ہیں ؟" رانی پدمنی بہادر راجپوتوں کو شیر کہہ کر پکار رہی تھی مگر اس کی آواز کی تھرتھراہٹ سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے آنے والا ایک بھیڑیا ہزاروں شیروں پر بھاری ہے۔

"نہیں مہارانی! آپ نہیں جانتیں کہ وہ کون ہے اور کس انداز سے آ رہا ہے ؟" رتن سنگھ کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر ہم اس ذلیل بھان متی کی باتوں پر اعتبار نہیں کر سکتے۔" رانی پدمنی نے ایک بار پھر اس عظیم گیانی عورت کو غلیظ کلمات سے یاد کیا۔ "وہ مجھ سے اپنی ذلت و رسوائی کا انتقام لے رہی ہے۔ ورنہ میں جانتی ہوں کہ اس کی آنکھیں کہاں تک دیکھ سکتی ہیں۔ آبو کی چوٹی پر بیٹھ کر دلی کے مناظر دیکھنا پاگلوں کی عادت ہے۔"

"مہارانی! بھان متی پاگل نہیں ہے۔ ہم اپنی نفرتوں کے ہجوم میں اسے مسلسل نظرانداز کر رہے ہیں۔ اس نے سنیاسی آنند پال کی اس تحریر کا بھی ذکر کیا جس پر ہم نے گہری سیاہی پھیر دی تھی۔" راجہ رتن سنگھ شدید ذہنی کشمکش کا شکار نظر آنے لگا تھا۔ "تمہارے خیال میں اگر وہ پاگل ہے تو پھر اس نے میلوں کے فاصلے سے سمبھو شیام کے مندر پر لکھی جانے والی سنیاسی کی تحریر کس طرح پڑھ لی ؟ آنند پال نے بھی تو یہی لکھا تھا کہ آنے والوں کو کوئی نہیں روک سکتا۔ اور بھان متی بھی یہی کہہ رہی ہے کہ علاءالدین خلجی آ رہا ہے۔ بھاگ سکو تو بھاگ جاؤ۔ دونوں کے الفاظ ایک ہیں۔"

رانی پدمنی کا روشن چہرہ بجھ گیا۔ اب اس کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ساری چرب زبانی زائل ہو کر رہ گئی تھی۔

جادوگر رام دیو اپنے سینے میں خباثتوں اور عیاریوں کا طوفان چھپائے ہوئے خاموشی سے چتوڑ کے حکمرانوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ جب دونوں خاموش ہو گئے تو وہ عیارانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"سمراٹ! وہ بوڑھی جادوگرنی ابھی زندہ ہے ؟"

"ہاں مہاراج! وہ ناپاک عورت! ابھی زندہ ہے۔" راجہ رتن سنگھ اس طرح شرمسار نظر آ رہا تھا جیسے کسی نے اسے جرم کرتے دیکھ لیا ہو۔

"ہم سے تو کہا گیا تھا کہ بھان متی قتل کر دی گئی۔" رام دیو کی گردن کج ہو گئی تھی اور وہ انتہائی گستاخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راجہ رتن سنگھ کی طرف دیکھنے کی بجائے کمرے کے وسط میں لگے ہوئے ایک خوبصورت فانوس کو دیکھنے لگا۔

"ہم نے آپ کے غصے کی آگ کو سرد کرنے کیلئے جھوٹ بول دیا تھا۔" راجہ رتن سنگھ حکمراں ہوتے ہوئے بھی غلاموں کی طرح بہانے تراش رہا تھا۔

"تو پھر سمراٹ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہندو دھرم میں جھوٹ بولنا کتنا بڑا پاپ ہے ؟" رام دیو کی عیاریاں عروج پر تھیں اور وہ بگڑی ہوئی سیاسی صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ "آپ کو یقیناً ہمارے الفاظ یاد ہوں گے۔ ہم نے کہا تھا کہ اس ریاست کے تین دشمن ہیں۔ ایک کو تو ہمارے حکم پر قتل کر دیا گیا اور باقی دو کو بچا لیا گیا اگر اسی وقت بھان متی اور راج دوت کا قصہ پاک کر دیا جاتا تو آج آپ کو یہ دن دیکھنا نہیں پڑتے۔" رام دیو نے بڑی ہوشیاری سے راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کے بکھرتے ہوئے اعصاب پر ایک اور کاری ضرب لگا دی تھی۔

"مہاراج! ہم اپنے ہی دوستوں سے فریب کھا گئے۔" راجہ رتن سنگھ پشیمانی کے انداز میں بول رہا تھا۔ "ہم نے وکرم سنگھ پر حد سے زیادہ اعتبار کیا اور اس نے ہمارے اعتماد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے راج دوت کو کسی تہہ خانے میں چھپا دیا۔ اب وقت ہماری گرفت میں نہیں ہے۔ آپ ہی بتائیں کہ ہم کیا کریں ؟"

راجہ رتن سنگھ نے گھبرا کر اس شخص کے سامنے اپنا دامن پھیلا دیا جسے کچھ دن پہلے وہ ہندوؤں کے روحانی پیشوا کے بجائے ایک شعبدہ باز سمجھنے لگا تھا مگر علاءالدین خلجی کے حملے کی خبر نے ایک بار پھر اس کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ رام دیو کو دیوتاؤں کے سنگھاسن پر بٹھا کر اپنا سر جھکا دے اور اسی بدکار شعبدہ باز سے رحم و کرم کی بھیک مانگے۔

"راج دوت کہیں نہیں گیا ہے۔" رام دیو نے احساس فخر سے گردن اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہمارا گیان بتاتا ہے کہ وہ منتری بھون کے کسی تہہ خانے میں موجود ہے اور اگر وہ پاتال (تحت الثریٰ) میں بھی موجود ہے تو ہم زمین کا سینہ چیر کر اس کی آخری گہرائی تک پہنچ جائیں گے اور راج دوت کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ مگر بھان متی کے بارے میں آپ ہی کو فیصلہ کرنا ہے۔"

"نہیں مہاراج! اب سب کچھ آپ کے اختیار میں ہے۔" اپنے اقتدار اور زندگی کو بچانے کیلئے راجہ رتن سنگھ نے رام دیو کے آگے سر جھکا دیا۔

"ہاں! سمراٹ! اب یہی ایک شرط ہے کہ چتوڑ کی جنگ میری ہدایتوں کے مطابق لڑی جائے گی۔ اگر آپ کو اپنی راج نیتی (سیاست) پر ناز ہے تو یہ پاپی رام دیو چلا۔ اسے اس کا بھگوان کافی ہے۔" رام دیو نے خود کو پاپی کہہ کر اپنی بساط کی بہت خوفناک چال چل دی تھی۔

"ایسا ہی ہو گا مہاراج! ایسا ہی ہو گا۔" اب کی بار رانی پدمنی نے جواب دیا تھا۔ وہ پہلے ہی رام دیو کی عقیدت مند تھی اپنی جذباتی عقیدت میں حقیقت کا رنگ بھرنے کیلئے پدمنی نے رام دیو کے قدم چھو لئے۔

"اٹھو مہارانی! تم کیوں اداس ہوتی ہو۔" رام دیو نے جھک کر اپنے دونوں ہاتھ پدمنی کے شانوں پر رکھ دیئے اور وہ کچھ دیر کیلئے خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔ ہوس پرست رام دیو کی زندگی کے وہ لمحات سب سے

زیادہ کیف آور ہوتے تھے جب رانی پدمنی جیسی حسین وجمیل عورت اس کے قدم چھوتی تھی اور ایک پیکرِ ناز کے ہاتھوں کا لمس اسے کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا کرتا تھا۔ پھر جب رانی پدمنی کھڑی ہوئی تو رام دیو بھی ہوش کی محفل میں لوٹ آیا۔

"میں نے تو چتوڑ میں رہنا ہی اس لئے گوارہ کیا ہے کہ یہاں تم جیسی دھرم داسی موجود ہے ورنہ اب تک تو میں کہیں اور جا چکا ہوتا۔ میرا کیا ہے کہ پوری ہندو قوم راستے میں آنکھیں بچھائے ہوئے ہے جدھر سے بھی گزروں گا میری پوجا کی جائے گی مگر اس دل کو کیا کروں کہ چتوڑ کی محبت کے سوا مجھے کچھ یاد ہی نہیں۔" آج رام دیو کی عیاری بڑے عجیب کرشمے دکھا رہی تھی۔ "نہیں مہاراج! آپ ہمیں چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔" رانی پدمنی کا سر عقیدت سے جھکا ہوا تھا۔ "اس چتوڑ کو بچا لیجئے جو آپ کی محبتوں کا مرکز ہے۔" رانی نے بڑے عاجزانہ لہجے میں درخواست کی۔

"پھر مہاراج! اس خبیث جادوگرنی بھان متی کو قتل کرا دیجئے۔" رام دیو، رتن سنگھ سے مخاطب ہوا۔ "اس کی لاش ہی چتوڑ کا سب سے مضبوط دفاع ہوگا۔ میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں کہ آنند پال اور بھان متی جیسے غدارانِ مذہب ووطن کے منتر ہی ان آفات ناگہانی کا سبب بنے ہیں۔ ہم نے آنند پال سے تو پیچھا چھڑا لیا مگر وہ ویشیا (طوائف) ابھی تک زندہ ہے۔ کسی کو کیا خبر کہ وہ چتوڑ کی تباہی کیلئے دن رات جاپ کر رہی ہے۔ اسی کے منتروں کا اثر ہے کہ علاءالدین خلجی نے چتوڑ پر یلغار کا ارادہ کیا۔ علاءالدین سے پہلے کتنے حکمراں گزرے ہیں مگر کوئی بھی تسخیرِ چتوڑ کا تصور تک نہ کر سکا۔ پھر آج علاءالدین کو یہ جرأت کیونکر ہوئی؟"

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی حیرت سے رام دیو کی باتیں سن رہے تھے۔

"یہ بھان متی کے ناپاک منتروں ہی کے اثرات ہیں جن کے سبب علاءالدین کے دل میں لشکر کشی کا خیال پیدا ہوا۔ اگر بھان متی کو قتل کر دیا جائے تو منتروں کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا پھر جیسے ہی منتروں کی لے ٹوٹے گی، علاءالدین خلجی کے خوفناک ارادے بھی دم توڑ دیں گے۔ یہ ایک طلسماتی جنگ ہے۔ اگر ہم اس طلسم کو پارہ پارہ کر دیں تو جنگی فضا خود بخود ختم ہو جائے گی اور علاءالدین دہشت زدہ ہو کر آدھے راستے سے واپس لوٹ جائے گا۔"

رام دیو نے بڑے عجیب انداز میں اپنے دلائل پیش کئے تھے جنہیں راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کی توہم پرستی نے فوراً ہی قبول کر لیا۔ کچھ دیر بعد راج محل کے نگرانوں نے دیکھا کہ آٹھ سپاہی اپنی شمشیریں بے نیام کئے ہوئے بمل شاہ کے مندر کی طرف جا رہے ہیں۔

☆..........................

سپاہیوں کو بمل شاہ کے مندر کی طرف بھیجنے کے بعد رام دیو نے راجہ رتن سنگھ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "سمراٹ! اگر آپ مجھ سے سارے واقعات پوشیدہ نہ رکھتے تو اب تک چتوڑ پر منڈلانے والے یہ گھور بادل چھٹ چکے ہوتے اور دیوتاؤں کی کرپا سے ہوائیں انہیں اڑا کر بہت دور لے جا چکی ہوتیں۔" جادوگر رام دیو اس احساسِ غرور کے ساتھ بولا جیسے وہ رتن سنگھ کی ڈگمگاتی ہوئی نیّا کا کھیون ہار ہو۔

راجہ رتن سنگھ نے شرم وندامت سے سر جھکا لیا۔ "مہاراج! میں آپ کو ضرور خبر کرتا مگر اس وقت آپ بہت زخمی تھے۔" رتن سنگھ نے ڈرتے ڈرتے آشرم کی تباہی اور رام دیو کے چیلوں کی ہلاکت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں سمراٹ! ہماری حالت کبھی خراب نہیں ہوئی۔" رام دیو بھی انتہائی فریب کاری سے کام لے رہا

تھا۔ "زخموں سے چور ہونے کے بعد بھی ہم اپنی شکتیوں سے محروم نہیں ہوئے۔ اصل شکتی بدن کی نہیں روح کی ہوتی ہے۔ اس سنسار میں بلوان وہی ہے جس کی آتما شکتی شال (طاقتور) ہے۔ ہم سوتے میں بھی جاگتے ہیں۔ سمراٹ نے پکار کر تو دیکھا ہوتا۔ ہم ہر مقام سے چتوڑ کو بچانے کیلئے آ جاتے۔" رام دیو ذلیل ورسوا ہونے کے بعد بھی اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے یہ کائنات اسی کے حکم سے چل رہی ہے۔

"مہاراج! آپ چتوڑ کو نہیں بچائیں گے تو پھر کون بچائے گا۔" رانی پدمنی کا سر اس طرح جھکا ہوا تھا جیسے کوئی پجارن اپنے دیوتا کے سامنے اظہارِ عقیدت کر رہی ہو۔

"مہارانی! ہم تمہاری خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔" ایک بار پھر رام دیو نے پدمنی کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔ اگر اس وقت راجہ رتن سنگھ علاءالدین خلجی کے حملے کی خبر سن کر بدحواس نہ ہو جاتا اور غور سے رام دیو کی طرف دیکھ رہا ہوتا تو وہ اس بدکار شعبدہ باز کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ لیتا لیکن سلطان کی لشکر کشی کے تصور نے اسے بدحواس کر دیا تھا اور وہ ایک مرتبہ پھر رام دیو کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر رہ گیا تھا۔

"مہاراج! کیا یہ آفتِ ناگہانی ہمارے سروں سے ٹل جائے گی؟" پدمنی بھی بہت زیادہ پریشان نظر آ رہی تھی۔

"اس ملیچھ علاءالدین کو چتوڑ کی سیما میں پرویش کرنے کیلئے ہماری انومتی (اجازت) کی ضرورت ہے۔" رام دیو کی آنکھیں اچانک چڑھ گئی تھیں اور سیاہ ماتھے پر کئی بل نمایاں ہو گئے تھے۔ "راجپوتوں کا پورا علاقہ ہماری نگرانی میں ہے۔ بھگوان نے اس بھومی کی رکشا ہمیں سونپ دی ہے۔ ہم جسے چاہیں یہاں آنے دیں اور جسے چاہیں دھتکار دیں۔ علاءالدین اپنی حدودِ سلطنت سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ اگر اس نے یہ نادانی کی تو پھر اپنے کئے کی سزا اس طرح بھگتے گا کہ آنے والا سمے اس کے منہ پر پراجیہ (شکست) کی سیاہی مل دے گا اور رانی پدمنی کا نام ہندوؤں کے اتہاس (تاریخ) میں سدا کیلئے روشن ہو جائے گا۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی لوگ کہا کریں گے کہ چتوڑ کی مہارانی امر ہے۔ بھارت ورش میں پیدا ہونے والی انسانی نسلیں مثال دیا کریں گی کہ سب کچھ مٹ گیا مگر پدمنی کو موت کے لمبے ہاتھ نہیں چھو سکے۔" رام دیو ایک مغرور عورت کی فطری کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔

"لیکن یہ کس طرح ہوگا مہاراج؟" رانی پدمنی، رام دیو کی لاف زنی سنتے سنتے اکتا گئی تھی۔ "وہ طوائف زادی بھان متی تو کہتی ہے کہ سلطان کا لشکر چتوڑ پہنچنے ہی والا ہے۔"

"مہارانی! طوائفوں اور پارساؤں کے قول میں بڑا فرق ہوتا ہے۔" بھان متی کا نام سن کر رام دیو بھڑک اٹھا۔ "جس کی اپنی زندگی چند لمحوں کی مہمان ہے وہ آنے والے وقت کے بارے میں کیا بتا سکتی ہے اور چتوڑ کی دھرتی پر کون ایسا ہے جو اس پاپ کی سنتان کا اعتبار کرے گا۔ اگر میری باتوں پر پہلے عمل کر لیا گیا ہوتا تو پھر یہ دن نہ دیکھنا پڑتے۔"

"مہاراج! آپ ان گزری ہوئی باتوں کو بار بار کیوں دہراتے ہیں؟" رانی پدمنی کی سرکشی آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگی تھی۔

رام دیو نے مہارانی چتوڑ کے بدلے ہوئے تیوروں کو فوراً ہی محسوس کر لیا۔ "میں آپ کی خاطر ان باتوں کو بھلائے دیتا ہوں۔ رام دیو تو وہ ہے جو کسی ماتھے پر بے نیازی کی ایک شکن بھی برداشت نہیں کرتا۔ من تو یہ چاہتا ہے کہ اپنا گیان سمیٹوں اور بہت دور جنگلوں میں نکل جاؤں۔ پھر اہلِ چتوڑ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان کے سروں سے سائبان چلا گیا اور وہ دشتِ رنج والم میں اس طرح بے آسرا کھڑے ہیں کہ وقت کا

بے رحم ہاتھ ان کے جسموں پر سنگ باری کر رہا ہے۔" رام دیو نے ایک بار پھر اپنی اہمیت ظاہر کرنے کیلئے راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کی طرف سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔

"جسے دیوتاؤں نے ہمارا نگہبان بنایا ہے وہ ہمیں چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہے؟" رتن سنگھ نے گھبرا کر سر جھکا دیا تھا۔

"ہاں! ہمیں اپنی اس ذمے داری کا احساس روک لیتا ہے۔ ہم ہندو دھرم کو سنکٹ میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ ہمیں دلی سے آنے والے راکششوں کے سامنے اپنے گیان کی طاقتوں سے فولاد کی ایک دیوار کھینچنی ہوگی۔ جس سے ٹکرا کر ایک ایک مسلمان ہلاک ہو جائے یا اپنے ناپاک ارادوں کی لاش اٹھائے ہوئے واپس چلا جائے۔ مہارانی کچھ دیر بعد اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گی کہ ہم نے کس طرح بھان متی کے طلسم کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس وشیا کے قتل کی خبر ملتے ہی ہم علاءالدین کے بڑھتے ہوئے لشکر پر ناقابل بیان عذاب لے آئیں گے۔ کبھی ہواؤں کے طوفان اٹھیں گے اور سلطان کے خیمے تنکوں کی طرح بکھر جائیں گے، کبھی آسمانوں کے دہانے کھل جائیں گے اور قیامت خیز بارش سلطان کے سامانِ جنگ کو بہا کر لے جائے گی۔ کبھی میدانوں میں شیروں کی آوازیں گونجیں گی اور علاءالدین کے گھوڑے اپنے سواروں کو لے کر اس طرح بھاگ کھڑے ہوں گے کہ ان کی کوئی منزل نہیں ہوگی اور آوارہ جنگلی جانوروں کی طرح ادھر ادھر بھٹکتے پھریں گے۔" رام دیو پرسوز آواز میں اس طرح بول رہا تھا جیسے واقعتاً علاءالدین خلجی کے لشکر پر دردناک عذاب نازل کر رہا ہے اور زمین و آسمان پر اسی کی حکومت ہے۔

اسی دوران سپہ سالار ہری سنگھ نے راجپوت سمراٹ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ پھر جب ہری سنگھ اس خصوصی کمرے میں داخل ہوا تو اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چہرے کا رنگ اڑا اڑا سا تھا۔

"سمراٹ! ہماری ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔ آپ کے جاں نثار سپاہیوں نے منتری بھون کے ایک ایک چپے کو کھود ڈالا مگر وہاں کوئی سرنگ یا تہہ خانے کا نشان تک نہیں ملا۔" ہری سنگھ شرمسار نظر آ رہا تھا۔

راجہ رتن سنگھ نے گھبرا کر رام دیو کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھ رہا تھا کہ آخر اس کے یہ دونوں دشمن کہاں گئے؟

رام دیو کے عیار ذہن نے فوراً ہی کروٹ لی۔ "سمراٹ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وکرم سنگھ کے گھر میں ہر طرف آگ لگا دی جائے شعلوں کی حرارت روپوش ہو جانے والوں کو ہر خفیہ پناہ گاہ سے نکلنے پر مجبور کر دے گی۔ اگر وہ آگ کو بھی برداشت کر گئے تو پھر ان کی زندگی ان سے خفا ہو جائے گی۔ آگ لگانے کے بعد اپنے سپاہیوں کو منتری بھون کے باہر متعین کر دیں۔ ممکن ہے کہ دھوئیں کی آڑ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہونے کی کوشش کریں۔"

"تم جاؤ ہری سنگھ اور منتری بھون کے ایک ایک گوشے کو پھونک ڈالو۔" اچانک رانی پدمنی اپنے سپہ سالار سے مخاطب ہوئی اس کا لہجہ آتش بار تھا۔ "مت چھوڑو کوئی نشان نافرمانوں کا۔" رانی پدمنی اس قصرِ دلفریب کو خاکستر کر دینے کا حکم دے رہی تھی جو اس کے آباؤ اجداد کی ایک حسین یادگار تھی اور جس کے بام و در کے سائے میں اس کا معصوم بچپن گزرا تھا۔

سپہ سالار ہری سنگھ نصف قد تک جھکا اور پھر الٹے قدموں واپس چلا گیا۔

ہری سنگھ کے جاتے ہی راجہ رتن سنگھ اور جادوگر رام دیو نے رانی پدمنی کی طرف دیکھا۔ وہ حسرت و نامرادی کی ایک تصویر اور رنج و الم کا ایک زندہ مجسمہ نظر آ رہی تھی۔

رتن سنگھ اپنی بیوی کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا مگر رام دیو نے انتہائی مطمئن لہجے میں کہا۔ "مہارانی! اب یہ رخِ روشن پر غموں کی گھٹا کیسی ہے؟" رام دیو کی زبان بھی اس کے دماغ کی طرح شراب کے اثر سے بہک رہی تھی۔ "وہ دیکھیں! اراولی اور آبو کی چوٹیوں سے سورج بلند ہو چکا ہے۔ رات اپنی آخری ہچکیاں لے کر کبھی کی ڈوب چکی۔ اب تو ہر طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ آپ اپنے چہرے کے اس سورج کو اداسیوں کے بادلوں سے محفوظ رکھیں جو آسمان کے سورج سے بھی زیادہ تابناک ہے۔ اگر یہ سورج بجھا تو اہلِ چتوڑ کے دل بجھ جائیں گے۔" رام دیو بظاہر حوصلہ افزائی کی باتیں کر رہا تھا مگر اس کے الفاظ میں کچھ اور ہی مفہوم پوشیدہ تھا۔

"مہاراج! آپ جس سورج کی بات کر رہے ہیں، شاید اس کے بجھنے کے دن آ گئے۔" یہ کہہ کر رانی پدمنی کھڑی ہو گئی۔ "اگر یہ سورج بجھا تو اس کی تمام تر ذمہ داری آپ پر ہوگی۔" رانی پدمنی قوت برداشت کی آخری حدوں سے گزر گئی تھی۔ "وہ دنیا کا کونسا عیش تھا جو ہم نے آپ کیلئے فراہم نہیں کیا اور وہ کونسا جذبۂ احترام تھا جسے ہم نے آپ کے قدموں میں نہیں ڈال دیا۔ پھر بھی آپ نے ہمارے دلوں کا حال سننے کی کوشش نہیں کی۔ ہماری نظروں نے بے شمار سوال کئے مگر آپ نے ہر بار جواب دینے سے گریز اختیار کیا۔ ہم آج تک آپ کی ریاضت اور گیان پر بھروسہ کرتے ہیں مگر جب بھی آزمائش کا وقت آیا آپ نے ہمیں اندھیروں میں چھوڑ دیا۔ وکرم سنگھ اپنی راج نیتی کی چالوں سے راج دوت کو بچا کر لے گیا اور پھر اس نے اپنی بیٹی نرملا کو بھی کسی قید خانے میں گم کر دیا۔ بقول آپ کے، آپ کا گیان تو اپار (غیر محدود) ہے۔ آپ تو آسمانوں کی خبر بھی لے آتے ہیں مگر ہمارے مجرم جو اسی زمین پر کہیں روپوش ہیں آپ کی نظریں ان تک بھی نہیں پہنچ سکیں۔ پھر کیا اسی شکتی کے سہارے آپ سلطان علاءالدین خلجی کے حملے کو روکیں گے؟" رانی پدمنی بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ آج پہلی بار اس نے مہاراج رام دیو کی محترم شخصیت کو اعتراضات کا نشانہ بنایا تھا۔

"مہارانی!" راجہ رتن سنگھ بھی گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"مہاراج کبھی ہمارے مفادات کی طرف سے غافل نہیں رہے۔ ان سے جو کچھ ممکن ہو سکا وہ ریاست کی بھلائی کیلئے کرتے رہے۔ اور آج بھی ہمارے ہی غم میں رات رات بھر جاگ کر تپسیا کر رہے ہیں۔ تم پریشان نہ ہو کہ مہاراج کی دعاؤں سے یہ مشکل وقت بھی گزر جائے گا۔"

"ہاں سمراٹ! وقت کو کون روک سکا ہے۔ وہ تو گزرنے ہی کیلئے آتا ہے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ مگر کون جانے کہ اس وقت کی دھارا میں کس کس کو بہہ جانا ہے۔ سب کی کشتیاں کنارے لگ جائیں گی مگر اس سیلاب میں راجپوتوں کی آن ڈوب جائے گی۔ سب کے سب آسودۂ ساحل ہو جائیں گے مگر پدمنی کو آگ کا بھنور نگل لے گا اور پھر دریا بھی ساکت ہو جائیں گے اور ہوائیں بھی پرسکون ہو جائیں گی۔ بس ایک میرے ہی ہونے سے یہ حشر برپا ہے۔ جب میں نہیں رہوں گی تو قیامت کو بھی قرار آ جائے گا۔" اتنا کہہ کر رانی پدمنی اپنی خواب گاہ میں چلی گئی اور راجہ رتن سنگھ حیرت و حسرت سے رام دیو کی طرف دیکھنے لگا۔

سمراٹ! آپ مہارانی کا دل بہلانے کی کوشش کریں۔" رام دیو نے انتہائی ہوشیاری کے ساتھ ایک اور چال چلی۔ "مہارانی بہرحال ایک عورت ہیں اور عورت کے اعصاب ریشم کے ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کے سینے میں پتھر کا دل اور فولاد کا دماغ ہونا چاہئے۔ وہ علاءالدین کے حملے سے خوفزدہ ہیں لیکن ان کی یہ دہشت بے سبب ہے۔ میرے روحانی کمالات پر سے ان کا اعتبار اٹھ گیا ہے۔ آپ اس اعتبار کو کسی بھی

طرح بحال کیجئے ورنہ میں اس بے اعتمادی کی فضا میں اپنا کام جاری نہ رکھ سکوں گا۔ " رام دیو نے ایک بار پھر بڑی مکاری سے آنکھیں پھیرلی تھیں اور اپنی اہمیت ظاہر کرنے کیلئے لفظوں کا نیا کھیل کھیل رہا تھا۔

" مہاراج! آپ اطمینان رکھیں۔ " رام دیو کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر راجہ رتن سنگھ نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔ " میں مہارانی کے مشتعل جذبات کو اعتدال پر لے آؤں گا۔ آپ اپنے جاپ اور منتر جاری رکھیں۔ "

" ہاں! مہارانی سے یہ ضرور کہہ دیں کہ میری خدمات کا اتنا بڑا صلہ نہ دیں کہ میں اپنے آپ سے شرمندہ رہوں اور منہ چھپا کر کسی اور طرف نکل جاؤں۔ " رام دیو نے اپنی ریشمی سیاہ چادر کو کاندھے پر ڈالتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل کر جانے لگا۔ راجہ رتن سنگھ بڑے غور سے ہندوستان کے مہان تانترک (عظیم جادوگر) کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا جو لنگڑا کر چل رہا تھا۔ یہ اس حادثے کی نشانی تھی جب مہاراج کا پورا آشرم سیاہ آندھی میں تباہ ہو گیا تھا۔ تمام چیلے پتھروں کے ڈھیر میں دب کر ہلاک ہو گئے تھے اور رام دیو بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ درباری حکیم کی سخت نگہداشت اور علاج سے رام دیو کے زخم تو بھر گئے تھے لیکن دائیں ٹانگ میں ہلکی سی کجی باقی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے اس کی رفتار کا توازن بگڑ گیا تھا اور وہ دوڑنے بھاگنے سے معذور ہو گیا تھا۔

رام دیو کے جاتے ہی راجہ رتن سنگھ' رانی پدمنی کی خواب گاہ میں داخل ہوا اس وقت رانی پدمنی اپنے بستر پر دراز تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر گہری اداسی چھائی ہوئی تھی۔ " مہارانی! " راجہ رتن سنگھ نے اپنی محبوب بیوی کو پکارا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

پدمنی نے آنکھیں کھول کر شوہر کی طرف دیکھا اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔ " اگر تم اسی طرح آزردہ خاطر رہیں تو میرے حوصلے پست ہو جائیں گے اور میں سیاسی جنگ کے ساتھ اپنی زندگی کی جنگ بھی ہار جاؤں گا۔ " راجہ رتن سنگھ کی آواز جذبات سے لبریز تھی اور اس کے ارتعاش کو صاف صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ " اگر تمہارا دستِ حنائی میری پشت پر ہے تو میں آغوشِ فنا کو بھی تمہارے مرمریں بازو سمجھ کر قبول کر لوں گا۔ اور تمہاری چشمِ ناز پھر گئی تو دنیا کی ہر شے مجھ سے روٹھ جائے گی۔ " رتن سنگھ کا اندازِ گفتگو گداگرانہ تھا۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ کسی بھکاری کے جذبوں کی ترجمانی کر رہا تھا۔

رانی پدمنی نے ایک خاص ادائے بے نیازی کے ساتھ راجہ رتن سنگھ کی جانب دیکھا اس کے سرخ و گداز ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ " سمراٹ! اگر آپ کو کچھ خیال ہوتا تو میرے شبستانِ جمال پر بدنامیوں کے یہ سائے ہی کیوں پڑتے؟ " رانی پدمنی اپنے اس شوہر کے تغافل کا گلہ کر رہی تھی جسے اہلِ چتوڑ بیوی کا غلام سمجھتے تھے۔

" مہارانی! یہ آپ کہہ رہی ہیں؟ " راجہ رتن سنگھ کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔

" ہاں! یہ میری ہی صدائے بے قرار ہے جو آپ کے کانوں تک پہنچ رہی ہے۔ " پدمنی کا لہجہ کس قدر تلخ ہو گیا تھا اور وہ جوشِ جذبات میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ " آپ نے ہمیشہ وکرم سنگھ کی رائے کو میری باتوں پر ترجیح دی۔ ہمیشہ اس منافق و غدار کی سیاست کے گن گائے۔ جب بھی میں نے زبان کھولی' میرے ہونٹوں پر یہ کہہ کر آمریت کی مہر لگا دی گئی کہ میں عورت ہوں اور مجھے راج نیتی کا ایک حرف بھی نہیں آتا۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ سلطان کے سفیر کا سر کاٹ کر دلی بھیج دیا جائے مگر آپ نے میری ایک نہیں سنی۔ یہاں تک کہ اس بھیڑیئے کے منہ سے ٹپکنے والے خون نے میرے وقار کے پیرہن کو داغدار کر دیا۔ " پدمنی کی تلخ کلامی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔

" میں سے کی بہتی دھارا کو واپس لے آؤں گا پدمنی! تیری خاطر! صرف تیری خاطر۔ " راجہ رتن سنگھ بھی جذبات سے مغلوب ہو گیا تھا۔ " سب کچھ لوٹ آئے گا' ایک ایک گھڑی' ایک ایک پل۔ جب سلطان کی فوجیں چتوڑ کے قریب پہنچیں گی تو ہمارے سرحدی سپاہی اسے اس کے سفیر کا سر پیش کریں گے۔ یہی اس کے خط کا جواب ہو گا۔ " رتن سنگھ اپنی خفا ہو جانے والی بیوی کو منانے کیلئے خوشامد کے عجیب عجیب انداز اختیار کر رہا تھا۔

" اور نرملا کا کیا ہو گا؟ " پدمنی بظاہر بہل گئی تھی مگر اب بھی اس کے دل کا اضطراب چہرے پر نمایاں تھا۔

" اب نرملا کی کیا ضرورت باقی رہ گئی ہے؟ " رتن سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا۔ " تمہارا منصوبہ اسی وقت کارگر ہو سکتا تھا جب سلطان دلی میں ہوتا اور ہمارے سپاہی اسے شاہی حرم میں پہنچا دیتے۔ "

" یقیناً صورتِ حال بدل گئی ہے مگر ہمارے دل کی آگ تو اسی وقت بجھے گی جب وکرم سنگھ کی بیٹی سلطان کے سپاہیوں کی خوراک بن جائے گی۔ "

" تمہیں اپنی اس خواہش کی تکمیل کیلئے کچھ دیر انتظار کرنا ہو گا۔ شاید رات تک یا پھر کل صبح تک۔ " راجہ رتن سنگھ لہجہ بدل بدل کر اس عورت کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا جو سراپا نفرت تھی' مجسم انتقام تھی۔

" رات تک کیوں؟ " نخوت و غرور سے پدمنی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ " ابھی اور اسی وقت کیوں نہیں؟ " اقتدار کے نشے کو اب انتظار نہیں تھا۔

" ہمارے سپاہی ان دونوں کو تلاش کر رہے ہیں۔ " رتن سنگھ نے سرکش بیوی کو کسی بچے کی طرح سمجھاتے ہوئے کہا۔ " ابھی تو منتری بھون میں آگ بھی نہیں لگی ہو گی۔ پہلے تو تمہارے غلام آگ سلگائیں گے' پھر شعلے بھڑکیں گے' اس کے بعد کہیں جا کر وہ چوہے اپنے سوراخوں سے نکلیں گے جنہیں وکرم سنگھ نے کسی محفوظ پناہ گاہ میں چھپا دیا ہے۔ "

" شاید منتری بھون کو نذرِ آتش کر دینے سے بھی ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہ ہو۔ " یکایک رانی پدمنی بہت زیادہ سنجیدہ نظر آنے لگی تھی اور اس کے چہرے پر نفرت و غضب کی کیفیات کا عکس تک باقی نہیں رہا تھا۔

" وہ کیوں؟ " راجہ رتن سنگھ نے حیران ہو کر پدمنی کی طرف دیکھا جو اس وقت بالکل مختلف عورت نظر آ رہی تھی۔

" وکرم سنگھ نے جس یقین کے ساتھ کہا تھا کہ ہمارے ہاتھ آفریدی اور نرملا تک نہیں پہنچ سکتے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے مکمل منصوبہ بندی کی ہے۔ " پدمنی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور پھر وہ ہذیانی انداز میں قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ " خیر! کچھ نہ ہو۔ گھر تو جلے گا' تماشا تو ہو گا' ناموروں کے نشان تو مٹیں گے' مذہب و وطن کے غداروں کی خاک تو اڑے گی۔ "

پھر نفرتوں نے وحشت و دیوانگی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ سپہ سالار ہری سنگھ کی نگرانی میں ریاست کے سپاہی اس شخص کے گھر کو آگ لگا رہے تھے' جس کے آگے کل تک اہالیان چتوڑ کی گردنیں جھکی رہتی تھیں منتری بھون اس طرح جل رہا تھا جیسے پہاڑوں پر بسیرا کرنے والے شاہین کے نشیمن کو کسی نے آگ لگا دی ہو نوادرات' قیمتی ساز و سامان' بام و در' محرابیں' طاقچے' شمشیریں' نیزے' پگڑیاں' لباس سب کچھ انتقام کی آگ کا ایندھن بن گئے تھے۔ ہر طرف کثیف دھواں تھا اور رقص کرتی ہوئی چنگاریاں تھیں۔ بگولے

اٹھ اٹھ کر چتوڑ کے رہنے والوں کو تباہی و بربادی کی ایک نئی داستان سنا رہے تھے۔ منتری بھون کے جلنے پر کسی دل میں سوزش پیدا نہیں ہوئی تھی کیونکہ راجہ رتن سنگھ کی طرف سے پہلے ہی وکرم سنگھ کو دیوتاؤں کا دشمن اور وطن کا غدار قرار دے دیا گیا تھا۔ اس لئے مہامنتری کی عظمتوں کے سارے مجسمے زمین بوس ہوگئے تھے اور اس شکست و بربادی پر کسی کو احساس تک نہیں ہوا تھا کہ کیسے عزت دار خاندان کی آخری نشانی راکھ کا ڈھیر بنتی جارہی تھی۔

☆..................☆..................☆

پھر جب آگ بڑھتے بڑھتے طلسم کدے تک پہنچی تو اس کی تپش سے فولادی دیواریں تپنے لگیں۔ اگرچہ وکرم سنگھ کے بزرگوں کا قائم کردہ یہ طلسم کدہ آگ اور پانی کی یورش سے ہر طرح محفوظ تھا لیکن پوری عمارت جل جانے کے سبب شعلوں کے اثرات نے طلسم کدے کے اندرونی حصے کو بھی کسی حد تک متاثر کر دیا تھا اور اچانک یہاں کے رہنے والے چاروں افراد کو شدید گرمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ طلسم کدے کی بیرونی دیوار میں بظاہر کوئی نمایاں شگاف نہیں تھا لیکن پھر بھی ہلکی دراڑوں سے دھواں اندر داخل ہو رہا تھا۔ یہ دراڑیں عام انسان کو نظر نہیں آتی تھیں اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پوری دیوار کو خوبصورت پھول پتیوں سے آراستہ کر دیا گیا تھا، اس لئے کوئی پیوند اور کوئی جوڑ دیکھنے والوں کی نظر کی گرفت میں نہیں آسکتا تھا۔ پھر بھی بال برابر دراڑوں کا وجود ایک حقیقت تھا اور ان ہی دراڑوں سے دھوئیں نے اندر داخل ہو کر تہہ خانوں کے مکینوں کو یہ اندوہناک اطلاع دیدی تھی کہ ان کا قصرِ زر نگار آگ کی خوراک بن گیا۔ یہ بات سب سے پہلے نرملا کماری نے محسوس کی تھی۔ جب ہلکے ہلکے دھوئیں کی بو صحن سے گزر کر دریچوں میں داخل ہوئی اور کمرے کی حرارت بڑھ گئی تو نرملا نے خادمہ رامیشوری کی توجہ اس طرف دلائی۔ "یہ دھواں کیسا ہے رامیشوری اور یہ حرارت کیوں بڑھتی جارہی ہے ؟"

رامیشوری کوئی جواب نہیں دے سکی تو نرملا اپنے کمرے سے نکل کر علی عامر آفریدی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہاں چندر سنگھ موجود تھا۔ "تم باہر جاؤ۔" نرملا نے چندر سنگھ سے کہا اور آفریدی کے بستر کے قریب پہنچ گئی۔ آفریدی راج کماری کے احترام میں تکیے کے سہارے سیدھا ہوا اور حیرت سے نرملا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظروں کے سامنے دنیا کی حسین ترین دوشیزہ کھڑی تھی۔ آفریدی پلکیں جھپکائے بغیر نرملا کے دلفریب چہرے کو دیکھتا رہا۔ نرملا کیلئے آفریدی کی یہ حرکت بڑی اجنبی اور غیر متوقع تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آج آفریدی کو کیا ہوگیا ہے ؟ جب علی عامر کا تحیر آمیز سکوت ختم ہوا تو نرملا نے آفریدی کو پکارا۔

"سردار! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ؟" نرملا کے لہجے سے پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

آفریدی فوراً ہی ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹ آیا اور اس نے احساسِ ندامت کے ساتھ ہی سر جھکا لیا.......... "ہاں! راج کماری میں بالکل ٹھیک ہوں۔" آفریدی کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

"پھر آپ کسی پتھر کے مجسمے کی طرح ساکت کیوں نظر آرہے تھے ؟" نرملا کا لہجہ پر خلوص تھا مگر اس میں بے تکلفی نہیں تھی۔

"راج کماری! میں اس عظیم باپ کی عظیم بیٹی کو دیکھ رہا تھا جن کے دم سے ستمگروں کی بستی میں انسانیت کا بھرم قائم رہا۔" آفریدی نے نظریں اٹھائے بغیر کہا اور اس کے چہرے پر کہیں کہیں پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے ابھر آئے۔

"آپ دیکھنے لگے ؟ آپ کی بینائی.......... آپ کی آنکھیں.........." نرملا جیسی اعصاب رکھنے والی لڑکی اس خبر کو سن کر اپنی گفتگو کا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ یہ بڑی عجیب خبر تھی۔ جیسے موت کی وادی میں کوئی فرشتہ زندگی کا پیغام لے کر آیا ہو۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنے مانگنے والے کو سب کچھ دیا۔" نرملا کی زبان سے بے اختیار نکلا اور پھر شرم و حیا نے اس کا دامن پکڑ لیا۔ یہ احساس بڑا سنسنی خیز تھا کہ ایک غیر مرد کی آنکھیں دیر تک اس کے چہرے پر مرکوز رہی تھیں۔ آج سے پہلے وہ کئی بار علی عامر کے سامنے بے حجابانہ آئی تھی مگر اس وقت نرملا کو یقین تھا کہ آفریدی کوئی باہری منظر دیکھنے کے قابل نہیں ہے اس لئے نرملا کسی تکلف کے بغیر شاہی سفیر کے سامنے چلی آتی تھی مگر آج وقت نے نئی کروٹ لی تھی اور اس کے دلکش چہرے کو کسی کی خوبصورت آنکھوں کا ہدف بنا دیا تھا۔ یہ تصادم اہلِ دل کو سرشار کر دینے کیلئے کافی تھا۔ نرملا منہ پھیرے کھڑی تھی مگر اس کے جسم کو یکبارگی رعشہ ستا رہا تھا کہ آفریدی کوئی عام شخص نہیں تھا۔ نرملا کی پرورش مردانہ انداز میں ہوئی تھی اور اس نے راج دربار میں سیکڑوں نوجوان راجپوتوں کو دیکھا تھا مگر ایک بار بھی نہ اس کے دل کی دھڑکنیں غیر متوازن ہوئی تھیں اور نہ آنکھوں کا زاویہ تبدیل ہوا تھا۔ پھر جسم و جاں میں یہ انقلاب کی لہریں کیوں اٹھ رہی تھیں۔ شناسائی اور وابستگی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ نرملا کو یقین آگیا تھا کہ وہ غیر شعوری طور پر علی عامر آفریدی سے وابستہ ہوچکی ہے ورنہ شرم و حیا اور گھبراہٹ کا یہ مظاہرہ ممکن نہیں تھا۔

"سردار! آپ کو زندگی کا یہ نیا دور مبارک ہو۔ روشن اور تابناک دور.........." نرملا کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔

"ہاں راج کماری! خدا نے میری بے کسی کی شرم رکھ لی۔۔" آفریدی نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھیں چھلک اٹھی تھیں مگر آفریدی کے یہ آنسو نرملا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ "اگر دینے والا آنکھوں کی روشنی واپس نہ دیتا تو زندگی کے اس بوجھ کو کس طرح اٹھائے پھرتا ؟ کون سہارا بنتا اور کب تک مجھے راستہ دکھاتا ؟ خدا نے میری والدہ اور بہن کی دعائیں سن لیں کہ ان کی دعاؤں کے بغیر تو میں ایک سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اب میں واپس جاسکوں گا۔ ان آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کیلئے جو میرے انتظار میں پتھرا گئی ہوں گی۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس کشمکشِ انتظار میں ان کے شب و روز کیسے گزرے ہوں گے۔ انہیں کس نے بتایا ہوگا کہ ان کا بیٹا اور بھائی زخموں کا کفن پہنے ایک تہہ خانے میں مجرموں کی طرح پڑا ہے۔ چتوڑ کی ہوائیں بھی اس طرف نہیں جاتی ہوں گی کہ انہیں آفریدی پر گزرنے والی قیامت کا علم ہوجاتا۔" آفریدی کے جذبات کا بند ٹوٹ گیا تھا اور اذیت و کرب کا کھولتا ہوا لاوا بہہ نکلا تھا۔

نرملا کی سانسیں رک گئی تھیں مگر اس نے مڑ کر آفریدی کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ جس کام سے یہاں آئی تھی اسے بھی فراموش کر دیا تھا اور آفریدی کے درد کی داستان اس طرح سننے لگی تھی جیسے اس کے اپنے غموں کی کہانی کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

"راج کماری! اب تو میں کسی کا سہارا لئے بغیر یہاں سے جاسکوں گا ؟" آفریدی نے پرجوش لہجے میں نرملا سے سوال کیا۔

"یقیناً! آپ اس تاریک زنداں سے باہر جاسکیں گے۔" نرملا نے اپنے جذبات پر قابو پالیا تھا اور ایک بار پھر اس کی آواز میں چٹانوں جیسی سختی آگئی تھی.......... "آپ کو کسی سہارے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔"

آفریدی چونک اٹھا۔ اب اس کے ذہن پر نرملا کے الفاظ کی گہرائیاں واضح ہوچکی تھیں..........

"راج کماری! معاف کیجئے گا' جب ٹھنڈی ہوا کا پہلا جھونکا آگ میں جلنے والے کسی انسان کے جسم کو چھوتا ہے تو وہ اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ اس اچانک ملنے والی خوشی نے مجھے کچھ دیر کیلئے پاگل سا کر دیا تھا۔ بہت دن بعد روشنی آئی ہے۔ اس لئے اپنے معمولی دکھوں کے سامنے آپ کے غموں کا پہاڑ نہیں دیکھ سکا۔"

"ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے غموں کا ایک پہاڑ کھڑا ہے۔ وہ کس کس کو دیکھے اور کسے کسے نظر میں رکھے۔" نرملا نے بڑے حوصلے کے ساتھ اپنے دکھوں کو صبر کی چادر میں لپیٹ لیا اور اس آگ کی طرف لوٹ آئی جس کی حرارت سے طلسم کدے کے در و دیوار تپنے لگے تھے۔ "کیا آپ کو اپنے کمرے کی فضا کچھ بدلی ہوئی محسوس نہیں ہوئی؟" نرملا نے آفریدی سے پوچھا۔

"میں تو بہت دیر سے گھٹن سی محسوس کر رہا ہوں۔ گرمی بھی معمول سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور لگتا ہے جیسے ہواؤں میں دھوئیں کی ناگوار بو شامل ہو گئی ہے۔" آفریدی نے حیران ہو کر کہا۔ "مگر آپ یہ سوال کیوں کر رہی ہیں؟"

"اس لئے کہ کل رات بھر منتری بھون کا فرش کھودا جاتا رہا اور اب اس کی دیواروں کو آگ لگا دی گئی۔" نرملا مڑی اور آفریدی کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "میں جانتی تھی کہ ایسا ہی ہو گا۔ ہمیں تلاش کرنے والے اتنی آسانی سے خاموش نہیں بیٹھیں گے۔"

"خدایا!" آفریدی کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ "ظلم کے ہاتھ بہت دراز ہو گئے ہیں۔ اب انہیں کاٹ دے کہ کہیں اہل چتوڑ تیری رحمتوں سے مایوس نہ ہو جائیں۔"

"ظلم تو اپنے وقت پر ہی فنا ہو گا مگر کیا آپ اس قابل ہیں کہ کسی کا سہارا لے کر باہر نکل سکتے ہیں؟" نرملا نے آفریدی کی باتوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"شاید!" آفریدی حیران و پریشان نظر آ رہا تھا۔

"ہمیں اس وقت تک ان کمروں سے باہر رہنا ہو گا جب تک آگ بجھ نہیں جاتی۔" نرملا نے کسی گھبراہٹ کا مظاہرہ کئے بغیر کہا۔ "یہ پورا طلسم کدہ فولاد و آہن سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس لئے ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ گرمی بڑھتی جائے گی اور پھر سانس لینا بھی دشوار ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر نرملا باہر نکلی۔ خادمہ رامیشوری اور چندر سنگھ دونوں اس کے منتظر تھے۔ "تم سردار آفریدی کو سہارا دے کر باہر لاؤ میں دروازہ کھولتی ہوں۔" نرملا تیزی سے آگے بڑھی اور اس نے وکرم سنگھ کے بتائے ہوئے طریقے سے ساتویں تہہ خانے کا دروازہ کھول دیا۔

پھر جب آفریدی' چندر سنگھ کے مضبوط بازوؤں کا سہارا لے کر باہر آیا تو باغ میں ہر طرف دھواں بھرا ہوا تھا۔ "مجھے زمین پر بٹھا دو چندر سنگھ! میرا دل ڈوب رہا ہے۔" آفریدی کے زخموں میں ٹیسیں ضرور اٹھ رہی تھیں مگر یہ تکلیف اس قدر ناقابل برداشت نہیں تھی کہ آفریدی جیسا مرد آہن چیخ اٹھتا وہ تو اس لئے چیخا تھا کہ رانی پدمنی اور رتن سنگھ نے اس کے محسنوں کے آشیانے کو پھونک ڈالا تھا اور نازل ہونے والے اس عذاب کا سبب محض اس کی ذات تھی۔ اگر وہ سلطان کا سفیر بن کر چتوڑ نہ آتا تو اس زمین کی کوکھ سے یہ خون رنگ مناظر بھی نہیں پھوٹتے۔ اسی احساس نے آفریدی کو چیخنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آگ کے شعلے اس عظیم انسان کی تاریخی یادگار کو چاٹ رہے تھے جس نے راجپوتوں کی اس طاقتور ریاست کی تعمیر کی تھی اور اب وہی معمار اپنے گھر سے دور جفا پرستوں کی قید میں زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا اور اس کی لاوارث بیٹی دھوئیں کے پار نیلے آسمان کو دیکھنا چاہتی تھی مگر آسمان نظر نہیں آ رہا تھا۔ رامیشوری اور چندر سنگھ گریہ و زاری کرتے ہوئے اپنی آقازادی کو تسلیاں دے رہے تھے لیکن نرملا خاموشی سے آسمان کی طرف

دیکھے جا رہی تھی۔ اسے کسی شور و فغاں کا احساس تک نہیں تھا آفریدی لرز اٹھا۔ ایسی ہولناک بربادی پر اس نے کسی عورت کو اتنا ثابت قدم نہیں دیکھا تھا۔ نرملا کی کشادہ آنکھیں ایک ہی نقطے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ چہرے پر خوں گشتہ حسرتوں کے رنگ ابھر ابھر کر ڈوب رہے تھے' لیکن زبان ساکت تھی۔ ہر شکایت سے آزاد اور ہر فریاد سے بے نیاز پھر بھی آفریدی کو محسوس ہوا کہ جیسے منتری بھون کی فضائیں ماتم کر رہی ہوں۔

دن گزرا تو رات بھی بھیانک مناظر پیش کرنے لگی۔ سورج ڈوب چکا تھا لیکن منتری بھون اپنی ہی آگ سے روشن تھا۔

☆..................☆..................☆

راج محل بھی روشن تھا اور وہاں ایک جشن کا سا سماں نظر آ رہا تھا۔ رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ اس طرح خوش تھے جیسے ان کے سپاہیوں نے علاءالدین خلجی کے لشکر پر غلبہ حاصل کر لیا ہو۔ رام دیو کی مسرت ناقابل بیان تھی اس کے دشمن کی آخری نشانی بھی مٹنے کے قریب تھی۔ رام دیو نے وکرم سنگھ سے اپنی توہین کا انتقام لے لیا تھا۔

"مہارانی کی فتوحات کا آغاز ہو چکا ہے۔" رام دیو نے پدمنی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

"منتری بھون کو جلتے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے ہیں مگر ابھی تک ہمارے کسی سپاہی نے راج دوت اور نرملا کے بارے میں کوئی خبر نہیں دی ہے۔" پدمنی خوش ہوتے ہوئے بھی ایک عجیب سی بے چینی کا شکار تھی۔

"بدنصیبوں کی خبر ہی کیا' کسی گوشے میں جل مرے ہوں گے۔" رام دیو مسکرایا۔ "سمراٹ! وکرم سنگھ کو زنداں کے جھروکوں سے یہ دلفریب منظر دکھائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ اپنی زبان بند نہیں رکھ سکے گا۔" رام دیو اذیت پسندی کی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔

راجہ رتن سنگھ کی آنکھیں چمک اٹھیں اور پدمنی کا چہرہ بھی فتح کے تصور سے سرشار نظر آنے لگا۔

"مہاراج کا یہ مشورہ کسی پتھر کی زبان کھولنے کیلئے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔" رتن سنگھ قہقہہ مار کر ہنسا اور اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جب چتوڑ کا حکمراں رانی پدمنی' رام دیو اور چند سپاہیوں کے ہمراہ وکرم سنگھ کے پاس پہنچا تو وہ زمین پر اوندھا لیٹا ہوا تھا اس کے بال' چہرہ اور کپڑے خون سے تر تھے۔

"وکرم سنگھ! اٹھو! میں تمہیں تمہاری زندگی کا سب سے دلنشیں منظر دکھاؤں۔" راجہ رتن سنگھ نے چیخ کر کہا۔

وکرم سنگھ کے جسم کو حرکت ہوئی اس نے گردن اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی مگر دوسرے ہی لمحے اپنا سر فرش پر رکھ دیا۔

"اٹھو چتوڑ کے عظیم سیاستداں! اور غور سے دیکھو کہ زمانہ کیسی چال چل گیا۔" رتن سنگھ دوبارہ چیخا مگر اس مرتبہ وکرم سنگھ نے اپنے سر کو جنبش تک نہیں دی۔

"اٹھو۔" رتن سنگھ نے آگے بڑھ کر ٹھوکر ماری۔ وکرم سنگھ کا جسم کانپا لیکن وہ سیدھا نہیں ہو سکا۔

راجہ رتن سنگھ نے دوسری ٹھوکر مارنا چاہی تو رام دیو بول اٹھا۔ "سمراٹ! شاید آپ کا مہامنتری آخری سانسیں لے رہا ہے۔"

رتن سنگھ ٹھہر گیا اور اس نے پلٹ کر سپاہیوں کو حکم دیا۔ "اسے اس کے قدموں پر کھڑا کرو اور دریچے کے قریب لے چلو۔" رتن سنگھ نے ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جہاں سے منتری بھون کے شعلے صاف نظر آ رہے تھے۔

وکرم سنگھ کو کھینچ کر کھڑکی تک لے جایا گیا۔ خون زیادہ خارج ہو جانے اور دو دن تک بھوکا رہنے کے سبب وکرم سنگھ کی جسمانی طاقت زائل ہو چکی تھی اور اب وہ اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا سارا بوجھ سپاہیوں کے ہاتھوں پر تھا۔

"وہ آگ دیکھ رہے ہو وکرم سنگھ؟" راجہ رتن سنگھ نے قریب آتے ہوئے کہا۔ رام دیو اور رانی پدمنی بھی مہامنتری کے نزدیک آ گئے تھے۔

وکرم سنگھ نے دھندلی آنکھوں کے ساتھ ان شعلوں کی طرف دیکھا جو پوری شدت سے بھڑک رہے تھے۔ "ہاں.......... دیکھ.......... رہا ہوں۔" وکرم سنگھ بمشکل تمام رک رک کر بول رہا تھا۔ "میرا گھر.......... جل.......... رہا.......... ہے۔" وکرم سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے لوہے کی سلاخوں کو پکڑ لیا۔ "بے ادبو! اپنے غلیظ ہاتھ ہٹالو میرے جسم سے۔ یہ وکرم سنگھ چوہان کا جسم ہے جو اس حالت میں بھی اپنا بوجھ خود اٹھا سکتا ہے۔" چند لمحوں کیلئے وکرم سنگھ کے ضعیف و ناتواں بدن میں قوی جلال کی آگ بھر گئی تھی۔ سپاہی ڈر کر پیچھے ہٹ گئے اور وکرم سنگھ اس طرح کھڑا رہا جیسے کوئی زرد پتہ آندھی میں کانپ رہا ہو۔

"میرا گھر جل رہا ہے رتن سنگھ میرا گھر جس کی بنیادوں میں خدا کے بندوں کا خون نہیں' میرے بزرگوں کا لہو شامل ہے۔ ایسی عمارتیں دنیا میں کبھی کبھی تعمیر ہوتی ہیں۔ اسے جل جانے دے کہ اس کی روشنی آنے والے قافلوں کو راستہ دکھائے گی۔ یہ مینارۂ نور ہے جو میرے مہمانوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ میرے محبوب مہمان' انہیں میرا اسلام پہنچے۔" یہ کہتے کہتے وکرم سنگھ کی آنکھیں اشکوں سے بھر گئیں۔ طاقتِ گفتار ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وکرم سنگھ دل کے زور سے بول رہا تھا۔ "اے میرے غمگسار چتوڑ کی آزاد ہواؤ! مہمانوں کو میری مجبوریاں بتا دینا کہ وقت کم تھا۔ اس لئے میزبان محفل سے اٹھ کر چلا گیا۔ اور یہ بھی کہہ دینا کہ وکرم سنگھ بہت مفلس تھا۔ اس کے پاس اجڑے ہوئے دل اور باپ دادا کے چھوڑے ہوئے گھر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے روشنی کیلئے دونوں کو جلا دیا۔" چند ساعتوں کیلئے وکرم سنگھ کے جسم میں جو شعلہ بھڑکا تھا وہ بجھ گیا اور لوہے کی سلاخیں اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئیں۔ وکرم سنگھ فرش پر گر گیا۔

"وکرم سنگھ!" رتن سنگھ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ "اس آگ میں تیری بیٹی جل رہی ہے اور وہ راج دوت بھی جس نے تجھ سے تیرے دیوتا چھین لئے۔ اگر انہیں بچا سکتا ہے تو بچا لے کہ ہمارے قہر کی آگ کو بجھانے والا کوئی نہیں۔"

"رتن سنگھ! تیری لگائی ہوئی آگ ان کے دامن کو کبھی نہیں چھو سکتی۔" وکرم سنگھ مسکرایا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

راجہ رتن سنگھ کو احساس شکست نے پاگل کر دیا تھا وہ دیوانوں کی طرح وکرم سنگھ کے ٹھوکریں مارتا رہا مگر مہامنتری نے زبان نہ کھولی۔ یہاں تک کہ اس کے ہوش و حواس رخصت ہو گئے اور جسم تازہ خون میں نہا گیا۔

☆..........☆..........☆

اس رات پورا چتوڑ جاگ رہا تھا۔ شہر کے باشندے شعلوں کا رقص دیکھ رہے تھے اور منتری بھون کے مکین بے گھر مسافروں کی طرح درختوں کے نیچے خاموش بیٹھے تھے۔ راج محل کا ایک مخصوص کمرہ روشن تھا جہاں رام دیو' رتن سنگھ سے پوچھ رہا تھا۔ "سرکار! آپ کے سپاہی بھان متی کا سر لے کر اب تک حاضر نہیں ہوئے؟ بمل شاہ کا مندر اتنی دور تو نہیں۔ کیا انہیں بھی وہ جادوگرنی کھا گئی؟" رام دیو کی آواز سے خوف جھلک رہا تھا۔

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے گھبرا کر رام دیو کی طرف دیکھا۔ وحشت سے دونوں کے چہرے زرد ہو گئے تھے۔

"یہ بہت غیر معمولی بات ہے۔" آخر رتن سنگھ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ "اب تک بمل شاہ کے مندر کے کئی پھیرے لگائے جا سکتے تھے۔"

"یقیناً۔" رانی پدمنی بھی بول اٹھی مگر اس کی آواز میں ٹھہراؤ نہیں تھا۔

رام دیو خاموش تھا وہ بار بار اپنی پیشانی کو رگڑ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے اعصاب پر وحشت مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ "ہمیں مزید سپاہی بھان متی کے قتل کیلئے روانہ کرنے ہوں گے۔" رام دیو نے شدید ذہنی کشمکش کے دائرے سے نکلتے ہوئے کہا۔ وہ سپاہیوں کے واپس نہ لوٹنے سے خوفزدہ تھا مگر راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ "ہمیں ہر حال میں بھان متی کا سر چاہئے۔ اس سے پہلے میرا کوئی منتر' کوئی جاپ کارگر نہیں ہو سکے گا۔ علاءالدین خلجی کے حملے کو روکنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ کوہ آبو میں بیٹھی ہوئی اس جادوگرنی کو ہلاک کر دیں۔ ورنہ.......... ورنہ.......... ورنہ.........." رام دیو نے انتہائی عیاری کے ساتھ بات کو الجھا دیا تھا۔

"ورنہ کیا ہو گا مہاراج؟" راجہ رتن سنگھ نے گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" رام دیو نے اپنی شعبدہ بازی کا مظاہرہ کرنے کیلئے اپنا دایاں ہاتھ اوپر کی جانب اٹھا دیا' جیسے وہ آسمان کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔ "ایشور کچھ بھی کر سکتا ہے' دیوتا ہم سے خفا بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے اتنے دن نافرمانوں کو چتوڑ کی دھرتی پر کیوں پناہ دی؟ یہ بڑا گناہ ہے اور بڑے گناہ کی سزا بھی ہمیشہ بہت دردناک ہوتی ہے۔"

رانی پدمنی برہم ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی بکھرتی ہوئی قوت برداشت کو سمیٹا۔ "مہاراج! بھگوان کیلئے اس انداز گفتگو کو ترک کر دیں۔ آپ کے گیان کی شکتیوں پر ہم میں سے کسی کو ہلکا سا بھی شک نہیں ہے۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ آپ ہی چتوڑ کی نیّا کے کھیون ہار ہیں مگر پتوار تو سنبھالئے' پانی تو دیکھئے کہ اس میں کیسے کیسے بھنور پڑ رہے ہیں۔" رانی پدمنی' رام دیو سے التماس کر رہی تھی مگر اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ شدید حالت بیزاری میں ہو اور اس صورت حال سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہو۔

رام دیو کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر نہایت گمبھیر لہجے میں کہنے لگا۔ "بھان متی اور آنند پال کا فتنہ بہت دن سے زیر زمین پرورش پا رہا تھا۔ اگر راج دوت کچھ دن اور چتوڑ نہ آتا تو ان دونوں کی بے وفائیوں پر اسی طرح پردہ پڑا رہتا۔ بھان متی اور آنند پال نے دیوتاؤں سے کئے ہوئے عہد بھلا دیئے تھے اور پھر وہ اس فکر میں تھے کہ کس طرح اپنے غلیظ جذبوں کو تسکین پہنچائیں اور چتوڑ کی آزادی کو مسلمانوں کے ہاتھوں فروخت کر دیں۔ اسی دوران جب علاءالدین خلجی کی فوجوں نے گجرات پر قبضہ کر لیا اور راجپوتوں کا ایک مضبوط ترین ستون گر گیا تو پھر بھان متی اور آنند پال کو اپنے خوابوں کی تعبیر سامنے نظر آنے لگی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ان دونوں نے مل کر اپنی روحانی طاقتوں کے ذریعے علاءالدین خلجی کو ورغلایا۔"

"ایک انسان سیکڑوں میل کے فاصلے سے دوسرے انسان کو کس طرح ورغلا سکتا ہے؟" رام دیو کی گفتگو مکمل ہونے سے پہلے ہی رانی پدمنی بول اٹھی' اسے رام دیو کی باتوں پر شک ہونے لگا تھا۔

رام دیو نے پدمنی کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔ "مہارانی! جس طرح آپ چتوڑ کے بیرونی نظام پر حکومت کرتی ہیں' اسی طرح ہم سادھو سنت لوگ اس نظام پر حکومت کرتے ہیں جو ظاہری آنکھ سے نظر نہیں آتا۔ یہ ایک مشکل گیان ہے جو اپنی ذات کو فنا کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ گیانیوں

کے اس طریقۂ کار کو ایک عام انسان نہیں سمجھ سکتا۔ " رام دیو نے ایک مضبوط دلیل پیش کی تھی جس کا رانی پدمنی کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔

پھر بھی وہ ایک ذہین عورت تھی۔ رام دیو کے جھوٹ کے انبار میں سے اس نے اپنے مطلب کی ایک بات نکال ہی لی۔ " مہاراج آپ کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھان متی اور آنند پال بھی گیان کی شکتی رکھتے تھے۔ "

" ہاں! انہیں شکتی حاصل تھی مگر تخریب اور گناہ کی شکتی۔ " رام دیو نے چند لفظوں میں آنند پال اور بھان متی کی نفی کر دی۔ " اپنی اسی تخریب و گناہ کی شکتی سے ان دونوں نے علاء الدین خلجی کو مہارانی چتوڑ کی طرف متوجہ کیا۔ راجپوتوں کی غیرت مند ملکہ کا چہرہ اسے خوابوں میں دکھایا کہ اس طرح علاء الدین کے ہوسناک جذبے مشتعل ہو جائیں گے اور پھر وہ چتوڑ پر لشکر کشی کر دے گا۔ "

" مہاراج! ہم نے تسلیم کر لیا کہ مذہب و وطن کے دو غداروں نے ہماری ذلت و تباہی کا یہ گھناؤنا منصوبہ بنایا تھا مگر آخر اس کا کوئی توڑ بھی ہے ؟ " اس بار راجہ رتن سنگھ نے زبان کھولی تھی اور واضح الفاظ میں رام دیو سے مدد کی درخواست کی تھی۔

" یہ طلسم پل بھر میں ٹوٹ جائے گا سمراٹ! مگر پہلے اس کی شرائط تو پوری کیجئے۔ " رام دیو نہایت اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ " مجھے اپنی زندگی کے اس خوفناک عمل کیلئے تین سر اور ایک جسم چاہئے۔ " گفتگو کے بے شمار پیچ و خم دینے کے بعد بالآخر رام دیو نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

" کس کے سر اور کس کا جسم ؟ " رانی پدمنی نے حیران ہو کر پوچھا۔

" بھان متی، وکرم سنگھ اور آفریدی کے سر۔ " رام دیو کے نفس کی تمام تر خباثت اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔

" آپ ان سروں کا کیا کریں گے ؟ " رتن سنگھ اور پدمنی دونوں پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔

" اصولی طور پر مجھے چوتھا سر بھی درکار تھا۔ " رام دیو نے اپنے گلے میں پڑی ہوئی یاقوت کی مالا سے کھیلتے ہوئے کہا۔

" وہ کس کا سر ہے ؟ " رانی پدمنی کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

" آنند پال کا سر کہ وہی اس طلسم کا بانی تھا۔ " رام دیو بہت تیزی سے مالا کو گردش دینے لگا۔

" ہم اس کا سر کہاں سے لائیں مہاراج کہ پاپی کی تو راکھ بھی ہوائیں اڑا کر لے گئیں۔ " راجہ رتن سنگھ شدید بے چارگی کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھوں کو رگڑ رہا تھا۔

" میں جانتا ہوں سمراٹ! میں جانتا ہوں۔ " رام دیو کے سیاہ اور بھدے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ " اسی لئے تو میں اصرار نہیں کر رہا ہوں۔ اگر میری جگہ کوئی دوسرا گیانی ہوتا تو آنند پال کا سر ضرور طلب کرتا۔ "

رتن سنگھ اور پدمنی کے چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

" مگر آپ ان سروں کا کیا کریں گے ؟ " چتوڑ کے حکمراں نے اس سنگدل جادوگر سے پوچھا جس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک حرف پُراسرار تھا۔ " میں آفریدی کا سر کہاں سے لاؤں گا۔ بھان متی اور وکرم سنگھ کے سر تو پیش کئے جا سکتے ہیں۔ " اچانک ایک اور الجھن کھڑی ہو گئی تھی جس نے رتن سنگھ اور پدمنی کی امیدوں پر خاک ڈال دی تھی۔

" سمراٹ! یہ آپ کا مسئلہ ہے ؟ " بے ضمیر اور عیار انسانوں کی طرح رام دیو نے فوراً ہی آنکھیں پھیر لی

تھیں۔.......... " دنیا کا ہر گیانی جانتا ہے کہ ہر منتر اور ہر جاپ کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں، کچھ شرائط ہوتی ہیں اگر ان میں سے کوئی بھی اصول ترک ہو جائے یا کوئی بھی شرط پوری نہ کی جائے تو پھر ناکامی کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ ساری عمر ریاضت کرتا رہے، اپنی زبان گھس ڈالے یہاں تک کہ آتما بھی تیاگ دے مگر کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ میں تو صرف آپ کی خاطر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہوں۔ اس عمل میں میری اپنی جان کے زیاں کا بھی اندیشہ ہے لیکن اپنے مذہب اور اہلِ وطن کو سُرخرو دیکھنے کیلئے میں یہ خطرہ بھی مول لے لوں گا۔ " رام دیو نے ایک بار پھر انتہائی چالاکی سے رتن سنگھ اور رانی پدمنی کے کاندھوں پر اپنے احسانات کا بوجھ لاد دیا تھا۔

پدمنی نے رام دیو کی طرف ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا اور تلخ لہجے میں کہنے لگی.......... " مہاراج! ہم آپ کے جاپ کیلئے صرف دو سر پیش کر سکتے ہیں، بھان متی اور وکرم سنگھ کے سر۔ اگر ان دونوں سروں سے آپ کے گیان کی پیاس بجھ سکتی ہے تو بجھا لیجئے ورنہ چتوڑ کو تنہا چھوڑ دیجئے۔ ہماری بہادر افواج آخری سانس تک علاء الدین کے لشکر کا مقابلہ کریں گی۔ اب کسے فتح حاصل ہوگی اور کون ہار جائے گا یہ مقدرات کی بات ہے۔ " اتنا کہہ کر رانی پدمنی اپنی خواب گاہ میں جانے کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

رام دیو اپنے شکار کو اتنی آسانی کے ساتھ چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ " مہارانی! آپ غلط مشیروں کی وجہ سے مسائل کے جال میں گھر گئی ہیں، اس لئے ہمت شکن باتیں کر رہی ہیں۔ مایوسیوں کے گہرے اندھیرے کے سبب آپ کو ہماری شخصیت نظر نہیں آتی ورنہ ساری بستی جانتی ہے کہ ہم جیسے گیان والے قسمت کے لکھے کو بھی مٹا دیتے ہیں۔ " رام دیو مکر و فریب کا نیا چولا پہن کر بولا.......... " اگر چتوڑ دشمنوں سے محفوظ رہا تو اس کے پیچھے ہماری ہی طاقت کارفرما ہوگی۔ ہماری تپسیا اور شکتی کو اس طرح نہ جھٹلائیں۔ منہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی۔ " اتنا کہنے کے بعد رام دیو بھی ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

" کل دن کے ٹھیک بارہ بجے دونوں نحس ستاروں شنی اور منگل (زحل و مریخ) کا میل ہے۔ شترو کا ناش کرنے کیلئے اس سے بہتر گھڑی اگر کوئی ہے تو برسوں بعد آئے گی۔ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ یہ میرا اہلِ چتوڑ پر آخری کرم ہے۔ آپ بھان متی اور وکرم سنگھ کے سر کل بارہ بجے تک کمبھ شیام کے مندر پہنچوا دیجئے۔ " رام دیو نے آفریدی کا سر کم کر دیا تھا۔

رانی پدمنی کے چہرے پر گمشدہ مسرتوں کے سائے لوٹ آئے.......... " مہاراج! واقعتاً سیاسی مسائل نے ہمارا ذہنی سکون برباد کر دیا ہے ورنہ آپ کی شان میں اس گستاخی کے مرتکب نہیں ہوتے۔ " پدمنی معذرت کا اظہار کر رہی تھی۔

" ہر گزرنے والی ساعت کو فراموش کر دیجئے۔ چتوڑ آپ کا ہے اور آپ ہی کا رہے گا۔ ہمارا کیا ہے، سارا جیون جوگ میں بیتا ہے، باقی دن بھی سنیاس لے کر گزار دیں گے۔ ایک بار پھر اپنے سر کا بوجھ بھی اتار دیں گے۔ آکاش سے پار چلے جائیں گے۔ دھرتی کے باسیوں نے ہماری قدر نہیں کی۔" رام دیو اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے وہ تمام عمر مخلوقِ خدا کا درد اپنے سینے میں چھپائے پھرتا رہا ہو اور اب اس درد کی شدت سے تنگ آ کر مرنے کی دعائیں کر رہا ہو۔

" نہیں مہاراج! ایسی نامبارک باتیں اپنی زبان پر نہ لائیں۔ " رانی پدمنی نے جوشِ عقیدت میں دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ " ہم پر اور اہلِ چتوڑ پر آپ کی نیکیوں کا سایہ ہمیشہ پھیلا رہے۔ "

رام دیو نے بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے کمرے کے وسط میں آویزاں ہفت رنگ قیمتی فانوس کو دیکھا اور پھر انتہائی کریہہ آواز میں چیخ ماری۔

"جے جگ دمبیے .... جے جگ دمبیے۔"

چیخ کیا تھی کسی جنگلی جانور کی دھاڑ تھی۔ رتن سنگھ اور پدمنی اچھل پڑے اور دوسرے ہی لمحے وہ فانوس فرش پر گر گیا جسے رام دیو گھور رہا تھا۔ رام دیو کی شعبدہ بازی رنگ لائی فانوس اپنی جگہ قائم تھا مگر رتن سنگھ اور رانی پدمنی اسے کھلی آنکھوں سے ٹوٹ کر بکھرتے دیکھ رہے تھے۔ رام دیو نظر بندی کے فن میں طاق تھا۔ وہ جس شخص کو جو کچھ دکھانا چاہتا تھا اس کی آنکھیں وہی منظر دیکھتی تھیں۔ رانی پدمنی نے بھی وہی دیکھا جو رام دیو نے اسے دکھایا ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پائی تھی کہ رام دیو نے اپنی چادر کا پلو ایک جھٹکے کے ساتھ کاندھے پر ڈالا اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں خوشبودار دھواں بھر گیا۔ اہل چتوڑ اس دھویں کو مقدس دھواں کہتے تھے۔ راجپوتوں کے بقول اس دھویں سے رام دیو نے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے۔ ریاست پر حملہ آور فوجوں کو وقتی طور پر اندھا کر دیا تھا اور جب چتوڑ کے دشمنوں کو راستہ نظر نہیں آیا تو وہ ناکام و نامراد واپس چلے گئے۔ اس طرح ہر طرف رام دیو کی "جے جے کار" ہونے لگی اور وہ ساحر اعظم قرار دیدیا گیا۔
رام دیو کا مقدس دھواں اس وقت بھی بہت کام آتا تھا جب کوئی ہندو دوشیزہ پہلی بار اپنا پاٹھ پڑھنے کیلئے آشرم میں داخل ہوتی تھی اور اس معصوم لڑکی کو اسی مقدس دھویں کے ذریعے بے ہوش کر دیا جاتا تھا۔
الغرض یہ دھواں رام دیو کی سب سے بڑی شکتی تھی اور اپنی اس شکتی پر وہ بہت نازاں رہا کرتا تھا مگر جب اس نے آفریدی پر اسی مقدس دھویں کو آزمایا تو سب کچھ رائیگاں گیا اور رام دیو کی شکتی کا سارا بھرم کھل گیا۔
رام دیو اپنی اس شکست پر بہت شرمسار تھا لیکن اس کی یہ ذلت چند افراد تک محدود تھی۔ رانی پدمنی اور رتن سنگھ، رام دیو کی طرف سے مشکوک ہوگئے تھے مگر اس نے علی عامر آفریدی کو بڑا جادوگر کہہ کر اپنی شکست کی پردہ پوشی کی۔ رانی پدمنی رام دیو کی اندھی عقیدت مند تھی اس لئے دوبارہ بہت جلد فریب میں آگئی۔ پدمنی کے اسی شبہ کو زائل کرنے کیلئے رام دیو نے نئے انداز سے اپنی شعبدہ بازی کا مظاہرہ کیا تھا۔ پہلے اس نے فانوس توڑا اور پھر کمرے کو دھویں سے بھر دیا۔

"مہاراج!" رتن سنگھ اور پدمنی پُرجوش انداز میں چیخے۔

"سمراٹ! میں جارہا ہوں علاءالدین کی بڑھتی ہوئی فوجوں کو روکنے کیلئے آپ اپنا کام جاری رکھیں۔"

رانی پدمنی اپنے روحانی پیشوا کو پکارتی رہ گئی۔ مگر رام دیو اس آشرم کی طرف چلا گیا جو کچھ دن پہلے سیاہ آندھی میں تباہ ہو گیا تھا اور جسے رتن سنگھ نے دوبارہ تعمیر کرا دیا تھا۔ اس آشرم میں رام دیو کا کوئی چیلا تو موجود نہیں تھا لیکن کئی دیوداسیاں اس کی خدمت کیلئے حاضر رہتی تھیں۔
رام دیو کے جانے کے بعد دھواں آہستہ آہستہ فضاؤں میں تحلیل ہو گیا۔ رانی پدمنی کے چہرے پر ناقابل بیان مسرت رقص کر رہی تھی۔ اس نے بڑے نازو ادا کے ساتھ اپنے شوہر کی طرف دیکھا مگر رتن سنگھ کی بے قرار نظریں کبھی کمرے کے فرش کی طرف دیکھتی تھیں اور کبھی اس فانوس کی طرف جو پہلے کی طرح کمرے کے وسط میں آویزاں تھا۔

"مہارانی! یہ فانوس تو ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ ہم نے خود اسے ریزہ ریزہ ہوتے دیکھا تھا اور شیشوں کے چٹخنے کی آوازیں بھی سنی تھیں۔ پھر یہ کیا ہوا کہ فانوس سالم و ثابت نظر آرہا ہے۔" رتن سنگھ حیران و پریشان کھڑا تھا۔

"سمراٹ! یہ سب مہاراج کی شکتی کا ایک ادنیٰ سا مظاہرہ ہے۔" رانی پدمنی کسی سادہ لوح عورت کی طرح رام دیو کی شعبدہ بازی سے بہل گئی تھی.......... "اب آپ کسی شک میں مبتلا نہ ہوں۔ مہاراج

اول و آخر ایک مہان پرش ہیں۔ وہی چتوڑ کو اس سنکٹ سے نکال سکتے ہیں.........." رانی پدمنی، رام دیو کی پرزور وکالت کر رہی تھی.......... "جو شخص ایک نظر سے شیشے کو توڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ اسے دوبارہ جوڑ بھی سکتا ہے یہی مہاراج کا کمال ہے۔"

"یقیناً۔" راجہ رتن سنگھ بے دست و پا نظر آرہا تھا۔ "ہم مہاراج کے گیان کے کب قائل نہیں رہے۔ آج تک ان ہی کی بات تو چتوڑ میں اونچی رہی ہے۔ اب بھی وہی سربلند رہیں گے۔ ہم تو ان کے سیوک ہیں۔" رتن سنگھ ایک بار پھر رام دیو کی شعبدہ بازیوں کا مکمل اسیر نظر آرہا تھا۔

"تو پھر بھان متی کے قتل کیلئے دوسرے سپاہی روانہ کر دیجئے۔" پدمنی نے رام دیو کے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کیلئے پہلا قدم اٹھایا۔

"سپاہی تو کب کے بھیجے جاچکے مگر ان میں سے ایک بھی لوٹ کر نہیں آیا۔" یکایک رتن سنگھ وحشت زدہ سا دکھائی دینے لگا۔

اس سلسلے میں رانی پدمنی خود بھی پریشان تھی مگر اس نے دل کو سمجھانے کیلئے نئے زاویے سے سوچنے کی کوشش کی۔ "سمراٹ! ہوسکتا ہے کہ وہ چاروں سپاہی بھی درپردہ اس طوائف زادی کے عقیدت مند ہوں اور اس بہانے بھان متی سے جاکر مل گئے ہوں۔"

"مہارانی!" رتن سنگھ کی آواز اونچی تھی اور لہجہ تلخ ہو گیا تھا.......... "اگر سب کچھ درپردہ ہی ہورہا ہے تو پھر ہمارے سامنے جھکنے والے کون لوگ ہیں؟ ان کے چہروں پر کیا لکھا ہے اور ان کے دلوں میں کیسا نفاق چھپا ہے؟ ہم کچھ بھی نہیں سمجھے۔"

"سمراٹ! میں نے تو صرف ایک خیال ظاہر کیا تھا۔" رانی پدمنی کے لہجے سے تشویش جھلک رہی تھی۔
"آپ دوسرے سپاہیوں کا ایک دستہ روانہ کر دیں، پھر یہ سارا عقدہ کھل جائے گا۔"

"کیسی عجیب بات ہے ایک بوڑھی عورت کو قتل کرنے کیلئے فوجی دستے روانہ کئے جارہے ہیں۔" رتن سنگھ شعلے کی طرح بھڑک اٹھا اور پھر اس نے شدید عالم طیش میں پچاس بہترین شمشیرزنوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "اس خبیث جادوگرنی کا سر کاٹ کر ہمارے حضور پیش کرو اور ان چاروں نمک حراموں کی لاشیں کھینچتے ہوئے لاؤ جو ہماری پناہ سے نکل کر ایک ویشیا کے شرن میں چلے گئے ہیں۔"

سپاہیوں کو رخصت کرنے کے بعد راجہ رتن سنگھ نے پدمنی کی طرف دیکھا.......... "کیا تم اپنے چچا وکرم سنگھ کے اس لرزہ خیز انجام کو خوشی سے قبول کرلو گی؟"

"اس سے میرا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔" رانی پدمنی نے غضبناک لہجے میں جواب دیا۔ "اگر یہ رشتہ قائم بھی رہتا تو راج نیتی اس رشتے کو قبول نہیں کرتی۔ اقتدار جذبوں سے نہیں دماغ سے برقرار رہتا ہے۔ چتوڑ کی سلامتی پر ایک وکرم سنگھ کیا ہزاروں وکرم سنگھ قربان کئے جاسکتے ہیں۔"

رتن سنگھ نے تحسین آمیز نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا.......... "ہمیں تم پر فخر ہے پدمنی! ہم نے اسی دن کیلئے تمہیں اپنا شریک زندگی بنایا تھا۔ دیوتاؤں کا کرم ہے کہ ہماری نگاہِ انتخاب نے دھوکا نہیں کھایا۔"

☆..........☆..........☆

رات کا قافلہ اپنے آخری مرحلے سے گزر رہا تھا۔ نرملا کماری، علی عامر آفریدی، خادمہ رامیشوری اور چندر سنگھ ایک لمحے کیلئے بھی نہیں سوئے تھے اور سوتے بھی کس طرح کہ منتری بھون جل رہا تھا۔ طلسم کدے کی آہنی دیواریں تپ رہی تھیں اور اس کے چاروں مکین درختوں کے نیچے بیٹھے اپنے اپنے خیالات میں گم

تھے۔

"راج کماری! مجھے اجازت دیں تو میں باہر نکلنے کی کوشش کروں" چندر سنگھ نے اس سکوت کو توڑا۔

"تم کہاں جاؤ گے چندر سنگھ! اس آگ نے تو کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑا ہے۔" نرملا بہت آہستہ بول رہی تھی۔ "اور اگر آگ بجھ بھی گئی تو کیا حاصل ہو گا؟ جسے جلنا تھا جل گیا اور جسے جانا تھا چلا گیا۔" نرملا کے لہجے میں نہ سوگواری تھی اور نہ لرزش۔ اس نے اپنا غم سینے کی گہرائیوں میں دفن کر دیا تھا مگر پھر بھی آنکھیں بہہ رہی تھیں کہ آنسوؤں پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ اگر وہ اشکوں کو پی لیتی تو پتھر کی ہو جاتی اور ابھی پتھر بن جانے کا موسم نہیں آیا تھا۔

"میں تو صرف اس لئے باہر جانا چاہتا ہوں کہ مالک کی خبر گیری کر سکوں۔" چندر سنگھ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور ہچکیوں سے رونے لگا۔ "خدا جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔"

"چندر سنگھ!" اچانک نرملا کی آواز سخت ہو گئی تھی۔ "میرے غم کو تماشا نہ بناؤ۔ مجھے خبر ہے کہ مہامنتری کس حال میں ہوں گے؟ باغیوں کا ایک ہی حال ہوتا ہے۔ زنداں سے گزرے تو مقتل جا پہنچے۔ پتاجی بھی اپنی منزل کی جانب گامزن ہوں گے اور ممکن ہے کہ ان کا سفر ختم بھی ہو گیا ہو۔ ایسے مسافروں کو تلاش نہیں کیا جاتا جو واپسی کے تمام دروازے بند کر کے اپنے گھر سے نکلتے ہیں۔"

چندر سنگھ پھر کچھ نہیں بولا اور فضائیں دوبارہ ساکت ہو گئیں۔ آفریدی، نرملا سے اظہار ہمدردی کرنا چاہتا تھا مگر نرملا کے ضبط غم کا انداز دیکھ کر وہ بھی اپنے ہونٹوں کو جنبش نہ دے سکا۔ اندھیروں کے مسافر قریب قریب بیٹھے تھے لیکن تاریکی نے ان کے چہرے ایک دوسرے سے چھپا لئے تھے اگر چہروں سے سیاہی کی چادر ہٹ جاتی تو آفریدی، رامیشوری اور چندر سنگھ کو اندازہ ہوتا کہ پتھر کے ایک مجسّمے میں کتنے شگاف پڑ گئے ہیں اور مجسّمے کی آنکھوں سے پانی نہیں خون بہہ رہا ہے۔

☆..................☆..................☆

علاء الدین خلجی کا لشکر راستے میں خیمہ زن تھا۔ فوجیوں کی اکثریت محوِ خواب تھی اور کچھ سپاہی مختلف خیموں پر پہرہ دے رہے تھے۔ حضرت امیر خسروؒ علاء الدین خلجی کے خیمے میں موجود تھے اور تہجد کی نماز ادا کر رہے تھے۔ جب آپ نماز اور دعا سے فارغ ہوئے تو علاء الدین نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"خسرو! تم نے اپنی دعاؤں میں کیا مانگا؟"

"اپنے سلطان کی بلند اقبالی۔" امیر خسروؒ نے جواباً کہا۔

علاء الدین مسکرایا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ "خسروؒ! حضرت شیخ نے ہماری اس مہم کے بارے میں کیا فرمایا تھا؟" علاء الدین بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا اگرچہ امیر خسروؒ سلطان کو کئی بار حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاؒ کے فرمودات سنا چکے تھے لیکن سلطان ایک مردِ کامل کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ بار بار سننا چاہتا تھا۔

"سلطان! پیرو مرشد نے عظیم الشان فتح کی خبر دی ہے۔ فرمایا ہے کہ مسلمان سپاہیوں کو دیکھ کر اراولی پہاڑ کی ساری بلندیاں زمیں بوس ہو جائیں گی اور سلطان کا پرچم قلعہ چتوڑ پر اس طرح لہرایا جائے گا کہ کسی آنکھ نے اس سے پہلے یہ منظر نہیں دیکھا ہو گا۔ سلطان جدھر سے گزریں گے ان کی بلند اقبالی کے چرچے ہوں گے اور راجپوتوں کی گردنیں اس طرح جھک جائیں گی کہ سلطان کے جاہ و جلال کے سوا کچھ باقی نہیں رہے گا۔"

"کیا حضرت شیخ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ معرکہ آرائی میں ہمیں بہت دشواریاں پیش آئیں گی اور ہماری

جان کو بھی خطرہ لاحق ہو جائے گا۔" علاء الدین خلجی ابھی تک مطمئن نہیں ہوا تھا وہ تو سارے راستے حضرت نظام الدین اولیاؒ کی باتیں سننا چاہتا تھا کہ اس طرح اس کے جذبۂ تسخیر کی تسکین ہوتی تھی اور نئی منزلوں کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے اعصاب پر ہلکا سا جو فطری خوف مسلط تھا سلطان اسے مکمل طور پر زائل کرنا چاہتا تھا۔

"ہر بڑی فتح میں دشواریاں تو پیش آتی ہیں۔" حضرت امیر خسروؒ نے کہا "مشکلیں جس قدر زیادہ ہوں گی، فتح اتنی ہی رنگین ہو گی، سختیاں آئیں گی مگر سلطان کا سایہ پڑتے ہی موم ہو جائیں گی۔ دشمن اپنے تمام حربے استعمال کر ڈالیں گے مگر سلطان کے جسم کو خراش تک نہیں پہنچے گی۔"

"ایسا ہی ہو گا خسرو! ایسا ہی ہو گا۔" علاء الدین نے جوشِ اضطراب میں زمین پر سر رکھ دیا۔ جیسے وہ اپنے خدا کا شکر ادا کر رہا ہو.......... "خسرو! چتوڑ پامال ہو جائے گا اور ہم دنیا میں فتوحات کی ایک نئی تاریخ لکھیں گے....." سلطان نے سر اٹھا کر کہا اور بے تابانہ اپنے خیمے میں ٹہلنے لگا۔

☆..................☆..................☆

رات گزر چکی تھی اور اندھیرے میں روپوش ہو جانے والے منظر صاف نظر آنے لگے تھے۔ رات بھر جاگنے کے اثر سے منتری بھون کے مکینوں کے چہرے بجھے بجھے نظر آ رہے تھے۔ آگ کے شعلے دم توڑ چکے تھے دھواں اب بھی اٹھ رہا تھا جو چیزیں راکھ ہونے سے بچ گئی تھیں وہ مسلسل سلگ رہی تھیں۔ نرملا کماری نے باغ کے آخری گوشے تک جا کر دیکھا مگر اسے منتری بھون کا کوئی مینار نظر نہیں آیا۔ طلسم کدہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ اس طرف محل کے دوسرے حصے کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی تھی بس ایک طویل اور اونچی دیوار تھی جو طلسم کدے اور منتری بھون کو آپس میں اس طرح جوڑتی تھی کہ دونوں ایک ہی عمارت کا حصہ ہوتے ہوئے بھی الگ الگ تھے۔ کچھ دیر تک اپنے بزرگوں کی نشانی کی بربادی کا منظر دیکھنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی علی عامر آفریدی کے نزدیک آئی اس دوران ملازمہ رامیشوری اور چندر سنگھ شکم کی آگ بجھانے کیلئے باغ کے درختوں میں لگے ہوئے پھل توڑنے چلے گئے تھے۔ نرملا کو اپنی طرف آتے دیکھ کر آفریدی اٹھ بیٹھا۔

"آپ کیسے ہیں سردار؟" نرملا نے نظریں جھکاتے ہوئے پوچھا۔ آفریدی نے نرملا کے بدلے ہوئے اس طرزِ عمل کو شدت سے محسوس کیا۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کرنے والی دوشیزہ اب ایک نوجوان مرد سے نگاہیں چرا رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں راج کماری مگر آپ کا غم برداشت نہیں ہوتا۔"

"جب مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے تو آپ میرے بارے میں کیوں پریشان ہیں۔" اس بار نرملا نے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کون پریشان ہو گا؟" آفریدی کی آواز میں ساری دنیا کا درد سمٹ آیا تھا.......... "مہامنتری کے بعد اس دنیا میں آپ کیلئے پریشان ہونے والا میرے سوا دوسرا کون ہے؟" آفریدی نے جوشِ جذبات سے ایک نازک بات کہہ دی تھی۔

نرملا نے چونک کر شاہی سفیر کی طرف دیکھا.......... "سردار! آپ غلطی پر ہیں غور سے دیکھئے۔ رامیشوری اور چندر سنگھ میری خاطر کیسا عذاب جھیل رہے ہیں کیا آپ کو ان کے چہرے جذبات سے عاری نظر آتے ہیں؟"

"میں ان کی وفاؤں پر شک نہیں کرتا.........." آفریدی کچھ سراسیمہ سا نظر آنے لگا تھا۔ مگر فوراً

سنبھل کر بولا۔ "ہر شخص کے جذبوں کی اپنی حدود ہوتی ہیں۔ وہ یقیناً آپ کی خاطر اپنی جانوں سے گزر جائیں گے لیکن کسے معلوم کہ یہ جاں نثاری کا طوفان کہیں اور بھی اٹھ رہا ہو۔ ایسا طوفان جسے وقت کے بھاری پتھروں نے اسے اس کے کناروں میں قید کر دیا ہو۔ طوفان کی مجبوریوں کی کسی کو خبر نہیں۔ کاش! وہ موجیں آزاد ہوتیں تو دریاؤں میں انقلاب آجاتا۔ ایسے بھنور پڑتے کہ سارا پانی تہ وبالا ہو کر رہ جاتا اور دنیا والوں کے بنائے ہوئے تمام سنگی کنارے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ...." آفریدی بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔

"طوفان کو خاموش رہنا چاہئے کہ خاموشی سے ہی اس کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔" نرملا' آفریدی کی باتوں کا مفہوم سمجھ گئی تھی۔ اس لئے نظریں جھکا کر بول رہی تھی۔ "جذبے اپنے آپ کو ظاہر کیوں کرتے ہیں کہ اس طرح تو ان کے نمائشی ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔"

"اظہار بھی ضروری ہے راج کماری!" آفریدی کا لہجہ شدید اضطراب کی عکاسی کر رہا تھا........ "ہم خدا نہیں ہیں کہ دلوں کا حال جان لیں۔ عہد اور اقرار اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب دل اور زبان دونوں گواہی دیں۔" آفریدی کی دلیل پر نرملا چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ "آپ کا گھر جل رہا ہے اور میں خاموش بیٹھ کر یہ ثابت کرتا رہوں کہ میرا دل جل رہا ہے۔ کیا میں جذبوں کے اسی انداز پر قناعت کرلوں؟ نہیں راج کماری! میری زبان کو بھی جل جانا چاہئے۔ پھر دیکھنے والا خود اندازہ کرے گا لفظ جھوٹے ہیں اور جذبے نمائشی ہیں۔ آپ کی غیرت وخودداری کو آفریدی کا سلام مگر اپنے غموں پر اتنے تاریک پردے نہ ڈالیں کہ آپ کا کوئی ہمدرد انہیں دیکھ ہی نہ سکے۔ اپنی ذات کے گرد کھینچا ہوا یہ دائرہ آپ کو ایک دن تنہا کر دے گا اور پھر یہ تنہائی آپ کو نفرت وبیزاری کے سوا کچھ نہیں دے گی۔ یہاں تک کہ دنیا سے آپ کا اعتبار اٹھ جائے گا۔ اگر میں لائق اعتبار نہیں تو خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ کسی کو بھی معتبر سمجھ کر اپنے غموں کا شریک بنا لیجئے۔"

"اپنے آپ کو درمیان میں کیوں لاتے ہیں؟" نرملا کے لہجے سے شکایت جھلکنے لگی تھی۔ "اگر آپ پر اعتبار نہیں ہوتا تو اپنا مذہب کیوں چھوڑتی؟ اقتدار کو کیوں ٹھکراتی؟" یہ کہہ کر نرملا نے منہ پھیر لیا۔ وہ آنسوؤں کو آفریدی سے چھپانا چاہتی تھی۔

"تو پھر خاموش نہ رہیں' بولتی رہیں' خیالات کو منتشر ہو جانے دیں' انہیں ایک نقطے پر سمٹنے کی کوشش نہ کریں کہ ہواؤں میں بڑا زہر شامل ہے اگر یہ زہر آپ کے دل میں اتر گیا تو میں بھی ایک زندہ لاش بن کر رہ جاؤں گا۔ آپ اس عظیم انسان کی امانت ہیں جس کے احسانات کے بوجھ سے نہ میرا سر اٹھ سکتا ہے اور نہ میری روح آزاد ہو سکتی ہے۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں اس امانت کو اس جفا پرست اور احسان ناشناس زمانے کے حوالے کر کے خائنوں کی قطار میں کھڑا ہو جاؤں اور پھر اپنا ایمان برباد کر ڈالوں؟"

"میں جانتی ہوں' میں جانتی ہوں۔" نرملا نے حالتِ اضطراب میں درخت کا سہارا لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ "سردار! آپ نہیں جانتے کہ میری پرورش کیسے ماحول میں ہوئی ہے اور ان آنکھوں نے چتوڑ میں کیا کیا مناظر دیکھے ہیں' مجھے تو دیوتاؤں کی پرستش کے دور میں بھی اس دنیا سے نفرت تھی۔ کس سے کہتی کہ دل پر کیا گزرتی ہے؟ ایک سننے والا تھا وہ بھی چلا گیا۔"

"جانے والا کہیں نہیں گیا۔" آفریدی اس حوصلہ مند دوشیزہ کی غم گساری کر رہا تھا جو اپنے ارادوں میں ایک چٹان تھی مگر آج غموں کی یلغار نے اسی چٹان میں ہلکی ہلکی دراڑیں ڈالنا شروع کر دی تھیں۔ "وہ تو ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہے اور ہماری نظروں کے سامنے متحرک ہے۔ اس کا مقام ہمارا دل ہے اور وہ

دلوں سے کبھی نہیں جائے گا۔"

بے غرض محبت کے اظہار نے نرملا کی پلکیں بھگو دیں۔ صدمات کا غبار جو پتھر کی طرح جمتا جا رہا تھا' خلوص کے لہجے کی حرارت سے پگھلنے لگا مگر آنکھوں کی یہ نمی بہت عارضی تھی۔ یادوں کے شدید حبس کے بعد جذبات کے بادل اٹھے لیکن چند بوندیں برسا کر گزر گئے۔ نرملا کو آفریدی سے حجاب آنے لگا تھا وہ کھل کر نہ رو سکی۔ پھر بھی غموں کی تپش کچھ کم ہو گئی تھی۔

"رات کے پچھلے پہر کچھ دیر کیلئے میری آنکھ لگ گئی تھی میں نے خواب میں دیکھا کہ جس سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھی ہوں' وہ اچانک جڑ سے اکھڑ گیا ہے اور میں اس کی شاخوں میں دبی چیخ رہی ہوں۔" اچانک نرملا نے آفریدی کو اپنا خواب سناتے ہوئے کہا۔ "یہ میری پریشان خیالی ہے یا اس خواب کا حقیقت سے کوئی تعلق ہے؟"

آفریدی' نرملا کا خواب سن کر چونک اٹھا مگر اس نے فوراً ہی اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانے کی کوشش کی اور نرملا کے اطمینان کیلئے کہنے لگا۔ "راج کماری! آپ پریشان نہ ہوں یہ محض منتشر خیالات ہیں جو خوابوں کی شکل میں ڈھل گئے ہیں۔"

"نہیں سردار! یہ میرا واہمہ نہیں۔ آندھی آچکی اور درخت گر چکا۔" نرملا کے ہونٹ بھنچ گئے اور وہ مندری بھون سے اٹھنے والے دھوئیں کو دیکھتی ہوئی اس طرف چلی گئی جہاں رامیشوری اور چندر سنگھ کھانے کیلئے پھل تلاش کر رہے تھے۔

☆............☆............☆

پورا راج محل پرسکون تھا مگر راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا اور بمل شاہ کے مندر کی طرف جانے والے سپاہیوں کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ بھان متی کو قتل کرنے کیلئے جو چار سپاہی ایک دن پہلے بھیجے گئے تھے وہ بھی واپس نہیں آئے تھے اور پھر ان کے تعاقب میں بھیجے جانے والے پچاس فوجی بھی ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔

رام دیو اطمینان سے اپنے آشرم کے ایک کمرے میں کسی دیوداسی سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھ رہا تھا کہ بارہ بجنے میں ابھی کتنی دیر ہے۔ دیوداسی جس کی زندگی تباہ کر دی گئی تھی' بادل ناخواستہ بتا رہی تھی کہ سورج کافی اوپر آچکا ہے اور دس بجے کا عمل ہوگا۔ رام دیو نے اس مجبور لڑکی کا جواب سن کر درندوں کی طرح اپنے دانتوں کی نمائش کی تھی اور پھر وحشیانہ انداز میں قہقہہ مارتے ہوئے کہا تھا۔

"بس دو گھنٹے باقی ہیں اس کے بعد ہمیں ان دونوں احمقوں سے نجات مل جائے گی۔"

رانی پدمنی اور رتن سنگھ پر ایک ایک لمحہ گراں تھا۔ راجپوت سمراٹ نے گھبرا کر اپنے محافظ دستے کے دو سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ کوہ آبو کی طرف جانے والے سپاہیوں کو تلاش کر کے اسے فوری مطلع کریں۔ محافظ دستے کے سپاہی قلعے سے نکل کر تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ انہیں ایک شہسوار بہت تیزی سے قلعے کی جانب بڑھتا ہوا نظر آیا اس نے محافظ سپاہیوں کے روکنے پر کچھ مبہم سی بات کی اور پھر گھوڑے سے اتر کر بھاگتا ہوا راجہ رتن سنگھ کی خدمت میں پہنچا۔ سپاہی کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں اور بہت بدحواس نظر آ رہا تھا۔

"بھان متی کا سر کہاں ہے؟" رتن سنگھ نے چیختے ہوئے کہا۔ "تم نکمے اور ناکارہ لوگوں کو معلوم ہے کہ وقت ہمارے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔"

سپاہی نے دونوں ہاتھ باندھ کر سر جھکا لیا تھا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "سمراٹ نے کل جن

سپاہیوں کو بمل شاہ کے مندر بھیجا تھا ان کی اور گھوڑوں کی لاشیں وادی میں پڑی ہوئی ہیں ہم نے انہیں تلاش کر لیا ہے۔ مندر سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر وہ کسی حادثے کا شکار ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پتھریلے راستے پر چلتے چلتے ان کے گھوڑے بھڑک گئے اور پھر اپنا توازن برقرار نہ رکھنے کے باعث وہ گہرے کھڈوں میں گر گئے۔ گھوڑے اور سپاہی مر چکے ہیں۔ ''

رتن سنگھ سناٹے میں آ گیا اور پھر اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ '' تمہارے جسموں کو تو موت نے نہیں چھوا تھا پھر تم لوگ رات کے پچھلے پہر سے لے کر اب تک کیا کر رہے تھے۔ کیا بمل شاہ کا مندر کسی دوسری ریاست میں آباد ہے ؟ اور کیا ایک بڑھیا کے قتل کیلئے پچاس سپاہیوں کا دستہ ناکافی ہے ؟ '' رتن سنگھ انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں سپاہی پر برس رہا تھا۔

'' ہمیں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی مرنے والے سپاہیوں کی لاشیں نظر آ گئی تھیں اور ہم حادثے کی تحقیق کئے بغیر بھان متی کو قتل کرنے کیلئے مندر کی طرف روانہ ہو گئے تھے مگر جیسے ہی ہمارے اور مندر کے درمیان نصف میل سے بھی کم فاصلہ رہ گیا تو.......... '' سپاہی کا جسم اچانک کانپنے لگا اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

'' پھر کیا ہوا نمک حرام! تو بھی کوئی بہانہ تراش لے۔ '' شدتِ غضب میں رتن سنگھ کے منہ سے کف اڑنے لگا۔

'' سمراٹ! آپ کے تخت و تاج کی قسم! میں کوئی عذر نہیں پیش کر رہا ہوں۔ مندر سامنے نظر آ رہا تھا مگر اچانک نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں تو صرف یہ خبر دینے آیا ہوں کہ آپ کے جاں نثار سپاہی اب تک چاروں طرف گھوڑے دوڑا رہے ہیں مگر مندر کا نشان نہیں ملتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسے دھرتی نے نگل لیا ہو۔ '' سپاہی کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور پورا جسم پسینے سے تر تھا۔

'' جو دھرتی بھان متی اور بمل شاہ کے مندر کو نگل گئی وہ تیری لاش کو بھی نگل جائے گی۔ '' یہ کہہ کر رتن سنگھ نے قریب ہی دیوار پر لٹکتی ہوئی تلوار کھینچی اور ایک ہی وار میں سپاہی کی گردن اڑا دی۔ سپاہی کے قتل سے پہلے پدمنی نے شوہر کو یہ کہہ کر روکنے کی کوشش کی تھی کہ سمراٹ واقعے کی پوری تفصیل تو سن لیں مگر رتن سنگھ اپنے حواس کھو چکا تھا اور وحشیوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ '' ہمارے حضور اتنا بڑا جھوٹ ؟ ایک ٹھکرائی ہوئی مجہول عورت گھوڑوں کی رفتار الٹ کر پچاس فوجیوں کی آنکھیں نہیں چھین سکتی۔ یہ سب فریب ہے ہماری صفوں میں نہ جانے کتنے غدار موجود ہیں جو ہمیں مسلسل دھوکا دے رہے ہیں۔ ''

'' اب کیا ہو گا ؟ '' پدمنی نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔ '' بارہ بجنے والے ہیں اور مہاراج کی ایک شرط بھی پوری نہیں ہو سکی۔ ''

'' ہمارے اختیار میں کچھ نہیں رہا۔ '' رتن سنگھ پر ہذیان کی کیفیت طاری تھی۔ '' اب ایک وکرم سنگھ کا سر ہماری شمشیر کی زد پر ہے اس کو مہاراج کے قدموں میں ڈال کر کہہ دیں گے کہ آپ ہی کچھ کریں ہمیں تو اپنے سپاہیوں پر بھی اعتبار نہیں رہا۔ ''

پھر رتن سنگھ خون میں ڈوبی ہوئی تلوار لے کر راج محل کے اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں مہامنتری وکرم سنگھ کو قید کیا گیا تھا۔ رانی پدمنی شوہر کی بگڑتی ہوئی حالت کے پیش نظر ساتھ ساتھ تھی۔ سپاہیوں نے آگے بڑھ کر کمرہ کھولا اور ایک طرف ہٹ گئے۔ '' دنیا کے سب سے زیادہ لعنت زدہ انسان! ہم نے تیری غداریوں اور گناہوں سے بہت چشم پوشی کی مگر آج تیری سانسیں پوری ہو گئیں۔ '' رتن سنگھ کسی بھوکے درندے کی مانند چیختا ہوا اندر داخل ہوا۔ سامنے ہی وکرم سنگھ فرش پر چیت لیٹا ہوا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ

سینے سے ذرا نیچے اس طرح بندھے ہوئے تھے جیسے کوئی مسلمان نماز پڑھ رہا ہو یا پھر کوئی درباری کسی شہنشاہ کی خدمت میں پورے ادب و احترام کے ساتھ حاضر ہو۔

رتن سنگھ نے مہامنتری کو ایک اور غلیظ گالی دے کر اپنی شمشیر بلند کی پھر دوسرے ہی لمحے جھجک کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وکرم سنگھ مر چکا تھا اس کی آنکھیں نیم وا تھیں جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی جیسے اسے آخری لمحوں میں نجات کی لازوال دولت میسر آ گئی ہو۔

'' یہ بھی فریب دے گیا۔ '' رتن سنگھ نے عالم طیش میں تلوار پھینک دی اور تیز رفتاری کے ساتھ رام دیو کے آشرم کی طرف بڑھ گیا۔

آشرم کے دروازے پر پہرہ دینے والے سپاہی ڈر کر ایک طرف ہو گئے اور رتن سنگھ رانی پدمنی کے ساتھ رام دیو کے مخصوص کمرے میں داخل ہو گیا جہاں وہ عیار شعبدہ باز رنگ رلیوں میں مشغول تھا۔ دیوداسیاں اپنے حکمرانوں کو دیکھ کر ملحقہ کمرے میں بھاگ گئیں اور رانی پدمنی نے شرم سے سر جھکا لیا۔

'' مہاراج! '' رتن سنگھ بے اختیار ہو کر چیخا۔ '' آپ کیف و مستی کی محفل سجائے بیٹھے ہیں اور چتوڑ پر قیامت ٹوٹ رہی ہے۔ ''

'' سمراٹ! اپنی زبان پر قابو پائیں۔ '' رام دیو نے آخری گھونٹ لے کر بلوریں پیالہ فرش پر پھینک دیا۔ '' آج تک کسی حکمراں نے ہم سے اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ ''

آج چتوڑ کا ہر فرد رتن سنگھ سے آنکھیں پھیر کر بات کر رہا تھا۔ راجپوت سمراٹ نے رام دیو کی کج ادائی بھی دیکھی مگر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا پھر اس نے اپنے چاروں سپاہیوں کی ہلاکت اور وکرم سنگھ کی موت کے واقعات سنائے تو ایک لمحے کیلئے رام دیو کا سیاہ چہرہ مزید دھواں ہو گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔

'' سمراٹ! آپ نے وقت کو کھو دیا اور وقت نے آپ سے بے وفائی کی۔ مجھے ہر حال میں بھان متی اور وکرم سنگھ کے سر چاہئیں اس کے ساتھ ہی مجھے نرملا کماری کا جسم بھی درکار ہے۔ '' رام دیو نے اپنی شرائط میں اضافہ کر دیا تھا۔

'' وکرم سنگھ تو مر چکا ہے۔ '' رتن سنگھ نے گھبرا کر کہا۔

'' اس کی لاش مسالوں کے ذریعے محفوظ کر دی جائے۔ بوقت ضرورت اس کا سر کاٹ لیا جائے گا۔ ''

رام دیو کی فریب کاریوں نے نیا انداز اختیار کر لیا تھا۔

'' نرملا کماری کا جسم تو آپ کے منتر کی شرائط میں شامل نہیں تھا۔ '' رتن سنگھ نے ایک اور سوال کیا۔

'' یہ آپ کا کام نہیں کہ روحانیت کے معاملات میں دخل دیں۔ '' رام دیو اچانک برافروختہ نظر آنے لگا۔ '' ہم جانتے ہیں کہ نرملا کماری اس جاپ میں کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ نرملا کو ہمارے سامنے زندہ پیش کیجئے کہ وہ راج دوت کا نعم البدل ثابت ہو گی پھر ہم چتوڑ کی سرحدوں سے دلی کے محلات تک آگ لگا دیں گے۔ ایسی آگ جو دشمنوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دے گی۔ ''

رتن سنگھ اور رانی پدمنی رام دیو کے آشرم سے ناکام و نامراد واپس لوٹ آئے۔ '' مہاراج نے چتوڑ کو بچانے کیلئے جو شرائط رکھی ہیں ہم انہیں پورا نہیں کر سکتے۔ '' رتن سنگھ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ '' اگر ہم کسی طرح نرملا کو پیش بھی کر دیں تو پھر مہاراج نیا مسئلہ کھڑا کر دیں گے۔ انہیں عورت اور شراب ہی سے فرصت نہیں ہے۔ وہ چتوڑ کی کیا حفاظت کریں گے ؟ ''

رانی پدمنی شدید ذہنی کشمکش کا شکار تھی اور الجھی ہوئی نظروں سے رتن سنگھ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"وکرم سنگھ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ مہاراج کو ملکی سیاست سے علیحدہ رکھیں ورنہ مسائل اور الجھ جائیں گے۔ اگر وہ آج زندہ ہوتا تو ہمیں کوئی نہ کوئی مشورہ ضرور دیتا۔"

"مت لیجئے میرے سامنے اس پاکھنڈی کا نام۔" یکایک پدمنی کے ہونٹوں سے شرارے پھوٹنے لگے۔ "آپ اس سیاستداں کی بات کرتے ہیں جو ظاہر میں ہندو تھا اور دل سے مسلمانوں کے خدا کو پوجتا تھا۔ آپ اس سے مشورہ طلب کرتے جو آپ کی بیوی کو سلطان کے حرم میں بھیجنا چاہتا تھا۔ آپ اس کی بات.........۔"

رتن سنگھ درمیان میں بول اٹھا۔ "اس نے کبھی ہم سے اتنی گندی بات نہیں کی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ اس الجھے ہوئے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور تلاش کرے گا۔"

"آخر کیا حل تلاش کرتا۔" پدمنی کچھ اور برہم ہو گئی تھی۔ "اس نے ہمیشہ ہمارے جذبات کے خلاف سوچا۔ جو ہمارا دشمن تھا وہ اس کا دوست تھا۔ اس کی نظروں میں بھان متی ایک پارسا عورت تھی اور آفریدی ایک مقدس انسان۔"

"مہارانی! حالات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔" راجہ رتن سنگھ کا لہجہ مصالحانہ تھا۔ وہ ایسے نازک وقت میں اپنی سرکش بیوی کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ "علاءالدین خلجی ہمارے سروں پر آپہنچا اور ہم اس شخص سے انتقام لینے کی بات کر رہے ہیں جس کی سانسیں لٹ چکیں، گھر جل چکا اور اولاد دربدر ہو گئی۔ اب آپ کے سینے میں بدلے کی اور کون سی آگ پوشیدہ ہے؟" رتن سنگھ نے پدمنی سے سوال کیا۔ "آپ اپنی رعایا کو یہ بتائیں گی کہ وکرم سنگھ مسلمان ہو چکا تھا۔" رتن سنگھ نے بڑے تحمل کے ساتھ پوچھا۔

"یقیناً ہم اپنی پرجا سے یہی کہیں گے کہ اس لعنت زدہ انسان نے اپنے باپ دادا کے مذہب کو ترک کر دیا تھا اور دیوتاؤں کی نگہبانی کے سائے سے دور چلا گیا تھا اس لئے عبرتناک انجام سے دوچار ہوا" پدمنی نے پورے زور و شور کے ساتھ اپنی دلیل پیش کی۔

"اس سے آپ کو کوئی سیاسی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔" راجہ رتن سنگھ نے دھیمے لہجہ میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اس طرح عام لوگوں کے ذہن الجھ جائیں گے۔ آپ کی وفادار پرجا یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گی کہ آخر اسلام میں وہ کون سی کشش ہے جو وکرم سنگھ کو کوچۂ فنا تک لے گئی اور اس نے اقتدار کی تمام آسائش چھوڑ کر موت کو گلے لگا لیا۔ مہارانی! آپ کی یہ دلیل چتوڑ کے لوگوں کو مطمئن نہ کر سکے گی۔ ذہن منتشر ہو جائیں گے اور دلوں میں شکوک و شبہات سر اٹھانے لگیں گے۔ اجمیر کے راجپوت پہلے ہی مسلمانوں کا مذہب قبول کر چکے ہیں، سلطانی فوجوں کے قبضے کے بعد گجرات میں بھی اسی انداز کی لہریں اٹھ رہی ہیں، آپ اپنے ہی دامن سے چتوڑ میں بھی اسی فتنے کو ہوا دینا چاہتی ہیں؟ یہ بڑی احمقانہ روش ہوگی۔" رتن سنگھ کا سارا غصہ زائل ہو چکا تھا اور اب وہ ایک سرد مزاج حکمراں کے انداز میں سوچ رہا تھا۔

"ہم اسے اپنے وطن سے غداری کے جرم میں ذلت و رسوائی کی سزا دیں گے۔" رانی پدمنی نے نیا حیلہ تراشا۔

"آپ کی یہ دلیل بھی اہل چتوڑ کو مطمئن نہیں کر سکے گی۔" رتن سنگھ حالات کے ایک ایک پہلو کا جائزہ لے رہا تھا۔ "بالفرض محال وکرم سنگھ کو غدارِ وطن ثابت بھی کر دیا گیا تو رعایا پر ہماری صفوں کا انتشار ظاہر ہو جائے گا۔ لوگوں کی انگلیاں اس انداز میں اٹھ سکتی ہیں کہ غدار وکرم سنگھ رشتے میں رانی پدمنی کا حقیقی چچا تھا اگر یہ حقیقت بھی نظر انداز کر دی جائے تو لوگ خواہ مخواہ کچھ اندیشوں میں مبتلا ہو جائیں گے اور ان

اندیشوں کا فائدہ بہرحال علاءالدین کو پہنچے گا۔"

رانی پدمنی خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر نفرت و غضب کا عکس نمایاں تھا مگر زبان خاموش تھی۔

"پھر وکرم سنگھ کے خلاف یہ سارا ہنگامہ کیوں تھا؟" کچھ دیر بعد پدمنی نے رتن سنگھ سے سوال کیا۔

"یہ ہنگامہ اس کی زندگی تک محدود تھا۔" رتن سنگھ نے جواباً کہا۔ "ہم اس پر تشدد کر کے آفریدی کا پتہ دریافت کرنا چاہتے تھے کہ اس طرح آپ کے جذبۂ انتقام کی تسکین ہوتی تھی۔ ہمارا یہ ارادہ ہرگز نہیں تھا کہ وکرم سنگھ کو قتل کر دیا جائے مگر وقت کی رفتار کو کیا کیا جائے کہ اس بار بھی ہم پیچھے رہ گئے۔ ہم وکرم سنگھ اور نرملا کو درباری حلقوں سے دور قیدِ تنہائی میں رکھنا چاہتے تھے کہ چتوڑ کے دوسرے لوگ ان کے نظریات سے کوئی تاثر قبول نہ کر سکیں۔ لیکن ہمارا یہ منصوبہ بھی ناکام رہا۔"

"پھر آپ وکرم سنگھ کی لاش کا کیا کریں گے؟" رانی پدمنی نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"اسے رات کے اندھیرے میں خاموشی کے ساتھ آگ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ مندر کا پجاری رام چندر یہ کام انتہائی رازداری سے انجام دے گا اور عام لوگوں کے شمشان میں وکرم سنگھ کی آخری رسوم ادا کر دی جائیں گی۔" رتن سنگھ نے اپنی بیوی کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

"اور مہاراج کا حکم کہ وکرم سنگھ کی لاش کو مسالوں کے ذریعے محفوظ کر دیا جائے۔ بھان متی کا سر کاٹنے کے بعد وکرم سنگھ کا جسم بھی ان کے جاپ میں کام آئے گا۔" رانی پدمنی نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

سادھوؤں اور جوگیوں کے منتروں سے بہل جانے والی پدمنی کی یہ معصومانہ ادا دیکھ کر رتن سنگھ مسکرایا۔ "مہارانی! بہتر ہے کہ اب آپ چتوڑ کے ساحرِ اعظم کو فراموش کر دیں۔ ان کا گیان تو راج دوت کی زبان بھی نہیں کھلوا سکا۔ پھر وہ علاءالدین کی یلغار کو کس طرح روکیں گے؟ سلطان کے لشکر میں تو ہزاروں آفریدی ہوں گے۔ جب وہ ایک آفریدی کو تلاش نہیں کر سکے تو پھر ہزاروں آفریدیوں کے بڑھتے ہوئے قدموں میں کس طرح زنجیر ڈالیں گے؟ مہاراج کو بھول جایئے کہ ان کی مہان شکتیاں ہمارے لئے ایک خواب تھیں۔"

رتن سنگھ رام دیو کی فریب کاریوں کے جال سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک محافظ دستے کے سپاہی نے ان فوجیوں کی واپسی کے بارے میں خبر دی جو مائی بھان متی کے قتل کیلئے روانہ کئے گئے تھے۔

رتن سنگھ سپاہیوں کی ناکام واپسی کی اطلاع پا کر بھڑک اٹھا اور ان سب کو دوسرے کمرے میں حاضر ہونے کا حکم دے کر خود بھی رانی پدمنی کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ راجہ رتن سنگھ نے بڑی حقارت آمیز نظروں سے اپنے ان سپاہیوں کی طرف دیکھا جن کی تلواریں نیام میں تھیں اور جن کے سر شرم و ندامت سے جھکے ہوئے تھے۔

"ہم جانتے ہیں کہ تم کیسی ذلت آمیز خبر لے کر آئے ہو۔ ایسی خبر ہمارے کانوں نے آج تک نہیں سنی.........۔" رتن سنگھ نے غضبناک لہجے میں سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے کہ تم ہمیں اپنی ناکامی کے فسانے سناؤ، ہم تمہیں تمہارے ایک ساتھی کے بارے میں بتانا چاہتے ہیں جو اب اس دنیا میں نہیں رہا اور جس کی ناکارہ زندگی کو ہماری شمشیرِ قہر کھا گئی۔ ہم نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ تم بھی وقت سے پہلے اپنے انجام سے باخبر ہو جاؤ۔"

تمام سپاہیوں نے گردنیں جھکا دیں۔ پھر مختصر سکوت کے بعد ایک سپاہی نے سر جھکائے جھکائے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی۔ "ہم سمراٹ کے جاں نثار ہیں اگر جاں سے گزر بھی گئے تو ہمیں کسی زیاں کا

احساس نہیں ہو گا۔ ہم نے سپاہیوں اور گھوڑوں کی لاشیں دیکھنے کے بعد اپنی جگہ طے کیا کہ مرنے والوں کی موت کا تجزیہ تو ہوتا ہی رہے گا لیکن اس سے پہلے ہمیں بھان متی کا کام تمام کر دینا چاہئے۔ اس ارادے سے ہم لوگ آگے بڑھے پھر ہم نے کوئی ایک میل کے فاصلے سے بمل شاہ کا مندر دیکھا۔ ہماری منزل قریب تھی مگر جیسے ہی ہم نے نصف فاصلہ طے کیا' مندر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ ہم سب بھگوان کو ساکشی (گواہ) بنا کر سمراٹ سے عرض کرتے ہیں بہت دیر تک ہم اس فریب میں مبتلا رہے کہ ہماری آنکھوں کی روشنی زائل ہو چکی ہے مگر جب قرب وجوار کے دوسرے مناظر صاف دکھائی دیتے رہے اور مندر کا ہلکا سا عکس بھی نظر نہیں آیا تو پھر ہمارے دلوں پر ایک نامعلوم سا خوف طاری ہو گیا۔ مجبوراً اپنے ایک ساتھی کو آپ کی خدمت میں روانہ کیا گیا تاکہ اس ناقابل یقین صورت حال سے راجپوت سمراٹ کو مطلع کیا جا سکے۔ اس سپاہی کی روانگی کے بعد بھی ہمارے گھوڑے چاروں طرف دوڑتے رہے مگر بمل شاہ کا مندر ہماری نگاہوں سے روپوش ہی رہا۔ پھر ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا' جب تمام سپاہی قلعے کی جانب واپس آ رہے تھے' اس وقت کسی شہسوار نے پلٹ کر مندر کی طرف دیکھا' بھان متی کی عبادت گاہ دوبارہ نظر آنے لگی تھی۔ ہم پھر گھبرا کر پلٹ پڑے مگر جیسے ہی چند قدم آگے بڑھے' مندر ایک بار پھر غائب ہو گیا۔ ہمارے ساتھ یہ کھیل کئی مرتبہ کھیلا گیا۔ اب سمراٹ آپ کو پورا ادھیکار ہے کہ ہماری باتوں کو سچ جانیں یا جھوٹ سمجھ کر ہمیں کڑی سے کڑی سزا دیں۔" یہ کہہ کر وہ سپاہی خاموش ہو گیا۔

راجہ رتن سنگھ سپاہی کا بیان سن کر سوچ میں ڈوب گیا۔

"مہارانی! آپ کا کیا خیال ہے؟" رتن سنگھ نے یہ عجیب وغریب واقعہ سن کر پدمنی کی طرف دیکھا۔

"ناقابل یقین! انتہائی ناقابل یقین......" رانی پدمنی کی خوبصورت آنکھیں کشادہ ہو گئیں۔

"پھر ہمیں خود ہی جائزہ لینا ہو گا۔" رتن سنگھ نے تحقیر آمیز نظروں سے سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر تم لوگوں کی بیان کردہ صورتحال غلط پائی گئی تو پھر ہم اس دیدہ دلیری کے ساتھ جھوٹ بولنے والوں کو بڑی دردناک سزا دیں گے۔"

"میں بھی آپ کے ہمراہ چلوں گی۔" رانی پدمنی نے پرعزم لہجے میں کہا۔ "اور دیکھوں گی کہ بھان متی میرے سامنے اپنی غلیظ جادوگرانہ حرکتوں کا مظاہرہ کس طرح کرتی ہے؟"

بمل شاہ کے مندر جانے سے پہلے راجہ رتن سنگھ نے رام دیو سے ایک ملاقات کرنا ضروری سمجھا۔ جب راجپوت سمراٹ اور رانی پدمنی جادوگر کے آشرم میں پہنچے تو وہ حسب عادت اپنی رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔ آشرم دیوداسیوں سے خالی ہو گیا تو رانی پدمنی اور رتن سنگھ اندر داخل ہوئے۔

"سمراٹ! شاید یہ اطلاع دینے آئے ہیں کہ بھان متی اور وکرم سنگھ کے سر کمبھ شیام کے مندر میں نہیں پہنچائے گئے۔" نشے کی زیادتی سے رام دیو کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"نہیں مہاراج! بھان متی ہماری دسترس سے بہت دور ہے۔" یہ کہہ کر رتن سنگھ نے سپاہیوں کی ناکام واپسی کا پورا واقعہ سنا دیا۔ پھر بولا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چل کر بھان متی کے اس ڈھونگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں...... اور اگر واقعتاً ایسا کوئی مسئلہ درپیش ہے تو اسے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ہمیشہ کیلئے ختم کر دیں۔"

"نہیں سمراٹ! اس سے زیادہ میری توہین نہیں ہو سکتی کہ میں دیوتاؤں کی مقہور ایک طوائف زادی کے جادو منڈپ میں اپنے قدموں سے چل کر جاؤں۔" رام دیو نے رتن سنگھ کی درخواست کو انتہائی حقارت سے جھٹلا دیا۔ وہ اپنی جگہ اس واقعہ سے بہت خوفزدہ تھا لیکن اس نے عیاری سے کام لیتے ہوئے ایک

ایسا بہانہ تراش لیا جس پر عقلی اعتبار سے کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا۔

رتن سنگھ کو رام دیو کی اس بے اعتنائی اور گستاخانہ سلوک سے شدید ذہنی اذیت پہنچی مگر اس نے رانی پدمنی کی خاطر مہاراج کے طرز عمل کو برداشت کر لیا اور چپ چاپ واپس چلا آیا۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی رتن سنگھ' پدمنی پر برس پڑا۔ "مہارانی! یہ ہے وہ تمہارا دیوتا جو چتوڑ کے دکھوں میں شریک نہیں۔ وہ چتوڑ جس نے اسے بے پناہ آدر (احترام) دیا اس کی پھٹی ہوئی جھولی ہیروں اور موتیوں سے بھر دی۔ اسے ہم نے سنسار کا کونسا سکھ نہیں بخشا۔ آج وہی احسان فراموش ہماری خاطر بمل شاہ کے مندر نہیں چل سکتا۔"

رانی پدمنی شوہر کی باتوں کا کیا جواب دیتی؟ اب اسے احساس ہونے لگا تھا کہ رام دیو قدم قدم پر مایوس کر رہا ہے اور ہر آڑے وقت میں اس طرح آنکھیں پھیر لیتا ہے جیسے والیان چتوڑ سے اس کی کوئی شناسائی ہی نہیں۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا سارا گیان ہم جیسے لوگوں کو متاثر کرنے کیلئے ہے۔ جب بھی آزمائش کا وقت آتا ہے وہ اسی طرح پیٹھ موڑ لیتا ہے۔" رتن سنگھ بہت دیر تک اپنے دل کا غبار نکالتا رہا۔ پھر اس نے اپنے سپہ سالار ہری سنگھ اور رانی پدمنی کے ماموں گنیش سنگھ کو طلب کیا۔

گنیش سنگھ ایک عمر رسیدہ اور بہادر راجپوت تھا۔ کئی جنگوں میں حصہ لے کر اپنی بہادری کے کارنامے دکھا چکا تھا۔ شجاعت کے ساتھ ذہانت بھی اس کی شخصیت کا ایک حصہ تھی...... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رانی پدمنی کا حقیقی ماموں تھا۔ اسی رشتے نے گنیش سنگھ کو راج دربار میں ایک ممتاز مقام بخشا تھا۔

گنیش سنگھ اور سپہ سالار ہری سنگھ کو طلب کرنے کے بعد راجپوت سمراٹ نے مختصراً رام دیو کا منصوبہ بیان کرتے ہوئے بھان متی کا ذکر کیا اور ان سپاہیوں کے دعوے کو پرکھنے کی خواہش ظاہر کی جن کی تعداد پچاس تھی اور سب کے سب ایک ہی بات کہہ رہے تھے۔

گنیش سنگھ اور سپہ سالار ہری سنگھ نے بھی رام دیو کی تائید میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس فتنے کو ختم کرنے کی کوششوں کو سراہا۔ ساتھ ہی ساتھ راجہ رتن سنگھ کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ خود چل کر مندر کے روپوش ہو جانے کی من گھڑت کہانی اور سپاہیوں کے جھوٹ کا پردہ چاک کر دیں۔

وہ عجیب منظر تھا جب راجہ رتن سنگھ' رانی پدمنی' گنیش سنگھ' سپہ سالار ہری سنگھ اور دیگر راجپوت امراء ان سپاہیوں کو لے کر بمل شاہ کے مندر کی طرف روانہ ہوئے جن کے بقول کبھی وہ مندر نظر آتا ہے اور کبھی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ رتن سنگھ اور رانی پدمنی سونے چاندی کے بنے ہوئے رتھ میں آگے آگے تھے۔ ان کے پیچھے دیگر سرداران قوم کے گھوڑے تھے اور سب سے پیچھے ان سپاہیوں کا دستہ تھا جن کی بیان کردہ روایت کو دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ قرار دیا جا رہا تھا۔

فاصلے کم ہوئے تو بمل شاہ کا مندر صاف نظر آنے لگا۔ "تم سب لوگ بھی دیکھ رہے ہو؟" رتن سنگھ نے چیخ کر کہا۔ "گنیش سنگھ! ان سپاہیوں سے بھی پوچھو جن کی بینائی کمزور ہو گئی ہے۔"

سپاہیوں نے اعتراف کیا کہ انہیں بھی مندر صاف نظر آ رہا ہے مگر نصف میل آگے بڑھنے کے بعد کوہ آبو کی چوٹی پر بنا ہوا یہ مندر اچانک غائب ہو جائے گا۔ راجہ رتن سنگھ اور پدمنی نے سپاہیوں کی اس دلیل کو تسلیم نہیں کیا...... مگر پھر جیسے ہی آدھے میل کا فاصلہ ختم ہوا' تمام سپاہیوں نے بیک زبان فریادی لہجے میں کہا۔

"سمراٹ! اب وہ مندر دکھائی نہیں دے رہا ہے۔"

"تم لوگ جھوٹ بولتے ہو۔" رتن سنگھ دوبارہ چیخا۔ "میری آنکھیں اب بھی مندر کے کلس کو دیکھ رہی ہیں۔" رانی پدمنی نے بھی اپنے شوہر کے دعوے کی تصدیق کی۔ "اور گنیش سنگھ! تمہاری آنکھیں تو تمہیں دھوکا نہیں دے رہی ہیں؟" رتن سنگھ نے پدمنی کے ماموں سے سوال کیا۔

گنیش سنگھ سناٹے میں آگیا حقیقتاً اب اسے بھی بمل شاہ کا مندر نظر نہیں آرہا تھا۔

گنیش سنگھ کو خاموش پاکر رتن سنگھ پوری طاقت سے چیخا۔ "تم جواب کیوں نہیں دیتے گنیش سنگھ؟ کیا اس جادوگرنی کے حصار میں داخل ہوتے ہی تمہاری آنکھوں کی روشنی بھی لٹ گئی؟"

گنیش سنگھ بدستور خاموش رہا۔ وہ اپنے حکمراں کے دعوے کو کس طرح جھٹلا سکتا تھا۔

رتن سنگھ وحشت زدہ ہوکر رتھ سے نیچے اتر آیا......... "وہ دیکھو! مندر کا سنہری کلس' اونچی دیواریں۔" رتن سنگھ نے مندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رتن سنگھ کے ساتھ ہی تمام امراء اور سپاہی گھوڑوں سے نیچے اتر آئے تھے۔

"اور مہارانی آپ کیا کہتی ہیں؟" رتن سنگھ نے گھبرا کر پدمنی سے پوچھا جو رتھ کے اندر اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کے چہرے کی رنگت اڑی اڑی سی تھی اور آنکھوں میں حیرت و پریشانی کے گہرے سائے لرز رہے تھے۔ "سمراٹ! میں بھی آپ کی طرح مندر کی بلند دیواروں اور سنہری کلس کو دیکھ رہی ہوں۔ مگر دوسرے لوگ اس حقیقت سے کیوں انکار کر رہے ہیں؟" رانی پدمنی کی آواز میں شدید جھنجلاہٹ اور غصے کی آمیزش تھی۔

"کچھ بھی ہو' ہماری آنکھیں تو مندر کو دیکھ رہی ہیں۔" رتن سنگھ نے دوبارہ رتھ میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہم خود مندر میں جائیں گے اور اپنی تلوار سے اس بدکار عورت کا سر کاٹیں گے جس نے جادو کے زور سے ہمارے راستے گمراہ کر دیئے ہیں۔"

شاہی رتھ تیز رفتاری سے آگے بڑھتا رہا۔ فاصلہ بظاہر ختم ہوچکا تھا مگر حقیقتاً مائی بھان متی اور راجہ رتن سنگھ کے درمیان کئی حجابات حائل تھے۔ مندر کے قریب پہنچ کر راجپوت سمراٹ اور رانی پدمنی بھی فریبِ نظر کا شکار ہوگئے۔ رتن سنگھ رتھ سے اتر آیا اور دیوانوں کی طرح چیخنے لگا۔ "ابھی ابھی مندر یہاں تھا۔ پھر اسے اٹھا کر کون لے گیا؟ زمین نے اتنے بڑے مندر کو کس طرح نگل لیا؟" رتن سنگھ کی بدحواسیاں دیکھ کر رانی پدمنی بھی نیچے اتر آئی۔ اب چتوڑ کے دونوں حکمراں بھی اندھوں کی صف میں شامل ہوگئے تھے۔ مندر اپنی جگہ موجود تھا مگر کوئی ایک فرد بھی اسے دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ تاحدِ نظر چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں اور بمل شاہ کی بنائی ہوئی عمارت کا ایک ایک نقش معدوم ہوچکا تھا۔

یکایک ان سب لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ایک اور عجیب منظر ابھر آیا۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے مائی بھان متی کو ایک چٹان پر کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ بوڑھی عورت سفید چادر میں ملبوس تھی اور چتوڑ کے حکمرانوں کو اشارے سے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ راجہ رتن سنگھ اور پدمنی نے گھبرا کر گنیش کی طرف دیکھا۔ گنیش سنگھ کا چہرہ خوف سے زرد ہوگیا تھا۔ سپہ سالار ہری سنگھ اور دوسرے سپاہی بھی لرزہ براندام نظر آرہے تھے۔

"چتوڑ کی دیوی اپنے دیوتا کے ساتھ ایک طوائف کی بیٹی کو قتل کرنے آئی تھی۔" بھان متی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ بوڑھی عورت کی آواز میں اس قدر جلال تھا کہ راجپوت سورماؤں کے دل کانپنے لگے۔ "مجھے تو بہت پہلے تیرے باپ نے قتل کر دیا تھا رتن سنگھ!" بھان متی چتوڑ کے حکمراں سے مخاطب تھی۔ "میں تو کب کی مرچکی۔ میرے جسم ناتواں کے پیچھے کیوں پڑا ہے؟ ان دیوزادوں کی طرف دیکھ جن کے

بازو بہت توانا ہیں اور جن کی شمشیروں کی پیاس کبھی نہیں بجھی۔"

بھان متی کی ہیبت سے رتن سنگھ کی سانسیں رکنے لگیں۔

"تیرا بھگوان رام دیو نہیں آیا پدمنی؟" بھان متی نے اب کی بار چتوڑ کی ساحرہ کو مخاطب کیا تھا۔ "وہ تیرے دیوتا کہاں رہ گئے؟ انہیں بھی جمع کرلے کہ یوم حساب قریب آپہنچا ہے۔ میں نے تو تجھے تیرے غلاموں کے ذریعے خبر پہنچادی تھی کہ آگ اور خون کے تاجر آرہے ہیں۔ تہذیب کے نئے بازار سجنے والے ہیں۔ آنے والے سوداگروں میں بڑی قوت خرید ہے۔ سب کچھ بک جائے گا۔ شریف زادی! تو اپنی قیمت متعین کرلے۔" فضاؤں میں الفاظ کی گونج باقی تھی مگر بھان متی کا چہرہ اچانک ہواؤں میں تحلیل ہوگیا تھا اور بمل شاہ کا مندر دوبارہ نظر آنے لگا تھا۔ "چلے آؤ کہ میں نے تمہاری نظروں سے پردے ہٹا دیئے۔ قہر و ستم کی جتنی طاقتیں تمہارے پاس ہیں انہیں بیک وقت استعمال کرلو کہ ناپاک سینوں میں کوئی جذبہ باقی نہ رہے۔" بھان متی کی آواز آہستہ آہستہ ڈوب گئی۔

راجہ رتن سنگھ کسی مجسّمے کی طرح ساکت تھا۔ چتوڑ کی ملکہ کا گلرنگ چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ طاقت کے سارے دعوے باطل ہوچکے تھے۔ رتن سنگھ نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے گنیش سنگھ کی طرف دیکھا' گنیش سنگھ ایک ہوشیار انسان تھا اس نے اپنی بھانجی اور داماد کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر کہا۔ "ایک ناکارہ اور بوڑھی عورت کی بدکلامیوں کا جواب دینا آپ کی شان کے منافی ہے سمراٹ! واپس چلیے کہ ہمیں دنیا میں بہت سے کام ہیں۔" گنیش سنگھ چتوڑ کے حکمرانوں کو بھان متی کے حصار سے نکال کر راج محل واپس لے جانا چاہتا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں رتن سنگھ اور پدمنی جوشِ غضب میں آگے نہ بڑھ جائیں۔ گنیش سنگھ نے پہلی بار اپنی آنکھوں سے بھان متی کی روحانی طاقت کے ناقابل یقین مظاہرے دیکھے تھے' اس لئے وہ خاموشی کے ساتھ لوٹ جانے ہی میں عافیت سمجھتا تھا۔

رتن سنگھ اور رانی پدمنی رتھ میں اس طرح سوار ہوئے جیسے کوئی حکمراں جنگ ہار گیا ہو اور میدان سے سخت ذلت کی حالت میں فرار ہو رہا ہو۔

☆..................☆..................☆

رتن سنگھ نے اب نئے انداز سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اس بار خفیہ اجلاس میں رانی پدمنی کے علاوہ گنیش سنگھ اور سیناپتی (سپہ سالار) ہری سنگھ بھی شامل ہوئے تھے۔ "ہم نہیں جانتے کہ ہمارے اس اعتبار نے ہمیں کس قدر نقصان پہنچایا؟" رتن سنگھ' گنیش سنگھ اور ہری سنگھ سے مخاطب تھا۔ "ہم نے مہاراج رام دیو اور مہامنتری وکرم سنگھ کو اپنا سب کچھ سونپ دیا تھا۔ محبت' خلوص' یقین' اعتماد......... مگر افسوس کچھ بھی ہمارے کام نہیں آیا۔ وکرم سنگھ' راج دوت کے فریب میں آکر مسلمان ہوگیا اور پھر اس نے موت کو گلے لگالیا۔ رہے مہاراج تو وہ بڑے گیانی ہیں لیکن ان کا گیان آج ہمارے کام نہیں آرہا ہے۔ وہ اپنے آشرم میں بدمست پڑے ہیں اور چتوڑ کی سرحدوں پر موت منڈلا رہی ہے۔"

گنیش سنگھ بہت غور سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب رتن سنگھ کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ بولا۔ "سمراٹ نے وہی کیا جو اہل دل کا پرانا چلن ہے' یہی کہ اپنے خاص رشتوں پر اعتبار کرنا۔ اب اگر لوگوں کے دل میلے ہوں تو وہ عیاری کے ساتھ نازک جذبوں کا خون کر دیتے ہیں۔ بے شک! آپ نے اپنے سینے پر بڑے کاری زخم کھائے ہیں لیکن یہ زخم جان لیوا نہیں ہیں۔ ابھی آپ کے بے شمار غم گسار زندہ ہیں جو اپنی وفاداری کے مرہم سے اس خلش کو مٹادیں گے۔ اب نئے انداز سے سیاست کی بساط بچھائی جائے۔" گنیش سنگھ نے بڑے پرفریب لہجے میں کہا۔ "پرانے مہرے مات کھا چکے اب

نئے مہروں کو نئے محاذوں پر آزمایا جائے۔"

"ہم نہیں سمجھے گنیش سنگھ کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" رتن سنگھ نے چونک کر پوچھا۔

"مہارانی!" گنیش سنگھ نے ملکۂ چتوڑ کو مخاطب کیا۔ "شاید آپ کو میری یہ بات گراں گزرے کہ بھان متی کی روحانی قوت مہاراج رام دیو سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ ہمارے اندازے کی غلطی تھی کہ ہم نے مہاراج کو دیوتا کا درجہ دے دیا اور بھان متی پورے چتوڑ کیلئے ایک لعنت زدہ عورت قرار پائی.......... اگر ہم..........۔"

گنیش سنگھ کی بات مکمل ہونے بھی نہ پائی تھی کہ پدمنی چیخ اٹھی۔ "گنیش سنگھ! تم بھی وہی کہہ رہے ہو جو وکرم سنگھ کہا کرتا تھا۔ کیا یہ ہمارا کرم نہیں ہے کہ وہ ہماری مملکت میں ابھی تک زندہ ہے۔ ہم چاہتے تو اس کے بوجھ سے دھرتی کو ہلکا کر سکتے تھے۔" کچھ دیر پہلے جو ناکامی والیان چتوڑ کا مقدر بنی تھی' پدمنی نے اس کے احساس تک کو مٹا ڈالا تھا۔ گنیش سنگھ' سیناپتی ہری سنگھ اور سپاہیوں کا ایک دستہ اس بات کا گواہ تھا کہ رتن سنگھ کی فوجی طاقت بھی ایک بوڑھی عورت کے سامنے بے دست و پا نظر آ رہی تھی.......... مگر پدمنی نے انتہائی بے شرمی کے ساتھ اپنی شکست کو جھٹلانے کی کوشش کی تھی۔

گنیش سنگھ سناٹے میں آ گیا مگر اس نے فوراً ہی ایک ذہین شاطر کی طرح نئی چال چلی.......... "مہارانی نے میری بات کو مکمل نہیں ہونے دیا۔ میں ملکۂ کہسار کی رائے پر نکتہ چینی نہیں کر رہا ہوں۔ میری نظروں کے سامنے جنگ کے کئی محاذ کھلے ہوئے ہیں اور ہر محاذ پر ہمارے بے شمار دشمن موجود ہیں۔ بھان متی بھی ان ہی دشمنوں میں سے ایک ہے جو چتوڑ کا وجود برداشت نہیں کرتے۔ اگر ہمارے سپاہی بھان متی کو قتل کر سکتے تو کب کا یہ قصہ ختم ہو چکا ہوتا۔"

رانی پدمنی اچانک وحشت زدہ نظر آنے لگی۔ شکست و ناکامی کا یہ تذکرہ زیادہ پرانا نہیں تھا۔ پدمنی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ "پھر! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہ جنگ ذہانت سے لڑی جائے گی۔" گنیش سنگھ رک رک کر بول رہا تھا۔ "دنیا جسے عیاری کہتی ہے ہم اسے ذہانت کہتے ہیں۔ مہاراج رام دیو کو ان کے مقام پر فائز رہنے دیجئے کہ وہ بھی ہماری سیاست کا ایک مہرہ ہیں۔ اگر وہ بھان متی سے محاذ آرائی میں شکست کھا چکے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کی روحانی طاقتیں سلب ہو چکی ہیں۔ انہیں فریب میں مبتلا رکھئے کہ صرف وہی ہماری کشتی کو پار لگا سکتے ہیں۔ مہاراج سے بگاڑنے کی کوشش نہ کیجئے گا کہ شاید ان کا کوئی ناکارہ منتر ہمارے کام آ جائے۔" گنیش سنگھ بڑی ہوشیاری سے اپنی بازی کھیل رہا تھا۔ "دوسری طرف ہمیں لازم ہے کہ ہم بھان متی کو بھی اپنے فریب کا آلۂ کار بنائیں۔ وہ زمانے بھر کی ٹھکرائی ہوئی ایک ستم رسیدہ عورت ہے۔ اگر رات کے اندھیرے میں کچھ دیر کیلئے ہم خوشامد کے ذریعے اسے رام کر لیں تو پھر آفریدی اور نرملا کماری کا پتہ چل سکتا ہے اور سلطان کے حملے سے محفوظ رہنے کی تدبیر بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ چند روز کیلئے اپنے دل پر جبر کر کے بھان متی کو دیوی کا درجہ دے کر اس سے روحانی مدد طلب کر لیجئے۔ پھر یہ آندھی گزر جائے گی تو پر سکون دنوں میں عقیدت اور اعتبار کے خنجر سے بھان متی کا بھی خون کر دیا جائے گا۔" گنیش سنگھ نے ایک ریاکارانہ تجویز پیش کی تھی جسے رانی پدمنی نے بڑی کراہیت کے ساتھ قبول کر لیا مگر یہ سوال بھی کر ڈالا کہ منافقت کے اس منصوبے کو کس طرح تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔

"مہارانی! یہ مجھ پر چھوڑ دیجئے کہ میں اس بوڑھی جادوگرنی کو کس طرح رام کرتا ہوں۔" گنیش سنگھ' رانی پدمنی کو آمادہ پا کر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ آج اسے اپنے برسوں پرانے خواب کی تعبیر مل گئی

تھی کہ وہ وکرم سنگھ کا منصب حاصل کر کے چتوڑ کے سیاسی امور میں مداخلت کرے اور پھر اپنے اقتدار کے دائرے کو یہاں تک وسیع کر دے کہ راجہ رتن سنگھ مفلوج اور مجہول نظر آنے لگے۔ گنیش سنگھ کے خیال میں آج وہی دن آ پہنچا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کا اندھیرا گہرا ہوا تو مہامنتری وکرم سنگھ کی لاش چند سپاہیوں اور مندر کے پجاری رام چندر کی نگرانی میں اس شمشان گھاٹ پر لے جائی گئی جہاں چتوڑ کے عام مردے جلائے جاتے تھے۔ عظیم خاندان کا عظیم سپوت بندراں' شدید عالم تنہائی میں جلا دیا گیا۔ یہ اس کے جرمِ حق شناسی کی سزا تھی۔ پتھروں سے بغاوت کا انجام تھا۔ اگر وہ دیوتاؤں کے قدموں پر سر رکھے رکھے مر جاتا تو آج پورا چتوڑ سوگوار ہوتا۔ اس کی ارتھی اس شان سے اٹھتی کہ راجہ رتن سنگھ' رانی پدمنی اور بڑے بڑے راجپوت امراء کی گردنیں بارِ غم سے جھکی ہوتیں اور مسلح افواج اس کے بے جان جسم کو سلامی پیش کر رہی ہوتیں۔ مگر آج اس کے تہمت زدہ جسم کے ساتھ بڑا ذلت آمیز سلوک کیا گیا۔ وہ اس طرح پھونک دیا گیا جیسے جلنے والا کوئی بے سہارا بھکاری تھا یا شودر (اچھوت) سے بھی بدتر کوئی مخلوق۔ نہ اس کی ہڈیوں کو سمیٹا گیا اور نہ راکھ کو دریائے گمبھیری میں بہایا گیا۔ بس اسے بکھرنا تھا' چپ چاپ بکھر گیا۔ آخری وقت میں کوئی رشتہ کام نہیں آیا۔ ایک بیٹی تھی' سے بھی تقدیر نے جیتے جی جدا کر دیا تھا۔ عجیب موت تھی۔ نہ کوئی نوحہ خوانی اور نہ کوئی بین کرنے والا۔ ایک چتوڑ کی ہوائیں تھیں جو ایک مردِ آزاد کی خاک کو اڑائے لئے جا رہی تھیں۔

اسی رات نرملا کماری بے اختیار روتی رہی تھی۔

رامیشوری اور چندر سنگھ نے بہت دلاسے دیئے مگر آنکھیں ایک لمحے کیلئے بھی خشک نہیں ہوئیں۔ آفریدی نے بھی دلجوئی کی مگر دل پر جو گھٹا چھائی ہوئی تھی' برستی ہی رہی۔ منتری بھون کی آگ بجھ چکی تھی مگر نرملا کے سینے میں ایک اور آگ بھڑک اٹھی تھی۔ دریائے گمبھیری کے کنارے جلائی جانے والی چتا کی آگ اور نرملا کے دل کی آگ میں بڑا گہرا تعلق تھا۔ اس آگ کے شعلوں نے نرملا کے دل و دماغ پر برسوں سے جمنے والی برف کو پگھلا کر رکھ دیا۔ آفریدی نے کئی بار اپنا دامن بڑھایا مگر نرملا نے غم خواری کے اس انداز کو قبول نہیں کیا۔

"مجھے رونے دو سردار! رونے دو کہ اس اشک ریزی کی وجہ میں خود بھی نہیں جانتی۔ یہ آنسو تو گھر جل جانے پر بھی پلکوں تک نہیں آئے تھے۔ پھر یہ دریا کیوں ابل پڑے؟ کون جانے کیا شے جل گئی ہے جو دل سے روح تک تپش ہی تپش ہے۔"

آفریدی کو شک تو ہوا کہ باپ پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے جس کے اثر سے بیٹی کے دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی ہے۔ مگر اس نے جان بوجھ کر مہامنتری کا ذکر نہیں چھیڑا کہ اس طرح نرملا کی وحشتیں کچھ اور بڑھ جائیں۔

☆..........☆..........☆

اسی رات علاء الدین خلجی سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ گیا اور حضرت امیر خسروؒ کو آوازیں دینے لگا۔ امیر خسرو اس وقت اپنے رب کے حضور گریہ وزاری کر رہے تھے۔ سلطان کی آواز سن کر خسرو نے اپنے وظائف ختم کئے اور علاء الدین خلجی کی مزاج پرسی کرنے لگے۔

"خسرو میں نے ابھی خواب میں دیکھا ہے کہ سورج آسمان سے اتر کر میرے خیمہ میں داخل ہو گیا ہے۔" علاء الدین خلجی نے جواب طلب نظروں سے اپنے مصاحب خاص کی طرف دیکھا۔

"سلطان! یہ ایک مبارک خواب ہے۔ عنقریب نئی فتوحات اور نئی بلندیاں آپ کے قدم چھونے والی ہیں۔"

علاءالدین مسکرانے لگا۔ "یقیناً خسرو! ایسا ہی ہوگا۔ یہ ساری بلندیاں ہمارے ہی لئے تو بنائی گئی ہیں۔"

اس کے بعد سلطان نے اپنے دربار کے خوش نوا مطرب ندیم کاشانی کو طلب کیا پھر جنگل کی پر سکون فضا کاشانی کے نغموں سے گونجنے لگی۔ وہ بلند آواز میں گا رہا تھا۔ "خلجی عظیم تھے مگر علاءالدین نے خلجیوں کی عظمت کے میناروں کو آسمان کے ستاروں تک بلند کر دیا۔ ابھی فاتح عالم کا سفر باقی ہے اور نہ جانے ابھی کتنی بلندیاں سلطان کے زیر دام آنے والی ہیں۔"

ندیم کاشانی کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک گونج رہی تھی اور پورے لشکر پر ایک خمار کی سی کیفیت طاری تھی۔

☆..................☆..................☆

آنے والا دن چتوڑ کی سیاست میں بڑی تبدیلیاں لے کر آیا تھا۔ راجہ رتن سنگھ نے مختصر الفاظ میں وکرم سنگھ کی اچانک موت اور جسم کو نذر آتش کرنے کی تفصیلات بتائیں۔ راجپوت سردار اس خبر سے بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ وکرم سنگھ کا جو کردار اہل چتوڑ کے سامنے پیش کیا گیا تھا' اس کے مطابق وکرم سنگھ ایک معتوب اور لعنت زدہ انسان تھا۔ ایسے انسان کی موت پر جشن ہی منایا جا سکتا تھا اور آج راج محل میں پورے زور و شور کے ساتھ جشن جاری تھا۔ وکرم سنگھ کی موت پر اگر کوئی شخص اداس تھا تو وہ راجہ رتن سنگھ کا جواں سال بھانجا سونگرا مال دیو سنگھ تھا۔ سونگرا' وکرم سنگھ کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر تھا اور اسی تاثر نے اسے نرملا کماری سے جذباتی رشتہ قائم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سونگرا کو نرملا سے شدید محبت تھی مگر نرملا نے اس انداز سے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ یکطرفہ طور پر سونگرا کے دل میں عشق کی آگ بھڑک رہی تھی۔ سونگرا اس وقت بھی چھپ چھپ کر رویا تھا جب منتری بھون کو آگ لگائی گئی تھی اور اس وقت بھی وکرم سنگھ کی موت کی خبر سن کر اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے پھر جب راجہ رتن سنگھ نے اپنے ماموں گنیش سنگھ کو چتوڑ کا وزیر اعظم نامزد کیا تو سونگرا کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے زیر لب کہا۔ "اب چتوڑ کی تباہی کا باب مکمل ہو گیا۔"

راجپوت سردار' رتن سنگھ کے اس اقدام کو دانشمندی کی انتہا کہہ کر گنیش سنگھ کو مبارکبادیں دے رہے تھے اور سونگرا اپنے ماموں رتن سنگھ کو بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دیکھتا رہا' بھرے دربار میں کوئی اس کی زبان سمجھنے والا نہیں تھا۔ مبارکبادی کا شور ختم ہوا تو گنیش سنگھ اپنی نشست پر کھڑا ہوا۔ پہلے اس نے راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کی شان میں ایک طویل قصیدہ پڑھا۔ پھر بلند آواز میں کہنے لگا۔

"راج جوتشی آچاریہ شنکر داس نے اپنے علم کے ذریعے ہمیں خبردار کیا ہے کہ سلطان علاءالدین خلجی کی فوجیں چتوڑ کے قریب پہنچنے والی ہیں۔ یہ تمام راجپوتوں کیلئے ایک کڑا وقت ہوگا۔ اس وقت کو ٹالنے کیلئے ضروری ہے ہم سب "ماتا کے مندر" میں حاضر ہو کر ساری رات "درگا اور کالی" کو سجدے کریں اگر ہم نے یہ گھڑیاں سو کر گزار دیں تو پھر ہمیں جگانے والا کوئی نہیں ہوگا۔"

"مہاراج رام دیو تو کہتے تھے کہ وہ اپنے منتروں کی طاقت سے سلطان کی فوجوں کا رخ موڑ دیں گے۔" ایک راجپوت سردار نے کھڑے ہو کر تلخ لہجے میں کہا۔

"مہاراج اب تھک چکے ہیں۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔" نئے مہامنتری گنیش سنگھ نے انتہائی

عیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "آچاریہ جی کا کہنا ہے کہ آسمان پر ستاروں کی چالیں بدل چکی ہیں۔ اب ہمیں درگا اور کالی ماتا کا آشیرواد ہی بچا سکتا ہے۔ اس آشیرواد کو حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ تمام استری اور پُرش مل کر پوجا کریں۔ کل پورن ماشی (مکمل چاند) کی رات ہے اگر یہ رات بیت گئی تو پھر آنے والی راتیں بہت بھیانک اور سیاہ ہوں گی۔"

گنیش سنگھ کی تقریر کے بعد راجہ رتن سنگھ سے اجازت لے کر آچاریہ شنکر داس کھڑا ہوا۔ یہ چتوڑ کا ایک عالم و فاضل برہمن تھا۔ شنکر داس نے مذہبی علم کے ساتھ ساتھ موسیقی اور نجوم میں بھی مہارت حاصل کی تھی۔ وہ ستاروں کی رفتار دیکھ کر پیش گوئیاں کرتا تھا اور اس کی کئی پیش گوئیاں درست بھی ثابت ہو چکی تھیں۔ پورا ہندو دھرم ان ہی پیش گوئیوں کے جال میں الجھا ہوا تھا۔ شادی بیاہ سے لے کر سیاست اور جنگ تک تمام لوگ دراصل نجومیوں کے محتاج تھے اور مہورت نکلوائے بغیر کسی کام کا آغاز نہیں کرتے تھے۔ شنکر داس اپنی اسی صفت کے باعث چتوڑ کے اعلیٰ طبقوں میں بہت مقبول تھا مگر اس کی یہ مقبولیت رام دیو کی شعبدہ بازیوں کی نذر ہو گئی تھی اور وہ اچانک گوشۂ گمنامی میں چلا گیا تھا۔ پھر جب علی عامر آفریدی کے سلسلے میں رام دیو مسلسل ناکامیوں کا شکار ہوا اور گنیش سنگھ اقتدار میں آیا تو اس نے اپنا حلقۂ اثر بڑھانے کیلئے شنکر داس کو استعمال کیا۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی' رام دیو سے بددل ہو چکے تھے' اس لئے شنکر داس کو اپنا پرانا ہنر آزمانے اور اپنے حریف کو نیچا دکھانے کا موقع مل گیا۔ ایک عمر کی روپوشی اور ناکامی نے شنکر داس کو بہت تلخ مزاج بنا دیا تھا۔ ماتا کے مندر کا بڑا پجاری ہونے کے باعث وہ تقریر کے فن سے بخوبی واقف تھا۔ آج قسمت شنکر داس پر مہربان ہوئی تو وہ جوشِ گفتار کا مظاہرہ کرنے لگا۔

"یہ میرے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وکرم سنگھ مرنے سے کچھ روز پہلے ماتا کے مندر آیا تھا۔" شنکر داس نے ریاکارانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "وکرم سنگھ میرے پاس آیا اور مجھ سے اپنی قسمت کا حال دریافت کرنے لگا۔ وہ اپنی جنم کنڈلی (زائچۂ پیدائش) ساتھ لے کر آیا تھا۔ ایک بوسیدہ کاغذ کو میرے سامنے رکھتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور منت سماجت کرتے ہوئے کہنے لگا مہاراج! اس وقت ہندوستان کا کوئی دوسرا ماہرِ نجوم ایسا نہیں جو ستاروں کی چالوں کو صحیح طور پر سمجھ سکے۔ میں ایک عجیب سے طوفان میں گھرا ہوا ہوں۔ مجھے اس سے نکلنے کی کوئی ترکیب بتایئے کہ آپ کے سوا حالات کی اس دلدل سے نکالنے والا کوئی نہیں......... میں نے ایک نظر وکرم سنگھ کی جنم کنڈلی کو دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ ستاروں کی چالیں اس کے حق میں نہیں تھیں۔ میری خاموشی سے وکرم سنگھ پریشان ہو گیا اور میری خوشامد کرنے لگا۔ "آچاریہ جی! آپ کی آنکھیں ستاروں میں جو کچھ دیکھ رہی ہیں اسے واضح الفاظ میں ظاہر کر دیا جائے۔" میں نے درپردہ اشاروں ہی اشاروں میں وکرم سنگھ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ حالات کا انکشاف مناسب نہیں ہے۔ مگر وہ نہیں مانا بالآخر میں نے اس سے دبے لفظوں میں کہہ دیا کہ عنقریب اس کے اقتدار کا سورج غروب ہونے والا ہے اور وہ ایک عجیب و غریب الزام میں اپنے عہدے سے معزول کر دیا جائے گا۔ میں نے جان بوجھ کر اس سے یہ بات چھپائی تھی کہ اقتدار کے ساتھ اس کی زندگی کے دن بھی پورے ہو چکے ہیں۔ آج دربار میں آ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ مذہب و وطن کا غدار تھا۔ اس لئے اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ گیا۔" آچاریہ شنکر داس بڑی بے حیائی کے ساتھ جھوٹ بول رہا تھا۔

وکرم سنگھ' آچاریہ کی عزت محض اس لئے کرتا تھا کہ اسے بڑے پجاری کی حیثیت حاصل تھی اس لئے وہ کبھی اس سے ملنے مندر آ جایا کرتا تھا۔ شنکر داس نے ان ملاقاتوں کو نیا رنگ دے کر وکرم سنگھ پر ایک نیا الزام تراشا ورنہ حقیقت یہ تھی وکرم سنگھ نے شنکر داس سے کبھی اپنی قسمت کا حال نہیں پوچھا۔ مرنے والے

پر یہ سنگین تہمت تو لگائی جا چکی تھی مگر اس کا جواب کون دیتا؟ وکرم سنگھ کی تو راکھ بھی ہوا میں بکھر چکی تھی۔

آچاریہ نے اپنی فریب کاریوں سے بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ اس صورت حال کو بدلنے کیلئے نئے مہامنتری گنیش سنگھ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "دھرم اور دیس کے غدار اپنی اپنی سزاؤں کو پہنچ چکے۔ اور جو باقی رہ گئے ہیں وہ بھی اپنا حشر دیکھ لیں گے آچاریہ! آپ تو وہ طریقہ بتائیے جس سے چتوڑ کو بیرونی اور اندرونی دشمنوں سے نجات مل سکے۔ ہمارا باہری دشمن دہلی کا سلطان علاءالدین خلجی ہے اور اندرونی دشمنوں میں وہ ضعیف وناتواں عورت بھان متی ہے جو اپنے جادو کے زور سے ہمارے منصوبوں میں خلل ڈال رہی ہے۔ ہم بیک وقت دونوں دشمنوں کا خاتمہ چاہتے ہیں آخر اس کا کیا اپائے ہے؟"

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ خوش قسمتی سے کل پورن ماشی (مکمل چاند) کی رات ہے اگر چاند اپنے پورے عروج پر ہو اور اس رات سچے دل سے دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی جائے تو آکاش پر دعائیں قبول ہوتی ہیں اور انسان سنکٹ کال (مصیبت کے زمانے) سے باہر نکل آتا ہے۔ مہامنتری کو پہلے ہی مطلع کر چکا ہوں کہ جب چاند طلوع ہو جائے اور مارواڑ کی بلند ترین چوٹی سے اوپر نظر آنے لگے تو اس وقت شیولنگ کے درشن کئے جائیں اور پھر درگا اور کالی ماتا کی پوجا شروع کی جائے۔ یہ پوجا اس وقت تک جاری رہے گی جب تک سورج دیوتا اپنے درشن نہیں دیتے۔ سمراٹ! جو کچھ چاہتے ہیں وہی ہو جائے گا۔ ستارے مجھ سے سرگوشیاں کر رہے ہیں کہ چوہانوں کی پگڑی خون سے تر ہو سکتی ہے مگر اسے زمین کی مٹی نہیں چھو سکتی۔ سلطان ایک بد نصیب حکمران ہے۔ اس کے اتنے بڑے دربار میں کوئی ایک بھی جوتشی ایسا نہیں ہے جو اسے ستاروں کی رفتار کے بارے میں اتنا ہی بتا دیتا کہ جب منگل (سیارہ مریخ) کمزور حالت میں ہو تو جنگ کے ارادے سے اپنی سرحدیں نہیں چھوڑنی چاہئیں۔" یہ کہہ کر آچاریہ شنکر داس نے راجہ رتن سنگھ کی طرف دیکھا۔ "سمراٹ ایک خوش قسمت فرمانروا ہیں کہ ان کے دشمن نے جنگ کیلئے غلط وقت کا انتخاب کیا ہے۔ جب ستارے اس زاویے سے حرکت کر رہے ہوں تو عام مسافر کیلئے بھی گھر سے نہیں نکلا جاتا۔ لڑائی میں الجھ جانا اور بھی خوفناک عمل ہے جس کا نتیجہ ذلت وشکست کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔" آچاریہ شنکر داس پُرغرور لہجے میں اپنے علم کا مظاہرہ کر رہا تھا اور علاءالدین کو محض اس لئے احمق قرار دے رہا تھا کہ لشکر کشی سے پہلے کسی نجومی سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ اب شنکر داس کو یہ کون بتاتا کہ سلطان نے اپنی زندگی میں چھوٹی بڑی چوراسی جنگیں لڑیں مگر ایک بار بھی کسی نجومی سے نہیں پوچھا کہ اس جنگ کا انجام کیا ہوگا۔ دہلی سے چتوڑ کی جانب روانہ ہوتے وقت بھی اس نے اپنے تمام سپہ سالاروں سے مشورے کئے تھے مگر کسی اجلاس میں بھی کسی ماہرِ نجوم کو شریک ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ آج شنکر داس اپنے ناپائیدار علم کے نشے میں بدمست ہو کر اسی علاءالدین کا مذاق اڑا رہا تھا۔

آچاریہ کی باتیں سن کر راجہ رتن سنگھ بہت خوش نظر آ رہا تھا........... "تم سچ کہتے ہو شنکر داس! منگل (مریخ) کی کمزوری کا نکتہ تو کبھی مہاراج رام دیو نے بھی ہمارے سامنے بیان نہیں کیا تھا۔"

"سمراٹ! ان کا ذکر نہ کریں کہ آخر وہ مہاراج ہیں' بڑے گیانی ہیں۔" شنکر داس کا ایک ایک لفظ طنز کے زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔ "یہ نکتہ تو وہی شخص بیان کر سکتا ہے جو شنکر داس (غلام) ہو اور بھگوان جس سے راضی ہوں۔" احساس فخر سے بوڑھے شنکر داس کی کمر میں تناؤ آ گیا تھا۔ اور وہ پورے جوش کے ساتھ بولنے لگا تھا۔ "کل رات تمام فیصلے ہو جائیں گے۔ دیوتا سلطان کے بڑھتے ہوئے لشکر پر عذاب نازل کر کے یا تو اسے ہمیشہ کیلئے تباہ کر دیں گے یا پھر وہ ناکام ونامراد ہو کر واپس لوٹ جائے گا۔ اور اپنی نسلوں سے کہہ مرے گا کہ آئندہ چتوڑ کا رخ نہ کرنا اس کے ساتھ ہی وہ جاہل عورت جسے چتوڑ کے توہم پرستوں نے

جادوگرنی کا لقب دے دیا ہے۔ پتھروں کے ڈھیر میں چیختی ہوئی دنیا سے رخصت ہو جائے گی اور وہ تنگ وتاریک کمرہ اس کی قبر بن جائے گا۔" آچاریہ شنکر داس نے مستقبل قریب میں ہونے والے فیصلوں کا ایک ہلکا سا عکس بیان کیا اور بے نیازانہ چلتا ہوا دربار سے رخصت ہونے لگا۔ اچانک دربار کے صدر دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رکا اور راجہ رتن سنگھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "سمراٹ! پوجا کی رسم کے اعلان کے ساتھ ہی اپنا یہ حکم بھی عام کر دیجئے کہ پورن ماشی کی رات چتوڑ کا کوئی اچھوت کسی مندر کے قریب جانے کی کوشش نہیں کرے گا اگر کوئی شودر کسی طرح اندر داخل ہو گیا تو دیوتاؤں کی ناراضگی ہمیں کہیں کا نہ چھوڑے گی۔" یہ کہہ کر آچاریہ شنکر داس ایک ہاتھ سے اپنے ریشمی جنیو (گردن میں پڑے ہوئے دھاگے) کو آہستہ آہستہ کھینچتا ہوا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی باریک ململ کی دھوتی کو سنبھالتا ہوا دربار سے نکل گیا۔

دربار خالی ہوتے ہی مہامنتری گنیش سنگھ نے اپنے حکمران بھانجے راجہ رتن سنگھ کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔

"تم بہت ذہین اور ہوشیار راجپوت ہو گنیش سنگھ۔" رتن سنگھ اپنے عمر رسیدہ ماموں کی تعریف وستائش کر رہا تھا۔ "کاش! ہم نے تمہیں پہلے آزما لیا ہوتا پھر ہم اس اذیت وکرب کا شکار نہ ہوتے۔ شنکر داس نے ہماری مشکلات اور دشواریوں کو کتنا سمیٹ دیا۔ رام دیو نے تو وہ شرائط پیش کی ہیں کہ جنہیں پورا کرنا کسی بھی انسان کے بس کی بات نہیں۔"

"دھیرج رکھیں سمراٹ! اب میں آ گیا ہوں تو سیاست کے بازار کی گرمی دیکھنا۔ ایک ایک حریف جل جائے گا اور ایک ایک دشمن کے قدموں پر برہمنوں کی یہ وسیع وعریض زمین تنگ ہو جائے گی۔" گنیش سنگھ اپنی تعریف سن کر بھکاری کے خالی پیالے کی طرح بج اٹھا تھا۔ "اب میں اس ویشیا بھان متی کی طرف جا رہا ہوں تاکہ اسے پورن ماشی کی پوجا سے بے خبر رکھ سکوں۔ یہ احتیاطی تدابیر اس لئے ہونگی کہ وہ اہل چتوڑ کی پوجا سے گھبرا کر اپنے گرد کوئی حصار نہ کھینچ لے اور اس طرح قبل از وقت ہوشیار ہو کر وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جائے۔"

"گنیش سنگھ! کیا تمہیں اب بھی آچاریہ کی پوجا کے اثرات پر شک ہے؟ کیا تم اس کے ستاروں کے حساب کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔" رانی پدمنی نے نئے مہامنتری سے پوچھا۔

"نہیں مہارانی! سیاست میں کوئی چال آخری چال نہیں ہوتی۔" گنیش سنگھ اس فاتح کے لہجے میں بول رہا تھا جس نے گھر بیٹھے علاءالدین خلجی کی فوجوں کو شکست دے دی ہو۔

"سیاست میں ہر شخص کا نعم البدل ہونا چاہئے۔ اگر آج گنیش سنگھ وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہے تو مہارانی کو اس کرسی کے تقاضے سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔ اگر ایک گنیش سنگھ سرکشی اختیار کرے تو دوسرا گنیش سنگھ حلف اٹھانے کیلئے تیار ہو۔ اس طرح پہلے گنیش سنگھ کی ساری ٹیڑھ درست ہو جائے گی۔ اب تک یہی ہوا ہے کہ تنہا وکرم سنگھ کے کاندھوں پر ریاست کی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال دیا گیا۔ اس پر مزید غضب یہ ہوا کہ آنکھیں بند کر کے ایک شخص پر اعتبار کر لیا گیا اور اسے یقین دلا دیا گیا کہ وہ چتوڑ کیلئے ناگزیر ہے۔ نتیجتاً اس نے ساری بازیاں اپنے دل کی مرضی سے کھیلیں اور ریاست کے مفادات کو بے رحمی کے ساتھ داؤ پر لگا دیا وہ تو دیوتاؤں کا علم تھا کہ عین موقع پر اس کی بدنیتی ظاہر ہو گئی اور چتوڑ تباہ ہونے سے بچ گیا۔" گنیش سنگھ بے تکلفانہ اور پُرجوش لہجے میں بول رہا تھا۔

رانی پدمنی نے سخت آواز میں اس کی گرفت کی........... "آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو گنیش سنگھ؟ بات

ہو رہی تھی بھان متی کی لیکن تمہارے الفاظ کی لے ٹوٹی وکرم سنگھ پر۔ " پدمنی ' گنیش سنگھ کی بے سروپا باتوں سے بیزار نظر آ رہی تھی۔

" مہارانی معاف کیجئے گا کہ یہ سیاست کا ایک اصول ہے جس کا اطلاق وکرم سنگھ پر بھی ہوتا ہے اور بھان متی پر بھی۔ " گنیش سنگھ نے اپنے دائرے میں محدود ہوتے ہوئے کہا۔ " سیاست میں ہر چیز کا نعم البدل ہونا بہت ضروری ہے اگر ایسا نہ ہو تو وہ سیاست نہیں ' حماقت کہلاتی ہے۔ ہم سے آچاریہ شنکر داس نے وعدہ کیا ہے کہ پورن ماشی کی رات میں بھان متی کا فیصلہ ہو جائے گا۔ بالفرض اگر ایسا نہیں ہوا......... اور بھان متی ہماری ان چالوں سے باخبر ہو گئی تو پھر ہم کیا کریں گے ؟ ہم نے اس کا کوئی نعم البدل سوچا ہے ؟ "

رانی پدمنی اور رتن سنگھ حیرت سے گنیش سنگھ کی طرف دیکھنے لگے۔

" مہارانی ! اس کا نعم البدل یہی ہے کہ ایک طرف ہم بھان متی کی زندگی کی جڑیں کاٹتے رہیں اور دوسری طرف اس کے سامنے بیٹھ کر اپنی عقیدتوں کا اظہار کرتے رہیں ایک تیر نشانہ خطا کر جائے تو کمان کو فوری طور پر اس طرح کھینچ لیا جائے کہ اس میں دوسرا تیر موجود ہو۔ " گنیش سنگھ کی باتیں فریب اور عیاری سے لبریز تھیں۔ وہ ہندوؤں کے مشہور سیاستدان کی زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔

رانی پدمنی اور رتن سنگھ نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔

" میں بھان متی کے پاس جا رہا ہوں۔ " یہ کہتے ہوئے گنیش سنگھ کرسی سے اٹھا اور رخصت ہونے کیلئے اجازت طلب کی۔

" اس کا خیال رکھنا گنیش سنگھ کہ وہ فاحشہ بڑے لمبے کان رکھتی ہے۔ " پدمنی نے اسے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ " کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ مندر میں بیٹھنے کے باوجود یہاں کی ایک ایک بات سن لیتی ہے۔ "

☆..................☆..................☆

گنیش سنگھ راج محل سے رخصت ہو کر بمل شاہ کے مندر پہنچا اور پھر دوسرے پجاریوں سے پوچھتا ہوا بھان متی کے کمرے کے آگے جا کر رک گیا۔ مائی اس وقت آنکھیں بند کئے اپنے دھیان میں بیٹھی تھی۔ معمولی کپڑے کی ایک سفید چادر میں لپٹی ہوئی بوڑھی عورت جو زندگی کی ہر آسائش سے محروم ہوتے ہوئے بھی چتوڑ کے اقتدار اعلیٰ کیلئے مستقل خطرہ بنی ہوئی تھی۔ گنیش سنگھ نے اس عورت کے بہت سے افسانے سنے تھے۔ جسے راج محل کے بسنے والے طوائف زادی کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ گنیش سنگھ مائی بھان متی کو چند قدم کے فاصلے سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی بھان متی کے چہرے پر گنیش سنگھ کی نظر پڑی ' اسے محسوس ہوا جیسے جھریاں بھرے چہرے سے چاند کی روشنی پھوٹ رہی ہو۔ گنیش سنگھ چونک اٹھا۔ طوائف زادیوں کے چہرے پر دل کو سکون پہنچانے والی ایسی ٹھنڈی روشنی نہیں ہوتی۔ پھر اچانک گنیش سنگھ نے اس روشنی کو اپنا مزاج بدلتے دیکھا۔ ٹھنڈک نے حرارت کی قبا پہن لی تھی۔ چاند کی سرد کرنیں سورج کی تیز شعاعوں میں ڈھل گئیں اور پھر بھان متی کے جلال کی تاب نہ لا کر گنیش سنگھ چیخ اٹھا۔

" مائی......... " اس کے منہ سے وہ لفظ ادا ہو گیا جس کے اظہار پر راج دربار نے پابندیاں عائد کر دی تھیں۔

ناگہاں اپنے قریب ایک چیخ سن کر بھان متی نے آنکھیں کھول دیں اور بڑی بے نیازی کے ساتھ گنیش سنگھ کی طرف دیکھا جو دروازے میں کھڑا کانپ رہا تھا۔ مائی کی نظریں اٹھیں تو مہامنتری کا سر پتھر کے فرش پر

جھک گیا۔

" میری چوکھٹ کو اپنے سجدے سے ناپاک نہ کر کہ تیرا سر تو راج دربار میں جھکنے کیلئے بنایا گیا ہے۔ " ایک ضعیف و ناتواں عورت کی آواز میں اس قدر ہیبت تھی کہ گنیش سنگھ کے دل کی دنیا میں لرزہ سا پڑ گیا۔

" مائی ! میں تیرا داس ہوں گنیش سنگھ۔ " مہامنتری نے سجدے کی اسی حالت میں گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

" پہلے کھڑا ہو ' اپنے حواس درست کر پھر بتا کہ تو کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے ؟ " مائی کا لہجہ حاکمانہ تھا۔

گنیش سنگھ کھڑا ہو گیا مگر اس کے جسم کی تھرتھراہٹ نمایاں تھی۔ " میں چتوڑ کا مہامنتری گنیش سنگھ ہوں۔ "

" اور وکرم سنگھ کہاں چلا گیا ؟ " بھان متی نے حیران ہو کر پوچھا۔

بھان متی کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہی گنیش سنگھ کی وحشت کم ہو گئی تھی اور اسے یقین آ گیا تھا کہ اس بوڑھی عورت کے روحانی علم کے بارے میں جو روایتیں مشہور ہیں ' ان میں زیادہ سچائی نہیں اگر وہ بند کمرے میں بیٹھے بیٹھے راج دربار کا حال جان سکتی تو پھر اسے یہ بھی پتا ہوتا کہ وکرم سنگھ کے ساتھ منتری بھون کو بھی نذرِ آتش کیا جا چکا ہے۔ یہ سوچ کر گنیش سنگھ کی جان میں جان آئی اور اس نے کسی قدر اعتماد کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہا......... " وکرم سنگھ ایک غدارِ وطن اور مذہب فروش تھا ' اس لئے سزایاب ہوا اور ذلت و رسوائی کے ساتھ دنیا سے رخصت کر دیا گیا۔ " گنیش سنگھ اس حقیقت کو بھول چکا تھا کہ مرنے والا وزیر اعظم مائی بھان متی سے کس قدر عقیدت رکھتا تھا۔

" وکرم سنگھ بھی آنند پال کے راستے پر چلا گیا۔ " یکایک مائی بھان متی کا لہجہ سوگوار ہو گیا تھا.........

" میں جانتی تھی کہ وہ اسی منزل کا مسافر ہے۔ کسی دوسرے راستے پر چل ہی نہیں سکتا۔ شاید اس نے جانے میں جلدی کی۔ اپنی کرنی کا پھل تو پا لیا۔ پتھروں کے سینے میں جو بیج بوئے تھے ان کو پھوٹتے ہوئے تو دیکھ لیا۔ " مائی بھان متی مسکرائی مگر یہ ایسی مسکراہٹ تھی جس کے پیچھے دیکھنے والی آنکھوں کو آنسوؤں کا ایک سمندر نظر آ سکتا تھا۔ گنیش سنگھ اندھا تھا ' اس لئے مائی کے ہزاروں پردوں میں لپٹے ہوئے جذبات کو نہ دیکھ سکا۔

" ہاں مائی ! اس نے اپنی کرنی کا پھل پا لیا۔ " اب گنیش سنگھ کا لہجہ کسی قدر پرجوش ہو گیا تھا۔ " دیوتاؤں نے اپنے ایک نافرمان کو ایسی سزا دیدی جسے چتوڑ کے رہنے والے رہتی دنیا تک یاد رکھیں گے۔ "

" تو ٹھیک کہتا ہے مہامنتری ! " بھان متی کی آواز میں بڑی خلش تھی مگر گنیش سنگھ اسے محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ " وکرم سنگھ امر ہو گیا اور تیرے دیوتا بے گھر ہو گئے۔ "

اچانک گنیش سنگھ کو احساس ہوا کہ بھان متی کے تیور پھر بگڑ گئے ہیں اور اس کی باتوں سے نفرتوں کا زہر ٹپکنے لگا ہے۔ " مائی ! جو مر گیا سو مر گیا۔ اس پر خاک ڈال دے اور اپنے اس داس کو اجازت دے کہ وہ تیرے پاؤں چھو سکے۔ "

" جس نے اپنی چوکھٹ کو چھونے کی اجازت نہیں دی ' وہ کسی کے ناپاک ہاتھوں کو اپنے جسم تک کس طرح پہنچنے دے گی ؟ " بھان متی کا لہجہ دیکھتے ہی دیکھتے شرربار ہو گیا تھا۔

" مائی ! میں تجھے بتانے آیا ہوں کہ راج دربار کے لوگوں نے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لی ہے۔ "

گنیش سنگھ نے اپنی عیاری کا آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ "راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوگیا ہے۔ وہ بہت شرمندہ ہیں اور اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"آخر کس طرح ؟" بھان متی نے اطمینان سے پوچھا۔

"راج دربار میں آپ کا شاندار استقبال کرکے ' آپ کو دیوی کا مقام دے کر کہ چتوڑ نے آج تک آپ جیسی گیانی اور اونچے چرتر (بلند کردار) والی عورت پیدا نہیں کی۔" گنیش سنگھ نے منصوبے کے مطابق اپنی زندگی کا سب سے بڑا جھوٹ بولا تھا۔

"پھر وہ دیویاں کہاں جائیں گی جو راج محل میں اپنی پوجا کرا رہی ہیں ؟" اس بار بھان متی کے لہجے میں غصے کی آمیزش نہیں تھی' ایک شگفتگی تھی' گنیش سنگھ اور دوسرے درباریوں کو ذلیل ورسوا کرنے والی شگفتگی۔

گنیش سنگھ سناٹے میں آگیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک گوشہ نشین عورت اس طرح بھی چتوڑ کی محترم خواتین کی تحقیر کر سکتی ہے۔ "آپ کو ان سب پر فوقیت حاصل ہوگی۔" گنیش سنگھ نے فوراً ہی دوسرا جھوٹ بولا۔

"اس طرح تو مجھے سب سے بڑی دیوی بنانا چاہتا ہے۔" بھان متی مسکرائی۔ "اگر میں دیوی بن گئی تو پھر مجھے کہاں بٹھایا جائے گا ؟"

"چتوڑ کا جو مندر بھی آپ کو پسند ہو۔" گنیش سنگھ خوش تھا کہ بھان متی آہستہ آہستہ اس کے بچھائے جال کے قریب آتی جارہی تھی۔

"کیا درگا اور کالی کی مورتیاں مندروں سے اٹھوا دی گئی ہیں ؟" بھان متی نے ایک اور عجیب سا سوال کیا۔

گنیش سنگھ کی پریشانی کی انتہا نہیں رہی تھی۔ آخر وہ کیا جواب دیتا ؟ حیران نظروں سے بھان متی کو دیکھتا رہا۔

"بول گنیش سنگھ! کیا تیرے حکمرانوں نے ساری دیویوں کو دیس نکالا دے دیا ہے ؟" بھان متی ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہی تھی اس کے لہجے میں نشتروں سے بھی زیادہ کاٹ تھی۔

"مائی! یہ کیسے ہوسکتا ہے ؟" گنیش سنگھ ناقابل بیان کشمکش کا شکار تھا۔

"پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بھان متی کے ہوتے ہوئے دوسری دیویوں کو پوجا جائے۔" مائی' گنیش سنگھ کی بے بسی سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ "اگر پدمنی اور رتن سنگھ کو اپنی بدسلوکیوں پر ندامت ہے اور وہ پچھلے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے ہیں تو ان سے کہہ دینا کہ یوگیشوری ' لکشمی' بھگوتی' نندا' رادھیکا' امبیکا ' درگا اور کالی کے مجسمے دریائے گمبھیری اور بڑیچ میں غرق کردیں۔ پھر ایک ایک مندر کو میری مورتیوں سے سجا دیں۔ جب چتوڑ کی تمام عبادت گاہوں میں بھان متی کے مجسمے نصب ہوجائیں گے تو وہ اہل چتوڑ کو اپنے درشن دینے چلی آئے گی۔"

"ہمارے مذہب کی توہین کرتی ہے بھان متی ؟" گنیش سنگھ شدتِ غضب میں اپنا لہجہ بھول گیا۔

"گنیش سنگھ یہ اچانک تیری زبان کو کیا ہوگیا ؟ کوئی داس اپنی مالکہ سے اس طرح بات کرتا ہے ؟" بھان متی خلاف عادت ہنس پڑی۔

"نہیں ہوں میں تیرا داس!" گنیش سنگھ عالمِ طیش میں کانپنے لگا۔ "ایک اعلیٰ نسل راجپوت ایک ویشیا (طوائف) کا داس ہو بھی نہیں سکتا۔"

"میری چوکھٹ کی دھول پر ابھی تک تیرے گھٹنوں کا عکس موجود ہے۔ جھک کر اسے غور سے دیکھ کہ یہ کس راجپوت کا عکس ہے ؟" بھان متی کا شعلہ ریز اندازِ گفتگو واپس لوٹ آیا تھا۔

گنیش سنگھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو اس کے منہ سے غلیظ کلمات کا فوارہ ابل پڑا۔ "اب مجھے اندازہ ہوا کہ تیرے دل میں کیسی کیسی ناپاک خواہشات جنم لیتی رہتی ہیں۔ دیوی بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ کوئی تیری لاش کو کاندھا دینے والا بھی نہیں ہوگا۔ ارتھی تک نہیں اٹھے گی تیری۔ یہیں اسی ایک گوشے میں سڑ جائے گی۔ چتوڑ کے درندے بھی تیری ہڈیاں قبول نہیں کریں گے۔"

مائی بھان متی مسکرانے لگی.......... "ان بدنصیبوں کو راج نیتی سکھا رہا ہے جن کے اقتدار کی چند گھڑیاں باقی رہ گئی ہیں ؟" یکایک مائی کا لہجہ پُرجلال ہوگیا۔ "مجھے دھوکے سے قتل کرنا چاہتا ہے ؟ میں نے تو تیرے آقا رتن سنگھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ راجپوت سورماؤں کا پورا لشکر لے کر آئے۔ پھر تو تنہا کیوں چلا آیا واپس جا کہ تیرا بڑا مالک قریب آپہنچا ہے۔ وہ تم سب کو زندگی کا سبق سکھائے گا کہ شہنشاہ کیسے ہوتے ہیں اور غلامی کس شے کا نام ہے ؟"

گنیش سنگھ پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ اس نے مائی بھان متی کو گلا دبا کر ہلاک کرنے کے بارے میں سوچا' مگر جیسے ہی آگے بڑھنے کی کوشش کی اسے اپنا پورا جسم شل ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ گنیش سنگھ کے اعصاب پر خوف کی ایک تیز لہر مسلط ہوگئی اور پھر وہ اپنی جان بچانے کیلئے بمل شاہ کے مندر سے بھاگ کھڑا ہوا۔

☆..........................☆..........................☆

پھر جب تنہائی میں گنیش سنگھ نے راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کو یہ واقعہ سنایا تو چتوڑ کے دونوں حکمران چند ساعتوں کیلئے مفلوج سے ہوکر رہ گئے۔ سکوت اور سناٹے کی اس کیفیت سے نکلنے کے بعد پدمنی نے گنیش سنگھ کو انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں مخاطب کیا۔

"تمہارا شوقِ سیاست آرائی تسکین پاگیا ؟ میں نے پہلے کہا تھا کہ وہ نیچ عورت ہے اور ایک نیچ سے کسی اونچے شخص کا میل نہیں ہوسکتا۔ آکاش دھرتی کو گلے لگائے تو دھرتی اپنے نیچ پن کی وجہ سے پاگل ہوجائے۔ وہ آکاش کے جھکنے کو مجبوری سمجھے گی اور پھر وہ اپنی کم ظرفی کے سبب چاند اور سورج کے منہ پر تھوکنے کی کوشش کرے گی۔ بھان متی نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس نے مہارانی پدمنی کے منہ پر تھوک دیا۔ کون پدمنی ؟ وہ پدمنی جس کا چہرہ چاند اور سورج سے بھی روشن تر ہے۔" ملکہ کوہسار پر وحشیوں کی سی کیفیت طاری تھی۔

"گنیش سنگھ! تم نے کیسے شفاف آئینے کو کیچڑ پر رکھ دیا۔ تمہارا جرم ناقابل معافی ہے۔" غصے کی شدت سے پدمنی کا چہرہ اس طرح سُرخ ہوگیا تھا جیسے سارے مسام کھل جائیں گے اور لب ورخسار کا تمام خون ابل پڑے گا۔

"ضبط وہوش سے کام لیجئے مہارانی!" پدمنی کی ہیجانی کیفیت دیکھ کر راجہ رتن سنگھ خود بھی بدحواس ہوگیا تھا۔ "مہامنتری نے جو کچھ کیا ریاست اور ہمارے مفاد میں کیا۔ اس میں ان کی اپنی غرض شامل نہیں تھی۔" رتن سنگھ اپنی بیوی کے جلتے ہوئے دل ودماغ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "مہارانی! اسے معاف کردیں۔ اگر آپ نے گنیش سنگھ کو معاف نہیں کیا تو پھر اسے زمین پر کہیں پناہ نہیں ملے گی۔" رتن سنگھ' پدمنی کی خوشامد کر رہا تھا۔ "اور گنیش سنگھ! تم بھی آگے بڑھ کر مہارانی کے پاؤں چھولو۔" رتن سنگھ نے حسنِ برہم کو منانے کیلئے اپنے عمر رسیدہ ماموں کی طرف دیکھا۔

گنیش سنگھ نے ایک لحہ ضائع کئے بغیر رانی پدمنی کے پاؤں پکڑ لئے اور دلگرفتہ آواز میں اپنی اس غلطی کی معافی مانگنے لگا۔ گنیش سنگھ ایک غیرت مند راجپوت تھا مگر ہوسِ اقتدار نے اسے پیروں پر گر جانے کا ہنر سکھا دیا تھا۔ ہندوؤں کا سیاسی پیشوا چانکیہ یہی تو کہتا تھا کہ اپنا مطلب نکالنے کیلئے ہر راستے سے گزر جاؤ۔ گنیش سنگھ بھی ایک حادثے میں حاصل کئے جانے والے اقتدار کو بچانے کیلئے بزرگ ہوتے ہوئے بھی ایک عورت کے قدموں کو اپنے آنسوؤں سے بھگو رہا تھا۔

جب گنیش سنگھ کے آنسوؤں سے پدمنی کے غصے کی آگ سرد پڑی تو اس نے اپنے حنائی پاؤں کھینچ لئے اور غرور کی انتہا کو چھوتے ہوئے کہا۔ "گنیش سنگھ! اگر تم ہمارے پران ناتھ (شوہر) کے ماموں نہ ہوتے تو ہم اس زبان کو کاٹ کر پھینک دیتے جس نے ہماری بلند و برتر ذات کو سیاست کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔"

"میں بہت نادم ہوں مہارانی! مگر عہد کرتا ہوں کہ بہت جلد اس رسوائی کے داغ کو دھو دوں گا۔ اگر بھان متی کی گردن نہ لا سکا تو اپنا سر آپ کے قدموں میں پیش کر دوں گا۔"

"مت کرو ایسا عہد جس کا کوئی مفہوم نہ ہو۔" رانی پدمنی نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ "اب تو پورن ماشی کی رات ہونے والی پوجا سے بھی ہمارا اعتبار اٹھ گیا ہے۔ دیوتا بھی اس ویشیا بھان متی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" مسلسل ناکامیوں کے بعد پدمنی شدید مایوسیوں کا شکار ہو گئی تھی۔ "ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ ہماری ایک جنبشِ چشم پر ہزاروں تلواریں بے نیام ہو جاتی ہیں۔ مگر کوئی ایک تلوار بھی اس بوڑھی عورت کی کھوکھلی ہڈیوں کو کاٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔"

"مہارانی! دھیرج دھریں۔" راجہ رتن سنگھ نے بھکاریوں کے سے لہجے میں کہا۔ "بھان متی کو کچھ دن کیلئے بھول جایئے کہ ہمارا سب سے بڑا دشمن سر پر آ پہنچا ہے۔ ایک ہی رات کی تو بات ہے۔ شنکر داس کے منتروں کو بھی آزما لیجئے۔ اگر وہ تیر بھی رائیگاں گیا تو کیا، ابھی ہماری سیاست کے ترکش میں بے شمار تیر باقی ہیں۔"

"اب تک لوگوں کو آزمایا ہی تو گیا ہے۔" رانی پدمنی نے نخوت سے کہا...... "آپ کی سیاست کی کمان سے تیر چھوٹتے رہیں گے اور ہمارا کام تمام ہو جائے گا۔" حُسن کے ناز و ادا کا سلسلہ جاری رہا اور گنیش سنگھ اجازت لے کر پوجا کے انتظامات مکمل کرنے چلا گیا۔

☆..............☆..............☆

سارا دن اور ساری رات حکومت کے ڈھنڈورچی نقارے پیٹ پیٹ کر چتوڑ کے گلی کوچوں میں پوجا کا اعلان کرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی ریاست کے اچھوتوں کو بھی تنبیہ کرتے رہے کہ اگر بھولے سے اس قوم کا کوئی فرد مندروں میں داخل ہو گیا تو اس کا اور اس کے خاندان کا نام و نشان تک مٹا دیا جائے گا۔ جب رات کے سناٹے میں قلعے کی فصیل سے اعلان کیا گیا تو نرملا کماری، آفریدی، رامیشوری اور چندر سنگھ نے بھی یہ پرشور آوازیں سنیں۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب آوازیں صاف سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ مگر جب بھی ہوا کا رخ ہوتا تو کوئی نہ کوئی بات سمجھ میں آ جاتی۔ منتری بھون کے خفیہ باغ میں پڑے ہوئے چاروں خانہ بدوشوں کے کان ان آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ آخر منتشر لفظوں کو جمع کرنے کے بعد نرملا کماری نے ایک مفہوم اخذ کیا۔

"کل پورن ماشی کی رات "ماتا" اور "کالکا" کے مندر میں صبح سورج نکلنے تک چتوڑ کی سلامتی کیلئے دعائیں کی جائیں گی۔" نرملا نے آفریدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ سیاسی صورتحال بگڑ گئی ہے۔" آفریدی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"یقیناً کوئی خاص مسئلہ ہے۔" نرملا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "چتوڑ کی یہی تاریخ ہے کہ آفت و مصائب کے زمانے میں اجتماعی پوجا ہوتی ہے اور پھر دیوتاؤں کے کرم سے وہ مشکل گھڑی گزر جاتی ہے۔"

"دیوتاؤں کے کرم سے؟" آفریدی نے حیرت زدہ ہو کر نرملا کی طرف دیکھا۔

"میرے دیوتا نہیں، اہلِ چتوڑ کے دیوتا"۔ نرملا کماری نے جواب دیا اور خاموش ہو گئی۔

"شاید سلطان کے لشکر چتوڑ کی سرحدوں کے قریب آ پہنچے۔" آفریدی نے خود کلامی کے انداز میں کہا ور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

☆..............☆..............☆

پورن ماشی کی رات آئی تو ماتا کے مندر میں بہت ہجوم تھا۔ یہ مندر راج محل کے درمیان میں بنایا گیا تھا۔ جس کے اندر چتوڑ کے امراء اپنی مذہبی رسمیں ادا کرتے تھے۔ آچاریہ شنکر داس کی ہدایت کے مطابق راجگان چتوڑ اور سرداران قوم کی کنواری لڑکیوں نے شیو کی پوجا اس حال میں کی کہ ان کے چہروں پر شرم و حیا کا عکس تک نہیں تھا اور ہوتا بھی کس طرح کہ وہ اس بے حیائی کی عادی ہو چکی تھیں۔ شیو پوجا ختم ہوتے ہی آچاریہ شنکر داس کی ہدایت کے مطابق پجاریوں کا یہ ہجوم "کالکا" کے مندر پہنچا۔ اس مندر میں "درگا" اور "کالی" کے طویل القامت مجسمے نصب تھے۔ دشمن کے مقابلے کے وقت خاص طور پر ان کی عبادت کی جاتی تھی۔ کالکا کے مندر میں شنکر داس تمام پجاریوں کی قیادت کر رہا تھا۔

شنکر داس کچھ دیر تک بہ آواز بلند مذہبی کتابوں کے اشلوک (فقرے) پڑھتا رہا۔ ابھی اشلوک پڑھتے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اراولی اور آبو کی چوٹیوں پر سیاہ گھٹائیں نمودار ہونے لگیں اور تیز بجلی کڑکنے لگی۔ پجاری بہت خوش تھے کہ دیویوں نے ان کی دعائیں فوراً ہی سن لی تھیں۔ رات بھر اسی طرح پوجا ہوتی رہی اور بجلی کسی سرخ سانپ کی طرح لہراتی رہی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ موسلا دھار بارش ہو گی مگر آسمانوں نے چتوڑ کی زمین کو پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں بخشا۔ پھر جیسے ہی صبح کا سورج طلوع ہوا پجاریوں کے منہ سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ مندر کا فرش اچانک ہلنے لگا تھا۔ لوگوں کو شور و غوغا سے باز رکھنے کیلئے شنکر داس کو خود پوری طاقت سے چیخنا پڑا۔ "ماتا کے پجاری گھبرائیں نہیں کہ یہ دیوتاؤں کا لایا ہوا زلزلہ ہے جو چتوڑ کے ہر دشمن کو تباہ کر دے گا۔"

ابھی ان الفاظ کی گونج ختم ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ درگاہ ماتا جو ایک پتھر کے وزنی شیر پر سوار تھی الٹ گئی۔ شنکر داس مجسمے کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا اس لئے اپنے ناتواں جسم کو نہ بچا سکا اور اس شیر کے نیچے دب گیا جسے درگا دیوی سیر و تفریح کیلئے استعمال کرتی تھی۔ لوگ دیوانہ وار بھاگ کھڑے ہوئے کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ مجسمے کے گرتے ہی زلزلہ بھی ختم ہو گیا تھا مگر لوگ بھاگے چلے جا رہے تھے۔ راجہ رتن سنگھ رانی پدمنی اور گنیش سنگھ کے ہمراہ بمشکل تمام اس بھیڑ سے نکل کر راج محل پہنچا۔ ابھی ایک آفت نے دم نہیں لیا تھا کہ دوسری مصیبت ٹوٹ پڑی۔

چتوڑ کے سرحدی دستوں کا ایک سپاہی لرزتے جسم اور اکھڑی سانسوں کے ساتھ رتن سنگھ سے سرگوشی کر رہا تھا۔ "سمراٹ! ہر طرف گھوڑے ہی گھوڑے ہیں۔ بے شمار تلواریں اور لاتعداد انسانی سر۔ علاء الدین خلجی ہماری سرحدوں میں داخل ہو گیا ہے۔"

علاء الدین خلجی کے حملے کی خبر سن کر راجہ رتن سنگھ سناٹے میں آ گیا۔ اس کے تصور میں بھی نہیں تھا

کہ سلطان کے لشکر اتنی تیزی سے یلغار کریں گے۔ دہلی سے چتوڑ تک کا فاصلہ علاء الدین نے کم سے کم وقت میں طے کر لیا تھا۔ وہ صرف رات کے وقت اپنے فوجی دستوں کو قیام کا حکم دیتا تھا اور پھر صبح صادق سے پہلے تمام سپاہی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔ فجر کی نماز ادا کرنے کیلئے کچھ دیر ٹھہرتے اور پھر اپنی اپنی رفتار بڑھا دیتے۔ جب چتوڑ کے محافظ دستوں کے سپاہیوں نے صبح کے دھندلکے میں ہر طرف شہسواروں کے سائے دیکھے تو ایک سپاہی نے ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے راج محل کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ اس نے دریائے گمبھیری میں اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ جہاں دریا کا پاٹ بہت کم ہو گیا تھا اور پانی گھوڑے کے ٹخنوں سے ذرا زیادہ اونچا نظر آ رہا تھا۔ وہ سرحدی سپاہی اس وقت راج محل پہنچا جب کالکا کے مندر میں افراتفری مچی ہوئی تھی اور لوگ چیختے چلاتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ سپاہی نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں راجہ رتن سنگھ کو بتایا کہ علاء الدین کا لشکر جرار آ پہنچا ہے۔ اس خبر کو سن کر کچھ دیر کیلئے راجپوت سمراٹ کے اعصاب شل ہو گئے تھے اور پھر اس نے فوراً ہی نئے مہامنتری گنیش سنگھ اور سپہ سالار ہری سنگھ کو اپنے مخصوص کمرے میں طلب کر لیا تھا۔

"تم نے سنا ہری سنگھ ؟" چتوڑ کے حکمراں نے اپنے سپہ سالار کو اس طرح مخاطب کیا جیسے اس کی زبان اور جسم راج محل میں موجود ہوں اور ذہن کسی مفرور مجرم کی طرح مختلف راستوں پر بھٹکتا پھر رہا ہو۔

ہری سنگھ نے اپنے فرمانروا کی سراسیمگی کو فوراً ہی محسوس کر لیا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر سر جھکاتے ہوئے کہا.......... "سمراٹ! میں اپنی سماعتوں کو دنیا کے شور سے محفوظ رکھتا ہوں۔ میں ایک سپاہی ہوں اپنے شاہ کے ایک ایک اشارۂ چشم کا منتظر اور ایک ایک جنبشِ لب کا تابع۔ سمراٹ جو کچھ کہتے ہیں میں وہی سنتا ہوں۔" ہری سنگھ ایک بہادر اور جاں نثار سپہ سالار تھا۔ اس لئے اس کے اندازِ گفتگو کو خوشامد سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے اسی حقیقی لہجے میں بول رہا تھا۔

رتن سنگھ کے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے اور اس نے تلخ آواز میں ہری سنگھ کو مخاطب کیا۔ "سیناپتی! ہمیں بہت دکھ ہوا کہ اب تم بھی ایک سیاستداں کی زبان میں بات کرنے لگے ہو۔"

سپہ سالار ہری سنگھ حیران و پریشان ہو کر اپنے فرمانروا کی طرف دیکھنے لگا۔ "سمراٹ! ممکن ہے کہ میری جاں نثاری راج محل کے معیار پر پوری نہ اترے مگر میرے ہونٹ آج بھی جھوٹ سے نا آشنا ہیں۔ میں نے مصلحت اور سیاست سے کبھی دوستی نہیں کی۔" اس الزام تراشی کو ضبط کرتے کرتے ہری سنگھ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"تو پھر تمہاری آنکھیں دھندلا گئی ہیں اور کان بہرے ہو گئے ہیں۔" رتن سنگھ نے اپنے سپہ سالار کے جذبات کا احساس کئے بغیر کہا۔

ہری سنگھ کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا اور اس کے چہرے پر ابھرنے والی ناگواری کا رنگ گہرا ہو گیا تاہم اس نے اپنی زبان کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔

"میں اب تک سمراٹ کی گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔"

"ہری سنگھ۔" والئی چتوڑ کی آواز پہلے سے زیادہ بلند اور تلخ تھی۔ "یہ تمہاری ذمے داری تھی کہ تم چتوڑ کی سرحدوں کی نگرانی کرتے اور اگر ہماری مملکت کے حساس علاقے سے کوئی گیدڑ بھی گزرتا تو ہمیں آگاہ کرتے۔"

"سمراٹ! آج تک کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا کہ میں اپنی سرحدوں سے غافل رہا ہوں۔ حالتِ امن میں بھی میری آنکھیں اپنی مملکت کی نگراں رہی ہیں۔" سپہ سالار ہری سنگھ سیدھا کھڑا ہو گیا تھا اور راجہ

رتن سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول رہا تھا۔

"تو پھر تم ہمیں یہ خبر کیوں نہیں دے سکے کہ سلطان علاء الدین خلجی چتوڑ کے قریب آ پہنچا ہے ؟" رتن سنگھ نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ ہمارا دشمن ہمارے کتنے نزدیک ہے ؟"

سیناپتی ہری سنگھ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ ایک سپہ سالار کی حیثیت سے اس کی بے خبری ناقابل معافی تھی۔ وہ شرم و ندامت کی دلدل میں ڈوبنے ہی والا تھا کہ تیزی سے ابھرنے والے ایک خیال نے اسے بچا لیا۔

"کئی ماہ سے تو میری راتیں بھی سرحدوں پر گزر رہی تھیں سمراٹ! مگر کل شب میں آپ کے حکم سے مجبور تھا۔" ہری سنگھ نے باوقار لہجے میں کہا۔ "کل دن بھر لوگوں کو شیو اور درگا کی پوجا کیلئے مندر میں جمع کرتا رہا۔ پھر آپ کے ساتھ مل کر رات بھر دیوتاؤں کو پکارا۔ اس دوران سرحدوں کے خیال سے بھی غافل نہیں رہا اگر پوجا کا اہتمام نہ ہوتا تو یہ خبر پہلے مجھ تک پہنچتی۔" ہری سنگھ نے ایک معقول دلیل پیش کر کے اپنے آپ کو بچا لیا تھا۔

راجہ رتن سنگھ کا غصہ اس دھوئیں کی طرح اڑ گیا جسے تیز ہوائیں دیکھتے ہی دیکھتے فضاؤں میں تحلیل کر دیتی ہیں۔ "اب کیا ہو گا ہری سنگھ ؟"

"بہادر راجپوت ' سلطان کی دست درازیوں کا مقابلہ کریں گے۔" ہری سنگھ کے بجائے مہامنتری گنیش سنگھ نے لاف زنی کرتے ہوئے کہا۔ "غیرت مند راجپوتوں کے گریبانوں کی طرف بڑھنے والے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے اور انہیں قلعہ کے صدر دروازے پر لٹکا دیا جائے گا کہ پھر کوئی شخص ایسے گناہ کا مرتکب نہ ہو سکے۔"

راجہ رتن سنگھ نے انتہائی تحقیر آمیز نگاہوں سے اپنے خوشامدی ماموں کی طرف دیکھا.......... "تم اپنے ہوش میں ہو گنیش سنگھ ؟"

"یقیناً سمراٹ!" گنیش سنگھ اپنے فرمانروا کے سامنے اس طرح جھک گیا کہ سنگی فرش اور اس کے سر میں برائے نام فاصلہ رہ گیا تھا.......... "میں ریاست کا بہترین دماغ ہوں سمراٹ اور ایسے دماغ کبھی بے ہوشی کی حالت میں نہیں رہتے۔"

"سیدھے کھڑے ہو جاؤ گنیش سنگھ۔" راجہ رتن سنگھ نے ڈانٹتے ہوئے کہا.......... "ہم اتنی خوشامد پسند نہیں کرتے کہ آدمی اپنے مقام سے گر کر کوئی پالتو کتا نظر آنے لگے۔" غصے سے رتن سنگھ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ "تم جس شخص کو کٹے ہوئے ہاتھوں کا تماشا دکھانا چاہتے ہو اسے جانتے بھی ہو کہ وہ کون ہے ؟"

گنیش سنگھ کیا جواب دیتا ؟ خوشامدی اور زمانہ ساز انسان تھا۔ اپنے حکمراں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو اس کے پاؤں کانپنے لگے۔

راجہ رتن سنگھ نے حقارت کے ساتھ منہ پھیر لیا اور اپنے سیناپتی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "ایسا سنگین وقت چتوڑ پر کبھی نہیں آیا ہری سنگھ۔ تم سلطان کی ٹڈی دل جیسی فوجوں کا مقابلہ کرو گے ؟ آگے بڑھ کر حملہ آور ہو گے یا پھر دفاعی حکمتِ عملی اختیار کرو گے ؟" رتن سنگھ نے اپنے اعصاب پر قابو پا لیا تھا مگر پھر بھی سلطان کے حملے کی خبر کوئی عام خبر نہیں تھی۔ چند لمحوں میں راجپوت سمراٹ کی نگاہوں کے سامنے کئی خوں رنگ مناظر ابھر کر ڈوب گئے تھے۔ اور اسے چتوڑ کا مستقبل دھواں دھواں نظر آ رہا تھا۔

سیناپتی ہری سنگھ بھی ہراساں تھا مگر امیرِ لشکر کی حیثیت سے اس نے اپنے آپ کو بہت زیادہ مضبوط انسان ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی.......... "میرا اندازہ ہے کہ تعداد کے اعتبار سے ہمارے اور سلطان کے

سپاہیوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ ہم نے اسے تسلیم نہیں کیا مگر وہ ایک شہنشاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔" سپہ سالار ہری سنگھ بڑی صاف گوئی سے بول رہا تھا۔ "سلطان کے پاس اسلحہ بھی زیادہ ہے اور سامانِ رسد بھی۔ وہ کھلے میدان میں ہے اور ہم قلعے میں محدود۔ بہتر یہی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ رسد کا سامان جمع کریں اور قلعہ بند ہو جائیں۔ اس کے بعد صورت حال کا جائزہ لیں اور وقت کے تقاضوں کے مطابق حکمتِ عملی اختیار کریں۔ کچھ فوجی دستے سلطان کے ساتھ تصادم میں الجھائے رکھیں اور باقی لشکر کو قلعے کی حفاظت کیلئے وقف کر دیں۔ اگر معرکہ آرائی نے طول کھینچا تو ہماری افواج مکمل طور پر محصور ہو جائیں گی اور پھر ہم موسم کی خرابی کا انتظار کریں گے۔ موسم پر فتح اور شکست کا دارومدار ہے........ مگر یہ سب کچھ آنے والے وقت پر منحصر ہوگا۔ فی الوقت آپ چتوڑ کے عوام اور فوجوں کو اپنی تقریر سے حوصلہ دیجئے کہ جنگ میں حوصلہ اور جذبہ ہی سب سے بڑا ہتھیار ہے۔" یہ کہہ کر ہری سنگھ اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ راجہ رتن سنگھ کے ایک محافظ خصوصی نے مہاراج رام دیو کے آنے کی اطلاع دی۔

رام دیو کا نام سنتے ہی رتن سنگھ اور پدمنی کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ گنیش سنگھ پہلے ہی دہشت زدہ تھا۔ اب رام دیو کی آمد کی خبر سنی تو وہ مزید بدحواس ہو گیا۔

سپہ سالار ہری سنگھ نے بڑی مایوس نظروں سے رتن سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا........ "کیا چتوڑ کی جنگ مہاراج رام دیو لڑیں گے ؟" ہری سنگھ کے اس مختصر سے سوال میں کئی نازک سوال پوشیدہ تھے۔

رتن سنگھ فوری طور پر اپنے سپہ سالار کے سوال کا جواب نہ دے سکا۔ "ہری سنگھ ؟ صبر و ضبط سے کام لو۔ مہاراج کو آنے دو اور ان کی باتیں غور سے سنو۔ آخری فیصلہ تو ہمارے ہی اختیار میں ہے۔"

ہری سنگھ کا چہرہ اتر گیا۔ وہ مہاراج رام دیو کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ مگر رتن سنگھ کی ملازمت نے اس کے ہونٹوں کو زنجیریں پہنا دی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے رام دیو کمرے میں داخل ہوا تو رتن سنگھ اور پدمنی کی تقلید میں اسے بھی احتراماً کھڑا ہونا پڑا۔

رام دیو اس حالت میں اندر آیا تھا کہ اس کے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے' آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اور سیاہ چہرہ کوئلے کا ایک تراشا ہوا ٹکڑا معلوم ہو رہا تھا۔ "سمراٹ! کل رات کی پوجا کیسی رہی ؟" رام دیو کی مکروہ آواز کمرے میں گونجی وہ کھڑے کھڑے بول رہا تھا اور اس کی سرخ آنکھیں پدمنی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ "ہم تو ایسے پاپی ہیں کہ دیوتاؤں کی پوجا میں بھی شریک نہیں ہو سکے۔" رام دیو نے گزشتہ شب کے ہنگاموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں مہاراج! گناہ گار تو ہم ہیں۔" پدمنی شرم و ندامت کے ساتھ رام دیو کے پاؤں چھونے کیلئے آگے بڑھی۔

"مہارانی! ایک پاپی کو مزید پاپی کیوں بناتی ہیں ؟" رام دیو انتہائی عیاری سے کام لیتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ اور پدمنی ایک مضحکہ خیز صورت حال کا شکار ہو کر رہ گئی۔ "چرن چھونے کے قابل تو آچاریہ شنکر داس ہے جو درگا ماتا کے مجسمے کے نیچے دبا پڑا ہے۔ اس کے بے جان جسم کو چھو لیجئے' تمام دکھوں سے نجات مل جائے گی۔" اچانک رام دیو نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر جانے لگا۔ رتن سنگھ اور کمرے میں موجود دوسرے لوگوں نے کان لگا کر سنا۔ رام دیو کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند تھے اور وہ کسی نیم وحشی انسان کی طرح بڑبڑاتا ہوا جا رہا تھا۔

"ہماری ساری عمر کی ریاضت رائیگاں گئی اور کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے والا "مہا گیانی" ہو گیا۔ ستارے اس سے سرگوشیاں کرنے لگے اور وہ انسانوں کی تقدیریں بدلنے لگا۔ لعنت ہے تجھ پر اے زمانے! ہزار بار لعنت۔ تف ہے تم پر اے چتوڑ کے رہنے والو کہ تم نے میری قدر نہیں کی اور اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر جلا ڈالے۔" رام دیو کمرے سے نکل کر راہداری طے کرتا ہوا اپنے آشرم کی طرف جانے لگا۔ اور اس کی بے ہنگم آواز آہستہ آہستہ ڈوب گئی۔

راجہ رتن سنگھ' رانی پدمنی' مہامنتری گنیش سنگھ اور سپہ سالار ہری سنگھ کچھ دیر تک سناٹے کے عالم میں کھڑے رہے۔ پھر ہری سنگھ نے چتوڑ کے حکمراں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سمراٹ! اگر میری حقیقت بیانی کو گستاخی نہ سمجھا جائے تو میں عرض کروں کہ تمام سادھوؤں اور جوگیوں کے منتر ناکام ہو چکے ہیں۔ براہِ کرم اب تو طلسمات کی دنیا سے نکل آیئے کہ دشمن ہمارے گھر تک آ پہنچا ہے۔"

ہری سنگھ نے ایک عقلی مشورہ دینے کی کوشش کی تھی مگر رانی پدمنی نے اسے جھڑک دیا۔ "سیناپتی! تم اپنی حدود میں رہو اور ملکی سیاست کو تلوار کا نشانہ بنانے سے گریز کرو۔ یہ جنگ کس طرح لڑی جائے گی' اس کا فیصلہ ہم خود کریں گے۔ تم چتوڑ کی سرحدوں کو مضبوط تر بنا دو اور سلطان کی فوجوں کو دریائے گمبھیری سے اس پار روک دو۔"

ہری سنگھ نے سر اٹھا کر ایک بار رانی پدمنی کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں مایوسیوں کے گہرے سائے لے کر خاموشی کے ساتھ چلا گیا۔ ہری سنگھ کے جاتے ہی پدمنی نے مہامنتری گنیش سنگھ کو حکم دیا۔

"تم چتوڑ کی پوری بستی میں اعلان کرا دو کہ آج سہ پہر کے وقت قلعے کے باہر میدان میں سمراٹ رتن سنگھ اپنی پرجا سے خطاب کریں گے۔"

گنیش سنگھ نے مہارانی کا حکم سنا اور سر جھکا کر کمرے سے نکل گیا۔ تنہائی ہوتے ہی راجہ رتن سنگھ نے اپنی محبوب شریکِ حیات کی طرف اداس نظروں سے دیکھا۔ "مہارانی! کیا دیوتاؤں نے ہماری قسمت میں یہ تاریک دن بھی لکھ دیئے تھے کہ نشاط و کیف کی ساری محفلیں اجڑ جائیں گی' ہاتھوں سے لبریز ساغر چھین لئے جائیں گے اور دل و جاں کو پگھلا دینے والا تمہارا حسن........" راجہ رتن سنگھ اپنی بات مکمل نہیں کر سکا۔ شدت جذبات سے اس کی آواز لرزنے لگی تھی۔

"کچھ نہیں ہوگا سمراٹ!" پدمنی کی وہی عشوہ طرازیاں تھیں اور وہی غمزے تھے........ "چتوڑ ناقابلِ تسخیر ہے سلطان کی فوجیں نشیب میں رینگتی رہیں گی اور ہم اراولی کی بلند چوٹیوں سے اسی طرح اپنے دشمن کی سرگردانی کا نظارہ کرتے رہیں گے۔"

رانی پدمنی نے قلعۂ چتوڑ کی مضبوط اور محفوظ ساخت کا ذکر کیا تو رتن سنگھ کے بجھے ہوئے چہرے پر امیدوں کے چراغ روشن ہو گئے۔ "پھر کیا ہوگا مہارانی ؟" رتن سنگھ کی وحشت دوبارہ لوٹ آئی تھی۔

"سلطان پستیوں میں رینگتا رہے گا۔ چٹانوں سے اپنا سر ٹکرائے گا اور پھر لہولہان ہو کر دہلی واپس لوٹ جائے گا۔" شدتِ غضب سے رانی پدمنی کے سینے میں ایک تلاطم سا برپا تھا اور اس کی سانسوں کے زیر و بم سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر علاءالدین خلجی اس کی گرفت میں آ جاتا تو ایک راجپوت عورت کے ہاتھوں سفاکی اور بربریت کی ایک نئی تاریخ رقم کی جاتی جس کے آگے شاید ہندو دیوی دیوتاؤں کی خون آشامی کے افسانے بھی دھندلے ہو جاتے۔ "سمراٹ! وہ ایک یادگار وقت ہوگا جب ہم اس کی ذلت آمیز واپسی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔" پدمنی کے سرخ و گداز ہونٹوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

☆........☆........☆

ہری سنگھ شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اسے راجہ رتن سنگھ کی حسن پرستی نے بڑی اذیت پہنچائی

تھی۔ وہ رتن سنگھ کو ایک ہوشمند آزاد حکمراں سمجھتا تھا مگر جب رانی پدمنی نے اس کے سامنے اپنے شوہر کو جھڑک دیا تو پھر ہری سنگھ کی مایوسی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ چتوڑ کی حفاظت کیلئے جان دینے کا جذبہ سرد پڑنے لگا اور پھر ہری سنگھ چتوڑ کے سابق سپہ سالار بچھمن سنگھ کے پاس پہنچا۔ بچھمن سنگھ نے اپنے دورِ جوانی میں ناقابل فراموش فوجی خدمات انجام دی تھیں مگر اب وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ بچھمن سنگھ کے سات بیٹے تھے اور وہ سب کے سب چتوڑ کی فوج میں شامل ہو کر اپنے وطن کا دفاع کر رہے تھے۔

بچھمن سنگھ نے ہری سنگھ کو آتے دیکھا تو چونک اٹھا پھر جب چتوڑ کے سپہ سالار نے اپنی الجھن کا ذکر کیا تو بوڑھے ٹھاکر کی پیشانی سوچ کی لکیروں سے بھر گئی۔

"ٹھاکر! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سمراٹ ایک شعبدہ باز سادھو اور ایک خوبصورت عورت کے ہاتھوں کا کھلونا بن جائیں گے۔" ہری سنگھ نے رام دیو اور رانی پدمنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قلعے سے نکل جاؤں اور آگے بڑھ کر سلطان کے لشکر کا مقابلہ کروں۔ کیا یہ خودکشی نہیں ہوگی؟" ہری سنگھ نے ایک تجربہ کار اور جہاندیدہ فوجی سے اپنے دل کا درد بیان کیا۔

بچھمن سنگھ کے جسم میں بھی وہی آگ بھری ہوئی تھی جس کی حرارت نے راجپوت قوم کو ایک منفرد اعزاز بخشا تھا۔ سلطان کے حملے کی خبر سن کر بچھمن سنگھ کے خون میں بھی جھاگ سے اٹھے لیکن فوراً ہی بیٹھ گئے۔ جذبوں کی آگ بجھ چکی تھی۔ بوڑھے راجپوت نے راکھ کو بہت کریدا مگر اب ایک بھی چنگاری ایسی نہیں تھی جو فضاؤں میں رقص کر سکے بچھمن سنگھ کانپ کر رہ گیا۔

"ہری سنگھ! کیسے برے وقت میں کتنی نازک خبر لائے ہو؟" خون کے ابال کو برداشت کرتے کرتے بچھمن سنگھ کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئیں......... "ایک جوان شیر نے بوڑھے شیر کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے۔ ٹیڑھی ہڈیاں اور لٹکتی ہوئی کھال کس کام کی اب تو غراہٹ بھی باقی نہیں جو آنے والے کو اپنی موجودگی کا احساس دلا سکے۔"

ہری سنگھ نے حیران ہو کر بچھمن سنگھ کی طرف دیکھا۔ "ٹھاکر! تم نے سلطان کو شیر کے لقب سے یاد کیا' بھیڑ اور بکری کہہ کر کیوں نہیں پکارا؟"

"نہیں ہری سنگھ! علاءالدین واقعتہً شیر ہے۔" بچھمن سنگھ اپنی دھندلی آنکھوں سے اس شیر کے مجسمے کو گھورنے لگا جو اس کی نشست گاہ کے ایک گوشے میں رکھا ہوا تھا۔ "اگر سلطان بھیڑ' بکری ہوتا تو ہندوستان پر حکومت نہیں کر سکتا تھا۔" بچھمن سنگھ نے ترکی النسل حکمراں کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

"تو پھر کیا ہمیں جنگل خالی کرنا ہوگا ٹھاکر؟" ہری سنگھ نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہری سنگھ۔" بوڑھے سپہ سالار کے لہجے میں سخت تشویش تھی.........۔ "یہ تو جنگل کا قانون ہے کہ تھکے ہوئے شیروں کو تازہ دم شیروں کیلئے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔ جو بے عقل اس قانون کا احترام نہیں کرتے انہیں ایک دن لومڑیاں اور گیدڑ ستاتے ہیں۔"

بچھمن سنگھ کی باتیں سن کر ہری سنگھ کے دل پر چوٹ سی لگی۔ پھر وہ بیزاری کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "ٹھاکر! تم نے بھی مجھے مایوس کیا۔ میں تو تمہاری آنکھوں میں کوئی جنگی نقشہ دیکھنے آیا تھا مگر یہاں تو مایوسی اور تھکن کے اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

بچھمن سنگھ مسکرایا......... "ابھی یہ چراغ بجھے نہیں ہیں ہری سنگھ! غور سے دیکھو! تمہیں ان کی دھندلی اور تھرتھراتی روشنی میں راستہ نظر آ جائے گا۔ کچھ دیر بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ دہلی کے شیر کو چتوڑ کے جنگلوں کا پتا کس نے بتایا؟ کیا پوری ریاست میں کوئی دماغ ایسا نہیں تھا جو اس شیر کو اپنی کچھار میں بند رکھتا؟ اس کے منہ

کو یہاں کے لوگوں کا خون کیسے لگ گیا؟"

ہری سنگھ بیٹھ گیا اور پھر اس نے علی عامر آفریدی کی آمد سے لے کر مہامنتری وکرم سنگھ کی موت تک سارے واقعات تفصیل سے سنا دیئے۔ بچھمن سنگھ حیرت و حسرت سے اس کا منہ دیکھتا رہا......... "میں خود تو کہیں جانے کے قابل نہیں رہا۔ صرف بیٹوں سے چتوڑ کے حالات پوچھتا رہتا ہوں۔ افسوس! میرے بچوں نے غلط بیانی سے کام لیا وہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ وکرم سنگھ کس درجے کا سیاستداں تھا؟ مرنے والے نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا یہ اور بات ہے مگر اس نے اپنی ماتر بھومی (مادرِ وطن) کو بچانے کیلئے جو چال سوچی تھی وہ درست تھی۔ سلطان کو دہلی تک محدود رکھا جا سکتا تھا اور یہ کام وکرم سنگھ ہی کر سکتا تھا۔ اب خلجی کو کسی صورت میں واپسی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔" بچھمن سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ وہ بڑے کربناک لہجے میں بول رہا تھا۔ "ہری سنگھ! بہت دیر ہو گئی۔ مجھے غلط نہ سمجھنا! چتوڑ پر وقت پڑا تو اپنے ساتوں بیٹے ہنستے ہنستے قربان کر دوں گا۔ میری بوڑھی آنکھیں زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکتیں مگر پھر بھی اتنا یاد رکھنا کہ کھلے میدان میں سلطان کی فوجوں سے مقابلہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے بہت سے کیڑے کسی بھوکے اژدھے کے منہ میں چلے جائیں۔ اگر ممکن ہو تو قلعہ بند ہو کر بیٹھ جانا۔ شاید محاصرے کی طوالت سے اکتا کر سلطان واپس لوٹ جائے۔ بس اس کے سوا ان بجھتی ہوئی آنکھوں میں کوئی نقشۂ جنگ نہیں۔ جاؤ جلدی کرو۔ وقت بہت آگے نکل گیا۔" بچھمن سنگھ کی آواز کانپنے لگی۔

☆.........☆.........☆

سورج کے ڈھلتے ڈھلتے قلعہ کے سامنے والا میدان چتوڑ کے باشندوں سے بھر گیا تھا اور جب راجہ رتن سنگھ نے اپنی رعایا کو سلطان علاءالدین خلجی کے حملے کی خبر دی تو انسانی ہجوم پر موت کا سا سناٹا طاری ہو گیا۔ نقیبوں نے چیخ چیخ کر راجپوتوں کی بہادری کے گیت گائے اور دشمن کا نام و نشان تک مٹا دینے کی قسمیں کھائیں۔ سادہ دل لوگوں کو دیوی دیوتاؤں کی آسمانی مدد کا یقین دلایا گیا۔ تب کہیں جا کر ڈوبتے ہوئے دل ٹھہرے اور منتشر ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو سکے۔ پھر اس عہد کے ساتھ تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے کہ وہ اناج اور ضرورت کی دوسری چیزوں سے قلعے کو بھر دیں گے۔

رات آئی تو ایک شخص کے سوا سارا چتوڑ جاگ رہا تھا اور وہ بے خبر سونے والا شخص رام دیو کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ راجستھان کے ساحرِ اعظم نے سرِ شام ہی اپنے پیانے میں آگ روشن کر دی تھی۔ آشرم میں دیوداسیاں رقص کر رہی تھیں اور رام دیو ہر فکر سے بے نیاز ہو کر پی رہا تھا۔

"کالکا" کا مندر ویران تھا اور آچاریہ شنکر داس کی لاش درگا کے مجسمے کے نیچے پڑی سڑ رہی تھی۔ کوئی پجاری اس خوف سے آچاریہ کے مردہ جسم کو باہر نکالنے نہیں گیا کہ اس پر دیوی کا قہر نازل ہوا تھا۔

☆.........☆.........☆

سلطان علاءالدین خلجی دریائے گمبھیری کے کنارے خیمہ زن ہوا تھا۔ سرحد کے نگراں دستوں میں چند سپاہی شامل تھے۔ دراصل راجپوت حکمرانوں کے نزدیک چتوڑ کی حقیقی طاقت اس کا مضبوط ترین قلعہ تھا جسے آج تک کوئی مسلمان فاتح تسخیر نہیں کر سکا تھا۔ اس لئے رتن سنگھ نے بہت کم فوج سرحدوں پر تعینات کی تھی۔ اس فوج کی موجودگی کا مقصد صرف جنگلی لٹیروں اور قزاقوں سے نجات حاصل کرنا تھا۔ قلیل تعداد میں پہرہ دینے والے سپاہی اس قابل نہ تھے کہ علاءالدین خلجی کے لشکرِ جرار کو آگے بڑھنے سے روک دیتے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ سلطان کے لشکر کے نمودار ہوتے ہی راجپوت سپاہیوں میں ہلچل سی مچ

گئی۔ چند فوجیوں نے مشتعل ہو کر اپنی تلواریں بے نیام کر لیں مگر کچھ دیر بعد ہی ان کے بازو شل ہو گئے اور وہ زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے۔ سلطان کے حکم پر انہیں مسلمانوں کے خیمے میں رکھ کر تیمارداری کی گئی۔ سپہ سالار خواجہ حاجی نے اپنے حکمراں سے اس نرم دلی کے مظاہرے کا سبب پوچھا تو سلطان نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ہم اس پر بھی قدرت رکھتے تھے کہ ان شکست خوردہ سپاہیوں کے سر جسم سے علیحدہ کر کے دریائے گمبھیری میں بہا دیتے یا پھر راجہ رتن سنگھ کے دربار میں یہ خوں رنگ تحفہ بھیج دیتے مگر ہم لٹیرے نہیں' شہنشاہ ہیں۔ اور ایک شہنشاہ کو ہر قدم پر آدابِ شاہی کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ کل صبح ہم والئی چتوڑ کو بتائیں گے کہ اس کی سرحدیں کتنی کمزور ہیں۔"

☆..................☆..................☆

اسی رات منتری بھون کے طلسم کدے میں چندر سنگھ اپنی آقازادی کے سامنے عرض کر رہا تھا۔ "راج کماری! اب یہ ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں نہیں جانتا کہ پربھو (مالک) کس حال میں ہیں؟ ایک غلام کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہے کہ میں ان کی خبر گیری کروں۔" چندر سنگھ نے پرسوز لہجے میں کہا۔

نرملا کماری نے اپنے وفادار خادم کو ستائشی نظروں سے دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر سختی کے آثار ابھر آئے۔ "خبر مل بھی گئی تو کیا کرو گے چندر سنگھ؟ پتاجی ایک سنگدل حکمران کی قید میں ہیں۔ کیا تم انہیں تنہا چھڑا لو گے؟"

"اگر مہامنتری کو قید سے آزاد نہ کرا سکا تو کم سے کم صورتحال کا تو پتا چل جائے گا۔" چندر سنگھ نے جذباتی ہو کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "ہم اپنے آپ سے تو شرمندہ نہیں رہیں گے کہ غلام ایک گوشے میں سر چھپائے پڑے رہے اور ان کے آقا پر ستم کے پہاڑ ٹوٹتے رہے۔"

"ہمارے کاندھے بہت کمزور ہیں چندر سنگھ! تم مصیبتوں کے پہاڑ کا ذکر کرتے ہو جبکہ ہم اپنی طرف آنے والے چند اینٹوں اور پتھروں کا بھی جواب نہیں دے سکتے۔" نرملا کماری بڑے صبر و تحمل سے بات کو ٹالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

چندر سنگھ کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گیا۔ پھر سوچتے ہوئے بولا۔ "مہامنتری نے رخصت ہوتے وقت یہی حکم دیا تھا کہ اگر سلطان کی فوجوں کو شکست ہو جائے تو ہم سرنگ کے راستے چتوڑ کی حدود سے نکل جائیں اور اگر اسلامی لشکر غالب آ جائے تو ہم سلطان کے سامنے پیش ہو جائیں۔"

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو چندر سنگھ؟" نرملا کماری نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"اگر ہم اسی طرح اس طلسم کدے میں بند رہے تو پھر ہمیں سلطان کے حملے اور جنگ کے نتائج کی خبریں کس طرح ملیں گی؟" چندر سنگھ نے ایک انتہائی معقول دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔

"پتاجی کا یہ حکم بھی تھا کہ خواہ صورتحال کتنی ہی خوفناک ہو جائے مگر ہم طلسم کدے کی حدود سے باہر نہیں نکلیں گے۔" نرملا نے مہامنتری وکرم سنگھ کے دوسرے حکم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

"یہ حکم صرف آپ کیلئے اور سردار آفریدی کیلئے مخصوص تھا۔" چندر سنگھ نے کہا۔ "میں بھی اس حکم کے دائرے میں آتا ہوں مگر میری زندگی اتنی زیادہ قیمتی نہیں ہے اور اگر میں خطرات مول لے رہا ہوں تو بھی ایک اہم مقصد کی خاطر۔ راج کماری! مجھے باہر نکلنا ہی ہو گا؟"

چندر سنگھ مسلسل ضد کر رہا تھا اور نرملا اس کی ضدوں کو سختی سے جھٹلا رہی تھی۔ بالآخر ایک طویل بحث کے

بعد چندر سنگھ نے اپنے موقف کو درست ثابت کر دیا۔ نرملا اور آفریدی کو چندر سنگھ کی بات ماننی ہی پڑی مگر اب سوال یہ تھا کہ پہچان لئے جانے کی صورت میں چندر سنگھ کا کیا حشر ہو گا؟

"نہیں سردار! اس حالت میں مجھے کوئی نہیں پہچانے گا۔" چندر سنگھ پہلے ہی ہر سوال کا جواب سوچ چکا تھا۔ "وحشیوں کی طرح داڑھی اور سر کے بڑھے ہوئے بالوں نے مجھے نیا بہروپ دیدیا ہے۔ بس چہرے پر ذرا سی راکھ ملنے اور گلے میں پتھروں کی مالا پہننے کی دیر ہے۔ پھر میں مکمل جوگی ہو جاؤں گا۔"

نرملا کماری چندر سنگھ کی اس ترکیب پر زیر لب مسکرائی مگر فوراً ہی سنجیدہ ہو گئی۔

"راج کماری! میں اپنی جاسوسی کے سفر کا آغاز چتوڑ کے مندروں سے کروں گا۔ یہیں ایک گوشے میں بیٹھ کو مجھے ساری خبریں مل جائیں گی اور پھر میں آدھی رات کے بعد کچھ دیر کیلئے واپس لوٹ آیا کروں گا۔" چندر سنگھ نے اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

نرملا نے آفریدی کی طرف دیکھا جیسے وہ چندر سنگھ کے سلسلے میں اس کی اجازت طلب کر رہی ہو۔ آفریدی' چندر سنگھ کی باتوں سے مطمئن ہوتے ہوئے بھی الجھا الجھا نظر آ رہا تھا۔ "چندر سنگھ اور رامیشوری! تم دونوں کچھ دیر کیلئے باہر چلے جاؤ میں تنہائی میں راج کماری سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔" اگرچہ آفریدی کو یہ بات کہتے وقت ایک عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا تھا لیکن وہ مصلحت اور دانشمندی کے تقاضوں سے مجبور تھا۔

خادمہ رامیشوری تیزی سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ چندر سنگھ نے اٹھنے میں کسی قدر تکلف سے کام لیا اور بہت تھکے تھکے قدموں سے باہر کی طرف جانے لگا۔ اس کا پرجوش چہرہ اب بجھا بجھا سا نظر آ رہا تھا۔ رامیشوری اور چندر سنگھ کے جاتے ہی آفریدی' نرملا سے مخاطب ہوا۔

"چندر سنگھ اسی طرح باہر جا سکتا ہے کہ وہ طلسم کدے کے کھلنے اور بند ہونے کے راز سے واقف ہو جائے۔ کہیں یہ صورتحال پریشان کن تو ثابت نہیں ہو گی؟"

آفریدی کا سوال سن کر نرملا بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگی۔ وہ بڑی بے چینی کے عالم میں بار بار اپنی اوڑھنی کے آنچل کو انگلیوں کے گرد لپیٹ رہی تھی۔ کبھی گھبرا کر آفریدی کی طرف دیکھتی اور کبھی نظریں چرا لیتی۔ ذہنی انتشار حد سے زیادہ بڑھا تو اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "سردار! میں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا۔" آخر بڑی کشمکش کے بعد نرملا کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

"میں چندر سنگھ کی وفاداریوں پر شک نہیں کر رہا ہوں مگر زمانے نے جو سبق مجھے سکھائے ہیں' ان کا تقاضا ہے کہ میں اپنی ذات پر بھی شبہ کروں۔" آفریدی بھی جوش اضطراب میں اپنے بستر سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔ اس کے زخم بھر گئے تھے لیکن ابھی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ کئی بار اس نے سنبھلنے کیلئے قریب رکھی ہوئی کرسیوں کا سہارا لیا۔

"آپ بیٹھ جائیں سردار! خدا کیلئے بیٹھ جائیں۔" نرملا نے بے اختیار ہو کر کہا اور آفریدی نزدیک پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نرملا کے اندازِ گفتگو نے اسے ایک بار پھر کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اپنائیت کا یہ اظہار بے سبب نہیں تھا۔ آفریدی خیالوں کی دنیا میں کھو گیا اور پھر یہ محویت اس وقت ختم ہوئی جب نرملا نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"زمانہ لاکھ غیر معتبر سہی لیکن پھر بھی اعتبار انسان کی ضرورت ہے۔ چندر سنگھ کے باپ دادا نے بھی ہمارے یقین کو بے آبرو نہیں کیا۔ اور خود یہ راجپوت زادہ بھی اب تک ہر آزمائش میں پورا اترا ہے اگر اس نے بھی کسی لالچ یا دباؤ سے مجبور ہو کر منافقت کا مذہب اختیار کر لیا تو ہمارے ذہنوں کو بھی دیمک نہیں

چاٹ گئی ہے۔ ہم اسے باغ کے راستے باہر جانے کا طریقہ سمجھا دیں گے۔" نرملا کماری نے بھی اس دوران ایک نئی ترکیب سوچ لی تھی۔ "ہم لوگ اس کے جانے کے بعد طلسم کدے میں بند رہیں گے اور جب چندر سنگھ اسی راستے سے واپس آئے گا تو پہلے دروازے پر پہنچ کر ہمیں سات بار پکارے گا پھر یقین کر لینے کے بعد کہ کسی خطرے کا امکان نہیں ہے دروازہ کھول دیا جائے گا۔"

اگرچہ یہ طریقہ بھی زیادہ محفوظ نہیں تھا لیکن آفریدی کو چندر سنگھ پر اعتبار کرنا ہی پڑا۔ جب رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تو چندر سنگھ اس حال میں رخصت ہوا کہ وہ کوئی بھکاری نظر آ رہا تھا۔ جاتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"راج کماری! اگر چندر سنگھ واپس نہ لوٹے تو سمجھ لیجئے گا کہ اس پر کوئی قیامت نازل ہو گئی ہو گی اور کسی نے اس بہروپ میں بھی مجھے پہچان لیا تو مطمئن رہئے گا کہ میری زبان خریدی نہیں جا سکتی۔" یہ کہہ کر چندر سنگھ نے اپنی قدیم رسم کے مطابق نرملا کماری کے پاؤں چھونے کی کوشش کی مگر آفریدی نے اسے ٹوک دیا۔

"اب تم مسلمان ہو چندر سنگھ اور مسلمان کسی کے آگے اس طرح نہیں جھکتا۔"

"معافی چاہتا ہوں سردار!" چندر سنگھ ایک احساس ندامت کے ساتھ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ "صدیوں تک بتوں کی پوجا کی ہے کبھی کبھی کوئی ٹوٹا ہوا صنم کسی گوشۂ دل سے ابھر ہی آتا ہے۔"

آفریدی نے آگے بڑھ کر چندر سنگھ کو گلے لگا لیا اور پھر اس کی کشادہ پیشانی کو بوسہ دیا۔ "میرا کوئی بھائی نہیں چندر سنگھ مگر آج میں تمہیں ایک حقیقی بھائی کی حیثیت سے رخصت کر رہا ہوں۔ کاش! تم بہت جلد ہمیں یہ خبر سنا سکو کہ مہامنتری ظالموں کے تشدد سے محفوظ ہیں۔ اسیر زنداں سہی مگر ہمیں پتا چل جائے کہ ابھی وہ روشن چراغ بجھا نہیں ہے لو تھرتھراتی رہے ہواؤں سے لرزتی رہے لیکن روشنی کی ایک لکیر باقی رہے کہ وہ لکیر ہماری زندگی ہے اور اسی لکیر سے روشنی کا ایک مینار تعمیر ہوتا ہے۔" یہ کہتے کہتے آفریدی کی آنکھیں چھلک اٹھی تھیں۔ نرملا کے دل پر چھائی ہوئی گھٹا بھی برسنے کیلئے بے قرار تھی مگر اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

صبح سورج طلوع ہوا تو چتوڑ پر زوال کے سائے پڑنا شروع ہو گئے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے زخمی راجپوت سپاہیوں کو اپنے خیمے میں طلب کیا۔ سپاہیوں کی تعداد سو کے قریب تھی۔ جب انہیں سلطان کے سامنے لایا گیا تو دشمن سپاہیوں کی گردنیں اٹھی ہوئی تھیں اور چہرے پر کھنچاؤ کی سی کیفیت طاری تھی۔ علاء الدین نے تحقیر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ ان کی طرف دیکھا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ ہم نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا ہے؟" علاء الدین پُرجلال لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ "ہم تمہارے جسموں کو کئی حصوں میں تقسیم بھی کر سکتے تھے اور تمہیں ناقابل بیان اذیتیں بھی پہنچائی جا سکتی تھیں مگر ہم نے اس سے گریز کیا۔ آخر کیوں؟"

"ہم کچھ نہیں جانتے۔" کئی سپاہیوں نے بیک زبان کہا۔ "جس کا جو جی چاہے کرے۔" راجپوت سپاہیوں کا انداز بہت بےباکانہ تھا۔

علاء الدین نے اس سرکش قوم کے کچھ نمائندوں کو بہت غور سے دیکھا۔ "تمہیں رتن سنگھ کی غلامی قبول ہے یا تم ہمارے سایۂ کرم میں زندہ رہنا چاہتے ہو۔" سلطان نے قیدی سپاہیوں سے بڑا عجیب سا سوال کیا تھا۔

"ہم کسی کے غلام نہیں ہیں اور کسی کے رحم و کرم کی بھیک پر زندہ رہنا بھی نہیں چاہتے۔" اب کی بار

تمام راجپوت ایک ساتھ بول اٹھے تھے۔

"اسے آگے کھینچ کر لاؤ۔" سلطان نے ایک راجپوت سپاہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو قیدیوں کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔

سلطان کے جاں نثار آگے بڑھے اور راجہ رتن سنگھ کے سپاہی کو قطار سے الگ کر کے اپنے حکمراں کے قریب لے آئے۔ راجپوت سپاہی کے دونوں ہاتھ زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔ جب وہ اپنے ساتھیوں کی صف سے الگ ہوا تو سلطان کا خیال تھا کہ راجپوت سپاہی خوفزدہ ہو جائے گا مگر علاء الدین کو اس کے چہرے پر دہشت کا ہلکا سا عکس بھی نظر نہیں آیا۔ ایک لمحے کیلئے سلطان کے شوقِ خود نمائی کو ٹھیس سی لگی کہ اس کی بے پناہ طاقت کے سامنے ایک معمولی سپاہی نے سر نہیں جھکایا تھا۔

"زمین پر رہنے والے ہر جاندار کو کسی نہ کسی کی غلامی قبول کرنی ہی پڑتی ہے۔ وہ نسلِ حیوانات کی کوئی شاخ ہو یا بنی نوع آدم کا کوئی قبیلہ۔" یہ کہہ کر علاء الدین نے اپنے سپاہیوں کو دوسرا حکم دیا۔ "اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دو۔"

حکم شاہی کا یہی مفہوم ہوتا ہے کہ الفاظ کی گونج ختم ہونے بھی نہیں پاتی اور عمل شروع ہو جاتا ہے شمشیر خلجی جو پہلے ہی بے نیام تھی' برق کی طرح فضا میں لہرائی اور اپنی بے مثال کاٹ کا ثبوت اس طرح دیا کہ راجپوت سپاہی کی گردن علیحدہ تھی اور جسم زمین پر تڑپ رہا تھا۔

شاہی خیمے میں سناٹا طاری تھا اس سکوت کو خود علاء الدین خلجی نے توڑا۔ "جن لوگوں کو زندگی کی غلامی پسند نہیں ہوتی انہیں موت کی غلامی گوارا کرنی پڑتی ہے۔ اب بتاؤ کہ تمہیں دونوں میں سے کونسا انداز غلامی پسند ہے؟" علاء الدین خلجی انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں راجپوت سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔

"ہمیں وہی غلامی پسند ہے جسے ہمارے ساتھی نے ہنستے ہنستے قبول کیا۔" راجپوت سپاہیوں کا لہجہ شرر آمیز تھا اور گردنیں احساس غرور سے ٹیڑھی ہو گئی تھیں۔

علاء الدین مسکرایا۔ "نہیں! ہم تمہیں یہ غلامی نہیں بخشیں گے۔" اتنا کہہ کر سلطان نے اپنے سپاہیوں کو ایک اور حکم دیا۔ "ان کی پیشانیوں پر ہمارے جاہ و جلال کے نقوش اس طرح روشن کر دو کہ اگر یہ اپنے ماتھے بھی گھس ڈالیں تو ہماری نشانیاں دھندلی نہ ہو سکیں۔"

پھر سلطان کے خیمے میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ علاء الدین جب کسی سے خوش ہوتا تو اس پر اس طرح نوازشوں کی بارش کر دیتا کہ انعام پانے والا ان مہربانیوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور اس کے برعکس کسی سے ناراض ہوتا تو عجیب عجیب سزائیں دیتا۔ راجپوت سپاہیوں سے بھی وہ خفا ہو گیا تھا اور اپنی خفگی کا اظہار کرنے کیلئے سلطان نے قیدیوں کی پیشانیوں کو روشن کر دینے کا حکم دیا تھا۔

سلطان کے حکم کے مطابق اسی وقت خیمے میں آگ جلائی گئی اور پھر بھڑکتے ہوئے شعلوں میں سونے کے سکوں کو یہاں تک تپایا گیا کہ ان کا سنہری رنگ سرخی مائل ہو گیا۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے تمام راجپوت سپاہیوں کے ماتھوں پر وہ جلتی ہوئی اشرفیاں رکھ دی گئیں۔ تکلیف کی شدت سے کچھ راجپوت چیخنے لگے اور کچھ سپاہی سوزش کو اس طرح برداشت کر گئے کہ ان کے پسینے میں نہائے ہوئے جسم خاک پر تڑپ رہے تھے مگر ہونٹوں پر کوئی فریاد یا کوئی چیخ نہیں تھی۔

"ان کے ہاتھ کھول دو۔" سلطان نے دوسرا حکم دیا۔

جب راجپوت سپاہیوں کے ہاتھوں کی زنجیریں کھول گئیں تو ان کی کشادہ پیشانیوں کے بیچ میں ایک سیاہ نشان نظر آ رہا تھا اور اس دائرے کے درمیان کچھ حرف ابھر آئے تھے۔ یہ حروف اس نام کو ظاہر کرتے تھے

جو سونے کے سکوں پر کندہ کیا گیا تھا اور یہ نام سلطان علاءالدین خلجی کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں تھا۔

"اب جاؤ کہ ہم نے تمہیں اپنی غلامی کی سند بخش دی۔ ایسی سند جو سوتے جاگتے' محفل میں' تنہائی میں' جنگ کے میدان میں اور مندروں میں اس طرح روشن رہے گی کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی پکار اٹھیں گے۔"

"وہ آ رہے ہیں فاتح عالم سلطان علاءالدین خلجی کے غلام۔"

شدتِ کرب سے راجپوت سپاہیوں کے چہرے سیاہ ہو گئے اور آنکھوں میں نفرتوں کے انگارے دہکنے لگے۔

"سلطان! تو نے یہ اچھا نہیں کیا۔" کئی سپاہی ایک دم بول پڑے۔ "ملیچھ (ناپاک) ملیچھ ہی رہتا ہے' چاہے بادشاہ کیوں نہ ہو جائے۔ آج تو نے ثابت کر دیا کہ تیرا تعلق کسی پست قبیلے سے ہے۔" راجپوت سپاہی اسیر ہوتے ہوئے گستاخی کی انتہا کو چھونے لگے تھے۔

ابھی راجہ رتن سنگھ کے فوجیوں کے الفاظ کی صدائے بازگشت باقی تھی کہ سلطان کے خیمے میں موجود تمام سپاہیوں اور سپہ سالاروں کی تلواریں بے نیام ہو گئیں۔ حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی آگے بڑھے اور علاءالدین خلجی کی طرف دیکھنے لگے۔ دونوں سپہ سالاروں کی نظروں کا ایک ہی مفہوم تھا کہ اگر سلطان کے ہونٹوں کو جنبش ہو تو بد کلام سپاہیوں کی گردنیں تن سے جدا کر دی جائیں۔

"نہیں عراقی.......... ہرگز نہیں۔" سلطان مسکراتے ہوئے بولا۔ "شکست خوردہ لوگوں کے پاس گالیاں دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ ایک فاتح قوم کو دشمن کے غلیظ کلمات سے لطف اندوز ہونا چاہئے کہ یہ حقیر الفاظ خود ان کی پستی اور بے کسی کی دلیل ہوتے ہیں۔ بے شک! تمہاری شمشیر کا ایک ہی وار انہیں ہمیشہ کیلئے خاموش کر دے گا مگر ان کی موت کے بعد ہماری لذت و آسودگی کے مناظر بھی ختم ہو جائیں گے۔ اور ہم نہیں چاہتے کہ یہ نشاط آور تماشا اتنی جلد اپنے انجام کو پہنچ جائے.......... خواجہ! اپنی شمشیر کے جوہر کی قدر کرو۔ اس کی کاٹ کو کہیں اور آزمایا جائے گا۔" اپنے سپہ سالاروں کے مشتعل جذبات کو سرد کرنے کے بعد علاءالدین خلجی قیدی سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔

"میرے نسب نامے کی تفصیل اور قبیلے کی پہچان تمہارے ماتھوں پر لکھ دی گئی ہے۔ یہ وہ تحریر ہے جسے اب فرشتۂ اجل کے خونی ہاتھ ہی مٹا سکتے ہیں۔ جاؤ! ہم نے تمہیں ایک لعنت زدہ زندگی بخش دی۔ اپنے حکمراں کو ہماری یہ روشن نشانی دکھا دو اور اس سے کہہ دو کہ ہم نے اپنی یہ مہر چند انسانوں کے جلے ہوئے گوشت اور جھلسی ہوئی کھال پر نہیں۔ چتوڑ کی پیشانی پر ثبت کی ہے۔" یہ کہہ کر علاءالدین خلجی نے منہ پھیر لیا اور اس کے جاں نثار فوجی راجپوت سپاہیوں کو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہانکتے ہوئے خیمے سے باہر لے گئے۔

☆..........☆..........☆

جب وہ سپاہی اپنی جلی ہوئی پیشانیاں لے کر راجہ رتن سنگھ کے سامنے حاضر ہوئے تو چتوڑ کا حکمراں بادلوں کی طرح گرجنے لگا۔ "میرے پاس آنے سے تو بہتر تھا کہ تم دریائے گمبھیری کے پانی میں غرق ہو جاتے۔ پھر مردہ خور مچھلیاں اور بھوکے مگرمچھ تمہارا گوشت کھا جاتے۔ میری آنکھیں اپنی ہی قوم کی رسوائی کا یہ منظر تو نہ دیکھتیں اور چوہانوں کا قبیلہ اپنے ہی فرزندوں کے اس شرمناک فعل پر نادم و شرمسار نہ ہوتا۔ زندگی کی ہوس نے تمہارے دلوں سے غیرت کا ایک ایک جذبہ چھین لیا ہے اور گرم خون کی ایک ایک بوند نچوڑ لی ہے۔ تم اچھوتوں سے بھی بدتر حال میں جینا چاہتے ہو۔" رتن سنگھ کے لہجے سے نفرت و حقارت کی آگ برس رہی تھی۔

"سمراٹ! ہمیں ایسی غلیظ گالیاں نہ دیں کہ ہم بھی آپ کے قبیلے سے جدا نہیں ہیں۔" تمام سپاہی بیک وقت چیخ اٹھے۔ "سلطان کے خیمے سے نکل کر ہمیں بھی غرقِ دریا ہونے کا خیال آیا تھا مگر اس طرح تو ذلت و رسوائی کا ایک اور افسانہ ہمارے ناموں کے ساتھ منسوب ہو جاتا۔ کہنے والے کہتے کہ ہم نامردوں کی طرح پانی میں ڈوب مرے۔ تاریخ چتوڑ ہم سے مطالبہ کرتی کہ ہمارے جسم راجپوت سورماؤں کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر روایتوں کی آگ میں کیوں نہیں جلے؟ ہم نے اپنی دھرتی اور اتہاس (تاریخ) کی اسی آواز کو سنا اور اپنے ماتھوں پر ناکامیوں کے داغ سجا کر چلے آئے۔ ہم اس وقت تک زندہ رہنا چاہتے ہیں جب تک سلطان کی پیشانی پر آپ کی غلامی کی مہر روشن نہ کر دیں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر دشمن کے اتنے ہی سپاہیوں کے ماتھے آپ کے سامنے جھکا دیں۔ پھر جب یہ حساب برابر ہو جائے گا تو ہم بہت دور چلے جائیں گے۔ اتنی دور کہ کوئی بھی آنکھ ہماری رسوائیوں کے ان داغوں کو نہ دیکھ سکے گی۔" زخم خوردہ سپاہیوں کے سینے میں اذیت و کرب کی وہ سوزش تھی کہ ان کے دل پگھلنے لگے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"یہ خوشامد ہے' فرار ہے' عیاری ہے اور جھوٹ ہے۔" راجہ رتن سنگھ نے اپنے مجبور سپاہیوں کی زبان سمجھنے سے انکار کر دیا تھا۔ "بزدل شکست خوردہ لوگ ایسے ہی بہانے تراشتے ہیں۔ ہری سنگھ! ان سب کو اسی وقت قتل کر ڈالو۔ میدان میں پیٹھ دکھانے والوں کی یہی سزا ہوتی ہے۔" رتن سنگھ نے سپہ سالار ہری سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنا بے رحمانہ فیصلہ سنا ڈالا۔ ایسا فیصلہ جو ذہن کے انتشار اور جذبوں کے اشتعال سے مجبور ہو کر کیا گیا تھا۔

ہری سنگھ شدید حیرت کے عالم میں اپنے حکمراں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ہاں! ہری سنگھ! ان کا قتل لازم ہے۔" راجہ رتن سنگھ نے اپنے سپہ سالار کے حیرت و سکوت کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "آزاد لوگوں کی صفوں میں غلاموں کے اس سزا یافتہ گروہ کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی فروخت شدہ پیشانیاں دیکھ کر ہمارے بہادر سپاہیوں میں مایوسی اور بددلی پھیلے گی۔ ہم نہیں چاہتے کہ شکست و ہزیمت کی یہ وبائی بیماری ہمارے بے داغ لشکروں کو متاثر کرے۔"

ہری سنگھ جیسے شجاع اور ہوشمند سپہ سالار کیلئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور انتہائی بے باکی کے ساتھ کہنے لگا۔ "سمراٹ! آپ کو اپنے جاں نثاروں کے جذبات کا احترام کرنا چاہئے۔ اگر یہ آپ سے مخلص نہیں ہوتے تو سلطان سے معافی مانگ کر زندگی کے محفوظ سائبان میں چلے جاتے۔ ان کی راج محل میں واپسی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ موت کے سائے میں جینا چاہتے ہیں۔ میری درخواست ہے کہ انہیں اپنے لفظوں کی سچائی ثابت کرنے کیلئے ایک اور موقع دیا جائے۔ میرے نزدیک نہ یہ جھوٹے ہیں اور نہ فریب کار.......... ان پر جو قیامت ٹوٹی ہے اس کا اندازہ راج محل کے ایک گوشے میں بیٹھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک حادثے کا شکار ہوئے ہیں۔ اگر وہ حادثہ اراولی اور آبو کی چوٹیوں کو پیش آ جاتا تو شاید کئی مضبوط چٹانیں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتیں۔ میں سمراٹ سے التجا کرتا ہوں کہ انہیں معاف کر دیا جائے۔"

رانی پدمنی اپنے سپہ سالار کے اس اندازِ گفتگو کو برداشت نہ کر سکی۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ راج سنگھاسن (تختِ شاہی) پر بیٹھنے والا شخص احمقانہ فیصلے نہیں کرتا۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک حرف اراولی اور آبو کی چوٹیوں سے زیادہ سخت اور اٹل ہوتا ہے۔"

"مہارانی! میں راج سنگھاسن کی طاقت کو بھی تسلیم کرتا ہوں اور سمراٹ کی عظمتوں کو بھی.......... مگر

ایک سپہ سالار کی حیثیت سے میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ راج دربار کے زاویۂ نظر سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ " ہری سنگھ نے باوقار لہجے میں اس مغرور عورت کو جواب دیا جس نے چتوڑ کی سیاست کو مٹی کا ایک بے جان کھلونا بنا کر رکھ دیا تھا۔

"پھر تمہیں بھی اپنی بینائی کی اصلاح کرنی ہوگی اور ایک ایک زاویۂ نظر کو ہماری نگاہوں کا پابند بنانا ہوگا۔ "

بڑا سخت مرحلہ تھا لیکن ہری سنگھ اس دشوار ترین منزل سے بڑے صبروضبط کے ساتھ گزر گیا۔ وہ مخصوص رفتار سے آگے بڑھا۔ پہلے اس نے سر سے اپنی سرخ دستار اتار کر راجہ رتن سنگھ کے قدموں پر رکھ دی۔ پھر شمشیر کھولی اور اسے بھی سمراٹ کے پیروں پر رکھ کر کہنے لگا۔ "مجھے جو اعزاز بخشا گیا تھا میں اسے نہایت اذیت و کرب کے ساتھ واپس کر رہا ہوں۔ " یہ کہہ کر ہری سنگھ سیدھا ہوا۔ اس نے رانی پدمنی پر ایک اچٹتی ہوئی سی نظر ڈالی اور رتن سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔ "سمراٹ! سچ تو یہ ہے کہ آپ کی نگاہِ کرم نے مجھے ریاست میں اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا تھا ورنہ میں اس عہدہ و منصب کے قابل نہیں تھا۔ میری اس گستاخی کا یہ مفہوم نہ لیا جائے کہ آزمائش کے وقت میں نے مادرِ وطن سے منہ پھیر لیا۔ میں آج بھی وہی ہری سنگھ ہوں' چتوڑ کی سلامتی کیلئے جان قربان کر دینے والا ہری سنگھ! مگر اب میری حیثیت ایک سپاہی کی سی ہوگی جو اپنے نئے سپہ سالار کے ایک اشارے پر نذرانۂ جاں پیش کرنے کیلئے ہر وقت سربکف رہے گا۔ "

ہری سنگھ کے اس اچانک فیصلے سے راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا سیناپتی اس طرح سرکشی پر اتر آئے گا۔ "کیا تمہاری اس حرکت کو بغاوت کا مفہوم دیا جائے ؟" رانی پدمنی نے سیاسی معاملات میں ایک بار پھر مداخلت کی۔

"سمراٹ اپنے فوجی نظام سے بخوبی واقف ہیں۔ " ہری سنگھ نے اپنے عہدے سے دستبرداری کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی نظروں سے یہ راز پوشیدہ نہیں ہے کہ سلطان کے سامنے ہماری افواج قلتِ تعداد کا شکار ہیں۔ آٹھ بے مثال سپاہی جادوگرنی بھان متی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ایک سپاہی کو سمراٹ نے جھوٹا قرار دے کر تہہ تیغ کر دیا۔ حالانکہ وقت نے ثابت کر دیا کہ وہ جھوٹا نہیں تھا۔ اب سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد اس جرم پر قربان کی جا رہی ہے کہ وہ دریائے گمبھیری میں غرقِ آب کیوں نہیں ہوئے ؟ اگر اسی طرح چتوڑ کے رکھوالوں کی قربانی کا سلسلہ جاری رہا تو میدانِ جنگ میں دشمنوں سے کون نبرد آزما ہوگا جو آپ کے اقتدار اور وطن کے وقار کیلئے جان لٹا دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ کسی مقصد کے بغیر تاریک راہوں میں مارے جا رہے ہیں۔ میں اپنے سرفروشوں کی یہ بربادی نہیں دیکھ سکتا۔ بے شک! میں آپ کی بساط کا ایک مہرہ ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی امیرِ لشکر بھی۔ اور ایک فرض شناس امیر کسی معمولی سپاہی کو بھی بے مقصد موت کے غار میں نہیں دھکیل سکتا۔ ہمارے جذبے لاکھ وارفتہ سہی اور ہمارا خون کتنا ہی گرم سہی مگر دشمن سے مقابلے کے وقت دماغ کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے دل جل رہے ہیں اور دماغ بجھے جا رہے ہیں۔ سمراٹ! میں نے تمام قوموں کی تاریخ پڑھی ہے۔ جس قوم کے دماغ بجھ جائیں وہ جنگ لڑنے کے قابل نہیں رہتی۔ " یہ کہہ کر ہری سنگھ چند لمحوں تک راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر نہایت پرجوش لہجے میں بولا۔ "اب ایک سپاہی کی حیثیت سے مجھے حکم دیجئے کہ میں گمبھیری اور بڑیچ کے پانی میں کود کر جان دے دوں یا اکیلا سلطان کے لشکر میں گھس کر اس زندگی کا قرض ادا کر دوں جس کا حساب مجھ سے بار بار طلب کیا جا رہا ہے۔ " سیناپتی ہری سنگھ کا ایک ایک لفظ عہدِ وفا کی آگ

میں جل رہا تھا۔

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی اپنے سپہ سالار کی ہوشمندانہ تقریر سن کر خاموش بیٹھے رہے۔

ہری سنگھ نے اپنے حکمرانوں کے ہونٹوں پر مہرِ سکوت دیکھ کر دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔ "میں تو چاہتا ہوں کہ ایسی سنگین فضا میں ہمارے محترم برہمن اور پجاری بھی خاموش نہ رہیں انہیں چاہئے کہ وہ اپنے ہاتھوں کی مالائیں چھوڑ کر تلواریں سنبھال لیں۔ اگر مندروں کی گھنٹیاں بجانے کا عمل عبادت کا درجہ رکھتا ہے تو دشمن سے مقابلے کے وقت تلواروں کی کھنک بھی پوجا کا روپ دھار لیتی ہے۔ سرخ اور زرد رنگوں سے ماتھوں پر لگائی جانے والی چھاپ اور تلک میں انسان کا اپنا لہو شامل ہو تو وہ دیوتاؤں کے نزدیک پسندیدہ ہوتا ہے۔ " آج ہری سنگھ نے زندگی کا ایک ایسا راز بیان کر دیا تھا جس سے راجہ رتن سنگھ اور پدمنی تو کیا' چتوڑ کے بڑے بڑے اہلِ دانش بھی بے خبر تھے۔

ریاست کے حکمراں چونک اٹھے۔ "آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو ہری سنگھ ؟"

"سمراٹ! میری اور آپ کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ گستاخی معاف! میں چتوڑ کے ایک ایک فرد کو سپاہی بنا دینا چاہتا ہوں اور آپ اپنے شاہانہ جذبوں کی تسکین کیلئے تجربہ کار سپاہیوں کو بھی مقتول یا مجہول کر دینا چاہتے ہیں۔ " ہری سنگھ نے بڑی جرات کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"میری خواہش ہے کہ ہزاروں برہمن اور پجاری جو مندروں میں سونے چاندی کی مسندوں پر بیٹھے ہوئے' جھوم جھوم کے بھگوان کی لیلا کے بھجن سنا رہے ہیں' جنہیں لوگوں کے سر اپنے قدموں میں جھکانے' آشیرواد کیلئے ہاتھ بلند کرنے اور پکھراج اور نیلم کی مالائیں جپنے سے فرصت نہیں ملتی' انہیں بھی مندروں سے باہر لا کر آدابِ جنگ سکھائے جائیں۔ امن کی حالت میں مرلی کی تانیں کانوں کو بہت بھلی لگتی ہیں مگر جب دشمن ہمارے گھروں پر دستک دینے لگتا ہے تو پھر یہی مسحور کن ساز ہمیں موت کی گہری نیند سلا دیتے ہیں۔ آپ اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے ان سونے والوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیجئے کہ اب ہر فرد کے جاگنے کا وقت آ گیا ہے۔ سلطان کی فوجیں بے اندازہ ہیں۔ اور اس کی طاقت بے پناہ ہے۔ اس توازن کو برقرار رکھنے اور چتوڑ کا دفاع کرنے کیلئے ہمیں چتوڑ کے ہر باسی کے ہاتھ میں تلوار دینا ہوگی۔ یہاں تک کہ شودروں (اچھوتوں) کو بھی کچھ دن کیلئے سپاہی بنانا ہوگا۔ پھر یہ ممکن ہے کہ ہم سلطان کے لشکرِ جرار کا مقابلہ کر سکیں اور سکون و عافیت کے ساتھ اپنی زندگی کے خواب دیکھ سکیں۔"

"اگر تمہارے پیش کردہ منصوبوں پر عملدرآمد نہ ہو سکا ؟" راجہ رتن سنگھ نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے انتہائی ہوشیاری سے سوال کیا تاکہ ہری سنگھ مکمل طور پر اس کے سامنے بے نقاب ہو جائے۔

"تو پھر ہم اپنی آزادی برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ " ہری سنگھ نے تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔ "سمراٹ! آپ قوم کی حالت نہیں دیکھ رہے ہیں ؟ ہر طرف چوپڑ' شطرنج اور گنجفے کی بساطیں بچھی ہوئی ہیں۔ موت کے سائے اراولی اور آبو کی چوٹیوں سے اتر کر میدانوں میں پھیلتے جا رہے ہیں اور یہ لوگ بازیاں کھیل رہے ہیں۔ جوئے میں مال و دولت بھی ہار رہے ہیں اور اپنی بیویوں کو بھی داؤ پر لگا رہے ہیں۔ شراب' بھنگ اور مدک کا استعمال عام ہے۔ ان کی مدہوشیوں کا یہ حال ہے کہ ایک ہاتھ میں شراب کی صراحی ہے اور دوسرے ہاتھ میں کسی خوبصورت رقاصہ کا ریشمی آنچل۔ کیا یہ زندہ رہنے کی علامات ہیں ؟ نہیں سمراٹ! ایسی غیر ذمے دار اور بے خبر قوم زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ " جوشِ جذبات میں ہری سنگھ کی سانسیں بے ربط ہو گئی تھیں۔

ایک جانباز سپہ سالار نے چتوڑ کے عیش پرست حکمرانوں کو سچائی کا آئینہ دکھایا تھا' اس لئے راجہ

رتن سنگھ' رانی پدمنی' مہامنتری گنیش سنگھ اور دوسرے راجپوت سردار آئینے میں اپنی اپنی صورتیں دیکھ کر ڈر گئے پھر اسی خوف نے سیناپتی ہری سنگھ سے اس کے سارے اختیارات چھین لئے............ اور وہ سرفروش سپہ سالار راج محل کے ایک کمرے میں نظربند کر دیا گیا۔

☆..............☆..............☆

علاء الدین خلجی بڑے عجیب فیصلے کر رہا تھا۔ ملک ظفر خان' خواجہ حاجی' ملک نصرت خان اور تاج الدین عراقی جیسے جہاندیدہ سپہ سالار خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ان میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اپنے فرمانروا کو کوئی مشورہ دے سکیں۔ اپنی زندگی کے سب سے خوفناک محاذ پر ان کی حیثیت ایک تماشائی سے زیادہ نہیں تھی۔ علاء الدین کے جاں نثاروں نے یہ منظر بھی بڑی حیرت سے دیکھا کہ سلطان خود دریائے گمبھیری کے کنارے پہنچا اور صورتحال کا جائزہ لینے لگا۔ اس دوران علاء الدین کو دریا میں کچھ کشتیاں نظر آئیں جنہیں ملاح چلا رہے تھے۔ کشتیاں بائیں جانب کچھ فاصلے پر تھیں اس لئے ملاحوں کے چہرے صاف نظر نہیں آ رہے تھے۔ مگر پھر بھی اندازہ ہوتا تھا کہ کشتیوں میں ایک سے زیادہ افراد موجود ہیں۔ سلطان نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر ملاحوں کو واپس بلائیں۔ علاء الدین کا حکم سنتے ہی چند شہسوار دریا کے کنارے کنارے آگے بڑھے اور پھر ملاحوں کو تیز آواز میں پکارنے لگے۔ ملاحوں نے سمجھا کہ راجہ رتن سنگھ کے سپاہی انہیں کسی کام سے طلب کر رہے ہیں اس لئے وہ فوراً ہی کشتیوں کا رخ موڑ کر کنارے کی طرف لوٹنے لگے۔ قریب آنے کے بعد ملاحوں نے ان سپاہیوں کو دیکھا جن کے چہرے اور لباس راجپوت فوجیوں سے مختلف تھے۔ سلطان کے سپاہیوں نے کشتیوں کی طرف اشارہ کیا جن میں کچھ دیہاتی سوار تھے جو اپنے ظاہری حلیے سے غربت و افلاس کا شکار نظر آ رہے تھے۔ ملاحوں نے کچھ اشاروں میں اور کچھ شکستہ زبان میں بتایا کہ وہ نسلی طور پر ملاح ہیں اور بستی کے لوگوں کو دریا پار کرا کے اپنی روزی حاصل کرتے ہیں۔ پھر جب ان ملاحوں پر حقیقت ظاہر ہوئی کہ دریا کے کنارے کھڑے ہوئے سپاہیوں کا تعلق چتوڑ سے نہیں تو وہ دہشت و خوف سے لرزنے لگے اور ان کی کشتیاں پانی میں ڈولنے لگیں۔ سپاہی انہیں دلاسہ دے کر اس مقام تک لائے جہاں سلطان علاء الدین خلجی ان کا منتظر تھا۔ ملاحوں کے ہاتھ قابو میں تھے اور نہ پتوار............ مگر کسی نہ کسی طرح کشتیوں کو کھیتے ہوئے کنارے تک لے آئے۔
پھر جب ملاحوں اور دیہاتی باشندوں کی نظر سلطان کے سرخ و سفید چہرے پر پڑی تو ان کی کشتیاں الٹ گئیں اور پھر وہ پانی میں بھیگے ہوئے دریا سے باہر آئے۔ اور سلطان کے قدموں پر لوٹنے لگے۔

علاء الدین نے پلٹ کر ملک ظفر خان' خواجہ حاجی' ملک نصرت خان اور تاج الدین عراقی کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ جیسے وہ اپنے سپہ سالاروں سے کہہ رہا ہو کہ تم نے ہمارا اقبال دیکھا اور جاہ و جلال کا نظارہ کیا۔ چاروں سپہ سالاروں نے گردنیں خم کر لیں اور جھکی ہوئی نگاہوں سے سلطان کے قدموں کو بوسہ دیا۔

علاء الدین نے ہاتھ کے اشارے سے ملاحوں اور دیہاتیوں کو کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ چتوڑ کی نواحی بستی کے رہنے والے کھڑے تو ہو گئے مگر ان کی سیاہ اور پتلی پتلی ٹانگیں سوکھے ہوئے جسموں کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر رہی تھیں۔ وہ بار بار اٹھتے اور زمین پر گر جاتے تھے ان کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے اور آنکھوں کی پتلیاں موت کے خوف سے کانپ رہی تھیں۔

''اے چتوڑ کی ناتواں مخلوق! ہم نے تجھ پر زندگی کے دروازے کھول دیئے۔ ہمیں اپنا نجات دہندہ سمجھ اور چین کی سانس لے کہ تیرے سر پر صدیوں سے چھائی رہنے والی مصیبت کی گھٹاؤں کو ہمارے انصاف کی

تیز ہوائیں اڑا کر لے گئیں۔''

سلطان کی اس یقین دہانی کے بعد وہ حقیر و کمزور لوگ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکے۔ پھر سلطان کے دریافت کرنے پر ملاحوں نے بتایا کہ ان کے بیس پچیس خاندان بستی میں آباد ہیں اور اتنی ہی کشتیاں موجود ہیں جن کے ذریعے انہیں روزی حاصل ہوتی ہے۔ ملاحوں کی روداد سننے کے بعد سلطان نے اپنے سپہ سالاروں کو حکم دیا کہ وہ ان غریب لوگوں میں اتنا سونا تقسیم کر دیں کہ وہ کئی سال تک سکون کی زندگی گزار سکیں اور اس کے ساتھ ہی دوسرا حکم دیا کہ تمام کشتیوں میں سوراخ کر دیئے جائیں۔ بڑا عجیب حکم تھا۔ ملک ظفر خان اور خواجہ حاجی نے حیران ہو کر اپنے فرمانروا کی طرف دیکھا۔

''ظفر خان! یہ ہمارا دماغی خلل نہیں کہ ہم کشتیاں ڈبو کر دریا کے پار اترنا چاہتے ہیں۔ شاید کم ہمت لوگ اسے ہمارا جنون سمجھیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم کسی بھی انداز سے دشمن کا احسان لینا نہیں چاہتے۔ ہم راجہ رتن سنگھ کو دکھانا چاہتے ہیں کہ ہمارے سبک رفتار گھوڑوں نے اس کے دریاؤں کے سینے چیر ڈالے اور اس طرح پار اتر گئے کہ انہیں کسی کشتی کا سہارا حاصل نہیں تھا۔''

سپہ سالاروں کے سر ایک بار پھر جھک گئے۔ وہ جانتے تھے کہ سلطان کبھی اپنا فیصلہ نہیں بدلتا۔

ملاح اور دوسرے دیہاتی سونے کے ٹکڑے لے کر بہت خوش تھے مگر اچانک ایک خیال ان کے ذہنوں میں ابھرا اور وہ اداس نظر آنے لگے۔ ایک ملاح نے آگے بڑھ کر سلطان کے قدموں پر سر رکھ دیا اور گڑگڑانے لگا۔ ''ان داتا! آپ کا دان (بخشش) ہم غریبوں کی ضرورت سے بہت زیادہ ہے مگر ہم اس سونے کو لے کر کہاں جائیں گے؟ اس کی قیمت کون ادا کرے گا؟ اور جب دریا کے پار جانے کے راستے ہی بند ہو جائیں گے تو ہم ہاٹ (بازار) سے کس طرح اناج اور دالیں خریدیں گے؟ ہم تو مر جائیں گے۔ پالن ہار! مر جائیں گے۔'' ملاح رونے لگا۔

''ہم جانتے ہیں' خوب جانتے ہیں۔'' سلطان نے اپنے پیروں کو جنبش دی۔ یہ ایک اشارہ تھا کہ ملاح اٹھ کر کھڑا ہو جائے۔ ''ہم نے تمہیں یہ سونا اس لئے نہیں دیا کہ تم اس سے اناج اور دالیں خریدو۔ یہ تو ایک انعام ہے جو شہنشاہ اپنی رعایا کو دیتے ہیں۔ تم رتن سنگھ کی غلامی سے آزاد ہو چکے ہو۔ ہمارے قدم جس زمین پر پڑتے ہیں وہ ہماری ملکیت ہو جاتی ہے۔ اب تمہاری کفالت اور پرورش کی ذمہ داری بھی ہم پر عائد ہوتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آج کے بعد سے تم اپنی زندگی کا کاروبار جاری نہ رکھ سکو گے۔ ہم نے یہ راستے رتن سنگھ کے سپاہیوں پر بند کئے ہیں۔ غریب رعایا کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی۔ جب تمہیں بھوک ستائے تو اپنی بستی کے سارے لوگوں کو لے کر ہمارے خیموں میں چلے آنا۔ خدائے ذوالجلال نے ہمیں اتنا رزق دیا ہے کہ ہم تقسیم کرتے کرتے تھکے جاتے ہیں مگر وہ ختم نہیں ہوتا۔ تم جب بھی آؤ گے تو ہمارے کارندوں کے ہاتھوں کو اناج سے بھرا ہوا پاؤ گے۔ یہاں تک کہ تمہارے دامن تنگ ہو جائیں گے لیکن ہمارے غلے کے ذخیروں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ یہ سونا ہم نے تمہیں برے دنوں سے بچانے کیلئے دیا ہے۔ عنقریب ان دریاؤں میں ایک خونیں سیلاب آنے والا ہے۔ ایسے گراں وقت میں یہ کشتیاں تمہارے کسی کام نہیں آتیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ رتن سنگھ کی معصوم رعایا ہماری وجہ سے بھوکی مر جائے۔ یہ ہمارا اور اس کا جھگڑا ہے۔ پھر تمہاری نا آسودہ اور ترسی ہوئی زندگیاں کیوں موت کی خوراک بن جائیں۔ جاؤ! اپنے اپنے گھروں میں جا کر چین کی سانس لو کہ ہم نے تمہیں امان دی۔ جب ہمارے قہر کا طوفان گزر جائے تو نئی کشتیاں بنا لینا............ اور پھر جس دن تم نئی کشتیاں پانی میں اتارو تو ہمیں یاد کر لینا اور دریا کی لہروں کو ہماری عظمتوں کے راگ سنانا کہ کیسا صاحب دل شہنشاہ یہاں آیا تھا۔''

ملاح اور بستی کے دوسرے لوگ سلطان کو دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے اور ساری کشتیاں دریائے گمبھیری میں غرق کر دی گئیں۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ سلطان نے سب سے پہلے اپنا گھوڑا دریا میں ڈالا اور پار اتر کر دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد بھی دریائے گمبھیری کو عبور کر گئی۔ سلطان نے جس جگہ سے دریا عبور کیا تھا وہاں پاٹ بہت چوڑا تھا۔ یہ علاءالدین کی عادت تھی کہ وہ اپنے لئے مشکل اور دشوار گزار راستوں کا انتخاب کرتا تھا۔ دریا کو پار کرتے وقت صرف امیر خسرؒ اور چاروں سپہ سالار اس کے ہمراہ تھے۔ باقی لشکر اس جگہ سے گزرا جہاں دریا کی چوڑائی بہت کم تھی۔ گمبھیری میں بعض مقامات پر پانی اتنا کم تھا کہ بس گھوڑوں کے سم ہی بھیگ سکتے تھے۔ سلطان نے اسی راستے کو سپاہیوں کیلئے عام گزر گاہ بنانے کا حکم دیا۔ فوجیوں کی ایک مخصوص تعداد خشکی میں متعین کر دی گئی۔ احتیاط کے طور پر لکڑی کا ایک پل بھی تعمیر کر دیا گیا جس کے سہارے دریائے گمبھیری کو آسانی کے ساتھ عبور کیا جا سکتا تھا۔ سلطان کی جنگی حکمتِ عملی یہ تھی کہ اس نے چتوڑ کے کسی علاقے کو اپنے سپاہیوں کی موجودگی سے خالی نہیں چھوڑا تھا۔ سامان رسد کا یہ حال تھا کہ دہلی سے چتوڑ کے مضافات تک گھوڑوں اور اونٹوں کی ایک طویل قطار تھی جس کا سلسلہ ایک دن کیلئے بھی منقطع نہیں ہوتا تھا۔ علاءالدین نے جاسوسی کے نظام کو اس طرح ترتیب دیا تھا کہ اسے دہلی کی خبریں مسلسل مل رہی تھیں۔ اس طرح دارالحکومت سے دور ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے پایۂ تخت کے قریب تھا۔

☆..................☆..................☆

چندر سنگھ طلسم کدے سے نکلنے کے بعد چتوڑ کے مختلف مندروں میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ آخر وہ ان سادھوؤں کے گروہ میں شامل ہو گیا جو نشے کے عادی تھے۔ چندر سنگھ کو یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی سادھو اپنے حواس کھو دے گا اور پھر بے خودی کی حالت میں اس کی زبان وہ اہم راز فاش کر دے گی جسے جاننے کیلئے چندر سنگھ نے اپنی زندگی خطرات کے حوالے کر دی تھی۔ وکرم سنگھ کا یہ وفادار خادم کئی دن تک بھنگ، افیم اور مدک پینے والے سادھوؤں کی محفلوں میں شریک رہا۔ نشے میں غرق ہو کر ان جوگیوں نے بڑے بڑے دعوے کئے کہ راجہ رتن سنگھ، سلطان کی فوجوں کو چیونٹیوں کے لشکر کی طرح مسل دے گا، مہاراج رام دیو اپنی روحانی طاقتوں سے مسلمانوں پر دردناک عذاب نازل کر دیں گے اور نئے مہامنتری گنیش سنگھ کی سیاست چتوڑ کو ناقابلِ تسخیر بنا دے گی۔ چندر سنگھ نئے مہامنتری کا نام سن کر چونکا تھا۔ پھر اس نے ان بدمست سادھوؤں کو کریدنے کی کوشش بھی کی تھی مگر وہ بے خبر وکرم سنگھ کے انجام کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے۔ چندر سنگھ مایوس ہو گیا اور گنیش سنگھ کے مہامنتری بن جانے کی اطلاع نے اسے نئے اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ سیاسی انقلاب ظاہر کر رہا تھا کہ جیسے وکرم سنگھ اس دنیا میں موجود نہ ہو۔ چندر سنگھ نے بمشکل تمام اپنے ذہن کو ان پریشان خیالات سے آزاد کیا اور پھر کئی دن بعد آدھی رات کے وقت منتری بھون کے جلے ہوئے کھنڈر سے گزر کر طلسم کدے میں داخل ہوا۔

"چندر سنگھ! میرے پتا جی کیسے ہیں؟" نرملا کی آواز کانپ رہی تھی اور چہرے پر اذیت و کرب میں ڈوبے ہوئے کئی رنگ ابھر آئے تھے۔

چندر سنگھ نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی اس نے جبراً اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی اور شگفتہ لہجے میں بتانے لگا۔

"مہامنتری بالکل محفوظ ہیں مگر انہیں عارضی طور پر نظر بند کر دیا گیا ہے۔" چندر سنگھ نے اپنے جھوٹ کو

سچائی کا لباس مہیا کر کے پیش کیا تھا لیکن نرملا کی آنکھوں نے پس پردہ سب کچھ دیکھ لیا تھا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو چندر سنگھ۔" یہ کہتے کہتے نرملا رونے لگی۔ "تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم مجھے اس طرح جھوٹی تسلیاں دو گے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں کس عذاب کی آگ میں مسلسل سلگ رہی ہوں۔ ایک لمحہ مجھے مار ڈالتا ہے اور دوسرا زندہ کر دیتا ہے۔ خدا مجھ جیسی زندگی اور موت کسی کو نہ دے۔ تم کہہ کیوں نہیں دیتے کہ پتا جی اس دنیا میں نہیں رہے۔ اس آگ کو ایک بار بھڑکا دو کہ میں مکمل راکھ ہو جاؤں۔" آفریدی نے پہلی بار ایک پتھر میں شگاف پڑتے اور پھر اس سے آنسوؤں کا آبشار ابلتے دیکھا تھا۔

چندر سنگھ نے اپنی آقا زادی کو یقین دلانے کیلئے کئی بار قسمیں کھائیں کہ اسے مہامنتری کے بارے میں کوئی بری خبر نہیں ملی ہے مگر نرملا نے اس کی ہر قسم کو جھٹلا دیا۔ "وہ میرے باپ ہیں۔ ان کے جسم پر جتنی خراشیں آئیں گی، وہ سب میرے دل کے زخم بن جائیں گی۔ چندر سنگھ! کسی کو کیا معلوم کہ میرے دل پر کتنے زخم ہیں۔ ان زخموں کو شمار کرتی ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ میرے باپ کو کیسے کیسے آزار پہنچائے گئے ہیں۔" یہ کہہ کر نرملا کماری اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔ کئی بار وہ گرتے گرتے بچی اور اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ خادمہ رامیشوری نے آگے بڑھ کر سہارا دینے کی کوشش کی مگر نرملا نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

بہت دیر تک در و دیوار پر سکوتِ مرگ طاری رہا۔ چندر سنگھ مسلسل روتا رہا اور آفریدی کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں۔ آخر طویل خاموشی کے بعد چندر سنگھ نے علاءالدین خلجی کے لشکر کی آمد سے لے کر گنیش سنگھ کے مہامنتری بن جانے تک ساری روداد سناتے ہوئے کہا۔ "آپ راج کماری کو حوصلہ دیں کہ میں نے انہیں اس طرح ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ مہامنتری اس دنیا میں نہیں رہے۔ گنیش سنگھ کا وزیر اعظم ہو جانا کسی خوفناک حادثے کی خبر دیتا ہے۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ اگر میرے آقا کسی کے تشدد کا شکار ہو گئے تو ان کے خون کا حساب مجھ پر قرض ہے۔ اب میں اسی وقت واپس آؤں گا جب یہ قرض ادا ہو جائے گا۔ واپس نہ آؤں تو آپ اور راج کماری مجھے معاف کر دیں کہ ایک غلام تھا جو اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے چلا گیا۔"

آفریدی نے چندر سنگھ کو روکنا چاہا مگر وہ بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ انتقام کی آگ میں جلتا ہوا طلسم کدے سے باہر نکلا اور جب وہ منتری بھون کے درمیان سے گزر رہا تھا تو اس پر ایک نئی افتاد ٹوٹ پڑی۔ منتری بھون کے جل جانے کے بعد چوروں کا ایک گروہ روزانہ رات کے اندھیرے میں یہاں اس خیال سے آتا تھا کہ شاید ملبے اور راکھ کے ڈھیر میں دبی ہوئی کوئی قیمتی چیز ہاتھ آ جائے۔ اتفاق سے اس دن چوروں کی وہ ٹولی بھی اسی وقت منتری بھون میں داخل ہوئی جب چندر سنگھ واپس جا رہا تھا چوروں نے پہچان لئے جانے کے خوف سے چندر سنگھ پر کئی مہلک وار کئے اور اس راجپوت زادے کو مار ڈالا جو اپنے آقا کے قاتلوں کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ نرملا کماری، علی عامر آفریدی اور خادمہ رامیشوری کئی دن تک چندر سنگھ کا انتظار کرتے رہے مگر انہیں کون بتاتا کہ ان کا جاں نثار کچھ قدموں کے فاصلے پر، دیوار کے پیچھے زخموں کا کفن پہنے لیٹا ہے۔ اس کی لاش پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ آؤ میرا ماتم کرو اور مجھے اپنے غم خوار ہاتھوں سے زمین کی گہرائیوں میں اتار دو۔ آواز جلے ہوئے کھنڈر میں گونجتی رہی۔ مگر اس آواز کا سننے والا کوئی نہیں تھا۔

☆..................☆..................☆

اب تو اہلِ چتوڑ ایک ہی آواز سن رہے تھے۔ اور وہ آواز علاءالدین خلجی کی تھی جس کی ہیبت سے

اراولی اور آبو کی چوٹیاں کانپ رہی تھیں۔

علاءالدین دریائے گمبھیری اور بڑیچ کے درمیان خیمہ زن ہوا۔ پھر اس نے اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ سپاہیوں کی ایک کثیر تعداد قلعے کی دائیں جانب بڑھ رہی تھی اور لشکر کا دوسرا بازو رتن سنگھ کی پناہ گاہ کو بائیں جانب سے اپنے حصار میں لے رہا تھا۔ ہر طرف سر ہی سر تھے۔ بلند اور اٹھے ہوئے سر، جن پر سجی ہوئی سرخ دستاریں کسی خونیں طوفان کی خبر دے رہی تھیں۔ علاءالدین کے سپاہی مقررہ سمتوں میں بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ قلعے کا محاصرہ مکمل ہو گیا۔

چتوڑ کے سرحدی سپاہی مارے جا چکے تھے یا پھر انہیں سلطان کے حکم پر ذلیل و رسوا کر کے راجہ رتن سنگھ کے دربار میں واپس بھیج دیا گیا تھا۔ علاءالدین کے سپہ سالاروں ملک ظفر خان، خواجہ حاجی، تاج الدین عراقی اور ملک نصرت خان نے دبے لفظوں میں سلطان کی اس حکمتِ عملی کو غیر مناسب قرار دیتے ہوئے عرض کیا۔

"وہ دشمن جن کی گردنیں ہماری شمشیروں کی زد پر تھیں، انہیں معاف کر کے کہیں ہم نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟" چاروں سپہ سالار بہت محتاط لہجے میں بول رہے تھے۔

"خواجہ! تم سے غلطی ہو سکتی ہے۔ عراقی، تمہارے سوچنے کا انداز غلط ہو سکتا ہے۔ ملک ظفر اور ملک نصرت! تمہارے ذہن پراگندہ خیالی کا شکار ہو سکتے ہیں مگر تمہارے سلطان سے کبھی کوئی احمقانہ فعل سرزد نہیں ہو سکتا۔" علاءالدین کے غرور و تکبر کا عجیب عالم تھا۔ سلطنت خلجی کے جاں نثاروں کو مجبوراً سر جھکا دینا پڑا۔ "تم لوگ یقیناً یہی سوچتے ہو گے کہ ہم نے اپنے مٹھی بھر دشمنوں کی جان بخش کر کوئی غیر دانشمندانہ حرکت کی ہے؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہمارے فیصلے دیوانوں کے فیصلے نہیں ہوتے۔ ہم نے رتن سنگھ کے سپاہیوں کو اس لئے واپس بھیجا ہے کہ جب وہ زخمی حالت میں اپنے حکمراں کے سامنے پہنچیں گے تو دوسرے سپاہیوں کے دلوں میں ہماری ہیبت قائم ہو جائے گی۔ انہیں سوچنا پڑے گا کہ ہمارا جنگ لڑنے کا انداز کس قدر بے نیازانہ ہے۔ ہم جب چاہتے ہیں دشمنوں کے جسموں پر قابو پا لیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں انہیں آزاد کر دیتے ہیں۔ جنگ ہمارے لئے کھیل ہے اور ہم اس کھیل پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ہماری یہی ادا ایک روز ان پہاڑی چوہوں کو ان کے سوراخوں میں منہ چھپا کر مرنے پر مجبور کر دے گی۔ وہ زیادہ دیر اپنی پناہ گاہوں میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہمارے جلال و جبروت سے ان کا دم گھٹ جائے گا۔ وہ گھبرا گھبرا کر اپنے سوراخوں سے باہر نکل آئیں گے اور پھر ہمارے قدموں سے سر ٹکرا کر اپنی جان دیدیں گے۔"

بالآخر ایسا ہی ہوا۔ جب زخمی سپاہیوں کا دوسرا دستہ قلعے میں پہنچا تو راجہ رتن سنگھ کے ہوش و حواس اڑ گئے اس نے فوری طور پر ایک خفیہ اجلاس طلب کیا جس میں رانی پدمنی اور مہامنتری گنیش سنگھ کے ساتھ ساتھ تمام راجپوت سردار شریک تھے۔ رتن سنگھ کا حقیقی بھانجا سوگرامال دیو سنگھ بھی اگلی قطار میں موجود تھا۔ سپہ سالار ہری سنگھ کی نظر بندی کو کئی دن گزر چکے تھے اور اس کی جگہ اجیت سنگھ چتوڑ کی فوجوں کی قیادت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اجیت سنگھ نے آج تک کسی جنگ میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا مگر اپنی خوشامدانہ عادتوں کے سبب ہمیشہ راجہ رتن سنگھ کے قریب رہتا تھا۔ ہری سنگھ پر عتاب آیا تو اجیت سنگھ کو سپہ سالاری کے عہدے پر فائز کر دیا گیا مگر اس تبدیلی کو فوج کی اکثریت نے ناپسندیدہ عمل قرار دیا تھا۔

اجلاس شروع ہوا تو مہامنتری گنیش سنگھ نے اس خوفناک حقیقت کا اعتراف کر لیا کہ ان کے آزاد وطن کو دہلی کے سلطان نے اپنے حصار میں لے لیا ہے اور چتوڑ کی نشیبی بستی دشمنوں کے نرغے میں اس طرح گھر

گئی ہے کہ قلعے سے اس کا کوئی رابطہ برقرار نہیں رہ سکا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ بستی میں رہنے والوں پر کیا گزری ہے؟ راجپوت نوجوان زندہ ہیں یا موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے؟ کوئی نہیں جانتا کہ بوڑھے اور بچے کس حال میں ہیں؟ اور کسی کو یہ بھی خبر نہیں کہ حیادار دوشیزاؤں اور غیرت مند عورتوں کے ساتھ سلطان کے سپاہیوں نے کیا سلوک کیا؟ مہامنتری گنیش سنگھ راج محل کے ایک گوشے میں بیٹھے بیٹھے چتوڑ کی بستی کی فرضی تباہی کا نقشہ اس طرح کھینچ رہا تھا جیسے علاءالدین کے ظلم و تشدد کو اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔

مہامنتری کا بیان سن کر دربار میں بیٹھے ہوئے تمام راجپوت سرداروں کے جسم جلنے لگے اور ان کے چہروں پر بھی نفرتوں کی آگ روشن ہو گئی۔ "اگر سلطان کے لشکروں کی یلغار کا یہی حال رہا تو ایک دن ہماری زندگی اور آبرو بھی غیر محفوظ ہو جائے گی۔" راجپوت سردار کرشن سنگھ نے اپنی نشست پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "مہامنتری گنیش سنگھ جواب دیں کہ بستی کی ایک بڑی آبادی کو اس قدر خاموشی کے ساتھ کیوں محصور کرا دیا گیا؟"

راجپوت سردار کا سوال سن کر گنیش سنگھ سراسیمگی کا شکار نظر آنے لگا اس نے فوراً ہی کسی عیار شاطر کی طرح اپنے چہرے پر سکون اور بے نیازی کی نقاب چڑھا لی۔ "یہ سب کچھ ہماری جنگی حکمت عملی کا ایک حصہ ہے۔ ہم نے سلطان کو خود موقع فراہم کیا ہے کہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر بڑھتا چلا آئے۔ یہاں تک کہ ایک خاص مقام پر پہنچ کر اسے اپنی حماقت کا احساس ہو جائے گا کہ وہ چتوڑ کے گرد دائرہ تنگ کرتے کرتے خود محصور ہو گیا ہے۔" یہ کہہ کر مہامنتری گنیش سنگھ نے مسکرانے کی مصنوعی کوشش کی تھی کہ اس طرح راجپوت سرداروں کو اس کی باتوں پر یقین آ جائے۔

گنیش سنگھ نے انتہائی پرزور لہجے میں جھوٹ بولا تھا مگر سردار کرشن سنگھ اس کی تقریر سے متاثر نہ ہو سکا۔ "اگر سلطان اسی طرح بڑھتا رہا تو آپ کے پاس اس کی کیا ضمانت ہے کہ آنے والوں کے قدم ہمارے سروں تک نہیں پہنچیں گے؟"

"وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔" مہامنتری گنیش سنگھ نے تیز آواز میں کہا۔ "امورِ سلطنت کو ہم سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ ہم اہل چتوڑ کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کی جانیں بھی محفوظ ہیں اور جاگیریں بھی۔ سلطان کے ہاتھ کتنے ہی دراز کیوں نہ ہوں مگر اسے چتوڑ کی آبرو سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

"مہامنتری! ہمیں یہ پُرجوش تقریریں مطمئن نہیں کر سکتیں۔" راجپوت سردار کرشن سنگھ دوبارہ کھڑا ہوا اور انتہائی تلخ لہجے میں گنیش سنگھ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "ہم نے اسی دربار میں مہاراج رام دیو کی بھی تقریریں سنی ہیں۔ مہاراج تو کہا کرتے تھے کہ ان کے گیان کی طاقت سلطان کو دہلی کی حدود سے باہر نہیں نکلنے دے گی مگر آج ہم اپنے گھروں کی دیواروں کے پیچھے اس کے تیز قدموں کی چاپ سن رہے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اگر مہاراج کا گیان سچا تھا تو سلطان کے سپاہی چتوڑ کی بستی تک کس طرح آ پہنچے؟"

راجپوت قوم کا مزاج یہ تھا کہ جب وہ لوگ دل کی بات کہنے پر آتے تو ان کی زبانوں پر خاموشی کی مہر لگانا مشکل ہو جاتا۔ کسی منتری کا تو ذکر ہی کیا، کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ ایک عام راجپوت سپاہی حقیقت کا اظہار کرنے کیلئے اپنے حکمراں کو بھی خاطر میں نہ لاتا۔ راجپوتوں کی اسی فطری بیباکی نے انہیں ایک آزاد و سربلند قوم کی حیثیت سے زندہ رکھا تھا۔ کرشن سنگھ بھی اس خفیہ اجلاس میں اپنی اسی روایت کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مہامنتری گنیش سنگھ ایک بار پھر گھبرا سا گیا اس کے پاس کرشن سنگھ کی اس بات کا کوئی معقول جواب نہیں تھا کہ سلطان کے لشکر کو اتنی آسانی کے ساتھ قلعے کا محاصرہ کیوں کرنے دیا گیا؟ مجبوراً گنیش سنگھ نے نئے سپہ سالار اجیت سنگھ کی طرف دیکھا اس کی خاموش نظروں کا ایک ہی مفہوم تھا کہ اجیت سنگھ اپنے جوابات سے راجپوت سرداروں کو مطمئن کر دے۔

اجیت سنگھ راجپوت سرداروں کی پیشانیوں کے بل اور آنکھوں کی چنگاریاں دیکھ چکا تھا مگر پھر بھی اسے مہامنتری کے اشارے پر کھڑا ہونا پڑا۔

"یہ چال ہماری جنگی سیاست کا ایک حصہ ہے۔" اجیت سنگھ نے بھی مہامنتری کے الفاظ کی نقل کرنا چاہی مگر راجپوت سرداروں نے اسے اپنی تقریر جاری رکھنے سے روک دیا۔ "سمراٹ! ہم اسے اپنا سپہ سالار تسلیم نہیں کرتے۔" تمام راجپوت سرداروں نے بیک زبان بلند آواز میں کہا۔ "جو سپاہی کا لباس پہننے کی اہلیت نہیں رکھتا اسے سپہ سالاری کی دستار پہنا کر ہم جاں فروشوں پر بڑی قیامت ڈھائی گئی ہے۔ ہمارے ساتھ اس سے زیادہ ذلت آمیز سلوک نہیں کیا جا سکتا کہ شہسواروں پر ایک ساربان کو مسلط کر دیا جائے۔ اس سے تو تلوار کا بوجھ بھی نہیں اٹھتا۔ یہ ہمیں کس طرح حکم دے گا اور ہم اس کا حکم کس طرح مانیں گے۔ نہیں سمراٹ! یہ تو ہمارے لئے میدان جنگ میں ایک مسئلہ بن جائے گا۔ جب سپاہی اپنے سالارِ لشکر کو تضحیک آمیز نظروں سے دیکھنے لگیں تو صفوں میں بڑا انتشار برپا ہو جاتا ہے۔ سمراٹ! اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ آپ ہمیں حکم دیں اور ہم آبو کی بلند ترین چوٹی سے نشیب میں کود کر اپنی جانیں چتوڑ کی نذر کر جائیں۔" راجپوت سرداروں نے بھرے دربار میں اجیت سنگھ کی نفی کر دی تھی۔

مہامنتری گنیش سنگھ کے اس خوشامدی مہرے نے اپنی صورت کو راجپوت سورماؤں کی گفتگو کے آئینے میں دیکھا تو شرم و ندامت سے اس کا سر جھک گیا۔

"پھر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" راجہ رتن سنگھ نے اس بگڑی ہوئی صورت حال کو سنوارنے کیلئے اپنے سرداروں سے دریافت کیا۔

"ہم سپہ سالار ہری سنگھ سے اپنے سوالوں کا جواب چاہتے ہیں۔" ایک بار پھر رتن سنگھ کا دربار تیز آوازوں سے گونجنے لگا۔

آخر گنیش سنگھ کی غلیظ اور احمقانہ سیاست ناکام ہو گئی اور راجہ رتن سنگھ کو مجبوراً اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ وہ ایک بڑا جذباتی منظر تھا جب سپہ سالار ہری سنگھ کو نظر بندی کے کمرے سے نکال کر دربار میں لایا گیا جیسے ہی ہری سنگھ داخل ہوا تمام راجپوت سردار اپنی اپنی نشستوں پر احتراماً کھڑے ہو گئے۔ چتوڑ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب کسی سپہ سالار کو ایک حکمراں کی طرح اعزاز بخشا گیا تھا۔ ہری سنگھ کی یہ عزت و توقیر دیکھ کر راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی اور گنیش سنگھ کے چہرے غصے سے سرخ ہو گئے اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ ہری سنگھ کو کسی تاخیر کے بغیر قتل کرا دیتے مگر ان کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ دشمن سر پر آ پہنچا ہے اور خود راجپوتوں کی صفوں میں بھی انتشار پیدا ہو چکا ہے۔ اس لئے چتوڑ کے حکمرانوں نے ایک خاص مصلحت کے پیشِ نظر سب کچھ برداشت کیا۔

پھر طویل بحث کے بعد جنگی صورت حال کا جائزہ لیا گیا اس دوران ہری سنگھ کی درخواست پر سابق سپہ سالار لچھمن سنگھ کو بھی دربار میں طلب کر لیا گیا۔ صبح سے لے کر آدھی رات تک یہ خفیہ اجلاس جاری رہا۔ ریاست کے تمام باہوش لوگوں کے مشوروں سے فیصلہ کیا گیا کہ فوج کا ایک مختصر حصہ قلعے کے باہر مختلف

مورچوں پر سلطان کو جنگ میں الجھائے رکھے گا اور باقی فوج قلعہ بند ہو جائے گی۔ فصیل پر بہترین تیراندازوں کے دستے متعین کر دیئے جائیں گے کہ اگر سلطان کے لشکر نشیب سے نکل کر قلعے کی طرف بڑھیں تو بلندی سے ہونے والی تیروں کی بارش دشمن سپاہیوں کے سینے چھید کر انہیں موت کی نیند سلا دے یا پھر وہ زخموں کی تاب نہ لا کر اپنی حدوں میں واپس لوٹ جائیں۔ اس منصوبہ بندی کے ساتھ سامانِ رسد کی فراہمی کو بھی تیز تر کر دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ایک جائزے کے مطابق قلعے میں اشیائے ضرورت کا اتنا ذخیرہ موجود تھا جس کے سہارے تین ماہ تک قلعہ بند رہ کر بھوک کے خوف سے نجات حاصل کی جا سکتی تھی۔ سپہ سالار ہری سنگھ اور لچھمن سنگھ کی رائے میں اناج اور دیگر چیزوں کا یہ ذخیرہ جنگ کی شدت کو دیکھتے ہوئے ناکافی تھا۔ لچھمن سنگھ کے بقول یہ ذخیرہ اتنا ہونا چاہئے تھا کہ ایک سال تک قلعہ بند لوگوں کو بھوک کا خیال تک نہیں آنا چاہیئے۔ ہری سنگھ کا کہنا تھا کہ یہ ذخیرہ کم سے کم چھ ماہ تک اہل چتوڑ کی کفالت کر سکے۔ معمولی سے اختلاف رائے کے بعد طے ہو گیا کہ سامانِ رسد کے حصول کی رفتار بڑھا دی جائے۔

ان فیصلوں سے تمام راجپوت سردار مطمئن تھے مگر اچانک ایک سردار بے چین ہو کر اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا۔ "سمراٹ! ہم نے خیالی طور پر منصوبہ مکمل کر لیا مگر اس پر عملدر آمد کس طرح ہو گا؟ سلطان کے لشکروں نے دونوں جانب سے قلعے کا محاصرہ کر لیا ہے اور اناج کے ذخائر تک پہنچنے کیلئے ہمیں بستی میں داخل ہونا پڑے گا۔ بیچ میں سلطان کا لشکر حائل ہے پھر یہ درمیانی راستہ کس طرح طے ہو گا؟" راجپوت سردار نے ایک انتہائی نازک سوال اٹھایا تھا۔

"یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم بستی والوں سے کس طرح رابطہ قائم کریں گے؟" رتن سنگھ نے بلند آواز میں کہا۔

"ہمیں آپ کی دانشمندی پر پورا بھروسہ ہے لیکن یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ ریاست کے ذمہ دار افراد میں سے کوئی بھی شخص اپنے خول میں بند رہے۔" دوسرے راجپوت سردار نے ادب و احترام کے ساتھ کہا وہ اپنے حکمراں سے اس کے دعوے کی وضاحت چاہتا تھا۔ "اس منصوبے کو چتوڑ کے جاں نثاروں پر ظاہر کیا جائے کہ اگر اس طرح کوئی کسر باقی رہ جائے تو اسے بروقت پورا کیا جا سکے۔"

راجہ رتن سنگھ کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر اس نے ان دونوں خفیہ سرنگوں کا ذکر کیا جو حالتِ جنگ میں سامانِ رسد حاصل کرنے کیلئے بنائی گئی تھیں۔ یہ سرنگیں راج محل سے گزرتی ہوئی دریائے گمبھیری اور برچ کو بڑے عجیب انداز میں عبور کر جاتی تھیں۔ دونوں سرنگیں اس قدر گہرائی میں بنائی گئی تھیں کہ اگر دریا کے کنارے بسنے والے اپنی ضرورت کیلئے کئی فٹ نیچے تک مٹی کھودیں تو تب بھی سرنگوں کو کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔ راجہ رتن سنگھ کے باپ سمر سنگھ نے اپنے وقت کے بہترین معماروں کے مشورے سے ان سرنگوں کو چتوڑ کی آخری سرحد تک پہنچا دیا تھا۔ راج محل اور مضافاتی بستیوں کے درمیان دو دریا حائل تھے یہاں چتوڑ کے معماروں نے اپنے فن کا مظاہرہ اس طرح کیا تھا کہ سرنگوں کو دریائے برچ اور گمبھیری کے ان حصوں سے گزارا تھا جن کی گہرائی بہت زیادہ تھی۔ گرمی کے موسم میں دریاؤں کے بیشتر حصے خشک ہو جاتے تھے مگر جہاں سے سرنگیں گزر رہی تھیں۔ وہاں خشک سالی کے دوران بھی پانی خشک نہیں ہوتا تھا سرنگوں کا وہ حصہ جو دریاؤں کے بیچ سے گزرا تھا، اسے مضبوط تر کرنے کیلئے پتھروں سے زیادہ سیسے کا استعمال کیا گیا تھا۔ ان سرنگوں کا دوسرا دروازہ گھنے جنگل میں کھلتا تھا۔ دروازے پر ہر وقت پندرہ بیس مسلح سپاہیوں کا پہرہ رہتا تھا۔ یہ جگہ اس قدر محفوظ تھی کہ سایہ دار درختوں اور خار دار جھاڑیوں کی وجہ سے دن

میں بھی اندھیرا چھایا رہتا تھا اناج سے بھری ہوئی بیل گاڑیاں پر پیچ راستوں سے گزر کر درختوں کے اس جھنڈ میں غائب ہو جاتی تھیں اور پھر مسلح سپاہیوں کی اجازت کے بعد انہیں سرنگوں میں داخل کر دیا جاتا تھا۔ سرنگیں اتنی چوڑی تھیں کہ ان کے درمیان سے ایک بیل گاڑی بہ آسانی گزر سکتی تھی بیل گاڑیاں اس وقت تک اپنا سفر جاری رکھتیں جب تک سرنگ کا راستہ زمین کی سطح کے برابر رہتا اور پھر جیسے ہی قلعے کی بلندی شروع ہو جاتی بیل گاڑیاں رک جاتیں اور ان پر لدا ہوا سامان مزدوروں کے ذریعے اتار لیا جاتا۔ اس کے بعد سیکڑوں مزدور اشیائے ضرورت کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر راج محل پہنچاتے۔ اس طرح چتوڑ کے باشندوں کو خبر تک نہ ہوتی اور انتہائی رازداری کے ساتھ اناج کے ذخائر میں اضافہ ہوتا رہتا۔

جب راجہ رتن سنگھ نے اپنے باپ کی بنائی ہوئی سرنگوں کی تفصیلات بیان کیں تو تمام راجپوت سردار کچھ دیر کیلئے حیرت زدہ رہ گئے اور پھر بے اختیار ان کے ہونٹوں پر آنجہانی راجہ سمر سنگھ کیلئے تعریفی کلمات ابھر آئے۔

"بے شک! سورگیہ (فردوس مکانی) سمراٹ سمر سنگھ ایک عظیم سیاستداں تھے۔ ان کی دور اندیشیوں نے چتوڑ کو کیسے مصائب سے بچا لیا۔ اگر یہ سرنگیں تعمیر نہ کی گئی ہوتیں تو آج راجپوتوں کی یہ عظیم سلطنت نہ جانے کن آفات کا شکار ہو جاتی۔" اپنے باپ کی تعریف و ستائش سن کر راجہ رتن سنگھ کی گردن کچھ اور کج ہو گئی' سر کچھ اور بلند ہو گیا' چہرے کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی۔

پھر خفیہ اجلاس برخاست ہو گیا اور رتن سنگھ کی فوجیں اپنے اپنے مورچے مضبوط کرنے لگیں۔

☆..............☆..............☆

منتری بھون کے جلے ہوئے کھنڈر میں چندر سنگھ کی بے گور و کفن لاش پڑی ہوئی تھی اور طلسم کدے کے تین قیدی بڑے کرب کے عالم میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ اذیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی تھی جب خادمہ رامیشوری غشی کی حالت میں بار بار چندر سنگھ کو پکارتی تھی۔ رامیشوری کی یہ حالت دیکھ کر علی عامر آفریدی چونک اٹھا تھا۔ اس نے نرملا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا.......... "راج کماری! اس وقت رامیشوی عقل و ہوش کی تمام پابندیوں سے آزاد ہو چکی ہے لیکن پھر بھی اسے ایک شخص یاد ہے۔ آخر چندر سنگھ سے رامیشوری کا کیا رشتہ ہے جو اس بے خبری کے عالم میں بھی نہیں ٹوٹتا ؟"

نرملا کچھ دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی اس کے دونوں ہاتھ رامیشوری کی جلتی ہوئی پیشانی پر تھے اور آنکھوں میں دھواں سا بھرا ہوا تھا۔

آفریدی' نرملا کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر ایک طویل سکوت کے بعد نرملا کے ہونٹ کانپنے لگے۔ "رامیشوری کی سانسوں پر چندر سنگھ کا قبضہ ہے۔ جب تک ایک ایک سانس نہیں ڈوب جاتی' اس وقت تک یہ رشتہ بھی نہیں ٹوٹے گا۔" نرملا کی آوار لرز رہی تھی۔

"چندر سنگھ کو اس رشتے کا علم ہے ؟" یہ سوال کرتے ہوئے آفریدی کی زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

"ہاں!" نرملا نے مختصراً کہا شرم کے بوجھ سے اس کا سر کچھ اور جھک گیا تھا۔

آفریدی' چندر سنگھ اور رامیشوری کے بارے میں مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ خادمہ کی ایک تیز چیخ بلند ہوئی۔ شاید یہ رامیشوری کی آخری چیخ تھی۔ اس نے بڑی جگر شگاف آواز میں چندر سنگھ کو پکارا تھا۔ جیسے موجوں کی آغوش میں ڈوبتا ہوا کوئی شخص ساحل پر کھڑے ہوئے اپنے کسی غمگسار کو صدا دے۔ رامیشوری کا جسم کچھ دیر تک کانپتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ پر سکون ہوتا چلا گیا۔

نرملا گھبرا کر کھڑی ہوئی اور آفریدی سے کہنے لگی۔ "سردار! اسے دیکھئے۔ یہ کیسا خون ہے ؟"

آفریدی قریب آیا۔ اس نے رامیشوری کا ماتھا چھو کر دیکھا۔ اتنا تیز بخار تھا جیسے بدن نادیدہ آگ میں جل رہا ہو پھر آفریدی کی نظریں رامیشوری کی ناک سے بہنے والے خون پر جم گئیں۔ گاڑھا گاڑھا خون ہونٹوں سے گزرتا ہوا گردن تک چلا گیا تھا۔ آفریدی لرز اٹھا۔ نرملا نے کئی بار رامیشوری کے سر پر پانی سے بھیگا ہوا کپڑا رکھا مگر موت کی آگ کو کون بجھا سکتا تھا۔ پھر جب دل کی آگ بجھی تو جسم خود بخود سرد ہو گیا۔ رامیشوری کے دماغ کی شریانیں پھٹ گئی تھیں۔ اس نے جذبات کی لہروں کو روکنے کیلئے دماغ کے گرد بہت مضبوط بند باندھے تھے مگر سرکش تمناؤں نے ہر دیوار کو توڑ دیا تھا۔

نرملا اور آفریدی اس حادثے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مگر جب رامیشوری دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے رخصت ہو گئی تو وہ دونوں بھی بہت دیر تک اس مرگِ ناگہاں کا ماتم کرتے رہے۔ اس ماتم میں آفریدی کے آنسو شامل تھے اور نرملا کی ہچکیاں۔ نرملا' رامیشوری کی لاش سے لپٹی رو رہی تھی۔ آفریدی نے بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔ اس طرح تو وہ اپنے باپ وکرم سنگھ کی رخصت پر بھی نہیں روئی تھی۔ آفریدی کو آج پہلی بار اندازہ ہوا کہ نرملا کے دل میں اپنی خادمہ کیلئے کیا مقام تھا۔

پھر جب اشکوں اور سسکیوں کا یہ طوفان ٹھہرا تو نرملا کے سوگوار چہرے پر ایک سوال ابھر آیا۔ وہ آفریدی سے پوچھ رہی تھی۔ "رامیشوری کی آخری رسمیں کس طرح ادا کی جائیں گی ؟"

"میں اپنی بہن کو سپردِ خاک کروں گا۔" آفریدی نے گلوگیر لہجے میں کہا.......... "کاش! وہ اس وقت دنیا کو خیرباد کہتی جب اس کے ہم مذہب چتوڑ پہنچ چکے ہوتے یا پھر اس نے دہلی میں اپنی آخری سانسیں لی ہوتیں۔ پھر دیکھنے والے دیکھتے کہ آگ اور مٹی میں کیا فرق ہے ؟"

نرملا حیرت سے آفریدی کی باتیں سن رہی تھی جب وہ خاموش ہوا تو کہنے لگی.......... "سردار! آپ رامیشوری کی قبر کھودیں گے ؟ آپ کے یہ زخم.........."

"اب زخموں سے لہو جاری ہو یا دست و بازو کٹ جائیں اپنے ایک رفیق کی بے حرمتی تو گوارہ نہیں کی جا سکتی۔" آفریدی کی آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں اور وہ آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا نرملا کو اندیشہ تھا۔ آفریدی باغ کے ایک تاریک گوشے میں رامیشوری کی قبر کھودنے لگا۔ زمین پتھریلی تھی' اس لئے آفریدی کو سخت دشواری پیش آ رہی تھی۔ پہلے اس کا سارا جسم پسینے میں تر ہوا اور پھر اسی پسینے کا رنگ سرخی مائل نظر آنے لگا۔ نرملا نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ چتوڑ کی زمین پر تیشہ زنی کرتا ہی رہا۔

شام کے قریب وہ گڑھا نما قبر مکمل ہوئی۔ اب رامیشوری کے آخری غسل کا سوال تھا۔ آفریدی الجھ کر رہ گیا۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے نرملا سے کہا کہ وہ اسی لباس میں رامیشوری کے جسم پر تین بار پانی بہا دے نرملا نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی مردہ جسم کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ مضبوط اعصاب رکھنے والی ایک بہادر لڑکی ہوتے ہوئے بھی نرملا کا چہرہ زرد ہو گیا تھا اور اس کے جسم پر ہلکی ہلکی لرزش طاری تھی۔

وہ لمحات بھی بڑے عجیب تھے جب رامیشوری کے جنازے کو اٹھا کر باغ میں لایا گیا۔ آفریدی نے تنہا ایک ایسی عورت کی نماز جنازہ پڑھائی جسے حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے ابھی چند روز گزرے تھے اور جو خود نماز کے مکمل آداب سے واقف نہیں تھی۔ پھر جب رامیشوری کے جسم کو قبر میں اتارا گیا تو نرملا کی حالت غیر ہو گئی۔ ایک جیتا جاگتا جسم اور ہنستا مسکراتا چہرہ مٹی کے پردے میں روپوش ہو گیا۔ آفریدی بلند آواز سے اس آیت مقدسہ کی تلاوت کر رہا تھا۔

"ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا' مٹی میں ملا دیا اور پھر ایک دن مٹی ہی سے اسے دوبارہ اٹھائیں گے۔"

رامیشوری کے دفن کے بعد آفریدی نے دعا کیلئے اپنے ہاتھ بلند کر دیئے.......... "اے قادرِ مطلق تو علیم وخبیر ہے کہ ہم اپنے ایک ساتھی کو آدابِ شریعت کے مطابق رخصت نہ کر سکے۔ نہ اہلِ اسلام کا قبرستان' نہ کسی عزیز کا کاندھا' نہ غسل' نہ کفن.......... پھر بھی تو اپنے بندوں کی مجبوریاں جانتا ہے۔ ان کی لغزشوں سے درگزر کرتا ہے اور ان کی خطائیں بخش دیتا ہے۔ رامیشوری کو بھی معاف کر دے کہ وہ اس بت کدے میں تیری نام لیوا تھی.......... اور تو اپنے نام لیواؤں کو کسی بھی حال میں بے یارومددگار نہیں چھوڑتا۔"

آفریدی کی دعا ختم ہوئی اور جیسے ہی اس نے اپنے قریب کھڑی نرملا کو دیکھا تو وہ کانپ اٹھا۔ نرملا خود کلامی کے انداز میں بول رہی تھی.......... "یہ کیسا سفر ہے اور یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں ؟ پتاجی رخصت ہو گئے' چندر سنگھ نے اپنا راستہ بدل لیا اور اب رامیشوری بھی چلی گئی.......... نرملا! تجھے سب اکیلا چھوڑ گئے۔ کسی نے تیری آواز نہیں سنی اور کسی کو تیری تنہائی کا خیال نہیں آیا۔ کیا تو اسی سلوک کی مستحق تھی ؟"

آفریدی بے اختیار ہو گیا.......... "ابھی میں ہوں نرملا! میری طرف دیکھو۔ میں کہاں گیا ہوں ؟" اضطراری طور پر آفریدی نے نرملا کے دونوں بازو پکڑ لئے۔

"ایک دن تم بھی چلے جاؤ گے سردار!" نرملا پر وحشت طاری تھی۔ "میں جانتی ہوں' تم بھی چلے جاؤ گے' سب بے وفا ہیں' سب خود غرض ہیں۔ اپنے دل کو تسکین پہنچانے کیلئے کیسی بے دردی سے دامن چھڑا لیتے ہیں۔ سب کو نیند آ گئی۔ سب کو قرار مل گیا۔ دیکھتے نہیں کہ یہ سب لوگ کیسے سکون سے سو رہے ہیں۔ کوئی میری طرف نظر بھی نہیں کرتا کہ میں کب سے اکیلی جاگ رہی ہوں۔"

آفریدی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کس طرح نرملا کو غموں کی اس بھڑکتی ہوئی آگ سے کھینچ کر باہر لائے۔ "تم میری طرف کیوں نہیں دیکھتیں ؟" آفریدی نے جوشِ جذبات میں نرملا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ "تمہیں میرا چہرہ نظر نہیں آتا کہ میں اس الم کدے میں تمہارے ساتھ جاگ رہا ہوں۔ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتیں کہ میں اس وقت تک جاگتا رہوں گا جب تک تم سکون کی گہری نیند نہیں سو جاؤ گی۔" آفریدی پوری طاقت سے چیخا تھا۔

نرملا کی وحشت کچھ دیر کیلئے تھم سی گئی۔ اس نے آفریدی کو بہت غور سے دیکھا اور پھر افغان سردار کے سینے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔

"اے وفا کے آبشار! اپنے دل میں پانی کا کوئی قطرہ باقی نہ رکھ کہ تیرے آنسو آفریدی کے خون سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔" علی عامر چاہتا تھا کہ وہ گھٹا کھل کر برس جائے جو بچپن سے نرملا کے دل پر چھائی ہوئی تھی.......... "اپنے آنسوؤں سے شاہی سفیر کو سرفراز کر دے کہ کوئی تمغہ' کوئی اعزاز اس کی برابری نہیں کر سکتا۔"

آفریدی اپنی زبان سے وہی الفاظ ادا کرتا رہا جو نرملا کماری کے شایانِ شان تھے.......... اور وکرم سنگھ چوہان کی بیٹی ان ہی الفاظ کی حرارت سے پگھلتی رہی۔

پھر جب دل کا غبار صاف ہوا تو گردوپیش کے مناظر صاف نظر آنے لگے۔ ایک طرف رامیشوری کی قبر تھی اور دوسری طرف آفریدی کا بھیگا ہوا دامن۔ نرملا کے آنسوؤں نے ایک ایسا راز فاش کر دیا تھا جس کی ابتداء رانی پدمنی کے دربار میں اس وقت ہوئی تھی جب آفریدی پر تشدد کیا جا رہا تھا اور وہ اپنے سلطان کے عزت ووقار کو بچانے کیلئے زخم پر زخم کھائے جا رہا تھا۔ آفریدی کی دلکش شخصیت اور جذبۂ وفا پرستی نے نرملا کے دل میں بڑی خاموشی سے عشق کی ایک چنگاری رکھ دی اور پھر یہی چنگاری آہستہ آہستہ سلگتی رہی۔ نرملا

نے اپنے نازک جذبات پر صبروضبط کا گہرا پردہ ڈال دیا تھا.......... مگر آفات ومصائب کی مسلسل آندھیاں بالآخر اس پردے کو اڑا کر لے گئیں۔ رامیشوری کی موت نے آفریدی اور نرملا کے درمیان کھڑی ہوئی تکلف اور حجاب کی دیوار کو گرا دیا۔ اگر یہ جانگداز حادثہ پیش نہ آتا تو آفریدی اور نرملا کو قربتوں کی آخری منزل تک پہنچنے کیلئے ایک زمانہ درکار ہوتا۔ راجپوت لڑکیوں میں پردہ داری کا یہ عالم تھا کہ شادی شدہ عورتیں بھی طویل گھونگھٹ میں رہتی تھیں۔ ان کے نزدیک اپنے شوہروں کا نام لینا بھی گناہ تھا۔ جس قوم میں غیرت وشرم کی یہ روایتیں موجود ہوں وہاں کسی دوشیزہ کا اظہارِ عشق انہونی بات تھی۔ اسی طرح آفریدی بھی اس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جہاں رسمِ عشق کا نبھانا آسان نہیں تھا۔ دونوں قومیں مردوزن کے جذباتی رشتوں میں بے حد حساس تھیں مگر حالات کے ناقابلِ یقین نشیب وفراز نے آفریدی اور نرملا کے درمیان وہ رشتہ قائم کر ہی دیا جس کے بغیر یہ کائنات بے رنگ اور بے جان نظر آتی ہے۔ چندر سنگھ اور رامیشوری بھی اسی رشتے سے بندھے ہوئے تھے مگر ہندو سماج نے انہیں اس وقت تک ملنے نہیں دیا جب تک وہ دونوں زندگی کی قید سے آزاد نہیں ہو گئے۔ موت کا طوفان گزر جانے کے بعد نرملا نے آفریدی کو بتایا کہ رامیشوری اچھوت دوشیزہ تو نہیں تھی لیکن راجپوتوں کی طرح اس کا تعلق کسی معزز خاندان سے بھی نہیں تھا۔ رامیشوری کے باپ کا انتقال اس وقت ہو گیا جب وہ تین سال کی تھی۔ دنیا میں کسی بچے کیلئے باپ کا نعم البدل کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی رامیشوری کو ماں کا سہارا تھا مگر یہ سہارا اس وقت ختم ہو گیا جب رامیشوری کی ماں کو اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جل جانا پڑا۔ نرملا نے آفریدی کو رامیشوری کی دکھ بھری کہانی سناتے ہوئے کہا.......... "رامیشوری کو اس کے عزیزوں نے بتایا کہ اس کی ماں لاجونتی شوہر کی چتا کے ساتھ جلنے کیلئے تیار نہیں تھی مگر برادری کے لوگوں نے اسے بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا۔ لاجونتی آخری سانس تک چیختی رہی کہ بھگوان کیلئے اسے آگ سے نکال لو وہ ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ اسے اپنی بے سہارا بچی کیلئے زندہ رہنا ہے مگر دھرم کے محافظوں نے اپنے کان بند کر لئے۔ یہاں تک کہ بیس سالہ لاجونتی اپنی تمام تر جوان حسرتوں کے ساتھ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی۔ پھر اس کی معصوم بچی در در کی بھیک مانگتی پھری۔ رشتے داروں نے رامیشوری سے تمام ناتے توڑ لئے تھے۔ بچپن غیروں کے ٹکڑے کھاتے ہوئے گزرا اور جب جوانی آئی تو چتوڑ کے راجپوت سردار اس کے جسم کو کھا گئے۔" یہ کہتے کہتے نرملا کماری پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔

آفریدی نے نرملا کے مشتعل جذبات کو سرد کرنے کیلئے کہا۔ "راج کماری! ماضی کی ان تلخ یادوں کو حال کے مقبرے میں دفن کر دو اور مستقبل کے پُرسکون جزیرے میں دلکش خواب دیکھو۔ جب کسی لاجونتی کو زندہ نہ جلایا جائے گا اور کوئی رامیشوری راجپوت سرداروں کی ہوس کا نشانہ نہیں بنے گی۔ میرے سلطان کی شکل میں قہرِ الٰہی چتوڑ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ عنقریب ان سرداروں پر ان کی اپنی ہی زمین تنگ ہو جائے گی۔ یہ اپنے ہی خنجروں سے اپنی شہ رگیں کاٹ دیں گے اور اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی پناہ گاہوں کو جلا ڈالیں گے۔ نرملا! یہ بتوں کی خدائی نہیں ہے کہ کمزور انسان دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھ گئے اور طاقتور ان پتھر کے مجسموں کے ساتھ مل کر خود بھی خدائی کرنے لگے۔ یہ اس خدا کی زمین ہے جو اپنی ذات میں تنہا ہے اور کسی کی شرکت برداشت نہیں کرتا۔ آج اسی خدا نے اپنے عذاب کے نمائندوں کو چتوڑ بھیجا ہے۔ بہت جلد تم اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھو گی جب ایک ایک ظالم زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو گا اور اس کے پھیلے ہوئے دامن میں موت کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔" آفریدی' نرملا کے سینے میں دبی ہوئی نفرتوں کی آگ کو اپنے الفاظ کی چھینٹوں سے بجھا دینا چاہتا تھا مگر وہ آگ آفریدی کے اندازے سے کہیں زیادہ تیز تھی۔

جیسے ہی اس پر پانی کے چند قطرے گرے وہ کچھ اور بھڑک گئی۔

"نہیں سردار! مجھے بولنے دو۔" نرملا کماری ناقابل بیان اذیت میں مبتلا تھی۔ اس نے شدت اضطراب میں آفریدی کے سامنے اپنا سر فرش پر رکھ دیا۔ "آج کی رات کوئی حکم نہ دو اور مجھے گستاخ و بے ادب ہو جانے دو۔ اگر آپ کے حکم کی تعمیل میں میرے لب خاموش ہو گئے تو دل پھٹ جائے گا۔ سلطان صرف ایک فاتح ہے اسے سیم و زر کے انبار اور زمین کے طول و عرض سے دلچسپی ہے۔ وہ اپنی فتوحات کے دفتر میں نئے اوراق کا اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ اسے کیا خبر کہ چتوڑ میں انسانوں کے ساتھ کیسا وحشیانہ سلوک ہوا ہے؟ مجھ سے پوچھو کہ میں اس دھرتی کی رازدار ہوں۔ میں آپ کو بتاؤں گی کہ اس سرزمین پر آدم زادوں کی تقسیم کس طرح ہوئی اور اونچی ذات والوں نے اپنے ہم شکل نیچ لوگوں پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے ہیں؟ سردار! آپ کو کچھ پتہ نہیں کہ یہاں کی عورت کتنی غم زدہ ہے۔ اگر میں بھی نہیں بولوں گی تو پھر کون بولے گا؟ آج اس رسمِ زباں بندی کو ٹوٹ جانے دیجئے۔"

نرملا کے آنسوؤں سے فرش بھیگ گیا تھا آفریدی پہلے تو حیرت زدہ رہ گیا کہ پتھر جیسے اعصاب رکھنے والی دوشیزہ اس طرح ریزہ ریزہ ہو کر کیوں بکھر رہی ہے؟ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ غلط انداز میں سوچ رہا ہے۔ انسان آخر انسان ہوتا ہے۔ قہقہوں کے ساتھ آنسو اور سکوت کے ساتھ فریادیں اس کی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہوتی ہیں۔ نرملا کی اشک ریزی نے اس کے انسان ہونے کا ثبوت پیش کیا تھا۔ اگر وہ اس طرح نہ روتی تو آفریدی کو نرملا کی ذات پر بھی کسی بے جان مجسمے کا گمان ہونے لگتا۔ "کہہ ڈالو نرملا! جو کچھ کہنا چاہتی ہو کہہ ڈالو۔" آفریدی نے ڈرتے ڈرتے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

نرملا کچھ دیر اسی طرح فرش پر سر رکھے بچوں کی مانند سسکتی رہی۔ پھر وہ سیدھی ہوئی اور اس نے علی عامر آفریدی کی طرف دیکھا۔ نرملا کی آنکھیں ویران تھیں مگر ان میں آنسوؤں کے سیلاب موجود تھے۔

"سردار! کسے معلوم کہ میرے دیس میں عورت کی حیثیت متاع کوچہ و بازار سے بھی کم ہے۔ ایک کسان اپنی بھیڑوں، بکریوں، گایوں اور بھینسوں کی نازبرداریاں کرتا ہے مگر عورت جانور کے مقام سے بھی گر گئی ہے۔ یہاں کے مرد روزانہ اپنی غرض کا قانون بناتے ہیں اور پھر اسے خود ہی توڑ دیتے ہیں۔ یہاں برہمن اور راجپوت مرد ہی برہما کی مخلوق میں شمار ہوتے ہیں۔ باقی یا تو کسی راکشس کی تخلیق ہیں یا پھر خود برہما نے انہیں پیدا کر کے اپنی مخلوق کے دائرے سے خارج کر دیا ہے۔ کاش! یہ ٹھکرائے ہوئے لوگ دھرتی کی کوکھ سے پیدا ہونے والے جھاڑ جھنکاڑ ہی ہوتے کہ تیز بارش کے بعد زمین سے اگنے لگتے اور پھر سر اٹھاتے ہی کسانوں کے ہل انہیں کچل دیتے یا حیوانوں کے بھوکے پیٹ انہیں اپنی خوراک بنا لیتے یا کسی آگ کا ایندھن بن جاتے۔ مگر افسوس! یہ تو خس و خاشاک بھی نہیں کہ ہوائیں ہی انہیں اڑا کر لے جاتیں اور یہ اپنی ذات کے رنج و الم سے نجات پا جاتے..........." نرملا کے ہونٹوں سے آگ برس رہی تھی..........

"یہ انسان بھی نہیں اور حیوان بھی نہیں۔ یہ وہ جاندار ہیں جو اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتے۔ انہیں موت کی تمنا میں کبھی سو برس جینا پڑتا ہے اور کبھی ساٹھ ستر سال۔ گردشِ تقدیر تو دیکھو کہ ان کی عمریں بھی طویل ہوتی ہیں۔ یہ مرنا چاہتے ہیں مگر اپنی خوشی سے موت کو بھی گلے نہیں لگا سکتے۔ انہیں زندہ رکھا جاتا ہے کہ اگر یہ شمشان کی بھینٹ چڑھ جائیں تو اونچی ذات والوں کے کام کون کرے گا اور انہیں سنسار کے سکھ کون پہنچائے گا؟"

"ان باتوں پر اپنا دل مت جلاؤ نرملا! یہ تفریق تو دنیا میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔" آفریدی نے ایک بار پھر نرملا کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ "چتوڑ کی تہذیب کے یہ انداز انوکھے نہیں ہیں۔ خدا کی پوری زمین ان

ہی ناہمواریوں کی شکار ہے۔"

"نہیں سردار! ایسا کہیں نہیں ہوتا۔" نرملا نے آفریدی کی منطق کو جھٹلا دیا تھا.......... "میری زمین کا موسم بھی نرالا ہے اور تہذیب بھی۔ آپ نے چتوڑ کے باسیوں کو ابھی دیکھا نہیں ہے۔ راج محل کے جھروکوں سے مظلوموں کی بستیوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اگر کبھی وقت آیا تو آپ دیکھیں گے کہ زمین پر رینگنے والے یہ کیڑے بھگوان کے چرنوں کو بھی نہیں چھو سکتے۔ ان کے سینوں میں بھی درد اٹھتا ہے اور صدیوں سے خشک آنکھوں کے دریاؤں میں بھی باڑھ آجاتی ہے۔ پھر یہ راندۂ درگاہ مخلوق دیوتاؤں کے چرنوں کو اپنے آنسوؤں سے دھونا چاہتی ہے مگر دیوتاؤں کے نزدیک ان کی آنکھوں سے بہنے والا پانی ناپاک ہے۔ سردار! یہ تو وہ بدنصیب ہیں کہ بھگوان بھی ان پر ستم ڈھاتے ہیں اور خود ان کے ہم جنس بھی۔ ان سے سب خفا رہتے ہیں کہ ان کی پیدائش ہی ایک گناہ ٹھہری ہے۔" نرملا کے دل کا غبار کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا۔ آندھیوں کا زور بڑھتا ہی جا رہا تھا اور نرملا کے ذہن کا ایک ایک گوشہ دکھوں کی گرد سے اٹ کر رہ گیا تھا۔

"راج کماری! اپنے ذہن سے ماضی کے نقوش کھرچ ڈالو۔ گزری یادیں روح کو پگھلانے اور دل کو جلانے کے سوا کچھ نہیں کرتیں۔" آفریدی مسلسل اس کوشش میں مصروف تھا کہ کسی طرح نرملا کو یادوں کے حصار سے باہر کھینچ لائے.......... مگر نرملا غموں کے اسی ایک دائرے میں گردش کر رہی تھی جس کے چاروں طرف آگ ہی آگ تھی۔

"اب جلنے کو باقی بھی کیا رہ گیا ہے سردار؟" نرملا کے لہجے میں وہی تپش تھی۔ "بچپن کے کچھ لمحے اس آگ سے محفوظ تھے لیکن میں نے انہیں بھڑکتے ہوئے الاؤ میں ڈال دیا۔ اب میری ہر سانس ایک شعلہ ہے اور اس شعلے کو بجھانے والا کوئی نہیں۔"

"میں بھی نہیں۔" آفریدی شدتِ اضطراب میں ایک نازک سا سوال کر بیٹھا۔

"ہاں سردار! تم بھی نہیں۔" نرملا کی باغیانہ روش توازن کی حدوں سے گزر چکی تھی.......... "یہ شعلے نرملا کی تنہا ذات کے شعلے نہیں کہ کسی غمگسار کے ہونٹوں سے ٹپکنے والی شبنم انہیں بجھا دے۔ رامیشوری جس آگ میں جل کر راکھ ہوئی ہے اسے کون بجھائے گا سردار؟"

آفریدی لرز کر رہ گیا۔ اس کے پاس نرملا کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"رامیشوری کی بدقسمتی کو میرے سوا کوئی نہیں سمجھتا تھا۔" نرملا پھر اس عورت کی طرف لوٹ گئی جو مٹی کا لباس پہنے باغ میں ابدی نیند سو رہی تھی.......... "سردار! اسے زندگی سے بہت محبت تھی۔ دنیا والوں کی نظر میں اس عورت کو زندہ رہنے کا حق نہیں جس کا جسم ہزار بار تقسیم ہوا ہو۔ پھر بھی وہ جینا چاہتی تھی اور جیون کی چاہت اسے ہمارے گھر تک لے آئی تھی۔ پتاجی نے اس کے ننگے سر کو آنچل بھی دیا اور سانس لینے کیلئے ایک محفوظ سائبان بھی۔ یہاں رہ کر رامیشوری کی اجڑی ہوئی آنکھوں نے پھر خواب دیکھنے شروع کئے۔ وہ اپنے دریدہ جسم کے باوجود یہ خواہش رکھتی تھی کہ کسی مرد کو اس کی پارسائی پر یقین آجائے۔ جبر و تشدد کے طوفان میں بہک جانے والا انسان گناہ گار نہیں ہوتا۔ رامیشوری بھی اسی وجہ سے اپنے آپ کو بے گناہ سمجھتی تھی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے چندر سنگھ نے بے گناہ سمجھ لیا.......... مگر جب شادی کا ذکر آیا تو چندر سنگھ کے خاندانی رسم و رواج نے رامیشوری کی محبت کو ڈس لیا۔ ایک بار پھر اس کے نا آسودہ بدن میں جدائی کا زہر پھیلنے لگا۔ چندر سنگھ اس نگری کی ریت سے مجبور تھا۔ ایک کم ذات عورت، ایک راجپوت زادے کی بیوی نہیں بن سکتی تھی۔ چندر سنگھ نے سماج کے اونچے لوگوں کا فیصلہ سنا اور سر جھکا کر

تسلیم کرلیا۔ وہ بہادر تھا مگر رسموں کی یلغار سے ڈر گیا پھر بھی اس نے جذبوں کی آبرو کو بچالیا۔ چندر سنگھ نے راجپوتوں کا فیصلہ مانا تو اپنا فیصلہ بھی ان پر نازل کر دیا کہ اس کی دلہن بنے گی تو رامیشوری.......... ورنہ وہ اکیلے ہی زندگی کے دن کاٹ دے گا۔ رامیشوری نے چندر سنگھ کو تنہائی کے عذاب سے بچانے کی کوشش کی اور اس کے راستے سے ہٹ جانا چاہتی تھی مگر چندر سنگھ غیرت مند بھی تھا اور سرکش بھی۔ اس نے رامیشوری سے صاف صاف کہہ دیا کہ آگے پیچھے تمام راستے بند ہیں۔ زندگی کے اسی برزخ میں ان دونوں کو زندہ رہنا ہوگا۔ وہ برسوں سے اسی کشمکش میں زیست بسر کر رہے تھے کہ سردار آپ آپہنچے۔ دونوں اپنا دھرم بدل کر رسمیں بدل جانے کی خوشی منا رہے تھے کہ انہیں موت کھا گئی۔ "

"راج کماری! آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ چندر سنگھ اس دنیا میں موجود نہیں۔ " آفریدی نے حیران ہو کر نرملا سے سوال کیا۔

"رامیشوری کی موت نے مجھ سے سرگوشیاں کی ہیں کہ چندر سنگھ بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ " نرملا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ "اگر چندر سنگھ زندہ ہوتا تو رامیشوری کبھی نہ مرتی۔ میں اس بدنصیب عورت کو جانتی ہوں کہ اس کی محبت عجیب محبت تھی۔ چندر سنگھ کے جسم پر ایک خراش لگتی تو وہ اپنے بدن پر دو خراشیں سجالیتی۔ چندر سنگھ بیمار پڑتا تو رامیشوری بھی بستر پر دراز ہو جاتی۔ اس کا دل چندر سنگھ کے ہر لمحے کا رازدار تھا۔ جب رامیشوری کا دل بجھا ہے تو پھر چندر سنگھ کا دل بھی بجھ گیا ہوگا۔ "

عجیب داستانِ فراق و وصال تھی۔ بیان کرنے والا بھی رویا اور سننے والا بھی۔ کچھ دیر تک فضاؤں میں خاموشیوں کی حکمرانی رہی۔ پھر بھی اس سکوت کے عالم میں نرملا کے آنسوؤں کی چاپ سنائی دیتی تھی جسے صرف آفریدی ہی سن سکتا تھا۔

"اگر رامیشوری کے ساتھ انصاف ہو بھی جاتا تو ان ہزاروں عورتوں کا مداوا کون کرتا جو تمہارے آنے سے پہلے ہی مردوں کے تعمیر کردہ جہنم کا ایندھن بن گئیں۔ " ایک طویل وقفۂ سکوت کے بعد نرملا دوبارہ بولنے لگی تھی۔ آفریدی کیا جواب دیتا۔ خاموشی سے سنتا رہا۔

"یہاں کی عورت بھی کیسی ستم رسیدہ ہے کہ اگر مرد خوش ہوا تو اسے تمام عمر کیلئے داشتہ بنایا اور ناراض ہوا تو جوئے کی بازی میں ہار دیا۔ مرد زندہ ہے تو وہ پیروں کی جوتی اپنی ادھڑی ہوئی کھال کے ساتھ سانسیں لیتی رہتی ہے.......... اور جیسے ہی مرد رخصت ہوا عورت پر زندگی کے سارے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ راجستھان کے راجاؤں میں انہیں سب سے زیادہ عزت مآب تسلیم کیا گیا ہے جن کی بیویوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔ داسیوں اور رکھیلوں (داشتاؤں) کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ "

" آفریدی کسی پتھر کے مجسّمے کی طرح ساکت بیٹھا ہوا چتوڑ کی عورت کا فسانۂ الم سن رہا تھا۔

"سردار! یہ کیسا قانون ہے کہ مرد کے ساتھ اس کی تمام بیویاں اور کنیزیں بھی جل جانے پر مجبور ہیں ان کا وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ ان سے کوئی دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ ان پر خوشی کی ہر تقریب حرام ہوتی ہے۔ " نرملا نے اس الم انگیز کہانی کا ایک اور ورق الٹ دیا تھا۔

"یہاں مرد ہی سب کچھ ہے۔ زندگی میں اس کی شان و شوکت کا اندازہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ وہ سیکڑوں عورتوں کا مالک تھا.......... اور مرنے کے بعد اس کا مقام طے کرنے کیلئے ان عورتوں کی ہڈیوں کا شمار کیا جاتا ہے جو اس کے ساتھ جل کر راکھ ہوئی تھیں۔ اگر وہ ہڈیاں تعداد میں زیادہ ہیں تو مرنے والا بہت بڑا آدمی تھا۔ " یہ کہتے کہتے نرملا نے آفریدی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی اشکبار تھیں مگر ہونٹوں پر اچانک ایک ایسی مسکراہٹ ابھر آئی تھی جس کے پیچھے چھپی ہوئی نفرتوں اور تلخیوں کا کوئی حساب

نہیں تھا.......... "سردار! میری طرف دیکھو! میں اس دیس کی رہنے والی ہوں جہاں مردوں کی بڑائی ثابت کرنے کیلئے عورتوں کی راکھ کے انبار اور ہڈیوں کے ڈھیر پیش کئے جاتے ہیں۔ "

آفریدی نرملا کے اس طرزِ تخاطب کا کیا جواب دیتا ؟ شرم و ندامت کے پسینے میں نہا گیا کہ آخر وہ بھی ایک مرد تھا۔ "راج کماری! کیا تم راجپوت مردوں کی وحشیانہ روش کا انتقام مجھ سے لینا چاہتی ہو۔ " آفریدی نے زبان کھولی مگر اس کا لہجہ بہت نرم تھا۔

"نہیں! ہرگز نہیں۔ " نرملا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا.......... "میں اور آپ سے انتقام ؟ کیسی انہونی بات ہے اور کیسا بھیانک تصور ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال بھی کیوں آیا ؟" نرملا جوشِ اضطراب میں کانپنے لگی۔ "میں نرملا کماری' وکرم سنگھ چوہان کی بیٹی جس نے اپنا عقیدہ' اپنی ہر تمنا' اپنا ہر جذبہ اور اپنا ہر اعتبار آپ کے حوالے کر دیا۔ پھر آپ مجھ سے دنیاداروں کے لہجے میں بات کرتے ہیں۔ سردار! اگر میری ذات کے حوالے آپ کے دل پر گراں ہیں تو میں خاموش ہوئی جاتی ہوں۔ "

"میں ایک مرد ہوں راج کماری! اپنے ہم جنسوں کی بیدادگری کے فسانے سن کر مجھے شرم آنے لگی ہے۔ گناہ کس نے کئے اور سر کس کا جھکا ؟ بڑی عجیب بات ہے' بہت ہی عجیب۔ " آفریدی کا لہجہ انتہائی سوگوار ہو گیا تھا۔ "میں خود بھی بہت شکستہ ہوں نرملا! مجھ سے روشنی کی باتیں کرو۔ اگر تم اسی طرح اندھیروں کا ذکر کرتی رہیں تو میں ایک دن کسی دیوار سے ٹکرا کر مر جاؤں گا۔ "

"نہیں سردار! آپ بہت دن زندہ رہیں گے۔ " یکایک نرملا کا گلاب رنگ چہرہ سرخ ہو گیا..........

"میں نے اپنی عمر بھی آپ کے نام کر دی ہے۔ چتوڑ کی سیاہ راتوں کے قصے اس لئے سنا رہی ہوں کہ وقت بہت کم ہے۔ کون جانے کب میری سانسوں کی رفتار تھم جائے۔ اگر میں دنیا سے اٹھ گئی تو راجستھان کی عورت کی داستان ادھوری رہ جائے گی۔ میرے بعد اس خوں چکاں حکایت کو سنانے والا کوئی نہیں آئے گا۔ میں جانتی ہوں کہ میرے بعد مجلسوں کی رونق بہت زیادہ ہوگی۔ نئے نئے راوی ہوں گے جو بڑے دلکش انداز میں نئے نئے قصے سنائیں گے۔ مگر وہ سب کے سب مردوں کی فتوحات کے فسانے ہوں گے جشنِ تسخیر کے ہنگاموں میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ہوگی کہ وہ راکھ کے ڈھیروں کی طرف دیکھ کر ان عورتوں کے بارے میں سوچے جو ہوس و تشدد کی آگ میں جل بجھیں۔ " نرملا کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گئی اور علی عامر آفریدی کی طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے اس کی اداس آنکھوں میں شکایتوں کے سوا کوئی دوسرا رنگ موجود نہ ہو۔

آفریدی کا احساسِ ندامت پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا نرملا نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا.......... "یہ داستانِ الم کا آخری باب ہے سردار! اسے اور سن لو کہ پھر اس کے بعد تو سکوت ہی سکوت ہے' خاموشی ہی خاموشی ہے.......... " ایک بار پھر نرملا کے لہجے سے دل کا درد جھلکنے لگا تھا.......... "قہر سا قہر ہے کہ ایک با اثر مرد ایک کمزور عورت کو بے آبرو کر دے اور چتوڑ کے سارے قوانین اندھے ہو جائیں کوئی منصف' کوئی عادل اس حیا سوز منظر کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہ کرے۔ کسی عدالت کا دروازہ نہ کھلے.......... اور جب کوئی فیصلہ ہو تو عورت ہی مجرم ٹھہرے۔ پھر دریاؤں کے کنارے تماشائیوں کی بھیڑ جمع ہو' پھر چتا سلگائی جائے اور پھر اس نامراد عورت کو بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ڈال دیا جائے۔ گناہ گار تو وہ مرد بھی تھا جو اس مجبور و معصوم عورت کو کوچۂ بے حیائی تک لے گیا تھا۔ پھر اسے کسی نے سزا کیوں نہیں دی ؟ مقتل مرد نے سجایا' ذبح عورت کی گئی۔ دونوں گناہ گار تھے۔ مگر قانون نے ایک کو بچالیا۔ اس سیاہ بخت عورت کی بکھری ہوئی ہڈیوں سے کون پوچھے کہ تیری ہی حیا کا آبگینہ ٹوٹا اور تیرے

ہی جسم کو نذر آتش کر دیا گیا۔ میں جانتی ہوں سردار علی عامر آفریدی کہ وہ عورت اس شکستگی کے بعد بھی جینا چاہتی تھی.......... " نرملا کا لہجہ اچانک شرربار ہو گیا تھا اور اس طویل عرصے میں اس نے پہلی بار آفریدی کو اس کا نام لے کر مخاطب کیا تھا۔ "میں نے ایسی کئی لڑکیوں کی چیخیں سنی ہیں جو آگ کے حوالے کئے جانے سے پہلے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیسا اذیت ناک منظر ہو گا' جب ان معصوم لڑکیوں نے اپنی لڑکھڑاتی زبانوں سے یہ الفاظ ادا کئے ہوں گے۔

"ہماری جانیں بخش دو کہ ہم عزت کے لباس اور آبرو کے آنچل کے بغیر بھی جی لیں گے۔ سردار! ایسی بھیک تو کسی نے کسی سے نہیں مانگی ہو گی۔ یہ غیرت مند راجپوت جن کی جھولیاں شجاعت و مردانگی کی دولت سے بھری ہوئی ہیں' اس وقت کیسے تہی دامن ہو جاتے تھے' کوئی نہیں جانتا۔ " نرملا کی آنکھوں میں پھر اشکوں کا سیلاب آ گیا تھا۔

"اور سردار! کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ چتوڑ کے داتاؤں نے بیواؤں کو اپنے رحم و کرم سے بھی نوازا ہے۔ کچھ عورتوں کو ان کے شوہروں کے ساتھ جلانے کے بجائے زندہ چھوڑ دیا جاتا تھا۔ وہ بڑے حیران کن لمحات ہوتے تھے کہ بظاہر "ستی" کی رسم ٹوٹتی نظر آتی تھی مگر ایک دن یہ بھیانک راز فاش ہو جاتا تھا کہ ان عورتوں کو زندہ کس لئے چھوڑا گیا ہے۔ چتا کے شعلوں سے بچا کر انہیں ایک دوسری آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔ پوری بستی میں ان بیوہ عورتوں سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے گھر کی چھت کے نیچے سو نہیں سکتی تھیں یہاں تک کہ اپنی بھوک مٹانے کیلئے انہیں روٹی کا ایک ٹکڑا بھی میسر نہیں ہوتا تھا۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے سکھوں کو ترسی ہوئی عورتیں کچھ دن بھوک کا عذاب بھی جھیل لیتی تھیں کہ شاید کسی کا مہربان ہاتھ ان کے آگے گایوں اور بھینسوں سے بچی ہوئی پھپھوند زدہ روٹی کے سوکھے ٹکڑے ڈال دے.......... مگر یہ انتظار بھی کسی دیوانے کے خواب سے کم نہیں ہوتا تھا.......... اور جب یہ خواب ٹوٹ کر بکھرتا تو دریاؤں میں ان بیوہ عورتوں کی لاشیں نوکیلے پتھروں سے ٹکراتی ہوئی نظر آتیں۔ اگر ان بدنصیبوں کو یہ معلوم ہوتا کہ بھوک کی آگ چتا کی آگ سے زیادہ اذیت ناک ہے تو وہ زندگی کی بھیک کبھی قبول نہ کرتیں۔ "

"خدا کیلئے اس فسانے کو ختم کر دو کہ اب مجھ میں سننے کی تاب نہیں ہے۔ " مرنے والوں کا کردار ہی ایسا تھا کہ اہل دل اپنے ہوش کھو بیٹھتے تھے۔ آفریدی کی قوت برداشت بھی جواب دے گئی تھی۔

"انہیں بس عورت کو جلانا آتا ہے۔ " نرملا نے آفریدی کی التجا کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا..........

"افلاس کی دھجیاں لپیٹ کر جلے یا قبائے زر نگار پہن کر.......... جلنا عورت ہی کو ہے.......... چتوڑ کے محافظوں نے عورت کو جلانے کیلئے کیسے کیسے انداز تراشے ہیں ؟ کوئی راجہ یا منتری مرتا ہے تو اس کی سیکڑوں بیویوں کو دلہن کی طرح سجایا جاتا ہے۔ دولت و اقتدار کا مظاہرہ کرنے کیلئے ان مظلوم عورتوں کو بہترین نسل کے گھوڑوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ خوشی کے ساز بجتے ہیں جیسے راجپوت سورماؤں نے جگ جیت لیا ہو اور پھر ان ہی سازوں کے شور میں وہ تن پھونک دیئے جاتے ہیں جو پھولوں سے بھی زیادہ کومل ہوتے ہیں۔ " راجپوت عورت کی ہلاکتوں' محرومیوں اور رسوائیوں کا فسانہ ختم ہو گیا تھا اور نرملا' آفریدی سے معذرت طلب کر رہی تھی۔ "مجھے معاف کرنا سردار کہ میں آپ کے سکون میں خلل انداز ہوئی مگر کیا کرتی ؟ آپ کے سوا میرا کوئی ہے بھی تو نہیں کہ جس کے آگے دل کا بوجھ ہلکا کر سکوں۔ میں نے اپنی بچھڑ جانے والی تمام سہیلیوں کے رازوں سے پردہ ہٹا دیا۔ شاید میری یہ گفتگو آداب رازداری کے خلاف ہو میں نے خوب سوچ سمجھ کر یہ امانت اس شخص کو منتقل کی ہے جو میری نظر میں بہت بڑا امین ہے۔ صدیوں سے جلنے والی

ساری عورتیں میری سہیلیاں تھیں۔ وہ شودر ہوں یا برہمن یا میری ہم نسل راجپوت۔ ان سب کا مجھ سے ایک ہی رشتہ تھا کہ وہ میری اپنی تھیں۔ میں اقتدار میں رہنے کے باوجود ان کے کسی کام نہ آ سکی۔ اب امید کی ایک کرن پھوٹی ہے کہ جور و ستم کے گلشن میں جتنے پھول باقی رہ گئے ہیں شاید انہیں علاءالدین خلجی کا لشکر جلنے سے بچا لے۔ اگر سلطان نے اس وحشیانہ رسم کو بدل ڈالا تو میں اس کی عظمتوں کو سلام کروں گی۔ خود بارگاہِ شاہ میں حاضر ہو کر اس کی بلندیوں کا ترانہ پڑھوں گی۔ وہ میری زندگی کا سب سے دلکش اور نشاط انگیز دن ہو گا جب چتوڑ کی کنواریاں اپنے چندر ما جیسے مکھڑوں پر گھونگھٹ ڈالیں گی' جب بسنتی ہوائیں مدھر راگ چھیڑیں گی' جب پن گھٹوں کی ناراض بہاریں واپس لوٹ آئیں گی اور چھلکنے والی کوری گگریاں کسی جابر و ہوس کار کے پھینکے ہوئے پتھر کی ضرب سے محفوظ رہیں گی۔ " نرملا کے چہرے پر کسی بچے کی طرح حسرت و ارمان مچل اٹھے تھے۔

"ایسا ہی ہو گا نا سردار ؟ " نرملا اپنے معصوم خوابوں کی تعبیر جاننے کیلئے آفریدی سے ہم کلام ہوئی۔

"ایسا ہی ہو گا راج کماری! " آفریدی نے اپنے ان اشکوں کو پیتے ہوئے کہا جو دوبارہ اس کے دامن کو بھگونا چاہتے تھے۔

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو جائے۔ " نرملا کماری نے شدید حسرت کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑتے ہوئے کہا۔ "ان عذاب ناک سوچوں کا سلسلہ کہیں تو ختم ہو۔ کوئی تو اپنے دستِ کرم سے قہر کے ان سفاک مناظر کو قتل کر ڈالے۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی تو ہو۔ " کمرے کی فضا نرملا کی سرد آہوں سے ایک ماتم کدہ بن کر رہ گئی تھی۔

"خدا کی زمین بہت وسیع ہے راج کماری! وہ لوگ ہندوستان کے گوشے گوشے سے نکل کر چتوڑ کی وادیوں میں سمٹ رہے ہیں۔ عنقریب تم اپنے حسرت زدہ خوابوں کی زندہ تعبیر دیکھ سکو گی۔ " علی عامر آفریدی اس طوفان کی تباہ کاریوں کے اثرات کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے نرملا کے دل و دماغ کی دیواروں سے ٹکراتا ہوا گزرا تھا۔

نرملا' آفریدی کی طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے اس کے خیالات کہیں دور بھٹک رہے ہوں۔

"سردار! تمہارے یہاں تو عورت کے ساتھ یہ بہیمانہ سلوک نہیں ہوتا۔ " نرملا نے اچانک ایک عجیب سوال کر ڈالا تھا۔ "تمہارے یہاں کی عورت اتنی حقیر اور غمزدہ تو نہیں کہ شوہر کے برابر اس کی قبر بھی کھودی جاتی ہو اور اسے بھی فریاد و فغاں کے شور میں زندہ درگور کر دیا جاتا ہو ؟ "

آفریدی چند لمحوں کیلئے سہم سا گیا۔ نرملا کے سوال پر اسے حضرت امیر خسروؒ کے وہ اشعار یاد آنے لگے جو انہوں نے اپنی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھے تھے۔

"کاش! تم پیدا نہ ہوتیں۔ ۔ اگر پیدا ہوتیں تو بیٹی کے بجائے بیٹا ہوتیں لیکن خدا کے حکم کو کون ٹال سکتا ہے۔ آخر میرے باپ بھی تو عورت سے پیدا ہوئے اور میری ماں بھی تو آخر ایک عورت ہی تھیں۔ "

آفریدی کے دل میں ایک حشر سا برپا تھا اور ذہن میں امیر خسروؒ کے اشعار تلاطم پیدا کر رہے تھے۔ حضرت امیر خسروؒ نے ہندوستانی عورت کی حالت زار بیان کرتے ہوئے اپنی بیٹی کو نصیحت کی تھی۔

"خبردار! چرخہ کاتنا نہ چھوڑنا اور کبھی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر نہ جھانکنا عافیت کے دروازے میں پاؤں رکھ' چہرہ دیوار کی طرف کر اور اپنی پشت جھروکے سے موڑ لے۔ "

آفریدی کچھ دیر کیلئے تصورات کی موجوں میں بہتا ہوا بہت دور نکل گیا تھا۔ یکایک نرملا نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "سردار آپ کیا سوچ رہے ہیں ؟ " نرملا کے لہجے میں وہی خلش تھی۔ "کیا آپ کے یہاں

بھی عورت اتنی ہی مظلوم ہے ؟" نرملا نے اپنا وہی نازک ترین سوال دُہرایا تھا۔

آفریدی نے اپنے منتشر خیالات پر قابو پالیا اور پُراعتماد لہجے میں کہنے لگا۔ " معاذ اللہ! مسلمان اس قدر سنگدل کیسے ہو سکتا ہے۔ اسلام تو انسانی پستیوں کی ناہمواریاں دور کر کے مساوات قائم کرنے آیا ہے ہم نے عورت کو لعنت و محرومی کی پستیوں سے نکال کر اپنے برابر کھڑا کیا ہے۔ "

" خدا کرے ایسا ہی ہو۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ " نرملا' آفریدی کی باتیں سن کر بچوں کی طرح اپنی خواہش کا اظہار کرنے لگی۔ " کاش! میری آنکھیں یہ منظر دیکھ سکیں اور میں اپنے دلِ وحشی سے کہہ سکوں کہ اب تو انسانیت پر اعتبار کر لے۔ "

" راج کماری! کیا تمہیں میری باتوں پر شک ہے ؟ " آفریدی نے بڑے اداس لہجے میں پوچھا۔

"نہیں سردار! " نرملا جذباتی ہو کر رونے لگی۔ " تم سچے' تمہارا مذہب سچا مگر میں اپنی چشمِ گناہ گار کو کیا کروں جو عورتوں کی ذلت و بربادی کے مناظر دیکھتے دیکھتے پتھرا گئی ہیں۔ اب یہ آنکھیں سکون و آبرو کا دھندلا عکس دیکھنے کے بھی قابل نہیں رہیں۔ دلِ بے اعتبار کو کیا کروں ؟ یقین ہی نہیں آتا کہ اس دنیا کے کسی خطے میں عورت محترم بھی ہو سکتی ہے۔ " نرملا کی مایوسی ناقابل بیان تھی۔

" نرملا! بس کچھ دن اور۔ کشمکشِ انتظار ختم ہوا چاہتی ہے۔ عنقریب میں تمہیں وہ مناظر دکھاؤں گا کہ تم اہل وفا سے راضی ہو جاؤ گی۔ " آفریدی کی پلکیں پھر نم ہونے لگی تھیں۔

" کاش! وہ دن میری زندگی میں آجائے۔ " نرملا کے اشکوں کی روانی کچھ اور بڑھ گئی۔ " دن تو کیا سردار! بس ایک ہی لمحہ میرا مقدر بن جائے۔ میں اسی پر قناعت کر لوں گی۔ ماہ و سال سے بہلنے والے کوئی اور ہوں گے۔ مجھے تو صرف ایک ساعت چاہئے۔ میں اسی ساعت سے مطمئن ہو جاؤں گی۔ "

" راج کماری تم اپنی زندگی کے سفر میں منزل سے اتنی مایوس کیوں ہو ؟ " آفریدی' نرملا کی ہمت شکن باتیں سن کر پریشان نظر آنے لگا تھا۔

نرملا نے اداس نگاہوں سے آفریدی کی طرف دیکھا اور کچھ سوچنے لگی۔ "ہاں سردار! میں اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی ہوں۔ " نرملا کا لہجہ بہت تھکا تھکا سا تھا۔ "اگر زیادہ دیر ہو گئی تو شاید میں اپنے خوابوں کی تعبیر نہ دیکھ سکوں۔ اب آنے والوں کو آجانا چاہئے کب تک راہ دکھائیں گے۔ "

" آنے والے تو آ چکے مگر تم جانے کی باتیں کیوں کرتی ہو ؟ " آفریدی بہت زیادہ دلگرفتہ ہو گیا تھا۔

" سردار! میں نے اپنے دل کے سارے بوجھ اتارنے میں عجلت سے کام لیا ہے۔ " اچانک نرملا کی آنکھوں میں شناسائی کا ایک عجیب سا رنگ ابھر آیا تھا۔ " میرے پاس وقت بہت کم ہے اس لئے وہ راز بھی سن لیں جس نے مجھے زندگی سے مایوس کر دیا ہے۔ " یہ کہتے کہتے نرملا کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور آنکھوں میں جلنے والی محبت کی قندیلیں آہستہ آہستہ بجھنے لگیں۔

" میری پیدائش سے پہلے راج جیوتشی نے پتاجی کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ کسی لڑکے کے باپ نہ بن سکیں گے۔ ایک لڑکی پیدا ہو گی جس کے دنیا میں آتے ہی ماں کا انتقال ہو جائے گا۔ راج جیوتشی کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ پتاجی نے میرے مستقبل کے بارے میں پوچھا تو جواب دیا گیا کہ لڑکی مسلسل عذابوں کا شکار رہے گی۔ "

" کیا تم نجومیوں کی پیش گوئیوں پر اعتبار کرتی ہو ؟ " آفریدی نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

" ہندو مذہب کے ماننے والے تو جیوتشی کے مشورے سے پہلے کوئی کام ہی نہیں کرتے۔ اس لئے میرا

متاثر ہو جانا بھی فطری امر تھا۔ ماں کی موت' پھر باپ کا زوال اور ان پر ٹوٹنے والے قہر و ستم نے مجھے یقین دلا دیا ہے کہ راج جیوتشی ٹھیک ہی کہتا تھا۔ " نرملا کا لہجہ افسردہ تھا اور چہرے پر مایوسیوں کا دھواں پھیلتا جا رہا تھا۔

" یہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔ " آفریدی نے نرملا کے ذہن سے توہم پرستی کا غبار صاف کرنے کی کوشش کی۔

نرملا نے آفریدی کے سوال کا جواب کوئی نہیں دیا اور اپنی گفتگو کا تسلسل برقرار رکھا۔ " میں بچپن سے ایک خواب دیکھتی آرہی ہوں۔ یہ بڑا بھیانک خواب ہے جو مسلسل میرا پیچھا کر رہا ہے۔ اس خواب نے کبھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ کبھی روزانہ اور کبھی دوسرے تیسرے دن۔ میں وہ لرزہ خیز منظر ضرور دیکھتی ہوں جب ایک سیاہ فام شخص میرا تعاقب کر کے مجھے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ پھر وہ مجھے تیز خنجر سے ذبح کرتا ہے۔ میں اپنے قتل ہونے کا منظر خاموشی سے دیکھتی رہتی ہوں۔ وہ بدصورت شخص میرے جسم کے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ میری آنکھیں نکالنے کیلئے مجھ پر جھک جاتا ہے۔ جیسے ہی اس کا خنجر میری آنکھوں کے قریب پہنچتا ہے میں چیخ اٹھتی ہوں اور اس شخص کو پہچان لیتی ہوں۔ " اپنا خواب بیان کرتے ہوئے نرملا کا جسم کسی کمزور شاخ یا زرد پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔

" نرملا! وہ کون شخص ہے ؟ " آفریدی جوشِ اضطراب میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اس کی حالت بھی نرملا کی طرح غیر ہوتی جا رہی تھی۔

" جسم کے ٹکڑے ہوتے وقت میں اس شخص کو نہیں پہچانتی مگر جب وہ میری آنکھیں نکالنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی شکل مہاراج رام دیو کے چہرے میں ڈھل جاتی ہے۔ "

نرملا کے خواب نے علی عمر آفریدی کو ایک ناقابل بیان اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ بہت دیر تک اسے محسوس ہوتا رہا جیسے اعصاب شل ہو گئے ہوں اور وہ قوت گویائی سے محروم ہو گیا ہو۔ اس دوران نرملا بھی آفریدی کی خاموشی کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر جب آفریدی کے ہونٹوں کو کسی انداز سے جنبش نہیں ہوئی تو خود اس نے کلام کر کے اس تکلیف دہ سکوت کو توڑا۔

" سردار! یہ میرا خواب ہے' میرے غموں کا ایک تاریک منظر' میرے انجام کا ایک دھندلا سا نقش' میری جانب تقدیر کا ایک مبہم اشارہ' آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں ؟ " نرملا نے اپنے لہجے کو خوشگوار بنانے کی ایک ناکام سی کوشش کی۔

" بے شک! تمہارے خوابوں سے میرا کوئی تعلق نہیں مگر سوچتا ہوں کہ جب کوئی رشتہ ہی نہیں تو سنانے والے نے مجھے اپنا خواب سنایا کیوں تھا ؟ " آفریدی نے اداس نظروں سے نرملا کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ نرملا کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ " وہ خواب اس لئے سنایا تھا کہ آپ کے سوا اب میرا کوئی رازدار نہیں۔ جب تک پتاجی قریب رہے انہیں اس خواب کے بارے میں بتاتی رہی۔ " نرملا نے بڑی سادگی سے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی اور ایک نازک سے اشارے میں آفریدی کو سمجھا دیا تھا کہ وہ اس کی زندگی میں کیا مقام رکھتا ہے۔

" رازداں کا درجہ دینے کے بعد یہ نصیحت کیوں کی جاتی ہے کہ میں پریشان ہونا چھوڑ دوں۔ " آفریدی کی زبان پر حرفِ شکایت ابھر آیا۔ " چندر سنگھ کے زخم کی خلش صرف رامیشوری محسوس کر سکتی ہے ؟ کیا وہ اس زمین پر آخری عورت و مرد تھے جو وفا کی رسمیں نبھا کر دنیا سے چلے گئے۔ کیا کوئی دوسرا انسان اس قدر حساس نہیں ہو سکتا ؟ " آفریدی نے بڑے عجیب انداز میں اپنے جذبوں کا اظہار کیا تھا۔

نرملا کا احساس جاگا تو اس کے چہرے پر شرم و حیا کے ساتھ خجالت کا رنگ بھی ابھر آیا۔ ”میں نے یہ نہیں کہا کہ رامیشوری اور چندر سنگھ محبت و وفا کا آخری پیکر تھے ؟“

”پھر ساری دنیا سے یہ بے اعتباری کیوں ؟“ آفریدی نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے ایک نیا سوال کر دیا۔

”دنیا میرے معیار پر پوری نہیں اتری۔“ نرملا دوبارہ اپنے خول میں واپس جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”دنیا نے اپنی وفاشعاری کا ثبوت فراہم نہیں کیا۔ جب بھی آزمائش کا وقت آیا اس نے مجھ سے منہ موڑ لیا۔ پھر کوئی کسی پر کیوں اعتبار کرتا ؟“

آفریدی الجھ کر رہ گیا۔ وہ نرملا کے سامنے لاجواب ہوتا جا رہا تھا۔ پھر بھی اس نے منطق کا سہارا لینا چاہا۔

”اگر کسی ایک شخص کو آنکھیں نہیں ملیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ساری دنیا تاریک اور ہر شے بے نور ہے۔“

”روشنی کا اپنا کوئی بھی اصول ہو لیکن وہ دیکھنے کی چیز ہے۔“ نرملا بھی ایک طاقتور دلیل پیش کر رہی تھی۔

”جب آنکھوں سے محروم شخص اجالے کی کوئی کرن نہیں دیکھ سکتا تو پھر وہ روشنی کے وجود پر گواہی بھی نہیں دے سکتا۔“

”اسے گواہی دینا چاہئے۔“ آفریدی کا لہجہ پرجوش تھا۔ ”اسے بہ آواز بلند کہنا چاہئے کہ میری تاریک دنیا کے باہر سورج موجود ہے‘ ستارے چمک رہے ہیں اور چاند روشنی تقسیم کر رہا ہے۔“

”آخر آپ کی یہ ضد کیوں ہے کہ ایک نابینا انسان روشنی کے ترانے گاتا رہے ؟“ نرملا نے سوال کیا۔

”اس لئے کہ روشنی روشنی ہے۔ انسان کو اسی کے خواب دیکھنے چاہئیں۔ کیا خبر کب کوئی روشنی کی لکیر آنکھوں پر اترے اور مقدر کے اندھیروں کو مٹاتی چلی جائے۔“ آفریدی‘ نرملا کو محرومیوں کے حصار سے باہر نکالنے کیلئے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ ”اعلیٰ ظرفی یہ ہے کہ خود دکھی ہو مگر دوسروں کیلئے خوشیاں مانگے۔“

”آخر آپ مجھے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں ؟“ نرملا یکایک بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ ”اگر میں کم ظرف ہوں تو مجھے اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے۔ میں نے کب کسی اعلیٰ ظرف سے اپنی زندگی کی بھیک مانگی تھی۔“ نرملا کے چہرے پر جھنجلاہٹ اور غصے کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔

”یہاں کوئی کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔ سب کے سب تقدیر کے آلۂ کار ہیں۔ قسمت جو چاہتی ہے وہی کام ان سے کرا لیتی ہے۔“ آفریدی کا لہجہ بھی قدرے تلخ ہو گیا تھا۔ ”اگر تمہارا اشارہ میری طرف ہے تو میں خود حالات کے بھنور میں رقص کرنے والا ایک حقیر سا تنکا ہوں۔ میں کسی کی غم خواری کیا کر سکتا ہوں ؟ میں نے تو راج جیوتشی کی پیش گوئی پر اعتراض کیا تھا اور تمہیں اس کائنات کی ایک پوشیدہ حقیقت بتانے کی کوشش کی تھی کہ آسمانوں کی وسعت میں تیرتے ہوئے ستارے انسانی مقدر پر اثرانداز نہیں ہو سکتے۔ وہ خود بے دست و پا ہیں‘ کسی کے حکم کے محتاج۔ ستاروں کی گردش ان کے اپنے اختیار میں نہیں۔ پھر وہ تمہاری تقدیر کا فیصلہ کس طرح کر سکتے ہیں۔ یہ محض اتفاق تھا کہ تم پیدائش کے بعد اپنی ماں کی آغوش سے محروم ہو گئیں۔ پھر وقت نے ایک اور کروٹ لی اور تمہارے باپ بھی تم سے بچھڑ گئے۔ بے شک! یہ بڑی آزمائش تھی مگر ستاروں کا اثر نہیں تھا۔ پھر چندر سنگھ اور رامیشوری رخصت ہوئے تو تمہیں راج جیوتشی اور بھی سچا نظر آنے لگا۔ حالانکہ وہ ازلی جھوٹا ہے۔ اسے اپنی ذات کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تو وہ تمہارے مستقبل کی کیا خبر دے گا ؟“ آفریدی کی آواز بلند تھی اور لہجہ تلخ تھا۔

اس دوران نرملا نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر آفریدی نے اسے سختی سے جھڑک دیا۔ ”میں مہامنتری وکرم سنگھ چوہان کی بیٹی راج کماری نرملا سے گفتگو نہیں کر رہا ہوں۔ میرے مخاطب اس طلسم کدے کے پتھر ہیں اور میں ان ہی پتھروں کو اپنی تقریر سنا رہا ہوں۔ راج جیوتشی تو یہ بھی کہتا تھا کہ چتوڑ ہمیشہ امن و عافیت کے سائے میں سرسبز و شاداب رہے گا اور کوئی دشمن اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ مگر تم زیر زمین قید ہوتے ہوئے بھی محسوس کر رہی ہو کہ چتوڑ کی آزادی و خوشحالی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ چتوڑ کے جس دشمن کو منتروں اور جاپوں کی مدد سے ہلاک کر دینے کے دعوے کئے گئے تھے وہ اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ آ پہنچا ہے۔ اسے نہ ستاروں کی چالیں روک سکیں اور نہ صدیوں سے خدائی کا روپ دھارنے والے پتھر کے مجسمے۔ وہ آیا اور اس طرح آیا کہ اس کے ایک ہاتھ میں زنجیر غلامی ہے اور دوسرے ہاتھ میں موت کا زہر آلود جام۔ اب دیکھیں کہ اہل چتوڑ کس کا انتخاب کرتے ہیں ؟ اپنے پاؤں آگے بڑھاتے ہیں یا لرزتے ہوئے ہاتھ ؟“ آفریدی اس بات سے بے نیاز ہو کر بول رہا تھا کہ اس کے لفظوں کی نشترزنی سے نرملا کے دل و جگر کٹتے ہیں یا اس کی روح پر جراحتوں کے نشان ابھرتے ہیں۔ ”چتوڑ کے حکمرانوں‘ سیاستدانوں‘ جادوگروں‘ نجومیوں اور جوگیوں نے بھی کچھ خواب دیکھے تھے مگر سارے کے سارے خواب باطل ثابت ہوئے۔ ان کا گیان ان ہی کے منہ پر الٹ دیا گیا اور ان کے خواب ان ہی کی کھلی آنکھوں کے سامنے ریزہ ریزہ کر دیئے گئے اب بھی اگر تمہیں اپنے خوابوں کی سچائی پر یقین ہے تو انہیں سینے سے لگا کر یہاں سے نکل جاؤ اور راج جیوتشی سے پوچھو کہ تمہارا مستقبل کیا ہے ؟“ یہ کہہ کر آفریدی چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا اور نرملا کماری کی طرف دیکھنے لگا جو دم بخود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے ذہن کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی یہ تصور موجود نہیں تھا کہ آفریدی کا لہجہ اس قدر تلخ اور سرکش بھی ہو سکتا ہے۔

دونوں طرف گہرا سکوت تھا۔ آفریدی کچھ دیر تک نرملا کا اداس چہرہ دیکھتا رہا اور پھر اپنے کمرے میں جانے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی تنہائی کا رازدار بنایا۔“ آفریدی جاتے جاتے اچانک مڑا اور نرملا کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”اگر عمر نے وفا کی اور وقت میری گرفت میں آ گیا تو آپ کے اس احسان کا قرض بھی اتار دوں گا۔“ آفریدی‘ نرملا کو تنہا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆..................☆..................☆

آفریدی ذہنی طور پر پریشان تھا اس کے دل و دماغ جل رہے تھے۔ نرملا کے سلسلے میں اسے اپنے لہجے کی جارحیت کا احساس ہو گیا تھا اور اب شرم و ندامت نے اس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیا تھا۔ اس کشمکش میں وہ بستر پر کروٹیں لے رہا تھا کہ یکایک اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور پھر اس پر گہری نیند طاری ہو گئی تھی آنکھیں بند ہوتے ہی اس نے ایک عجیب منظر دیکھا کہ وہ منتری بھون کے طلسم کدہ سے نکل کر ایک مندر میں پہنچ گیا۔ وہاں بے شمار پجاری اپنے دیوتاؤں کی پوجا میں مصروف تھے۔ آفریدی ان سب سے دامن بچاتا ہوا مندر کے ایک کمرے کے سامنے رک گیا۔ جہاں دروازے پر ایک بوڑھی عورت سفید ساڑھی میں ملبوس تھی۔ عورت کے چہرے پر عجیب سی روشنی تھی اور ہونٹوں پر محبت بھری مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ آفریدی کو دیکھ کر بوڑھی عورت نے کہا۔

”بیٹے۔ اندر چلے آؤ۔ میں نے تمہیں ایک ضروری کام سے یہاں بلایا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے بوڑھی

عورت نے دروازہ کھول دیا اور آفریدی ایک سحرزدہ انسان کی طرح اندر داخل ہوگیا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ عورت کون ہے اور وہ ہندوؤں کی عبادت گاہ میں کس لئے آیا ہے؟ بوڑھی عورت نے شاید اس کی ذہنی پریشانی کا سبب جان لیا تھا' اس لئے ایک مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔

"میرے دو بچے ہیں۔ ایک تم اور ایک نرملا۔ کوئی ماں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کی اولاد کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے فرق آجائے۔ تم نرملا کو نہیں جانتے۔ وہ بہت معصوم لڑکی ہے اس نے اس سنسار میں ان گنت دکھ جھیلے ہیں۔ تم اسے اور دکھی نہ کرو۔ فوراً واپس جاؤ اور میری بیٹی کو منانے کی کوشش کرو ورنہ تمہاری ماں تم سے روٹھ جائے گی۔"

"مگر تم میری ماں تو نہیں ہو۔ میں نے تمہیں آج تک نہیں دیکھا۔" آفریدی شدید حیرت کے عالم میں بول رہا تھا۔

"میں بھی تمہاری ماں کی طرح ہوں۔ عنقریب تم مجھے اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھ سکو گے۔ جلدی کرو' وقت بہت کم ہے۔ نرملا کو آہستہ آہستہ اندھیرے سے نکالو۔ اگر تم نے جبر اور غصے سے کام لیا تو وہ ٹھوکر کھا کر گر جائے گی۔"

جیسے ہی بوڑھی عورت کے الفاظ کی گونج ختم ہوئی' وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ آفریدی نے ایک عجیب سا خواب دیکھا تھا۔ وہ اس عورت کو پہچاننے سے قاصر تھا جو اس کی ماں ہونے کا دعویٰ کر رہی تھی۔ آفریدی بہت دیر تک خواب کے مناظر میں الجھا رہا۔ پھر اسے نرملا کا خیال آیا۔

"شاید نرملا اس تلخ بیانی کی مستحق نہیں تھی۔" آفریدی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "بالآخر وہ ایک عورت ہے۔ غیرت مند اور خوددار عورت جسے حادثات کی بارش نے دنیا کے ہر مرد کی طرف سے مشکوک بنا دیا ہے۔ اس نے بچپن سے لے کر جوانی تک بتوں کی پوجا کی ہے۔ اس کی ایک ایک سانس توہم پرستی کی فضا میں گزری ہے۔ اس کا پورا ماحول گمراہ کن عقائد کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے۔ کبھی وہ پیپل کے درخت کی جڑوں میں انسانی سروں کو جھکا ہوا دیکھتی ہے۔ کبھی نیل کنٹھ (پرندے) کو دیوتا کے روپ میں آدم زادوں کی بستیوں پر سایہ فگن پاتی ہے۔ کبھی ایک حقیر کچھوا دھرتی کا سارا بوجھ اٹھا لیتا ہے۔ کبھی زہریلے اور خوفناک سانپ خالص دودھ پی کر آستینوں میں پلتے ہیں۔ کبھی دریاؤں کی دیوی جوان اور کنواری لڑکیوں کی بھینٹ قبول کرتی ہے۔ کہیں ایک جانور کی گندگی مشک و عنبر سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ تو کہیں دلوں پر سیاہ بلیوں کے پہرے ہیں۔ کہیں ایک دیوتا دوسرے دیوتا کی بیوی پر بری نظر رکھتا ہے تو کہیں اوتاروں کی بیویاں اپنے شوہروں سے بے وفائی کرتی ہیں۔ کہیں رقص ہے' کہیں نشہ ہے اور کہیں مرلی کی تانیں ہیں جن پر ہزاروں دوشیزائیں اس لئے ناچ رہی ہیں کہ کب کوئی منوہر آئے اور انہیں "بندرابن" کی "کنج گلی" میں لے جائے۔" علی عامر آفریدی کا ذہن چتوڑ کی تہذیب کے ایک ایک گوشے کو بے نقاب کر رہا تھا۔

"پھر اگر نرملا کماری بھی ستارہ پرست ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ ابھی حلقۂ اسلام میں نرملا کی حیثیت اس بچی سے زیادہ نہیں جس نے پورے اعتماد اور استقامت کے ساتھ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا بھی نہیں سیکھا ہے۔ پھر وہ زندگی کے سفر میں تیز رفتاری کے ساتھ کس طرح چل سکتی ہے؟"

آفریدی کو ہوش سا آگیا اور وہ دوبارہ نرملا کے کمرے میں داخل ہوا اور نرملا کو مخاطب کر کے بولا۔ "اگر تم اسی طرح روتی رہیں تو ایک دن آفریدی ضرور غرق ہو جائے گا۔ پھر کہنے والے کہیں گے کہ جسے ملک کافور

کی سازشیں' رام دیو کی عیاریاں اور رانی پدمنی کا تشدد نہ ڈبو سکا وہ ایک نازک مزاج اور ضدی لڑکی کے آنسوؤں میں ڈوب گیا۔"

"آپ ان لوگوں کو یہ نہیں بتائیں گے کہ وہ لڑکی کیوں روتی تھی اور اسے یہ آنسو کس نے بخشے تھے؟" نرملا نے سسکتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"دنیا آنسوؤں کی خریدار نہیں۔ وہ صرف قہقہوں کی تاجر ہے اور ان کا ہی مول لگاتی ہے۔" آفریدی کی سنجیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ "ہمیں اشکوں کو اپنے ہی گوشۂ چشم میں قید رکھنا چاہئے جب بھی یہ آزاد ہوں گے اسی دن رونے والوں کو تماشا بنا ڈالیں گے۔"

"سردار! آپ سے بھی میرے آنسو برداشت نہیں ہوتے؟" نرملا نے عجیب معصومیت سے پوچھا۔

"تم بھول رہی ہو نرملا!" آفریدی نے کہا۔ "وہ میں ہی تو تھا جس نے ایک روز تم سے کہا تھا کہ اپنے سارے آنسو میرے دامن میں جذب کر دو مگر مجھ سے راجپوت مردوں کی سفاکیوں کا انتقام نہ لو۔ اگر میں تمہارا حرفِ اعتبار نہیں تو مجھے مٹا دو لیکن انسانیت پر اتنا شک نہ کرو کہ آنے والوں کیلئے تمام راستے ہی بند ہو جائیں۔"

"یہ غلط ہے سردار! یہ غلط ہے۔" نرملا گھبرا کر تیز لہجے میں بولی۔ "میں نے ایک لمحے کیلئے بھی آپ کو بے اعتبار نہیں سمجھا۔ خدا مجھے اس دن کیلئے زندہ نہ رکھے جب میں آپ پر شک کروں۔" ایک بار پھر نرملا کے آنسو بہنے لگے تھے۔

فضا پر جذبات کی دھند چھانے لگی تو آفریدی نے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔ نرملا کمرے سے نکل کر باغ میں آئی۔ نہر میں ہاتھ منہ دھوئے تو گھٹن کم ہوئی اور تازہ ہوا نے شادابی کا ہلکا سا احساس بخشا۔

کھانے کے بعد آفریدی نے اسی خواب کا ذکر دوبارہ چھیڑ دیا جس نے نرملا کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔

"اسے جانے دیجئے سردار! اب میں کبھی آپ کو اپنا خوابِ پریشاں سنا کر آزردہ نہیں کروں گی۔" نرملا گریز اختیار کر رہی تھی۔

"میں تمہیں ماضی کی اس رہ گزر پر لے جانا نہیں چاہتا جو دکھوں کے کانٹوں سے بھری ہوئی ہے مگر پھر بھی اپنے خواب کی کچھ اور تفصیلات بیان کرو۔" آفریدی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کیا تم بچپن سے رام دیو کو جانتی ہو؟"

"نہیں!" نرملا نے جواب دیا۔ "میں نے تو اسے گزشتہ سال چند مذہبی تقریبات میں دیکھا تھا۔ یا پھر وہ راج دربار میں کسی جشن کے موقع پر نظر آتا تھا۔ یہ جاننے کے بعد کہ رام دیو چتوڑ کا سب سے بڑا گیانی ہے مجھے اس سے کسی حد تک عقیدت ہو گئی تھی مگر جب پتاجی اور اس کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو یہ راز کھلا کہ وہ دھرم کی نقاب پہن کر کیسی کیسی شعبدہ بازیاں دکھاتا ہے۔ پھر مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔"

"اس نفرت کے بعد وہ تمہیں خوابوں میں دکھائی دیا؟" آفریدی نے ایک اور سوال کیا۔

"اس سے بہت پہلے وہ مجھے خوابوں میں نظر آتا تھا مگر میں اسے پہچانتی نہیں تھی۔" نرملا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ایک دن اچانک میں نے محسوس کیا کہ مجھے قتل کرنے والے اس کریہہ المنظر انسان کا چہرہ رام دیو سے ملتا ہے۔ میں نے صبح بیدار ہوتے ہی پتاجی کے سامنے اپنا خواب بیان کر دیا۔ پتاجی خاموش ہو گئے۔ وہ راج جیوتشی یا کسی مذہبی پیشوا سے میرے خواب کی تعبیر دریافت نہیں کر سکے تھے۔ رام دیو' راجہ

رتن سنگھ اور رانی پدمنی کے دلوں پر حکومت کرتا تھا اس خوف سے پتاجی مجھے خاموش رہنے کی تلقین کرتے رہے کہ کہیں میری زبان پر رام دیو کا نام نہ آ جائے اور پھر ایک نئی قیامت ٹوٹ پڑے پتاجی کا خیال تھا کہ میرے دل میں رام دیو کیلئے نفرت کے جذبات پوشیدہ ہیں اور وہی نفرت خوابوں میں ڈھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ یہ چہرہ بچپن سے میرا تعاقب کر رہا ہے مگر وقت نے میرے باپ کو اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنی بیٹی کے اس بھیانک خواب کا راز معلوم کر سکتے۔ "

"میرے خیال میں مہامنتری کا اندازہ درست تھا۔ " آفریدی نے بہت غور و فکر کے بعد کہا۔ "بعض نفرتیں اور محبتیں انسانی ذہن کو اتنی مضبوطی سے گرفت کر لیتی ہیں کہ پھر وہ اس کے خوابوں کا ایک مستقل حصہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ تم رام دیو کے ناپاک تصور اور اس کے گھناؤنے وجود کو اپنے دماغ سے یکسر جھٹک دو اور سمجھ لو کہ وہ آگ کا ایندھن بن گیا اور پھر اس کی غلیظ راکھ ہوا میں اڑا دی گئی۔ تم بس روشنی کے خواب دیکھو۔ وہ روشنی جو آسمانوں سے اتر کر چتوڑ کے تاریک زندان میں داخل ہو رہی ہے اور صدیوں کے اندھیرے سسک سسک کر دم توڑ رہے ہیں۔ " اس کے بعد آفریدی نے نرملا کو چند آیاتِ قرآنی یاد کرائیں اور پرزور لہجے میں کہا۔ "یہ کلماتِ مقدسہ رام دیو کو اس قابل نہیں چھوڑیں گے کہ وہ تمہیں خوابوں میں آ کر پریشان کر سکے۔ "

☆..................☆..................☆

آفریدی اور نرملا کے دلوں میں جو طوفان اٹھا تھا وہ کسی تباہی کے بغیر خاموشی سے گزر گیا۔ مگر سلطان علاء الدین خلجی کے لشکر میں جو سیلاب آیا تھا وہ ہلاکت و بربادی کے بغیر نہیں گزرا۔ اس میں کئی لاشیں زمین پر تڑپیں اور پھر ساکت ہو گئیں۔ سلطان کے پورے لشکر پر ایک لرزہ ساطاری تھا مگر کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ علاء الدین خلجی سے رحم و کرم کی بھیک بھی مانگ سکے۔ سلطان نے مرنے والوں کی طرف سے منہ پھیر کر اپنے دامن کو جھٹک دیا تھا اس اشارے کا واضح مطلب یہ تھا کہ مجرموں پر زندگی کے دروازے بند ہو چکے ہیں اور سلطان کے دامن میں موت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ دردناک واقعہ اس طرح رونما ہوا کہ سلطان کے چار سپاہی جاسوسی کے فرائض انجام دیتے دیتے چتوڑ کی نواحی آبادی میں داخل ہو گئے۔ یہ بستی شودروں کی بستی تھی جہاں ہندو دھرم کے مطابق نیچ ذات کے لوگ رہتے تھے۔ جب سلطان کے سپاہی بستی میں داخل ہوئے تو وہاں کے رہنے والے ایک خاص جذبۂ احترام کے ساتھ اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ ساری بستی میں سلطان کے انعامات و نوازشات کی دھوم مچی ہوئی تھی اور تاجدارِ ہند کی اسی ادا نے چھوٹے لوگوں کے دل جیت لئے تھے۔ سراغ رساں سپاہیوں نے کچھ دیر تک بستی والوں سے رسمی باتیں کیں اور اس دوران وہ ان نوجوان لڑکیوں کو دیکھتے رہے جو شاہی سپاہیوں کو دیکھنے کے شوق میں اپنے اپنے گھروں سے نکل آئی تھیں۔ سلطان کے فوجیوں نے پہلی بار راجستھان میں حسن و شباب کی ایک نئی لہر دیکھی تھی۔ سانولے چہرے' چٹان جیسے جسم' میلے کچیلے لباسوں میں الہڑ اور پرشور جوانیاں ندی میں آنے والی باڑھ کی طرح تند و تیز۔ سلطان کے سپاہیوں نے چار لڑکیوں کا انتخاب اس طرح کیا جیسے کوئی خریدار بہت دیر تک بھیڑ بکریوں کی قطاروں کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اپنی پسند کا جانور خرید لیتا ہے۔

"یہ کچھ دن ہماری خدمت کریں گی۔ " ایک سپاہی نے چیخ کر کہا۔ "جب یہ ہماری خدمت کے قابل نہیں رہیں گی تو ہم انہیں واپس بھیج دیں گے تم لوگ دوسری لڑکیاں تیار رکھنا جو ہماری خدمت کی اہل ثابت ہو سکیں۔ "

بستی والوں نے یہ جابرانہ حکم سن کر سر جھکا لئے۔ سپاہی نے غریبوں کی بستی کے ترسے ہوئے لوگوں کو

مطمئن کرنے کیلئے کہا۔ "ہم اس شہنشاہ کے سپاہی ہیں جو تمہاری تقدیروں کا مالک ہے۔ تم نہیں جانتے کہ ہماری بخشش کے انداز کیسے نرالے ہیں۔ تم یہاں تک آسودہ ہو جاؤ گے کہ تمہارے گھر بھر جائیں گے۔ "

بستی والوں کے چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

"ان لڑکیوں کے باپ کہاں ہیں ؟ " تیسرے سپاہی نے بلند آواز میں ان بدنصیب انسانوں کو پکارا جن کی آبرو کا سودا ہو رہا تھا۔

سپاہی کے الفاظ کی گونج ختم ہوتے ہی چار آدمی آگے بڑھے جن کے جسموں پر کپڑوں کے نام پر چیتھڑے جھول رہے تھے اور زندگی کے مسائل جھریوں کی شکل میں پورے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔

چوتھا سپاہی اس طرح آگے بڑھا جیسے وہ اپنے پیروں کے نیچے دبی ہوئی کسی چیز کو مسل رہا ہو۔ "اگر سلطان کو خبر ہو جائے کہ تمہاری لڑکیوں نے ہماری خدمت کی ہے تو تم صرف انکار کر دینا۔ " سپاہی نے بوڑھے کے سینے پر اس طرح ہاتھ مارا کہ وہ لڑکھڑا گیا اور زمین پر گرتے گرتے بچا۔

"پربھو (مالک) ! کس چیز کا انکار ؟ " بوڑھے باپ نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"سلطان سے کہہ دینا کہ ہم یہاں نہیں آئے تھے۔

علاء الدین خلجی کے سپاہی نے گرجتے ہوئے کہا۔ "سلطان کے سامنے کھلے الفاظ میں اقرار کرنا کہ تم لوگ خود اپنی لڑکیوں کو لے کر ہماری خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ " جبر و اقتدار نے مظلوموں سے تڑپنے اور فریاد و فغاں کا حق بھی چھین لیا تھا۔

"ایسا ہی ہو گا داتا! ایسا ہی ہو گا۔ " بوڑھے نے جھک کر سپاہی کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا۔ "ہمارے لئے یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ ہم تو ایسا کرتے ہی آئے ہیں۔ بڑے لوگ ہماری کنیاؤں کو اسی طرح چھین کر لے جاتے ہیں اور جب ہم سے کوئی پوچھتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ خود ہم نے اپنی بیٹیوں کو سجا کر ان کی سیوا کیلئے بھیجا تھا۔ "

"تمہیں اپنی یہی رسم جاری رکھنی ہو گی کہ اسی میں تمہارے لئے بھلائی اور خیر ہے۔ " چاروں سپاہیوں نے بیک زبان کہا اور اپنی اپنی پسندیدہ لڑکیوں کو لے کر خیموں کی طرف چلے گئے۔

ان چار لڑکیوں میں سے ایک لڑکی ایسی تھی جس نے آج سے پہلے کسی موج بلا کا سامنا نہیں کیا تھا۔ باقی تین لڑکیاں راجپوت سرداروں کے ہوس کدے کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔ وہ لڑکی جواب تک ظلم کے خونی پنجے کی گرفت سے محفوظ رہی تھی' اس کی چیخیں دور تک گونجتی چلی گئی تھیں لیکن سپاہی کے خیمے تک پہنچتے پہنچتے وہ بے جان سی ہو گئی تھی۔

رات گہری ہوئی تو شیطان بھی انسانی نفس پر مسلط ہو گیا لڑکی آخری بار چیخی۔ "تم مجھے میرے ماں باپ سے چھین کر یہاں کیوں لائے ہو ؟ تمہارے سلطان نے تو کہا تھا کہ بستی کے سارے لوگ اس کی امان میں ہیں مگر یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے ؟ ایک شہنشاہ کی بخشی ہوئی یہ کیسی امان ہے کہ مجبور و بے کس لڑکیاں قتل کی جا رہی ہیں اور اس دھرتی کے داتا کو خبر بھی نہیں۔ "

سپاہی لڑکی کی چیخوں سے گھبرا گیا تھا اس نے تلوار کھینچی اور لڑکی کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب اگر تیرے ہونٹوں کو جنبش ہوئی تو زبان سے محروم کر دی جائے گی۔ "

سپاہی کا خیال تھا کہ موت کو اپنے سامنے دیکھ کر لڑکی بدحواس ہو جائے گی مگر اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ لڑکی کی آواز کچھ اور بلند ہو گئی تھی۔ "سلطان کے سپاہیو! کیا تم سرِ شام سو گئے ؟ آؤ اور دیکھو کہ تمہارے ہم پیشہ اپنے سلطان کے احکام کو کس طرح جھٹلا رہے ہیں ؟ "

سپاہی نے تلوار پھینک دی اور لڑکی کا منہ بند کرنے کیلئے آگے بڑھا۔ اچھوت لڑکی ابھی اپنے حواس میں تھی۔ وہ خیمے کے ایک گوشے میں سمٹ گئی۔ جب بدحواس سپاہی اس کے قریب آیا تو وہ اس کے بازوؤں کی گرفت سے بچ کر باہر نکل گئی اور پوری طاقت سے چیخنے لگی۔ "کیا تم سب ان ہی درندوں کے ساتھی ہو؟ کیا تمہیں موت کھا گئی؟ اپنے خیموں سے باہر کیوں نہیں آتے؟ کیا اتنے بڑے لشکر میں ایک بھی سپاہی ایسا نہیں جو سلطان کو ان نافرمانوں کی بداعمالیوں کی خبر دے سکے۔"

اچھوت لڑکی رات کے اندھیرے میں دریائے گمبھیری کے کنارے بھاگتی رہی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ سپاہیوں کے خیمے دور دور ہیں وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی ایک آواز پر بہت سے سپاہی دوڑے چلے آئیں گے مگر جب اس کی چیخوں کے جواب میں کوئی صدا بلند نہیں ہوئی تو اسے یقین آگیا کہ سلطان کے سارے سپاہی ہوس کے اس کھیل میں برابر کے شریک ہیں۔ یہ بڑے ہمت شکن لمحات تھے مگر لڑکی نے حوصلہ نہ چھوڑا۔ وہ بھاگتی رہی اور کچھ دور چل کر ایک دوسرے خیمے میں داخل ہو گئی۔ یہ خیمہ ترکی کے سردار امیر شایان کا خیمہ تھا جب لڑکی خیمے میں داخل ہوئی تو امیر شایان نماز پڑھ رہا تھا اور حالتِ قیام میں تھا لڑکی اس بات سے بے خبر تھی کہ وہ کون شخص ہے اور اس وقت کونسا فریضہ انجام دے رہا ہے؟ اس نے قریب پہنچ کر امیر شایان کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

"تو کس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہے؟ تجھے خبر بھی ہے کہ تیرے قریب کے خیموں میں بوڑھے باپوں کی جوان لڑکیاں ذبح کی جا رہی ہیں۔"

امیر شایان کی نماز مکمل نہیں ہوئی تھی مگر اس نے لڑکی کی چیخیں سن کر نیت توڑ دی۔ اس دوران وہ سپاہی بھی خیمے میں داخل ہو چکا تھا۔ سپاہی کو دیکھتے ہی لڑکی دوبارہ چیخی۔

"یہی وہ بھیڑیا ہے جو میرا گوشت کھانا چاہتا ہے اور اسی کے ساتھی میری بستی کی تین لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

امیر شایان نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور قہر آلود نظروں سے سپاہی کی طرف دیکھا۔

"امیر! آپ اس معاملے میں مداخلت نہ کیجئے۔" سپاہی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "یہ ہمارے مفتوحہ علاقے کی لڑکیاں ہیں جن کے جسم و جاں پر ہمیں تصرف کا مکمل اختیار حاصل ہے۔"

"تو جھوٹ بولتا ہے۔" امیر شایان کے ہونٹوں سے آگ برسنے لگی۔ "سلطان نے انہیں امان بخشی ہے۔ یہ ہماری شمشیروں کے سائبان میں ہیں۔"

"امیر! آپ ایک کافر لڑکی کیلئے اپنے بھائی کو جھوٹا قرار دے کر ذلیل کر رہے ہیں۔" سپاہی نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

"اسلام نے تیرے اور میرے درمیان برابری کا رشتہ قائم کیا تھا۔" امیر شایان کی آواز شدتِ غضب سے لرز رہی تھی۔ "جب تو نے اس تعلق کا احترام برقرار نہیں رکھا تو پھر سارے رشتے ٹوٹ گئے۔ اب میرے نزدیک تو ایک حقیر سپاہی ہے جس کی گردن میں گناہِ عظیم کا طوق صاف نظر آ رہا ہے۔ تو خدا کا بھی نافرمان ہے اور سلطان معظم کا بھی۔ یہ تیرا دُہرا جرم تجھے ہلاکت سے نہیں بچا سکے گا۔" یہ کہہ کر امیر شایان نے اپنی تلوار اٹھالی۔ سپاہی، ترکی سردار کی یہ حالت دیکھ کر بھاگا۔ امیر شایان نے خیمے سے باہر نکل کر چیختے ہوئے اپنے سپاہیوں کو پکارا۔ قریب کے خیموں میں لرزہ سا پڑ گیا۔ چند سپاہی امیر شایان کے قریب آئے اور ادب سے سر جھکائے ہوئے اپنے سردار کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد پچاس ساٹھ سپاہیوں نے ان چاروں فوجیوں کے خیموں کو گھیر لیا جو چتوڑ کی بستی سے جبراً

لڑکیاں اٹھا کر لائے تھے۔ جس سپاہی کی گرفت سے اچھوت لڑکی آزاد ہوئی تھی وہ ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ اس نے اپنے خیمے میں داخل ہو کر تلوار سنبھالی اور پھر پاگلوں کی طرح باہر نکل آیا۔ وہ شمشیر کو فضا میں لہرا لہرا کر چیخ رہا تھا۔

"مجھ سے میرے عمل کا حساب لینے والا کوئی نہیں۔"

امیر شایان کے سپاہیوں نے اس سرکش فوجی کو نرغے میں لے کر زیر کرنا چاہا مگر ترکی سردار نے انہیں روک دیا۔ اور خود جھپٹ کر تلوار کا وار کیا۔ مجرم سپاہی اپنے دفاع میں پیچھے ہٹا۔ امیر شایان کی شمشیر دوبارہ لہرائی اور اپنے مقابل کے ہاتھ پر گہرا زخم چھوڑتی ہوئی زمین سے جا لگی۔ زخم کاری تھا' مجرم کے ہاتھ سے تلوار گر گئی دوسرے ہی لمحے وہ رسیوں میں جکڑا ہوا اپنے تینوں ساتھیوں کے ہمراہ لکڑی کے پل کو پار کر رہا تھا۔ چاروں لڑکیاں بھی سپاہیوں کے درمیان سہمی ہوئی چل رہی تھیں۔ امیر شایان اسی وقت رات کے اندھیرے میں تمام مجرموں کو سلطان کے سامنے پیش کر دینا چاہتا تھا۔

اور جب امیر شایان نے علاءالدین خلجی کو اس دردناک سانحے کی اطلاع دی تو سلطان سر سے پاؤں تک قہر و غضب کا زندہ مجسمہ بن گیا۔ "سلطان معظم! یہ غلام آپ کے آرام میں خلل اندازی کا مجرم ہے مگر بڑی مجبوری تھی کہ مجھ سے یہ رات کاٹے نہیں کٹی۔" امیر شایان نے فرش پر دونوں گھٹنے ٹیک دیئے اور اپنا سر علاءالدین کے قدموں کے قریب رکھ دیا۔

"نہیں شایان! تم نے کوئی گستاخی نہیں کی۔" جوشِ غضب میں سلطان کی سانسیں بے ربط ہو گئی تھیں۔ "اگر تم یہ رات سو کر گزار دیتے اور صبح ہمیں اس حیا سوز واقعے کی اطلاع دیتے تو ہماری نگاہِ جلال میں تم بھی مجرم بن کر رہ جاتے۔ اس وقت ان بے نسب نمک حراموں کو ہمارے سامنے سے لے جاؤ۔ ہم دن کی روشنی میں ان کے سیاہ چہرے دیکھ کر فیصلہ کریں گے۔"

امیر شایان الٹے قدموں واپس جانے لگا تو علاءالدین نے دوبارہ چیخ کر کہا۔ "کل صبح ان بدنصیب لڑکیوں کے نامراد باپوں اور بستی کے سارے لوگوں کو بھی ہمارے سامنے حاضر کرو تاکہ تمہارا سلطان پورا پورا انصاف کر سکے۔"

☆..........☆..........☆

وہ صبح بڑی لرزہ خیز تھی۔ بستی کے تمام رہنے والے قطار در قطار سر جھکائے کھڑے تھے اور ان کے جسم خوف و دہشت سے اس طرح کانپ رہے تھے کہ موت کی ہوائیں انہیں زمیں بوس کر دیں گی یا خس و خاشاک کی مانند اڑا کر کہیں دور لے جائیں گی۔ چاروں لڑکیاں اگلی قطار میں تھیں۔ تینوں لڑکیاں جو چپ چاپ ہوس کا نشانہ بن چکی تھیں' ان کی گردنیں خم تھیں مگر وہ لڑکی جو ایک طاقتور بھیڑیئے کے خلاف مزاحمت کر کے امیر شایان کے خیمے تک پہنچی تھی اس کے کھڑے ہونے کا انداز بڑا جارحانہ تھا۔

"داتا! مجھے انصاف دے۔ ایسا انصاف جسے چتوڑ کی آنکھ نے آج تک نہیں دیکھا۔"

علاءالدین خلجی نے اس لڑکی پر نظر کی اور اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کر دیا۔ یہ خاموش رہنے کا اشارہ تھا۔ اس کے بعد سلطان کے حکم پر ان لڑکیوں کے باپ آگے بڑھے اور زمین پر سجدے کی حالت میں جھک گئے۔

"تمہیں میرے سپاہیوں سے کیا شکایت ہے؟" علاءالدین کی پُر جلال آواز گونجی۔

"کچھ نہیں داتا! کچھ نہیں۔" وہ سب کے سب زمین پر اوندھے پڑے گڑگڑا رہے تھے۔ "ہمارے ساتھ کسی نے کوئی اتیاچار (ظلم) نہیں کیا۔ آپ ہمارے داتا ہیں اور داتا کا کوئی سینک (سپاہی)

دوشی (مجرم) نہیں ہو سکتا۔ یہ لڑکیاں تو جنم سے داسیاں ہیں۔ ہم تو کئی جگ سے مہان لوگوں کی سیوا کرتے آئے ہیں۔ اگر یہ ابھاگنیں داتا کی سیوا نہ کر سکیں تو پوری بستی پڑی ہے۔ ہم اور داسیاں پیش کر دیں گے جو داتا کے من کو بھائے وہی حاضر ہے۔"

ایک لمحے کیلئے علاء الدین خلجی بھی کانپ اٹھا صدیوں کی غلامی نے چتوڑ کے اچھوتوں سے غیرت و حیا اس طرح چھین لی تھی کہ اس کا کوئی دھندلا عکس تک موجود نہیں تھا۔ ظلم سہتے سہتے وہ لوگ اتنے بے حس ہو گئے تھے کہ اپنی مجبور بیٹیوں کو طاقتوروں کی جائز غذا سمجھنے لگے تھے۔

"نہیں داتا! نہیں داتا! میں اپنی گندی بستی چھوڑ کر کسی مہان پرش کے گھر نہیں جاؤں گی۔ میرا باپو جھوٹ بولتا ہے۔" وہ اچھوت لڑکی سسک سسک کر رونے لگی جسے امیر شایان نے اپنے سپاہی کے پنجۂ ہوس سے بچایا تھا۔

"لڑکی تو کہیں نہیں جائے گی۔" دیکھنے والوں نے علاء الدین جیسے سخت مزاج انسان کی آنکھ میں پہلی بار نمی دیکھی۔ "تو اپنی جھونپڑی کا چراغ ہے۔ ہم تیری روشنی کو محلوں کے طاق و محراب تک نہیں جانے دیں گے۔ اگر کسی بدبخت نے ہماری خواہش کا احترام نہیں کیا تو ہم اس کے بام و در پھونک ڈالیں گے۔"

پھر علاء الدین نے ان مجبور باپوں کو کھڑا ہو جانے کا حکم دیا جو اپنے آنسوؤں سے پتھریلی زمین بھگو رہے تھے۔

اس کے بعد سلطان کا قہر اپنے مجرم سپاہیوں پر ٹوٹا۔ "تمہارے سینوں میں وہ کونسا غلیظ جذبہ موجزن تھا جس نے تمہیں اپنے سلطان کے چہرے پر سیاہی ملنے کیلئے اکسایا؟" علاء الدین شرربار لہجے میں مجرم فوجیوں سے مخاطب تھا۔

"ہم حالتِ جنگ میں ہیں اپنے گھروں سے دور ہیں۔" چاروں سپاہیوں نے جھکے ہوئے سروں کے ساتھ بیک زبان کہا۔ "ہم جسموں کی بھوک برداشت نہیں کر سکے۔ سلطانِ والا حشم خوب جانتے ہیں کہ دشمن سے معرکہ آرائی کے وقت ہر عمل جائز ہے۔"

"تم نے حرام کو حلال بنا ڈالا اور حلال کو حرام کا لباس پہنا دیا۔" علاء الدین شدتِ غضب میں اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا۔ "تم سڑی ہوئی مٹی کے کیڑے! اپنے خدا کے قوانین کا مذاق اڑانے والے! اپنے سلطان کے بلند نام کو خاک میں ملانے والے!" خلجی کے منہ سے کف اڑ رہا تھا۔ "تمہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ تم اپنے ہی خنجروں سے اپنی شہ رگیں کاٹ دو۔ یہی تمہاری سزا ہے۔"

فرمانِ شاہی جاری ہو چکا تھا کس میں جرأت تھی کہ ایک حرف کے خلاف بھی احتجاج کر سکے۔ سلطان اس وقت تک کھڑا رہا جب تک چاروں سپاہی اپنے خنجروں سے اپنی شریانیں کاٹ کر زمین پر نہ گر پڑے۔ پھر جب ان کے جسم سرد ہو کر اکڑنے لگے تو سلطان اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

پھر وہ بستی کے لوگوں سے مخاطب ہوا۔ "وہ احساس جو تمہارے دلوں سے چھین لیا گیا تھا' آج ہم اسے واپس کرتے ہیں۔ تمہاری بے زبان لڑکیوں کی عزت و ناموس اور رانی پدمنی کی آبرو میں کوئی فرق نہیں۔ راجپوت زادیوں کی حیا اور تمہاری بچیوں کی عزت ہم رنگ ہے۔ آج کے بعد اگر کوئی تفریق کا دعویٰ کرے تو اسے بتا دینا کہ یہ آسمان کا فیصلہ ہے۔ فاتح عالم سلطان علاء الدین خلجی کا قائم کردہ توازن ہے جسے بگاڑنے والوں پر زندگی کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔"

بستی کے لوگ علاء الدین کی جے کار کرتے ہوئے چلے گئے تو سلطان اٹھا اور چاروں لاشوں کے قریب پہنچ کر کچھ دیر تک ان مردہ جسموں کو دیکھتا رہا پھر انتہائی نفرت و حقارت کے لہجے میں بولا۔

"افسوس! ان بدنصیبوں کے مقدر میں شہیدوں کی موت نہیں تھی۔ صد حیف! یہ اپنے وطن سے دور جانور کی موت مارے گئے۔"

☆..................☆..................☆

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کے جاسوس مندروں اور بستیوں میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے ظاہری حلیے بھکاریوں اور حالات کے ستائے ہوئے انسانوں کی مانند تھے جو راجہ رتن سنگھ کے مظالم کا شکوہ کرتے نظر آتے تھے اور اس طرح سلطان کے لشکر کی نقل و حرکت سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ شودروں کی صفوں میں بھی رتن سنگھ کے جاسوس موجود تھے۔ بالآخر جب انہوں نے راجہ رتن سنگھ کو علاء الدین خلجی کے نئے اقدامات کی خبر دی تو راج محل میں سناٹا چھا گیا۔ "سمراٹ! اس ملیچھ نے اپنی سیاست سے بستی والوں کے دل جیت لئے ہیں۔" ایک جاسوس نے راجہ رتن سنگھ کے سامنے اپنی حاصل کردہ معلومات کی تفصیل پیش کرتے ہوئے کہا۔ "سلطان چتوڑ کے اچھوتوں کو برہمنوں اور راجپوتوں کی قطار میں کھڑا کر کے ایک نیا تہذیبی انقلاب لانا چاہتا ہے اور وہ اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گیا ہے۔ شودروں کی پوری بستی اسے "داتا" کہہ کر پکار رہی ہے اور وہ ان کے پھٹے ہوئے دامنوں کو سونے کے تاروں سے رفو کر رہا ہے۔ یہ بڑی خوفناک سیاست ہے اور اس سے زیادہ تباہ کن عمل یہ ہے کہ اس نے اچھوت لڑکیوں کی آبرو بچانے کیلئے اپنے چار بہترین سپاہیوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ بستی والوں نے سلطان کے ان اقدامات کا گہرا اثر قبول کیا ہے۔"

جاسوس خاموش ہوئے تو راجہ رتن سنگھ نے مہامنتری گنیش سنگھ کی طرف دیکھا۔

"سمراٹ! یہ کوئی انوکھی بات نہیں' سلطان اس طرح اہلِ چتوڑ کے دل تو جیت سکتا ہے مگر ہمارے اقتدار پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ ہم دنیا کی محفوظ ترین پناہ گاہ میں بیٹھے ہیں۔" مہامنتری گنیش سنگھ اپنی خوشامدانہ باتوں سے رتن سنگھ کا دل بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

چتوڑ کے حکمراں نے گنیش سنگھ کی باتوں کو غور سے سنا اور پھر اپنی محبوب بیوی رانی پدمنی کی طرف دیکھنے لگا۔

"مہامنتری درست کہتا ہے کہ چتوڑ کے نشیبی علاقوں میں اپنی دولت کا مظاہرہ کرنا دیگر بات ہے اور قلعے کی بلندیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا مختلف عمل ہے' دونوں باتوں میں کوئی ربط نہیں اگر سلطان کو نواحی بستیوں میں حیران و پریشان پھرنے کا شوق ہے تو اسے ایسا کرنے دیجئے۔ کچھ دن اسی طرح پتھروں سے سر ٹکراتا پھرے گا اور پھر ایک روز ناکام و نامراد واپس لوٹ جائے گا۔" چتوڑ کی خوبصورت ترین عورت نے علاء الدین خلجی کو ایک بیوقوف اور مجنون حکمراں قرار دے کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"اور تم کیا کہتے ہو ہری سنگھ؟" راجہ رتن سنگھ اپنے سپہ سالار سے مخاطب ہوا جسے کچھ دن پہلے اس کے عہدے سے معزول کر کے حوالۂ زنداں کر دیا گیا تھا۔

سپہ سالار ہری سنگھ کچھ دیر تک خاموش کھڑا رہا اسے راجپوت سرداروں کے دباؤ کے تحت آزاد کر دیا گیا تھا مگر راجہ رتن سنگھ کے روّیے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی طرف سے چتوڑ کے حکمراں کا دل صاف نہیں ہے۔ ہری سنگھ بھی اس طرح منافقانہ رسم و راہ کا قائل نہیں تھا لیکن گردشِ وقت نے اسے ایک نازک مرحلے پر پہنچا دیا تھا اگر وہ اپنی تحقیر کا احساس کر کے فوجی عہدے سے دستبردار ہو جاتا تو پوری قوم طعنہ زنی کرتی کہ ہری سنگھ اس وقت ایک گوشے میں روپوش ہو گیا جب ماتر بھومی (مادرِ وطن) اسے اپنی حفاظت کیلئے پکار رہی تھی۔ یہی وہ زنجیر تھی جس نے ہری سنگھ جیسے شجاع اور غیرت مند انسان کے پیروں کو جکڑ لیا تھا۔

رتن سنگھ کے تمام درباریوں کی نظریں ہری سنگھ پر مرکوز تھیں۔ اسے خاموش پا کر رتن سنگھ دوبارہ مخاطب ہوا۔ "ہری سنگھ! تمہاری خاموشی گستاخی کی دلیل ہے۔" رتن سنگھ کا لہجہ ناخوشگوار تھا۔

"نہ میں گستاخ ہوں اور نہ بے ادب۔" آخر ہری سنگھ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی.......... "میں صرف ایک سپاہی ہوں جو اپنے فرائض سے بخوبی آشنا ہے۔ جب عام لوگ جنگی امور پر بے دھڑک اپنی رائے دے سکتے ہیں تو میری خاموشی سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں بولوں یا نہ بولوں مگر وہ لوگ تو بول رہے ہیں جن کی آنکھوں نے نہ تیر و کمان دیکھے ہیں اور نہ جن کی سماعتوں میں شمشیروں کی جھنکار گونجی ہے۔" ہری سنگھ کی بے باک فطرت اسے مصلحت کے تقاضوں سے بہت دور لے گئی تھی۔

"ہم تمہارے جذبوں کی قدر کرتے ہیں ہری سنگھ!" راجہ رتن سنگھ لہجہ بدل کر بولا۔ "اپنے دل و دماغ کا غبار دھو ڈالو غلط فہمیوں کو زیادہ دیر قائم نہیں رہنا چاہئے۔"

"سمراٹ! میں اپنا سینہ ہمیشہ صاف رکھتا ہوں۔" ہری سنگھ کے لہجے میں سپاہیانہ جلال تھا۔ "اگر دل میں غبار ہوتا تو اہل دربار راج محل میں میری پرچھائیاں تک نہ دیکھتے۔"

"تو پھر تمہارا منصوبہ کیا ہے؟" رتن سنگھ نے پوچھا۔ "سلطان کے بڑھتے ہوئے قدموں کو کس طرح روکا جا سکتا ہے؟"

"فی الحال ہم علاء الدین خلجی کی یلغار کو روکنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔" ہری سنگھ نے کسی رعایت کے بغیر اپنی رائے پیش کر دی۔ "اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارے فوجی مجہول ہیں یا مقابلے سے جان چرا رہے ہیں۔ ہمارا ایک ایک سپاہی سرفروشی کے جذبے سے سرشار ہے مگر ہمارے پاس سر کم ہیں اور سلطان کی شمشیریں تعداد میں زیادہ ہیں۔ اگر ہم نے اپنے سروں کو عقل کی گرفت سے آزاد کر دیا تو علاء الدین کی تلواروں کی پیاس کچھ اور بڑھ جائے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ پیاس بھڑکنے نہ پائے اور ہم اپنے سروں کا استعمال اس وقت کریں جب ہمیں فتح کا یقین ہو جائے۔"

"تم بڑی عجیب بات کر رہے ہو ہری سنگھ۔" راجہ رتن سنگھ حیران ہو کر بولا۔

"سمراٹ! میری کوئی بات عجیب نہیں۔" ہری سنگھ بڑے اعتماد سے بول رہا تھا۔ "کھلے میدان میں سلطان کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اسے کچھ دن اور صحرا کی گرمی میں جھلسنے دیجئے پھر ہم دیکھیں گے کہ اس کے حوصلوں میں کتنی توانائی باقی ہے۔ اس دوران ہمارے سامان رسد میں مسلسل اضافہ جاری رہنا چاہئے۔ بے شک! ہمارے قلعے کی دیواریں بہت مضبوط اور بلند ہیں۔ سلطان کا لشکر کسی بھی دروازے سے داخل نہیں ہو سکتا۔ اگر اس نے یہ مجنونانہ حرکت کی تو ہمارے تیر انداز ایک بھی مسلمان سپاہی کے سینے اور گلے کو محفوظ نہیں رہنے دیں گے۔ ہمیں اس جنگ میں قلتِ افواج کے باوجود یہ برتری حاصل ہے کہ بلند پناہ گاہوں میں ہیں اور سلطان کا لشکر نشیب میں رینگ رہا ہے۔ قلعے تک پہنچنے کیلئے وہ یقیناً اوپر کی جانب رخ کرے گا ہمیں اس قدر خوش گمان نہیں ہونا چاہئے کہ سلطان کے تیر انداز ناکارہ اور بے ہنر ہوں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کی کمانیں بھی چڑھیں گی' ان کے تیر بھی چنگاریاں اگلیں گے مگر پستی سے بلندی کی طرف یہ سفر بہت سست اور بے اثر ثابت ہو گا۔" ہری سنگھ نے اپنے بائیں جانب مڑ کر سابق سپہ سالار پچھمن سنگھ کی طرف دیکھا جسے مشورے کیلئے دربار میں طلب کیا گیا تھا۔ "سردار پچھمن سنگھ بھی یقیناً میری تائید کریں گے کہ وہ بہت سرد و گرم آشنا انسان ہیں۔"

راجہ رتن سنگھ نے بوڑھے سیناپتی پچھمن سنگھ کی جانب پُرامید نظروں سے دیکھا۔

پچھمن سنگھ کرسی کا سہارا لے کر کھڑا ہوا۔ اس کا جسم لاغر ہو چکا تھا مگر آواز کی گرج اب بھی باقی تھی۔

"سمراٹ! ہری سنگھ کا مشاہدہ درست ہے۔ قلعہ بند ہو کر لڑنا چتوڑ کی فوجوں کے حق میں ہے۔ طویل محاصرہ یقیناً ایک دن سلطان کو تھکا ڈالے گا۔ راجستھان کا گرم موسم مسلمان سپاہیوں کو کسی مرض میں بھی مبتلا کر سکتا ہے۔"

ابھی پچھمن سنگھ کی گفتگو مکمل ہونے نہیں پائی تھی کہ راجہ رتن سنگھ کا جواں سال حقیقی بھانجا سونگرا مال دیو سنگھ کھڑا ہو گیا۔ "سردار پچھمن سنگھ کا مسلمانوں کے بارے میں یہ اندازہ درست نہیں ہے۔ انہیں کوئی موسم متاثر نہیں کرتا۔ وہ خود موسموں کو بدل دینے والے ہیں۔ گردش وقت ان سے بچ کر چلتی ہے اور ناساز گار فضائیں ان کی مرضی کے مطابق ڈھل جاتی ہیں۔" سونگرا مال دیو کے لہجے سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ مسلمانوں کی تلخ کوشی اور سخت جانی سے بہت زیادہ متاثر ہے۔

پچھمن سنگھ کی بھنویں کھنچ گئیں اور ماتھے پر کئی بل پڑ گئے بوڑھے سپاہی کو ایک نوجوان کی یہ مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔

"فرزند۔ ابھی تمہاری اتنی عمر نہیں کہ راج محل کے ایک گوشے میں بیٹھ کر فوجی سیاست پر کوئی تبصرہ کر سکو۔" پچھمن سنگھ نے ناگوار لہجے میں سونگرا مال دیو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں اپنے بزرگ کے تجربات و مشاہدات کا مذاق نہیں اڑا رہا ہوں۔" سونگرا کا انداز تکلم مودبانہ تھا۔ "میں کم عمر سہی لیکن مجھے مسلمان قوم کے مزاج کا خوب اندازہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ محمد بن قاسم کیسے ناہموار راستوں پر چل کر سندھ تک پہنچا تھا۔ مجھے یہ بھی خبر ہے کہ ہندوستان کے موسم نے محمود غزنوی کی راہ میں کیسی کیسی رکاوٹیں کھڑی کی تھیں اور وہ ان سب کو ایک ہی جست میں عبور کر گیا تھا۔ اور مجھے شہاب الدین غوری کی یلغار کا انداز بھی یاد ہے کہ وہ اجمیر کے تپتے ہوئے ریگ زار میں دوبارہ کس طرح داخل ہوا تھا۔ بیرون ہند سے ہمارے گھروں کی طرف آنے والے سب کے سب مسلمان تھے اور علاء الدین خلجی بھی اسی قوم کا ایک فرد ہے' ہمیں سلطان اور اس کے سپاہیوں کو نازک مزاج ثابت کرنے سے پہلے سوچ لینا چاہئے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں؟"

پچھمن سنگھ کا بڑھاپا سونگرا کے جوان لفظوں کی ضرب برداشت نہ کر سکا اور اس چنگاری کی طرح لو دینے لگا جسے تیز ہوا نے بھڑکا دیا ہو۔ "راجپوتوں کے ناسمجھ بیٹے! تجھے اندازہ نہیں کہ تو کیا کہہ رہا ہے؟" پچھمن سنگھ اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکا۔ "مسلمانوں کی اس طرح تعریف کرنا میری قوم کے حق میں وہ زہر ثابت ہو گا جس کا تریاق دنیا کے کسی وید کے پاس موجود نہیں۔ افسوس تجھے یہ راز نہیں معلوم کہ تو چتوڑ کا نادان دوست ہے۔"

سونگرا مال دیو بھی خاموش نہ رہ سکا۔ "میں خوب جانتا ہوں کہ وطن دوست کون ہے اور کون اپنی دھرتی سے دشمنی کر رہا ہے؟" سونگرا کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ "میں مسلمانوں کی شجاعت کے راگ نہیں گا رہا ہوں۔"

"پھر تیرا کیا مقصد ہے؟" اب کی بار پچھمن سنگھ کے بجائے راجہ رتن سنگھ اپنے بھانجے سے مخاطب ہوا تھا۔ "آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے سونگرا!" راجپوت سمراٹ کے لہجے میں دبے دبے غصے کی آمیزش تھی۔

"میں چتوڑ کے نگہبانوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے دشمنوں کے بارے میں غلط اندازے قائم کر کے کسی فریب کا شکار نہ ہوں۔ مقابلے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے حریف کی قوت' عادت و مزاج اور اس کی پوری تاریخ کو اچھی طرح سمجھ لیں۔" سونگرا نے اپنے ماموں راجہ رتن سنگھ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "قلعہ بند ہو کر لڑنا کوئی ایسا نظریۂ جنگ نہیں جس سے سلطان ناواقف ہو۔ دہلی سے کوچ

کرتے وقت علاء الدین نے اس امکان کو بھی پیشِ نظر رکھا ہوگا۔ وہ قلعے کی بلندی سے بھی آگاہ ہوگا اور اس نے محاصرے کی طوالت کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہوگا۔ وہ اس حقیقت سے بھی باخبر ہے کہ آج تک کسی مسلمان حکمراں نے چتوڑ کی تسخیر کے خواب نہیں دیکھے ہیں۔ کیا اہلِ دربار کی نظروں میں علاء الدین کوئی مخبوط الحواس شخص ہے جو اپنے انجام سے بے نیاز ہوکر چلتے ہوئے پتھروں سے سر ٹکرانے چلا آیا ہے ؟" اتنا کہہ کر سونگرا چند لمحوں کیلئے خاموش ہوگیا اور پھر بلند آواز میں کہنے لگا۔ "دیوتاؤں کی قسم! وہ بہت ہوشیار ہے، ہمارے اور آپ کے وہم و گمان سے بھی زیادہ ہوشیار۔ میں چاہتا ہوں کہ سمراٹ اپنے دشمن کے تیوروں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آخر اسے اس قدر اطمینان کیوں حاصل ہے ؟ اور وہ کونسا منصوبہ ہے جس پر عمل کرکے علاء الدین چتوڑ سے اس کی آزادی چھین لینا چاہتا ہے ؟"

"منصوبہ! کیسا منصوبہ ؟" راجہ رتن سنگھ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ منصوبہ جس کی کامیابی پر سلطان کو پورا یقین ہے۔" سونگرا بہت جذباتی ہوگیا تھا۔

"اس کا شوقِ معرکہ آرائی ایک دیوانگی ہے اور دیوانوں کو ان کے کسی فعل سے روکا نہیں جاسکتا۔" راجہ رتن سنگھ نے سلطان علاء الدین خلجی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"سمراٹ! علاء الدین دیوانہ نہیں ہے۔" سونگرا مزید جذباتی ہوگیا۔ "بھگوان کیلئے اس کے جنگی منصوبے پر غور کیجئے۔ جاسوسوں کو اس کام پر متعین کیجئے کہ وہ اپنی جان دے کر بھی وہ راز حاصل کرلیں جس کی بنیاد پر سلطان آگ اور خون کا یہ کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔"

کیسا راز ؟" راجہ رتن سنگھ چونک اٹھا۔

"آخر علاء الدین کے پاس ایسا کونسا اسلحہ ہے جس کے ذریعہ وہ سیکڑوں فٹ بلندی پر واقع قلعہ چتوڑ کی تسخیر کرلے گا جبکہ ایک ایک دیوار کی بنیاد میں سیسہ اور تانبا بھرا ہوا ہے اور ایک ایک دروازے کو فولاد سے تعمیر کیا گیا ہے۔ قلعے پر نہ تیر اور نیزے اثر کرسکتے ہیں اور نہ تلواریں۔ پھر وہ کونسے آلاتِ حرب ہیں جن پر سلطان کو یقین کامل ہے کہ وہ ان کے ذریعہ اس معرکے کو سر کرلے گا۔" سونگرا مال دیو نے کم عمر ہوتے ہوئے بھی اس ذہانت کا ثبوت دیا تھا جس سے چتوڑ کے جہاندیدہ بوڑھے بھی محروم تھے۔

کچھ دیر کیلئے دربار میں سناٹا سا چھا گیا۔

"ہم نہیں سمجھتے کہ سلطان اپنے خصوصی اسلحہ خانے کے ساتھ یہاں تک پہنچا ہے۔" آخر ایک مختصر وقفۂ سکوت کے بعد راجہ رتن سنگھ نے اسی رعونت آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ اپنی بے اندازہ فوجی قوت کے نشے میں ہوش و حواس کھو بیٹھا اور اسے ہماری عظمتوں کے بلند میناروں سے ٹکرانے کا شوق چتوڑ تک کھینچ لایا ہے۔"

سونگرا نے بڑی مایوس نگاہوں سے اپنے ماموں کی طرف دیکھا۔ "سمراٹ! مجھے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا۔ میں بعض حکمرانوں کی اس ادا سے بھی واقف ہوں کہ طاقت کا خمار انہیں گہری نیند سلا دیتا ہے۔ اگر بربادی و زوال کے نمائندے بھی ان کے دروازے پر دستک دیں تو وہ جاگنے کی کوشش نہیں کرتے۔ میرے عظیم بزرگ! آپ بھی سو چکے ہیں اور آپ کو سلانے میں ان خوشامدی درباریوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے جو اپنی پگڑیوں کی سلامتی کو چتوڑ کی عزت و ناموس پر ترجیح دیتے ہیں۔"

دربار میں ہلچل سی مچل گئی۔ راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی اور دیگر راجپوت یہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کہ راج گھرانے کا ایک فرد اس قدر باغیانہ روش اختیار کرلے گا۔

"سمراٹ! میں ایک اور بات بھی آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ اقتدار کی سیاست میں کبھی

طاقت کا مظاہرہ انسانوں کو کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے اور کبھی دماغ کا استعمال۔" سونگرا مال دیو نے راجہ رتن سنگھ کے قہر و غضب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "یہ وہی موسم ہے جب ہمیں اپنے ذہنوں کے دریچے کھول کر تازہ ہوا کے اثرات کو اپنے جسموں میں جذب کرنا چاہئے۔ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو صدیوں سے اکڑے ہوئے جسم چٹخ جائیں گے۔ ہوا بہت گرم ہے۔ اگر اس کے جھونکوں نے براہ راست جسموں کو چھو لیا تو ہڈیاں تک پگھل جائیں گی۔ ہم نے ہمیشہ اپنی بدنی توانائیوں پر غرور کیا اور ایک بار بھی نہیں سوچا کہ ہمارے سروں کے ڈھانچوں میں دماغ جیسی دولت کو کیوں محفوظ کیا گیا ہے۔ پہلے مجھے صرف شک تھا مگر اب یقین ہو چلا ہے کہ ہمارے سر خالی ہیں اور ان ہڈیوں کے درمیان ایشور (خدا) نے دماغ نام کی کوئی چیز پیدا ہی نہیں کی۔"

"سونگرا!" راجہ رتن سنگھ چیخ اٹھا۔ "تو ہمیں اب حکومت سکھا رہا ہے ؟"

"نہیں سمراٹ! میں تو ہواؤں کے رخ کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ کاش! اس بھرے دربار میں کوئی ایک شخص میرے اشارے کو سمجھ لے۔" سونگرا کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔

"تو چاہتا ہے کہ ہم سلطان کے سامنے سر خم کر دیں اور راجپوتوں کی عظیم روایات کو ایک ناپاک انسان کی چوکھٹ پر لے جاکر جھکا دیں۔ سونگرا! تو نے یہ شرمناک بات کہنے سے پہلے اپنی زبان کاٹ کر ہمارے حضور کیوں نہ پیش کر دی۔" راجہ رتن سنگھ شدتِ غضب میں کانپنے لگا تھا۔

"اگر میری زبان کٹ جانے سے چوہانوں کی مریادا (عزت و شان) بچ جائے تو شیو اور شنکر کی سوگندھ! میں اپنے جسم کے اس گستاخ حصے کو اسی وقت علیحدہ کرکے آپ کے قدموں میں ڈال دوں۔" سونگرا اس قدر جذباتی ہوگیا تھا کہ اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہوگئے تھے۔

"تجھے خبر ہے کہ سلطان نے تیری ماں کو دنیا کی فحش گالی دی ہے۔" راجہ رتن سنگھ نے رانی پدمنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تو کیسا بے غیرت چوہان ہے کہ راج ماتا کے وقار کو نیلام کرکے تخت و تاج بچانا چاہتا ہے۔"

"میں نے اب تک کوئی شے فروخت نہیں کی مگر میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ عنقریب چتوڑ کی گلی گلی میں وحشتوں کا بازار سجنے والا ہے۔ بھگوان ہی جانے کہ اس بازار میں کیا کیا بیچا جائے گا اور آنے والے کیا کیا خریدیں گے۔" سونگرا مال دیو کی آواز لرز رہی تھی۔ "کہیں ہم لوگوں نے سلطان کو سمجھنے میں تو غلطی نہیں کی ؟ وہ اس کی ایک شاہانہ ادا ہو، آمریت کی ایک لہر ہو۔ اسے کسی نے ورغلایا ہو یا خود اس نے چتوڑ پر لشکر کشی کا یہ بہانہ تراشا ہو۔ کوئی اس سے بات تو کرے کہ آخر وہ کیوں کسی کے عزت و ناموس سے کھیلنا چاہتا ہے۔ کوئی تو راج محل سے باہر نکلے اور سلطان سے پوچھے کہ حکمرانی کا یہ کیا انداز ہے ؟ اس سے نرم لہجے میں مصالحت کی بات کی جائے۔ وہ بڑا آدمی ہے۔ اگر ہم نے اس کے مزاج کے مطابق بات کی تو وہ اپنے اس فیصلے پر شرمسار بھی ہوسکتا ہے۔" سونگرا بے ہوش کی باتیں کر رہا تھا۔

"سلطان ایک نیچ ذات سے تعلق رکھتا ہے، چتوڑ کے شودروں کی طرح۔ ہم اعلیٰ نسل لوگ اس سے گفتگو کرنے کی ذلت برداشت نہیں کرسکتے۔" راجہ رتن سنگھ اپنے نوعمر بھانجے کی کوئی بات سننے کیلئے آمادہ نہیں تھا۔

"سمراٹ! پرتھوی راج چوہان نے بھی شہاب الدین غوری کیلئے ایسے ہی حقیر الفاظ استعمال کئے تھے اور پھر اپنے جسم کو ایک ملیچھ کی زنجیروں کے حوالے کر دیا تھا۔ آج پرتھوی راج کا وارث بھی اسی غلطی کو دہرا رہا ہے۔" سونگرا نے راجپوتوں کی تاریخ کا ایک سیاہ ترین حوالہ پیش کرکے راجہ رتن سنگھ کو قائل کرنے کی

کوشش کی تھی مگر اس کی ہر دلیل رائیگاں گئی۔

"سونگرا! تجھ پر دیوتاؤں کی لعنت ہو کہ تیرے خون میں بھی وکرم سنگھ کی طرح غداری کے کیڑے پرورش پا کر جوان ہو چکے ہیں۔" راجہ رتن سنگھ غصے سے بے قابو ہو گیا تھا۔

"سمراٹ! مہامنتری وکرم سنگھ غدار نہیں تھے۔" کوئی بھی تنبیہہ سونگرا کو اپنے دل کی بات کہنے سے باز نہ رکھ سکی۔" میں نے ان جیسا وطن دوست نہیں دیکھا' اگر آج وہ زندہ ہوتے تو یقیناً چتوڑ کو تباہ ہونے سے بچا لیتے۔"

راجہ رتن سنگھ سر سے پاؤں تک اپنے قہر کی آگ میں جل اٹھا۔ "ہم تجھے بھی وکرم سنگھ کے پاس پہنچائے دیتے ہیں۔ ہمیں کیا معلوم تھا ہم نے ایک غدار وطن کو اپنی آغوشِ محبت میں پال کر جوان کیا ہے۔"

سونگرا مال دیو کا باپ مان سنگھ ایک جنگ میں قتل ہو گیا تھا۔ رتن سنگھ نے اپنے یتیم بھانجے کی نگہداشت کی' اسے فنونِ جنگ کی تربیت دی اور اعلیٰ عہدے پر فائز کیا۔ رتن سنگھ' سونگرا سے بہت محبت کرتا تھا مگر گردشِ وقت نے سونگرا کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں اس کی پوری شخصیت مجرمانہ ہو کر رہ گئی تھی۔ سونگرا ذہنی طور پر وکرم سنگھ سے متاثر تھا۔ پھر نرملا کماری کی محبت اسے مہامنتری کے بہت زیادہ قریب لے آئی تھی۔ آج وہ وکرم سنگھ کے لہجے میں بات کر رہا تھا اور اس کی یہی حرکت رتن سنگھ کیلئے ناقابلِ برداشت تھی۔ سونگرا وکرم سنگھ کی طرح سیاست و تدبر سے علاءالدین خلجی کے حملے کو روکنا چاہتا تھا اور جب اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو بات بگڑتی چلی گئی۔

رتن سنگھ نے طیش میں آکر اپنے حقیقی بھانجے کے قتل کا حکم دے دیا۔ تمام درباری سونگرا کے خلاف تھے مگر سپہ سالار ہری سنگھ اسے مجرم ماننے کیلئے تیار نہیں تھا۔ ہری سنگھ نے راجپوت سمراٹ سے درخواست کی کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں اور سونگرا کے خیالات کو غداری کا لباس نہ پہنائیں۔ اسی دوران سونگرا کی ماں کو یہ قیامت خیز خبر ملی تو وہ راج محل سے دیوانوں کی طرح بھاگتی ہوئی دربار میں داخل ہوئی اور اس نے اپنے بھائی کے پاؤں پکڑ لئے۔

"سمراٹ! یہ میری زندگی کا آخری سہارا ہے۔ میں ودھوا (بیوہ) ویسے ہی اس دھرتی کا بوجھ ہوں۔ اس بوجھ کو اتنا نہ بڑھائیں کہ زمین بھی میرے وجود کو برداشت کرنے سے منحرف ہو جائے۔ سونگرا کو بخش دیں کہ وہ نادان ہے۔"

رتن سنگھ کسی طرح بھی سونگرا کو معاف کرنے کیلئے تیار نہیں تھا مگر جب بڑی بہن اس کے پیروں کو اپنے آنسوؤں سے مسلسل بھگوتی رہی اور سرِ دربار ایک مظلوم عورت کی چیخیں گونجتی رہیں تو رتن سنگھ کا غصہ سرد ہو گیا۔ اس نے ایک شرط پر سونگرا کی جان بخش دی کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ قلعے سے نکل کر اچھوتوں کی بستی میں چلا جائے۔ اور پھر کبھی راج محل کا رخ نہ کرے۔

رتن سنگھ کے فیصلے پر راجپوت سرداروں نے سخت اعتراض کیا کہ اس طرح سونگرا' علاءالدین خلجی کے لشکر میں شامل ہو کر چتوڑ کے کئی اہم فوجی راز فاش کر سکتا ہے۔ راجپوت سرداروں کی اس الزام تراشی پر سونگرا کے جسم و جاں سلگ اٹھے۔

"سمراٹ! اس سے تو بہتر ہے کہ مجھے قتل کر دیں۔" سونگرا بچوں کی طرح رونے لگا۔

رتن سنگھ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر اس نے سونگرا کو راج محل کے ایک سنسان گوشے میں قید کر دینے کا حکم دے دیا اور تمام لوگوں پر پابندی عائد کر دی کہ وہ اس سے کوئی تعلق برقرار نہ رکھیں۔ صرف سونگرا کی ماں

اپنے بیٹے سے مل سکتی ہے تاکہ وہ اس کے کھانے پینے کا انتظام کر سکے۔

رتن سنگھ کی بیوہ بہن اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہی تھی اور سونگرا رو رو کر کہتا جا رہا تھا۔ "سمراٹ! جب یہ سارے وطن دوست چتوڑ کے سفینے کو بلاؤں کے طوفان میں غرق کر دیں گے اس وقت آپ کو اپنا یہ غدار بیٹا یاد آئے گا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ تیر و کمان اور نیزے اس مسئلے کا حل نہیں ہیں۔ اگر ایک شمشیر بھی بے نیام ہوئی اور ترکش سے ایک تیر بھی چھوٹا تو پورا چتوڑ خون میں نہا جائے گا۔"

سونگرا کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی مگر پورے دربار میں کوئی اس کی زبان سمجھنے والا نہیں تھا۔ بس ایک ہری سنگھ تھا جس کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے رنگ ابھرتے تھے اور پھر دھندلے پڑ جاتے تھے۔

☆..................☆..................☆

راجہ رتن سنگھ نے اپنے حقیقی بھانجے سونگرا کو غدار کہہ کر قیدِ تنہائی کی سزا تو دیدی مگر وہ اور رانی پدمنی رات بھر سو نہیں سکے۔ تنہائی ملی تو سونگرا کے آخری الفاظ دونوں کے ذہنوں میں گونجنے لگے۔ رتن سنگھ نے سہمے ہوئے انداز میں پدمنی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ذہین عورت تھی۔ اس نے شوہر کو اعصابی شکستگی سے بچانے کیلئے اپنے ہاتھوں سے تیز ترین شراب پیش کی۔ پھر بھی رتن سنگھ کی بدحواسیاں کم نہیں ہوئیں تو رانی پدمنی نے بڑا جذباتی سا گیت چھیڑا۔ ایسا گیت جس میں دنیا کی تلخیوں کو فراموش کر دینے کی تلقین تھی۔ گیت کے بولوں میں شاعر نے زندگی کے نشاط انگیز لمحوں کا رس بھرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ رس جو شراب سے بھی زیادہ نشہ آور تھا۔ پدمنی گاتی رہی مگر رتن سنگھ کو قرار نہیں آیا۔ چتوڑ کے حکمراں کا دل اس طرح نہیں بہلا تو پدمنی نے ایک ہیجان خیز رقص بھی پیش کیا لیکن آج کی رات ہر دعوتِ کیف بے اثر تھی۔

"پدمنی! تمہارا حسنِ جانسوز بھی وہی ہے' شراب بھی وہی ہے اور ہم بھی وہی ہیں مگر فضائیں بدل گئی ہیں۔ ہمیں تمہارے مہکے ہوئے گیسوؤں کے سائے میں کیسے نیند آئے کہ قلعے کی دیوار کے نیچے ہمارا بدترین دشمن جاگ رہا ہے۔" رتن سنگھ کی آواز لڑکھڑا رہی تھی مگر وہ بہت ہوش کی باتیں کر رہا تھا۔ "مہارانی! ہمارا غدار بیٹا سونگرا ابھی وہی بات کہتا ہے جسے ادا کرنے کے جرم میں ہم نے آنند پال کی زبان کاٹ دی تھی اور وکرم سنگھ کے جسم کو اپنی نفرت کی آگ میں جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ وہ فاحشہ' بھان متی بھی یہی کہتی ہے کہ سلطان کو ہمارے تخت تک پہنچنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ پدمنی! کیا یہ بدنہاد لوگ سچ بول رہے ہیں؟ کیا ایک لٹیرا ہمارے سر سے تاج چھین لے گا اور ہماری آبرو شاہی محل کی زینت بن جائے گی؟"

خوف و دہشت اور شدید جذبات سے مغلوب ہو کر رتن سنگھ نے پدمنی کی زلفِ پریشاں میں اپنا منہ چھپا لیا۔

پدمنی نے وارفتہ ہو کر اپنے شوہر کو جذباتی سہارا دیا۔ "نہیں سمراٹ! ملکۂ کہسار صرف آپ کیلئے پیدا ہوئی ہے۔ اور یہ شاخِ گل آپ ہی کے ہاتھوں میں لچکے گی اور رعنائی کے یہ پھول آپ ہی کے دوش پر مہکیں گے۔" پدمنی کی آواز سرمستی جذبات سے لبریز تھی مگر رتن سنگھ کا دھڑکتا ہوا دل کسی صورت سنبھلنے میں نہیں آتا تھا۔

"کاش! ہماری سماعتیں تمہارے کیف آور نغموں میں ہمیشہ کیلئے ڈوب جائیں مگر ہم کیا کریں پدمنی کہ ہمارے کان مسلسل اس درندے کے قدموں کی چاپ سن رہے ہیں۔" رتن سنگھ ایک بار پھر گھبرا کر پدمنی سے الگ ہو گیا اور اس نے اضطراری حالت میں ادھر ادھر ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔

"آپ اپنے ذہن سے اس بھیڑیئے کے تصور کو جھٹک دیجئے۔" رانی پدمنی تیزی سے رتن سنگھ کے قریب آئی اور اسے اپنے بازوؤں کا سہارا دیتے ہوئے کہنے لگی۔ "علاءالدین اور آپ کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ ازل سے ایک مکار اور بزدل بھیڑیا ہے اور آپ پیدائشی سنگھ (شیر) ہیں۔

فطرتاً بہادر اور تمام درندوں پر حکومت کرنے والے۔ " پدمنی نئے نئے انداز سے شوہر کو بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"نہیں مہارانی! وقت نے ساری بساط الٹ دی۔ شیر بھیڑیئے بن گئے اور بھیڑیوں نے شیروں کا روپ دھار لیا۔ " رتن سنگھ ذہنی طور پر منتشر ہو گیا تھا۔ "یہ سب لوگ ہمیں تسلیاں دے رہے ہیں اور مسلسل جھوٹ بول رہے ہیں۔ آچاریہ شنکر داس کہتا تھا کہ سلطان نے حملے کیلئے غلط وقت کا انتخاب کیا ہے۔ ستاروں کی گردش اسے ذلیل ورسوا کر کے دربدر پھرائے گی مگر کیا ہوا؟ خود شنکر داس درگا کے مجسمے کے نیچے دب کر مر گیا کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ دیوتا بھی ہمارے خلاف ہو گئے ہیں۔ درگا ماتا نے ہمیں شکتی دینے کے بجائے اپنے ہی ایک بھگت کو ہلاک کر ڈالا۔ یہ سب کیا ہے؟ ستارے کہاں روپوش ہو گئے اور دیوتاؤں نے آکاش کے کس گوشے میں منہ چھپا لیا۔ " یہ کہتے کہتے رتن سنگھ چیخ اٹھا تھا۔

پدمنی نے گھبرا کر ایک اور جام لبریز کرنے کی کوشش کی مگر رتن سنگھ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"مہارانی! یہ مدرا (شراب) کے بھرے ہوئے پیالے ہمارے غموں کا علاج نہیں۔ "

پدمنی کا گلرنگ چہرہ زرد ہو گیا۔ رتن سنگھ کچھ دیر تک اپنی ایک قدِ آدم تصویر کو دیکھتا رہا۔ مصور نے اس تصویر میں رتن سنگھ کے جاہ و جلال کا ایک عجیب منظر پیش کیا تھا۔ رتن سنگھ کی آنکھوں سے قہر و غضب کے شعلے نکل رہے تھے اور پس منظر میں ایک طاقتور ہاتھ تھا جو آسمان کی بلندیوں سے برآمد ہوتا ہوا رتن سنگھ کے سر پر سایہ فگن تھا۔ مصور نے اس خیال کی عکاسی کی تھی کہ راجپوت سمراٹ کے سر پر دیوتاؤں کا ہاتھ ہے۔

"کیا یہ تصویر ہماری ہے؟" رتن سنگھ نے پدمنی سے سوال کیا۔

"اس میں کیا شک ہے سمراٹ!؟" پدمنی نے ایک ادائے توبہ شکن کے ساتھ کہا۔ "یہ دلوں کو جیتنے والے نقش و نگار اسی رتن سنگھ کے ہو سکتے ہیں جو راجپوتوں کی آن ہے اور چتوڑ کا مان ہے"۔ پدمنی ایک ہاتھ سے شوہر کے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوار رہی تھی اور اس کا دوسرا ہاتھ تصویر کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

"پھر علاء الدین خلجی ہمارے قدم چھونے کی اجازت کیوں نہیں مانگتا؟" راجہ رتن سنگھ نے اداس لہجے میں کہا۔

"وہ آ رہا ہے سمراٹ!" پدمنی نے پھر رتن سنگھ کو جھوٹی تسلی دی۔ "بس وہ پہنچنے ہی والا ہے۔ فاصلہ طویل ہونے کے باعث اس کے آنے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ وہ یقیناً آئے گا اور آپ کے پیروں پر اپنا سر رکھ دے گا۔ "

"مہارانی! کل صبح ہوتے ہی چتر کار (مصور) گوتم کو بلاؤ اور اسے حکم دو کہ تصویر میں نظر آنے والے چہروں کو مٹا کر ایک نیا چہرہ بنا دے۔ سلطان علاء الدین خلجی کا چہرہ جو ہمارے قدموں پر جھکا ہوا رحم و کرم کی بھیک مانگ رہا ہو۔ " راجہ رتن سنگھ اپنے نا آسودہ جذبوں اور تشنہ آرزوؤں کو عجیب انداز سے تسکین پہنچا رہا تھا۔

"ایسا ہی ہو گا سمراٹ! ایسا ہی ہو گا۔ " پدمنی اسے کھینچ کر بستر تک لے جانا چاہتی تھی مگر اسی وقت ایک اور عجیب سانحہ پیش آیا۔ راجہ رتن سنگھ کی طویل و عریض تصویر اچانک زمین پر گر پڑی۔

رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے انتہائی بدحواسی کے عالم میں پلٹ کر دیکھا۔ راجپوت سمراٹ کی تصویر زمین پر الٹی پڑی تھی۔ رتن سنگھ کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئیں۔ رانی پدمنی کا چہرہ اس طرح بے رنگ ہو گیا تھا جیسے کسی لہو آشام عفریت نے اس کے جسم کا سارا خون پی لیا ہو۔

"مہارانی! یہ بڑی بدشگونی ہے۔ " رتن سنگھ کا جسم کانپ رہا تھا اور آواز بھی۔ "نحوستوں نے ہمیں

چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ پہلے درگا ماتا کا مجسمہ زمین بوس ہوا اور اب ہماری تصویر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ " راجہ رتن سنگھ زیادہ دیر تک اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ اس نے ایک کرسی کا سہارا لیا اور بیٹھ گیا۔ "مہارانی! غور سے دیکھو۔ سونے کی زنجیریں اس قدر مضبوط تھیں کہ اسے بڑے سے بڑا پہلوان بھی نہیں توڑ سکتا تھا پھر کس نے ہماری تصویر کی یہ بے حرمتی کی؟ وہ کس کا نادیدہ ہاتھ ہے جو ہمارا تاج اچھالنا چاہتا ہے؟"

رانی پدمنی بھی اس واقعے سے اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ وہ شوہر کی وحشت ناک باتوں کا کوئی جواب نہ دے سکی۔

راجہ رتن سنگھ بہت دیر تک ناقابلِ بیان اذیت میں مبتلا رہا پھر اس نے شراب کا ایک اور جام حلق سے اتارا اعصاب کچھ پر سکون ہوئے تو رتن سنگھ نے مہاراج رام دیو کو طلب کیا جو اس وقت آشرم میں دیوداسیوں سے دل بہلا رہا تھا۔

"سمراٹ کو میری کوئی ضرورت نہیں۔ " رام دیو نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "چتوڑ میں بڑے بڑے گیانی موجود ہیں۔ انہیں اعزاز بخشیں مالائیں پہنائیں رام دیو تو محض ایک پاپی ہے اور کوئی پاپی کسی کو سنکٹ سے مکتی نہیں دلا سکتا۔ " رتن سنگھ نے دوبارہ التجاؤں کے ساتھ اپنے محافظِ خاص کو آشرم بھیجا تو رام دیو اس طرح آیا کہ وہ شراب کے نشے میں جھوم رہا تھا۔ "میرے پاس کوئی خبر نہیں ہے سمراٹ۔ " رام دیو بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ "شنکر داس کی سڑی ہوئی لاش سے پوچھیئے کہ اب کیا ہو گا؟"

رتن سنگھ اور پدمنی رام دیو کے قدموں میں جھک گئے۔ "درگا ماتا کے مجسمے اور ہماری تصویر کے گر جانے سے کیا شگون نکلتا ہے؟" رتن سنگھ ایک بار پھر اس سیاہ کار شعبدہ باز کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔ "اگر ہم سے آپ کی شان میں کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو ہمیں معاف کر دیں۔ یہ چتوڑ کی آبرو اور ہندو دھرم کی عزت کا سوال ہے۔ "

رام دیو کے ہونٹوں پر ایک غلیظ مسکراہٹ ابھر آئی۔ "آپ نے وقت کو کھو دیا اور کھونے والوں کی کامنائیں کبھی پوری نہیں ہوتیں ہم گزرے ہوئے وقت کو موڑ کر واپس لا سکتے تھے۔ مگر آپ نے ہماری شرائط کی تکمیل نہیں کی۔ " رام دیو بڑی عیاری کے ساتھ بہانے تراش رہا تھا۔

"آپ تو مہاتما ہیں' مہا گیانی ہیں۔ اپنی تپسیا سے ان بدشگونیوں کو مٹا سکتے ہیں۔ " رتن سنگھ کی خوشامد کا انداز گداگرانہ ہوتا جا رہا تھا۔

رام دیو نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور زیرِ لب کچھ بڑبڑاتا رہا۔ پھر اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھیں کھول دیں۔ جن میں شیطنت کے سوا کوئی دوسرا عکس موجود نہیں تھا۔ "میں نے صرف آپ کی خاطر آکاش کا دشوار گزر سفر طے کیا۔ دیوتاؤں کے چرنوں میں اپنا شیش (سر) جھکا دیا اور ان سے دیا کی بھیک مانگی۔ تب کہیں جا کر دیوتاؤں نے مجھ سے سرگوشیاں کیں۔ "سات راجپوت دوشیزائیں جن کا تعلق راج گھرانے سے ہو گا وہ دریائے گمبھیری کی بھینٹ چڑھائی جائیں گی۔ " رام دیو نے چتوڑ پر نازل ہونے والی مصیبت کا سفاکانہ حل پیش کر دیا تھا۔ "وہ ساتوں دوشیزائیں سات دن تک مندر میں پوجا کریں گی اور مسلسل برت رکھیں گی اس دوران وہ کوئی غذا استعمال نہیں کر سکیں گی۔ انہیں صرف پانی پر گزارہ کرنا ہو گا پھر جب ان کے شریر اور آتمائیں دنیا کی آلائشوں سے پاک ہو جائیں گی تو انہیں گمبھیری کی لہروں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ راجپوت دوشیزاؤں کی یہ قربانی گمبھیری کے پانی میں ہلچل مچا دے گی' آکاش اپنے دہانے کھول دے گا پھر ایک خوفناک سیلاب آئے گا جس میں چتوڑ کی تمام نواحی بستیاں غرق

ہو جائیں گی۔ یہاں تک کہ سلطان کا ایک ایک سپاہی بھی ان موجوں کی خوراک بن جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی سلطان اور اس کے سارے خواب بھی زیرِ آب چلے جائیں گے۔"

مہاراج رام دیو نے سلطان علاء الدین خلجی کی تباہی کیلئے ایک خوفناک عمل تیار کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی ہندوستان اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں نوخیز لڑکیوں کو دریا کے بھینٹ چڑھانے کی رسم مذہبی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں گمراہ مصری بھی اسی طرح نوجوان دوشیزاؤں کو دریائے نیل کی بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ اہلِ مصر کے عقیدے کے مطابق کسی کنواری لڑکی کا جسم قبول کرنے کے بعد دیوتاؤں کا قہر ختم ہو جاتا تھا اور وہ دریاؤں کو ابل پڑنے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔ اس طرح نیل میں طغیانی آ جاتی تھی اور پیاسی زمین سیراب ہو جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس کافرانہ رسم کو ہمیشہ کیلئے ختم کیا اور دریائے نیل کے نام ایک عجیب و غریب خط لکھا۔ پھر جب وہ خط دریا میں ڈالا گیا تو ایسی طغیانی آئی کہ اہلِ مصر بھی کبھی خشک سالی کا شکار نہیں ہوئے۔ اسلام اپنی پوری توانائی کے ساتھ دیارِ ہند میں داخل ہو چکا تھا مگر جو علاقے اس کی دسترس سے باہر تھے وہاں ابھی کفر کی وہی وحشیانہ رسمیں جاری تھیں۔ رام دیو بھی اسی قدیم رسم کا سہارا لے کر کوئی نیا شعبدہ دکھانا چاہتا تھا۔ حالانکہ لڑکیوں کے بھینٹ چڑھانے کی رسم محض اس لئے تھی کہ دریاؤں میں سیلاب آ جائے اور وہ علاقہ قحطِ آب سے محفوظ ہو جائے۔ مگر رام دیو' راجپوت دوشیزاؤں کی قربانی کو کسی اور مقصد کیلئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکیوں کے زیرِ آب جاتے ہی چتوڑ میں پانی کا طوفان آ جائے گا اور اسلامی لشکر غرقاب ہوتے ہی اس کی روحانی عظمتیں واپس لوٹ آئیں گی۔

راجہ رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں نے رام دیو کے منصوبے کو بغور سنا اور فوراً ہی اس کے آغاز و تکمیل کی اجازت دیدی۔ ان سات منتخب لڑکیوں میں مہامنتری گنیش سنگھ کی بیٹی بھی شامل تھی۔ تمام راجپوت سردار بہت خوش تھے کہ اس طرح سلطان کی تباہ کن یلغار سے بھی نجات مل جائے گی اور ان لڑکیوں سے بھی چھٹکارہ حاصل کر لیا جائے گا جو اپنے باپوں کیلئے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ بن گئی تھیں۔ راجپوت سردار اس لئے بھی خوش تھے کہ یہ سب کچھ مذہب کے پردے میں دیوتاؤں کی رضامندی کیلئے کیا جا رہا تھا۔

جب راجپوت دوشیزاؤں کو اپنے بھینٹ چڑھائے جانے کا علم ہوا تو شدتِ خوف سے ان کی خوبصورت آنکھیں پتھرا گئیں۔ جن آنکھوں میں جوانی کا خمار اور حسرتیں کروٹیں لے رہی تھیں۔ اب ان ہی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب تھا۔ وہ اپنے باپوں کے سامنے بہت دیر تک ماتم کرتی رہیں مگر ان کی چیخیں رائیگاں گئیں۔ راجپوت سرداروں کے چہروں پر اپنی جوان سال بیٹیوں کیلئے ہمدردی کا کوئی جذبہ نمایاں نہیں تھا۔ لڑکیوں کی ماؤں نے شوہروں سے احتجاج کیا تو انہیں انتہائی جارحانہ انداز میں جھڑک دیا گیا۔

"یہ دیوتاؤں کا فیصلہ ہے' اس فیصلے سے انحراف کرنے والے ناستک (منکرِ خدا) قرار پاتے ہیں اور نافرمانوں کا ٹھکانہ نرک کی بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔"

مجبور عورتیں جابر و سفاک مردوں سے کیا کہتیں کہ انہیں تو روز ہی دوزخ کی آگ میں جلنا پڑتا تھا۔ لڑکیوں نے ماؤں کی گود میں سر رکھ کر گریہ وزاری کے طوفان اٹھائے مگر ہندوستان کی ایک مجبور عورت دوسری مقہور عورت کو کیا دے سکتی تھی۔ بالآخر ساتوں دوشیزاؤں کو ان کی ماؤں کی آغوش سے چھین لیا گیا۔ پھر ان کے زیورات اتارے گئے اور ریشمی کپڑوں کو سفید ملبوسات میں بدل دیا گیا۔ جیسے وہ سولہ سترہ سال کی' خوابوں کے جزیرے میں رہنے والی رنگین قبا لڑکیاں نہ ہوں بلکہ شمشان گھاٹ کی طرف جانے

والی غمزدہ بیوائیں ہوں جنہیں ستمگر سماج نے وقت سے بہت پہلے بیوگی کا کفن پہنا دیا ہو۔ تمام دوشیزاؤں کو رام دیو کی ہدایت کے مطابق ماتا کے مندر بھیج دیا گیا۔ خوف و دہشت کی ماری ہوئی ساتوں لڑکیاں نیم جانی کی حالت میں' زرد چہروں کے ساتھ' رام دیو کے بتائے ہوئے منتر پڑھنے لگیں۔ سورج ڈوبنے کے بعد انہیں صرف پانی پینے کی اجازت ہوتی اور پھر صبح کے قریب ان کا پانی بھی بند کر دیا جاتا۔ ساری لڑکیاں راجپوت قوم سے تعلق رکھنے کے سبب جسمانی طور پر بہت مضبوط تھیں مگر غذا کی کمی نے انہیں ایک ہی دن میں نڈھال کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس دوران سلطان علاء الدین خلجی نے حصار کا دائرہ مزید تنگ کر دیا۔ پہلے وہ دریائے گمبھیری اور بریچ کے درمیان خیمہ زن ہوا تھا۔ پھر اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ سلطان اپنے بہترین فوجی دستوں کے ساتھ چتوڑ نام کی ایک چھوٹی سی پہاڑی تک پہنچ گیا۔ یہ پہاڑی قلعے کے عین سامنے واقع تھی۔ سلطان نے اس ناہموار جگہ کو دیکھا' پھر ایک نظر قلعے پر کی اور نیا حکم جاری کر دیا۔

"اس کی ساری ناہمواریاں دور کر کے ہمارا تخت یہاں بچھا دو۔" علاء الدین نے اپنے سپہ سالاروں خواجہ حاجی' ملک نصرت خان' تاج الدین عراقی اور ملک ظفر خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحے لشکر کے بیشتر سپاہی اس پہاڑی کو کاٹنے میں مصروف ہو گئے جس قدر آڑے ترچھے پتھر تھے انہیں تراش کر پہاڑی کی سطح ہموار کر دی گئی۔ اس مشکل کام کے بعد سلطان نے اپنے سپہ سالاروں کو پرچمِ شاہی لانے کا حکم دیا۔ خواجہ حاجی جھنڈا لے کر آیا تو سلطان نے دوسرا حکم دیا کہ پرچم خسروؒ کے حوالے کیا جائے۔ خواجہ نے شاہی حکم کی تعمیل کی۔ امیر خسروؒ نے آگے بڑھ کر پرچم اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور علاء الدین خلجی کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

"خسروؒ! یہ پرچم تم ہمیں پیش کرو۔" علاء الدین نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ "ہم یہی سمجھیں گے کہ اس پرچم کو حضرت شیخ نظام الدینؒ کی دست بوسی کا شرف حاصل ہے۔" یہ کہتے کہتے سلطان کی آنکھوں میں محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کیلئے ایک عقیدتِ خاص کا رنگ ابھر آیا تھا۔

حضرت امیر خسروؒ جھنڈا لے کر آگے بڑھے اور علاء الدین خلجی کو پیش کر دیا۔ سلطان کچھ دیر تک پرچم کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر اپنے ہاتھوں سے اسے ایک مضبوط لکڑی کے سہارے باندھ دیا۔ اس کے بعد کئی کڑیاں جوڑی گئیں اور جھنڈا بلند کر دیا گیا۔ یہ پرچم چتوڑ پہاڑی کے سب سے بلند حصے پر نصب کیا گیا تھا۔ جب تیز ہوا میں شاہی پرچم لہرایا تو سلطان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ اس نے باری باری اپنے تمام سپہ سالاروں کی طرف دیکھا اور پھر حضرت امیر خسروؒ سے مخاطب ہوا۔

"خسروؒ! تم ہمارے پرچم کی آب و تاب دیکھ رہے ہو؟" علاء الدین کا لہجہ پرجوش تھا۔

"صرف خادم ہی نہیں' چشمِ فلک بھی اس پرچمِ جلال کی نگراں ہے۔" امیر خسروؒ نے تعریفی انداز میں کہا۔

"دیکھو خسروؒ! اس کا رخ قلعے کی جانب ہے۔" سلطان نے پرچم کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہوائیں اسے اڑا لے جانے کیلئے بے چین ہیں کہ راجپوتوں کے دلوں میں پیوست ہو جائے۔ اور پھر ان کے سر اسے سجدہ کرنے کیلئے زمین پر جھک جائیں۔" احساسِ فخر و غرور سے علاء الدین کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ "حضرت شیخ نے کیا فرمایا تھا خسرو! ایک بار پھر ہم تمہاری زبان سے وہی الفاظ سننا چاہتے ہیں۔"

حضرت امیر خسروؒ' سلطان کی بے تابی کا مفہوم سمجھ رہے تھے اس لئے آپ نے اپنے پیر و مرشد حضرت

نظام الدین اولیاؒ کے بابرکت الفاظ کو ذہن میں تازہ کرنے لگے۔

علاء الدین پر ایک اضطراب ساطاری تھا۔ امیر خسروؒ ابھی جواب دینے بھی نہیں پائے تھے کہ سلطان خود ہی بول اٹھا۔ "حضرت شیخ نے فرمایا تھا کہ ہمارے اقبال کی روشنی کے سامنے اقتدار کے سارے سورج گہنا جائیں گے، ہمارے گھوڑے کے سم پتھروں کے سینے میں شگاف ڈال دیں گے اور ہماری شمشیر کسی دشمن کے کاندھے پر اس کا سر باقی نہیں رہنے دے گی۔ کیوں خسروؒ! یہی تھے نا وہ الفاظ ؟"

حضرت امیر خسروؒ نے خاموشی اختیار کر لی اور احتراماً سر جھکا دیا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے علاء الدین خلجی کو فتح کی بشارت دی تھی مگر آپ کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ بہت مختصر تھے۔ علاء الدین نے اپنی خواہشِ اقتدار کے مطابق ان الفاظ کی نئی تشریح کی تھی اور اپنے جذبۂ بے اختیار کو تسکین دینے کیلئے ایک بزرگ کے کلمات کو نیا رنگ دے دیا تھا۔ امیر خسروؒ نے یہی مناسب جانا کہ سکوت اختیار کریں، اس لئے چپ چاپ اس شخص کی گفتگو سنتے رہے جو تسخیر و فتح کے سوا کچھ جانتا ہی نہیں تھا۔

راجستھان کی ہوائیں چلتی رہیں اور پرچمِ شاہی لہراتا رہا۔ علاء الدین خلجی کے اس پرچم پر تین کلمات تحریر کیے گئے تھے۔

"خدا کا سایہ............وقت کا سورج............محافظِ عالم............"

☆............☆............☆

راجہ رتن سنگھ کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ اس نے سابق سپہ سالار لچھمن سنگھ اور موجودہ سیناپتی کو ایک مجلسِ خاص میں طلب کیا۔ ہری سنگھ نے اپنے حکمراں کو اشاروں میں یہ بات سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ وہ مہارانی پدمنی کو اس مجلسِ مشاورت سے دور رکھے۔ ابھی یہ باتیں جاری تھیں کہ رانی پدمنی اس انداز دلربائی و بے نیازی سے داخل ہوئی جیسے ریاست کی سرحدیں بیرونی حملے کے خطرات سے مکمل محفوظ ہیں اور چتوڑ کے دیوار و در سکون و عافیت کی گہری نیند سو رہے ہیں۔ رانی پدمنی داخل ہوئی تو راجہ رتن سنگھ احتراماً کھڑا ہوا۔ ہری سنگھ جیسے غیرت مند سپاہی کیلئے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی مگر اسے بھی جبراً کھڑا ہو جانا پڑا۔

رانی پدمنی، راجہ رتن سنگھ کے دائیں جانب بیٹھ گئی اور پھر اس نے تمام راجپوت سرداروں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی کچھ دیر بعد کارروائی کا آغاز کر دیا گیا۔ ہری سنگھ نے پوری تفصیلات کے ساتھ محاذِ جنگ کی صورتِ حال بیان کی۔

"پھر تم کیا چاہتے ہو ہری سنگھ ؟" راجپوت سمراٹ نے اپنے سپہ سالار سے پوچھا۔

"اب جنگ کا فطری تقاضا یہی ہے کہ ہمارے کچھ فوجی دستے قلعے سے نکل کر اس طرح مزاحمت کریں کہ سلطان کے لشکر پر چتوڑ کی ہیبت قائم ہو جائے۔" ہری سنگھ نے اپنا منصوبہ پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اور لچھمن سنگھ تم کیا کہتے ہو ؟" راجہ رتن سنگھ نے چتوڑ کے بوڑھے سیناپتی سے مشورہ طلب کیا۔

"میں ہری سنگھ کی تجویز سے متفق ہوں۔" بڑھاپے نے لچھمن سنگھ کے جسم میں ہلکا سا رعشہ پیدا کر دیا تھا۔ مگر اس کی آواز میں وہی جوانوں جیسی گرج تھی............ "مضبوط دفاع کے ساتھ دشمن پر حملہ آور ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ عمل ہماری غیرت مندانہ زندگی اور بیدار حوصلوں کا ثبوت فراہم کرے گا۔"

راجہ رتن سنگھ نے براہ راست جواب دینے کے بجائے رانی پدمنی کی طرف دیکھا۔

"ہم چتوڑ کی آبرو کیلئے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کریں گے۔" رانی پدمنی نے شاید پہلی بار سیاسی زبان استعمال کی تھی۔ اہلِ دربار اپنی ملکہ کی سوچ پر مطمئن نظر آنے لگے۔ سپہ سالار ہری سنگھ بھی پدمنی کے مثبت اندازِ فکر پر خوشی محسوس کر رہا تھا۔

"تو پھر سمراٹ اپنے ماہر تیر اندازوں کو حکم دیں کہ............۔"

ابھی ہری سنگھ کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ رانی پدمنی نے درمیان میں مداخلت کی۔ "ابھی ہمیں نئی منصوبہ بندی کیلئے تین چار دن کی مہلت درکار ہوگی۔ ہماری آنکھیں آسمان کی جانب لگی ہیں اور ہم دیوتاؤں کی مدد کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"دیوتاؤں کی مدد............ آسمان ؟" ہری سنگھ نے حیران ہو کر کہا۔

"کیا تم (وسیع و عریض) آکاش کے نیچے نہیں رہتے ؟ اور کیا تم دیوتاؤں کی شکتی کے منکر ہو ؟" رانی پدمنی نے ہری سنگھ سے ایک عجیب سا سوال کیا۔

"نہیں! کبھی نہیں۔ سارا چتوڑ جانتا ہے کہ میں دیوتاؤں سے کتنی عقیدت رکھتا ہوں۔" ہری سنگھ نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ "آخر مہارانی میرے دھرم کو شک کی نگاہ سے کیوں دیکھ رہی ہیں ؟"

"اس لئے کہ تم اپنے بازوؤں کی قوت پر زیادہ بھروسہ کرتے ہو۔" رانی پدمنی کا دل ہری سنگھ کی طرف سے ابھی تک صاف نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس نازک وقت میں بھی اپنے لائق سپہ سالار کی شخصیت کو طنز کا ہدف بنانے سے باز نہیں آئی تھی۔

ہری سنگھ خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ "یہ کسی کے عقیدے کو پرکھنے کا موسم نہیں ہے۔ اس فضا میں جو جہاں ہے اسے وہیں رہنے دیجئے۔ میں اول و آخر دیوتاؤں کا پجاری ہوں۔ لیکن انسانی عمل کی حقیقت سے آنکھیں بند کرنا میرا شیوہ نہیں۔ ہم اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کریں اور دیوتاؤں کو ان کی مرضی پر چھوڑ دیں۔ آکاش اور دھرتی کو ایک دوسرے سے ملانے کی فکر نہ کریں کہ اس سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

"اگر تم دیوتاؤں کے کرم پر یقین رکھتے ہو تو کچھ دن انتظار کرو۔" رانی پدمنی نے کمرے کے وسط میں آویزاں ہفت رنگ فانوس کو دیکھتے ہوئے کہا "آکاش سے دیوتاؤں کی فوج اترنے والی ہے۔ مہاراج رام دیو نے بتایا ہے کہ اس بار دیوتاؤں کی سینا پانی کی بوندوں کی شکل میں چتوڑ کی دھرتی پر اترے گی اور پھر سلطان کے لشکر کو گمبھیری اور بیڑچ کی لہریں کسی مگرمچھ کی طرح نگل جائیں گی۔" یہ کہہ کر رانی پدمنی نے اپنے فوجی مشیروں اور راجپوت سرداروں کو اس جاپ کی تفصیلات سے آگاہ کیا جس میں رام دیو سات معصوم لڑکیوں کو دریا کی بھینٹ چڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"نہیں مہارانی!" ہری سنگھ کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور اس نے شدید پیچ و تاب کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھوں سے سر کے بالوں کو جکڑ لیا............ "مہاراج رام دیو کو آخر چتوڑ سے کیا دشمنی ہے کہ وہ اپنی ہی زمین سے اس قدر خوفناک انتقام لے رہے ہیں ؟ اگر لڑکیوں کی لاشوں سے گمبھیری کو پاٹ دیا جائے تب بھی کوئی سیلاب نہیں آئے گا۔ دیوتاؤں کی قسم! کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہ سب ان لوگوں کی بہانہ سازیاں ہیں جو اپنے ہاتھ پاؤں کاٹ کر بیٹھ گئے ہیں اور پوری قوم کو غلط عقیدے کی دلدل میں اتار دینا چاہتے ہیں۔ اگر رام دیو کو اپنے منتروں کی سچائی پر اتنا ہی یقین ہے تو وہ خود دریا کی لہروں میں کیوں نہیں اتر جاتا۔" ہری سنگھ کا لہجہ گستاخانہ ہو گیا تھا۔

رانی پدمنی ہری سنگھ کی اس جارحانہ گفتگو پر اپنے غصے کا اظہار کرنا چاہتی تھی مگر لچھمن سنگھ نے انتہائی ذہانت کا ثبوت دیا اور ہری سنگھ کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے بوڑھے سیناپتی نے ایک سرکش اور توہم پرست عورت کو مطمئن کرنے کیلئے کہا۔ "رانی! ہری سنگھ ایک بے باک فوجی ہے۔ وہ مذہب کی گہرائیوں کو زیادہ نہیں سمجھتا۔ مہاراج رام دیو بڑے گیانی ہیں۔ دیوتا ان سے ہم کلام ہوتے ہیں

اور آکاش کی خبریں دیتے ہیں۔ زمین پر رہنے والے ہم گناہ گار کچھ دن اور انتظار کر لیں گے۔" لچھمن سنگھ راجپوتوں کو آپس کے اختلافات سے بچانا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ ہری سنگھ کو تصادم کے مقام سے ہٹا کر دور لے گیا۔

☆..................☆..................☆

راجپوت دوشیزاؤں کا سات روزہ برت پورا ہو چکا تھا۔ مسلسل فاقہ کشی سے لڑکیاں اتنی کمزور ہو چکی تھیں کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑی نہیں ہو سکتی تھیں۔ جاپ کے مکمل ہو جانے کے بعد رام دیو نے رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ سے کہا کہ وہ چند سپاہیوں کے ذریعے لڑکیوں کو دریا کے کنارے پہنچا دیں اور پھر گمبھیری کی لہروں کے حوالے کر دیں۔ رام دیو نے ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ کوئی لڑکی غرق ہونے سے محفوظ نہ رہے ورنہ ساری تپسیا رائیگاں جائے گی۔

رانی پدمنی اور رتن سنگھ بہت خوش تھے مگر اچانک ان کے چہرے بجھتے ہوئے نظر آنے لگے۔ "ہمارے جاسوسوں کی اطلاعات کے مطابق سلطان کا محاصرہ بہت سخت ہے۔ اس صورت میں دریائے گمبھیری تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔"

"سمراٹ! یہ میری ذمہ داری نہیں۔" رام دیو نے بے رخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آنکھیں چڑھا کر کہا۔ "رات کے اندھیرے میں آسانی سے دریا تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اگر علاء الدین کے سپاہی درمیان میں حائل ہو بھی جائیں تو ان سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ لڑکیاں اپنی مذہبی رسم ادا کرنے کیلئے گمبھیری کے پانی میں غسل کرنا چاہتی ہیں اور پھر وہ مزاحمت کریں تو خوشامد سے کام لیں کہ یہی راج نیتی (سیاست) ہے۔"

رانی پدمنی اور رتن سنگھ کے چہروں پر اطمینان کا رنگ دوبارہ ابھر آیا۔

پھر وہ سیاہ رات طلوع ہوئی جس کے اندھیرے میں سات جانوں کے چراغ بجھانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ چودہ سپاہی ان لڑکیوں کو لے کر راج محل سے باہر نکلے۔ ہر لڑکی کو دو سپاہی اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑے ہوئے تھے اور لاغر و نحیف دوشیزاؤں کو مردہ جانوروں کی طرح دریائے گمبھیری کی طرف کھینچ کر لئے جا رہے تھے۔ سپاہیوں نے بڑی احتیاط سے راستہ طے کیا تھا مگر انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ گمبھیری کے کنارے کنارے سلطان کے بے شمار سپاہی پھیلے ہوئے ہیں اور مسلسل گردش میں ہیں۔ علاء الدین کے ایک فوجی دستے نے اس وقت رتن سنگھ کے سپاہیوں کو جا لیا جب وہ دریا کے قریب پہنچنے والے تھے۔

رام دیو کی ہدایت کے مطابق چتوڑ کے سپاہیوں نے مذہبی رسم کی ادائیگی کا بہانہ تراشا مگر لڑکیوں کی گھٹی گھٹی چیخوں نے ان کے فریب کا پردہ چاک کر دیا۔

"ہم مرنا نہیں چاہتے۔ تمہیں تمہارے دیوتاؤں کا واسطہ! ہمیں بچا لو کہ ہم نردوش (بے قصور) ہیں۔ ہمیں جبراً دریا کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔" لڑکیوں نے اس طرح سلطان کے سپاہیوں سے فریاد کی کہ ان کی آوازیں ڈوبتی جا رہی تھیں اور الفاظ اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے جیسے کسی انسان پر نزع کا عالم طاری ہو۔

علاء الدین کے جانباز سپاہیوں نے جب رتن سنگھ کے فوجیوں سے بازپرس کی تو وہ غصے سے بھڑک اٹھے۔

"یہ ہماری حدودِ مملکت ہیں اور ہم اپنی ہی زمین پر کسی دوسرے کو جوابدہ نہیں ہیں۔" راجپوت سپاہیوں کا لہجہ تحقیر آمیز تھا۔

"وہ دن خواب ہو گئے جب یہ زمین تمہاری تھی۔" علاء الدین کے ایک سپاہی نے گرجدار آواز میں

کہا۔ "جس زمین کی تم بات کر رہے ہو اسے ہمارے سلطان بزور طاقت کبھی کے خرید چکے۔ اب تم اور تمہارا حکمراں رتن سنگھ ہمارے غلام ہیں اور غلاموں کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ آقاؤں کی مرضی کے بغیر جنبش بھی کر سکیں۔"

آخر راجپوت خون تھا۔ شاہی سپاہیوں کے گرم الفاظ سن کر اس طرح کھول اٹھا کہ دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں اور پھر رتن سنگھ کے سپاہیوں کی تلواریں بے نیام ہو گئیں کچھ دیر تک دریائے گمبھیری کے کنارے ایک خونریز معرکہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ سلطان کے فوجیوں نے اپنے دشمنوں کے جسموں پر غلبہ حاصل کر لیا۔ دس راجپوت سپاہی مارے گئے اور چار شدید زخمی حالت میں قیدی بنا لئے گئے۔ اس تصادم میں سلطان کے تین سپاہی بھی کام آئے۔

☆..................☆..................☆

سلطان کے سامنے ان ساتوں راجپوت دوشیزاؤں کو پیش کیا گیا۔ لڑکیوں کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی فوری طور پر شاہی طبیب کو بلایا گیا۔ پھر کہیں جا کر صبح تک وہ لڑکیاں اس قابل ہو سکیں کہ علاء الدین کی کسی بات کا جواب دے سکیں۔ جب لڑکیوں نے آہ و زاری کے ساتھ اپنی رودادِ غم سنائی تو سلطان کے جسم و جاں جل اُٹھے۔

"تمہارے دیوتا ان دریاؤں کے سینے سے طوفان اٹھائیں گے جو ہمارے جاہ و جلال کی ہیبت سے خشک ہوئے جاتے ہیں۔" سلطان نے راجپوت دوشیزاؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

معصوم لڑکیاں خوف و دہشت سے کانپ رہی تھیں۔ غیرت مند دوشیزاؤں نے اپنی زندگی میں پہلی بار نامحرم مردوں کا ہجوم دیکھا تھا۔ شرم و حیا سے جھکی ہوئی گردنیں اور لرزہ خیز انجام کے ڈر سے کانپتے ہوئے جسم ایک ناقابلِ بیان منظر پیش کر رہے تھے۔ علاء الدین نے سہمی ہوئی لڑکیوں کی جانب نگاہ کی اور پھر بہت نرم لہجے میں کہنے لگا۔

"تم اس سلطان کی امان میں ہو جو بے گناہ اور مجبور لڑکیوں پر کبھی دست درازی نہیں کرتا۔ وہ تو حسنِ مغرور کو اپنے قدموں میں جھکانے کا عادی ہے۔ تم ہر خوف اور خدشے سے بے نیاز ہو جاؤ۔ اگر تمہیں ہماری طاقت و جبروت کے سائبان پر اعتبار نہیں تو اپنی اپنی چھتوں کے نیچے لوٹ جاؤ۔ ہمارے سپاہی تمہیں اس طرح قلعے تک پہنچا دیں گے جیسے تم اپنی ماؤں کے آنچلوں کے زیرِ سایہ چل رہی ہو۔" سلطان کے تند و تیز لہجے میں اچانک کسی مہربان باپ کی شفقت شامل ہو گئی تھی۔

"نہیں سلطان! ہمیں اپنے سائے میں پڑا رہنے دو۔" راجپوت دوشیزاؤں کی فریاد و فغاں سے سلطان کا خیمہ گونج اٹھا۔ "وہ لوگ ہمیں پھر کسی دیوی دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیں گے۔ سلطان! ہم اس بستی میں کیسے لوٹ کر جائیں جہاں ہمارا بچپن ایک بوجھ اور جوانیاں ایک عذاب ہوں۔ ہمیں رخصت کرتے وقت ماؤں کے سوا کسی کے آنکھوں میں آنسو نہیں آئے اور کسی کے ہونٹوں سے کوئی چیخ نہیں ابھری۔ گھر کے دیوار و در بے وفا' آنگنیں نا آشنا' گلیاں بے رحم' کوچے قاتل' آسمان دور' زمین تنگ' کوئی بھی تو نہیں اپنا' اپنے جسم کے حصے کاٹ کر پھینک دینے والے باپ' رقص و شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے حکمراں' دن رات انسانی خون سے پیاس بجھانے والے دیوتا۔ سلطان! آپ کو کیا معلوم کہ ہماری بستی کیسی بستی ہے؟ کیسے چلے جائیں؟ وہاں' ہمارا کون ہے؟ ہمیں آپ ہی قتل کر ڈالیں اس طرح مرتے وقت یہ سکون تو حاصل ہو جائے گا کہ قاتل ہمارے ہم مذہب نہیں تھے غیر تھے اور بہت دور سے آئے تھے۔"

راجپوت دوشیزاؤں کی داستانِ الم نے کئی آنکھیں نمناک کر دیں اور کئی دامن بھگو ڈالے۔ حضرت

امیر خسروؒ کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ ایک حساس شاعر اور دردمند صوفی کے دل پر چوٹ پڑی تو آنکھوں کے آبشار بہہ نکلے۔ خود علاءالدین خلجی کا چہرہ بھی دھواں دھواں نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

"یہ راجپوت سرداروں کی بیٹیاں ہیں۔ ان کے ساتھ خاندانِ شاہی کی طرح سلوک کیا جائے۔ اگرچہ ہم حالتِ جنگ میں ہیں لیکن پھر بھی انہیں وہی آسائش و احترام دیا جائے جس کی یہ مستحق ہیں۔"

راجپوت لڑکیوں کو لشکر شاہی میں اس طرح پناہ دیدی گئی جیسے وہ اپنے گھروں میں محفوظ ہوں۔

پھر اس کے بعد جب سپہ سالاروں نے رتن سنگھ کے قیدی سپاہیوں کے بارے میں دریافت کیا تو انہیں جواب دیا گیا۔

"یہ واپس جائیں گے۔" سلطان نے اپنے طبیب خاص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ان زخموں کو چند روز میں بھر جانا چاہئے۔"

خیمے میں موجود تمام لوگوں نے سلطان کے حکم کو بڑی حیرت سے سنا اور خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔

☆..................☆..................☆

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی بڑی شدت سے اپنے سپاہیوں کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ رات ڈھل گئی اور سورج نکل آیا مگر سپاہی لوٹ کر نہیں آئے۔ رام دیو کو فوری طلب کیا گیا۔ بدمست شعبدہ باز لڑکھڑاتا ہوا آیا اور جب اس نے یہ خبر سنی کہ لڑکیوں کو لے جانے والے سپاہی ابھی تک راج محل نہیں پہنچے ہیں تو وہ بھڑک اٹھا۔

"میں کب تک اپنے گیان کو برباد ہوتا ہوا دیکھوں۔ میں نے اس دھرتی کیلئے سیکڑوں راتیں جاگ کر گزار دیں اور ہزاروں دن تپسیا کی آگ میں جلتے ہوئے بسر کر دیئے مگر سب کچھ رائیگاں گیا۔ دیوتا خود نہیں چاہتے کہ اس زمین کی آبرو برقرار رہے۔ پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟" رام دیو بڑبڑاتا ہوا واپس جانے لگا۔ رانی پدمنی نے اسے روکنے کی کوشش کی تو وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ "اب دیوتاؤں سے کہو کہ وہ خود دھرتی پر آتر آئیں اور چتوڑ کی نیّا کو منجدھار سے نکالیں۔" رام دیو نے نیا بہانہ تراشا اور راج محل سے نکل کر اپنے آشرم میں چلا گیا۔

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی آسمانی امداد سے مایوس ہو چکے تھے۔ اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ سابق سپہ سالار لچھمن سنگھ کے توسط سے ناراض ہری سنگھ کو منانے کی کوشش کریں۔ ہری سنگھ ایک وطن دوست سپاہی تھا جب لچھمن سنگھ نے اس کے سامنے راجپوت سمراٹ کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ کسی شکایت کے بغیر اس فوجی اجلاس میں شریک ہو گیا جو چتوڑ کو بچانے کیلئے منعقد کیا گیا تھا۔

"میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ہم اپنے کچھ فوجی دستے قلعے سے باہر نکالیں اور سلطان کے بڑھتے ہوئے لشکر کو "چتوڑ پہاڑی" سے پہلے روکنے کی کوشش کریں۔" ہری سنگھ اپنی اس جنگی حکمتِ عملی کا ذکر کر رہا تھا جس پر رام دیو کے منتروں اور جاپوں کی وجہ سے اب تک کوئی عمل نہیں ہو سکا تھا۔ "چتوڑ کی پہاڑی پر دشمن کا جھنڈا نصب ہونے کا ایک ہی مفہوم ہے کہ حصار کا دائرہ بہت زیادہ تنگ ہو گیا ہے۔ قلعے کی پشت دشمنوں سے بھری ہوئی ہے۔ دائیں اور بائیں جانب بھی سلطان کے سپاہی ہماری نقل و حرکت کے تمام راستے بند کر چکے ہیں اور اب قلعے کے عین مقابل، تھوڑے فاصلے پر خود علاءالدین کا نمودار ہونا کوئی اچھی علامت نہیں۔ تین ماہ کے محاصرے میں بس یہی ہماری کامیابی ہے کہ سلطان نے ہمارے رسد کے سلسلے کو منقطع نہیں کیا ہے۔ شاید اسے ہماری زیرِ زمین سرنگوں کا علم نہیں ورنہ اب تک خوراک کا قحط بھی پڑ چکا ہوتا

اور یہ بڑی عذاب ناک صورت حال ہوتی۔" ہری سنگھ نے مختصراً میدان جنگ اور دشمن کی چالوں کا جائزہ لیا۔

خفیہ اجلاس کے کمرے پر گہرا سکوت طاری تھا۔

خاموشی کے ایک مختصر سے وقفے کے بعد ہری سنگھ نے دوبارہ لب کشائی کی۔ "اب ہمیں لازم ہے کہ ہم اپنے تیراندازوں کے ایک دستے کو آزمائیں اور مشاہدہ کریں کہ سلطان کا خیمہ ہماری دسترس سے کتنا دور ہے۔ اگر ہمارا ایک تیر بھی علاءالدین کی خیمہ گاہ تک پہنچ گیا تو یہ بڑی کامیابی ہوگی۔"

ابھی ہری سنگھ اپنے نئے جنگی منصوبے کی پوری تفصیل پیش نہیں کر سکا تھا کہ راجہ رتن سنگھ کے محافظ خاص نے ایک چونکا دینے والی خبر دیتے ہوئے کہا۔

"سمراٹ! ہمارے چار زخمی سپاہی سلطان کی قید سے آزاد ہو گئے ہیں اور وہ آپ سے فوری طور پر ملنے کی اجازت چاہتے ہیں۔"

یہ بڑی سنسنی خیز اطلاع تھی۔ جوشِ اضطراب میں رتن سنگھ اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا اور پھر تیز آواز میں محافظ سے کہنے لگا۔ "چتوڑ کے ان جانبازوں کو فوراً ہمارے روبرو حاضر کرو۔ ہم ان سورماؤں کے چہرے دیکھنا چاہتے ہیں جنہیں سلطان کی مضبوط زنجیریں بھی اپنی قید میں نہ رکھ سکیں۔"

رتن سنگھ، رانی پدمنی اور تمام راجپوت سردار یہ اطلاع پا کر بہت خوش تھے مگر سیناپتی ہری سنگھ کے ماتھے پر فکر اور سوچ کی کئی گہری لکیریں ابھر آئی تھیں۔ وہ زخمی سپاہیوں کی واپسی کو ایک غیر معمولی واقعہ سمجھ رہا تھا پھر جیسے ہی وہ چاروں سپاہی راجہ رتن سنگھ کے مخصوص کمرے میں داخل ہوئے، تمام حاضرین دم بخود رہ گئے۔ رانی پدمنی اور دیگر راجپوت سرداروں کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے اور ان کی آنکھیں اس طرح کشادہ ہو گئی تھیں جیسے پتلیوں کی حرکت رک گئی ہو۔

"یہ سب کچھ کیا ہے؟" راجہ رتن سنگھ اپنے سپاہیوں کو دیکھ کر چیخا جن کے ہاتھ پشت سے بندھے ہوئے تھے۔ تین سپاہیوں کی گردن میں لوہے کے کڑے ڈال دیئے گئے تھے۔ جسے زمانہ قدیم میں غلامی کا نشان سمجھا جاتا تھا اور ایک سپاہی کے گلے میں تانبے کی ایک تختی لٹک رہی تھی جس پر لکھی ہوئی عبارت نظر آرہی تھی۔

"گنیش سنگھ! اس تحریر کو پڑھو۔" شدتِ غضب سے رتن سنگھ کا پورا جسم کانپنے لگا تھا۔

مہامنتری گنیش سنگھ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور سپاہی کے قریب پہنچ کر تانبے کی تختی کو پڑھنے لگا۔ فوجی مجلس کے تمام ارکان کی نظریں گنیش سنگھ پر مرکوز تھیں۔ یکایک تمام لوگوں نے دیکھا کہ گنیش سنگھ کا چہرہ زرد ہو گیا ہے اور اس کے جسم کی لرزش پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔

"کیا لکھا ہے گنیش سنگھ!" راجپوت سمراٹ نے چیخ کر کہا۔ "کیا تو اس تحریر کو پڑھنے کے لائق نہیں ہے یا تیری زبان کو فالج کھا گیا ہے؟"

"سمراٹ! جو کچھ سلطان نے لکھا ہے اسے ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔" مہامنتری نے لکنت زدہ لہجے میں کہا۔

"کوئی بھی ذی ہوش انسان اپنے دشمن سے شیریں کلمات کی توقع نہیں رکھ سکتا۔" راجہ رتن سنگھ نے غضب ناک ہو کر کہا۔ "ہم جانتے ہیں کہ اس ذلیل انسان نے اس بار پھر ہمیں گالیاں لکھی ہوں گی۔ پڑھو! بہ آوازِ بلند پڑھو کہ آج کوئی حدِ ادب قائم نہیں ہے۔"

مہامنتری گنیش سنگھ نے اس تحریر کو پڑھنا شروع کیا جو تلوار کی نوک سے تانبے کی تختی پر لکھی گئی تھی۔

"رتن سنگھ! یہ طوقِ غلامی ہے جسے عنقریب تیری گردن میں ڈال دیا جائے گا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ تیرے

دیوتا بے جان پتھروں کے سوا کچھ نہیں۔ ان کے ساکت مجسموں کو غور سے دیکھ کہ وہ تو اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ تو معصوم لڑکیوں کو ہلاک کر کے اپنے دریاؤں میں سیلاب لانا چاہتا ہے کہ اس طرح ہمارا جاہ و جلال چتوڑ کے ندی نالوں میں غرق ہو جائے۔ اگر تیرے گھر سے رسم مردانگی نہیں اٹھ گئی ہے تو پھر ایک بار قلعے سے نکل کر دیکھ کہ ہماری آتشِ قہر نے تیرے دریاؤں کے جگر خشک کر دیئے ہیں۔ رتن سنگھ! ہماری بات پر یقین کر کہ ہم کبھی بلند بانگ دعوے نہیں کرتے۔ اپنی دستار کہیں چھپا دے کہ عنقریب ہمارا دستِ دراز کسی مفلس کی قبا کی طرح اسے تار تار کر دے گا اور اپنے تاجِ زر نگار کو کسی گوشے میں دفن کر دے کہ ہمارے آہنی قدم اسے پامال کر ڈالیں گے اور اپنے قلعے کی دیواروں کو مزید اونچا اٹھا لے کہ ہمارے لائے ہوئے خونی سیلاب کی موجیں تیرے میناروں سے بلند تر ہوں گی۔ "

سلطان علاء الدین خلجی کی تحریر کردہ عبارت ختم ہو گئی تھی۔ مہامنتری گنیش سنگھ کا پورا بدن پسینے میں تر ہو گیا تھا اور چاروں سپاہی مجرموں کی مانند سر جھکائے کھڑے تھے۔

راجہ رتن سنگھ اپنے سپاہیوں کی یہ حالت دیکھ کر بدحواس ہو گیا تھا۔ یہ دوسرا موقع تھا جب سلطان علاء الدین خلجی نے اسے عجیب انداز میں ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ "ہم نہیں جانتے کہ یہ بے غیرتی اور بے ضمیری کی کونسی منزل ہے؟ ایک راجپوت اپنی آزادی فروخت کر کے بھی زندہ رہ سکتا ہے؟ یہ منظر ہم نے آج ہی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ "

قیدی سپاہیوں کے چہرے مسخ ہو گئے تھے۔ "سمراٹ! ہم پر اور طعنہ زنی نہ کریں' بس حکم دیں کہ ہمیں اس شرمناک زندگی سے نجات دلائی جائے۔ کاش! ہمارے ہاتھ کھلے ہوتے تو ہم خود ہی اپنے سر کاٹ کر آپ کے قدموں پر رکھ دیتے۔ ہم نے غلامی کے یہ طوق اپنی خوشی سے نہیں' بڑے عالمِ جبر میں قبول کئے ہیں۔ " شدت جذبات سے سپاہی رونے لگے تھے۔

"اپنے ہاتھوں کو دشمن کے حوالے کرنے اور غلامی کا طوق پہننے میں بڑا وقفہ ہے' بڑا فاصلہ ہے۔ تم نے اپنی نامراد زندگی میں یہ منزل آنے ہی کیوں دی؟ تمہارے جسم کے ٹکڑے سلطان تک کیوں نہیں پہنچے؟ "

"ہمیں جب تک ہوش رہا ہم اپنے سمراٹ کا نام اونچا رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ " بے دست و پا سپاہی کسی مجرم کی مانند اپنی صفائی پیش کر رہے تھے۔ "بے ہوش ہونے تک ہم راجپوتوں کی آزادی و سربلندی کے ترانے گاتے رہے مگر جب زخموں نے ہم سے ہمارے حواس چھین لئے تو پھر ہم کیا کرتے؟ مجبوریوں نے ہمارے ہاتھ جکڑ دیئے اور گردشِ وقت نے ہماری گردنیں جھکا دیں۔ "

راجہ رتن سنگھ نے سپاہیوں کی مجبوریوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے انہیں قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ سپہ سالار ہری سنگھ نے راجپوت سمراٹ کو سمجھانا چاہا کہ یہ سپاہی میدان کے مفرور نہیں' ایک حادثے کا شکار ہیں اور یہ حادثہ بڑے بڑے سورماؤں کی زندگی میں بھی پیش آ سکتا ہے۔ اس لئے انہیں معاف کر دیا جائے اور چتوڑ کی افرادی قوت کو خود اپنے ہاتھوں برباد نہ کیا جائے۔ یہ ایک ہوشمندانہ مشورہ تھا مگر راجہ رتن سنگھ اس قدر مشتعل ہو گیا تھا کہ اس نے سپاہیوں کے قتل کا حکم واپس نہیں لیا اور اس طرح چار جاں نثار فوجی ایک حکمراں کی بد دماغی کا شکار ہو گئے۔

سپاہیوں کو قلعے کے کھلے میدان میں قتل کیا گیا جب ان بدنصیبوں کے جسم تڑپ تڑپ کر ساکت ہو گئے تو راجہ رتن سنگھ نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ .... "جن کے چہرے ہماری جانب تھے اور جن کی پشت میدان کی طرف تھی' انہیں ایسی ہی سزا در کار تھی ہم فرار کی تہمت اٹھانے والوں کو معاف نہیں

کرتے اور آئندہ بھی ایسا ہی کریں گے۔ اب چتوڑ میں وہی شخص رہ سکتا ہے جسے جلنے' برباد ہونے اور مرنے سے محبت ہے۔ جہاں جہاں تک تمہاری آواز پہنچ سکتی ہے' اہل چتوڑ کو ہمارا یہ پیغام پہنچا دو کہ اب موت کی آغوش کے سوا کسی کیلئے کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔ " راجہ رتن سنگھ بہت زیادہ غضبناک نظر آ رہا تھا۔

چتوڑ کے جن لوگوں نے اپنے مجبور سپاہیوں کو بے کسی کی موت مرتے دیکھا تھا وہ خود بھی اپنی اپنی جگہ لرز کر رہ گئے تھے اور چند روزہ زندگی سے ان کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ راجہ رتن سنگھ نے یہ سنگدلانہ فیصلہ اس لئے کیا تھا کہ اہل چتوڑ کے دلوں سے سلطان کی ہیبت کا اثر زائل ہو جائے اور تمام راجپوت اس تلخ حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ زندگی سے پیار کرنے والوں کیلئے چتوڑ میں کوئی گنجائش نہیں ہے......... مگر جب شکست و زوال انسان کا مقدر بنتے ہیں تو پھر ہر مثبت تدبیر کا منفی اثر مرتب ہوتا ہے

وقت کیا شے ہے پتہ آپ کو چل جائے گا
ہاتھ پھولوں پہ بھی رکھو گے تو جل جائے گا

راجہ رتن سنگھ کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ وہ اپنے جاں نثاروں کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا' مہامنتری وکرم سنگھ کا قتل' سونگرا مال دیو سنگھ کی اسیری' مائی بھان متی کی گرفتاری کیلئے بھیجنے والے سپاہیوں کی ہلاکت' آچاریہ شنکر داس کے منتروں اور مہاراج رام دیو کے جاپوں کا الٹا اثر' یہ تمام واقعات اس گردشِ وقت کی روشن علامتیں تھیں جن کی رفتار لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

رتن سنگھ نے اپنے سب سے بڑے ہمدرد سپہ سالار ہری سنگھ کی تجویز کو مسترد کر کے ایک اور حماقت کی۔ اس نے اپنے چاروں سپاہیوں کے کٹے ہوئے سروں کو ایک بڑے طشت میں سجا کر سلطان کی خدمت میں بھیج دیا۔ ہری سنگھ نے ایک بار پھر مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"سمراٹ! آپ کی بساط کے مہرے بہت تیزی سے کم ہوتے جا رہے ہیں اور یہ مہرے جن کے سر آپ سلطان کو پیش کر رہے ہیں' بے قصور بھی تھے اور جاں نثار بھی۔ "

رتن سنگھ بھڑک اٹھا......... "ہری سنگھ! اس میں کوئی شک نہیں کہ تم تلوار کے دھنی ہو اور تم نے کئی بار بڑی بے جگری سے اپنے دشمنوں کا مقابلہ کیا ہے مگر امور مملکت سے ذرا بھی واقف نہیں۔ ایک سیناپتی کو اپنی شمشیر کی کاٹ پر نازاں نہیں ہونا چاہئے کہ اس میں اس کا اپنا کوئی کمال نہیں ہوتا۔ یہ صرف ہماری حکمتِ عملی ہے جس کے سہارے فوجیں لڑتی ہیں اور پھر فتح سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ تمہیں بھی یہ سرفرازی و سربلندی ہماری ہی مہربانیوں سے حاصل ہوئی ہے۔ ہم نے تمہاری تلوار کو آب بخشی اور پھر اسے دشمنوں کی گردنیں کاٹنے کا ہنر سکھایا۔ اور آج تمہاری ناشکری کا یہ حال ہے کہ تم اپنے سمراٹ کو جینے کے انداز سکھا رہے ہو۔ "

راجہ رتن سنگھ کی یہ تحقیر آمیز گفتگو سن کر ہری سنگھ کا چہرہ بجھ گیا اور یوں محسوس ہوا جیسے بھرے دربار میں اس کے جسم سے فوجی لباس اتار کر اسے کسی اچھوت کے کپڑے پہنا دیئے گئے ہوں۔ ہری سنگھ چاہتا تھا وہ سرکشی اختیار کرے مگر وطن دوستی نے اس کے غیور جذبوں کو مجبوریوں کی زنجیریں پہنا دی تھیں۔

پھر وہ عجیب منظر دیکھنے میں آیا جب دس راجپوت سپاہیوں کا ایک دستہ قلعے کے صدر دروازے سے برآمد ہوا جس کا رخ چتوڑ پہاڑی کی طرف تھا جہاں سلطان علاء الدین خلجی نے پرچم لہرانے کے ساتھ ساتھ اپنا دربار بھی آراستہ کیا تھا۔ دس سپاہیوں کے درمیان ایک سبک رفتار گھوڑا تھا جس کی پشت پر سروں سے بھرا ہوا خوان موجود تھا۔ طشت پر سرخ رنگ کا کپڑا ڈال دیا گیا تھا جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ایک حکمراں کی طرف سے دوسرے فرمانروا کو کوئی قیمتی تحفہ بھیجا جا رہا ہے۔ جب راجہ رتن سنگھ کے سپاہیوں نے

نصف راستہ طے کر لیا تو ان کے دھندلے چہرے واضح نظر آنے لگے۔ سلطان کے خیمے پر پہرہ دینے والے سپاہی چونک اٹھے ابھی چند لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ پچاس ساٹھ شہسوار اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے آنے والے دشمن سپاہیوں کے قریب پہنچ گئے اور انہیں گھیرے میں لے لیا پھر تلاشی کے بعد سلطان کے خیمے میں جانے کی اجازت دیدی۔

علاءالدین خلجی اپنے سپہ سالاروں کے ساتھ اس طرح جلوہ افروز تھا کہ حضرت امیر خسروؒ اس کے دائیں جانب کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے' بائیں طرف سپہ سالار خواجہ حاجی 'تاج الدین عراقی 'ملک نصرت خان اور ملک ظفر خان دست بستہ بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے نائب فوجی افسر کھڑے ہوئے تھے۔ عارضی طور پر جو تخت بنایا گیا تھا اس کے نیچے مسلح سپاہیوں کی دورویہ قطاریں تھیں۔ جیسے ہی رتن سنگھ کے سپاہی طشت لے کر اندر داخل ہوئے ان کی نظر سلطان علاءالدین خلجی کے سرخ و سفید چہرے پر پڑی راجپوت فوجیوں نے پہلی نگاہ میں سلطان کی شخصیت سے کوئی تاثر قبول نہیں کیا مگر جب ان کی آنکھیں والئی ہند کی آنکھوں سے چار ہوئیں تو ایک لمحے کیلئے انہیں اپنے جسموں میں سنسنی سی محسوس ہوئی۔ علاءالدین خلجی کی آنکھوں میں ایک تیز چمک سی تھی جیسے چنگاریاں سی پھوٹ رہی ہوں اور یہی بلند اقبالی کی وہ روشنی تھی جسے عام انسان برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ راجپوت سپاہیوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اس طرح سیدھے کھڑے ہوگئے کہ ان کے ماتھوں پر غرور کی لکیریں تھیں اور گردنیں احساسِ فخر سے اکڑ گئی تھیں۔

راجپوت سپاہیوں کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھ کر سلطان علاءالدین خلجی زیرِ لب مسکرایا۔

رتن سنگھ کے فوجیوں سے سلطان کی یہ مسکراہٹ برداشت نہ ہو سکی۔ وہ سپاہی جو طشت اٹھائے ہوئے تھا' آگے بڑھا اور اس نے سرخ خوان پوش علاءالدین کے آگے رکھ دیا۔

"آخر رتن سنگھ کو احساس ہو گیا کہ ہمارے حضور نذر پیش کرنے ہی میں اس کیلئے امن اور سلامتی ہے۔" جیسے ہی وہ سپاہی طشت رکھ کر سیدھا ہوا علاءالدین نے دوسرے سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اس میں کیا ہے ؟" سلطان نے طشت کی طرف اشارہ کیا۔ "رتن سنگھ کو معلوم بھی ہے کہ ہر چیز ہمارے شایانِ شان نہیں ہوتی۔"

"یہ تحفہ بڑا گرانقدر ہے سلطان۔" ایک راجپوت سپاہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہمارے سمراٹ کی پیش کی ہوئی نذر یقیناً آپ کو پسند آئے گی۔"

علاءالدین خلجی نے ایک بار پھر طشت کو غور سے دیکھا اور چونک اٹھا.......... "ہمارے یہاں سرخ رنگ قتل و غارت اور جنگ کی علامت ہے۔ نذر ایسی تو نہیں ہوتی کہ اس سے خون ٹپکتا نظر آئے۔"

"ہمارے یہاں کی یہی ریت ہے۔" راجہ رتن سنگھ کے دوسرے سپاہی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ہم راجپوت جب کسی کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں تو ہمارے تحائف کا رنگ خون کی طرح سرخ ہو جاتا ہے۔ یہ اپنے اپنے جینے کی ادا ہے۔ محبت کا انداز ہے۔"

علاءالدین کے چہرے کا رنگ بدل گیا.......... "پھر اپنے ہاتھ سے اس کپڑے کو الٹ دو۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ راجپوتوں کی رسموں کا رنگ زیادہ سرخ ہے یا ہمارے جلال کا ؟"

خیمے میں موجود سپہ سالاروں کی نظریں طشت پر مرکوز تھیں۔ راجپوت سپاہی نے آگے بڑھ کر خوان پوش الٹ دیا۔ خیمے کی فضائیں چند لمحے کیلئے ساکت ہو گئیں۔ تمام سپہ سالار گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور اپنی اپنی تلوار کے دستوں پر ان کے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

"بیٹھ جاؤ عراقی!" سلطان اپنے سپہ سالاروں سے مخاطب ہوا۔ "پُر سکون رہو حاجی! اشتعال میں نہ

آؤ ملک نصرت! اور ملک ظفر! تم کسی وحشت کا مظاہرہ نہ کرو۔ تمہارے سلطان نے یہ کھیل بہت دیکھے ہیں۔"

"سلطانِ والا حشم! یہ آپ کے جاہ و جلال کی توہین ہے۔" سپہ سالار تاج الدین عراقی نے ادب سے خم ہوتے ہوئے کہا.......... "ہمیں حکم دیجئے کہ ہم اس سے زیادہ خون رنگ تحائف رتن سنگھ کو ارسال کریں۔ یہ چار سر اور باقی دس سپاہیوں کے سر' ہم رتن سنگھ کے دربار میں پھینک کر آئیں گے۔"

"نہیں عراقی! اتنے جذباتی نہ ہو۔ عقل و ہوش سے کام لو.........." سلطان علاءالدین خلجی نے انتہائی پر سکون لہجے میں کہا۔ "حافظہ تمہارا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ عراقی! تمہیں یاد نہیں رہا کہ ہم دوبارہ یہ خون رنگ تحائف رتن سنگھ کو بھیج چکے ہیں۔"

عراقی سیدھا ہو گیا مگر اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

"ہم تمہارے راجہ کا یہ تحفہ ٹھکرا بھی سکتے ہیں۔" علاءالدین خلجی بڑے سرد لہجے میں بول رہا تھا جیسے وہ اپنی شمشیر سے آہستہ آہستہ رتن سنگھ کے سپاہیوں کی شہ رگیں کاٹ رہا ہو۔ "ہماری ایک ہلکی سی ٹھوکر ان بدنصیب سپاہیوں کو مزید رسوا کر سکتی ہے مگر ہم سلطان ہیں۔ مرنے والوں کو اپنے جذبۂ انتقام کا ہدف نہیں بناتے.........." یہ کہہ کر علاءالدین چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا اور راجپوت سپاہیوں کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ جن کے ماتھوں پر نخوت کے بل ابھی تک نمایاں تھے اور جن کی گردنیں بدستور کج نظر آ رہی تھیں۔ "تمہارے راجہ نے ہمیں تحفہ ضرور بھیجا مگر وہ ہمارے مرتبے کو نہ پہچان سکا اور بدحواسی میں اپنی حیثیت بھی بھول گیا۔" سلطان دوبارہ راجپوت سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "آخر وہ ایک معمولی جاگیردار ہے۔ اسے کیا معلوم کہ شہنشاہ کے حضور کیا نذر پیش کی جاتی ہے۔ ہم اسے احمق سمجھتے تھے لیکن اتنا بھی نہیں کہ وہ اپنے آپ کو دیوانہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ اپنے ہی وفاداروں کی گردنیں کاٹ کر ہمیں پیش کر دے گا۔"

"یہ دیوانگی نہیں۔" ایک راجپوت سپاہی نے جواباً کہا۔ "ہمارے سمراٹ نے جو کچھ کیا ہے پورے ہوش و حواس کے ساتھ کیا ہے۔ اپنے دشمن کے نام ان کا پیغام ہے کہ راجپوت شکست کی ذلت برداشت کرنے سے پہلے موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔"

ایک سپاہی خاموش ہوا تو دوسرا کہنے لگا۔ "سمراٹ نے یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں آگ اور خون کا کوئی کھیل بھی متاثر نہیں کر سکتا۔"

"تمہارا سمراٹ جھوٹ بولتا ہے۔" سلطان کے ہونٹوں پر بڑی تحقیر آمیز مسکراہٹ رقصاں تھی۔.......... "اگر موت کا خوف اس کے اعصاب پر مسلط نہیں ہوتا تو وہ اپنے ہی جاں نثاروں کو زندگی سے محروم نہ کر دیتا۔ یہ وحشیانہ حرکت اس کی بزدلی کی دلیل ہے۔ ہمیں خدا نے دو اضافی آنکھیں عطا کی ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں سے تمہارے سمراٹ کو پراسرار تہہ خانوں اور خفیہ سرنگوں میں چھپتا دیکھ رہے ہیں۔ ابھی اس نے راجپوت سپاہیوں کے سر قطع کئے ہیں مگر ہماری آنکھیں تو اس وقت کا بھی مشاہدہ کر رہی ہیں جب وہ اپنی گردن کاٹ کر ہمارے قدموں پر رکھ دے گا۔ تم واپس جاؤ اور اس سے کہہ دینا کہ ہم نے اس کا حقیر تحفہ قبول کیا۔ اگرچہ ہمارے شوقِ تسخیر کے شعلوں کو تمام اہالیان چتوڑ کے خون کی بارش بھی سرد نہیں کر سکتی لیکن کیا کریں کہ ہمارا حریف بہت مفلس اور مجبور و ناتواں انسان ہے۔ ایک بھکاری ہماری نذر کیلئے اور کیا بھیج سکتا تھا ؟"

جیسے ہی راجپوت سپاہی اپنے دلوں میں نفرتوں کا طوفان چھپائے مڑے' علاءالدین نے چیخ کر اپنے سپاہیوں سے کہا.......... "ان بےادبوں کو دربار شاہی کے آداب سکھاؤ۔"

راجپوت سپاہیوں کے مڑتے ہی ان کی پشت سلطان کی طرف ہو گئی تھی۔ علاءالدین یہ گستاخی برداشت نہ کر سکا۔ اپنے سلطان کی آواز سنتے ہی سپاہیوں کی شمشیریں بے نیام ہو گئیں اور ان کی نوکیں راجپوت فوجیوں کے سینوں میں چبھنے لگیں۔ رتن سنگھ کے نمائندے کچھ دیر تو فولاد کی سوزش برداشت کرتے رہے مگر جب شاہی تلواریں گوشت کی دیواروں کو کاٹتی ہوئی ہڈیوں میں اترنے لگیں تو پلٹ پڑے اب ان کے چہرے علاءالدین کی طرف تھے۔

"تمہارے جاہل سمراٹ نے تمہیں دربارِ شاہی میں داخلے اور واپسی کے آداب نہیں سکھائے۔" علاءالدین کا لہجہ قہرناک ہو گیا تھا.......... "اب الٹے قدموں واپس جاؤ اور اس وقت تک چلتے رہو جب تک تمہارے مکروہ چہرے ہماری نظروں کے سامنے سے اوجھل نہ ہو جائیں۔"

راجہ کے سپاہی کچھ دیر تک ساکت کھڑے رہے مگر جب انہیں اپنی پشت پر تلواروں کا دباؤ محسوس ہوا تو وہ اس حقیقت تک پہنچ گئے کہ سلطان اپنی بات تسلیم کرائے بغیر واپس جانے نہیں دے گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی راجپوت سپاہی پیچھے ہٹنے لگے۔ ان کی گردنیں تنی ہوئی تھیں اور سینوں پر خون کے ہلکے ہلکے نشانات نظر آ رہے تھے۔

رتن سنگھ کے سپاہی ابھی چند قدم ہی پیچھے ہٹے ہوں گے کہ سلطان کی گرجدار آواز ابھری..........

"ٹھہرو۔" علاءالدین کی تیز آواز سن کر وہ رک گئے۔

"ہماری بارگاہ میں تحفہ لانے والے غلام خالی ہاتھ واپس نہیں جاتے۔" یہ کہہ کر علاءالدین اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "ان کے دامن اشرفیوں سے بھر دو۔"

سلطان کے حکم کی گونج ختم ہوتے ہی سونے کے سکوں سے بھرے ہوئے طشت لائے گئے شاہی لشکر کے ایک سپاہی نے سخت لہجے میں کہا۔ "اپنے اپنے دامن پھیلاؤ تاکہ تمہیں سلطان عالی مقام کی بخشش و عطا کا اندازہ ہو سکے۔"

ایک آزاد قوم کے افراد کیلئے یہ تحقیر ناقابل برداشت تھی نفرت و غضب کی شدت سے راجپوت سپاہیوں کے چہرے جلنے لگے۔ پھر بیک وقت ان سب کی نفرت آمیز صدائیں شاہی خیمے میں گونجنے لگیں۔

"آج تک ہمارے دامن کسی کے سامنے نہیں پھیلے۔ اس طرح تو ہم اپنے سمراٹ کے دیئے ہوئے انعام و اکرام بھی قبول نہیں کرتے۔"

"تمہیں اپنی رسمیں اور عادتیں بدلنا ہوں گی۔" علاءالدین پوری طاقت سے چیخا۔ "یہ کسی جاگیردار کی سرائے نہیں' فاتح عالم سلطان علاءالدین خلجی کا دربار ہے۔"

علاءالدین اپنے جاہ و جلال کا مظاہرہ کرتا رہا مگر راجپوت سپاہیوں کے ہاتھوں کو جنبش نہیں ہوئی۔ نہ ان کی گردنوں کا تناؤ ختم ہوا اور نہ چہروں کی آگ۔

سلطان کی سماعت نے آج تک حرفِ انکار نہیں سنا تھا۔ راجپوت سپاہیوں کی سرکشی نے اسے بہت زیادہ مشتعل کر دیا۔ علاءالدین کے سپاہیوں نے راجپوت فوجیوں کی گردنوں پر اپنی شمشیریں رکھ دیں مگر انہوں نے ہمت کر کے اس حقیقت کو جھٹلا دیا کہ ان کی شہ رگوں پر دست قضا کے خنجروں کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔

اور پھر جب چتوڑ کے سپاہی کسی طرح بھی شاہی عطیات قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے تو سلطان غصے

سے بے قابو ہو گیا۔

"ان کے چہروں پر لعنتوں کی سیاہی مل دو۔" سلطان کے لبوں سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔ "اگر ہمیں قانونِ سفارت کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم ان پہاڑی کتوں کی زبانیں کاٹ کر رتن سنگھ کو بھیج دیتے اور سنگلاخ دیواروں کی اوٹ سے جھانکنے والی اس لومڑی کو بتا دیتے کہ شیروں کو چھیڑنے کا انجام کس قدر بھیانک ہوتا ہے؟"

حکم شاہی کو کون ٹال سکتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے راجپوت سپاہیوں کے چہروں پر گہری کالک مل دی گئی۔ راجپوت سپاہی چیختے رہے۔ "اس کے علاوہ تیرے اختیار میں کیا ہے کہ تو ہمارے چہروں کو کالا کر دے مگر ان غیرت مند دلوں کا کیا کرے گا جو سورج سے بھی زیادہ روشن ہیں۔"

"ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔" علاءالدین نے ایک شان بے نیازی کے ساتھ کہا۔ "تمہیں اپنے جن آزاد جذبوں اور روشن دلوں پر ناز ہے' ہماری ہیبت سے ایک دن وہ بھی بجھ جائیں گے۔"

جب راجپوت سپاہیوں کے چہرے سیاہ کر کے انہیں خیمے سے رخصت کیا گیا تو جوشِ جذبات میں خود علاءالدین خلجی بھی باہر نکل آیا۔ رتن سنگھ کے فوجی ذلتوں کے پسینے میں نہائے ہوئے لڑکھڑاتے قدموں سے قلعے کی طرف جاتے رہے۔

"بازاری عورتوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے اس نامرد سے کہہ دینا کہ جس غلیظ کھیل کی ابتداء تو نے کی ہے' اس کی انتہا ہم کریں گے۔ ہم نے چاہا تھا کہ ہم تیرے ساتھ شاہوں کی طرح پیش آئیں مگر تو اپنی سطح سے گر گیا۔ خدائے ذوالجلال کی قسم! اہلِ دنیا نے ہمارے نفرت و غضب کو حقیقی لباس میں نہیں دیکھا۔ اب فاتح عالم کا قہر چتوڑ کے در و دیوار پر اس طرح برسے گا کہ آنے والی صدیاں بھی اسے فراموش نہ کر سکیں گی۔"

☆..........☆..........☆

پھر جب راجپوت سپاہی اپنے سیاہ چہروں کے ساتھ رتن سنگھ کے دربار میں داخل ہوئے تو ایک کہرام سا برپا ہو گیا۔

سیناپتی ہری سنگھ نے سپاہیوں کو دیکھتے ہی کہا۔ "سمراٹ! یہ کالک دس چہروں پر نہیں ملی گئی ہے بلکہ سلطان نے چتوڑ کی پوری تاریخ کو سیاہی میں ڈبو دیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ علاءالدین ایسا ہی کرے گا۔ دیوتاؤں کی سوگندھ! یہ بے مقصد چھیڑ چھاڑ ہمیں بہت مہنگی پڑے گی۔"

اس تلخ تجربے کے بعد راجہ رتن سنگھ کے غرور کا نشہ ٹوٹنے لگا تھا اور رانی پدمنی کے تکبر کا خمار اترتا جا رہا تھا۔ دیوانگی کے بجائے ہوش و خرد سے کام لیا گیا اور تمام راجپوت سردار سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ چتوڑ کو موت کے خونی پنجوں کی گرفت سے دور رکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ سب سے پہلے سامان رسد کا جائزہ لیا گیا۔ رسد کی ترسیل کا کام اگرچہ زیادہ تیز نہیں تھا لیکن مسلسل تین ماہ کی ذخیرہ اندوزی نے راجپوتوں کو اس قابل کر دیا تھا کہ وہ چھ ماہ تک ضروریات زندگی سے بے نیاز رہ کر جنگ کر سکتے تھے۔ یہ ایک اطمینان بخش پہلو تھا جس نے راجہ رتن سنگھ اور چتوڑ کے سپاہیوں کو نئے حوصلے بخشے تھے مگر سلطان کی پیش قدمی نے ہری سنگھ اور لچھمن سنگھ کو ایسے اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا جن کا بظاہر کوئی علاج ممکن نہیں تھا۔ فوجی امور کے ماہر ہونے کی حیثیت سے ہری سنگھ اور لچھمن سنگھ' علاءالدین خلجی کی منصوبہ بندی کو چتوڑ کی سلامتی کیلئے خطرۂ عظیم قرار دے رہے تھے۔ ان کے خیال میں شاہی فوجوں کا قلعے کے مقابل پہاڑی تک پہنچ جانا کوئی

اچھی علامت نہیں تھی بہت غور و فکر کے بعد آخر ہری سنگھ نے لب کشائی کی۔

"سمراٹ! میں سونگرا کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ سلطان کا بے خوف و خطر آگے بڑھنا کسی وحشت یا اضطراب کی دلیل نہیں۔ ہمارا دشمن مکمل آسودگی اور اطمینان سے جہاں چاہتا ہے اپنی فوجوں کو حرکت دیتا ہے۔ ہم چاروں طرف سے محصور ہو چکے ہیں۔ بے شک! ہمارے پرکھوں کا بنایا ہوا یہ مضبوط قلعہ ہماری محفوظ ترین پناہ گاہ ہے۔ مگر ہم پتھر کی دیواروں پر زیادہ بھروسہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنے ماضی سے سبق لینا چاہئے۔ تاراگڑھ قلعے کے بارے میں بھی یہی روایتیں مشہور تھیں کہ وہ ناقابل تسخیر ہے اور دشمن کے ناپاک قدم اسے چھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ جب شہاب الدین غوری کی فوجیں قلعے سے سیکڑوں فٹ نیچے وادی میں گردش کر رہی تھیں تو ان کے اس عمل کو کیڑے مکوڑوں کی حرکت سے تعبیر کیا گیا تھا۔ بلند ترین پناہ گاہوں میں بیٹھے ہوئے راجپوت سپاہی غوری کے اس اقدام کا مذاق اڑاتے ہوئے مسلمان حکمراں کو پاگل کہتے تھے ان کے خیال میں شہاب الدین آٹھ سو فٹ کی بلندی پر چڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر اس کی فوجیں اس دیوانگی کا مظاہرہ کرتیں تو اوپر بیٹھے ہوئے راجپوت سپاہی صرف پتھر مار کر ہی اپنے دشمن کو ہلاک کر ڈالتے۔ یہ ہماری قوم کا ایک گمراہ کن خواب تھا جسے بالآخر شہاب الدین غوری نے پارہ پارہ کر دیا خیالوں کے طلسم میں گرفتار رہنے والے یہی کہتے رہے کہ تاراگڑھ کا قلعہ سمندر کی سطح سے دو ہزار آٹھ سو چپن فٹ بلند ہے' اس کی اونچائی تک کوئی ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ مگر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ غوری کے لمبے ہاتھوں نے تاراگڑھ کی آخری چوٹی کو چھو لیا اور پھر بلندیوں کی اس دستار کو دھجیاں کر کے ہوا میں بکھیر دیا گیا۔"

ماضی کی اس تلخ روداد کو سن کر راجہ رتن سنگھ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے اور اس نے اپنے سیناپتی کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہری سنگھ! یہ کونسا موقع ہے کہ ہم اپنے سڑے ہوئے زخموں کو کریدیں اور ان کی بو سے اپنے دماغوں کو منتشر کر ڈالیں۔"

"قوموں کیلئے سمراٹ! اپنی شکست و ناکامی کی تاریخ کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔" ہری سنگھ نے اپنے حکمراں کی ناراضگی کا احساس کئے بغیر کہا۔ "اس طرح ہمیں پتا چل سکتا ہے کہ ہم نے کہاں غلطی کی تھی اور ہماری ایک لغزش کے کیا نتائج برآمد ہوئے تھے؟ چتوڑ کا فوجی ٹھکانہ یقیناً تاراگڑھ سے زیادہ مضبوط ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آج تک کسی مسلم حکمراں نے اسے تسخیر کرنے کا خواب نہیں دیکھا مگر علاء الدین مسلسل یہ خواب دیکھ رہا ہے اور اپنے اس خواب کی تعبیر حاصل کرنے کیلئے چٹانوں سے سر بھی ٹکرا رہا ہے۔ میں اہلِ مجلس سے صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا سلطان کا یہ عمل محض دیوانگی ہے؟"

"تاراگڑھ اور چتوڑ میں فرق ہے۔" ایک سردار نے انتہائی تضحیک آمیز لہجے میں ہری سنگھ کو مخاطب کیا۔ "ہمارے سیناپتی اس حقیقت کو فراموش کر رہے ہیں کہ تاراگڑھ کا محافظ پرتھوی راج چوہان تھا اور چتوڑ کے نگہبان ادھیراج (شہنشاہِ اعظم) رتن سنگھ ہیں۔" یہ خوشامد اور مصاحبت کی ایک خوفناک افیون تھی جو رتن سنگھ کو پلا دی گئی اور وہ عورت پرست حکمراں اس نشے سے بہت زیادہ سرشار نظر آنے لگا۔

راجپوت سرداروں کو غرورِ قومی نے اندھا کر دیا تھا اور ان کی عقل مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ چتوڑ کے قلعے کو تاراگڑھ سے زیادہ مضبوط و مستحکم اور بلند سمجھ رہے تھے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ تاراگڑھ اپنی اونچائی اور استحکام میں چتوڑ سے بڑھ کر تھا۔ چتوڑ سطح زمین سے پانچ سو فٹ بلند تھا اور سطح سمندر سے اٹھارہ سو پچاس فٹ۔ اس کی لمبائی تقریباً تین میل تھی اور چوڑائی نصف میل۔ شاید اسی طول و عرض کی بنیاد پر راجپوت سردار

تاراگڑھ کے مقابلے میں چتوڑ کو ترجیح دے رہے تھے۔ چتوڑ کے قلعے میں ایک خوبی اور تھی جو تاراگڑھ کا مقدر نہیں بن سکی تھی۔ اس قلعے میں تالاب کنڈ' باؤڑیاں اور جھرنے ہمیشہ پانی سے بھرے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ قحط کے زمانے میں بھی قلعے کے اندر پانی کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کثرتِ آب کی وجہ سے قلعے کی حدود میں اناج کی فصلیں بھی اگائی جا سکتی تھیں۔ یہاں کے حکمرانوں کا خیال تھا کہ اگر کوئی حملہ آور نشیبی علاقے کا محاصرہ بھی کر لے تو قلعے کے باسیوں کو کھانے پینے کی چیزوں کا محتاج نہیں ہونا پڑے گا۔ یہی وہ جغرافیائی حالات تھے جن کے زیر اثر راجپوت سردار بدمستوں کے انداز میں سوچ رہے تھے اور ہری سنگھ جیسے ذہین ترین سپہ سالار کی مثبت سوچ کو نہایت جاہلانہ طریق سے ٹھکرایا جا رہا تھا۔

ہری سنگھ تنہا کیا کرتا' اکثریت کی بے عقلی کا مرثیہ پڑھتا ہوا اٹھ گیا۔ "میں نے یہ بحث ذاتی نمود و نمائش کیلئے نہیں چھیڑی تھی۔ اس سے میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ ہم اپنی اور دشمن کی صحیح طاقت کا اندازہ کر سکیں۔ یہ جنگ تو سب لوگوں کو مل کر لڑنا ہے۔ پھر بھی میں سمراٹ سے اتنی التجا کروں گا کہ وہ سونگرا مال دیو سنگھ کی باتوں کو صرف جوشِ جوانی کا مظاہرہ نہ سمجھیں۔ ہمارے جاسوس اس راز کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں کہ علاء الدین خلجی اس قدر اطمینان کے ساتھ آگے کیوں بڑھ رہا ہے اور اس کے پاس وہ کونسا اسلحہ ہے جو قلعے کی تسخیر کیلئے استعمال کیا جائے گا۔"

ہری سنگھ کے اس سوال کے جواب میں رتن سنگھ نے کہا۔ "ہمارے جاسوس اطلاع دے چکے ہیں کہ سلطان کے پاس تیروں' نیزوں' شمشیروں اور بھاری گرزوں کے علاوہ ایسا کوئی اسلحہ نہیں جو قلعہ شکنی کے کام آسکے۔"

ہری سنگھ مایوس ہو چکا تھا لیکن اس نے ضبط و ہوش سے کام لیتے ہوئے اپنی رائے پیش کی۔ "میں راج دربار کے جاسوسوں کی تحقیق پر شک نہیں کرتا مگر یہ بھی سچ ہے کہ میرے اندر کی آواز چتوڑ کے دوسرے جان نثاروں کی آواز سے مختلف ہے۔"

راجہ رتن سنگھ' رانی پدمنی اور دوسرے راجپوت سرداروں نے ہری سنگھ کے زاویۂ نظر کو جاننے کی کوشش نہیں کی اور وہ فوجی اجلاس یہ کہہ کر ختم کر دیا گیا کہ سلطان کے اگلے اقدام کا انتظار کیا جائے اور پھر جنگی ضرورت کے مطابق چتوڑ کے لشکروں کو حرکت دی جائے۔

☆..........☆..........☆

راجہ رتن سنگھ کی اس حرکت سے سلطان بہت زیادہ برہم ہو گیا تھا اور اس نے شاہی جاسوسوں کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"رتن سنگھ کی یہ گستاخی بے سبب نہیں تھی۔ وہ مکمل طور پر اپنے آپ کو ہماری یلغار سے محفوظ سمجھتا ہے اور اس نے یقین کر لیا ہے کہ ہمارے ہاتھ بہت مختصر ہیں۔"

شاہی جاسوسوں نے اپنی گردنیں خم کر دیں۔

"تمہارے جھکے ہوئے سر ہمارے سوال کا جواب نہیں ہیں۔" علاء الدین کا لہجہ بہت تند و تیز تھا۔ "ہم اب تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ قلعے میں سامان رسد کا ذخیرہ پہلے سے موجود ہے یا کسی خفیہ راستے سے اس کی ترسیل ابھی تک جاری ہے؟ ہم نے بظاہر رتن سنگھ کی تمام راہیں مسدود کر دی ہیں اور وہ بیرونی دنیا سے بالکل کٹ کر رہ گیا ہے مگر ہمیں ہماری عقل خبر دیتی ہے کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ آج بھی باہر کی فضاؤں سے اس کا رابطہ برقرار ہے۔ ہم تمہیں ایک ہفتے کی مہلت دیتے ہیں کہ اگر اس قسم کا کوئی تعلق موجود ہے تو اسے بنیادوں سے کاٹ دیا جائے۔"

اس حکم کے بعد سلطان کے جاسوسی دستے میں ہلچل سی مچ گئی۔ وہ جانتے تھے کہ سلطان ناکامی کی تفصیلات سننے کا عادی نہیں ہے۔ وہ صرف جشنِ فتح منانا جانتا ہے۔ اس نے شکست کی کسی تقریب کا منہ نہیں دیکھا' اس لئے وہ جاسوسوں کی جھکی ہوئی گردنوں اور لڑکھڑاتی ہوئی زبانوں کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ اس تصور نے جاسوسوں کے خون کی گردش تیز کر دی تھی اور اسی گرم خون کا اثر تھا کہ سلطان کے خفیہ نمائندوں نے تین دن کے اندر اس سرنگ کا راستہ دریافت کر لیا جس سے گزر کر اناج کی بھری ہوئی بیل گاڑیاں قلعے تک پہنچتی تھیں۔ یہ چتوڑ کے مضافات کا ایک جنگلی علاقہ تھا جہاں گھنے درختوں کی اتنی کثرت تھی کہ دن کے وقت بھی رات کا گمان ہوتا تھا جب شاہی جاسوس دور دور تک چاروں طرف پھیل گئے تو ایک روز انہیں ایک ایسی بیل گاڑی نظر آئی جو انتہائی ویران علاقے کی طرف جا رہی تھی مختلف پیچ دار راستوں سے گزر کر اس کا تعاقب کیا گیا تو یہ راز فاش ہوا کہ گھنے درختوں اور خار دار جھاڑیوں کو کاٹ کر سرنگ کے دہانے تک پہنچنے کا راستہ بنایا گیا تھا۔ بیل گاڑی گیہوں' چاول سے بھری ہوئی تھی۔ اناج کا یہ ذخیرہ دور دراز کے دیہاتوں سے جمع کر کے اس سنسان جگہ لایا جاتا تھا' اور پھر بڑی ہوشیاری کے ساتھ منتقل کر دیا جاتا تھا۔ شاہی جاسوسوں نے پیڑوں کی اوٹ سے بیل گاڑی کو دیکھا اور خاموشی کے ساتھ جانے دیا۔ سراغ مل گیا تھا۔ دوسرے ہی دن شاہی فوج کے ایک دستے نے ان باربرداروں کو روک لیا۔ جب ان پر سختی کی گئی تو وہ اپنی زبانیں بند نہ رکھ سکے۔ سلطان کو اس کامیابی کی خبر دی تو وہ جوشِ مسرت سے مسکرایا اور اپنی فوج کا ایک طاقتور دستہ سرنگ کے دہانے پر متعین کرتے ہوئے نیا حکم جاری کر دیا۔

"ہمارے کسی سپاہی کو اندر داخل ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمام فوجی رات دن سرنگ کے دہانے پر مستعد کھڑے رہیں جب اناج کی ترسیل منقطع ہو جائے گی تو خبر گیری کیلئے رتن سنگھ کے آدمی یقیناً باہر آئیں گے اس وقت انہیں بے دریغ قتل کر دیا جائے۔"

پھر ایسا ہی کیا گیا۔ رتن سنگھ کے جس قدر سپاہی بدلی ہوئی صورت حال کا جائزہ لینے کیلئے سرنگ کے باہر آئے انہیں دوبارہ لوٹ کر جانا نصیب نہیں ہوا۔

راج دربار میں طوفان سا آ گیا۔ علاءالدین خلجی نے ایک بہت اہم محاذ پر راجہ رتن سنگھ کو شکست دیدی تھی۔ اگرچہ قلعے میں تین چار ماہ کا ذخیرہ موجود تھا لیکن محاصرہ مزید طویل ہونے کی صورت میں قلعہ نشینوں کے سامنے فاقہ کشی کا بھوت اپنی تمامتر ہولناکیوں کے ساتھ رقص کرنے لگا تھا۔

مجبوراً راجہ رتن سنگھ کو اپنی فوجی قوت کا پہلا مظاہرہ کرنا پڑا۔ طویل غور و فکر کے بعد ہری سنگھ اور پچھمن سنگھ کے مشوروں سے ریاست کے بہترین تیر اندازوں کا انتخاب کیا گیا۔ یہ سارے تیر انداز انتہائی ماہر نشانہ باز تھے اور جسمانی طاقت کے اعتبار سے پورے راجستھان میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔ تیر اندازوں کو حکم دیا گیا کہ وہ قلعے کی فصیل کے آخری کنارے پر پہنچ کر اپنے نشانے آزمائیں۔ اگر سلطان کا خیمہ تیروں کی زد میں آ گیا تو یہ چتوڑ کیلئے بہت زیادہ خوش قسمتی کی بات ہوگی۔

تیر اندازوں نے علاءالدین کے خیمے پر نگاہ کی۔ ان کا خیال تھا کہ سلطان کی پناہ گاہ زہریلے تیروں کی دسترس سے محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ اسی لئے راجپوت تیر انداز ناقابل بیان حد تک پر جوش نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار اپنی کمانوں کو دیکھا۔ طاقتور بازوؤں پر نظر ڈالی اور بہت تیزی سے کمانیں چڑھا لیں۔ سانسوں کا توازن برقرار رکھنے کیلئے اپنے سینوں کو ابھارا اور "مہابھارت" کے فاتح ارجن کا نام لے کر تیر نشانے کی طرف چھوڑ دیئے۔ زہر میں بجھے ہوئے لوہے کے یہ ٹکڑے کچھ دیر تک ہوا میں تیرتے رہے اور پھر زمین پر گر گئے۔ تیر اندازوں کی ساری خوش فہمی دور ہو گئی۔ سلطان کا خیمہ تیروں کی پہنچ سے تقریباً چار گنا

فاصلے پر تھا۔

راجہ رتن سنگھ مایوس ہو گیا۔ سیناپتی ہری سنگھ نے یہ کہہ کر اسے آس دلائی کہ سلطان کو ہراساں کرنے کیلئے دوسرے ہدف کا انتخاب کیا جائے گا۔ قلعے کی فصیل سے علاءالدین کے خیمے پر تیروں کی بارش ممکن نہیں تھی۔ نتیجتاً ہری سنگھ نے اپنے تیر انداز دستے کو قلعے کے صدر دروازے سے باہر نکالا اور نئی ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ آہستہ روی اور احتیاط کے ساتھ آگے بڑھتے رہو اور جب سلطان کا خیمہ تمہارے نشانے پر آ جائے تو بے دریغ تیروں کی بارش کر دو۔"

راجپوت تیر انداز اپنے سیناپتی کی ہدایت کے مطابق بہت محتاط انداز میں آگے بڑھے سلطان کے نگراں دستے جو خیمے کے چاروں طرف دور دور تک گشت کر رہے تھے چتوڑ کے سپاہیوں کی نقل و حرکت دیکھ کر چند لمحوں کیلئے حیرت زدہ ہوئے اور ان پر جھپٹنے کیلئے پر تولنے لگے ساتھ ہی اس صورت حال سے سلطان کو بھی آگاہ کیا گیا۔

علاءالدین خلجی جو بہت پہلے جنگ کی منصوبہ بندی کر چکا تھا اس صورت حال سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا اس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے تیر انداز دستوں کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر دشمنوں کے سینے چاک کر ڈالیں۔ یہ ایک عجیب جنگی چال تھی جسے چتوڑ کے سپاہی سمجھنے سے عاجز رہے۔ سلطان نے اپنے تیر اندازوں کو اس طرح روانہ کیا تھا کہ اگلی قطار میں پیدل سپاہیوں کا ایک دستہ تھا جس کے ہر سپاہی کے دائیں ہاتھ میں چمکدار نیزہ اور بائیں ہاتھ میں معمول سے زیادہ چوڑی ڈھال تھی۔ بظاہر یہ سپاہی کاندھے سے کاندھا ملا کر چل رہے تھے مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا دور سے دیکھنے والوں کو سپاہیوں کی قطار میں کوئی شگاف نظر نہیں آتا تھا لیکن واقعہ یہ تھا کہ سلطان نے ہر سپاہی کے درمیان چھ انچ کا فاصلہ برقرار رکھنے کا حکم دیا تھا اس طرح فوجیوں کی نیزہ بردار صف میں شروع سے آخر تک ایک مختصر سا خلاء موجود تھا جو چتوڑ کے سپاہیوں کو کسی طرح بھی نظر نہیں آ سکتا تھا اسی خلاء سے کام لینے کیلئے علاءالدین خلجی نے اپنے تیر اندازوں کو پچھلی قطار میں متعین کیا تھا اور جنگ کا طریقہ کار اس طرح طے کر دیا تھا کہ راجپوت سپاہیوں کے جو تیر سلطانی خیمے کی طرف آئیں گے انہیں فولاد کی چوڑی ڈھالوں پر روکا جائے گا اور پھر اس سے پہلے کہ دشمن دوبارہ اپنی کمانوں کو سیدھا کرے علاءالدین کے تیر انداز درمیانی خلاء سے اپنے جوہر دکھائیں گے۔

راجپوت تیر انداز شاہی نیزہ برداروں کی ایک طویل قطار دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے کہ ان کے خیال میں سلطان نے راجپوتوں کے بھوکے شیروں کیلئے ایک لقمۂ تر بھیج دیا تھا۔ چتوڑ کے تیر انداز بے خوف و خطر آگے بڑھے اور اپنے ہدف کے قریب پہنچ کر انہوں نے شاہی نیزہ بردار دستے پر تیروں کی بارش کر دی۔ سلطان کے تجربہ کار سپاہی دشمن کے آنے والے ہر تیر کو اپنی مضبوط ڈھالوں پر روکتے اور پھر فوراً ہی درمیانی خلاء سے جوابی حملہ کرتے۔ راجپوت سپاہیوں کو پتا بھی نہیں چلا کہ یہ تیر کدھر سے آئے اور ان کے کئی ساتھیوں کا کام تمام کر گئے۔

سلطان کا نیزہ بردار دستہ اپنے تیر اندازوں کو عقب میں لئے ہوئے مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ راجپوت سپاہیوں نے پورے جوش کے ساتھ اپنے فن تیر اندازی کا مظاہرہ کیا مگر ان کا سارا ہنر رائیگاں گیا۔ سلطان کے تیر اندازوں نے دوسرے حملے میں کئی دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اب راجپوت تیر اندازوں پر یہ بھیانک حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ میدان جنگ میں سلطان کے فوجیوں کی دو قطاریں گردش کر رہی ہیں۔ نیزہ بردار دستہ محض ایک فریب ہے اور سلطان کی اصل طاقت تیر اندازوں کا وہ دستہ ہے جسے کوئی ضرر نہیں پہنچایا

جا سکتا۔ اس خیال نے راجپوت سپاہیوں پر وحشت سی طاری کر دی۔ اب ان کی ساری کوششیں کارِ عبث تھیں اور زہریلے تیر فولادی ڈھالوں سے ٹکرا ٹکرا کر زمین پر گر رہے تھے بساط الٹ گئی تھی۔ راجپوت تیراندازوں نے اپنے حصار میں واپس جانا چاہا مگر سلطان کے جاں نثاروں نے واپسی کے تمام راستے بند کر دیئے۔ چتوڑ کے بہترین تیراندازوں کی لاشیں قلعے سے کچھ فاصلے پر پڑی ملیں۔ بمشکل چند تیرانداز فرار کی ذلت برداشت کر کے اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے۔

سلطان نے یہ محاذ بھی آسانی سے جیت لیا تھا۔ فاتح دستے شاہی خیمے کی جانب لوٹنے ہی والے تھے کہ انہیں علاءالدین خلجی کا دوسرا حکم موصول ہوا۔ "دشمن سپاہیوں کی لاشوں کو ان کی مذہبی رسم کے مطابق آگ کے حوالے کر دو۔"

اور پھر سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے راجہ رتن سنگھ' رانی پدمنی اور دیگر راجپوت سرداروں نے قلعے کی فصیل سے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے دیکھے۔ چتوڑ کے ماہر تیراندازوں کی لاشیں جل رہی تھیں اور ہر طرف ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ تیز ہوا کا کوئی جھونکا رتن سنگھ اور پدمنی کے چہروں کو بھی چھو لیا کرتا تھا اور چتوڑ کے دونوں حکمراں محسوس کر رہے تھے جیسے علاءالدین کے ہاتھوں میں ایک جلتی ہوئی مشعل ہے اور وہ پورے قلعے کو آگ لگا دینے کیلئے برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا آ رہا ہے۔

چتوڑ کے تیرانداز دستوں کی تباہی اور پھر سپاہیوں کی لاشیں جلا دینے کے سلطانی عمل نے راجہ رتن سنگھ کے دربار میں ہلچل مچا دی۔ سپہ سالار ہری سنگھ اور لچھمن سنگھ بھی اداس بیٹھے تھے کہ ان دونوں کی ہدایت پر ریاست کا بہترین تیرانداز دستہ قلعے سے نکالا گیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے علاءالدین خلجی کے جانبازوں نے اسے اپنی خوراک بنا لیا تھا۔ ہری سنگھ اور دیگر راجپوت سرداروں کو اپنے سپاہیوں کی ہلاکت کا غم اس لئے نہیں تھا کہ وہ پیوند خاک ہو گئے۔ موت کے کھیل میں تو جنازے ہی اٹھتے ہیں۔ ہری سنگھ اس لئے ناقابل بیان اذیت میں مبتلا تھا کہ سلطان نے میدان جنگ میں ایک بڑی چال چلی تھی جسے چتوڑ کے فوجی ماہرین آخری لمحے تک سمجھ ہی نہیں سکے اور بڑے بھونڈے انداز میں مات کھا گئے۔ ہری سنگھ بہت بے قرار تھا اور بار بار اپنی نشست پر پہلو بدل رہا تھا۔ راجہ رتن سنگھ' رانی پدمنی' مہامنتری گنیش سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں نے اپنے سیناپتی کی بے قراریوں کو دیکھا اور پہلی بار صحیح حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے ہری سنگھ کو تسلیاں دینے لگے۔

"تم کیوں اداس ہوتے ہو ہری سنگھ کہ یہ تباہی تو جنگ کے کھیل کا ایک حصہ ہے ابھی چتوڑ کے جسم میں خون کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ چند قطروں کے بہہ جانے پر یہ ماتم کس لئے ؟ ابھی اور محاذ کھلیں گے' ابھی موت کا رقص نئے زاویے تبدیل کرے گا۔ پھر دیکھیں گے کہ کس میں کتنی طاقت ہے ؟"

ان تسکین آمیز کلمات سے ہری سنگھ کی وحشت کسی قدر کم ہو گئی تھی اور اس کے بجھے ہوئے چہرے پر ایک ایسا رنگ ابھر آیا تھا جس میں دشمن سے انتقام کی گہری جھلک موجود تھی۔

"میں سمراٹ رتن سنگھ' رانی پدمنی اور تمام راجپوت سرداروں کا شکر گزار ہوں کہ آج کوئی شخص میری شکست پر طعنہ زن نہیں۔ دشمن میرے اندازوں سے کہیں ہوشیار ثابت ہوا۔ اس بات کا مجھے شدید قلق ہے مگر میں اپنے فرمانروا اور اپنی قوم کے معزز اراکین کے سامنے قسم کھاتا ہوں کہ چتوڑ کے پیرہن سے شکست کے اس بدنما داغ کو بہت جلد دھو ڈالوں گا۔ سلطان کی یہ چال مجھ پر قرض ہے۔ علاءالدین کو نہیں معلوم مگر سارا چتوڑ جانتا ہے کہ ہری سنگھ اپنے سر پر قرض کے اس بوجھ کو زیادہ دن برداشت نہیں کر سکتا۔"

سپہ سالار ہری سنگھ کے اس انتقامی عہد و پیمان سے راج دربار میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔

قلعے کا محاصرہ روز بہ روز تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ سلطان کو چتوڑ کی پہاڑی پر خیمہ زن ہوئے پانچ ماہ گزر چکے تھے۔ اس دوران راجہ رتن سنگھ کے ایماء پر ہری سنگھ نے راجپوت سپاہیوں کے چھوٹے چھوٹے دستے بھیج کر سلطانی شمشیر کی کاٹ کو آزمانے کی کوشش کی تھی مگر یہ ایک احمقانہ فیصلہ تھا۔ علاءالدین کی تلواروں میں موت کی آب شامل تھی اور موت کسی جاندار کو نہیں چھوڑتی۔ رتن سنگھ کے سپاہی ایک بار قلعے سے نکلے تو پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ سلطان کے فوجیوں نے انہیں فرار کا بھی موقع نہیں دیا۔ قلعے کی فصیل سے ان کے جلتے ہوئے جسم ہی دیکھے گئے۔ رتن سنگھ کو میدان سے اٹھتا ہوا دھواں ہی نظر آیا جو چتوڑ کے افق پر تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔

علاءالدین نے راجہ رتن سنگھ کو اعصابی طور پر شکست دے دی تھی۔ بس چتوڑ کے قلعے پر عملاً قبضہ باقی تھا۔ ایک تاریخی فتح کا آغاز ہو چکا تھا لیکن محاصرے کی طوالت نے سلطان کو ایک عجیب سی الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

"اب ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔" ایک دن علاءالدین نے تمام سپہ سالاروں کو جمع کر کے کہا۔ "ہماری گفتگو کا یہ مفہوم نہ لیا جائے کہ ہم جلدباز ہیں اور عجلت میں کوئی فیصلہ کر کے پورے کھیل کو درہم برہم کر دینا چاہتے ہیں۔" علاءالدین کے ایک ایک لفظ سے جلالِ شاہی ٹپک رہا تھا۔ "اور یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ صحرا کی دھوپ نے ہمارا چہرہ جھلسا دیا ہے اور پتھروں کی چبھنے والی نوکوں نے ہمارے بستر کو بے آرام بنا دیا ہے اور رتن سنگھ کی محفوظ قلعہ بندی نے ہمارے سربلند ارادوں میں دراڑیں ڈال دی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دارالحکومت سے اتنا طویل فاصلہ آئین سیاست کے منافی ہے۔ ہم اپنے جاں نثاروں پر شک نہیں کرتے مگر دہلی سے اتنے دن دور رہنا دانشمندی کے خلاف ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ رتن سنگھ جلد از جلد ہمارے آگے گھٹنے ٹیک دے اور اس کا اٹھا ہوا سر ہمارے قدموں سے مس ہو جائے۔"

تمام سپہ سالاروں نے احتراماً اپنے سر جھکا دیئے اور ایک ایسا عجیب فیصلہ کیا گیا جس کی مثال ہندوستان کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس کے بعد سلطان نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اچھوتوں کی بستی سے چند بوڑھے اور ذی ہوش انسانوں کو لا کر ہمارے حضور پیش کیا جائے پھر جب وہ جہاندیدہ اچھوت بوڑھے سلطان کے سامنے لائے گئے تو والیٔ ہند نے ان سے عجیب عجیب سوالات شروع کر دیئے۔

"راجپوتوں کا طریقۂ جنگ کیا ہے ؟ یہ لوگ دشمن کے محاصرے کو کتنے دن تک برداشت کر سکتے ہیں ؟ شکست کے بعد ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے ؟ اور اگر شاہی فوجیں واپس چلی جائیں تو اچھوت بستیوں کے ساتھ ان کا کیا سلوک ہو گا ؟"

بوڑھے اچھوت' سلطان کے اکثر سوالات کا جواب دینے سے عاجز رہے مگر پھر بھی ان حوادث آشنا بوڑھوں نے اتنا ضرور بتایا کہ راجپوت فیصلہ کن جنگ لڑنے سے پہلے اپنے بیوی بچوں کو بھڑکتی ہوئی آگ کے حوالے کر دیتے ہیں پھر اپنے گھر اور مال و اسباب پھونک کر اس طرح میدان جنگ کا رخ کرتے ہیں کہ انہیں واپس نہیں لوٹنا ہے۔

عورتوں اور بچوں کو آگ میں جلائے جانے کا ذکر سن کر کچھ دیر کیلئے علاءالدین پر ایک اداسی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

سلطان نے آگ کے اس خوفناک کھیل کی تفصیلات پوچھیں تو بوڑھے اچھوتوں نے بتایا۔

"راجپوتوں کے یہاں غلامی کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ جب وہ لوگ یقین کر لیتے ہیں کہ ان

کے آزاد جسموں کو زنجیریں پہنادی جائیں گی تو پھر زندگی سے ساری محبت ختم ہو جاتی ہے اور وہ موت کو اپنی پری میکا (محبوبہ) سمجھنے لگتے ہیں۔ اس صورت میں راجپوت عورتیں ہنسی خوشی اپنے تمام زیورات پہن کر چھوٹے بچوں کے ہمراہ بھڑکتی ہوئی آگ میں کود پڑتی ہیں اور جب تک جل نہیں جاتیں اس وقت تک راجپوت مرد جنگ کیلئے باہر نہیں نکلتے پھر جیسے ہی ان کی آنکھوں کے سامنے بیوی بچوں کی راکھ اڑنے لگتی ہے وہ جے ماتا کے نعرے لگاتے ہوئے دشمن کے مقابل چلے جاتے ہیں۔"

علاءالدین خلجی نے جہالت کے ظلم وتشدد کی یہ دردناک داستان بہت غور سے سنی اور پھر اچھوت بوڑھوں سے ایک نیا سوال کیا۔ "اس وحشیانہ کھیل سے راجپوت مردوں کو کیا حاصل ہوتا ہے؟"

ایک بوڑھے اچھوت نے کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ کہا "سلطان! اس سلسلے میں ہم کچھ نہیں جانتے مگر پرکھوں سے یہی سنا ہے کہ راجپوت بہت غیرت مند ہوتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ میدان جنگ میں مارے جانے کے بعد دشمن ان کے ناموس پر للچائی ہوئی ہوسناک نظریں ڈالے۔ اس لئے وہ عورتوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے آگ کا ایندھن بنادیتے ہیں۔"

"اور وہ معصوم بچے؟ ان کے نذر آتش کرنے کا سبب؟" یکایک علاءالدین خلجی کا لہجہ قہر آلود ہو گیا تھا۔

"بچوں کو اس لئے آگ میں جھونکا جاتا ہے کہ راجپوت نسل محفوظ رہ سکے۔" بوڑھے اچھوت نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ نہیں چاہتے کہ ان کے بچے قید کر لئے جائیں اور پھر غلامانہ ماحول میں ان کی پرورش ہو۔"

"یہ شیطانی رسم ہے۔" سلطان شدتِ غضب سے چیخ اٹھا۔ "ہم اس رسم کو بدل ڈالیں گے۔"

"نہیں حضور! آپ اس رسم کو نہیں بدل سکتے۔" یہ کہتے ہوئے بوڑھے اچھوت نے سلطان کے سامنے زمین پر اپنا سر رکھ دیا۔ "وہ بہت وحشی ہیں آپ کے اندازے سے بھی زیادہ وحشی۔"

"ہمارے نفرت وغضب کا جال بہت مضبوط اور وسیع ہے۔" علاءالدین کا غصہ عروج پر تھا۔ "جو قوم اپنی وحشتیں نہیں چھوڑتی ان کے جسموں اور دماغوں کو ہمارا یہ آہنی جال اپنے پھندوں میں جکڑ لیتا ہے۔ ہمارے قہر کی بارش ان کے بہیمانہ جذبوں کو دھو ڈالے گی ہم ایسے وحشیوں کو رام کرنا خوب جانتے ہیں۔"

پھر جب بستی کے بوڑھے اچھوت واپس چلے گئے تو سلطان نے اپنے سپہ سالاروں ملک نصرت خان' خواجہ حاجی' تاج الدین عراقی اور ملک ظفر خان کو خلوت میں طلب کیا۔ حضرت امیر خسروؒ پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ سپہ سالاروں کے خیمے میں داخل ہوتے ہی علاءالدین نے انہیں مخاطب کیا اور اچھوت بوڑھوں سے اپنی ملاقات کا حال سناتے ہوئے کہا۔ "دنیا کا ہر غیر مسلم فاتح جب کسی زمین کو تسخیر کرتا ہے تو وہاں اپنے بے پناہ ظلم کی نشانیاں چھوڑ جاتا ہے۔ مگر ہم اول و آخر مسلمان ہیں ہماری خواہش ہے کہ جب ہمارے تابناک چہروں کا رخ دہلی کی جانب ہو تو چتوڑ کے گلی کوچوں میں جاہ وجلال کے ساتھ ہمارے رحم وکرم کے ترانے بھی گائے جائیں ہم اس علاقے کے مجبور و مقہور باشندوں کو ایک پرسکون اور باعزت زندگی عطا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ بات ہرگز پسند نہیں کہ ہماری موجودگی میں یہاں کی بے گناہ عورتوں اور معصوم بچوں کو آگ کی خوراک بنادیا جائے۔"

اس کے بعد سلطان نے تمام سپہ سالاروں کو اپنے نئے فیصلے سے آگاہ کیا جسے سن کر ملک نصرت خان' خواجہ حاجی' تاج الدین عراقی اور ملک ظفر خان نے اپنے سر زمین پر رکھ دیئے اور سوالیوں کے انداز میں گڑگڑانے لگے۔

"سلطان ذی جلال! آپ اہلِ چتوڑ پر نہیں ہم عاجزوں پر رحم فرمائیں ساری دنیا سے زیادہ ہم آپ کے کرم کے محتاج ہیں۔" سپہ سالاروں کے لہجے میں بڑی رقت تھی' بڑا گداز تھا ان کی زبانیں لڑکھڑا رہی تھیں اور خوف ودہشت سے جسم کانپ رہے تھے "خدانخواستہ اگر آپ دشمن کی عیاریوں کا نشانہ بن گئے تو ہماری شجاعت ومردانگی پر قیامت تک آسمان سے لعنتیں برستی رہیں گی۔ سلطان والا حشم! ہمیں آپ کے جبروت کی قسم! اگر یہ حادثہ رونما ہو گیا تو ہم اپنے چہروں پر سیاہی مل کر ہندوستان کے دور دراز جنگلوں میں نکل جائیں گے۔ اس کے بعد ہم نامرادوں میں اتنی ہمت نہیں ہوگی کہ ہم اہلِ دہلی کا سامنا کر سکیں۔ ہم "قصرِ ہزار ستون" کے در و دیوار کو کیا بتائیں گے کہ ہمارا سردار' ہمارا حکمراں کہاں کھو گیا؟ نہیں آقا! ہماری زندگی میں یہ نہیں ہو سکتا۔ غلاموں کو حکم دیجئے کہ وہ اپنے سر لے کر رتن سنگھ کے دربار میں حاضر ہو جائیں۔ اگر سلطان ہمارے اس فیصلے کو نافرمانی تصور کرتے ہیں تو پہلے غلاموں کے جسموں کے ٹکڑے کر دیئے جائیں پھر والئی ہند کو اختیار ہے کہ ہمارے بعد جو چاہیں کریں۔"

علاءالدین زیر لب مسکرایا۔ "کھڑے ہو جاؤ عراقی اور ملک نصرت تم اپنے قدموں کا سہارا لو۔ اور حاجی! تم ہماری طرف دیکھو اور ملک ظفر! تم بھی اپنا سر اٹھا لو۔"

سلطان کا حکم پاتے ہی چاروں سپہ سالار کھڑے ہو گئے علاءالدین نے اپنے سرفروشوں کی طرف دیکھا۔ جانبازوں کے جسم پسینے میں نہا گئے تھے۔ کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سلطان اس قدر پرُخطر اور ہولناک قدم اٹھائے گا۔ علاءالدین نے شاہی سفیر کی حیثیت سے راجہ رتن سنگھ کے دربار میں جانے کا فیصلہ کیا تھا اور جب اس نے اپنے سپہ سالاروں کو اس ناقابلِ یقین فیصلے سے آگاہ کیا تو ان بلند حوصلہ لوگوں کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ موت کو ایک دلچسپ کھیل سمجھنے والے اس طرح کھڑے لرز رہے تھے جیسے کسی سیاہ رات میں کوئی تنہا بچہ بھیانک خواب دیکھ کر ڈر گیا ہو۔ سب کے سب بے دست و پا تھے اور کسی میں سلطان کو روکنے کی ہمت نہیں تھی۔

پھر علاءالدین نے امیر خسروؒ کو حکم دیا کہ وہ راجہ رتن سنگھ کے نام شاہی فرمان تحریر کریں۔ امیر خسروؒ کو ہدایت کی گئی کہ سفیر علی عامر آفریدی کی گمشدگی سے لے کر اب تک کی تمام نافرمانیوں اور توہین آمیز رویوں کا کھلے الفاظ میں ذکر کیا جائے۔ شاہی فرمان کی تفصیلات سمجھانے کے بعد علاءالدین نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا جس کا واضح مفہوم تھا کہ سلطان اب تخلیہ چاہتا ہے۔

امیر خسروؒ ساری رات عبارت آرائی کرتے رہے۔ سپہ سالاروں کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ وہ کبھی خیمے کے اندر ٹہلنے لگتے اور کبھی حالتِ اضطراب میں باہر نکل کر سلطان کی آرام گاہ کو دیکھنے لگتے جہاں گہرا سکوت طاری تھا۔

علاءالدین اپنے بستر پر دراز تھا اور تصورات کی دنیا میں اس منظر کا جائزہ لے رہا تھا جب راجپوت عورتیں زندگی سے نجات حاصل کرنے کیلئے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے حصار میں داخل ہوتی ہیں۔ سلطان نے انسانی تاریخ کا یہ خوفناک ترین فیصلہ اس لئے کیا تھا کہ وہ چتوڑ کی شکست سے پہلے بہت سی چیزیں قریب سے دیکھ سکے۔ بوڑھے اچھوتوں کی سنائی ہوئی داستانوں کے مطابق راجہ رتن سنگھ کے ہار جانے کے بعد رانی پدمنی کا جل جانا بھی ایک یقینی امر تھا۔ سلطان کے ذہن میں کئی اندیشے سر ابھارنے لگے اور پھر وہ ایسے راستے پر گامزن ہو گیا جہاں موت نئے نئے زاویوں سے رقص کر رہی تھی۔

شب کے پچھلے پہر علاءالدین اپنے خیمے سے باہر آیا اور امیر خسروؒ کے خیمے میں جھانک کر دیکھا خسروؒ شمع کی روشنی میں قرطاس پر وہ عبارت منتقل کر رہے تھے جس کا ایک ایک حرف علاءالدین کے جاہ وجلال کا مظہر

تھا۔ سلطان، امیر خسروؒ کو ہمہ تن مصروف پا کر مسکرایا اور دبے قدموں واپس لوٹا۔ چاروں سپہ سالار بھی اپنے اپنے خیموں کے دروازوں پر سر جھکائے کھڑے تھے۔ علاءالدین چند لمحوں کیلئے ان کے پاس ٹھہرا اور پرجوش لہجے میں کہنے لگا۔

"ہمیں فخر ہے کہ ہمارے جاں نثار وقت کے اشاروں کو پہچانتے ہیں کہ یہ سونے کا موسم نہیں ہے مگر انہیں جان لینا چاہئے کہ ان کا سلطان بھی خوابوں کی دنیا میں نہیں رہتا۔"

☆..................☆..................☆

سلطان کے فوجیوں کیلئے وہ صبح ایک عام صبح تھی مگر کسی لشکری نے اپنے سپہ سالاروں کے اترے ہوئے چہروں اور سرخ آنکھوں کی طرف نہیں دیکھا وہ اپنے اپنے فرض کی تکمیل میں مصروف تھے اور انہیں خبر تک نہ ہو سکی کہ امیرانِ لشکر کے دلوں میں رات بھر کیسے کیسے طوفان اٹھتے رہے ہیں۔

علاءالدین نے اپنی قبائے شاہانہ تبدیل کی اور ایک عام سفیر کا لباس پہنا اس وقت سلطان کے خیمے میں چاروں سپہ سالاروں کے علاوہ حضرت امیر خسروؒ بھی موجود تھے۔ علاءالدین نے ملک نصرت کی طرف دیکھا۔

"نصرت! تم ہمارے ساتھ رتن سنگھ کے دربار میں جاؤ گے۔" سلطان نے اپنے سپہ سالار کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "وہاں تمہاری حیثیت ہمارے سفیر خاص کی ہوگی اور ہم تمہاری معاونت کیلئے موجود ہوں گے۔"

ملک نصرت نے سر جھکا دیا اس کے جسم پر ہلکا سا لرزہ طاری تھا۔

"نہیں ملک! ہمیں تمہارا یہ انداز پسند نہیں آیا۔" علاءالدین کا لہجہ تند و تیز تھا۔ "اگر تم رتن سنگھ کے دربار میں بھی اس طرح کانپتے رہے تو راز فاش ہو جائے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ راجپوت حکمراں کے سامنے ہماری شخصیت ایک سپاہی سے زیادہ اہمیت کی حامل نہ ہو۔ تم کچھ دیر کیلئے اپنے سلطان کے جاہ و جلال کو نظرانداز کر دینا۔ اس وقت یہی ہمارا حکم اور یہی تمہارا فرض منصبی ہے۔"

ملک نصرت خان نے اپنے کانپتے ہوئے جسم پر قابو پایا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

سلطان یکایک مڑا اور اپنے دوسرے سپہ سالاروں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "ہم دشمن کے نرغے میں پہنچ کر اپنی اقبال مندی کو آزمانا چاہتے ہیں اگر ہماری خوش قسمتی کا ستارہ خوش بختی کے آسمان پر طلوع ہو چکا ہے تو رتن سنگھ ہمیں دیکھ کر اپنی بینائی کھو دے گا اور اس کے درباری اندھے ہو جائیں گے کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ فاتح عالم کس بے جگری سے آیا اور اپنے بدنصیب حریفوں کے درمیان سے گزر کر چلا گیا۔"

علاءالدین چند لمحوں کیلئے خاموش ہوا اور پھر ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہنے لگا۔ "اگر ناکامی کے اندھیرے ہمارا مقدر بن جائیں تو پھر تم لوگ اپنے سلطان کی موت کا انتقام اس طرح لینا کہ تباہی و بربادی کی تاریخ ایسی کوئی مثال پیش نہ کر سکے۔ تمہارے دست جفا کار میں جس قدر رسوائیاں ہوں وہ سب کی سب اہل چتوڑ پر برسا دینا قلعے کا کوئی گوشہ تمہارے جوشِ انتقام سے محفوظ نہ رہے بس اڑتی ہوئی راکھ کے سوا ان کی کوئی نشانی باقی نہ رہے۔" یہ کہہ کر علاءالدین مڑا۔ "آؤ ملک! رتن سنگھ اور اس کے درباری ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

سلطان قلعے کی جانب روانہ ہوا۔ وہ تھوڑی دور تک محافظ سپاہیوں کے نرغے میں چلتا رہا پھر نصف راستہ طے کرنے کے بعد اپنے فوجی دستے کو واپسی کا حکم دیا۔ اس وقت علاءالدین آگے آگے چل رہا تھا۔ محافظ دستے سے الگ ہو جانے کے بعد سلطان نے ملک نصرت خان کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ ملک نصرت ایک

لمحے کیلئے جھجکا مگر سلطان کی ہدایت کا خیال آتے ہی آگے بڑھا اور اپنے قدموں کو مضبوطی سے جماتے ہوئے چلنے لگا۔

"اب تم ایک شاہی سفیر معلوم ہو رہے ہو مگر چال میں ہلکی سی لرزش ہے۔" علاءالدین نے ملک نصرت کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ "اپنی رفتار میں سرمستی اور بےنیازی پیدا کرو۔"

ملک نصرت نے اپنے دل و دماغ کو اس خوف سے آزاد کرنے کی کوشش کی کہ سلطان کی طرف اس کی پشت ہو رہی ہے۔

"اب ٹھیک ہے۔" علاءالدین نے ملک نصرت کے قدموں کی استقامت سے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

☆..................☆..................☆

کچھ دیر بعد علاءالدین خلجی اور ملک نصرت خان کو رتن سنگھ نے اپنے دربار میں طلب کر لیا۔

"ملک! فرمان شاہی کو اس طرح پڑھنا کہ خسروؒ کے لکھے ہوئے الفاظ کا حق ادا ہو جائے۔" رتن سنگھ کے روبرو پہنچنے سے پہلے علاءالدین نے سرگوشی کی۔

ملک نصرت خان نے سر کی جنبش سے اپنے فرمانروا کے حکم کی تائید کی وہ راجپوت سپاہیوں کی دو رویہ قطار سے گزر رہا تھا۔ اس لئے اپنے ہونٹوں کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ یہ وہی ملک نصرت تھا جسے سلطان کے حلقۂ اعتبار میں ایک ممتاز درجہ حاصل تھا۔ اس کی جاں نثاریاں سلطانی فتوحات کا ایک ناقابل فراموش باب تھیں اور یہ وہی ملک نصرت تھا جس نے گجرات کی فتح کے بعد ملک کافور کو اس کے آقا سندلال سے چھین کر سلطان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اب وہی نصرت خان اپنے شاہ کے ایک عجیب و غریب حکم کی تعمیل کیلئے موت کے غار میں داخل ہو رہا تھا اس ناقابل یقین مہم میں خود سلطان بھی نصرت خان کے دوش بدوش چل رہا تھا لیکن اگر اتفاق سے علاءالدین موجود نہ ہوتا تب بھی نصرت خان وہ شخص تھا کہ ہنستے ہنستے بڑے سے بڑے عذاب کو گلے لگا لیتا اور اس کے کشادہ ماتھے پر شکن نہ ابھرتی۔

رتن سنگھ کے پورے دربار میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چتوڑ کے سمراٹ اور کہسار کی ملکہ رانی پدمنی کے چہروں پر غیر معمولی سنجیدگی طاری تھی۔ ملک نصرت خان تخت کے قریب پہنچ کر قدرے خم ہوا۔ اس نے یہ حرکت محض اس لئے کی تھی کہ وہ اپنے آپ کو ایک مکمل سفیر ثابت کر سکے۔ ملک نصرت کے عقب میں علاءالدین خلجی تھا۔ سلطان نے دربار میں رتن سنگھ کا احترام ملحوظ نہیں رکھا اور یہ بات اس کے شایان شان بھی نہیں تھی ملک نصرت کے قدم رکے تو علاءالدین بھی ٹھہر گیا۔ ملک نصرت کی نظریں رتن سنگھ پر جمی ہوئی تھیں اور سلطان کی نگاہوں کا مرکز وہ کافر ادا پدمنی تھی جس کا رخِ روشن دیکھنے کیلئے علاءالدین نے اپنی جانِ بےقرار کو ہلاکت میں ڈال دیا تھا۔

"تمہارا نام؟" رتن سنگھ نے گرجدار لہجے میں ملک نصرت خان کو مخاطب کیا۔

شاہی سفیر نے انتہائی باوقار انداز میں والئی چتوڑ کو اپنا نام بتایا۔

"تمہارا منصب؟" رتن سنگھ نے دوسرا سوال کیا۔

"سلطانِ معظم کا ادنیٰ ترین خادم۔" ملک نصرت کا انداز بڑا والہانہ تھا اس نے سلطان سے اپنی نسبت کو اس طرح ظاہر کیا تھا کہ غیر ارادی طور پر علاءالدین کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ ملک نصرت وفاداری کا حق ادا کر رہا تھا۔

"اور تمہارا نام؟" راجہ رتن سنگھ نے انتہائی غرور و تکبر کے عالم میں اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دیتے

ہوئے سلطان کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کارِ سفارت میں میری اور میرے نام کی کوئی حیثیت نہیں۔" علاء الدین اس سوال کیلئے تیار نہیں تھا مگر پھر بھی اس نے اپنے ذہن کو منتشر نہیں ہونے دیا۔ "میں شاہی سفیر کا معاون ہوں کہ حاکم چتوڑ کی طرف سے جو کچھ کہا جائے اسے اپنی سماعت اور دماغ میں محفوظ رکھ سکوں۔" علاء الدین نے خادمانہ لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی تھی مگر فطرتِ شاہی اسے بے نیازی کے ساتھ کھڑا ہونے پر مجبور کر رہی تھی۔

رتن سنگھ نے علاء الدین کو نظر انداز کر دیا مگر سپہ سالار ہری سنگھ معاون سفیر کے اس طرز گفتگو پر چونک اٹھا تھا وہ بار بار سلطان کے سراپا کا جائزہ لے رہا تھا اس کی بے چین آنکھیں کبھی راجہ رتن سنگھ کو دیکھتیں اور کبھی اس شخص کو جو ظاہری اعتبار سے غیر اہم نظر آ رہا تھا۔ ہری سنگھ نے یہ بات بھی بہت شدت سے محسوس کی تھی کہ سلطان کا معاون سفیر رانی پدمنی کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے بھرے دربار میں چتوڑ کی حکمراں کے سوا کوئی دوسرا فرد موجود ہی نہ ہو۔

"یہاں تمہاری آمد کا مقصد ؟" راجہ رتن سنگھ نے ملک نصرت خان سے ایک سوال کیا۔

"چتوڑ کے حکمراں تک فرمان شاہی کو پہنچانا' اس کا جواب حاصل کرنا اور واپس چلے جانا۔" ملک نصرت خان نے اس قدر بارعب لہجے میں کہا کہ رتن سنگھ کا پورا دربار گونجنے لگا۔

"اگر تمہارا سلطان مصالحت اور دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہے تو اسے خود ہمارے دربار میں آنا چاہئے تھا۔" راجہ رتن سنگھ نے فرمانِ شاہی سے آگاہی حاصل کئے بغیر کہا۔ اس کا لہجہ تلخ اور کسی قدر نفرت آمیز تھا۔ "ہمیں اس سے کوئی سرحدی رقابت نہیں تھی اور نہ کبھی ہم نے اس کے تخت و تاج کی طرف حریصانہ نظروں سے دیکھا ہم تو باہر کی فضاؤں سے بے نیاز ہو کر اپنی دنیا میں مگن تھے کہ تمہارے سلطان نے بڑے بے رحمانہ انداز میں ہمارے دروازے پر دستک دی۔ یہ مہذب انسانوں کا طریقۂ کار نہیں تھا مگر جب یہ جرم سرزد ہو گیا ہے تو پھر اسے خود ہی اس کے ازالے کیلئے یہاں تک آنا پڑے گا۔"

ملک نصرت خان' راجہ رتن سنگھ کی گفتگو سن کر حیران رہ گیا۔ دردناک موت کا سایہ قلعے کے در و دیوار پر منڈلا رہا تھا اور وہ احمق حکمراں 'علاء الدین خلجی کے جرائم گنا کر ان کے ازالے کی ترکیبیں بتا رہا تھا۔ ملک نصرت کا دل چاہا کہ وہ پوری قوت کے ساتھ راجپوتوں کی نادانی پر قہقہہ زن ہو مگر سفارت کا نازک ترین فرض اسے جارحانہ رویّے سے روک رہا تھا۔

"والئی چتوڑ کو لازم ہے کہ وہ قیاس آرائی سے گریز کریں۔" ملک نصرت خان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "پہلے فرمانِ شاہی کو بغور سنیں پھر اندازہ کریں کہ سلطانِ ذی جلال کی کیا خواہش ہے ؟"

اس دوران رانی پدمنی مسلسل نصرت خان کو دیکھ رہی تھی اس کے چہرے پر غرور و نخوت کی گہری پرچھائیاں موجود تھیں۔ ملک نصرت خان نے قصداً ایک بار بھی رانی پدمنی کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نگاہِ شاہ میں پدمنی کا کیا مقام ہے۔ اسے اپنی غلامی کا پورا پورا احساس تھا اور وہ رسمِ وفا کو اس طرح ادا کر رہا تھا جو اہل وفا کا شیوہ ہے۔ البتہ علاء الدین کی نظریں ایک لمحے کیلئے بھی پدمنی کے چہرے سے نہیں ہٹی تھیں۔ پورے دربار میں صرف ہری سنگھ ایک ایسا شخص تھا جو ملک نصرت خان اور راجہ رتن سنگھ کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی سن رہا تھا اور معاون سفیر کی حرکات و سکنات بھی دیکھ رہا تھا۔ ہری سنگھ کے نزدیک رانی پدمنی کی ذات میں ایک عام سپاہی کی یہ دلچسپی بے سبب نہیں تھی اس کا ذہن بہت تیزی سے

گردش کر رہا تھا اور وہ جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا مگر اس اثناء میں راجہ رتن سنگھ ملک نصرت خان کو فرمان شاہی بہ آواز بلند پڑھنے کی اجازت دے چکا تھا۔

اہل دربار کی سانسیں رک سی گئیں۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی اپنے تمامتر غیظ و جلال کے باوجود پتھر کے مجسمے نظر آنے لگے۔ چھ سات ماہ پہلے بھی اسی دربار میں ایک حادثہ پیش آیا تھا اور جن لوگوں نے علی عامر آفریدی کا لایا ہوا خط سنا تھا وہ پھر کسی حادثے کے منتظر تھے۔ ان لوگوں کے خیال میں یہ متوقع حادثہ زیادہ سنگینی اختیار کر سکتا تھا۔ دونوں پیغامات میں "وقت اور مقام" کے پیش نظر بہت بڑا فرق نہیں ہونا چاہئے تھا۔ سلطان نے اپنا محبت نامہ اس وقت ارسال کیا تھا جب وہ چتوڑ سے بہت دور دہلی میں مقیم تھا اور دوسرا پیغام اس وقت تحریر کیا گیا تھا جب سلطان پورے چتوڑ کا محاصرہ کر کے راجہ رتن سنگھ کو قیدیوں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور کر رہا تھا کچھ دیر بعد اہل دربار کے دلوں کی حرکت تیز ہو گئی اور ان کے ذہنوں میں بے شمار اندیشے سر ابھارنے لگے تھے۔

اچانک ہری سنگھ نے سنا۔ ملک نصرت خان کی آواز پورے دربار میں گونج رہی تھی اس کی نظریں معاون سفیر کے چہرے سے ہٹیں اور شاہی سفیر پر اس طرح مرکوز ہو گئیں جیسے دربار چتوڑ میں ملک نصرت خان اور ہری سنگھ کے علاوہ تیسرا فرد موجود نہ ہو۔ راجپوت سیناپتی کا انہماک راجہ رتن سنگھ سے بھی زیادہ تھا۔ وہ ایک ایک حرف کو یوں سن رہا تھا جیسے سلطان علاء الدین خلجی خود اس سے مخاطب ہو۔

سلطان کا انداز تخاطب بڑا عجیب تھا اہل دربار کی بھنویں کھنچ گئیں ان کے ہاتھ اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو بل دینے لگے اور پیشانیاں لکیروں سے بھر گئیں۔

"فرمان فاتح عالم سلطان علاء الدین خلجی۔ بنام رتن سنگھ چوہان۔" ملک نصرت خان کی آواز گونجی۔ سلطان کے خط میں رتن سنگھ کا کوئی عہدہ و منصب بیان نہیں کیا گیا تھا۔ چتوڑ کے حکمراں کو ایک عام شخص سمجھ کر اس کی حاکمیت سے صریحاً انکار کر دیا گیا تھا اور فرمان کا لفظ واضح کر رہا تھا کہ چتوڑ کی حکومت سلطنت دہلی کی تابع ہے اور اس طرح رتن سنگھ یا تو علاء الدین کا خدمت گار ہے یا پھر وہ اپنی شکست تسلیم کر کے سلطانی فتوحات کے وسیع و عریض دائرے میں داخل ہو چکا ہے۔

"رتن سنگھ! پورے ہوش و حواس میں رہ کر سنو کہ اہل دانش تمہارے جہل اور بے خبری پر ماتم کرتے ہیں۔ تم نے آج تک شکست گجرات سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا حالانکہ راجہ کرن بھی تمہاری ہی طرح راجپوتوں کے قبیلے سے تھا۔ ہم نے جنگ سے پہلے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی کہ اب وقت کی رفتار ہمارے ساتھ ہے اور جدھر ہمارا گھوڑا مڑتا ہے گردش وقت بھی اس طرف کا رخ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ ایک زندہ حقیقت تھی۔ مگر گجرات کے توہم پرستوں نے اسے تسلیم نہیں کیا اور پھر میدان چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے اس روایت کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہے جس کی بنیاد پر راجپوت قوم کٹ مرنے کے دعوے کرتی تھی۔ ہمارے جاں نثاروں نے بریدہ سروں کا شمار کیا تو ان کی تعداد بہت کم تھی اور بھاگتے ہوئے قدموں کے نشان بہت زیادہ تھے۔" یہ کہہ کر ملک نصرت خان چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا اور شاہی فرمان کے رد عمل کا جائزہ لینے لگا۔ راجہ رتن سنگھ کا سرخ چہرہ آہستہ آہستہ سیاہی مائل ہوتا جا رہا تھا۔ ملک نصرت نے رانی پدمنی کی طرف نہیں دیکھا کہ اس کی نظروں کی حدود وہاں پہنچ کر ختم ہو جاتی تھیں۔

پدمنی کے تاثرات کا جائزہ لینے کیلئے علاء الدین خلجی دربار چتوڑ میں موجود تھا۔ سلطان نے محسوس کیا کہ پدمنی کے گلنار چہرے پر بھی ہلکی ہلکی گھبراہٹ کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ علاء الدین کیلئے یہ بات بڑی آسودگی کا سبب تھی اس کی فتوحات کا ذکر سن کر حسن بے نیاز بھی سہما سہما نظر آ رہا تھا۔

"پھر ہمارے سرفروشوں نے یہ بھی دیکھا کہ راجہ کرن گجرات کی آبرو رانی کنولا دیوی کو دشمنوں کے نرغے میں چھوڑ کر اپنی پشت اور چہرے پر ذلتوں کے داغ سجائے ہوئے میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ کنولا دیوی ہوشمند تھی کہ وہ اپنے بزدل اور نکمے شوہر کو ٹھکرا کر ہمارے جاہ و جلال کے سائے میں سمٹ گئی۔" ملک نصرت خان دوبارہ فرمانِ شاہی کی عبارت پڑھ رہا تھا۔ اب اس کا لہجہ زیادہ باوقار اور آواز زیادہ بلند تھی۔

"گجرات کی مٹی کو ہمارے سپاہیوں نے اس لئے خوں رنگ بنایا تھا کہ چتوڑ کے حکمرانوں کی آنکھیں کھل جائیں اور وہ اپنی زمین کو ہمارے قہر کی سرخی سے محفوظ رکھیں۔ رتن سنگھ! ہم نے تمہیں سوچنے کیلئے بہت زیادہ وقفہ دیا تھا اگرچہ ہمارا مزاج یہ ہے کہ ہم دشمنوں کو زیادہ مہلت نہیں دیتے لیکن چتوڑ کیلئے ہمارے دل میں کچھ نرم گوشے موجود تھے۔ افسوس! تم نے ہماری اس نرمی کا غلط فائدہ اٹھایا اور اس شاہی سفیر کو قتل کر دیا جو فاتح عالم کا راز دار بھی تھا۔" ملک نصرت خان ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔

"رتن سنگھ! ہم تم سے اپنے سفیر علی عامر آفریدی کا حساب مانگتے ہیں کہ وہ چتوڑ کی حدود میں داخل ہو کر کہاں گم ہو گیا؟ اسے حوالۂ زنداں کر دیا گیا یا وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہے؟ ہمیں آفریدی کے ایک ایک لمحے کا حساب درکار ہے۔ ہمیں بتایا جائے کہ اس کا استقبال کس حیثیت سے کیا گیا؟"

ابھی فرمانِ شاہی اپنے اختتام تک نہیں پہنچا تھا کہ راجہ رتن سنگھ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ جوش اضطراب میں چیخ اٹھا۔

"چتوڑ کی حدود میں دہلی کا کوئی سفیر داخل نہیں ہوا۔"

علاءالدین کی نظروں کا زاویہ پہلی بار تبدیل ہوا اور اس نے تیز نظروں سے راجہ رتن سنگھ کی طرف دیکھا چند لمحوں کی بات تھی۔ سلطان نے رتن سنگھ کے وحشت زدہ چہرے سے اس کے دل میں چھپا ہوا راز جان لیا اور پھر حسبِ معمول رانی پدمنی کی طرف دیکھنے لگا۔

"ابھی فرمانِ شاہی کی عبارت باقی ہے۔" ملک نصرت خان نے بڑے تحمل کے ساتھ رتن سنگھ کے اضطراب کی طرف اشارہ کیا۔

رتن سنگھ اپنی نشست پر پیچ و تاب کھاتا رہا اور ملک نصرت خان ایک عجیب والہانہ انداز میں اپنے شاہ کا فرمان پڑھ کر سناتا رہا۔

"ہم نے اپنے سفیر کے ذریعے تمہیں خیر سگالی کا پیغام بھیجا تھا کہ ہمیں بے سبب انسانی خون بہانے کی عادت نہیں ہے۔ ہم نے تمہیں باخبر کیا تھا کہ ہندوستان کا ایک ایک گوشہ ہماری ملکیت میں شامل ہو چکا ہے۔ یہ ہماری جانب سے ایک کھلا اشارہ تھا کہ تمہارا اقتدار اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا جب تک تمہیں ہماری پناہ اور تائید حاصل نہ ہو۔ صد حیف کہ تم نے ہماری فراخ دلی کی قدر نہیں کی اور اپنی زندگی کے سب سے خوبصورت لمحے برباد کر دیئے۔ ہم اپنے حلقۂ اثر میں احمقوں کا وجود برداشت نہیں کرتے لیکن تمہیں ایک اور موقع دیا جاتا ہے کہ وقت کی رفتار کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ گجرات کے راجپوتوں کی پگڑیاں اس طرح اچھالی گئیں کہ ہم "قصرِ ہزار ستون" میں آرام فرماتے تھے اور ہماری آتشِ جلال نے راجہ کرن کی ایک ایک نشانی کو پھونک ڈالا تھا۔ مگر آج ہم بہ نفسِ نفیس تمہارے قلعے کے مقابل میدانِ کارزار میں موجود ہیں تم نہیں جانتے کہ جس جنگ میں ہم بذاتِ خود شریک ہوتے ہیں وہاں ہمارا قہر کیا شکل اختیار کر لیتا ہے؟ تمہاری بستی کے لوگوں نے ہمارے قدموں پر سر رکھ کر "فاتح عالم" کے رحم و کرم کو آواز دی ہے ہم انہیں مایوس نہیں کرنا چاہتے کہ خدا نے ہمیں بے پناہ طاقت بخشی ہے۔ ہم نے ان محتاجوں کی صدائیں سن لی ہیں

اور انہیں یقین دلا دیا ہے کہ چتوڑ کی نواحی بستیاں ہمارے غضب سے محفوظ رہیں گی مگر یاد رہے کہ ہم نے تمہارے اور قلعہ نشینوں کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں دی ہے۔ ہاں! اگر تم شکست سے پہلے قلعہ چھوڑ کر باہر نکل آؤ اور اپنی دستار ہمارے پیروں پر ڈال کر امان مانگو تو ہم تمہیں بھی بخش دیں گے۔"

راجہ رتن سنگھ کی قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی وہ فرطِ غضب سے بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔

علاءالدین نے پہلی بار پدمنی کے چہرے کو غصے کی آگ میں جلتے دیکھا۔ سلطان کو اپنے بت پرست محبوب کی یہ ادا بہت پسند آئی تھی۔

راجہ رتن سنگھ کا یہ شدید ردعمل نصرت خان کو متاثر نہ کر سکا اس نے بڑے سکون سے فرمانِ شاہی کی باقی عبارت بھی مکمل کی۔

"رتن سنگھ! اگر تمہیں ہماری یہ شرط منظور نہیں تو پھر ہمارا آخری حکم پورے ہوش و حواس کے ساتھ سن لو کہ چتوڑ کی کسی عورت اور کسی بچے کو بھڑکتی ہوئی آگ کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ یہ ایک شیطانی رسم ہے اور ہم خدا کی زمین پر شیطان کے نمائندوں کو محوِ رقص دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ بہت قریب ہے وہ ساعت جب ہم قلعے کی بلند فصیلوں کو مسمار کر کے اندر داخل ہوں گے اگر اس وقت ہم نے ایک بھی جلی ہوئی لاش دیکھ لی تو ذمہ دار افراد کو بڑی دردناک سزا دیں گے۔ اس کے ساتھ ہم راجپوت سرداروں کو بھی تنبیہہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے حکمراں کی دیوانگی میں شریک نہ ہوں۔ جنگ کے نتائج ان کے اندازے سے بھی زیادہ بھیانک ثابت ہوں گے۔ ہم نہیں چاہتے کہ قلعے کے درمیان سے انسانی خون کا چشمہ پھوٹے اور وہ دریائے گمبھیری اور بریچ کے پانی سے جا کر مل جائے۔ ہم سلامتی اور امن طلب کرنے والوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ اگر راجپوت سرداروں نے ہمارے الفاظ کی قدر و قیمت پہچان لی تو ہم انہیں ایسی پُر آسائش زندگی عطا کریں گے جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی۔"

راجہ رتن سنگھ تخت پر کھڑا کانپ رہا تھا اور ملک نصرت خان کی آواز گونج رہی تھی۔

"امان ہے چتوڑ کے بوڑھوں کو، عورتوں کو، بچوں کو.......... اور ان نوجوانوں کو بھی جن کی عہدِ شباب کی سرمستیوں کا ابھی آغاز ہوا ہے اور ان راجپوت سرداروں کو بھی جو اپنی دستاریں خاک و خون سے آلودہ کرنا نہیں چاہتے.......... اہلِ چتوڑ گواہ رہیں کہ ہم نے اتمام حجت کیلئے عافیت کا راستہ اختیار کیا اب اگر لہو کی موجیں تمہارے سروں سے گزریں اور کوئی برقِ غضب تمہاری جانوں پر ٹوٹے تو اس میں فاتح عالم کا کوئی قصور نہیں وہ تو بڑا صاحبِ دل اور بڑا صاحبِ ظرف ہے۔"

ملک نصرت خان نے فرمانِ شاہی کا آخری لفظ بھی ادا کر دیا تھا۔

راجہ رتن سنگھ کے جسم کی لرزش کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

"ایک پاگل شخص کی لکھی ہوئی تحریر ہمارے حوالے کی جائے۔ ہم اس کا جواب دیں گے۔" رتن سنگھ نے چیختے ہوئے کہا۔

سپہ سالار ہری سنگھ تیزی سے اٹھا اور اس نے ملک نصرت خان کے ہاتھ سے فرمانِ شاہی لے کر رتن سنگھ کو پیش کر دیا۔ پورے دربار پر سکوتِ مرگ سا طاری تھا۔ رتن سنگھ نے ایک نظر اس تحریر کو دیکھا جو سرخ روشنائی سے لکھی گئی تھی راجپوت حکمراں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ رانی پدمنی کی تیز آواز ابھری۔

"سمراٹ! اس جہالت نامے کو چاک کر دیا جائے اور پھر قلعے کی فصیل سے اس کے پرزوں کو ہوا میں اڑا دیا جائے۔ چتوڑ کی آزاد ہوائیں خود کاغذ کی دھجیوں کو اڑا کر اس جانور کے خیمے کی طرف لے جائیں گی جو

شراب کے نشے میں اپنے آپ کو فاتحِ عالم کہتا ہے ؟"

رتن سنگھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا جیسے ہی رانی پدمنی کے لفظوں کی گونج ختم ہوئی۔ راجپوت سمراٹ نے فرمانِ شاہی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

علاء الدین خلجی جیسے باجبروت حکمراں کیلئے یہ بڑے گراں لمحات تھے پہلی بار اس نے فرمانِ شاہی کی تحقیر اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ سلطان کے سینے میں نفرت و قہر کے آتش فشاں نے بڑی شدت سے کروٹ لی تھی۔ اگر علاء الدین کی جگہ کوئی دوسرا حکمراں ہوتا تو معاون سفیر کا لبادہ اتار پھینکتا اور سرِ دربار بے نقاب ہو جاتا مگر سلطان بڑے مضبوط اعصاب کا انسان تھا اس کے چہرے پر ناگواری کا رنگ ضرور ابھرا کہ ایک سفیر کی حیثیت سے یہ ردِ عمل ایک لازمی امر تھا پھر بھی اس نے اپنے جذبوں کو بے نقاب نہیں ہونے دیا۔

جب فرمانِ شاہی کے ٹکڑے تخت پر بکھیر دیئے گئے تو ملک نصرت خان کی آواز بلند ہوئی۔ "فاتحِ عالم کا تحریر کردہ ایک ایک لفظ اس قابل تھا کہ راجہ رتن سنگھ اسے بوسہ دیتے لیکن گردشِ وقت نے چتوڑ کے حکمراں سے یہ موقع بھی چھین لیا۔" ملک نصرت خان نے ایک نظر فرمانِ شاہی کے ٹکڑوں کو دیکھا انتہائی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے ہونٹ بھنچ گئے تھے اور پورے چہرے پر رگوں کا ایک جال سا ابھر آیا تھا۔ "بہت قریب ہے وہ وقت جب تم سب کے سب فرمانِ شاہی کے ٹکڑوں کو اپنے سروں پر سجائے ہوئے سلطانِ معظم کے روبرو حاضر ہو گے اور یہی تمہارے گناہ کا کفارہ ہوگا۔" یہ کہہ کر ملک نصرت خان واپس جانے کیلئے مڑا۔ علاء الدین نے اس نازک ترین موقع پر بھی ضبط و ہوش کا دامن نہیں چھوڑا۔ اس نے ملک نصرت خان کے آگے بڑھ جانے کا انتظار کیا اور آدابِ سفارت کے مطابق اپنے سپہ سالار کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

جاتے جاتے سلطان نے ان شمشیروں کی جھنکار سنی جو راجپوت سرداروں کی نیاموں سے باہر نکل آئی تھیں اس کے ساتھ ہی کچھ قہقہے بھی گونجے تھے مگر ملک نصرت خان اور علاء الدین نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جب تاریخ کی یہ عجیب و غریب سفارت ختم ہوئی تو سلطان کے سپہ سالار اور دیگر سپاہی اپنے خدا کے حضور سجدۂ شکر ادا کر رہے تھے۔

سلطان کی واپسی پر اس کے جاں نثار فوجیوں نے دشمن کی سرزمین پر ایک جشنِ خاص کا اہتمام کیا۔ یہ جشن شراب و رقص کے ہنگاموں سے پاک تھا۔ اس جشن میں شاہی مطرب ندیم کاشانی نے اس طرح نغمہ سرائی کی کہ تمام سپہ سالار اور لشکری فرطِ مسرت سے جھوم اٹھے۔ ندیم کاشانی بڑے والہانہ انداز میں گا رہا تھا۔

"ہمارے شاہ کی بلند اقبالی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ وہ تنہا دشمن کے نرغے میں چلا گیا۔

اپنا فرمان جاری کیا اور اسی جاہ و جلال کے ساتھ واپس آ گیا۔

یہ حوصلہ کس انسان میں ہے ؟

اور کس کا خون اتنا گرم ہے کہ خالی ہاتھ ہوتے ہوئے بھی وہ دشمن کی بے نیام شمشیروں کو جھٹلا دے۔

اور کس کے دل میں ایسا جذبہ ہے جو موت کے جبڑوں کو چیرتا ہوا

گزر جائے۔

نہیں! اس دنیا میں فاتحِ عالم کے سوا ایسا کوئی دوسرا جانباز موجود نہیں ہے۔

بت پرستو! تمہیں عبرت ہو کہ تمہاری تقدیریں بھی پتھر کی ہو گئی ہیں۔

اور ایک خدا کا نام لینے والو! تمہیں یہ مثالی فتح مبارک ہو۔"

ندیم کاشانی کی نغمہ سرائی ختم ہوئی اور سلطان نے اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔

پھر سلطان جشن سے اٹھ کر اپنے خیمے کی طرف روانہ ہوا۔ جاتے جاتے اس نے حضرت امیر خسروؒ اور چاروں سپہ سالاروں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اس مجلسِ خاص میں حضرت امیر خسروؒ بہت زیادہ بے قرار نظر آ رہے تھے۔

"اگر سلطان کو کچھ ہو جاتا تو اسی لمحے ہندوستان کی تاریخ بھی بدل جاتی۔" خسروؒ کا لہجہ بہت پرسوز تھا۔ "خادموں کی مجبوری بھی کیسی مجبوری ہے کہ آقا کے حضور اپنے جذبات بھی بیان نہیں کر سکتے۔"

"خسرو! تم جانتے ہو کہ موت کی ساعت بھی نہیں ٹلتی اور قبر کی جگہ بھی نہیں بدلتی۔" علاء الدین خلجی بڑے بے نیازانہ انداز میں بول رہا تھا۔ "اگر چتوڑ کے قلعے کو ہمارا مقبرہ ہی بننا تھا تو قسمت کی اس تحریر کو کون مٹا سکتا تھا۔ ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ کاتبِ تقدیر نے ہمارے مقدر میں کیا لکھا ہے؟ پھر ہم نے رتن سنگھ کے قریب پہنچ کر اس عبارت کو پڑھ لیا۔ راجپوت حکمراں نے ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے فرمان کے ٹکڑے کر دیئے۔ بے شک! یہ بڑی گستاخی تھی مگر ہم نے اس بے ادبی سے یہی فال نکالی ہے کہ چتوڑ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اب راجپوتوں کو ذلت آمیز شکست سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔"

سپہ سالاروں نے احتراماً سر جھکا دیا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا سردار کس قدر بہادر اور ضدی ہے۔ ان کے خیال میں علاء الدین کے بعض اقدامات وحشت و دیوانگی کے زمرے میں آتے تھے مگر سلطان کا یہی پاگل پن تاریخ کے دھارے کو موڑ دیتا تھا اور فتوحات کے نئے دروازے کھل جاتے تھے۔ اس بار بھی یہی ہوا تھا۔ سلطان نے دشمنوں کے ہجوم میں تنہا داخل ہو کر ثابت کر دیا تھا کہ ابھی اس کی تقدیر زوال کے اندھیروں سے محفوظ ہے۔

تمام امیرانِ لشکر اسی سوچ میں گم تھے کہ سلطان نے ملک نصرت خان، تاج الدین عراقی، خواجہ حاجی اور ملک ظفر خان کو ان کے ناموں کے ساتھ پکارا۔ علاء الدین کی سلطنت کے یہ طاقتور ستون ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"اب ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ راجپوتوں کی ہمتیں پست ہو گئی ہیں اور وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہو کر ہمیں گالیاں بک رہے ہیں۔ جب دشمن کا دماغ بجھ جائے اور جذبات کی آگ میں اس کا دل جلنے لگے تو پھر اس ہوش کو ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔ اپنے مقابل پر حملے کا مناسب ترین وقت وہی ہوتا ہے جب اس کا ذہن دل کی غلامی اختیار کر لے۔ ہم نے چند لمحوں کی ملاقات میں رتن سنگھ کی غلامی کے کئی انداز دیکھے ہیں۔ وہ نسلی غرور کا بھی غلام ہے اور ایک خوبصورت عورت کا بھی۔ نہ اس کا دل ٹھکانے ہے اور نہ دماغ کام کر رہا ہے۔ ایسے شخص کو حکمرانی کا کوئی حق نہیں اور ہمارے حق میں یہی بہتر ہے کہ ہم جلد از جلد اسے اقتدار سے محروم کر دیں۔ ہم قلعے میں اسی لئے گئے تھے کہ اپنی آنکھوں سے دشمن کی طاقت کا جائزہ لیں۔ تم لوگوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ تمہارا دشمن اندر سے کھوکھلا ہے۔ قلعے کی دیواریں یقیناً مضبوط ہیں

مگر اس کے نگہبان بہت کمزور ہیں۔ تم عنقریب دیکھو گے کہ تمہارے یہ شکار بہت آسانی سے زیر دام آجائیں گے۔" علاء الدین خلجی محاذ جنگ کے اسرار کو اس طرح کھول رہا تھا کہ عام سپہ سالار حیرت زدہ تھے۔ سلطان کی قوتِ مشاہدہ اس قدر تیز تھی کہ پانچ ماہ کے طویل ترین قیام میں جو مسائل حل نہیں ہوئے تھے انہیں سلطان نے ایک مختصر سے وقت میں سلجھا دیا تھا۔

"اپنے خیمے اکھاڑ لو کہ اب یہ جگہ ٹھہرنے کیلئے مناسب نہیں۔" سلطان نے اچانک اپنے سپہ سالاروں کو نیا حکم دیا۔

عراقی، خواجہ حاجی، ملک نصرت اور ملک ظفر خان حیران ہو کر علاء الدین خلجی کی طرف دیکھنے لگے۔

پہاڑی سے نیچے اترو اور آگے بڑھ کر قیام کرو۔" سلطان نے اپنے حکم کی تفصیلات بیان کیں.........

"میدان کی سطح قلعے کے برابر کر دو۔ پھر اسی مقام سے ہماری جنگ کا آغاز ہوگا۔"

اب سپہ سالاروں کے چہروں پر سوچ کی پرچھائیاں بھی لرزنے لگی تھیں۔

"یہ کام دشوار ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔" سلطان نے اپنے امیرانِ لشکر کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ خون کے بجائے ہمارے سپاہیوں کا پسینہ بہہ جائے.........اور اس کام میں تمہارا پسینہ ہی بہے گا، خون نہیں۔ ہمیں تمہارے خون کی قیمت معلوم ہے کہ یہ بہت مہنگا ہے۔ اس لئے ہم ایک ایک قطرے کو سوچ سمجھ کر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔"

حکمِ شاہی نافذ ہو چکا تھا اور سپہ سالار اجازت لے کر اپنے اپنے خیموں میں جا چکے تھے۔

☆.................☆.................☆

رات آئی تو سلطان نے ملک نصرت خان کو اپنے خیمے میں طلب کیا۔ ملک نصرت خان تنہا شخص تھا۔ جس کے سینے میں سلطان کے کئی راز دفن تھے اور یہ اعزاز بھی صرف اسی کو حاصل تھا کہ علاء الدین اپنے سپہ سالار سے نازک ترین باتیں بھی کہہ دیا کرتا تھا۔ ملک نصرت خان خیمے میں داخل ہوا اور اس نے قدم بوسی کی رسم ادا کی۔

"بیٹھ جاؤ ملک! بیٹھ جاؤ۔" سلطان نے جوشِ اضطراب میں نصرت خان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آج میں سلطانِ معظم کے روشن چہرے پر دھواں سا دیکھ رہا ہوں۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔" ملک نصرت خان واقعتہً سلطان کی یہ حالت دیکھ کر اداس ہو گیا تھا۔

"ہاں! ملک! جتنی عمر گزرتی جا رہی ہے ہماری اداسیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔" سلطان کے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر تھے اور آنکھیں خیمے کی چھت کو گھور رہی تھیں۔ "آج ہم قصر ہزار ستون کے نرم بستروں کو چھوڑ کر چٹانوں پر لیٹے ہوئے ہیں۔ اپنے گھر سے، بیوی بچوں سے اور تخت و تاج سے بہت دور۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا شوقِ کشور کشائی بہت جلد تکمیل پا جائے گا۔ ہم اس محاذ کو بھی سر کر لیں گے اور ہمارے قدم قلعہ چتوڑ کے بلند ترین میناروں کو بھی پامال کر ڈالیں گے۔ پھر ہماری سلطنت اور وسیع ہو جائے گی۔ لوگ ہمیں فاتح عالم کہہ کر بھی پکاریں گے مگر کون جانتا ہے کہ ہمارے دل کی دنیا میں کیسا سناٹا ہے؟ ہم اپنے جاں نثاروں کیلئے کیسی کیسی آسائشیں فراہم کرتے ہیں اور ہمارے خدمت گاروں کو کیا کیا مراعات حاصل ہیں اس کا کسی کو احساس نہیں۔"

"نہیں! سلطانِ ذی حشم! یہ غلام تو آپ کی بخشش و عطاء سے خوب واقف ہے۔" ملک نصرت خان نے علاء الدین کے پیروں پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں ملک! ہم تمہاری جاں نثاری پر شک نہیں کر رہے ہیں۔" سلطان نے اپنے قدموں کی حرکت

سے ملک نصرت خان کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ "اس دنیا میں ایک تم ہی تو ہو جسے اپنے سلطان کے جذبوں کا لحاظ رہتا ہے اور باقی تو سب تماشائی ہیں، ہمارے اچھے وقت کے تماشائی۔ اگر ایک لمحے کیلئے بھی ہم پر بدقسمتی سایہ فگن ہو جائے تو یہ سارے کے سارے اپنی آنکھیں بند کر لیں گے، چہرے موڑ لیں گے اور ہماری طرف پشت کر کے، ہمیں تنہا چھوڑ کے بہت دور چلے جائیں گے۔" سلطان کا چہرہ بجھ کر رہ گیا تھا اور ملک نصرت خان نے خیمے میں داخل ہوتے ہی سلطان کے چہرے سے اٹھنے والے جس ہلکے ہلکے دھویں کو دیکھا تھا اب وہی دھواں مزید گاڑھا ہوتا جا رہا تھا۔

"فاتح عالم کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔" ملک نصرت خان رونے لگا۔ "سلطان! اس غلام کی دریدہ دہنی معاف کہ یہ لہجہ دنیا کو تسخیر کرنے والے کا لہجہ نہیں۔" ملک نصرت خان اپنی باتوں کی تیز ہوا سے اس دھویں کو اڑا دینا چاہتا تھا جس کی کثافت نے سلطان کے دل و دماغ کو جکڑ لیا تھا۔

"ہاں ملک! تم سچ کہتے ہو کہ یہ فاتح عالم کا لہجہ نہیں مگر دنیا کی تسخیر کرنے والا بھی تو آخر ایک انسان ہوتا ہے یہ لوگ ہمیں آدم زادہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ہمارا جسم بھی مٹی سے بنایا گیا ہے۔ ہمارے دل میں بھی بہت تیز درد اٹھتا ہے اور آج اسی درد کی شدت نے ہمیں بے قرار کر دیا ہے۔ ملک! تم یہ راز نہیں جانتے کہ ہم دل کی دنیا میں ایک گداگر سے بھی بدتر ہیں۔ ہم نے آج تک کسی کی زبان سے یہ الفاظ نہیں سنے کہ وہ اس علاء الدین کو چاہتا ہے جو کبھی ایک عام انسان تھا۔ یہ تو اس علاء الدین کی پرستش ہو رہی ہے جو بہت زیادہ بااختیار ہے۔ تمہیں یاد نہیں رہا کہ رانی کنولا دیوی نے ہمارے حرم میں داخل ہونے سے پہلے کیا مطالبہ کیا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ وہ ملکۂ جہاں کا خطاب چاہتی ہے۔ اس کے بعد وہ ہماری شریکِ حیات بن جائے گی۔ کاش اس نے کہا ہوتا کہ وہ علاء الدین کی بیوی بننا چاہتی ہے جو ایک جانباز مرد ہے۔ اور جو اپنی آبرو کو ہوس کے بازاروں میں چھوڑ کر فرار نہیں ہوتا۔" سلطان نے گجرات کی رانی کنولا دیوی کا ذکر چھیڑا تو اس کے چہرے کا دھواں کچھ اور تیز ہو گیا۔

"ملک! ہم بہت دن سے دنیا کی نیلام گاہ میں کھڑے سوچ رہے ہیں کہ یہ سب کے سب تاجر ہیں۔ کوئی کسی کے ہاتھوں فروخت ہو رہا ہے اور کوئی کسی کو خرید رہا ہے۔ سب اپنی اپنی قیمت چاہتے ہیں۔ بیٹے دعائیں کرتے ہیں کہ باپ مر جائے اور پھر وہ اس کی وسیع و عریض سلطنت کو آپس میں تقسیم کر لیں۔ بیویاں اپنے شوہر کی درازیٔ عمر کیلئے دعائیں مانگتی ہیں کہ اگر شوہر مر گیا تو وہ بیوہ ہو جائیں گی۔ ملک! انہیں اپنی بیوگی کا احساس مجبور کرتا ہے کہ وہ میری زندگی کی دعائیں مانگیں.........اور اولاد کو وراثت کے حصول کا شوق اکساتا ہے کہ باپ قبر میں سو جائے۔ ایک میرے جاگنے کی تمنا کرتا ہے اور دوسرا میرے سونے کا منتظر ہے۔ دونوں میرے جسم کے حصے ہیں مگر کتنے مختلف ہیں اور کیسی متضاد خواہش رکھتے ہیں۔ کبھی کسی بیٹے نے یہ تو کہا ہوتا کہ علاء الدین ان کا باپ ہے۔ صرف باپ.........اور کبھی کسی بیوی کے ہونٹوں نے یوں بھی جنبش کی ہوتی کہ علاء الدین ان کا شوہر ہے، صرف شوہر۔"

ملک نصرت خان حیران بھی تھا اور سخت پریشان بھی۔ اس نے آج تک سلطان کو اس قدر جذباتی نہیں دیکھا تھا۔ "اگر غلام کی موت زمانے کی بے وفائیوں کی تلافی کر دے تو مجھے حکم دیجئے کہ میں اپنے خون سے شاہِ والا کے قدموں کو بھگو دوں۔" ملک نصرت کی آواز لرز رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

"نہیں ملک! تم کیوں کسی کے گناہوں کا کفارہ ادا کرو۔" علاء الدین نے تیز لہجے میں کہا۔ "تمہیں دیکھ کر تو احساس ہوتا ہے کہ دنیا ابھی اہلِ وفا سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ اگر تم بھی ہماری محفل سے اٹھ گئے تو پھر ہم تنہا اور وحشی ہو جائیں گے۔"

ملک نصرت خان ' سلطان کے اس درد سے آشنا تھا۔ یہ درد شدید احساسِ محرومی کی پیداوار تھا۔ سیاست واقتدار کی دنیا میں اس نے ناقابلِ یقین کارنامے انجام دیئے تھے مگر دل کی دنیا میں اس کا مقام ایک مفلس شخص سے بھی کم تر تھا۔ اس کی بیویاں خود غرض اور بے پرواتھیں اور بچے سرکش و نافرمان۔ یہی وہ محرومی تھی جو کبھی کبھی سلطان کو ساری دنیا سے بیزار کر دیتی تھی۔ آج ایک انتہائی سنگین اور نازک موڑ پر اس کا یہ احساس جاگا تھا اگر اس درد میں مزید اضافہ ہو جاتا تو سلطان کی نظریں محاذِ جنگ سے ہٹ جاتیں اور پھر چتوڑ کا طویل ترین محاصرہ ایک مذاق بن کر رہ جاتا۔

"سلطان! آپ نے رانی پدمنی کو دیکھا!" ملک نصرت خان ' سلطان کے خیالات کو منتشر کر دینا چاہتا تھا۔

علاءالدین اپنے سپہ سالار کا سوال سن کر مسکرایا۔ "ملک! تم بے شک بہت ذہین بھی ہو اور اپنے شاہ کے غم خوار بھی مگر کبھی کبھی اس حقیقت کو بھول جاتے ہو کہ ہم زیادہ دیر تک اپنے جذبوں کا ماتم نہیں کرتے۔ ہاں! ہمارے سینے میں درد کی وہ تیز لہر اٹھی تھی لیکن ہم نے اسے فوراً ہی عقل و ہوش کے لامحدود سمندر میں ڈبو دیا۔ اب تمہارا آقا پرسکون ہے اور راجہ رتن سنگھ کے اقتدار کو ختم کرنے کیلئے نئی منصوبہ بندی کر رہا ہے؟"

ملک نصرت خان کے ہونٹوں کی گمشدہ مسکراہٹ لوٹ آئی اور اس نے جوشِ جذبات میں اپنے دونوں ہاتھ علاءالدین کے پیروں پر رکھ دیئے۔ "ہاں! میرا شاہ ایسی ہی زبردست قوتِ ارادی والا ہے۔ جس کی ایک نگاہِ کرم سے دشمنوں کے حصار جل اٹھتے ہیں۔"

سلطان نے اپنے مصاحبِ خاص کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھا۔ "ملک! تم واقعتہً ہمارے مزاج آشنا ہو۔ اسی لئے ہم تمہاری بہت قدر کرتے ہیں۔ کاش! ہمارے اہل و عیال بھی اسی جذبے کا مظاہرہ کرتے۔ رسماً ہی سہی مگر تمہاری طرح کوئی تو بیٹا ہمارے قدموں پر سر رکھ کر اپنا خون بہانے کا اعلان کر دیتا۔ آخر ہم باپ ہیں۔ اپنی اولاد کا خون کس طرح برداشت کرتے لیکن ہمیں سکون مل جاتا کہ ہمارے بھی چاہنے والے ہیں۔"

ملک نصرت خان ایک بار پھر پریشان نظر آنے لگا تھا۔ سلطان نے اپنے درد کی جس لہر کو ہوش کے سمندر میں غرق کر دینے کا دعویٰ کیا تھا وہ لہر دوبارہ ایک خوفناک بھنور بننے لگی تھی۔ سلطان نے اپنے سپہ سالار کے چہرے پر لکھے ہوئے کئی سوالات پڑھ لئے اور پھر انتہائی پرسکون لہجے میں کہنے لگا۔

"ملک! تم پریشان نہ ہو۔ جب ہم کسی محاذِ جنگ کی طرف بڑھتے ہیں تو اپنے دل سے ایک ایک جذبے اور ایک ایک خواہش کو کھرچ ڈالتے ہیں۔ اگر اس وقت کوئی تمنا باقی رہ جاتی ہے تو بس یہ کہ دشمن کا سر نیزے پر بلند ہو یا پھر ہمارے قدموں کو بوسہ دے۔" نصرت نے حیرت سے دیکھا۔

علاءالدین کے چہرے پر اس عظیم فاتح کے جذبات ابھر آئے تھے جو زندگی کو زندگی اور موت کو موت نہیں سمجھتا تھا۔ ملک نصرت نے اپنی پوری زندگی میں ایسا انسان نہیں دیکھا تھا جس نے دل کا ماتم کرتے کرتے اچانک تلوار اٹھالی ہو اور وہ ایک ناکام عاشق کے بجائے خونخوار سپاہی نظر آنے لگا ہو۔

اپنے سپہ سالار اور مصاحب خاص کو حیرت زدہ دیکھ کر سلطان مسکرانے لگا۔ "تم رانی پدمنی کا ذکر کر رہے تھے؟" علاءالدین نے اس طرح گفتگو کا رخ موڑ دیا جیسے چند لمحے پہلے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش ہی نہیں آیا تھا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ ہم نے یہ خطرناک راہ کیوں اختیار کی تھی؟"

ملک نصرت خان کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر سر جھکا کر کہنے لگا۔ "سلطان کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہو گیا

تھا کہ اگر راجپوتوں کو شکست ہو گئی تو ان کی عورتیں ایک قدیم وحشیانہ رسم کا شکار ہو کر آگ میں زندہ جل مریں گی اور شاید اس طرح رانی پدمنی بھی..........." ملک نصرت خان نے سلطان کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"علاءالدین ایک بار پھر مسکرایا۔ "ہمیں تمہاری ذہانت سے یہی توقع تھی۔ ہمیں اس اندیشے نے پریشان کر دیا تھا کہ اگر پدمنی ہمارے روبرو حاضر ہونے سے پہلے جل کر مر گئی تو ہماری اس عظیم الشان فتح کی داستان نامکمل رہ جائے گی۔ ہم دربار چتوڑ میں پہنچ کر کچھ اور اندازے بھی کرنا چاہتے تھے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ کسی خوفناک حادثے سے پہلے پدمنی کا دیدار ہماری عین خواہش تھی۔"

"تو پھر سلطانِ والا حشم نے رانی پدمنی کو کیسا پایا؟" ملک نصرت خان کبھی کبھی سلطان کے سامنے بے باک ہو جاتا تھا اور اس وقت بھی وہ اسی انداز میں بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔

"برہمن راگھو چیتن نے پدمنی کی شان میں جو قصیدے پڑھے تھے۔ وہ کچھ زیادہ مبالغہ آمیز تھے۔" علاءالدین نے کہا۔ "پدمنی خوبصورت ہے مگر اتنی بھی نہیں کہ ہم اسے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق سمجھنے لگیں۔ وہ ذہین بھی ہے اور بہادر بھی مگر ہم سمجھتے ہیں کہ رتن سنگھ کی قربت نے پدمنی کی ان دونوں صفات کو تباہ کر دیا ہے یا پھر پوری طرح ابھرنے کا موقع نہیں دیا ہے۔"

ملک نصرت خان حیرت سے سلطان کی طرف دیکھنے لگا۔ "ملک! تم اس راز کو نہیں سمجھو گے۔" علاءالدین سنجیدہ نظر آنے لگا تھا۔ "عورت کی خوبیوں کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ آزمائش کے مرحلے سے گزر رہی ہو۔ ہم نے محسوس کیا ہے کہ رتن سنگھ فطری طور پر عورت پرست ہے اور جذبوں کی اسی بے اعتدالی نے اسے حسن کا غلام بنا دیا ہے۔ غلامی عشق کے مذہب کا تو ایک انداز ہو سکتی ہے لیکن سیاست کے مذہب میں غلامی ایک بدترین لعنت ہے۔ ہم رتن سنگھ کو ایک لعنت زدہ انسان سمجھتے ہیں۔ اگر وہ ایک مردِ آزاد ہوتا تو پدمنی کے کہنے پر ہمارے فرمان کو اس طرح سرِ دربار چاک نہ کرتا۔ رتن سنگھ کی ان ہی نازبرداریوں نے پدمنی کی ذہانت اور شجاعت کو گمراہ کر دیا ہے۔ یہ پدمنی کی بدقسمتی ہے کہ اسے ایک مکمل مرد نہیں ملا۔ وہ حکم دینے اور اپنی بات منوانے کی عادی بن چکی ہے۔ جس دن اس کے یہ اختیارات سلب ہو جائیں گے۔ وہ ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ رتن سنگھ کے سجدوں نے اسے شیشے کی عورت بنا دیا ہے۔ وہ حالات کا ایک پتھر برداشت کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ چٹانوں کی آغوش میں پلنے والی عورت سراپا موم کی ہو کر رہ جائے گی۔ شکست کی آگ کہاں اسے تو دھوپ کی تیز کرنیں ہی پگھلا دیں گی۔ اب ہم مطمئن ہیں کہ شکستِ چتوڑ کی صورت میں پدمنی خودکشی نہیں کرے گی۔ اسے ہمارے لئے زندہ رہنا ہو گا۔"

"اور راجپوتوں کی وہ رسمیں جو مذہب کا درجہ اختیار کر گئی ہیں؟" ملک نصرت خان نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"پدمنی ان رسموں کو ٹھوکر مار دے گی۔" علاءالدین نے پُریقین لہجے میں کہا۔ "وہ عورتیں اور ہوتی ہیں جو پورے ہوش و حواس کے ساتھ آگ میں جل جاتی ہیں۔ حکمرانی کے دور کی بگڑی ہوئی عادتیں اسے شعلوں کی تپش سے دور رکھیں گی اور یہی بات ہمارے لئے باعثِ تسکین ہے۔ ہم پدمنی کو ضرور حاصل کریں گے کہ اٹھے ہوئے سروں کو جھکانے میں ہمیں بڑی لذت حاصل ہوتی ہے۔"

ملک نصرت خان کے چہرے کی شادابی لوٹ آئی۔ "خدا کا شکر ہے کہ میرے شاہ کے دل سے

اداسیوں کا غبار چھٹ گیا۔" ملک نصرت خان نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں ملک! ہمارے دل کا وہ غبار کبھی صاف نہیں ہوگا۔" علاءالدین یک بیک پھر اداس ہو گیا تھا۔ "وہ ہماری ازلی محرومی ہے۔ ہمیں سب کچھ دینے کے باوجود محبت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ اسی طرح اس تماشے کو جاری رکھیں۔ جس دن یہ تماشا ختم ہو جائے گا ہم بھی فنا ہو جائیں گے اور ابھی ہم مرنا نہیں چاہتے۔ ملک! ہم نے دنیا دیکھی ہے۔ یہ سب طاقت کا کھیل ہے۔ انسان کو انسان سمجھنے والے اس زمین سے رخصت ہو چکے ہیں۔ تم بھی اپنی تلوار کو بے نیام رکھو کہ اس سے ٹپکتے ہوئے خون کے قطرے لوگوں کو ادب کرنا سکھاتے ہیں۔ وہ حسن کا شبستان ہو یا سیاست کا مقتل، ہر جگہ اسی شمشیرِ آبدار کی ہنگامہ آرائی ہے۔ تمہاری شمشیریں بجھیں تو تم بھی ان چراغوں کی طرح بجھا دیئے جاؤ گے جو بادِ صبا اور نسیمِ سحری کو اپنا محبوب سمجھتے ہیں۔ ملک! تمہیں نہیں معلوم کہ ہواؤں کے یہ نرم و گداز جھونکے کیسے قاتل ہوتے ہیں۔ اپنی ذات کی لو کو تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز کر لو کہ جب یہ فریب کار ہوائیں تمہیں چھونے کی کوشش کریں تو خود ان کے ہونٹ بھی جل اٹھیں اور سینے چاک ہو جائیں۔" علاءالدین کے لہجے کا وہی جلال لوٹ آیا تھا۔ "بس اب تم آرام سے جا کر سو جاؤ کہ ہم جاگ رہے ہیں۔"

ملک نصرت خان بارگاہِ شاہی سے اٹھا تو اس کے دل و دماغ زیر و زبر ہو چکے تھے۔ آج اسے پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ ظاہری کم علمی کے باوجود سلطان زندگی کے کیسے کیسے نازک پہلوؤں پر سوچتا ہے اور اس کی آنکھیں کتنی دور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

☆.................☆.................☆

شاہی خیموں پر آسودگی اور اطمینان کا گہرا سکوت طاری تھا اور چتوڑ کے راج محل میں ہر قدم پر وحشت ناچ رہی تھی۔ رتن سنگھ بھی ایک ناقابلِ بیان اضطراب کے عالم میں جاگ رہا تھا۔ پدمنی اپنے شوہر کو ساغر لبریز دینے کے ساتھ ساتھ جھوٹی تسلیاں بھی دے رہی تھی۔ رتن سنگھ نے جلتی آنکھوں سے اپنی خوبصورت شریکِ حیات کی جانب دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا برابر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ کمرہ پدمنی کی خواب گاہ سے ملحق تھا اور اپنے طول و عرض میں بہت زیادہ وسیع تھا۔ اس کمرے میں چتوڑ کے سابقہ حکمرانوں کے قدِ آدم مجسمے نصب تھے اور دیواروں پر ان کی تلواریں آویزاں تھیں۔ رتن سنگھ آگے بڑھتے بڑھتے ایک مجسمے کے سامنے ٹھہر گیا۔ پدمنی بڑی حیرت اور خاموشی سے اپنے شوہر کے اس ردِ عمل کو دیکھ رہی تھی۔ رتن سنگھ جس مجسمے کے نزدیک جا کر رک گیا تھا وہ اس کے باپ سمر سنگھ کا مجسمہ تھا۔

"مہارانی! اس شخص کو پہچانتی ہو؟" رتن سنگھ نے اچانک ایک عجیب سے لہجے میں اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔

"کیوں نہیں سمراٹ! کیوں نہیں۔" پدمنی گھبرا کر بولی۔ "یہ پوجیہ (لائق پرستش) پتا جی کی مورتی ہے۔ سمراٹ سمر سنگھ کی مورتی.......... ایک مہان شاسک عظیم حکمران کی مورتی جس سے شجاعت کی ہزاروں داستانیں منسوب ہیں۔ اور جن داستانوں کو سن کر آج بھی راجپوت سورماؤں کے خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔" پدمنی نے اپنے آنجہانی خسر کیلئے بھرپور جذباتِ عقیدت پیش کیے۔

"ہاں پدمنی! یہ وہی سمراٹ سمر سنگھ ہیں جن کی شجاعت بے مثال تھی مگر سیاست مفلوج۔" رتن سنگھ کا لہجہ بہت تلخ ہو گیا تھا۔ "اسی عظیم حکمران کی ایک لغزش نے چتوڑ کو یہ دن دکھائے ہیں اگر یہ شخص علاءالدین کی فوجوں کو گجرات جانے کیلئے راستہ نہ دیتا تو آج سلطان کو چتوڑ کا محاصرہ کرنے کی جرأت نہ

ہوتی۔" رتن سنگھ کا لہجہ گستاخانہ ہو گیا تھا۔ "رہنما کی ایک غلطی پوری قوم کو کس طرح رلاتی ہے، اس کا اندازہ آج ہو رہا ہے۔ حماقت کا بیج کس نے بویا اور فصل کون کاٹ رہا ہے؟ کاش ایسا نہ ہوتا۔" رتن سنگھ کسی وحشت زدہ انسان کی طرح مجسمے کے قدموں میں جھک گیا اور پتھر سے اپنا سر ٹکرانے لگا۔ اس کی زبان پر ایک جملہ بار بار گردش کر رہا تھا۔ "آپ کی نادانی سے چتوڑ پر وہ عذاب نازل ہوا ہے جو ہماری جانیں لے کر ہی جائے گا۔ کاش! پتا جی! آپ ایسا نہ کرتے۔ کاش! کاش!!" رتن سنگھ پاگل سا ہو گیا تھا۔

اسی وقت خواب گاہ کے دروازے پر دستک ہوئی اور خادمہ نے باہر کھڑے کھڑے اطلاع دی کہ سیناپتی ہری سنگھ اسی وقت سمراٹ سے ملنا چاہتے ہیں۔ رتن سنگھ چونک اٹھا۔

"میں خود دیکھتی ہوں کہ ہری سنگھ کیوں آیا ہے؟" یہ کہتے ہوئے پدمنی دروازے کی طرف بڑھی۔

"مہارانی! اسے نشست گاہ میں بیٹھنے کیلئے کہیں.........." رتن سنگھ نے پدمنی کو روکتے ہوئے کہا۔ "کوئی بہت اہم کام ہو گا ورنہ ہری سنگھ اس وقت حاضر نہیں ہوتا۔"

پدمنی نے مڑ کر رتن سنگھ کی طرف دیکھا۔ "اس حالت میں آپ کا سیناپتی سے ملنا مناسب نہیں۔ ماتھے کی یہ خراشیں اور خون کے یہ قطرے اسے کوئی اور ہی کہانی سنا دیں گے۔" پدمنی نے کہا اور خواب گاہ سے نکل کر نشست گاہ تک پہنچی۔ پھر دربان کے ذریعے ہری سنگھ کو اندر طلب کیا۔

ہری سنگھ بھی چہرے سے پریشان نظر آ رہا تھا۔ پدمنی نے اسے بتایا کہ سمراٹ ابھی ابھی سوئے ہیں۔ کل صبح سے پہلے یہ ملاقات ممکن نہیں۔ ہری سنگھ واپس جانے لگا تو پدمنی نے اس سے پوچھا۔ "کوئی بری خبر تو نہیں ہے؟"

ہری سنگھ ضبط کر گیا۔ وہ ایک سرکش عورت کو کیا بتاتا کہ اس کے ناز و ادا نے کیسے کیسے گل کھلائے ہیں۔ "نہیں مہارانی! آپ کے نمک خوار اتنے جلد باز نہیں۔" ہری سنگھ مبہم الفاظ میں بہت کچھ کہہ گیا تھا مگر پدمنی ریاست کے محافظِ اعلیٰ کی بات پر غور کئے بغیر اپنی خواب گاہ میں واپس لوٹ آئی اور رتن سنگھ کو مطمئن کرتے ہوئے اسے گہری نیند سو جانے کا مشورہ دینے لگی۔

رتن سنگھ اپنے سپہ سالار کی بے وقت آمد کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا مگر ماتھے پر خون کی تازہ چھینٹیں اسے ہری سنگھ کے سامنے جانے سے روک رہی تھیں۔ پدمنی نے رتن سنگھ کی اس چوٹ کو راز میں رکھنے کیلئے خود ہی شوہر کی پیشانی کا خون صاف کیا اور جلتی ہوئی شمع بجھا دی۔ خواب گاہ میں اندھیرا ہوتے ہی درباری مطربہ نے ایک سحر کار گیت چھیڑ دیا۔ ایسا گیت جس میں رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ کیلئے درازیٔ عمر اور پُر کیف خوابوں کی دعائیں کی گئی تھیں۔ مطربہ کی دلنشیں آواز نے تھوڑی ہی دیر میں رانی پدمنی کو گہری نیند سلا دیا مگر رتن سنگھ جاگتا رہا تاریکی ہونے کے باوجود اس کے تصورات میں سمر سنگھ کا مجسمہ ابھرتا رہا اور وہ زیرِ لب ایک ہی جملہ دہراتا رہا۔ "پتا جی! کاش آپ نے ایسا نہ کیا ہوتا۔" شکست کے خوف نے رتن سنگھ کو بدحواس کر دیا تھا اور اسی دہشت کے زیرِ اثر وہ اپنے باپ پر چتوڑ کی تباہی کا الزام عائد کر رہا تھا حالانکہ حقیقت کچھ اور تھی۔ سمر سنگھ کی غیر معمولی ذہانت نے اس وقت چتوڑ کو بچا لیا تھا۔ علاءالدین نے سات سال پہلے 697ھ میں اپنا ایک لشکرِ جرار گجرات کی طرف بھیجا تھا۔ اس وقت بعض راجپوت سرداروں نے راجہ سمر سنگھ کو اکسایا تھا کہ وہ راستے کی دیوار بن کر سلطانی فوجوں کو روک لے۔ سمر سنگھ بھی غیرتِ قومی کے جوش میں اپنی فوج لے کر چتوڑ کے قلعے سے نکل آیا تھا مگر پھر اچانک اسے خیال آ گیا کہ علاءالدین کی فوجی طاقت بے پناہ ہے اور یہ تصادم اس کی ریاست کیلئے تباہ کن ثابت ہو گا۔ سمر سنگھ نے ضبط و ہوش سے کام لیا اور علاءالدین کے لشکروں کو میدانی راستے سے چپ چاپ گزر جانے دیا۔ سمر سنگھ کے اس فیصلے پر کچھ راجپوت سرداروں نے

سخت اعتراضات کیے۔ یہاں تک کہا گیا کہ سمر سنگھ بزدل ہے اور وہ اپنے ہم قوم حکمراں راجہ کرن کی تباہیوں کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ سمر سنگھ جیسے جوشیلے فرمانروا نے بڑے تحمل کے ساتھ ان الزامات کو برداشت کیا اور اپنے قلعے میں خاموش بیٹھا رہا۔ گجرات کی شکست کے بعد چتوڑ کے سیاستداں طبقے کو اندازہ ہو گیا کہ راجہ سمر سنگھ کا فیصلہ کس قدر درست تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ راز بھی فاش ہوا کہ سلطان علاء الدین خلجی نے درمیانی راستے میں سمر سنگھ کی مزاحمت کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا اور اسی امکان کے پیش نظر علاء الدین نے سپاہیوں کی ایک کثیر تعداد گجرات کی طرف روانہ کی تھی۔ دہلی سے روانگی کے وقت علاء الدین نے اپنے سپہ سالاروں الماس بیگ اور نصرت خان کو ہدایت کر دی تھی کہ انہیں دو محاذوں پر جنگ کرنا ہے۔ سلطان کے اندازے کے مطابق اگر سمر سنگھ قلعہ چھوڑ کر میدانوں میں نکل آئے تو پہلے اس کا مقابلہ کیا جائے پھر اس وقت تک سلطانی لشکر آگے نہ بڑھے جب تک سمر سنگھ کی فوجیں فرار نہ ہو جائیں۔

علاء الدین ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی سلطان نے اپنے سپہ سالاروں کو یہ تنبیہہ بھی کر دی تھی کہ اگر سمر سنگھ چھیڑ چھاڑ نہ کرے تو اسلامی سپاہ بھی خاموشی سے اپنے ہدف کی جانب پیش قدمی جاری رکھیں۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ سمر سنگھ جوشِ جذبات میں قلعے سے نکل کر کچھ دور تک آگے بڑھا اور پھر انتہائی دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے واپس لوٹ گیا۔ اگر سمر سنگھ کسی وجہ سے یہ حماقت کر بیٹھتا تو چتوڑ کی مضبوط سلطنت سات سال پہلے ہی تباہ ہو چکی ہوتی۔ چتوڑ کی فوجوں کو صرف قلعہ بند ہو کر لڑنے کی رعایت حاصل تھی ورنہ کھلے میدانوں میں سمر سنگھ کی فوجوں کا سلطانی لشکر سے کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ یہ بات بڑی عجیب ہے کہ اس نے ایک پرجوش قوم کا نمائندہ ہوتے ہوئے بھی بڑے ہوش سے کام لیا تھا اور سلطانی افواج کو گجرات جانے کا راستہ دے کر سلطنت چتوڑ کی عمر میں سات سال کا اضافہ کر دیا تھا۔ اگر سمر سنگھ ایسا نہ کرتا تو چتوڑ بہت پہلے زنجیرِ غلامی پہن چکا ہوتا اور رتن سنگھ حکمران ہونے کے بجائے سلطان علاء الدین خلجی کا حاشیہ بردار ہوتا یا پھر اس کی چتا کو آگ لگائی جا چکی ہوتی۔ اسی طرح رانی پدمنی بھی بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود کر اپنے حسنِ جہاں سوز کو آگ کا ایندھن بنا چکی ہوتی یا پھر کسی مسلمان سپہ سالار کی کنیز کی حیثیت سے رو رو کر زندگی بسر کر رہی ہوتی۔ یہ راجہ سمر سنگھ ہی کی ذہانت تھی جس کے صدقے میں اہل چتوڑ نے سات سال تک آزادی کی سانسیں لیں۔ رتن سنگھ نے اپنے سر پر سنہری تاج سجایا اور پدمنی نے اپنے شوہر کے دل و دماغ کے ساتھ ساتھ بے شمار راجپوتوں پر بھی حکومت کی۔......... مگر آج وہی سمر سنگھ اپنے عیش پرست بیٹے رتن سنگھ کی نظروں میں ایک معتوب انسان تھا۔ رتن سنگھ شراب کے نشے میں غرق ریشمی بستر پر پڑا ہوا اپنے باپ کو برا بھلا کہہ رہا تھا اور اسے یہ احساس تک نہیں تھا کہ سمر سنگھ نے ایک مضبوط حکومت ورثے میں چھوڑی تھی جسے اس کے وارث نے پدمنی کی ہوشربا اداؤں اور بادۂ گلفام میں غرق کر دیا تھا۔ رتن سنگھ کچھ دیر تک پیچ و تاب کھاتا رہا اور پھر شراب کے اثر نے اسے گہری نیند سلا دیا۔

☆ ☆ ☆

اسی رات طلسم کدے کے دو علیحدہ علیحدہ کمروں میں راج کماری نرملا اور علی عامر آفریدی بڑے عجیب خواب دیکھ رہے تھے۔ آفریدی نے دیکھا کہ وہ مہامنتری وکرم سنگھ کے طلسم کدے سے نکل کر ہانسی پہنچ گیا ہے جہاں اس کی والدہ شائستہ بیگم اور بہن عالیہ آفریدی مقیم ہیں۔ اچانک مکان کی دیوار میں شگاف پڑ جاتا ہے اور وہی سیاہ پوش انسان نمودار ہوتا ہے۔ جسے آفریدی کئی بار خوابوں میں دیکھ چکا ہے۔ اس اجنبی سیاہ پوش کو دیکھ کر علی عامر کی سانسیں رک سی جاتی ہیں پھر یکایک شائستہ بیگم اور عالیہ کی چیخیں گونجنے لگتی ہیں۔ آفریدی گھبرا کر اس کمرے کی طرف بھاگتا ہے جس کے اندر اس کی والدہ اور بہن ایک نامعلوم اذیت کا

شکار ہیں۔ آفریدی کمرے کے بند دروازے کو توڑ دینا چاہتا ہے مگر وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہتا ہے اور چیخیں مسلسل ابھرتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ خوف اور دہشت سے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ آفریدی بہت دیر تک پسینے میں نہایا ہوا بستر پر لیٹا رہتا ہے۔ پھر باہر نکل آتا ہے۔ اور نرملا کے کمرے کے قریب پہنچ کر دروازے پر دستک دیتا ہے۔

نرملا کماری گہری نیند سوئی ہوئی تھی اور ایک عجیب سا خواب دیکھ رہی تھی۔ آفریدی مسلسل دستک دیتا رہا۔ پھر نرملا نیند سے بیدار ہوئی اور اسی خمار آلود کیفیت میں بھاگتی ہوئی دروازے تک آئی اور اس نے تیزی سے دونوں کواڑ کھول دیے۔

"خیریت تو ہے سردار؟" نرملا بے ترتیب حالت میں بستر سے اٹھ کر چلی آئی تھی۔

"معاف کرنا راج کماری!" آفریدی، نرملا کو دیکھ کر کچھ جھجک سا گیا۔ "میں بہت دیر سے باہر کھڑا تھا اور یہ بات میرے ذہن سے محو ہو گئی تھی کہ آپ سو رہی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے آرام میں خلل انداز ہوا۔" آفریدی کے چہرے پر ندامت کا ہلکا ہلکا رنگ ابھر آیا تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سردار؟" نرملا نے دروازے میں کھڑے کھڑے جواب دیا۔ "یہ کیسی معذرت ہے، یہ کیسا تکلف ہے اور یہ کیسی رسم ہے؟ میں تو کچھ بھی نہیں سمجھی۔" نرملا حیرت زدہ پریشان سی نظر آ رہی تھی۔ "آپ باہر کیوں کھڑے تھے؟ دروازہ تو کھلا ہوا تھا جن عورتوں کے محافظ زندہ ہوتے ہیں وہ اپنے دروازے بند نہیں کرتیں۔ آپ کو میرے آرام کا خیال کیوں آیا؟ آپ کی خواہش کا احترام ہی میرا عیش و سکون ہے۔ آپ اس کا خیال نہ کریں کہ میں کس حال میں ہوں؟ آپ کسی وقت بھی پکاریں۔ مجھے آنا ہے اور میں آؤں گی۔ یہ کوئی جبر نہیں، یہ میرا عہد ہے اور ایفائے عہد میں اس وقت تک کوئی چیز حائل نہیں ہوتی جب تک انسان سے اس کی سانسیں نہ چھین لی جائیں۔ جسم کو زنجیر ستم میں جکڑ دیا جائے یا اس کے دست و پا کاٹ دیے جائیں تو عہد نبھانے کیلئے اس کا دل دھڑکتا ہے۔ اگر مجھ پر یہ قیامت گزر جاتی تو میرے دل کی دھڑکنیں آپ کی آواز پر دوڑی چلی جاتیں۔ اور اگر دل بند ہو جاتا تو پھر مجبوری تھی۔" نرملا کی آواز سے درد جھلکنے لگا تھا۔

"اچھا! اب راستہ دو۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔" آفریدی نے ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

نرملا دروازے سے ہٹ گئی اور پھر آفریدی کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی کمرے کے اندر آئی۔ "سردار! میں ایک عجیب سا خواب دیکھ رہی تھی۔"

آفریدی نے چونک کر راج کماری کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے دل کا درد سنانے آیا تھا مگر نرملا کے خواب کا ذکر سن کر سب کچھ بھول گیا۔

نرملا بہت اداس لہجے میں اپنا خواب سنا رہی تھی۔ "میں نے دیکھا کہ قلعے میں ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ اونچی اونچی دیواریں گر رہی ہیں اور مضبوط ترین برج منہدم ہو رہے ہیں۔ ہر طرف اجنبی انسانوں کا ہجوم ہے۔ ان کے لباس اور دستاروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کی قوم کے افراد ہیں۔ یقیناً سلطان کے سپاہی ہوں گے۔ ان لوگوں نے قلعے پر مکمل غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ اچانک آگ کے شعلوں کے درمیان تین چہرے ابھرتے ہیں۔ میں انہیں فوراً ہی پہچان لیتی ہوں۔ مائی بھان متی اور سنیاسی آنند پال آگے آگے ہیں اور میرے پتاجی ان کے عقب میں چل رہے ہیں۔ تینوں بہت خوش ہیں۔ پتاجی سفید کپڑوں میں ملبوس ہیں اور ان کے چہرے پر ایک عجیب سی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ پتاجی کا لباس میرے لئے ناقابل فہم ہے۔ میں نے آج تک انہیں ایسے لباس میں نہیں دیکھا۔" یہ کہہ کر نرملا خاموش ہو گئی اور رونے لگی۔

"یہ تو بہت مبارک خواب ہے۔ نرملا!" آفریدی اس بلند حوصلہ لڑکی کو سمجھانے لگا جو حادثات کی یلغار کا تنہا مقابلہ کر رہی تھی۔ "اس خواب کی تعبیر کا استقبال آنسوؤں سے نہ کرو"۔

"سردار! پہلے مجھے شک تھا مگر اب یقین ہو گیا ہے کہ پتاجی اس دنیا میں نہیں رہے۔" نرملا کے آنسو بدستور بہہ رہے تھے۔ مگر ہونٹوں پر کوئی فریاد نہیں تھی۔ "میں نے انہیں جس لباس میں دیکھا ہے وہ عام انسانوں کا لباس نہیں ہوتا۔"

"راج کماری! تم سچ کہتی ہو۔ وہ روشن چہرہ اور بے داغ لباس دوسری دنیا کا انعام ہوتا ہے۔ مہامنتری ایک خدا اور اس کے آخری رسولؐ پر ایمان لے آئے تھے اس لئے انہیں آخرت کے انعام سے نواز دیا گیا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی بیٹی نے اپنی آنکھوں سے اپنے باپ کا انجام بھی دیکھ لیا۔ وکرم سنگھ چوہان نے پوری زندگی بت پرستی میں بسر کی مگر ان کا دل سنیاسی آنند پال کے ساتھ تھا اور سنیاسی آنند پال شروع ہی سے ایک موحد تھا۔ وحدانیت کی گواہی نے اسے اس کی منزل تک پہنچایا اور پھر جس نے آنند پال کا احترام کیا وہ بھی ہدایت پا گیا۔ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے اور ان سے عقیدت رکھنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

نرملا کماری کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ ابھر آئی وہ اپنے باپ کی دائمی جدائی سے مضطرب بھی تھی اور ان کا روشن چہرہ دیکھ کر مطمئن بھی۔

"تم نے جس بوڑھی عورت مائی بھان متی کا ذکر کیا ہے' وہ کون ہے؟ اس دنیا میں موجود ہے یا سنیاسی آنند پال کی طرح رخصت ہو گئی"؟ آفریدی نے اچانک کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

نرملا کماری نے آفریدی کو مائی بھان متی کی دردناک کہانی سنائی اور جب یہ بتایا کہ وہ کوہ آبو کے ایک مندر میں گوشہ نشین ہے اور اس نے بہت پہلے چتوڑ کی تباہی کی پیش گوئی کی تھی تو آفریدی کا پورا جسم لرزنے لگا۔ علی عامر کی یہ کیفیت دیکھ کر نرملا گھبرا سی گئی۔

"تم پریشان نہ ہو راج کماری!" آفریدی نے نرملا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "یہ اس حق پرست عورت کا روحانی جلال ہے جس کے اثر سے آفریدی کی روح کانپ رہی ہے۔ وہ عظیم خاتون ایک بار میرے خواب میں بھی آئی تھیں اور مجھے بیٹا کہہ کر پکارا تھا۔ تمہیں یہ سن کر تعجب ہو گا کہ وہ تمہاری حالت سے باخبر ہیں بلکہ مجھے حکم بھی دیا تھا کہ میں تمہارا خیال رکھوں۔ چتوڑ بڑا خوش نصیب تھا کہ اس کے درمیان دو ایسی ہستیاں موجود تھیں جو ایک خدا پر ایمان رکھتی تھیں مگر افسوس! اہلِ چتوڑ نے اپنی خوش بختی کی قدر نہ کی اور ہزاروں انسان اس طرح خاک و خون میں مل گئے کہ ان کی دنیا بھی تباہ ہو گئی اور آخرت بھی۔"

کمرے کی فضا پر بہت دیر تک گہرا سکوت طاری رہا پھر جب نرملا نے آفریدی سے آدھی رات کے وقت اس کے دروازے پر دستک دینے کا سبب پوچھا تو علی عامر ٹالنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اپنی داستانِ الم سنا کر نرملا کو مزید رلانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر نرملا اپنی ضد پر قائم رہی۔ بالآخر آفریدی کو ملک کافور کی سازشوں سے لے کر اپنی والدہ اور بہن کی ہانسی روانگی تک کے سارے واقعات سنانا پڑے اور اسے یہ بھی بتانا پڑا کہ وہ شائستہ بیگم اور عالیہ کے بارے میں یہ لرزہ خیز خواب کئی بار دیکھ چکا ہے۔ اپنا فسانۂ درد سناتے سناتے آفریدی کی آنکھیں بھی اشکوں سے لبریز ہو گئی تھیں۔

"نرملا! اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں اس دنیا میں تنہا رہ جاؤں گا،" آفریدی کے آنسو بہت تیزی سے بہنے لگے تھے۔ "دشمنوں کو مجھ سے شکایت ہے تو میرے جسم کے ٹکڑے کر دیں' مجھے آگ میں پھونک ڈالیں مگر ان بے گناہ اور معصوم خواتین نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ مردوں کو اپنا حساب مردوں تک ہی رکھنا چاہئے یہ

کہاں کی مردانگی ہے کہ مجھے زنجیریں پہنا دی گئیں اور میری عدم موجودگی میں میرے ناموس کے آبگینوں کو توڑ دیا گیا۔" آفریدی جوشِ اضطراب میں کھڑا ہو گیا۔

"سردار! یہ تو محض ایک خواب ہے۔" نرملا بھی بے قرار ہو کر کھڑی ہو گئی۔ "آپ کو خواب کی باتوں پر اس طرح یقین نہیں کرنا چاہئے کہ اپنی جان کو نیا روگ لگا لیں۔"

"نہیں نرملا! یہ خواب نہیں ہے۔" آفریدی کا اضطراب کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ "ایک ہی منظر کا تسلسل کے ساتھ ابھرنا خواب کی علامت نہیں۔ یہ کوئی دل پگھلا دینے والا حادثہ ہے جو میرا انتظار کر رہا ہے۔" یہ کہتے کہتے آفریدی نے اس کھڑکی سے اپنا سر ٹیک دیا جو باغ کی طرف کھلتی تھی اور جہاں ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور اندھیرے کے قلب سے ابھرتی ہوئی جھینگروں کی آوازیں کسی عیار دشمن کی سرگوشیوں سے مشابہ تھیں۔

"نرملا! تم نہیں جانتیں کہ میری دنیا میں کتنا اندھیرا ہے؟" آفریدی نے اعصاب کے تناؤ کو کم کرنے کیلئے دونوں ہاتھوں سے لوہے کی سلاخیں پکڑ لی تھیں۔ "نظر کی انتہا تک اندھیرا بھیانک اور قاتل اندھیرا۔" ہمت و عزم کا پہاڑ آہستہ آہستہ ٹوٹ رہا تھا۔

"میری طرف دیکھو آفریدی!" نرملا نے آج پہلی بار علی عامر کو اس کا نام لے کر پکارا تھا۔ شدتِ غم کے باوجود آفریدی نے اس طرزِ تخاطب پر چونک کر نرملا کی جانب دیکھا۔ "میری زندگی کے اندھیروں کا تو خیال کرو کہ وہ کس قدر گہرے ہیں اور کتنی دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔" نرملا کے لہجے میں جذباتیت نہیں' ٹھہراؤ تھا۔ "سردار! میرا تو کوئی بھی نہیں۔ نہ ماں' نہ باپ' نہ بہن' نہ بھائی۔ یہاں تک کہ میری زمین بھی نہیں' میرا گھر بھی نہیں۔ تصور میں بھی آ سکتی نہیں مجبوریاں میری۔ مگر اس لئے زندہ ہوں کہ آپ میرے رفیقِ سفر ہیں۔ اور یہی رفاقت مجھے اندھیروں سے جنگ کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ میں اپنی اور آپ کی آنکھوں سے اس صبح کا خواب دیکھ رہی ہوں جو بالآخر ان اندھیروں پر غالب آ جائے گی۔" یہ کہہ کر نرملا کماری نے اپنے آنچل سے آفریدی کے بہتے ہوئے آنسو خشک کر دیئے۔

آفریدی مردِ میدان تھا' جذبوں کا آتش فشاں اور ارادوں کا سرکش طوفان......... مگر جب حسن کی قربت میسر آئی تو ایک گنگناتا ہوا آبشار بن گیا۔

☆..................☆..................☆

سپہ سالار ہری سنگھ رات بھر شدید بے چینی کے عالم میں جاگتا رہا۔ صبح ہوتے ہی اس نے دوبارہ راجپوت سمراٹ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ شراب کا خمار ٹوٹ جانے کے بعد رتن سنگھ بھی اپنے سیناپتی کا منتظر تھا۔ پھر جب وہ نشست گاہ میں ہری سنگھ سے ملا تو راجپوت سیناپتی کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ رتن سنگھ چونک اٹھا۔ "یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے ہری سنگھ۔"

"سمراٹ! چتوڑ کی سرحدوں کا خیال سونے نہیں دیتا۔" ہری سنگھ کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔ اسے گزشتہ رات رانی پدمنی کی مداخلت بہت گراں گزری تھی۔

"ہم جانتے ہیں ہری سنگھ!" راجپوت سمراٹ نے مصلحتاً اپنے سیناپتی کی سرفروشانہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔" ہری سنگھ نے رانی پدمنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہہ ڈالو۔" راجپوت سمراٹ کا انداز بے نیازانہ تھا۔

"اس کیلئے مجھے تنہائی درکار ہوگی۔" جب رتن سنگھ اپنے سپہ سالار کا اشارہ نہیں سمجھ سکا تو ہری سنگھ نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس گفتگو کے درمیان پدمنی کی موجودگی پسند نہیں کرتا۔

"تمہیں معلوم ہے ہری سنگھ کہ ہم مہارانی کی شمولیت کے بغیر کوئی بات سننا پسند نہیں کرتے۔" ایسے سنگین وقت میں بھی رتن سنگھ ایک کافرادا عورت کا غلام نظر آ رہا تھا۔

ہری سنگھ کے چہرے پر مایوسیوں کے سائے ابھرنے لگے مگر وہ ایک جانباز سپاہی تھا۔ نتائج کی پروا کئے بغیر بول اٹھا۔

"سمراٹ! یہ ایک بہت نازک بات ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے سننے کے بعد مہارانی کی سماعتیں مجروح ہو جائیں۔"

رتن سنگھ نے نزاکتوں کو جھٹلا دیا......... اور وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا۔

ہری سنگھ کچھ دیر تک ذہنی کشمکش کا شکار رہا اور پھر اس نے رانی پدمنی کی موجودگی میں وہ بات کہہ ڈالی جو غیرت مند خواتین کا صبر و قرار چھین لیتی ہے۔ "سمراٹ! مجھے شک ہے کہ معاون سفیر کے روپ میں خود علاءالدین خلجی یہاں آیا تھا اور اپنے فرمان کے بکھرے ہوئے ٹکڑے دیکھ کر واپس چلا گیا۔"

رتن سنگھ اور رانی پدمنی جوشِ اضطراب میں کھڑے ہو گئے۔ "حد سے بڑھی ہوئی ذہانت انسان کو اندھا بھی بنا دیتی ہے ہری سنگھ!" راجپوت سمراٹ کا لہجہ تحقیر آمیز تھا۔

"میں ذہین نہیں سمراٹ مگر اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں۔"

"تم اپنے دعوے کی کوئی دلیل بھی پیش کر سکتے ہو' ہری سنگھ یا راجپوتوں کی صفوں میں دہشت پھیلانا ہی تمہارا کام ہے؟" رانی پدمنی نے ایک لمحے میں اپنے جاں نثار سیناپتی کو اس کے منصب سے اتار کر زمین پر پھینک دیا تھا۔

چند لفظوں نے ہری سنگھ کے دل و جگر کاٹ کر رکھ دیئے تھے مگر وہ بڑی قوتِ برداشت کا انسان تھا۔ اس کی دونوں مٹھیاں اس طرح بھنچ گئی تھیں جیسے وہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے دل کا خون نچوڑ رہا ہو۔ پھر وہ اس خون کو بھی قطرہ قطرہ کر کے پی گیا۔ "مہارانی! معاون سفیر ایسے نہیں ہوتے۔ آپ نے سرِ دربار اس کے کھڑے ہونے کی ادائیں دیکھی؟ سفیروں کے یہ تیور نہیں ہوتے اور ان کی رفتار بھی ایسی نہیں ہوتی اور آپ نے یہ بھی محسوس نہیں کیا کہ تمام وقت اس کی آنکھیں مہارانی چتوڑ کے چہرے پر جمی رہیں۔ کیا ایسے بدترین موسم میں کوئی سفیر اپنے دشمن کے یہاں اس لئے آتا ہے کہ وہ ایک نامحرم عورت کو مسلسل دیکھتا رہے اور خاموش نظروں سے راجپوتوں کے جاہ و جلال کو ٹھکراتا ہوا واپس چلا جائے۔"

"پھر تم نے کیوں نہیں بتایا کہ وہ بھیڑیا خود چل کر ہماری تلواروں کے ہدف تک آ پہنچا ہے۔" رانی پدمنی کسی بدحواس انسان کی طرح چیخنے لگی۔

"مجھے صرف شک تھا۔ مہارانی 'یقین نہیں۔" ہری سنگھ پر پدمنی کی چیخ ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ "میں اپنے شبہات کو یقین میں بدلنے کی کوشش کرتا مگر فرمانِ شاہی کے ٹکڑوں نے مجھ سے میرے ذہن کی یکسوئی چھین لی اور میں منتشر ہو گیا۔" "آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" رتن سنگھ نے اس طرح زمین پر پاؤں مارتے ہوئے کہا جیسے اسے اپنے شکار کے نکل جانے کا بہت افسوس ہو۔

"سمراٹ! یہ ایک اچھا موقع تھا جسے ہم نے گنوا دیا۔" ہری سنگھ کی آواز سے بہت زیادہ تھکن کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ہاں! یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا۔" رانی پدمنی نے چیختے ہوئے کہا۔ "اگر تم اشارہ بھی

کر دیتے تو ہم آسانی کے ساتھ سلطان کو قتل کر سکتے تھے۔" غرور کی ماری ہوئی عورت عقل و ہوش سے بیگانہ نظر آ رہی تھی۔

ہری سنگھ احمقوں کی اس دنیا سے دور چلا جانا چاہتا تھا مگر فرض شناسی کے احساس نے اسے جواب دینے پر مجبور کر دیا۔ "سمراٹ! میں علاءالدین کے قتل کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ سلطان کی موت تو چتوڑ کو اتنی مہنگی پڑتی کہ اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں ذکر کر رہا ہوں سفارت کے اس موقع کا جو قسمت نے ہمیں فراہم کیا تھا۔ ہم اپنے قہر و غضب کا مظاہرہ کئے بغیر سفارتی سطح پر ان مذاکرات کو طول دے سکتے تھے اور پھر شاید ایسا کوئی موڑ آ جاتا کہ کم سے کم خون بہا کر ہم اس مسئلے کا سیاسی حل تلاش کر لیتے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ہم سلطان کے آگے جھک جاتے اور اپنے عزت و ناموس اس کے حوالے کر دیتے۔" اب کی بار رتن سنگھ بھی چیخ اٹھا تھا۔

"میں نے سیاسی گفتگو جاری رکھنے کی بات کی ہے' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔" آج ہری سنگھ بھی مہامنتری و کرم سنگھ کے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

"تم اپنے چند سپاہیوں کی لاشیں دیکھ کر ڈر گئے ہو ہری سنگھ!" راجپوت سمراٹ کی آواز کچھ اور بلند ہو گئی تھی۔ "تم فرار چاہتے ہو اور اپنی بزدلی کا جواز پیدا کرنے کیلئے ہمیں بھی نامردوں اور خواجہ سراؤں کی زندگی گزارنے کی تلقین کر رہے ہو۔" رتن سنگھ جوشِ جذبات میں حد سے گزر گیا تھا۔

"سمراٹ! یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کون رن بھومی سے فرار ہوا اور کون اپنی دھرتی کی بھینٹ چڑھ گیا۔" ہری سنگھ اپنے انجام سے بے نیاز ہو کر بولا۔ "میں تو سورماؤں کی اس زمین کو اپنے خون کا ایک ایک قطرہ پلا دوں گا مگر چتوڑ کی یہ مٹی بہت پیاسی ہے۔ اب تو لہو کا کوئی دریا ہی اس کی پیاس بجھا سکتا ہے۔"

"ہری سنگھ! ہماری نظروں سے دور ہو جاؤ۔" رتن سنگھ کی چیخ سے پورا کمرہ گونج اٹھا۔

"دھرتی ماں کو تمہارے ناپاک خون کی ضرورت نہیں۔" راجپوت سمراٹ نے اپنے لائق ترین سپہ سالار کو دنیا کی بدترین گالی سے نوازا اور ہری سنگھ کا پورا جسم نادیدہ آگ کے شعلوں میں جل اٹھا۔

"میں جا رہا ہوں سمراٹ! ہمیشہ کیلئے جا رہا ہوں۔" ہری سنگھ مڑا اور چند آگے جا کر پلٹا۔ "بس آخری بات کہ اگر میری رگوں میں دوڑنے والا خون ناپاک ہے تو پھر کس کا لہو اپنے پاک ہونے کا دعویٰ کرے گا۔" یہ کہہ کر ہری سنگھ تیزی سے مڑا اور رتن سنگھ کی نشست گاہ سے نکل کر چلا گیا۔

راجپوت سمراٹ نے فوراً ہی اپنے کچھ جاسوس ہری سنگھ کی نگرانی کیلئے مقرر کر دیئے۔ جاسوسوں نے رتن سنگھ کو خبر دی کہ ہری سنگھ کمبھ شیام کے مندر کی طرف جا رہا ہے۔ یہ وہی مندر تھا جہاں سنیاسی آنند پال نے اپنی ساری زندگی نظربندی کی حالت میں گزار دی تھی۔ زبان کٹ جانے کے بعد اسی مندر کے ایک کمرے میں آنند پال نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی تھی اور اسی مندر کی ایک دیوار پر آنند پال نے وہ خوفناک پیش گوئی تحریر کی تھی جس کا ایک ایک حرف درست ثابت ہو رہا تھا۔

چتوڑ کے عام سپاہیوں کو خبر نہیں تھی کہ ان کے سپہ سالار ہری سنگھ اور چتوڑ کے حکمران راجہ رتن سنگھ کے اختلاف کس منزل میں پہنچ گئے ہیں اور انتشار کی یہ فضا ریاست کی سلامتی کیلئے کس قدر خوفناک ہے؟ وہ تو صرف اس انتظار میں تھے کہ کب جنگ مغلوبہ چھڑ جائے اور کب وہ اپنی جنم بھومی کو بچانے کیلئے جانوں کے نذرانے پیش کر دیں۔ البتہ اعلیٰ سرکاری حلقے زیادہ دیر تک اس خبر کی سنگینی سے محفوظ نہ رہ سکے جب راجپوت سرداروں کو یہ اطلاع ملی تو ان میں ہلچل سی مچ گئی۔ چتوڑ پر قیامت نازل ہو رہی تھی اور حکمرانوں کی طفلانہ ضدیں علاءالدین خلجی کے حملے کو ایک دلچسپ کھیل سمجھ رہی تھیں۔ اس تکلیف دہ خبر نے سابق

سیناپتی پچھمن سنگھ کو بہت زیادہ اداس کر دیا تھا۔ "اے بھگوان! کیا تو نے اس بوڑھے سپاہی کو یہ دن دکھانے کیلئے زندہ چھوڑ دیا ہے۔" پچھمن سنگھ جوشِ وحشت میں اپنے بال نوچ رہا تھا اور اس کے سات کڑیل جوان بیٹے اپنے باپ کی حالت زار دیکھ کر بدحواس ہو رہے تھے۔

"پتا جی! آپ تو ہوش میں رہیں۔" ایک بیٹے نے آگے بڑھ کر پچھمن سنگھ کو اس دیوانگی کی حرکت سے روکنے کی کوشش کی۔

"میں پاگل ہو جاؤں تو کیا غم ہے مگر وہ تو ہوش میں رہے جس کی وحشت مادر وطن کے سر سے آنچل کھینچ کر اسے بازار سیاست میں ناچنے پر مجبور کر رہی ہے۔" پچھمن سنگھ کی آواز میں اب بجلیوں جیسی کڑک تھی۔ "اسے جا کر کوئی کیوں نہیں سمجھاتا کہ وہ اپنی زہریلی زبان کو قابو میں رکھے اور اس طرح غیرت داروں کی پگڑیاں نہ اچھالے۔"

"کون ہے وہ؟ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟" پچھمن سنگھ کے دوسرے بیٹے نے چونک کر اپنے باپ سے سوال کیا۔

"وہی راجپوتوں کی آن 'رانی پدمنی'۔ اور وہی سورماؤں کے سمراٹ راجہ رتن سنگھ جن کی جہالت وفاداروں کو غداری کے تمغے بانٹ رہی ہے۔" پچھمن سنگھ کے ہونٹوں سے نفرتوں کے شرارے پھوٹ رہے تھے۔

"پتا جی! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سمراٹ اپنی جگہ درست ہوں اور ہری سنگھ بہادری کے جوش میں حدود سے باہر نکل گیا ہو۔" تیسرے بیٹے نے حالات کو ایک نئے زاویے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہری سنگھ! پہلے بھی معتوب قرار دیا جا چکا ہے یقیناً اس بار بھی اسی سے کوئی بے ادبی سرزد ہوئی ہوگی۔"

پچھمن سنگھ نے جلتی ہوئی آنکھوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ "تم جانتے بھی ہو کہ ہری سنگھ کون ہے؟ ہری سنگھ وہ ہے جس کی شجاعت کے سامنے تمہارے باپ کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔" پچھمن سنگھ کا لہجہ شرربار تھا اور وہ اپنے سے کم عمر سپہ سالار کو بڑے والہانہ انداز میں خراج تحسین پیش کر رہا تھا۔ "ہری سنگھ امورِ جنگ کا اتنا ماہر ہے کہ اس جیسا ذہین انسان آج تک خاکِ چتوڑ سے نہیں اٹھا۔ وہ صاحب دل بھی ہے اور صاحبِ ہوش بھی۔ پچھلی بار رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ کے غرور و تکبر نے اسے رسوا کرنے کی کوشش کی تھی مگر ہری سنگھ اہل ظرف ہے اس نے اپنے وطن اور قوم کیلئے یہ ذلت بھی گوارہ کر لی تھی۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس مرتبہ بھی ہمارے نادان حکمرانوں نے اس کے کسی فیصلے کو حقارت سے جھٹلا دیا ہو گا ورنہ ہری سنگھ اتنا تنگ نظر نہیں ہے کہ ریاست کی سرحدوں پر آگ لگی ہو اور وہ مندر کے کسی گوشے میں پڑا پجاریوں کی گھنٹیاں سن رہا ہو۔"

"تو پھر آپ سمراٹ سے بات کیوں نہیں کرتے؟" پچھمن سنگھ کے بڑے بیٹے امر سنگھ نے باپ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کا بھی تو فرض ہے کہ اس بھڑکتی ہوئی آگ کو اپنی تدبیر کے چھینٹوں سے بجھا دیں۔"

"نہیں بیٹے! اب کچھ باقی نہیں رہا۔" پچھمن سنگھ کی آواز سے اچانک ایک درد سا جھلکنے لگا تھا۔ "اہل شمشیر کی وہ ناقدری دیکھی ہے کہ دل ہی بجھ کر رہ گیا ہے اب تو دل چاہتا ہے کہ اپنے ہی گلے پر اپنی تلوار پھیر لوں اور دنیا سے چپ چاپ گزر جاؤں۔" خشک سمندر میں بڑا ہولناک طوفان اٹھا بوڑھے پچھمن سنگھ کے جذبات اس قدر مشتعل ہو گئے تھے کہ وہ اپنے بیٹوں کی بھی کوئی بات سننے کیلئے تیار نہیں تھا مگر جب چتوڑ کی آبرو کا حوالہ پیش کیا گیا تو بوڑھے راجپوت کے چہرے کی آگ سرد پڑنے لگی اور اس کی گردن کا تناؤ کم

ہو گیا۔ "ہاں اپنی قوم اور زمین سے یہی عہد تو ہمارے پیروں کی زنجیر ہے ہم اہل غیرت اس زنجیر سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتے۔" پچھمن سنگھ کا سر جھک گیا تھا اور سفید داڑھی آہستہ آہستہ آنسوؤں سے تر ہونے لگی تھی۔ پھر وہ کمر خمیدہ بوڑھا آہنی بید کے سہارے اٹھا اور مکان سے نکل کر راج محل کی طرف جانے لگا۔

☆..................☆..................☆

دربار آراستہ تھا اور چتوڑ کے دونوں حکمران تخت پر اتنے اطمینان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے جیسے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش ہی نہیں آیا ہو۔ پچھمن سنگھ دربار میں داخل ہوا تو رتن سنگھ اپنے سرداروں کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔ "ہم نے ہری سنگھ کو اس کے عہدے سے ہمیشہ کیلئے معزول کر دیا۔" رتن سنگھ کا لہجہ پُرغرور تھا۔ "اب اگر کوئی شخص ہمیں یہ بشارت دے کہ ہری سنگھ کی قیادت راجپوت لشکر کو عظیم الشان فتح سے ہمکنار کر دے گی تو ہم اس خبر کو سننا بھی گوارہ نہیں کریں گے۔ ہم چتوڑ کی شکست برداشت کر سکتے ہیں مگر ہمیں یہ منظور نہیں کہ ہری سنگھ جیسا بزدل سپہ سالار ہمارے غیرت مند سپاہیوں پر حکومت کرے۔"

پھر جیسے ہی رتن سنگھ خاموش ہوا ایک راجپوت سردار نے اپنی نشست پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے کہ ہم اپنا نیا سیناپتی منتخب کریں، ہمیں ہری سنگھ کا جرم تفصیل کے ساتھ بتایا جائے۔ جس شخص نے تمام عمر راجپوت سپاہیوں کی قیادت کی ہو، ایسے نازک موقع پر اس کی برطرفی سے شکوک و شبہات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہم حالتِ مجبوری میں اس کا نعم البدل بھی تلاش کر سکتے ہیں لیکن ہری سنگھ پھر ہری سنگھ ہے جب تک اس کا جرم ثابت نہ ہو جائے کسی نئے سپہ سالار کی تقرری کا اعلان کوئی دانشمندانہ فعل نہیں ہو گا۔"

راجہ رتن سنگھ نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ راجپوت سردار کی باتوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہری سنگھ کی معزولی کے نتائج غلط ہو سکتے ہیں۔ رانی پدمنی بھی کچھ پریشان سی نظر آ رہی تھی۔ آخر بہت غور و فکر کے بعد رتن سنگھ نے ہری سنگھ کے جرائم کی تفصیل اہلِ دربار کے سامنے پیش کر دی۔ "وہ گستاخ و بے ادب ہے، مغرور ہے اور چتوڑ کی بہادر افواج کو کم ہمتی کا سبق دینے والا ایک بزدل سپہ سالار ہے۔"

پچھمن سنگھ سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ اپنے جسم کا بوجھ سنبھالتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ "سمراٹ! اس بوڑھے کی لغزشِ زبان کو معاف کیا جائے۔ ہری سنگھ کی ذات میں ایسی کوئی خرابی موجود نہیں اس کی قیادت کے دوران ہماری فوج زیادہ منظم ہوئی ہے اور ہر سپاہی نے جنگ و جدل کے نئے انداز سیکھے ہیں۔"

ہری سنگھ کی حمایت میں بلند ہونے والی آوازیں سن کر راجہ رتن سنگھ بھڑک اٹھا اور اس نے پورا واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ "اس سے زیادہ شرمناک فعل کیا ہو گا کہ ہم اپنی عزت و ناموس کے ساتھ چتوڑ کی آزادی بھی سلطان کے ہاتھوں فروخت کروا لیں۔"

پورے دربار پر سناٹا طاری ہو گیا۔ رتن سنگھ کے انکشاف نے راجپوت سرداروں کے دل و دماغ کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا تھا اور ان کے چہروں پر بیک وقت کئی سوالات ابھر آئے تھے۔ "سمراٹ! ہری سنگھ ایسا نہیں کر سکتا۔" پچھمن سنگھ بے قرار ہو کر بولا۔ "یقیناً آپ کے اور اس کے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے ورنہ کیسے ممکن ہے کہ ہری سنگھ دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیک دے، ابھی تو زمین آسمان اپنی جگہ قائم ہیں۔ جب یہ دونوں اپنے محور سے سرک جائیں گے تو پچھمن سنگھ یقین کر لے گا کہ ہری سنگھ ملک و قوم کا تاجر بن کر ذلتوں کی دلدل میں اتر گیا ہے۔" پچھمن سنگھ کا لہجہ اس قدر یقین و اعتماد میں ڈوبا ہوا تھا کہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کو بھی چونک جانا پڑا۔ ابھی راجپوت سمراٹ کوئی جواب دینے نہیں پایا تھا کہ پچھمن سنگھ دوبارہ بول اٹھا۔ "میں چتوڑ کی سربلندی اور آزادی کے نام پر سمراٹ سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کروں گا کہ

ہری سنگھ کے بارے میں کئے جانے والے فیصلے پر نظرِ ثانی کر لیں کہ یہ پوری راجپوت قوم پر آپ کا احسان عظیم ہو گا۔ "بوڑھا سپاہی ملک و قوم کی بقاء کیلئے انتہائی عاجزی کے مقام پر اتر آیا تھا۔

رتن سنگھ بہت دیر تک سوچتا رہا اور پھر یہ کہہ کر اٹھ گیا۔" جاؤ! تم خود ہی اس سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتا ہے ؟"

☆..................☆..................☆

چھمن سنگھ بہت خوش تھا اور وہ کئی راجپوت سرداروں کے ساتھ کمبھ شیام کے مندر کی طرف جا رہا تھا جب یہ معززینِ قوم اپنے دل شکستہ سپہ سالار کی خبر گیری کیلئے پہنچے تو ہری سنگھ طاقت کی دیوی درگا کے قدموں پر جھکا ہوا رقت آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "دیوی! تجھ سے یہ راز پوشیدہ نہیں ہے کہ ہری سنگھ کون ہے اور اس کے سینے میں دھڑکنے والا دل کن جذبوں کا مالک ہے اور دیوی تو یہ بھی جانتی ہے کہ تیرے ادنیٰ پرستار کے دل پر کیا گزر رہی ہے ؟ اگر مجھے دنیا کی طعنہ زنی کا خوف نہ ہوتا تو میں اپنا سر کاٹ کر تیرے چرنوں میں ڈال دیتا لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ احمق اور نکمّے لوگ میری موت کے بعد کیا تبصرے کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ ہری سنگھ دشمن کی یلغار سے ڈر گیا اور پھر دہشت میں مبتلا ہو کر اس نے خودکشی کر لی۔"

ہری سنگھ درگا ماتا کے قدموں سے لپٹا ہوا دیوانہ وار رو رہا تھا۔ "دیوی! آج میں تجھ سے شکتی مانگنے نہیں آیا ہوں آج میری پرارتھنا (التجا) ہے کہ مجھ پر یہ آسمان گرا دے یا مندر کی کسی دیوار کو ڈھا دے اور اپنے اس داس کو' اپنے اس بھکشو (بھکاری) کو جیون بندھن سے مکتی دیدے' میں تیرا حقیر پجاری' تیری لازوال قوتوں کو پکارتا ہوں۔ میری مدد کر دیوی! اور مجھے اس حالت میں زندہ نہ رکھ کہ میری آنکھ کے سامنے چتوڑ کو شمشان بھومی میں بدل دیا جائے اور میری زندہ و تابندہ قوم غلامی کی زنگ آلود زنجیر پہن لے۔ مجھے بھیک دے دیوی اپنی اپار دیا کی بھیک! میرے کاندھوں سے میرے سر کے بوجھ کو ہلکا کر دے۔ اس سر میں کئی ماہ سے ایک ناسور رس رہا ہے اور اب اس ناسور کی خلش مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ میں اپنے ہی دیار میں اجنبی ٹھہرا ہوں۔ یہ لوگ میری زبان نہیں سمجھتے اب انہیں میرے خون پر بھی شک ہو گیا ہے۔ مجھے اس زندگی کی نعمت سے نجات دے دیوی! اس زمین کے جگر کو پھاڑ دے کہ میں اس میں سما جاؤں یا مجھے اوپر اٹھا لے اور آسمان کی وسعتوں میں گم کر دے۔ میرا وجود عدم سے ملا دے کہ تیرا غلام ہری سنگھ اپنی ذات کی نفی کرتا ہے۔" سیناپتی ہری سنگھ' دیوی کے قدموں میں پڑا ہوا اس طرح گریہ وزاری کر رہا تھا کہ چھمن سنگھ اور دوسرے راجپوت سردار بھی رونے لگے۔ فریاد و فغاں کا یہ سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہتا کہ چھمن سنگھ نے آگے بڑھ کر ہری سنگھ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ چتوڑ کا معتوب سپہ سالار چونک اٹھا اور حیرت سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے آشنا چہروں کو دیکھنے لگا۔

"تمہارا خون ناپاک نہیں ہے ہری سنگھ! اس خون کی حرارت سے تو مجھ بوڑھے کو نئی زندگی کی تڑپ ملتی ہے۔" آج چھمن سنگھ کے لہجے میں وہ محبت شامل تھی جس کا اظہار اس نے کبھی اپنے بیٹوں سے بھی نہیں کیا تھا۔ "واپس چلو ہری سنگھ کہ دھرتی ماں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ اگر تم لوٹ کر نہیں آئے تو اس کے سارے بیٹے مارے جائیں گے اور ماں کی کوکھ سدا کیلئے اجڑ جائے گی۔"

ہری سنگھ کھڑا ہو گیا اور حیرت سے بوڑھے چھمن سنگھ کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھنے لگا۔ "چھمن سنگھ! تم کیوں روتے ہو۔" ہری سنگھ نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔ "رونا تو انہیں چاہئے جن کی آنکھوں کا پانی سوکھ گیا ہے۔"

"سردار! اب اس کا وقت گزر گیا۔ میں نے تو اپنا فوجی لباس بھی اتار دیا اور تلوار بھی دیوی کے قدموں پر

رکھ دی۔ یہ جس کی امانتیں تھیں اس کو لوٹا دیں۔ اب تو میں ایک مفلوج اور شکستہ دل انسان ہوں جب تک سانسیں چل رہی ہیں جسم کا بوجھ اٹھائے پھر رہا ہوں۔ اب نہ میں یہ لباس پہن سکوں گا اور نہ یہ تلوار مجھ سے اٹھ سکے گی۔ میں کم ظرف نہیں کہ اپنی رسوائیوں سے گھبرا کر ملک و قوم کی بربادی کیلئے دعائیں مانگنے لگوں۔ ایشور! چتوڑ کو اتنی فتوحات دے کہ اس کا دامن تنگ ہو جائے ایک ہری سنگھ کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میری دھرتی کی خاک سے پیدا ہونے والا ہر نوجوان ہری سنگھ ہے۔ بلکہ ہری سنگھ سے بھی زیادہ وطن دوست' سرفروش اور جانباز۔"

چھمن سنگھ جانتا تھا کہ ہری سنگھ دوبارہ راج دربار میں حاضر ہونے کی ذلت برداشت نہیں کر سکے گا۔ اس لئے وہ غیرت مند سردار وطن کی محبت میں اپنا سب کچھ لٹانے پر آمادہ ہو گیا۔ اچانک چھمن سنگھ کے دونوں ہاتھ بلند ہوئے اور دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی پگڑی اتار کر ہری سنگھ کے قدموں میں ڈال دی۔ یہ سب کچھ اس قدر غیر متوقع تھا کہ ہری سنگھ ساکت ہو گیا اور اس کی آنکھیں پتھرا سی گئیں۔ چھمن سنگھ کے ہمراہ آنے والے راجپوت سردار سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ چتوڑ کا یہ معزز ترین فرد وطن کی محبت میں اپنی آن بان اس طرح لٹا دے گا۔

"ہری سنگھ! اب تو لوٹ چلو کہ اس سے زیادہ تمہیں دینے کیلئے میرے پاس کچھ نہیں۔" چھمن سنگھ شدتِ درد سے بے قرار ہو کر رونے لگا۔ "اس دستار کی عزت رکھ لو ہری سنگھ کہ یہ بھی تمہاری طرح ایک سیناپتی کی دستار ہے اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس دستار کو آج تک زمین کی مٹی نے میلا نہیں کیا ہے۔"

ہری سنگھ کچھ دیر تک کسی مجسمے کی مانند بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر اس نے تیزی سے جھک کر چھمن سنگھ کے قدموں کو چھوا اور دستار اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے باندھنے لگا۔ "سردار! میں نے آج تک آپ سے زیادہ وطن دوست انسان نہیں دیکھا۔" ہری سنگھ کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو بہہ نکلے تھے۔ "اس دستار کی عظمت پر ایک نہیں ہزاروں ہری سنگھ قربان اس کی ایک ایک شکن پر میرا مان' میری مریادا سو سو بار صدقے۔"

☆..................☆..................☆

چتوڑ کے راج دربار میں ایک اہم ترین فوجی اجلاس ہو رہا تھا۔ ہری سنگھ کی خواہش پر عام راجپوت سردار اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے اور رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے بڑے جبر کے ساتھ اپنے معتوب سپہ سالار کی یہ بات تسلیم کی تھی کہ وہ جو کچھ کہے گا سر دربار کہے گا۔ پھر جب ہری سنگھ اپنی نشست پر کھڑا ہوا تو اجلاس کے تمام شرکاء کی سانسیں رک سی گئیں وہ ایک ناراض سپاہی اور ایک مطلق العنان حکمراں کی گفتگو سننے کیلئے بے چین تھے۔ "سمراٹ! میں اپنے وطن اور سردار چھمن سنگھ کی خاطر دوبارہ لوٹ آیا ہوں اب نہ مجھے سالاری کی تمنا ہے اور نہ کسی سے کوئی شکایت۔" رتن سنگھ ہر خوف اور لالچ سے بے نیاز ہو کر بول رہا تھا۔

"میرے اندازِ فکر سے آپ کو بھی اختلاف ہو سکتا ہے اور ان راجپوت سرداروں کو بھی جن کے مضبوط کاندھوں پر چتوڑ کے اقتدار کی عمارت کھڑی ہے۔ میں پسند نہیں کرتا کہ میرے جذبات میری عقل پر غالب آ جائیں اور میں دیوانوں کی طرح ایک ایسے فعل کا مرتکب ہو جاؤں جس سے پوری قوم ہلاکت میں پڑ جائے۔ میں نے کبھی نہیں کہا کہ یہ سربلند و آزاد قوم دشمن کے سامنے سر جھکا کر غلامی کی دستاویز پر دستخط کر دے۔ میں چاہتا ہوں کہ چتوڑ کے چند باہوش انسان علاء الدین خلجی کے پاس جائیں اور اسے سمجھانے کی کوشش کریں کہ ہمارا اس سے کوئی جھگڑا نہیں ہے وہ خود بھی آزاد فضاؤں میں سانس لے اور ہماری

ہواؤں کو بھی سبک رفتار رہنے دے۔ اپنے خون کو بھی خاک میں جذب نہ کرے اور ہمارے لہو کو بھی رگوں میں محفوظ رہنے دے۔ اگر اسے اپنے حرم کی آبرو عزیز ہے تو ہمارے ناموس پر بھی دست درازی نہ کرے۔ اسے یہ بھی بتایا جائے کہ چتوڑ اور دہلی کے درمیان بہت فاصلہ ہے اور اس پر یہ نکتہ بھی واضح کر دیا جائے کہ دہلی کو چتوڑ سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا اور اسے یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کی جائے کہ راجپوت سپاہی خلجی سلطنت کے دشمنوں کو کوئی رعایت نہیں دیں گے۔"

"کیا یہ تمام باتیں علاءالدین سے بھیک مانگنے کے مترادف نہیں ہوں گی؟" راجہ رتن سنگھ نے تلخ لہجے میں ٹوکتے ہوئے کہا۔

"نہیں سمراٹ! ہرگز نہیں۔" ہری سنگھ نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ "اس قسم کے سیاسی مذاکرات میں کامیابی و ناکامی کا سارا دارومدار انسان کے طرزِ گفتگو پر ہوتا ہے۔ ہمارے نمائندے آبرومندانہ لہجے میں بات کریں گے۔ ان کے چہروں سے گداگری کا نہیں برابری کا رنگ جھلکے گا وہ علاءالدین کے آگے کشکول نہیں بڑھائیں گے' اس سے اتمامِ حجت کیلئے آخری گفتگو کریں گے۔"

"ہری سنگھ! کیا تم سمجھتے ہو کہ سلطان پانچ ماہ کے طویل ترین محاصرے کے بعد اتنی آسانی سے واپس چلا جائے گا۔" رتن سنگھ نے نہایت بے دلی کے انداز میں کہا۔

"میں نے اس کی واپسی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔" ہری سنگھ نے جواباً کہا۔

"پھر یہ لاحاصل دوڑ دھوپ کس لئے؟" رتن سنگھ نے اپنے سپہ سالار سے دوسرا سوال کیا۔

"سمراٹ! چتوڑ پر اتنا برا وقت کبھی نہیں پڑا۔ اگر کسی طرح یہ منحوس ساعتیں ٹل جائیں تو اچھا ہے۔" ہری سنگھ اچانک اداس نظر آنے لگا تھا۔ "ایک سپہ سالار کی حیثیت سے میں یہ راز جانتا ہوں کہ کبھی فوجوں کو موت کے منہ میں جھونک دینا بہادری کی علامت ہوتی ہے اور کبھی سپاہیوں کو فنا کی وادی سے بچا کر لے آنا شجاعت کہلاتی ہے۔ لشکروں کا آگے بڑھنا ہی فتح و نصرت کی دلیل نہیں ہوتی۔ کبھی کسی بڑی کامیابی کیلئے فوجوں کو پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ آج ہم کسی معرکے کو سر کرنے کی نہیں' اپنے سر بچانے کی کوشش کر رہے ہیں اگر سر بچ گئے تو سرداریاں بھی برقرار رہیں گی ورنہ سب کچھ غارت ہو جائے گا۔"

راجہ رتن سنگھ اپنے سپہ سالار کے ہوشمندانہ دلائل سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر ایک طویل وقفۂ سکوت کے بعد اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ "اگر علاءالدین نہیں مانا اور اس نے ہماری مرضی کے خلاف جواب دیا تو..........." رتن سنگھ نے قصداً اپنی بات نامکمل چھوڑ دی تھی۔

"پھر ہماری تلواریں ہوں گی' مارواڑ کے صحرا کی تپتی ہوئی ریت ہوگی' سنگلاخ چٹانیں ہوں گی' ہمارے اور دشمن کے کٹے ہوئے سر ہوں گے' بھڑکتی ہوئی چتائیں ہوں گی' تنگ و تاریک قبریں ہوں گی' ہر طرف رقص ہوگا' بے رحم اور سفاک موت کا رقص۔" انتہائی پرسکون نظر آنے والا ہری سنگھ اچانک مشتعل ہو گیا تھا۔ "درگا کی قسم! علاءالدین ہماری پشت نہیں دیکھے گا اس کی آنکھیں تو ایک ہی منظر کا مشاہدہ کریں گی کہ سیاہ نیزے ہمارے سینوں کے آر پار ہوں گے' زہریلے تیر ہماری گردنوں میں پیوست ہوں گے' رقصِ وحشت کا آغاز ہوگا اور فنا کے ساز پر ایک ہی نغمہ ابھر رہا ہوگا.......... راجپوت عظیم ہیں اور ناقابلِ تسخیر ہیں۔ موت ان کے ریزہ ریزہ جسموں پر قابو پا سکتی ہے مگر ان کی آزاد روحوں کو زنجیر نہیں کر سکتی۔" ہری سنگھ کا لہجہ جاں فروشی کے جذبے سے اس قدر سرشار تھا کہ اہلِ دربار کے جسموں میں بھی آگ سی بھڑکنے لگی۔

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے بالآخر راجپوت سمراٹ نے علاءالدین سے گفتگو کرنے کیلئے جہاندیدہ اور ذہین افراد پر مشتمل ایک وفد بھیجنے کی اجازت دیدی۔ اس وفد میں بوڑھا

سردار پچھمن سنگھ بھی شامل تھا۔ ہری سنگھ نے نصف قد تک خم ہو کر اپنے فرمانروا کو سلام پیش کیا جو اس بات کی علامت تھی کہ اب رتن سنگھ کی طرف سے اس کے دل میں کوئی کدورت باقی نہیں۔

☆..........☆..........☆

ابھی وفد کے دیگر ارکان کا انتخاب جاری تھا کہ دوسرے دن صبح راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے قلعے کی فصیل پر چڑھ کر سلطان کے جنگی مورچوں کی طرف دیکھا۔ علاءالدین کے بے شمار سپاہی اپنے خیموں سے نکل کر قلعے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رتن سنگھ دشمن کی فوجوں کی غیر معمولی نقل و حرکت دیکھ کر چونک اٹھا۔ پھر فوراً ہی اس نے سپہ سالار ہری سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں کو طلب کر لیا۔ ہری سنگھ اور دیگر سردار بھی یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ علاءالدین کے ہزاروں سپاہی بے دریغ بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب منظر صاف نہیں تھا مگر پھر بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ دشمن خالی ہاتھ نہیں ہیں اور وہ کچھ چیزیں اٹھائے ہوئے مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔

"کیا سلطان براہِ راست قلعے کے صدر دروازے پر حملہ کرنا چاہتا ہے؟" راجپوت سمراٹ نے پریشان ہو کر ہری سنگھ سے پوچھا۔

"نہیں سمراٹ! سلطان ایسی حماقت نہیں کر سکتا۔" ہری سنگھ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "علاءالدین کی فوجیں نشیب میں حرکت کر رہی ہیں اگر وہ ہمارے تیراندازوں کے ہدف تک پہنچ گئیں تو دشمن کا ایک سپاہی بھی زندہ نہیں بچے گا۔"

"پھر یہ سب کچھ کیا ہے؟" راجہ رتن سنگھ بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔

"ہم اپنے تیراندازوں اور سنگ باری کرنے والے سپاہیوں کو ہوشیار رہنے کا حکم دیئے دیتے ہیں' سلطان کے ارادے زیادہ سے زیادہ شام تک ظاہر ہو جائیں گے۔" ہری سنگھ نے جواباً کہا۔

اور پھر قلعے کی فصیل پر ایک ہلچل سی مچ گئی۔ فصیل کے دائیں اور بائیں جانب سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا اور صدر دروازے کے عین اوپر بھی ماہر تیراندازوں کے دستے متعین کر دیئے گئے۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی اپنے سرداروں کے ساتھ جلتی دھوپ میں کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ سلطان کے سپاہی بڑھتے بڑھتے ایک مخصوص فاصلے پر پہنچ کر ٹھہر گئے۔ ہری سنگھ نے اندازہ کرتے ہوئے بتایا کہ دشمن کے سپاہیوں کا موجودہ قیام ان کے خیموں سے تقریباً آدھے فاصلے پر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہری سنگھ نے یہ تجویز پیش کی کہ چند تیراندازوں کو دشمن پر تیر برسانے کا حکم دیا جائے۔

راجہ رتن سنگھ نے اپنے کچھ تیراندازوں کو اشارہ کیا' کمانیں چڑھیں اور پھر تیر چھوڑ دیئے گئے۔ ہری سنگھ چونک اٹھا۔ راجپوت سپاہیوں کے چھوڑے تیر ہدف پر پہنچنے سے پہلے ہی زمین پر گر گئے تھے۔ "وہ بہت ہوشیار ہے۔" ہری سنگھ پیچ و تاب کھانے لگا۔ "میں جانتا ہوں کہ اس سے کوئی حماقت سرزد نہیں ہو سکتی۔"

راجہ رتن سنگھ گھبرا کر اپنے سپہ سالار کا منہ دیکھنے لگا۔

"سلطان جب چتوڑ کی پہاڑی پر خیمہ زن ہوا تھا تو ہم لوگ سمجھے تھے کہ وہ اپنے اندازوں کی غلطی کا شکار ہو جائے گا مگر بعد میں ثابت ہو گیا کہ سلطان کی جاگنے والی آنکھیں ایک ہی نظر میں فاصلوں کی پیمائش کر لیتی ہیں۔ اس وقت علاءالدین کے خیمے ہمارے تیراندازوں کے ہدف سے تقریباً چار گنا دور تھے اور اب یہ فاصلہ بھی ہماری دسترس سے باہر ہے۔" سپہ سالار ہری سنگھ نے سلطانی لشکروں کی نقل و حرکت کے بارے میں رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔

"آخروہ کیا چاہتا ہے ؟" راجہ رتن سنگھ پر سراسیمگی سی طاری تھی اور رانی پدمنی بھی بار بار علاء الدین کے متحرک سپاہیوں کو دیکھ رہی تھی۔

"میرے خیال میں سلطان اپنا نیا فوجی پڑاؤ قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس وقت قلعے سے تقریباً پانچ سو گز کے فاصلے پر خیمہ زن ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔" ہری سنگھ کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا مگر چہرے سے ہلکی ہلکی پریشانی جھلک رہی تھی۔

"کیا اس طرح وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا ؟" راجہ رتن سنگھ کی فکر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"کامیابی تو اس کا مقدر نہیں مگر اس طرح محاصرہ کچھ اور تنگ ہو جائے گا۔" ہری سنگھ کے ذہن میں کئی اندیشے سر ابھار رہے تھے لیکن اس نے جنگی حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے سلطان کی فتح کے امکانات کو یکسر مسترد کر دیا۔ اگر ہری سنگھ منفی انداز میں اپنے ہونٹوں کو جنبش دیتا تو راجپوت لشکر میں انتشار پھیل جانے کا خطرہ تھا۔ اس لئے چتوڑ کے ذہین سپہ سالار نے مصلحت آمیز جھوٹ سے کام لیا اور سلطان کی اس حرکت کو محض وقت کی بربادی سے تعبیر کرنے لگا۔ "محاصرہ کتنا بھی تنگ ہو جائے مگر اس سے سلطان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ ہمارے قلعے کی فصیلیں اس کی دست درازیوں سے مکمل طور پر محفوظ ہیں۔"

☆..........☆..........☆

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے وہ رات بھی سکون سے سو کر گزاری مگر سیناپتی ہری سنگھ اور بوڑھا سردار پچھمن سنگھ رات بھر جاگتے رہے امورِ جنگ کے دونوں ماہرین مختلف زاویوں سے بحث کر رہے تھے اور اس نتیجے پر پہنچنے کیلئے بے چین تھے کہ سلطان نے آخر یہ اقدام کیوں کیا ہے ؟

پھر جب صبح ہوئی اور سورج مارواڑ کی پہاڑیوں سے طلوع ہوا تو قلعے کی فصیل پر کھڑے ہوئے رتن سنگھ کی آنکھیں ایک اور عجیب منظر دیکھ رہی تھیں۔ سلطان کے سپاہی جس پہاڑی پر خیمہ زن تھے اب اسی پہاڑی کو کاٹا جا رہا تھا۔ رتن سنگھ کیلئے دشمن فوجیوں کی یہ حرکت ناقابلِ فہم تھی۔ فوری طور پر ہری سنگھ اور پچھمن سنگھ کو طلب کیا گیا۔ اگرچہ پچھمن سنگھ کا بڑھاپا اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا لیکن وطن پرستی کا جذبہ اسے فصیل کی طرف کھینچے لئے جا رہا تھا۔ وہ کئی بار راج محل کی پرپیچ سیڑھیوں پر گرا اور کسی کی مدد کے بغیر اٹھ کر فصیل تک پہنچا۔ پچھمن سنگھ کی کمزور آنکھیں زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکتی تھیں مگر اس کا چہرہ دشمن کے خیموں کی طرف تھا اور سماعت کی پوری قوتیں رتن سنگھ کی باتوں پر مرکوز تھیں۔

"علاء الدین کے سپاہی اس پہاڑی کو کیوں کاٹ رہے ہیں ؟" راجہ رتن سنگھ نے اپنے سپہ سالار ہری سنگھ سے پریشان لہجے میں سوال کیا۔

"کچھ نہیں کھلتا سمراٹ کہ آخر اس کے ارادے کیا ہیں ؟" ہری سنگھ بھی خلجی حکمراں کی چالوں کو سمجھنے سے عاجز تھا۔

"کیا تم دشمن کے سپاہیوں کی تعداد کا اندازہ کر سکتے ہو ہری سنگھ ؟" راجپوت سمراٹ نے دوسرا سوال کیا۔

"آج سارے اندازے غلط ٹھہریں گے سمراٹ !" ہری سنگھ کے لہجے میں ہلکا ہلکا اضطراب شامل تھا۔ "جدھر دیکھتا ہوں دشمنوں کے سر ہی سر ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ساری دہلی چتوڑ پر اُمڈ آئی ہے۔"

"پہاڑی کے گرد سلطان کے سپاہی حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔" راجہ رتن سنگھ شدید بے قراری کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ "دشمن فوجیوں کی قطاریں سی بنی ہوئی ہیں۔ شاید یہ لوگ پہاڑی کے پتھر

کاٹ کر اگلے مورچے پر منتقل کر رہے ہیں۔" رتن سنگھ نے رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔ "کیا اس مورچہ بندی کو روکا نہیں جا سکتا ؟" رتن سنگھ نے کسی بچے کی طرح اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"باہر کی فضاؤں پر سلطان کا مکمل قبضہ ہے۔ اندر کے لوگ محصور ہو جائیں تو باہر کی دنیا سے ان کا کوئی رابطہ نہیں رہتا۔" ہری سنگھ اپنے تمامتر تجربے اور تدبر کے باوجود بے دست و پا نظر آ رہا تھا۔

ہری سنگھ ! ہم سے ایسی مایوسی کی باتیں نہ کرو۔" راجہ رتن سنگھ کی اعصابی شکستگی اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی۔ "جھوٹ ہو مگر ہمیں فتح کی نوید دو۔ ہمارے کانوں میں کہہ دو کہ دشمن چتوڑ کے ناقابلِ تسخیر قلعے سے ٹکرا کر واپس چلا جائے گا۔ ہم یہ جنگ ہار کر اپنے اقتدار سے محروم ہونا نہیں چاہتے۔"

آج پہلی بار ہری سنگھ نے اپنی آنکھوں سے غرور کے آہنی مجسمے کو پگھلتے دیکھا تھا۔ تاج و تخت کیسی بلاخیز زنجیریں ہیں کہ آدمی آخری سانس تک ان کی گرفت سے آزاد ہونا نہیں چاہتا رتن سنگھ بھی اس بچے کی طرح مچل اٹھا تھا جس نے چمکتے ہوئے چاند کو دیکھ کر کہا تھا کہ اسے زمین پر اتار کر اس کی آغوش میں ڈال دو۔ ہری سنگھ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے فریب خوردہ حکمراں کو کس طرح جھوٹی تسلیاں دے۔ وہ اپنے عقب میں تھوڑے ہی فاصلے پر دشمن کے قدموں کی چاپ سن رہا تھا مگر رتن سنگھ کی بدحواسی دیکھ کر اسے مجبوراً جھوٹ بولنا پڑا۔ "سمراٹ ! میں نے صرف دشمن کی مورچہ بندی کا ذکر کیا ہے۔" اب ہری سنگھ کے لہجے میں آثارِ شکستگی کے بجائے راجپوتوں کا روایتی جلال تھا۔ "ابھی جنگ کا فیصلہ کن مرحلہ تو بہت دور ہے۔ دونوں طرف بساطیں بچھادی گئی ہیں۔ مہرے گردش کر رہے ہیں اور نتیجہ ؟ وہ تو ایشور کے اختیار میں ہے۔ پھر بھی آخری فتح ہماری ہوگی۔ قلعے کی فصیل تک پہنچنا آسان نہیں۔ علاء الدین بڑی گمراہ کن خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ اسے اندازہ نہیں کہ یہ دیواریں کن ہاتھوں نے تراشی ہیں ؟" ہری سنگھ اپنے حکمراں اور فوج کو ذہنی انتشار سے بچانے کیلئے جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ اپنے جھوٹ پر دل میں پشیمان تھا مگر اس نے رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں کو دھوکا دینے کیلئے چہرے پر یقین کی آگ روشن کر لی تھی۔

"اور تمہارے اس وفد کا کیا ہوا جسے تم علاء الدین کے پاس بھیجنا چاہتے تھے ؟" اچانک رتن سنگھ نے ایک اور سوال کر دیا۔

ہری سنگھ نے چونک کر راجپوت سمراٹ کی طرف دیکھا۔ راتوں رات کیسا عجیب انقلاب آ گیا تھا کہ ہری سنگھ کی پیش کردہ سیاسی مذاکرات کی جس تجویز کو بزدلی کی بدترین علامت قرار دیا جا رہا تھا' آج رتن سنگھ اسی تجویز کے سائے میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اس وفد کے ارکان کا انتخاب ہو گیا ہے۔" ہری سنگھ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اب چتوڑ کے ان نمائندوں کا بھیجنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔"

راجہ رتن سنگھ نے استفہامیہ نظروں سے ہری سنگھ کی طرف دیکھا۔

"اب ہمارے نمائندوں کی ذمے داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔" ہری سنگھ نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ایک طرف وہ سلطان کو سیاسی گفتگو کے پیچ و خم میں الجھائیں گے اور دوسری طرف دشمن کے نئے اقدامات کی جاسوسی بھی کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ کل دوپہر تک یہ راز بھی فاش ہو جائے گا کہ سلطان کے سپاہی اس پہاڑی کو کس مقصد کیلئے کاٹ رہے ہیں اور نئی مورچہ بندی میں دشمن کے کیا عزائم پوشیدہ ہیں۔"

رتن سنگھ کے چہرے پر خوشی کا ہلکا سا رنگ ابھر کر ڈوب گیا۔ "یہ چال بہت گہری بھی ہے اور بروقت بھی۔ ہم تمہاری ذہانت کے قائل ہو گئے ہیں ہری سنگھ۔"

ہری سنگھ بے حس و حرکت کھڑا، سلطان کے سپاہیوں کو دیکھ رہا تھا جو "چتوڑ پہاڑی" اور نئے مورچے کے درمیان بہت تیزی سے گردش کر رہے تھے۔

☆..................☆..................☆

نئی صبح راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کیلئے ایک پراسرار پیغام لے کر آئی تھی۔ وہ پیغام اہل چتوڑ کو خوشیاں بھی فراہم کر سکتا تھا اور نئے آزار بھی پہنچا سکتا تھا۔ ہری سنگھ نے اپنے وفد سے آخری ملاقات کی اور وفد کے قائد سردار لچھمن سنگھ کو ہدایت کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے آپ کے تجربے اور قوتِ برداشت پر بہت بھروسہ ہے سردار! میری خواہش ہے کہ گفتگو کا آغاز بھی آپ کریں اور اختتام بھی۔ یہ دوسرے ارکان کی ذات پر بے اعتمادی کی بات نہیں، صرف احتیاط اور پیش بندی ہے۔ گرم خون رکھنے والی قوموں کے نمائندے اکثر جذباتی ہو جاتے ہیں اور اس روش کا انجام ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔" یہ کہہ کر ہری سنگھ نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "میں چتوڑ کے معزز سرداروں سے التجا کرتا ہوں کہ وہ اپنے لہجوں کو نرم اور چہروں کو پرسکون رکھیں۔ صورت حال کتنی ہی بگڑ جائے مگر آپ لوگ اپنی ہوشمندی سے سنوارنے کی کوشش کریں۔ ہمیں سلطان کے ذلت آمیز سلوک کی بھی توقع ہے مگر آپ اسے برداشت کر لیجئے گا۔ خاکِ وطن کبھی کبھی عجیب قربانیاں طلب کرتی ہے۔" ہری سنگھ کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گیا۔

آٹھ افراد پر مشتمل اس وفد کے سارے ارکان پورے انہماک کے ساتھ سیناپتی کی باتیں سن رہے تھے۔

ہری سنگھ نے آخری ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ قلعے سے نکل کر بے نیازانہ سلطان کے خیمے کی طرف بڑھیں گے۔ دشمن سپاہیوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں گے مگر انہیں اندازہ نہیں ہونے دیں گے کہ یہ وفد کسی قسم کی جاسوسی کیلئے روانہ کیا گیا ہے۔"

چتوڑ کا سیاسی وفد اس طرح روانہ ہوا کہ راجہ رتن سنگھ اور سپہ سالار ہری سنگھ ان معزز سردارانِ قوم کو رخصت کرنے قلعے کے دروازے تک آئے پھر جیسے ہی راجپوت سرداروں نے دروازے سے باہر قدم رکھے، رتن سنگھ کی تھرتھراتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔

"شیو اور وشنو کا بے پناہ کرم تمہارے سروں پر سایہ فگن رہے اور تمہیں دیکھتے ہی دشمنوں کی صفیں درہم برہم ہو جائیں.......... اور درگا کی لامحدود شکتیاں تمہارے جسموں میں اس طرح حلول کر جائیں کہ تمہارے قدموں کی دھمک سے چتوڑ کے بدخواہوں کی سانسیں اکھڑ جائیں اور پھر "کالی" کے قہر کی ہوائیں ان کے خیموں کو اڑا کر دور کہیں لے جائیں۔" راجہ رتن سنگھ اپنے دیوتاؤں کو مدد کیلئے پکار رہا تھا اور راجپوت سردار آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

☆..................☆..................☆

تقریباً پانچ سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد رتن سنگھ کے نمائندوں اور سلطان کے سپاہیوں کا آمنا سامنا ہوا۔ علاء الدین کے فوجی ایک لمحے کیلئے چونکے مگر راجپوت سرداروں کو خالی ہاتھ دیکھ کر مطمئن نظر آنے لگے۔ ملک نصرت خان نے آگے بڑھ کر ان کے قلعے سے نکلنے کا سبب دریافت کیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ راجہ رتن سنگھ اپنے سفیروں کے ذریعے سلطان سے گفتگو کرنا چاہتا ہے تو ملک نصرت خان ان آٹھوں افراد کو لے کر علاء الدین کے خیمے تک پہنچا۔ پھر جب ملک نصرت خان نے اپنے سلطان کو رتن سنگھ کی اس خواہش سے باخبر کیا تو علاء الدین حالتِ غضب میں بھڑک اٹھا۔

"ان نامرادوں کو واپس لوٹا دو کہ گفتگو کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ اب تو ایک ہی راہ کھلی ہے، قتال و جدال کی راہ.......... لاشوں اور جنازوں کی راہ.......... شمشیروں اور نیزوں کی راہ.......... جس

کے بازو زیادہ طاقتور ہوں گے وہی اپنے حریف کے چہرے پر سیاہی مل دے گا۔ اب چتوڑ کی فضاؤں میں روشنی نہیں ہوگی ملک! صرف دھواں پھیلے گا اور زمین کی آغوش سے اندھیرے پھوٹیں گے۔ ہم نے دوبار چاہا کہ رتن سنگھ کے سر پر اپنے کرم کا سایہ دراز کر دیں اور اس کے گناہوں کو بخش دیں مگر وہ فطرتاً مجرم ہے۔ اس کی بینائی لٹ چکی ہے اور وہ اپنی بجھی ہوئی آنکھوں سے ہماری شانِ خسروانہ دیکھ نہیں سکا۔ رتن سنگھ نے ہر مرتبہ ہم سے قہر و نفرت کا سودا کرنے کی کوشش کی۔ اس بدنصیب کو نہیں معلوم کہ ہم بازار سیاست کے سب سے بڑے تاجر ہیں۔ ہم صلح پسندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتے مگر جب کوئی ظلم اور نافرمانی کی ابتداء کر دیتا ہے تو ہم اس کی زمین، اس کا اقتدار اور اس کی سانسیں تک خرید لیتے ہیں۔" آتشِ غضب سے علاء الدین کی زبان بھی جل رہی تھی اور چہرہ بھی۔

"فاتح عالم کے دروازے پر چند گداگر کھڑے ہیں۔" ملک نصرت خان نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "غلام اس حقیقت سے خوب واقف ہے کہ آج تک شاہ کے دروازے سے کوئی بھکاری خالی ہاتھ نہیں گیا۔ رتن سنگھ کی پشت میں خم نمایاں ہو گیا ہے اور اس کی ٹانگیں کانپنے لگی ہیں۔ اگر سلطان چتوڑ کے سفیروں کو اپنے رخِ تابناک کی ایک جھلک ہی دکھا دیں تو یہ سعادت ان کیلئے کافی ہوگی۔" ملک نصرت خان چاہتا تھا کہ سلطان، رتن سنگھ کے نمائندوں کو خلوت میں طلب کر کے ان سے اپنی توہین کا انتقام لے مگر علاء الدین نے اپنے سپہ سالار کی بات کا مفہوم سمجھے بغیر اسے جھڑک دیا۔

"ملک! تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہر آنکھ ہمارے دیدار کے لائق نہیں ہوتی۔" علاء الدین کا مزاج کچھ اور برہم سا ہو گیا تھا۔

"یقیناً.......... اے صاحب جبروت! اس میں کیا شک ہے؟" ملک نصرت خان نصف قد تک خم ہو گیا۔ "غلام تو چاہتا تھا کہ چتوڑ کے بھکاری ایک نظر میرے سلطان کا جاہ و جلال دیکھ لیں اور جب وہ لرزتے ہوئے دلوں کے ساتھ واپس جا کر اس ملاقات کا حال بیان کریں تو ان کے چہروں پر خوف کی دھند چھائی ہوئی ہو اور ان کی زبانیں وحشت سے لڑکھڑا رہی ہوں۔"

علاء الدین خلجی کے اعصاب کا کھنچاؤ کسی قدر کم ہو گیا۔ "ملک! ہم تمہارے جذبۂ شاہ پرستی کی قدر کرتے ہیں مگر رتن سنگھ اسی سلوک کا مستحق تھا۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ ہم اسے شرف باریابی بخشیں تو چتوڑ کے قاصدوں سے کہو کہ ان کا حکمران ہمارے فرمان کے ٹکڑوں کو اپنے سر پر سجا کر گھٹنوں کے بل چلتا ہوا شاہی خیمے تک پہنچے۔ پھر یہ ممکن ہے کہ ہم ازراہِ کرم اس کی درخواست قبول فرما لیں۔"

ملک نصرت خان الٹے قدموں چلتا ہوا خیمے سے باہر آیا اور زبانِ شاہ سے ادا ہونے والا ایک ایک حرف چتوڑ کے سفیروں کو منتقل کر دیا۔

علاء الدین کے الفاظ کی حرارت سے راجپوت سرداروں کے دل و دماغ جھلس اٹھے تھے۔ ان کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی مگر ہری سنگھ کی ہدایات نے انہیں لب کشائی سے روکا۔ تاہم سردار لچھمن سنگھ اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکا۔ "تمہارے سلطان نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اسے معزز سفیروں کا احترام کرنا چاہئے تھا۔"

"سلطان اپنے برابر کے لوگوں سے گفتگو کرتے ہیں۔" ملک نصرت خان کی پیشانی پر بھی کئی بل ابھر آئے تھے۔ "تم نے اپنی پست قامتی کی طرف بھی نہیں دیکھا اور اپنے گریبانوں میں بھی نہیں جھانکا، پھر کس منہ سے شاہ کے انداز تغافل کی شکایت کرتے ہو؟ کیا یہ سلطان عالی مقام کا کرم نہیں ہے کہ تم اپنی جانوں اور پگڑیوں کی سلامتی کے ساتھ واپس جا رہے ہو؟ شاہ تو شاہ اس کے غلاموں کے ہاتھ بھی اتنے

دراز ہیں کہ وہ اونچی سی اونچی دستار کو اچھال سکتے ہیں مگر ہم نے ایسا نہیں کیا کہ آدابِ سفارت نے ہماری کلائیوں کو جکڑ رکھا ہے۔" یہ کہہ کر ملک نصرت خان نے منہ پھیر لیا اور اپنے چند سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ چتوڑ کے قاصدوں کو پوری حفاظت کے ساتھ قلعے کے دروازے تک چھوڑ آئیں۔

لچھمن سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں کے قدم زمین میں دھنسے جا رہے تھے۔ احساسِ ندامت نے ان کے پیروں کی جان سلب کر لی تھی مگر وہ کسی نہ کسی طرح اپنے جسموں کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے قلعے میں داخل ہو گئے۔

☆..................☆..................☆

راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی، سیناپتی ہری سنگھ اور دیگر اراکین سلطنت بڑی بے چینی سے اپنے سفیروں کی واپسی کے منتظر تھے۔ جب انہیں اطلاع دی گئی کہ چتوڑ کے قاصد لوٹ آئے ہیں تو راجہ رتن سنگھ اور سپہ سالار ہری سنگھ چونک اٹھے۔ انہیں ایک ہی لمحے میں اس بات پر یقین آ گیا تھا کہ مذاکرات ناکام ہو چکے ہیں ورنہ اتنی جلد واپسی کس طرح ممکن تھی؟ لچھمن سنگھ کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ پوری روداد سناتا رہا اور راجپوت سرداروں کے دل و دماغ میں نفرت و انتقام کے شعلے بھڑکتے رہے۔

"تم نے اپنی ضد کا انجام دیکھ لیا ہری سنگھ؟" اچانک رانی پدمنی اپنے سپہ سالار سے مخاطب ہوئی۔ "تمہیں بہت شوق تھا کہ راجپوت سورماؤں کے چہروں کو خجالت کے پسینے میں ڈوبا ہوا دیکھو۔" پدمنی کا اندازِ تخاطب انتہائی تحقیر آمیز تھا۔ ہری سنگھ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور جسم پر ہلکی ہلکی لرزش طاری تھی۔

لچھمن سنگھ کی بروقت مداخلت نے چتوڑ کی فوجی قوت کو منتشر ہونے سے بچا لیا۔ "نہیں مہارانی! اس میں ہری سنگھ کا کوئی قصور نہیں۔ اس کی ذہانت نے تو حالات کے کئی بند دروازے کھول دیئے ہیں۔ جو اذیتیں ملک و قوم کی خاطر برداشت کی جاتی ہیں وہ فرزندانِ وطن کیلئے سب سے بڑا اعزاز ہوتی ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم نے اپنی دھرتی ماں کیلئے سلطان کی گالیاں کھائیں اور اس کے ساتھ ہی دشمن کے تیور بھی پہچان لئے۔ ہری سنگھ کا منصوبہ کامیاب رہا۔ سلطان کے سپاہی قلعے کے عین مقابل ایک اونچا اور وسیع و عریض ٹیلہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہزاروں سپاہی پہاڑی کاٹنے پر متعین ہیں اور ہزاروں فوجی بھاری پتھروں کو نئے مورچے کی طرف منتقل کر رہے ہیں۔"

ہری سنگھ جوشِ اضطراب میں کھڑا ہو گیا۔ "مجھے اندازہ تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔" ہری سنگھ، رانی پدمنی کی طنز آمیز باتوں کو فراموش کر کے لچھمن سنگھ سے پوچھنے لگا۔ "کیا تم نے سلطان کے لشکر میں کوئی غیر معمولی اسلحہ دیکھا ہے؟"

"نہیں!" لچھمن سنگھ نے جواباً کہا۔ "اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم گہری نظروں سے دشمن کی جنگی تیاریوں کا جائزہ لیتے اور پھر سلطان کے سپاہی بہت بڑے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی تعداد کا صحیح اندازہ بھی ممکن نہیں۔ اب تو ان لوگوں پر ایک ہی دھن سوار ہے کہ پہاڑی کو جلد از جلد کاٹ کر نیا مورچہ بنا ڈالیں۔"

لچھمن سنگھ کے جواب نے سیناپتی کو اداس کر دیا تھا۔ "اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم خاموشی کے ساتھ سلطان کی نئی مورچہ بندی کے انتظامات کو دیکھتے رہیں۔ دشمن کی چال کو سمجھے بغیر ہم کوئی نیا قدم نہیں اٹھا سکتے۔ بس یہ کہ چتوڑ کی تمام فوج قلعے کی فصیلوں پر متعین کر دیں اور مسلسل جاگتے رہیں۔"

☆..................☆..................☆

راجہ رتن سنگھ اور اس کے فوجی سردار اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ علاء الدین خلجی نے دہلی سے دس ہزار تازہ دم سپاہی طلب کئے تھے اور ان سپاہیوں کے چتوڑ پہنچتے ہی سلطان نے پہاڑی کو کاٹنے اور نیا

مورچہ بنانے کا حکم دے دیا تھا۔ اس کے علاوہ علاء الدین کے سپاہیوں کو جہاں جہاں بھی پتھر دستیاب ہوتے تھے وہ انہیں گھوڑوں کی پیٹھوں پر لاد کر قلعے کے سامنے اتار دیا کرتے تھے۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی اپنے سرداروں کے ہمراہ روزانہ قلعے کی فصیل پر نمودار ہوتے اور بڑی حیرت سے سلطان کے سپاہیوں کو ایک ایسے کام میں مصروف دیکھتے جو بظاہر بے مقصد تھا مگر اس کی تہہ میں دشمن کی کوئی گہری چال پوشیدہ تھی۔

کچھ دن تک تو راجہ رتن سنگھ نے ہری سنگھ کی باتوں کو اہمیت نہیں دی لیکن جب پتھروں کا انبار زمین کی سطح سے بلند ہونے لگا تو راجپوت سمراٹ کی پریشانیاں بھی بڑھتی چلی گئیں۔ اب صورت حال یہ تھی کہ وہ صبح سے شام تک سلطان کے سپاہیوں کی جاں فشانیوں کا منظر دیکھتا رہتا اور رات کو شراب پی کر سونے کی کوشش کرتا مگر اس کی آنکھوں سے نیندیں اڑ چکی تھیں۔ پدمنی کی دلفریب ادائیں اپنے شوہر کو خوابوں کے پرسکون جزیرے میں کھینچ کر لے جانا چاہتیں لیکن اقتدار سے محرومی کا خوف رتن سنگھ کے رگ و پے میں اتر چکا تھا اور اس پر دنیا کی ہر آسائش کا تصور بھی حرام ہو چکا تھا۔

چتوڑ کے باشندے کئی ماہ سے قیدیوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے اور اب یہ زندگی دشوار سے دشوار تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اگرچہ قلعے میں چند ماہ کا غذائی ذخیرہ موجود تھا لیکن غیر یقینی مستقبل کے اندیشوں نے ہر شخص سے اس کی ذہنی آزادی چھین لی تھی اور ہر فرد کے دل پر غلامی کا خوف غالب آتا جا رہا تھا۔

علاء الدین کے سپاہیوں کی مشقتوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور اب وہ رات کے اندھیروں میں بھی مورچہ بندی کا کام جاری رکھتے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد اس شدید محنت کا جو نتیجہ برآمد ہوا اس نے رتن سنگھ کا باقی ماندہ سکون بھی چھین لیا۔ پتھروں کا وہ ٹیلہ جسے اہلِ چتوڑ نے شروع میں کوئی اہمیت نہیں دی تھی، اب وہ بلند ہوتے ہوتے ایک پہاڑی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس نئی مورچہ بندی کے بارے میں مختلف تاریخ نویسوں کی مختلف رائے ہے۔ مسلم مورخین کہتے ہیں کہ چتوڑ کا محاصرہ مسلسل چھ ماہ تک قائم رہا۔ ہندو مورخوں کا دعویٰ ہے کہ اس محاصرے کی مدت پورے آٹھ ماہ تھی۔ وقت کے تعین میں اس معمولی سے اختلاف کے باوجود تمام ہوشمندوں کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں یہ سب سے طویل اور سخت محاصرہ تھا۔ اگر علاء الدین کی جگہ کوئی دوسرا حکمراں ہوتا تو بہت پہلے محاصرہ اٹھا کر دہلی واپس جا چکا ہوتا لیکن خلجی حکمراں ایک غیر معمولی اعصاب کا انسان تھا۔ اس نے مسلسل چھ یا آٹھ ماہ تک جس سخت جانی کا ثبوت فراہم کیا وہ دنیا بھر کی جنگی مہمات میں ایک عظیم الشان کارنامہ ہے.......... اور سلطان کی یہی وہ قوتِ برداشت تھی جس نے موسم کی بے شمار سختیوں کا مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔ پھر اسی جوانمردی نے چتوڑ سے اس کے ناقابلِ تسخیر ہونے کا اعزاز چھین لیا۔

وہ دن بڑا لرزہ خیز تھا جب راجہ رتن سنگھ نے سلطان کے نئے مورچے کی طرف اشارہ کیا۔ "تم دیکھ رہے ہو ہری سنگھ؟" راجپوت سمراٹ کی آواز میں ارتعاش تھا۔ "ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ علاء الدین کے سپاہی اس مختصر سے عرصے میں قلعے کے مقابل ایک مصنوعی پہاڑ کھڑا کر دیں گے۔"

ہری سنگھ خاموش تھا اور اداس نظروں سے سلطان کے قائم کردہ نئے مورچے کو دیکھ رہا تھا جس کی اونچائی قلعے کی فصیلوں کے برابر تھی۔ "سمراٹ! یہ ممکن نہیں تھا مگر اس نے ممکن بنا دیا۔" ہری سنگھ نے اپنے حکمراں کی بات کا جواب دیا مگر وہ لہجے کی تھکن کو نہیں چھپا سکا۔

"آخر اس طرح وہ کیا حاصل کرنا چاہتا ہے؟" رتن سنگھ نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا اس کے تیر انداز دستے ہمارے سپاہیوں پر تیروں کی بارش کریں گے؟"

"نہیں!" ہری سنگھ کا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ "جب ہمارے تیر سلطان کے مورچے کو نہیں چھو سکے تو پھر اس کے تیر بھی ہماری فصیلوں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

"تم ہمیں جھوٹی تسلیاں دے رہے ہو ہری سنگھ۔" راجپوت فرمانروا نے چیختے ہوئے کہا۔

"مجھے معاف کریں سمراٹ کہ میں بھی دشمن کی اس چال کو سمجھنے سے عاجز ہوں۔" ہری سنگھ اپنی زندگی میں پہلی بار کسی مجرم کی طرح شرمندہ نظر آرہا تھا۔

"جب تجھے ملک وقوم کو منجدھار ہی میں چھوڑ کر جانا تھا تو پھر تو نے ان بہادر سپاہیوں کی قیادت کیوں قبول کی تھی؟" راجہ رتن سنگھ اپنے ہوش وحواس کھو چکا تھا۔

ہری سنگھ نے اپنے حکمراں کے ذلت آمیز سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں مستقل پہاڑی پر جمی ہوئی تھیں جہاں دشمن کے سپاہیوں کی نقل وحرکت بہت تیز تھی۔

فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث ہری سنگھ وہ منظر نہیں دیکھ سکا جب سلطان علاءالدین خلجی نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور بلند آواز میں کہا۔ "ساری بڑائی خدا کیلئے ہے جس نے اپنے بندے علاءالدین پر راہ کی مشکلیں آسان کیں۔" علاءالدین اپنے چاروں سپہ سالاروں اور حضرت امیر خسروؒ کے درمیان کھڑا تھا۔ خالق کائنات کی تعریف وستائش کے بعد سلطان نے ایک منجنیق پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر چند گز پیچھے ہٹ کر اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔

دوسرے ہی لمحے راجہ رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں نے خوفناک دھماکوں کی آوازیں سنیں۔ قلعے کی دیواروں میں ہلکے ہلکے شگاف پڑنے لگے تھے۔ ہر طرف ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ چتوڑ کے فوجیوں نے اپنی پوری زندگی میں پہلی بار ایسے دھماکوں کی آوازیں سنی تھیں جو ان کیلئے ناقابل فہم تھے۔ دشمن ان سے بہت دور تھا مگر اس کے حملے کی ضرب انہیں اپنے سروں کے قریب محسوس ہو رہی تھی کچھ دیر تک تو سیناپتی بھی علاءالدین کی جنگی حکمتِ عملی کو سمجھنے سے عاجز رہا۔ وہ بدحواس انسانوں کی طرح شمالی اور جنوبی فصیلوں پر دوڑتا رہا۔ پھر کہیں جاکر یہ راز کھلا کہ سلطان کے سپاہی قلعہ پر سنگ باری کر رہے ہیں۔

علاءالدین نے اپنا نیا مورچہ مشرق کی جانب قائم کیا تھا اور پھر اس نے اپنے نشانہ بازوں کو حکم دیا تھا کہ پہلے قلعے کی جنوبی فصیل کو مسمار کر دیا جائے اس لئے شاہی منجنیقوں کا ہدف قلعے کی وہ دیوار تھی جس کے ٹوٹ جانے پر راجپوتوں کی محفوظ پناہ گاہ میں داخل ہونے کا راستہ بھی کھل جاتا اور چھ ماہ تک برداشت کی جانے والی اذیتوں کا مداوا بھی ہو جاتا۔ سلطان کے ماہر نشانہ باز مسلسل پتھر برسا رہے تھے مگر قلعے کی دیواریں ابھی تک محفوظ تھیں ان میں کہیں کہیں رخنے پیدا ہو رہے تھے جو راجہ رتن سنگھ کیلئے زیادہ نقصان دہ نہیں تھے۔ ہری سنگھ نے کئی دن تک اس صورت حال کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا اور پھر مطمئن لہجے میں راجہ رتن سنگھ سے کہا تھا۔

"سمراٹ! یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ دشمن کی سب سے زیادہ خوفناک چال بھی ناکام ہو گئی۔ سلطان کا خیال تھا کہ اس کے پھینکے ہوئے پتھر قلعے کی دیواروں میں شگاف ڈال دیں گے مگر اسے دیواروں کی ساخت اور مضبوطی کا اندازہ نہیں تھا۔ پتھر دیواروں پر اثر انداز تو ہو رہے ہیں مگر اس طرح نہیں کہ وہ ہماری فصیلوں کو توڑ سکیں۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر سلطان ایک سال تک بھی اسی طرح سنگ باری کرتا رہے تو چتوڑ کے قلعے کا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

راجہ رتن سنگھ کے چہرے پر ہلکی ہلکی خوشی کا عکس ابھرنے لگا تھا۔ "ہری سنگھ! میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ یہ کونسا جنگی ہتھیار ہے جس کے ذریعے دشمن ہماری محفوظ ترین پناہ گاہ کو منہدم کر دینا چاہتا ہے۔"

ہری سنگھ گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر کچھ دیر بعد آہستہ سے لہجے میں کہنے لگا۔ "سمراٹ! میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ قلعہ شکن ہتھیاروں میں سب سے زیادہ موثر اور خوفناک ہتھیار ہے اسی کے ذریعے مسلمان سپہ سالار محمد بن قاسم نے دیبل کا قلعہ فتح کیا تھا۔"

"جب دیبل کا قلعہ فتح ہو سکتا ہے تو پھر چتوڑ..........." راجہ رتن سنگھ کے اعصاب پر ایک بار پھر وحشت وبدحواسی طاری ہو گئی تھی۔

ہری سنگھ نے فوراً اپنا لہجہ بدل ڈالا۔ "دیبل اور چتوڑ کے قلعوں کی ساخت میں بڑا فرق ہے اور پھر علاءالدین کے قلعہ شکن آلات بھی اتنے طاقتور نہیں کہ وہ ہماری فصیلوں کو مسمار کر سکیں۔"

راجہ رتن سنگھ مطمئن ہو گیا اور ہری سنگھ کی وہ بے چینی بھی ختم ہو گئی جس نے چھ مہینے سے اس کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔

☆..........☆..........☆

چار پانچ دن تک سنگ باری ہوتی رہی مگر علاءالدین کے نشانہ باز خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے تھے۔ اس دوران سلطان نے قلعے کی شمالی فصیل کو بھی ہدف بنانے کا حکم جاری کر دیا تھا لیکن یہاں بھی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ پتھر فصیل تک پہنچتے تھے اور دیوار پر معمولی اثرات چھوڑ کر اپنی فطری قوت سے محروم ہو جاتے تھے۔ قلعے کے دونوں جانب دیواروں کے نیچے پتھروں کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا اور راجپوت بے پناہ خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ دشمن کو اپنی جس حکمت عملی پر ناز تھا وہ بہت تیزی سے ناکامی کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ جب علاءالدین کو یہ خبر دی گئی تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے اپنے نشانہ بازوں کے سردار ہشام اسدی کو خیمے میں طلب کر لیا جہاں ملک نصرت خان، خواجہ حاجی، تاج الدین عراقی اور ملک ظفر خان پہلے سے موجود تھے۔ ہشام اسدی رسم تعظیم بجالایا اور پھر زمین سے اٹھ کر دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

"ہشام! کیا تیرے شاگردوں کی بینائی کم ہونے کے سبب نشانے خطا کر گئے یا ان کے بازوؤں کی طاقت سلب ہو گئی۔" علاءالدین کا لہجہ انتہائی ناخوشگوار تھا۔

"جب تک سلطان معظم کی بلند اقبالی کا سورج نصف النہار پر چمک رہا ہے غلاموں کے نشانے کبھی غلط نہیں ہوں گے اور ان کے بازوؤں کی طاقت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔" ہشام اسدی نے سینے پر دونوں ہاتھ باندھ کر گردن کو خم کرتے ہوئے کہا۔ ہشام اسدی ایک طویل القامت عرب تھا جو سلطان جلال الدین خلجی کے دور حکومت میں ہندوستان آیا تھا اسے تیر اندازی کے فن میں بے مثال مہارت حاصل تھی۔ مگر جس صلاحیت نے اسے سلطانی لشکر میں سربلند کیا تھا وہ منجنیق چلانے کا غیر معمولی ہنر تھا۔ چتوڑ پر لشکر کشی سے پہلے علاءالدین نے ہشام اسدی سے طویل مشورہ کیا تھا۔

"پھر قلعے کی دیواریں ابھی تک اپنی بنیاد پر کیوں قائم ہیں؟" علاءالدین نے قدرے ناگوار لہجے میں کہا۔ "یہ ہمارے سامنے سجدہ ریز کیوں نہیں ہوتیں؟ یقیناً تیرا نشانہ غلط ہے یا پھر تیرے ہاتھ شل ہو گئے ہیں۔"

ہشام اسدی سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

"یا ہم سے غلطی سرزد ہوئی ہے کہ ہم نے نامناسب جگہ پر مورچہ بندی کی۔ اس طرح منجنیقوں اور قلعے کی دیواروں کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔" علاءالدین نے ہشام کو خاموش پاکر کہا۔

"سلطان معظم کے اندازے کبھی غلط نہیں ہوتے۔" ہشام نے گردن اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہمارے

آلاتِ جنگ اور ہدف کے درمیان کا فاصلہ بہت زیادہ مناسب ہے ہم اس سے آگے پڑاؤ ڈال بھی نہیں سکتے تھے۔ "

"پھر یہ ناکامی کس لئے ؟" علاء الدین نے جھنجلا کر کہا۔

"غلام نے روانگی سے پہلے عرض کر دیا تھا کہ چتوڑ کے محاذ پر قلعہ شکنی کیلئے ہمیں "آتش فشاں" کی ضرورت ہوگی۔ " ہشام اسدی نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ "آتش فشاں" علاء الدین خلجی کے اسلحہ خانے میں سب سے بڑی اور طاقتور منجنیق تھی۔ ہم اس کا مقابلہ اس منجنیق سے کر سکتے ہیں جسے حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کے ہمراہ سندھ پر حملے کیلئے بحری راستے سے روانہ کیا تھا۔ اس منجنیق کا نام "عروسک" تھا جسے پانچ سو آدمی کھینچتے تھے۔ "عروسک" ہی کے ذریعے محمد بن قاسم نے دیبل (سندھ) کے مضبوط ترین قلعے میں شگاف ڈال کر دشمن پر تاریخ ساز برتری حاصل کی تھی۔ علاء الدین خلجی کے پاس بھی ایک ایسی ہی منجنیق تھی جسے اس نے "آتش فشاں" کے نام سے موسوم کیا تھا۔ "آتش فشاں" کو بھی کم و بیش پانچ سو طاقتور سپاہی کھینچتے تھے۔ جب سلطانی لشکر دہلی سے روانہ ہو رہا تھا اس وقت ہشام اسدی نے تجویز پیش کی تھی کہ اس حملے میں "آتش فشاں" کی غیر معمولی قوت سے کام لیا جائے مگر علاء الدین نے یہ کہہ کر ہشام کی تجویز مسترد کر دی تھی۔

"ہم ایک ایسے علاقے میں جا رہے ہیں جہاں کی ہر شے ہمارے لئے اجنبی ہے۔ چتوڑ کی زمین بھی پراسراریت کے پردوں میں لپٹی ہوئی ہے اور محاذ جنگ بھی اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے۔ اگر موسم ناساز گار ثابت ہوا اور قسمت نے یاوری نہیں کی تو یہ طویل سفر بہت اذیت ناک ثابت ہوگا۔ ایسے میں ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے موثر ترین ہتھیار کو کوئی نقصان پہنچے اور ہم اپنا بہترین جنگی سرمایہ برباد کر کے ناکام و نامراد واپس چلے آئیں۔ "

ہشام اسدی اپنے شاہ کی رائے سے اختلاف نہیں کر سکتا تھا کہ علاء الدین مرد میدان تھا اور اس کی ذہانت نے بے شمار معرکے سر کئے تھے۔ پھر بھی ہشام کے دل میں ایک خلش سی تھی اور وہ سوچا کرتا تھا کہ کاش سلطان اس ہولناک جنگی مہم میں "آتش فشاں" کو اپنے ہمراہ لے چلیں۔ علاء الدین کے ذہن میں صرف قلعہ چتوڑ کی اونچائی بنیادی اہمیت رکھتی تھی اور اس کے توڑ کیلئے اس نے قلعے کے مقابل مصنوعی پہاڑی قائم کرنے کا منصوبہ پہلے ہی تیار کر لیا تھا اور یہ وہ منصوبہ تھا جس کے ذریعے سلطان اپنے کئی دشمنوں کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کر چکا تھا۔ اپنی اسی حکمتِ عملی کو وہ چتوڑ میں بھی بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ علاء الدین کے خیال میں پہاڑی مورچے کی تعمیر کے بعد "آتش فشاں" جیسی طاقتور منجنیق کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ ماضی کے تجربات کی روشنی میں چتوڑ کی فصیلوں کو مسمار کرنے کیلئے ہلکی منجنیقیں ہی کافی تھیں۔ اس کے علاوہ سلطان کے پیش نظر یہ دشواری بھی تھی کہ آتش فشاں جیسی منجنیق کو ایک بلند پہاڑی پر کھینچ کر لے جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس سخت مرحلے میں آتش فشاں کی ساخت کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ ان ہی نزاکتوں اور مصلحتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے کئی ہلکی منجنیقوں کا انتخاب کیا تھا اور پھر ہشام اسدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے لوہے کی اس طویل و عریض گاڑی پر نہیں 'تیرے نشانے پر اعتماد ہے ہشام! منجنیق ہلکی ہو یا بھاری' میں تیری ذہانت 'تیری بینائی اور تیرے بازوؤں کی طاقت پر یقین رکھتا ہوں۔ "

فرمانروائے ہند کی زبان سے اپنی تعریف سن کر ہشام اسدی بہت خوش ہوا تھا مگر پھر بھی اس نے احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا تھا اور چلتے چلتے آتش فشاں کا نعم البدل تلاش کر لیا تھا۔

"ہاں! ہشام! ہمیں یاد آیا تو نے آتش فشاں کے بارے میں کہا تھا۔ " علاء الدین کے چہرے پر مایوسی کی ایک تیز لہر ابھر کر ڈوب گئی۔ پھر اس نے ملک نصرت خان کی طرف دیکھا۔ "ملک! دہلی سے چتوڑ کا فاصلہ کم سے کم کتنے وقت میں طے کیا جا سکتا ہے ؟"

ملک نصرت خان نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "ایک تنہا سوار تو فاصلوں کو امکانی حد تک کم کر سکتا ہے مگر "آتش فشاں" کا سفر بہت سست رفتار ہوگا۔ ایک ماہ سے کم مدت میں شاید ہم اپنے اس خوفناک ہتھیار کو چتوڑ کے محاذ تک نہ پہنچا سکیں۔ "

"پھر ایک طویل عرصے تک ہمیں اپنی یلغار کو روکنا ہوگا۔ " علاء الدین پریشان تھا۔

"نہیں! سلطان ذی وقار! آپ کی محنتیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ " ملک نصرت خان کے بجائے ہشام اسدی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ دو دن تک سنگ باری کو ملتوی کرنا ہوگا۔ "

ہشام اسدی نے بڑی عجیب بات کہی تھی۔ سلطان کے ساتھ تمام سپہ سالار بھی چونک اٹھے۔ "دو دن تک ؟ تیری بات ناقابلِ فہم ہے ہشام۔ " علاء الدین نے کہا۔

"غلام "آتش فشاں" کے بغیر وہ کارکردگی تو نہیں دہرا سکتا مگر تین دن کے اندر چتوڑ کی فصیلیں محفوظ نہیں رہیں گی۔ "

"یہ کوئی دعویٰ ہے ہشام ؟" سلطان نے پر جلال آواز میں کہا۔

"دعویٰ نہیں 'غلام کا اندازِ خدمت گزاری۔ " ہشام اسدی آگے بڑھ کر زمین بوس ہو گیا۔

"اٹھو ہشام!" علاء الدین نے اپنے پیروں کو جنبش دی۔ "اگر تین دن کے اندر قلعے کی فصیلیں ہمارے آگے سجدہ ریز نہیں ہوئیں تو پھر اپنی سزا تو خود ہی تجویز کر لے۔ "

"غلام کے جسم و جاں شاہ کی امانت ہیں۔ " ہشام اسدی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "اگر تین دن میں یہ آہنی دیواریں مسمار نہ ہوں تو اس نمک خوار کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ " جوشِ جذبات میں ہشام کے چہرے اور ہاتھوں کا رواں کھڑا ہو گیا تھا۔

"اگر تو نے ہمیں آتش فشاں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تو ہم تجھے زر و جواہر میں تول دیں گے ہشام۔ "

ہشام اسدی نے ایک بار پھر سر جھکا دیا۔ "غلام نے احتیاط کے پیش نظر آہن گر سے کچھ پرزے ڈھلوائے تھے جو اپنی طاقت میں آتش فشاں کے برابر ہیں۔ میں ان آلات کو چھوٹی منجنیق میں نصب کر کے اپنے شاہ کے نام پر نیا تجربہ کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ خدائے ذوالجلال سلطان کی بلند اقبالی کے صدقے میں میری اس تدبیر کو ناکامی سے دوچار نہیں کرے گا۔ "

☆..................☆..................☆

ہشام اسدی ایک منجنیق میں نئے آلات نصب کر رہا تھا۔ یہ منجنیق اپنی ظاہری ساخت میں "آتش فشاں" سے نصف تھی مگر ہشام اسدی ایک نیا تجربہ کر کے اسے آتش فشاں کے ہم پلہ بنانا چاہتا تھا۔ اس دوران سنگ باری روک دی گئی۔ شاہی فوجوں کی مصلحت آمیز خاموشی نے راجہ رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں کے حوصلے بلند کر دیئے۔ سپہ سالار ہری سنگھ کے قائم کردہ اندازوں کی بہت زیادہ تعریف کی گئی۔

"یقیناً سمراٹ! ایشور نے میری ماتر بھومی کو بچا لیا اور راجپوتوں کی آن کو آبو کی چوٹیوں کی طرح بلند رکھا۔ درگا کی لازوال شکتی نے علاء الدین کی ساری طاقت اسی کے منہ پر الٹ دی۔ دشمن نے بڑی عجیب

چال چلی تھی مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ چتوڑ کی رکشا ہزاروں دیوتا کر رہے ہیں۔"

"کیا وہ آگے بڑھ کر نیا مورچہ قائم کر سکتا ہے؟" راجہ رتن سنگھ کے ذہن میں اچانک نیا خیال ابھر آیا تھا۔

"اگر علاءالدین نے نیا مورچہ قائم کیا تو اس کی تکمیل میں کئی ماہ لگ جائیں گے۔" ہری سنگھ نے بے نیازانہ کہا۔ "دشمن کو بے گھری کے آزار اٹھاتے اٹھاتے زمانہ گزر گیا ہے۔ اگر محاصرے نے مزید طول کھینچا تو علاءالدین کے سپاہیوں میں بددلی پھیل جائے گی اور پھر یہی بیزاری ہماری فتح کا سبب بنے گی۔"

ہری سنگھ کی یقین دہانی کے بعد راجپوت مطمئن ہوگئے اور مندروں میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے دُرگا کے قدموں پر سر رکھ کر اپنی دیوی کا شکریہ ادا کیا۔ خود ہری سنگھ بھی اس پوجا میں شریک تھا۔ ابھی مسرتوں کا یہ جشن جاری تھا کہ یکایک جادوگر رام دیو مندر میں داخل ہوا۔

"سنو! اے ساکنانِ چتوڑ سنو! تم نے مجھے اس طرح مٹا دیا کہ جیسے میں کوئی حرفِ غلط تھا۔" رام دیو کے اندازِ تخاطب نے درگا کی پوجا کرنے والے تمام لوگوں کو ساکت کر دیا۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے گھبرا کر سیاہ فام جادوگر کی طرف دیکھا۔ غصے کی آگ نے رام دیو کے چہرے کی سیاہی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ "سمراٹ! تم نے بھی اپنے مہاراج کو نظرانداز کر دیا۔" رام دیو' رتن سنگھ سے مخاطب ہوگیا۔

"جب سپاہی سے تلوار اور گیانی سے اس کا گیان چھن جاتا ہے تو پھر دونوں کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔" راجہ رتن سنگھ کا لہجہ تلخ بھی تھا اور تحقیر آمیز بھی۔

رام دیو کی سرخ آنکھیں ابل پڑیں مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب وہ پدمنی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اور مہارانی تم بھی موسم کی طرح بدل گئیں نہ تمہارے چہرے پر عقیدت کا کوئی عکس ابھرا اور نہ تمہارے ہاتھ مہاراج کے قدموں کی طرف بڑھے۔ یہ کیسا انقلاب آ گیا؟ اور کیا تمہارے جذبوں نے کوئی نیا دیوتا تراش لیا؟"

پدمنی چند لمحوں کیلئے پریشان سی نظر آئی مگر پھر اس کے تیور بھی بدل گئے۔ "دیوتا اس وقت تک دیوتا ہے جب تک اس کی شکتیاں برقرار ہیں اور جس دن یہ شکتیاں زائل ہوئیں' وہ دیوتا نہیں' ایک بے جان پتھر بن جاتا ہے۔" یہ کہتے کہتے رانی پدمنی کھڑی ہوگئی۔ جوشِ جذبات سے اس کا چہرہ گلنار نظر آ رہا تھا۔ "مہاراج! مجھ سے کیا شکایت کرتے ہیں۔ میری عقیدتوں نے تو آپ کو چتوڑ کی دھرتی سے اٹھا کر آکاش تک پہنچا دیا تھا مگر آپ ہی اس قابل نہ تھے کہ ان بلندیوں اور عظمتوں کو برداشت کر سکتے۔"

"میں اس قابل نہ تھا؟" رام دیو ایک عورت کی طعنہ زنی برداشت نہ کر سکا۔ "مہارانی! وہ میں ہوں جس نے چتوڑ کو چتوڑ بنایا۔"

"مہاراج اب ان باتوں کا وقت گزر چکا۔" رانی پدمنی نے رام دیو کو جھڑکتے ہوئے کہا۔ "جب چتوڑ پر قیامت ٹوٹ رہی تھی اس وقت آپ مدرا (شراب) سے دل بہلا رہے تھے۔" رانی پدمنی آپے سے باہر ہوگئی تھی۔ وہ ایک سرکش اور جذباتی عورت تھی جب تک رام دیو کی ساحرانہ قوتوں کے زیرِ اثر رہی' اسے دیوتا سمجھ کر پوجا کرتی رہی مگر جیسے ہی رام دیو کی شعبدہ بازیاں بے نتیجہ ثابت ہوئیں' اس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر منہ موڑ لیا۔

رام دیو نے آج تک اتنی اونچی آواز اور اس قدر برہم لہجہ نہیں سنا تھا۔ وہ جوشِ غضب میں کانپنے لگا۔

"آج میں اس دھرتی کا اتنا بڑا بوجھ بن گیا ہوں؟ سنو! اے چتوڑ کے باسیو! سنو! تمہاری یہ خوشیاں بہت عارضی ہیں' مسرتوں کا یہ جشن بہت ناپائیدار ہے۔ تم شنکھ (ناقوس) کی لے پر خواب آور بھجن

گا رہے ہو مگر میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ عنقریب تمہاری آوازیں گھٹ جائیں گی اور خوشی کے یہ راگ موت کی راگنیوں میں بدل جائیں گے پھر تمہیں احساس ہوگا کہ رام دیو کون تھا اور چتوڑ کو اس کی کتنی ضرورت تھی۔" یہ کہہ کر رام دیو نے زمین پر گھسٹتی ہوئی چادر کو اپنے کاندھے پر ڈالا اور شدید غصے کے عالم میں آشرم کی طرف واپس جانے لگا۔

تمام لوگ خاموش تھے مگر ایک آواز اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ ابھر رہی تھی اور یہ آواز سیناپتی ہری سنگھ کی تھی جو رام دیو کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔ "مہاراج! اس قوم کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ کو اپنے منتر مبارک اور چتوڑ کے بسنے والوں کو ان کی یہ کڑی آزمائش مبارک۔ وہ اپنے سکھ دکھ خود بانٹ لے گی اور اسے کسی دیوتا نما انسان کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔"

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کے چہروں پر بے اندازہ خوشیاں رقص کر رہی تھیں اور دُرگا کے پجاری اس خیال سے دیوانہ وار ناچ رہے تھے کہ سلطان علاءالدین خلجی کو اس کے منصوبوں میں ناکامی ہو چکی ہے۔

☆..............................☆..............................☆

سنگ باری دوسرے دن بھی بند رہی ہشام اسدی ایک چھوٹی منجنیق میں بڑے آلات نصب کر رہا تھا اور اسے اپنے ارادوں میں کامیابی حاصل نہیں ہو رہی تھی۔ علاءالدین خلجی نے اسے اپنے خیمے میں طلب کیا تو ہشام کا پورا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور فکر و پریشانی کے احساس نے اس کے چوڑے ماتھے پر کئی سلوٹیں ڈال دی تھیں۔ سلطان نے اپنے ماہر نشانہ بازوں کے سربراہ کو ایک نظر دیکھا اور بہت آہستہ لہجے میں کہا۔

"ہشام! دو دن گزر چکے ہیں اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" سلطان خلافِ معمول نرم آواز میں بول رہا تھا۔ اسے بھی ہشام اسدی کے ذہنی اضطراب کا اندازہ تھا۔

ہشام نے سر جھکا دیا۔ "غلام اپنے شاہ کو ایک ایک لمحے کا حساب پیش کرے گا۔"

"اور تمہیں ایسا ہی کرنا چاہئے کہ ہم بھی ایک ایک ساعت کا حساب رکھتے ہیں۔" اس بار علاءالدین نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

"سلطان والا حشم! چتوڑ اور اس کی تباہی کے درمیان بس ایک رات کا پردہ حائل ہے۔" ہشام اسدی سیدھا ہوا اس کے بہتے ہوئے پسینے نے شاہی خیمے کے فرش کو بھگو دیا تھا۔

"کل صبح کا سورج کیا طلوع ہوگا' سلطان کا جلال نمودار ہوگا اور پھر اس کی حرارت سے یہ پردہ بھی جل جائے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" سلطان نے اپنا دایاں ہاتھ دراز کر دیا۔

ہشام اسدی پیچھے ہٹا اور الٹے قدموں چلتا ہوا خیمے سے نکل گیا۔

وہ رات ہشام اسدی نے منجنیق اور نئے آلات سے لڑتے ہوئے گزار دی۔ شب کے پچھلے پہر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ ہشام نے اطمینان کی سانس لی اور قلعے کے صدر دروازے کی طرف دیکھا' قلعے کے عین اوپر ایک سرخ قندیل سی روشن تھی۔ یہ ستارہ مریخ تھا جو صبح کے وقت طلوع ہوا تھا۔ اس کی سرخ روشنی ایک عجیب سا منظر پیش کر رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مریخ کے سینے سے شعاعیں نہیں' آگ خارج ہو رہی ہو۔

☆..............................☆..............................☆

کچھ دیر بعد ہشام اسدی نے نماز فجر ادا کی اور سجدے میں سر رکھ دیا۔ "اے لازوال قوتوں والے! اپنے

حقیر ترین بندے ہشام کی آبرو رکھ کہ وہ تیرے کرم کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتا۔ " پھر سورج طلوع ہونے سے پہلے ہشام اسدی دبے پاؤں حضرت امیر خسروؒ کے خیمے میں داخل ہوا اس وقت امیر نماز فجر سے فارغ ہو چکے تھے اور دونوں ہاتھ بلند کئے ہوئے گریہ وزاری کر رہے تھے۔ خسروؒ کی آنکھیں بند تھیں اور صرف ہونٹ لرز رہے تھے۔ یہ تو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ خسروؒ کیا دعا مانگ رہے تھے لیکن ہشام کو یقین تھا کہ اس عالم میں خسروؒ لشکرِ اسلام کی سربلندی کے سوا کوئی دوسری دعا مانگ ہی نہیں سکتے تھے۔ ہشام اسدی اپنی سانسیں روکے' سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس کے ہاتھ اس طرح سینے پر بندھے ہوئے تھے جیسے وہ علاء الدین خلجی کی بارگاہِ ادب میں کھڑا ہو۔

امیر خسروؒ کی دعا ختم ہوئی اور جب آپ نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ہشام اسدی کو سامنے کھڑا پایا۔

"ہشام! تم یہاں ؟ " حضرت امیر خسروؒ نے سلطنت خلجی کے بے مثال جانباز کو پکارا۔

ہشام اسدی آگے بڑھا اور گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ پھر اس نے امیر کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "امیر! میں آپ کی خصوصی دعاؤں کا طالب ہوں۔ وہ دعائیں جنہیں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے آستانۂ پاک سے نسبت ہے۔ "

"ہشام تم میرے حلقۂ دعا سے دور نہیں ہو" امیر خسروؒ نے انتہائی شفقت آمیز لہجے میں فرمایا۔

"نہیں امیر! اس طرح نہیں کہ میں عام حلقۂ دعا میں شامل کر لیا جاؤں۔ " ہشام اچانک رونے لگا تھا۔

"یہ غلام ہمیشہ سے آپ کی دعاؤں کا طالب رہا مگر آج جس قدر محتاج ہے اس کا اندازہ صرف آپ ہی کر سکتے ہیں۔ امیر! اہل دنیا کو کیا خبر کہ ہشام اسدی کس آزمائش میں مبتلا کر دیا گیا ہے ؟ "

"میں جانتا ہوں ہشام! میں جانتا ہوں۔ " امیر خسروؒ نے بے قرار ہو کر فرمایا۔

"تو پھر میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیجئے اور کہہ دیجئے کہ یہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کا ہاتھ ہے۔ " ہشام اسدی کے آنسو کچھ اور بھی تیز ہو گئے تھے۔

"نہیں ہشام! یہ ممکن نہیں۔ " امیر خسروؒ بہت زیادہ مضطرب نظر آنے لگے۔ "ایک مجبور غلام کے ہاتھ کو کسی با اختیار شہنشاہ کے دستِ مبارک سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ "

"ان ہاتھوں نے اس شہنشاہ کے قدم تو چھوئے ہیں میں اسی نسبت اور شرف کی بات کر رہا ہوں۔ " ہشام اسدی جیسا مرد شجاع بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ "امیر! اسی حوالے سے میرے لئے دعا کیجئے میں دنیا کی نظروں سے چھپ کر آپ کی بارگاہ میں آیا ہوں۔ میرے جسم پر سلطان کی حکومت ہے مگر میرے دل اور روح کے تاجدار آپ ہیں۔ امیر! میری مجبوریوں کی طرف نہیں' میرے دل کی جانب نگاہ کیجئے۔ "

حضرت امیر خسروؒ کچھ دیر تک آنکھیں بند کئے سوچتے رہے۔ پھر آپ نے ہشام اسدی کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "خدا تجھے ہمیشہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی دعاؤں کے سائے میں رکھے۔ "

ہشام اسدی نے امیر خسروؒ کو آخری بوسہ دیا اور کھڑا ہو گیا۔ "اب میں مطمئن ہوں امیر! اپنی زندگی سے بھی مطمئن اور موت سے بھی راضی۔ "

یہ کہہ کر ہشام اسدی' امیر خسروؒ کے خیمے سے باہر نکلا اور تیز رفتاری کے ساتھ علاء الدین کے خیمے کی طرف بڑھنے لگا۔ محافظوں نے سلطان کو ہشام کی آمد سے خبردار کیا۔ علاء الدین نے فوراً ہی اسے خیمے میں طلب کر لیا۔ "غلام کی خواہش ہے کہ شاہ اپنے مبارک ہاتھوں سے قلعہ شکنی کی اس تقریب کا افتتاح کریں۔ " ہشام اسدی کا لہجہ بہت زیادہ پُر اعتماد تھا۔

"تجھے اپنے کمال و فن پر اتنا یقین ہے ہشام ؟ " سلطان نے خلاف توقع مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے فن پر نہیں' سلطان کی بلند اقبالی پر۔ " ہشام اسدی کی گردن خم ہو گئی۔

اس کے بعد سلطان نے ہشام سے کچھ نہیں پوچھا اپنے سپہ سالاروں کو طلب کیا اور پہاڑی کے اس حصے کی طرف جانے لگا جہاں نئے آلات کے ساتھ منجنیق نصب کی گئی تھی۔

☆..................☆..................☆

"یہی ہے تیری ذہانت کا کارنامہ ؟ " سلطان نے منجنیق پر ہاتھ رکھا اور مڑ کر ہشام اسدی کی جانب دیکھا جو سپہ سالاروں کے پیچھے خاموش کھڑا۔ "ہشام! آگے بڑھ اور ثابت کر کہ سلطان کی نظریں انسانوں کے انتخاب میں کبھی دھوکا نہیں کھاتیں۔ "

ہشام اسدی سر جھکائے ہوئے آگے بڑھا۔ پھر اس نے علاء الدین کے سامنے جھک کر رسم تعظیم ادا کی اور ایک نظر حضرت امیر خسروؒ کی طرف دیکھا۔ ہشام کی آنکھوں میں التجا تھی کہ امیر اس کی کامیابی کیلئے دعا کریں۔ خسروؒ نے اپنے چہرے کے تاثرات سے ظاہر کر دیا کہ اس کا شمار بھی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے غلاموں میں ہوتا ہے اور حضرت شیخ کا کوئی غلام بھی حلقۂ سعادت سے دور نہیں ہوتا چاہے وہ دنیا کے کسی بعید ترین گوشے میں آباد ہو۔

ہشام اسدی نے اپنے معاون نشانہ بازوں کو کچھ ہدایات دیں اور پھر منجنیق کی چرخی اتنی تیزی سے گردش کرنے لگی کہ اس کی آواز پر طوفانی ہوا کے شور کا گمان ہوتا تھا۔ علاء الدین خلجی اور تمام سپہ سالار حیرت سے اس عمل کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک ہشام اسدی اپنے دائیں جانب جھکا اور منجنیق کی کمانی کو پوری قوت سے کھینچا۔ دوسرے ہی لمحے سلطان نے دیکھا کہ چند بھاری پتھر دشمن کی فصیل کی جانب پرواز کر رہے تھے۔ یہ فتح کے تصور میں ڈوبی ہوئی بڑی خوشگوار ساعتیں تھیں مگر ان ساعتوں کا تاثر اس وقت زائل ہو گیا جب پتھر فصیل تک پہنچتے پہنچتے بے جان ہو گئے تھے۔ پتھروں نے قلعے کی دیوار کو چھو لیا لیکن اس طرح جیسے تلوار کا کوئی شدید وار دشمن کے لباس کو کاٹتا ہوا گزر جائے اور اس کا جسم محفوظ رہے اپنے وار کی ناکامی پر ہشام سناٹے میں آگیا۔

"یہ کیا ہوا ہشام ؟ " سلطان نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "اس سے زیادہ موثر تو پہلی سنگ باری تھی۔ "

ہشام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جھک کر پہاڑی کی اس سطح کا جائزہ لینے لگا جس پر منجنیق نصب کی گئی تھی۔ احساسِ ناکامی نے ایک بار پھر ہشام کے پورے جسم کو پسینے میں ڈبو دیا تھا۔ وہ بہت دیر تک نئے آلات کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر دیکھتا رہا پھر اس نے معاون نشانہ بازوں کو ہدایت دی کہ منجنیق کا ایک پایہ کم کر کے چرخی کی گردش کو تیز تر کر دیا جائے۔

سلطان کے جاں نثاروں کے بازو اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ حرکت کر رہے تھے مگر ہر شخص اپنی جگہ بے یقینی کا شکار تھا۔ ہشام اسدی اپنے سلطان اور سپہ سالاروں کے احساس سے بے خبر کبھی فصیل کی جانب دیکھتا اور کبھی منجنیق کی طرف۔ پھر جب چرخی کی گردش سے پیدا ہونے والی آوازوں نے فضا میں ایک عجیب سا شور برپا کر دیا تو ہشام تیزی سے جھکا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے کمانی کو کھینچ لیا۔ موت کا دہانہ کھلا اور فنا کے سفیر پتھروں کی شکل میں دشمن کے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ سلطان بڑی حیرت سے پتھروں کی پرواز دیکھ رہا تھا۔ اسے ہشام کی کامیابیوں کی زیادہ امید نہیں تھی مگر ایک خوفناک دھماکے نے علاء الدین کے خیالات کو منتشر کر دیا۔ پتھر اسی قوت کے ساتھ اپنے ہدف سے ٹکرائے تھے جسے ہشام اسدی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس تصادم سے پیدا ہونے والا دھماکہ اتنا پر شور تھا کہ اس کی آواز سلطان نے بھی سنی۔

منجنیق میں دوبارہ پتھر رکھے گئے اور نشانہ باندھا گیا۔ اب کی مرتبہ بھی ہشام اسدی نے اسی طاقت سے کمانی

کھینچی تھی اور چند لمحے گزرتے ہی اسی انداز کا دوسرا خوفناک دھماکہ سنائی دیا تھا۔

"آفرین! ہشام! آفرین!" سلطان کی آواز سنائی دی مگر ہشام نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

جن نشانہ بازوں نے دوبار چرخی کو گردش دی تھی، انہیں روک دیا گیا تھا اب تازہ دم سپاہی اپنے بازوؤں کی طاقت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ پھر تیسری بار پتھروں نے فصیل کو چھوا تو اس میں ایک خلاء نمایاں ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہشام کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور وہ دیوانہ وار جھک گیا۔ ہشام اسدی سجدۂ شکر ادا کر رہا تھا اور شدید اضطراب کے عالم میں ایک ہی جملہ بار بار دہرا رہا تھا۔

"تیری قدرتِ لازوال کی قسم! تو اپنے نام لیواؤں کو کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔"

سلطان کے لشکر میں ایک ہیجان خیز خوشی رقص کر رہی تھی۔ خود سلطان بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے خم ہو کر ہشام اسدی کو اٹھا لیا۔ ملک نصرت خان، خواجہ حاجی، ملک ظفر خان اور تاج الدین عراقی بھی ہشام کے گرد سمٹ آئے تھے۔ علاءالدین خلجی ہشام کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بہ آواز بلند کہہ رہا تھا۔

"ہشام! خدا ان ہاتھوں میں اور آگ بھر دے کہ یہ ہاتھ تو تیرے سلطان کے ہاتھ ہیں۔ تو نے فولاد کو پتھر سے توڑ دیا اور مجھے ان بت پرستوں کے سامنے رسوا ہونے سے بچا لیا۔ لوگ کہتے تھے کہ علاءالدین مجنوں ہے، وحشی ہے، اس کی عقل کو زنگ لگ گیا ہے اور اس کی آنکھیں پاگلوں کے سے خواب دیکھتی ہیں۔ مگر تو نے میرے خواب کی تعبیر پیش کر دی ہشام! زندہ اور روشن تعبیر جسے جھٹلانے والا کوئی نہیں۔ خدائے حی و قیوم کی قسم! کوئی نہیں کوئی نہیں۔"

ہشام اسدی زار و قطار رو رہا تھا۔

"مرحبا ہشام! مرحبا! خدا تیری عمر دراز کرے۔" سلطان کی پرجلال آواز گونج رہی تھی اور قلعہ چتوڑ کی جنوبی فصیل کا شگاف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

☆..........☆..........☆

دو دن کی مکمل خاموشی کے بعد جو حشر اٹھا تھا اس نے کچھ دیر کیلئے راجہ رتن سنگھ اور راجپوت سرداروں سے قوت گویائی چھین لی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور سیناپتی ہری سنگھ ان کے درمیان اپنے آپ کو ایک بڑا مجرم سمجھ رہا تھا۔ آخر رتن سنگھ نے اس تکلیف دہ سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ "ہری سنگھ! مسلمانوں کا یہ حملہ تمہارے تمام تر فوجی تجربات کی نفی کر رہا ہے۔" راجپوت سمراٹ کے لہجے میں ساری دنیا کی تلخیاں گھل گئی تھیں۔ "تمہاری ایک غلطی اہل چتوڑ کو اتنی مہلت بھی نہیں دے گی کہ اپنی آرزوؤں کا ماتم ہی کر سکیں۔"

ہری سنگھ پشیمان تھا مگر اس قدر سنگین الزام تراشی برداشت نہ کر سکا۔ "سمراٹ! میں نے ایک اندازہ قائم کیا تھا۔ راجپوت قوم کو لوریاں نہیں سنائی تھیں کہ وہ اپنے نرم بستروں پر سو جائے اور موت کے محاذ کو کھلا چھوڑ دے۔"

راجہ رتن سنگھ نے اس کے کسی عذر کو قبول نہیں کیا۔ "مہاراج رام دیو درست کہتے تھے کہ یہ طوفان دوبارہ کروٹ لے گا۔" راجپوت سمراٹ شدید غضب میں کھڑا ہو گیا۔ "ہری سنگھ! تو نے تو ہمیں اس قابل بھی نہیں چھوڑا کہ ہم اپنے کھیون ہار کو پکار سکیں۔" راجہ رتن سنگھ کا اشارہ رام دیو کی طرف تھا۔

"آپ اس نکمے جادوگر کو مدد کیلئے آواز دیں، میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے ہری سنگھ

اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب مجھے اس کی پروا نہیں کہ خود ساختہ عظمت کے گیت گانے والی قوم نے میرے جذبوں کا کیا صلہ دیا؟ ہری سنگھ کے کاندھوں پر ایک سر ہے، اس کا بوجھ کہیں بھی ہلکا ہو جائے گا۔"

راجہ رتن سنگھ نفرت آمیز نظروں سے اپنے سپہ سالار کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور ہری سنگھ نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ چتوڑ کا حکمراں اس کی گستاخ کلامی پر کس تاثر کا اظہار کر رہا ہے۔

"ہری سنگھ کو جانے دیں سمراٹ!" کئی راجپوت سرداروں نے رتن سنگھ کا غصہ دور کرنے کیلئے نرم لہجے میں کہا۔ "کسی ایک شخص کی غلطیاں شمار کرنے کا وقت نہیں۔ آپ چتوڑ کی سلامتی کیلئے جو مناسب سمجھتے ہیں اس پر بلا تاخیر عمل کر ڈالیں۔ بے شک! ہم نے مہاراج کے سلسلے میں سخت احسان فراموشی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے گیان نے ہمیں جس حادثے کی خبر دی تھی بالآخر وہ ظاہر ہو کر رہا۔" راجپوت سردار بھی اپنے حواس کھو چکے تھے اور اب انہیں تلواروں کے بجائے رام دیو کے منتروں میں اپنی بقاء نظر آ رہی تھی۔

راجہ رتن سنگھ کچھ دیر تک کسی زخمی درندے کی طرح کمرے میں ٹہلتا رہا اور پھر تمام راجپوت سرداروں کو لے کر رام دیو کے آشرم میں پہنچ گیا۔

"میں جانتا تھا کہ تمہاری مجبوریاں ایک دن تمہیں میرے دروازے تک کھینچ لائیں گی۔" رام دیو کے ہونٹوں پر تحقیر آمیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ "اب تم لوگوں کیلئے اس آشرم کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں۔"

رتن سنگھ اور تمام راجپوت سرداروں کے سر ندامت سے جھکے ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب بہ آواز بلند اپنی غلطیوں کا اعتراف کر رہے تھے۔

"اس طرح نہیں۔" رام دیو گرجدار آواز میں بولا۔ "اپنے سر زمین پر رکھ دو اور اس گناہ کی معافی طلب کرو جسے صرف رام دیو ہی معاف کر سکتا ہے۔"

زندگی کی محبت نے رتن سنگھ اور راجپوت سرداروں کو پیشانیاں رگڑنے پر مجبور کر دیا۔ پھر کہیں جا کر رام دیو اس بات پر آمادہ ہوا کہ وہ علاءالدین کے لشکر میں پھوٹ ڈال کر اسے سوکھے پتوں کی طرح منتشر کر دے گا۔

رام دیو نے ریاست چتوڑ پر آخری احسان کرنے کیلئے اپنے مکروہ ہونٹوں کو جنبش دی۔ "اگر آج شام تک مجھے سات مردوں کی راکھ فراہم کر دی جائے تو میں دشمن کی فوجوں کا رخ دہلی کی طرف موڑ دوں گا۔" رام دیو نے اپنے طلسم کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "کچھ پجاریوں کو شمشان گھاٹ بھیج کر جلے ہوئے انسانوں کی راکھ حاصل کی جائے میں اس راکھ پر رات بھر منتر پڑھوں گا اور صبح ہوتے ہی خود سلطان کے خیمے کی طرف جاؤں گا۔ میرے سوا کوئی دوسرا شخص یہ کام نہیں کر سکتا۔ اگر وہ راکھ مسلمانوں کے لشکر میں چھڑک دی گئی تو ان کے دل اچاٹ ہو جائیں گے۔ اس راکھ کی یہی تاثیر ہوتی ہے کہ جہاں بھی پہنچے گی سناٹے اور ویرانیاں لائے گی۔ بستیاں اجڑ جائیں گی اور شہر شمشانوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔" رام دیو نے بڑا عجیب انکشاف کیا تھا۔ جادوگروں کا یہ ایک آزمودہ اور مشہور عمل تھا جس کے ذریعے وہ لوگوں میں پھوٹ ڈال دیتے تھے اور ہنستے بستے گھر آن کی آن میں ویران ہو جاتے تھے۔

راجہ رتن سنگھ اور راجپوت سرداروں کے بجھتے ہوئے چہرے روشن ہو گئے۔ اس منتر کو خود ان لوگوں نے بھی کئی بار آزمایا تھا اور اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کیلئے جادو کی اس تخریبی قوت کا سہارا لیا تھا۔

☆..........☆..........☆

محاصرے کی وجہ سے شمشان گھاٹ کے تمام راستے بند تھے مگر راجہ رتن سنگھ کے حکم پر چند پجاری موت کے منہ میں جا رہے تھے۔ علاء الدین کے سپاہیوں نے پجاریوں کو روکا لیکن جب سلطان کو اطلاع دی گئی کہ کچھ ہندو اپنی مذہبی رسم ادا کرنے کیلئے شمشان گھاٹ کی طرف جانا چاہتے ہیں تو انہیں اجازت دے دی گئی۔ پجاری بہت خوش تھے کہ انہیں غیر متوقع طور پر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ پھر جب وہ شمشان پہنچے تو ان پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ ہر طرف انسانی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں اور تیز ہوائیں ان آدم زادوں کی راکھ کو اڑائے لئے جا رہی تھیں جو سرکش بھی تھے اور نافرمان بھی۔ پجاری پہلے بھی شمشان آئے تھے مگر دہشت سے ان کے دل نہیں دھڑکے تھے۔ آج انہیں ہر سمت اپنی موت ناچتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس لئے ان کی سانسیں بے ربط ہو گئی تھیں اور خوف کی شدت سے آنکھوں کی پتلیاں کانپ رہی تھیں۔ سات مردوں کی راکھ سمیٹتے سمیٹتے پجاریوں کا برا حال ہو گیا تھا اور جب وہ رام دیو کے سامنے پہنچے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے شمشان سے کچھ مردے نکل کر مہاراج رام دیو کے آشرم میں داخل ہو گئے ہوں۔

راجہ رتن سنگھ اور راجپوت سردار پجاریوں کی اس کامیابی پر بہت خوش تھے۔ رام دیو بھی دونوں ہاتھ لہرا لہرا کر چیخ رہا تھا۔ "علاء الدین کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے اور اس نے اپنی گردن میرے ہاتھوں میں دیدی۔ اب تم لوگ جاؤ۔ کل صبح تک سلطان کا لشکر بھی اس راکھ کی طرح بکھر جائے گا۔"

رتن سنگھ راجپوت سرداروں کے ساتھ راج محل میں لوٹ آیا۔ رام دیو نے منتر پڑھنے کیلئے آشرم کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ ہری سنگھ اپنے معتمد سپاہیوں کی صف بندی کر رہا تھا اور سلطان کے سپاہیوں کی سنگباری جنوبی فصیل میں نئے شگاف پیدا کر رہی تھی۔

☆..........☆..........☆

سورج کے غروب ہوتے ہی خوفناک دھماکوں کی آوازیں بند ہو گئی تھیں اور رام دیو نے ایک بہت بوسیدہ کتاب کھول لی تھی۔ چتوڑ کا سب سے بڑا شعبدہ باز آہستہ آہستہ کتاب کے اوراق پلٹتا رہا۔ پھر ایک خالی مقام پر اس نے کچھ تحریر کیا اور پجاریوں کی لائی ہوئی راکھ چھڑکنے لگا۔ عبارت دھندلی پڑ گئی۔ رام دیو نے ایک تیز پھونک سے اس راکھ کو اڑا دیا۔ حروف صاف نظر آنے لگے۔ رام دیو نے یہ عمل کئی بار کیا یہاں تک کہ اس کی لکھی ہوئی عبارت پر برسوں پرانی تحریر کا گمان ہونے لگا۔ رام دیو مسکرایا اور دیوداسی کے ہاتھ سے شراب کا لبریز جام پی کر سو گیا۔

اس طویل ترین محاصرے کے دوران اہل چتوڑ کیلئے وہ پہلی رات تھی جب انہوں نے اپنے دروازوں پر موت کی دستک سنی تھی۔ راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی اور چند راجپوت سرداروں کے سوا قلعے کے تمام مکین جاگ رہے تھے۔ اگرچہ سنگباری رک گئی تھی لیکن ہر شخص کو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ ساری دیواریں بیٹھ گئی ہیں اور سلطان کے سپاہی ہر بلندی کو پامال کر کے قلعے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب تو انہیں اپنی پرچھائیوں پر بھی دشمن کے سائے کا گمان ہوتا تھا۔

اسی رات طلسم کدے میں نرملا کماری، علی عامر آفریدی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی اور آفریدی اس کی زلفِ پریشان کو سنوارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "نرملا ہماری تاریک راتوں کا سفر ختم ہوا۔ یہ دھماکے روشنی کے نقیب ہیں جو صدیوں کے اندھیروں کا حصار توڑ کر اپنی آمد کا اعلان کر رہے ہیں۔"

نرملا کے چہرے پر خوشی بھی رقصاں تھی اور غم کے سائے بھی لرزاں تھے۔ آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی خوشی اور اپنے وطن کی تباہی کا غم، آفریدی نے نرملا کی اس جذباتی کشمکش کو محسوس کر لیا اور پھر اس صبح کے گیت گانے لگا جو اپنی تابندگی کے باعث قوم اور وطن کے رشتوں سے بالاتر تھی۔

صبح ہوئی تو رام دیو اس طرح آشرم سے باہر نکلا کہ اس کے ایک ہاتھ میں پجاریوں کی لائی ہوئی راکھ تھی اور دوسرے ہاتھ میں وہ بوسیدہ کتاب جس کے ایک ورق پر رام دیو نے کوئی عبارت تحریر کی تھی۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کیلئے رام دیو کے پاؤں چھوئے اور وہ سیاہ فام جادوگر قلعے سے اس طرح نکلا جیسے تن تنہا سلطان کے لشکر کو فتح کرنے جا رہا ہو۔ رام دیو نے چند گز کا فاصلہ طے کرتے ہی مردوں کی راکھ زمین پر چھڑکنا شروع کر دی تھی اور جب وہ سلطان کے سپاہیوں کے قریب پہنچا تو پوری راکھ ختم ہو چکی تھی اب اس کی بغل میں صرف بوسیدہ کتاب دبی ہوئی تھی۔

"میں علاء الدین خلجی کا آدمی ہوں۔" سپاہیوں کے روکنے پر رام دیو نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

سلطان کو اطلاع دی گئی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ علاء الدین چتوڑ کے کسی نمائندے سے ملنا نہیں چاہتا تھا مگر جب اسے بتایا گیا کہ آنے والا سلطان کا خدمت گزار ہے تو وہ حقیقت حال جاننے کیلئے مجبور ہو گیا۔ سپاہی، رام دیو کو اپنے نرغے میں لے کر آگے بڑھے اور جب چتوڑ کے عظیم گیانی کو سلطان کے روبرو پیش کیا گیا تو رام دیو لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ سجدے میں چلا گیا۔

"میں سلطان کے مذہب پر، سلطان کی فتوحات پر اور سلطان کے جاہ و جلال پر ایمان لایا۔" رام دیو سجدے کی حالت میں بہ آواز بلند اقرار کر رہا تھا۔ "میں بت پرستی سے تائب ہو کر سلطان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا ہوں۔"

علاء الدین ایک اجنبی شخص کی اس حرکت پر حیران ہو رہا تھا۔ "تو کون ہے؟" سلطان نے رام دیو کو غضب ناک لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ہم تجھے پہچانتے تک نہیں اور تو ہم سے قریبی رشتے کا دعویٰ کر رہا ہے۔" علاء الدین نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ وہ سیاہ فام اجنبی کو اٹھا کر سیدھا کر دیں۔

سلطان کے محافظوں نے رام دیو کو کھینچ کر کھڑا کیا تو اس کی بغل میں دبی ہوئی بوسیدہ کتاب زمین پر گر گئی۔

"یہ کیا ہے؟" سلطان نے اس سرخ کپڑے کے متعلق دریافت کیا جس میں کتاب لپٹی ہوئی تھی۔

"اس بات کا ثبوت کہ میں آپ کا پجاری ہوں۔" رام دیو نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"کچھ دیر پہلے تو بتوں کا پجاری تھا اور اب ہماری پرستش کا اعلان کر رہا ہے۔ تیرے عقائد اس قدر تیزی سے بدلتے ہیں؟" سلطان کا لہجہ قہر آلود تھا۔ "کل تو مندروں میں گھنٹیاں بجا رہا تھا اور آج جب تیرے لئے فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تو ہمارے سامنے جھک گیا۔ ہم تجھے حکم دیتے ہیں کہ واپس جا اور ان نافرمانوں کے ساتھ اپنا حشر دیکھ جن کی شکست و بربادی کی گھڑیاں گنی جا چکی ہیں۔"

رام دیو نے جھک کر کتاب اٹھائی اور وہ صفحہ الٹ کر سلطان کے سامنے کر دیا جس پر اس نے گزشتہ رات چند سطریں تحریر کی تھیں۔ "سلطان میں اپنے سینے میں حسرتوں کا غبار لئے واپس چلا جاؤں گا مگر اس عبارت کو ایک نظر ضرور دیکھ لیں جو میرے جذبات کی ترجمان ہے اور جسے زمانے کی آنکھ سے چھپائے چھپائے پچیس سال ہو گئے ہیں۔"

علاء الدین نے خسروؒ کی طرف دیکھا۔ "امیر! اسے پڑھیں کہ اس بدحواس انسان نے کیا لکھا ہے؟"

امیر خسروؒ نے اس عبارت پر نگاہ کی جو سنسکرت زبان میں تحریر کی گئی تھی۔ رام دیو نے اپنے شاگردوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"ان لوگوں کے نام جو سلامتی چاہتے ہیں، میں رام دیو! اپنے ماننے والوں کو خبردار کرتا ہوں چتوڑ

کے پہاڑ ایک ایسے شخص کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں گے جو دہلی سے مارواڑ کی جانب خروج کرے گا۔ وہ ایک خدا کا ماننے والا ہو گا اور جس کی شمشیرِ بے نیام پتھروں کے جگر تک کاٹ کر رکھ دے گی۔ میرے گیان نے مجھے بتایا ہے کہ وہ پیدائشی فاتح ہے۔ جدھر کا رخ کرے گا کامیابیاں اس کے قدم چومیں گی۔ جس نے بھی اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ میں نے ستاروں سے کئی بار پوچھا ہے اور ہر مرتبہ ایک ہی جواب آتا ہے کہ اس کے ماتھے سے روشنی پھوٹ رہی ہو گی اور اس روشنی کے سامنے اقتدار کے تمام چراغ بجھ جائیں گے۔ اے میری قوم ! اگر وہ شخص چتوڑ کی حدود میں داخل ہو جائے تو بے دریغ اپنے گھروں سے نکل کر اس کی راہ میں جذبوں کے پھول بچھا دینا۔ اس سے طاقت کی زبان میں بات نہ کرنا کہ دنیا کی ساری طاقتیں اس کی غلام بنا دی گئی ہیں۔ وہ سنسار کا وجیتا (فاتح عالم) ہے۔ اگر میں زندہ رہا تو خود اپنے آشرم سے نکل کر اس کا استقبال کروں گا اور اگر مجھے موت آ گئی تو تم لوگوں پر فرض ہے کہ اسے میرا اسلام پہنچا دینا اور کہہ دینا کہ رام دیو نے تیرا بہت انتظار کیا وہ رام دیو جو ہندوستان کا سب سے بڑا گیانی تھا اور جس کے مقدر میں آنے والے کا دیدار نہیں لکھا تھا۔"

تحریر ختم ہو گئی تھی۔ خیمے میں ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا اور سلطان کے چہرے پر عجیب سے رنگ ڈوب کر ابھر رہے تھے۔ عام سپہ سالاروں نے دیکھا کہ علاءالدین اپنی نشست پر بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ "فاتح عالم" کا لفظ سن کر سلطان اس طرح چونک اٹھا تھا جیسے کسی کے خنجر نے اس کی رگِ جاں کو چھو لیا ہو۔ "تو سچ کہتا ہے پجاری!" سلطان نے بڑے جذباتی لہجے میں رام دیو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بے شک! تو بڑا گیانی ہے۔ اگر تیرا علم سچا نہیں ہوتا تو پھر تجھے کون بتاتا کہ وہ فاتح عالم ہم ہی ہیں جس کا تو برسوں سے انتظار کر رہا ہے۔"

رام دیو کی عیاریوں نے سلطان کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور یہ سب کچھ انجانے میں ہو گیا تھا۔ رام دیو کی پیش گوئی ستاروں کے کسی حساب کے مطابق نہیں تھی بس اس نے ایک مطلق العنان شہنشاہ کی تعریف میں نئے انداز کا قصیدہ لکھ دیا تھا۔ رام دیو کو انسانی فطرت کا اندازہ تھا کہ کوئی بھی حکمراں پہلے اپنی پڑوسی ریاستوں پر غلبہ حاصل کرنے کے خواب دیکھتا ہے، پھر یہ خواب پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور آخر میں بڑھتے بڑھتے ساری دنیا کے گرد رقص کرنے لگتے ہیں۔ انسان کی اسی بے لگام خواہش کے پیش نظر رام دیو نے علاءالدین کو بھی "فاتح عالم" کہہ کر پکارا تھا۔ اب یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ اس نے نادانستگی میں سلطان کے خوابوں کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ تیر نشانے پر بیٹھا تو رام دیو کی مکاری نے ایک اور کروٹ لی۔ "اے سنسار کے وجیتا! میری پیاسی آنکھیں تیرے درشن سے سیراب ہو گئیں۔ اب میں اس نرک میں جلنے کیلئے واپس جا رہا ہوں۔ جہاں ہر طرف جاہل بستے ہیں اور جن وحشیوں کے درمیان پاؤ صدی سے میرا علم رسوا ہو رہا ہے۔" یہ کہہ کر رام دیو جانے کیلئے مڑا۔

"نہیں پجاری! اب تو اس جہنم میں نہیں جلے گا۔" علاءالدین نے پُر جلال لہجے میں رام دیو کو آواز دی...... "وہ دوزخ چتوڑ کے نافرمانوں کیلئے ہے۔ ہم تیرے علم کی قدر کرتے ہیں کہ تو نے پچیس سال پہلے اس تحریر کو پڑھ لیا جو آئندہ قرطاسِ عالم پر لکھی جانے والی ہے۔"

رام دیو تیزی سے پلٹا اور علاءالدین کے سامنے زمین پر سر رکھ دیا۔

سلطان نے امیر خسروؒ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا...... "خسرو! اسے حلقۂ اسلام میں داخل کر لو کہ یہ بڑا دیدہ ور ہے، عنقریب ہم اسے اپنے مشیرِ خاص کا درجہ عطا کریں گے۔"

رام دیو اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گیا اور بہ آواز بلند کلمہ پڑھنے لگا۔ علاءالدین کے تمام سپہ سالار

حیران تھے کہ رام دیو نے بڑی عجیب عبارت لکھی تھی جس کا ایک ایک حرف درست ثابت ہو رہا تھا۔ اب ان شمشیر زنوں کو کیا معلوم کہ اس سیاہ فام شعبدہ باز نے معمولی سے رد و بدل کے ساتھ اس عبارت کو اپنی بوسیدہ کتاب میں منتقل کر دیا تھا جو سات ماہ قبل سنیاسی آنند پال نے کمبھ شیام کے مندر کی دیوار پر تحریر کی تھی۔

☆..................☆..................☆

ہشام اسدی مسلسل سنگ باری کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ تین دن کے مختصر عرصے میں اس نے جنوبی فصیل کا بالائی حصہ مسمار کر دیا پھر وہ اپنی منجنیق لے کر پہاڑی کی نچلی سطح پر آ گیا۔ اب اس کے پتھروں کا ہدف فصیل کا درمیانی حصہ تھا الغرض آٹھ دن میں ہشام اسدی نے راجپوتوں کی محفوظ ترین پناہ گاہ میں بڑے بڑے شگاف ڈال دیئے تھے۔ اب ان دراڑوں سے علاءالدین کے سپاہی آسانی کے ساتھ قلعے کے اندر داخل ہو سکتے تھے۔ اپنے دعوے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے بعد ہشام نے سلطان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"نہیں ہشام! ابھی اپنے بازوؤں کو حرکت میں رہنے دے۔" سلطان نے نیا حکم جاری کرتے ہوئے کہا...... "ابھی ہم دشمن پر حملہ نہیں کریں گے۔ قلعے کی شمالی فصیل بھی مسمار کر دے کہ اس طرح دونوں محاذ کھل جائیں گے ہم اپنے نافرمانوں کو ہر طرف سے بے اماں دیکھنا چاہتے ہیں۔"

اب شمالی فصیل پر سنگ باری ہو رہی تھی اور راجہ رتن سنگھ رام دیو کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ "اب وہ نہیں آئے گا سمراٹ! وہ نہیں آئے گا۔" رانی پدمنی کسی وحشت زدہ عورت کی طرح اپنے آراستہ کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ "وہ فریب کار جادوگر علاءالدین کی پناہ میں جا چکا ہے اسے تو یہاں سے نکلنے کا بہانہ چاہیئے تھا۔ سو ہم نے فراہم کر دیا۔" رانی پدمنی کے لہجے میں احساسِ ندامت کی جھلک بھی تھی اور زہر جیسی تلخی بھی۔

"کیا خبر تھی مہارانی کہ دھرم کے ادھیکاری بھی چھل اور کپٹ سے بھرے ہوئے ہیں۔" رتن سنگھ کے چہرے پر مایوسیوں کا دھواں پھیلا ہوا تھا...... "ہمیں ہماری تقدیر نے حسرتوں کے صحرا میں تنہا چھوڑ دیا ہے جہاں نہ ابر کا کوئی ٹکڑا ہے اور نہ پانی کی کوئی بوند بس حادثات کی تیز دھوپ ہے جو ہمیں جلانے کیلئے لپک رہی ہے۔"

"اب جلنے کو کیا باقی رہ گیا ہے سمراٹ ؟" رانی پدمنی نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس ایک شریر (جسم) کے سبب سارا ہنگامہ ہے۔" پدمنی آگے بڑھ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ "اس بھیڑیئے علاءالدین کو نہیں معلوم کہ تمام ہرنیاں درندوں کی خوراک نہیں بنتیں۔ میں وہ غزالِ دشت ہوں کہ ساری دنیا کے شیر بھی میرا تعاقب نہیں کر سکتے۔ میرے قدم ہوا کے قدم ہیں اور میری رفتار بجلی کی رفتار ہے مجھے میری مرضی کے بغیر کوئی چھو بھی نہیں سکتا۔ ٹھاکروں کے غیرت مند خون کی قسم! سب کچھ جل کر راکھ ہو جائے گا۔"

☆..................☆..................☆

اس کے بعد رانی پدمنی نے تمام فوجیوں اور قلعہ نشین راجپوتوں کے نام ایک حکم جاری کیا کہ وہ سب کے سب قلعے کے میدان میں جمع ہو جائیں پھر جب تمام لوگ ایک مرکز پر سمٹ آئے تو رانی پدمنی بڑی آن بان کے ساتھ اپنی رعایا کے سامنے نمودار ہوئی اس وقت وہ گہرے سرخ رنگ کا لباس پہنے ہوئی تھی پہلی نظر میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے پدمنی اپنے خون میں نہائی ہوئی اہل چتوڑ کے سامنے کھڑی ہے۔ "عظیم قوم کے

عظیم وارثو! تمہیں اس عورت کا سلام پہنچے جو رشتے میں تمہاری ماں کا درجہ رکھتی ہے۔ "

راجپوتوں کے دہکتے ہوئے سینوں میں جذبات کا آتش فشاں کروٹیں لینے لگا۔

"بے شک! تو ہماری ماں ہے۔ " بیک وقت بے شمار آوازیں گونجنے لگیں.......... "راج ماتا! اپنے بیٹوں کو حکم دے کہ وہ تیری خدمت کا حق ادا کر سکیں۔ "

رانی پدمنی نے اس ہجوم کو دیکھا جو شدید اضطراب کے عالم میں اپنی راج ماتا کی ایک جنبشِ لب کا منتظر تھا۔

"تم جانتے ہو کہ دشمن نے پہلے تمہاری جنم بھومی کا محاصرہ کیا' پھر تمہارے پرکھوں کی ان سربلند دیواروں کو ڈھا دیا اور اب وہ چاہتا ہے کہ اس کے ناپاک ہاتھ تمہاری ماں کے سر سے آنچل اتار لیں اور وہ اسے برہنہ سر کھینچتا ہوا اپنے حرم میں لے جائے۔ "

یہ بڑی غلیظ گالی تھی۔ راجپوتوں کے دماغ جل اٹھے اور ان کی زبانوں سے آگ برسنے لگی۔ "وہ ہاتھ تراش دیئے جائیں گے یا پھر تیرے بیٹے اپنے خون سے راجپوتوں کی نئی تاریخ لکھ جائیں گے۔ "

"تو پھر میرے آنچل کی قسم کھاؤ کہ تم راجپوتوں کی تمام سابقہ روایات بدل ڈالو گے۔ " رانی پدمنی اس آگ کو نئے انداز سے ہوا دے رہی تھی۔ "تمہارے باپ دادا بھی غیرت مند اور شجاع تھے مگر تمہیں ثابت کرنا ہو گا کہ تم سے زیادہ بہادر آسمان کی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا.......... مارواڑ کی تاریخ ہمیشہ خون سے لکھی گئی ہے مگر جب میں تم سے رخصت ہو کر آکاش پہ چلی جاؤں تو دیوتا مجھ سے کہیں کہ تیرے بیٹوں کے خون کا رنگ ان کے بزرگوں سے زیادہ تیز تھا اور اس میں آگ سے زیادہ حرارت تھی۔ "

"ایسا ہی ہو گا راج ماتا! ایسا ہی ہو گا۔ " راجپوت دیوانہ وار چیخ رہے تھے۔

پھر رانی پدمنی نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کر دیا اور اس کی اوڑھنی کا سرخ آنچل ہوا میں لہرا رہا تھا اور ایک ایک راجپوت سپاہی اسے عقیدت و محبت سے چھو کر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ پدمنی کا ہاتھ شل ہو گیا تھا مگر وہ انتہائی کرب کے عالم میں کسی مضبوط ستون کی مانند کھڑی رہی۔ راجپوت سپاہیوں کے جذبات ابھارے جا چکے تھے اور انہوں نے خوفناک عزائم کے ساتھ اپنے اپنے مورچے سنبھال لئے تھے۔ سب سے آخر میں سپہ سالار ہری سنگھ آیا اور اس نے پدمنی کے آنچل کو بوسہ دیا۔

"ہری سنگھ! تم ؟ " پدمنی چونک اٹھی۔

"اختلاف رائے اپنی جگہ ہے اور راج ماتا کی عزت اپنی جگہ۔ " ہری سنگھ نے پدمنی کا آنچل اپنے سر پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "سرکش و نافرمان بیٹے بھی اپنی ماں کی درد بھری چیخ نہیں سن سکتے میری زندگی میں کوئی غلیظ ہاتھ اس آنچل کو نہیں چھو سکتا۔ "

"ہری سنگھ! راج ماتا کو تم پر ناز ہے۔ " پدمنی کی آواز لرز رہی تھی۔ "دیوتا تمہارے اس دعوے کی شرم رکھیں۔ "

☆..........☆..........☆

قلعے کی شمالی فصیل بھی مسمار کی جا چکی تھی۔ اپنی محفوظ ترین پناہ گاہ کا یہ حشر دیکھ کر راجپوت سپاہیوں نے قلعے کے دروازے کھول دیئے اور سلطانی لشکر کی یلغار کو روکنے کیلئے باہر نکل آئے۔ علاء الدین گھوڑے کی پشت پر سوار تھا اور ایک فاتحانہ تبسم کے ساتھ اس تاریخی قلعے کی طرف دیکھ رہا تھا جسے ناقابل تسخیر تصور کیا جاتا تھا۔

راجپوت معماروں نے قلعے کی حفاظت کیلئے سات دروازے تعمیر کئے تھے۔ قلعے کی مشرقی سمت میں

"سورج پول" کا بڑا دروازہ تھا اور دوسری جانب "لاکھوٹا باری" تھی جس کے ذریعے دشمن کے داخلے کو روکا جا سکتا تھا۔ قلعے میں داخل ہونے کیلئے سب سے پہلے "پاڈن پول" سے گزرنا پڑتا تھا اگر دشمن کا لشکر اس دروازے سے گزر جائے تو "بھیرو پول" اس کے راستے میں مزاحم ہوتا اس مشکل مرحلے کو طے کرنے کے بعد تین دروازے "گنیش پول" "لکشمن پول" اور "جوڈن پول" آتے تھے۔ ان تمام دروازوں کو مضبوط دیواروں سے اس طرح جوڑا گیا تھا کہ حملہ آور دروازوں کو توڑے بغیر قلعے پر قبضہ نہیں کر سکتا تھا۔ "جوڈن پول" ایک مشکل مورچہ تھا جس کے سامنے دشمن کی فوج کو آسانی سے روکا جا سکتا تھا۔ "جوڈن پول" کی اونچائی اور پیچ و خم مقامی سپاہیوں کیلئے ایک محفوظ پناہ گاہ کا درجہ رکھتے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک اور بڑا دروازہ "رام پول" تعمیر کیا گیا تھا۔ اس دروازے کو عبور کرنے کے بعد قلعے کی ہموار سطح شروع ہو جاتی تھی۔ "رام پول" میں داخل ہوتے ہی "تلجا ماتا" کا مندر نظر آتا تھا۔ مندر سے گزرنے کے بعد ایک محفوظ مقام "نولکھ بھنڈار" کے نام سے تعمیر کیا گیا تھا یہاں مورچہ قائم کر کے کچھ دن تک دشمن کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا اس جگہ سے گزرنے کے بعد "ترپولیاں" نام کا ایک اور دروازہ بنایا گیا تھا (یہاں ماتا کا مشہور مندر آج بھی موجود ہے) اسی مندر میں حکمران خاندان کے لوگ اپنی مذہبی رسموں کے مطابق پوجا پاٹ کرتے تھے اور یہیں ایک خفیہ سرنگ بھی موجود تھی جس کا راستہ چتوڑ کے دور دراز جنگلی علاقوں سے مل جاتا تھا۔

مسلمان سپاہی اپنے شہنشاہ کے اشارے کے منتظر تھے۔ سلطان نے آخری بار اپنے مضطرب فوجیوں کی طرف دیکھا پھر حضرت امیر خسروؒ پر نگاہ کی جو دائیں جانب موجود تھے۔ "خسروؒ! حضرت شیخ نے! اسی دن کیلئے ہمیں اپنی دعاؤں سے نوازا تھا ؟ " علاء الدین کا لہجہ بڑا جذباتی تھا۔

"یقیناً سلطان معظم! یہی وہ دن ہے' میرے شیخ کی دعاؤں کا نتیجہ اور میرے مرشد کے الفاظ کا صلہ۔ "

یہ کہتے کہتے امیر خسروؒ کی آنکھوں میں نمی سی جھلکنے لگی تھی اور ان کی نگاہوں میں وہ پورا منظر ابھر آیا تھا جب حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا تھا۔ "خسرو! تمہارا سلطان بحکم خدا یہ مشکل ترین معرکہ بھی سر کر لے گا۔ "

"اور خسرو! وہ دن آپہنچا۔ " علاء الدین کی پُرجلال آواز گونجی اور شمشیرِ آب دار فضا میں لہرانے لگی۔

"آگے بڑھو میرے جانبازو! اور رتن سنگھ کا سرِ پُرغرور اپنے سلطان کے قدموں میں جھکا دو۔ "

یہ چودہ اگست 1303ء کا تاریخ ساز دن تھا جب علاء الدین خلجی کے سپاہی سفیران اجل کے لباس میں راجہ رتن سنگھ کے لشکر پر ٹوٹ پڑے۔ راجپوتوں کی ایک شمشیر بکف جماعت نے سلطان کے جاں نثاروں کی یورش کو بڑی مردانگی کے ساتھ روکا۔ وہ نہایت بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ پہلے ہی حملے میں علاء الدین کے پچاسوں سپاہی موت کا لقمہ بن گئے۔ راجپوت اپنی اس عارضی کامیابی پر بہت خوش تھے مگر انہیں اندازہ نہیں تھا کہ دشمن سپاہیوں کے اس دستے کی قیادت علاء الدین کا مایہ ناز سپہ سالار خواجہ حاجی کر رہا تھا جو عقاب سے زیادہ تیز نظریں رکھتا تھا اور اپنی سرد مزاجی میں کسی پہاڑی آبشار کے پانی سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔ خواجہ حاجی نے چند لمحوں میں اندازہ کر لیا کہ راجپوت سپاہیوں کے دل جذبات کی بھٹی میں تپ رہے ہیں اور ان کے دماغوں سے عقل و ہوش کی صلاحیتیں رخصت ہو چکی ہیں۔

"ان پاگلوں کا راستہ چھوڑ دو اور انہیں اندر تک آنے دو۔ " خواجہ حاجی نے چیخ کر فارسی زبان میں کہا راجپوت سپاہی اس آواز کا مفہوم سمجھنے سے عاجز تھے۔

سلطان کے سپاہی اپنے سپہ سالار کے حکم پر لڑتے ہوئے پیچھے ہٹے اور انتہائی احتیاط کے ساتھ دائیں بائیں دو قطاروں میں تقسیم ہوگئے۔ راجپوت سپاہیوں نے سمجھا کہ دشمن پسپا ہورہا ہے اس لئے وہ دیوانہ وار آگے بڑھے اور پھر کچھ دیر بعد ہی محصور ہوگئے۔ تلواروں کے تصادم سے موت کے نغمے پھوٹے اور آتش فنا کی چنگاریاں رقص کرنے لگیں۔ راجپوت تعداد میں بھی کم تھے اور اپنے حواس بھی کھو چکے تھے۔ نتیجتاً موت کے دونوں جبڑوں میں پس کر رہ گئے۔ مرنے سے پہلے وہ "جے ماتا" کے نعرے بلند کررہے تھے۔ مگر ان کی زندگی کی سانسیں شمار کی جاچکی تھیں۔ کوئی نعرہ کام نہیں آیا اور چتوڑ کے محافظوں کا ایک دستہ دیکھتے ہی دیکھتے اس موت کی خوراک بن گیا جس کے خونی ہاتھوں نے بہت پہلے ان کی دیوی کو بھی شکار کیا تھا۔

☆..............☆..............☆

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے دل تھام کر یہ اندوہناک خبر سنی کہ راجپوت سرفروشوں کی ایک جماعت میدان جنگ میں اس طرح کام آگئی کہ وہ دشمن کو بہت معمولی سا جانی نقصان پہنچا سکی۔ یہ شکست کی پہلی علامت تھی جس نے تمام ہوشمند انسانوں کو چتوڑ کے مستقبل سے مایوس کردیا تھا مگر اب صلح یا فرار کی کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی اس لئے راجپوت سپاہی موت کو گلے لگانے پر مجبور تھے۔

دوسرے دن ایک اور جماعت قلعے سے باہر نکل کر سلطانی لشکر کے سامنے صف آراء ہوئی۔ سپاہیوں کے اس دستے کی قیادت راجہ رتن سنگھ کا چھوٹا بھائی راج کمار آرسی کررہا تھا اس جماعت نے بھی پہلا حملہ اتنی شدت سے کیا کہ مسلمان سپاہی چند لمحوں کیلئے حیرت زدہ رہ گئے۔ راج کمار آرسی آندھی کے کسی بگولے کی طرح اٹھا اور کچھ دور تک آگے بڑھتا چلا گیا۔ ملک نصرت خان جو ایک آزمودہ کار امیر لشکر تھا اور جس نے کچھ عرصہ پہلے گجرات کے حکمراں راجہ کرن کو شکست فاش دی تھی، راجپوتوں کے پرجوش حملے سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ راستہ چھوڑدیں اور عقل وہوش سے عاری راجپوتوں کو لشکر کے قلب میں داخل ہوجانے دیں۔ ملک نصرت خان کے سپاہیوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ بڑی ذہانت سے کترا کر نکل گئے اور راجپوت شہسوار فتح کے نشے میں اتنے آگے چلے گئے کہ ان کی بحفاظت واپسی کے تمام راستے بند ہوگئے۔

راج کمار آرسی بار بار چیخ رہا تھا۔ "میں عام سپاہیوں سے لڑنا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ علاءالدین اگر مرد ہے تو میرے مقابل آئے۔ میں اسے بتاؤں گا کہ فن سپاہ گری کیا ہے اور جنگ کس طرح لڑتے ہیں۔"

ملک نصرت خان نے اس راجپوت نوجوان کی لاف زنی کا جواب دینے کے بجائے اپنے سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اسے مت چھونا کہ یہ میرا شکار ہے۔" یہ کہہ کر ملک نصرت خان، راج کمار آرسی کی طرف جھپٹا۔ راج کمار دیوانوں کی طرح لڑرہا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح سلطان علاءالدین خلجی کے قریب پہنچ جائے۔ حالانکہ سلطان اس کی دسترس سے بہت دور تھا لیکن راج کمار کی چیخیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔

"کہاں ہے تمہارا نامرد سلطان جو میری مبارزطلبی کا جواب نہیں دیتا۔ اس سے کہو کہ راج کمار آرسی اسے پکاررہا ہے۔ شیروں کی جنگ میں یہ گیدڑ کہاں سے آگئے ہیں۔" آرسی کے منہ سے غلیظ کلمات سن کر مسلمان سپاہیوں کا خون کھول اٹھا تھا۔ سلطان کا ہر جاں نثار یہی چاہتا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اپنی شمشیر کے جوہر دکھائے اور راجپوت نوجوان کو اس کی بدکلامی کی اذیت ناک سزا دے مگر علاءالدین کے تمام سپاہی اپنے سپہ سالار ملک نصرت خان کے حکم سے مجبور تھے۔ وہ ایک دیوار کی طرح راج کمار کے سامنے کھڑے

ہوگئے تھے اور آرسی کے ہر وار کو دفاعی انداز میں روک رہے تھے۔

ملک نصرت خان اپنے سپاہیوں کی قطار کو چیرتا ہوا راج کمار آرسی تک پہنچ گیا اور اس کی شمشیر خارا شگاف فضا میں لہرائی۔ آرسی نے ملک نصرت خان کا وار روکنے کی کوشش کی مگر اس کا دایاں ہاتھ زخمی ہوگیا اور پھر دوسرے ہی لمحے سلطان کے سپاہیوں نے دیکھا کہ راج کمار کی تلوار چھوٹ گئی۔ ملک نصرت خان نے اپنے ایک فوجی کو حکم دیا۔ "اس کی تلوار اسے واپس کردو کہ سلطان علاءالدین خلجی کے غلام نہتوں پر وار نہیں کرتے۔"

مسلمان سپاہی نے گھوڑے سے اُتر کر تلوار اٹھائی اور راج کمار آرسی کی طرف بڑھائی۔ راجپوت نوجوان نے حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ تلوار لے کر ملک نصرت خان پر وار کیا مگر اس کا حملہ رائیگاں گیا۔ داؤ پیچ کے مختصر سے مظاہرے کے بعد راج کمار آرسی مزید زخمی ہوگیا اور اس کی تلوار دوبارہ زمین پر گر گئی۔ ملک نصرت خان نے ایک مرتبہ پھر راج کمار کو اس کی تلوار لوٹا دی۔ مسلمان سپہ سالار کی طرف سے یہ انتہائی ذلت آمیز سلوک تھا مگر راج کمار آرسی لڑتا رہا۔ یہاں تک کہ ملک نصرت خان نے اس کے جسم پر کئی گہرے زخم سجا دیئے اور راجپوت نوجوان اپنے خون میں نہا کر تپتی ہوئی ریت پر گر گیا۔ اب اس میں اٹھنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تھی۔

"اسے لے جاکر سلطان کے قدموں میں ڈال دو۔" ملک نصرت خان نے اپنے سپاہیوں کو نیا حکم دیا۔

راج کمار آرسی کو کھینچ کر سلطان کے قریب لے جایا گیا۔ راستے بھر وہ اپنی زبان سے علاءالدین خلجی کیلئے نازیبا کلمات ادا کرتا رہا۔ سلطان نے بڑی حقارت سے راجپوت نوجوان کی طرف دیکھا جو خاک میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا تھا۔

"اسے نئی تلوار فراہم کرو کہ ہم بھی اس کے بازوؤں کی طاقت دیکھنا چاہتے ہیں۔" علاءالدین کی ہیبت ناک آواز گونجی اور قریب کے سپاہیوں میں ایک لرزہ سا پڑ گیا۔

سپہ سالار تاج الدین عراقی جو سلطان کے گرد ایک حصار قائم کئے ہوئے تھا آگے بڑھا اور اپنی تلوار کو زمین کی طرف جھکاتے ہوئے بولا۔ "سلطان معظم کا یہ عمل آداب جنگ کے خلاف ہے۔ اگر خدانخواستہ........"

عراقی کا جملہ مکمل نہیں ہونے پایا تھا کہ علاءالدین گرج اٹھا۔ "تمہارا سلطان اپنی جنگ کے آداب خود بناتا ہے۔ عراقی! اسے کسی دوسرے قانون کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

تاج الدین عراقی نے سر جھکا دیا اور راج کمار آرسی کو نئی تلوار دے دی گئی۔ راجپوت نوجوان نے شمشیر کے قبضے پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اٹھنے کی بہت کوشش کی مگر زخموں نے اسے نڈھال کردیا تھا وہ اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کرسکا۔ پھر ایک طویل اذیت ناک کشمکش کے بعد اس نے علاءالدین کی دی ہوئی تلوار سے اپنی شہ رگ کاٹ دی۔ گرم لہو کا فوارہ سا ابل پڑا۔ راج کمار کچھ دیر تک تڑپتا رہا اور پھر اس کا جسم سرد پڑ گیا۔

"تم نے دیکھا عراقی! سلطان کے بدخواہوں کا انجام کس قدر عبرتناک ہوتا ہے۔" علاءالدین نے سپہ سالار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں تمام عمر افسوس رہے گا کہ یہ نوجوان فاتح عالم سے دست بدست مقابلے کی تمنا لئے ہوئے رخصت ہوگیا۔ کاش! اسے موت اتنی مہلت دیتی اور پھر وہ اندازہ کرسکتا کہ سلطان کے بازوؤں کی ضرب کتنی کاری ہے۔"

اس دوران باقی راجپوت سپاہی بھی لقمۂ اجل بن چکے تھے اور جو زندہ بچ گئے تھے انہوں نے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنے آپ کو قیدی کی حیثیت سے سلطانی لشکر کے حوالے کر دیا تھا۔

علاء الدین کے حکم پر راج کمار آرسی کی لاش قلعہ کے محافظوں کے سپرد کر دی گئی۔

جب آرسی کا خون آلود جسم قلعے میں پہنچا تو ہر طرف ایک کہرام برپا ہو گیا۔ حکمران خاندان کی عورتیں ماتم کرتی ہوئی اپنے اپنے کمروں سے نکل آئیں۔ راجہ رتن سنگھ کا چہرہ گیندے کے پھولوں کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ وہ اپنے جواں مرگ بھائی کی لاش سے لپٹا ہوا کچھ دیر تک گریہ وزاری کرتا رہا پھر قلعہ کے میدان میں راج کمار آرسی کی چتا کو آگ لگا دی گئی۔ یہ دوسری شکست تھی جس نے راجپوت سورماؤں کو اپنی زندگی سے مایوس کر دیا تھا۔ اب قلعے کی شکستہ فصیلوں اور راج محل کی دیواروں پر ایک ہی لفظ لکھا ہوا نظر آتا تھا۔

"موت.........بے بسی اور تنہائی کی دردناک موت۔"

☆..........☆..........☆

راجہ رتن سنگھ نے اپنی قبائے زرنگار سے بہتے ہوئے آنسو خشک کئے اور فوری طور پر ایک ہنگامی اجلاس طلب کر لیا۔ اس اجلاس میں صرف حکمراں خاندان کے افراد شریک ہوئے تھے۔ "آنے والا طوفان اتنا سرکش ہے کہ اب اسے ہماری لاشوں کی دیواریں بھی نہیں روک سکتیں۔" راجہ رتن سنگھ نے حکمراں طبقے کے نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سمراٹ! میں ابھی چتوڑ کی فتح سے مایوس نہیں ہوا ہوں۔" راج کمار اجیسی نے اپنی نشست پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اجیسی عمر میں مقتول راج کمار آرسی سے ایک سال چھوٹا تھا اور اس نے چند برس پہلے ہی منزل شباب میں قدم رکھا تھا۔

"مجھے تمہارے حوصلوں پر ناز ہے اجیسی!" رتن سنگھ نے بڑی مایوس نظروں سے اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا۔ "مجھے اپنے خون کے خالص ہونے پر پورا یقین ہے کہ اس میں بزدلی کا ایک ذرہ بھی شامل نہیں ہوا ہے۔"

"تو پھر میرے ہاتھوں میں تلوار دیجئے کہ موت کی دلہن میرا انتظار کر رہی ہے۔" اجیسی کا لہجہ شرربار تھا اور چہرہ خون کی حدت سے تمتما رہا تھا۔

"اجیسی! میں یقیناً اپنی خاندانی تلوار تیرے حوالے کروں گا مگر پرکھوں کی وہ شمشیر دشمن سے مقابلہ کرنے کیلئے نہیں ہوگی۔"

راجہ رتن سنگھ کی یہ بات سن کر حاضرین سناٹے میں آ گئے۔ "وہ تلوار اس عظیم خاندان کی آخری نشانی کے تحفظ کیلئے ہوگی۔" راجہ رتن سنگھ نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ "میں چاہتا ہوں کہ تو آرسی کے بیٹے ھمیر کو لے کر اتنی دور چلا جا کہ دشمن تم دونوں کی گرد بھی نہ پا سکے۔"

"میں اس حالت میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔" راج کمار اجیسی بچوں کی طرح مچل گیا۔ "ایسی زندگی پر ہزار بار لعنت کہ بزرگ خطرات میں گھرے رہیں اور کڑیل جوان اپنی جانیں بچا کر فرار ہو جائیں۔"

"یہ میرا حکم ہے اجیسی!" راجہ رتن سنگھ نے انتہائی شفقت آمیز لہجے میں اپنے چھوٹے بھائی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "تم فرار نہیں ہو رہے ہو بلکہ چوہانوں کی آخری نشانی کو بچانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اگر تم اور ھمیر دشمنوں کی درندگی سے محفوظ رہے تو میں یہ سوچ کر مطمئن ہو جاؤں گا کہ میری قربانی رائیگاں نہیں گئی۔"

اس کے بعد راجہ رتن سنگھ، راج کمار اجیسی کو لے کر مخصوص کمرے میں آیا جہاں اس کے خاندانی

نوادرات موجود تھے۔ رتن سنگھ نے آگے بڑھ کر ایک تلوار اٹھائی اور اجیسی کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

"میں مارواڑ کی سب سے قیمتی تلوار تیری حفاظت میں دیتا ہوں۔ یہ طلسمی تلوار وشوا کرما نے تیار کی تھی اور خود دیوی نے اپنے ہاتھوں سے تیرے مورث اعلیٰ راول کے گلے میں ڈالی تھی۔" رتن سنگھ نے راج کمار اجیسی کو طلسمی شمشیر کی تاریخ بتاتے ہوئے کہا۔ "اس تلوار کی کرشمہ سازی یہ ہے کہ دشمن کو ہلاک کرتی ہے اور جس کے ہاتھ میں ہو اسے تمام بلاؤں سے محفوظ رکھتی ہے۔"

راج کمار اجیسی نے بڑے بھائی کے حکم کی تعمیل میں سر جھکا دیا۔

☆..........☆..........☆

جنگ کے چوتھے دن راج کمار اجیسی اور دس سالہ ھمیر راجپوت جانبازوں کی ایک جماعت کی نگہبانی میں "بدل پول" سے باہر آئے۔ اس دروازے پر سلطان کے سپاہی موجود نہیں تھے۔ اجیسی اطمینان کے ساتھ اپنے بھتیجے ھمیر کو لے کر آگے بڑھا مگر جب وہ لوگ "سورج پول" کے قریب پہنچے تو مسلمان فوجیوں کو اپنا منتظر پایا۔ راجپوت بڑی بہادری سے لڑے۔ راج کمار اجیسی اور ھمیر کو رتن سنگھ کی ہدایت تھی کہ وہ مسلسل بھاگتے رہیں یہاں تک کہ دشمن کے حصار سے باہر نکل جائیں۔ یہ رتن سنگھ کی احمقانہ سوچ تھی۔ علاء الدین کے جہاندیدہ سپاہیوں نے اجیسی اور ھمیر کو فرار ہونے نہیں دیا۔ اجیسی ایک مقابلے کے بعد مارا گیا اور نوخیز ھمیر کو بچہ سمجھ کر مسلمان فوجیوں نے اپنی پناہ میں لے لیا۔ راجہ رتن سنگھ صدر دروازے کے اوپر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ مقدس تلوار ٹوٹ چکی تھی اور اس کے خاندان کی آخری نشانی ایک قیدی کی حیثیت سے سلطان کے خیمے میں پہنچا دی گئی۔

رتن سنگھ کو محسوس ہوا جیسے چتوڑ کی تمام پہاڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئی ہوں اور وہ پتھروں کے ڈھیر میں دبا چیخ رہا ہو۔ ایک ایک کر کے تمام ساتھی بچھڑ رہے تھے اور راجپوتوں کی شکست قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔

سردار لچھمن سنگھ کے ساتوں بیٹے چتوڑ کی آبرو پر قربان ہو چکے تھے اور سپہ سالار ہری سنگھ لڑتے لڑتے زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر گیا تھا۔ اسے بس سلطان علاء الدین خلجی سے دست بدست جنگ کی آرزو تھی مگر ہری سنگھ کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ غلام کا مقابلہ غلام ہی کر سکتا ہے۔ بالآخر ہری سنگھ کو گرفتار کر کے سلطان کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

"ہری سنگھ! ہم تمہاری شجاعت و مردانگی کی قدر کرتے ہیں۔" علاء الدین نے راجپوت سپہ سالار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جس کے پورے جسم پر زخموں کی گلکاریاں تھیں مگر زبان پر بیہودہ الفاظ نہیں تھے۔

"سلطان! اگر آپ واقعتاً مردوں کی قدر کرتے ہیں تو مجھے اپنی تلوار سے ہلاک کر دیجئے۔ میں سمجھوں گا کہ میری زندگی ٹھکانے لگ گئی۔" ہری سنگھ لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "مجھے مرتے وقت اس بات پر ناز ہو گا کہ میری موت ایک ذہین اور بہادر شہنشاہ کے ہاتھ سے واقع ہوئی۔ سلطان! بے شک! آپ حکمرانی کے لائق ہیں۔"

"نہیں ہری سنگھ!" سلطان نے جذباتی لہجے میں کہا......... "تم زندہ رہو گے اور تمہیں ہم تمہارے شایان شان نیا منصب عطا کریں گے۔"

"نہیں سلطان! ہرگز نہیں۔" ہری سنگھ اپنے خون آلود ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنے لگا.........

"شکست کے بعد ہر منصب اور ہر مرتبہ غلامی کی یاد دلاتا ہے اور میں ایک غلام کی حیثیت سے زندہ رہنا نہیں

چاہتا۔ "

"ہم تمہیں غلامی کا احساس تک نہیں ہونے دیں گے ہری سنگھ!" علاء الدین نے دشمن سپہ سالار کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں شہنشاہ! غلامی غلامی ہی ہوتی ہے چاہے اسے کوئی بھی قباء پہنادی جائے۔" نقاہت سے ہری سنگھ کی آنکھیں بند ہوتی جارہی تھیں۔

"ہم تمہیں کسی قیمت پر مرنے نہیں دیں گے ہری سنگھ۔" سلطان کی آواز بہت زیادہ پُرجوش ہوگئی تھی۔

"میں نے ایک ہی کی غلامی اختیار کی ہے شہنشاہ! صرف اپنے عظیم اور محبوب وطن چتوڑ کی غلامی۔" خون زیادہ بہہ جانے کے سبب ہری سنگھ کی آواز میں مزید لرزش پیدا ہوگئی تھی اور اس کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہورہے تھے۔ "میں.......... اپنی.......... وفاداریاں.......... تبدیل نہیں.......... کرتا۔ مجھے اعتراف ہے کہ شکست.......... میرا مقدر بن گئی.......... میں نے میدان جنگ میں.......... مرنے کی.......... کوشش کی.......... مگر غیرت مندوں.......... اور سورماؤں کی موت.......... میری قسمت میں.......... نہیں لکھی گئی تھی.......... اگر آپ میرے قتل کا.......... حکم نہیں دے سکتے تو پھر مجھے جانے دیجئے۔ میں کسی گوشۂ تنہائی میں.......... مرجاؤں گا.......... یہ ایک راجپوت کا عہد ہے کہ دوبارہ.......... اہلِ چتوڑ کے سامنے.......... نہیں آؤں گا۔" یہ کہتے کہتے ہری سنگھ بے ہوش ہوگیا۔

سلطان نے اپنے طبیب خاص مولانا بدرالدین دمشقی کو حکم دیا کہ وہ ہری سنگھ کے زخموں کو بھرنے کیلئے موثر ترین دوائیں استعمال کریں۔ مولانا دمشقی کو علمِ طب میں اس قدر مہارت حاصل تھی کہ اگر چند جانوروں کا پیشاب ایک ہی برتن میں ان کے سامنے پیش کیا جاتا تو مولانا بدرالدین فوراً تمام جانوروں کے نام بتادیتے۔

☆..........☆..........☆

جنگ اب فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوچکی تھی اور راجپوت اپنے صدیوں کے اقتدار سے محروم ہوتے نظر آرہے تھے۔ رانی پدمنی کے رشتے کا بھتیجا بادل سنگھ میدان جنگ میں جانے کیلئے بہت بے قرار تھا مگر رتن سنگھ محض اس خیال سے بادل سنگھ کو اجازت نہیں دے رہا تھا کہ وہ اس کی محبوب بیوی کے خاندان کی آخری نشانی تھا۔ راجپوتوں کی تاریخ میں بادل سنگھ "گورا بادل" کے نام سے بڑی شہرت رکھتا ہے۔ وہ بیس سال کا ایک خوبصورت نوجوان تھا جس کے چہرے سے شاہانہ وجاہت جھلکتی تھی۔

"سمراٹ! جب آپ کے خاندان کی کوئی یادگار باقی نہیں رہی تو پھر بادل سنگھ پر یہ پابندی کیوں لگادی گئی ہے؟" رانی پدمنی نے اپنے شوہر سے شکایت آمیز لہجے میں کہا.......... "جب ہزاروں ماؤں کی چھاتیاں بیٹوں کے فراق کی آگ میں جل گئیں تو پھر پدمنی کے ساتھ یہ ذلت آمیز سلوک کیوں؟ بادل سنگھ زندہ رہا تو غلام بنالیا جائے گا اور دھرتی ماں ہمیشہ میرے خاندان کا نام لے کر طعنے دیا کرے گی کہ اس کے بھتیجے نے موت سے ڈر کر زنجیریں پہن لیں۔"

رتن سنگھ کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر مایوس نظروں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا..........

"مہارانی! میں اجیسی' ھمیر اور بادل سنگھ کو ہر قیمت پر بچانا چاہتا تھا مگر دیوتاؤں کو شاید منظور نہیں کہ راجپوتوں کے یہ وارث اپنے دشمن سے انتقام لینے کیلئے زندہ رہیں۔ کل ہم بادل سنگھ کو لے کر علاء الدین سے آخری مقابلے کیلئے رن بھومی کا رخ کریں گے۔" رتن سنگھ نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

"سمراٹ!" یہ کہتے ہوئے رانی پدمنی رتن سنگھ کے قدموں سے لپٹ گئی۔ "تو پھر اس کنیز کو بھی رخصت کیجئے۔ اب ہم دوسری دنیا میں ملیں گے جہاں دلوں کے درمیان کوئی علاء الدین خلجی ہجروفراق کی دیوار نہیں کھینچے گا۔"

☆..........☆..........☆

وہ رات چتوڑ کیلئے بڑی دہشت ناک اور لرزہ خیز تھی قلعے پر کسی ماتم کدے کا گمان ہوتا تھا۔ بوڑھے راجپوت کانپتی آوازوں میں گزرے ہوئے زمانے کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ شادی شدہ عورتیں حیرت وسکوت اور رنج والم کا مجسمہ بن کر رہ گئی تھیں۔ ان کے سینوں میں زندہ رہنے کی تڑپ موجود تھی مگر ہندو سماج کی رسمیں انہیں بھڑکتی ہوئی آگ میں چپ چاپ جل جانے کیلئے مجبور کررہی تھیں۔ نوخیز دوشیزائیں جن پر ابھی عہدِ شباب کے اسرار و رموز بھی نہیں کھل سکے تھے' اپنے ماں باپ اور بھائیوں کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی خوفزدہ آنکھوں میں بس ایک ہی سوال لرز رہا تھا۔

"ہمیں کس جرم میں زندہ جلایا جارہا ہے؟"

راجپوت سورما جو صدیوں سے عورتوں کو کچی مٹی کا کھلونا سمجھتے آئے تھے' اپنی شمشیریں بے نیام کئے ہوئے پُرجوش تقریریں کررہے تھے۔ "ہمارے بعد تمہارا جیون اس دھرتی کا ایک بوجھ بن جائے گا۔ دہلی سے آنے والے ملیچھ بھوکے درندوں کی طرح تمہارے اچھوتے جسموں پر ٹوٹ پڑیں گے اور تم لعنت ورسوائی کا کبھی نہ مٹنے والا نشان بن کر رہ جاؤ گی۔ اس سے پہلے کہ دشمن کے خونی ہاتھ تمہارے دامنِ آبرو کو تار تار کر ڈالیں' تم ہماری آنکھوں کے سامنے پوترا گنی (مقدس آگ) کے حصار میں داخل ہوجاؤ۔ اس طرح تمہیں تمام دکھوں سے مکتی بھی مل جائے گی اور تمہاری بے چین روحوں کو لازوال سکون بھی حاصل ہوجائے گا۔"

"ابھی تو ہمارے باپ اور بھائی زندہ ہیں۔" بہت سی راجپوت دوشیزاؤں نے بلند آواز میں احتجاج کیا۔ "ان کے جیتے جی ہم کیسے مرجائیں۔"

"تمہیں ہماری زندگی میں موت کو قبول کرنا ہوگا۔" راجپوت مردوں نے چیختے ہوئے کہا۔ "اب ہم اسی حالت میں جنگ کرسکتے ہیں جب ہمیں یقین ہوجائے کہ ہماری عزت وناموس کو مکمل تحفظ حاصل ہوگیا ہے اور یہ تحفظ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب ہماری نظروں کے سامنے تمہارے جسموں کی راکھ ہوا میں بکھر جائے۔"

"سلطان نے یقین دلایا ہے کہ چتوڑ کے بوڑھوں' بچوں اور عورتوں کو ان کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا حق حاصل ہوگا۔" ایک خوبصورت دوشیزہ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ یہ لڑکی حکمراں خاندان سے تعلق رکھتی تھی' بہت زیادہ تعلیم یافتہ تھی اور اس نے اپنے کانوں سے علاء الدین کا آخری فرمان سنا تھا۔ وہ فرمان جسے ملک نصرت خان نے سرِدربار پڑھ کر سنایا تھا اور جس میں سلطان نے راجہ رتن سنگھ کو حکم دیا تھا کہ شکست کے بعد راجپوت اپنی وحشیانہ رسموں کو دہرانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ راجپوت دوشیزہ نے علاء الدین خلجی کے اسی فرمان کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اپنی قوم کی لڑکی کا یہ بیباکانہ جواب سن کر راجپوت سپاہی مشتعل ہوگئے۔ "سلطان جھوٹا ہے۔ وہ تمہیں عافیت وامان دینے کے بہانے ایک خوفناک کھیل کھیل رہا ہے۔ تم ابھی معصوم ہو اور تمہیں تاریخ کے مزاج کا اندازہ نہیں کہ جب کوئی قوم شکست سے دوچار ہوجاتی ہے تو سب سے پہلے اس کی عورتیں حملہ آوروں کے تشدد کا نشانہ بنتی ہیں۔"

"ہمیں خبر ہے کہ مسلمان جھوٹ نہیں بولتے۔" راجپوت دوشیزہ بڑی جرأت کے ساتھ جواب دے رہی تھی۔ "محمد بن قاسم آیا مگر اس نے کسی ہندو عورت کو چھوا تک نہیں پھر شہاب الدین غوری ایک فاتح کی حیثیت سے نمودار ہوا اور اس کے سپاہیوں نے بھی کسی راجپوت لڑکی کے سر سے آنچل نہیں کھینچا۔ اب علاء الدین چیخ چیخ کر اہل چتوڑ کو یقین دلا رہا ہے کہ تمام کمزور و ناتواں مرد' بچے اور عورتیں اس کی شمشیر کے سائے میں ہیں۔ سارے مقامی باشندے اس راز سے بھی باخبر ہیں کہ سلطان کے جن سپاہیوں نے اچھوت دوشیزاؤں پر دست درازی کی تھی وہ ہماری ہی سرزمین پر موت کی نیند سلا دیئے گئے۔ بے شک! ہم قلعے کی چار دیواری میں قید ہیں مگر ہماری سماعتیں ملاحوں اور اچھوتوں کی بستیوں میں رہنے والوں کے وہ گیت سن رہی ہیں جن میں سلطان کی عظمت کے ترانے دن رات گائے جاتے ہیں۔" راجپوت دوشیزہ موت کے خوف سے بے نیاز ہو چکی تھی اور اس نے اپنے جذبوں کو اس دلیری کے ساتھ ظاہر کیا تھا کہ چتوڑ کے نگہبان سناٹے میں آ گئے تھے۔ چند لمحوں تک قلعے کے طویل و عریض میدان پر موت کا سا سکوت طاری رہا۔

پھر ایک راجپوت سردار نے اس بے باک لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تجھ پر دیوتاؤں کی لعنت ہو کہ تو نے راجپوتوں کی آن مٹی میں ملا دی۔ کیا تجھے خبر نہیں کہ وہ راکشس سلطان تیری راج ماتا کو دربار میں نچانا چاہتا ہے؟"

"ایشور راج ماتا کے تقدس کی حفاظت کرے۔" راجپوت دوشیزہ اچانک اداس نظر آنے لگی تھی۔ "اس دھرتی پر وہ رات کبھی نہ اترے جس کے اندھیرے ہماری راج ماتا کے روشن چہرے کو ذلت کی سیاہی سے بھر دیں۔"

"تو پھر خاموشی سے اس آگ میں جل جاؤ جو کچھ دیر بعد دہکائی جائے گی۔" راجپوت سردار نے تلخ لہجے میں کہا۔

"خاموشی سے نہیں' خوشی سے کہو سردار۔" راجپوت دوشیزہ ایک بار پھر سرکش نظر آنے لگی تھی۔

"دونوں باتوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔" راجپوت سردار نے جھنجلا کر کہا۔

"ہرگز نہیں۔" راجپوت دوشیزہ کی آواز یکایک بلند ہو گئی تھی۔ "خاموشی جبر کا نام ہے اور خوشی آزادی کا۔ ان معصوم لڑکیوں کے چہرے تو دیکھیں۔ کیا کہیں خوشی کا کوئی عکس نظر آتا ہے؟ یہ سب کی سب زندہ رہنا چاہتی ہیں مگر انہیں ہمارے سماج کی ظالم رسمیں جلا ڈالنا چاہتی ہیں۔"

راجپوت سردار مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ راجہ رتن سنگھ کے حکم پر اس شوریدہ سر لڑکی کو قتل کر دیا گیا جو اپنی جوان آرزوؤں کے سائے میں زندہ رہنا چاہتی تھی۔

"ہر وہ جسم اسی طرح ساکت کر دیا جائے گا جس کے اندر دیوتاؤں کے قوانین سے بغاوت کی لہریں اٹھیں گی۔ ہم اپنی آبرو کو لعنت زدہ زندگی کی تھالیوں میں سجا کر دشمن کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیں گے۔"

اس جابرانہ حکم نے راجپوت دوشیزاؤں کے تانبے جیسے جسموں سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا۔ کچھ دیر بعد ہزاروں عورتیں جن میں نوخیز دوشیزائیں بھی شامل تھیں ایک بڑے جلوس کی شکل میں ماتا کے مندر کی طرف جانے لگیں۔ اس دوران زنانہ محل کے ہر کمرے میں لکڑیوں کے انبار جمع کئے جاتے رہے۔

رات کا قافلہ دبے پاؤں گزرتا ہوا صبح کی منزل کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ نصف شب کے بعد عورتوں کی پوجا مکمل ہوئی۔ پھر ان مظلوموں کے کارواں کو وادئ ہلاکت کی طرف لے جایا گیا۔ تمام کمروں میں آگ لگا دی گئی تھی۔ مندر کے پجاری زنانہ محل کے بڑے دروازے پر پیتل کے برتن لئے کھڑے تھے۔ ان برتنوں میں "گومکھ" کا پانی بھرا ہوا تھا یہ وہ پانی تھا جسے گائے کا منہ دھلانے کے بعد برتنوں میں محفوظ کر لیا

جاتا تھا۔ اس پانی کو "آبِ مقدس" کا درجہ حاصل تھا اور خاص خاص تہواروں کے موقع پر اس کے چند قطرے چھڑکنا باعث برکت سمجھا جاتا تھا۔ عورتوں کے ستی ہونے کی رسم کو دو مرحلوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ پہلے مرحلے میں عام راجپوت سپاہیوں کی بیویاں اور بیٹیاں شامل تھیں جنہیں زنانہ محل کے کمروں میں جل کر خاک ہونا تھا۔ دوسرے مرحلے میں رانی پدمنی اور تمام راجپوت سرداروں کی بیویاں تھیں جنہوں نے ستی کی رسم ادا کرنے کیلئے ماتا کے مندر کا انتخاب کیا تھا۔

رات کے پچھلے پہر اس وحشیانہ رسم کا آغاز ہوا۔ بڑے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے پجاری جلنے والی عورت کے کپڑوں پر "گومکھ" کے پانی کی چند بوندیں ڈالتے تھے اور پھر وہ عورت اپنے مقتل کی طرف بڑھ جاتی تھی۔ ہر کمرے کے دروازے پر دس دس بیس بیس مسلح سپاہی کھڑے تھے جن کا ایک ہی کام تھا کہ وہ عورتوں اور بچوں کو بھڑکتی ہوئی آگ میں دھکیلنے کے بعد باہر سے دروازے بند کر دیں اور اگر کوئی عورت موت سے ڈر کر بھاگنا چاہے تو اس کیلئے راہ فرار باقی نہ رہے۔ وہ شادی شدہ عورتیں جن کے شوہر بارہ روزہ جنگ میں مارے جا چکے تھے' بے دھڑک آگ میں داخل ہو گئیں مگر جب ان کے بچوں کو شعلوں کے درمیان پھینکا گیا تو وہ دردناک آوازوں میں چیخ چیخ کر رحم کی بھیک مانگنے لگیں۔

"ہمیں جلا ڈالو مگر ہمارے بچوں کو اس آگ سے نکال لو کہ ان کی موت ہم سے نہیں دیکھی جاتی۔"

جلنے والی عورتوں کی چیخوں نے راج محل میں بڑا ہولناک سماں پیدا کر دیا تھا۔ ابھی مشکل سے چند سو عورتیں ہی آگ کا ایندھن بنی ہوں گی کہ بڑے دروازے میں داخل ہونے والی خواتین یکایک ٹھہر گئیں۔

"ہماری زندگی میں ہمارے بچے اس بے درد آگ کی غذا نہیں بن سکتے۔" کئی ہزار عورتوں نے اپنے مردوں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر جب ان پر جبر کیا گیا تو وہ قلعے کے میدان کی طرف بھاگ کھڑی ہوئیں۔ ایک عجیب سا حشر برپا تھا۔ راجپوت سپاہی دشمن کا مقابلہ کرنے کے بجائے اپنی عورتوں اور بچوں کا تعاقب کر رہے تھے اور انہیں پکڑ پکڑ کر آگ میں جھونک رہے تھے۔

دوسری طرف ماتا کے مندر کے وسیع احاطے میں لکڑیاں جلا دی گئی تھیں اور شعلے اس طرح رقص کر رہے تھے جیسے بے شمار ناگوں کی زبانیں کسی جاندار کو ڈسنے کیلئے لپک رہی ہوں۔ راجہ رتن سنگھ اپنے سرداروں کے ہمراہ آخری بار رانی پدمنی سے ملنے آیا۔ وہ زرد لباس پہنے اپنی کنیزوں کے درمیان کھڑی تھی اور اس کے گلے میں چنبیلی کے پھولوں کے گجرے پڑے ہوئے تھے۔ ستی ہوتے وقت راجپوت عورتوں کا یہی انداز ہوتا تھا۔ دوسرے سرداروں کی بیویاں بھی زرد کپڑوں میں لپٹی ہوئی کھڑی تھیں۔ آگ کے شعلے اس قدر بلند تھے کہ محل کے تاریک ترین گوشے بھی روشن ہو گئے تھے۔ راجہ رتن سنگھ نے رانی پدمنی کی طرف دیکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں اپنی محبوب بیوی کو مخاطب کیا۔

"الفراق! ملکۂ کوہسار! الوداع! مہارانی چتوڑ! دیوتاؤں کو منظور ہے تو بہت جلد ہم سب لوگ تم سے پرلوک (دوسری دنیا) میں آملیں گے۔"

اسی طرح دوسرے راجپوت سرداروں نے بھی اپنی بیویوں کو مخاطب کر کے الوداعی کلمات کہے۔ رانی پدمنی کا لباس زرد تھا۔ مگر اس کے چہرے کی سرخی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ باوقار انداز میں اس طرح کھڑی تھی جیسے وادئ مرگ میں نہیں' راج دربار میں اپنی پرجا کو درشن دینے جا رہی ہو۔ یہی کیفیت دوسرے سرداروں کی بیویوں کی بھی تھی۔ ان کے چہروں پر نہ خوف و دہشت کا کوئی عکس تھا اور نہ اذیت و کرب کی کوئی پرچھائیں۔ جیسے آگ میں جلنا ان کی زندگی کا دلچسپ مشغلہ ہو۔ مندر کے احاطے کا دروازہ بند کر دیا گیا اور راجہ رتن سنگھ اپنے سرداروں کے ساتھ پہرہ داروں کی طرح کھڑا

ہو گیا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں علاءالدین کے سپاہی رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر محل میں داخل نہ ہو جائیں اور رانی پدمنی کے ستی ہونے کی رسم نامکمل نہ رہ جائے۔

قلعہ کے میدان میں ایک قیامت سی برپا تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یوم حساب آپہنچا ہو، گناہ گار اپنے المناک انجام کے خوف سے بھاگ رہے ہوں اور عذاب کے فرشتے انہیں پکڑ پکڑ کر دوزخ کی آگ میں ڈال رہے ہوں۔ جب انسانی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا تو راجہ رتن سنگھ بھی پریشان سا نظر آنے لگا۔ اسے اطلاع دی گئی کہ عورتوں کا ہجوم بے قابو ہو گیا ہے۔ راجپوت سمراٹ نے فوراً حکم جاری کیا کہ کوئی عورت قلعے سے باہر نہ جانے پائے۔ چتوڑ کے مسلح سپاہی ان عورتوں کا پیچھا کر رہے تھے جنہیں جیتی جاگتی زندگی کی طلب تھی اور جو بڑی جرأت کے ساتھ اپنی مذہبی رسموں کو جھٹلا چکی تھیں، اس کشمکش میں بہت سی عورتیں دیواروں سے ٹکرا کر زخمی ہو گئیں مگر پھر بھی زندگی کی تڑپ نے انہیں ہر چوٹ سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ گر گر کر اٹھ رہی تھیں اور اٹھ اٹھ کر بھاگ رہی تھیں۔ شیر خوار بچے ان کی آغوش میں تھے اور وہ کسی صورت قلعے کی چار دیواری سے باہر نکل جانا چاہتی تھیں۔ موت اور زندگی کے اس خوفناک کھیل میں راجپوت عورتوں کی نصف تعداد ان غزالان دشت کی طرح پکڑ لی گئی جن کے تعاقب میں طاقتور درندے دوڑ رہے تھے اور جنہیں اسیر کرنے کیلئے قدم قدم پر آہنی جال بچھائے گئے تھے پھر بھی دو تین ہزار خواتین اس حالت میں قلعے سے نکل گئیں کہ ان کے جسم زخمی تھے اور لباس جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ یہ اس دست درازی کا نتیجہ تھا جس کا مظاہرہ راجپوت سپاہیوں نے عورتوں کو روکنے کیلئے کیا تھا مگر وہ اپنے ارادوں میں مکمل طور پر کامیاب نہ ہو سکے۔

☆..............☆..............☆

قلعے سے بلند ہونے والے آگ کے شعلوں نے علاءالدین کو پہلے ہی ہوشیار کر دیا تھا۔ سلطان نے اسی وقت رام دیو کو طلب کر کے پوچھا۔ "یہ کیسی آگ ہے؟ کیا رتن سنگھ نے اپنی شکست سے خوفزدہ ہو کر قلعے کو نذر آتش کر دیا۔"

"نہیں فاتح عالم! یہ تو ان بے زبان عورتوں کے زندہ جلائے جانے کا اہتمام ہے جن کی موت کے بعد راجپوت سپاہی سلطان کے لشکر پر آخری حملہ کریں گے اور یہ حملہ انتہائی خوفناک ہو گا۔" رام دیو نے اپنی قوم کے ایک اہم راز کو فاش کرتے ہوئے کہا۔

"ہم نے تو رتن سنگھ کو بہت پہلے حکم دیا تھا کہ وہ اس حیوانی حرکت سے باز رہے۔" علاءالدین نے غضبناک لہجے میں کہا۔ "ہماری جنگ مظلوموں سے نہیں، ہم تو ستمگروں کو ان کے انجام تک پہنچانے آئے ہیں۔"

"اے سنسار کو اپنی شمشیر کے سائے میں امان دینے والے! وحشی راجپوت انسانیت کی زبان نہیں سمجھتے۔ یہ ان کی مذہبی رسم ہے وہ اسے ہر حال میں ادا کر کے رہیں گے۔" رام دیو نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"ہماری زبان تو درخت اور پتھر بھی سمجھتے ہیں، پھر راجپوتوں کی کیا مجال ہے کہ وہ علاءالدین کا حکم سننے سے انکار کر دیں۔" سلطان خود بھی آگ کے شعلے کی طرح بھڑک اٹھا تھا اسے مظلوم عورتوں کے ساتھ پدمنی کے جل جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ اس لئے وہ بے قرار ہو کر خیمے سے باہر نکل آیا اور اپنے امیرانِ لشکر کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"قلعے میں داخل ہو کر اس آگ کو بجھا ڈالو جو کسی طرح بھی تمہارے سلطان کے قہر کی آگ سے زیادہ تیز نہیں ہے۔"

"سلطانِ معظم! ابھی رات کا اندھیرا باقی ہے۔" سپہ سالار خواجہ حاجی نے سر جھکائے ہوئے کہا۔ "قلعے کے اندرونی راستوں سے ناواقفیت کے سبب یہ تاریکی سلطان کے لشکر کو نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ صبح کا اجالا ہم سے زیادہ دور نہیں۔ اگر ہم روشنی کا انتظار کر لیں تو.........۔"

"نہیں خواجہ!" سلطان نے اپنے سپہ سالار کی بات کاٹ دی۔ "آج کوئی اندھیرا تمہارے راستے میں حائل نہیں ہو گا۔ تم تو روشنی کے نمائندے ہو، اجالوں کے سفیر ہو۔ پھر ان بے جان تاریکیوں سے کیوں خوفزدہ ہوتے ہو؟"

خواجہ حاجی نے اپنی شمشیر پر گرفت مضبوط کر دی۔

پھر علاءالدین نے ملک نصرت خان، تاج الدین عراقی اور ملک ظفر خان کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "شمال اور جنوب سے اپنے لشکروں کو آگے بڑھاؤ اور صدر دروازے پر پوری طاقت سے یلغار کرو۔ یہ حملے کا بہترین وقت ہے۔ سکندر پانی کے سیلاب سے گزر کر دشمن کے سروں پر پہنچا تھا۔ ہم آگ کے طوفان کو عبور کر کے قلعے میں داخل ہوں گے۔" علاءالدین ہمیشہ اپنے آپ کو سکندر ثانی سمجھتا تھا اور اس وقت بھی وہ سکندر اعظم کے انداز میں فتح کا خواب دیکھ رہا تھا۔ "عراقی! تم راجپوتوں کی بدنصیبی کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے ہی ہاتھوں اپنے گھر جلا رہے ہیں۔ آگے بڑھو اور اس بے عمل قوم کو غلامی کی زنجیر پہنا دو۔"

ابھی سلطان اپنے سپہ سالاروں کو نئی حکمت عملی کا مفہوم سمجھا رہا تھا کہ اگلے دستوں کے کچھ سپاہی بھاگتے ہوئے آئے اور راجپوت عورتوں کے قلعے سے باہر نکل آنے کا واقعہ بیان کرنے لگے۔ علاءالدین کے فوجیوں نے بتایا کہ وہ مظلوم عورتیں سلطان کو مدد کیلئے پکار رہی ہیں۔ چند لمحوں کیلئے علاءالدین پر لرزہ سا طاری ہو گیا پھر اس نے اپنے سپاہیوں سے چیخ کر کہا۔ "جو عورتیں درندوں کی گرفت سے نکل آئی ہیں انہیں پناہ دیدو اور جو موت کے دہانے میں گھر گئی ہیں انہیں بھی نجات دلانے کی کوشش کرو۔ موت و زیست پر صرف خدا کا اختیار ہے مگر تم اپنی شمشیروں کا قرض ادا کرو۔ آج مظلوموں کی ایک جماعت نے تمہیں مدد کیلئے پکارا ہے۔ تم نے سیاسی جنگیں بہت لڑی ہیں لیکن اس جنگ کو ان ستم رسیدہ عورتوں کے نام کر دو جن سے تمہارا کوئی مذہبی رشتہ نہیں ہے۔"

سلطان کا حکم سنتے ہی مسلمان سپاہی کئی سمتوں میں بکھر گئے۔ سپہ سالار خواجہ حاجی صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ سلطان کے فوجیوں کی ایک کثیر تعداد قلعے کی شمالی اور جنوبی فصیلوں کے گہرے شگاف سے اندر داخل ہوئی۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں کی روشنی انہیں راستہ دکھا رہی تھی لیکن وہ بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔ انجانے محاذ پر یہ مقابلہ بہت سخت اور صبر آزما ثابت ہوا۔ اگرچہ نادیدہ مورچوں پر راجپوت سپاہیوں کی تعداد کم تھی لیکن رات کے دھندلکے سے انہیں بہرحال ایک مخصوص فائدہ پہنچ رہا تھا۔ وہ کسی موڑ، کسی اوٹ سے اچانک برآمد ہوتے اور مسلمان سپاہیوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتے۔ علاءالدین کے جاں نثار کٹ کٹ کر زمین پر گر رہے تھے مگر ان کی پیش قدمی جاری رہی۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے سلطان کا یہی حکم تھا۔

"سورج پول" جو قلعہ چتوڑ کا صدر دروازہ تھا اس پر گھمسان کا رن پڑا۔ راجپوت سپاہی بڑی بے جگری کے ساتھ اپنی پناہ گاہ کا دفاع کر رہے تھے۔ مسلمان سپاہیوں کیلئے ایک گز آگے بڑھنا بھی دشوار نظر آ رہا تھا۔ راجہ رتن سنگھ اپنے سرداروں کے ہمراہ ماتا کے مندر پر پہرہ دے رہا تھا۔ اسی دوران اسے اطلاع ملی کہ

مسلمان سپاہیوں نے حملہ کر دیا ہے اور وہ مختلف سمتوں سے قلعے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ایک چونکا دینے والی خبر تھی کچھ دیر تک تو رتن سنگھ کو یقین ہی نہیں آیا کہ سلطان کے فوجی اس طرح بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ آخری جنگ دن کے اجالے اور تیز دھوپ میں لڑی جائے گی مگر جب قلعے میں ہر طرف شور بلند ہوا تو رتن سنگھ نے حکم دیا کہ بیشتر سپاہی "سورج پول" کی حفاظت کریں۔ اس دروازے میں داخل ہونے کے بعد قلعے کا کوئی حصہ محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ باقی راستے بہت زیادہ پرپیچ تھے۔ ان سے مسلمان فوجیوں کا گزرنا آسان نہیں تھا۔ یہی سوچ کر رتن سنگھ نے اپنی تمام نئی طاقت "سورج پول" کے دفاع کیلئے وقف کر دی تھی۔ راجپوت سپاہی بڑی تیزی سے سمٹ کر "سورج پول" پر جمع ہو رہے تھے اور سلطانی لشکر کے سامنے ایک آہنی دیوار بن گئے تھے ایک گھنٹے کی مختصر سی جنگ میں علاءالدین کے سیکڑوں سپاہی لقمۂ اجل بن چکے تھے مگر خواجہ حاجی اپنے فوجیوں کو مسلسل پیش قدمی کا حکم دے رہا تھا۔ یہ پیش قدمی اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ مسلمان سپاہی چند قدموں کا فاصلہ طے کریں اور راجپوتوں کے زہریلے تیروں کا نشانہ بن جائیں۔

خواجہ حاجی چیخ چیخ کر اپنے سپاہیوں کے حوصلے بلند کر رہا تھا۔ "بس چند لمحوں کی بات ہے' سورج طلوع ہونے والا ہے اور تمہارے دوسرے بھائی عقبی راستوں سے قلعے میں داخل ہو چکے ہیں۔ کچھ دیر اور موت کا بازار گرم ہونے دو۔ پھر دشمن ہر طرف سے محصور ہو جائے گا اور اس پر زندگی کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔" مسلمان سپاہی اپنے امیرِ لشکر کے حکم پر سربکف ہو کر لڑ رہے تھے۔ یہاں تک کہ رات کے سر سے سیاہ چادر ہٹ گئی اور فضا میں اس قدر اجالا پھیل گیا جس سے محاذِ جنگ کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ خواجہ حاجی نے اداس نظروں سے اپنے ان سپاہیوں کی لاشوں کو دیکھا جنہوں نے جاں نثاری کی نئی تاریخ رقم کی تھی۔

سورج کی روشنی راجپوتوں کیلئے فنا کا پیغام ثابت ہوئی۔ سلطان کے تیرانداز دستے نے ان تمام راجپوت تیراندازوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو مختلف جھروکوں اور کھڑکیوں سے علاءالدین کے سپاہیوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ قلعے میں داخل ہونے کیلئے یہی سب سے بڑی رکاوٹ تھی جسے بہت جلد دور کر دیا گیا' اب سلطانی لشکر کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے والا کوئی نہیں تھا کچھ دیر تک "سورج پول" پر خوفناک جنگ ہوتی رہی۔ راجپوتوں نے قلعے کے راستے میں اپنی لاشوں کی دیواریں بنا دی تھیں مگر علاءالدین کے فوجیوں کا جذبۂ تسخیر ایک ایسا سیلاب تھا جس سے پتھروں کے جگر بھی کٹ جاتے تھے۔ انسانی گوشت کے نرم و نازک ٹکڑے ان کی راہ میں کس طرح حائل ہو سکتے تھے؟ جب "سورج پول" پر چتوڑ کے محافظوں کی گرفت کمزور ہونے لگی تو کچھ سرداروں نے رتن سنگھ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ قلعے کا صدر دروازہ بند کر دیا جائے۔ راجپوت سردار اس طرح اپنی شکست کو عارضی طور پر ٹالنا چاہتے تھے مگر رتن سنگھ نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا۔

"اگر سورج پول بند ہو گیا تو ہم دشمنوں کے نرغے میں گھر کر بے کسی کی موت مارے جائیں گے۔" رتن سنگھ کو اندازہ تھا کہ علاءالدین کے سپاہی شمالی اور جنوبی سمتوں سے قلعے کے اندر داخل ہو چکے ہیں' اگرچہ انہیں ایک طویل چکر کاٹ کر سورج پول تک پہنچنا ہو گا لیکن انجام کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اسی خیال کے پیش نظر راجہ رتن سنگھ سورج پول کو بند کرنے سے گریزاں تھا۔ راجپوت سمراٹ نے آخری بار اپنے سپاہیوں کو مخاطب کیا۔ "درگا اور کالی کی قوتیں تمہارے سروں پر سایہ فگن

ہیں۔ شکست کسی بھی صورت میں تمہارا مقدر نہیں بن سکتی۔ جیتے تو جیتا (فاتح) کہلاؤ گے اور مر گئے تو امر ہو جاؤ گے۔"

رتن سنگھ کی اس تقریر نے راجپوتوں کے بجھتے ہوئے جذبوں کی آگ کو نئے انداز سے بھڑکا دیا۔ اب ان کیلئے زندگی اور موت کے الفاظ اپنا مفہوم کھو چکے تھے۔ گھروں میں آگ لگ چکی تھی' بیوی بچے یا تو نذرِ آتش ہو چکے تھے یا پھر اس ہنگامۂ دار و گیر میں ان کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ زندہ ہیں تو کس حالت میں ہیں؟ چتوڑ کے نگہبان پیچھے مڑ کر دیکھتے بھی تو کس کیلئے؟ زندگی جن رشتوں سے عبارت ہے وہ ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے تھے۔ مجبوراً راجپوتوں کو ہلاکت و بربادی سے اپنا ناتا جوڑنا پڑا۔ وہ دیوانہ وار سلطان کے بڑھتے ہوئے لشکر پر حملے کر رہے تھے۔

جنگ صرف جذبوں سے نہیں' عقل و ہوش سے بھی لڑی جاتی ہے۔ دشمن پر فتح حاصل کرنے کیلئے شجاعت و مردانگی ہی نہیں' بہترین منصوبہ بندی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر راجپوت اس صلاحیت سے محروم ہو چکے تھے۔ ان کی تلواریں فضا میں لہرا رہی تھیں لیکن وحشت و جنون کے سبب اکثر وار خالی جا رہے تھے۔ راجہ رتن سنگھ کو یقین ہو گیا تھا کہ "سورج پول" پر یہ معرکہ آرائی زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکے گی۔ اس لئے وہ اپنے چند معتمد سرداروں کے ساتھ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا رہا۔ رانی پدمنی کا بھتیجا گورا بادل جوشِ جوانی میں بے قابو ہو گیا۔ رتن سنگھ نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر خون کی حدت گورا بادل کو اڑائے لئے جا رہی تھی۔ وہ برق رفتاری کے انداز میں آگے بڑھا اور راجپوت سپاہیوں کی اگلی صفوں میں نمودار ہوا۔ گورا بادل کی بھی بس ایک ہی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح علاءالدین تک پہنچ جائے اور پھر خلجی حکمراں کو دست بدست جنگ کیلئے للکارے۔ اسی دھن میں یہ نوخیز راجپوت زادہ قلعے سے باہر نکلا اپنی شمشیر زنی کے بھرپور جوہر دکھاتے ہوئے کئی مسلمان سپاہیوں کو تہہ تیغ کیا مگر جب موت آئی تو اس طرح کہ علاءالدین کے ایک جانباز نے گورا بادل کے جسم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ عہدِ شباب کے متوالے نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ سلطان کے تیغ زن کس قدر جہاندیدہ ہیں اور سپہ گری کے فن میں کیسی مہارت رکھتے ہیں؟

چتوڑ کی تاریخِ آزادی کا ایک ایک ورق بکھرتا جا رہا تھا۔ راجہ رتن سنگھ قربان گاہ کے احاطے کے قریب پہنچا تو آگ کے شعلے پوری طرح بھڑک چکے تھے اور تیز ہوا نے انہیں بہت زیادہ منتشر کر دیا تھا۔ تپش اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ پچاس پچاس گز تک کسی انسان کا ٹھہرنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ لوہے کا دروازہ پگھل کر دہکتی ہوئی آگ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ راجہ رتن سنگھ نے حسرت زدہ نظروں سے مندر کی بلند دیواروں کو دیکھا جو شعلوں کی تمازت اور دھوئیں کی کثرت سے سیاہ ہو چکی تھیں۔ "اب ہم صحن میں داخل بھی نہیں ہو سکتے۔" رتن سنگھ تھکے تھکے لہجے میں اپنے سرداروں سے مخاطب ہوا۔

"نہیں سمراٹ! بہت دیر ہو چکی۔" سردار بلرام سنگھ کی آواز سے انتہائی تلخی کا اظہار ہو رہا تھا۔ "اور یہ سب کچھ آپ کی وجہ سے ہوا۔ ہمیں اسی وقت احاطے میں داخل ہو جانا چاہئے تھا۔"

"یہ تاخیر بہت ضروری تھی بلرام سنگھ۔" راجپوت سمراٹ نے اپنے سردار کے لہجے کی سرکشی کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "اگر ہم ایسا نہ کرتے تو کوئی راجپوت دشمن سے مقابلے کیلئے آمادہ نہ ہوتا۔"

"چتوڑ کا انجام کچھ بھی ہو مگر یہ تاخیر ہمیں زندگی کی آخری سانس تک خون کے آنسو رلائے گی۔" بلرام سنگھ اپنے دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے چیخا۔

"ہوش سے کام لو اور کوئی تدبیر سوچو۔" رتن سنگھ نے صبر وضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "ابھی سورج پول پر جنگ جاری ہوگی اور دشمن کو یہاں تک پہنچنے میں کئی گھنٹے درکار ہوں گے۔ وقت کی اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔"

بلرام سنگھ سنبھل گیا۔ تمام سرداروں کے ذہن تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ رتن سنگھ شدید اضطراب کے عالم میں مندر کے گرد کئی چکر کاٹ چکا تھا لیکن ہر بار اس کے چہرے پر مایوسیوں کے سائے ابھر کر ڈوب جاتے تھے۔ بلرام سنگھ نے گھبرا کر دیوار پر کمند ڈالی مگر آگ کی لپٹوں نے ریشم کی رسی کو دوسرے ہی لمحہ جلا ڈالا۔ بلرام سنگھ بھاگ کر دوسری دیوار کی طرف گیا۔ وہاں شعلوں کی لپک کسی قدر کم نظر آ رہی تھی۔ کمند آگ کے اثرات سے محفوظ رہی، بلرام سنگھ نے خوشی میں نعرہ بلند کیا۔ "جے ماتا کی" اور دیوار پر چڑھنے لگا۔

رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت سردار بھی اچانک بہت زیادہ مطمئن نظر آنے لگے تھے مگر اس وقت ان کی مایوسیوں کی انتہا نہ رہی جب بلرام سنگھ نے ایک ہاتھ سے دیوار کی منڈیر کو پکڑنے کی کوشش کی۔ دیوار کے پتھر لوہے کے ٹکڑوں کی طرح تپ گئے تھے۔ بلرام سنگھ اس آفتِ ناگہانی کو برداشت نہ کر سکا اور توازن کھو بیٹھا کمند اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ دیوار اور زمین کے فرش کا فاصلہ زیادہ تھا۔ اس لئے بلرام سنگھ کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ فطرتاً بہادر تھا، تکلیف برداشت کر گیا مگر اب وہ کسی سہارے کے بغیر چلنے سے معذور ہو گیا تھا۔ اپنے ایک ساتھی کا حشر دیکھ کر راجہ رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں کی آخری امید بھی دھوئیں کے گہرے بادلوں میں ڈوب گئی تھی۔ ابھی وہ سب کے سب شعلوں میں گھرے ہوئے مندر کے طلائی گنبد کو یاس بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ چند بدحواس سپاہی رتن سنگھ کے قریب آئے اور سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے اترے ہوئے چہرے بھی دھوئیں کے ہم رنگ ہو گئے تھے۔

"خاموش کیوں ہو؟ کیا تمہاری زبانوں کو فالج نے کھا لیا؟" رتن سنگھ چپ کھڑے ہوئے سپاہیوں پر برس اٹھا۔

"سمراٹ! آپ کے غلام "سورج پول" کی حفاظت نہ کر سکے۔" ایک سپاہی نے لرزتے ہوئے یہ المناک خبر سنائی۔ "ہر قدم پر راجپوت ویروں نے شتروؤں کو روکنے کیلئے اپنے شریروں کی باڑھ لگا دی مگر علاءالدین کی سینا انہیں بھی پار کر گئی۔"

"بزدلو! واپس جاؤ اور ایک ایک انچ زمین کیلئے لڑو۔" رتن سنگھ نے غضب ناک لہجے میں اپنے سپاہیوں کو حکم دیا لیکن راجپوت سردار دیکھ رہے تھے کہ ان کے فرمانروا کے قدموں کی لرزش نمایاں ہو چکی تھی۔ سپاہی گردنیں جھکائے ہوئے لوٹ گئے اور رتن سنگھ اپنے سرداروں کے ہمراہ ایک خفیہ تہہ خانے کی طرف بڑھا۔ بلرام سنگھ کو دو سردار سہارا دیئے ہوئے تھے اور چتوڑ کا حکمراں طبقہ اپنی جان بچانے کیلئے آخری پناہ گاہ ڈھونڈ رہا تھا۔

☆..................☆..................☆

وہ 26 راگست 1303ء (محرم 703ھ) کا ایک یادگار دن تھا جب دوپہر کے بعد سلطان علاءالدین خلجی کا لشکر اس قلعے میں داخل ہوا جسے بڑے بڑے فوجی دانشور ناقابلِ تسخیر قرار دیتے آئے تھے اور جس کے بارے میں خوش گمان راجپوتوں کا خیال تھا کہ آسمان کو چھو لینا ممکن ہے مگر کوئی دشمن چتوڑ کی بلند دیواروں تک نہیں پہنچ سکتا۔ (مسلمان مورخوں کی روایت کے مطابق چھ ماہ اور ہندو تاریخ نویسوں کی رائے میں مسلسل آٹھ ماہ کے تھکا دینے والے محاصرے کے بعد علاءالدین نے چتوڑ کا ایک ایک اعزاز چھین

کر اسے اپنے قدموں تلے روند ڈالا) آج تمام بلندیاں پستیوں میں بدل گئی تھیں اور سارے آہنی دعوے کسی نازک شیشے کے ٹکڑوں کی طرح ٹوٹ کر ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔

علاءالدین خلجی حضرت امیر خسروؒ کے ساتھ اس مصنوعی پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا تھا جہاں ہشام اسدی نے منجنیقیں نصب کر کے قلعے کی سنگی دیواروں کو گھاس کے تنکوں کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ "خسروؒ! ہمارے جانبازوں کو دیکھ رہے ہو کہ کیسی سرمستی کے عالم میں آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ آج انہیں روکنے والا کوئی نہیں اور ان سرفروشوں کو کیسے روکا جا سکتا ہے کہ یہ سب کے سب حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے غلام ہیں۔" علاءالدین فتح کا یہ ناقابلِ یقین منظر دیکھ کر بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں نمی سی جھلکنے لگی تھی۔ "خسروؒ! حضرت شیخ کی دعاؤں نے علاءالدین کو شرم رسوائی سے بچا لیا ورنہ آج تمہارا سلطان اپنے سینے پر ناکامی کے زخم سجائے کسی گوشے میں پڑا لوگوں کے طعنے سن رہا ہوتا۔ وہ کیسا اذیت ناک وقت ہوتا خسرو! جب ہمارا شوقِ تسخیر ایک دیوانے کا خواب بن جاتا۔ ہم نے کیسے پرہول صحرا میں اپنے لشکروں کو جھونک دیا تھا۔ خدا کی پناہ! خدا کی پناہ!" جوشِ اضطراب میں علاءالدین نے حضرت امیر خسروؒ کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ "خسرو! ہم تمہارے شکر گزار ہیں کہ تم نے حضرت شیخ کی بارگاہ میں ہماری درخواست پیش کی۔"

امیر خسروؒ کی عجیب کیفیت تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور آپ خاموش کھڑے اس راستے کی طرف دیکھ رہے تھے جس سے گزر کر سلطان کا لشکر یہاں تک پہنچا تھا۔

"خسرو! ہمارے پاس حضرت شیخ کا شکریہ ادا کرنے کیلئے الفاظ نہیں ہیں۔ خدا نے ہمیں سیم وزر کے اتنے انبار دیئے ہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا بادشاہ بھی دولت میں ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا مگر جب ہم نظام الدین اولیاؒ کو کوئی نذر پیش کرنا چاہتے ہیں تو یہ سارے خزانے بڑے حقیر نظر آنے لگتے ہیں اور ہم اچانک شہنشاہ سے ایک غریب و مفلس انسان بن جاتے ہیں جس کا دامن دریدہ ہوتا ہے اور ہاتھ خالی نظر آتے ہیں۔"

"شیخ کے حضور یہی انکسار سب سے بڑی نذر ہے۔" حضرت امیر خسروؒ نے انتہائی ذہانت سے سلطان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "جب تک آپ کے یہ جذبات برقرار رہیں گے، حضرت شیخ کی دعاؤں کی سعادت بھی حاصل رہے گی۔"

"خسروؒ! ایسا ہی ہوگا۔" علاءالدین کا لہجہ اثر انگیز تھا جیسے یہ اس کے دل کی آواز ہو۔

اچانک ملک نصرت خان گھوڑے پر سوار، پہاڑی کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ سلطان نے امیر خسروؒ کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور اپنے مصاحب خاص کی جانب دیکھا۔ نصرت خان بار بار اپنی شمشیر کو فضا میں لہرا رہا تھا۔ پھر وہ پہاڑی کے نیچے آ کر ٹھہر گیا اور بلند آواز میں بولا مگر فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب علاءالدین اس کی گفتگو کو سمجھ نہیں سکا۔

"ہم آ رہے ہیں نصرت خان.........!" سلطان نے جواباً کہا اور ہاتھ کے اشارے سے نصرت خان کو نیچے ٹھہرنے کیلئے کہا۔ حفاظتی دستے اپنی اپنی جگہ ہوشیار و مستعد ہو گئے اور علاءالدین اپنے جاں نثاروں کی دورویہ قطاروں کے درمیان سے گزرتا ہوا پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ ابھی سلطان کے قدم ہموار زمین کو چھو بھی نہیں سکے تھے کہ ملک نصرت خان احتراماً جھک گیا۔

"اٹھو نصرت خان! ہمیں اپنا چہرہ دکھاؤ کہ تم کڑی آزمائش کے میدان سے سرخرو لوٹے ہو۔" علاءالدین نے اپنے جانباز سپہ سالار کو پرجوش آواز میں پکارا۔

ملک نصرت خان سیدھا ہوا اور اس نے اپنی شمشیر کو نیام سے نکال کر سلطان کے قدموں میں رکھتے ہوئے کہا۔ "سلطان کے جاہ و جلال کا سایہ پورے چتوڑ پر چھا گیا۔ شاہ کے دستِ کشور کشا نے غلاموں کو جو شمشیریں عنایت کی تھیں وہ سب کی سب دشمنوں کے خون سے سرخ ہو گئیں۔ کسی سرکش و نافرمان کی گردن اس کے کاندھوں پر قائم نہیں رہی اور راجپوتوں کے جتنے سر بھی نظر آ رہے ہیں وہ سلطان کی دہشت سے جھکے ہوئے ہیں۔ انہیں امان دیدی گئی ہے کہ وہ فاتحِ عالم کے رحم کی بھیک مانگ رہے تھے۔" ملک نصرت خان نے محاذِ جنگ کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"اور وہ مغرور عورت کہاں ہے ملک؟" سلطان نے بے چین ہو کر رانی پدمنی کے متعلق سوال کیا۔

"ابھی کچھ خبر نہیں سلطان معظم!" ملک نصرت خان نے جواباً عرض کیا۔ "ہر طرف آگ ہی آگ ہے۔ اشہنشاہ کے نمک خوار معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

ایک لمحے کیلئے علاءالدین اداس نظر آنے لگا مگر اس نے فوراً ہی اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔ "اور خواجہ حاجی کہاں ہے؟ عراقی اور ظفر خان کیا کر رہے ہیں؟" سلطان نے اپنے تینوں سپہ سالاروں کے بارے میں دریافت کیا۔

"شاہ کا ہر غلام اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔" ملک نصرت خان نے اطلاعاً کہا۔

"انہیں ہماری طرف سے اس عظیم الشان فتح پر مبارکباد دو اور ان سے کہو کہ وہ احتیاط کے ساتھ آگے بڑھیں۔ اگر ان کے جسموں پر کوئی زخم آیا تو شاہ والا اسے اپنے دل پر محسوس کریں گے۔" سلطان نے ملک نصرت خان کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "تم سب ہمارے دست و بازو ہو اور ہم کسی بھی صورت میں یہ برداشت نہیں کریں گے کہ ہمارا ایک ہاتھ کٹ جائے۔ ملک! ان تینوں کو ہمارا حکم پہنچا دو کہ ان کی جانیں ہمارے لئے چتوڑ کی فتح سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ اگر انہوں نے اپنی سلامتی کی طرف سے غفلت برتی تو بہت جلد ہم ان سے ایک ایک کوتاہی کا حساب لیں گے۔"

ملک نصرت خان اپنے سلطان کی اس کرم نوازی پر بے قرار ہو گیا اس نے آگے بڑھ کر علاءالدین کے ہاتھوں کو بوسہ دیا قبائے شاہی کو کئی بار آنکھوں سے ملا اور تیزی کے ساتھ قلعے کی طرف چلا گیا۔

سلطان اپنے خیمے میں واپس پہنچا تو رام دیو ہاتھ باندھے دروازے پر کھڑا تھا۔ علاءالدین کو دیکھتے ہی زمین بوس ہو گیا۔ "تیرا علم سچا ہے رام دیو۔" علاءالدین نے اس شعبدہ باز کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تیری پیش گوئی پوری ہو گئی۔"

"سمراٹوں کے سمراٹ! ابھی کیا ہوا ہے۔" رام دیو سلطان کے قدموں پر مچلنے لگا۔ "میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ابھی تو اس زمین پر بڑے بڑے حشر اٹھیں گے، انسانی خون کے بڑے سیلاب آئیں گے اور پھر سلطان کا پرچم دنیا پر لہرا جائے گا۔"

"اسے ہمارے خیمے میں بھیج دو۔" علاءالدین نے اپنے محافظ سپاہیوں کو حکم دیا اور خود تیزی سے اندر چلا گیا۔ رام دیو زمین سے اٹھا اور سلطان کی قربت سے شرف یاب ہونے کیلئے آگے بڑھنے لگا۔ حضرت امیر خسروؒ نے اس عیار انسان کو انتہائی ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہہ سکے کہ انہیں علاءالدین کے مزاج کا بخوبی اندازہ تھا۔ خوشامد پسندی سلطان کی فطرت میں شامل تھی اور رام دیو اس کی اس کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔

☆..........................☆..........................☆

علی عامر آفریدی بیرونی دنیا سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ اُسے سلطانی لشکر کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی مگر وہ جنگ کے نتائج سے بے خبر تھا۔ چندر سنگھ کے قتل ہو جانے کے بعد ایک امکانی رابطہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ وہ شدید بے کسی کے عالم میں روزانہ آسمان کی طرف دیکھتا اور اپنے پیدا کرنے والے کو پکارتا۔ "اے خدا! ہمیں اس جبر کے زنداں سے نکال کہ اب ان طلسمی دیواروں میں تیرے مجبور بندوں کا دم گھٹا جاتا ہے۔"

نرملا کماری جو آفریدی سے زیادہ غمزدہ تھی، ان حوصلہ شکن لمحات میں اسے تسلیاں دیتی۔ "سردار! دنیا کا ہر قید خانہ اس لئے بنایا جاتا ہے کہ ایک دن اس کی دیواریں گر جائیں اور قیدی آزاد فضاؤں میں سانس لے سکیں۔"

علی عامر آفریدی چند لمحوں کیلئے شرمسار سا نظر آنے لگتا اور پھر نرملا کے دلکش چہرے کو دیکھ کر بے اختیار کہہ اٹھتا۔ "اگر تم میرے ساتھ ہو تو دنیا کی ساری آزادیاں اس قید پر قربان کر دوں مگر مجھے والدہ محترمہ کی اذیتوں کا خیال آتا ہے کہ بیٹے کی جدائی نے ان کا کیا حال بنا دیا ہو گا؟ آخر وہ ماں ہیں.......... اور پھر عالیہ بہت یاد آتی ہے جب میں نے اسے ہانسی روانہ کیا تھا تو وہ اس طرح روئی تھی جیسے مجھ سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو رہی ہو اور وہ خواب نرملا! بڑے بھیانک خواب ہیں جو مجھے ہر وقت ڈراتے رہتے ہیں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا کہ آبرومندانہ موت ہر مسلمان کی تمنا ہوتی ہے لیکن ملک کافور کا تصور مجھے چین سے سونے نہیں دیتا۔ کون جانے اس غیرت فروش اور بزدل دشمن نے میرے پیچھے کیا گل کھلائے ہوں؟ میں تو ہر وقت لرزتا ہی رہتا ہوں۔ میرے غم کو کوئی نہیں سمجھ سکتا نرملا! کوئی نہیں سمجھ سکتا۔" یہ کہتے کہتے آفریدی کسی وحشت زدہ انسان کی مانند نظر آنے لگتا۔ اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا اور آنکھوں سے نفرت و غضب کی چنگاریاں پھوٹنے لگتیں۔

"میں ان دونوں کیلئے دعا کرتی ہوں سردار!" نرملا رونے لگتی۔ "دن رات اپنے خدا سے ان کیلئے سلامتی مانگتی ہوں۔ میں نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا۔ اب وہی تو میری سسکتی ہوئی تمنا کی تسکین کا ایک ذریعہ ہیں۔"

نرملا کی غمگساری کا یہ انداز دیکھ کر آفریدی بھی اشکبار ہو جاتا۔ "ہاں نرملا! تم ضرور دعا مانگا کرو۔ ہمارا کیا ہے کہ ہم تو پیدائشی مسلمان ہیں مگر تم اپنا سب کچھ چھوڑ کر حلقہ اسلام میں داخل ہوئی ہو۔ تمہارے جذبے ہم سے زیادہ سچے اور معصوم ہیں، اس لئے خدا تمہاری زیادہ سنے گا۔"

اسی کربناک فضا میں چھ ماہ گزر چکے تھے لیکن آج جب علی عامر آفریدی طلسم کدے کے باغ میں آ کر حسب عادت آسمان کی طرف دیکھنے لگا تو اسے ہر طرف دھواں ہی دھواں نظر آیا پھر اس نے بڑی وارفتگی کے عالم میں چیختے ہوئے نرملا کو اطلاع دی۔ "میرا سلطان آ پہنچا اور اس نے رتن سنگھ کے غرور کو خاک میں ملا دیا۔"

آفریدی بدحواسوں کی طرح نرملا کو کھینچتا ہوا باغ میں لایا اور سیاہ دھوئیں کے بادلوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ "میرے سلطان کی آتشِ جلال نے بت پرستوں کے نشیمن کو پھونک ڈالا۔ پتھر کے پجاری چند گز کی بلندی پر اپنے آشیانے کے چار تنکے سجا کر دعوے کر رہے تھے کہ بجلیاں انہیں چھو بھی نہیں سکتیں۔ افسوس! نادانوں کے انجام پر جنہیں کوئی بتانے والا نہیں تھا کہ برق ہمیشہ آسمان سے ٹوٹتی ہے اور آسمان کے آگے دنیا کی ہر بلندی ہیچ ہے۔"

علی عامر آفریدی رقص کے سے انداز میں اپنے جذبۂ مسرت کا اظہار کر رہا تھا اور نرملا کماری کی

خوبصورت آنکھیں دھویں کو دیکھتے دیکھتے پتھرا کر رہ گئی تھیں اس کا سرخ و سفید پیکر ایک زرد رنگ اور بے جان مجسمے میں ڈھل گیا تھا۔ "یہ میرا گھر جل رہا ہے سردار!" اچانک نرملا کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔ "میری قوم' میرا وطن' میری گلیاں' میرے پنگھٹ' میرے بچپن اور جوانی کی یادیں' میری سہیلیاں' آج ہر شے کو آگ لگ گئی۔ کچھ بھی نہیں بچے گا۔" یہ کہہ کر نرملا نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور سر کو ایک درخت سے ٹیک دیا۔ "مجھے سہارا دو آفریدی! میں اپنی زندگی کی آخری آزمائش سے گزر رہی ہوں۔"

آفریدی گھبرا کر آگے بڑھا اور اس نے نرملا کو اپنے توانا بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ اب علی عامر کو احساس ہو رہا تھا کہ جو لمحہ اس کیلئے ناقابل بیان خوشی لے کر آیا تھا' اسی لمحے نے نرملا کے ہوش و حواس چھین لئے تھے۔ آفریدی اپنی اضطراری حرکت پر بہت زیادہ پشیمان نظر آ رہا تھا۔ اس نے نرملا کی دلجوئی کیلئے بے شمار تسلی آمیز کلمات کہے مگر وہ ساعت ہی بڑی جان لیوا تھی۔ بہت دیر تک نرملا پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری رہی۔

"یہ آگ سلطان کے سپاہیوں نے نہیں' خود راجپوتوں نے اپنے گھروں میں لگائی ہے۔" نرملا آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ "یہ ان کی صدیوں پرانی رسم ہے کہ شکست سے پہلے اپنے بیوی بچوں کو بھڑکتی ہوئی آگ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ آپ کو نہیں معلوم کہ ان شعلوں میں وہ لوگ جل رہے ہیں جن کا کوئی قصور نہیں۔ معصوموں اور بے گناہوں کے اس جرم کی سزا ہے کہ وہ دنیا میں کیوں آئے تھے؟"

آفریدی کے ذہن میں ایک آندھی سی چلنے لگی۔ "نرملا! مجھے اس طلسم کدے سے باہر جانا ہوگا۔ اٹھو! اور مجھے اس قید سے رہائی دو کہ طلسم کدے سے نکلنے کا راز صرف تم ہی جانتی ہو۔"

"کیا ہوا سردار؟" نرملا' آفریدی کی جنونی کیفیت دیکھ کر سہم سی گئی۔

"مجھے مہامنتری کے آخری الفاظ یاد آ رہے ہیں۔" آفریدی یکایک بہت اداس نظر آنے لگا۔ "انہوں نے رخصت ہوتے وقت کہا تھا کہ اگر سلطان چتوڑ پر غلبہ حاصل کر لے تو تم اس سے میری قوم کیلئے بہتر سلوک کی سفارش کرنا۔"

باپ کا ذکر سن کر نرملا کے جذبات کی دنیا ایک بار پھر زیر و زبر ہوگئی۔ ایک لمحے میں آنکھوں کے سامنے کئی زمانے آئے اور گزر گئے۔

"نرملا! یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔" آفریدی نے تیز آواز میں کہا۔

نرملا نے اپنے دل پر بڑا جبر کیا اور سنبھلنے کی کوشش کرنے لگی۔ "اس ہنگامہ خیزی میں آپ کہاں جائیں گے؟ کسی کو اپنی جان کا بھی ہوش نہیں ہوگا۔ کون جانے کہ راجپوت قلعے سے نکلنے والے ہیں یا سلطان کے سپاہی اندر داخل ہو چکے ہیں' اس عالم میں آپ کو کون پہچانے گا؟ پہلے آگ کو بجھ جانے دیجئے پھر پتہ چلے گا کہ کیا بچا ہے اور کیا کیا جل گیا ہے؟ میں آپ کو ان شعلوں کے درمیان سے گزر کر نہیں جانے دوں گی۔" نرملا صدموں سے نڈھال ہونے کے باوجود اٹھی اور آفریدی کا دامن سختی سے پکڑ لیا۔

☆..................☆..................☆

شام تک قلعے کے ہر گوشے پر مسلمانوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ تقریباً تیس ہزار راجپوت قیدی بنا لئے گئے تھے' ان میں جوان' بوڑھے اور بچے سبھی شامل تھے۔ ہزاروں عورتیں جل کر خاک ہو چکی تھیں اور اتنی ہی خواتین کو بھڑکتی ہوئی آگ کے حصار سے باہر نکال لیا گیا تھا۔ اس کشاکش میں سلطان کے سپاہیوں کے لباس بھی جگہ جگہ سے جل گئے تھے۔ جن عورتوں کو موت کے منہ سے کھینچا گیا تھا ان کے چہرے بری طرح جھلس گئے

تھے اور وہ تکلیف کی شدت سے دردناک آوازوں میں چیخ رہی تھیں۔ معصوم بچوں کو بھی بچانے کی کوشش کی گئی تھی مگر ان میں اکثر سوزش کی تاب نہ لا کر مر چکے تھے۔

سلطان قلعے میں داخل ہونے کیلئے بے قرار تھا مگر سپہ سالاروں کی درخواست پر اسے رک جانا پڑا۔ سپاہی ایک ایک لمحے کی خبر دے رہے تھے مگر علاء الدین کو جس اہم ترین اطلاع کا انتظار تھا وہ ابھی تک موصول نہیں ہوئی تھی۔ رانی پدمنی ماتا کے مندر میں جل کر ستی ہوگئی تھی۔ سلطان کے فوجیوں نے اس احاطے میں داخل ہونے کی بہت کوشش کی مگر وہ ناکام رہے' پدمنی کے ساتھ راجہ رتن سنگھ بھی غائب تھا۔ شام کے سائے آہستہ آہستہ زمین پر اترنے لگے تھے' اندھیرا پھیل جانے کے خیال سے علاء الدین کے سپاہیوں نے راجپوت سمراٹ کی جستجو کا کام تیز تر کر دیا تھا لیکن ابھی تک رتن سنگھ کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔

"میں جانتا ہوں سلطان کہ وہ بزدل حکمراں اس وقت کہاں ہوگا؟" علاء الدین کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے رام دیو آگے بڑھا۔ "اس نے راج محل کے کسی خفیہ تہہ خانے میں پناہ ڈھونڈی ہوگی مگر وہ زیادہ دیر تک فاتح عالم کی دسترس سے دور نہیں رہ سکتا۔"

علاء الدین نے فوراً رام دیو کو اشارہ کیا کہ وہ سپاہیوں کے ہمراہ جا کر رتن سنگھ کو تلاش کرے مگر اس عیار شعبدہ باز نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "رات کے اندھیرے میں ہماری تمام دوڑ دھوپ رائیگاں جائے گی۔"

"اور اگر وہ اس تاریکی سے فائدہ اٹھا کر غائب ہوگیا؟" علاء الدین نے اپنا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"سلطانِ معظم کے جاں نثاروں کا محاصرہ اس قدر تنگ ہے کہ کوئی بلی بھی شاہِ والا کے حکم کے بغیر قلعے سے باہر نہیں جا سکتی۔" ملک نصرت خان اور خواجہ حاجی نے بیک زبان کہا۔

علاء الدین کچھ سوچتا رہا اور پھر اپنے سپہ سالاروں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "محاصرہ اس قدر تنگ کر دو کہ چیونٹیاں بھی اپنے سوراخوں سے باہر نہ آ سکیں۔ تمام رات اس طرح جاگو کہ تمہاری پلک تک جھپکنے نہ پائے۔ ہم رتن سنگھ کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔"

وہ رات اہل چتوڑ کیلئے آہوں اور سسکیوں کی رات تھی۔ آخر جب مرنے والے مر گئے تو فریاد و فغاں کا ایک طوفان اٹھا اور پھر آہستہ آہستہ ڈوب گیا' چھ ماہ کے محاصرے میں یہاں کے باشندے روز جیتے تھے اور روز مرتے تھے۔ انہیں اپنی آخری موت کا انتظار تھا اور جب وہ موت بھی آ گئی تو خوف و دہشت کا عذاب ختم ہوگیا۔ وسوسوں اور اندیشوں کا ایسا عذاب جو حقیقی موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔

علاء الدین نے اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ فوجیوں کی بڑی تعداد راجپوت قیدیوں کی نگرانی کر رہی تھی جنہیں کئی بڑے خیموں میں محصور کر دیا گیا تھا۔ کچھ سپاہی راجپوت خواتین کی نگہبانی پر مامور تھے۔ ان میں وہ عورتیں بھی شامل تھیں جنہیں آگ کے شعلوں سے بچا لیا گیا تھا۔ سلطان کے حکم پر جھلسی ہوئی عورتوں اور بچوں کو طبی امداد بھی فراہم کی جا رہی تھی۔ ایک دستہ ان ماہر شمشیر زنوں کا تھا جو قلعے کے چاروں طرف پہرے داروں کی حیثیت سے متعین کئے گئے تھے تاکہ راجہ رتن سنگھ اپنے سرداروں کے ساتھ فرار نہ ہو سکے۔

علاء الدین ایک تاریخی فتح حاصل کرنے کے باوجود بہت زیادہ بے چین نظر آ رہا تھا۔ چتوڑ پر فوج کشی کے کئی سیاسی اسباب تھے سلطان چاہتا تھا کہ پورا ہندوستان مکمل طور پر اس کے حلقۂ اثر میں شامل ہو جائے۔ اسی

مقصد کے پیش نظر علاءالدین نے اپنے وفادار سپہ سالاروں کو ہندوستان کے دور دراز گوشوں میں بھیجا تھا اور یہ سلطان کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے جاں نثاروں نے حق غلامی ادا کرتے ہوئے بڑی خونریز جنگیں لڑی تھیں۔ نتیجۃً ہندوستان کے ایسے علاقوں پر بھی علاءالدین کا مکمل قبضہ ہو گیا تھا جن کی تسخیر کے خواب دیکھتے دیکھتے کئی مسلمان حکمراں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان مقبوضہ خطوں میں بنگال، سندھ، گجرات، مالوہ، پنجاب اور کشمیر نمایاں تھے۔ جنوبی ہندوستان کی فتوحات اور شمالی علاقے پر خلجی حکومت کے اثرات اسی وقت قائم رہ سکتے تھے جب چتوڑ کی آزادی سلب کر کے اسے غلامی کی ناقابلِ شکست زنجیر پہنا دی جائے۔ یہاں سے گزر کر تجارتی راستے گجرات، مالوہ، وسط ہند اور سندھ کی طرف جاتے تھے۔ اس لئے تجارتی نقطۂ نظر سے بھی چتوڑ پر غلبہ حاصل کرنا ضروری ہو گیا تھا اور جہاں تک چتوڑ کی فوجی اہمیت کا سوال ہے تو اس پر پرچم لہرائے بغیر تسخیرِ ہندوستان کا خواب دیکھنا محض حماقت تھی۔ اپنے اسی خواب کی تعبیر پانے کیلئے علاءالدین خلجی نے اس دشوار گزار گھاٹی کا انتخاب کیا تھا جسے ہم "وادیٔ فنا" بھی کہہ سکتے ہیں۔

علاءالدین عجیب و غریب فطرت کا انسان تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے دشمن سے الجھنے کیلئے ناقابلِ بیان بہانے تراشتا تھا۔ راجہ رتن سنگھ ہی نہیں خود سلطان کے سپاہی بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ علاءالدین صرف ایک عورت کیلئے انتہائی پیچیدہ بازی کھیل رہا ہے مگر یہ راز چند لوگوں کو معلوم تھا کہ علاءالدین کی نظریں کہیں اور تھیں، نشانہ کہیں اور۔

آج سلطان کے تمام تیر نشانے پر بیٹھ گئے تھے لیکن وہ پھر بھی بے قرار اور بجھا بجھا نظر آ رہا تھا۔ یہ اداسی اور بے چینی محض اس لئے تھی کہ وہ مکمل فتح حاصل کرنے کے باوجود رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ کو لڑکھڑاتے قدموں سے اپنی بارگاہ میں داخل ہوتے نہیں دیکھ سکا تھا۔ پھر جب سلطان کا اضطراب حد سے بڑھا تو اس نے رام دیو کو اپنے خیمے میں طلب کرتے ہوئے کہا۔ "تو نے پچیس سال پہلے ہماری آمد اور فتح کی پیش گوئی کی تھی مگر آج ہم پوچھتے ہیں کہ پدمنی اور رتن سنگھ کے بارے میں تیرا علم کیا کہتا ہے؟"

رام دیو فوراً اپنی بوسیدہ کتاب لے کر حاضر ہوا۔ شکستہ اوراق میں کچھ دیکھتا رہا اور پھر کاغذ پر زائچہ کھینچنے کے بعد بولا۔ "فاتح عالم! ستاروں کی رفتار بتا رہی ہے کہ پدمنی آگ کے شعلوں میں جل کر دوسری دنیا کی طرف جا چکی۔ رتن سنگھ اپنی ایک خفیہ پناہ گاہ میں زندہ ہے جو کل کسی وقت ایک قیدی کی حیثیت سے آپ کے سامنے حاضر ہو جائے گا۔"

"پدمنی چلی گئی؟ ہماری اجازت کے بغیر۔" علاءالدین کا لہجہ قہرناک تھا مگر اس میں پوشیدہ شکست کے آثار کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔ "آج تک ایسا نہیں ہوا رام دیو! کیا ستاروں کی چالیں بدلی نہیں جا سکتیں۔"

"اے سنسار کے وجیتا! ستاروں کی چال کو پرماتما کے سوا کون بدل سکتا ہے؟" رام دیو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہاں! آسمان کے فیصلوں کو بدلا نہیں جا سکتا۔" علاءالدین نے اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔ "پھر بھی ہم نے اس پر زندگی کے دروازے تو بند کر دیئے۔ جو ہماری بارگاہ میں حاضر نہیں ہو سکتا اس سے جینے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہے۔" علاءالدین کے لہجے میں دولت و اقتدار کی بڑی خوفناک آگ تھی جس کی لپٹیں دیکھ کر رام دیو لرزنے لگا۔

چند لمحوں تک سلطان خاموشی سے خیمے کی چھت کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ دوبارہ رام دیو سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کیا دہلی کے سفیر نے پدمنی تک ہمارا حکم نہیں پہنچایا تھا کہ وہ سلطان کے شبستان میں داخل ہو کر پورے ہندوستان پر حکمرانی کرے۔" علاءالدین نے غیر ارادی طور پر علی عامر آفریدی کا ذکر چھیڑ دیا

تھا۔ "رتن سنگھ کہتا تھا کہ ہمارا کوئی سفیر چتوڑ کے دربار میں داخل نہیں ہوا۔"

آفریدی کا ذکر سن کر رام دیو ایک لمحے کیلئے سناٹے میں آ گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس کا عیار ذہن نئی کروٹ بدل چکا تھا۔ "رتن سنگھ جھوٹ بولتا ہے فاتح عالم!" رام دیو کا لہجہ انتہا سے زیادہ خوشامدانہ تھا۔ "وہ نوجوان سفیر چتوڑ آیا تھا اور اس نے آپ کا فرمانِ خاص بھی چتوڑ کے حکمرانوں تک پہنچا دیا تھا۔"

علاءالدین یک بیک مضطرب سا نظر آنے لگا۔ "آفریدی یہاں آیا تھا؟" سلطان نے چونک کر پوچھا۔ "پھر وہ کہاں چلا گیا؟ ہم بہت دن تک دہلی میں اس کا انتظار کرتے رہے مگر جب کوئی اطلاع نہیں ملی تو ہم نے اپنی فوجوں کو یلغار کا حکم دیا کہ جن معاملات میں تحریر اثر انداز نہیں ہوتی ہم اس کا فیصلہ شمشیر سے کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر علاءالدین جواب طلب نظروں سے رام دیو کی طرف دیکھنے لگا۔

رام دیو کیلئے یہی ایک موقع تھا جب وہ آفریدی کی طرف سے سلطان کے دل میں نفرتوں کا غبار بھر سکتا تھا۔ "فاتح عالم کے تمام فیصلے دانشمندانہ سہی مگر دل کی سفارت کیلئے بلند کردار انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاید سلطان نے اس بے شرم نوجوان پر کچھ زیادہ ہی اعتبار کر لیا تھا۔" رام دیو نے شک کی زمین میں فتنہ انگیزی کا پہلا بیج بوتے ہوئے کہا۔

علاءالدین کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ "ہماری آنکھیں اتنا بڑا دھوکا کھا سکتی ہیں؟"

"سلطانِ زمانہ! اس حقیر غلام کی زبان حقیقت کا اظہار کرنے سے عاجز ہے۔" رام دیو لرزنے لگا۔

"کہہ دے کہ جو کچھ تجھے کہنا ہے کہ اس میں تیرا کوئی قصور نہیں۔" علاءالدین کی تیز آواز اس طرح گونجی کہ رات کے سناٹے بھی کانپنے لگے۔

"میں نے اپنی زندگی میں اتنا بدکردار، نمک حرام اور بے وفا شخص نہیں دیکھا سلطان!" رام دیو نے علی عامر آفریدی کے بارے میں زہر اگلنا شروع کر دیا۔ "اس نے شاہ والا کی اعلیٰ ظرفی کے قصیدے پڑھنے کے بجائے ایسی غلیظ باتیں اپنی زبان سے ادا کیں کہ خلجی حکومت کی عظمتوں کا فلک بوس محل کسی غریب کی کچی جھونپڑی سے بھی زیادہ کمتر نظر آنے لگا۔"

علاءالدین کے چہرے کا رنگ آہستہ آہستہ بدلنے لگا مگر اس کے ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوئی۔ بس قہر رنگ آنکھوں کی جنبش سے رام دیو کو بیان جاری رکھنے کا حکم دے کر ہمہ تن گوش ہو گیا۔

رام دیو نے سر جھکا لیا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہنے لگا۔ "اس نے آپ کا خط دینے سے پہلے رانی پدمنی کو تنبیہہ کی تھی کہ سلطان حرفِ انکار سننے کا عادی نہیں۔ جو عورت علاءالدین کے جذبات کا احترام نہیں کرتی اسے جبراً شبستان شاہی میں داخل کر لیا جاتا ہے اور ایسی عورتوں سے دہلی کے محلات بھرے ہوئے ہیں۔" رام دیو کا لہجہ اس قدر سرد تھا جیسے کوئی سانپ اپنے شکار کو ڈس رہا ہو۔

علاءالدین کے دل و دماغ جلنے لگے تھے۔ "اور اس ناشکر گزار آفریدی نے کیا کہا تھا؟"

رام دیو کی گردن بدستور جھکی رہی۔ "اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ جب سلطان اپنے حقیقی چچا کا سر کاٹ کر گلی گلی پھرا سکتا ہے تو انکار کی صورت میں پدمنی بھی کوچہ بہ کوچہ کسی طوائف کی طرح نچائی جا سکتی ہے۔" یہ کہہ کر رام دیو نے ایک نظر سلطان کی طرف دیکھا۔

علاءالدین کے غصے کی آگ بھڑک کر بے قابو ہو گئی تھی۔ "احسان فراموش نے گستاخی کی انتہا کر دی۔"

رام دیو کا مقصد پورا ہو چکا تھا لیکن پھر بھی اس نے پگھلے ہوئے لوہے پر آخری ضرب لگا کر اسے اپنی مرضی کے مطابق موڑنے کی کوشش کی۔ "اگر وہ نافرمان سفیر شاہ والا پر یہ تہمت نہ تراشتا تو بہت ممکن تھا کہ پدمنی،

سلطان کے حرم میں داخل ہونے پر آمادہ ہوجاتی لیکن ایک خاندانی عورت داشتہ کی حیثیت سے زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔ یہی وہ اندیشے تھے جس نے پدمنی کو آپ سے ہمیشہ کیلئے بدظن کر دیا ورنہ کون ایسی خاتون ہے جو ملکۂ ہند کا تاج پہننا نہیں چاہتی۔ " رام دیو' علاءالدین کے سینے میں بھڑکتی ہوئی نفرتوں کی آگ کو عجیب عجیب انداز سے ہوا دے رہا تھا۔

"تیرا مطلب ہے کہ اس بدکار آفریدی کی غلط سفارت نے ہمارے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔ " علاءالدین کے لہجے سے انگارے برس رہے تھے۔

"یقیناً فاتح عالم! " رام دیو نے اپنا سر زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اٹھ' کہ سجدہ گزاری کا وقت نہیں ہے۔ " علاءالدین نے رام دیو کے سر پر ہلکی سی ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ اپنا مذہب بیچ دینے والا عیار برہمن سیدھا ہوگیا۔ "ہمیں بتا کہ ہمارے وقار کے پیرہن کو داغدار کرنے کے بعد وہ بدنہاد کہاں چلا گیا ؟ "

"رانی پدمنی اس گستاخ و بے ادب سفیر کو قتل کرا دینا چاہتی تھی مگر ریاست کا مہامنتری وکرم سنگھ ایک ہوشمند انسان تھا۔ اس نے سیاسی تقاضوں کے پیش نظر آفریدی کو چتوڑ کے حکمرانوں کے قہر و غضب سے بچا لیا اور اپنے گھر لے گیا۔ " رام دیو انتہائی جھوٹ کی آمیزش کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات سنانے لگا۔ "وکرم سنگھ نے سلطان کے سفیر کو محض اس لئے بچایا تھا کہ وہ دہلی واپس جانا نہیں چاہتا تھا اسے آپ سے شدید نفرت تھی۔ اس نے کئی بار رانی پدمنی سے سیاسی پناہ حاصل کرنے کی درخواست بھی کی تھی۔ وکرم سنگھ بھی آپ کا بدترین دشمن تھا اور فاتح عالم کو سرِ دربار گالیاں دیا کرتا تھا۔ مہامنتری ہی نے رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ آفریدی کی جان بخش دیں اور اس کے صلے میں شاہی سفیر حکومت خلجی کے کئی اہم فوجی راز ظاہر کر دے گا۔ رانی پدمنی کا غصہ کسی حد تک زائل ہوچکا تھا اور وہ آفریدی کی درخواست پر ابھی غور ہی کر رہی تھی کہ ایک عبرتناک واقعے نے حالات کا رخ موڑ دیا۔ آپ کا وہ نامہ بر صرف احسان فراموش ہی نہیں بلکہ ایک بدکردار نوجوان بھی تھا۔ اس نے وکرم سنگھ کی آوارہ مزاج بیٹی نرملا کو ورغلایا اور پھر ایک دن وہ دونوں رات کی تاریکی میں "منتری بھون " سے فرار ہوگئے۔ وکرم سنگھ رانی پدمنی کا حقیقی چچا تھا۔ ریاست کا ہر فرد اسے احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ مگر اس واقعے نے چوہان راجپوتوں کی آبرو کو مٹی میں ملا دیا۔ وکرم سنگھ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکا اور بالآخر ایک روز اس نے خودکشی کر لی۔"

علاءالدین کے ذہن میں نفرت و قہر کی آندھیاں سی اٹھ رہی تھیں لیکن اس نے اپنے سفیر کی بے راہ روی کے افسانے کو پورے تحمل کے ساتھ سنتے ہوئے کہا۔ "کیا چتوڑ کا حفاظتی نظام اس قدر ناقص ہے کہ دو مجرم عاشق اتنی آسانی کے ساتھ فرار ہوسکتے ہیں ؟ "

"ریاست کے سرحدی انتظامات تو اپنی جگہ درست تھے لیکن چتوڑ کی بعض رازدار شخصیتوں کا خیال ہے کہ وکرم سنگھ کے محل میں کوئی خفیہ سرنگ موجود ہے اسی سرنگ کے ذریعے وہ دونوں فرار ہوئے ہیں۔ " رام دیو نے اپنی من گھڑت کہانی میں نئی رنگ آمیزی کرتے ہوئے کہا۔

"کیا رتن سنگھ اور پدمنی نے ان دونوں کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی ؟ " علاءالدین نے ایک اور سوال کیا۔

رام دیو چند لمحوں کیلئے خاموش ہوگیا پھر اسے مجبوراً سچ بولنا پڑا۔ "رتن سنگھ نے آفریدی اور نرملا کی جستجو میں "منتری بھون " کو آگ لگا دی مگر اس سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوا۔ سرنگ کا کوئی سراغ نہیں ملا اس

طرح اہل چتوڑ کو یقین کر لینا پڑا کہ دونوں ریاست کی سرحدوں سے بہت دور جا چکے ہیں۔ "

علاءالدین کی پیشانی لکیروں سے بھر گئی تھی اور اس کا چہرہ سرخ لوہے کی طرح تپنے لگا تھا۔ یکایک سلطان نے ہاتھ کے اشارے سے رام دیو کو نکل جانے کیلئے کہا اور پھر خلوت ہوتے ہی اس کے ذہن میں ملک کافور کے الفاظ ابھرنے لگے۔ سلطان کے محبوب غلام نے کہا تھا۔ "آفریدی' شاہ والا کو محسن جلال الدین خلجی کا قاتل کہتا ہے اور ایک قاتل کے سایۂ اقتدار میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ اسی لئے اس نے اپنی ماں اور بہن کو ہانسی روانہ کر دیا ہے کہ موقع ملتے ہی انہیں بھی چتوڑ بلا لے اور سلطان کی حدودِ مملکت سے دور چلا جائے۔ " رام دیو اور ملک کافور کے بیانات میں ایک بات مشترک تھی کہ آفریدی علاءالدین خلجی کو محسن کش سمجھتا ہے اور اس کے اقتدار کو غاصبانہ قرار دیتا ہے۔ سلطان کو رام دیو کے بیان پر اعتبار آگیا کہ وہ سیکڑوں میل دور رہتے ہوئے بھی اسی بات کو دہرا رہا تھا جو ملک کافور نے "قصر ہزار ستون" کے شاہی عشرت کدے میں کہی تھی۔ حالانکہ چتوڑ کے منافق جادوگر نے اس مشہور واقعے کی طرف اشارہ کیا تھا جس سے ہندوستان کی اکثریت باخبر تھی۔ جب علاءالدین نے اپنے چچا کے کٹے ہوئے سر کو اودھ کی گلی گلی میں پھرایا تھا تو چتوڑ کے حکمران اس واقعے کو کس طرح فراموش کر سکتے تھے۔ رام دیو نے علاءالدین کی سفاکی کے اسی افسانے کو آفریدی سے منسوب کر دیا تھا تاکہ شاہی سفیر سلطان کی نظروں سے گر جائے اور اس طرح اس کا انتقامی جذبہ تسکین پا سکے۔ اب یہ آفریدی کی بدنصیبی تھی کہ وہ سفارت کی اعلیٰ ترین مثال قائم کرنے کے باوجود علاءالدین کی نفرتوں کا ہدف بن گیا۔

سلطان اپنے خیمے میں تنہا تھا اور شدید عالم غضب میں بول رہا تھا۔ "ہم نے تجھے زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچایا مگر تیری نمک حرام فطرت نے ہماری نوازشات کی قدر نہ کی۔ اب تو سمجھتا ہے کہ چتوڑ سے فرار ہوکر ہمارے حلقۂ اثر سے نکل جائے گا۔ نہیں! خدا کی قسم! ہرگز نہیں۔ ہم رتن سنگھ کے نخفیئے سے نجات حاصل کر لیں۔ پھر تجھے دیکھیں گے کہ تو کہاں تک بھاگ سکتا ہے ؟ اور کچھ دن اپنی مجرمانہ سانسیں پوری کر لے۔ احسان فراموشی اور ناشکر گزاری کے مجرموں کو سلطان کے دستِ قہر سے کوئی نہیں بچا سکتا۔"

☆..................☆..................☆

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی علاءالدین نے رام دیو کو طلب کیا۔ اس دوران سلطان کے تمام سپہ سالار بھی خیمے میں حاضر ہوچکے تھے۔ "کیا مرنے والے راجپوت سپاہیوں کے چہرے دیکھ لئے گئے ؟ " علاءالدین نے ملک نصرت خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سلطان معظم کے حکم سے پہلے ہی ایک ایک لاش کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔ " ملک نصرت خان نے جواباً عرض کیا۔ "مرنے والوں میں رتن سنگھ موجود نہیں ہے۔ "

"پھر رام دیو کا خیال درست ہے۔ " سلطان نے اس غدار برہمن کی طرف دیکھا جو علاءالدین کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنے ملک و قوم کی آخری نشانی بھی فروخت کر دینا چاہتا تھا۔ "ملک نصرت! تم رام دیو کے ساتھ اس خفیہ سرنگ کی تلاشی لو جہاں رتن سنگھ کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے۔ مگر اس طرح کہ تمہیں کوئی گزند نہ پہنچے۔ نہایت ہوشیاری کے ساتھ کہ وہ پہاڑی چوہا اپنے سوراخ میں شیر بننے کی کوشش کرے گا۔ تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈال دینا۔ "

ملک نصرت خان نے گھٹنوں کے بل جھک کر سلطان کی قبائے زر نگار کو بوسہ دیا اور ماہر شمشیر زنوں کا ایک دستہ لے کر قلعے کی جانب روانہ ہوگیا۔ خواجہ حاجی کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے سپاہیوں کے ہمراہ ملک

نصرت خان کے قریب رہے۔ سلطان کی یہ پیش بندی اس لئے تھی کہ اگر رتن سنگھ فوجیوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ روپوش ہو گیا تو پھر سخت مقابلے کا اندیشہ تھا اور اس نازک موقع پر ملک نصرت خان کو تازہ کمک کی ضرورت محسوس ہو سکتی تھی۔ تاج الدین عراقی اور ملک ظفر خان کو ہدایت دی گئی کہ وہ قلعے کے ساتوں دروازوں پر مزید فوجی دستے متعین کر دیں کہ رتن سنگھ کیلئے کھلے راستوں سے فرار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ آخری احکام جاری کرنے کے بعد سلطان اپنے خیمے میں واپس آ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ رانی پدمنی کے جل کر ہلاک ہونے، رتن سنگھ کی روپوشی اور علی عامر آفریدی کی غداری کے تصورات نے اسے رات بھر سونے نہیں دیا تھا۔

رام دیو ملک نصرت خان کے ہمراہ قلعے کے مختلف پیچ و خم سے گزرتا ہوا رانی پدمنی کی خواب گاہ تک پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ملک نصرت خان کے توانا سپاہیوں نے بھاری گرزوں کی ضرب سے دروازہ توڑ دیا۔ ملکۂ کہسار کی خواب گاہ اگرچہ بے حد قیمتی چیزوں سے آراستہ تھی لیکن ملک نصرت خان نے کسی شے کو نظر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی۔ اسے علاء الدین خلجی جیسے شہنشاہ کی خواب گاہ دیکھنے کے مواقع میسر آتے رہے تھے، اس لئے رانی پدمنی کا راحت کدہ خلجی سردار کو متاثر نہ کر سکا۔ وہ بے نیازانہ آگے بڑھتا رہا۔ رام دیو پدمنی کی خواب گاہ سے نکل کر ایک اور آراستہ کمرے میں پہنچا۔ یہ راجہ رتن سنگھ کا عشرت خانہ تھا جہاں شراب نوشی کے قیمتی برتنوں کے علاوہ دلکش عورتوں کے کچھ مجسمے بھی نصب تھے جنہیں ملک نصرت خان نے حیرت سے دیکھا۔ بے حیائی کے یہ پیکر آج تک خلجی سردار کی نظروں سے نہیں گزرے تھے۔ رام دیو نے تیز قدموں سے اس کمرے کو عبور کر لیا اور پھر وہ ملحقہ کمرے میں پہنچا جہاں رتن سنگھ کے آباؤ اجداد کی بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں۔

"ابھی ہمیں اور کتنے مرحلوں سے گزرنا پڑے گا؟" ملک نصرت خان نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بس سردار! ہم اپنی منزل تک پہنچ گئے۔" رام دیو نے خوشامد کے انداز میں کہا اور سامنے کی دیوار کو دیکھنے لگا جس پر ایک شیر کا حنوط شدہ سر آویزاں تھا۔ رام دیو کچھ دیر تک اس سر کو مختلف زاویوں سے دیکھتا رہا۔ پھر مسرت آمیز لہجے میں چیختے ہوئے بولا۔ "میرا اندازہ درست نکلا۔ رتن سنگھ اس راستے سے اپنے خفیہ تہہ خانے میں داخل ہوا ہے۔ یہ پناہ گاہ میرے ہی مشورے پر تعمیر کی گئی تھی۔"

"اپنی لاف زنی بند کر کہ ہمارے پاس ان فضول باتوں کے سننے کیلئے وقت نہیں ہے۔" ملک نصرت خان نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں سردار! یہ کوئی عام راستہ نہیں ہے۔" رام دیو ملک نصرت خان کی تلخ کلامی پر جھنجلا اٹھا تھا۔ مگر اسے مجبوریوں کا یہ زہر اپنے حلق سے اتارنا پڑا۔ "میں نے یہ تہہ خانہ سات ستاروں اور سات دنوں کے حساب سے تعمیر کرایا تھا۔ اس میں ایک مخصوص طلسم پوشیدہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس طلسم سے واقف نہیں تو زندگی بھر بھٹکتا رہے گا اور راجہ رتن سنگھ کا ہلکا سا سراغ تک نہ پا سکے گا۔"

یہ کہہ کر رام دیو نے دیوار پر آویزاں شیر کے سر کو اتارنے کی کوشش کی مگر وہ ایک پستہ قد انسان تھا۔ اس لئے اس کے ہاتھ ہدف تک نہ پہنچ سکے۔ رام دیو پلٹا اور ملک نصرت خان سے کہنے لگا۔ "سردار! آپ پوری طاقت سے اس درندے کے سر کو کھینچ کر الگ کر دیجئے۔"

ملک نصرت خان نے اپنی دراز قامتی سے فائدہ اٹھایا مگر وہ سر کو دیوار سے علیحدہ نہ کر سکا۔

"اسے دائیں جانب گھمائیں یہاں تک کہ سر الٹا ہو جائے۔" رام دیو نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

ملک نصرت خان نے ایسا ہی کیا۔ شیر کا سر آسانی کے ساتھ گھوم گیا۔ "اب اسے بائیں جانب گردش دیں۔" رام دیو نے دوسری ہدایت دی۔

ملک نصرت خان نے تیزی سے اس شعبدہ باز کی ہدایت پر عمل کیا، شیر کا سر گھومتے گھومتے ایک خاص نقطے پر ٹھہر گیا۔ اس سر کے گرد چار بڑے بڑے قیمتی پتھر یاقوت، زمرد، پکھراج اور نیلم جڑے ہوئے تھے۔ یاقوت اور پکھراج دائرے میں تھے اور زمرد اور نیلم دوسرے دائرے میں نصب کئے گئے تھے۔ جب شیر کا سر گردش کرتے کرتے نیلم کے قریب پہنچا تو رام دیو نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "بس سردار! اب اسے اپنی طرف کھینچ لیجئے۔ طلسم کے تقاضے پورے ہو گئے۔"

ملک نصرت خان نے رام دیو کی ہدایت کے مطابق سر کو کھینچا اور وہ آسانی کے ساتھ اس کے ہاتھوں میں آ گیا۔ اب وہاں چار میخیں نظر آ رہی تھیں سونے، چاندی، تانبے اور لوہے کی بنی ہوئی میخیں۔

"اب ان میخوں پر ترتیب کے ساتھ ضرب لگائیں۔" رام دیو نے نئی ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

ملک نصرت خان نے اپنے ایک سپاہی سے وزنی گرز لے کر پہلے سونے، پھر چاندی، تانبے اور آخر میں لوہے کی میخ پر بھرپور ضربیں لگائیں۔ ملک نصرت خان کا خیال تھا کہ ان ضربوں کے بعد اس دیوار میں کوئی شگاف پیدا ہو جائے گا مگر جب اس قسم کے آثار ظاہر نہیں ہوئے تو شاہی سپہ سالار نے سوالیہ نظروں سے رام دیو کی طرف دیکھا۔

رام دیو بہت غور سے مختلف دھاتوں کی ان ابھری ہوئی میخوں کو دیکھ رہا تھا جو ملک نصرت خان کی زوردار ضربوں کے بعد دیوار کی سطح کے برابر ہموار نظر آنے لگی تھیں۔

"آفرین ہے سردار!" رام دیو نے ملک نصرت خان کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کے بازوؤں کی طاقت بے مثال ہے۔ آپ کی ایک ہی ضرب نے ان میخوں کو اس نقطے تک پہنچا دیا جو اس طلسم کی حقیقی کنجی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ رتن سنگھ کے طاقتور ترین سپاہی بھی کئی ضربوں میں اس سطح کو ہموار کرتے تھے۔"

ملک نصرت خان حیرت زدہ سا کھڑا تھا۔ "اب ہمیں کیا کرنا ہو گا؟"

اس کے ہونٹوں کو اس طرح جنبش ہوئی جیسے وہ خود بھی رام دیو کے طلسم کا ایک حصہ بن گیا ہو۔

رام دیو نے کوئی جواب نہیں دیا اور رتن سنگھ کے باپ سمر سنگھ کی تصویر کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ تصویر اپنے طول و عرض میں اتنی بڑی تھی کہ اس کا ایک حصہ فرش پر تھا اور دوسرا حصہ کمرے کی چھت سے ٹکرا رہا تھا۔ رام دیو نے تصویر کا جائزہ لیا۔ وہ ایک طرف سے کچھ جھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ "یقیناً راجہ رتن سنگھ تہہ خانے کے اندر موجود ہے۔" رام دیو نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تہہ خانہ گھبراہٹ میں بند کیا گیا ہے، اس لئے یہ تصویر اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے۔"

پھر رام دیو کی ہدایت پر کئی سپاہیوں نے تصویر کو کھینچ کر الگ کیا تو ملک نصرت خان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ تصویر کے پیچھے دیوار میں اتنا بڑا شگاف نمایاں ہو گیا تھا جس سے ایک آدمی بآسانی گزر کر اندر جا سکتا تھا۔ "یہی وہ راستہ ہے جو ہمیں رتن سنگھ کی آخری پناہ گاہ تک لے جائے گا۔"

ملک نصرت خان کچھ دیر تک اس طلسم کو دیکھتا رہا جو اپنی ساخت کے اعتبار سے بہت مشکل اور پیچیدہ نظر آ رہا تھا۔ اگر اس سلسلے میں رام دیو رہنمائی نہ کرتا تو رتن سنگھ پر قابو پانا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔ ابھی ملک نصرت خان اپنے خیالات میں گم تھا کہ رام دیو نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سردار! یہ ایک مختصر سی سرنگ ہے جسے عبور کرنے کے بعد بائیں ہاتھ پر ایک اور آہنی دروازہ نمودار

ہو گا۔ اس دروازے سے گزر کر ہم ایک طویل وعریض کمرے میں پہنچ جائیں گے جہاں رتن سنگھ تنہا ہو گا یا کچھ دوسرے راجپوت سردار بھی موجود ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے چتوڑ کے باقی ماندہ فوجی دستے اپنی حفاظت کیلئے متعین کر دیئے ہوں' اس لئے آپ احتیاط سے آگے بڑھیں۔ اپنے سپاہیوں کو آگے چلنے کا حکم دیں اور خود ان کے پیچھے رہیں۔" رام دیو نے ملک نصرت خان کو طلسم کدے کے پیچ وخم سمجھاتے ہوئے کہا۔

ملک نصرت خان نے تحقیر آمیز نظروں سے رام دیو کی طرف دیکھا۔" سلطان کے جاں نثاروں کا یہ مزاج نہیں کہ سپاہیوں کو خطرات کی آغوش میں جھونک دیں اور خود اپنے آگے حفاظتی دیوار کھڑی کر دیں۔ یہ تو راجپوت سرداروں ہی کو زیب دیتا ہے کہ پوری قوم خون میں نہا گئی اور وہ "طلسم کدے" کی پناہ ڈھونڈ رہے ہیں' سلطان عالی مقام نے اپنے غلام ملک نصرت خان کو رتن سنگھ کی گرفتاری کا حکم دیا ہے۔ اس لئے وادیٔ فنا میں سپاہیوں کی قیادت بھی وہی کرے گا۔" یہ کہہ کر ملک نصرت خان نے اپنی شمشیر کھینچی اور سپاہیوں کو بلند آواز میں پکارا۔ "تم لوگ میرے عقب میں چلتے رہو اور رام دیو کو سب سے پیچھے رکھو کہ اسے موت سے ڈر لگتا ہے۔"

سرنگ تاریک تھی۔ ملک نصرت خان کے حکم پر مشعلیں روشن کر دی گئیں۔ پھر علاء الدین کا یہ وفادار مصاحب تیغ بے نیام لے کر آگے بڑھا۔ رام دیو واقعتہً خوفزدہ تھا۔ موت کی اسی دہشت نے اسے تمام سپاہیوں سے پیچھے رکھا تھا۔ سرنگ ختم ہوئی تو رام دیو کے بیان کے مطابق بائیں ہاتھ پر ایک مضبوط آہنی دروازہ موجود تھا۔ ملک نصرت خان نے طاقت آزمائی مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ خلجی سردار چند قدم پیچھے ہٹ گیا اور ان سپاہیوں کو دروازہ توڑ دینے کا حکم دیا جو بھاری گرز اٹھائے ہوئے تھے۔ بالآخر بڑی جانفشانی کے بعد راستے کی یہ رکاوٹ دور ہوئی۔ ملک نصرت خان نے دروازے میں داخل ہو کر دیکھا۔ راجہ رتن سنگھ اپنے پچاس ساٹھ سرداروں کے ساتھ وسیع وعریض کمرے میں موجود تھا۔ دروازہ ٹوٹنے کی آواز سن کر رتن سنگھ اور اس کے ساتھی ہوشیار ہوگئے تھے مگر ان کے چہروں پر حیرت وناامیدی کی گہری پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ راجپوت سمراٹ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سلطان کے سپاہی تعاقب کرتے ہوئے اس خفیہ پناہ گاہ تک پہنچ جائیں گے جس کا علم رانی پدمنی اور رتن سنگھ کے سوا کسی تیسرے شخص کو نہیں تھا۔ پھر اس کے ذہن میں ایک برق سی لہرائی اور تصورات کے پردے پر رام دیو کا کریہہ چہرہ ابھرا مگر وقت بہت آگے جا چکا تھا۔ رتن سنگھ نے دیکھا۔ ملک نصرت خان تہہ خانے کے دروازے میں کھڑا اسے پکار رہا تھا۔

"رتن سنگھ! اگر تجھے معرکہ آرائی کا شوق ہے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ میرا ایک سپاہی بھی آگے نہیں بڑھے گا۔ یہ مقابلہ صرف تیرے اور میرے درمیان ہے۔ اگر تو مجھ پر غالب رہا تو شاہ والا کے دوسرے سپہ سالار قسمت آزمائی کریں گے۔ اگرچہ میرے ایک حکم پر تیرے جسم کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے لیکن میں تجھے موقع فراہم کرتا ہوں کہ شاید اس طرح تیری ناکام حسرتوں کا غبار کچھ کم ہو جائے۔"
راجہ رتن سنگھ نے نفرت بھری نظروں سے ملک نصرت خان کی طرف دیکھا اور گرجدار آواز میں بولا۔
"میں تیرے سلطان سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ تو میرے درجے کا انسان نہیں ہے۔"

"تو ایک حقیر سا جاگیردار تھا۔ اس تہہ خانے سے نکل کر دیکھ کہ تیری وراثت راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے۔" ملک نصرت خان نے بھی تند وتیز لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ "اگر کسی طرح تیری یہ جاگیر عتاب شاہی سے محفوظ رہتی تب بھی تو اس قابل نہ ہوتا کہ سلطان معظم کو مقابلے کیلئے پکار سکے۔ یہ الفاظ

قیصر وکسریٰ اور سکندر ودارا کے ہی شایان شان تھے کہ وہ میدانِ کارزار میں شاہ والا کو دست بدست جنگ کرنے کیلئے آواز دیتے۔ ذلت آمیز شکست نے تجھ سے تیرے حواس چھین لئے ہیں رتن سنگھ! تو میرے منصب اور درجے کی بات کرتا ہے ؟ تجھے کیا خبر کہ فاتح عالم کے دربان بھی تجھ سے زیادہ حیثیت رکھتے ہیں اور قصر ہزار ستون میں رہنے والی کنیزیں بھی تجھ سے زیادہ شجاع اور غیرت مند ہیں۔ میں نے آج تک اتنا بے ضمیر حکمران نہیں دیکھا جو اپنی قوم کو ہلاکت کے منجدھار میں چھوڑ کر خود ساحل کی طرف فرار ہو جائے۔ گجرات کا راجہ کرن تو میدان جنگ سے بھاگا تھا مگر تو نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر پشت دکھا دی۔ اور اب موت تیرے سر پر منڈلانے لگی تو سلطان سے مقابلہ کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہے..........." یہ کہہ کر ملک نصرت خان آگے بڑھا۔ "اپنی شمشیر اٹھا اور مجھ پر وار کر! پھر تجھے اندازہ ہو جائے گا کہ علاء الدین کے چاروں طرف جاں نثاروں کا کیسا حصار قائم ہے۔" رتن سنگھ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا مگر اس کی تلوار نیچے کی جانب جھکی ہوئی تھی۔ باقی تمام راجپوت سرداروں کا بھی یہی حال تھا۔ شدتِ غضب سے ان کے دل ودماغ جل رہے تھے لیکن کسی میں ملک نصرت خان سے مقابلے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی آزادیاں ختم ہو چکی ہیں اور شرمناک غلامی آہنی زنجیر لئے ہوئے ہر طرف رقص کر رہی ہے۔

ملک نصرت خان ہر خوف سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ رتن سنگھ کے قریب جا کر ٹھہر گیا۔ اس دوران علاء الدین کے سپاہی زیر زمین کمرے میں داخل ہوتے رہے اور راجپوت سرداروں کے گرد اپنا حصار قائم کرتے رہے۔ سب سے آخر میں رام دیو اندر پہنچا اسے دیکھتے ہی رتن سنگھ بدحواس ہو گیا۔

"وہ گھر کا بھیدی تو ہی تھا جس نے راجپوتوں کی لنکا کو ڈھا دیا۔ نمک حرام بہروپیئے! تجھ پر دیوتاؤں کی لعنت ہو۔" یہ کہہ کر رتن سنگھ نے رام دیو پر جھپٹنے کی کوشش کی مگر نصرت خان کی تلوار نے راجپوت سمراٹ کا راستہ روک لیا۔

"رتن سنگھ! وہ دن یاد کر جب تو نے میرے گیان کی توہین کی تھی' میری ریاضتوں کو جھٹلایا تھا اور چتوڑ کے ذلیل پجاریوں کو مجھ پر فوقیت دی تھی..........." رام دیو کے منہ سے کف اڑ رہا تھا اور زبان سے شعلے چھوٹ رہے تھے......... "آج میں نے اپنی تمام رسوائیوں کا انتقام لے لیا اور رام دیو کا انتقام اتنا ہی خوفناک ہوتا ہے۔ تیرے جھوٹے اقتدار کی یہ لنکا اسی قابل تھی کہ فاتح عالم کی ایک ہی ٹھوکر اسے ڈھا کر رکھ دے۔ یہ پتھر کی بے جان مورتیاں میرا کیا بگاڑیں گی کہ میں تو ہمیشہ سے دیوتاؤں کا باغی تھا۔ اب میں ایک خدا کا نام لیوا ہوں' سلطان علاء الدین خلجی کا ادنیٰ غلام......... میں نے شاہ سے وعدہ کیا تھا کہ جس طلسم کو میں نے اپنی ذہانت سے تیار کیا تھا وہ ایک دن میرے ہی ہاتھوں برباد ہو گا۔ ملک نصرت خان! میرے بھائی! میں نے اپنا وعدہ وفا کر دیا۔ اب تم آگے بڑھو اور چوڑیاں پہن کر تہہ خانے میں روپوش ہو جانے والی ان لونڈیوں کو شاہ والا کے حضور کھینچتے ہوئے لے جاؤ۔"

"ایسا ہی ہو گا رام دیو! واقعتہً تو بڑا گیانی ہے۔" ملک نصرت خان نے پیچھے مڑے بغیر کہا۔ اس کی تلوار سینے سے گزر کر راجہ رتن سنگھ کے حلقوم تک پہنچ گئی تھی۔

ذلت آمیز شکست اور رام دیو کی غداری کے احساس نے رتن سنگھ کے جسم پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ اسے ہر حال میں زندہ رہنے کی خواہش تھی اور اسی خواہش نے رتن سنگھ سے راجپوتوں کی روایتی شجاعت' غیرت' مردانگی' غرض سب کچھ چھین لیا تھا۔

"اگر تم لوگ اپنی شمشیروں کی آبرو برقرار نہیں رکھ سکتے تو انہیں زمین پر پھینک دو کہ اسی میں تمہارے

لئے سلامتی ہے۔ ” ملک نصرت خان نے سخت لہجے میں راجہ رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

چتوڑ کا شکست خوردہ حکمران چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا اور پھر اس نے اپنی تلوار پھینک دی۔ راجپوت سرداروں نے بھی اپنے فرمانروا کی تقلید کی اور ان شمشیروں کو فرش پر پھینک دیا جو ایک سربلند قوم کی عظمت کی نشان تھیں۔ مگر آج گردش وقت نے اس نشان کو دھندلا کرتے کرتے ذلت ورسوائی کی نہ مٹنے والی یادگار میں تبدیل کر دیا تھا۔ کج کلاہوں کے سر جھک گئے اور صدیوں کے غرور نے لمحوں کے آگے اپنی پیشانیاں ٹیک دیں۔

ملک نصرت خان نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ وہ تمام تلواریں جمع کر لیں اور چتوڑ کے حکمراں کو زنجیریں پہنچا دیں۔ سپاہی اپنے امیرِ لشکر کا حکم سن کر آگے بڑھے تو رتن سنگھ بلند آواز میں ملک نصرت خان سے مخاطب ہوا۔

” بے شک! میں نے اپنی شکست تسلیم کر لی مگر اس کا لحاظ رہے کہ میں ریاست کا فرمانروا ہوں۔ میرے ساتھ عام قیدیوں جیسا سلوک نہ کر کہ میں بہرحال سمراٹ رتن سنگھ چوہان ہوں۔ ”

ملک نصرت خان کے ہونٹوں پر طنز آمیز ہنسی ابھر آئی۔ ”رتن سنگھ تیری اسی گمراہ سوچ نے تجھے یہ برے دن دکھائے ہیں۔ آدمی اس وقت تک بڑا کہلاتا ہے جب تک وہ آزاد رہے اور فتوحات اس کے قدم چومتی رہیں۔ اگر میں تجھے زنجیروں کے بجائے ہیروں اور جواہرات سے مرصع کنگن بھی پہنا دوں تو کیا فرق پڑے گا۔ تو غلام ہے اور غلام ہی رہے گا۔ بڑائی تو وہ ہوتی کہ ہم تیرا سر کاٹ کر اپنے شہنشاہ کے حضور لے جا رہے ہوتے تو پھر ساری دنیا پکار اٹھتی کہ وہ آ رہا ہے سمراٹ رتن سنگھ چوہان۔ ”

ملک نصرت خان کے الفاظ کی ضرب بہت شدید تھی مگر رتن سنگھ صرف کانپ کر رہ گیا۔ زندگی کی بھیک مانگنے والے اس کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ نصرت خان چاہتا تو رتن سنگھ کو زنجیروں میں جکڑ کر علاءالدین کے سامنے لے جاتا لیکن یہ شرمناک منظر دیکھ کر اس کے جسم میں بھی کچھ دیر کیلئے سنسنی سی دوڑ گئی۔ عبرت کا مقام تھا' اس لئے ملک نصرت خان نے رتن سنگھ کی خواہش کا احترام کیا اور والئی چتوڑ کے ہاتھوں کو کھلا رہنے دیا۔ باقی تمام سرداروں کو زنجیریں پہنا دی گئیں۔

پھر کچھ برق رفتار سواروں نے علاءالدین کو اس کی زندگی کی یہ ناقابل فراموش خوشخبری سنائی کہ رتن سنگھ کو ایک قیدی کی حیثیت سے سلطان کے حضور لایا جا رہا ہے۔ فرمانروائے ہند جوشِ اضطراب میں کھڑا ہو گیا۔ سپاہیوں کو انعام واکرام سے نوازا اور پھر اپنے ایک محافظ کو حکم دیا کہ سپہ سالار ہری سنگھ کو اسی وقت شاہ کے خیمے میں لایا جائے۔

ہری سنگھ سر سے پاؤں تک زخمی تھا مگر سلطان کے خصوصی معالج مولانا بدرالدین دمشقی کی غیر معمولی توجہ کے باعث وہ دو آدمیوں کے سہارے چند قدم چل سکتا تھا جب اسے سلطان کے روبرو لایا گیا تو وہ بہت اداس تھا۔

”ہری سنگھ! ہم نے تمہیں اس لئے طلب کیا ہے کہ اپنی آنکھوں سے اس مغرور حکمراں کا حشر دیکھ سکو جس نے تم جیسے سورماؤں کے قیمتی خون کو بڑی ناقدری اور ارزانی کے ساتھ زمین پر بہا دیا۔ ”

ہری سنگھ کچھ دیر تک انتہائی تکلیف دہ سکوت کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ”سلطان میں نے پہلے ہی درخواست کی تھی کہ میرے کاندھوں سے اس جھکے ہوئے سر کا بوجھ کم کر دیا جائے مگر نہ جانے کیوں آپ مجھ سے انتقام لے رہے ہیں۔ یہ بہادروں کی شان نہیں ہوتی شہنشاہ!

میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ ”

”نہیں ہری سنگھ! ہم تمہیں ذلیل نہیں کر رہے ہیں۔ ” سلطان' راجپوت سپہ سالار کی بات سن کر مضطرب ہو گیا۔ ”ہم رتن سنگھ کو بتانا چاہتے ہیں کہ وہ راجپوت نسل کا نمائندہ نہیں۔ راجپوت ایسے ہوتے ہیں جیسے تم ہو۔ ہم تمہیں کھونا نہیں چاہتے ہری سنگھ! تم ہمارے قریب آ کر تو دیکھو کہ ہم بہادروں کے کیسے قدرداں ہیں؟ تمہارا وہی منصب رہے گا بلکہ اختیارات اور بڑھا دیئے جائیں گے۔ کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ تمہیں شکست خوردہ یا غلام کہہ کر پکار سکے۔ تم اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ہمارے مفادات کی حفاظت کرو گے۔ بس یہی تمہارا فریضہ ہو گا۔ اس کے سوا ہم کچھ نہیں چاہتے۔ ایک بار اپنی زبان سے کہہ دو کہ تم ہمارے ہو۔ ”

ہری سنگھ نے مغموم نظروں سے علاءالدین کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی جھلکنے لگی تھی۔

” سلطان! میں چتوڑ کے سوا کسی کا نہیں لیکن آپ کا شکر گزار ضرور ہوں۔ بے شک! آپ سورماؤں کے سورما ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا بہادر انسان آج تک نہیں دیکھا۔ زمین و آسمان گواہ رہیں کہ میں دنیا کے اس مردِ شجاع کو سلام کر رہا ہوں جس کا نام سلطان علاءالدین خلجی ہے۔ ” یہ کہہ کر ہری سنگھ نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس حرکت سے اس کے زخم کھل گئے اور وہ بڑے کرب میں مبتلا ہو گیا تھا۔

”پوری تاریخ چتوڑ جانتی ہے کہ ہری سنگھ نے اس انداز میں رتن سنگھ کو بھی سلام نہیں کیا۔ ”

”اس میں کوئی شبہ نہیں ہری سنگھ! کوئی شبہ نہیں۔ ہم تمہاری اسی ادا کے عاشق ہیں۔ ” علاءالدین جیسے آہنی اعصاب کا انسان بھی جذباتی نظر آنے لگا تھا۔

”بس اب مجھے جانے دیجئے سلطان! ” ہری سنگھ نے دونوں ہاتھ سیدھے کرتے ہوئے کہا۔ ”میں رتن سنگھ کی رسوائی کا منظر نہیں دیکھ سکوں گا۔ آخر وہ میرا سمراٹ ہے۔ ”

”تم اس حالت میں کہاں جاؤ گے ہری سنگھ؟ ” علاءالدین نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”اگر تم ہماری بخشش قبول نہیں کرتے تو اتنے دن ٹھہر جاؤ کہ تمہارے یہ زخم بھر جائیں۔ ”

”نہیں سلطان! ” ہری سنگھ نے ایک بار پھر سر جھکا لیا تھا۔ ”اگر سارا عالم بھی تیمارداری کرے تو کیا ہو گا؟ روح پر جو زخم کھائے ہیں وہ کبھی نہیں بھریں گے۔ ”

سلطان مایوس ہو گیا۔ وہ ہری سنگھ جیسے انسان کو کسی قیمت پر نہیں روک سکتا تھا۔ ”آخر تم جاؤ گے کہاں؟ ” علاءالدین نے اداس لہجے میں راجپوت سپہ سالار سے دریافت کیا۔

”میں فی الحال کوہ آبو کے ایک مندر میں جانا چاہتا ہوں۔ مائی بھان متی سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کیلئے۔ ” ہری سنگھ کی آواز سے اچانک ایک نیا درد جھلکنے لگا تھا۔ ”اگرچہ میں نے اس عظیم عورت کو کبھی غلط نہیں سمجھا لیکن میرا قصور یہ ہے کہ میں نے اس کی پارسائی پر گواہی نہیں دی۔ شاید دیوتاؤں نے مجھے اسی لئے زندہ رکھا ہے کہ میں اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کر سکوں۔ ”

”یہ مائی بھان متی کون ہے؟ ” علاءالدین نے حیران ہو کر پوچھا۔

”مائی کے بارے میں چتوڑ کے رہنے والے آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔ ” ہری سنگھ نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ ”میرے نزدیک وہ ایک پارسا عورت ہے۔ جس پر بڑے ستم ڈھائے گئے ہیں افسوس! میں اپنے دورِ اقتدار میں اس مظلوم خاتون کیلئے کچھ نہ کر سکا۔ سلطان! یہ آپ کا آخری احسان ہو گا کہ مجھ اپاہج کو اپنے سپاہیوں کے ذریعے اس مندر تک پہنچوا دیں جہاں بھان متی رہتی ہے۔ ”

علاءالدین کچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ راجپوت سپہ سالار کو شاہی

رتھ میں بٹھا کر اس مقام تک پہنچا دیں جہاں وہ جانا چاہتا ہے۔ ہری سنگھ نے فوجی انداز میں سر کو خم کیا اور اپنے پیروں کو گھسیٹتا ہوا خیمے سے باہر جانے لگا۔

شاہی رتھ میں بیٹھنے سے پہلے ہری سنگھ کو یکایک کوئی بات یاد آ گئی اس نے گھبرا کر سپاہیوں سے کہا۔ "مجھے چند لمحوں کیلئے سلطان کے پاس لے چلو۔" پھر جب وہ مڑا تو علاءالدین کو خیمے کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ "ہم راجپوت سورما کو الوداع کہنے آئے ہیں ہری سنگھ!" سلطان مسکرایا مگر اس کی ہنسی ہری سنگھ کے جسم کی طرح زخمی تھی۔

"ایشور! سلطان کی فتوحات میں مزید اضافہ کرے۔" ہری سنگھ اپنی پذیرائی کا یہ انداز دیکھ کر رونے لگا۔ "سلطان سے آخری التجا ہے کہ میرے بچوں کو اس ذلت آمیز فرار کی خبر نہ ہو۔ اگر وہ زندہ بچ گئے ہوں تو انہیں یقین دلا دیجئے گا کہ ان کا باپ میدان جنگ میں مارا گیا۔"

"اور تمہاری بیوی کہاں ہے ہری سنگھ؟" سلطان کی آواز سے ایک خلش سی ظاہر ہو رہی تھی۔

"وہ خوش نصیب تھی سلطان کہ چتوڑ کا زوال دیکھنے سے ایک سال پہلے مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔" یہ کہہ کر ہری سنگھ مڑا اور سپاہیوں کا سہارا لے کر رتھ میں بیٹھنے لگا۔

"ہم تمہیں ہمیشہ یاد رکھیں گے ہری سنگھ کہ چتوڑ کے میدانوں میں ایک مرد سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مرد جسے ہم نے چند لمحوں کیلئے پایا اور پھر کھو دیا۔"

ہری سنگھ نے اشکبار آنکھوں سے سلطان کی طرف دیکھا۔ راج محل سے اٹھتے ہوئے دھوئیں پر ایک نظر ڈالی اور سر جھکا لیا۔ علاءالدین اس وقت تک شاہی رتھ کو دیکھتا رہا جب تک وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

سلطان ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا کہ ملک نصرت خان نے باریابی کی اجازت چاہی۔ علاءالدین کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور گہری اداسی کی جگہ ایک ناقابل بیان مسرت جھلکنے لگی۔ ملک نصرت خان آگے بڑھ کر سلطان کے سامنے زمین بوس ہو گیا۔

"سلطان عالی مقام کو تاریخ کی یہ بے مثال فتح مبارک ہو۔" ملک نصرت خان سجدے کی حالت میں بول رہا تھا۔ "چشم فلک حیران ہے کہ اس نے آج تک ایسی فتح نہیں دیکھی اور اہل زمین سر بہ گریباں ہیں کہ شاہ والا نے تمام بلندیوں کو پامال کر ڈالا۔"

"اٹھو نصرت خان کہ تم جیسے جاں نثار بھی اس مبارکباد کے مستحق ہیں۔" سلطان نے اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"رام دیو نے ہماری مکمل رہنمائی کی اور فاتح عالم کے مجرموں کو ان کے عبرتناک انجام تک پہنچا دیا۔" ملک نصرت خان سیدھا ہوا اور قبائے شاہی کو اپنی آنکھوں سے ملنے لگا۔ "رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت سردار زنجیروں میں جکڑے ہوئے خیمے کے باہر کھڑے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو ان نافرمانوں کو خدمت عالیہ میں پیش کیا جائے۔"

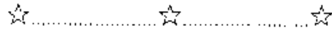
"ابھی نہیں۔" سلطان نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "ابھی ہمیں پدمنی کے بارے میں آخری خبر کا انتظار ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ جل کر ہلاک ہو گئی مگر جب تک ہمیں یقین نہیں آ جاتا اس وقت تک ہم رتن سنگھ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔ اس بدنصیب حکمراں کو تمام قیدیوں سے الگ خیمے میں رکھو اور حفاظتی اقدامات سخت تر کر دو۔"

حکم شاہی پا کر جیسے ہی ملک نصرت خان مڑا' سلطان کے ایک محافظ نے خواجہ حاجی' ملک ظفر خان اور

تاج الدین عراقی کی آمد سے مطلع کیا۔ ان تینوں سپہ سالاروں کو بھی باریابی کی اجازت دے دی گئی۔ میران لشکر ایک ایک کر کے آگے بڑھے اور زمین بوسی کی رسم کے بعد سلطان کو عظیم الشان فتح کی مبارکباد دینے لگے۔

"اور تم لوگ پدمنی کے بارے میں کیا خبر لائے؟" سلطان کی بے قراریوں کا وہی حال تھا۔

"شاہ والا کے غلام ایک ایک گوشے کی تلاشی لے رہے ہیں۔" خواجہ حاجی نے دو قدم آگے بڑھ کر عرض کیا۔ "راج محل کے چپے چپے کو چھان مارا مگر رانی پدمنی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ کچھ راجپوت عورتوں نے بتایا ہے کہ پدمنی اور چتوڑ کے دوسرے سرداروں کی بیویوں نے ماتا کے مندر میں "ستی" کی رسم ادا کی ہے۔ مندر کے چاروں طرف ہمارے سپاہی پہرہ دے رہے ہیں لیکن ابھی آگ کی تپش اتنی تیز ہے کہ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہونا ممکن نہیں۔ شعلے سرد پڑ چکے ہیں مگر انگارے دہک رہے ہیں۔ شاید ہمیں ایک دن اور انتظار کرنا ہو گا۔"



دوسرے روز جب دہکتے ہوئے انگارے سرد راکھ میں تبدیل ہو گئے تو سلطان نے رام دیو کو طلب کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں تیری وفاداریوں پر اعتبار آ گیا ہے۔ رتن سنگھ ہماری شمشیر قہر کے دائرے سے زیادہ دن دور نہیں رہ سکتا تھا۔ ہم راج محل کی بنیادیں کھود کر بھی اسے تلاش کر لیتے مگر تیری وجہ سے کام کچھ آسان ہو گیا۔ چتوڑ کے لوگ کہتے ہیں کہ پدمنی آگ میں جل کر مر گئی لیکن ہمیں یقین نہیں آتا جس طرح رتن سنگھ بھاگ جانے کی فکر میں تھا اسی طرح پدمنی بھی فرار ہو سکتی ہے۔" علاءالدین کا لہجہ انتہائی ناخوشگوار تھا۔ پدمنی کے بغیر اسے اپنی فتح نامکمل نظر آ رہی تھی۔

"میں فاتح عالم کو اس ذہنی کشمکش سے نجات دلا دوں گا۔" رام دیو نے گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ آگ میں جل کر مری ہے تو یقیناً اپنی کوئی نشانی چھوڑ گئی ہو گی۔ شاہ والا کے اس غلام کی آنکھ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ اگر اس نے فرار ہونے کی کوشش کی ہے تو میرا علم مجھے بتا دے گا کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟"

علاءالدین کا اضطراب کسی طرح کم نہیں ہوا تو وہ خود اپنے چاروں سپہ سالاروں اور رام دیو کے ہمراہ قلعے میں داخل ہو گیا۔ قدم قدم پر عبرت خیز تباہی کے منظر دکھائی دے رہے تھے۔ چتوڑ کا راج محل جو کچھ دن پہلے صناعی کا بہترین نمونہ تھا' دیکھتے ہی دیکھتے کسی ہولناک ویرانے میں بدل گیا تھا۔ بے رحم آگ نے سب کچھ پھونک ڈالا تھا۔ قیمتی اشیاء اور انسانی جانیں موت کے منہ سے اگلا ہوا نوالہ بن چکی تھیں۔ سرخ اور سنہری درودیوار کوئلے کی مانند سیاہ ہو گئے تھے اور فنکاروں کے کھینچے ہوئے دلکش نقش و نگار نے ایسی ڈراؤنی شکلیں اختیار کر لی تھیں جیسے ہر طرف بھوت پریت رقص کر رہے ہوں۔ علاءالدین کے چہرے پر خوشی کا ہلکا سا عکس تک نہیں تھا۔ سلطان نے بے شمار جنگیں لڑی تھیں مگر تباہی کا ایسا دہشت ناک منظر آج تک نہیں دیکھا تھا وہ یکایک ایک ایسی جگہ ٹھہر گیا جہاں عورتوں اور بچوں کے نیم سوختہ ڈھانچے پڑے ہوئے تھے۔

"اے بے زبان مخلوق! تیری لاشوں پر ماتم کیلئے کون آئے گا کہ تجھے خود تیرے رکھوالوں نے اس حال کو پہنچایا ہے۔ ہم نے تمہیں امان بخشی تھی مگر تم لوگ ازلی بدنصیب تھے۔ افسوس! تمہاری حالت زار پر ہزار بار افسوس!" یہ کہہ کر علاءالدین آگے بڑھ گیا۔ وہ اس وادیٔ عذاب سے بہت جلد گزر جانا چاہتا تھا۔

قلعے کی پرپیچ راہداریاں طے کرنے کے بعد فرمانروائے ہند اس طویل و عریض میدان میں پہنچا جہاں چتوڑ کے سیاسی اجتماعات ہوا کرتے تھے۔ وہاں بھی ہر طرف لاشوں کے انبار تھے۔ سلطان نے ایک نظر مردہ

راجپوتوں کے ہجوم کو دیکھا اور اس طرف متوجہ ہو گیا جدھر رام دیو اشارہ کر رہا تھا۔ "فاتح عالم! وہ ہے ماتا کا مندر جس کے احاطے میں رانی پدمنی جل کر ہلاک ہوئی ہے۔"

علاءالدین نے بڑے جذباتی انداز میں مندر کی بلند دیواروں کو دیکھا جن کے پیچھے اس کی زندگی کا ایک دلنشیں خواب آگ اور دھویں میں کھو گیا تھا۔

علاءالدین نے اطراف پر نظر ڈالی۔ ہر سمت ایک عبرتناک ویرانی برس رہی تھی۔ کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں تھا جہاں ادھ جلی لکڑیوں اور سرخ راکھ کے ڈھیر موجود نہ ہوں۔ مندر کی عمارت صحن کی سطح پر کچھ بلندی پر تعمیر کی گئی تھی۔ ہندوؤں کی اس عبادت گاہ کے دروازے میں داخل ہونے کیلئے پندرہ سیڑھیوں کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ علاءالدین نے مندر کا عقبی حصہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو ملک نصرت خان نے دست بستہ عرض کیا۔

"سلطان معظم! ہر طرف مردہ عورتوں کی راکھ اور ہڈیاں بکھری ہوئی ہیں.......... اگر شاہ والا ادھر سے گزرے تو قدم آلودہ ہو جائیں گے اور یہ کوئی نیک شگون نہیں ہو گا"۔

"شگون؟" علاءالدین کے ماتھے پر کئی لکیریں ابھر آئیں اور اس نے گردن کو ذرا سا کج کر کے اپنے بائیں جانب کھڑے ہوئے ملک نصرت خان کی طرف دیکھا۔

"ہاں! فاتح عالم! یہ کوئی اچھی فال نہیں ہے کہ خودکشی کرنے والی عورتوں کی خاک شہنشاہ کے پائے تسخیر کو چھو لے۔" ملک نصرت خان نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"نصرت خان! کیا ہندوستانی بت پرستوں کی جاہلانہ رسموں نے تیرے دل و دماغ کو بھی غبار آلود کر دیا"۔ سلطان کا لہجہ قدرے ناخوشگوار تھا۔ "تو نے تو ہماری صحبت پائی ہے.......... پھر یہ توہم پرستیاں تیرے رگ و پے میں کس طرح اتر گئیں۔ تو تو بڑا روشن خیال انسان تھا۔ پھر تجھے کیا ہوا کہ ہمیں بے جان عورتوں کی راکھ سے ڈرانے لگا۔"

ملک نصرت خان ایک لمحے کیلئے لرز کر رہ گیا اور پھر لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہنے لگا۔ "نہیں سلطان عالی مقام! میرا یہ مفہوم ہرگز نہیں تھا۔ معاذ اللہ! جس کی ٹھوکروں میں بڑے بڑے جابروں اور مغروروں کے سر رہے ہوں، اسے خاکِ پریشاں کے چند ذرے کیا متاثر کر سکتے ہیں۔ غلام تو یہ چاہتا تھا کہ قبائے شاہی پر گرد و غبار کا کوئی عکس نہ ابھر آئے"۔ ملک نصرت خان کے لہجے سے پشیمانی جھلک رہی تھی اور سر ندامت سے جھکا ہوا تھا۔

"نصرت خان! تجھے اقتدار کا فلسفہ نہیں معلوم کہ لاشوں پر سے گزرے بغیر وقار شاہی کو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔" علاءالدین اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ بول رہا تھا۔

"آج اگر چتوڑ کے راجپوت دردناک موت سے ہم آغوش نہ ہوتے تو تمہارے سلطان کو زندگی کی یہ نئی بلندیاں کس طرح حاصل ہوتیں؟ ہم اسی راکھ سے گزر کر جائیں گے پھر اہل ہند پر یہ حقیقت ظاہر ہو گی کہ جن لوگوں کے سر اور ہونٹ علاءالدین خلجی کے تلوؤں کو بوسہ نہیں دیتے ان کا یہی حشر ہوتا ہے"۔ یہ کہہ کر سلطان راکھ کے ڈھیر کو پامال کرتا ہوا مندر کے عقب میں پہنچ گیا۔ وہاں بھی کچھ ایسا ہی منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ علاءالدین نے ایک طویل چکر کاٹا۔ مندر کے چاروں طرف ایک مخصوص فاصلے پر آگ بھڑکائی گئی تھی۔ راکھ کے انبار سے گزرتے ہوئے کئی بار سلطان کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ٹھوس چیز اس کے پیروں سے ٹکرائی ہو، یہ جلنے والی عورتوں کی ہڈیاں تھیں جو خاک ہونے سے بچ گئی تھیں۔ علاءالدین کے چہرے پر عجیب رنگ ابھر کر ڈوب رہے تھے۔ پھر وہ مندر کے دروازے کے سامنے آ کر ٹھہر گیا اور رام دیو سے مخاطب

ہو کر کہنے لگا۔ "کیا اس مندر میں تو ایسا کوئی تہہ خانہ موجود نہیں جہاں پدمنی روپوش ہو سکے۔"

"نہیں سنسار کے وجیتا! چتوڑ کے کسی مندر میں کوئی خفیہ سرنگ تعمیر نہیں کی گئی ہے"۔ رام دیو نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "آپ کا یہ داس ریاست کے ایک ایک چپے سے واقف ہے۔"

علاءالدین کچھ سوچتا رہا اور پھر فکر آمیز لہجے میں بولا.......... "ہمیں یقین نہیں آتا کہ پدمنی جیسی زندگی پرست عورتیں بھی اس طرح ہنستے کھیلتے موت کو گلے لگا سکتی ہیں۔"

"یہ حقیقت ہے سلطانِ ذی حشم!" سپہ سالار خواجہ حاجی اور تاج الدین عراقی نے بیک زبان کہا۔ "قلعے سے فرار ہونے والی عورتوں نے یہی بتایا ہے کہ پدمنی راجپوت سرداروں کی بیویوں کے ساتھ مندر کے احاطے ہی میں جل کر خاک ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ جن عورتوں کو آگ سے بچا لیا گیا ہے ان کے بیانات بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔"

"مگر خواجہ! اس ضدی عورت نے "ستی" ہونے کیلئے مندر کے احاطے کا انتخاب کیوں کیا؟" علاءالدین نے اپنے سپہ سالاروں سے سوال کرتے ہوئے کہا.......... "وہ اپنی خواب گاہ میں جل کر ہلاک کیوں نہیں ہوئی؟ ہمارا مشاہدہ اور تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ جب کوئی حکمراں دنیا سے گزرتا ہے تو اقتدار کی ساری نشانیاں اپنے قریب سجا لیتا ہے، یہاں تک کہ ان ہی نشانیوں کو دیکھتے دیکھتے اس کا دم نکل جاتا ہے۔ پدمنی کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ ہمارا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا۔"

خواجہ حاجی اور تاج الدین عراقی کیا جواب دیتے؟ خاموش ہو گئے.......... مگر رام دیو بول اٹھا.......... "فاتح عالم کے اندازوں اور قیاسات کو جھٹلانے والا اس دنیا میں کوئی نہیں لیکن پدمنی بہت مغرور عورت تھی۔ اس نے راج محل کے بجائے "مندر" کا انتخاب اس لئے کیا کہ یہ دیوتاؤں کا استھان ہے جو اپنے تقدس کے سبب آراستہ کمروں اور دلکش خواب گاہوں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ پدمنی نے چتوڑ کے راجپوتوں پر اپنی برتری قائم رکھنے کیلئے مندر کے احاطے میں آگ بھڑکائی تاکہ اس کی موت بھی دوسری خواتین سے مختلف نظر آئے اور کہنے والے فخریہ طور پر یہ کہہ سکیں کہ پہاڑوں کی ملکہ نے دیوتاؤں کے قدموں میں جان دی تھی۔"

"رام دیو! تیری بیان کردہ کہانی درست ہو سکتی ہے لیکن ہم اس معاملے میں کسی پر اندھا اعتبار نہیں کر سکتے۔" علاءالدین نے اس عیار شعبدہ باز کی بات کو جھٹلاتے ہوئے کہا.......... "ہم ثبوت چاہتے ہیں کہ پدمنی بھی اس آگ میں جل کر راکھ ہو گئی۔"

"فاتح عالم ذرا انتظار فرمائیں۔" رام دیو نے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہوئے کہا.......... "کچھ دیر بعد یہ راکھ اپنے سینے میں چھپے ہوئے تمام راز اگل دے گی۔"

پھر رام دیو کے ایماء پر مندر کے احاطے میں ہر طرف پھیلی ہوئی راکھ کا جائزہ لیا گیا۔ سلطان کے چند سپاہی راکھ میں کسی ایسی علامت کو تلاش کرنے لگے جس کا تعلق براہ راست رانی پدمنی سے ہو۔ آخر بست جستجو کے بعد ایک مقام پر علاءالدین کے فوجیوں کو سونے کے الجھے ہوئے تار سے نظر آئے۔ رام دیو نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "یہ پدمنی کے لباس کا وہ حصہ ہے جسے آگ صرف پگھلا سکی مگر جلا کر خاک کرنے میں ناکام رہی۔"

علاءالدین نے غور سے سونے کے ان تاروں کو دیکھا جو دھویں کے اثرات سے اپنا رنگ بدل چکے تھے۔ "راجپوت سرداروں کی بیویاں بھی اسی آگ میں جل کر ہلاک ہوئی ہیں.......... ممکن ہے کہ یہ ان میں سے کسی عورت کی نشانی ہو۔" سلطان ابھی تک پدمنی کی موت کا یقین کرنے کیلئے آمادہ نہیں تھا۔

رام دیو لاجواب سا ہو گیا مگر اس کی نظریں ابھی تک راکھ میں کچھ تلاش کر رہی تھیں.......... پھر وہ خود ہی آگے بڑھا اور اس جگہ کو دیکھنے لگا جہاں سونے کے تار بر آمد ہوئے تھے......... "ایک انسان جلتے وقت کسی مخصوص نقطے پر ساکت نہیں رہ سکتا......... آگ کی سوزش اسے ادھر ادھر حرکت کرنے پر بھی مجبور کر سکتی ہے۔" رام دیو نے سلطان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا......... "آپ اپنے سپاہیوں کو مزید تلاشی کا حکم دیں۔ مجھے یقین ہے کہ پدمنی کی ایک نشانی نہیں، کئی نشانیاں مل جائیں گی۔ پھر آپ بھی میری بات پر اعتبار کر لیں گے کہ چتوڑ کی مہارانی کا مدفن اسی راکھ کے نیچے ہے۔"

سلطان نے اپنے فوجیوں کو اشارہ کیا اور پھر تھوڑے ہی وقفے کے بعد کوئی چھ سات گز کے فاصلے پر کچھ ایسی علامتیں ظاہر ہوئیں جو رام دیو کے دعوے کی تصدیق کر رہی تھیں۔ یہ اعلیٰ نسل راجپوت خواتین کے لباسوں کے وہ باقی ماندہ حصے تھے جن پر روپہلی اور سنہری تاروں سے نقش و نگار بنائے گئے تھے اس کے ساتھ کچھ پائلیں تھیں اور کچھ گلے کے ہار تھے جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مرنے والی عورتوں کا تعلق حکمراں خاندان سے تھا۔ یہ انتہائی قیمتی اور مرصع زیورات تھے جو آگ اور دھوئیں کے اثرات سے سیاہ ہونے کے باوجود اپنے گراں بہا ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ اب علاءالدین کو کسی حد تک یقین ہو چلا تھا کہ رانی پدمنی اسی آگ میں جل کر ہلاک ہوئی ہے مگر پھر بھی وہ اس ثبوت کی تلاش میں تھا جسے کسی طرح جھٹلایا نہ جا سکے...... اور کچھ دیر بعد ہی سلطان کے سپاہیوں نے یہ ثبوت بھی فراہم کر دیا۔ راکھ کے ڈھیر سے ایک ایسا ڈھانچہ بر آمد ہوا تھا جس پر کسی ملکہ یا رانی کے تاج ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ کپڑا جل جانے کے سبب وہ ایک ڈھانچہ ہی رہ گیا تھا جسے سونے کے موٹے موٹے پتروں سے بنایا گیا تھا۔

رام دیو نے پرجوش لہجے میں دعویٰ کرتے ہوئے کہا.......... "یہی وہ تاج ہے جسے پہن کر رانی پدمنی اپنے دربار میں جلوہ افروز ہوتی تھی۔"

سلطان غور سے اس تاج کو دیکھنے لگا جس کے درمیان بہت قیمتی ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اب علاءالدین کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ پدمنی کی موت کا یقین کر لے۔ فرمانروائے ہند جلے ہوئے تاج کو دیکھ کر چند لمحوں کیلئے اپنے خیالوں میں گم ہو گیا تھا۔ تمام سپہ سالار اور سپاہی سلطان کے چہرے سے اندازہ کر رہے تھے کہ وہ کسی اندرونی کرب میں مبتلا ہے۔ وہی کرب جو ایک فاتح کو اپنی پسندیدہ شے حاصل نہ کرنے پر ہوتا ہے۔ علاءالدین خلجی کو بھی اپنی نامکمل فتح کا غم تھا۔ پدمنی کی موت اس کی خود پسندی اور انانیت پر ایک کاری ضرب تھی۔ سلطان نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے جذبوں کو رعایا پر ظاہر نہ ہونے دے مگر ناکام رہا۔ پدمنی کی آخری نشانی دیکھی تو علاءالدین کو کئی کہانیاں یاد آ کے رہ گئیں اور چند ساعتوں کیلئے اس کا سرخ و سفید چہرہ دھواں دھواں سا نظر آنے لگا۔

"خواجہ! یقین نہیں آتا کہ ایک عورت بھی ہمیں شکست دے سکتی ہے۔" سلطان اپنے سپہ سالاروں کی طرف مڑا......... "نصرت خان! آج ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم دنیا کی ہر شے کو حاصل نہیں کر سکتے.......... بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو ہماری دسترس سے دور ہیں۔" سلطان کے لہجے سے محرومی کا درد جھلک رہا تھا۔

خواجہ حاجی تو اس نازک ترین موقع پر اپنے ہونٹوں کو جنبش نہ دے سکا مگر ملک نصرت خان نے آگے بڑھ کر اپنے آقا کی غمگساری کی۔ "نہیں! شاہ والا! آپ کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ یہ عظیم الشان فتح ہے جسے آنے والی نسلیں صدیوں تک یاد رکھیں گی۔ سلطان معظم نے دہلی سے روانگی کے وقت یہی تو کہا تھا کہ اے ارضِ چتوڑ ہم آ رہے ہیں......... اے اراولی اور آبو کی سرکشیدہ چوٹیو! ہمارے جبروت کے آگے سجدہ ریز ہو جاؤ......... اور اے قلعے کے بلند مینارو! ہمارے احترام میں یہاں تک جھکو کہ ہمارے قدم

تمہیں روند ڈالیں۔" ملک نصرت خان بڑے جذباتی انداز میں اپنے سلطان کے جاہ و جلال کا قصیدہ پڑھ رہا تھا۔ "اور پھر ایسا ہی ہوا فاتح عالم کہ آبو جھک گیا، اراولی نے گھٹنے ٹیک دیئے اور قلعے کی تمام فصیلیں اپنے سربہ فلک میناروں کے ساتھ زمین بوس ہو گئیں۔ چتوڑ کا والی زنجیریں پہن کر حضور کے غلاموں میں شامل ہو گیا اور چتوڑ کے سرکش راجپوتوں نے موت کے بجائے شہنشاہ کے رحم و کرم کی بھیک مانگ لی۔ تمام دعوے باطل قرار پائے، اور اب ان چٹانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی ہے کہ مالکِ لوح و قلم نے دنیا کی ہر فتح سلطان معظم کی تقدیر میں لکھ دی ہے۔"

اپنے ایک جاں نثار کی باتیں سن کر علاءالدین کے چہرے پر نشاط و کیف کا ایک تیز رنگ ابھرا مگر دوسرے لمحے وہی افسردگی لوٹ آئی۔ "نصرت خان! تم ہمارے وفادار ہو اس لئے اپنے شاہ کی دلجوئی کر رہے ہو مگر سچ تو یہ ہے کہ ہمیں ایک زاویے سے شکست ہو گئی ہے۔" علاءالدین نے حسرت بھری نظروں سے پدمنی کے ادھ جلے تاج کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں شاہ والا! میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔" ملک نصرت خان کا لہجہ کچھ اور پُرجوش ہو گیا تھا۔ "اہلِ دل خودکشی کو بہادری نہیں کہتے، وہ دنیا کی بدترین شکست ہوتی ہے۔"

علاءالدین کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ نمایاں ہوئی۔ اس نے اپنے سر کو جنبش دی اور مندر کے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ "رام دیو! کیا تجھے یقین ہے کہ مندر کے اندر کوئی خفیہ سرنگ موجود نہیں ؟" سلطان نے اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جو کچھ دن پہلے چتوڑ کا "مہاتما" تھا مگر آج اپنا مذہب بدل کر علاءالدین کے نمک خواروں میں شامل ہو گیا تھا۔

"فاتح عالم جانتے ہیں کہ رام دیو جھوٹ نہیں بولتا۔" عیار شعبدہ باز نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی ہم مندر کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔" یہ کہہ کر سلطان سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

تمام سپہ سالار برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھے اور اپنے حکمران کو شمشیروں کے سائے میں لے لیا۔ جاں نثاروں کو اندیشہ تھا کہ کہیں دشمنوں کا کوئی گروہ مندر کے اندرونی حصے میں روپوش نہ ہو اور موقع ملتے ہی سلطان پر وار نہ کر بیٹھے۔ ملک نصرت خان نے بہت تیزی سے سیڑھیاں عبور کیں اور مندر کے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نصرت خان کے ہاتھ کا دباؤ پڑتے ہی دونوں پٹ کھل گئے۔ اس کے ساتھ ہی خواجہ حاجی، ملک نصرت خان اور تاج الدین عراقی مندر میں داخل ہو گئے۔ وہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا جس کے وسط میں درگاماتا کا مجسمہ نصب تھا۔ سلطان کے سپہ سالاروں نے ایک ایک گوشے کا جائزہ لیا مگر وہاں کسی شخص کی موجودگی کا امکان نہیں تھا۔ اس دوران علاءالدین حضرت امیر خسروؒ کے ہمراہ دروازے پر کھڑا رہا پھر جب اس کے جاں نثاروں نے تصدیق کر دی کہ مندر خالی ہے تو سلطان امیر خسروؒ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ رام دیو سیڑھیوں سے نیچے کھڑا ہوا علاءالدین کے حکم کا منتظر تھا۔ سلطان نے جاتے جاتے اسے بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ رام دیو کسی حقیر غلام کی طرح لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور سلطان کے قریب پہنچ کر ٹھہر گیا۔

علاءالدین درگاماتا کے مجسمے کے نزدیک رک کر اس عجیب و غریب عورت کی مورتی دیکھنے لگا جس کے بدن پر چاروں طرف کئی ہاتھ نمایاں تھے۔

"یہ کون ہے ؟" علاءالدین نے رام دیو سے پوچھا۔

"سنسار کے وجیتا! ہندو قوم اسے درگاماتا کہہ کر پکارتی ہے۔" رام دیو نے بڑے اجنبی لہجے میں اپنی سابقہ دیوی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ طاقت کی دیوی ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق دنیا

کے ہر انسان کو درگاہی طاقت بخشتی ہے اگر یہ دیوی کسی شخص سے خفا ہو جائے تو پھر اسے زوال اور بربادی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ "

"اور یہ اس کے جسم پر پھوٹنے والے ہاتھ کیسے ہیں ؟" علاءالدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ ہاتھ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ دیوی کی طاقتیں لامحدود ہیں۔ " رام دیو نے وضاحت کی۔ .... "یہ سر سے پاؤں تک خالص سونے کی ہے اور اس کی چمک دار آنکھوں میں قیمتی ہیرے آویزاں کئے گئے ہیں۔ "

علاءالدین مسکرایا........ "رام دیو! کیا تیری دیوی پدمنی اور رتن سنگھ سے خفا ہو گئی تھی ؟" سلطان کا لہجہ انتہائی طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔

"فاتح عالم! اب اس دیوی سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔ " اپنے ماضی کا حوالہ سن کر رام دیو کے چہرے پر وحشت سی برسنے لگی تھی۔ "میں سلطان کے دستِ کشور کشا پر ایمان لے آیا اور میں نے اپنا رخ بت خانوں کی طرف سے موڑ کر ایک کعبے کی سمت کر لیا۔ " رام دیو کسی مجرم کی مانند اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔

"نہیں رام دیو ہمیں تیرے ایمان پر کوئی شک نہیں ہے۔ " علاءالدین نے سنجیدہ لہجے میں کہا............

"تیرے ماضی کا ذکر ہماری زبان پر اس لئے آگیا کہ آخر تو نے بھی تو اپنا بچپن اور جوانی ان ہی بتوں کی خدائی کے زیر اثر گزاری ہے تو پتھروں کے کاروبار سے خوب واقف ہے کہ ان کے نام پر راجپوتوں نے کیسے کیسے گل کھلائے ہیں ؟ تیرا تعلق برہمنوں کی نسل سے ہے ؟" اچانک علاءالدین نے رام دیو سے ایک اور سوال کر دیا۔

"تو پھر تو نے بھی ان ہی مجسموں کی آڑ میں چتوڑ کے سادہ دل لوگوں پر برسوں حکومت کی ہوگی۔ " علاءالدین مسکرا رہا تھا مگر اس کی ہنسی میں زہر آلود نشتروں سے زیادہ تیزی تھی۔

رام دیو جواباً کچھ نہیں بولا........ اس کا سر بارِ ندامت سے کچھ اور جھک گیا تھا۔

علاءالدین نے بھی اسے مزید نہیں چھیڑا........ اب وہ حضرت امیر خسروؒ سے مخاطب تھا............

"خسرو! دیکھ رہے ہو کہ خدا کی زمین پر کیسی کیسی مخلوق آباد ہے اور کیسے کیسے بے جان پتھروں نے خدائی کی قبا پہن لی ہے ؟"

خسروؒ بہت زیادہ سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بولے.......... "سلطان معظم! اس واقعے میں اہل ایمان کیلئے بڑی عبرت ہے۔ جو شخص بھی اس کائنات کے مالک سے کیا ہوا عہد توڑے گا' اس کا یہی حشر ہوگا۔ کل تک یہ لوگ دنیا کی خرافات میں کیسے مگن تھے اور بدمستی کی گہری نیند میں کیسے کیسے خواب دیکھ رہے تھے کہ ان سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی' دست غیب ان کی گرفت نہیں کرے گا اور یہ شرابیں پی پی کر اسی طرح دیوتاؤں کے سامنے شرمناک حالت میں رقص کرتے رہیں گے اب ان کی لاشوں پر جا کر کون پکارے کہ جس عذاب کا انکار کیا جا رہا تھا وہ نازل ہو چکا۔ " امیر خسروؒ نے بڑے سلیقے سے درپردہ سلطان کو نصیحت کی۔

کچھ دیر کیلئے علاءالدین کا چہرہ بھی بجھ کر رہ گیا مگر اس نے فوراً ہی سنبھلتے ہوئے کہا........ "ہاں خسرو! نافرمانوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ " یہ کہہ کر سلطان درگا ماتا کے مجسمے کو چھو کر دیکھنے لگا۔ اس نے کئی بار مورتی کو ہلانے کی کوشش کی مگر وہ بڑی مضبوطی سے نصب کی گئی تھی۔

"اس کے نیچے تو کوئی سرنگ موجود نہیں ہے ؟" علاءالدین نے ایک بار پھر رام دیو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں پربھو (مالک)!" رام دیو پُریقین لہجے میں بولا۔ سلطان بہت دیر تک درگا کے مجسمے کا جائزہ لیتا رہا۔

رام دیو نے خوشامد کا ایک اور انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "شاہ والا! یہ مورتی کئی من سونے سے تعمیر کی گئی ہے اور اس کی آنکھوں کے ہیرے بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ "

"آخر تو کیا کہنا چاہتا ہے' رام دیو ؟" علاءالدین نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"سلطان کے اس حقیر غلام کی خواہش ہے کہ ان بتوں کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیجئے۔ " رام دیو نے اپنے اسلامی جوش کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا.......... "میری نظر میں آپ سب سے بڑے بت شکن ہیں.......... میرے علم نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ چتوڑ کے صنم خانے آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں اور جب شاہ والا کے قدم یہاں پڑیں گے تو ساری مورتیاں سجدہ ریز ہو جائیں گی۔ "

"نہیں رام دیو! ہم مذہب کے سلسلے میں کسی پر جبر نہیں کرتے۔ " علاءالدین نے رام دیو کی تجویز کو سختی سے مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک سیاسی جنگ تھی جسے ہم نے شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ جیت لیا اگر ہم ظلم و ستم کو روا رکھتے تو پھر آگ میں جلنے والی عورتوں کو بچانے کا حکم نہ دیتے۔ ایک ایک بوڑھے اور بچے کو قتل کرا دیتے مگر تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ہزاروں راجپوت سپاہی ہماری عنایتِ خسروانہ کے سائے میں زندہ ہیں.......... اگر ہم اپنی شمشیر قہر کو بے نیام کر لیں تو چتوڑ کی سرزمین پر ایک بھی ذی روح زندہ نہیں رہے گا۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام افراد ہماری مکمل اطاعت اختیار کر لیں۔ ان بت خانوں کے بارے میں تو اہل چتوڑ ہی فیصلہ کریں گے کہ وہ انہیں مسمار کر کے حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے ہیں یا اپنے باپ دادا کے مذہب پر قائم رہتے ہیں۔ انہیں ہر قسم کی آزادی حاصل ہوگی۔ "

رام دیو نے شرمسار ہو کر سر جھکا لیا اور سلطان اپنے سپہ سالاروں کے ہمراہ مندر سے باہر نکل آیا۔ چلتے چلتے بھی اس کی زبان پر ایک ہی فقرہ گردش کر رہا تھا۔ "اگرچہ پدمنی کا برباد شدہ تاج ہمارے ہاتھوں میں ہے اور کوئی بھی اہلِ نظر اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ پدمنی جل کر ہلاک ہو گئی لیکن ہمارا شعور اس وقت بھی ہم سے سرگوشیوں میں کہہ رہا ہے کہ وہ آفتِ جان آج بھی زندہ ہے۔ راجپوت ہوتے ہوئے بھی رتن سنگھ کا بزدلوں کی طرح تہہ خانے میں روپوش ہونا اور پدمنی کا مندر کے احاطے میں جلنا' عام واقعات نہیں ہیں۔ راکھ کے اس ڈھیر سے ہمیں انسانی گوشت کی نہیں' کسی سازشی منصوبے کی بو آ رہی ہے "

تمام سپہ سالاروں اور مصاحبوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں.......... وہ اپنے اندر سلطان کے اندیشوں کو رد کرنے کی جرأت نہیں پا رہے تھے۔

☆.............................☆.......... ....☆

پھر سلطان نے ایک نیا حکم جاری کیا کہ مصنوعی پہاڑی کو مسمار کر کے پورے میدان کو ہموار کر دیا جائے۔ علاءالدین اسی میدان میں اپنی فتح کا جشنِ عام منانا چاہتا تھا۔ سلطان کے ہونٹوں کی ایک جنبش کے ساتھ ہی چتوڑ کی نواحی بستیوں کے اچھوت اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے اور شاہی فوج کے کارندوں کے ساتھ بھاری پتھروں کو اٹھا اٹھا کر دریائے گمبھیری کے کنارے جمع کرنے لگے۔ سلطان اپنی فوجوں کی آمدورفت کیلئے دریا پر ایک مضبوط پل بنانا چاہتا تھا اس لئے اس نے مقامی لوگوں کو حکم دیا تھا کہ پل کم سے کم مدت میں تعمیر کر دیں۔ چتوڑ کے اچھوت جو پہلے ہی علاءالدین کے احسانات کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے' پوری لگن اور جانفشانی کے ساتھ پل تعمیر کرنے لگے۔

اس دوران ملک نصرت نے کئی بار راجہ رتن سنگھ کو سلطان کے حضور پیش کرنے کی اجازت طلب کی مگر علاءالدین نے ہر مرتبہ یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ "نصرت خان! ہم اس نافرمان کا چہرہ جشنِ فتح کے دن دیکھیں گے۔"

پل کے ساتھ ساتھ علاءالدین نے میدان میں ایک بلند مینار تعمیر کرایا جس پر روشن حروف میں یہ عبارت تحریر کی گئی۔

"سلطان علاءالدین ...... خلجی .... خدا کا سایہ .... وقت کا سورج .... دنیا کا محافظ و نگہبان .... اور سکندر ثانی۔"

اس عرصے میں راج محل کی مستقل تلاشی جاری رہی۔ آگ کا طوفان تھم جانے کے بعد راجہ رتن سنگھ کی بیوہ بہن فریاد کرتی ہوئی سلطان کے روبرو پہنچی اور اس نے اپنے بیٹے سونگرامال دیو پر ڈھائے جانے والے مظالم کی روداد بیان کی۔ علاءالدین کے حکم پر سونگرامال دیو کو بھاری زنجیروں سے آزاد کر کے سلطان کے سامنے لایا گیا .... پھر جب رتن سنگھ کی بہن نے یہ بتایا کہ سونگرا پر محض اس لئے تشدد کیا گیا کہ وہ سلطان کے اقتدار کو تسلیم کرتا تھا تو علاءالدین نے اس جواں سال راجپوت زادے کے تدبر اور فراست کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "ہم اپنے ماننے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتے سونگرا! تو ذہین بھی ہے اور خوش نصیب بھی کہ ہماری آمد سے پہلے ہی ہمارے جاہ و جلال کے آگے جھک گیا۔"

سونگرامال دیو بزدل نہیں تھا مگر جوشِ مردانگی میں عقل کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ اس نے علاءالدین کے سامنے برملا اعتراف کرتے ہوئے کہا .... "میں نے اپنے ماموں کو مشورہ دیا تھا کہ سلطان سے آمادۂ جنگ ہونے کے بجائے باوقار انداز میں صلح کی بات کی جائے۔ میں نے سمراٹ رتن سنگھ سے یہ بھی کہا تھا کہ دیوتاؤں نے ہندوستان کی حکمرانی کا فیصلہ سلطان کے حق میں کر دیا ہے۔ وہ اس علاقے کی سب سے بااثر شخصیت ہیں اور ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو شمشیروں کے ذریعے نہیں روکا جا سکتا۔ میں نے آخری حد تک انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ مجھے بزدل اور نکما قرار دیتے رہے۔ یہاں تک کہ شہنشاہ کی حمایت کے سبب وہ ستم توڑے گئے کہ آج مجھ میں ان کے بیان کرنے کی بھی ہمت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر سونگرامال دیو نے سلطان کو اپنے جسم پر ان زخموں کے نشانات دکھائے جو رتن سنگھ کی درندگی کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کر رہے تھے۔

راجپوت زادے کی اس بے پناہ جرأت نے علاءالدین کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ "سونگرا! تو نے جو زخم ہمارے لئے کھائے ہیں ہم انہیں اپنی نوازش و کرم سے اس طرح دھوئیں گے کہ ان سے مشک و گلاب کی خوشبو آنے لگے گی۔"

اس کے بعد علاءالدین نے سونگرامال دیو سنگھ کو مصاحبوں کے حلقے میں شامل کر لیا۔

راج محل کی تلاشی کے دوران رانی پدمنی اور رتن سنگھ کے کمروں سے بے شمار قیمتی نوادرات سپاہیوں کے ہاتھ آئے۔ مگر ابھی تک چتوڑ کے خزانے کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ علاءالدین نے نصرت خان کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "ملک! تم رتن سنگھ سے پوچھو کہ اس نے اپنا خزانہ کہاں چھپایا ہے؟ اگر وہ بتانے سے انکار کرے تو تم خوب جانتے ہو کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے؟"

رتن سنگھ نے سر جھکا دینے ہی میں اپنی عافیت سمجھی اور اس نے خفیہ تہہ خانے کا پتہ بتا دیا جہاں چتوڑ کے سابقہ حکمرانوں کی دولت کے انبار جمع تھے۔ ہندو بنیادی طور پر ایک زر پرست قوم ہے اور اپنی اسی سرمایہ پرستی

کا جواز پیدا کرنے کیلئے اس نے "لکشمی" نام کی دیوی کو تراشا تا کہ دولت کی ذخیرہ اندوزی کو عبادت کا درجہ دیا جا سکے۔ جب علاءالدین نے زر و جواہر کے ڈھیر دیکھے تو اس کے چہرے پر ایسی شادابی ابھر آئی جس کی جھلک آج سے پہلے نہیں دیکھی گئی تھی۔

"اب ہماری دولت کے سامنے محمود غزنوی کے خزانے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔" علاءالدین نے اپنے مصاحبوں اور سپہ سالاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں عجیب سا احساسِ فخر تھا اور آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہو گئی تھی جس کے اظہار کیلئے الفاظ کا تلاش کرنا مشکل نظر آ رہا تھا۔

ایک ایک کر کے تمام امیرانِ لشکر نے سلطان کو اس یادگار فتح پر مبارکباد پیش کی اور درباری مطرب ندیم کاشانی نے بڑے اثر انگیز انداز میں یہ نغمہ چھیڑ دیا۔

"دنیا میں وہ شخص سلطان معظم کے سوا کون ہو سکتا ہے جس کے قدموں کو چھو کر خاک بھی اکسیر بن جاتی ہے۔"

☆ .... ☆ .... ☆

اس دوران علی عامر آفریدی نے طلسم کدے سے باہر جانے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ نرملا کماری نے اسے یہ کہہ کر روک لیا۔ "ابھی شکست و فتح کے ہنگامے ختم نہیں ہوئے ہیں۔ ایسے سنگین لمحات میں یہاں سے نکلنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔"

"آگ تو بجھ چکی ہے اور دھواں فضاؤں میں تحلیل ہو گیا۔ پھر یہاں سے جانے میں کیا قباحت ہے؟" آفریدی نے جھنجلا کر کہا۔

"یقیناً راج محل کی آگ بجھ چکی ہے مگر نفرتوں کی آگ بھڑک رہی ہوگی۔" نرملا نے آفریدی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"تمہاری باتیں میرے لئے ناقابل فہم ہیں۔" آفریدی کے لہجے سے ناخوشگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔ "تمہیں دوسروں کی آگ کی فکر ہے مگر میری طرف نہیں دیکھتیں میں اپنی والدہ اور بہن کی جدائی کے شعلوں میں کب سے جل رہا ہوں؟"

نرملا کماری کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گئی اور پھر بہت آہستہ لہجے میں کہنے لگی۔ "مجھے تو آپ کے غموں کا اس قدر احساس ہے کہ اپنے غم بھی فراموش کر بیٹھی ہوں۔ کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ اس طلسم کدے کو توڑ کر دیوانہ وار نکل جاؤں اور چتوڑ کے در و دیوار سے پوچھتی پھروں کہ میرے پتا جی کیسے ہیں اور اتنے دن تک ان پر کیا گزرتی رہی ہے؟"

نرملا کی بات سن کر علی عامر آفریدی سناٹے میں آ گیا۔ "معاف کرنا راج کماری! اہلِ وطن کی آمد کا سن کر جذبات بے قابو ہو گئے۔ میں خود غرض نہیں کہ مجھے صرف اپنی ماں اور بہن کا خیال ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں مہ منتری کی آخری خواہش کے احترام میں سلطان کے روبرو جانا چاہتا ہوں۔"

"اس طرح تم کیا حاصل کر سکو گے؟" نرملا کی آنکھیں اداس تھیں اور آواز بجھی بجھی محسوس ہو رہی تھی۔

"میں سلطان سے اہلِ چتوڑ کیلئے امان طلب کروں گا۔" آفریدی نے بے قرار ہو کر کہا۔

"کیا سلطان نے تمہارے مشورے سے چتوڑ پر فوج کشی کی ہے؟" نرملا نے ایک عجیب سا سوال کر ڈالا تھا۔

آفریدی پریشان سانظر آنے لگا اور پھر ایک طویل وقفۂ سکوت کے بعد اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

"میں سلطنت خلجی کا ایک عام سردار ہوں اور مجھ سے زیادہ مرتبہ رکھنے والے لوگ دربار شاہی میں موجود ہیں۔"

"اگر آپ سلطان کے مقرب خاص ہوتے تب بھی اس کی فطرت اور مزاج پر اثر انداز نہیں ہوسکتے تھے۔" نرملا کسی سیاستدان کے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ "شاہوں کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ وہ جسے چاہتے ہیں اماں بخش دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں قبر میں سلا دیتے ہیں۔ ان کا ہر کام سیاسی ضروریات کے مطابق ہوتا ہے۔ میرے پتا جی ایک وطن دوست انسان ہیں اور انہیں اپنی قوم سے بے پناہ محبت ہے۔ ان ہی جذبات سے مضطرب ہو کر انہوں نے کہہ دیا ہو گا کہ آپ سلطان سے اہل چتوڑ کیلئے رعایت طلب کریں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی رعایتیں درخواست سے نہیں شاہ کی مرضی سے ملتی ہیں۔ چتوڑ کی قسمت کا فیصلہ مہامنتری وکرم سنگھ اور سردار علی عامر آفریدی کی التجاؤں کے زیر اثر نہیں ہو گا۔ اب اس کا انحصار علاء الدین خلجی کی سوچ پر ہے کہ وہ غلاموں اور محکوموں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے؟"

علی عامر آفریدی حیرت سے نرملا کماری کی طرف دیکھنے لگا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ منتری بھون کی پُر آسائش فضا میں پرورش پانے والی ایک نوخیز دوشیزہ زندگی کے اس قدر تلخ حقائق کا بھی علم رکھتی ہوگی۔ "تم ٹھیک کہتی ہو نرملا مگر اس کے ساتھ ہی میں اپنی والدہ اور بہن کی خیریت بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں۔"

"ان کی خیریت کس سے معلوم کریں گے؟" نرملا نے ایک اور سوال کرتے ہوئے کہا۔

آفریدی اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا۔

"کیا ان لوگوں کو ہانسی روانہ کرنے سے پہلے آپ نے سلطان کو مطلع کیا تھا؟" نرملا نے آفریدی کو خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"میں یہ راز کسی دوسرے شخص پر کس طرح فاش کر سکتا تھا؟" آفریدی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جب ان کی روانگی ایک راز ہے تو پھر کون بتائے گا کہ وہ کس حال میں ہیں؟" نرملا مسلسل سوال کر رہی تھی۔ "کیا آپ خود اس راز سے پردہ ہٹانا چاہتے ہیں کہ ملک کافور کے خوف سے آپ نے اپنی بہن اور والدہ کو دہلی سے ہانسی منتقل کر دیا ہے؟"

آفریدی حیرت زدہ نگاہوں سے نرملا کی طرف دیکھنے لگا۔

"سردار! بہتر یہی ہے کہ آپ کچھ دن اور صبر و ضبط سے کام لیں۔" نرملا نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ نے اس معاملے میں ایک بار بھی اپنی زبان کو جنبش دی تو بڑے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ اس طوفان کو خاموشی سے گزر جانے دیجئے۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ اس قدر جاں نثاری کے باوجود سلطان سے دور ہیں اور آپ کے دشمن قریب تر۔"

آفریدی کی اداسیوں میں اضافہ ہو گیا مگر وہ اس بات سے خوش تھا کہ اسے زندگی کے خارزار میں ایک ایسے رفیق کی قربت حاصل تھی جو ہوشمند بھی تھا اور وفادار بھی۔

☆..................☆..................☆

چتوڑ کے ہر گوشے پر مکمل غلبہ حاصل کر لینے کے بعد علاء الدین نے جشنِ عام کی تقریب منعقد کرنے کا حکم دیا۔ چتوڑ کی نواحی بستیوں میں منادی کرا دی گئی کہ بیماروں کے علاوہ مقامی آبادی کا ایک ایک باشندہ

اس تقریب میں شرکت کیلئے پابند ہے۔

اعلان شاہی سنتے ہی دور دراز کے اچھوت بھی قلعے کے اس میدان میں جمع ہو گئے تھے جسے نئے نئے زاویوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ پھر تاریخ ہند کا وہ عجیب لمحہ آپہنچا جب راجپوت سرداروں کو زنجیروں میں جکڑ کر سلطان علاء الدین خلجی کے سامنے لایا جا رہا تھا۔ راجہ رتن سنگھ آزاد تھا مگر اس طرح کہ سلطان کے سپاہی اس پر اپنی تلواروں کا سایہ کیے ہوئے تھے اور چتوڑ کے حکمراں کا پورا جسم شرم و ندامت کے پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔

راجہ رتن سنگھ نے بڑے کرب کے عالم میں اس انسانی ہجوم پر نظر ڈالی جو راجپوت سمراٹ کے زوال اور شکست کا تماشائی تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی نے ایک خاص منصوبے کے تحت چتوڑ کے اچھوتوں کو دونوں جانب اگلی قطاروں میں کھڑا کیا تھا تاکہ مجبور و بے کس رعایا ان ستمگروں کا حشر دیکھ سکے جو صدیوں سے نسلِ آدم کے ایک بڑے گروہ کو جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کر رہے تھے۔ رتن سنگھ جیسے ہی آراستہ میدان میں داخل ہوا اس نے اچھوتوں کی بھیڑ دیکھی تو اسے اندازہ ہو گیا کہ علاء الدین کے تیور کیا ہیں اور خلجی حکمراں کس انداز میں اسے ذلیل و رسوا کرے گا؟ رتن سنگھ کے قدم لڑکھڑا رہے تھے مگر اس نے فوراً ہی اپنے اعصاب پر قابو پایا اور سر اٹھا کر چلنے لگا۔ جاتے جاتے اس نے کئی بار اپنے دائیں اور بائیں کھڑے ہوئے راجپوتوں پر نگاہ کی اور ایک جگہ رک کر تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔

"یہ گردشِ وقت ہے جس نے مجھے اتنے برے دن دکھائے ہیں مگر تم یہاں کس لئے آئے ہو؟ میری ذلت کے اس تماشے سے تمہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔ تم نے اپنی وفاداریاں بدل ڈالیں مگر اس سے تمہاری تقدیر نہیں بدلے گی۔ تم کل بھی شودر (اچھوت) تھے اور آج بھی نیچ ہو۔ میں آزاد رہ کر بھی عظیم راجپوتوں کی اولاد تھا اور بیڑیاں پہن کر بھی رتن سنگھ چوہان ہوں۔ سورج دیوتا کا بیٹا.......... اور تم گندی کیچڑ سے پیدا ہونے والے غلیظ و بدرنگ کیڑے.......... اپنے آقاؤں کا تماشا دیکھنے جمع ہوئے ہو؟" رتن سنگھ ان اچھوتوں پر برس پڑا جو سلطان کے حکم پر اس جشن میں شریک ہوئے تھے۔

صدیوں سے خوف و دہشت اور محرومیوں کی فضاؤں میں پلنے والے شودروں کی گردنیں جھک گئیں۔ علاء الدین نے انہیں نئے انداز سے جینے کا حوصلہ بخشا تھا مگر جب وہ راجپوتوں کے مقابل آئے تو ان کا ماضی انہیں ڈرانے لگا۔

علاء الدین اور رتن سنگھ کے درمیان فاصلہ تھا' اس لئے خلجی حکمراں راجپوت سمراٹ کی گفتگو نہیں سن سکا لیکن اس نے اندازے سے سمجھ لیا کہ رتن سنگھ چتوڑ کے اچھوتوں کی موجودگی کو برداشت نہیں کر سکا ہے۔ سلطان نے اپنے سپاہیوں کو ہاتھ کا اشارہ کیا جس کا مفہوم تھا کہ وہ رتن سنگھ کو کھینچتے ہوئے اس جگہ تک لائیں جہاں علاء الدین شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ سلطان کا اشارہ پاتے ہی چند سپاہیوں نے اپنی تلواروں کا رخ بدل دیا اور جب رتن سنگھ کو اپنی پشت میں چبھن سی محسوس ہوئی تو وہ سیدھا ہو کر آگے بڑھنے لگا۔

علاء الدین کا تخت اس مینار کے نیچے سجایا گیا تھا جسے سلطان نے اپنی فتح کی یادگار کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔ تخت پر علاء الدین کے دائیں جانب حضرت امیر خسروؒ تشریف فرما تھے۔ پھر ملک نصرت خان اور خواجہ حاجی کی نشستیں تھیں۔ بائیں جانب سلطان کا بڑا لڑکا خضر خان بیٹھا تھا اور اس کے بعد دونوں سپہ سالار تاج الدین عراقی اور ملک ظفر خان موجود تھے۔ باقی مصاحب اور فوجی سردار ایک طویل قطار بنائے ہوئے علاء الدین کے

عقب میں کھڑے تھے۔ زمین کی سطح سے تخت کا فاصلہ تقریباً چار ہاتھ تھا۔

جب سپاہی رتن سنگھ کو لے کر تخت کے قریب پہنچے تو سلطان نے اپنے ایک سپاہی سے اس واقعہ کی تفصیلات دریافت کیں۔ جب راجپوت سمراٹ اچھوتوں کے سامنے اپنے قہروغضب کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ سلطان کے جاں نثار فوجی نے آگے بڑھ کر تختِ شاہی کو بوسہ دیا اور پھر راجہ رتن سنگھ کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک حرف بیان کر دیا۔

علاءالدین نے تحقیر آمیز نظروں سے رتن سنگھ کی طرف دیکھا جیسے اس کے روبرو چتوڑ کا حکمراں نہیں، کوئی رہزن و قزاق ہو۔ ”رتن سنگھ! یہ کمزور و ناتواں مخلوق جسے تو اور تیری قوم کے لوگ اچھوت کہہ کر پکارتے ہیں اسے ہم نے انسانوں کا درجہ بخشا ہے۔ تو نے اور تیرے جابر و سفاک باپ دادا نے ان کیلئے خوف و دہشت کا جو پنجرہ بنایا تھا آج اس کا دروازہ ہم نے کھول دیا۔ آزادی کی ایک ایک سانس کو صدیوں سے ترستے ہوئے یہ لوگ اب ہر پابندی اور زنجیر سے بے نیاز ہیں۔ ہمارے رحم و کرم نے انہیں قوت پرواز دی ہے۔ اب یہ خدا کی بنائی ہوئی آزاد فضاؤں میں اڑیں گے اور جور و جفا کے موسم کی سختیاں ان کے بازوؤں کو چھو بھی نہیں سکیں گی۔ اب یہ بولیں گے اور پوری توانائی کے ساتھ بولیں گے کہ ہم نے انہیں زبان بخشی ہے۔ اب یہ اپنے گھروں میں، چتوڑ کے میدانوں اور کھیتوں میں رقص کریں گے۔ گمبھیری اور بڑیچ کی موجوں کے ساز پر آزادی کے نغمے گائیں گے۔ وہ آزادی جو فاتح عالم کا عطیۂ خاص ہے۔ یہ ہمارے حکم پر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ہمارا حکم جو ٹالا نہیں جاسکتا۔ ہم چاہتے تھے کہ یہ ڈرے سہمے لوگ بھی اپنی آنکھوں سے تیرے جھوٹے اقتدار کی بربادی کا تماشا دیکھیں۔“ علاءالدین کا ایک ایک لفظ زہر آلود نشتر تھا جس نے رتن سنگھ کے دل و دماغ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

شدتِ غضب سے رتن سنگھ کانپنے لگا۔ ”علاءالدین! تو نے یہ اچھا نہیں کیا۔ جھگڑا تیرے اور میرے درمیان تھا تو فاتح قرار پایا اور میں شکست کھا گیا۔ یہ تو مقدرات کے کھیل ہیں مگر اعلیٰ ظرف لوگ اپنے حریفوں سے ایسا ذلت آمیز سلوک نہیں کرتے۔“ رتن سنگھ کی رگوں میں راجپوتی خون کی گردش تیز ہو گئی تھی اور غلامی کے حصار میں داخل ہونے کے بعد بھی وہ اپنی برباد شدہ شخصیت کا بھرم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”رتن سنگھ! کیا تجھ جیسا بزدل اور پست فطرت انسان بھی اعلیٰ ظرفی کا مفہوم سمجھتا ہے؟“ اپنے دشمن کو بدترین اذیت میں مبتلا دیکھ کر علاءالدین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”بدنصیب! تو ہمیں اعلیٰ ظرفی کا سبق دیتا ہے جبکہ ہمارے غلام بھی اپنے سینوں میں تجھ سے زیادہ بڑا دل رکھتے ہیں۔“ یہ کہہ کر علاءالدین نے ملک نصرت خان کی طرف دیکھا۔ سلطان کی جنبشِ چشم کے ساتھ ہی نصرت خان اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنی گردن خم کر دی۔ ”یہ ہمارا مزاج آشنا سپہ سالار نصرت خان ہے۔“ علاءالدین نے دوبارہ رتن سنگھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”اس نے ہمارے حکم کے بغیر تجھ سے صاحبِ ظرف انسانوں کی طرح سلوک کیا۔ آخر یہ ہمارا سفیر ہے، ہمارا نمائندہ ہے، اسے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ اگر ہم اعلیٰ ظرف نہ ہوتے تو نصرت خان تجھے زنجیریں پہنا دیتا اور پھر تیرے سر کے بال پکڑ کر مجرموں کی طرح کھینچتا ہوا ہمارے روبرو حاضر کرتا۔ یہ ہماری اعلیٰ ظرفی ہی کا صدقہ ہے کہ شکست کھانے کے بعد بھی تیری پہچان باقی ہے۔ ہم تیری اس پہچان کو مٹا بھی سکتے تھے۔ پھر تجھے بدترین حالت میں ہمارے حضور پیش کیا جاتا۔ ہم نے چشم پوشی سے کام لیا۔ شاہانہ تواضع اور رواداری کو برقرار رکھا۔“ علاءالدین کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی اور اس کا چہرہ آتشِ غضب سے جلنے لگا تھا۔

”علاءالدین یہ تیری تواضع اور رواداری ہے کہ تو میرے ہی غلاموں کو میرے ڈوبتے ہوئے جاہ و جلال کا تماشا دکھا رہا ہے؟“ رتن سنگھ کے لہجے میں ساری دنیا کی نفرتیں اور تلخیاں سمٹ آئی تھیں۔ ”تجھے اس بات پر قدرت حاصل تھی کہ تو مجھے تنہائی میں طلب کرتا اور میری تحقیر و رسوائی پر گہرا پردہ ڈال دیتا۔“

”ہم ایسا ہی کرتے رتن سنگھ مگر تیری بدبختی نے تجھے یہ شرمناک دن دکھائے۔“ علاءالدین کی آواز پہلے سے زیادہ بلند ہو گئی تھی۔ ”وہ وقت یاد کر جب تو نے ہماری نظروں کے سامنے ہمارے فرمان کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ تو نے کاغذ کے ٹکڑے نہیں کئے تھے، ہمارے وقار کو چاک کر ڈالا تھا۔ تجھے نہیں معلوم کہ وہ منظر دیکھ کر ہمارے دل پر کیا گزری تھی؟ تو نہیں جانتا کہ علاءالدین کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ اور اس کے دل میں ابھرنے والے جذبات کی کیا قیمت ہے؟ تجھے لازم تھا کہ ہمارے فرمان کو بوسہ دیتا، آنکھوں سے لگاتا اور پھر اسے اپنے سامنے رکھ کر سجدہ ریز ہو جاتا لیکن تو نے ایسا نہیں کیا کہ ذلتوں کے اندھیرے تیرے دل و دماغ کا احاطہ کر چکے تھے۔ روشنی کی کوئی کرن آتی تو کہاں سے آتی؟ پھر ہم نے بھی فیصلہ کر لیا کہ تجھے ایسی عبرتناک سزا دیں گے جسے سرزمینِ چتوڑ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ تو نے ہمارے فرمان کے ٹکڑے کئے تھے اور ہم نے تیری سلطنت کو اس طرح پیس ڈالا کہ اس کے ذرے تک ہوائیں بکھر گئے۔ آج صرف تیرے اقتدار کی جلی ہوئی راکھ ہے جو ہر طرف اڑتی پھر رہی ہے اور اپنے اس حکمران کا مرثیہ پڑھ رہی ہے جس کے سینے پر تلوار کا کوئی زخم نہیں آیا۔ اگر تو زخموں سے چور ہو کر ہمارے سامنے لایا جاتا یا تیری گردن شانوں سے کٹ کر الگ ہو گئی ہوتی تو پھر ہم تیری لاش کے احترام میں کھڑے ہو جاتے۔ تیرے جنازے کو شاہانہ اعزاز کے ساتھ نذر آتش کر دیتے اور ساری دنیا کو بتاتے کہ رتن سنگھ ایک مردِ شجاع تھا اور ہم سورماؤں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ ہماری آنکھ نے تیری ریاست میں بس ایک ہی بہادر دیکھا، سپہ سالار ہری سنگھ۔ تو نہیں جانتا کہ ہم نے اس کی کیسی عزت افزائی کی تھی مگر وہ مرد خوددار تھا، منہ چھپا کر چلا گیا۔ تو تو چوہانوں کی نسل پر کبھی نہ مٹنے والا ایک داغ ہے، بزدلی، کم ہمتی، بے غیرتی اور نامردی کا گہرا داغ............ ہم نے اچھوتوں کے ہجوم کو اسی لئے جمع کیا ہے کہ وہ اس حکمراں کا سیاہ چہرہ اور جھکا ہوا سر دیکھ سکیں جو کمزور بکریوں اور ناتواں ہرنوں کے غول میں شیر کی طرح دہاڑتا تھا مگر جب حقیقتاً ہندوستان کا سب سے طاقتور شیر اس کے جنگل میں نمودار ہوا تو وہ کسی لومڑی اور گیدڑ کی مانند فرار ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ یہاں تک کہ شیر کے نوآموز بچوں نے اسے کسی خرگوش یا گلہری کی طرح اپنے خونخوار پنجوں میں جکڑ لیا۔ اب وہی لومڑی ایک ضیغمِ دشت سے اس کی رواداری اور تواضع کا قانون دریافت کر رہی ہے۔ رتن سنگھ! ہم نے تجھ سے زیادہ لعنت زدہ انسان آج تک نہیں دیکھا۔“

علاءالدین نے رتن سنگھ کی نام نہاد شجاعت و مردانگی کے بت کو اپنے الفاظ کی ضرب سے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ راجپوت سمراٹ کے جسم کی لرزش اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ جوش و غضب میں بہت دیر تک کچھ بول ہی نہ سکا بس خونیں نظروں سے علاءالدین کی طرف دیکھتا رہا۔ سلطان کے ہونٹوں پر ایک بار پھر وہی تحقیر آمیز مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ فاتح چتوڑ اپنے شکار کی بے بسی سے خوب خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ رتن سنگھ کے جسم میں نفرت کی بجھتی ہوئی چنگاریاں دوبارہ بھڑک اٹھی تھیں۔ اگرچہ اب جھوٹی شان و شوکت کا مظاہرہ بے سود تھا لیکن پھر بھی رتن سنگھ اندرونی کرب سے بے قرار ہو کر چیخ اٹھا۔

”علاءالدین! تیری رواداری کا قانون یہ ہے کہ تو دوسروں کی عزت و ناموس پر دست درازی کرے اور لوگ تیری اس شیطانی خواہش کے آگے سر جھکا دیں؟ تیرا فرمان اس قابل تھا کہ اسے جوتوں سے

مسل دیا جائے۔ ہم نے پھر بھی اتنا لحاظ رکھا کہ کاغذ کے اس ٹکڑے کو چاک کرنے کیلئے اپنے ہاتھوں کا استعمال کیا۔" رتن سنگھ بھی شرربار لہجے میں بول رہا تھا۔ "یہ تیری تواضع ہے کہ تو نامحرم خواتین پر ہوس آمیز نظریں ڈالے اور جب کوئی شخص تیرے اس ذلت آمیز سلوک پر احتجاج کرے تو تیرے وحشیانہ جذبے بیدار ہو جائیں اور تو بے قصور انسانوں کی پوری بستی کو آگ لگا دے۔"

رتن سنگھ نے علاءالدین پر بڑی خوفناک تہمت تراشی تھی۔ خلجی حکمراں اس غلیظ الزام کو برداشت نہ کر سکا اور شدید حالتِ اضطراب میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ شاہ کی یہ کیفیت دیکھ کر تمام مصاحب اور سپہ سالار بھی اپنی اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے۔ ملک نصرت خان اس قدر جذباتی ہو گیا تھا کہ وہ آدابِ شاہی کا بھی خیال نہ رکھ سکا اور اس نے تلوار کھینچ لی۔ "سلطانِ معظم! غلام اس سے زیادہ برداشت کی قوت نہیں رکھتے۔ حکم دیجئے کہ اس احسان فراموش کی وہ زبان کاٹ کر پھینک دی جائے جس سے ناشکر گزاریوں کا غلیظ چشمہ پھوٹ رہا ہے۔"

"نہیں نصرت خان! ...." علاءالدین نے اپنے سپہ سالار کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "کسی کی زبان قطع کر دینا بہت آسان فعل ہے مگر تمہارے شاہ کا یہ مزاج نہیں۔ علاءالدین تو وہ ہے جو انسانی زبانوں کے زاویے بدل ڈالتا ہے اور ان کے رخ موڑ دیتا ہے۔ جس زبان نے تمہارے سلطان کو گالیاں دی ہیں' وہی زبان کچھ دیر بعد فاتح عالم کی عظمتوں کا کلمہ پڑھے گی۔ خدائے بزرگ و برتر کی قسم! ہم اس سے کم پر راضی نہیں ہوں گے۔"

یہ کہہ کر علاءالدین راجہ رتن سنگھ سے مخاطب ہوا۔ "نسل چوہان کے ذلیل ترین نمائندے! تو جھوٹ بولتا ہے۔ ہم تیری بیوی پدمنی کے نام تک سے واقف نہ تھے اپنے اس درباری برہمن راگھو چیتن کو یاد کر جسے تو نے ٹھکرا دیا تھا اور جو آج کل دہلی میں ہمارے ٹکڑوں پر پل رہا ہے۔ اسی منافق پنڈت نے ہمیں بتایا تھا کہ ایک عورت چتوڑ کے راجپوتوں پر حکومت کر رہی ہے۔ یہ سن کر ہم نے چاہا کہ تجھ سے تیرا اقتدار چھیننے کیلئے کوئی بہانہ تراش لیں اور پھر ہم نے ایسا ہی کیا۔ تو پیدائشی احمق ہے کہ ہمارے انداز سیاست کو سمجھ نہ سکا۔ اگر تو ہم سے ہمارے رحم کی بھیک مانگتا تو ہم تجھے تیری ریاست بھی بخش دیتے اور پدمنی بھی.......... تو کہتا ہے کہ ہم دوسروں کی عورتوں کو ہوس آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کیا تجھے رانی کنولا دیوی یاد نہیں جو تیری ہی ہم قوم ہے جب اس کا شوہر راجہ کرن اپنی آبرو کو چھوڑ کر میدان جنگ سے فرار ہو گیا تو کنولا دیوی نے ہماری پناہ میں آنے کی درخواست کی۔ ہم اس بات پر قدرت رکھتے تھے کہ کنولا دیوی کو ہمیشہ کیلئے داشتہ بنا دیتے مگر وہ ایک اعلیٰ خاندان کی عورت تھی۔ ہم نے اس کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھایا اور کنولا دیوی کو "ملکۂ جہاں" کا خطاب عطا کیا کہ ہم شرفاء کی اسی طرح قدر کرتے ہیں۔ ہمارے معیارِ کرم کو اپنے سامنے کھڑے ہوئے اچھوتوں سے پوچھ کہ ہم نے ان کی بیٹیوں کا بھی دامنِ عصمت چاک نہیں ہونے دیا۔ ہمارے جن سپاہیوں کی نظریں بہکی تھیں ہم نے ان کی شہ رگیں کاٹ دیں۔ ہماری عظیم الشان سلطنت میں لاکھوں ہندو خواتین آباد ہیں۔ ان سے دریافت کر کہ ہم نے انہیں کس طرح تحفظ دیا ہے۔ تم درندوں کا مزاج ہے کہ بے کس عورتوں کو اپنی فطری غذا سمجھ کر استعمال کرتے ہو۔ ہمیں تیرے ہی علاقے کی خواتین نے اپنی بربادیوں کے وہ دردناک افسانے سنائے ہیں کہ انہیں دہراتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ذلیل رتن سنگھ! یہ تیرا گناہ تھا مگر اس کا ذکر کرتے ہوئے ہماری گردن اس لئے جھک جاتی ہے کہ ہم ایک عالی نسب اور اعلیٰ ظرف انسان ہیں۔ اگر خدا نے ہمیں اعلیٰ ظرف نہ بنایا ہوتا تو آج آسمان کی آنکھ بڑا عجیب تماشا دیکھتی۔ ہم اس پر قادر تھے کہ تیری گردن میں طوق غلامی ہوتا اور تیرے پاؤں بھاری زنجیروں کے

بوجھ سے لڑکھڑا رہے ہوتے.......... اور ہم اس پر بھی قادر تھے کہ تیری دستار ہمارے گھوڑوں کے سموں سے رگڑ کر دھجیوں میں بدل جاتی.......... اور ہم اس پر بھی قادر تھے کہ تیرا چہرہ سیاہ کرا دیتے اور تو چتوڑ کی گلیوں میں پاگلوں کی طرح گھوم رہا ہوتا۔ پھر ان ہی ٹھکرائے ہوئے لوگوں کے ہاتھ کھلے ہوتے اور تیرے جسم پر پتھروں کی بارش ہو رہی ہوتی.......... اور ہم اس پر بھی قادر تھے کہ ریاست کے اچھوتوں کو اشارہ کر دیتے۔ پھر یہ حقیر مخلوق تجھ پر تھوک رہی ہوتی اور تیرا خوشبوؤں میں بسا ہوا صاف و شفاف بدن ان ناپاک انسانوں کے لعاب دہن میں نہا جاتا۔ آخر بدسلوکی کا وہ کونسا انداز ہے جو آج ہمارے قبضۂ قدرت سے باہر ہے؟ بخدا! ذلت و رسوائی کا ایسا کوئی زاویہ موجود نہیں جو ہم تجھ پر مسلط نہ کر سکیں۔ آج دنیا کے تمام جبر و ستم ہمارے آگے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں جسے بھی حکم دیں گے وہ پوری طاقت سے تجھ پر نازل ہو جائے گا مگر ہم ایسا نہیں کریں گے کہ آدابِ شاہی ہمیں قہر و غضب کے مظاہرے سے روکتے ہیں تو شکست خوردہ سہی لیکن کل تک اسی زمین پر حکمراں رہ چکا ہے ہم اپنے اصولوں کے احترام میں تیری بد کلامی کو نظرانداز کرتے ہیں۔"

راجہ رتن سنگھ کچھ دیر تک سناٹے کے عالم میں کھڑا رہا مگر پھر اپنے دل کا غبار کم کرنے کیلئے تند و تیز لہجے میں بول اٹھا۔ "تو کچھ بھی کہہ لے علاءالدین لیکن تجھے تیرے ارادوں میں شکست ہو گئی تو جیت کر بھی ہار گیا کہ پدمنی تیری پہنچ سے بہت دور دیوتاؤں کے سائے میں جا چکی ہے۔ بے شک! تجھے فتح حاصل ہوئی مگر یہ فتح ایک اپاہج انسان کی زندگی کی طرح بے رنگ اور ادھوری ہے۔" راجپوت سمراٹ نے علاءالدین کا مذاق اڑانے کی ایک ناکام سی کوشش کی۔

"لعنت زدہ رتن سنگھ! ہماری کوئی فتح نامکمل اور مفلوج نہیں ہوتی۔" سلطان کے ہونٹوں سے ایک بار پھر شرارے پھوٹنے لگے۔ "تو پدمنی کی بات کرتا ہے کہ وہ دیوتاؤں کی پناہ میں چلی گئی! یہ کیسا بے سروپا جھوٹ ہے۔ اس نے آگ میں جل کر خودکشی کر لی۔ یہ اس کی بدترین شکست تھی۔ جس سے ہم روٹھ جاتے ہیں اس پر زندگی اپنے دروازے بند کر دیتی ہے۔ پدمنی کے ساتھ بھی قسمت نے یہی خوفناک کھیل کھیلا ہے۔ یقیناً وہ ہم سے بہت دور جا چکی ہے لیکن جاتے جاتے وہ اپنا وقار ہمارے حوالے کر گئی ہے۔" یہ کہہ کر علاءالدین نے اپنی قبا کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پدمنی کا وہ تاج نکال لیا جو راکھ کے ڈھیر سے برآمد ہوا تھا۔ سلطان کے خدمت گاروں نے تاج کی ساری کثافت دور کر دی تھی جس کے نتیجے میں تمام ہیرے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگانے لگے تھے۔ راجہ رتن سنگھ نے چونک کر اس تاج کو دیکھا جو اس کی محبوب بیوی کی آخری یادگار تھا۔

علاءالدین نے اچانک پدمنی کا تاج اس زاویے سے نیچے پھینکا کہ وہ اس کے پیروں میں جا گرا۔ "خیالوں کی دنیا میں رہنا ہماری عادت نہیں لیکن آج ہم یہ تصور کئے لیتے ہیں کہ پدمنی کا سر ہمارے قدموں پر جھک گیا ہے۔" سلطان کے لہجے میں ایک بار پھر ساری دنیا کی حقارت سمٹ آئی تھی اور وہ رتن سنگھ کو بڑے عجیب انداز سے ذلیل کر رہا تھا۔

خوف و دہشت کی اس فضا میں راجپوت سمراٹ پہلی مرتبہ مسکرایا اور پھر اس دبی دبی مسکراہٹ نے تیز قہقہے کی شکل اختیار کر لی۔ "علاءالدین! یہ کوئی انوکھا کھیل نہیں ہے۔ ناکام لوگ اسی طرح کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ تو خوب جانتا ہے کہ حکمرانوں کے نزدیک تاج و تخت کی قیمت کھلونوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ بھی ایک بے جان کھلونا ہے جو اس وقت تیرے جوتوں میں پڑا ہوا ہے تو چاہے تو اسے توڑ بھی سکتا ہے مگر اس سے پدمنی کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔"

"نہیں رتن سنگھ! تو اپنے آپ کو فریب دے رہا ہے۔" حیرت انگیز طور پر علاءالدین کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔ مگر لفظوں میں وہی نشتروں جیسی کاٹ تھی۔ "حکمراں تو اپنے تخت و تاج ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ اگر یہ دونوں چیزیں تیرے قبضے میں ہوتیں تو آج تیری صورت پر بھکاریوں جیسی پھٹکار نہ برس رہی ہوتی۔ تو واقعتاً بے غیرت ہے کہ سر کی عزت چھن جانے کے بعد بھی مطمئن نظر آتا ہے۔ خیر! یہ تیرا اپنا مسئلہ ہے کہ ہم تجھے شرم و حیا کا درس دینے نہیں آئے ہیں۔ تیری نظر میں بدمنی کا تاج ایک کھلونا سہی مگر ہم اس سے کھیلیں گے نہیں۔ یہ تو ہماری طاقت کا ادنیٰ ترین مظاہرہ تھا کہ ہم نے تجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ کھیل تو اب شروع ہو گا۔ رتن سنگھ! بس چند لمحوں کی بات ہے پھر تو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ علاءالدین کس انداز کا کھلاڑی ہے؟" یہ کہہ کر علاءالدین تخت سے نیچے اتر آیا۔ ملک نصرت خان' تاج الدین عراقی' خواجہ حاجی' ملک ظفر خان اور حضرت امیر خسروؒ بھی سلطان کے پیچھے پیچھے بہت تیزی سے اترے۔ چاروں سپہ سالاروں کی شمشیریں بے نیام تھیں۔ ان کی روشن آنکھیں کسی عقاب کی طرح اپنے شکار پر جمی ہوئی تھیں۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی راجپوت سردار مشتعل ہو کر شاہ والا کی شان میں گستاخی نہ کر بیٹھے اور رتن سنگھ تو مکمل طور پر آزاد تھا۔ موت کے منہ میں پہنچ کر یہ بات قرینِ قیاس تھی کہ راجپوت سمراٹ سلطان پر ناکام حملے کی کوشش بھی کر سکتا تھا ان ہی خطرات کے پیشِ نظر تمام امیرانِ لشکر حد سے زیادہ محتاط اور مستعد ہو گئے تھے۔ ان کی شمشیروں کے زاویوں میں اس قدر تبدیلی آ گئی تھی کہ اگر راجپوت قیدیوں میں سے کوئی سردار ذرا بھی جنبش کرتا تو اس کی گردن اور جسم میں ایک دھاگے کا بھی رشتہ باقی نہ رہتا۔ علاءالدین چند قدم آگے بڑھ کر راجپوت سرداروں کے سامنے ٹھہر گیا۔ جشنِ عام کے تمام شرکاء اس طرح کھڑے تھے کہ انہیں اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"دن رات ڈسنے والے زنداں کے بھیانک اندھیرے یا سلطان کے بے مثال کرم کی روشنی؟ ہڈیوں میں ناسور پیدا کر دینے والی زنجیرِ غلامی یا ہمارے بخشے ہوئے نرم و نازک ریشمی لباس؟" علاءالدین نے ایک راجپوت سردار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس سردار نے بہت کوشش کی کہ وہ سلطان سے نظریں ملا کر بات کر سکے مگر علاءالدین جیسے حکمراں کی چنگاریاں اگلتی ہوئی آنکھوں کی تاب لانا آسان کام نہیں تھا۔ راجپوت سرداروں کی نگاہیں جھک گئیں۔

"ہم اپنے سوال کے جواب میں لمحوں کی بھی تاخیر برداشت نہیں کرتے۔" علاءالدین کا لہجہ اچانک سخت ہو گیا تھا۔ "تم پر کوئی جبر نہیں۔ یہ محض ایک سیاسی تجارت ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کر سکتے ہو۔"

راجپوت سردار نے ایک نظر سلطان کی طرف دیکھا اور اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ اس نے موت کی سختیاں بیچ کر زندگی کے عیش و نشاط خرید لئے تھے۔

"اس کی زنجیریں کھول دو۔" علاءالدین نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ اس کے بعد سلطان نے دوسرے راجپوت سرداروں کو بھی پیشکش کی جسے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر قبول کر لیا گیا۔

"اب ہماری وفاداریوں کا بہ آوازِ بلند اعلان کرو۔" علاءالدین نے راجپوت سرداروں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ قلعۂ چتوڑ کے آخری ستون بھی سلطان کی طاقت کے دباؤ سے کانپنے لگے تھے۔ پھر فضاؤں میں ایک شور بلند ہوا۔ راجپوت سردار اونچی آوازوں میں علاءالدین خلجی کو اپنا فرمانروا تسلیم کر رہے تھے۔

"ہمیں تمہاری زبان پر پورا اعتبار ہے کہ شکست کھانے کے باوجود تم راجپوت ہو۔" علاءالدین نے کہا۔ "اب تم سب لوگ اپنے شاہ کی وفاداری کا عملی ثبوت پیش کرتے ہوئے رتن سنگھ کے منہ پر تھوک

دو۔"

راجپوت سردار سلطان کا حکم سن کر سناٹے میں آ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ علاءالدین زنجیریں کھول کر انہیں اذیت و کرب کے نئے جال میں جکڑ لے گا۔

ابھی چند ساعتیں ہی گزری تھیں کہ علاءالدین نے گرجدار آواز میں کہا۔ "تمہارے اعلانِ وفاداری پر شک کے سائے پڑنے لگے ہیں اور ہم مشتبہ لوگوں کا وجود ایک لمحے کیلئے بھی گوارہ نہیں کرتے۔"

بالآخر چتوڑ کے سرداروں نے اپنی جانیں بچا لیں اور رتن سنگھ کے منہ پر تھوک دیا۔ راجپوت سمراٹ کی ذلت و رسوائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایک سردار نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو علاءالدین نے ملک نصرت کو پکارا۔ "اس پر زندگی حرام کر دو۔ اس نے ہماری نوازشات کی قدر نہیں کی۔"

دوسرے ہی لمحے ملک نصرت خان کی شمشیر بلند ہوئی اور ایک ہی وار میں راجپوت سردار کی گردن کٹ کر زمین پر گر پڑی۔ شدت خوف سے حاضرین کے دل کانپ رہے تھے مگر علاءالدین انتہائی سکون کی حالت میں رتن سنگھ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"رتن سنگھ تو نے ان جاں نثاروں کو چتوڑ کی نگہبانی کے فرائض سونپے تھے۔ یہ تو اپنے تنہا جسم کی بھی حفاظت نہ کر سکے۔" علاءالدین کا لہجہ تحقیر آمیز تھا۔ "ہماری فتح کا یہی راز ہے کہ ہمارے سپاہی زندگی کے مقتل میں سر بیچ دیتے ہیں۔ مگر اپنے شاہ کے جسم پر کوئی خراش نہیں آنے دیتے۔"

راجہ رتن سنگھ غصے سے پاگل ہو گیا تھا اور اس غلیظ عمل سے بچنے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر سلطان کے سپاہی اس کے دونوں بازوؤں کو جکڑے ہوئے تھے۔ "علاءالدین! تو مرد نہیں۔ اگر مرد ہوتا تو ایک اکیلے شخص پر یہ نسوانی حربے استعمال نہ کرتا۔"

علاءالدین خلافِ توقع مسکرایا۔ "مردانہ حربے کیا ہوتے ہیں؟" سلطان نے رتن سنگھ سے پوچھا۔

"تو بھی شمشیر بکف ہوتا اور میں بھی۔ پھر دنیا دیکھتی کہ کون کس معیار کا مرد ہے؟" رتن سنگھ نے علاءالدین کو دست بدست جنگ پر اکسانے کی کوشش کی۔

علاءالدین نے رتن سنگھ کو سر سے پاؤں تک دیکھا جو اپنے ہی سرداروں کے تھوک میں نہا چکا تھا۔

"بڑی عجیب بات ہے کہ شکست کھا جانے والے آخری سانسوں تک نئے نئے بہانے تراشتے رہتے ہیں۔ ہم دشمن کی گالیاں سن کر بھی جذباتی نہیں ہوتے مگر آج تجھے قسمت آزمائی کا ایک موقع ضرور فراہم کریں گے۔" اس کے ساتھ ہی سلطان نے اپنے ایک سپاہی کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی تلوار رتن سنگھ کو دیدے۔

بڑا عجیب حکم تھا جسے سن کر علاءالدین کے جاں نثاروں میں لرزہ سا پڑ گیا۔ ملک نصرت خان تیزی سے آگے بڑھا۔

"نہیں سلطان معظم! غلام کا مقابلہ ایک غلام ہی کرے گا۔"

"نصرت خاں! ہم کئی دن سے دیکھ رہے ہیں کہ تو بار بار بہکنے لگتا ہے۔" علاءالدین کا لہجہ قہرناک تھا۔

"تجھے نہیں معلوم کہ تیرا سلطان اپنا حکم واپس نہیں لیتا۔ زندگی کا کیا ہے کہ ریشمی بستر پر بھی روٹھ سکتی ہے۔ مگر ہمارے الفاظ ہم سے بے وفائی نہیں کرتے۔ جب یہ زبان سے ادا ہوتے ہیں تو زمین پر اپنا مکمل نفاذ چاہتے ہیں۔"

ملک نصرت خان سلطان کے تیور دیکھ کر لرز گیا۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور حضرت امیر خسروؒ سے اشاروں میں کہنے لگا کہ آپ ہی شاہ والا کو سمجھائیں۔ نصرت خان کو یقین تھا کہ اس کی یہ تدبیر کارگر رہے گی۔ عام درباریوں کا بھی یہی تاثر تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ سے عقیدت خاص کے سبب علاءالدین امیر خسروؒ کی

بات نہیں ٹالتا تھا۔ یہی سوچ کر ملک نصرت خان نے خسروؒ سے خاموش التجا کی تھی کہ وہ سلطان کو اس خوفناک ارادے سے باز رکھیں۔ نصرت خان کی جنبشِ چشم کے ساتھ ہی حضرت امیر خسروؒ بڑھے۔

"سلطانِ معظم اس راز سے خوب واقف ہیں کہ یہ عیار لومڑی طعنہ زنی کر کے جنگل کے شہنشاہ کو ایسے عمل پر اکسا رہی ہے جو اس کے شایانِ شان نہیں ہے۔ خاکم بدہن! اگر وقت کی چال الٹی ہو گئی تو ارضِ ہندوستان کے اعصاب میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ یہ صدمہ برداشت کر سکے۔" امیر خسروؒ کو اندیشہ تھا کہ اس دست بدست مقابلے میں کہیں راجہ رتن سنگھ، علاءالدین پر غالب نہ آ جائے۔

"نہیں خسروؒ! ہرگز نہیں۔" علاءالدین نے جوشِ غضب میں امیر کی بات کو بھی رد کر دیا۔ "تم صوفی ہو، اس لئے ہم سے بہتر جانتے ہو کہ قبر کی رات قبر ہی میں کٹے گی۔ اگر چتوڑ کے پتھروں کے مقدر میں ہمارے خون سے رنگین ہونا لکھا ہے تو پھر اسے کون ٹال سکتا ہے؟" یہ کہتے ہوئے سلطان نے اپنے ایک سپاہی کے ہاتھ سے تلوار لے کر رتن سنگھ کی طرف اچھال دی پھر عقب کی طرف مڑے بغیر اس نے نصرت خان کی تلوار طلب کی۔ اگرچہ علاءالدین کی ذاتی شمشیر اس کے پاس موجود تھی لیکن وہ اسے استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"اس کے بعد تو تیرے دل میں کوئی حسرت باقی نہیں رہے گی؟" علاءالدین نے رتن سنگھ سے پوچھا۔

رتن سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا اور تیزی سے جھپٹ کر سلطان پر ایک بھرپور وار کیا۔

علاءالدین اپنے دائیں جانب خم ہوا اور رتن سنگھ کا وار خالی گیا پھر برق کی سی تیزی کے ساتھ سلطان کی شمشیر لہرائی اور راجپوت سمراٹ کی آستین کاٹتی ہوئی گزر گئی۔ علاءالدین کا وار مکمل تھا لیکن زاویہ بدل جانے سے رتن سنگھ کی کلائی پر ابھرنے والا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ پھر بھی خون کی ایک پتلی سی دھار دشمن کے لباس کو رنگین بنا رہی تھی۔

عام سپاہی تو علاءالدین کی زندگی کے بعض اہم رازوں سے ناآشنا تھے مگر تمام مصاحب اور سپہ سالار جانتے تھے کہ ان کا سلطان کس قدر شجاع، جنگجو اور بلند حوصلہ انسان ہے؟ رتن سنگھ سے لڑائی کے دوران باخبر لوگوں کو وہ حادثہ یاد آ گیا جب الماس بیگ "رنتھنبور" کی مہم میں ناکام ہو چکا تھا اور پھر علاءالدین انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں ایک مختصر سا لشکر لے کر راجپوتوں کی سرکوبی کیلئے دہلی سے نکلا۔ سلطان کو شکار کا بہت شوق تھا.......... "تلپت" کے مقام پر ٹھہر کر اس نے چند روز کیلئے اپنی اس پسندیدہ تفریح کو جاری رکھنے کا منصوبہ بنایا ایک دن شکار کھیلنے نکلا مگر معمول کے مطابق رات کو اپنی خیمہ گاہ پر واپس نہ آیا۔

دوسرے دن علاءالدین نے حکم دیا کہ سورج نکلنے سے پہلے "قمرغہ" کا انتظام کیا جائے۔ "قمرغہ" ایک مخصوص شکار گاہ کو کہتے ہیں جس کے طویل و عریض احاطے میں چیتل اور ہرن کھلے چھوڑ دیئے جاتے تھے اور پھر بادشاہ اور دیگر امراء ان جانوروں کا شکار کرتے خدمت گار "قمرغہ" کا انتظام کرنے میں مصروف تھے اور سلطان کچھ فاصلے پر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ایک اونچی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا اسی دوران علاءالدین کا بھتیجا سلیمان شاہ اپنے حامی سپاہیوں کو لے کر وہاں پہنچ گیا اور حکومت کے خلاف سازش کرنے والے ان فوجیوں نے سلطان پر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے علاءالدین کے تمام محافظ ہلاک ہو گئے۔ سلطان نے ایسی جانگداز ساعتوں میں بھی بڑی جوانمردی اور حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ وہ بہت دیر تک تیروں کی یلغار سے بچنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بالآخر اس کے دونوں بازو شدید زخمی ہو گئے۔ اس نازک ترین موقع پر علاءالدین کے ہر وقت بیدار رہنے والے ذہن نے ایک عجیب بہانہ تراشا اور وہ مُردوں کی طرح زمین پر گر پڑا۔ اپنے چچا کا یہ حال دیکھ کر سلیمان شاہ آگے بڑھا اور گھوڑے سے اتر کر علاءالدین کے

قریب پہنچا وہ چاہتا تھا کہ سلطان کا سر اسی طرح قطع کر دے جیسے علاءالدین نے اپنے چچا جلال الدین خلجی کا سر کاٹا تھا۔ مگر جب سلیمان شاہ نے علاءالدین کو غور سے دیکھا تو وہ مر چکا تھا۔ ویسے حقیقت یہ تھی کہ سلطان نے بڑی ہوشیاری سے اپنی سانسیں روک لی تھیں جس کے نتیجے میں دشمن فریب کھا گئے۔ پھر سلیمان شاہ اپنے ہم نوا سپاہیوں کو لے کر "قصرِ ہزار ستون" میں داخل ہوا اور تختِ شاہی پر بیٹھ کر اعلان کرا دیا کہ علاءالدین کو قتل کیا جا چکا ہے اور اب وہ ہندوستان کا خود مختار حکمراں ہے۔ علاءالدین کے بیشتر فوجی "رنتھنبور" کی مہم پر جا چکے تھے، باقی لشکر نے سلیمان شاہ کی باتوں پر یقین کر کے اس کے اقتدار کو تسلیم کر لیا اور پھر ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق دربار میں حاضر ہوا اور نئے بادشاہ کو اس کی کامیابی کی مبارکباد پیش کرنے لگا۔ ادھر محل میں نشاط انگیز جشن کا سماں تھا اور ادھر علاءالدین خلجی دہلی سے اٹھارہ میل دور انتہائی زخمی حالت میں زمین پر پڑا تھا۔ پھر جب سلطان کو ہوش آیا تو خود اس نے اپنے ہاتھوں سے خون دیتے ہوئے زخموں پر پٹیاں باندھیں اور لڑکھڑاتا ہوا خیمہ گاہ تک پہنچا۔ علاءالدین اس غیر متوقع بغاوت کے سبب "رنتھنبور" جانا چاہتا تھا تاکہ اپنے لشکروں کو سمیٹ کر پوری طاقت سے دہلی پر حملہ آور ہو مگر سلطان کے مقرب خاص ملک حمید الدین نے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ سلیمان شاہ ابھی مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوا ہے اگر سلطان اسی وقت دہلی لوٹ جاتے ہیں تو پرانے نمک خوار شاہ والا کو دیکھتے ہی اپنے مرکز کی طرف پلٹ آئیں گے۔ علاءالدین نے ایسا ہی کیا۔ وہ اسی منتشر فضا میں بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ دارالحکومت پہنچا اور بے مثال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قلعے میں داخل ہوا۔ راستے میں جس سپاہی کی نظر بھی سلطان پر پڑتی تھی وہ اپنے سر کو اطاعت میں خم کر کے اسی کے ہمراہ ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ سلیمان شاہ کا عارضی دربار درہم برہم ہو گیا اور وہ باغی فرار ہو کر افغان پور پہنچا مگر سلطان کے سپاہی اس کے تعاقب میں تھے بالآخر سلیمان شاہ کا سر کاٹ کر علاءالدین کے حضور پیش کیا گیا۔

رتن سنگھ سے لڑتے وقت امرائے دربار کے ذہنوں میں اس واقعے کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ علاءالدین راجپوت سمراٹ پر حملہ کرتے وقت بہت زیادہ خونخوار نظر آ رہا تھا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ رتن سنگھ کے ہاتھوں سے تلوار چھوٹ گئی۔ سلطان نے اپنے بلند ہوتے ہوئے ہاتھ کو روک لیا اور حکم دیا کہ چتوڑ کے حکمراں کو دوسری تلوار فراہم کی جائے۔ سپاہی اپنے شہنشاہ کا حکم ماننے کیلئے مجبور تھے۔ رتن سنگھ کو جنگی اصولوں کے خلاف رعایت بخشی گئی مگر وہ سلطان کے مقابلے کا اہل نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں زخمی ہو کر زمین پر گر پڑا۔

علاءالدین نے آگے بڑھ کر اپنی شمشیر اس کے حلق پر رکھ دی۔ "رتن سنگھ! ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ تجھے کسی بھیڑیا بکری کی طرح ذبح کر ڈالیں مگر ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہمیں تجھ جیسے بزدلوں کو زندہ رکھ کر زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر علاءالدین نے تلوار کی نوک سے رتن سنگھ کی پوری قبا چاک کر دی۔ "اب تجھے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہم نے یہ عظیم الشان سلطنت اسی شمشیر کے ذریعے حاصل کی ہے جس کی پیاس سرکشوں اور نافرمانوں کے خون سے بجھتی ہے۔"

رتن سنگھ نے اٹھنے کی کوشش کی مگر زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے لڑکھڑا کر گر گیا۔ علاءالدین نے ملک نصرت خان کو اس کی تلوار واپس کی اور امیر خسروؒ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"خسروؒ! ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے تمہاری درخواست کو جھٹلا دیا مگر یہ تو چند لمحوں کا تماشا تھا اور تم ان ہی لمحات سے خائف نظر آ رہے تھے۔ ہم تمہارے جذبوں کی قدر کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی موت اور زندگی کے مقررہ وقت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔" یہ کہہ کر علاءالدین دوبارہ تخت تک پہنچا اور ایک

عجیب شانِ بے نیازی سے اپنی نشست پر دوبارہ بیٹھ گیا۔

ملک نصرت خان نے نیچے کھڑے ہوکر خون آلود شمشیر کو بوسہ دیا۔ "شاہ والا کے ہاتھوں کو چھوکر لوہے کا یہ ٹکڑا شجاعت کی تاریخ میں معتبر ہوگیا۔"

علاءالدین اپنے جاں نثار کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "نصرت خان! تم بھی ہمارا حرفِ اعتبار ہو۔"

مسلمان سپاہیوں کے بجھے ہوئے چہروں پر شادابی لوٹ آئی تھی۔ پھر چند فوجیوں نے قدم بوسی کا شرف حاصل کرکے سلطان سے التجا کی کہ آج ان لوگوں کو اپنے دلی جذبات کا مظاہرہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ علاءالدین نے ہاتھ کے اشارے سے سپاہیوں کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اس جشنِ فتح میں مسرتوں کا اظہار کرسکتے ہیں۔ سلطان کی جنبشِ لب کے ساتھ ہی شاہی فوجیوں کا ایک دستہ نمودار ہوا۔ ان سب کی شمشیریں بے نیام تھیں۔ وہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ آگے بڑھے اور تلواروں کو اس طرح فضا میں لہرانے لگے کہ جیسے رزم گاہ اچانک محفلِ طرب بن گئی ہو اور پازیبوں کی جگہ شمشیروں کی جھنکار گونجنے لگی ہو۔ یہ ایک مخصوص رقص تھا جس کے ذریعے سلطان کے سپاہی جشنِ فتح منا رہے تھے۔

پھر یکایک چتوڑ کی فضائیں پرشور آوازوں سے بھر گئیں۔

"وقت کا سورج......... خدا کا سایہ......... دنیا کا نگہبان........." یہ وہ الفاظ تھے جو چتوڑ میں تعمیر شدہ مینار پر کندہ کئے گئے تھے اور اسی مینار کے نیچے علاءالدین نے اپنے تخت کو آراستہ کیا تھا۔ بہت دیر تک ایسے ہی نعروں سے فضائیں لرزتی رہیں۔ سلطان کے سپاہی دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ایک حصے سے آوازیں بلند ہوتیں تو دوسرے حصے کے لوگ ان کی تقلید کرتے نتیجتاً چتوڑ کا پورا علاقہ ان نعروں سے گونجنے لگا جن میں سلطان علاءالدین خلجی کی صفات بیان کی گئی تھیں۔

اس اثناء میں شاہی طبیب مولانا بدرالدین دمشقی نے سلطان کے ان ہلکے زخموں کو صاف کیا جو رتن سنگھ سے لڑائی کے دوران کلائیوں اور بازوؤں پر ابھر آئے تھے۔ رتن سنگھ ابھی تک زمین پر پڑا ہوا تھا۔ نعروں کا شور سن کر کبھی وہ آنکھیں کھول دیتا اور کبھی سختی سے پلکیں بند کرلیتا۔ اس کا چہرہ خون اور مٹی کی آمیزش سے بہت بھیانک ہوگیا تھا۔ علاءالدین کی شان میں یہ تعریفی کلمات سن کر اس کی حالت کچھ اور بگڑ جاتی تھی۔ جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آتی تھیں اور دونوں ہونٹ آپس میں پیوست ہوجاتے تھے۔ چہرے کے ساتھ اس کی روح پر شکست کے گہرے زخم تھے جن کی سوزش نے اسے ناقابل بیان اذیت میں مبتلا کردیا تھا۔

اچانک علاءالدین کا دایاں ہاتھ بلند ہوا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ نعرہ زنی ختم کی جائے اور شمشیروں کا رقص روک دیا جائے۔ دوسرے ہی لمحے فضا پر سکون نظر آنے لگی۔ پھر سلطان نے ملک نصرت خان کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "رتن سنگھ کو اٹھا کر ہمارے روبرو لایا جائے تاکہ ہم اسے جلالِ شاہی کا مفہوم سمجھا سکیں۔" علاءالدین کے لہجے سے قہر جھلک رہا تھا۔

ملک نصرت خان تیزی سے نیچے اترا اور رتن سنگھ کو کھینچ کر اٹھایا۔ اس کے سارے جسم پر لباس کی دھجیاں جھول رہی تھیں۔ راجپوت سمراٹ اپنے قدموں کے سہارے چل نہیں سکتا تھا۔ نصرت خان نے دوسرے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ پھر رتن سنگھ کو اس طرح علاءالدین کے سامنے لے جایا گیا کہ وہاں اس سے زیادہ کمزور اور ناتواں شخص کوئی دوسرا موجود نہیں تھا۔ جب سپاہیوں نے چتوڑ کے حکمراں کو چھوڑا تو وہ لہرا کر تخت کے قریب گر گیا۔ ملک نصرت خان نے اسے دوبارہ کھڑا کرنے کی کوشش کی تو سلطان نے منع

کردیا۔

"اسے ہمارے قدموں میں پڑا رہنے دو کہ اس کا صحیح مقام یہی ہے۔"

رتن سنگھ کے دل پر علاءالدین کے الفاظ کا تازیانہ پڑا تو وہ درد کی شدت سے چیخ اٹھا۔ "اس سے بہتر ہے کہ تو مجھے قتل کردے۔"

"نہیں رتن سنگھ! تو نے ہم سے زندگی کی طلب کی تھی مگر تجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ محکوموں اور غلاموں کی زندگی کیسی ہوتی ہے؟" سلطان کے نفرت آمیز لہجے کی کاٹ کچھ اور تیز ہوگئی تھی۔ "آج ہمارے جاہ وجلال کے صدقے میں تو اس زندگی کا مزہ چکھ لے۔" یہ کہہ کر علاءالدین نے ملک نصرت خان کو اشارہ کیا کہ وہ رتن سنگھ کو کھینچ کر اس کا سر شاہ کے پیروں پر رکھ دے۔ نصرت خان نے اپنے فرمانروا کے حکم پر عمل کیا مگر رتن سنگھ تڑپ کر الگ ہوگیا۔ ایک بار پھر اس نے کھڑے ہونے کی ناکام کوشش کی تھی مگر لڑکھڑا کر گر پڑا۔

"رتن سنگھ! آج تیرے لئے ہمارے قدموں کے سوا کوئی جائے اماں نہیں ہے۔" علاءالدین چیخ کر بولا۔ "ہمارے قہر کی گرفت سے تجھے کوئی نہیں چھڑا سکتا۔ اب اسی میں سلامتی ہے کہ تو کھلے دل سے ہمیں سجدہ کرلے ورنہ ہمارے جبروتشدد کی لے تیرے اندازے سے بھی زیادہ تیز ہوجائے گی۔ بخدا! ہم نہیں چاہتے تھے کہ تیرے ساتھ یہ سلوک روا رکھیں مگر تو نے ہمیں مقابلے کیلئے پکارا۔ یہ ہماری توہین تھی لیکن ہم نے اسے گوارہ کیا۔ اب تجھے ہر زاویے سے شکست ہوچکی ہے اس لئے ہوشمندی سے کام لے اور ہمارے قہر کی آگ کو بجھانے کی کوشش کر۔ نہیں تو یہ شعلے بھڑک بھڑک کر تجھے اس طرح جلاتے رہیں گے کہ نہ تو کوئلہ بن سکے گا اور نہ راکھ۔"

علاءالدین کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بلند آواز میں بولا۔ "ہم جسمانی اذیتوں کا سلسلہ ایک شرط پر موقوف کرسکتے ہیں کہ تو ہماری رعایا کے سامنے چیخ چیخ کر کہے۔"

"رتن سنگھ ابن سمر سنگھ کا اقتدار سلطان علاءالدین کے جوتوں کے نیچے۔"

راجپوت سمراٹ کچھ دیر تک انکار کرتا رہا مگر جب اس کے زخموں پر نمک چھڑکا گیا تو وہ چیخ اٹھا۔

"میرا اقتدار سلطان کے جوتوں کے نیچے۔"

علاءالدین خلجی پہلی بار قہقہہ زن ہوا۔ "رتن سنگھ! تو بہت ذہین ہے کہ تو نے اپنے آپ کو ہمارے قہر سے بچا لیا ورنہ ہم تجھ پر وہ ستم ڈھاتے کہ جن کی سختیوں سے آبو اور اراولی کے سینے بھی شق ہوجاتے۔"

اس کے بعد سلطان نے اپنے طبیب خاص مولانا بدرالدین دمشقی کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "رتن سنگھ کے زخموں پر مرہم رکھ دیا جائے کہ اس نے ہماری اطاعت قبول کرلی ہے۔ اسے پہننے کیلئے وہ پوشاک دو کہ اس نے جس کا تصور بھی نہ کیا ہو اور اسے کھانے میں وہ نعمتیں پیش کی جائیں جن کے ذائقے سے اس کی زبان آشنا نہ ہو۔"

سلطان کا حکم سنتے ہی چند سپاہی رتن سنگھ کو سہارا دے کر ان خیموں کی طرف لے گئے جو امراء کیلئے بنائے گئے تھے۔

علاءالدین کے چہرے پر ناقابل بیان خوشی رقص کررہی تھی۔ جشنِ فتح کو یادگار بنانے کے بعد وہ اپنے بڑے بیٹے خضر خان کی طرف متوجہ ہوا جو اس کے بائیں جانب ادب واحترام کے باعث خاموش بیٹھا تھا۔ سلطان نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ وہ "تاج سرخ" حاضر کریں۔ انسانی ہجوم دم بخود تھا اور کوئی

نہیں جانتا تھا کہ علاءالدین آنے والے لمحات میں کیا فیصلہ کرے گا؟

جب خدمت گار "تاجِ سرخ" لے کر آگئے تو سلطان اپنے فرزند خضر خان سے مخاطب ہوا۔

"جانِ پدر! اب تم بڑے ہوگئے ہو اس لئے ہم تمہارے کاندھوں پر نئی ذمہ داریوں کا بار ڈال رہے ہیں۔ یہ ذمہ داریاں حقیقت میں پہاڑوں سے بھی زیادہ گراں ہیں مگر ہمیں یقین ہے کہ تم اس بوجھ کو اٹھالوگے اور اپنے بزرگوں کی روح کو شرمندہ نہیں ہونے دوگے۔"

خضر خان سر جھکا کر باپ کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ علاءالدین تخت سے اٹھا اور اپنے ہاتھوں سے "تاجِ سرخ" خضر خان کے سر پر رکھتے ہوئے بلند آواز میں کہنے لگا۔

"ہمارے تمام جاں نثار گواہ رہیں کہ ہم نے خضر خان کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا۔ یہ فاتح عالم کے خوابوں کی تعبیر اور نسلِ خلجی کا وارث و جانشین ہے۔ اس کے حضور خم ہو جاؤ کہ ہمارے بعد یہی تمہارا شہنشاہ ہوگا۔"

تمام سپہ سالار اور مصاحب خضر خان کے سامنے جھک گئے پھر بہت دیر تک میدان مبارکبادوں کے شور سے گونجتا رہا۔ اس جشنِ مسرت میں پوری اچھوت قوم شریک تھی اور وہ راجپوت عورتیں اور مرد بھی جو سلطان کی فتح کو دل سے تسلیم کر چکے تھے۔ اس ہنگامۂ نشاط میں رام دیو پیش پیش تھا جو بار بار خضر خان کو سجدے کر رہا تھا۔

پھر فضائیں ساکت ہوئیں تو علاءالدین نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی ایک اہم اعلان باقی ہے جسے ہم رتن سنگھ کے زخمی ہونے کی وجہ سے ملتوی کر رہے ہیں۔ اب یہ اعلان جشنِ فتح کے تیسرے دن کیا جائے گا۔ جس میں چتوڑ کے ایک ایک باشندے کی شرکت لازمی ہوگی۔"

علاءالدین خاموش ہوا تو انسانی ہجوم الٹے قدموں چلتا ہوا منتشر ہوگیا۔

☆..................☆..................☆

تیسرے دن بھی جشن کی ہنگامہ خیزیوں کا وہی عالم تھا۔ سلطان نے تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہونے کے بعد راجہ رتن سنگھ کو اپنے روبرو پیش کرنے کا حکم دیا۔ دو روز کی تیمارداری کے بعد رتن سنگھ اس قابل ہوگیا تھا کہ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے مسند تک پہنچ سکے۔ آج کی تقریب میں ایک نمایاں تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ راجپوت سردار بھی سلطان کے عقب میں قطار در قطار کھڑے تھے۔ رتن سنگھ کو علاءالدین کے بائیں جانب سب سے آخر میں جگہ دی گئی تھی۔ جب راجپوت سمراٹ اپنی نشست پر بیٹھ گیا تو سلطان کھڑا ہوا تمام لوگ اس اہم ترین اعلان کے منتظر تھے جس کیلئے آج خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔

سلطان نے ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا پھر اس کی نگاہیں قلعے کے میناروں پر جم گئیں۔ حاضرین پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ ہر شخص دھڑکتے دل کے ساتھ اس بات کا انتظار کر رہا تھا کہ کب علاءالدین کے ہونٹوں کو جنبش ہو اور کب وہ چین کی سانس لے سکے اچانک دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سلطان قلعے کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا۔ "اے ارضِ چتوڑ! ہم نے تیرا غرور خاک میں ملا دیا' تیری آزادیاں سلب کرلیں اور پھر تیرا نام تک بدل ڈالا۔" یہ کہہ کر علاءالدین پلٹا اور اس نے راجہ رتن سنگھ کی طرف دیکھا جو کرسی پر بیٹھا ہوا کانپ رہا تھا۔ "اب یہ چتوڑ نہیں" "خضر آباد" ہے۔" سلطان کی آواز دوبارہ گونجی۔ "ہم اس علاقے کا انتظام اپنے بیٹے خضر خان کے سپرد کرتے ہیں۔ جو شخص خضر خان کا وفادار رہے گا وہ سلطان کو اپنے قریب پائے گا اور جس نے خضر خان سے سرکشی اختیار کی اس پر یہ زمین تنگ ہو جائے گی۔"

ایک بار پھر مبارکبادوں کا شور بلند ہوا۔ جب سلطان کے سپاہی اور مقامی باشندے خضر خان کو درازیٔ عمر

کی دعائیں دے چکے تو علاءالدین نے ملک نصرت خان کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "رتن سنگھ کو اس کے خیمے میں پہنچا دو۔ جب تک ہم "خضر آباد" کے مستقبل سے مطمئن نہیں ہو جاتے اس وقت تک اس کی حیثیت ایک جنگی قیدی سے زیادہ نہیں ہوگی۔"

رتن سنگھ لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ اذیت و کرب کی شدت سے اس کا چہرہ مسخ ہوگیا تھا۔ ابھی انسانی ہجوم چتوڑ کے حکمراں کی ذلتوں کا تماشائی تھا کہ ایک نقیب نے پکار کر کہا۔

"سردار آفریدی' بارگاہِ سلطانی میں شرفیابی کی اجازت چاہتے ہیں۔"

علاءالدین کے ساتھ تمام امیرانِ لشکر اور راجپوت سردار چونک اٹھے۔ علی عامر آفریدی' راج کماری نرملا کے ساتھ خیمہ گاہ کے دروازے میں کھڑا تھا۔

"اس بدنصیب کو بھی حاضر کرو کہ اس کے بغیر ہماری فتح کا جشن نامکمل تھا۔" علاءالدین نے چیخ کر کہا۔

فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب علی عامر آفریدی اپنے سلطان کے الفاظ نہیں سن سکا۔ جب سپاہیوں نے اسے دروازے میں داخل ہونے کی اجازت دی تو فرطِ مسرت سے آفریدی کے قدم کانپ رہے تھے۔ وہ فتح کے جذبوں سے سرشار آہستہ آہستہ سلطان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

علی عامر آفریدی کا چہرہ جوشِ مسرت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اگرچہ اپنی مجبوریوں کے سبب اس نے عملی طور پر جنگ میں شرکت نہیں کی تھی لیکن اس کا دل' اس کا ایک ایک جذبہ مسلسل آٹھ ماہ تک دشمن سے برسرِپیکار رہا تھا۔ پھر آج جب طلسم کدے سے نکلنے کے بعد اس نے اپنے شاہ کا دربارِ عام آراستہ دیکھا تو حادثاتی خوشی پا کر وارفتہ سا ہوگیا۔ خیمہ گاہ تک پہنچتے پہنچتے کئی بار اس کے قدم لڑکھڑائے تھے اور نرملا نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

"میں کیا کروں نرملا؟ مجھ سے یہ خوشی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔" علی عامر آفریدی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا تھا اور اس کی حرکات و سکنات سے بدحواسی ظاہر ہو رہی تھی۔ "تم نے دیکھا کہ میرا شاہ میدان کارزار میں نمودار ہوا اور اس نے دشمن کے غرور کا نشان تک مٹا ڈالا۔ میں نے رتن سنگھ کے دربار میں یہی تو کہا تھا کہ مجھے سلامتی کے ساتھ واپس جانے دو۔ اگر میرے جسم پر ہلکی سی بھی خراش آئی تو میرا سلطان پورے چتوڑ کا چہرہ بگاڑ دے گا۔ وہ بڑا سخت حساب لینے والا ہے۔ اگر اس کے جاں نثاروں کے لہو کا ایک قطرہ زمین پر ٹپکتا ہے تو وہ خون کے دریا بہا دیتا ہے۔ تم دیکھ رہی ہو نرملا کہ یہ دلکش محلات کیسے سونے پڑے ہیں؟ خواب گاہیں قبریں بن گئیں اور پھولوں کی سیجیں شمشان کی چتاؤں میں ڈھل گئیں۔ سب کچھ بدل گیا۔"

"میں تمہاری خوشی میں برابر کی شریک ہوں سردار!" نرملا نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔ وہ آفریدی کی جذباتی باتیں سن کر جبراً مسکرا رہی تھی مگر اس کا دل رو رہا تھا۔ طلسم کدے سے نکل کر جب نرملا نے "منتری بھون" کی شکستہ حالت دیکھی تھی تو کچھ دیر تک اس کی آنکھوں کے سامنے گہرا اندھیرا چھایا رہا تھا اور وہ جلے ہوئے کھنڈر کی دیواروں سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔ آفریدی کو نرملا کے غم کا شدید احساس تھا لیکن وہ ماضی کا ماتم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے راستے میں نرملا کو یہ حقیقت سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ عقیدے کی تبدیلی کے ساتھ انسان کے تمام معاشرتی رشتے بھی بدل جاتے ہیں۔ آفریدی نے بہت پرجوش لہجے میں یہ بھی کہا تھا۔

"علاءالدین کی فتح مسلم قوم کی فتح ہے اور ایک مسلمان لڑکی کی حیثیت سے اس فتح میں تمہارا بھی حصہ ہے۔"

نرملا ایک بار پھر مسکرائی تھی مگر اس کے تبسم میں دل کی خلش نمایاں تھی۔ زمین اور نسل کے رشتے اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹتے۔ برسوں ان کی یادیں ستاتی ہیں' تب کہیں جا کر انسان کا ماضی ایک بھولا ہوا خواب بنتا ہے لیکن کبھی کبھی یہی خواب اس طرح کروٹیں لیتے ہیں کہ انسان حال کے ساتھ ساتھ ماضی کی بھی پرستش کرتا رہتا ہے۔ نرملا نے بتوں کی خدائی سے انکار کر دیا تھا مگر وطن اور دوسرے رشتوں کی محبت ابھی اس کے خون میں موجزن تھی۔ انقلاب تو بڑے بڑے جوانمردوں کو اشک ریزی پر مجبور کر دیتا ہے اور نرملا تو محض ایک نوعمر دوشیزہ تھی جس نے کم سنی ہی میں اپنا سب کچھ کھو دیا تھا۔ اگر آج وہ پرشور آواز میں بھی ماتم کرتی تو یہ کوئی تعجب خیز عمل نہ ہوتا لیکن نرملا نے بے مثال ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔ بس چند لمحے تھے جب وہ ماضی سے لپٹ کر روئی تھی اور پھر اس نے ایک ایک یاد کو اپنے بازوؤں کے حلقے سے الگ کر دیا تھا۔ اب وہ ایک نئی دنیا میں قدم رکھ رہی تھی۔ ایسی دنیا جو اس کیلئے قطعاً اجنبی تھی۔ نرملا نے راجہ رتن سنگھ کو دیکھا جو زخمی حالت میں کچھ سپاہیوں کا سہارا لئے مسند پر کھڑا تھا۔ پھر جیسے ہی آفریدی تخت کے قریب پہنچا' سلطان نے راجپوت سمراٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جا رتن سنگھ کہ آج ایک اہم ترین مسئلے پر ہمیں تیری گواہی درکار ہوگی۔"

علاءالدین کا حکم سن کر رتن سنگھ نے ایک نظر علی عامر آفریدی اور نرملا کی طرف دیکھا پھر چند قدم پیچھے ہٹ کر دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

آفریدی شدید حالتِ اضطرار کا شکار تھا۔ رتن سنگھ کے بیٹھتے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھا اور تخت کے نیچے چار ہاتھ کے فاصلے پر نصف حد تک جھک گیا۔ پھر سیدھا ہوا اور دونوں بازو پھیلا دیئے۔ یہ شاہ کے احترام کا ایک مخصوص انداز تھا۔

"سلطانِ ذی حشم کو یہ عظیم الشان فتح مبارک ہو۔" آفریدی کی آواز بلند تھی اور لہجہ دلی جذبات سے سرشار تھا۔ "بے شمار طالع آزماؤں نے دیارِ ہند کا رخ کیا مگر ایسی فتح کسی کو میسر نہیں آئی۔ آج ساری اقبال مندیاں میرے امیر کے قدم بہ قدم چل رہی ہیں۔ غلاموں کی زبانیں عاجز ہیں کہ وہ کن الفاظ میں شاہِ والا کو خراجِ تحسین پیش کریں۔"

ابھی علی عامر آفریدی کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ علاءالدین کی پرہیبت آواز گونجی۔ "آفریدی! ہم نمک حراموں اور احسان فراموشوں کی مبارکباد قبول نہیں کرتے۔"

علی عامر سناٹے میں آ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چند لمحوں میں اعتبار کی پوری بساط الٹ جائے گی۔ آفریدی کو جس انداز سے گالیاں دی گئی تھیں وہ ایک حساس اور وفادار نوجوان کو ہلاک کر دینے کیلئے کافی تھا۔ آفریدی کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا پورا وجود بدترین زلزلے کی زد میں ہو۔ ذہن پر بیک وقت کئی پہاڑ ٹوٹ کر گر گئے ہوں اور وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا ہو۔ آفریدی نے سلطان کی بارگاہ میں پھیلے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو سمیٹا اور پھر انہی لرزتے ہاتھوں سے دل کو پکڑ لیا۔ آفریدی کو ایسا لگا جیسے علاءالدین نے خود آگے بڑھ کر اس کے سینے میں زہر آلود نشتر اتار دیا ہو۔

"شاہ! کیا سب کچھ ختم ہو گیا؟" علی عامر آفریدی کی آواز کانپ رہی تھی۔ "کیا سازش کی تیز آندھی نے چراغِ وفا بجھا دیا اور کیا یہ غلام درجۂ اعتبار سے گر گیا؟" اذیت و کرب کی شدت سے آفریدی کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا اور خلشِ دل نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔

"تو معتبر ہی کب تھا آفریدی؟" علاءالدین کے لہجے میں نفرتیں ہی نفرتیں تھیں۔ "ہم نے تجھے زندگی کی پستیوں سے اٹھا کر اعتبار کے بلند ترین درجے پر فائز کیا مگر تو ایک غلام زادہ تھا' شاہوں کے احسانات کی قدر

نہ کر سکا۔" علاءالدین کی برہمی کا انداز اس قدر خوفناک تھا جیسے وہ اپنے معتمد سپہ سالار کے بجائے کسی فریب کار دشمن سے مخاطب ہو۔

سلطان کی طرف سے علی عامر آفریدی کو ایک اور گالی دی گئی تھی جو اپنے اثرات میں پہلی سے زیادہ شدید تھی۔ علاءالدین نے اسے احسان فراموش اور نمک حرام قرار دیا تھا۔ وہ اس کلمۂ بد کو کسی طرح برداشت کر گیا مگر جب یہ کہا گیا کہ وہ غلام زادہ ہے تو آفریدی کو محسوس ہوا جیسے سلطان نے اس کے پورے نسب نامے پر سیاہی پھیر دی ہو۔ افغان سپہ سالار اس الزام تراشی پر چیخنا چاہتا تھا مگر اس نے شرطِ وفا نبھاتے ہوئے زہر کا یہ پیالہ بھی حلق سے اتار لیا۔ آفریدی کے دل و جگر کٹ رہے تھے مگر اس کے ہونٹوں پر شورِ فغاں نہیں تھا۔ اسے سنبھلتے سنبھلتے بہت دیر لگ گئی۔ علی عامر کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی غیر معمولی قوتِ ارادی کے ذریعے جلتے ہوئے جذبات پر قابو پا لیا۔ سینے میں درد کی آگ تو اب بھی روشن تھی مگر آفریدی نہیں چاہتا تھا کہ ہزاروں انسانوں کے ہجوم میں وہ اپنے شاہ سے تکرار کرے اور دیکھنے والے ایک نیا تماشا دیکھیں۔ اسی مجبوری نے آفریدی کو روکا اور وہ اپنی روح کے زخموں کو فراموش کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"شاہ! آخر میرا قصور کیا ہے کہ میں درجۂ اعتبار سے گر کر احسان فراموشوں کی صف میں شامل ہو گیا؟" آفریدی کا لہجہ دل کی جراحتوں سے زخمی تھا۔

"ہم کہاں تک تیرے جرائم شمار کریں۔" علاءالدین کے قہر و غضب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ "تیرا یہی ایک گناہ تجھے راندۂ درگاہ کرنے کیلئے کافی ہے کہ تو ہمیں غاصب اور محسن کش قرار دیتا ہے۔" یہ کہہ کر علاءالدین نے رام دیو کی پوری گفتگو دہرا دی۔

آفریدی کی سماعتوں میں آندھیاں سی چلنے لگیں اور پھر سازش کی ان گرم و تیز ہواؤں نے اس کے دل و دماغ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آفریدی کو ہر طرف ایک عجیب سا شور سنائی دے رہا تھا۔ جیسے ساری دنیا مل کر چیخ رہی ہو کہ علی عامر' شاہ کا غدار ہے اور ملک و ملت کا بدترین دشمن ہے' عہد شکن ہے اور اس نے ہندوؤں کے ہاتھوں اپنا ضمیر بیچ دیا ہے۔

"اے خدا! یہ کیسی قیامت ہے جو وقت سے پہلے صرف ایک شخص پر نازل کر دی گئی ہے؟" علی عامر درد کی شدت سے چیخ اٹھا وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہر مجرم اسی طرح خدا کو پکارتا ہے۔" علاءالدین کے غصے کی آگ کچھ اور بھڑک گئی تھی۔

آفریدی نے ایک بار پھر اپنی بکھرتی ہوئی شخصیت کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ "سلطانِ ذی وقار! میرا جرم اپنی جگہ مگر میں درخواست کرتا ہوں کہ یہ گفتگو سرِ دربار نہ کی جائے میں نہیں چاہتا کہ میرے شاہ کا راز خلوتِ خاص سے نکل کر کم ظرفوں کی انجمن میں چلا جائے۔"

"جو خود کم ظرفی کی انتہائی پستیوں میں اتر گیا آج وہ دوسروں کے ظرف پر اعتراض کر رہا ہے۔ آخر بے غیرتی کی یہ کونسی منزل ہے؟" علاءالدین کے ایک ایک لفظ سے اپنے سپہ سالار کیلئے تحقیر کا اظہار ہو رہا تھا۔ "آفریدی! کیا تجھے وہ وقت یاد نہیں جب تو نے ہمارے جاہ و جلال کو رتن سنگھ کے دربار میں نیلام کر دیا تھا اور ایک ایسے شخص سے سیاسی پناہ طلب کی تھی جو ہمارا معتوب تھا۔ پھر تو کس طرح دعویٰ کر سکتا ہے کہ ہمارا راز صرف تیرے سینے کی گہرائیوں میں محفوظ ہے؟"

"میں نے شاہ کے وقار کو ان اذیت ناک لمحوں میں بھی داغدار نہیں ہونے دیا جب اس غلام کی جان پر بن گئی تھی۔" آفریدی کی آواز لرز رہی تھی۔ "وہ رتن سنگھ ہو یا چتوڑ کے دوسرے سردار' ہر شخص یہی

چاہتا تھا کہ میں آپ کی مذمت کروں۔ پھر جب میں نے ان ستمگروں کے ہاتھوں سفارت کے تقدس کو فروخت کرنے سے انکار کر دیا تو پتھروں کے پجاریوں نے مجھ پر وہ سنگ باری کی کہ "آبو" اور "اراولی" بھی چیخ اٹھے۔ کاش! آپ دیکھتے کہ میرے غم پر نا آشنا چٹانیں بھی خون کے آنسو رو رہی تھیں۔"

"تو جھوٹا ہے آفریدی!" علاء الدین کی آواز سے شرارے پھوٹنے لگے تھے۔ "ہم نے تجھے پہچاننے میں غلطی کی۔ تو اول و آخر ایک زہریلا سانپ ہے۔ تیری فطرت میں زہر شامل ہے۔ تو انہیں بھی ڈس لیتا ہے جو تجھے دودھ پلاتے ہیں۔" یہ کہہ کر علاء الدین نے رام دیو کو پکارا وہ شعبدہ باز لرزتا ہوا آگے بڑھا اور سلطان کے روبرو پہنچ کر سجدے میں گر پڑا۔ "رام دیو! اٹھ اور اس کے جرم کی مکمل روداد بیان کر۔" علاء الدین نے چتوڑ کے جادوگر کو اپنی ٹھوکر سے سیدھا کیا۔

اسلام کی قبا پہن کر بدلتے ہوئے موسم کے ساتھ رقص کرنے والے اس عیار انسان نے آفریدی کو ایک ایسے گناہ میں ملوث کر دیا جو سلطان کے نزدیک ناقابل معافی تھا۔ رام دیو پوری رنگ آمیزی کے ساتھ جھوٹی داستان سناتا رہا جسے اس کے شیطان دماغ نے نہایت ہوشیاری سے تراشا تھا۔ سلطان جلال الدین خلجی کے قتل سے لے کر نرملا کماری کے فرار اور وکرم سنگھ کی خودکشی تک اس نے بڑے لرزہ خیز افسانے سنا ڈالے۔ ایسے افسانے جن میں آفریدی کے سوا کسی دوسرے مجرم کا سراغ نہیں ملتا تھا۔

جب رام دیو خاموش ہوا تو علاء الدین نے آفریدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا.......... "تیری روانگی کے بعد لوگوں نے بتایا کہ تو ہمیں غاصب' جابر اور احسان فراموش سمجھتا ہے۔ ہم نے اس خوفناک انکشاف کو ایک تہمت سے زیادہ اہمیت نہیں دی اور یہ سوچ کر نظر بچالی کہ شاید دوسرے درباری تجھ سے حسد رکھتے ہیں مگر جب چتوڑ کے در و دیوار سے بھی یہی آوازیں ابھرنے لگیں تو ہمیں یقین کر لینا پڑا کہ کہنے والے سچ کہتے تھے۔ افسوس! ہم نے تجھ پر کیسا اعتبار کیا کہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے یہ حقیر و ناتواں لوگ بھی ہمارا مذاق اڑانے لگے۔"

"شاہ والا! اگر میں آپ کا وفادار نہیں تھا تو لوگ اس وقت کیوں خاموش رہے؟" آفریدی نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے ایک مضبوط دلیل کا سہارا لیا۔ "مجھ پر الزامات کی یہ بارش روانگی کے بعد کیوں کی گئی؟"

"اس لئے کہ لوگ ہمارے قہر سے ڈرتے تھے۔" علاء الدین نے آفریدی کی دلیل کو جھٹلا دیا۔ "انہیں معلوم تھا کہ جب ہم کسی کو پسند کرتے ہیں تو اس کے خلاف کوئی کمزور بات سننا گوارہ نہیں کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ سلطنت خلجی کے جاں نثاروں نے وقتی طور پر ہمارے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا تھا مگر جب انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوا تو وہ خاموش نہ رہ سکے۔"

آفریدی کی آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کیلئے امید کی جو کرن جھلملائی تھی وہ فوراً ہی بجھ گئی۔ اپنے چچا سلطان جلال الدین خلجی کو قتل کرنے کے بعد علاء الدین ہر وقت احساس جرم میں مبتلا رہتا تھا۔ اس کی اسی کمزوری سے ملک کافور نے فائدہ اٹھایا تھا۔ اب یہ آفریدی کی بدنصیبی تھی کہ رام دیو نے بھی اپنی جان بچانے کیلئے اسی جھوٹ کا سہارا لیا اور علاء الدین کے دل میں علی عامر کی طرف سے ایسی گرہ پڑ گئی جسے کسی طرح بھی کھولا نہیں جا سکتا تھا۔ علاء الدین بڑا فراخدل حکمراں تھا مگر جب ایک بار کسی کی طرف سے بدگمان ہو جاتا تو پھر اس کیلئے معافی کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ آفریدی کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا تھا کہ دشمنوں نے اس کے حوالے سے سلطان کے ایک ایسے زخم کو کھرچ ڈالا جس کی سوزش علاء الدین کیلئے ناقابل برداشت تھی۔

"تو نے ہمیں بھی رسوا کیا اور بے چارے وکرم سنگھ کو بھی جس نے تجھے پناہ دی۔" ایک مختصر سے وقفۂ سکوت کے بعد سلطان کی گرجدار آواز دوبارہ ابھری۔ "تو نے ہمارے اعتبار کا بھی خون کیا اور اس شخص کو بھی خودکشی پر مجبور کر دیا جو احمق ہوتے ہوئے بھی تیرا محسن تھا۔"

"شاہِ والا! میں ایک بار پھر التجا کرتا ہوں کہ ان نازک باتوں کو سرعام نہ چھیڑا جائے۔" آفریدی نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ "غلام کی عزت تو خاک میں مل چکی مگر میں اس عظیم فاتح کے دامنِ جلال کو غبار آلود دیکھنا نہیں چاہتا جس کی منزل ہندوستان کی سرحدوں سے بہت آگے ہے۔ لوگ تو یہ چاہتے ہیں کہ میرا شاہ اپنے جاں نثاروں سے بدگمان ہو کر وسوسوں کے جال میں الجھتا چلا جائے اور دنیا کی تسخیر کا خواب اپنی تعبیر سے پہلے ہی آنکھوں میں دم توڑ دے۔"

"کیا تو سمجھتا ہے کہ ہماری فتوحات تجھ جیسے ناشکر گزار غلاموں کی محتاج ہیں؟" علاء الدین کا غصہ اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا اور اب مثبت دلائل بھی منفی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ جب دلوں میں نفرتیں جڑ پکڑ لیتی ہیں تو سورج کی تیز روشنی بھی رات کا اندھیرا معلوم ہونے لگتی ہے۔ علاء الدین کی بھی یہی کیفیت تھی۔

"نہیں شاہ! آپ کی اقبال مندی ہم جیسے خدمت گاروں کی محتاج نہیں مگر یہی تو وہ ہاتھ ہیں جو اپنے امیر کا پرچم لے کر وادیٔ فنا میں داخل ہوتے ہیں۔" یہ کہتے کہتے علی عامر آفریدی نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ "فاتحِ عالم نے اپنے ایک ادنیٰ غلام سے یہ تو پوچھا ہوتا کہ آفریدی تیرے ہاتھوں کو کیا ہوا ہے؟ یہ بدنما داغ کیسے ہیں؟ اور تیرے چہرے پر یہ زخم کس نے سجائے ہیں؟ اور تیرے جسم پر تشدد کی یہ علامتیں کہاں سے آئی ہیں؟"

"ہم نے تیری چرب زبانی کا یہ انداز آج تک نہیں دیکھا تھا آفریدی!" علاء الدین کے قہر کی وہی حالت دوبارہ لوٹ آئی۔ "تو محض ایک مسخرہ شاعر ہے جسے خوشامد کے آداب بھی نہیں آتے۔"

"اے صاحبِ جاہ و جلال! میں نہ شاعر ہوں اور نہ زمانہ ساز سیاستداں!" سوزشِ دل نے آفریدی کے الفاظ میں آگ بھر دی تھی۔ "میں صرف ایک جاں نثار ہوں' ہمیشہ سر بکف رہنے والا۔ شاہ کا ایک اشارہ ہو اور میں اپنی متاعِ جاں لٹا دوں۔ اس سے زیادہ مجھے وفاداری کا دعویٰ نہیں۔"

علاء الدین چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا اور بہت غور سے آفریدی کو دیکھنے لگا۔ "اگر تو سچا ہے تو ان ہزاروں انسانوں کے ہجوم میں سے کوئی ایک گواہ پیش کر دے۔ پھر ہم سمجھ لیں گے کہ لوگوں نے اپنی حاسدانہ فطرت سے مجبور ہو کر تیرے خلاف سازش کی ہے۔"

آفریدی اس طرح مطمئن نظر آنے لگا جیسے کسی نے اچانک اسے موت کے منجدھار میں ساحلِ حیات کی خوشخبری سنائی ہو۔ "خود راجہ رتن سنگھ گواہ ہیں کہ میں نے بدترین حالات میں شاہ کی سفارت کے فرائض کس طرح انجام دیئے تھے؟" آفریدی نے انتہائی پرجوش انداز میں راجپوت سمراٹ کی طرف اشارہ کیا جو پتھر کے کسی مجسمے کی طرح خاموش بیٹھا تھا۔

آفریدی کا اشارہ دیکھتے ہی رتن سنگھ کے چہرے پر نفرت کے کئی رنگ نمایاں ہو گئے اور اس کی آنکھوں میں آٹھ ماہ پہلے کا وہ منظر ابھر آیا جب ایک مسلم نوجوان اپنے سلطان کی وکالت کرتے ہوئے راجپوتوں کے وجود کی نفی کر رہا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی رتن سنگھ کا ذہن سلگنے لگا اور اب وہ اپنی شکست کا انتقام آفریدی سے لینا چاہتا تھا۔

پھر جب علاءالدین نے اسے پکارا تو وہ اس طرح چونک اٹھا جیسے اسے اپنے گردوپیش کی خبر ہی نہیں تھی۔

"رتن سنگھ! تو اس شخص کو یقیناً پہچانتا ہو گا۔ یہ ہمارا سفیر علی عامر آفریدی ہے۔ رام دیو کے بقول اس نے ہماری شان میں نازیبا کلمات ادا کرنے کے بعد تجھ سے سیاسی پناہ طلب کی تھی۔ اگر یہ حقیقت ہے تو اپنی زبان سے پوری تفصیلات بیان کر کہ ہمارے نزدیک تیری گواہی بڑی اہمیت رکھتی ہے اور ہم نے سنا ہے کہ راجپوت جھوٹ نہیں بولتے۔"

علاءالدین نے آفریدی کے مقدمے میں بڑی خوفناک شہادت طلب کی تھی۔ رتن سنگھ اپنی نشست پر کھڑا ہونے لگا تو سلطان نے اس ٹوکا۔ "زخمیوں کیلئے ضروری نہیں کہ وہ کھڑے ہو کر احترامِ شاہ کا مظاہرہ کریں۔"

رتن سنگھ دوبارہ بیٹھ گیا اور علی عامر آفریدی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ نوجوان تو اس قابل ہی نہ تھا کہ سفارت کا فریضہ انجام دے سکے۔ میرے معمولی درباریوں کو بھی حیرت ہوئی تھی کہ آخر سلطان سے اتنی بڑی غلطی کس طرح سرزد ہو گئی؟" راجہ رتن سنگھ بڑی عیاری سے آفریدی کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔
"اس نادان نے اپنے فرمانروا کی شانِ جلالی ظاہر کرنے کیلئے کہا تھا کہ علاءالدین ایک ایسا بھیڑیا ہے جو اپنے خونی رشتوں کو بھی نگاہِ کرم سے نہیں دیکھتا اسے انسانی لہو پینے کی عادت ہے چاہے یہ لہو سلطان جلال الدین خلجی کا ہو یا خود اس کے اپنے کسی بیٹے کا۔ وہ ہر حال میں قہر کا دیوتا ہے۔" یہ کہہ کر راجہ رتن سنگھ خاموش ہو گیا اور سلطان کی طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس نے ایک بھیانک حقیقت کا انکشاف کر کے علاءالدین کی نسلوں پر احسان کیا ہے۔
"تو نے سنا آفریدی؟" سلطان کسی شعلے کی مانند بھڑک اٹھا۔ "رام دیو نے تو بہت شائستہ الفاظ میں تیرا غلیظ جرم بیان کیا تھا مگر رتن سنگھ نے سب کچھ کہہ ڈالا۔"
ابھی آفریدی کوئی جواب دینے نہیں پایا تھا کہ رتن سنگھ بلند آواز میں کہنے لگا۔ "اگر یہ بےہودہ شخص درمیان میں نہ ہوتا تو یقیناً کچھ اور نتائج برآمد ہوتے۔" راجہ رتن سنگھ نے انتہائی شرمناک جھوٹ کا سہارا لے کر آفریدی کے جرائم کی فہرست مکمل کر دی تھی۔
علاءالدین نے کچھ کہے بغیر اپنے سفیر کی طرف دیکھا جسے رام دیو اور رتن سنگھ کی جھوٹی گواہیوں نے سیاسی تاریخ کا سب سے بڑا گناہ گار ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔
"سمراٹ! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک راجپوت اپنی قومی روایت کو اس طرح پامال کر ڈالے گا۔" آفریدی نے رتن سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے مہاراج رام دیو سے تو کوئی شکایت نہیں کہ ان کا مذہب ہی منافقت ہے مگر آپ تو ایک شمشیرزن تھے۔ پھر آپ نے سورماؤں کی رسم کو اتنے سستے داموں کیوں فروخت کر ڈالا۔"

"سلطان! آپ اس کی بدکلامی کا انداز دیکھ رہے ہیں؟" رتن سنگھ شدتِ غضب سے کانپنے لگا تھا۔
"اس نے آپ کی شان میں کچھ اور بھی نازیبا کلمات ادا کئے تھے۔ اب میں کیا عرض کروں کہ آپ خود ہی تمام حقائق کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔"
"آخر ان لوگوں کو تجھ سے کیا عداوت ہے آفریدی؟" علاءالدین مزید غضبناک ہو گیا تھا۔ "اگر تو سچا ہوتا تو تیرے حق میں کوئی نہ کوئی گواہی ضرور پیش کی جاتی۔ تو پورے چتوڑ سے صرف ایک شہادت ڈھونڈ لا جو تیری بےگناہی کا اظہار کر سکے۔"
آفریدی نے گھبرا کر راجپوت سرداروں کی طرف دیکھا جو تختِ شاہی پر سلطان کے عقب میں صف بستہ

کھڑے تھے۔ "اے مردانِ شجاع! کیا تم بھی یہی کہتے ہو کہ میں نے راجہ رتن سنگھ کے دربار میں اپنے سلطان کی مذمت کرتے ہوئے راجپوت سمراٹ سے سیاسی پناہ طلب کی تھی؟" مگر وہ سب کے سب علی عامر کی تباہی پر متفق ہو چکے تھے۔ یہ انتقام کا ایک سنہری موقع تھا جسے کوئی شخص بھی گنوانا نہیں چاہتا تھا۔
کچھ دیر فضا پر خاموشی طاری رہی پھر تمام راجپوت سرداروں نے بیک زبان راجہ رتن سنگھ کے الفاظ کی تائید کرتے ہوئے آفریدی کی بدقسمتی پر مہرِ ثبت کر دی۔
"کیا تیرے خیال میں یہ بھی جھوٹے ہیں؟" علاءالدین نے چیختے ہوئے کہا۔ "اگر ساری بستی جھوٹی ہے تو کیا میں تیری بےگناہی کیلئے آسمان سے فرشتے طلب کروں؟"
اس کے بعد علی عامر آفریدی نے وہ اشعار پڑھے جو سندھ سے رخصت ہوتے وقت محمد بن قاسم کی وردِ زبان تھے۔
"لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کیسے جوانمرد کو ضائع کر دیا جو رخنہ بندی اور جنگ کے دن کام آتا۔"

سارے دربار پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آفریدی نے تمام حاضرین پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور بڑے کربناک لہجے میں وہ شعر پڑھا جو محمد بن قاسم واسط کے قید خانے میں اس وقت پڑھا کرتے تھے جب اسلام کے عظیم فرزند پر وحشیانہ انداز میں تشدد کیا جاتا تھا۔
"اے زمانے! تجھ پر افسوس کہ تو شرفاء کے حق میں بڑا ہی بددیانت ہے۔"
آفریدی نے کئی بار اس شعر کی گردان کی اور پھر علاءالدین سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "شاہِ والا! اگر سارا عالم بھی میرے خلاف گواہی دینے لگے تو میری وفاداری اور سچائی پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ میں اہلِ وفا کی اولاد ہوں۔ میرے بزرگ سچ پر زندہ رہے اور سچ کی خاطر اپنی جانیں لٹا کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ میں بھی عنقریب اپنے انجام کو پہنچنے والا ہوں۔ سلطانِ ذی حشم! یہ سب کے سب اس لئے میرے دشمن ہو گئے ہیں کہ میں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ جھوٹوں اور منافقوں کا وہ گروہ ہے جو میرے ذریعے آپ کی رسوائی چاہتا تھا میں چتوڑ کا تمام راز دار ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ کون آپ کیلئے کیا جذبات رکھتا ہے؟ یہ مجھے مردہ سمجھ کر مطمئن ہو گئے تھے کہ شاہِ والا کی سماعت تک ان کے غلیظ کلمات پہنچانے والا زندہ نہیں رہا مگر جب میں واپس لوٹ آیا تو یہ خوفزدہ نظر آنے لگے' اس سے پہلے کہ میں ان کے راز فاش کرتا یہ میرے خلاف متحد ہو گئے۔ بدی سے بدی کا اور جھوٹ سے جھوٹ کا بڑا قوی رشتہ ہوتا ہے۔" آفریدی جانتا تھا کہ سلطان کے دل کا غبار صاف نہیں ہو گا مگر پھر بھی وہ اپنے دل کا بوجھ اتار دینا چاہتا تھا۔
علاءالدین گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس نے علی عامر کو کبھی اتنا جذباتی نہیں دیکھا تھا۔ آفریدی کا لب ولہجہ اور چہرے کا رنگ ثابت کر رہا تھا کہ وہ بےگناہ ہے لیکن علاءالدین کے ذہن میں ملک کافور کے الفاظ گردش کر رہے تھے اور ان ہی الفاظ کی گونج رام دیو' راجہ رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں کے بیانات میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ گواہیوں کے اسی تسلسل نے علاءالدین کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ آفریدی کی ہر بات کو جھٹلا دے۔ سلطان اپنے سفیر کا بڑے سے بڑا گناہ معاف کر سکتا تھا لیکن سلطان جلال الدین خلجی کے قتل کے سلسلے میں وہ بہت زیادہ حساس تھا۔ اپنے اس جرم کی پردہ پوشی کیلئے علاءالدین نے ان لوگوں کو بھی قتل کرا دیا تھا جو مرحوم سلطان کیلئے اپنے دل میں ذرا بھی نرم گوشہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آفریدی کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے اتمامِ حجت کے طور پر راجہ

رتن سنگھ کے بھانجے سونگرا مال دیو کو پچھلی صف سے نکل کر آگے آنے کا حکم دیا۔
سونگرا چند قدم کا فاصلہ طے کر کے سلطان کے سامنے خم ہو گیا۔
"آفریدی! تو اسے پہچانتا ہے؟" سلطان نے انتہائی ناخوشگوار لہجے میں علی عامر کو مخاطب کیا۔
"نہیں سلطان معظم! میں اس نوجوان سے واقف نہیں۔" آفریدی نے حیرت سے سونگرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"یہ سونگرا مال دیو ہے' پورے چتوڑ میں ہمارا انتہا وفادار۔ اس نے ہماری خاطر بڑی ایذائیں برداشت کی ہیں کیا تو اس جوانمرد کی گواہی سے مطمئن ہو جائے گا؟"
آفریدی خاموش رہا۔ وہ کیا جواب دیتا کہ چتوڑ کی فضائیں تک اس کی دشمن ہو گئی تھیں۔
"جو شخص اظہارِ حقیقت کیلئے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دے وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔" علاءالدین کی پُرجلال آواز دوبارہ گونجی۔ "سونگرا ایک ایسا ہی نوجوان ہے جسے ہم معتبر سمجھتے ہیں۔ اگر یہ تیرے حق میں گواہی دیدے تو ہم تجھے معاف کر دیں گے آفریدی!"
"کل تک میں بھی آپ کا حرفِ اعتبار تھا شاہ والا!" علی عامر کے ہونٹوں سے آہِ سرد نکل گئی۔
علاءالدین نے آفریدی کی شکایت کو نظرانداز کر دیا اور سونگرا کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔
سونگرا بڑی عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس نے اداس نظروں سے نرملا کماری کی طرف دیکھا جس کے حُسنِ تابناک کو گردشِ روز و شب نے بجھا کر رکھ دیا تھا۔ سونگرا کے دل میں جذبات کی ایک تیز لہر اٹھی اور پھر اس کے ہوش و حواس پر چھاتی چلی گئی۔ سونگرا' نرملا سے شدید محبت کرتا تھا لیکن نرملا اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ ایک راجپوت زادہ اس کا خاموش پرستار ہے۔ سونگرا نے کئی بار کوشش کی تھی کہ وہ اپنی بے چین تمناؤں کا اظہار کر سکے مگر نرملا کی شاہانہ بے نیازی اور غیر معمولی سنجیدگی نے اسے لب کشائی کا موقع نہیں دیا۔ سونگرا کسی مناسب وقت کے انتظار میں تھا کہ آفریدی کی آمد نے سب کچھ بدل ڈالا۔ وکرم سنگھ کو قتل کر دیا گیا مگر سونگرا یہ نہیں سمجھتا تھا کہ وکرم سنگھ کے ساتھ اس کی محبت بھی ایک اندوہناک حادثے کا شکار ہو جائے گی۔ پھر آج جب ایک طویل عرصے کے بعد سونگرا نے نرملا کو آفریدی کے ساتھ دیکھا تو یہ راز فاش ہو گیا کہ اس کی محبوبہ کسی غیر کے دامن سے وابستہ ہو چکی ہے۔ سونگرا کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور دل کی دنیا زیر و زبر ہو کر رہ گئی تھی۔ آخر سونگرا کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور اس نے علی عامر آفریدی کے خلاف شہادت پیش کر دی۔ ایک بے گناہ انسان پر الزام تراشی کرتے ہوئے سونگرا کی زبان میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی تھی مگر جھوٹ اور نفاق کے ہنگامے میں کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ کوئی اس نقطہ پر غور کرتا۔

"بدنصیب آفریدی! اپنی قسمت پر ماتم کر کہ یہ آخری گواہ بھی تیرے کام نہیں آیا۔" علاءالدین کی پُرہیبت آواز گونجی "کیا اب بھی تو منکر ہے کہ تجھ سے یہ گناہِ عظیم سرزد نہیں ہوا؟"
"ہاں سلطان! سردار آفریدی ان تمام الزاموں سے بری ہیں جو ان پر انتہائی بے شرمی کے ساتھ لگائے گئے ہیں۔" ابھی علاءالدین کے قہرناک لہجے کی گونج باقی تھی کہ نرملا نے چند قدم آگے بڑھ کر بلند آواز میں کہا۔ "سونگرا مال دیو پر شہادت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ آخری گواہ تو میں خود ہوں' نرملا کماری' مہامنتری وکرم سنگھ چوہان کی بیٹی۔"
فضا ایک بار پھر ساکت ہو گئی۔ علاءالدین نے حیرت سے اس خوبصورت دوشیزہ کو دیکھا جس پر جلال شاہی اثرانداز نہیں ہو سکا تھا۔ راجہ رتن سنگھ بے چینی سے اپنی نشست پر پہلو بدلنے لگا ور عقبی صف میں

کھڑے ہوئے رام دیو کے چہرے پر زردی پھیلنے لگی۔
"اے میری چچازاد بہن کے شوہر سمراٹ رتن سنگھ! اور اے راجپوت قوم کے معزز سردارو! مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ دھرتی کی کوکھ سے اتنے بے ضمیر انسان آج تک پیدا نہیں ہوئے تم نے بزرگوں کی رسموں کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا اور ان کے روشن چہروں پر کبھی نہ مٹنے والی کالک مل دی۔"
ابھی نرملا کماری کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ رام دیو بدحواس ہو کر پچھلی قطار سے نکلا اور سلطان کے سامنے آ کر گڑگڑانے لگا .... "فاتح عالم! یہی ہے وکرم سنگھ کی آوارہ بیٹی نرملا کماری جو شاہی سفیر کے ساتھ فرار ہو گئی تھی اور جس کے شرمناک فعل نے ایک غیرت مند باپ کو خودکشی پر مجبور کر دیا تھا۔"
"تو جھوٹ بولتا ہے رام دیو! میرے باپ نے خودکشی نہیں کی۔ انہیں قبولِ اسلام کے جرم میں رتن سنگھ نے قتل کیا ہے۔" نرملا نے جوشِ جذبات میں اس حقیقت کو فراموش کر دیا تھا کہ وہ علاءالدین جیسے باجبروت شہنشاہ کے سامنے حاضر ہے اور جہاں اونچی آواز میں بولنا ایک سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔
راجپوت سمراٹ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ "سلطان! یہ لڑکی اپنے باپ کی موت کے صدمے سے پاگل ہو گئی ہے۔ کون ذی ہوش اس کی باتوں پر یقین کرے گا کہ وکرم سنگھ نے مرنے سے پہلے اپنا مذہب بدل ڈالا تھا۔"

"میں اپنے مرحوم باپ کے ایمان پر گواہی دوں گی۔" وکرم سنگھ کی موت کا یقین آ جانے کے بعد نرملا کماری سوگوار ہو گئی تھی اور اس کے لہجے سے دل کا درد جھلکنے لگا تھا۔ "سردار آفریدی بتائیں گے کہ ان کی موجودگی میں مہامنتری نے خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا تھا اور پیغمبر اسلام کی رسالت پر گواہی دی تھی۔ میرے باپ کا یہی جرم تھا کہ جس کی سزا میں ان سے زندگی چھین لی گئی۔"
علاءالدین شدید حیرانی کے عالم میں اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کے انکشافات نے صورت حال یکسر بدل ڈالی تھی۔
"سلطان! میں انصاف چاہتی ہوں۔" نرملا نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "مجھے بتایا گیا ہے کہ اسلام میں جان کا بدلہ جان ہے۔ اس لئے رتن سنگھ کو میرے حوالے کیا جائے۔"
"یہ ریاست چتوڑ کا اندرونی معاملہ ہے۔ ہم اس میں مداخلت نہیں کر سکتے۔" علاءالدین واقعات کے پیچ و خم میں الجھ کر رہ گیا تھا۔
"یہ ریاست کا اندرونی معاملہ نہیں سلطان! یہ ایک مسلمان کے خونِ ناحق کا حساب ہے۔" نرملا بہت زیادہ پُرجوش ہو گئی تھی۔ "مہامنتری کو اس وقت قتل کیا گیا جب وہ ایمان لا چکے تھے۔"
علاءالدین خاموشی سے اس بیباک لڑکی کی گفتگو سنتا رہا۔
"رتن سنگھ کا دامن ایک اور عظیم انسان سنیاسی آنند پال کے خون میں ڈوبا ہوا ہے۔" نرملا کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ "سنیاسی اس طرح ایمان لائے تھے کہ ایک ایک راجپوت ان کی تبدیلیٔ مذہب سے واقف ہے۔ چتوڑ کے تمام باسی جانتے ہیں کہ اس جرم میں آنند پال کی زبان کاٹ دی گئی تھی اور پھر جب انہیں مرنے کے بعد آگ میں جلایا گیا تو چتوڑ کو سیاہ آندھی نے گھیر لیا تھا۔ وہ عذاب بھی سردار آفریدی کے سبب ٹل گیا کہ سنیاسی نے انہیں اپنا بیٹا بنا لیا تھا اس کی گواہی یہ اچھوت بھی دیں گے جو سلطان کے حکم پر جمع ہوئے ہیں۔"
علاءالدین نے ریاست کے اچھوتوں کی طرف دیکھا مگر راجپوتوں کے خوف سے کسی نے آنند پال کے

قتل اور سیاہ آندھی کا اعتراف نہیں کیا۔

"لڑکی! تجھے تیرے باپ کی موت نے بدحواس کر دیا ہے۔" علاءالدین نے بیزار لہجے میں کہا۔ "اگر تو راجپوتوں کو اپنا دشمن سمجھتی ہے تو پھر یہ اچھوت کیوں خاموش ہیں؟ تیرے حق میں کوئی تو گواہی دیتا؟"

"کیا میری شہادت کافی نہیں ہے؟" شدتِ جذبات سے نرملا کی آواز کانپ رہی تھی۔ "میں ایک مسلمان لڑکی ہوں جس نے سردار آفریدی کے کردار سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔"

"آفریدی کا کوئی کردار نہیں کہ وہ اپنا اعتبار کھو چکا ہے۔" علاءالدین کے ہونٹوں سے نفرت کی وہی آگ برس رہی تھی۔

نرملا، سلطان کی اس جارحیت پر احتجاج کرنا چاہتی تھی کہ حضرت امیر خسروؒ کھڑے ہو گئے اور سلطان سے مخاطب ہو کر بولے...... "شاہِ والا! جب ایک شخص بہ آواز بلند کلمہ پڑھ لے تو پھر اس کے ایمان پر کسی شہادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔" امیر خسروؒ نے نرملا کی حمایت کی وہ آفریدی کو بے قصور سمجھتے تھے مگر چتوڑ میں آنے والے واقعات سے بے خبر ہونے کے سبب بھرپور وکالت نہ کر سکے۔

"موت کے ڈر سے ایمان لانے والا مسلمان نہیں ہوتا خسروؒ۔" علاءالدین کو یہ مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔

"یہ لڑکی! اس وقت ایمان لائی جب ہر طرف کافروں کا ہجوم تھا۔" امیر خسروؒ نے سلطان کی ناراضگی کے باوجود اسلامی عقیدے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "حالات بتاتے ہیں کہ اس نے موت کے نرغے میں اسلام قبول کیا پھر موت کا خوف کہاں باقی رہتا ہے؟"

خسروؒ کی دلیل سن کر علاءالدین کے چہرے پر ناگواری کا رنگ ابھر آیا۔ "کیا اس طرح تم اس شخص کی طرفداری کر رہے ہو جو تمہارے سلطان کے وقار کا قاتل ہے۔"

"نہیں شاہِ والا! میں تو سارے معاملات سے بے خبر ہوں۔" امیر خسروؒ نے حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا۔ "پھر بھی اتنا عرض کروں گا کہ آفریدی کو تنہائی میں ایک موقع فراہم کیا جائے تاکہ وہ اپنے موقف کی وضاحت کر سکے۔ میرے خیال میں حالات وہ نہیں جو بظاہر نظر آتے ہیں یقیناً یہاں کچھ ایسے حادثات پیش آئے ہیں جن کی تفصیل جاننا سلطان کیلئے بے حد ضروری ہے۔"

علاءالدین حضرت نظام الدین اولیاؒ سے نسبت رکھنے کے باعث امیر خسروؒ کا بہت لحاظ کرتا تھا اور اس نے آج تک ان کی کوئی بات نہیں ٹالی تھی اس وقت بھی جب خسروؒ نے آفریدی کی سفارش کی تو سلطان پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

"ہم تمہاری درخواست پر غور کریں گے خسروؒ!" یہ کہہ کر علاءالدین اپنے محافظ دستے کے سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "جب تک ہم کوئی فیصلہ صادر نہ کر دیں اس وقت تک آفریدی کو نظر بندی کی حالت میں رکھا جائے۔" پھر ایک مختصر سے سکوت کے بعد سلطان نے دوسرا حکم دیا۔ "اور اس لڑکی کو شاہی حرم سرا میں داخل کر دیا جائے۔"

نرملا تڑپ اٹھی...... "سلطان میں کوئی لوٹا ہوا مال نہیں کہ کسی کنیز یا لونڈی کی طرح شاہی عشرت کدے کی زینت بنا دی جاؤں۔ میں ایک مسلم دوشیزہ ہوں اور میری زندگی سردار آفریدی سے وابستہ ہے۔ اس لئے مجھے بھی ان کے ساتھ حوالۂ زنداں کر دیا جائے۔"

علاءالدین کیلئے ایک کمزور سی لڑکی کا یہ تلخ لہجہ ناقابل برداشت تھا۔ ابھی وہ اپنے ردعمل کا اظہار کرنا ہی چاہتا تھا کہ اسے خیمہ گاہ کے دروازے پر ہلچل سی نظر آئی۔ علاءالدین نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت

دروازے میں داخل ہو چکی تھی۔ پہرے دار سپاہی اسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ عورت بے نیازانہ بڑھی چلی آ رہی تھی۔

"یہ کون ہے رتن سنگھ؟" علاءالدین نے گھبرا کر راجپوت سمراٹ سے پوچھا۔

رتن سنگھ پر بھی دہشت سی طاری ہو گئی تھی وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ "سلطان! یہ بھان متی ہے طوائف زادی چتوڑ کی ٹھکرائی ہوئی ویشیا۔" رتن سنگھ کی آواز خوف سے لرز رہی تھی۔

☆............☆............☆

مائی بھان متی تیزی سے علاءالدین خلجی کی طرف بڑھتی رہی۔ دروازے پر پہرے دار سپاہیوں نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کون ہے اور سلطان سے کس لئے ملنا چاہتی ہے؟ جواب میں بھان متی نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور کسی اجازت کے بغیر دروازے میں داخل ہو گئی تھی۔ سپاہیوں نے بہت کوشش کی کہ وہ اس بوڑھی عورت کو جبراً روک لیں مگر بھان متی نے جب بھی ان کی طرف دیکھا، وہ سہم کر اپنی جگہ رک گئے۔ سپاہیوں کو محسوس ہوا جیسے ان کے جسموں کی طاقت سلب ہو گئی ہے۔ پھر جب بھان متی تخت کے قریب پہنچ گئی تو علاءالدین نے چیخ کر اپنے محافظ سپاہیوں سے کہا۔

"اس ناپاک عورت کو کس نے اندر آنے دیا؟" علاءالدین، رتن سنگھ کی وضاحت کے بعد بھان متی کو طوائف زادی سمجھنے لگا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے بوڑھی عورت کو ناپاک کہہ کر پکارا تھا۔

بھان متی مسکرائی۔ "علاءالدین! یہ تیرے پارسا سپاہی مجھ گناہ گار کو روکنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔"

بھان متی کا اندازِ تخاطب بڑا عامیانہ تھا۔ جیسے اس کے سامنے سلطان علاءالدین خلجی کے بجائے کوئی معمولی انسان ہو۔ فرمانروائے ہند پہلے ہی بھان متی سے خفا تھا کہ وہ اجازت کے بغیر اندر چلی آئی تھی پھر جب اس نے شہنشاہ کو اس کے نام سے پکارا تو علاءالدین مزید غضب ناک ہو گیا۔

"بدنصیب عورت! تجھے خبر نہیں کہ یہ فاتح عالم کا دربار ہے۔" علاءالدین نے قہرآلود لہجے میں بھان متی کو مخاطب کیا۔ "یہاں حاضری کی پہلی رسم سجدہ گزاری ہے۔ کوئی انسان اس وقت تک شرفیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ ہمارے سامنے جھک نہ جائے۔"

"یہ تیرے دربار کے آداب ہیں جنہیں تو خوب جانتا ہے۔" مائی بھان متی کا وہی لہجہ تھا جس سے علاءالدین کیلئے انتہائی تحقیر کا اظہار ہو رہا تھا۔ "اور جن لوگوں نے تیرے لئے سجدہ روا رکھا وہ خود اپنے اعمال کے جوابدہ ہیں۔ میں ایک ذات کے سوا کسی کے آگے خم نہیں ہوتی۔ رتن سنگھ گواہ ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ حرف بہ حرف سچ ہے۔" مائی بھان متی نے راجپوت سمراٹ کی طرف اشارہ کیا جو ابھی تک بدحواسی کے عالم میں اپنی نشست پر کھڑا تھا۔ "اور رام دیو بھی مجھ سے بخوبی واقف ہے کہ میں نے کسی بت کی خدائی کو تسلیم نہیں کیا۔ ساری بستی جانتی ہے کہ میں کون ہوں؟ میرے لئے تمام موسم یکساں ہیں۔ رتن سنگھ راج سنگھاسن (تختِ شاہی) پر بیٹھے یا منہ کے بل اوندھا گر پڑے، کوئی سمراٹ کا لقب اختیار کر لے یا کوئی شہنشاہیت کی قبا پہن لے، میرے نزدیک سب کے سب بھکاری ہیں۔ یہ زمین راجپوتوں کی ہے نہ ترکوں کی۔ زمین کا مالک جو ازل میں تھا وہی آج بھی ہے۔ تم سارے کے سارے کرایہ دار ہو۔ مکان والا تو کوئی اور ہے۔ وہ جب چاہے گا تمہیں اپنے گھر سے نکال باہر کرے گا۔"

علاءالدین نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک ایسی عورت کو دیکھا تھا جو آدابِ شاہی سے قطعاً بے نیاز تھی۔

"ہماری سماعت ایسے گستاخانہ لہجے کی عادی نہیں اور ہماری آنکھیں بے ادبی کے اس منظر کو کبھی برداشت

نہیں کرتیں۔ " یہ کہتے کہتے سلطان کھڑا ہوگیا تھا حاضرین دیکھ رہے تھے کہ شدتِ غضب کی وجہ سے علاءالدین کے جسم پر ہلکا ہلکا لرزہ طاری تھا۔

"اپنا اور میرا وقت برباد نہ کر علاءالدین۔" مائی بھان متی نے اسی جارحانہ انداز میں فرمانروائے ہند کو مخاطب کیا۔ "میں تیرے جاہ و جلال کا مظاہرہ دیکھنے کیلئے یہاں نہیں آئی ہوں۔ مجھے بہت سے ضروری کام ہیں۔ میں شاید زندگی بھر ظلم کی اس تماشا گاہ کا رخ نہ کرتی مگر مجھے اپنے بچوں کی خاطر اس جگہ بھی آنا پڑا جسے دنیا کا سب سے زیادہ لعنت زدہ مقام سمجھتی ہوں۔" بھان متی نے دریا کے اس خوفناک دھارے کی شکل اختیار کرلی تھی جو اچانک پتھروں کا بند ٹوٹ جانے سے آزاد ہوگیا ہو۔ جشنِ فتح میں شریک ہونے والے ایک ایک فرد پر سکوتِ مرگ طاری تھا۔ ہر شخص حیران و پریشان نظروں سے بھان متی کو دیکھ رہا تھا۔ مقامی آبادی کے جو لوگ بھان متی سے واقف تھے وہ بھی حیرت کی موجوں میں ڈوب گئے تھے کہ آج تک انہوں نے اس بوڑھی عورت کو اتنا برہم نہیں دیکھا تھا.......... اور سلطان کے مصاحب' سپہ سالار اور فوجی جو بھان متی سے نا آشنا تھے ان پر تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ شاہ کے وفاداروں نے تو آج تک ایک ہی منظر دیکھا تھا کہ جو بھی علاءالدین کے سامنے آتا زمیں بوس ہوجاتا۔ پھر یہ عورت کون تھی جس نے سلطان کے جبروت کو چند لمحوں میں کسی بھکاری کی شخصیت سے بھی زیادہ بے اثر بنا دیا تھا۔

سلطان کی نازک مزاجیاں بھلا اس بے ادبی کو کس طرح برداشت کرتیں ؟ علاءالدین اپنی جس سنگدلی اور سفاکی کیلئے مشہور تھا اس کی وہی حالتِ قہر لوٹ آئی۔ "اس طوائف زادی کی زبان کاٹ کر اپنے شاہ کے قدموں میں رکھ دو۔" علاءالدین نے ان سپاہیوں کو حکم دیا جو اچھوتوں کی اگلی قطاروں کے قریب کھڑے تھے۔

سپاہیوں نے سلطان کا حکم سنا اور مائی بھان متی کو دردناک سزا دینے کیلئے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کرسکے۔ سپاہیوں کو ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے ان کے جسم منجمد ہوگئے ہوں۔

علاءالدین دوبارہ چیخا۔ "کیا تم دربارِ سلطانی کی روایت کو بھول گئے کہ تمہارا شاہ اپنے حکم کی تعمیل میں ایک لمحے کی بھی تاخیر برداشت نہیں کرتا۔"

سپاہیوں کی بے کسی قابلِ دید تھی۔ وہ اپنی تلواریں بے نیام کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے ہاتھ کسی فالج زدہ انسان کے ہاتھ ہوکر رہ گئے تھے پھر جب غلاموں سے کوئی تدبیر نہ بن پڑی تو وہ رو رو کر کہنے لگے۔ "شاہِ والا! ہمارے جسم پتھرا گئے ہیں ہم اپنی مرضی کے مطابق جنبش بھی نہیں کرسکتے۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ تمہیں ایک فاحشہ عورت کی بدکلامیوں نے خوفزدہ کردیا ہے۔" علاءالدین کی آواز میں کسی زخمی درندے جیسی غراہٹ تھی۔

"سلطانِ معظم! ہم تو کبھی موت سے بھی نہیں ڈرے۔ پھر یہ کمزور سی عورت ہمیں کس طرح دہشت میں مبتلا کرسکتی ہے ؟" سپاہیوں نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہم شہنشاہ کو کیسے بتائیں کہ ہماری قوتِ ارادی فنا ہوگئی ہے اور ہم اپنے آپ کو ایک بے جان مجسمہ سمجھ رہے ہیں۔"

علاءالدین نے بڑی حیرت سے اپنے سپاہیوں کا جواب سنا اور پھر ملک نصرت خان سے مخاطب ہوکر کہنے لگا۔ "آخر تجھے ہمارے حکم کا انتظار کیوں ہے نصرت خان ؟ تو نے آج سے پہلے تو اس قدر بے حسی کا مظاہرہ نہیں کیا کہ ایک غلیظ عورت تیرے آقا کی شان میں مسلسل گستاخیاں کرتی رہے اور تیری تلوار بے نیام نہ ہو۔"

ملک نصرت خان سلطان کی اس طعنہ زنی سے بدحواس ہوگیا۔ اس نے شدید سراسیمگی کی کیفیت میں

شمشیر کھینچی مگر بھان متی پر وار نہ کرسکا۔ وہ بھی کسی ناقابلِ فہم خوف کا شکار ہوگیا تھا۔ علاءالدین اپنے جاں نثار امیرِ لشکر کو برا بھلا کہتا رہا اور پھر اس نے چاہا کہ وہ خود آگے بڑھ کر بھان متی کو اس کی گستاخیوں کی سزا دے۔

سلطان کو مشتعل دیکھ کر حضرت امیر خسروؒ نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "سلطان عالی مقام! ایک بوڑھی عورت کی بدحواسیوں کو درگزر فرمائیں۔ یہ بات منصبِ شاہی کے خلاف ہے کہ ہندوستان کا ایک بااثر حکمران عام انسانوں کی طرزِ کلام میں الجھ جائے۔ یہ درباری آداب سے واقف نہیں۔ اس لئے سلطان کے شایانِ شان الفاظ استعمال نہیں کرسکتی۔ اس کی لغزشِ زبان پر نہ جایئے اور اس سے پوچھئے کہ اسے اس کی کونسی ضرورت یہاں تک کھینچ لائی ہے۔" حضرت امیر خسروؒ بھان متی سے ذاتی طور پر تو واقف نہیں تھے مگر اس کے چہرے کا جلال اور آواز کی تپش دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ وہ کوئی عام عورت نہیں ہے۔ ملک نصرت خان اور دیگر سپاہیوں کا مفلوج ہوجانا بھی کوئی عام واقعہ نہیں تھا۔ خسروؒ کی عارفانہ بصیرت نے اس راز کو جان لیا تھا کہ بھان متی بھی کوئی صاحبِ دل خاتون ہے جس نے خدا کی محبت میں دنیا کی ہر طاقت کو ٹھکرا دیا ہے۔

بھان متی نے چونک کر امیر خسروؒ کی طرف دیکھا پھر علاءالدین کو مخاطب کرتے ہوئے بلند آواز میں بولی۔ "کیا میں نے اپنے خدا کی پرستش اس دن کیلئے کی تھی کہ دنیا کے ہوس پرست میرے جسم پر قابو پالیں اور میری ذات کو ایک تماشا بنا ڈالیں۔ اسے تو اس لئے پوجا تھا کہ وہ آفات و مصائب کے وقت اپنی لازوال قوتوں کے ساتھ میری مدد کو آئے اور مایا جال کے تمام پھندے کاٹ کر آتما کو موہ کے خونی پنجوں سے بچالے۔"

ابھی مائی بھان متی کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ رام دیو بول اٹھا۔ "سلطان! خدا کیلئے اس کی شعبدہ بازیوں سے کوئی تاثر نہ لیجئے گا کہ یہ چتوڑ کی جادوگرنی ہے۔ اس نے خبیث طاقتوں کے بل پر اس نگری کے باسیوں کو بہت ستایا ہے آج جبکہ بت پرستوں کی بساط الٹ گئی ہے تو یہ عیار عورت بھی خدا کا نام لے رہی ہے۔ اسے اپنا حشر معلوم ہے اس لئے اپنے لرزہ خیز انجام سے بچنے کیلئے خدا کی پناہ ڈھونڈ رہی ہے۔ اس کا تعلق نہ مسلمانوں کے خدا سے ہے اور نہ ہندوؤں کے دیوتاؤں سے' یہ محض شیطانی قوتوں کی پجاری ہے۔" رام دیو اپنی ناکامیوں کا انتقام لینے کیلئے مائی بھان متی پر تہمتیں تراش رہا تھا۔

بھان متی رام دیو کی بدحواسیاں دیکھ کر مسکرائی۔ "بے شک! میرا خدا وہ نہیں ہے جو تیرا ہے۔ میں جس نادیدہ قوت کی عبادت کرتی ہوں وہ تیری سمجھ میں آ بھی نہیں سکتی۔" یہ کہہ کر بھان متی علاءالدین سے مخاطب ہوئی۔ "اے دنیا کی فتح کے خواب دیکھنے والے! اس منافق کو درمیان سے ہٹا دے کہ میرے پاس ریاکاروں کی باتیں سننے کا وقت نہیں ہے۔"

علاءالدین بھی کچھ پریشان سا نظر آرہا تھا اپنے تمام تر شاہانہ جاہ و جلال کے باوجود اسے محسوس ہورہا تھا جیسے وہ ایک بوڑھی عورت کو اپنے سامنے جھکانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ آخر سلطان نے ہاتھ کے اشارے سے رام دیو کو بیٹھ جانے کیلئے کہا اور بھان متی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"اے عورت! تو کون ہے اور ہماری بارگاہ میں کس لئے حاضر ہوئی ہے ؟ ہمارے روبرو اپنی ضرورت بیان کر تاکہ ہم تجھے اپنی بخشش و عطا سے نواز دیں۔ اگر تیرے ساتھ اہلِ چتوڑ نے کوئی ظلم کیا ہے تو ہمیں بتا کہ تیرا مجرم کون ہے ؟ ہم تیرے ساتھ پورا پورا انصاف کریں گے۔"

"تو میرا مشکل کشا نہیں ہوسکتا علاءالدین کہ میں کوئی حاجت ہی نہیں رکھتی۔" بھان متی کا انداز گفتگو

بڑا بے نیازانہ تھا۔ ”اگر تو میری ضرورت پوری کرنے پر قادر ہوتا تب بھی میں تیرے سامنے اپنا دامن نہیں پھیلاتی۔ چتوڑ کی بستی والوں نے نہیں، ظلم تو تونے مجھ پر کیا ہے کیسا ظلم کہ میں اس کی شکایت بھی نہیں کر سکتی۔ تجھے کیا خبر کہ آبو کے مندر میں بیٹھ کر میں کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔ میری آنکھوں سے پوچھ جو آنے والوں کا راستہ دیکھتے دیکھتے بجھ گئیں۔ اور میرے ہونٹوں سے پوچھ جو ایک خدا کے نام لیواؤں کیلئے دعائیں کرتے کرتے پتھرا گئے.......... اور میرے قلبِ سوزاں سے پوچھ جو اس تمنا میں جل رہا تھا کہ جب اہلِ ایمان کے روشن چہرے دیکھوں گی تو جانِ حزیں کو قرار آجائے گا.......... مگر علاءالدین! تونے مجھے بہت مایوس کیا۔ تو وہ نہیں ہے جس کے شوقِ دید میں سنیاسی آنند پال ہلاک ہو گیا اور جس کی خاک پریشاں چتوڑ کی فضاؤں میں چیختی پھر رہی ہے اور تو وہ بھی نہیں ہے جسے دیکھنے کی آرزو میں مہامنتری وکرم سنگھ نے موت کو گلے لگالیا۔ تو تو محض ایک دنیا پرست ہے جس کے اقتدار کی بھوک نہ انسانی لاشوں سے مٹتی ہے اور نہ جلے ہوئے مکانات کے ڈھیر سے .... تیرے دربار میں رام دیو جیسے ضمیر فروش اعزاز پاتے ہیں اور آفریدی جیسے جاں نثار مجرم بنا کر پیش کئے جاتے ہیں۔ خوشامدی تیرے تلوے چاٹ کر زر نگار کرسیوں پر بیٹھتے ہیں اور غیرت مند صرف اس لئے زنداں کے اندھیروں میں پھینک دیئے جاتے ہیں کہ وہ تیرے جوتوں کو بوسہ نہیں دے سکتے۔ جس کی بینائی اتنی کمزور ہو کہ وہ اپنے قریب رہنے والے جانبازوں کے چہرے نہیں دیکھ سکتا وہ بھان متی کے ساتھ کیا انصاف کرے گا؟“

”اے عاقبت نااندیش عورت! آخر تو کہنا کیا چاہتی ہے؟“ بھان متی کے الفاظ کی گرمی سے علاءالدین کے دل و دماغ جل اٹھے تھے۔ ”میں نے تیرے بڑھاپے پر ترس کھا کر بہت دیر تک برداشت کیا مگر تیری وحشت یہی سمجھتی رہی کہ علاءالدین ان شعبدہ بازیوں سے خوفزدہ ہے۔ تو نہیں جانتی کہ میں نے اپنی زندگی میں کیسے کیسے مداری اور کیسے کیسے جادوگر دیکھے ہیں۔ تو اول و آخر ایک ضعیف و ناتواں عورت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تیری زباں بندی کیلئے مجھے جبر سے کام لینا پڑے اور پھر تاریخ ہند میری طرف یہ کہہ کر انگلی اٹھائے کہ علاءالدین کمزوروں اور بے کسوں کے گناہوں کو معاف نہیں کر سکا۔“

”مجھے تیرے بارے میں جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکی۔“ بھان متی کی آواز سے وہی جلال نمایاں تھا۔ ”میرے دم کو غنیمت جان علاءالدین کہ میں اپنے بچوں کی وجہ سے تجھ تک پہنچی اور تجھے آنے والے زمانوں سے خبردار کیا۔ میں جانتی ہوں کہ تو نے اپنی آنکھوں اور کانوں پر بے خبری کے پہرے بٹھا لئے ہیں اور یہ پہرے اس وقت تک نہیں اٹھیں گے جب تک تجھے دو گز زمین کے اندر اینٹوں اور پتھروں کے نیچے نہیں دبا دیا جائے گا۔“

بھان متی کے لہجے کی نشتریت اس قدر خوفناک تھی کہ علاءالدین اس کی سوزش سے کانپنے لگا۔ ”ہماری بارگاہِ جلالی کو اس فاحشہ عورت کے وجود سے خالی کر دو۔“ سلطان نے وحشت زدہ ہو کر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔

سپاہی بڑی عجیب کشمکش کا شکار تھے وہ اپنے فرمانروا کے حکم پر بلا تاخیر عمل کرنا چاہتے تھے مگر ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کر سکتے تھے۔ تمام فوجی ایک بار پھر لرز کر رہ گئے اور انہیں اپنے دست و پا مفلوج سے نظر آنے لگے۔

”علاءالدین! تیرے یہ غلام کچھ نہیں کر سکتے۔ آج خدا کو یہی منظور ہے کہ وہ تیری بے پناہ طاقتوں کے سامنے ایک بے سہارا فاحشہ کو سربلند رکھے۔“ اچانک بھان متی کی آواز لرزنے لگی اور اس کی پلکیں اس بھاپ سے بھیگنے لگی تھیں جو دل کے جلنے سے پیدا ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ جذبوں کا سلگتا ہوا بادل

بھان متی کے رخساروں پر برس جاتا، وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی علی عامر آفریدی کے قریب پہنچی۔ جشنِ فتح میں شریک ہونے والا ایک ایک فرد بوڑھی عورت کی ناقابلِ فہم حرکات دیکھ رہا تھا۔ بھان متی چند لمحوں تک آفریدی کو دیکھتی رہی پھر علاءالدین کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ”سلطان! یہ میرا بیٹا علی عامر آفریدی ہے۔ اس عورت کا بیٹا جسے اہلِ چتوڑ طوائف زادی کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس نے میری کوکھ سے جنم نہیں لیا مگر یہ میرے شریر کا وہ انگ ہے کہ اگر اسے دکھوں کا کوئی کانٹا چھولے تو میں سر سے پاؤں تک زخمی ہو جاؤں اور میری روح خراشوں سے بھر جائے۔ ایک خدا کے پوجنے والے دھرتی کے کسی بھی کونے میں رہیں، ان کے بیچ فاصلوں کی کتنی ہی دیواریں کھنچ جائیں لیکن وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ یہ آفریدی میرا بیٹا جس نے چتوڑ کے بت کدے میں اپنے کردار کا چراغ روشن کیا، آج اس لئے اندھیروں میں بھٹک رہا ہے کہ اس کی وفا پر کوئی گواہی دینے والا موجود نہیں۔ جن کی آنکھیں تھیں وہ اندھے بن گئے اور جو زبانیں رکھتے تھے انہوں نے اپنے ہونٹ سی لئے۔“ یہ کہہ کر بھان متی چند لمحوں کیلئے خاموش ہوئی اور پھر اس نے رتن سنگھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”عظیم راجپوتوں کے عظیم فرزند! تجھے خبر ہے کہ چتوڑ پر یہ عذاب کیوں نازل ہوا؟ اس لئے کہ تو بڑا بن بیٹھا تھا اور تو نے خدا کے ان بندوں کو حیوانوں سے بدتر قرار دیدیا تھا جو اپنی ماؤں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے اور جن کے خون کا رنگ تیرے خون کی طرح سرخ تھا۔ تو نے انسانی حقوق غصب کر لئے اور ان لوگوں کو نیچ بنا کر جانوروں کے درجے سے بھی گرا دیا جو تیری ہی طرح آدم کی اولاد تھے۔ تو نے اطلس و کمخواب پہنا اور ان کے جسم ٹاٹ کی دھجیوں کو ترستے رہے۔ ان کے پیٹ بھوک کی آگ میں جل کر کوئلہ بن گئے اور تیرے گھوڑوں اور کتوں کی توانائی میں اضافہ ہوتا رہا۔ پھر جب وہ اپنی محرومیوں کا ماتم کرنے تیرے عالی شان قلعے کی طرف بڑھے تو ان کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے کہ وہ سینہ کوبی نہ کر سکیں۔ ان کے شورِ فغاں سے تیری نیندوں میں خلل واقع ہوتا تھا، اس لئے ان کے ہونٹوں پر پگھلا ہوا سیسہ ٹپکا دیا گیا کہ اس نگری سے فریاد اور احتجاج کی رسم ہمیشہ کیلئے اٹھ جائے۔ ان کے دل میں آہنی میخیں ٹھونک کر سرِراہ چھوڑ دیا گیا کہ پھر کوئی غریب زندگی کا ارمان ہی نہ کر سکے۔ تیری سفاکیوں نے خدا کی بستی کو مذبح خانہ بنا ڈالا اور اپنے ہم جنسوں کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ چتوڑ کے درندے بھی شرما کر جنگلوں میں روپوش ہو گئے وہ کونسی رسمِ گناہ تھی جس نے تیرے دورِ حکومت میں فروغ نہیں پایا اور وہ کونسا ظلم تھا جسے تیری حمایت حاصل نہیں رہی۔“ ستر سال سے جو لاوا بھان متی کے سینے میں پک رہا تھا آج وہ ہونٹوں کے راستے بہہ نکلا تھا۔ ”پھر جب تو اپنے جور و جفا پر مطمئن ہو گیا تو آسمان نے تیری ذلت اور تباہی کے دروازے کھول دیئے۔ تو اور یہ تیرے ستم پیشہ ساتھی کیسی شرمناک حالت میں زندہ ہیں؟ ایسی لعنت زدہ زندگی تو کتے بھی قبول نہیں کریں گے۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ یہ ناپاک جانور بھی اس وقت تک چیختے رہتے ہیں جب تک انہیں ہلاک نہ کر دیا جائے۔ مگر تیری روح کی غلاظت نے تجھ سے چیخنے کا یہ حوصلہ بھی چھین لیا ہے۔“

پوری خیمہ گاہ پر ایک تکلیف دہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بھان متی ایک بار پھر مڑی اور آفریدی کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ ”میرے بیٹے! یہ ظلم کے خالق، یہ تشدد کے بندے اور حرص و ہوس کے غلام، تیری بے گناہی پر شہادت نہیں دیں گے۔ اگر یہ مظلوموں کی دادرسی کرتے اور حق کو حق سمجھتے تو ان پر کوئی عذاب نازل نہیں ہوتا۔ قہر تو ٹوٹا ہی اس لئے ہے کہ یہ سچ کو چھپاتے تھے اور جھوٹ کی پرورش کرتے تھے۔ تیرے کردار پر سنیاسی آنند پال کی گواہی کافی ہے کہ وہ مردِ پارسا تجھے اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔ تجھے وکرم سنگھ کی گواہی سے مطمئن ہو جانا چاہئے کہ وہ تیری خاطر ہلاک ہو گیا اور یہ میری معصوم بچی نرملا، جس نے تیرے لئے اپنا سب کچھ تیاگ

دیا' اس کی رفاقت کی قدر کرنا۔ بس یہ تین گواہیاں بہت ہیں۔ تجھے کیا معلوم کہ اکثر انسانوں کی پوری زندگی میں ایک گواہی بھی میسر نہیں آتی۔ تو خوش نصیب ہے میرے بچے کہ ایسے محبت کرنے والے کسے ملتے ہیں ؟ اگر سچ کے راستے میں کچھ لوگ تجھ سے بچھڑ جائیں تو زیادہ غم نہ کرنا کہ اس منزل تک وہی پہنچتے ہیں جن کی روحیں فگار ہوتی ہیں' جن کے دلوں سے خون کے قطرے ٹپکتے رہتے ہیں اور جن کے سینوں سے ہر موسم میں زخموں کی فصل اگتی رہتی ہے۔ میری طرف دیکھ آفریدی ! اپنی ماں کی دھندلی آنکھوں کی طرف۔ "

علی عامر گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے مہامنتری وکرم سنگھ اور نرملا کماری کی زبانی بھان متی کے تذکرے سنے تھے۔ آفریدی کو وہ دردناک منظر یاد آ گیا جب رتن سنگھ کے سپاہیوں کی شدید ضربات نے کچھ دن کیلئے اس کی بینائی چھین لی تھی اور وکرم سنگھ کا وفادار ملازم چندر سنگھ رات کے اندھیرے میں بمل شاہ کے مندر پہنچا تھا۔ پھر جواب میں مائی بھان متی نے کہا تھا کہ آفریدی اس کا بیٹا ہے جو بہت جلد صحت یاب ہو جائے گا۔

آفریدی نے غور سے اس پارسا عورت کی طرف دیکھا جسے راجپوتوں کی جابرانہ رسموں نے طوائف زادی بنا دیا تھا اور وہ ستم رسیدہ خاتون دیوتاؤں کی فوج سے بیزار ہو کر بت خانۂ چتوڑ میں ایک خدا کی پرستش کرنے لگی تھی۔ آفریدی کے ذہن کی سطح پر یادوں کا عکس ابھرا اور پھر اس نے مائی کو پہچان لیا۔ بھان متی اس وقت علی عامر کے خواب میں آئی تھی جب وہ طلسم کدے میں ایک مفرور قیدی کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ مائی نے اسے نصیحت کی تھی کہ وہ نرملا کا خیال رکھے۔ آج جب اسی غمگسار ماں کو اتنے قریب پایا تو آفریدی بے قرار ہو کر رونے لگا۔

" بیٹے ! ابھی بہت طوفان آئیں گے' بڑے حشر اٹھیں گے اور تجھ پر زمین تنگ ہو جائے گی۔ تو غیروں کی کرم فرمائیاں دیکھ چکا مگر ابھی اپنوں کی مہربانیاں باقی ہیں۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں جب زندگی پر سے تیرا اعتبار اٹھ جائے گا اگر مایوسیوں کے ایسے جانگداز لمحے تجھے گھیر لیں اور نجات کی کوئی راہ باقی نہ رہے تو مجھ گناہ گار کی اذیتوں کو یاد کرنا۔ آفریدی ! میں وہ ہوں جس نے اس ملامت کدے میں نوے سال گزارے ہیں۔ سنیاسی آنند پال اور وکرم سنگھ کے سوا انسانوں کی اتنی بڑی بستی میں میری بے گناہی پر بھی گواہی دینے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے بڑے بڑے دھرماتماؤں کو دیکھا ہے ان کی زبانیں بھی اقتدار کے آگے گنگ ہو گئی تھیں۔ میری بجھتی ہوئی آنکھوں کے سامنے بہت سے لرزہ خیز مناظر ابھر رہے ہیں۔ میں تجھے خون کے دریاؤں سے گزرتا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ اہل درد کا ہر زمانے میں کیسا انجام ہوتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہوس کار دنیا کے بازار میں تو اپنی متاع درد کو نیلام کر دے۔ خبردار ! میرے بیٹے ! ایسا ہرگز نہ کرنا کہ یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔ اگر تیرا جسم آرے سے بھی چیرا جائے تو رحم کی بھیک نہ مانگنا۔ سانسوں کا شمار پورا ہو کر رہے گا۔ وقت سے پہلے ان کے تسلسل کو کوئی توڑ نہیں سکتا۔ " یہ کہہ کر مائی بھان متی نے اپنے دونوں بازو پھیلائے اور آفریدی ایک ایسی عورت کی آغوشِ محبت میں سما گیا جس سے اس کا بظاہر کوئی رشتہ نہیں تھا۔ " آخری بار اپنی ماں کے سینے پر سر رکھ کر رو لے کہ عنقریب شامِ فراق طلوع ہونے والی ہے پھر اس کے بعد اندھیرا ہے' روح کو پگھلا دینے والا قاتل اندھیرا۔ "

آفریدی کے تصور میں اپنی والدہ شائستہ بیگم کا چہرہ ابھر آیا اور پھر اس کی آنکھوں سے اشکوں کے آبشار جاری ہو گئے۔ " تو بھی آ ! میری بچی نرملا !" بھان متی نے لرزتے ہوئے لہجے میں وکرم سنگھ کی بیٹی کو آواز دی۔ نرملا جو پہلے ہی اپنے باپ کی موت کا ذکر سن کر اشکبار تھی۔ مائی کی مادرانہ شفقت پا کر مزید بے اختیار ہو گئی اور ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ " بیٹی ! زندگی سے بدگمان نہ ہونا۔ ہر طرف کانٹے ہی کانٹے بکھرے ہوئے ہیں۔ ایسے خارزار میں آنچل الجھ بھی جاتا ہے اور تار تار بھی ہو جاتا ہے' مگر روح کو زخمی نہ ہونے دینا۔ "

علاء الدین اور دوسرے درباری ایک عجیب سے عالمِ حیرت و سکوت میں یہ ناقابل فہم منظر دیکھ رہے تھے۔

اچانک بھان متی نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور بڑے کربناک لہجے میں پکارنے لگی۔ " اے خدا ! تیرے سوا کوئی نہیں' کوئی نہیں' کوئی نہیں۔ " پھر اس نے نرملا اور آفریدی کے سر پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ " میں کام چور اور گناہ گار اس لائق تو نہیں کہ تجھ سے اپنی مزدوری مانگوں مگر کائنات کا ہر ذرہ میرے کانوں میں کہتا ہے کہ تو بے حساب دینے والا ہے۔ اپنی اسی بے مثال بخشش کے صدقے میں میرے بچوں کی حفاظت کر۔ "

یہ کہہ کر بھان متی مڑی اور چند قدم کا فاصلہ طے کر کے تخت کے قریب پہنچی۔ پھر حضرت امیر خسروؒ سے مخاطب ہو کر بولی۔ " اس شہنشاہ کی خدمت میں میرا سلام پیش کرنا جس کے در کے بھکاری بھی شاہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ " بھان متی کا اشارہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی طرف تھا۔

امیر خسروؒ نے علاء الدین کی خفگی کا احساس کئے بغیر کہا۔ " محترم خاتون ! میں پیرومرشد کے حضور تمہارا سلامِ عقیدت پیش کر دوں گا۔ "

خسروؒ کا جواب سن کر علاء الدین کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا مگر وہ زبان سے کچھ نہیں بولا۔

" اور شہنشاہ سے یہ بھی کہنا کہ داسی بہت تھک گئی ہے۔ اب وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے۔ دعا کریں کہ اس کا انجام بخیر ہو۔ " یہ کہتے کہتے بھان متی آبدیدہ ہو گئی۔

" ہاں ! میں شیخ کے حضور سب کچھ عرض کر دوں گا۔ " بھان متی کی کیفیت دیکھ کر امیر خسروؒ بھی اداس ہو گئے تھے۔

" خدا دونوں جہان میں تمہارا بھلا کرے۔ " بھان متی تیزی سے پلٹی اور چند لمحوں کیلئے آفریدی کے پاس ٹھہر گئی۔ " بیٹے ! میں تیرا انتظار کروں گی۔ مجھے اس وقت تک موت نہیں آئے گی جب تک تو دوبارہ چتوڑ نہیں پہنچ جائے گا۔ میری آنکھیں تیرے راستے میں بچھی رہیں گی۔ میں تجھے اسی بمل شاہ کے مندر میں ملوں گی جہاں ہر طرف بت ہی بت ہیں اور جہاں بیٹھ کر میں نے پون صدی تک پتھر کے خداؤں کا انکار کیا ہے۔ اگر تیرے آتے آتے موت میرے بدن کو چھو لے تو مجھے آبو کے کسی تاریک اور ویران گوشے میں دفن کر دینا۔ " یہ کہہ کر بھان متی نے اپنی زرد چادر کے پلو کو ایک جھٹکے کے ساتھ کاندھے پر ڈالا اور چیخ کے انداز میں نعرہ زن ہوئی۔

" سدا رہے نام اللہ کا۔ "

آواز کیا تھی' ایک زلزلہ سا تھا۔ جشنِ فتح میں شریک ہونے والے لرز کر رہ گئے۔ علاء الدین کو محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ بھان متی کے جاتے ہی اس نے چونک کر امیر خسروؒ سے پوچھا۔

" یہ عورت کون تھی خسرو۔ " علاء الدین کے لہجے میں تھکن بھی تھی اور جھنجلاہٹ بھی۔

اس سے پہلے کہ امیر خسروؒ سلطان کے سوال کا جواب دیتے' رام دیو بول اٹھا۔ " یہ بھان متی ہے' یک راجپوت سردار کے گناہوں کا پھل۔ روپ متی کی ناجائز اولاد جسے محرومیوں نے پاگل بنا دیا ہے۔ بمل شاہ کے مندر کے ایک کمرے میں پڑی رہتی ہے۔ کمزور عقیدے کے لوگ اسے " جادوگرنی " کے نام سے بھی پکارتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ صدمات کی زیادتی نے اس کے ہوش و حواس چھین لئے ہیں۔ آپ اس کی مجنونانہ حرکتوں پر کوئی دھیان نہ دیں۔ "

" اور یہ سنیاسی آنند پال کون تھا ؟ " علاء الدین نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ بھان متی کے طرزِ عمل نے

سلطان کے مزاج کو برہم کر دیا تھا۔

"وہ بھی بھان متی کی طرح ایک دیوانہ تھا۔ اپنی ریاضت کے نشے میں حکومت کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ آخر ایک دن قتل کر دیا گیا۔" رام دیو نے اس خوفناک راز کو چھپانے کی کوشش کی جس کا آفریدی کی ذات سے بہت گہرا تعلق تھا...... اور اگر وہ راز فاش ہو جاتا تو شاہی سفیر کے خلاف بچھائی جانے والی سازشوں کی بساط بھی الٹ جاتی۔

ابھی علاء الدین رام دیو سے کچھ سوالات کرتا کہ یکایک خیمہ گاہ کے دروازے پر ہلچل سی ہوئی۔ سلطان نے چونک کر ادھر دیکھا۔ چند محافظ سپاہی تیزی سے فرمانروا کی طرف آرہے تھے۔ ان کے چہروں پر نظر آنے والی گھبراہٹ صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ صورت حال جاننے کیلئے ملک نصرت خان نیچے اتر آیا۔ سپاہی امیر لشکر کو دیکھ کر ٹھہر گئے۔ پھر انہوں نے سرگوشیوں میں ملک نصرت خان سے کچھ کہا جسے سن کر علاء الدین کے جانباز سپہ سالار کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔

"انہیں شاہی خیمے میں اس طرح پہنچا دو کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔" ملک نصرت خان نے سپاہیوں کو حکم دیا اور خود تیزی سے پلٹ کر سلطان کے قریب پہنچا۔ علاء الدین بڑی حیرت سے ان رازدارانہ سرگرمیوں کو دیکھ رہا تھا پھر جب ملک نصرت خان نے سرگوشی کرتے ہوئے اسے ایک نیا واقعہ پیش آنے کی اطلاع دی تو چند لمحوں کیلئے سلطان کے چہرے پر بھی پریشانی کے سائے پھیل گئے مگر علاء الدین ایک انتہائی مضبوط قوت ارادی کا انسان تھا۔ اس نے اس فکر انگیز خبر کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور حاضرین کو محسوس تک نہ ہو سکا کہ دہلی کی طرف کیسا ہولناک طوفان بڑھ رہا ہے۔

جشن فتح کے شرکاء ملک نصرت خان اور محافظ سپاہیوں کے درمیان ہونے والی پراسرار گفتگو پر چونکے ضرور تھے لیکن علاء الدین نے اپنی باتوں سے ان کے تمام شکوک وشبہات کو زائل کر دیا تھا۔ وہ اپنے وفاداروں کیلئے مراعات کا اعلان کرتا رہا اور نافرمانوں کو بدترین عذاب کی خبر دیتا رہا۔ علاء الدین نے بڑی ذہانت سے یہ نازک وقت گزارا۔ اس نے حسب معمول انتہائی صبر و سکون کے ساتھ جشن کی تقریبات جاری رکھیں اور علی الاعلان کہا۔

"جو خضر خان کا اطاعت گزار ہے' وہ میرا بھی فرمانبردار ہے۔ جس نے میرے نامزد کارندوں کے احکام پر عمل کیا گویا اس نے "قصر ہزار ستون" سے وفاداری کا ثبوت فراہم کیا...... اور ہم ایسے وفاداروں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کیلئے ہماری طرف سے بڑے انعام واکرام کی خوشخبری ہے...... اور جس نے خضر خان کے کسی فرمان کو جھٹلا دیا' اس نے گویا ہمارے احکام کی نفی کر دی۔ اور ہم ایسے سرکشوں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ ہمارا یہ مزاج بھی نہیں کہ ہم باغیوں کو خاموشی کے ساتھ اپنی حدود مملکت سے نکل جانے دیں۔ جس نے ایک بار عہد توڑا' وہ ہمیشہ کیلئے راندۂ درگاہ ٹھہرا...... اور ہمارے قانون میں کسی راندۂ درگاہ کی کم سے کم سزا یہ ہے کہ اس سے اس کی سانسیں چھین لی جائیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ایسے مجرموں کیلئے ہمارے قہر کی آخری شکل کیا ہوگی؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نافرمانوں کی لاشوں کو چوراہے پر لٹکا دیں...... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم ان کے بے جان جسموں کو جنگلوں میں پھنکوا دیں کہ انسانی گوشت سے مردہ خور پرندے بہت لذت حاصل کرتے ہیں...... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم ان کے ساتھ ان کی نسلوں کا بھی نام ونشان مٹا ڈالیں۔ سخت تنبیہہ ہے ان لوگوں کیلئے جن کے دلوں میں ہماری طرف سے کھوٹ ہے۔ وہ اپنے دماغوں کی ٹیڑھ کو کسی تاخیر کے بغیر درست کرلیں اور اپنے تمام تر جذبوں کے ساتھ صرف ہمارے ہو کر رہ جائیں کہ ہم بساط سیاست پر اپنے حریف کو برداشت نہیں

کرتے۔"

راجپوت سرداروں اور چتوڑ کی عام رعایا کو اپنے احکام سنانے کے بعد علاء الدین نے جشن فتح کے اختتام کا اعلان کیا۔ پھر علی عامر آفریدی اور نرملا کی طرف متوجہ ہوا۔ "ان دونوں کے ساتھ اس وقت تک قیدی کی طرح سلوک کرو جب تک ہمارا دل صاف نہیں ہو جاتا۔ ہم کسی دوسرے موقع پر ان کے دلائل سنیں گے اور پھر یہ جس چیز کے مستحق ہوں گے وہ انہیں سزا و جزا کے طور پر بخش دی جائے گی۔" یہ کہہ کر علاء الدین اپنے سپہ سالاروں کے درمیان چلتا ہوا شاہی خیمے میں داخل ہو گیا۔

☆......☆......☆

خیمے میں سلطنت دہلی کے دو جاسوس سپاہی پہلے سے موجود تھے۔ ان کے چہروں پر وحشت برس رہی تھی اور پورا جسم گرد و غبار میں اٹا ہوا تھا۔ علاء الدین کے دریافت کرنے پر جاسوسوں نے بتایا کہ وہ دن رات سفر کی سختیاں برداشت کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔

علاء الدین نے اپنے خدمت گاروں کو تعریفی نظروں سے دیکھا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے حکم دیا کہ وہ اپنی بے وقت آمد کا سبب بیان کریں۔

جاسوس سپاہیوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ خبر ماوراء النہر تک پہنچ گئی ہے کہ سلطان معظم محاصرۂ چتوڑ میں مصروف ہیں۔ وہاں کے باشندوں کا خیال ہے کہ اب جنگی مہم کی تکمیل میں شاہ والا کو ایک طویل عرصہ درکار ہوگا۔ وحشی مغل اپنے سردار طرغی کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو رہے ہیں۔ اس بار ان کے ارادے بہت خوفناک ہیں۔ وہ حضور کی غیر حاضری کے سبب دہلی کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔"

"واللہ! یہ کیسے ممکن ہے؟" علاء الدین اپنے جاسوسوں کی روداد سنتے ہی غصے سے بھڑک اٹھا۔ "ان وحشیوں کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ ہم کہیں بھی رہیں مگر ہمارا اقبال ہر گوشۂ ملک پر حکمرانی کرتا ہے۔ کیا مغلوں کی شامت آئی ہے جو وہ دہلی کی طرف نظر بد سے دیکھ رہے ہیں۔ بخدا! ہم انہیں اس شورش کی بدترین سزا دیں گے۔"

اس کے بعد سلطان رات گئے تک اپنے سپہ سالاروں سے مشورے کرتا رہا۔ اس وقت علاء الدین کی فوج کا ایک بڑا حصہ دکن میں ورنگل کے محاذ پر الجھا ہوا تھا۔ سپاہیوں کی ایک کثیر تعداد گجرات میں سلطانی اقتدار کو مستحکم کرنے کیلئے موجود تھی۔ اس صورت میں حملہ آور مغلوں کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ پھر بھی علاء الدین ایک نئے حوصلے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے فوری طور پر ورنگل اور گجرات کی طرف اپنے قاصد بھیجے کہ جس قدر بھی افرادی قوت ممکن ہو اسے دہلی کی جانب روانہ کر دیا جائے۔

پھر خضر خان کو مختلف نصیحتیں کرنے کے بعد سلطان نے علی الصباح چند ہزار سپاہیوں کے ہمراہ دہلی کی طرف کوچ کیا۔ راجہ رتن سنگھ' علی عامر آفریدی اور نرملا کماری بھی ایک قیدی کی حیثیت سے اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ رخصت ہوتے وقت رام دیو نے سلطان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

"میں فاتح عالم کے بغیر چتوڑ میں ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتا۔" یہ کہتے کہتے عیار رام دیو رونے لگا تھا۔ "بت پرستوں کی یہ سرزمین شہنشاہ کے اس غلام کو ضمیر فروش اور غدار کہہ کر پکارتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی غیر موجودگی میں یہ پتھر کے پجاری مجھ سے شدید انتقام لیں۔" رام دیو بہت زیادہ خوفزدہ نظر آرہا تھا۔

"شاہ کی وفاداریوں کا بھی دم بھرتا ہے اور ان پتھروں سے بھی ڈرتا ہے جو شاہ کے قدموں میں بے حس و حرکت پڑے ہیں۔" علاء الدین' رام دیو کی وحشت دیکھ کر مسکرایا۔ "اگر اہل وفا میں سے ہے تو

پھر شاہ کے نام پر قربان ہو جا۔"

"فاتح عالم پر ایسی ہزار جانیں صدقے۔" یکایک رام دیو کا لہجہ پرجوش ہو گیا تھا مگر اس کے چہرے پر اب بھی بد حواسیاں لرز رہی تھیں۔ سلطان نے اپنے پاؤں کھینچ لئے اور رام دیو کا سر زمین سے ٹکرا گیا۔ "اٹھ کہ ہم تجھے بھی اس سفر میں اپنی ہم رکابی کا شرف بخشتے ہیں۔"

رام دیو خوشی سے پاگل ہو کر رقص کرنے لگا۔ قسمت قدم قدم پر اس شعبدہ باز کا ساتھ دے رہی تھی۔

پھر جب سلطان کا مختصر سا لشکر چتوڑ کی حدود سے نکلا تو نرملا کماری بے قرار ہو کر رونے لگی۔ وہ اور آفریدی گھوڑوں پر سوار تھے مگر اس طرح کہ ان کے چاروں طرف مسلح شہسواروں کا پہرہ تھا۔ نرملا کماری بار بار چتوڑ کے جلے ہوئے قلعے' آبو اور اراولی کی سربلند چوٹیوں اور گمبھیری اور بڑیچ کے شفاف پانی کو دیکھ رہی تھی۔ پھر نرملا کے ہونٹوں سے ایک آہِ سرد نکلی اور اس نے بڑے جانگداز لہجے میں کہا۔

"الوداع! میرے عظیم باپ! آپ مجھ سے اس طرح رخصت ہو گئے کہ میں نہ تیمارداری کا حق ادا کر سکی اور نہ آپ کی آخری رسموں میں شریک ہو سکی۔"

"الفراق! میرے وطن چتوڑ کہ میں نے تجھے جلتے ہوئے دیکھا مگر اپنے اشکوں سے تیرے سینے کی آگ نہ بجھا سکی۔"

اور آفریدی ایک مجسمے کی مانند گھوڑے کی پشت پر سوار تھا۔ وہ اپنے وطن واپس لوٹ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر زندگی کی کوئی علامت باقی نہیں تھی۔ ایک جانباز سپہ سالار اپنے فاتح لشکر کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا مگر اس طرح کہ جیت کر بھی اپنا سب کچھ ہار چکا تھا۔

☆..................☆..................☆

علاءالدین بہت تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ عام سپاہی سمجھ رہے تھے کہ سلطان اپنی عظیم الشان فتح کے نشے سے سرشار ہے' اس لئے جلد از جلد دہلی کی حدود میں داخل ہونا چاہتا ہے مگر یہ راز چاروں امیرانِ لشکر اور حضرت امیر خسروؒ کے علاوہ کسی دوسرے مصاحب کو بھی معلوم نہیں تھا کہ سلطان دارالحکومت پہنچنے کیلئے اس قدر بے قرار کیوں ہے؟ وہ مسلسل سفر کر رہا تھا یہاں تک کہ آدھی آدھی رات تک ویران فضاؤں میں گھوڑوں کے سموں کی آوازیں گونجتی رہتیں۔ سپاہی اس مشقت سے نڈھال ہوتے جا رہے تھے مگر ان کا سلطان پوری طرح چاق و چوبند نظر آ رہا تھا.......... پھر جب گھوڑے ہی گردنیں ڈال دیتے تو علاءالدین اپنے لشکر کو ٹھہر جانے کا حکم دیدیتا۔ اس طرح سلطان نے چتوڑ سے دہلی تک کا فاصلہ نصف مدت میں طے کیا۔

دارالسلطنت پہنچنے سے پہلے چند برق رفتار سپاہی قصرِ ہزار ستون میں داخل ہو چکے تھے اور تمام اہالیان شہر کو اطلاع دی جا چکی تھی کہ سلطان معظم ایک یادگار فتح حاصل کرنے کے بعد دہلی لوٹ رہے ہیں۔ یہ خبر سن کر محلاتِ شاہی میں جشن نشاط کا ساماں پیدا ہو گیا۔ حکومت کے تمام وزراء' سردار' خدمت گار اور سپاہی قطار در قطار اس سمت میں روانہ ہو گئے جدھر سے علاءالدین کا سرخرو لشکر آنے والا تھا۔ تقریباً دہلی سے پندرہ میل دور وفادارانِ سلطنت نے سلطان کا استقبال کیا۔ منزل قریب آنے سے پہلے علاءالدین نے ملک نصرت خان کو حکم دیا تھا کہ وہ راجہ رتن سنگھ کے گلے میں لوہے کا کڑا ڈال دے اور اسے ہلکی زنجیریں پہنا دے۔ حکم شاہی سن کر رتن سنگھ نے گداگرانہ لہجے میں سلطان سے درخواست کی تھی۔

"شاہِ والا! ساری دنیا جانتی ہے کہ رتن سنگھ شکست کھا گیا ہے اور اس کے تخت پر سلطان علاءالدین

خلجی نے قبضہ کر لیا پھر میرے ساتھ یہ غلامانہ سلوک کیوں؟ دیکھنے والی آنکھیں خود ہی اندازہ کر لیں گی کہ مجھے ایک قیدی کی حیثیت سے لایا جا رہا ہے.......... پھر میرے لئے نیا سامانِ رسوائی کیوں؟"

علاءالدین' رتن سنگھ کی التجا سن کر مسکرایا.......... "زندگی کی جنگ میں ہار جانے والے لوگ اس طرح کے مطالبات نہیں کرتے تیرا جرم تو بہت سنگین تھا مگر یہ ہمارا مزاج کرم ہے کہ ہم نے سخت محاسبہ نہیں کیا.......... اگر ہم اپنے فطری جلال و قہر کی طرف لوٹ آتے تو ساری دنیا دیکھ رہی ہوتی کہ تجھے ہمارے گھوڑے سے باندھ دیا جاتا زنجیر ہمارے ہاتھوں میں ہوتی اور تیرا جسم پتھریلی شاہراہوں پر گھسٹ رہا ہوتا۔ یہ تو تیری غلامی کی کم سے کم سزا ہے جو ہم نے تجویز کی ہے۔"

رتن سنگھ مسلسل گڑگڑاتا رہا مگر علاءالدین نے اس کی ایک نہیں سنی۔ راجپوت سمراٹ کی گردن میں آہنی طوق ڈال دیا گیا اور اسے اتنی ہلکی زنجیریں پہنا دی گئیں جن کا بوجھ آسانی سے اٹھایا جا سکتا تھا۔

"رتن سنگھ! شاہی رعب و جلال برقرار رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ آقا اور غلام کے درمیان ایک نمایاں لکیر کھینچ دی جائے' ہماری رعایا سوال کر سکتی ہے کہ ہم ان کیلئے چتوڑ سے کیا سوغات لے کر آئے؟ ہم نہیں چاہتے کہ انہیں زبانی جواب دیں.......... ہماری خواہش ہے کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے تجھے پابہ زنجیر دیکھیں۔"

اذیت و کرب کے احساس سے رتن سنگھ کا چہرہ مسخ ہو گیا اور پھر وہ دہلی کی حدود میں اس طرح داخل ہوا کہ اس کی زنجیر ملک نصرت خان کے ہاتھ میں تھی اور ملک نصرت خان علاءالدین کے بائیں ہاتھ پر چند قدم کے فاصلے سے چل رہا تھا۔

پھر وہ منزل بھی آ گئی جب علاءالدین نے اس انسانی ہجوم کی طرف دیکھا جو اپنے شاہ کا استقبال کرنے کیلئے گھروں سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اہل شہر بہت زیادہ پرجوش تھے اور فلک شگاف نعروں کے ساتھ سلطان کی درازئ عمر اور بلند اقبالی کیلئے انتہائی جذباتی کلمات استعمال کر رہے تھے۔ عام رعایا کو ایک مخصوص دائرے میں رکھنے کیلئے بہت سخت اقدامات کئے گئے تھے ورنہ چتوڑ کی فتح کی خبر سن کر عوام اس قدر وارفتہ ہو گئے تھے کہ وہ دہلی سے بہت دور جا کر اپنے حکمراں کا استقبال کرنا چاہتے تھے۔ امرائے سلطنت رعایا کی اس دلی کیفیت سے باخبر تھے مگر انہوں نے نظم و ضبط برقرار رکھنے کیلئے حد بندی کر دی تھی اور نقیبوں کے ذریعے اعلان کرا دیا تھا کہ تمام لوگ اپنے جذبات پر قابو رکھیں۔ سلطان کا دیدار کریں اور خاموشی کے ساتھ واپس لوٹ جائیں۔ اسی احتیاط کے پیش نظر فوج کے سپاہی اگلی صفوں میں نمایاں تھے اور بار بار عوام کو پُرسکون رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔

جب سلطان کا گھوڑا ہجوم کے قریب آ کر رکا تو نعروں کا ایسا شور بلند ہوا کہ قرب و جوار کی فضائیں تک گونج اٹھیں۔ علاءالدین نے اپنی شمشیر بے نیام کی اور تیز آواز میں بولا..........

"سلطنت خلجی کے وفادارو! غور سے دیکھو کہ تمہارے شاہ کی تلوار سے سرکش راجپوتوں کا خون ٹپک رہا ہے۔"

شاہی نقیب انسانی ہجوم میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے ہی سلطان کی زبان سے کوئی جملہ ادا ہوتا' نقیب اسے عوام تک منتقل کرنے کیلئے بلند آواز میں دہرا دیتے۔

جب علاءالدین نے اپنی شمشیر بے نیام کر کے فضا میں لہرائی اور نافرمان راجپوتوں کی عبرتناک شکست کا ذکر کیا' عوام بے اختیار ہو کر چیخ اٹھے.......... "صاحب جاہ و جلال کی شمشیرِ اختیار کبھی کسی مجرم کو

معاف نہیں کرتی۔ "

"تمہاری سماعتوں نے ابھی تک اتنی بڑی خبر نہیں سنی ہوگی کہ چتوڑ کا ناقابل تسخیر قلعہ اپنی پوری عاجزی کے ساتھ تمہارے شاہ کے قدموں پر جھک گیا۔ " آج کے دن علاء الدین کے جلال کا انداز بہت مختلف تھا۔

"بے شک! آپ سے پہلے ہمیں ایسی خبر سنانے والا کوئی نہیں تھا۔ " عوام نے اپنے شاہ کے دعوے کی پرزور تائید کی۔

"اور ہم نے چتوڑ سے اس کا نام تک چھین لیا۔ "جوشِ جذبات سے سلطان کا چہرہ تپنے لگا تھا۔ "اب وہ خضر آباد ہے' تمہارے محبوب شہزادے کے وقار کی زندہ علامت۔ "

عوام نے شہزادہ خضر خان کی صحت و زندگی اور فتح و نصرت کیلئے دعائیں مانگیں۔

"اور یہ ہے وہ روسیاہ مجرم جس نے تمہارے سلطان کا حکم نامہ چاک کر دیا تھا۔ " علاء الدین نے اپنی شمشیر کا زاویہ بدل کر راجہ رتن سنگھ کی طرف اشارہ کیا۔ "ہم نے اس کی شخصیت کو پارہ پارہ کر دیا اور اس کے اقتدار کی دھجیاں اڑا دیں۔ " علاء الدین اپنی رعایا کے دلوں پر ہیبت قائم کرنے کیلئے غرور و تکبر کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

" سلطان معظم کا احتساب بہت سخت ہے۔ " عوام کی پرشور آوازیں گونجنے لگیں۔

"ہمارے قہر کی یہ آگ صرف دشمنوں کیلئے ہے جو بھڑکتی ہے تو اس وقت تک نہیں بجھتی جب تک نافرمانوں کا پورا وجود خاکستر نہ ہو جائے۔ " علاء الدین کا لہجہ کچھ اور بھی تند و تیز ہو گیا تھا۔ "مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ جب ہم حلقۂ یاراں سے گزرتے ہیں تو بادِ صبا سے زیادہ نرم اور ساون کی گھٹاؤں سے زیادہ کیف آور ہو جاتے ہیں۔ "

تمام لوگ تعظیماً نصف قد تک خم ہو گئے۔

"ہم نے تمہاری وفاداریوں کو شرفِ قبولیت بخشا۔ " یہ کہتے ہوئے علاء الدین نے اپنی تلوار کو اس طرح سیدھا کر دیا جیسے وہ عوام کے سروں پر سایہ فگن ہو۔ "جاؤ کہ ہم تمہیں مزید سلامتی اور خوشحالی کی نوید سناتے ہیں۔ " اس کے ساتھ ہی سلطان نے حکومت کے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے' غریب لوگوں میں کپڑے اور اناج کی تقسیم اور معمولی نوعیت کے مجرموں کی رہائی کا اعلان کیا۔ ترسے ہوئے لوگوں کیلئے یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں بہت بڑی نعمت تھیں۔ وہ سلطان کیلئے نئی فتوحات کی دعائیں کرتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔

☆..................☆..................☆

امرائے سلطنت اگلی قطار میں دست بستہ کھڑے تھے۔ ملک کافور بھی ان کے درمیان موجود تھا اور بہت زیادہ بے چین نظر آ رہا تھا پھر جیسے ہی فرمانروائے ہند کی مختصر تقریر ختم ہوئی' وہ تیزی سے آگے بڑھا اور سلطان کے قدموں سے لپٹ گیا۔ اس نے بار بار علاء الدین کے جوتوں کو بوسہ دیا۔ تمام وزراء' اور عہدیدار ملک کافور کی ان خوشامدانہ حرکتوں کو انتہائی سکوت کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے بے جان مجسموں میں تبدیل ہو گئے تھے اور سانسیں رکی رکی سی محسوس ہوتی تھیں۔ کوئی امیر یا وزیر ملک کافور سے خوش نہیں تھا۔ اس وقت بھی ان کے سینوں میں نفرتوں کے طوفان اٹھ رہے تھے مگر علاء الدین کے خوف سے ہر شخص نے مصلحت کی قبا پہن لی تھی۔ سب کے سب گردنیں جھکائے کھڑے تھے کہ کہیں ان کے چہروں پر

ناپسندیدگی کا کوئی عکس نہ ابھر آئے اور پھر وہ بارگاہِ شاہی میں معتوب قرار دیدیئے جائیں۔

یکایک ملک کافور جھکا اور اس نے علاء الدین کے گھوڑے کے سموں کے نیچے کی خاک اٹھائی اور اپنے چہرے پر ملنے لگا۔ علاء الدین بھی اپنے دوسرے خدمت گاروں کی موجودگی سے بے نیاز صرف ملک کافور کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

" آقا! آپ کے جسم پر کوئی خراش تو نہیں آئی ؟ " ملک کافور نے بڑے والہانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ "فاتح عالم! آٹھ ماہ تک دعائیں مانگتے مانگتے یہ ہاتھ شل ہو گئے ہیں۔ "

"تیری دعائیں قبول ہوئیں ملک! مگر تو بھی تو ٹھیک ہے نا ؟ " علاء الدین نے ایک عجیب سی دل بستگی کے انداز میں اپنے محبوب غلام سے پوچھا۔

"شاہ والا کے بغیر غلام کے تمام دن کرب و اضطراب کا شکار تھے اور ساری راتیں بے خواب......... زندگی ایک عذاب کے سوا کچھ نہیں تھی۔ " ملک کافور خوشامد کی آخری سطح پر گر کر کھلا ہوا جھوٹ بول رہا تھا۔

"تو سچ کہتا ہے ملک! تیرے سوا ہمارے لئے بے چین رہنے والا کون ہے ؟ " یہ کہہ کر علاء الدین نے اپنی تلوار ملک کافور کو دیدی اور خود گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔

ملک کافور نے شمشیرِ سلطانی کو بوسہ دیا اور دوبارہ شاہ کے قدموں پر جھک گیا۔

"بس ملک! " علاء الدین نے اپنے محبوب غلام کو ٹوکتے ہوئے کہا......... "یہ دوسرے اراکین سلطنت بھی ہماری چشم کرم کے منتظر ہیں۔ "

ملک کافور سیدھا ہوا تو دیگر وزراء اور خدمت گار زمین بوس ہو گئے۔ ساحلِ جمنا کی ریت ان کے عماموں' چہروں اور داڑھیوں کو چھو رہی تھی مگر وہ سب کے سب اپنی اس حالت سے بے نیاز علاء الدین کے سامنے جھکے ہوئے تھے اور ہر شخص کی ایک ہی تمنا تھی کہ اس کا سجدہ رائیگاں نہ جائے۔

سلطان نے شرفائے دہلی کی تعظیمانہ رسموں کو پسندیدگی اور قبولیت کی نظروں سے دیکھا اور پھر اپنے محل "قصر ہزار ستون" روانہ ہو گیا۔

علاء الدین کی آمد کی خبر سنتے ہی اس کی تمام بیگمات قلعے کے دروازے پر جمع ہو گئی تھیں۔ شاہی حرم کی عزت و توقیر کیلئے دور تک ریشمی قناتیں اور پردے کھینچ دیئے گئے تھے۔ مسلسل جنگی کامیابیوں کے سبب بہت سی عورتیں اس کے حرم میں داخل ہو گئی تھیں۔ اسی وجہ سے علاء الدین کی اولاد میں بھی بکثرت اضافہ ہوا۔ آج تک کوئی مورخ بھی سلطان کی اولاد کے سلسلے میں صحیح اعداد و شمار پیش نہیں کر سکا بعض تحقیق کرنے والوں کا تو یہ خیال ہے کہ خود علاء الدین کو بھی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی صحیح تعداد کا علم نہیں تھا۔ آج جب سلطان اپنی زندگی کے سب سے سخت معرکے میں فتح حاصل کرنے کے بعد قصر ہزار ستون واپس لوٹا تھا تو اس کی تمام بیگمات اپنے شوہر کے استقبال کیلئے ایک مقام پر جمع ہوئی تھیں۔ وہ بہترین قباؤں میں ملبوس تھیں' غازے کی چمک سے چہرے تابناک تھے اور مختلف خوشبوؤں کے اثرات سے جسم مہک رہے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں طلائی خوان تھے جو تحائف سے لبریز تھے۔ علاء الدین کی ہر بیوی چاہتی تھی کہ سلطان اس کی پیش کردہ نذر کو سب سے زیادہ اہمیت دیں مگر فرمانروائے ہند کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اپنی ایک ایک شریک حیات کو جذباتی طور پر مطمئن کر سکتا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا ایک لمحے کیلئے ایک بیوی کے پاس ٹھہرتا اور خوان پر ہاتھ رکھ کر سر کی جنبش سے اس بات کا اظہار کر دیتا کہ نذر قبول کی گئی۔ یکایک بیگمات کے دمکتے ہوئے چہرے بجھ گئے۔ ایک طویل انتظار کے بعد ان کی زندگی کا ساتھی آیا بھی تو کس حال میں کہ اس

کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تک نہ تھی۔ علاءالدین کی ازدواجی زندگی بہت تلخ تھی۔ وہ اکثر اپنی بیویوں کے سلوک سے شاکی رہتا تھا کسی بیگم کو بھی اس کی دل بستگی کا خیال نہیں تھا۔ سب کی سب اپنی ذاتی آرائش اور اقرباء نوازی میں مصروف رہتی تھیں۔ انہیں صرف زر و جواہر کی بھوک تھی اور سلطان کی پسند و ناپسند کا خیال تک نہ تھا۔ اس کے برعکس شاہی بیگمات کو علاءالدین سے یہ گلہ تھا کہ وہ مہینوں انہیں شرف باریابی نہیں بخشتا تھا۔ اس عالم میں تنہا پھولوں کی سیج پر جلنا ایک عورت کیلئے قیامت سے کم نہ تھا۔ علاءالدین کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ہمیشہ سیاسی منصوبہ بندیوں میں الجھا رہتا تھا۔ کبھی کسی بغاوت کو کچلنے کی تدبیریں کر رہا ہے اور کبھی کسی نئے علاقے کو تسخیر کرنے کیلئے فوجیں بھیج رہا ہے۔ غرض وقت کا بیشتر حصہ روز و شب کے ان ہی ہنگاموں میں گزر جاتا تھا۔ جب اسے چین کی کچھ سانسیں میسر آتیں تو وہ کسی جاں نثار شریک حیات کا قرب ڈھونڈتا اور اس کی خواہش ہوتی کہ ریشمی آنچل کا سایہ جنگ و جدل اور سیاست کی جلتی ہوئی دھوپ کے اثرات کو زائل کر دے............ مگر کوئی بھی بیوی سلطان کی مزاج آشنا نہیں تھی۔ جس کے نتیجے میں علاءالدین اپنی بیگمات سے دور ہوتا چلا گیا۔ سلطان کی ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ وہ اپنے حقیقی چچا اور خسر جلال الدین خلجی کو قتل کر کے مسند اقتدار تک پہنچا تھا اکثر اس کے کانوں میں مقتول حکمراں کے یہ الفاظ گونجتے رہتے تھے۔

"بے وفا بھتیجے! وہ وقت یاد کر جب میں تجھے اپنے سینے پر سلاتا تھا۔"

اگر انصاف کی آنکھ سے دیکھا جائے تو یہ علاءالدین کی بدترین بے وفائی اور شرمناک بد عہدی تھی۔ تمام دنیا جانتی ہے کہ علاءالدین نے اپنے محسن کے اعتبار کا خون کر کے تاج و تخت حاصل کئے تھے۔ وہ انسانیت کی نظروں میں وفا کا قاتل اور عہد شکنی کا سنگین مجرم تھا۔ اسی احساسِ گناہ کے سبب علاءالدین کے ذہن میں یہ خیال پوری طرح جڑ پکڑ گیا تھا کہ دنیا کا ہر شخص خود غرض اور بے وفا ہے۔ سلطان کے نزدیک وہی شخص لائق اعتبار ہوتا جو مسلسل اس کے قدموں پر جھک کر رحم و کرم کی بھیک مانگتا رہتا۔ ملک کافور چونکہ بچپن ہی سے بے غیرتی کی آخری منزل کو چھو چکا تھا اس لئے وہ سلطان کے معیار پر پورا اترا اور ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ علاءالدین کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ بیگمات شاہی اس غرور میں مبتلا تھیں کہ وہ فرمانروائے ہند کی بیویاں ہیں اور معاشرتی طور پر بلند ترین درجہ رکھتی ہیں۔ اسی ناز بے جا نے انہیں اپنے شوہر کو سمجھنے کا موقع نہیں دیا۔ یہاں تک کہ علاءالدین اور اس کی حرم سرا کے درمیان بڑے فاصلے حائل ہو گئے۔ تنہائیوں کی ایک خلیج تھی جو بڑھتی چلی گئی۔ سلطنت خلجی کے دشمنوں نے علاءالدین کی اس فطری کمزوری کا بغور مشاہدہ کیا اور سیاست کے پردے میں ایک ہندوزادے کو آزمانے کی کوشش کی۔ اسلامی حکومت کے بدخواہوں کا منصوبہ کامیاب رہا اور ملک کافور، سلطان کے ہوش و حواس پر چھاتا چلا گیا۔

کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر سلطان اپنی خدائی کا اعلان کرتا تو ملک کافور پہلا شخص ہوتا جو سجدے میں گر کر اقرار کرتا کہ میں علاءالدین کا بندہ ہوں............ جب خوشامد کا یہ انداز ہو تو ایک دنیا پرست حکمران کے بہک جانے کو حیرت انگیز عمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ طویل جدائی کے بعد بھی دہلی لوٹنے پر سلطان نے کسی کی مزاج پرسی نہیں کی، کسی بیگم کو منہ لگایا اور نہ کسی بچے کو قریب بٹھا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا............ اگر علاءالدین کو کوئی یاد آیا تو بس ملک کافور جو بڑے بڑے مردانِ شجاع کی پگڑیاں اچھالنے کیلئے بے قرار رہتا تھا۔

اس موقع پر خواجہ سراؤں نے بھی اپنا لگائی بجھائی کا ہنر خوب دکھایا۔ ناکارہ انسانوں کی اس جماعت نے

انعام پانے اور بیگمات شاہی کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ملک کافور کی خبریں بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ حرم شاہی تک پہنچائیں۔ بیگمات کے دل تو پہلے ہی سلگ رہے تھے، جب اس بے حیا غلام کے بارے میں نئی اطلاعات ملیں تو قصر ہزار ستون کا زنان خانہ ایک ماتم کدے میں تبدیل ہو گیا۔ اگرچہ محل کا ایک ایک گوشہ فانوسوں اور قندیلوں سے روشن تھا لیکن علاءالدین کی تمام بیویوں کے آراستہ کمرے زندہ مقبروں میں ڈھل گئے تھے۔ جہاں مایوسیوں کے اندھیرے رقص کر رہے تھے اور ناکام حسرتیں اپنی موت پر خود مرثیہ پڑھ رہی تھیں۔

اسی رات جب بڑے بڑے امراء علاءالدین کو نذر پیش کر رہے تھے اور ہنگامۂ نشاط جاری تھا، سلطان کی ایک بیوی ارجمند ناہید اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس عورت کا پیدائشی نام سرلا دیوی تھا جو رنتھنبور کے ایک راجپوت سردار کی لڑکی تھی۔ شکست کے بعد سرلا دیوی مسلمان ہو کر علاءالدین کے حرم میں داخل ہو گئی تھی۔ سلطان نے ارجمند ناہید سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بیوی کی حیثیت سے اسے خصوصی درجہ دے گا مگر سیاسی ہنگامہ آرائیوں اور نئی نئی دلچسپیوں میں گم ہو جانے کے سبب علاءالدین اپنا وعدہ وفا نہ کر سکا۔ خوبصورت راجپوت زادی آتش انتظار میں جلتی رہی کئی سال کے دوران اسے ایک یا دو بار شوہر سے گفتگو کرنے کی سعادت حاصل ہو سکی۔ ارجمند ناہید کی دنیا ویران ہو چکی تھی جس کی خاطر مذہب چھوڑا، گھر کو آگ لگائی، وہ قریب رہ کر بھی ہزاروں میل دور تھا، آشنا ہو کر بھی اجنبی تھا۔ ارجمند کچھ دن یہ سوچ کر خاموش رہی کہ شاید سلطان کو اپنی کوتاہی کا احساس ہو جائے اور پھر یہ اندازِ تغافل رسم التفات میں بدل جائے مگر ملک کافور کے بڑھتے ہوئے عروج نے ارجمند کو زوال کی پستیوں میں دھکیل دیا تھا۔ راجپوت زادی نے ایک طویل عرصے تک یہ زہر بھی قطرہ قطرہ کر کے پیا تھا لیکن آج جب خواجہ سراؤں نے ملک کافور کی پذیرائی کا حال بیان کیا تو ارجمند کے دل و دماغ جل اٹھے پھر آدھی رات کے قریب وہ ایک خوفناک فیصلہ کرنے کے بعد اپنے کمرے سے نکل کر راہداری میں کھڑی ہو گئی۔ ارجمند کو ملک کافور کا انتظار تھا کہ وہ کب سلطان کے عشرت کدے میں داخل ہوتا ہے؟

شب کے پچھلے پہر محفلِ کیف و نشاط سرد ہوئی اور امراء ایک ایک کر کے چلے گئے تو گجرات کا ہندوزادہ بارگاہِ شاہی کی طرف بڑھا۔ ارجمند ناہید ایک ستون کی اوٹ سے باہر نکلی اور اس نے ملک کافور پر خنجر کا بھرپور وار کیا مگر موت ابھی اس بے ضمیر غلام سے بہت دور تھی۔ ایک تو عورت کی جسمانی کمزوری اور دوسرے گھبراہٹ کا غلبہ ان دونوں چیزوں نے مل کر ارجمند ناہید کو ناکامی سے دوچار کر دیا۔ ملک کافور کے دائیں شانے پر ہلکا سا زخم آیا اس نے پلٹ کر ارجمند کی کلائی پکڑ لی اور زور زور سے چیخنے لگا۔ عشرت کدے کے محافظ سپاہی دوڑتے ہوئے ملک کافور کے قریب پہنچے۔ پرشور آوازیں سن کر سلطان بھی کمرے سے باہر نکل آیا۔ علاءالدین کے ہاتھ میں شمشیر بے نیام تھی اور چہرہ غصے کی آگ سے دہک رہا تھا۔

"کیا تم بدنصیبوں کو نہیں معلوم کہ شاہ کے آرام میں خلل ڈالنے کا کیا انجام ہوتا ہے؟" محل کی راہداری میں علاءالدین کی پرہیبت آواز اس طرح گونجی کہ دوسری بیگمات بھی اپنی اپنی خوابگاہوں سے باہر نکل آئیں۔ اس تصور سے کسی کو نیند نہیں آئی تھی کہ ان کا شوہر آٹھ ماہ بعد چتوڑ سے واپس لوٹا تھا اور ابھی تک کسی بیگم کو شرف باریابی نہیں بخشا گیا تھا۔ اس کے برعکس درباری رقاصائیں شاہ کا دل بہلا رہی تھیں اور شاہ کو احساس تک نہیں تھا کہ اس کے انتظار میں وہ عورتیں زندگی کے دوزخ میں جل رہی تھیں جن کے بے شمار حقوق تھے اور وہ حقوق مسلسل غصب کئے جا رہے تھے۔

"کون بے ادب ہمارے سرہانے کھڑے ہو کر چیخا تھا؟" علاء الدین نے اپنے محافظ سپاہیوں سے انتہائی قہرناک لہجے میں پوچھا...... چونکہ ملک کافور کی چیخیں عشرت کدے کے قریب گونجی تھیں' اس لئے علاء الدین نے جرم کی شدت ثابت کرنے کیلئے اپنی خواب گاہ اور سرہانے کی تشبیہہ استعمال کی تھی۔

"سردار ملک کافور زخمی ہو گئے۔" ایک محافظ سپاہی نے ڈرتے ڈرتے کہا اسے خود اپنی زندگی بھی خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ ملک کافور کے متعلق یہ حکم شاہی بہت پہلے نافذ کر دیا گیا تھا کہ اگر ملک کو جسمانی طور پر کوئی تکلیف پہنچی تو یہ وحشیانہ عمل خود سلطان پر حملے کے مترادف ہو گا۔ علاء الدین نے یہ احتیاطی تدبیر اس لئے اختیار کی تھی کہ محلات شاہی میں ملک کافور کے بے شمار دشمن موجود تھے اور کئی بار اس کی جان لینے کے منصوبے بنائے گئے تھے پھر جب ہر طرف اعلان شاہی کی گونج سنائی دینے لگی تو ملک کافور کے خلاف کی جانے والی سازشوں نے دم توڑ دیا تھا اور بڑے سے بڑا طاقتور وزیر بھی اس خواجہ سرا غلام سے خائف نظر آنے لگا تھا...... مگر آج ایک انہونی بات ہو گئی تھی۔

"سردار کافور پر ایک عورت نے حملہ کیا ہے۔" محافظ سپاہی نے کانپتی ہوئی آواز میں وضاحت کی۔

ملک کا نام سن کر علاء الدین بد حواس ہو گیا اور تیز قدموں سے اس طرف بڑھا جہاں سپاہیوں کا ہجوم سا تھا۔ سلطان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر قصر ہزار ستون کے نگہبان ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ علاء الدین نے دیکھا کہ ملک کافور کے بائیں شانے سے خون بہہ رہا تھا اور وہ ابھی تک ایک نقاب پوش عورت کی کلائی کو نہایت سختی سے پکڑے ہوئے تھا۔

علاء الدین عورت کو پہچان نہیں سکا...... اس نے گھبرا کر ملک کافور کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ غلام کے خون سے آقا کے ہاتھ رنگین ہو گئے۔ "ملک! زخم گہرا تو نہیں ہے؟" سلطان نے شدید کرب کے عالم میں دریافت کیا۔

"نہیں! شاہ والا کا سایۂ کرم نہ ہوتا تو آج یہ خنجر غلام کی شہ رگ میں اتر چکا ہوتا۔" اگرچہ موت ٹل گئی تھی لیکن پھر بھی موت کے احساس سے ملک کافور بہت زیادہ خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔

"تو یہ عورت تیرے شاہ کا خون بہانا چاہتی تھی۔" سلطان نے انتہائی نفرت آمیز نظروں سے نقاب پوش خاتون کی طرف دیکھا اور محافظ سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "اسے اسی وقت ہماری بارگاہ میں حاضر کرو...... ہمارا نظام انصاف کسی تاخیر کو برداشت نہیں کرتا۔" یہ کہہ کر علاء الدین مڑا اور دوبارہ اپنے عشرت کدے میں داخل ہو گیا۔

☆......☆......☆

جب وہ عورت مجرم کی حیثیت سے علاء الدین کے سامنے لائی گئی اور اس نے اپنے چہرے کا نقاب ہٹایا تو لرزہ سا پڑ گیا۔ علاء الدین کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی خوبصورت بیوی ارجمند ناہید ہو سکتی ہے۔ سلطان نے تمام سپاہیوں کو اپنے کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ صرف ملک کافور' علاء الدین کے روبرو کھڑا رہا۔

"تو نے ایسا کیوں کیا ارجمند؟" سلطان کا لہجہ غضب ناک تھا۔

ارجمند ناہید ابھی کوئی جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ عشرت کدے کے دروازے پر ہلچل سی ہوئی محافظ سپاہی نے دوبارہ حاضر ہو کر بتایا کہ بیگمات شاہی اندر آنے کیلئے اجازت کی طلب گار ہیں۔

"انہیں آنے دو کہ وہ بھی اپنی ایک ہم جنس کے انجام سے سبق حاصل کر لیں۔" علاء الدین سر سے پاؤں تک ایک مجسمۂ قہر بن گیا تھا۔

بیگمات لرزتے قدموں کے ساتھ سلطان کے عشرت کدے میں داخل ہوئیں۔ گجرات کی رانی ملکہ جہاں کنولا دیوی سب سے آگے تھی۔

"تمہارے آنے کا سبب؟" علاء الدین کی آواز میں نرمی کا شائبہ تک نہ تھا۔

"ہم شاہ والا سے درخواست کرنے آئے ہیں کہ سرلا دیوی بے قصور ہے۔"

علاء الدین نے قہر آلود نظروں سے اپنی بیویوں کی طرف دیکھا اور پھر ارجمند ناہید سے مخاطب ہوا۔

"آخر تو نے ہمارے جاری کردہ حکم کا مذاق کیوں اڑایا؟"

"میں شاہ کے حکم کے خلاف سرکشی کا تصور بھی گناہ سمجھتی ہوں۔" ارجمند ناہید باوقار لہجے میں بول رہی تھی۔

"کیا سلطنت خلجی میں بسنے والوں کے کانوں تک ہمارا یہ حکم نہیں پہنچا کہ جسے ہم محترم قرار دیدیں پھر وہ حقیر نہیں ہو سکتا۔" غصے کی شدت سے علاء الدین کے الفاظ بھی جلنے لگے تھے۔

"سلطان معظم کا ارشاد بجا ہے۔" ارجمند نے روایتی ادب کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"پھر تو نے اس شخص پر خنجر آزمائی کیوں کی جس کے خون کو ہم نے حرام قرار دیدیا ہے۔" علاء الدین نے ملک کافور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرے مذہب میں اس کا خون اتنا ہی جائز ہے جتنا کہ ایک درندے یا موذی جانور کا۔" یکایک ارجمند جذباتی ہو گئی تھی۔ "شاہ والا! میں نے کسی انسان پر خنجر نہیں اٹھایا' میرا ہدف ایک زہریلا کیڑا تھا جو پورے حرم سرا کو نہ جانے کب سے ڈس رہا ہے۔" یہ کہتے کہتے ارجمند کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

علاء الدین سناٹے میں آ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک عورت کا لہجہ اس قدر جارحانہ بھی ہو سکتا ہے۔ "یہ تو کہہ رہی ہے ارجمند! جسے ہم نے رتبۂ عظیم بخشا اور جس پر ہم نے اپنی بے مثال عنایات کی بارش کر دی؟"

"فاتح عالم! اس سے بڑی عنایت کیا ہو گی کہ آپ کے بیوی بچے ایک محبت بھری نظر اور ایک دلنواز مسکراہٹ کیلئے مہینوں سے ترس رہے ہیں اور یہ بے شرم خواجہ سرا اس طرح شاہ کے قدموں سے لپٹا ہوا ہے کہ جیسے اس کے سوا کسی دوسرے رشتے کا وجود ہی نہیں ہے۔ عدل و مساوات کا دعویٰ کرنے والے عظیم فرمانروا! ایک بار تو مڑ کر دیکھا ہوتا کہ جن قدموں کی دھمک سے "آبو" اور "اراولی" کی چٹانیں دہل رہی تھیں' ان ہی قدموں کے نیچے دب کر بندگان خدا کے کتنے حقوق ریزہ ریزہ ہو گئے ہیں۔ ایک فتنے کو پرورش کر کے اس کا خون حرام قرار دیدیا مگر اس کا احساس تک نہیں کہ آپ کی بے اعتنائی روز و شب کتنے خون کرتی رہتی ہے۔ وہ خون جسے خدا نے حرام قرار دیا ہے۔"

"شاید تجھے اپنی زندگی عزیز نہیں ارجمند!" علاء الدین شعلے کی طرف بھڑک اٹھا۔

"ہاں! میں ایسی زندگی سے انکار کرتی ہوں۔" ارجمند ہر شے سے بے نیاز ہو کر بول رہی تھی۔

"آپ سے بہتر تو وہ گداگر ہیں جو دن بھر بھیک مانگتے ہیں اور شام کو بیوی بچوں کے سامنے اپنی جھولی کھول دیتے ہیں۔"

علاء الدین کیلئے اس سے بڑی گالی اور کیا ہو سکتی تھی۔ وہ آندھی کے کسی تیز جھونکے کی طرح برہم ہو گیا۔ "کیا اس طرح تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گی؟"

"آج نہیں تو کل سہی...... مجھے جب بھی موقع ملے گا میں اس بدنہاد کو قتل کر دوں گی۔" یہ کہہ

کر ارجمند ناہید چند قدم آگے بڑھی اور اس نے ملک کافور کے منہ پر تھوک دیا۔ "میں قصرِ ہزار ستون سے لعنت کے اس نشان کو مٹا کر ہی دم لوں گی۔"

علاء الدین کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ "اس سے پہلے کہ تیری وحشت رنگ لائے ہم تجھ پر زندگی کے دروازے بند کئے دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر سلطان نے ارجمند کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔ بیگمات شدتِ غم سے چیخنے لگیں۔ علاء الدین کی ایک ایک بیوی نے ارجمند کیلئے رحم کی بھیک مانگی مگر سلطان نے انہیں غلاموں کی طرح جھڑک دیا۔ "ہم کسی حسن ظن یا امکان کے سہارے زندگی بسر نہیں کرتے جو ایک بار نظروں سے گر گیا سو گر گیا۔ اب تو لوگ اس کی لاش ہی اٹھائیں گے۔"

ارجمند ناہید جو ایک نہایت مہذب اور شائستہ عورت تھی اپنی زندگی میں پہلی بار قہقہہ زن ہوئی۔

"سلطان! یہ موت اس موت سے بدرجہا آسان ہے جو ہر رات مجھ پر نازل ہوتی ہے میں خود بھی چاہتی ہوں کہ اس ہوس کدے سے نکل کر اپنے خالق کے پاس چلی جاؤں اور اس سے شکوہ کروں کہ جو حقوق تو نے بخشے تھے وہ تیرے بندوں نے چھین لئے۔"

پھر رات کے اندھیرے میں ارجمند ناہید کو قتل کر دیا گیا۔ اکثر بیگمات رنج و الم کی شدت سے بے ہوش ہوگئیں اور امرائے سلطنت اس خوف سے کانپنے لگے کہ کہیں علاء الدین کی نظریں ان کے دل کا حال بھی نہ جان لیں۔

☆..........................☆..........................☆

اہل شہر نے کئی ماہ تک مسلسل جشن فتح منانے کی تیاریاں کی تھیں مگر علاء الدین نے یہ کہہ کر انہیں روک دیا کہ ابھی مسرت و شادمانی کے بھرپور مظاہرے کا وقت نہیں آیا ہے۔ سلطان اپنی رعایا کو یہ تو نہیں بتا سکا کہ دارالحکومت نئے خطرات کی زد میں ہے مگر اس نے دوسرے ہی دن مغلوں کی یورش کو روکنے کے انتظامات شروع کر دیئے۔ سلطان کی فکر و پریشانی دیکھ کر بعض فوجی سرداروں نے مشورتاً کہا۔

"یہ جاسوسوں کا واہمہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ اطلاعات بھی غلط ہو سکتی ہیں جو شاہ والا کو بہم پہنچائی گئی ہیں۔"

"سب کچھ ممکن ہے مگر ہم خطرات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔" سلطان نے انتہائی ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"جب اپنے غداری کر سکتے ہیں تو پھر بیگانوں کی طرف سے یہ بے پروائی کیوں؟ مغلوں کا مفسدانہ وجود ایک زندہ حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ وہ سلطان غیاث الدین بلبن کے دور حکومت میں بھی اپنی شرانگیزیوں سے باز نہیں آئے اور شہزادہ محمد ان ہی کے تیر ستم کا نشانہ بنا۔ جس قوم کا ماضی ہمارے سامنے ہو ہم اس کے حال پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ ہمارے مخبروں کی اطلاعات کتنی بھی نادرست ہوں مگر ہم ابر کا ایک ٹکڑا دیکھتے ہیں تو تیز بارش کا یقین کر لیتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمیں نیند آگئی ہے مگر ہم تو خواب میں بھی جاگتے ہیں۔"

سپہ سالاروں اور جنگی امور کے ماہرین نے سلطان کے آگے سر جھکا دیئے اور علاء الدین اپنی سلطنت کے دفاعی انتظامات میں گم ہو گیا۔

☆..........................☆..........................☆

اس دوران ملک کافور پر یہ راز فاش ہو گیا تھا کہ راجہ رتن سنگھ کے ساتھ علی عامر آفریدی کو بھی ایک قیدی کی حیثیت سے قصر ہزار ستون لایا گیا ہے۔ ملک کافور کے معتمد خاص نور الدین نورا نے اسے بتایا تھا کہ جو کام وہ انجام نہ دے سکا اسے چتوڑ کے ایک برہمن رام دیو نے تکمیل تک پہنچا دیا۔ نورا نے رام دیو کے مسلمان ہونے سے لے کر آفریدی پر الزام تراشی تک پیش آنے والے تمام واقعات سنا ڈالے۔

"سلطان نے اس افغان زادے کے بارے میں ابھی تک آخری فیصلہ نہیں کیا ہے؟" ملک کافور نے گھبرا کر نورا سے پوچھا۔

"فیصلہ تو ہو چکا تھا مگر امیر خسروؒ نے درمیان میں مداخلت کر کے آفریدی کو صفائی کا ایک اور موقع فراہم کر دیا۔" نورا نے بڑے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

ملک کافور حضرت امیر خسروؒ کا ذکر سن کر بھڑک اٹھا۔ "اسے شاعری کے سوا آتا ہی کیا ہے۔" ملک کافور نے امیر خسروؒ کی شان میں نازیبا کلمات ادا کرتے ہوئے کہا۔ "وقت بتائے گا کہ اس بوڑھے کی شاعری کام آتی ہے یا میری سیاست؟ آفریدی کو ذلت و رسوائی کی موت سے کوئی نہیں بچا سکتا نورا!" ملک کافور نے اس قدر پر اعتماد لہجے میں کہا جیسے اہل ہند کی تقدیریں اس کے رحم و کرم کی محتاج ہوں۔

"جو حضور چاہیں گے وہی ہو گا۔" نورا نے کسی فرمانبردار غلام کی طرح گردن خم کر دی۔ "پھر بھی ہمیں ہر لحظہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ چتوڑ کی ایک جادوگرنی بھان متی نے سر دربار کہا تھا کہ آفریدی کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" نورا بڑی عیاری کے ساتھ ملک کافور کے سینے میں چھپی ہوئی نفرت کی چنگاریوں کو ہوا دے رہا تھا۔

"سب کے سحر و طلسم ناکام ہو جائیں گے نورا! دنیا میں جادو تو بس ملک کافور ہی کا ہے۔" علاء الدین کا غلام کسی مطلق العنان شہنشاہ کے لہجے میں بول رہا تھا۔ "منصف بھی میرا' عدالت بھی میری اور گواہ بھی میرے........ آفریدی کیلئے اب کوئی پناہ گاہ نہیں۔ زنداں اور زنجیریں........ جلاد اور مقتل........ خون آلود لاش اور تاریک قبر........ اس کے سوا کچھ نہیں۔" ملک کافور دیر تک ہنستا رہا اور پھر اپنے کمرے کے دروازے پر نظر ڈالتے ہوئے نورا سے سرگوشیوں میں کہنے لگا........ "تو کل ہی ہانسی روانہ ہو جا اور ہمارے وفاداروں کو حکم دیدے کہ آفریدی کی ماں اور بہن کا قصہ پاک کر دیا جائے۔"

نورا ایک لمحے کیلئے لرز اٹھا۔ "اس کام میں بڑے خطرے پوشیدہ ہیں۔ حضور پر کوئی الزام نہ آجائے۔"

"ہمارے دامن پر کوئی داغ نہیں آسکتا۔ سارا الزام مغل وحشیوں کے سر جائے گا۔" ملک کافور نے اپنے منصوبے کی وضاحت کی تو نورا مسکرانے لگا۔

"خدا نے حضور کو بڑا روشن دماغ بخشا ہے۔ ہر سوچ کا زاویہ کسی شہنشاہ کے انداز فکر سے ملتا ہے۔" نورا نے اس شخص کی خوشامد کرتے ہوئے کہا جو اپنے کردار کے لحاظ سے دنیا کا بدنام ترین غلام تھا۔

"نورا! تو سچ کہتا ہے۔ ہم حکمرانی کیلئے پیدا ہوئے ہیں۔ عنقریب دنیا ہماری شاہی کے انداز بھی دیکھے گی۔" ملک کافور علاء الدین کی نقل کر رہا تھا۔

"بے شک! بے شک!" نورا نے جھک کر رخصتی سلام کیا اور ہانسی جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

نورا کے ذریعے ملک کافور کو ایک راجپوت لڑکی نرملا کے بارے میں بھی معلوم ہوا تھا جو آفریدی کے ساتھ شاہی محل میں لائی گئی تھی۔ ملک کافور نے نرملا سے ملنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ اپنے ارادوں میں

ناکام رہا تھا۔ حرم سرا میں اس کا داخلہ بند تھا۔ ورنہ وہ براہ راست نرملا سے ملاقات کر کے اس حقیقت کو بھی جان لیتا کہ ایک راجپوت زادی سلطنت خلجی کے افغان سردار سے کس قدر والہانہ محبت کرتی ہے' تاہم نورا نے ملک کافور کو یہ بتا دیا تھا کہ چتوڑ کے مہامنتری کی بیٹی دنیا کی ہر آسائش کو ٹھکرا چکی ہے اور آفریدی کے ہمراہ رہ کر سنگین سزا بھگتنے کیلئے آمادہ ہے۔ ملک کافور نے یہ خبر بڑی حیرت سے سنی تھی۔ پھر اس نے دیگر امراء سے یہ بات بھی معلوم کر لی کہ سلطان نے آفریدی کے مقدمے کا فیصلہ اس وقت تک کیلئے ملتوی کر دیا ہے جب تک سیاسی فضا پر سکون نہیں ہو جاتی ملک کافور یہ سن کر مطمئن ہو گیا کہ ابھی اس کی ریشہ دوانیوں کیلئے کافی وقت تھا۔

پھر اس نے رام دیو سے ملاقات کی۔ رام دیو پہلی ہی نظر میں پہچان گیا کہ آنے والا کون ہے ؟ ملک کافور نے فوری طور پر اس سے آفریدی کا ذکر نہیں کیا بلکہ علم نجوم پر گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "مجھے بتانے والوں نے بتایا ہے کہ آپ زمین و آسمان دونوں کی خبر رکھتے ہیں۔"

تعریف اور خوشامد انسان کی خوفناک کمزوریاں ہیں۔ رام دیو بھی اپنے بارے میں ستائشی الفاظ سن کر بدمست ہو گیا۔ پھر ملک کافور نے اپنے مستقبل کے بارے میں پوچھا تو رام دیو کاغذ پر کچھ لکیریں کھینچنے لگا۔ یہ علاء الدین کے غلام کی قسمت کا زائچہ تھا۔ رام دیو ستاروں کی رفتار دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے ملک کافور کو بتایا کہ وہ عروج حاصل کرتے کرتے ایک دن اپنے سر پر تاج شاہی سجا لے گا۔ یہ سن کر ملک کافور کی آنکھوں میں اقتدار کے پر کیف خواب کروٹیں لینے لگے مگر اس نے رام دیو کو منع کر دیا کہ وہ اس ملاقات کا ذکر کسی سے نہ کرے اور اپنی پیش گوئی کو ہونٹوں کی قید ہی میں رہنے دے۔ اگر اس نے مذاق میں بھی یہ بات کسی سے کہہ دی تو وہ سلطان کے عتاب کا نشانہ بن جائے گا۔ رام دیو نے چند لمحوں میں ملک کافور کی شخصیت کا جائزہ لے لیا تھا اور اسے اس بااثر غلام کے چہرے میں اپنی ذاتی کامیابیوں کے روشن امکانات نظر آ رہے تھے۔ ملک کافور یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ وہ آئندہ بھی رام دیو سے ملاقاتیں کرے گا اور اس کے روحانی علوم کی روشنی میں مناسب قدم اٹھائے گا۔ اس طرح ملک کافور اور رام دیو کے درمیان ایک خصوصی تعلق قائم ہو چکا تھا اور دونوں چالباز اپنے اپنے مفادات کیلئے ایک دوسرے کو فریب دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

☆......☆......☆

نور الدین نورا' ملک کافور کے خوفناک منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کیلئے دہلی سے ہانسی روانہ ہو چکا تھا۔

آفریدی کی والدہ شائستہ بیگم اور بہن عالیہ اپنے آبائی مکان میں ایک قیدی کی سی زندگی گزار رہی تھیں۔ ملک کافور کے سپاہی ہر وقت مکان کے باہر پہرہ دیتے رہتے تھے۔ اس دوران شائستہ بیگم نے حضرت بابا فرید کے خلیفہ حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کے مزار مبارک پر حاضری دینے کی بھی درخواست کی تھی مگر سپاہیوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ انہیں گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ شائستہ بیگم نے سپاہیوں سے اپنے بیٹے کے متعلق دریافت کیا تو جواب دیا کہ وہ کسی آفریدی کو نہیں جانتے۔ پھر شائستہ بیگم نے اپنی نظر بندی کا سبب پوچھا تو کہا گیا کہ وہ لوگ دربار شاہی کے معتوب ہیں۔ اس لئے ان کی آزادیاں سلب کر لی گئی ہیں' شائستہ بیگم ایک حوادث آشنا عورت تھیں۔ اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں انہوں نے بے شمار خونیں انقلابات دیکھے تھے۔ آفریدی کی طویل غیر حاضری اور اپنی نظر بندی کے بعد شائستہ بیگم نے سمجھ لیا تھا کہ پھر کوئی جانگداز حادثہ پیش آنے والا ہے۔ اس لئے وہ شب و روز اپنے خدا کے حضور سجدہ ریز رہتی تھیں اور

آفریدی کے حق میں دعائیں کرتی رہتی تھیں۔ عالیہ آفریدی اپنی نو عمری کے سبب گھبرا کر کبھی کبھی رونے لگتی تھی۔ اس موقع پر شائستہ بیگم اپنی بیٹی کو گریہ وزاری سے باز رہنے کی تلقین کرتیں۔

"تو اس قوم کی وارث ہے جس نے موت کا استقبال بھی مسکراہٹوں کے ساتھ کیا ہے' تیرے بزرگوں نے اپنے خدا سے بے آبروئی کی زندگی کبھی طلب نہیں کی' تو بھی دعا کر کہ سانسوں کا یہ سلسلہ منزل ایمان پر جا کر ٹھہر جائے۔"

عالیہ خاموش ہو جاتی اور دل ہی دل میں آفریدی کی سلامتی کیلئے دعائیں کرنے لگتی۔ وہ بڑی جاں نثار اور محبت کرنے والی بہن تھی۔ اپنی تکلیفوں سے زیادہ بھائی کے مصائب کا خیال کرتی اور پھر یہی احساس اسے آنسو بہانے پر مجبور کر دیتا۔

نور الدین نورا ہانسی پہنچ چکا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ کب مغلوں کی آمد کا غلغلہ بلند ہو اور کب وہ ملک کافور کے شرمناک منصوبے پر عمل کرے۔ تقریباً پندرہ دن بعد ایسی خبریں ملنے لگیں کہ مغل وحشی اپنی تمامتر سفاکیوں کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ نورا کو اسی لمحے کا انتظار تھا۔ پھر جب آدھی رات کے قریب شائستہ بیگم' عالیہ آفریدی اور دوسرے پڑوسی سوئے ہوئے تھے' ملک کافور کے سپاہیوں نے بیک وقت کئی مکانوں پر نفط (مٹی کا تیل) چھڑک کر آگ لگا دی۔ تیل اس قدر زیادہ مقدار میں استعمال کیا گیا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شعلوں نے تقریباً پورے محلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہر طرف ایک کہرام سا برپا تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ اس ناگہانی حادثے نے لوگوں کے حواس چھین لئے تھے۔ ملک کافور کے سپاہیوں نے افراتفری اور انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برتنوں میں تیل بھر بھر کر آفریدی کے مکان کے اندر پھینکا۔ پہلے تو کسی کو ہوش ہی نہیں تھا لیکن پھر بھی اگر کسی نے سپاہیوں کو مصروف عمل دیکھا تو وہ یہی سمجھا کہ سلطان کے فوجی بھی آگ بجھانے میں مدد کر رہے ہیں۔ اب کسی کو کیا پتہ کہ سپاہیوں کے برتنوں میں پانی نہیں آگ بھری ہوئی تھی۔ شعلے اتنی تیزی سے بھڑکے کہ شائستہ بیگم اور عالیہ آفریدی کمرے سے نکل کر صحن تک بھی نہیں پہنچ سکیں۔ سپاہیوں نے عقبی دیوار پر چڑھ کر بہت سا تیل مکان کے آنگن میں بھی پھینک دیا تھا نتیجتاً چند لمحوں میں دونوں ماں بیٹی کے گرد آگ کا ایک حصار کھنچ گیا۔

عالیہ بے اختیار ہو کر مدد کیلئے چیخنے لگی مگر شائستہ بیگم نے ایسی لرزہ خیز ساعتوں میں بھی صورت حال کو سمجھ لیا تھا۔ صرف ان ہی کا مکان نہیں' پڑوسیوں کے گھر بھی جل رہے تھے۔ جب پوری فضا ہی شعلوں میں گھر گئی ہو تو مدد کیلئے کون آتا۔ شائستہ بیگم نے عالیہ کو اپنی چادر میں چھپا لیا۔ ان کی یہ تدبیر ایک جذباتی حرکت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ اپنی مامتا سے مجبور تھیں اس لئے بیٹی کو آگ کی لپٹوں سے بچانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جان بچانے کی جدوجہد کے یہ لمحات بھی بہت مختصر تھے۔ شائستہ بیگم' عالیہ کو لے کر اس امید پر صحن کی طرف بڑھیں کہ شاید کچھ آگے پہنچنے کے بعد بھڑکتے ہوئے شعلوں کا سلسلہ ختم ہو جائے گا مگر یہ ان کی خوش گمانی تھی۔ ملک کافور کے سپاہیوں نے مکان میں ہر طرف آگ کی دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ وہ ایک دیوار کو عبور کرتیں تو دوسری مزاحم ہو جاتی۔ بمشکل نصف صحن تک ہی پہنچی ہوں گی کہ شائستہ بیگم اور عالیہ کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ عالیہ جسم کی سوزش سے گھبرا کر علیحدہ ہونا چاہتی تھی مگر شائستہ بیگم نے اسے الگ نہیں ہونے دیا۔ وہ اسے اپنے بازوؤں میں لئے آگے بڑھتی رہیں۔ دھوئیں اور شعلوں کی کثرت نے عقبی دروازے کا راستہ بھی گم کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد شائستہ بیگم کی قوت برداشت جواب دے گئی

اور وہ زمین پر گر پڑیں۔ آگ کے عفریت اپنی سرخ زبانوں سے ماں اور بیٹی کے جسموں کو ڈستے رہے۔

"اے خدا! میں تیرے فیصلے سے راضی ہوں مگر آفریدی کو دونوں جہان میں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھنا۔" یہ شائستہ بیگم کے آخری الفاظ تھے اس کے بعد وہ اور عالیہ راکھ کا ڈھیر بن گئیں۔

☆..................☆..................☆

ایک لاکھ بیس ہزار مغلوں کا لشکر اپنے سردار طرغی کی قیادت میں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تمام راستے مسدود ہو چکے تھے اور علاء الدین کے دوسرے سپہ سالار اپنی اپنی فوجوں کو لے کر مرکز تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ طرغی دریائے جمنا کے کنارے خیمہ زن ہوا۔ سلطان اپنے سپاہیوں کی قلت اور مغلوں کی کثرت سے ہراساں نظر آنے لگا۔ پھر بھی وہ نہایت حوصلہ مندی کے ساتھ دہلی سے نکلا اور سیری میں مقیم ہو گیا۔ اس نے چاروں طرف گہری خندقیں کھدوائیں اور اپنی لشکر گاہ کے آس پاس خاربندی کرا کے مغلوں کے فوری حملے کو روکنے کی کوشش کی۔ اس طرح علاء الدین کچھ دن کیلئے اپنی عسکری قوت کو بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر مغلوں نے دہلی کے تمام نواحی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

مغل سردار طرغی روزانہ نئے احکام جاری کرتا اور اس کے سپاہی لوٹ مار اور قتل و غارت کا طوفان کھڑا کر دیتے۔ مغلوں نے کئی بار خاص شہر دہلی پر حملہ کر کے اناج کے ذخائر لوٹ لئے لیکن رعایا کو پریشان نہ کیا۔ یہ بڑی مایوس کن صورت حال تھی جس نے علاء الدین جیسے آہنی اعصاب رکھنے والے انسان کی بھی نیندیں اڑا دی تھیں۔ حالات اس وقت اور بھی خراب ہو گئے جب مغلوں نے خندقیں عبور کیں اور خاردار راستوں سے گزر کر علاء الدین کے لشکر پر کئی حملے کئے۔ بہت سے سپاہیوں کو ہلاک کر ڈالا اور بے شمار فوجیوں کو زخمی کیا۔

مغلوں کی یہ تخریب کاریاں مسلسل ڈیڑھ ماہ سے جاری تھیں اور علاء الدین کا اقتدار اس مریض کی مانند نظر آ رہا تھا جو اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہو۔

ایک طرف سلطان کی فوجی طاقت کم ہوتی جا رہی تھی اور دوسری جانب مغلوں کے حوصلے بلند ہوتے جا رہے تھے۔ علاء الدین بار بار ان راستوں پر نظر ڈالتا جن سے گزر کر تازہ دم لشکر آنے والے تھے۔ پھر اس کی تھکی ہوئی نگاہیں واپس لوٹ آتیں۔ راہیں سنسان پڑی تھیں اور علاء الدین لحظہ بہ لحظہ نئی مایوسیوں کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ وحشی مغلوں کے محاصرے کو دو ماہ گزر چکے تھے اب علاء الدین کی وہی کیفیت تھی جس سے کچھ دن پہلے راجپوت سمراٹ دوچار ہو چکا تھا۔ کیسا عجیب انقلاب تھا کہ دیکھتے دیکھتے دہلی چتوڑ بن گئی تھی اور خود علاء الدین، راجہ رتن سنگھ کی طرح بے دست و پا نظر آ رہا تھا۔ ایک دن سلطان نے اپنے امیرانِ لشکر ملک نصرت خان، خواجہ حاجی اور تاج الدین عراقی سے انتہائی شکستہ لہجے میں پوچھا۔

"کیا تم نے کسی راستے سے غبار اٹھتے ہوئے دیکھا ہے؟" علاء الدین کی مراد اپنے ان شہسواروں سے تھی جن کے انتظار میں اس کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔

سپہ سالاروں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔

"کیا تمہارے کانوں میں ہمارے گھوڑوں کے سموں کی وہ آوازیں نہیں گونجتیں جنہیں سن کر دشمنوں کے سینے شق ہو جاتے تھے؟" علاء الدین گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر رہا تھا۔

کچھ دیر تک سکوت طاری رہا۔ پھر ملک نصرت خان نے سر اٹھایا اور اداس لہجے میں کہنے لگا۔

"سلطان عالی قدر! آپ کے غلام بہت مجبور ہیں۔ وہ شاہِ والا کی قدم بوسی کیلئے کس طرح آئیں کہ مغل

درندے ان کا راستہ روکے کھڑے ہیں۔"

"آنے والے واقعتاً مجبور ہیں یا موت کے خوف نے ان کے قدموں کو جکڑ لیا ہے؟" علاء الدین کا لہجہ یکایک غضب ناک ہو گیا تھا۔

"نہیں فاتح عالم! آپ کے جاں نثاروں نے کبھی موت کی پروا نہیں کی۔" ملک نصرت خان نے پُرجوش آواز میں کہا۔ وہ سلطان کو بدگمانی سے بچانا چاہتا تھا۔ "مغل سردار طرغی نے آپ تک پہنچنے کے تمام راستے بند کر دیئے ہیں۔ دہلی کی طرف آنے والے ہر شاہراہ پر دشمنوں کا ہجوم ہے۔ آپ کے نمک خوار یقیناً کسی مناسب موقع کے منتظر ہوں گے اگر انہیں ایک سوراخ کی جگہ بھی مل گئی تو وہ اسے کھود کر کشادہ کر دیں گے۔ اور کسی نہ کسی طرح اپنے شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔"

"کیا وہ اس وقت پہنچیں گے جب ان کے شاہ کا تاج درندوں کی ٹھوکروں میں ہو گا؟" علاء الدین بہت زیادہ برہم نظر آ رہا تھا۔ "کیا وہ اس وقت غلامی کا حق ادا کریں گے جب قبائے شاہی کی دھجیاں اڑ چکی ہوں اور خلجیوں کا عظیم وارث اپنے خون میں نہایا ہوا فرشِ خاک پر تڑپ رہا ہو گا؟" سپہ سالاروں نے اپنی زندگی میں پہلی بار علاء الدین کو اس قدر پریشان دیکھا تھا۔

"نہیں شاہا! غلاموں کی زندگی میں وہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔" ملک نصرت خان نے اپنی شمشیر کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آنے والے آتے رہیں گے مگر جو غلام اس وقت موجود ہیں انہیں حکم دیجئے کہ وہ آگے بڑھ کر موت کا زاویہ تبدیل کر دیں یا خود اس کے منہ کا لقمہ بن جائیں۔"

"نصرت خان!" علاء الدین نے چیخنے کے سے انداز میں کہا.......... "کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میں اپنے دست و بازو بھی موت کے منہ میں دے کر ایک احمق تماشائی بن جاؤں؟"

"اس طرح شاہ کو یقین تو آ جائے گا کہ ابھی دنیا میں رسم وفا باقی ہے اور گردش کے وقت نمک خواروں نے اپنے آقا کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔" ملک نصرت خان اس قدر جذباتی ہو گیا تھا کہ اس کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔

"میں تمہاری وفاؤں پر شک نہیں کرتا۔" علاء الدین نے تحسین آمیز نظروں سے پہلے ملک نصرت خان کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے امیرانِ لشکر پر نگاہ کی۔ "میری خوش بختی میں تمہاری سرفروشیاں بھی شامل ہیں۔ اب کسی حکمراں کو ایسے جانباز سپاہی شاید ہی میسر آئیں۔ تم میرے احکام کو نافذ کرنے والے، میرے منصوبوں میں حقیقت کا رنگ بھرنے والے اور میرے ایک اشارے پر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دینے والے وہ اطاعت شعار ہو کہ جس پر تاریخ وفا ہمیشہ ناز کرے گی۔ تم میرا وہ اعتبار ہو کہ جس کے بغیر میں فتح کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" علاء الدین نے ان سنگین لمحات میں اپنے آپ کو ٹوٹ کر بکھرنے سے بچایا اور ان سپاہیوں کو بھی جو مغلوں کے پے در پے حملوں سے ہراساں نظر آ رہے تھے۔

علاء الدین صرف اپنی قوت ارادی سے دشمنوں کا سامنا کر رہا تھا ورنہ جنگی نقطۂ نظر سے وہ شکست کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ داخلی اعتبار سے اس کی مملکت میں بڑا انتشار تھا۔ مغلوں نے پُرامن شہریوں کا قتل عام تو نہیں کیا تھا مگر جہاں تک ان کی شر انگیزیوں کا تعلق تھا تو وہ عام رعایا کا مال و اسباب لوٹ چکے تھے اور مقامی املاک کو سخت نقصان پہنچا رہے تھے۔ مغلوں کو اپنی اس حکمت عملی سے دو بڑے فائدے حاصل ہو رہے تھے۔ ایک یہ کہ اناج کے ساتھ دیگر اشیائے ضرورت کے ذخائر پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا اور دوسرے یہ کہ ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ عوام چیخ رہے تھے اور اپنی حکومت پر سے ان کا اعتبار اٹھتا جا رہا تھا۔

خارجی طور پر کوئی سلطنت خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو مگر داخلی انتشار اس کی جڑیں کھوکھلی کر کے رکھ دیتا ہے۔ علاءالدین دونوں محاذوں پر بری طرح پسپا ہو رہا تھا۔

☆..............☆..............☆

آنے والی رات بڑی قیامت خیز تھی۔ سرِ شام ہی مغلوں نے علاءالدین کے لشکر پر ایک اور حملہ کیا تھا۔ سلطان کے فوجیوں نے بڑی ہمت سے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ اس تازہ یورش میں مغلوں کا بھی نقصان ہوا مگر علاءالدین کے سپاہیوں کی تعداد مختصر تھی۔ اس لئے ایک فوجی کی ہلاکت بھی سلطان کو بہت گراں گزرتی تھی۔ علاءالدین اپنے طاقتور حریف طرغی کی منصوبہ بندی کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ شہر میں لوٹ مار مچانے کے بعد اب مغل ایک مرکز پر سمٹ رہے تھے اور وہ مرکز تھا سلطان کی لشکر گاہ۔ طرغی مسلسل اپنا دائرہ تنگ کرتا جا رہا تھا۔ اس کے تیور بہت خطرناک نظر آ رہے تھے۔ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی اس نے مغل سپہ سالاروں کو اپنے خیمے میں جمع ہونے کا حکم دیا۔

"کیا حکم ہے سردار؟" مغل سپہ سالار انتہائی تند و تیز لہجے میں بول رہے تھے۔ .... "کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم ہندوستان کے مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹا ڈالیں؟"

"بے شک! وہ وقت آ پہنچا ہے۔ جس کا ہم برسوں سے انتظار کر رہے تھے۔" طرغی اپنے سپاہیوں کا جوش دیکھ کر مسکرایا۔

"پھر حکم دیجئے کہ ہم ان کے جوانوں اور بچوں کو تہہ تیغ کر ڈالیں اور ان کی عورتوں کو اپنے تصرف میں لے آئیں" ایک مغل فوجی اپنے سردار طرغی سے اس طرح مخاطب ہوا کہ اس کے لہجے سے آگ برس رہی تھی۔

"نہیں! ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔" طرغی نے بلند آواز میں کہا۔ "جو قومیں اس طرح قتل و غارت میں مصروف ہو جاتی ہیں انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارا نشانہ دہلی کے بے دست و پا عوام نہیں۔ وہ تو محض بھیڑ بکریاں ہیں۔ انہیں جب چاہیں گے ہانک کر لے جائیں گے۔"

"پھر؟" دوسرے مغل سپہ سالار کی بھنویں کھنچ گئیں وہ سوالیہ انداز میں طرغی کی جانب دیکھنے لگا۔

"ہمارا اصل ہدف سلطان علاءالدین ہے۔" طرغی کے ہونٹوں پر زہر آلود تبسم رقص کر رہا تھا۔ "اگر تمہارے تیر اس کے گلے کو چھو لیں اور تمہاری شمشیریں اس کے سر تک پہنچ جائیں تو پھر پورا ہندوستان ہمارے قدموں کی دھول بن جائے گا۔ علاءالدین ہی ہمارے راستے کا سب سے بڑا کانٹا ہے جب تک وہ زندہ ہے ہمارے خواب تعبیر کیلئے ترستے رہیں گے۔"

مغل فوجی اپنے سردار کی باتیں بہت غور سے سن رہے تھے۔

طرغی نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا اور اس طرح گردش دی جیسے وہ علاءالدین کو قتل کر رہا ہو............ "اس زہریلے کانٹے کی نوک توڑ دو پھر یہ گزر گاہیں ہمیشہ کیلئے صاف ہو جائیں گی۔"

مغل سپاہیوں نے چونک کر طرغی کی جانب دیکھا۔

سردار طرغی متوقع کامیابی کے نشے سے سرشار تھا اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بند کر لی تھیں اور ایک عام سی لکڑی کے تخت پر بیٹھا جھوم رہا تھا۔ خیمے کی فضائیں ساکت تھیں۔

"سردار! کیا ہم علاءالدین کا سر کاٹ کر تیری خدمت میں پیش کر دیں؟" ایک مغل سردار نے اس سکوت کو توڑا۔

طرغی نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے سر کو نفی میں جنبش دینے لگا۔ "علاءالدین کا سر کاٹنا اتنا آسان نہیں ہے وہ اس وقت بھی اپنے بہترین فوجیوں کے حصار میں موجود ہو گا۔ پہلے تم اس کی عسکری قوت کو تباہ کر دو پھر علاءالدین کا سر تو خود بخود شانوں سے الگ ہو کر زمین پر گر جائے گا۔"

مغل فوجی اپنے سردار کا اشارہ سمجھ چکے تھے پھر بھی ایک سپہ سالار نے اس نئے حکم کی وضاحت چاہی۔

"میرا خیال ہے کہ علاءالدین کے پاس اتنی فوج نہیں کہ وہ آگے بڑھ کر حملہ آور ہو سکے۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو وہ اب تک غاروں کے حصار سے باہر آ چکا ہوتا۔ ہمارے سپاہیوں نے وہ راستے بھی بند کر دیئے ہیں جن سے تازہ فوجی کمک پہنچنے کا امکان تھا۔ علاءالدین کی طاقت منتشر ہو چکی ہے۔ وہ اس وقت تنہا ہے اور اس کی یہی تنہائی ہمیں ہماری منزل تک پہنچانے کا سبب بن جائے گی۔ اگر علاءالدین کے باقی لشکر بھی اس سے آ ملے تو پھر شاید ہم کبھی اس پر غلبہ حاصل نہ کر سکیں۔ آسمان نے ہمیں یہ بڑا عجیب موقع فراہم کیا ہے۔ تم آخری بار اپنی جانوں پر کھیل جاؤ اور صبح ہوتے ہی سلطان کی لشکر گاہ کو روند ڈالو اگر علاءالدین گرفتار ہو گیا یا جنگ کرتے ہوئے مارا گیا تو اس کی بے پناہ فوجی قوت تنکوں کی طرح بکھر جائے گی۔ پھر ہم بڑی آسانی کے ساتھ اس زرخیز ملک کی نعمتوں سے فیض یاب ہو سکیں گے۔"

مغل فوجیوں نے اپنے سردار سے عہد و پیمان کئے، کٹ مرنے کی قسمیں کھائیں اور صبح ہوتے ہی علاءالدین کی صفیں الٹ دینے کی تیاریاں کرنے لگے۔

☆..............☆..............☆

اسی رات علاءالدین اپنی خواب گاہ میں تنہا تھا۔ تمام امراء اور فوجی سردار پریشان تھے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ آنے والے لمحات کیسی جانگداز خبر لے کر آئیں گے۔ بظاہر سب کے سب اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے اور چتوڑ کی فتح کے نشے کو وحشی مغلوں نے اس طرح زائل کر دیا تھا جیسے تیز آندھی تناور درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔ اسی وحشت کے عالم میں ملک کافور خواب گاہ سلطانی کی طرف بڑھا اور دبے قدموں کمرے میں داخل ہو گیا۔ ۔ علاءالدین پشت پر دونوں ہاتھ باندھے ٹہل رہا تھا۔ ملک کافور تیزی سے جھکا اور سلطان کے پیروں پر سر رکھ کر بہ آواز بلند کہنے لگا۔

"شاہِ والا کا اقبال بلند ہو۔"

علاءالدین نے اپنے پاؤں کھینچ لئے ملک کافور کا سر فرش سے ٹکرایا اور سلطان دیوار پر آویزاں ہندوستان کے نقشے کو دیکھنے لگا۔ علاءالدین کی نظریں ملتان اور دیپال پور کے علاقے پر مرکوز تھیں۔ جہاں سے گزر کر مغل سپاہیوں کا ٹڈی دل ہندوستان کے سرسبز و شاداب کھیتوں کو چاٹ لیا کرتا تھا آج علاءالدین کو بڑی شدت سے اپنی اس کوتاہی کا احساس ہو رہا تھا کہ وہ جوشِ تسخیر میں ہندوستان کے دور دراز علاقوں پر لشکر کشی کرتا رہا مگر اس نے بیرونی خطرات کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ اب ہوش آیا تو وقت بہت آگے جا چکا تھا۔ علاءالدین بہت دیر تک کسی مجسمے کی مانند بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر اچانک پلٹا تو اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا اور آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے۔ دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پیوست تھے اور ہونٹ سختی کے ساتھ بھنچے ہوئے تھے۔ ملک کافور دست بستہ کھڑا تھا' سلطان کی یہ کیفیت دیکھ کر لرزنے لگا۔ علاءالدین نے اپنے محبوب غلام پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دریچے کے قریب پہنچا اور باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ رات بہت تاریک تھی گرد و پیش کی ہر چیز اندھیرے کا کفن اوڑھے سناٹے کی قبر میں لیٹی ہوئی تھی کبھی کبھی ہوا کے رخ پر دریائے جمنا کے سینے سے اٹھنے والی پر شور موجوں کی

آواز سنائی دیتی تھی سننے والوں کو محسوس ہوتا تھا جیسے موت دبے پاؤں ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔

یکایک علاءالدین کی صدا گونجنے لگی۔ وہ بہت پرسوز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "اے خدا! تو نے علاءالدین کی تقدیر روشن حروف سے لکھی ہے پھر یہ کیسا اندھیرا ہے جو اسے نگلنے کیلئے آگے بڑھ رہا ہے۔ مجھے ایک موقع اور دیدے کہ میں سنبھل سکوں مغل درندوں نے مجھ پر عقب سے وار کیا ہے کاش! یہ میرے سامنے نمودار ہوتے پھر میں دیکھتا کہ ان کے دانت کس فولاد سے بنے ہیں اور ان کے پنجے کتنے تیز ہیں؟ اے خدا! شیروں کے وارث کو گیدڑوں اور لومڑیوں کے حوالے نہ کر۔ میرے بچھڑے ہوئے سپاہیوں کو مجھ تک پہنچنے کا راستہ دے کہ میں ان قزاقوں کو کھلے میدان میں للکار سکوں۔" مادی سہارے ناکام ہوگئے تو علاءالدین آسمانی طاقت کو پکارنے لگا۔

"ایسا ہی ہوگا۔" ملک کافور بولا۔

سلطان نے پلٹ کر دیکھا اور کہا۔ "کیا تو اپنے شاہ کے مزاج کو نہیں جانتا کہ وہ اپنی جنگ خود لڑتا ہے۔" علاءالدین کا لہجہ کچھ اور سخت ہو گیا تھا۔ "تجھے خبر نہیں کہ تیرا شاہ مصیبت کے وقت کتوں کی پاسبانی قبول نہیں کرتا۔"

"میں جانتا ہوں فاتح عالم! میں جانتا ہوں۔" ملک کافور ایک بار پھر سجدے میں گر کر سر رگڑنے لگا تھا۔ "آپ حکم دیں تو میں رام دیو کو حضور کی خدمت میں حاضر کروں کہ وہ ستاروں کا حساب خوب جانتا ہے۔"

علاءالدین رام دیو کا ذکر سن کر چونک اٹھا.......... "ستاروں کا حساب؟" سلطان نے تیز آواز میں کہا۔

ملک کافور اٹھا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ "رام دیو جسے آپ نے چتوڑ میں غلامی کا اعزاز بخشا تھا وہ بہت بڑا ماہر نجوم ہے اس کا دعویٰ ہے کہ ایک روز آپ ساری دنیا پر حکومت کریں گے۔"

علاءالدین کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ ابھر آیا۔ وہ اچانک گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

ملک کافور رام دیو کی تعریفیں کرنے لگا۔ "وہ چند لمحوں میں بتا دے گا کہ ستاروں کی یہ گردش کب ختم ہوگی؟"

ملک کافور ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ علاءالدین نے اسے جھڑک دیا۔ "راجپوتوں کی بھیک کے ٹکڑے کھانے والا وہ برہمن ہمارے مستقبل کے بارے میں بتائے گا؟" سلطان کے لہجے سے شرارے چھوٹ رہے تھے.......... "خود جس کی زندگی ہمارے رحم و کرم کی محتاج ہو وہ ہماری تقدیر کی خبر دے گا؟"

ملک کافور کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ شاہ کے رعب و جلال سے لرزنے لگا۔

"امیر خسروؒ کہاں ہیں؟" اچانک علاءالدین نے اپنے غلام سے پوچھا۔

"شاید وہ اپنے کمرے میں موجود ہوں۔" ملک کافور نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا وہ سلطان کے ذہن کو پڑھنے سے قاصر تھا۔

"تو جا اور کسی محافظ سپاہی کو اندر بھیج دے۔" یہ کہہ کر سلطان نے منہ پھیر لیا۔ ملک کافور سمجھ گیا کہ اب اس کی موجودگی ناقابل برداشت ہے وہ بے جان قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

چند لمحوں بعد سلطان نے اپنے ایک محافظ کو حکم دیا کہ وہ امیر خسروؒ تک یہ پیغام شاہی منتقل کر دے کہ علاءالدین ان سے ملاقات کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ محافظ نے امیر خسروؒ کو بہت تلاش کیا مگر اپنی جستجو میں

کامیاب نہ ہوسکا علاءالدین کو اطلاع دی گئی کہ امیر خسروؒ لشکر گاہ میں موجود نہیں ہیں سلطان انتہائی فکر مند نظر آرہا تھا اس نے دوسرا حکم جاری کیا کہ بیک وقت کئی خدمت گار امیر خسروؒ کی تلاش جاری رکھیں آخر بہت دوڑ دھوپ کے بعد امیر خسروؒ سپاہیوں کو نظر آئے وہ لشکر گاہ کے ایک انتہائی سنسان گوشے میں دریا کے کنارے عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد اپنے روزانہ کے وظائف میں مشغول تھے۔

حکم شاہی سنتے ہی امیر خسروؒ نے دعا کے واسطے ہاتھ بلند کئے کچھ دیر تک اپنے رب سے مسلمانانِ ہند کیلئے عافیت طلب کرتے رہے اور پھر علاءالدین کے روبرو پہنچ کر خاموش کھڑے ہوگئے۔

"خسروؒ! تم جانتے ہو کہ ہم نے تمہیں کیوں یاد کیا ہے؟" علاءالدین کے لہجے سے شدید اضطراب جھلک رہا تھا۔

"شاہ والا خود ہی بہتر جانتے ہیں۔" امیر خسروؒ نے مبہم سا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"مغلوں کے محاصرے کو دو ماہ گزر چکے ہیں۔" علاءالدین چہرے سے بہت زیادہ پریشان نظر آرہا تھا۔ "مخلوق خدا ان لٹیروں کے ہاتھوں سخت اذیتیں برداشت کر رہی ہے۔ عوام بظاہر اپنی زبانوں سے کچھ نہیں کہتے مگر ان کے سینوں میں وہی بات دبی ہوئی ہے جو ہونٹوں تک آجائے تو خسروؒ تمہاری سماعت بھی جل اٹھے۔ اگرچہ رعایا سے ہمارا رابطہ ٹوٹ چکا ہے مگر اتنے فاصلے کے باوجود ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ہمارے جاہ و جلال کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ہمیں خدا کی طرف سے عوام کا نگہبان ٹھہرایا گیا تھا لیکن جب ان پر یہ آفت ناگہانی نازل ہوئی تو ہم ان کے حقوق کی حفاظت نہ کر سکے۔" یہ کہہ کر علاءالدین خلجی چند لمحوں کیلئے خاموش ہوگیا اور اداس نظروں سے امیر خسروؒ کی طرف دیکھنے لگا۔ "ہمارے دورِ حکومت میں کل تک وہ اپنے دروازے کھلے چھوڑ کر چین کی نیند سو جاتے تھے مگر آج یہ حال ہے کہ ان کے جان و مال محفوظ ہیں اور نہ عزت و ناموس۔ کیسی گردشِ وقت ہے کہ ہم نے اپنا اعتبار کھو دیا خسروؒ! چتوڑ ہماری قبر بن گیا ہم جیت کر بھی ہار گئے وہ جشنِ فتح نہیں ہمارا جنازہ تھا جس پر اہل شہر ماتم کر رہے تھے۔"

علاءالدین اس قدر شکستہ نظر آرہا تھا کہ اس نے اپنا سر دیوار سے ٹیک دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔

"نہیں رعایا پرور! ابھی تو آپ کے دعاگو زندہ ہیں۔" امیر خسروؒ نے اس عالمِ بے کسی میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔

"خسروؒ! کیسی دعا۔" علاءالدین کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے ہونٹ بہت آہستہ حرکت کر رہے تھے.......... "لوگ تو ہمارے مرنے کی دعائیں کر رہے ہوں گے.......... اور وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ہم نے بھی تو انہیں موت کے منہ میں تنہا چھوڑ دیا ہے۔" علاءالدین کی مایوسی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

"نہیں شاہ! آپ کی سلامتی کیلئے دعائیں مانگنے والا تو کوئی اور ہے۔" امیر خسروؒ نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں حضرت شیخ کا ذکر کر رہا ہوں۔"

علاءالدین نے آنکھیں کھول دیں اور سیدھا کھڑا ہوگیا .... "ہم نے تمہیں اسی لئے یاد کیا تھا خسروؒ مگر کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ کب تک اپنے ناپاک دامن کو حضرت شیخ کے سامنے پھیلائیں۔"

"آپ کا خادم تو درمیان میں موجود ہے۔" امیر خسروؒ نے علاءالدین کو مطمئن کرتے ہوئے کہا.......... "میں پیر و مرشد کے قدموں سے لپٹ جاؤں گا اور اس وقت تک دامن نہیں چھوڑوں گا

جب تک یہ سیاہ رات ختم نہیں ہو جائے گی۔"

"ہمیں یقین ہے خسروؒ کہ تم ایسا ہی کرو گے۔" علاءالدین کے چہرے پر زندگی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ "حضرت شیخ کی دعائیں ہی اس خون آشام بلا کو ٹال سکتی ہیں۔ ابھی تک ہم نے اپنے کسی سپہ سالار پر یہ راز ظاہر نہیں کیا ہے کہ ہمارے اقتدار کی گھڑیاں گنی جا چکی ہیں۔ امیرانِ لشکر اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ ایک طویل عرصے تک کامیابی کے ساتھ دفاع کرتے رہیں گے انہیں کیا خبر کہ مغلوں کے ہاتھ ہمارے سینے اور گردن تک آ پہنچے ہیں۔" علاءالدین نے صحیح صورت حال کا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے یہاں مایوسی کفر کا درجہ رکھتی ہے۔" امیر خسروؒ کا لہجہ پرجوش تھا۔

علاءالدین نے کوئی جواب نہیں دیا وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ امیر خسروؒ نے دیکھا کہ سلطان کی پیشانی پر کئی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ "مگر تم جاؤ گے کس طرح؟ تمام راستے تو بند ہیں۔"

"جس کا بندہ ہوں وہی میرا محافظ ہے۔" یہ کہتے کہتے امیر خسروؒ کو اپنا وہ زمانہ یاد آ گیا جب سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے میں مغلوں نے ملتان پر حملہ کیا تھا اس جنگ میں بلبن کا لائق ترین فرزند شہزادہ سلطان محمد قتل ہو گیا تھا اور امیر خسروؒ قیدی بنا لئے گئے تھے پھر قید و بند کی سختیاں جھیلنے کے بعد آزاد کئے گئے اور راستے کی بے شمار تکلیفیں برداشت کرتے ہوئے دہلی پہنچے آج وہی مغل ملتان کی حدود سے گزر کر دارالحکومت تک آ گئے تھے اور ان کی چیرہ دستیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ شاہی لشکر بھی بے دست و پا نظر آ رہا تھا۔ چند لمحوں کیلئے امیر خسروؒ کی نگاہوں کے سامنے کئی اذیت ناک منظر متحرک ہو گئے تھے۔

علاءالدین، خسروؒ کا جواب سن کر خاموش رہا مگر اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی افسردگی بتا رہی تھی کہ وہ اس جواب سے مطمئن نہیں ہے۔ سلطان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جہاں قدم قدم پر مغل سپاہی موجود ہوں وہاں سے ایک تنہا شخص سلامتی کے ساتھ کس طرح گزر سکتا ہے۔

امیر خسروؒ نے سلطان کے چہرے پر لکھے ہوئے پریشان خیالات کو پڑھ لیا............ "شاہ والا! آپ میرے بارے میں ذرا بھی فکرمند نہ ہوں میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کا غلام ہوں۔ مغل مجھے راستہ دینے کیلئے مجبور ہیں انہیں ایسا کرنا ہی ہوگا۔" امیر خسروؒ یقین کی آخری منزل سے بول رہے تھے۔

کچھ دیر علاءالدین ساکت کھڑا رہا پھر اس نے اپنے چند محافظ سپاہیوں کو طلب کرتے ہوئے کہا۔

"خسروؒ! تم ان کے ہمراہ چلے جاؤ۔"

"نہیں سلطان معظم! ایسا ممکن نہیں ہے۔" امیر خسروؒ نے ادب و احترام کے لہجے میں انکار کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس وقت حضرت شیخ کو کیا جواب دوں گا جب پیر و مرشد مجھ سے فرمائیں گے خسروؒ! کیا تجھے اپنے خدا کی حفاظت و نگہبانی پر اعتبار نہیں تھا؟"

علاءالدین کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا پھر بھی اس نے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ اس وقت واپس لوٹ آنا جب خسروؒ خندق کو عبور کر لیں پھر یہ اپنے اللہ کی نگہبانی میں ہوں گے۔"

امیر خسروؒ نے اس سے اتفاق کیا اور اجازت لے کر اس راستے کی طرف بڑھنے لگے جو غیاث پور سے قریب تر تھا غیاث پور دہلی کے مضافات میں وہی مقام خاص ہے جہاں حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنی خانقاہ تعمیر کی تھی۔

☆............☆............☆

امیر خسروؒ پہلے خاروں کے حصار سے نکلے اور پھر خندق کو پار کر کے ہموار راستے پر چلنے لگے، خسروؒ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ چپے چپے پر مغل سپاہی موجود تھے اور رات کی تاریکی کے باوجود حرکت میں نظر آ رہے تھے۔ خسروؒ کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ حملہ آوروں کے ارادے خطرناک ہیں اور وہ کسی خاص منصوبہ بندی پر عمل کر رہے ہیں اس صورت میں خسروؒ کا خاموشی سے گزر جانا تقریباً ناممکن نظر آ رہا تھا پھر بھی وہ اپنے خدا کے بھروسے پر آگے بڑھتے رہے ابھی امیر خسروؒ نے چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ کچھ مغل سپاہیوں کی نظر ایک سائے پر پڑی وہ بے اختیار چیخ اٹھے۔

"دشمن آ رہا ہے اپنی اپنی جگہ ہوشیار ہو جاؤ۔"

رات کے سناٹے میں مغلوں کی آوازیں دور تک گونج رہی تھیں امیر خسروؒ ایک لمحے کیلئے گھبرا سے گئے مگر پھر فوراً ہی سورہ یٰسین کی اس آیت کا ورد کرنے لگے جسے پیغمبر اسلامؐ نے ایک جنگ کے موقع پر پڑھا تھا اور جس کے اثرات سے کفار کا لشکر مسلمانوں کو ایذا پہنچانے سے قاصر رہا تھا۔

"اے پیغمبر! یہ تمہاری طرف دیکھ ہی نہیں سکتے کہ ہم نے ان کی آنکھوں کے آگے دیوار کھینچ دی ہے۔"

امیر خسروؒ اس آیتِ مقدسہ کو زیر لب پڑھتے رہے چند لمحوں کی بات تھی مغلوں کی آنکھوں پر بھی پردہ سا پڑ گیا پھر ان کا اضطراب ختم ہو گیا اور وہ پرسکون نظر آنے لگے۔

"کوئی نہیں ہے کوئی نہیں ہے۔ وہ ہماری نگاہ کا فریب تھا۔" مغل سپاہی ایک دوسرے سے کہنے لگے اور امیر خسروؒ انتہائی تیز رفتاری سے آگے بڑھتے رہے۔

پھر جب حضرت نظام الدین اولیاؒ کا یہ چہیتا مرید آدھی رات کے بعد پسینے میں نہایا ہوا خانقاہ پہنچا تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ طویل مسافت کے سبب امیر خسروؒ کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں اور چہرے کا رنگ متغیر نظر آ رہا تھا۔ حضرت شیخ کے تمام خدمت گار امیر خسروؒ کو اس حال میں دیکھ کر پریشان ہو گئے کئی درویشوں نے وحشت و اضطراب کا سبب پوچھا مگر خسروؒ کسی کو کیا بتاتے؟ وہ تو ایک راز تھا جسے حضورِ شیخ ہی بیان کیا جا سکتا تھا۔ خسروؒ کچھ دیر تک خاموش کھڑے رہے اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پایا اور آہستہ آہستہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے حجرۂ مبارک کی طرف بڑھنے لگے۔

حضرت شیخ کا معمول تھا کہ نماز عشاء کے بعد اپنے مخصوص کمرے میں تشریف لے جاتے اور پھر کسی شخص کو اندر آنے کی اجازت نہ ہوتی مگر امیر خسروؒ اس پابندی سے مستثنیٰ تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کا حکم تھا کہ خسروؒ جب چاہیں حجرۂ مبارک میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک منفرد اعزاز تھا جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں تھا۔ خسروؒ خانقاہ میں موجود ہوتے تو ساری رات حضرت شیخ کے قدموں میں بسر کر دیتے۔ ان کا ایک مشہور شعر ہے۔

"غریب خسرو اس تمنا میں کئی راتوں سے جاگ رہا ہے کہ اسے حضور کے تلوے میسر آ جائیں اور پھر وہ ان پر اپنی آنکھیں رکھ کر سو جائے۔"

اسی عقیدے نے امیر خسروؒ کو بارگاہ شیخ میں محبوبیت کے درجہ تک پہنچا دیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ ان کی کسی درخواست کو مسترد نہیں کرتے تھے بعض مواقع پر امیر خسروؒ نے بے جا ضدیں بھی کیں مگر حضرت شیخ نے ان کا بھرم رکھا آج اسی نسبتِ خاص کے پیش نظر امیر خسروؒ نصف شب کے بعد خدمتِ شیخ میں حاضر ہو رہے تھے۔

حجرۂ مبارک کا دروازہ بہت آہستگی کے ساتھ کھولا گیا امیر خسروؒ نے دیکھا کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ شدید استغراق کے عالم میں چٹائی پر تشریف فرما تھے' ہر طرف ایک نور پھیلا ہوا تھا۔ امیر خسروؒ کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور پھر اسی کیفیت میں آگے بڑھے اور حضرت شیخ کے قدموں سے لپٹ گئے۔ خسروؒ کے اس عمل سے حضرت نظام الدین اولیاؒ کی یکسوئی متاثر ہوئی آپ نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

"خسرو! تم اس وقت ؟" حضرت شیخ نے تعجب سے فرمایا۔

"ہاں سیدی میں بیچارہ خسرو۔" امیر خسروؒ کی آواز رقت آمیز تھی۔

"کیا بات ہے ؟ تم رو رہے ہو ؟" حضرت نظام الدین اولیاؒ بے چین نظر آنے لگے۔

"سیدی! یہ دردِ فراق ہے جو اس غلام کو رلا رہا ہے۔" امیر خسروؒ نے عرض کیا اور شیخ کی خدمت میں دست بستہ ہو کر بیٹھ گئے آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ظاہری حالت بہت زیادہ بگڑی ہوئی نظر آرہی تھی۔

"تم ہم سے دور کب ہو خسرو!" حضرت نظام الدین اولیاؒ نے بے قرار مرید کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ "اگر درمیان میں ہزاروں میل کا فاصلہ بھی حائل ہو تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ تم سامنے بیٹھے ہو۔"

"سیدی! خادم اس اعزاز کے لائق نہیں تھا مگر یہ تو شیخ کا کرم ہے کہ دوریاں بھی قربتوں میں ڈھل گئیں۔" امیر خسروؒ نے روتے ہوئے عرض کیا اور اپنی بے وقت آمد کا سبب بیان کرنے لگے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ نے تمام واقعات سننے کے بعد فرمایا۔ "خسرو! تم ایسے شخص کی سفارش کرتے ہو جسے فتح حاصل کرنے کے بعد کچھ یاد نہیں رہتا۔"

"سیدی! آپ کے غلام نے سلطان سے وعدہ کیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے امیر خسروؒ زار و قطار رونے لگے۔ "مخلوقِ خدا ایک جان لیوا عذاب میں مبتلا ہے۔ مغل وحشی رقص کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ اس وقت بھی جاگ رہے ہیں۔ شاید دہلی پر اسلامی اقتدار کی یہ آخری رات ہو۔ اگر مغلوں نے علاءالدین کے تخت و تاج کو روند ڈالا تو مسلمان منتشر ہو جائیں گے۔"

حضرت نظام الدین اولیاؒ نے امیر خسروؒ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اتنے بے قرار نہ ہو خسرو! تمہارے آنسو تو ہمیں بھی رلا دیتے ہیں۔ مخلوق خدا کا خیال ہی تو ہمیں دست دعا دراز کرنے کیلئے مجبور کر دیتا ہے۔ ہم اس امید پر جی رہے ہیں کہ شاید علاءالدین بدل جائے مگر آثار بہت مایوس کن ہیں۔ ہم نے تمہاری جدائی بھی محض اس لئے برداشت کی ہے کہ تم سلطان کے قریب رہ کر اسے مناسب الفاظ میں نصیحت کرتے رہو۔ ممکن ہے کہ خدا اس کے دل کو پھیر دے۔"

"شیخ! آپ کا یہ حقیر خادم کبھی اپنے فرض سے غافل نہیں رہا مگر سلطان پر بدکردار مشیروں کا بہت غلبہ ہے۔"

"ہم جانتے ہیں خسرو!" حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا۔

"پھر اسے سنبھلنے کا ایک اور موقع عنایت کر دیجئے۔" امیر خسروؒ نے درخواست کی۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ خاموش رہے۔

"یہ سلطنت علاءالدین خلجی کی نہیں ہے۔ اس مملکت کے تاجدار آپ ہیں۔" امیر خسروؒ کی التجا کا انداز بدل گیا تھا۔ "یہ آپ کی رعایا ہے جو اپنے شاہ کو مدد کیلئے پکار رہی ہے۔"

"نہیں خسروؒ! زمین بھی خدا کی' اقتدار بھی خدا کا اور رعایا بھی خدا کی۔" حضرت نظام الدین اولیاؒ کی

آنکھوں میں نمی سی جھلکنے لگی اور آپ نے انتہائی پرسوز لہجے میں فرمایا۔ "ہم تو ایک فقیر بوریا نشین ہیں' اللہ کے بندوں کے خدمت گار داتا کی چوکھٹ پر سر رکھ کر جھولی پھیلا دیتے ہیں۔ اب یہ اس کی شانِ بندہ نوازی ہے کہ وہ ہمارے دامن کو خالی نہیں رہنے دیتا۔"

"سیدی! پھر علاءالدین کے حق میں دعائے خیر فرما دیجئے۔" امیر خسروؒ کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں شدت آگئی تھی۔ "مغل سردار طرغی" سلطان کی بے کسی پر خندہ زن ہے اس نے قسم کھائی ہے کہ وہ علاءالدین کو تباہ کئے بغیر اپنے وطن واپس نہیں جائے گا۔"

"طرغی کس شمار میں ہے ؟ ایک دن سبھی کو جانا ہے۔" حضرت نظام الدین اولیاؒ کے چہرہ مبارک پر جلال روحانی نمایاں ہو گیا تھا۔ "طرغی بھی جائے گا' بحکم خدا اسے جانا ہی ہو گا۔"

امیر خسروؒ ایک بار پھر حضرت شیخ کے قدموں سے لپٹ گئے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنے مریدِ خاص کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا۔ "خسروؒ! اب تم جاؤ اور آرام کرو۔ بہت تھک گئے ہو۔"

امیر خسروؒ اٹھے' حضرت شیخ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور الٹے قدموں حجرۂ مبارک سے نکل کر خانقاہ کے صحن میں چلے آئے۔

☆..........................☆..........................☆

علاءالدین ساری رات جاگتا رہا۔ ایک لمحے کیلئے بھی اس کی آنکھ نہیں جھپکی تھی۔ وہ بار بار اپنے محافظ سپاہیوں سے پوچھتا کہ ان لوگوں نے خسروؒ کو کس حال میں چھوڑا تھا۔ سپاہی اس کے سوا کیا بتا سکتے تھے کہ امیر خسروؒ خندق عبور کر کے رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے تھے اور مغل سپاہی غیر معمولی انداز میں چاروں طرف گردش کر رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ خسروؒ مغلوں کے نرغے سے نکل کر سلامتی کے ساتھ خانقاہ تک پہنچ گئے ہوں گے۔ علاءالدین حضرت نظام الدین اولیاؒ کے کشف و کرامات کا قائل تھا مگر امیر خسروؒ کے عارفانہ مقام سے بے خبر تھا۔ اسے یہی خدشات گھیرے ہوئے تھے کہ کہیں یہ نابغۂ روزگار شاعر مغلوں کی تلواروں کا ہدف نہ بن گیا ہو۔ اسی دوران علاءالدین کے جاسوس مسلسل یہ خبریں بھی دیتے رہے کہ خندق کے قریب دشمن کے سپاہی جمع ہو رہے ہیں۔ سلطان نے مغلوں کی اس نقل و حرکت کو دیکھ کر اندازہ کیا تھا کہ آنے والی صبح اور دنوں سے زیادہ تباہ کن ثابت ہو گی۔ علاءالدین بہت دیر سے محل کے دریچے میں کھڑا تھا۔ اس کی روشن آنکھیں باہر کی فضا کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہی تھیں مگر گہری تاریکی نے ہر شے کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ سلطان پلٹ کر آیا اور دوسرے ہی لمحے اس نے تمام سپہ سالاروں کو اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔ امیرانِ لشکر نے علاءالدین کو بتایا کہ شاہی فوج کے دستے پوری طرح چاق و چوبند ہیں اور قصرِ سلطانی کی حفاظت کر رہے ہیں۔

علاءالدین پر ایک عجیب سا اضطراب طاری تھا۔ اس نے فوراً ہی اپنے سپہ سالاروں کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا۔ "کاروانِ شب گزرنے والا ہے ہمیں ڈر ہے کہیں سرد ہوا کے جھونکے تمہیں گہری نیند نہ سلا دیں۔ اس لئے جاگتے رہو کہ یہ رات بڑی قیامت خیز ہے۔"

امیرانِ لشکر گردنیں جھکائے ہوئے بارگاہ شاہی سے نکل کر اپنے اپنے محاذوں پر چلے گئے اور علاءالدین نے ملک کافور سے شراب لانے کیلئے کہا۔ "ہماری خواہش تو یہی ہے کہ ہم مغلوں کے جسموں سے خون کشید کریں اور اپنے لبریز ساغر کو منہ لگا دیں مگر کیا کریں کہ وقت بہت بے وفا ہے۔ کاش! ہمارے تمام سپاہی ہم سے آملتے۔ پھر معرکہ آرائی ہوتی۔ پھر ہم ساری دنیا کو دکھاتے کہ ہماری شوریدہ سری اور

وحشت کا کیا معیار ہے ؟" علاءالدین خود کلامی کے انداز میں بول رہا تھا۔ ملک کافور سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

جب سلطان کے اعصاب کچھ پرسکون ہوئے تو وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ ٹہلتے ٹہلتے علاءالدین کو شدید تھکن کا احساس ہونے لگا تھا۔ ملک کافور نے آگے بڑھ کر شمعیں گل کر دیں اور پھر دبے قدموں واپس چلا گیا۔ سلطان سونا نہیں چاہتا تھا مگر تیز شراب اور پچھلے پہر کی ٹھنڈی ہوا نے اس کی پلکوں کو بوجھل کر دیا۔ کچھ دیر کیلئے آنکھ لگی تو علاءالدین نے خواب میں ایک پرہول منظر دیکھا۔

سلطان جلال الدین خلجی کا کٹا ہوا سر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ علاءالدین نے وحشت زدہ ہو کر اپنے چچا کی طرف دیکھا۔ جلال الدین خلجی کے چہرے پر ناقابل بیان کرب کا اظہار ہو رہا تھا۔ بہتے ہوئے آنسو اس کی سفید داڑھی کو بھگو رہے تھے۔ علاءالدین بدحواس ہو گیا۔ جلال الدین خلجی کا آگے بڑھتا ہوا سر اچانک ٹھہر گیا پھر مقتول سلطان کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ایک ماتمی آواز فضاؤں میں گونجنے لگی۔

"بے وفا بھتیجے! تو نے یہ کیا کیا ؟"

ابھی اس فریاد کی بازگشت جاری تھی کہ علاءالدین کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا پورا بدن پسینے میں تر تھا اور خوف کی ایک لہر رگ و پے میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں اندھیرا دیکھ کر وہ پوری قوت سے چیخا۔

"یہ شمعیں کس نے بجھائی ہیں ؟ روشنی کرو۔"

ملک کافور سلطان کی چیخ سن کر تیزی سے بھاگا اور خوابگاہِ شاہی کے فانوس دوبارہ جل اٹھے۔ روشنی ہوئی تو ملک کافور نے دیکھا کہ سلطان بستر سے اتر کر فرش پر کھڑا ہے اور اس کی بے چین نظریں کمرے میں کسی شے کو تلاش کر رہی ہیں۔ جب علاءالدین نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ وہ ایک خواب تھا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے ملک کافور کو باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ تنہائی ملتے ہی علاءالدین دوبارہ وحشت زدہ نظر آنے لگا۔ آج اس نے پہلی مرتبہ سلطان جلال الدین خلجی کو خواب میں دیکھا تھا۔

"آخر اس خواب کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے ؟" علاءالدین اپنے آپ سے سوال کرنے لگا۔ اس موقع پر سلطان کو قاضی صدرالدین عارف یاد آ گئے جو دیگر علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ خواب کی تعبیر کا علم بھی رکھتے تھے۔ اگر وہ موجود ہوتے تو علاءالدین انہیں اسی وقت طلب کر کے اپنے بھیانک خواب کی تعبیر دریافت کرتا لیکن قاضی صدرالدین سے فوری طور پر رابطہ قائم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ علاءالدین بہت دیر تک کسی بدحواس انسان کی مانند کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اس خواب نے اسے بہت زیادہ خوفزدہ کر دیا تھا۔ مغلوں کی یورش کا خیال آتے ہی سلطان کی وحشت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ کہیں یہ خواب اس کے عبرتناک انجام کی پیش گوئی نہ ہو۔ جس طرح علاءالدین نے اپنے چچا کا سر کاٹ کر اودھ کی گلیوں میں پھرایا تھا' اسی طرح طرغی بھی اس کی گردن جدا کر کے عوام کو ایک خوں رنگ تماشا دکھا سکتا ہے۔ یہ تصور بڑا اذیت ناک تھا۔ علاءالدین کا ذہن اندیشوں سے بھر گیا اور وہ سوچنے لگا کہ ایسے سنگین لمحات میں یہ خواب بے معنی نہیں ہے۔ ضرور کسی آفتِ ناگہانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وسوسوں نے دماغ میں اس طرح جگہ بنا لی کہ علاءالدین شکست کے ساتھ اپنی موت کو بھی یقینی سمجھنے لگا۔

☆..........☆..........☆

پھر جب ایک ایک کر کے تمام ستارے قتل ہو گئے' رات کا قافلہ لٹ گیا اور سورج نے اپنی زندگی کا

احساس دلایا تو سلطان کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر ابھر رہا تھا جس پر اہل دل کے سوا کسی کو یقین نہیں آئے گا۔ علاءالدین کے تمام سپہ سالار اور فوجی کچھ دیر کیلئے پتھر کے بے جان مجسمے بن کر رہ گئے تھے۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی دل فریب خواب دیکھ رہے ہیں۔

آخر ملک نصرت خان نے علاءالدین کو یہ جاں فزاء خبر سنائی۔ "سلطان کی بلند اقبالی نے طرغی کو مجبور کر دیا کہ وہ محاصرہ توڑ دے اور ناکام و نامراد واپس لوٹ جائے۔"

علاءالدین کو اپنے سپہ سالار کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا۔ "نصرت خان! مسلسل شب بیداری نے تیرے حواس میں خلل ڈال دیا ہے۔"

"کسی غلام میں یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ آقا کے سامنے کوئی مہمل بات اپنے ہونٹوں پر لائے۔" نصرت خان نے ادب سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "مغل اپنے خیمے اکھاڑ کر واپس جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔"

علاءالدین یہ خبر سن کر کچھ دیر تک ساکت کھڑا رہا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین تھا اور نہ ملک نصرت خان کی فراہم کردہ اطلاع پر۔

"سلطان خود محاذ جنگ کا معائنہ فرما سکتے ہیں۔" نصرت خان نے علاءالدین کو بے یقینی کی کیفیت سے نکالنے کیلئے پرجوش لہجے میں کہا۔ "مغل اپنے گھوڑوں پر مال و اسباب لاد رہے ہیں۔ شاہ والا! یہ انداز سفر کے سوا کسی اور بات کی نشاندہی نہیں کرتا۔"

علاءالدین شدید حیرت و سکون کے عالم میں محل سے نکلا اور پھر درمیانی فاصلے سے مغلوں کی روانگی کا منظر دیکھنے لگا۔ "ناقابل یقین۔ انتہائی ناقابل یقین۔" سلطان کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ "کون اس خبر پر اعتبار کرے گا کہ ہمارے دشمن نے اس وقت محاصرہ اٹھا لیا جب وہ فتح کے قریب پہنچ چکا تھا۔ یہ سب حضرت شیخ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے ورنہ ہماری بچھائی ہوئی بساط تو الٹ چکی تھی۔"

ادھر مسلمان سپاہیوں کے دل غائبانہ طور پر حضرت نظام الدین اولیاؒ کی بارگاہ میں خم تھے اور ادھر سردار طرغی اپنے سپاہیوں سے کہہ رہا تھا۔ "جلدی کرو۔ ہمارا سفر بہت طویل ہے۔"

مغل فوجی اپنے سردار سے پوچھ رہے تھے۔ "کیا سب کچھ رائیگاں گیا ؟ یہ راستے کی دشواریاں' یہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں' ہمیں کیا حاصل ہوا سردار ؟"

"اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ لو اور دہلی کی طرف پیٹھ کر لو کہ اسی میں تمہاری عافیت ہے۔" طرغی نے چیخ کر کہا اور مغل فوجیوں نے اپنے سر جھکا دیئے۔

☆..........☆..........☆

سردار طرغی کا اچانک محاصرہ اٹھا لینا اور مغل سپاہیوں کا اپنے وطن واپس لوٹ جانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ جب اہل شہر کو اس کا علم ہوا کہ وہ دو ماہ کی بدترین قید سے آزاد ہو چکے ہیں تو ہر شخص کے منہ سے بے اختیار نکل گیا کہ "دہلی نظام الدین اولیاؒ کی دعاؤں کے سائے میں ہے۔ اگر حضرت شیخ یہاں کے باشندوں کیلئے خدا سے اس کی رحمت طلب نہ کرتے تو یہ دلکش اور بارونق شہر اب تک کسی مقتل میں تبدیل ہو چکا ہوتا۔

خود علاءالدین کو بھی اس حقیقت کا احساس تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی دعاؤں کے بغیر وحشتوں کی یہ آندھی کسی طرح رکنے والی نہیں تھی۔ اس نے مغلوں کے چلے جانے کے بعد انتہائی پرجوش انداز میں

امیر خسروؒ کا شکریہ ادا کیا تھا مگر جب مبارک باد وں کا ہنگامہ برپا ہوا تو اس شور میں سلطان نے سب کچھ فراموش کر دیا۔ ایک بار پھر محفلِ کیف و نشاط آراستہ کی گئی اور ایسے ہی خمار انگیز لمحات میں رام دیو نے اپنا ہنر دکھایا۔ وہ عیار شعبدہ باز بہت دن سے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔

ایک روز ملک کافور نے رام دیو کو علاء الدین کے حضور پیش کرتے ہوئے کہا۔ "سلطان عالی مقام! اب جبکہ وہ سنگین وقت گزر چکا ہے' یہ غلام ایک ایسے راز کا انکشاف کرنا چاہتا ہے جس سے شاہ کی نئی عظمتوں کا سراغ ملتا ہے۔"

علاء الدین نے حیرت سے ملک کافور کی طرف دیکھا۔

"جب سلطانِ معظم مغلوں کے خلاف صف آرائی میں مشغول تھے اس وقت گیانی رام دیو نے مجھ سے کہا تھا کہ دشمن کسی حملے کے بغیر فرار ہو جائے گا۔" ملک کافور' علاء الدین کی فطری کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آخر تو کیا کہنا چاہتا ہے گیانی؟" سلطان' رام دیو سے مخاطب ہوا۔

"یہی کہ میں نے آج تک ایسا بھاگ شالی (خوش نصیب) انسان نہیں دیکھا۔" رام دیو نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "چتوڑ سے لے کر دہلی تک آپ کا یہ داس ریکھائیں ہی کھینچتا رہا ہے اور یہ لکیریں روزانہ مجھ سے سرگوشیوں میں نہ جانے کیا کیا کہتی رہی ہیں۔"

"کیا کہتی ہیں یہ لکیریں؟" علاء الدین نے رام دیو کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ سلطان کے دربار میں ہندوستان کے سب سے بڑے نجومی موجود تھے مگر وہ ستارہ شناسوں سے کوئی رغبت نہیں رکھتا تھا۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ اس نے رام دیو کی گفتگو توجہ سے سنی تھی۔

"سمراٹوں کے سمراٹ! ہر ریکھا مجھ سے یہی کہتی ہے کہ آپ سنسار کے وجیتا ہیں۔" یکایک رام دیو' سلطان کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ "میں علم قیافہ بھی جانتا ہوں فاتح عالم۔" رام دیو نے خوشامد کا نیا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "ماتھے کی لکیریں بھی یہی کہتی ہیں کہ زمین کا ایک ایک ذرہ شہنشاہ کو سجدہ کرنے کیلئے بے قرار ہے۔"

"تیرا علم اور کیا کہتا ہے؟" علاء الدین رام دیو کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔

"سلطان کبھی شکست سے دوچار نہیں ہوں گے۔" رام دیو کی عیاریوں نے ایک اور کروٹ لی۔ "یہ سلطان کا اقبال ہی تھا جس نے چتوڑ کی تاریخ سے آزادی کا لفظ کھرچ ڈالا۔ برہمنوں کے بھجن' پنڈتوں کے کیرتن اور جوگیوں کے پاٹھ سب رائیگاں گئے۔ کیا یہ اس قدر آسان تھا جیسا کہ لوگ سمجھ رہے ہیں۔ نہیں سلطان! ہرگز نہیں۔" رام دیو بہت زیادہ پرجوش نظر آنے لگا تھا۔ "شاہ کا اٹھنے والا ہر قدم فتح گر ہے۔ فاتح عالم خوابیدہ ہوں یا جاگ رہے ہوں' اقتدار ہر حالت میں آپ کی پاسبانی کرے گا۔ سلطان کسی کی طرف بڑھیں یا کوئی سلطان کی طرف بڑھے' دونوں صورتوں میں مقابل کی خرابی ہے۔ شاہ جسے پسند کریں گے وہ برقرار رہے گا اور جس سے نظر پھیر لیں گے اس کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ مغلوں نے بھی اس وقت حملہ کیا تھا جب شہنشاہ محوِ خواب تھے مگر جلال شاہی نے ان کے دلوں میں خوف ڈال دیا اور وہ ناکام و نامراد لوٹ گئے۔"

"نہیں رام دیو! وہ ہماری اقبال مندی نہیں' حضرت نظام الدین اولیاؒ کی دعائے خاص تھی جس نے ہمارے دشمنوں کو جنگ کے بغیر پسپا کر دیا۔" علاء الدین نے رام دیو کے خوشامدانہ انداز کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔

رام دیو اس عرصے میں ملک کافور کے ذریعے بہت سی معلومات حاصل کر چکا تھا اور اسے اس بات کا بھی پتا چل گیا تھا کہ علاء الدین خلجی ایک مسلمان بزرگ سے بہت زیادہ عقیدت رکھتا ہے۔ "میں شیخ کی بزرگی سے انکار نہیں کرتا مگر سلطان کی بلند اقبالی کسی کی دعاؤں کا نتیجہ نہیں ہے۔" رام دیو نے ایک نفسیاتی حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ "رتن سنگھ بھی سیکڑوں سادھوؤں' رشیوں' سنتوں اور مہنتوں کی دعاؤں کے سائے میں تھا مگر کوئی اس کے اقتدار کو نہیں بچا سکا۔ اس لئے کہ وہ پیدائشی بدنصیب تھا۔ اس کی سیاہ بختی کو کسی جوگی یا پنڈت کا آشیرواد زائل نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ وہ شاہ کے قید خانے میں کسی مجرم کی طرح ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے رام دیو! مگر شیخ نظام الدین اولیاؒ اور ایک بت پرست جوگی کی دعاؤں میں بڑا فرق ہے۔" علاء الدین نے ایک بار پھر رام دیو کی دلیل مسترد کر دی تھی۔

"میں ایمان اور کفر کے اس فرق کو خوب سمجھتا ہوں فاتح عالم!" رام دیو نے اپنے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔ "اگر انسان ذاتی طور پر خوش نصیب نہیں ہے تو پھر اسے کسی کی دعائیں گردش سے محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔ آپ کا زائچۂ پیدائش بتاتا ہے کہ دنیا میں نزول فرماتے وقت شاہ کے تمام ستارے انتہائی طاقتور تھے۔ صدیوں کے بعد ستاروں کے یہ زاویے قائم ہوئے ہیں۔ شاید آج آپ کو میری باتوں پر یقین نہ آئے مگر آنے والا وقت ثابت کر دے گا کہ یہ زمین صرف آپ کے قدموں سے پامال ہونے کیلئے بنائی گئی ہے۔ میری گناہ گار آنکھیں آپ کی ذات میں فرشتوں اور دیوتاؤں جیسی صفات دیکھ رہی ہیں۔ بے شک! آپ آدمی ہیں مگر دنیا کے سارے انسانوں سے مختلف۔" یہ کہہ کر رام دیو نے گردن جھکا لی۔

"تو بڑی عجیب باتیں کرتا ہے گیانی!" علاء الدین اچانک کچھ بے قرار سا نظر آنے لگا تھا۔ "ملک! اعلان کر دے کہ ہم نے آج سے رام دیو کو اپنا مصاحبِ خاص بنا لیا ہے۔" سلطان' ملک کافور سے مخاطب ہوا۔ "اور اسے ساری دنیا کی آسائشیں فراہم کر دے کہ یہ سلطان علاء الدین خلجی کی عظیم الشان مملکت ہے' کسی زمیندار کی دیہاتی جاگیر نہیں۔" رام دیو کی خوشامد رنگ لائی تھی اور علاء الدین بہت زیادہ سرشار نظر آ رہا تھا۔

رام دیو آگے بڑھ کر سلطان کے آگے سجدہ ریز ہو گیا۔ "نہیں شہنشاہ! مجھے آپ کی محبت کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔ میں تو دریائے جمنا کے کنارے ایک سنسان سا گوشہ چاہتا ہوں۔ جہاں بیٹھ کر ستاروں کی روشنی میں اپنے سلطان کا چہرہ دیکھتا رہوں۔" رام دیو کی چالیں بہت گہری تھیں جنہیں اگر سلطان سمجھنا بھی چاہتا تو خوشامد کا یہ غلامانہ انداز اس کے دماغ اور آنکھوں پر سیاہ پردہ ڈال دیتا۔

علاء الدین نے رام دیو کی درخواست قبول کر لی اور ملک کافور کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "گیانی کی اس خواہش کو پورا کیا جائے۔"

رام دیو رخصتی سلام کر کے دروازے کی طرف بڑھا مگر جاتے جاتے اچانک مڑا اور سلطان سے عرض کرنے لگا۔ "ایک اور اہم بات لکیروں نے مجھے بتائی ہے کہ آپ کے دشمن کبھی کامیاب نہیں ہوں گے لیکن وہ قبائے سلطانی کو داغدار کرنے کی کوشش کریں گے۔ مغل ایک بار پھر حملہ آور ہوں گے مگر تباہی ان کا مقدر بن چکی ہے۔" یہ کہہ کر رام دیو چلا گیا۔

علاءالدین تنہا تھا لیکن رام دیو کی باتیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ سلطان بچپن ہی سے سکندر بننے کا خواب دیکھتا تھا' اس کی شدید آرزو تھی کہ وہ یونانی حکمراں کی طرح دہلی سے نکل جائے اور پھر ساری دنیا کو تسخیر کر کے فاتح عالم کی حیثیت سے اپنے مرکز کی طرف لوٹے۔ اسی جذبے کی تسکین کیلئے کبھی کبھی وہ مصاحبوں کے حلقے میں اپنے آپ کو "سکندر ثانی" کے لقب سے پکارا کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ علاءالدین نے چتوڑ میں ایک مینار تعمیر کراتے وقت اس پر "سکندر ثانی" کے الفاظ بھی کندہ کرائے تھے۔ "تسخیر دنیا" کی خواہش علاءالدین کے سینے کی گہرائیوں میں خوابیدہ تھی مگر رام دیو نے اسی تمنا کو جھنجوڑ کر بیدار کر دیا تھا۔ علاءالدین بستر پر لیٹے لیٹے اپنے ماضی کو یاد کرنے لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک عام سپاہی سے سردار اور پھر "سپہ سالار" سے "سلطان" تک کا یہ طویل سفر اس طرح طے ہو جائے گا کہ کامیابیاں ہر موڑ پر اس کے قدم چومیں گی۔ علاءالدین کو رام دیو کی باتوں میں حقیقت نظر آنے لگی اور وہ نئے انداز سے دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھنے لگا۔ اسی دوران سلطان کی آنکھ لگ گئی اور اس نے وہی خواب دوبارہ دیکھا جو مغلوں کی روانگی سے ایک رات پہلے دیکھا تھا۔ مقتول حکمراں جلال الدین خلجی کا کٹا ہوا سر علاءالدین کے کمرے میں داخل ہوا اور پھر ہر طرف پُرشور آوازیں گونجنے لگیں۔

"بےوفا بھتیجے! تو نے یہ کیا کیا کہ اسی سر کو کاٹ کر کوچہ در کوچہ پھرایا جس نے تجھے زمانے میں سربلند کیا۔ میرے بھائی کے خودغرض بیٹے! ان ہونٹوں کو دیکھ جو تیری پیشانی کو بوسہ دیا کرتے تھے.....خاندانِ خلجی کے سنگدل وارث! میری آنکھوں کو دیکھ جن میں تیرے لئے محبتوں کے کیسے کیسے دریا موجزن تھے........ اور اے نمک حرام علاءالدین! اس سینے پر ایک نظر ڈال جسے تو نے خاک کے ڈھیر میں دبا دیا ہے........ یہ وہ سینہ ہے جس پر تو ساری ساری رات سویا کرتا تھا......... بدکاروں اور خوشامدیوں کے ہجوم سے بہلنے والے! کیا تو سمجھتا ہے کہ اہلِ ہند نے میرے قتل کو فراموش کر دیا ہے ؟ اپنے عشرت کدے سے باہر نکل کر دیکھ کہ تجھے مخلوق خدا کیا کہتی ہے ؟"

اس فریاد و فغاں کے بعد جلال الدین خلجی کا خون آلود سر غائب ہو گیا اور علاءالدین بدحواسی کے عالم میں اٹھ کر بیٹھ گیا پھر تھکے تھکے قدموں سے دریچے تک آیا اور باہر کی فضا کو دیکھنے لگا۔ صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ اس مختصر سے عرصے میں علاءالدین نے دو بار اپنے چچا سلطان جلال الدین خلجی کو خواب میں دیکھا تھا۔ مقتول فرمانروا کے یہ الفاظ اس کے ذہن پر جم کر رہ گئے تھے۔

"اپنے عشرت کدے سے باہر نکل کر دیکھ کہ مخلوق خدا تجھے کیا کہتی ہے ؟"

علاءالدین کو محسوس ہوا کہ محل کے ایک ایک دریچے' ایک ایک دیوار اور ایک ایک در سے یہی آواز ابھر رہی ہے۔ اچانک اسے چتوڑ کا وہ جشن فتح یاد آ گیا جب رام دیو نے کہا تھا کہ علی عامر آفریدی کی وجہ سے تمام راجپوت اسے ایک احسان فراموش اور غاصب حکمراں سمجھتے ہیں۔ اپنے سفیر کا خیال آتے ہی شدتِ غضب سے علاءالدین کا پورا جسم کانپنے لگا۔ مغلوں کے ہنگامے میں وہ آفریدی کو بھول ہی گیا تھا۔ آج کے خواب نے کئی تلخ یادوں کو زندہ کر دیا۔ مائی بھان متی کا چہرہ بھی علاءالدین کی نظروں کے سامنے ابھر آیا۔ پھر اسے اپنی بے کسی بھی یاد آ گئی کہ وہ ایک ضعیف و ناتواں عورت کو اس کی زہرفشانیوں کی سزا تک نہیں دے سکا تھا۔ ہزاروں اچھوتوں کے سامنے ایک بے سہارا بڑھیا اس کے جلالِ شاہی کو للکار کر چلی گئی تھی اور وہ رعایا کے درمیان بیٹھا ہوا اپنا ہی خون پیتا رہا تھا۔ علاءالدین کے ذہن میں نفرت و غضب کی سرخ آندھی

اٹھی جس کے تیز جھونکوں نے اسے زیروزبر کر کے رکھ دیا۔ سلطان' علی عامر آفریدی کے خلاف ایک خوفناک فیصلہ کر چکا تھا۔

☆..........................☆..........................☆

جب دربار آراستہ ہوا تو علاءالدین نے علی عامر آفریدی اور نرملا کماری کو طلب کر لیا۔ راجہ رتن سنگھ اور رام دیو بھی گواہوں کے طور پر بلائے گئے تھے۔ آفریدی کے پیروں میں زنجیریں تھیں اور وہ لڑکھڑاتا ہوا تخت کے نیچے تک پہنچا تھا۔ رتن سنگھ زنجیروں سے آزاد تھا مگر اس کی حیثیت بھی ایک مجرم سے زیادہ نہیں تھی۔

"آفریدی! یہ کام ہمارے لئے بہت آسان تھا کہ ہم ایک اشارہ کر دیتے اور گھوڑوں کے سم تیرے جسم کو روند ڈالتے۔ ہمیں اس پر بھی قدرت تھی کہ ہم اپنے ہونٹوں کو جنبش دیتے اور شمشیرِ فنا تیری شہ رگ میں اتر جاتی مگر ہماری غیرتِ شاہانہ کو یہ گوارہ نہیں کہ تجھے صفائی کا ایک اور موقع دیئے بغیر موت کی نیند سلا دیا جائے۔ آخر تو ہمارا رازدار رہ چکا ہے۔" علاءالدین نے آفریدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ہم تجھ سے پوچھتے ہیں کہ تو نے ہمارے اعتبار کو کیوں فروخت کیا ؟ اور دنیا میں وہ کونسا خریدار ہے جو ہم سے زیادہ قیمت ادا کر سکتا ہے ؟ بدنصیب آفریدی! تجھے کس شے کی طلب تھی ؟ ہمارے دستِ اختیار میں کیا کچھ نہیں تھا۔ مانگ کر تو دیکھا ہوتا۔ ہم اپنے کرم کی اتنی بارش کر دیتے کہ تیرا دامن چھلک اٹھتا۔"

"میں نے شاہِ والا کے اعتبار کو کسی بازار میں نیلام نہیں کیا۔" آفریدی کا لہجہ پرجوش تھا۔ "والد مرحوم نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میں آخری سانس تک شاہانِ خلجی کا وفادار رہوں۔ میرے بزرگوں کو آپ کی ذات کے آئینے میں ہندوستانی مسلمانوں کا روشن مستقبل نظر آتا تھا۔ اسی لئے میں بھی ان ہی کی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ نہ میرے آباؤاجداد انعام و اکرام کے بھوکے تھے اور نہ میرے دل میں کوئی جذبۂ حرص موجود ہے۔ میں اول و آخر ایک سپاہی ہوں جو اپنے امیر کے حکم پر سرفروشی کی تمنا رکھتا ہے۔ مجھے جس محاذ پر بھیجا گیا تھا وہاں موت بھی تھی' تشدد تھا اور لامحدود رسوائیاں تھیں۔ میں نے سب کچھ برداشت کیا مگر آپ کے پرچم جاہ و جلال کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ اگر دیارِ دشمناں میں مجھے موت بھی آتی تو اس طرح کہ میری مٹھیاں بند ہوتیں اور پرچم شاہی کو الگ کرنے کیلئے میرے دونوں ہاتھ کلائیوں سے کاٹ دیئے جاتے۔" یہ کہتے کہتے آفریدی بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔

"ہم پہلے بھی تیری لفاظی سن چکے ہیں۔" علاءالدین غضبناک نظر آنے لگا۔ "کیا تو نہیں جانتا کہ ہم لمبی زبان رکھنے والوں کو برداشت نہیں کرتے ؟"

علی عامر آفریدی حیرت زدہ رہ گیا۔ عجیب عدالت تھی کہ منصف اس کی کوئی دلیل سننے کیلئے تیار ہی نہیں تھا۔

"کیا تو اپنی نام نہاد جاں فروشی کا ذکر کر کے ہماری ذات پر احسان کرنا چاہتا ہے ؟" علاءالدین کا لہجہ مزید قہرناک ہو گیا تھا۔

"نہیں سلطان عالی مقام! میں تو اس گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" چند لمحوں کیلئے آفریدی کی زبان لڑکھڑا سی گئی مگر وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ "مجبوراً میں نے یہ راہ اختیار کی ہے اگر منزلِ وفا سازشوں کے غبار میں گم نہ ہوتی تو میں گزرے ہوئے زمانے کا کوئی حوالہ پیش نہ کرتا۔"

"کیا تو نے رتن سنگھ کے بھرے دربار میں ہمیں قاتل' جابر' غاصب اور احسان فراموش نہیں کہا ؟" علاءالدین کے چہرے سے شدید نفرت و قہر کا اظہار ہو رہا تھا۔

"شاہ والا! میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ یہ مجھ پر ایک سنگین تہمت ہے اور میرے خلاف ایک غلیظ سازش۔"

"کیا رتن سنگھ اور راجپوت سردار تیرے خلاف سازش کر رہے ہیں؟" علاءالدین نے سوال کیا۔ "تیری ذات کب سے اتنی اہمیت اختیار کر گئی کہ تو سازشوں کا مرکز بن گیا۔"

"جب سے آپ نے اپنے معاملاتِ دل میں مجھے رازداری کا شرف بخشا۔" علی عامر آفریدی اب اپنے اعصاب پر قابو پا چکا تھا۔

علاءالدین کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔

"رتن سنگھ مجھ سے اس لئے خفا ہے کہ میں نے رانی پدمنی تک آپ کا ایک ذاتی پیغام پہنچانے کی کوشش کی تھی۔" آفریدی کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ "راجپوت سردار مجھ سے اس لئے ناخوش ہیں کہ میں نے بھرے دربار میں آپ کی مذمت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر رانی پدمنی زندہ ہوتی تو شاید اس بات کا اعتراف کر لیتی کہ میرے انکار کے بعد مجھے کس طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔" آفریدی اپنے انجام سے بے نیاز ہو کر بول رہا تھا۔ "اور مہاراج رام دیو مجھ سے اس لئے ناراض ہیں کہ ان کے تمام جادوئی حربے ناکام ہو چکے تھے۔ یہ وہی ستارہ شناس برہمن ہے جو کل تک اپنے طلسمات کے ذریعے آپ کے اقتدار کو جلا کر خاک کر دینے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ مگر آج وہ شاہ کے اتنے قریب ہے کہ اسے دیکھ کر میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ خدایا! یہ کیسا انقلاب ہے۔" آفریدی نے بڑے مایوسانہ انداز میں آسمان کی طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن درمیان میں پتھریلی چھت اور شیشے کے فانوس حائل تھے۔

کچھ ساعتوں کیلئے دربار میں سناٹا چھا گیا۔ "آفریدی! تیرا یہ دعویٰ ابھی تشنۂ دلیل ہے کہ تو نے ہماری خاطر دشمنوں کے مظالم برداشت کئے۔" علاءالدین کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دوبارہ اپنے سفیر سے مخاطب ہوا۔ "پھر بھی ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ تو سچ بول رہا ہے۔"

"تو پھر اے میرے امیر! مجھے اس سچائی کا صلہ دیجئے۔" آفریدی کا لہجہ انتہائی پرسوز تھا۔

"ابھی ہماری بات مکمل نہیں ہوئی آفریدی!" علاءالدین کا اندازِ گفتگو تحقیر آمیز تھا۔ "اگر غیروں کا تشدد سہتے سہتے تجھے موت بھی آ جاتی تو یہ ایک حقیر قربانی ہوتی۔ کیا تو نے کبھی اپنی آنکھوں سے یہ منظر نہیں دیکھا کہ جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو بے شمار ستارے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ہم وقت کا سورج ہیں اور تو ہماری اقبال مندی کے دائرے میں تیرتا ہوا ایک کمزور اور حقیر ستارہ۔ ایک تیرے بجھ جانے سے کیا فرق پڑتا؟ تجھ سے پہلے نہ جانے کتنے ستارے گردش کرتے کرتے تھم گئے، اپنے مرکز سے ٹوٹے اور ہمارے اقتدار کی لامحدود فضاؤں میں تحلیل ہو گئے۔" آفریدی فرطِ حیرت سے ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ آج اس نے پہلی بار مزاجِ شاہی کی ایک ایسی جھلک دیکھی تھی جس کا انسانیت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

"سلطان ذی حشم! یہ تو خدائی کا انداز بھی نہیں ہوتا۔" علی عامر آفریدی اپنی زبان پر قابو نہیں رکھ سکا۔ "خدا نے بھی تمام تر بے نیازیوں کے ساتھ ایک دن ایسا مقرر کیا ہے جب وہ اپنے بندوں سے پوچھے گا کہ آج تمہاری مرضی کیا ہے؟" علی عامر آفریدی کی گفتگو سن کر تمام اہلِ دربار لرز گئے۔ اب انہیں یقین آ گیا تھا کہ افغان سپہ سالار کو سلطان کے قہر و غضب سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

علاءالدین کو محسوس ہوا کہ جیسے تختِ شاہی اچانک جل اٹھا ہے اور جس کی گرمی سے اس کے دل و دماغ جھلس گئے ہیں۔ سلطان کی سماعت ایسے بیباک اور نازک الفاظ سے آشنا نہیں تھی۔ وہ جنگل کی آگ، پاگل

ہوا اور برقِ بے اماں کی طرح برہم ہو جانا چاہتا تھا مگر اس نے خلافِ عادت صبر و ضبط سے کام لیا۔ دربار میں امیر خسروؒ جیسے صوفی اور دیگر علماء بھی موجود تھے۔ علاءالدین آفریدی کی اس دلیل کو رد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے زاویہ بدل کر علی عامر سے مخاطب ہوا۔

"ہمیں تجھ سے اس بے ادبی کی شکایت نہیں کہ تو مرضیٔ شاہ کو سمجھنے سے عاجز رہا۔" علاءالدین کا لہجہ بدستور غضب ناک تھا۔ "تجھ پر بنیادی الزام یہ ہے کہ تو نے دشمنوں کے درمیان اپنے فرمانروا کا مذاق اڑایا اور اس کے اقتدار کو ناجائز قرار دیا یہ صریحاً بغاوت ہے اور ایک باغی کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں۔ اگر رتن سنگھ، گیانی رام دیو اور دوسرے راجپوت سردار جھوٹے ہیں تو پھر ان گواہوں کا کیا ہو گا جو دہلی میں موجود ہیں اور تجھ سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ہم شاید چتوڑ میں سنی جانے والی آوازوں کو فراموش کر دیتے مگر جب ہر طرف ان ہی آوازوں کی بازگشت سنائی دے تو پھر یہ الزام تراشی نہیں، ایک سنگین حقیقت ہے۔"

"شاہ والا! اب میں اپنی جاں نثاریوں کا کوئی حوالہ پیش کرنا نہیں چاہتا۔" آفریدی ہواؤں کے رخ کو پہچان چکا تھا۔ "گردشِ وقت میرے تعاقب میں ہے اور میں فرار کی طاقت نہیں رکھتا۔ پھر بھی میں ان گواہوں کے روشن چہرے دیکھنا چاہتا ہوں جو دوستی کی قبا پہن کر نفرتوں کی تجارت کر رہے ہیں۔"

علاءالدین نے مڑ کر ملک کافور کی طرف دیکھا جو سلطان کے بائیں ہاتھ پر اگلی قطار میں کھڑا تھا۔ شہنشاہ کی جنبشِ چشم کے ساتھ ہی ملک کافور آگے بڑھا۔ تخت کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکا اور پھر اس جگہ کو بوسہ دیا جو سلطان کی گزر گاہ تھی۔

"فاتح عالم! سردار آفریدی کے جرائم کا ایک گواہ یہ غلام بھی ہے۔" ملک کافور سر جھکائے دست بستہ کھڑا تھا۔

"میں اس ہندوزادے کی شہادت تسلیم نہیں کرتا۔" آفریدی بے اختیار ہو گیا وہ جانتا تھا کہ ملک کافور سلطان کی بارگاہ میں کس قدر قربت رکھتا ہے مگر آفریدی انصاف سے مایوس ہو چکا تھا اور یہی شکستگی اسے ایک ایسی منزل کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی جو تباہی اور بربادی کی منزل تھی۔

"یہ بزدل خواجہ سرا کسی مردِ میدان کے کردار کی کیا گواہی دے گا؟ سلطان ذی وقار! اس سے بہتر ہے کہ کسی ثبوت کے بغیر میرے قتل کا حکم جاری کر دیں۔ میں صبر کر لوں گا کہ ایک سپاہی اپنے شاہ کی بے جا خواہشوں پر قربان ہو گیا۔" آفریدی جذبات کی انتہائی حدوں تک پہنچ گیا تھا اور مسلسل ایسی باتیں کر رہا تھا جو اس کی موت کا سبب بنتی جا رہی تھیں۔

سلطان کے چہرے پر دھواں سا پھیل گیا تھا اس نے دوبارہ ملک کافور کی طرف دیکھا۔

"میں ذاتی طور پر کتنا ہی پست و ذلیل سہی مگر فاتح عالم کے کرم کا ایک حوالہ ہوں۔" ملک کافور بے حیائی کے ساتھ جھک گیا۔ "اگر سردار آفریدی مجھے بے اعتبار سمجھتے ہیں تو میں ان کے قریبی دوستوں کو بھی شہنشاہ کی عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔"

"کہاں ہیں وہ گواہ؟" علاءالدین بہت زیادہ مشتعل ہو گیا تھا۔

"اگر غلام کو معلوم ہوتا کہ فوری طور پر ان گواہوں کی ضرورت پیش آئے گی تو یہ بندوبست بہت پہلے ہو چکا ہوتا۔" ملک کافور نے انتہائی عاجزی کے ساتھ کہا۔ "سردار آفریدی نے صرف سلطان معظم کی ذاتِ گرامی ہی کو داغدار کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے کچھ بے کس و مجبور لوگوں پر بھی مظالم ڈھائے ہیں اگر شاہ والا اجازت دیں تو ان ستم رسیدہ انسانوں کو بھی عدالت میں پیش کر دیا جائے جو انصاف کیلئے ترس رہے ہیں اور سردار آفریدی کے خوف سے دربارِ عالیہ تک پہنچنے

سے قاصر ہیں۔" ملک کافور اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ دس گیارہ ماہ کی طویل منصوبہ بندی پر عمل کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

علاءالدین نے سر کی جنبش سے ملک کافور کو اجازت دی اور علی عامر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔
"احسان فراموش آفریدی! تجھے چتوڑ کی اس بوڑھی جادوگرنی نے ہلاک کر ڈالا۔" سلطان کا اشارہ مائی بھان متی کی طرف تھا۔ "ہم تیری زبان کاٹ کر پھینک سکتے تھے مگر اہل دنیا کیا کہتے کہ سلطان نے جبر و اختیار سے کام لیا اور ایک مجرم کو صفائی پیش کرنے کی مہلت نہیں دی۔ تیری زندگی کے ڈوبتے ہوئے سفینے کو آج کی رات ہم اور امان دیتے ہیں۔ کل تیرے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا۔ اگر کسی ایک شخص نے بھی تیری بے گناہی پر شہادت دی تو ہم تجھے معاف کر دیں گے۔"

☆..........................☆..........................☆

سلطان کے اس حکم کے ساتھ ہی دربار برخاست ہو گیا۔ وہ رات علی عامر آفریدی کے ساتھ دہلی کے تمام امراء کیلئے بڑی پر ہول تھی۔ ایک نوجوان سپہ سالار کی بیباکی نے انہیں ملک کافور کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا جو شرفاء کیلئے ایک سنگین خطرے کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

نرملا کماری محل سرا کے ایک تنہا کمرے میں بہت اداس تھی۔ شاہی بیگمات اس سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہتی تھیں۔ مگر انہیں اس بات کا خوف تھا کہ کہیں کوئی جاسوس کنیز سلطان تک یہ خبر نہ پہنچا دے۔ اسی مجبوری نے بیگمات کے قدموں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔ وہ اپنی ایک ہم جنس کو شمع کی طرح پگھلتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ مگر اس کے آنسو خشک کرنے کیلئے اپنے دامن کو آگے نہیں بڑھا سکتی تھیں۔

آفریدی بھی کمرے کے فرش پر بے حس و حرکت لیٹا تھا مگر اس کا ذہن مسلسل سفر میں تھا۔ کبھی نظروں کے سامنے شائستہ بیگم کا اداس چہرہ ابھر آتا' کبھی محسوس ہوتا کہ عالیہ اس سے سرگوشیاں کر رہی ہے' کبھی یوں لگتا جیسے مائی بھان متی اسے پکار رہی ہے' کبھی نرملا کی آواز سنائی دینے لگتی کہ سردار مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ کئی تلخ یادیں تھیں جو بہت دنوں سے اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ وہ کسی کو کیا جواب دیتا؟ وقت نے تو اس کی قوتِ گفتار ہی چھین لی تھی۔ آفریدی اپنی اس مجبوری پر تڑپ کر کروٹ لیتا تو زنجیریں بج اٹھتیں اور علی عامر کو احساس ہوتا کہ موت اس کے بہت قریب رقص کر رہی ہے۔

اسی رات ملک کافور' علاءالدین کے قدموں پر سر رکھے رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا آفریدی نے چتوڑ روانہ ہوتے وقت مجھے شاہ کے حوالے سے دنیا کی غلیظ ترین گالی دی تھی۔ ملک کافور کے بہتے ہوئے آنسو کچھ اور تیز ہو گئے تھے۔ "میں اس کی طعنہ زنی کو برداشت کر گیا تھا کہ وہ رانی پدمنی کے معاملے میں آپ کے رازدار قاصد کا فریضہ انجام دے رہا تھا مگر کل دربار عام میں اس نے جس لقب سے مجھے یاد کیا ہے' میں اسے کس طرح بھول جاؤں؟" ملک کافور کی عیاریاں اپنے عروج پر تھیں۔

"کیا تجھے سرلا دیوی کا حشر یاد نہیں؟" علاءالدین یکایک کسی شعلے کی مانند بھڑک اٹھا۔ "سرلا دیوی تو آخر ہماری بیوی تھی مگر تیری خاطر ہم نے اسے بھی معاف نہیں کیا۔ پھر آفریدی سے ہمارا کیا رشتہ ہے؟ ہم اسے کس طرح معاف کریں گے؟ ہرگز نہیں۔"

ملک کافور کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو چکی تھی پہلے اس نے ساقی گری کے فرائض انجام دیئے اور پھر خود بھی اپنی فتح کے نشے میں لڑکھڑاتا ہوا عشرت کدے سے باہر چلا گیا۔

ملک کافور کے جانے کے بعد علاءالدین' آفریدی کے بارے میں سوچنے لگا۔ سلطان کو اپنے سفیر کی جاں نثاریوں کا خیال آ گیا مگر اس خیال کو ملک کافور کے آنسوؤں نے دھندلا کر دیا۔ علاءالدین نے چند لمحوں کیلئے آفریدی کے اس گناہ سے چشم پوشی کرنا چاہی لیکن سلطان کے ذہن میں ابھرنے والا دوسرا خیال بہت اذیت ناک تھا۔ سیاسی اعتبار سے آفریدی کا قتل ضروری ہو گیا تھا۔ اگر علاءالدین اسے معاف کر دیتا تو دوسرے درباریوں کے دلوں میں غلط قسم کے جذبے پرورش پانے لگتے۔ علاءالدین نے آفریدی کے قتل کا فیصلہ کر لیا۔ علی عامر کی سزائے موت کے پردے میں وہ اپنے دشمنوں کو خوفزدہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی علاءالدین کی خواہش تھی کہ اس کا دامن آفریدی کے خون سے پاک رہے۔

☆..........................☆..........................☆

دوسرا دن آفریدی کے فیصلے کا دن تھا۔ علی عامر اپنے کئی قریبی دوستوں کو دربار میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ سب کے سب اس کے خلاف گواہی دینے آئے تھے اور پھر ایسا ہی ہوا جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ آفریدی کا ایک دوست سلیم ذیشان جسے وہ اپنے جسم کا ایک حصہ سمجھتا تھا' بڑے پرجوش لہجے میں بول رہا تھا۔

"سلطان عالی مقام! ہم نے اس کے باغیانہ خیالات کو بدلنے کی بہت کوشش کی مگر وہ فطرتاً مجرم ہے۔ ہم نے اسے شاہ کے احسانات یاد دلائے مگر یہ عادتاً خود غرض ہے۔ اس کا کوئی کردار نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے اس سے ترکِ تعلق کر لیا تھا۔"

اہل دربار اپنی نشستوں پر ساکت بیٹھے تھے۔

پھر اس سکوت کے قلب میں علاءالدین کی پرہیبت آواز نے گہرے شگاف ڈال دیئے۔ "کیا یہ تیرے دوست نہیں؟"

اس سے پہلے کہ آفریدی کوئی جواب دیتا' سلیم ذیشان بول اٹھا۔ "نہیں شاہ! ہم اس کے دوست نہیں' آپ کے غلام ہیں' ازلی غلام۔"

"کیا تجھے ابھی کوئی اور گواہی درکار ہے؟" علاءالدین نے غضبناک ہو کر آفریدی سے پوچھا۔

"نہیں شاہ والا!" یکایک آفریدی کی آواز سخت ہو گئی تھی۔ "جب میرے اعضاء ہی میرے خلاف گواہی دینے لگے تو پھر اس زمین پر مجھ سے بڑا گناہ گار کون ہے؟"

ابھی آفریدی کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ایک برقع پوش عورت دربار میں داخل ہوئی اور تخت کے نیچے فرش پر سر رکھ کر رونے لگی۔

"یہ کون ہے؟" علاءالدین نے چونک کر پردہ دار خاتون کی طرف دیکھا۔

عورت سجدے کی حالت سے اٹھ کر سیدھی ہوئی اور فریاد کرنے لگی۔ "شہنشاہ! مجھے بھی انصاف چاہئے۔ میرا بڑا مجرم اس وقت آپ کی عدالت میں کھڑا ہے۔" عورت نے علی عامر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "سردار آفریدی میری حقیقی خالہ اور ان کے تین بچوں کا قاتل ہے۔" اتنا کہہ کر عورت نے کپڑے میں لپٹا ہوا ایک کاغذ نکالا اور آگے بڑھ کر سلطان کے قدموں میں رکھ دیا۔ "یہ کیا ہے؟" علاءالدین حیران تھا۔

"آفریدی کے جرائم کی دستاویز۔" برقع پوش خاتون نے لرزتے ہوئے کہا۔

سلطان کے حکم پر اس کاغذ کو کھول کر سرِ دربار پڑھا گیا۔ یہ وہی خط تھا جو ملک کافور کے سپاہیوں نے درباری رقاصہ زہرہ جمال سے جبراً تحریر کرایا تھا۔

"شاہ والا کو خبر ہو کہ سلطنت خلجی کے ایک معتمد سردار علی عامر آفریدی نے میری بے آبروئی کی۔ میں اس جارحیت کی داستان سنا کر سلطان معظم سے انصاف چاہتی تھی مگر وہ اتنا با اثر تھا کہ عدالت عالیہ تک میری رسائی ممکن نہ ہو سکی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ آفریدی مجھے اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول کر کے جائز حقوق دیدے لیکن وہ سنگدل اور بے کردار انسان ہے۔ آخر تمام راستے بند پا کر میں اور میرے گھر والے ایسے راستے پر جا رہے ہیں جس کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ دیر بعد میں' میری اندھی ماں' چھوٹی بہن اور بھائی ظالموں کی اس بستی سے بہت دور چلے جائیں گے۔ پھر سرِ محشر میرے ہاتھ میں سلطان معظم کا گریبان ہوگا۔ میں انصاف طلب کروں گی اور میرا خدا ان سب لوگوں سے ایک ایک ذرے کا حساب لے لے گا جو اس ظلم میں شریک رہے ہیں۔" سلطان علاءالدین خلجی کے دربار کی ایک ادنیٰ رقاصہ! زہرہ جمال۔"

خط کیا تھا! الفاظ کا ایک آتش فشاں تھا جس کے اثر سے پورے دربار پر لرزہ ساطاری ہو گیا تھا۔

"کیا زہرہ اور اس کے گھر والے قتل کر دیئے گئے۔" آفریدی اس صدمے کو برداشت نہ کر سکا اور بے اختیار اس کی زبان سے ایسے کلمات ادا ہو گئے جو علاءالدین اور دوسرے درباریوں کو شبہات میں مبتلا کرنے کیلئے کافی تھے۔

نرملا کماری نے بھی آفریدی کے یہ الفاظ بڑی حیرت سے سنے تھے اور پہلی بار اس کے ذہن میں بدگمانیوں نے کروٹ لی تھی۔

"ہم تجھے حکومت کے غدار کی حیثیت سے سزا دیں یا چار انسانوں کے قاتل کی حیثیت سے؟" بالآخر علاءالدین کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ "تو کیسا فریب کار تھا آفریدی؟ ہماری نگاہیں بھی دھوکا کھا گئیں۔"

علی عامر نے نرملا کی طرف دیکھا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے کو مایوسیوں کے غبار نے گھیر لیا تھا۔ آفریدی کی تھکی ہوئی نظریں واپس لوٹ آئیں۔ پھر اس نے چاروں طرف گھوم کر اہل دربار پر نگاہ کی۔

"کیا موت کے احساس نے تجھ سے تیرے حواس چھین لئے ہیں؟" آفریدی کی یہ اضطراری حرکت دیکھ کر علاءالدین نے پوچھا۔

"نہیں شاہ والا! آپ کے جاں نثار موت سے نہیں گھبراتے۔" آفریدی کے لہجے میں وہی اہل وفا کے لفظوں کی خوشبو تھی۔ "میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ میری جانِ ناتواں پر اور کس کس کا قرض باقی ہے؟ بظاہر تو سب نے اپنے اپنے حسابات طلب کر لئے۔ پھر بھی سوچتا ہوں کہ شاید کسی کا ہاتھ میرے گریبان تک پہنچنے سے رہ گیا ہو۔"

علاءالدین نے آفریدی کی اس جذباتی گفتگو پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اب وہ نرملا کماری سے مخاطب تھا۔

"تو اسی منافق کے کردار سے متاثر ہو کر ایمان لائی تھی؟" سلطان اس راجپوت زادی کو ذلیل کر رہا تھا جس نے چتوڑ کے جشنِ فتح میں انتہائی بےباکی کا مظاہرہ کیا تھا۔

نرملا خاموش کھڑی رہی۔ شدتِ غم سے اس کا چہرہ سیاہی مائل نظر آ رہا تھا اور آنکھوں سے ایک ناقابلِ بیان ویرانی برس رہی تھی۔

علاءالدین کی نظروں کا زاویہ تبدیل ہوا۔ پھر اس نے آفریدی کی سزائے موت کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ "اعتبار کے رہزن کی سزا موت۔ چار انسانوں کے قتل کی سزا موت.......... ہمارے قانون کے مطابق

مملکت کے اس غدار پر پانچ موتیں بیک وقت نازل ہونی چاہئے تھیں مگر ہم اس کی گزشتہ خدمات کا لحاظ رکھتے ہوئے چار موتیں معاف کرتے ہیں۔ اسے صرف ایک موت دی جائے۔ پھر اس کی لاش کو گلی گلی پھرایا جائے کہ سلطان کے اقتدار کو ناجائز کہنے والے کی سزا اتنی ہی دردناک ہوتی ہے۔"

سلطان کا فیصلہ سن کر اہل دربار لرز اٹھے۔

نرملا جس نے مصائب کے کئی طوفان دیکھے تھے' غموں کے آخری سیلاب کو برداشت نہ کر سکی اور بے ہوش ہو کر کسی کمزور دیوار کی طرح گر گئی۔

"اسے اٹھا کر حرم سرا میں پہنچا دو۔" علاءالدین نے سخت لہجے میں اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔

آفریدی' نرملا کی حالت دیکھ کر ناقابل بیان اذیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے علاءالدین سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔ "سلطان! مجھے نرملا سے ملنے کی اجازت دی جائے کہ میرے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

علاءالدین نے بڑی بے رحمی سے آفریدی کی اس درخواست کو مسترد کر دیا۔ محبت کے معاملے میں وہ خود محرومی کا شکار تھا اس لئے دوسروں کے احساسات سے بھی بے خبر تھا۔

"میری والدہ اور بہن ہانسی میں مقیم ہیں انہیں دہلی طلب کر لیا جائے تاکہ میں آخری بار انہیں دیکھ سکوں۔" علی عامر آفریدی نے لرزتی ہوئی آواز میں دوسری درخواست کی۔

علاءالدین کچھ سوچنے لگا۔ اس کے چہرے کی سختی کسی قدر کم ہو گئی تھی وہ اس سلسلے میں کوئی حکم دینے ہی والا تھا کہ ملک کافور کا خادم خاص نورالدین نوراً فوراً بول اٹھا۔

"مغلوں کی روانگی کے بعد میں اپنے کچھ عزیزوں سے ملنے کیلئے ہانسی گیا تھا۔ وہاں حملہ آور وحشیوں نے وہ تباہی مچائی تھی کہ محلے کے محلے نذر آتش کر دیئے تھے۔ جہاں سردار آفریدی کا مکان تھا وہ پورا علاقہ جلے ہوئے کوئلے کی کان معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ شاید ہی کوئی شخص زندہ بچا ہو۔ پھر بھی حضور والا سپاہیوں کو بھیج کر تحقیقات کرا لیں۔"

علی عامر آفریدی کی نظروں کے سامنے گہری تاریکی چھا گئی وہ لڑکھڑا کر فرش پر گرا۔ زنجیریں بج اٹھیں۔ عجیب تماشا تھا۔ تمام درباری سانسیں روکے ہوئے اس جانباز سپہ سالار کو دیکھتے رہے جو کل تک سلطان کا رازدار تھا آج اس پر مسلسل عذاب نازل ہو رہے تھے۔

آفریدی سنبھل کر اٹھا اور اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کرنے کی کوشش کی۔ زنجیروں کی جھنکار سے دربار شاہی گونج اٹھا۔ وہ اپنی ماں اور بہن کے حق میں دعائے خیر کر رہا تھا۔ لوگوں نے صرف اس کے ہونٹ لرزتے ہوئے دیکھے۔

دو سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اس کے بازوؤں پر اپنی گرفت مضبوط کر دی وہ اسے قید خانے میں واپس لے جانا چاہتے تھے۔ علاءالدین کے حکم کے مطابق آفریدی کو صبح سورج نکلنے سے پہلے قتل ہونا تھا۔ اس سے پہلے کہ سپاہی اسے پکڑ کر کھینچتے وہ سنبھل گیا۔

"سلطان! یہ بھی رسم دنیا ہے کہ مرنے والے سے اس کی آخری خواہش معلوم کی جاتی ہے۔" آفریدی کا لہجہ بے نیازانہ تھا۔ موت کو اتنے قریب پا کر اس نے سارے تکلفات اٹھا دیئے تھے۔

"رحم کی درخواست کے سوا اپنی ہر خواہش بیان کر۔" علاءالدین نے بڑا جارحانہ جواب دیا۔

"کاش! میں اپنے خدا کا وفادار ہوتا تو اس قدر رسوائی کی موت نہ مرتا۔" آفریدی کے لہجے میں کرب

بھی تھا اور نفرت کی بھڑکتی ہوئی آگ بھی۔

"یہ رسوائیاں تو نے خود خریدی ہیں۔" علاءالدین کی آواز سے وہی غرور جھلک رہا تھا جو ایک آمر کی خاص پہچان ہے۔

"نہیں شاہ! میرا کوئی ذکر نہیں کہ میں تو اپنے انجام کو پہنچ چکا۔" آفریدی ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ "مجھے اس وقت سے ڈر لگتا ہے جب گجرات کا یہ ہندوزادہ بڑے بڑے شرفاء کی پگڑیاں اچھالے گا۔ میں نے شاہ والا کو اتنا کمزور کبھی نہیں دیکھا ہے۔ میری لاش پر ماتم کرنے والے تو اٹھ گئے مگر میں اس حکمراں کا مرثیہ پڑھتا ہوں جو ایک بے حیا غلام کی آنکھوں سے دیکھے' اسی کے کانوں سے سنے اور اسی کے دماغ سے سوچے۔ میرے مردہ جسم کی تشہیر کرانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ سلطان ذی وقار! اس کو دریائے جمنا میں غرق کر دیجئے کہ یہ بڑا فتنہ ہے۔" آفریدی نے ملک کافور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور رام دیو کو بھی کہ یہ اپنے دور کا عبداللہ بن ابی ہے۔" (عبداللہ بن ابی عہد رسالت میں منافقوں کا سردار تھا۔ علی عامر آفریدی نے رام دیو کے متعلق اسی مناسبت سے یہ تشبیہ استعمال کی تھی)

"اسے ہمارے سامنے سے لے جاؤ کہ موت کے تصور نے اس کے ہوش و حواس چھین لئے ہیں۔" علاءالدین نے چیخ کر کہا اور سپاہی حکومت کے معتوب کو کھینچنے لگے۔

علی عامر آفریدی نے اپنے قدموں کو جمانے کی کوشش کی اور بلند آواز میں حضرت امیر خسروؒ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "امیر! آپ کے سوا یہاں اہل دل کی زبان سمجھنے والا کوئی نہیں۔ میں بہت مجبور ہوں کہ میری آواز اس تک پہنچ نہیں سکی۔ اگر آپ کو موقع مل جائے تو زرملا سے کہہ دیجئے گا کہ وہ چتوڑ کی طرف واپس لوٹ جائے۔ میں شرمسار ہوں کہ میں نے بحیثیت مسلمان اسے بہت مایوس کیا۔" آفریدی کی آواز گونج رہی تھی پھر یہ آواز زنجیروں کے شور میں ڈوب گئی۔

سپاہی اسے بڑی بے دردی کے ساتھ کھینچتے ہوئے لئے جا رہے تھے اور آفریدی جاتے جاتے ایک بار پھر چیخ اٹھا اس کے ہونٹوں پر محمد بن قاسم کا وہی شعر تھا جسے وہ عظیم سپہ سالار واسط کے قید خانے میں پڑھا کرتا تھا۔

"اے زمانے تجھ پر افسوس کہ تو شرفاء کے حق میں بڑا ہی بددیانت ہے۔"

سپاہی علی عامر آفریدی کو کھینچتے ہوئے دربار سے لے گئے مگر دیر تک حاضرین کی سماعتوں میں اس کی بارعب آواز گونجتی رہی۔ ایک فرمانبردار بیٹے اور غمگسار بھائی کی حیثیت سے آفریدی کی حالت اس وقت بگڑ گئی تھی جب نورالدین نورانے شائستہ بیگم اور عالیہ کے جل جانے کی المناک خبر سنائی تھی۔ یہ انتہائی نازک اور جذباتی رشتے تھے وہ اپنی ماں بہن کے ساتھ اس وحشیانہ سلوک پر سر دربار ماتم کرنا چاہتا تھا مگر خاندانی غیرت و شجاعت نے اس کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگا دی تھی۔ سینے میں ایک حشر سا برپا تھا' شکایتوں کے سیکڑوں طوفان اٹھ رہے تھے مگر کس کے سامنے زبان کھولتا۔ کچھ دیر سر ٹکراتا رہا کہ شاید کسی کے دل میں گداز پیدا ہو جائے مگر فطرت نہیں بدلتی۔ علی عامر کو شکست ہوئی۔ وقت کے اندھیروں سے اتنے ہاتھ برآمد ہوئے کہ وہ کسی کو پہچان بھی نہ سکا۔ ہر ہاتھ میں زہر آلود خنجر تھا اور تمام وار پشت سے کئے گئے تھے یہاں تک کہ سارے نشتر شہ رگ میں اتر گئے یا دل میں پیوست ہو گئے۔ موت اس کا مقدر بن چکی تھی آفریدی نے مردانہ وار موت کو گلے سے لگایا اور پھر علاءالدین سے وہ باتیں بھی کہہ گیا جسے کوئی شہنشاہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

دربار برخاست ہوا تو سلطان اس طرح بے نیازانہ اٹھ کر اپنے عشرت کدے کی طرف چلا گیا جیسے کچھ دیر

پہلے کوئی واقعہ پیش ہی نہ آیا ہو۔ اس کیلئے سلطنت کے ایک معتمد سردار کی موت کا حکم کسی کیڑے کی موت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ ہندوستان کے حکمراں کو یہ احساس تک نہ ہو سکا کہ اقتدار کی ضرب سے ٹوٹ کر بکھر جانے والا کون تھا؟

علی عامر آفریدی کو اسی تاریک کمرے کے حوالے کر دیا گیا جہاں وہ دو ماہ سے ایک لعنت زدہ مجرم کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا اب حیات و موت کے درمیان صرف ایک رات کا وقفہ تھا۔

☆......☆......☆

سورج بجھ گیا اور اندھیرے طلوع ہو گئے۔ ملک کافور کی خوشی ناقابل بیان تھی وہ شراب کے نشے میں بدمست رام دیو کے سامنے بیٹھا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ لہرا لہرا کر کہہ رہا تھا۔ "گیانی! میں جسے ڈس لوں وہ پانی بھی نہیں مانگتا۔" ملک کافور کی آواز نشے کے اثر سے لڑکھڑا رہی تھی۔

"بے شک! مستقبل کے شہنشاہ کی گرفت اتنی ہی مضبوط ہونی چاہئے۔" رام دیو نے اپنی گردن میں پڑی ہوئی یاقوت کی مالا سے کھیلتے ہوئے کہا۔ وہ خود بھی شراب کے نشے میں بدمست تھا۔

"میرے کاٹے کا نہ کوئی تریاق ہے اور نہ کوئی منتر۔" ملک کافور بدمستی کے عالم میں کھلتا جا رہا تھا۔

"گیانی! میرے دکھ کو کوئی نہیں جانتا۔ مجھے اپنا اتیت (ماضی) یاد آتا ہے۔ ہائے کیسے سنہرے زمانے تھے؟ کیسا خوابناک بچپن تھا؟ بے خبری کے چمکیلے دن تھے اور سکھ کی لمبی راتیں تھیں۔ پھر میرے گھر پر آکاش سے دکھوں کی ورشا (بارش) ہونے لگی۔ ماں باپ بھوک کا شکار ہو گئے۔ پیٹ کی آگ نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ میرا بیوپار کریں اور مجھے کسی دھنوان کے ہاتھ بیچ ڈالیں۔" شراب اپنا رنگ لا رہی تھی اور ملک کافور بہکتا جا رہا تھا۔ "آخر میرا سودا ہو گیا اور گجرات کے ایک ساہوکار نندلال نے مجھے خرید لیا۔ نندلال بڑا اوباش انسان تھا۔ اس نے اپنی دولت کا سہارا لے کر گھر کے گھر برباد کر ڈالے تھے مگر جس طرح مجھے برباد کیا گیا اس کی کوئی مثال نہیں ملتی گیانی!" ملک کافور' رام دیو کو اپنی تباہیوں کی داستان سنا رہا تھا۔

"نندلال کی بہت سی بیویاں تھیں جو ہر وقت جدائی کی آگ میں جلتی رہتی تھیں۔ اس ظالم ساہوکار نے ان سب کو مختلف چار دیواریوں میں اس طرح قید کر رکھا تھا جیسے وہ احساسات و جذبات رکھنے والی زندہ عورتیں نہ ہوں' بے زبان گائیں ہوں۔ نندلال کو میرے بے پناہ حسن اور چڑھتی ہوئی جوانی سے خطرہ تھا اس کی کئی بیویاں میری طرف نظر التفات سے دیکھتی تھیں اور پھر اسی لغزش نگاہ نے مجھے بدترین مخلوق بنا دیا۔ میں زندہ درگور ہو گیا اور جیتے جی قتل کر دیا گیا۔ نندلال نے مجھ سے میری مردانگی چھین لی میں ایک کمزور اور بے سہارا لڑکا تھا جسے اقتدار اور ظلم کی ہوائیں کوچہ بہ کوچہ اڑائے پھرتی تھیں۔ اچانک انقلاب کی سیاہ آندھی نے مجھے گجرات سے اٹھا کر "قصر ہزار ستون" کے دروازے پر پھینک دیا۔ میں سلطان معظم کا احسان مند ہوں کہ شاہ نے ایک خواجہ سرا غلام کو مخصوص اعزاز بخشا اور راستے کے پتھر کو اٹھا کر بلند ترین مقام پر نصب کر دیا۔ آج مجھے دنیا کی ہر نعمت میسر ہے لیکن میرا مذہب سیاست کے سمندر میں ڈوب گیا۔ کل میں غریب گوپی رام تھا لیکن دنیا والے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ آج میرا نام ملک کافور ہے مگر دہلی کے سردار مجھے ایک کتے سے بھی زیادہ حقیر سمجھتے ہیں۔ بیگمات شاہی میری جان کی دشمن ہیں۔ کسی کا کوئی بس نہیں چلتا۔ اگر انہیں موقع میسر آ جائے تو وہ میرے جسم کا گوشت نوچ کر جانوروں کو کھلا دیں۔" یہ کہتے ہی ملک کافور چونک اٹھا اور اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔

"کوئی نہیں ہے سمراٹ! ہمارے سوا اس کمرے میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔" رام دیو نے ملک کافور کو

مکمل طور پر شیشے میں اتارنے کی کوشش کی اور اس خواجہ سرا غلام کو شہنشاہ کہہ کر پکارنے لگا۔

"آہستہ بول گیانی! آہستہ بول۔" ملک کافور بد حواس ہو گیا۔ "ایک داس کو سمراٹ کہتا ہے۔ اگر کسی نے سن لیا تو آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ تیری لاش بھی شاہراہوں پر کھینچی جا رہی ہوگی اور میں بھی سولی پر لٹکا ہوا نظر آؤں گا۔"

"تو گوپی رام ہے اور میں رام دیو۔" عیار شعبدہ باز مسکرایا۔ "دونوں بھارت ورش (ہندوستان) کے اتہاس (تاریخ) میں امر ہو جائیں گے۔ تجھے گجرات یاد آتا ہے اور مجھے چتوڑ۔ دونوں کا دہلی سے کوئی سمبندھ نہیں۔ تیرا بھی اپمان ہوا ہے اور میرا بھی۔ تجھے بھی بدلہ لینا ہے اور مجھے بھی۔ آنے والے دن کا انتظار کر، وہ دن بہت قریب ہے۔" یہ کہہ کر رام دیو شراب کا پیالہ بھرنے لگا۔

"میرا ایک دشمن تو ٹھکانے لگ گیا گیانی!" جوشِ جذبات میں ملک کافور کا چہرہ کچھ اور سرخ ہو گیا تھا۔

"کل صبح ہوتے ہی اس کا سر نیزے پر بلند ہو گا اور لاوارث جسم پر مردہ خور پرندے منڈلا رہے ہوں گے۔" علاء الدین کا خواجہ سرا غلام مستی میں جھوم رہا تھا۔ "اس کی ماں اور بہن کی تو راکھ بھی منتشر ہو چکی ہوگی۔ وہ اسلام کے بہت دعوے کرتے تھے میں نے ان پر آگ کا عذاب نازل کیا۔ وہ آگ جو ہمارا مقدس نشان ہے۔"

"آگ ہی غالب رہے گی گوپی رام!" تکلفات کے پردے ہٹ چکے تھے اور دونوں منافق شاہی محل کے ایک کمرے میں اپنے دل کا غبار نکال رہے تھے۔

"اگر دیوتا مجھے شکتی دیتے تو میں آفریدی کے جسم کو بھی آگ لگا دیتا۔" ملک کافور اچانک بہت زیادہ غضب ناک نظر آنے لگا تھا۔

"دھیرج گوپی رام! دھیرج!" رام دیو نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

بار بار گوپی رام کا لفظ سن کر ملک کافور کے تصور میں ساہو کار نند لال کا چہرہ ابھرنے لگا جو مرنے سے قبل ایک بار دہلی آیا تھا اور رخصت ہوتے وقت اس نے ملک کافور سے کہا تھا۔ "تو گوپی رام ہے اور گوپی رام ہی رہے گا۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے گیانی! میں اول و آخر گوپی رام ہوں اور اسی گوپی رام نے علی عامر آفریدی کا نام و نشان تک مٹا دیا۔" ملک کافور اس طرح کہہ رہا تھا جیسے اس نے کسی خونریز جنگ کے بعد عظیم الشان فتح حاصل کر لی ہو۔

"آفریدی کا ذکر کیوں کرتا ہے کہ وہ تو ریت کی ایک دیوار تھی، تیز ہوا چلی، بیٹھ گئی۔ ان پہاڑوں کی طرف دیکھ جو تیرے راستے میں سر اٹھائے کھڑے ہیں۔"

"دیکھ رہا ہوں۔ گیانی! بہت دن سے دیکھ رہا ہوں۔" ملک کافور نے ایک اور جام لبریز کرتے ہوئے کہا۔

"تو آگے بڑھ اور ان پہاڑوں کی گردنیں تراش دے۔" رام دیو کیف و مستی کی تیز لہر میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس نے شراب کی ایک صراحی اٹھا کر ملک کافور کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے تیشہ بنالے گوپی رام اور پہاڑوں کے جگر کاٹ دے۔" رام دیو کے ہوش و حواس گم ہوتے جا رہے تھے۔

سرکاری طور پر شراب نوشی حرام قرار دے دی گئی تھی۔ علاء الدین نے اقتدار حاصل کرنے کے کچھ دن بعد ہی اس غلیظ رسم پر پابندی عائد کر دی تھی۔ ایک مجمع عام میں اعلان کیا گیا کہ بادشاہ نے شراب سے توبہ کر لی ہے۔ (حالانکہ حقیقت یہ نہ تھی) اس حکم کے بعد اب اگر کوئی شخص شراب بیچے گا یا پیئے گا تو اسے

سخت سزا دی جائے گی۔ علاء الدین کا یہ بڑا جرأت مندانہ اقدام تھا۔ اس نے ہندوستان کے کوچے کوچے میں پائی جانے والی کیف و نشاط کی محفلوں کو برباد کر دیا اور خصوصاً مسلمان قوم کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ تمام مقبوضہ علاقوں میں "شراب بندی" کے احکام بھیجے گئے۔ شاہی فرمان کے الفاظ اتنے سخت تھے کہ کوئی شخص بھی انکار کی جرأت نہ کر سکا۔ لوگوں نے اپنے اپنے گھروں سے شراب نکال کر اس طرح گلی کوچوں میں بہائی کہ برسات کے موسم کی مانند ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ نظر آتی تھی۔ شراب پینے والے بڑی حسرت سے اس منظر کو دیکھتے اور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہتے۔

"کاش! ہم مٹی ہوتے۔ کاش ہم مٹی ہوتے۔"

چوکیدار بڑی سختی کے ساتھ اس بات کا خیال رکھتے کہ شراب کا کوئی برتن شہری حدود میں داخل نہ ہونے پائے اگر کبھی کوئی شخص گھاس، لکڑیوں اور دیگر سامان کے اندر شراب چھپا کر شہر میں لے جانے کی کوشش کرتا تو اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ چوکیدار ایسے مجرموں کو فوراً تاڑ لیتے اور شراب چھین کر بحق سرکار ضبط کر لیتے۔ یہ ساری شراب شاہی فیل خانے میں بھیج کر ہاتھیوں کو پلا دی جاتی۔ ان تمام تر حفاظتی تدابیر کے باوجود بھی کچھ لوگ کسی نہ کسی بہانے شراب لے آتے تھے اور اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر ساغر و مینا سے دل بہلاتے تھے۔ ان بدمستوں کو قید و بند کی سختیوں کا ذرا بھی احساس نہ ہوتا اور نہ وہ اپنی ذلت و رسوائی سے ڈرتے تھے۔ جب علاء الدین کو ان لوگوں کی ایسی دلیرانہ حرکتوں کا علم ہوا تو اس نے نیا حکم جاری کیا کہ "بدایوں دروازے" کے قریب جو شاہراہ عام پر واقع ہے ایک کنواں کھودا جائے اور تمام نافرمانوں کو اس کنویں میں قید کر دیا جائے۔ سلطان کے اس حکم پر فوراً عمل کیا گیا۔ قانون توڑنے والے شرابی اس عجیب و غریب قید خانے میں ڈال دیئے گئے۔ کنویں کے اکثر قیدی تو اسیری کے دوران ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے تھے اور جو لوگ اس قید سے رہائی حاصل کر لیتے تھے ان کی صحت اس قدر خراب ہو جاتی تھی کہ وہ برسوں اپنا علاج کراتے۔ تب کہیں چلنے پھرنے کے قابل ہوتے۔ جب علاء الدین نے دیکھا کہ ملک سے شراب نوشی کی لعنت تقریباً ختم ہو چکی ہے اور اس سلسلے کے احکامات پر سختی کے ساتھ عمل کیا جانے لگا ہے تو اس نے اتنی نرمی برتتے ہوئے یہ اجازت دیدی کہ اگر امراء اور وزراء اپنے گھروں میں شراب پینا چاہیں تو پی سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ دہرا قانون تھا لیکن پھر بھی تاریخ علاء الدین کے اس کارنامے کو فراموش نہیں کر سکتی کہ اس نے عیش و عشرت کی عام محفلیں تباہ کر ڈالیں اور اپنی رعایا کو بربادی کے تاریک غاروں سے نکال کر ایک صحت مند معاشرے کو جنم دیا۔ ملک کافور اور رام دیو اسی دہرے قانون کی وجہ سے آزادانہ طور پر شراب پی رہے تھے۔ یہ رات ان تمام خوشامدی امراء کیلئے جشن کی رات تھی جو علی عامر آفریدی سے اس کی سچائی و بیباکی کے سبب نفرت کرتے تھے۔ آج ان پر انگلی اٹھانے والا موت کے قریب کھڑا تھا۔

"کیسا احمق نوجوان تھا؟" ملک نصرت خان نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں علی عامر کے انجام سے عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ نصرت خان!" ایک امیر نے کیف و مستی کے باوجود چونکتے ہوئے کہا۔ "آفریدی کی موت بہرحال ایک سچے انسان کی موت ہے۔ وہ جاتے جاتے بھی ہمیں خبردار کر گیا ہے۔"

"جسے اپنی خبر نہ ہو وہ دوسروں کو کیا خبردار کر سکتا ہے؟" ملک نصرت خان نے ناگوار لہجے میں کہا۔

"سرداری کے منصب پر پہنچ کر وہی لوگ ہوش و حواس میں رہ سکتے ہیں جن کے دل سمندر کی مانند ہوتے ہیں۔" ملک نصرت خان، علاء الدین کا مصاحب خاص تھا، اس لئے حقیقت سے منہ موڑ کر سلطان کی

طرفداری کر رہا تھا۔

"یہاں شاہ کا ذکر نہیں"۔ دوسرے امیر نے فکرمند لہجے میں کہا۔ "بات اس ہندوزادے کی ہو رہی ہے جس نے ایک بہادر سپہ سالار کے خلاف سازش کی اور کامیاب ہو گیا۔"

"کوئی سازش نہیں۔ آفریدی جھوٹا ہے۔" نصرت خان نے برہم ہوتے ہوئے کہا۔ "وہ اس قابل ہی کہاں ہے کہ اس کے خلاف کوئی سازش کی جا سکے"۔ ملک نصرت خان علاءالدین کی زبان میں بول رہا تھا۔

"کچھ بھی کہو نصرت خان!" تیسرے امیر نے محفلِ طرب سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آج یا کل ہماری باری ہے"۔

ملک نصرت خان نے جواب میں قہقہہ مارا اور پھر جام کھنکنے لگے۔

علاءالدین کے دوسرے امراء کا بھی یہی حال تھا۔ ان کے نزدیک آفریدی کی موت کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی کہ سیاست کے میدان میں کم و بیش روزانہ ہی ایسے کھیل کھیلے جاتے رہتے ہیں۔ انہیں تو افغان سپہ سالار کی زبان سے ادا ہونے والے وہ الفاظ پریشان کر رہے تھے جو ملک کافور کے بارے میں سرِدربار کہے گئے تھے۔

"میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں سلطان جب یہ ہندوزادہ بڑے بڑے شرفاء کی پگڑیاں اچھالے گا۔"

☆..................☆..................☆

شاہی حرم سرا میں بہت زیادہ بے چینی پائی جاتی تھی۔ علاءالدین کی بیگمات علی عامر آفریدی کے انجام سے غمزدہ نظر آ رہی تھیں مگر ان کے تاثرات بھی بڑے عجیب تھے وہ اس لئے اداس نہیں تھیں کہ ایک بہادر سپہ سالار ناکردہ گناہی کے صلے میں مارا جا رہا تھا۔ بیگمات کی افسردگی کا سبب یہ تھا کہ ان کا رقیب ملک کافور ایک بار پھر سرخرو ہو کر ابھرا تھا۔ سرلادیوی کی موت کے بعد یہ دوسرا واقعہ تھا جب سلطان نے ملک کافور کی وجہ سے اپنے ایک اور جاں نثار کو قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا۔

ہر شخص کو اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کی فکر تھی مگر کچھ لوگ مکمل طور پر بے حس نہیں ہوئے تھے ان کے سینوں میں دل دھڑک رہے تھے اور دلوں میں یہ احساس باقی تھا کہ ایک بے گناہ شخص محلاتی سازشوں کا شکار ہو کر اپنی موت سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ وہ لوگ آفریدی کے انجام پر خلش محسوس کر رہے تھے مگر اس کے غم کو بانٹنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے دلوں میں درد کی لہریں اٹھتی تھیں مگر زبانیں اس ناانصافی کا ماتم نہیں کر سکتی تھیں۔ علاءالدین کے درباریوں میں ایک ایسا شخص بھی موجود تھا جو علی عامر آفریدی کے قتل کا حکم سن کر رونے لگا پھر اس نے فوراً ہی اپنے آنسو رومال سے خشک کر لئے تھے کہ کہیں علاءالدین کے جاسوس بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ لیں اور اس کیلئے کوئی نئی مشکل کھڑی ہو جائے۔ یہ شخص سلطان کا ہم نام ملک علاءالدین کوتوال شہر تھا۔ عرف عام میں اسے علاءالملک کہتے تھے۔ بہت زیادہ موٹا ہونے کے سبب وہ آسانی کے ساتھ چل پھر نہیں سکتا تھا۔ اس لئے مہینے میں ایک دو بار ہی سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ دہلی کی یہ مخصوص رسم تھی کہ نیا چاند دیکھ کر تمام امراء' وزراء اور علماء پہلی تاریخ کو سلطان کے سلام کیلئے حاضر ہوتے تھے۔ علاءالملک بھی پابندی سے پہلی تاریخ کو دربار میں حاضر ہوتا اور آدابِ شاہی بجالاتا۔

جس روز علی عامر آفریدی کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا' اس دن علاءالملک خاص طور پر دربارِ شاہی میں حاضر ہوا تھا۔ اس نرم دل کوتوال کو علی عامر آفریدی سے اپنے بیٹوں کی طرح محبت تھی وہ

افغان سپہ سالار کی شجاعت اور بلند کرداری کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ علاءالملک دل ہی دل میں آفریدی کی کامیابیوں کیلئے دعائیں کرتا تھا مگر جب اچانک وقت کے بے رحم ہاتھوں نے زندگی کی بساط الٹ دی تو دہلی کا کوتوال اپنے سینے میں درد کا ایک طوفان چھپائے اٹھ کھڑا ہوا۔ راستے بھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ گھر پہنچا تو علاءالملک کی یہ حالت دیکھ کر بیوی بچے پریشان ہو گئے۔ اہل خانہ کے بار بار پوچھنے پر بھی علاءالملک نے انہیں اپنی اشک ریزی کی وجہ نہیں بتائی۔ وہ رات گئے تک تنہا کمرے میں اداس بیٹھا رہا۔ علاءالملک کی بیوی شمسہ تاجدار بیگم ہمت کر کے شوہر کے کمرے میں داخل ہوئی۔

آخر بہت اصرار کے بعد علاءالملک نے اپنی بیوی کو آفریدی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ "تاجدار! ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کل صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے میرا ایک بیٹا قتل کر دیا جائے گا۔"

شمسہ تاجدار بیگم بھی افسردہ نظر آنے لگی۔

"تم آفریدی کو نہیں جانتیں تاجدار!" علاءالملک کی آواز کانپ رہی تھی اور اس بدنما انسان کا خوبصورت دل پگھلتا جا رہا تھا۔ "وہ تمہارے بیٹوں سے بھی زیادہ لائق ہے۔"

"مجھے آپ کی باتوں پر پورا اعتبار ہے۔ یقیناً آفریدی ایسا ہی ہو گا۔" علاءالملک کی بیوی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا سلطان کی بارگاہ میں آفریدی کی جاں بخشی کیلئے سفارش کرنے والا کوئی نہیں؟"

"نہیں کوئی نہیں۔" علاءالملک شدید بے چارگی کے عالم میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ "دشمنوں نے پیچ ہی وہ ڈالا ہے کہ کوئی تدبیر کام نہیں کر سکتی۔ اگر کسی طرح اس گرہ کو کھول بھی دیا جائے تو سلطان کی عادت ہے کہ وہ اپنے الفاظ واپس نہیں لیتا۔ اپنے حکم کو آسمانی حکم سمجھتا ہے کسی کی طرف سے ایک بار دل میلا ہو جائے تو پھر اس غبار کو کوئی صاف نہیں کر سکتا۔"

شمسہ تاجدار بیگم کچھ دیر تک سوچتی رہی اور پھر چونک کر اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی۔ "کیا سلطان پر حضرت نظام الدین اولیاؒ کے بے شمار احسانات نہیں ہیں؟"

علاءالملک حیرت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ "حضرت شیخ کے احسانات کا شمار کون کر سکتا ہے؟ فتح چتوڑ کس کی دعاؤں کا نتیجہ ہے؟ اور مغلوں کی ناکام واپسی کس کی روشن کرامت ہے؟ سلطان کی تو ایک ایک سانس حضرت شیخ کے بارِ احسان سے دبی ہوئی ہے اگر وہ سرکشی اختیار کر لے تو اور بات ہے۔ ویسے ساری دنیا جانتی ہے کہ علاءالدین کے اقتدار کی تجدید غیاث پور کی خانقاہ سے ہوتی ہے۔"

"تو پھر آپ حضرت شیخ کی جناب میں آفریدی کیلئے رحم کی درخواست کیوں نہیں کرتے؟" شمسہ تاجدار بیگم نے اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے شوہر کو تیز روشنی کا راستہ بتاتے ہوئے کہا۔ "کیا سلطان' حضرت شیخ کے حکم کو ٹالنے کی گستاخی کر سکتا ہے؟"

علاءالملک کا چہرہ یکایک زرد نظر آنے لگا۔ "سلطان اس قدر نادان نہیں کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دے۔"

"پھر آپ غیاث پور کیوں نہیں چلے جاتے؟ ابھی تو بہت رات باقی ہے۔" شمسہ تاجدار بیگم نے مضطرب ہوتے ہوئے کہا۔

"میں گناہ گار؟" علاءالملک کانپنے لگا۔ "میں سیاہ کار اس مردِ پاکباز کے آستانے پر کیسے جا سکتا ہوں جہاں سلطان علاءالدین خلجی بھی ایک بھکاری نظر آتا ہے؟" علاءالملک زار و قطار رونے لگا اس کے پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ "کاش! میں اس قابل ہوتا تو حضرت شیخ کے قدموں سے لپٹ جاتا اور اس

وقت تک دامن نہیں چھوڑتا جب تک محبوب الٰہیؒ (نظام الدین اولیاؒ) آفریدی کی زندگی کیلئے اپنا دستِ دعا بلند نہیں فرمادیتے۔"

"تو کیا آفریدی قتل ہو جائے گا؟" شمسہ تاجدار بیگم نے انتہائی مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"شاید نہیں!" علاء الملک کے ذہن میں ایک برق سی لہرائی اور اس کے مردہ چہرے پر نئی زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ "میں امیر خسروؒ سے التجا کروں گا سلطان بھی ان ہی کے حوالے سے حضرت شیخ کی بارگاہ میں اپنی درخواست پیش کرتا ہے۔ امیر خسروؒ بھی ایک ایسے شخص ہیں جن کی بات ٹالی نہیں جا سکتی۔ میں آفریدی کیلئے امیر کے آگے دامن پھیلا دوں گا۔" یہ کہہ کر علاء الملک نے اپنے کوچوان کو آواز دی اور پھر تھوڑی دیر بعد اس کی سواری "قصر ہزار ستون" کی طرف جا رہی تھی۔

☆..................☆..................☆

نرملا کو ہوش آ چکا تھا۔ مگر ابھی تک اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ حرم سرا کی کنیزوں نے اس کے سامنے کھانا رکھا مگر نرملا نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ کنیزوں نے رانی کنولا دیوی کو خبر دی اگرچہ کنولا دیوی مسلمان ہو کر علاء الدین کی بیوی بھی بن چکی تھی اور اسے "ملکۂ جہاں" کا خطاب حاصل ہو چکا تھا لیکن ایک راجپوت عورت کی حیثیت سے وہ نرملا کماری کو نظر انداز نہ کر سکی۔ ماضی کے رشتوں نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ نرملا کماری کی دلجوئی کرے اور ایک معزز خاندان کی لڑکی کو سسک سسک کر مرنے سے بچائے۔ کنیزوں کی زبانی نرملا کماری کی حالت زار کا ذکر سن کر کنولا دیوی خود اس کمرے میں آئی جہاں ایک راجپوت زادی تصویر درد بنی دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھی تھی۔

ملکۂ جہاں نے کنیزوں کی طرف دیکھا۔ ایک جنبشِ چشم کے ساتھ ہی تمام خادمائیں کمرے سے باہر نکل گئیں۔ تنہائی ہوتے ہی ملکۂ جہاں نرملا کماری سے مخاطب ہوئی۔ "لڑکی! تم مجھے جانتی ہو کہ میں گجرات کی مہارانی کنولا دیوی ہوں۔"

نرملا کماری نے سر کے اشارے سے اقرار کیا۔

"اور کیا تم اس حقیقت سے بھی باخبر ہو کہ اب میں سلطان علاء الدین خلجی کی بیوی "ملکۂ جہاں" ہوں۔" رانی کنولا دیوی کا لہجہ کسی قدر ناخوشگوار تھا۔

نرملا کماری نے دوبارہ سر کو جنبش دی۔

"پھر تم میرے استقبال کیلئے کھڑی کیوں نہیں ہوئیں؟" رانی کنولا دیوی کی آواز تلخ تھی۔

"ملکۂ جہاں کو احساس ہونا چاہئے کہ جو انسان موت کے قریب کھڑا ہو اس کی ذہنی حالت کیا ہوتی ہے؟" نرملا کماری نے باوقار لہجے میں کہا مگر اس کے ایک ایک لفظ سے دل کا درد جھلک رہا تھا۔

"میں تمہیں ایک عورت کی حیثیت سے یہی بات سمجھانے آئی ہوں کہ عین عالمِ شباب میں موت کی تمنا نہیں کرتے۔" رانی کنولا دیوی اچانک بہت زیادہ مہربان نظر آنے لگی تھی۔ "تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میرا پہلا شوہر راجہ کرن مجھے دشمنوں کے نرغے میں چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا اس نے آزمائش کے وقت بڑی بے شرمی کے ساتھ پیٹھ دکھا دی۔ تم نہیں سمجھ سکتیں کہ میں نے کس طرح حادثات کی یلغار سے اپنے آپ کو بچایا؟ ڈوبتی ہوئی کشتی کی پتوار اس شخص کے ہاتھ میں دیدی جو بڑا زور آور ملاح تھا۔ طاقتور بازوؤں والا بڑا بے جگر ناخدا تھا۔ میں دوسری شادی کر کے رانی کنولا دیوی سے ملکۂ جہاں بن گئی۔ یہ وہ اعزاز ہے جس کی تمنا میں بے شمار عورتیں زیر زمین چلی گئیں یا پھر شمشان گھاٹ میں جل بجھیں۔ میں نے اس اعزاز کو حاصل

کر لیا مگر یہ راز کسے بتاؤں کہ ملکۂ جہاں ہوتے ہوئے بھی اپنے شوہر کی قربت کو ترستی ہوں۔" رانی کنولا دیوی بہت زیادہ اداس نظر آنے لگی تھی۔

"آخر آپ مجھے کیا سمجھانا چاہتی ہیں؟" نرملا کماری نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"میں تمہارے معزز و محترم خاندان سے بخوبی واقف ہوں اس لئے مجھے تم سے ہمدردی ہے۔" رانی کنولا دیوی نے نرملا کماری کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تم نے شدت جذبات میں ایک ایسے مرد کا انتخاب کر لیا جو تمہارے برابر کھڑا نہیں ہو سکتا وہ ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ خیر! اب تو وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا بالفرض اگر زندہ بھی رہ جاتا تو کیا تم اس کی بدکرداریوں کو فراموش کر دیتیں؟"

نرملا کماری بڑے تعجب سے رانی کنولا دیوی کو دیکھنے لگی۔

"میں اس بات کو پسند نہیں کروں گی کہ تم کسی شمعِ محفل کی طرح قطرہ قطرہ گھل گھل کر فنا ہو جاؤ اور اوباش مردوں کا ہجوم تمہارا تماشا دیکھتا رہے۔" رانی کنولا دیوی کا اندازِ گفتگو تحکم آمیز تھا۔ "میری خواہش ہے کہ تم اس بے وفا مرد کے منہ پر تھوک دو اور کسی ایسے معزز شخص کا دامن تھام لو جو روشن مستقبل کی طرف گامزن ہو۔ اپنے آپ کو اس طرح نہ جلاؤ کہ راکھ تک باقی نہ رہے۔"

نرملا کماری کو دوبارہ سکتہ سا ہو گیا۔ رانی کنولا دیوی بڑے عجیب راستے کی نشاندہی کر رہی تھی۔

"میرے مشورے کو جذبات کی آنکھ نہیں، ہوش کی نظر سے دیکھو۔" نرملا کماری کو خاموش پا کر رانی کنولا دیوی دوبارہ بولی۔ "یہ سفاک مردوں کی قتل گاہ ہے جہاں روزانہ ان گنت عورتیں بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ رسمِ عاشقی، وفا کے دعوے، عہد و پیمان، پرجوش قسمیں، میں نے ان آنکھوں سے سب کا حشر دیکھ لیا۔"

رانی کنولا دیوی اپنی زندگی کے تلخ ترین تجربات بیان کر رہی تھی اور نرملا کماری کے چہرے پر انتہائی ناگواری کے تاثرات گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ "ملکۂ جہاں! یہ اپنے اپنے جینے کی ادا ہے۔ کوئی ایک کشتی میں پاؤں رکھ کر ڈوب جاتا ہے اور کوئی ہواؤں کا رخ دیکھتے ہوئے دس کشتیوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے مگر ساحل اسے بھی نہیں ملتا۔ اس کا انجام بھی تند و تیز موجوں میں غرق ہو جانا ہے۔" نرملا کماری نے بڑے شائستہ لہجے میں رانی کنولا دیوی کے مشورے پر اعتراض کیا تھا۔ "زندگی مضبوط سہارے ڈھونڈنے کا نام نہیں۔ انسان کو خود پہاڑ کی طرح اٹل ہونا چاہئے۔"

رانی کنولا دیوی ایک شکستہ عورت تھی۔ پہلے شوہر کی بے وفائی نے اسے دنیا کے تمام مردوں سے بدظن کر دیا تھا۔ علاء الدین کی بیوی بن جانے کے بعد اسے دنیا کی ساری آسائشیں حاصل ہو چکی تھیں مگر پھر بھی ایک احساس کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹکتا تھا۔ کہنے والوں کی زبانیں خاموش تھیں مگر آنکھوں میں سب کچھ لکھا ہوا تھا۔ رانی کنولا دیوی اس تحریر کو پڑھ کر لرز جاتی تھی۔ اکثر لوگوں کی نظر میں راجہ کرن مجرم نہیں تھا۔ اس نے سیاسی محاذ پر شکست کھائی تھی اور جان بچانے کیلئے فرار ہو گیا تھا۔ اقتدار کی کشمکش میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ کبھی تخت و تاج کے ہنگامے اور کبھی مقتل و زنداں کے خوفناک سناٹے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں کی اکثریت راجہ کرن کو بے قصور سمجھتی تھی۔ اس کے برعکس عام انسانوں کی نگاہ میں رانی کنولا دیوی ایک گناہ گار عورت تھی جس نے اپنا مذہب بھی بدل ڈالا تھا اور اپنے جذبات بھی علاء الدین کے عشرت کدے میں فروخت کر دیئے تھے اگرچہ علاء الدین نے اس موقع پر اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن رانی کنولا دیوی اپنے نسلی معیار سے گر چکی تھی کہنے والے یہی کہتے تھے کہ وہ ایک تاجر عورت ہے اس نے بازار

کا رنگ بدلتے دیکھ کر ہی راجہ کرن کو ٹھکرا دیا اور علاء الدین سے سودا کر لیا۔ رانی کنولا دیوی کو بھی اکثر تنہائی میں ان الزام تراشیوں کا شور سنائی دیتا تھا وہ بظاہر "ملکۂ جہاں" تھی مگر رعایا کی آنکھوں میں صاف لکھا تھا کہ "گجرات کی مہارانی ایک بے وفا عورت ہے۔" زندگی کے ایسے خوفناک انقلاب نے رانی کنولا دیوی کو نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ وہ علی الاعلان دنیا کے سارے مردوں کو مجرم قرار دیتی تھی مگر درپردہ اس کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ کوئی عورت "وفا" کا نام نہ لے۔ نرملا کماری کے جذبۂ ایثار کو دیکھ کر کنولا دیوی اندر ہی اندر سلگ اٹھی تھی اور پھر اس نے کوشش کی تھی کہ یہ راجپوت زادی بھی کسی دوسرے بااثر سردار کا دامن تھام کر اپنی شخصیت کو داغدار بنا لے اس طرح کنولا دیوی کے مجرم جذبات تسکین پاتے تھے مگر جب نرملا کماری نے بے وفائی اور عہد شکنی کی راہ پر چلنے سے انکار کر دیا تو ملکۂ جہاں پیچ و تاب کھانے لگی اور ایک بار پھر اس کا احساسِ جرم پوری شدت کے ساتھ ابھر آیا۔

"آفریدی کتنا ہی بدکردار سہی اول و آخر میرا ہے۔" نرملا کماری کے لہجے سے عجیب کیفیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "آفریدی وہ ہے جسے میں نے اپنے دل کے راستے سے گزرنے کی اجازت دی اس پر پہلی بار ایک غیرت مند دوشیزہ کی آرزوئیں بے نقاب ہوئیں اور ان سانسوں کے راز کھلے جنہیں لالہ و گل کے سوا کسی انسان نے محسوس نہیں کیا تھا۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں اپنے دل کو گزر گاہِ عام بنا ڈالوں۔ آفریدی نہیں تو کوئی اور سردار سہی۔ آپ نے اس طرح میری غمگساری کیوں نہیں کی کہ آفریدی کی لاش کے ساتھ میں بھی قبر میں سو جاؤں۔" اچانک نرملا کماری کا لہجہ بہت تلخ ہو گیا تھا۔

"یہاں کے لوگ تجھے اتنی آسانی سے قبر میں سونے نہیں دیں گے۔" ملکۂ جہاں کو ایک کمزور لڑکی کے سامنے اپنی ذلت کا احساس ہو گیا تھا اس لئے وہ غضب ناک نظر آنے لگی۔

"میں دربارِ شاہی سے اپنے لئے دو گز جگہ مانگ لوں گی سلطان علاء الدین خلجی کی سلطنت بہت وسیع ہے۔" نرملا کے ہونٹوں پر خلاف موسم ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی مگر اس مسکراہٹ میں نہ جانے کتنی تلخیاں پوشیدہ تھیں۔ "اگر سلطان کا دامن اتنا تنگ ہوا کہ مجھے قبر کی بھی جگہ نہ مل سکی تو خود اپنی زندگی کو قبر بنا لوں گی۔"

رانی کنولا دیوی جھنجلا کر کھڑی ہو گئی اسے نرملا سے اظہار ہمدردی کر کے بڑی ندامت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔
"نادان لڑکی! تو نے مجھے میرے احسان کا بڑا عجیب صلہ دیا ہے پھر بھی میں تیرے لئے اپنے دروازے کھلے رکھوں گی جب تجھ پر ہندوستان کی زمین کا ایک ایک گوشہ تنگ ہو جائے تو مجھے پکار لینا میں تیری فریاد کا جواب دوں گی۔" یہ کہہ کر ملکۂ جہاں چلی گئی۔ ایک ستم رسیدہ اور بے گھر لڑکی نے قصرِ ہزار ستون میں رہنے والی بااختیار عورت کے غرور کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

نرملا کماری کو علی عامر آفریدی سے بڑی شکایت تھی درباری رقاصہ زہرہ جمال کے واقعے نے نرملا کے ہوش و حواس چھین لئے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آفریدی اس قدر پستی میں اتر سکتا ہے۔ نرملا نے جب بھی علی عامر کو دیکھا تھا وہ اسے کوہ آبو کی بلند ترین چوٹی سے بھی زیادہ اونچا نظر آیا تھا اور اسی اونچائی کو چھونے کیلئے اس نے آفریدی کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔ پھر خوش گمانی کا یہ طلسم ٹوٹا تو علی عامر اسے ایک گڑھے میں رینگتا ہوا نظر آیا وہ گڑھا جو غلیظ کیچڑ سے بھرا ہوا تھا۔ نرملا آخری بار آفریدی سے ملنا چاہتی تھی مگر سلطان نے اس کی درخواست کو بڑی بے رحمی کے ساتھ مسترد کر دیا تھا وہ اپنی زندگی کے شریک سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ جن کے چہرے دیکھ کر لوگ اپنا مذہب تک بدل ڈالتے ہیں ان کی

تنہائیوں کو بھی بتوں سے پاک ہونا چاہئے۔ نرملا اس راز کو تو سمجھ گئی تھی کہ سلطان کے حوالے سے آفریدی کے چاروں طرف سازشوں کا آہنی حصار کھینچا جا رہا ہے مگر زہرہ جمال اور اس کے گھر والوں کی خودکشی نے نرملا کے دل و دماغ میں شبہات کا زہر بھر دیا تھا اس بدگمانی میں مزید اضافہ یوں بھی ہوا کہ آفریدی نے طویل رفاقت کے دوران کسی رقاصہ کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ پھر ان ہی اندیشوں نے علی عامر اور نرملا کے درمیان فاصلوں کی ایک دیوار کھڑی کر دی تھی۔ ہلکی سی ضرب لگی تو دل کا آبگینہ بکھرتا ہی چلا گیا۔ نرملا' آفریدی سے خفا تھی مگر اس نے رانی کنولا دیوی کے سامنے اپنے محبوب کو آسمان کی بلندیوں پر رکھا۔ یہ ایک راجپوت زادی کے عشق کا انداز تھا کہ غیروں سے شکایت نہیں کی دل پر قیامت گزر گئی مگر دوسروں کے روبرو چیخنا تو درکنار' چہرے پر عکسِ ملال تک نہیں آنے دیا۔ جب ملکۂ جہاں چلی گئی تو نرملا نے کمرے کے فرش پر سر رکھ دیا اور وہ سجدے کی حالت میں تھی آنکھوں سے اشکوں کا آبشار جاری تھا اور قصر ہزار ستون کے سرخ پتھر بھیگتے جا رہے تھے۔

"اے خدا! اے خدا! آفریدی کو زندگی دے اور میری جان کا صدقہ قبول کر لے۔ اب میں جاگتے جاگتے تھک گئی ہوں۔ مجھے ابدی نیند بخش دے کہ تیرے لازوال خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔"

☆..............................☆..............................☆

کوتوال علاء الملک دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ امیر خسروؒ سے شاہی محل میں ملاقات ہو جائے اس بات کا بھی امکان تھا کہ کہیں خسروؒ اپنے پیرو مرشد کے نیاز حاصل کرنے کیلئے غیاث پور تشریف نہ لے گئے ہوں۔ علاء الملک اس خیال سے ہی کانپ اٹھتا تھا۔ غرض ایک شدید ذہنی کشمکش میں گرفتار علاء الملک قصر ہزار ستون پہنچا۔ خاصی رات ہو چکی تھی۔ محل کے محافظ کوتوالِ شہر کو دیکھ کر چونک اٹھے مگر علاء الملک نے پہرے داروں کے احساسات سے بے نیاز ہو کر امیر خسروؒ کے بارے میں پوچھا پھر جب اسے معلوم ہوا کہ امیر خسروؒ موجود ہیں تو علاء الملک کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنے بے ہنگم جسم کے ساتھ بھاگتا ہوا امیر خسروؒ کی قیام گاہ تک پہنچا۔ محافظ نے بتایا کہ امیر اس وقت اپنے شبینہ وظائف میں مشغول ہیں۔ علاء الملک بدحواس ہو گیا۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ ان حالات میں اندیشہ تھا کہ کہیں علاء الدین کی خواب گاہ کے دروازے بند نہ ہو جائیں اور رحم کی درخواست کرنے سے پہلے ہی آفریدی قتل نہ کر دیا جائے۔ علاء الملک کچھ دیر تک امیر خسروؒ کے کمرے کے سامنے ٹہلتا رہا اور پھر دربان سے یہ کہتا ہوا اندر داخل ہو گیا کہ وہ زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ امیر خسروؒ اس قدر گہرے مراقبے میں تھے کہ انہیں دروازہ کھلنے اور علاء الملک کے بھاری قدموں سے چلنے کی آواز تک سنائی نہیں دی۔

"امیر! میرے اس گناہ کو معاف کریں کہ میں آپ کی ریاضت میں خلل انداز ہوا۔" علاء الملک نے امیر خسروؒ کے قریب پہنچ کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

امیر خسروؒ نے آنکھیں کھول کر علاء الملک کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر وحشت کے سوا کوئی دوسرا رنگ موجود نہیں تھا۔ "تم' اس وقت؟ خیر تو ہے علاء الملک؟" امیر خسروؒ نے شفیق و مہربان لہجے میں پوچھا۔

"میں آفریدی کیلئے بہت پریشان ہوں۔" علاء الملک ہاتھ باندھ کر امیر خسروؒ کے سامنے بیٹھ گیا۔

"ہم بھی اس طرف سے بہت فکر مند ہیں۔" امیر خسروؒ نے فرمایا۔ "شام ہی سے بارگاہِ ذوالجلال میں اس کی عافیت کیلئے دعا کر رہے ہیں۔ آفریدی پر عجیب وقت آ پڑا ہے۔ آزمائش کا ایک طویل دور ہے'

بہت طویل......... بسم و جاں پگھلا دینے والا۔ تم نہیں سمجھ سکتے علاء الملک کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ خدا ہی اپنے رازوں کو بہتر جانتا ہے۔"

"سلطان کا مزاج ہے کہ وہ اپنے الفاظ واپس نہیں لیتے مگر ایک آپ ہی کی ذات ہے جو ان کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔" کوتوال علاء الملک بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔ "امیر خدا کیلئے کچھ کیجئے کہ آفریدی اور اس کی موت کے درمیان بہت کم وقت رہ گیا ہے۔" یہ کہتے کہتے علاء الملک کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"خدا کا شکر ہے کہ ابھی دربار شاہی میں تم جیسے دردمند انسان موجود ہیں۔" امیر خسروؒ نے تحسین آمیز نظروں سے علاء الملک کو دیکھا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا مگر تمہیں بھی خدا اس غمگساری کا صلہ ضرور عطا کرے گا۔"

امیر خسروؒ اپنے کمرے سے باہر تشریف لے آئے اور آہستہ آہستہ خواب گاہِ سلطانی کی طرف بڑھنے لگے۔ علاء الملک بھی امیر کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس میں علاء الدین کا سامنا کرنے کی تو ہمت نہیں تھی مگر وہ آج کی رات گھر جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ایک طویل راہداری سے گزر کر امیر خسروؒ سلطان کی خواب گاہ تک پہنچے۔ محافظ خاص نے بتایا کہ آج سلطان خلافِ معمول وقت سے پہلے سو گئے ہیں۔ علاء الملک کو محسوس ہوا کہ جیسے جلادوں نے آفریدی کے بجائے خود اس کی گردن پر تلوار چلا دی ہو۔

"امیر! مجھے اسی بات کا خوف تھا۔" علاء الملک رونے لگا۔

امیر خسروؒ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر تک خواب گاہ کے دروازے کے سامنے کھڑے سوچتے رہے اور پھر دربان سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ "سلطان تک یہ اطلاع پہنچا دو کہ خسروؒ آیا ہے۔"

دربان نے انکار کر دیا کہ وہ اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔

"تو پھر مجھے اندر جانے دو کہ میں صبح کا انتظار نہیں کر سکتا۔" امیر خسروؒ کا جلالِ روحانی ابھر آیا۔

دربان نے انہیں روکنا چاہا مگر امیر خسروؒ کی نگاہِ گرم کی تاب نہ لا سکا۔ اس پر خوف و دہشت کا اس قدر غلبہ ہوا کہ تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی اور امیر خسروؒ خواب گاہِ شاہی میں داخل ہو گئے۔ کمرے کے اندر ہلکی روشنی تھی۔ علاء الدین ابھی سویا نہیں تھا۔ وہ نیم خوابی کی کیفیت سے دوچار تھا کہ کسی کے قدموں کی آہٹ سن کر چونک اٹھا۔

"کون؟ ملک؟" بے وقت مداخلت نے علاء الدین کو غضب ناک کر دیا تھا۔

"نہیں شاہ والا! میں امیر خسروؒ!"

سلطان گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور خسروؒ سے نصف شب کے قریب غیر متوقع آمد کا سبب دریافت کرنے لگا۔

"اگر میں نے شاہ والا کی کوئی خدمت انجام دی ہے تو اس کے صلے میں آفریدی کی جان بخش دی جائے۔" امیر خسروؒ نے اپنی خواہش کا برملا اظہار کر دیا۔

علاء الدین بہت دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر بڑے شکستہ لہجے میں بولا۔ "خسروؒ! ہم تمہاری درخواست کو نظر انداز نہیں کر سکتے مگر تمہیں بھی اپنے شاہ کے قانون کا احترام کرنا چاہئے۔"

امیر خسروؒ سلطان کی گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھ سکے اور سوالیہ نظروں سے اس شخص کی جانب دیکھنے لگے جو اپنے فیصلے میں ترمیم کرنے کا عادی نہیں تھا۔

"ہم تمہاری خاطر آفریدی کی جان بخش دیتے ہیں مگر وہ اس وقت تک قیدی کی زندگی بسر کرے گا جب

تک ہم دنیا سے گزر نہیں جاتے۔" علاء الدین نے فوراً ہی نیا حکم جاری کر دیا جس کے مطابق علی عامر آفریدی، سلطان کی زندگی میں آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ بڑی عجیب سزا تھی۔ امیر خسروؒ علاء الدین کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل آئے۔ کوتوال علاء الملک اداس تھا مگر اس اداسی کے عقب میں ایک خوشی بھی رقصاں تھی۔

قصر ہزار ستون آدھی رات کے وقت دوبارہ جاگ اٹھا۔ اس خبر پر کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ سلطان نے آفریدی کے قتل کا فیصلہ واپس لے لیا ہے۔

☆.......☆.......☆

صبح ہوتے ہی آفریدی کو محل کے کمرے سے نکال کر زمین دوز قید خانے کی طرف لے جایا جانے لگا۔ جب سپاہی قصر ہزار ستون کی حدود سے باہر آئے تو دہلی کے مشہور بزرگ بشیر مجذوب نعرہ زنی کر رہے تھے۔

"آسمان زمین پر جھک گیا اور زمین انسانوں کے خون سے بھر گئی۔"

بشیر مجذوب اسی قسم کی پُراسرار باتیں کرتے تھے۔ آفریدی قریب سے گزرا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر بشیر مجذوب کو سلام کرنے کی کوشش کی۔ زنجیریں بج اٹھیں اور سید بشیر چیخنے لگے۔

"کیسا شور ہے؟ خدا کی پناہ! خدا کی پناہ!"

سپاہی آفریدی کو بے رحمی سے کھینچ رہے تھے۔ اس نے بلند آواز میں پکار کر کہا۔ "سید! میں جا رہا ہوں۔"

"تجھ سے پہلے یہ سب چلے جائیں گے۔" بشیر مجذوب نے فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

سپاہی ہنسنے لگے۔ "عجیب پاگل ہے۔"

آفریدی نے سپاہیوں کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا اور سر جھکا کر چلنے لگا۔

ملک کافور کی ساری خوشیاں فنا ہو گئی تھیں۔ اس کا بدترین دشمن اچانک موت کے خونی پنجوں سے نکل آیا تھا۔

"صبر کر گوپی رام! صبر کر۔" رام دیو، ملک کافور کو تسلیاں دے رہا تھا۔ "جیت ہماری ہوئی ہے۔ آفریدی کو قید کی حالت میں زہر بھی دیا جا سکتا ہے۔"

ملک کافور کی بگڑتی ہوئی حالت سنبھل گئی۔ "ہاں! یہ ممکن ہے۔" وہ جوشِ مسرت سے چیخ اٹھا۔ "کہاں تک بھاگے گا آفریدی! میرے ہاتھ بہت دراز ہیں۔"

☆.......☆.......☆

علی عامر آفریدی کو ایک زیرِ زمین قید خانے میں پہنچا دیا گیا۔ سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو اس قسم کے قید خانوں میں رکھا جاتا تھا۔ یہ قید خانے طویل اور کشادہ قبروں سے مشابہہ ہوتے تھے۔ اگر کوئی کمزور اعصاب کا انسان ایسے قید خانوں میں کچھ سال گزار لیتا تو آزاد ہونے کے بعد بھی وہ ایک ناکارہ اور بیمار شخص نظر آتا تھا۔ آفریدی کو بھی اسی لئے زمین دوز قید خانے میں بھیجا گیا تھا کہ چند سالوں کی قید اسے تھکا ڈالے گی اور اگر بعد میں وہ چھوٹ بھی گیا تو زندہ درگور ہو جائے گا۔ علی عامر آفریدی جھوٹی شہادتوں کی وجہ سے اصولی طور پر بغاوت کا مجرم تھا اور ایسے مجرموں کیلئے علاء الدین خلجی نے بہت سخت قوانین بنائے تھے۔ وہ باغیوں کو بلا دریغ قتل کرا دیا کرتا تھا۔ ان میں سے اکثر کی لاشیں شہر میں کوچہ در کوچہ پھرائی جاتی تھیں اور اس کے ساتھ ہی باغی خاندان کو بھی دردناک سزائیں دی جاتی تھیں۔ آفریدی کے ساتھ بھی یہی سب

کچھ پیش آتا مگر امیر خسروؒ کی مداخلت کے سبب اس کے قتل کی سزا معاف کر دی گئی۔ اگرچہ آفریدی کی والدہ اور بہن جل کر خاک ہو چکی تھیں لیکن ابھی اس کے کچھ رشتے دار باقی تھے۔ انہیں بھی یقینی طور پر سنگین سزاؤں سے دوچار ہونا پڑتا لیکن خطرہ اس وقت ٹل گیا جب آفریدی کی سزا میں تبدیلی ہو گئی۔ علاء الدین کے دور حکومت میں یہ پہلا واقعہ تھا جب ایک باغی کو قتل کے بجائے قید کی سزا دی گئی اور وہ سزا بھی مشروط تھی۔ اگر علاء الدین دوسرے دن ہی انتقال کر جاتا تو آفریدی زنداں کی تاریکیوں سے باہر نکل آتا اور اس کی باقی سزا معاف ہو جاتی اس کے برعکس اگر علاء الدین مزید پچاس سال تک زندہ رہتا تو آفریدی کو بھی اپنی پوری جوانی قید و بند کے اندھیروں میں گزارنی پڑتی۔ سلطان کے اس فیصلے سے وہ درباری امراء کسی قدر مطمئن نظر آنے لگے تھے جن کے سینوں میں ابھی احساس زندہ تھا۔ ان کے خیال میں امیر خسروؒ کی سفارش سے ملک کافور جیسے بے حیاء غلام کو شکست ہو گئی تھی اور اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کا طوفان ایک مقام پر ٹھہر گیا تھا۔

ملک کافور اور رام دیو کو اس اچانک انقلاب سے سخت اذیت پہنچی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا شکار اس طرح موت کے منہ سے بحفاظت نکل آئے گا۔ ملک کافور سب سے زیادہ امیر خسروؒ کو ناپسند کرتا تھا کہ ان کے سامنے سلطان بھی کسی حد تک باادب نظر آتا تھا۔

"اس درباری شاعر نے ہماری بساط الٹ کر رکھ دی۔" ملک کافور نے بہت تند و تیز لہجے میں کہا۔

"بساط کہاں الٹی ہے گوپی رام ؟ ابھی تو مہرے گردش کر رہے ہیں۔" رام دیو کی آواز سے گہرا سکون جھلک رہا تھا۔ "صرف محاذ بدل گیا ہے۔ اب ہمیں نئے محاذ پر جنگ کرنی ہوگی۔ میں نے بہت غور سے ستاروں کی چال کا مشاہدہ کیا ہے۔ بالآخر آفریدی مارا جائے گا اور اس کی موت زہر خورانی سے واقع ہوگی۔"

"تیرے اس دعوے کی بنیاد کیا ہے گیانی ؟" ملک کافور نے بیزاری کے عالم میں کہا۔

"قید خانے کے محافظ کو بڑی آسانی سے ورغلایا جا سکتا ہے۔" رام دیو کی سرخ آنکھوں میں شیطان رقص کر رہا تھا۔ "ایک بڑی رشوت! ایک گراں بہا انعام محافظ سے اس کا ایمان خرید سکتا ہے۔ زہر کے چند قطرے آفریدی کے دل و جگر کو کاٹ دیں گے اور پھر وہ خون تھوکتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔" رام دیو نے بڑی عیاری کے ساتھ سنگدلانہ منصوبہ پیش کیا۔

"گیانی! تیری تجویز معقول ضرور ہے مگر اس پر اتنی آسانی سے عمل نہیں کیا جا سکتا۔" ملک کافور جھنجلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ "آفریدی کی غیر فطری موت پر لوگ چونک بھی سکتے ہیں اور پھر سلطان کی بارگاہ میں احتجاج بھی کر سکتے ہیں۔"

"یہ تیرا خیال ہے گوپی رام! اس بدنصیب کی لاش پر ماتم کرنے کیلئے کون آئے گا ؟" رام دیو انتہائی بے شرمی کے ساتھ ہنسا۔

"وہی بوڑھا شاعر جس نے آفریدی کو موت کے پنجوں سے نکال لیا۔" ملک کافور نے امیر خسروؒ کا ذکر بڑے ناپسندیدہ انداز میں کیا۔ "وہی اس کی لاش اٹھا کر سلطان کے سامنے لے جائے گا اور پھر انصاف طلب کرے گا۔ داروغۂ زنداں سے بازپرس ہوگی کہ آفریدی کو زہر آلود کھانا کس نے پہنچایا ؟ کس میں اتنی ہمت ہے کہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس رازداری کا بھرم رکھ سکے۔"

رام دیو حیرت سے ملک کافور کی طرف دیکھنے لگا۔ نوعمری کے باوجود اس کا ذہن بڑے بڑے جہاندیدہ

انسانوں کے انداز میں سوچتا تھا۔ "اب تو بہت ہوشیار ہو گیا ہے گوپی رام!"

"میری ہوشیاری پر لعنت بھیج گیانی!" ملک کافور یکایک غضبناک نظر آنے لگا تھا۔ "آج سلطان نے آفریدی کی سزائے موت معاف کی ہے۔ کل قید کی سزا بھی معاف کی جا سکتی ہے پھر اگر آفریدی باہر آ گیا تو میرے لئے بڑی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ اس کی موت کی تدبیر سوچ! ایسی تدبیر کہ میرا دامن بے داغ رہے۔"

رام دیو نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے عیار ذہن کو گردش دینے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے ملک کافور سے پوچھا۔ "کیا تمہارے یہاں ایسے مجرم نہیں ہوتے جنہیں زہر دے کر ہلاک کیا جاتا ہے۔"

"سلطان کے قانون میں زہر دے کر مارنے کی کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی ہے۔" ملک کافور نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ہاں! کبھی کبھی ایسے مجرم بھی سامنے آئے ہیں جن کی موت کا الزام سلطان اپنے سر نہیں لینا چاہتے۔ انہیں آہستہ آہستہ قتل کیا جاتا ہے۔"

"وہ کس طرح ؟" رام دیو نے چونک کر پوچھا۔

"ایسے مجرموں کو قید کے دوران افیم کے پوست کا پانی دیا جاتا ہے۔ اس پانی سے مجرم فوری طور پر نہیں مرتے۔ آہستہ آہستہ وہ نشے کے عادی ہو جاتے ہیں پھر یہی پانی ان کے جسموں کو کھوکھلا اور دماغوں کو شل کر دیتا ہے۔ مجرموں کی بھوک بالکل ختم ہو جاتی ہے اور اتنے لاغر ہو جاتے ہیں کہ ٹانگیں بدن کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن انہیں موت آ جاتی ہے۔ عام رعایا سمجھتی ہے کہ وہ اپنی طبعی موت مرے ہوں گے مگر حقیقتاً افیم کا قاتل پانی انہیں چاٹ لیتا ہے۔ بالفرض کوئی سخت جان مجرم قید سے چھوٹ بھی جائے تو اس کی زندگی ایک عذاب بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپاہجوں کی طرح اپنے گھر میں منہ چھپائے پڑا رہتا ہے اور اس کا عادی جسم ہمہ وقت افیم جیسی نشہ آور شے مانگتا رہتا ہے۔ اس طرح دونوں حالتوں میں اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اور حکومت پر کوئی الزام نہیں آتا۔" ملک کافور نے سیاست کے ایک اہم ترین راز کو فاش کرتے ہوئے کہا۔

رام دیو کے چہرے پر ناقابل بیان خوشی کا عکس ابھر آیا۔ "علی عامر آفریدی کو بھی اسی طرح مارا جائے گا۔ سلطان کی زندگی تک تو وہ قید سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ یہ طویل عرصہ ہمارے منصوبے کی کامیابی کیلئے بہت زیادہ ہے گوپی رام۔"

ملک کافور داروغۂ زنداں کے بارے میں غور کرنے لگا جو ایک ترکی سردار سلیمان بن یوسف تھا۔ یہ سردار اپنے اصولوں کا بہت سخت اور ایک باکردار انسان تھا۔ "سلیمان بن یوسف کو اتنی آسانی سے نہیں خریدا جا سکتا۔" ملک کافور نے پریشان لہجے میں کہا۔ "افیم کے پانی کو آفریدی کے جسم پر آزمایا جا سکتا ہے مگر یہ پانی اس کے حلق میں کون ٹپکائے گا۔"

"اگر داروغۂ زنداں سخت گیر ہے تو اس کے نائب بزدل ہوں گے۔" رام دیو نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔ "سلیمان بن یوسف تو قید خانے پر پہرہ نہیں دیتا۔ ہمیں ان سپاہیوں سے کام لینا ہوگا جو قیدیوں کو کھانا فراہم کرتے ہیں۔" ملک کافور نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ "ہاں! یہ ممکن ہے۔" اس کے ساتھ ہی علی عامر آفریدی کے خلاف ایک نئی سازش کا آغاز ہو گیا



دوسری طرف کوتوال علاء الملک بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک زمانہ آشنا انسان تھا۔ اپنے

تجربات کی روشنی میں اسے یہ بات صاف نظر آرہی تھی کہ جاں بخشی کے باوجود علی عامر آفریدی خطرات سے محفوظ نہیں تھا۔ ملک کافور کے بڑھتے ہوئے اثرات کسی وقت بھی رنگ لا سکتے تھے۔ ان ہی اندیشوں کے پیش نظر علاء الملک نے امیر خسروؒ سے ملاقات کی۔

"امیر! خدا آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ کی کوششوں سے ایک بے گناہ انسان کو نئی زندگی مل گئی۔" علاء الملک اس طرح امیر خسروؒ کا شکریہ ادا کر رہا تھا جیسے علی عامر آفریدی خود اسی کا بیٹا ہو۔

"نہیں علاء الملک! کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو آفات و مصائب سے نہیں بچا سکتا۔" امیر خسروؒ کا لہجہ بہت عاجزانہ تھا۔ "خدا کے یہاں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ ابھی آفریدی کی موت نہیں آئی تھی اس لئے دستِ قضاء اس کی روح تک نہیں پہنچ سکا۔"

"مگر مجھے اب بھی محسوس ہو رہا ہے کہ دشمنوں کے سائے آفریدی کے تعاقب میں ہیں۔" علاء الملک نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی آفریدی کو آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔"

پھر ایک طویل گفتگو کے بعد امیر خسروؒ نے علاء الملک کو یقین دلایا کہ وہ اس امکانی سازش کو روکنے کی کوشش کریں گے۔ کوتوال شہر رخصت ہوا تو امیر خسروؒ داروغۂ زنداں سلیمان بن یوسف سے ملاقات کیلئے تشریف لے گئے۔

ترکی سردار امیر خسروؒ کی آمد پر حیران رہ گیا۔ سلیمان بن یوسف حضرت نظام الدین اولیاؒ کا بے حد عقیدت مند تھا اور اسی حوالے سے وہ امیر خسروؒ کا بھی بہت احترام کرتا تھا۔

"امیر! آپ نے کس لئے زحمت کی؟ کسی بھی خدمت گار کے ذریعے مجھ تک پیغام پہنچا دیتے، میں خود حاضر ہو جاتا۔" سلیمان بن یوسف شرمسار نظر آرہا تھا۔

امیر خسروؒ نے ترکی سردار کی نیازمندی سے متاثر ہوتے ہوئے فرمایا۔ "غرض تو میری ہی تھی، پھر تم کیوں آتے؟" یہ کہہ کر امیر خسروؒ نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

سلیمان بن یوسف کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ ابھر آیا۔ "امیر! آپ کی سفارش کے بعد آفریدی بھی میرے لئے محترم ہو گیا ہے۔ اگر سلطان ہی کی طرف سے کوئی دوسرا حکم جاری ہو جائے تو مجھے مجبور سمجھ کر معاف کر دیجئے گا۔ ورنہ جہاں تک قید خانے کے اندر کسی سازش کا سوال ہے تو میں اس کے امکان کو بھی باقی نہیں رہنے دوں گا۔ میری موجودگی میں اس بدذات ملک کافور کا ہاتھ آفریدی کے دامن کو بھی نہیں چھو سکتا۔"

"مگر تم ہر وقت موجود نہیں رہو گے۔" امیر خسروؒ نے اپنا اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"آج کے بعد میری موجودگی اور عدم موجودگی برابر ہوگی۔ امیر!" سلیمان بن یوسف نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "میں قید خانے کے ایک ایک محافظ سپاہی کو تنبیہ کر دوں گا۔"

امیر خسروؒ نے داروغۂ زنداں کے حق میں دعائے خیر کی اور واپس تشریف لے گئے۔

اس کے ساتھ ہی سلیمان بن یوسف نے تمام متعلقہ سپاہیوں کو طلب کر لیا۔ "اگر آفریدی کو ذرا بھی تکلیف پہنچی تو تم سب اس کے ذمے دار ہو گے۔" سلیمان کا لہجہ غضب ناک تھا۔ "میں اس سلسلے میں کوئی معذرت نہیں سنوں گا۔ اگر آفریدی کے جسم پر ایک خراش آئی تو میں تمہارے بدن پر بے شمار زخم ابھار دوں گا۔" قید خانے کے نگراں سپاہی لرزنے لگے۔ انہوں نے اپنے افسر کو آج تک اس قدر غصے کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ "اور اگر کسی نے چند سکوں کے لالچ میں آفریدی کو زہر دیا تو یہ جرم تم سب

کے سر جائے گا۔ پھر اس کی سزا صرف تمہاری ذات تک محدود نہیں ہوگی پہلے تم اپنے اہل خانہ کو اپنی آنکھوں سے زہر پی کر مرتے ہوئے دیکھو گے اور اس کے بعد تمہاری دنیا خراب کر دی جائے گی۔ آخرت کی خبر خدا جانے کہ وہ بڑی سخت جگہ ہے۔" سلیمان بن یوسف نے تمام سپاہیوں کو اس طرح تنبیہ کی تھی کہ ہر شخص اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگا تھا۔

☆..........................☆..........................☆

جب قصر ہزار ستون کی ایک کنیز نے نرملا کماری کو علی عامر آفریدی کی جاں بخشی کی خبر سنائی تو کچھ دیر کیلئے اس کی حالت غیر ہو گئی۔ اچانک خوشی سے اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پھر اس کی کشادہ اور غلافی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ نرملا کی وہی کیفیت تھی جو پہلی بارش کے چھینٹوں سے دھوپ میں تپتی ہوئی زمین کی ہو جاتی ہے۔ سنسناہٹ کی سی آوازیں ابھرتی ہیں، پانی اور مٹی کے ملاپ سے بخارات اٹھتے ہیں اور پھر ہر طرف ایک عجیب سی سوندھی خوشبو پھیل جاتی ہے۔ نرملا کماری بھی اسی جلتی ہوئی مٹی کی مانند تھی جسے پانی کی تیز پھوار نے ناقابل بیان لذت کا احساس بخشا تھا۔ پھر جب شاہی کنیز نے اسے یہ بتایا کہ سلطان کی زندگی تک آفریدی زنداں کے اندھیروں میں گم رہے گا تو نرملا کی مایوسیاں دوبارہ لوٹ آئیں۔ پانی کے چند قطرے جلتی ہوئی مٹی کی پیاس نہ بجھا سکے اور خود ہی غبار بن کر اڑ گئے۔ نرملا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے کنیز کو اس طرح دیکھنے لگی جیسے وہ مقدر کی ستم ظریفیوں کا گلہ کر رہی ہو ؎

تغافل سے جو باز آیا، جفا کی
تلافی کی بھی تو ظالم نے کیا کی

بعد میں کنیز نے نرملا کو یہ بھی بتا دیا کہ اگر امیر خسروؒ مداخلت نہ کرتے تو اب تک آفریدی قتل ہو چکا ہوتا۔ اس عرصے میں نرملا سنبھل گئی تھی اس نے باوقار انداز میں کنیز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر امیر بھی ایسا نہ کرتے تو پھر کون کرتا؟ وہ بڑے انسان ہیں۔ شاید ان ہی کی دعاؤں سے سلطان کا اقتدار قائم ہے ورنہ اس کی سلطنت کا بھی وہی حشر ہوتا جو رتن سنگھ کے راج پاٹ کا ہوا ہے۔ یہاں بھی ظلم کا وہی انداز ہے جسے میں نے چتوڑ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مقامات بدل گئے مگر ظلم کی فطرت نہیں بدلی۔" نرملا کماری اپنے دل کا غبار دھو ڈالنا چاہتی تھی مگر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ وہ کنیز تو خود مسلا ہوا پھول ہے، اسے کلیوں کی شادابی سے کیا دلچسپی ہوگی۔ غلامی انسان کا ضمیر تک بدل دیتی ہے پھر اس کے سینے میں کوئی احساس باقی نہیں رہتا۔

شاہی کنیز واپس جانے لگی تو نرملا کماری نے پکار کر کہا۔ "اپنے سلطان تک میرا پیغام پہنچا دو کہ مہامنتری وکرم سنگھ کی بیٹی ان کے سامنے حاضر ہو کر کچھ عرض کرنا چاہتی ہے۔"

کنیز رک گئی اور آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی نرملا کماری کے قریب آگئی اس سے پہلے اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ "میں آپ کی ہمدرد ہوں۔ میری بات پر اعتبار کیجئے کہ یہاں کی فضا آپ کے حق میں نہیں ہے۔" شاہی کنیز کا لہجہ اس قدر غمگسارانہ تھا کہ نرملا کماری کو چونک جانا پڑا۔ "سلطان کو سیاسی ہنگاموں کے سبب اتنی فرصت نہیں کہ وہ اتنی معمولی معمولی باتوں پر دھیان دے سکیں اگر آپ..........۔"

نرملا کماری ایک بار پھر بکھر گئی۔ "یہ معمولی باتیں ہیں؟ ان کی رعایا کا ایک فرد موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے اور حاکم کو خبر بھی نہیں کہ اس پر کیا گزر رہی ہے؟ کیا وہ میری فریاد اس وقت سنیں گے جب میں تباہ کر دی جاؤں گی؟" نرملا نے تیز لہجے میں کہا۔ اس کی آواز بہت زیادہ بلند ہو گئی تھی۔

"آہستہ بولیں راج کماری!" شاہی کنیز نے گھبرا کر کہا۔ "اس کمرے کی دیواریں' دروازے' پتھر' لکڑیاں' شیشے' یہاں تک کہ ہر ذرہ سلطان کا جاسوس ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بتا دیں۔ میں کسی ایسے وقت میں جب شہنشاہ مہربان ہوں گے آپ کی درخواست پیش کر دوں گی۔ مجھ سے زیادہ یہاں آپ کا غمگسار کون ہو گا کہ میں خود بھی ایک عورت ہوں جسے گردشِ وقت نے بہت ستایا ہے۔" یہ کہتے کہتے کنیز مہرخانم کی آنکھوں میں سارے جہاں کی اداسیاں سمٹ آئیں اور آواز سے رقت جھلکنے لگی

نرملا کماری نے ایک نظر اس ستم رسیدہ لونڈی کو دیکھا اور پھر آہستہ لہجے میں کہنے لگی۔ "میں سلطان کے طرزِ حکومت کی بات نہیں کرتی کہ وہ جابرانہ ہے یا غاصبانہ ؟ مجھے تو اس پر اعتراض ہے کہ جب بے شمار بندگانِ خدا کی کفالت کا ذمہ لیا ہے تو پھر یہ بے خبری کیوں ؟ اگر کوئی ایک شخص بھی سرِ راہ بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جائے تو اس کی موت کا ذمہ دار سلطان ہے۔ اگر کسی ملک کا حکمراں یہ ذمہ داری قبول نہیں کرتا تو رعایا کی گردنوں میں پڑا ہوا طوقِ غلامی کاٹ دے اور انہیں آزاد کر دے پھر وہ خدا کی اس وسیع و عریض زمین میں کہیں بھی سما جائیں گے۔"

"آپ اپنی بات کریں راج کماری!" کنیز مہرخانم نے اس جذباتی لڑکی کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "کس کس کے زخم دیکھیں گی ؟ یہاں تو ہر سینہ فگار ہے۔"

"کیا کروں ؟ دل ہی ایسا بنایا گیا ہے۔" نرملا کے لہجے کی سرکشی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ "اگر صرف اپنی ذات کا غم ہوتا تو آفریدی کے ساتھ سب کچھ چھوڑ کر دہلی کیوں چلی آتی ؟"

"گستاخی معاف راج کماری! آپ نے ایک غلط مرد کا انتخاب کیا۔" مہرخانم نے پہلی بار نرملا کے ذاتی مسئلے کو چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔

نرملا چونک کر اس کنیز کو دیکھنے لگی جو بڑے ہوش کی باتیں کر رہی تھی۔ رانی کنولا دیوی (ملکۂ جہاں) نے بھی آفریدی کے بارے میں اسی رائے کا اظہار کیا تھا۔

"اور اس میں آپ کا بھی کیا قصور کہ یہاں سارے مرد ہی ایسے ہیں۔" کنیز مہرخانم نے گفتگو کا زاویہ بدلا۔ "جہاں کسی کو موقع ملتا ہے' نسوانی وقار پامال کر ڈالتا ہے۔ عورت بھی مردوں کی سیاست کے کھیل کا ایک حصہ ہے۔ جب یہ کھیل ختم ہو جاتا ہے' عورت بھی فنا ہو جاتی ہے کاش! آپ فریبِ نظر میں جتلا نہ ہوتیں۔"

مہرخانم کی باتیں سن کر ایک بار پھر نرملا کماری کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں اور دل میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی جس نے راجپوت زادی کو بے قرار کر دیا۔ "بس! بہت ہو چکا۔" نرملا کا لہجہ ناخوشگوار تھا۔ "میں اپنے ذاتی مسئلے میں کسی کو مداخلت کی اجازت نہیں دیتی۔ اپنے الفاظ کا یہ مرہم کسی اور کیلئے رہنے دے کہ تیرے بقول یہاں ہر عورت زخمی ہے۔" نرملا نے غیر معمولی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا اور آفریدی کو ایک کنیز کے ہاتھوں ذلیل و رسوا ہونے سے بچا لیا۔

"میں پہلے ہی راج کماری سے معافی کی درخواست کر چکی ہوں۔" مہرخانم نے ایک اور زاویہ بدلا۔ "آپ کی تنہائی دیکھ کر دل بھر آیا تھا ورنہ میں نے تو اتنے ہولناک مناظر دیکھے ہیں کہ سر سے پاؤں تک پتھر کی ہو کر رہ گئی ہوں۔ اب اگر کوئی لڑکی خون بھی روئے تو مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آپ کی بات کچھ اور تھی راج کماری! بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں' اچھے دن دیکھے تھے' ایک بہادر قوم پر حکمرانی کی تھی' اس لئے کچھ راز کی باتیں کہہ ڈالیں۔ آئندہ ہونٹوں کو جنبش تک نہیں دوں گی۔" کنیز مہرخانم بہت زیادہ جذباتی

نظر آنے لگی تھی۔

نرملا کو ندامت کا احساس ہونے لگا۔ اس نے اپنی ایک ہمدرد عورت کے ساتھ جارحانہ سلوک کیا تھا۔ "مجھے معاف کر دے مہرخانم کہ میں تجھے پہچان نہیں سکی تھی۔" نرملا نے اپنی خاندانی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور اس کنیز سے معافی مانگ لی جو قصرِ ہزار ستون میں ایک حقیر ترین کھلونے کی حیثیت رکھتی تھی۔

مہرخانم نے آگے بڑھ کر نرملا کماری کے پاؤں پکڑ لئے۔ "بے شک! آپ عظیم ہیں راج کماری! میں نے آج تک اتنے بڑے دل کی عورت نہیں دیکھی۔ میں آپ کی عظمتوں کو سلام کرتی ہوں۔" مہرخانم کا لہجہ بہت اثر انگیز تھا۔

نرملا کماری نے اپنے پاؤں کھینچ لئے۔ "قبولِ اسلام سے پہلے یہ رسمیں بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں مگر اب ان سے نفرت ہو گئی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو کس لئے سجدہ کرے۔ مساوات کا دعویٰ ہے تو لوگ برابری سے کیوں نہیں ملتے ؟ اور پھر تو بھی تو مسلمان ہے۔"

مہرخانم سیدھی ہو گئی۔

"اگر سلطان مجھے حاضری کی اجازت نہیں دے سکتے تو پھر ان تک میرا پیغام پہنچا دے کہ مجھے شاہی محل کے بجائے امیر خسروؒ کے یہاں منتقل کر دیا جائے۔ میں اس کمرے میں اپنے آپ کو بہت غیر محفوظ سمجھتی ہوں۔ میں اپنا حالِ دل کسی سے بیان کرنا نہیں چاہتی تھی مگر تیری غمگساری دیکھ کر مجبور سی ہو گئی۔ اب کس سے کہوں کہ چتوڑ کا مقتل چھوٹا تو دہلی کا قہر کدہ میرا مقدر بن گیا۔"

کنیز مہرخانم نے نرملا کماری کو اپنے تعاون کا یقین دلایا اور ادب و احترام کا مظاہرہ کرتی ہوئی چلی گئی۔

نرملا' آفریدی کی طرف سے اپنے ذہن کو صاف رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی مگر شاہی کنیز نے الزام تراشی کر کے نئے اندیشوں کی ایک اور فصل بو دی تھی .... اب نرملا کو اس بات پر یقین سا آنے لگا تھا کہ اتنے لوگ جھوٹ نہیں بول سکتے۔

"کاش! یہ سب کچھ غلط ہوتا۔" نرملا بدحواس ہو کر چیخنے لگی .... تنہا کمرے میں وہ اپنی ہی آوازوں کی بازگشت سن رہی تھی۔ "آفریدی! کاش! تو چتوڑ نہ آیا ہوتا۔"

☆..................☆..................☆

نرملا کے کمرے سے جانے کے بعد کنیز مہرخانم ملک کافور کے پاس پہنچی اور اسے تمام باتیں تفصیل سے بتا دیں .... دراصل مہرخانم ملک کافور ہی کی جاسوسہ تھی جو بیگمات شاہی کی مخبری کر کے ساری اطلاعات سلطان کے خواجہ سرا غلام کو فراہم کرتی تھی۔ مہرخانم کا تعلق گجرات کے ایک نیچ ہندو خاندان سے تھا۔ علاء الدین کے قبضے کے بعد جہاں اور قیدی گجرات سے دہلی آئے تھے وہاں مہرخانم بھی مسلمانوں کے دارالحکومت چلی آئی تھی اور بہتر مستقبل کی تلاش میں اس نے اپنا آبائی مذہب تبدیل کر دیا تھا۔ مسلمان ہونے سے پہلے اس کا نام کوشلیا تھا پھر اس نے وقت کے تقاضوں کے مطابق ایک خوبصورت نام "مہرخانم" تراش لیا۔ اگرچہ رانی کنولا دیوی بھی قصرِ ہزار ستون میں ملکۂ جہاں کی حیثیت سے موجود تھی لیکن مہرخانم کو اپنی سابقہ مہارانی سے شدید نفرت تھی۔ گجرات کے راجپوتوں نے مقامی اچھوتوں پر جو ستم ڈھائے تھے ان کی تلخ یادیں ابھی تک مہرخانم کے دل و دماغ میں محفوظ تھیں اور اسی فطری نفرت نے اچھوت عورت کو ملک کافور کے حلقے تک پہنچا دیا تھا۔ اب مہرخانم محض اس لئے سکون کی زندگی گزار رہی تھی کہ وہ شاہی

حرم سرا کے بعض راز ملک کافور تک پہنچا دیا کرتی تھی جس کے صلے میں اسے خفیہ انعام واکرام سے نواز دیا جاتا تھا۔

آج مہر خانم بہت اہم خبر لے کر آئی تھی۔ ملک کافور ہر سطح پر علی عامر آفریدی کو اذیت میں مبتلا رکھنا چاہتا تھا۔ شائستہ بیگم اور عالیہ کو زندہ جلا دینے کے بعد اب نرملا کماری اس کے انتقام کا ہدف تھی وہ بہت دن سے آفریدی کی محبوبہ کے بارے میں منصوبے بنا رہا تھا مگر اب تک کوئی موقع اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ مہر خانم کی فراہم کردہ نئی اطلاع کے بعد ملک کافور کو اپنی کامیابی کا دھندلا سا امکان نظر آنے لگا۔ وہ اس بیباک راجپوت زادی کی گستاخانہ گفتگو کو بنیاد بنا کر سلطان کو نرملا کماری کی طرف سے بدگمان کر سکتا تھا اور پھر یہی بدگمانی کوئی بھیانک رخ بھی اختیار کر سکتی تھی۔ اسی امید کے پیش نظر ملک کافور، رام دیو سے مشورہ کرنے کیلئے اس کے کمرے میں پہنچا۔

تمام واقعہ سننے کے بعد رام دیو خوشی سے رقص کرنے لگا اور پھر وحشیانہ انداز میں ملک کافور سے بولا۔
"گوپی رام! تو جانتا ہے کہ اس لڑکی کے باپ مہامنتری وکرم سنگھ نے مجھے کتنے آزار پہنچائے ہیں ؟"
ملک کافور سوالیہ نظروں سے رام دیو کی طرف دیکھنے لگا۔
"گوپی رام! میں نے دیوتاؤں کے سامنے قسم کھائی تھی کہ اس خاندان کا نام ونشان تک مٹا دوں گا۔" رام دیو حالتِ غضب میں بول رہا تھا۔ "اس کا باپ وکرم سنگھ میرے عتاب کا نشانہ بنا.......... میں نے راجہ رتن سنگھ کے ذریعے اسے ایسی دردناک سزا دلوائی.......... پھر میرے قہر کی آگ نے "منتری بھون" کو جلا کر راکھ کر دیا.......... میری ہی وجہ سے رانی پدمنی شعلوں کی خوراک بن گئی اور راجہ رتن سنگھ قصر ہزار ستون کے ایک ویران گوشے میں غلاموں کی طرح لعنت زدہ زندگی بسر کر رہا ہے.......... اس کے خاندان کی بس ایک نشانی باقی رہ گئی تھی.......... آج دیوتاؤں نے اسے بھی میری گرفت میں دیدیا.......... مجھے کچھ نہیں چاہئے گوپی رام! اس لڑکی کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔"
"میں تیری بات نہیں سمجھا گیانی!" ملک کافور نے چونک کر کہا۔
"فاتح عالم سے کہہ کر نرملا کو میری کنیزوں کے حلقے میں داخل کرا دے۔" رام دیو، ملک کافور کے سامنے کسی بھکاری کی مانند گڑگڑانے لگا۔ "وکرم سنگھ تو زندہ نہیں رہا مگر میں اس کی بھٹکتی ہوئی روح کو یہ منظر دکھانا چاہتا ہوں کہ مہامنتری کی بیٹی کے جسم پر مجھے مکمل قابو حاصل ہے۔" رام دیو نے کسی جھجک کے بغیر اپنی غلیظ ترین خواہش کا اظہار کر دیا۔
ملک کافور قہقہہ مار کر ہنسا۔ "کیا تو نرملا سے شادی کرنا چاہتا ہے بوڑھے گیانی ؟ ؟"
"نہیں! گوپی رام! ہرگز نہیں۔" رام دیو ہذیانی انداز میں بولا۔ "شادی تو ایک مقدس رشتہ ہے، میں وکرم سنگھ کی بیٹی کیلئے اپنے دل میں تقدس کا شائبہ تک نہیں پاتا.......... وہ انتقام کی آگ میں اس وقت تک جلے گی جب تک خود میرے سینے کی تپش ختم نہیں ہو جاتی۔" رام دیو کی روح میں پوشیدہ تمام تر خباثتیں عود کر آئی تھیں۔
"یہ کیسے ممکن ہو گا گیانی ؟" ملک کافور سوچنے لگا۔
"گوپی رام! تجھے بڑی قربت حاصل ہے۔ سلطان کو نرملا سے بدظن کر دے۔" رام دیو نے پرجوش لہجے میں کہا۔
"وہ کس طرح گیانی! اپنے منصوبے کی وضاحت کر۔" ملک کافور، رام دیو کی باتیں سمجھنے سے عاجز تھا۔

"تو نہیں جانتا گوپی رام کہ اس بیہودہ لڑکی نے جشنِ فتح کے موقع پر کس قدر گستاخانہ لہجے میں سلطان سے گفتگو کی تھی۔" رام دیو نے ماضی کی داستان کا ایک ورق پلٹتے ہوئے کہا۔ "سلطان نے اس وقت درگزر سے کام لیا تھا لیکن مہر خانم کی اس اطلاع کے بعد فاتح عالم نرملا کو معاف نہیں کریں گے تو سلطان سے صاف صاف کہہ دے کہ یہ پارسا راجپوت زادی قصر ہزار ستون کو دنیا کی بدترین ہوس گاہ سمجھتی ہے اور سلطان سے یہ بھی کہہ دے کہ نرملا، سلطان کے نظامِ انصاف کا مذاق اڑاتی ہے اور یہ بھی کہہ دے کہ اسے سلطان کے بخشے ہوئے تحفظ پر اعتبار نہیں ہے۔"
ملک کافور کی آنکھوں میں ناقابل بیان خوشی کی چمک ابھر آئی۔
"سلطان کی سماعتوں میں زہر بھرنے کے بعد تجویز پیش کر دینا کہ وکرم سنگھ کی بیٹی، رانی پدمنی کا نعم البدل ہے۔" رام دیو کا شیطانی دماغ مختلف سمتوں میں گردش کر رہا تھا۔
ملک کافور بوڑھے شعبدہ باز کو ایک بار پھر حیرت سے دیکھنے لگا۔
"سلطان کی دلی خواہش تھی کہ رانی پدمنی ان کے حرم میں داخل ہو جائے مگر قسمت نے یاوری نہیں کی۔" رام دیو بڑی ذہانت سے ملک کافور کو اکسا رہا تھا۔ "نرملا کماری بھی پدمنی کی حقیقی چچازاد بہن ہے۔ دونوں ایک دادا کی اولاد ہیں۔ پدمنی نہ سہی نرملا کماری سہی۔ اس طرح فاتح عالم کے ان زخموں کا مداوا ہو جائے گا جو ناکامی کی صورت میں شاہ کے دل پر ابھر آئے ہیں۔ سلطان نے غور سے نہیں دیکھا، نرملا بھی پدمنی ہی کی طرح توبہ شکن حسن رکھتی ہے۔"
ملک کافور کو رام دیو کی یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ وہ ایک زمانہ میں پدمنی کو اپنی رقیب سمجھ کر مہارانی چتوڑ سے نفرت کرنے لگا تھا پھر پدمنی جل کر خاک ہو گئی تو ملک کافور نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ اب رام دیو، نرملا کی شکل میں ایک اور رقیب پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "نہیں گیانی! یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں ہو گا۔" ملک کافور نے اپنے جذبۂ حسد کو چھپاتے ہوئے کہا۔
"میں جانتا ہوں کہ سلطان انکار کر دیں گے۔" رام دیو نے مطمئن لہجے میں کہا۔ "شاہ کے انکار کے بعد ہی ہماری کامیابیوں کا آغاز ہو جائے گا اور نرملا میری لونڈی بن جائے گی تو فاتح عالم سے اس راجپوت زادی کو مانگ لینا۔"
"میں ؟" ملک کافور کا چہرہ مسخ ہو گیا اور بار ندامت سے گردن جھک گئی۔
رام دیو کو فوراً احساس ہو گیا کہ اس نے نادانستگی میں ملک کافور کو ایک ایسی گالی دے دی تھی جو شاہی خواجہ سرا کیلئے ناقابل برداشت تھی۔ چتوڑ کے شعبدہ باز نے بگڑی ہوئی بات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "نرملا، آفریدی کی محبوبہ ہے اور آفریدی تیرا بدترین دشمن۔ کیا تو نہیں چاہتا کہ تیرے دشمن کی قبائے آبرو چاک ہو جائے پھر یہ خبریں قید خانے میں پہنچیں اور وہ افغان سردار شدتِ غم سے گھبرا کر خودکشی کر لے۔" رام دیو نے اچانک لہجہ بدل کر ملک کافور کے جذبات پر ایک اور کاری ضرب لگائی تھی۔ "یہ آفریدی کیلئے کتنی دردناک سزا ہو گی کہ نرملا تیری کنیز بن جائے، تیرے جوتوں کو صاف کرے اور تیرے لئے شراب کے جام بھرے.......... گوپی رام! ان مناظر کو تصور کی آنکھ سے دیکھ کہ ایسے مناظر تو انسانی تاریخ میں بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔"
ملک کافور تذبذب کا شکار نظر آ رہا تھا۔

"پھر میرا ہاتھ آسانی کے ساتھ نرملا کے گریبان تک پہنچ جائے گا۔" رام دیو نے اپنے شرمناک منصوبے

کا آخری گوشہ بھی بے نقاب کر دیا۔ "اگر نرملا بوڑھے شاعر کے یہاں چلی گئی تو پھر تمام عمر کفِ افسوس ملتا رہے گا۔ آگے بڑھ اور اپنے دشمن کے چہرے پر ذلتوں کی ایسی سیاہی مل دے کہ اس کی موت بھی ان دھبوں کو دور نہ کر سکے۔"

ملک کافور بہت دیر تک ذہنی کشمکش سے دوچار رہا۔ وہ نرملا کو کنیز بنانے سے گریزاں نہیں تھا۔ یہ تو اس کی دلی تمنا تھی کہ وہ آفریدی کو ہر سطح پر رسوا کرے اور اذیتیں پہنچائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ ڈرتا تھا کہ کہیں سلطان، نرملا کو شاہی حرم میں داخل نہ کر لیں اور پھر اس کی شہ رگ کے قریب ایک نیا خطرہ پرورش پانے لگے۔ ملک کافور اس بات سے بھی ہراساں تھا کہ اگر نرملا امیر خسروؒ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو پھر انتقام کا یہ موقع ہمیشہ کیلئے اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ملک کافور ہر پہلو پر غور کر رہا تھا اور اس دوران رام دیو اسے بار بار ایک ہی ترغیب دے رہا تھا یہاں تک کہ شاہی خواجہ سرا نے یہ خوفناک بازی کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆.................☆.................☆

نصف شب کے قریب ملک کافور علاءالدین کی خدمت میں حاضر تھا اور سلطان کے قدموں سے لپٹا ہوا گریہ وزاری کر رہا تھا۔ "شاہ! میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں کہ حضور کے جوتوں سے لپٹی ہوئی دھول ہوں۔ مگر اہل دربار نے آپ کے اس اقدام کا اچھا تاثر قبول نہیں کیا ہے۔"

علاءالدین خلجی بھڑک اٹھا۔ "کیا ہمارے احکام رعایا کی خواہشات کے پابند ہیں؟"

"نہیں فاتح عالم۔" پہلی بار ملک کافور نے رام دیو کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

علاءالدین نے چونک کر اپنے محبوب غلام کی طرف دیکھا۔

"ساری دنیا آپ کے جذبات کی غلام ہے۔" ملک کافور نے خوشامد کا آہن تیز تر کر دیا۔ "میں تو شاہ کے اس رعب و جلال کی بات کر رہا ہوں جسے آفریدی کی بے ادبی نے مجروح کر دیا ہے۔ بڑے بڑے امراء کی زبانیں حضور والا کے روبرو لڑکھڑانے لگتی ہیں مگر دربار کی اس رسم کو آفریدی نے پامال کر ڈالا۔"

"ہم مجبور تھے ملک؟" علاءالدین نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔ "امیر خسروؒ نے اس احسان فراموش کی سفارش کی تھی نتیجتاً ہمیں اپنے حکم کو بدل دینا پڑا۔ ہم آفریدی کو بڑی عبرتناک سزا دیتے مگر خسروؒ درمیان میں تھے اور خسروؒ کی ناراضگی ہم سے برداشت نہیں ہوتی۔"

"اور اس غلام کا کیا ہو گا جس کی پوری ذات رعایا کی نظروں میں ایک گالی بن کر رہ گئی ہے۔" ملک کافور نے علاءالدین کے قدموں پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ "شاہ والا کی بے پناہ نوازشات کے سبب تمام درباری پہلے ہی مجھ سے خفا تھے۔ آفریدی کی الزام تراشی کے بعد ہر شخص کی آنکھوں میں میرے لئے نفرت و انتقام کا ایک دریا موجزن ہے۔"

پھر سلطان نے دیکھا کہ ملک کافور رو رہا تھا۔ خلجی حکمران بے قرار ہو گیا۔ "ملک! اگر ساری دنیا بھی تیرے خلاف گواہی دے تو ہم اسے تسلیم نہیں کریں۔ تجھ سے زیادہ "سلطنت" خلجی" کا وفادار کوئی نہیں۔ ہم تیرے خلاف کھلنے والی زبانیں تو کاٹ سکتے ہیں مگر دلوں پر ہمیں اختیار نہیں۔ ہم لوگوں کے جذبات کو کس طرح کچلیں کہ ہمارے پاس ایسا کرنے کا کوئی جواز موجود نہیں۔ پھر بھی ہم تجھے سربلند رکھنے کیلئے عنقریب بڑا فیصلہ کرنے والے ہیں۔"

"کیا فیصلہ؟ حضور والا!" ملک کافور خوشی سے وارفتہ ہو گیا۔

وقت آنے پر تمام باشندگانِ ہند اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔" علاءالدین نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "یہ بات آئینِ سیاست کے خلاف ہے کہ ہم اپنے دل کا راز کسی سے کہہ ڈالیں۔ لیکن ملک! تو ہمارے فیصلے سے مطمئن ہو جائے گا۔ وہ تاریخ کا بڑا فیصلہ ہے بہت بڑا اور ہم اپنے جاں نثاروں کے حق میں ایسے ہی فیصلے کرتے ہیں۔"

"اور آفریدی کی اس گالی کا کیا ہو گا جو مجھے سلطان کے حوالے سے دی گئی ہے۔" ملک کافور نے سلطان کی اس وقتی سرشاری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو تیری خوش نصیبی ہے ملک کہ تجھے علاءالدین کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ سعادت تو آج تک کسی کو نہیں ملی تجھے ہماری نسبت پر ناز کرنا چاہئے۔"

ملک کافور نے دوبارہ علاءالدین کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ "اسی نسبت سے تو گجرات کا گوپی رام، دہلی کا ملک کافور ہے مگر پھر بھی آفریدی کا تصور مجھے سونے نہیں دیتا۔"

وہ تیرا کیا بگاڑ سکتا ہے ملک؟ ہم نے اسے زنداں کے اندھیروں میں گم کر دیا ہے۔" علاءالدین نے اپنے غلام کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "وہ تو انسانی تاریخ کا ایک شکستہ ورق ہے جسے انقلاب کی ہوائیں اڑائے لئے پھر رہی ہیں۔ عنقریب اس طرح بکھر جائے گا کہ اس کی پہچان تک باقی نہیں رہے گی۔"

"اگر آپ آفریدی کو میرے حوالے نہیں کر سکتے تو پھر اسے زہر دلوا دیجئے۔ اس کانٹے کی خلش مجھے چین سے جینے نہیں دیتی۔" آخر ملک کافور نے اپنے گھناؤنے ارادوں کو ظاہر کر دیا۔

"نہیں ملک! ہم امیر خسروؒ سے بدعہدی نہیں کر سکتے۔" علاءالدین نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "اپنی احمقانہ سوچ سے باز آ کہ آفریدی تجھے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔"

"فاتح عالم کی اسی نرم دلی نے حرم سرا کی کنیزوں کو بھی گستاخ بنا دیا ہے۔" ملک کافور کسی زخمی سانپ کی طرح پلٹا اور اس نے مہر خانم کی تمام باتیں سلطان کے گوش گزار کر دیں۔ "وہ راجپوت زادی نرملا اپنے آپ کو قصرِ ہزار ستون میں غیر محفوظ سمجھتی ہے اور شاہی لونڈیوں کے سامنے برملا کہتی ہے کہ یہ ہندوستان کی سب سے بڑی ہوس گاہ ہے۔" ملک کافور کے الفاظ کا زہر سلطان کی سماعت سے گزر کر دل تک پہنچ گیا۔

علاءالدین، نرملا کی گستاخ کلامی کے سبب پہلے ہی اس سے خفا تھا پھر مائی بھان متی کی تلخ ترین گفتگو نے اسے اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔ آفریدی کے حوالے سے بھی نرملا کماری اس کے نزدیک ایک انتہائی ناپسندیدہ عورت تھی اب مہر خانم نے شاہی محلات کے بارے میں راجپوت زادی کے خیالات بیان کئے تو علاءالدین غضبناک ہو گیا۔ اسی وقت کنیز مہر خانم کو طلب کر کے باز پرس کی گئی۔ مہر خانم، ملک کافور کی حمایت کے سبب مطمئن تھی اس لئے نرملا کماری کی باتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے لگی پھر بھی اس نے ملک کافور کی ہدایت پر درمیان سے امیر خسروؒ کا ذکر حذف کر دیا۔

سلطان نے جلتے ہوئے دل و دماغ کے ساتھ پورا واقعہ سنا اور مہر خانم کو ہاتھ کے اشارے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ تنہائی پاتے ہی ملک کافور نے ڈرتے ڈرتے رام دیو کے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔

"تخت و تاج لٹ گئے، گھروں میں آگ لگ گئی، کوچہ در کوچہ رسوائیاں ہوئیں مگر اس راجپوت لڑکی کا غرور نہیں گیا۔"

"نہیں ملک!" علاءالدین چیخ اٹھا "جلالِ شاہی کے سامنے کسی کا غرور برقرار نہیں رہتا۔ خدا کی قسم ہم عاجز و ناتواں نہیں ہیں۔ ہم نے اسے ایک مجبور لڑکی سمجھ کر چشم پوشی سے کام لیا تھا۔"

"پھر کم ظرفوں نے شاہ کی ایسی رعایت کو کمزوری کیوں نہ سمجھ لیا۔" ملک کافور' علاءالدین کی آتشِ غضب کو ہوا دے رہا تھا۔ "ایسی ناشکر گزار بدزبان عورتوں کا یہی حشر ہونا چاہئے کہ وہ آخری سانس تک حضور والا کی غلامی کریں۔" ملک کافور نے کہنے کو تو یہ بات کہہ دی تھی مگر وہ دل ہی دل میں خوفزدہ تھا کہ کہیں سلطان حقیقتاً نرملا کو اپنی کنیزوں کے حلقے میں شامل نہ کر لے۔

"نہیں ملک اب یہ ممکن نہیں۔" علاءالدین نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ "ہم عورتوں پر جبر نہیں کرتے۔ نرملا فوج کے ایک ادنیٰ سردار سے وابستہ رہ چکی ہے' اس لئے تیرے شاہ کے لائق نہیں۔"

ملک کافور کو اسی لمحے کا انتظار تھا بے قرار ہو کر بول اٹھا۔ "تو پھر غلام کے زخموں کا مداوا کر دیجئے۔"

علاءالدین زیرِ لب مسکرایا۔ "دنیا تجھ پر ہنسے گی ملک۔"

"مگر میں آفریدی سے انتقام لینے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔" ملک کافور' علاءالدین کے تلوؤں سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگا۔ "شاہ کی بلند اقبالی کا صدقہ غلام کو مایوس نہ کیجئے۔"

"جا تو بھی اپنے دل کی حسرت نکال لے۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ چتوڑ کی بوڑھی جادوگرنی اپنی بیٹی کو کس طرح بچاتی ہے؟" علاءالدین کے ہونٹوں سے آگ برسنے لگی تھی اور آنکھوں کے سامنے وہ منظر دوبارہ ابھر آیا تھا جب مائی بھان متی نے جشنِ فتح میں سلطان کو ذلیل کیا تھا اور ہندوستان کا باجبروت شہنشاہ انتہائی کوشش کے باوجود ایک نحیف و لاغر عورت کو اس کی گستاخیوں کی سزا نہیں دے سکا تھا۔ "ملک اس سرکش لڑکی کو بتا دے جو شخص ہمارے محافظ ہونے پر یقین نہیں رکھتا ہم بھی اس کی نگہبانی سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں۔"

ملک کافور نے علاءالدین کے قدموں کو بوسہ دیا اور جانے کیلئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "مگر یاد رکھنا ملک کہ اسے کوئی جسمانی آزار نہ پہنچے۔ ہم نے یہ فیصلہ تیری خواہش کے زیرِ اثر نہیں کیا ہے۔ ہم تو اسے صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب ہماری نظرِ کرم پھر جاتی ہے تو اعلیٰ خاندان کے لوگ بھی پنچ بن جاتے ہیں۔ انہیں غلاموں کی غلامی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ یہ اس کے جرم کی عارضی سزا ہے۔ جب وہ اپنے گناہ سے تائب ہو جائے گی تو ہم بھی اسے فراخدلی کے ساتھ معاف کر دیں گے۔"

ملک کافور نے رات کا آخری سجدہ ادا کیا اور علاءالدین کے عشرت کدے سے نکل کر چلا گیا۔

☆ .... ☆ .... ☆

دوسرے دن سرِشام کنیز مہرخانم نے نرملا کماری کو اطلاع دی کہ سلطان نے اس کی درخواست قبول کر لی ہے اور وہ آج رات ہی امیر خسروؒ کے مکان پر منتقل ہو جائے گی۔ نرملا کماری کو گہری طمانیت کا احساس ہوا۔ اب وہ اپنے آپ کو ایک آزاد شہری سمجھنے لگی تھی۔ پھر اندھیرا پھیلتے ہی مہرخانم نے نرملا کو چلنے کو کہا۔

راجپوت زادی اٹھی اور اپنی ایک ہم جنس پر اعتبار کر کے شاہی حرم سرا کی طویل راہداریاں طے کرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ مہرخانم اسے کئی پرپیچ راستوں سے گزارنے کے بعد قصرِ ہزار ستون کے مردانہ حصے میں لے آئی۔ یہ فریب کار لونڈی بڑی رازداری کے ساتھ ملک کافور کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

ملک کافور کا کمرہ محل کے آخری حصے میں واقع تھا۔ اس سے ملحقہ کمرے میں رام دیو رہتا تھا اور اس کے بعد محل کی حدود ختم ہو جاتی تھی یہ نہایت پرفضا مقام تھا کمروں کے عقبی دریچے دریائے جمنا کی طرف کھلتے تھے۔ رام دیو نے خاص طور پر سلطان سے اس جگہ کی درخواست کی تھی۔ وہ دن میں سب کے سامنے نماز ادا کیا کرتا تھا مگر سورج نکلتے ہی کمرے کے پچھلے حصے سے باہر آ کر سنگِ مرمر کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا تھا اور دل ہی دل میں "سورج دیوتا" کی پوجا کرتا تھا۔ رام دیو نے یہ کمرہ طلب کرتے وقت سلطان سے یہی کہا تھا کہ وہ یکسوئی کے

ساتھ ریاضت کرنا چاہتا ہے۔ شور و غل سے دور رہ کر اسے ستاروں کی چالیں سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی اور وہ سلطان کے اس خواب کی تعبیر بھی تلاش کر سکے گا جس کے تحت علاءالدین ساری دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ خلجی حکمران کو علمِ نجوم سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن جب سے رام دیو نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ ایک دن سلطان سارے عالم کو فتح کر لے گا اسی روز سے چتوڑ کا شعبدہ باز' علاءالدین کی نظروں میں اہمیت اختیار کر گیا تھا پھر اسی تاثر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رام دیو نے وہ کمرہ حاصل کر لیا جس کی دیواریں ملک کافور کے کمرے سے ملتی تھیں اس منافق برہمن کا یہی منصوبہ تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ملک کافور کے قریب رہ سکے اور اس خواجہ سرا غلام کے ذریعے خلجی حکومت کی جڑیں کھوکھلی کرتا رہے جو علاءالدین کی کمزوری بن چکا تھا۔

مہرخانم اس معصوم لڑکی کو لے کر کمرے میں داخل ہوئی جس کیلئے قصرِ ہزار ستون کا ہر راستہ اجنبی تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت نرملا کماری کی وہی کیفیت تھی جو برسوں کی قید کے بعد قفس سے چھوٹنے والے ایک پرندے کی ہوتی ہے۔ آج وہ اس شخص کی پناہ میں پہنچ گئی تھی جسے مائی بھان متی جیسی پارسا عورت نے بھی سلامِ عقیدت پیش کیا تھا مگر دوسرے ہی لمحے نرملا کے ہوش و حواس پر بجلی گر پڑی ملک کافور اس کے سامنے کھڑا تھا۔

نرملا کماری نے حیرت زدہ نظروں سے ملک کافور کی طرف دیکھا۔ مگر پھر فوراً ہی پلٹ کر مہرخانم سے مخاطب ہوئی۔ "یہ تو مجھے کہاں لے آئی نمک حرام کنیز۔"

"راج کماری! آپ نے مجھے غلط الزام دیا۔ میں تو جس کی خدمت گزار ہوں اسی کے نمک کا حق ادا کر رہی ہوں۔" مہرخانم نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "خوفزدہ نہ ہوں کہ آپ صحیح مقام پر آ پہنچی ہیں۔"

"لعنت زدہ عورت! تیری وہ ہمدردیاں اور غمگساریاں کیا ہوئیں؟" نرملا کماری سخت عالمِ طیش میں نظر آ رہی تھی۔

"وہ سب ایک فریب تھا۔" کنیز مہرخانم نے شرمناک لہجے میں کہا۔ جیسے وہ قصرِ ہزار ستون کی خادمہ نہ ہو' کسی بالاخانے کی عیار نائکہ ہو۔ "کیا اعلیٰ نسل لوگوں کو وہ دن یاد نہیں رہے جب انہوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں کی ایک بڑی جماعت کو حیوانوں کی قطار میں کھڑا کر دیا تھا۔ سانپوں کی پوجا ہوتی رہی اور بے ضرر معصوم لڑکیاں تمہارے بتائے ہوئے قانون کے مقتل میں ذبح کی جاتی رہیں' میں ان ہی بدنصیب دوشیزاؤں کے قافلے سے بچھڑی ہوئی ایک لڑکی ہوں جسے گجرات میں اتنی بار لوٹا گیا کہ اب زخموں کا شمار بھی یاد نہیں۔"

"تو راجپوتوں سے اپنے پرانے قرض چکا رہی ہے؟" نرملا کماری کا لہجہ بدل گیا اور راجپوتی خون کی گرمی نے اس کے الفاظ میں بھی ایک آگ سی بھر دی۔

"یقیناً۔" مہرخانم کی آواز اس طرح بلند ہو گئی تھی جیسے آج وہ خود کسی بااختیار ریاست کی راج کماری ہو اور نرملا کو وقت کے انقلاب نے قصرِ ہزار ستون کی بدترین لونڈی بنا دیا ہو۔ "بے غیرت ہے وہ عورت جو اپنی رسوائیوں کے زمانے کو فراموش کر دے۔"

ملک کافور انتہائی بے حیائی کے ساتھ کمرے کے وسط میں کھڑا اس منظر سے لطف اندوز رہا تھا۔

مہرخانم کی گفتگو سن کر نرملا کماری کے خون کی گردش تیز ہو گئی تھی اور اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے سب سے اذیت ناک موڑ پر تنہا کھڑی تھی اور اس کے گرد کم ظرف

دشمنوں کی اٹھائی ہوئی آہنی دیواریں تھیں جن سے ٹکرا کر خود کو ہلاک تو کیا جا سکتا تھا مگر رہائی کسی طرح بھی ممکن نہیں تھی۔

"اب مجھے تجھ سے کوئی گلہ نہیں مہر خانم!" نرملا کماری نے بڑے حوصلے کے ساتھ اپنے شکستہ اعصاب پر قابو پایا اور نئی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"راج کماری! تمہیں کوئی شکایت ہونی بھی نہیں چاہئے کہ تم اس خون آشام قوم کی سردار رہ چکی ہو۔" مہر خانم کا لہجہ مزید نفرت آمیز ہو گیا تھا۔ "تمہاری سزا عام راجپوتوں سے زیادہ سنگین ہوگی.......... اور تمہارے حق میں وقت کا انتقام شدید تر ہو گا۔" ابھی مہر خانم کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ ملک کافور نے اسے ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کا حکم دیا۔

مہر خانم مسکرائی اور نرملا کماری پر ایک حقارت کی نظر ڈالتی ہوئی واپس جانے لگی۔

نرملا کماری نے شاہی کنیز کو جاتے ہوئے غور سے دیکھا۔ مہر خانم کی رفتار میں ساری دنیا کی بے حیائیاں سمٹ آئی تھیں۔

کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ ملک کافور کا خیال تھا کہ نرملا کماری وحشت زدہ ہو کر چیخنے لگے گی یا پھر خود دروازہ کھولنے کیلئے بھاگے گی مگر راجپوت زادی نہایت اطمینان سے اپنی جگہ کھڑی رہی پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ مہر خانم بہت دور جا چکی ہے تو وہ ملک کافور سے مخاطب ہوئی۔

"مجھے یہاں کس لئے لایا گیا ہے؟" نرملا کے لہجے میں وہی حاکمانہ وقار تھا۔ "اس کنیز نے کہا تھا کہ مجھے امیر خسروؒ کے مکان پر لے جایا جا رہا ہے۔ میں دہلی کے راستوں سے ناآشنا ہوں ورنہ اس طرح فریب نہ کھاتی اور مجھے میری مرضی کے بغیر اس ناپاک جگہ پر پہنچایا نہیں جا سکتا تھا۔" نرملا نے چند الفاظ میں ملک کافور کے ذلت آمیز اور سیاہ اقتدار کی نفی کر دی تھی۔

شاہی خواجہ سرا ایک مجبور لڑکی کا یہ طرز تخاطب دیکھ کر لرز اٹھا۔ "بدنصیب لڑکی! وقت تجھے دربدر پھرا رہا ہے مگر تیری عادات نہیں بدلتی۔"

نرملا کماری خاموشی سے سنتی رہی۔

"کیا تو سمجھتی ہے کہ تجھے وہ بوڑھا شاعر میرے پنجۂ ستم سے بچا لے گا۔" ملک کافور نے حضرت امیر خسروؒ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی حیثیت ہی کیا ہے یہاں؟ کیا وہ تجھے پناہ دے سکتا ہے؟" ملک کافور کے دل کی ساری کدورتیں زبان پر آ گئی تھیں اور وہ اپنی غلیظ روح کا کثیف غبار ایک بند کمرے میں نکال رہا تھا۔ سر دربار وہ امیر خسروؒ کی طرف غلط نگاہ سے دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا مگر آج تنہائی میں اسی بے حیاء غلام کے ہونٹوں سے نفرتوں کا زہر ٹپک رہا تھا۔

"میں خدا کے سوا کسی دوسرے کی مدد پر یقین نہیں رکھتی مگر خسروؒ ایک عظیم انسان ہیں۔ جب مائی بھان متی ان کے آگے احترام سے سر جھکا سکتی ہیں تو پھر میری کیا حیثیت ہے؟" نرملا کماری کے لہجے میں غیرت مند اور شجاع عورتوں کا فطری جلال تھا۔ "انہیں دیکھ کر انسانیت پر اعتبار آ جاتا ہے۔ شاید ان ہی کی دعاؤں سے قصر ہزار ستون اپنی جگہ ٹھہرا ہوا ہے۔ ورنہ اب تک اس کے مکین لقمۂ اجل ہو چکے ہوتے۔"

"تو پھر اسی بوڑھے شاعر کو پکار کہ وہ تیرا مقدر بدل ڈالے۔" ملک کافور مشتعل ہو گیا۔

"میری تقدیر تو وہی ہے جو لکھ دی گئی ہے.......... اور میں اسے ہی پکاروں گی جو پکارنے کے لائق ہے۔" خطرات کے ہجوم میں بھی نرملا کماری کی بے خوفی برقرار تھی۔

"تیری تقدیر تو میں لکھوں گا نرملا کماری!" ملک کافور غصے سے بے قابو ہو گیا تھا۔ "وہ تقدیر جس سے دنیا کی مفلس ترین عورت بھی پناہ مانگے گی۔"

"اپنا مقصد بیان کر اور مجھے باہر جانے دے کہ میں تیرے سلطان کے عالی شان محلات کو آخری سلام کر سکوں۔" نرملا کماری کچھ اور بیباک نظر آنے لگی تھی۔

"قصر ہزار ستون میں داخل ہونے کے بعد واپسی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔" ملک کافور اپنی تمامتر خباثتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہنسا۔ "سلطان کے بعد ملک کافور ہی دوسری طاقت ہے جس کے اشارے پر موت و زیست کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اگر تو چاہتی ہے کہ یہ دروازہ دوبارہ کھل جائے تو مجھ سے میرے رحم کی بھیک مانگ۔"

"اور اگر میں انکار کر دوں؟" اچانک نرملا کے ہونٹوں پر ایک عجیب سا تبسم ابھر آیا تھا۔

"تو پھر میں تجھے جینے نہیں دوں گا نرملا!" ملک کافور کا معیارِ گفتگو بہت پست تھا اور وہ ایک راج کماری سے بڑا عامیانہ سلوک کر رہا تھا۔ "پھر نہ زندگی تیری ہوگی اور نہ موت۔ دنیا کے سارے غم اور رسوائیاں تیرے مقدر میں لکھ دوں گا۔ تو مجھے نہیں جانتی کہ میں کون ہوں؟ اگر آفریدی میرے آگے جھک گیا ہوتا تو آج اس طرح زنداں کے اندھیروں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہ مرتا۔ میں اس پر دولت و اقتدار کی بارش کر دیتا کہ میرے سوا یہاں کوئی تقدیر ساز نہیں۔"

"میں تجھے خوب جانتی ہوں۔" نرملا کماری کے لہجے میں وہی بے نیازی تھی۔ "تو ملک کافور ہے۔ انسانی تاریخ کے اوراق پر غلاظت کا ایک ڈھیر جسے صاف کرنے کیلئے آفریدی جیسے مردوں کو نذرانۂ جاں پیش کرنا ہی پڑتا ہے۔"

ابھی کمرے میں نرملا کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ اس گونج میں ایک اور آواز شامل ہو گئی یہ آواز ملک کافور کے اس تھپڑ کی تھی جو نرملا کے سرخ و سفید رخساروں پر ایک گہرا نشان چھوڑ گیا تھا۔

راجپوت زادی سناٹے میں آ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ملک کافور اس جارحیت پر اتر آئے گا۔

" ذلیل خواجہ سرا! تو مجھے نہیں جانتا کہ میں کون ہوں؟" یکایک نرملا کی آواز غضب ناک ہو گئی۔ "اگر تجھے اتنا ہی شوقِ ستم ہے تو شمشیر اٹھا اور میرے ہاتھ میں بھی تلوار دے۔ پھر تیرا سلطان ہی نہیں، تمام اہل دربار بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اس کمرے کا فرش کس کے خون سے رنگین ہوا ہے۔"

ملک کافور کچھ دیر کیلئے سہم سا گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ مہامنتری وکرم سنگھ کی بیٹی بھی فنونِ سپاہ گری سے واقف ہوگی۔ وہ نرملا کو عیش و نشاط کی خواب آور فضا میں پلنے والی ایک نرم و نازک سی لڑکی سمجھ رہا تھا۔ پھر جب راجپوت زادی کے تیور بدل گئے تو ملک کافور چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"تو ایک ستم رسیدہ عورت ہے نرملا! میں تجھ سے الجھنا نہیں چاہتا۔" ملک کافور نے اپنی ندامت مٹانے کیلئے چیخ کر کہا۔

نرملا کماری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ملک کافور کو مسلسل قہر آلود نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔

"آج کے بعد سے اپنی حیثیت پہچان لے کہ سلطان معظم نے تجھے میری کنیزوں کے حلقے میں داخل کر دیا ہے۔" بالآخر ملک کافور نے اپنی سفلی خواہش کا اظہار کر دیا۔ "اگر تجھے زندگی عزیز ہے تو میری خدمت گزاری کو اپنا مذہب سمجھ ورنہ سارے جہاں کی لعنتیں تیرا مقدر بن جائیں گی۔ میں تجھے صرف ایک رات کی مہلت دیتا ہوں۔ یہ رات تیرے فیصلے کی رات ہوگی۔ محفوظ اور آسودہ زندگی یا اذیتوں سے

بھری ہوئی موت ؟"

"سوچنے کی مہلت تو وہ مانگتے ہیں جنہیں زندگی سے محبت ہوتی ہے۔" نرملا کا لہجہ شرر فشاں تھا۔ "موت جس کی ہمدم ہو' رنج والم جس کے چارہ ساز ہوں اور رسوائیاں جس کی دوست ہوں وہ ایک لمحے کیلئے بھی نہیں سوچتا۔ اپنے سلطان کو میرے فیصلے سے باخبر کر دے کہ اس کا یہ وحشیانہ حکم میرے لئے اتنا بھی لائق توجہ نہیں جتنی کہ ایک بھکاری کی لرزتی ہوئی صدا۔"

ملک کافور کچھ دیر تک کھڑا سوچتا رہا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

شاہی خواجہ سرا کے جانے کے بعد نرملا کماری نے نئی صورت حال پر غور کیا۔ اب اس کی داستانِ حیات کا ایک اور اذیت ناک باب شروع ہو گیا تھا۔

ملک کافور اپنے کمرے سے نکل کر رام دیو کے کمرے میں پہنچا۔ عیار شعبدہ باز عقبی دریچے میں کھڑا ہوا ان ہواؤں کا لطف لے رہا تھا جو دریائے جمنا کے سرد پانی کو چھو کر قصر ہزار ستون میں داخل ہوئی تھیں۔ آج کل دریائے جمنا میں طغیانی آئی ہوئی تھی اور سرکش موجوں کا شور رات کے سناٹے میں عجیب سی آوازیں پیدا کر رہا تھا۔ ملک کافور کے داخل ہوتے ہی رام دیو پلٹ آیا۔ اس کے غلیظ ہونٹوں پر ایک خبیث مسکراہٹ رقصاں تھی اور آنکھوں میں کئی سوال لرز رہے تھے۔

"میں اس محاذ پر بھی جیت گیا۔" ملک کافور نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "میری فتوحات کا دائرہ بڑھتا جا رہا ہے گیانی! آج مجھے اندازہ ہو گیا کہ سلطان میری کسی خواہش کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

"تو بھوش (مستقبل) کا سمراٹ ہے گوپی رام۔" منافق رام دیو مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے پہلی بار بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ رام دیو کے دونوں ہاتھ ملک کافور کے کاندھوں پر رکھے ہوئے تھے اور وہ شاہی خواجہ سرا کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ "یہ سب کچھ یوں ہی نہیں ہو رہا ہے۔ تیری کامیابیوں میں ہندوستان کے سب سے بڑے گیانی کا آشیرواد بھی شامل ہے۔"

ملک کافور نے خاموشی سے اپنے سر کو جنبش دی۔ "گیانی! تیرے دہلی آ جانے سے مجھے بڑی تقویت حاصل ہوئی ہے۔ میں کئی سال سے اکیلا ہی اپنے دشمنوں کے خلاف جنگ کر رہا تھا۔ اب تو آ گیا ہے تو میں اپنے اندر نیا حوصلہ پا رہا ہوں۔"

"یہ کامیابیاں کچھ نہیں گوپی رام! میں تجھے راج سنگھاسن پر براجمان دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ کیسا عجیب وقت ہو گا جب پورا بھارت ورش تیرے قدموں پر جھک جائے گا۔ میں نے کل رات بھی تیرے زائچے پر غور کیا ہے۔ ستارے اسی انداز میں سرگوشیاں کر رہے ہیں کہ ایک دن مکٹ (تاج) تیرے سر پر سجا دیا جائے گا۔"

"تیرا گیان سچا ہے' رام دیو! مگر نرملا کے تیور بہت خوفناک ہیں۔" ملک کافور نے اچانک گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "اگر کچھ دیر پہلے اس کے ہاتھ میں خنجر ہوتا تو تجھے میرے کاندھوں پر سر نظر نہیں آتا یا پھر وہ وحشی لڑکی میرا سینہ چاک کر چکی ہوتی۔" ملک کافور نے نرملا کماری کے بارے میں ساری تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

"مت گھبرا گوپی رام! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" رام دیو کی ہوس کار آنکھوں میں کئی خواب کروٹیں لینے لگے تھے۔

"مجھے یقین نہیں گیانی کہ وہ میری بات مان جائے گی۔" ملک کافور گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ "عورتوں کا تو ذکر ہی کیا' میں نے بغاوت کے ایسے خوفناک شعلے تو کسی مرد کی آنکھوں میں بھی نہیں دیکھے۔ آخر تو کس بنیاد پر کہتا ہے کہ نرملا میری خواہشات کے آگے سر جھکا دے گی ؟ اس نے مجھے آفریدی سے بھی زیادہ غلیظ گالی دی ہے۔ میں اس کے نزدیک صرف ایک خواجہ سرا ہوں۔" ملک کافور کا چہرہ احساس ندامت و محرومی سے دھواں ہو رہا تھا۔ "خدا کی لعنت ہو نند لال پر کہ اس نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔"

ملک کافور اپنے ماضی کو یاد کر کے ایک ایسی آگ میں جلنے لگا تھا جسے ساری دنیا کی دولت اور اقتدار مل کر بھی نہیں بجھا سکتے تھے۔

"گزرا زمانہ واپس تو نہیں آ سکتا گوپی رام! مگر تو اپنی ہمت سے وقت کی باگ موڑ سکتا ہے۔" رام دیو نے ملک کافور کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا تو لہجہ بدل کر تسلیاں دینے لگا۔ "تجھے ان سب کے ہاتھ کاٹنا ہوں گے جن کی انگلیاں تیری طرف اٹھتی ہیں۔ آفریدی کی بدترین سزا یہ ہو گی کہ نرملا' نرملا نہ رہے۔ راج دربار کی ویشیا بن جائے۔ پھر اگر وہ زندہ بھی رہے تو کیا ہے ؟ اس سے اس کا مان چھین لے۔"

"میں نرملا کی طرف سے بہت مایوس ہوں۔ گیانی!" ملک کافور کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ "میں تو اسے زیادہ دیر تک اپنے کمرے میں بھی نہیں رکھ سکتا۔ پتہ نہیں' وہ کب مجھ پر بے خبری کے عالم میں وار کر دے۔ جو عورت ایک شاہی سپہ سالار کو مقابلے کیلئے للکار سکتی ہے اس پر قابو پانا اتنا آسان نہیں ہے۔"

ملک کافور کی گھبراہٹ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ "کیا وہ شمشیر زنی کے فن سے واقف ہے ؟" اچانک ملک کافور کو کچھ یاد آ گیا اور وہ رام دیو سے سوال کرنے لگا۔

"شاید!" رام دیو نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "وکرم سنگھ کے کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اس لئے اس نے اپنی لڑکی کو بھی مردوں کی طرح تربیت دی تھی۔" رام دیو کے حافظے میں ماضی کی کچھ یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ "وہ کئی بار شہسواری کے مقابلے میں سرفہرست رہ چکی ہے۔ ریاست چتوڑ کے جانباز نوجوان بھی اس کی برابری نہیں کر سکے تھے۔" رام دیو نے حقیقت کا اعتراف کر لیا۔

یہ سن کر ملک کافور کی دہشت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ "پھر ایسی لڑکی پر کون قابو پا سکتا ہے ؟" ملک کافور کے لہجے سے شدید مایوسی جھلک رہی تھی۔

"کیسی بزدلانہ باتیں کرتا ہے گوپی رام ؟ تیرے پاس طاقت ہے۔" رام دیو کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ "تو با اختیار ہے ؟ پھر اس گنبد میں اس بدنصیب لڑکی کی چیخیں سننے والا کون ہے ؟"

"سلطان کا حکم ہے کہ میں اسے کوئی جسمانی آزار نہ پہنچاؤں۔" ملک کافور نے علاء الدین کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ "پھر جب اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے اور وہ اپنے گناہ سے تائب ہو جائے گی تو سلطان اسے معاف کر دیں گے۔"

"نرملا کی معافی تیری موت ہے گوپی رام! ایک بار شکست کھائی تو پھر ہارتا ہی چلا جائے گا۔" رام دیو نے ملک کافور کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "راج نیتی کا پہلا اصول ہے کہ دشمن کو سانس لینے کا موقع بھی فراہم نہ کیا جائے۔"

"میں پریشان ہوں گیانی! بہت زیادہ پریشان۔" ملک کافور کے چہرے سے اضطراب جھلک رہا تھا۔ "اگر سلطان یہ شرط عائد نہ کر دیتے تو میں اس راجپوت زادی کو بھی وہی سزا دیتا جو رقاصہ زہرہ جمال کا مقدر بنی شاید اس سے بھی زیادہ لرزہ خیز اور عبرتناک۔"

"اپنے اقتدار کا مظاہرہ کر گوپی رام کہ تجھے بہرحال ہندوستان کا شہنشاہ بننا ہے۔" رام دیو نے ملک کافور کو ہراساں دیکھ کر ایک اور زاویہ بدلا۔ "سلطان سیاست کے ہنگاموں میں الجھا ہوا ہے۔ اسے اتنی فرصت کہاں ہے کہ وہ تجھ سے نرملا کے روز و شب کا حساب طلب کرے۔ تو نے نہیں دیکھا کہ تیرا سلطان پدمنی جیسی عورت کو بھلا بیٹھا۔ شہنشاہیت کی یہی ادائے خاص ہوتی ہے کہ وہ گزرے ہوئے لمحوں کا شمار نہیں کرتی۔"

رام دیو کی تقریر کا طلسم رنگ لا رہا تھا اور ملک کافور کی وحشت کم ہوتی جا رہی تھی۔

شاہی خواجہ سرا کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھ کر رام دیو نے اسے مشورہ دیا۔ "شکار تیری طاقت کے حصار میں موجود ہے اس سے پوری لذت حاصل کر۔ نئے نئے انداز سے آزار پہنچا پہلے اسے دولت کی چمک دکھا کر فریب دے۔ آفریدی کو اسی کی محبوبہ کے ہاتھوں ذلیل کرانے کی کوشش کر۔ پھر اگر وہ آمادہ نہ ہو تو بھرپور تشدد سے کام لے، میں تیرے ساتھ ہوں۔ مجھے بھی تو کرم سنگھ کی آوارہ روح سے اپنا حساب چکانا ہے۔" رام دیو، خواجہ سرا ملک کافور کے پردے میں کچھ اور ہی کھیل کھیلنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

☆ .... ☆ .... ☆

ملک کافور، سلطان کے عشرت کدے میں حاضری دینے کے بعد آدھی رات کے قریب واپس پہنچا۔

اس وقت نرملا کماری، ملک کافور کی خواب گاہ سے ملحقہ کمرے میں موجود تھی۔ مہر خانم اور دوسری کنیزیں اس کام کیلئے مامور کی گئی تھیں کہ کہیں نرملا کماری کمرے سے باہر نہ نکل جائے اور پھر ایک نیا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو۔ جب ملک کافور کمرے میں داخل ہوا تو نرملا کماری کنیزوں کے درمیان فرش پر بیٹھی تھی۔ اس کا انداز بے نیازانہ تھا جیسے وہ کسی محفوظ مقام پر ہو۔ ملک کافور اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتا ہوا اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔ مہر خانم بھی شاہی خواجہ سرا کے پیچھے پیچھے اس کمرے میں پہنچی جسے انتہائی قیمتی ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا تھا۔

"حضور!" مہر خانم ملک کافور کے سامنے جھک گئی۔ "یہ خود سر لڑکی کسی طرح بھی آپ کی خدمت گزاری کیلئے آمادہ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اس نے کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا ہے۔"

ملک کافور ایک بار پریشان نظر آنے لگا مگر فوراً ہی اسے رام دیو کا مشورہ یاد آ گیا کہ نرملا کا انکار دربارِ شاہی میں اس کے اثرات کو زائل بھی کر سکتا ہے۔ اس لئے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ جابرانہ اقدام کرے اور نرملا کماری کا اٹھا ہوا سر اپنے پیروں میں جھکا دے۔

"تو جا مہر خانم! میں اس راجپوت زادی کے حوصلے آزماؤں گا۔ وہ نہیں جانتی کہ چتوڑ اور دہلی کے دربار میں کتنا فرق ہے؟"

مہر خانم بظاہر مسلمان تھی مگر اس نے ابھی تک ہندوانہ رسمیں ترک نہیں کی تھیں۔ رخصت ہوتے وقت وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور ملک کافور کے قدموں میں جھک کر رات کا آخری سلام کیا۔ ملک کافور نے اپنے اقتدار کا مظاہرہ کرتے ہوئے مہر خانم کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہ عیار کنیز خواجہ سرا کی خواب گاہ سے نکل کر چلی گئی۔ دوسری کنیزیں بھی مہر خانم کے ساتھ تھیں کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا اور نرملا کماری تنہا رہ گئی۔

مہر خانم کے جاتے ہی ملک کافور ان تمام خنجروں اور تلواروں کو اتار کر الماریوں میں بند کرنے لگا جو کمرے کی زیبائش کیلئے دیواروں پر آویزاں کیے گئے تھے۔ یہ اس خوف کا ردعمل تھا جو نرملا کماری کی طرف

سے اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا تھا۔ وہ اس بہادر لڑکی کے بیباکانہ سلوک سے خائف تھا جو کسی وقت بھی اس کی موت کا سبب بن سکتی تھی، پھر اس کے بعد ملک کافور نے شراب کا ایک لبریز جام ہونٹوں سے لگایا۔ بادہ کشی کے دوران وہ نرملا کماری کو زیر کرنے کے مختلف طریقے سوچتا رہا اور کچھ دیر بعد ایک خفیہ دروازے سے نکل کر اس کمرے میں آ گیا جہاں نرملا کماری اپنے خیالات میں غرق سر جھکائے بیٹھی تھی۔

ملک کافور کے قدموں کی چاپ سن کر نرملا نے سر اٹھایا اور پھر دوسرے ہی لمحے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

ملک کافور آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا اور بڑے زہر آلود لہجے میں نرملا کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"وکرم سنگھ کی خوددار بیٹی! یہ میری مملکت ہے یہاں اسی شخص کی غیرت برقرار رہ سکتی ہے جس سے ملک کافور خود راضی ہو۔"

نرملا کماری نے اس بے حیاء خواجہ سرا کی جانب دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی۔

"یہ میرے اقتدار کا تعمیر کیا ہوا زنداں ہے۔" ملک کافور نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ "یہاں کوئی بھوکا رہے یا پیاسا! میں اپنے نافرمان کو اتنی آسانی سے مرنے نہیں دیتا۔ مجھے تیری زندگی پر مکمل اختیار حاصل ہے۔ تو اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک میں تیری موت کے حکم نامے پر مہر شاہی ثبت نہیں کر دیتا۔"

نرملا کماری نے ایک نگاہ غلط انداز سے ملک کافور کی طرف دیکھا۔ "میں نے اپنی گمراہی کے دور میں بھی دیوتاؤں سے آبرومندانہ زندگی کی پرارتھنا کی تھی پھر جب میں ایک خدا پر ایمان لائی تو میرے دامن پھیلانے کا انداز بھی بدل گیا ہے۔ اب میں زندگی کی کوئی تمنا نہیں رکھتی۔ میں اپنے پیدا کرنے والے سے دن رات ایک ہی دعا کرتی ہوں کہ مجھے موت آ جائے۔ ایسی موت جو غیرت مندوں کا مقدر ہوتی ہے۔"

"نرملا! تیری زندگی اور موت ہمارے ہونٹوں کی جنبش سے مشروط ہے۔ تیری پرسکون زندگی کیلئے اب صرف دو راستے باقی ہیں۔ ایک یہ کہ تجھے دل و جان سے میری خدمت گزاری کا فریضہ انجام دینا ہو گا۔ جب میں امور سلطنت کی تکمیل کے بعد تھک کر چور ہو جاؤں تو تیرے ہونٹوں کی مسکراہٹ مجھے تازہ دم کر دے، تیرے نازک ہاتھ جامِ سرخ پیش کریں اور مخروطی انگلیاں رباب کے تاروں کو چھیڑ دیں۔ یہاں تک کہ میں نغمہ و شراب کے اثر سے مسحور ہو کر خوابوں کے جزیرے میں چلا جاؤں۔ یہ وہ اعزاز ہے جو آج تک کسی عورت کو نہیں بخشا گیا۔ مگر میں تجھے سرفراز کرنا چاہتا ہوں کہ تو میرے دشمن علی عامر آفریدی کی محبوبہ ہے۔" ملک کافور شراب کے نشے سے سرشار تھا اور بڑی بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ "اگر تو آفریدی کو میرے سامنے ایک بار ذلیل کر دے تو میں تجھے ان عظمتوں کا تاج پہناؤں گا جس کے بارے میں تو نے سوچا بھی نہیں ہو گا۔"

نرملا کماری اٹھ کر کھڑی ہو گئی مگر اس نے شاہی خواجہ سرا کی اس شرمناک پیشکش کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ملک کافور کی بزدلی اور بے حیائی نے اس خاموشی کا یہی مفہوم لیا کہ نرملا اس کی باتوں سے مغلوب ہوتی جا رہی ہے۔ "اور اگر تو نے میری خواہش کا احترام نہیں کیا تو میں تجھے طویل اذیت رسانی کے بعد اس قدر بھیانک موت سے دوچار کروں گا جو درندگی میں اپنی مثال آپ ہو گی۔"

نرملا بدستور خاموش رہی وہ بڑے حوصلے کے ساتھ شاہی خواجہ سرا کی دھمکیوں کو برداشت کر رہی تھی۔

"موت سے پہلے ہم تجھے بہت رسوا کریں گے نرملا۔" ملک کافور نے ایک مجبور لڑکی کو دہشت زدہ کرنے کیلئے مزید جارحانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ ہم تیرے جسم پر لباس کا کوئی تار باقی نہ

رہنے دیں۔" شاہی خواجہ سرا ایک شریف زادی کے ساتھ بدترین سلوک کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تجھے سر دربار رقص کرنے پر مجبور کر دیں۔" ملک کافور وحشیانہ انداز میں دھمکیاں دے رہا تھا۔ "اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم تجھے بہت پنچ لوگوں کی داشتہ بنا ڈالیں"

نرملا کماری نے بڑے صبر و ضبط کے ساتھ ملک کافور کی دھمکیاں سنیں اور مڑ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے کے عقبی حصے کی طرف بڑھ گئی۔ دریائے جمنا میں تلاطم برپا تھا۔ طغیانی کے سبب پانی کی موجیں شدید پیچ و تاب میں مبتلا تھیں۔ اس وقت کوئی اہل دل موجود نہیں تھا ورنہ وکرم سنگھ کی بیٹی کا چہرہ دیکھ کر اسے اندازہ ہو جاتا کہ دریائے جمنا سے زیادہ خوفناک طوفان خود نرملا کے سینے میں اٹھ رہا ہے۔

نرملا نے لوہے کی سلاخوں سے باہر کی سمت دیکھا جہاں ہر شے اندھیروں میں لپٹی ہوئی تھی۔ یہ کمرے کا عقبی دروازہ تھا جسے ایک بھاری قفل کے ذریعے بند کر دیا گیا تھا۔ نرملا نے آہنی سلاخوں پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی اور گہری تاریکی میں روشنی کی اس کرن کو تلاش کرنے لگی جسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کی آنکھیں تھک گئی تھیں۔

ملک کافور قہقہہ زن ہوا۔ "جمنا بھی ہمارے حکم سے بہتی ہے نرملا! تجھے پانی کی تہہ میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔ یقیناً تیرا انجام خودکشی ہے........ مگر ابھی نہیں۔ رسوائیوں کا منظر دیکھ لے، پھر بھوک اور پیاس کے راستے سے گزر کر خود کو ہلاک کر ڈالنا، آگ لگا لینا یا بہتے ہوئے پانی میں اتر جانا۔ آج کی رات........ فقط آج کی رات........ یہ بھی بڑی مہلت ہے۔ کل ہم کوئی عذر نہیں سنیں گے۔" ملک کافور نے اس طرح نرملا کماری کے سامنے مختلف احکامات جاری کیے جیسے وہ مملکت ہند کا با اختیار حکمراں ہے اور نرملا اس کے سایۂ کرم میں پرورش پانے والی کمزور ترین مخلوق۔

نرملا نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا اور ملک کافور لڑکھڑاتا ہوا اپنی خواب گاہ میں واپس چلا گیا۔

☆..................☆..................☆

نرملا کچھ دیر آہنی سلاخوں سے سر ٹیکے کھڑی رہی۔ پھر اسے کسی قدر کمزوری کا احساس ہوا۔ آج نرملا نے شدید غصے کے سبب کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ اپنی ذات پر قصر ہزار ستون کا ہر عیش و سکون حرام کر چکی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ یا تو عزت مندانہ طور پر محلات شاہی کی حدود سے نکل کر کہیں اور چلی جائے گی یا پھر اسی طرح بھوکی اور پیاسی مر جائے گی۔ نرملا جانتی تھی کہ اس کا یہ احتجاج رائیگاں جائے گا مگر موت کے سوا نجات کا کوئی دوسرا راستہ بھی باقی نہیں تھا۔ رات کے پچھلے پہر اسے کمزوری محسوس ہوئی تو وہ کمرے کے اسی عقبی دروازے کے قریب فرش پر بیٹھ گئی۔ ایسی سنگین فضا میں نیند کہاں آتی ہے مگر جمنا کے پانی کو چھو کر آنے والی سرد ہواؤں نے اسے کچھ دیر کیلئے سلا دیا۔

اچانک نرملا کماری نے مائی بھان متی کو دیکھا جو کمرے کے دروازے سے داخل ہوئی اور بڑے والہانہ انداز میں نرملا کی طرف بڑھنے لگی۔ نرملا دیوانہ وار اٹھی اور بھان متی کے سینے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔

"مجھے سب چھوڑ کر چلے گئے ماں!" نرملا، بھان متی سے اہلِ دنیا کی بے وفائی اور وقت کے جور و ستم کا شکوہ کر رہی تھی۔

"بیٹی! تجھے کسی نے نہیں چھوڑا ہے۔" بھان متی، نرملا کو ایک شفیق و مہربان ماں کے لہجے میں تسلیاں دے رہی تھی۔ "جو اپنوں کے بھیس میں پرائے تھے وہ یقیناً چلے گئے۔ اور ان کا چلا جانا ہی بہتر تھا۔ مگر تجھ

سے محبت کرنے والے کہاں جا سکتے ہیں؟ لوگ توڑنا بھی چاہیں تو یہ رشتے نہیں ٹوٹ سکتے۔ وہ چپ چاپ مجبوریوں کی آگ میں جل رہے ہیں۔ ان کے دکھ کو کوئی نہیں سمجھ سکتا لیکن وہ سچے ہیں۔"

"اگر تو میری ہمدرد ماں ہے تو اپنی بیٹی کو عذاب کے اس جنگل میں تنہا چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھی؟" نرملا نے سسکتے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ میرے ساتھ کیسا سلوک کر رہے ہیں؟"

"میں تیرے پاس ہوں نرملا!" بھان متی خلشِ دل سے بے قرار نظر آ رہی تھی۔ "ہر لمحہ تیرے قریب ہی رہتی ہوں۔ تجھ پر گزرنے والی ایک ایک قیامت کو دیکھ رہی ہوں۔"

"پھر مجھے قہر کے اس زنداں سے نکال کر کہیں دور کیوں نہیں لے جاتی؟" نرملا نے کسی معصوم بچے کی طرح مچلتے ہوئے کہا۔ "آبو کی چوٹیوں سے بلند، تاروں کے پار، بہت دور........ بہت دور۔"

"تو اپنی ماں کی طرف کیوں نہیں دیکھتی بیٹی؟" مائی بھان متی نے نرملا کو علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ "میری جانب دیکھ کہ دنیا والے مجھے تمام عمر طوائف زادی کہہ کر پکارتے رہے۔ تو اندازہ کر سکتی ہے کہ میرے سینے پر محرومیوں اور غموں کا کتنا بوجھ ہے؟ پھر بھی میں زندہ ہوں، پورے یقین اور اطمینان کے ساتھ۔ الزاموں اور تہمتوں کی اس بارش نے میری روح کو نئی تازگی بخشی۔ میرے دل کی بنجر زمین سے ایمان کی فصل پھوٹی۔ اگر یہ پتھر کے پجاری مجھے اتنے آزار نہ پہنچاتے تو میں ایک خدا کی تلاش میں گھر سے کس طرح نکلتی؟ اپنے پیدا کرنے والے کو کیسے پکارتی؟ درد کا طوفان اٹھا تو میں نے چیخ کر اسے پکارا۔ اس نے میری پکار کا جواب دیا، میری مدد کو آیا اور مجھے توہمات کے منجدھار سے نکال کر یقین کے کنارے تک لے گیا۔ آفات و مصائب کی یلغار سے پریشان نہ ہو میری بیٹی! اس کے نام لیواؤں کو آزمائش کے اس مرحلے سے بھی گزرنا پڑتا ہے لوگ تو پتھروں کی خاطر ہنستے ہنستے اپنی جانوں کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ پھر تجھے کیا ہو گیا ہے؟ یہ بے صبری اور بے اختیاری کیوں؟ کسی سے عہد کیا ہے تو نبھا دے........ ورنہ تجھ میں اور رام دیو میں کیا فرق رہ جائے گا؟ بس میں تجھ سے یہی کہنے آئی تھی کہ اگر کوئی عورت ماں ہے تو وہ اپنی بیٹی سے دور نہیں رہ سکتی۔" یہ کہہ کر مائی بھان متی نے دروازہ کھولا اور باہر چلی گئی۔

خواب بکھر گیا اور نرملا گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ ظلم اور ناانصافی کے حصار میں پائی جانے والی ہر شے اپنی جگہ موجود تھی۔ دروازہ بدستور بند تھا۔ بس ایک مائی بھان متی ہی نہ تھی۔ نرملا نے بار بار اپنے اطراف پر نظر ڈالی۔ جانے والی جا چکی تھی اور اس کے قدموں کا عکس تک باقی نہ تھا۔ نرملا، بھان متی کو یاد کر کے رونے لگی۔ اب تک وہ غمگسار چہرہ آنکھوں سے روپوش تھا۔ خواب میں آیا تو ماضی کی یادیں ابھر آئیں۔ یادوں کی لے تیز ہوئی تو پلکیں بھیگنے لگیں۔ نرملا دوبارہ اٹھی اور آہنی سلاخوں سے باہر کا منظر دیکھنے لگی۔ جمنا کی موجیں اسی طرح بے چین تھیں اور قصر ہزار ستون کے پتھروں سے اپنا سر ٹکرا رہی تھیں۔

☆..................☆..................☆

اگرچہ داروغۂ زنداں سلیمان بن یوسف، آفریدی پر بہت مہربان تھا مگر زنجیریں پھر زنجیریں تھیں اور اسیری پھر اسیری تھی۔ تنہائی اور قید کے اندھیروں میں اس کا دم گھٹنے لگتا تھا اور ساری ساری رات جاگتے ہوئے گزر جاتی تھی یادوں کا ایک سیلاب تھا جو زنداں کی دیواریں توڑ کر اندر داخل ہو جاتا تھا اور پھر آفریدی کی خاموش دنیا تہہ و بالا ہو کر رہ جاتی تھی۔

کبھی مرحوم باپ کا چہرہ اس طرح روشن ہو جاتا کہ وہ اپنے بیٹے کو فرمانروائے وقت سے وفاداری کی تلقین

کرتے ہوئے نظر آتے۔ آفریدی انتہائی ضبط کے باوجود چیخ اٹھتا۔

"بابا! آپ کا بیٹا رسم وفا نبھاتے نبھاتے یہاں تک پہنچ گیا کہ حکومت کے سربراہ نے اس کے گلے میں "غداری" کا طوق ڈال دیا۔ اب آپ مجھ سے اور کیا چاہتے ہیں؟"

باپ کا چہرہ اوجھل ہو جاتا تو شائستہ بیگم کی نورانی شکل ابھر آتی۔ مسکراتے ہونٹوں سے شفقتوں کے پھول بکھرنے لگتے۔

"آفریدی! تو اہل وفا کی اولاد ہے۔"

ماں کی یہ دل نشیں آواز سماعتوں میں گونجتی تو آفریدی کے زخم خون دینے لگتے۔

پھر یکایک کسی گوشے سے عالیہ نمودار ہوتی اور شکایت کرنے لگتی۔ "بھائی! آپ اتنے دن تو گھر سے کبھی دور نہیں رہے۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ اب آ کیوں نہیں جاتے؟"

اس کے ساتھ ہی آفریدی کو وہ بھیانک خواب یاد آجاتا جسے وہ ایک تسلسل کے ساتھ چھوڑ کے طلسم کدے میں دیکھتا رہا تھا۔ اس خواب کی یاد تازہ ہوتے ہی آفریدی کو محسوس ہوتا جیسے کائنات میں ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے اور سرخ شعلوں کے درمیان اس کی ماں اور بہن چیخ رہی ہیں۔

آفریدی بے اختیار ہو کر زنداں کی دیواروں سے سر ٹکرانے لگتا۔ "اے خدا! اے خدا! میرے ساتھ انصاف کر! میں بہت کمزور ہوں۔ تو ان سے میرا بدلہ لے۔ ظالموں کو اس طرح زمین پر کھلا نہ چھوڑ۔ جس طرح میں جلا ہوں' ان کے گھروں پر بھی ایسی ہی آگ برسا دے کہ تیرے سوا میرا کوئی کفیل نہیں۔"

کبھی کبھی آفریدی اپنی نفرتوں کے اظہار کیلئے اتنی طاقت سے چیختا کہ قید خانے کے محافظ بھی لرز اٹھتے۔ پھر داروغۂ زنداں سلیمان بن یوسف کو اس کی تسلی کیلئے خود آنا پڑتا۔ آفریدی قید خانے کے نگراں کو دیکھ کر سنبھل جاتا۔ علی عامر پر یہ راز تو پہلے ہی فاش ہو چکا تھا کہ حضرت امیر خسروؒ کی مداخلت کے سبب سلطان نے اس کی جاں بخشی کی ہے پھر ایک دن سلیمان بن یوسف نے آفریدی کو یہ بھی بتا دیا کہ امیر خسروؒ اس کی خبر گیری کیلئے قید خانے کی دیواروں تک آئے ہیں۔

سلیمان بن یوسف خود بھی ایک باکردار انسان تھا' اس لئے آفریدی سے بہت محبت کرنے لگا تھا۔ پھر جب علی عامر اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ذکر کرتا تو سلیمان بن یوسف اس غیرت مند اور مظلوم نوجوان کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہتا۔

"میرے بچے! ظلم کی یہ ادا بہت قدیم ہے کوئی زمانہ تشدد اور ناانصافی سے خالی نہیں رہا ہے۔ پھر بھی ہر دور میں ظلم کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے اور تو بھی ان ہی جانبازوں میں شامل ہے جن کے سینے فگار ہوئے مگر آسمان کی آنکھ نے ان کی پیٹھ نہیں دیکھی۔ اپنے اشکوں کو پی لے کہ یہ آنسو خدا کی عدالت میں تیرے مقدمے کو کمزور کر دیں گے۔ اس سے انصاف چاہتا ہے تو پھر سب کچھ اسی پر چھوڑ دے۔ تو اس غم خانے میں تنہا نہیں۔ تیرے سوا یہاں کچھ اور بھی شب گزیدہ ہیں جو بہت دن سے اجالے کی ایک کرن کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ تو بس بے داغ اور روشن صبح کا انتظار کر۔"

سلیمان بن یوسف کی ہمدردیاں اسے پرسکون کر دیتیں اور وہ دوبارہ جی اٹھتا۔ پھر آفریدی' نرملا کماری کا حال جاننے کیلئے بے چین ہو جاتا تو داروغۂ زنداں یہ کہہ کر معذرت طلب کر لیتا۔

"قصر ہزار ستون میں اس کا گزر نہیں۔ وہ محلاتِ شاہی کے راز جاننے سے قاصر ہے۔"

اور کسی کو نرملا کا راز معلوم بھی کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ غمزدہ لڑکی ملک کافور کی بدترین قید میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ نرملا نے دوسرے دن بھی کھانا نہیں کھایا تھا اور اس کی نقاہت غیر معمولی حد تک بڑھ گئی تھی۔ ملک کافور دربار سے اٹھ کر سیدھا اس کمرے میں پہنچا جہاں نرملا ایک قیدی کی طرح فرش پر دراز تھی۔ شاہی خواجہ سرا کو محل کی کنیزوں نے بتایا کہ نرملا کسی طرح بھی غذا کے استعمال کیلئے آمادہ نہیں ہے۔ ملک کافور کے قدموں کی آہٹ سن کر نرملا اٹھ بیٹھی اور اسی انداز میں منہ پھیرے ہوئے کمرے کے عقبی دروازے تک چلی گئی جہاں سے دریائے جمنا کا تیز رفتار پانی صاف نظر آتا تھا۔

"رات گزر چکی نرملا اور تجھے دی ہوئی مہلت بھی ختم ہو گئی۔" ملک کافور نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

نرملا کوئی جواب تو کیا دیتی' اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

ملک کافور نے دروازہ بند کیا اور خاموشی سے اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔ پھر فوراً ہی شراب کی ایک لبریز صراحی اور بلوریں جام لے کر واپس آیا۔ "ساقی گری کی رسم ادا کر کہ میں بہت تھک گیا ہوں۔" یہ کہتا ہوا ملک کافور' نرملا کے قریب پہنچا۔

راجپوت زادی غیر متوقع انداز میں مڑی اور اس نے ملک کافور کے ہاتھ سے صراحی و جام لے لئے۔ خواجہ سرا کے چہرے پر ناقابل بیان خوشی رقص کرنے لگی۔ مگر یہ خوشی اس وقت فنا ہو گئی جب کمرے کے فرش پر ہر طرف شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے اور شراب قالین میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔

"آئندہ بھی تیری ہر پیشکش کا یہی حشر ہو گا۔" نرملا نے کہا اور بے نیازانہ چلتی ہوئی دریچے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

ملک کافور نے دیوار پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ لی تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں پہنچا پھر کچھ دیر بعد ہی اس کا ملازم خاص نورالدین نورا چند سپاہیوں کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا اور نرملا کو کھینچتا ہوا اس جگہ لے گیا جہاں ملک کافور ایک آبنوسی کرسی پر بیٹھا ہوا شغل مے کر رہا تھا۔

"اسے ستون سے باندھ دے نورا! اور باہر کی فضا پر گہری نظر رکھ!" ملک کافور کے ارادے غیر ہو گئے تھے۔

نورا نے اپنے آقا کے حکم پر عمل کیا اور نرملا کے چاروں طرف ریشمی رسیوں کا حصار کھینچ کر چلا گیا۔

ملک کافور اپنی نشست سے اٹھا۔ "تیری طرح آفریدی نے بھی یہی کہا تھا کہ میں صرف ایک خواجہ سرا ہوں۔" ملک کافور' نرملا کے قریب آیا اور شراب کا بھرا ہوا جام اس کے چہرے پر الٹ دیا۔

نرملا خاموش کھڑی رہی مگر ملک کافور کی اس حرکت پر اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

"تجھے میری غلامی منظور ہے؟" ملک کافور کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ نرملا سے آخری سوال کر رہا ہو۔

"اگر تیرا سلطان مجھ سے یہ بات پوچھتا تو میں اسے جواب دیتی۔" بالآخر نرملا کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

"تو تو غلامی کے قابل بھی نہیں بے حیا!"

ملک کافور کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ پھر کچھ دیر بعد نرملا کے جسم پر تازیانوں کی بارش ہونے لگی۔ ملک کافور کے سینے میں چھپی ہوئی نفرتوں نے بزدلانہ تشدد کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔

فطرتاً بہادر ہونا اور بات ہے مگر نرملا اول و آخر ایک شاخِ گل تھی۔ قہر کی آندھی اسے جھکا تو نہیں سکی لیکن ٹوٹ جانا اس کا مقدر تھا۔ اس نے کئی تازیانوں کی ضربیں برداشت کیں۔ پھر درد کی شدت سے چیخی اور بے ہوش ہو گئی۔ کئی جگہ سے اس کا لباس بھی دریدہ ہو گیا تھا۔

ملک کافور' نرملا کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک بے سہار الڑکی تازیانے کی شکل دیکھ کر ہی اپنا ایمان بدل ڈالے گی مگر شاہی خواجہ سرا کی تمام قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوئیں۔ ملک کافور' نرملا کی بگڑی ہوئی حالت پر دھیان بھی نہ دیتا لیکن اسے سلطان کی تنبیہہ یاد آرہی تھی اور اسی وجہ سے وہ خوفزدہ ہو کر کمرے سے نکل گیا۔

دوسرے ہی لمحے شاہی خواجہ سرا رام دیو کو ساری صورت حال بتا رہا تھا۔ "دو دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ بھوک اور زخموں کی شدت اس کی جان لے لے گی رام دیو!" ملک کافور کے لہجے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہو گا گوپی رام! مجھے اسی لمحے کا انتظار تھا۔" رام دیو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اسے میرے کمرے میں پہنچا دے میں نرملا سے تیری توہین کا انتقام بھی لے لوں گا اور اپنا قرض بھی اتار دوں گا۔"

ملک کافور پلٹا اور پھر نور الدین نورا کے ساتھ کئی سپاہی بے ہوش نرملا کو ایک خفیہ دروازے سے نکال کر رام دیو کے کمرے کی طرف لئے جا رہے تھے۔ ملک کافور نے کنیز مہر خانم کو بھی طلب کر لیا تھا جو مختلف خوشبوئیں اور دوائیں لے کر حاضر ہو چکی تھی۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور رات کی تاریکی آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی۔ مہر خانم نے قیمتی خوشبوؤں اور دواؤں کو نرملا کے جسم پر آزمایا۔ زخم بہت گہرے نہیں تھے۔ بھوک سے پیدا ہونے والی نقاہت اور تازیانے کی ضربوں نے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ پھر جب شربت نیلوفر اور شہد کے چند چمچے اس کے منہ میں ڈالے گئے تو وہ ہوش میں آنے لگی۔ ملک کافور مطمئن ہو گیا۔

مہر خانم کو کمرے سے رخصت کر کے وہ رام دیو سے سرگوشیاں کرنے لگا۔ "سلطان کی خدمت میں حاضری کے بعد نصف شب کے قریب واپس لوٹوں گا۔ میرا خیال ہے کہ اس لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔" نرملا کی حالت زار دیکھ کر ملک کافور کا جوش انتقام سرد ہوتا جا رہا تھا۔ "اگر یہ مر گئی تو نیا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو گا۔"

"گوپی رام! تو پورے اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے۔" رام دیو کے ہونٹوں پر وہی عیار مسکراہٹ مچل رہی تھی۔ "تیرے آنے تک اس کا دماغ درست ہو چکا ہو گا۔ میرا منتر اس کی غیرت و حیاء کا طلسم توڑ دے گا۔ پھر یہ تیرے پیروں میں ایک داسی کی طرح جھک جائے گی۔"

ملک کافور مطمئن ہو کر چلا گیا اور رام دیو' نرملا کے قریب بستر پر بیٹھ گیا جو آہستہ آہستہ ہوش میں آرہی تھی۔ شیطان اپنے ایک پیرو کار کے جسم میں پوری طرح حلول کر چکا تھا۔ رام دیو نے بڑی ہوس کار نظروں سے اس لڑکی کی طرف دیکھا جس کے سامنے رانی پدمنی کا حسن بھی ہیچ تھا۔ وہ تو رانی ہونے کے سبب شہرت پا گئی تھی ورنہ جہاں تک دلکشی کا تعلق تھا تو نرملا کماری' پدمنی سے زیادہ جاذب نظر عورت تھی۔ رام دیو کچھ دیر تک وکرم سنگھ کی بیٹی کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کے دل و دماغ آتشِ انتقام میں جلنے لگے۔ وہ سنیاسی آنند پال اور مہامنتری سے انتقام لینا چاہتا تھا۔

رام دیو نے جی بھر کے شراب پی اور نرملا کے مکمل ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بار بار اس کے چہرے پر عرق گلاب چھڑک رہا تھا۔ یہاں تک کہ نرملا نے آنکھیں کھول دیں۔ اس وقت رام دیو اپنے ہاتھ سے طاقت بخشنے والی دوا کی ایک خوراک پلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نرملا فوری طور پر رام دیو کو نہ پہچان سکی مگر

اس نے ایک غیر مرد کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دیا اور انتہائی ضعف و ناتوانی کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کون ہے تو؟" نرملا نے ڈانٹ کر پوچھا اور لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ بستر سے اترنے لگی۔

رام دیو خاموش کھڑا رہا۔ پھر جب نرملا کی دھندلی آنکھیں صاف ہوئیں تو وہ جوشِ غضب سے چیخ اٹھی۔

"رام دیو!"

"رام دیو نہیں' مہاراج رام دیو تیرا آقا۔"

"میرے بزرگوں کی بھیک پر پلنے والا منافق برہمن۔" نرملا اتنی زور سے چیخی کہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور لہرا کر فرش پر گر پڑی۔ "تو یہاں کس لئے آیا ہے؟"

"اس خواجہ سرا کی تو محض ایک آڑ ہے۔ دراصل سلطان نے تجھے میری خدمت گزاری کیلئے وقف کر دیا ہے۔" رام دیو بے ہنگم انداز میں ہنسا۔ شراب اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ "آج میں تجھے داغدار کر کے تیرے باپ کی آوارہ روح سے اپنا سارا حساب چکا دوں گا اور تیری ماں' بھان متی کو بھی بتا دوں گا کہ رام دیو کے منتروں کا کوئی توڑ نہیں۔"

نرملا نے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی مگر رام دیو کا سیاہ ہاتھ بلند ہوا اور راجپوت زادی کے چہرے پر گہرے زخم کا نشان چھوڑ گیا۔ رام دیو کے دونوں ہاتھ لوہے کے کڑوں سے بھرے ہوئے تھے اور ان ہی کڑوں کی ضرب سے نرملا دوبارہ فرش پر گر گئی تھی۔ یہ چوٹ اتنی شدید تھی کہ نرملا مزاحمت نہ کر سکی اب اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر جسم نے مدافعت سے انکار کر دیا تھا۔ رام دیو کی دست درازیاں بڑھتی چلی گئیں اور شیطان کے ایک پجاری نے اس پاکباز دوشیزہ کو بے لباس کر دیا جسے ہواؤں نے بھی بے پردہ نہیں دیکھا تھا۔ نرملا کی آواز بیٹھ چکی تھی مگر پھر بھی وہ مسلسل چیخ رہی تھی۔ رام دیو کا آہنی ہاتھ دوبارہ بلند ہوا اور نرملا کے چہرے کی دوسری جانب نیا زخم ابھر آیا۔

نرملا کی آنکھیں اشکوں سے بھر گئیں اور ہونٹ کانپنے لگے۔

کمرے میں رام دیو کا شیطانی قہقہہ گونجنے لگا.......... "آبو کی چوٹیوں پر رہنے والی جادوگرنی! تو اپنی بیٹی کا حشر دیکھ رہی ہے؟ اور اے چتوڑ کے عظیم سیاستداں! تو نے دیکھا کہ فتح کس کی ہوئی؟" رام دیو کسی درندے کی طرح رقص کر رہا تھا۔ "بس چند لمحوں کی بات ہے تیری غیرت و ناموس کی کتاب ورق ورق ہوا میں اڑتی پھرے گی۔"

پھر یکایک رام دیو کے ہذیانی قہقہے بند ہو گئے۔ وہ وحشیانہ انداز میں نرملا کی طرف بڑھا۔ راجپوت زادی کے آنسو اس کے چہرے کے زخموں کو دھو رہے تھے اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے رام دیو کو اپنے قریب آتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ چتوڑ کا شعبدہ باز نرملا کے نزدیک پہنچ کر آخری بار ہنسا اور پھر دفعتاً اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا سارا جسم پتھر کا ہو گیا ہے۔ رام دیو پیچھے کی طرف پلٹا۔ اس کے دست و پا اچانک حرکت کرنے لگے۔ رام دیو دوبارہ نرملا کی جانب بڑھا اور ایک مرتبہ پھر اس کی وہی حالت ہو گئی۔ خوف و دہشت کی تیز لہر اور فالج زدہ جسم۔ منافق برہمن نے کئی بار یہ عمل دہرایا۔ جب وہ نرملا سے دور ہو جاتا تو اس کی جسمانی طاقت لوٹ آتی تھی اور پھر جیسے ہی وہ نرملا کو چھونے کی کوشش کرتا تو اس پر ناقابلِ بیان خوف طاری ہو جاتا اور وہ اپنے آپ کو پتھر کا ایک بے جان مجسمہ سمجھنے لگتا۔

آخر اس کشمکش میں بہت دیر ہو گئی۔ رام دیو کی بدحواسی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر وہ اپنے بال نوچنے لگا۔ کسی نادیدہ طاقت نے سارا گیان اور سارے منتر اس کے منہ پر الٹ مارے تھے۔ رام دیو پاگل ہو کر چیخنے

لگا۔ "میں جانتا ہوں کہ وہ بوڑھی جادوگرنی میرے راستے کی دیوار بن گئی ہے......... مگر میں بھی اپنی قسم پوری کرکے رہوں گا۔" یہ کہہ کر رام دیو نے جلتی ہوئی شمع اٹھالی اور بڑے خوفناک ارادوں کے ساتھ نرملا کی طرف بڑھا۔ "میں تجھے اس انداز سے داغدار کروں گا کہ تو دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ جس خوبصورت چہرے کو رام دیو نہیں چھو سکتا' اسے پھر کوئی آئینہ بھی قبول نہیں کرتا۔"

کمرے میں نرملا کی گھٹی گھٹی چیخیں گونجنے لگیں۔ رام دیو کے ہاتھ تیزی سے گردش کررہے تھے............ اور وہ بدکار جادوگر شمع کی دھیمی دھیمی آگ سے نرملا کے دلکش چہرے کو جلا رہا تھا۔ چند لمحوں میں رام دیو نے راجپوت زادی کے جسم پر اتنے داغ ابھار دیئے تھے کہ ان کا کوئی شمار نہیں تھا۔ مرمریں بدن اب کوئلے کی طرح سیاہ ہوچکا تھا......... اور نرملا کماری زخموں کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوگئی تھی۔

رام دیو مسلسل شراب پی رہا تھا اور خود کلامی کے انداز میں بول رہا تھا۔ "انتقام کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جو چیز حاصل نہ ہوسکے اسے تباہ کرڈالو۔"

جب آدھی رات کے قریب ملک کافور واپس آیا تو رام دیو شراب کے نشے میں بیٹھا جھوم رہا تھا اور نرملا کماری قریب ہی کمرے کے فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔

"یہ سب کچھ کیا ہے گیانی؟" ملک کافور' نرملا کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ "کیا تو نے اسے مار ڈالا؟"

رام دیو نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان کے ساتھ اپنی ناکامی کا اعتراف کرلیا۔ "گوپی رام! میں تیرے دشمن کو بے آبرو تو نہ کرسکا مگر میں نے اس کی دنیا خراب کردی۔"

"اگر کسی دن سلطان نے اسے طلب کرلیا تو........." شدتِ خوف سے ملک کافور کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کہہ دینا کہ رسوائی کے خوف سے اس نے خودکشی کرلی۔" رام دیو انتہائی سفاک مگر مطمئن لہجے میں بول رہا تھا۔ "اس کا مرجانا ہی تیرے حق میں بہتر ہے۔ جو سانسیں بچ گئی ہیں انہیں جمنا کا پانی نگل لے گا۔ یہ پاپی شریر اس قابل تو نہیں کہ اسے پوتر جل کی بھینٹ چڑھایا جائے لیکن کیا کریں گوپی رام! مجبوری ہے۔"

پھر رات کے سناٹے میں ملک کافور اور رام دیو' نرملا کے بے ہوش جسم کو اٹھائے ہوئے عقبی دروازے سے نکل کر باہر آئے اور سیڑھیاں اتر کر جمنا کے کنارے پہنچ گئے۔ سرکش موجیں اس طرح آپس میں متصادم تھیں کہ ہر طرف ایک عجیب سا شور برپا تھا۔ یکایک چار طاقتور ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور نرملا کا بے لباس جسم دریا میں پھینک دیا گیا۔

رام دیو کا خوفناک قہقہہ گونجا۔ "گوپی رام! تجھے یہ شاندار فتح مبارک ہو۔ تیرے دونوں دشمن اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ ایک مچھلیوں کی غذا بن جائے گا اور دوسرے کو زنداں کے اندھیرے آہستہ آہستہ چاٹ لیں گے۔" رام دیو لڑکھڑایا لیکن اس نے فوراً ہی ملک کافور کے کاندھے کا سہارا لے لیا اور آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"دیکھ میرے مستقبل کے شہنشاہ! غور سے دیکھ! تیرے اقتدار کا ستارہ مریخ کیسی آب و تاب سے چمک رہا ہے؟ آج اس کا رنگ کتنا سرخ ہے؟"

(ختم شد)